شمارۂ خاص

(۱۰۔۱۱)

[سندھ یونیورسٹی کی پچاسویں سالگرہ تقریبات (۱۹۹۷ء ۔ ۱۹۴۷ء)
کی مناسبت سے ایک خصوصی پیشکش]

(۱۹۹۶۔۹۷ء)

TAHQIQ, VOL. 10-11,1996-97

Department of Urdu, University of Sind, Jamshoro, Pakistan

شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ

دسواں، گیارہواں مشترکہ شمارہ

سندھ یونیورسٹی کی پچاسویں سالگرہ تقریبات (۱۹۴۷ء - ۱۹۹۷ء)
کی مناسبت سے بطور شمارۂ خاص شائع کیا جاتا ہے

شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی

۱۹۹۷ء - ۱۹۹۶ء

فہرستِ مشمولات

مقالات

متعاقب تحریریں:

مکتوبات:

تبصرے | رفتار تحقیق | مجالس تحقیق و مذاکرہ

اس شمارے کے مقالہ نگار

مقالہ نگار	
ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں	پروفیسر ایمریطس سندھ یونیورسٹی
ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ	پروفیسر ایمریطس سندھ یونیورسٹی
ڈاکٹر نذیر احمد	پروفیسر ایمریطس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ڈاکٹر مختار الدین احمد	پروفیسر ایمریطس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ڈاکٹر عبدالجبّار جونیجو	سابق پروفیسر اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس، سندھ یونیورسٹی
نگینہ پروین تحسیم	استاد شعبۂ نفسیات، سندھ یونیورسٹی
زاہد منیر عامر	استاد شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی
ڈاکٹر آصفہ زمانی	صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی
سیّد محمد سلیم	ڈائریکٹر ادارہ تحقیق تعلیم، لاہور
ڈاکٹر قمر جہاں مرزا	استاد شعبۂ سندھی، سندھ یونیورسٹی
سیّد جاوید اقبال	استاد شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی
حکیم محمد موسیٰ امرت سری	٥٥ ۔ ریلوے روڈ، لاہور
ڈاکٹر سیّد حسن عبّاس	رضا لائبریری، رام پور
علی رضا ذکاوتی قراگزلو	بتوسط مجلات معارف و نشر دانش تہران
جلال الیاس	
نصر اللہ حکمت	
سیّد علی میر افضلی	
حنا عنبرین	لیکچرر، گرلز ماڈل کالج، اسلام آباد
نجم الاسلام	مدیر تحقیق

گوشۂ تحقیق منسوبات حصہ دوم کے مقالہ نگار

توضیحات ـــ ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گیان چند، نجم الاسلام۔

مقالات ـــ شبلی، محمود شیرانی، محمد محفوظ الحق، نکلسن، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر نذیر احمد، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، مالک رام، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سیّد امیر حسن عابدی، عطا الرحمن کاکوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر محمد ایّوب قادری، ڈاکٹر امیر اللہ شاہین، عبدالرحمن المعلمی، حبیب الرحمن اعظمی، ضیاء الدّین اصلاحی، پول کروس، راشد برہانپوری، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر حسینی شاہد، سخاوت مرزا، نجم الاسلام، زاہد منیر عامر، خورشید احمد خاں، محمد ابراہیم ڈار، محمد اسلم۔

مترجمین

ڈاکٹر ہدایت اللہ اخوند، مسز فہمیدہ شیخ، ضیاء الدّین اصلاحی، نجم الاسلام

ماہرین خصوصی برائے مقالات

حسب سابق

مُبصّرین

نجم الاسلام، سیّد جاوید اقبال، انعام الحق عباسی

پیش گفتار

یہ جامعۂ سندھ کی پچاسویں سالگرہ (۱۹۴۷ء - ۱۹۹۷ء) کے حوالے سے، رسالۂ تحقیق کا خصوصی شمارہ ہے۔

اس کے مشمولات میں، علاوہ تحقیقی مقالات کے، دو گوشے خصوصیت سے قابل ذکر و قابل توجہ ہیں۔

گوشۂ بلوچ، تہنیت نامہ ہے ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کی نصف صدی سے بھی زائد عرصے کی وقیع علمی خدمات کے اعتراف میں۔ ان کی علمی زندگی عبارت ہے شوق و شغف اور محنت و انہماک سے۔

دوسرا گوشہ، تحقیقِ منسوبات سے متعلق ہے۔ غلط انتسابات کی تحقیق سے متعلق اتنا کثیر مواد شاید ہی کہیں اور یکجا ملے۔ یہ ادبی تحقیق کی ایک اہم خدمت ہے جو رسالۂ تحقیق کے ذریعے انجام پائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ گوشہ ہمارے اسکالر صاحبان کی علمی ضرورتوں کو بخوبی پورا کرے گا، اور اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

اس نوعیت کے گوشوں کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ یہ جامعہ کے علمی مقاصد کے فروغ میں مددگار ہوں گے۔

نذیر احمد مغل

(ڈاکٹر نذیر احمد مغل)

وائس چانسلر، سندھ یونیورسٹی

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں :

تقدیمات

(گوشۂ بلوچ اور گوشۂ تحقیق منسوبات کے حوالے سے)

(۱)

فاضل محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب

علامہ آئی آئی قاضی مرحوم (م ۱۹۶۸ء) نے از راہ کرم مجھ عاجز کو ۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے نوازا۔ اسی دن سے محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب، ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ صاحب اور پروفیسر علی نواز جتوئی مرحوم (۱۹۹۶ء) نے اپنے اخلاق کریمانہ سے مجھ پر عنایتیں مبذول فرمائیں۔ یونیورسٹی میں آتے ہی قریب ڈھائی ماہ کے بعد والدۂ ماجدہ کا انتقال ہوا۔ تینوں بزرگوں نے بڑی محبت اور ہمدردی کے ساتھ میرے غم میں شرکت فرمائی۔ پھر عجیب اتفاق ہوا کہ میرے بڑے بھائی صاحب اور میری خوش دامن صاحبہ نے بھی دو تین ماہ کے بعد ہم لوگوں کو غم زدہ چھوڑا۔ علامہ صاحب مرحوم اور بالخصوص مذکورۂ بالا تینوں بزرگوں نے ہر موقع پر تعزیت اور انتہائی خلوص سے نوازا۔ بحمداللہ یہ خلوص ان کے اور مجھ عاجز کے عزیزوں میں روز افزوں ہے۔

محترم ڈاکٹر بلوچ صاحب نے اپنے بعض علمی کاموں میں مثلاً بیگلار نامہ، سندھی اردو ڈکشنری، اردو سندھی ڈکشنری، دیوان احمدؔ، سندھ میں اردو شاعری کی ترتیب، تصحیح اور تزئین میں بھی مجھ عاجز کو تعاون کا موقع عنایت کیا اور جب بھی ان کی کوئی تصنیف شائع ہوئی تو انھوں نے مجھے کبھی فراموش نہیں فرمایا۔ ان کے اعزہ اور اقارب کا بھی یہی کرم ہے اور مسلسل عنایتیں بدستور ہیں۔

ان کے گراں قدر علمی اور سماجی کاموں کا تفصیلی اور سیر حاصل جائزہ لیا جانا ابھی باقی

ہے۔ لیکن مجھے ڈاکٹر صاحب کے دینی شغف کا شاید زیادہ علم ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ بحمداللہ بہت دین دار ہیں۔ خاموشی سے غریبوں کی امداد فرماتے ہیں۔ مختلف دینی کاموں میں (بالخصوص مساجد اور مدارس کی تعمیر میں) حصہ لیتے ہیں۔ رمضان المبارک میں روزہ داروں کے لیے مناسب انتظامات میں بھی ان کا حصہ بہت پوشیدہ طور پر ہوتا ہے۔ ایسا مہذّب ، مؤدّب اور باوقار پڑوسی مجھ عاجز کے لیے بہت بڑا انعام ہے۔ میں ہمیشہ ان کے لیے اور ان کے اعزہ کی فلاح کے لیے دعا کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو دونوں جہانوں میں سرفراز و سربلند فرماتا رہے۔ آمین ۔ ثم آمین۔

وہ سلامت رہیں ہزار برس　　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۲)

گوشۂ تحقیق منسوبات

عزیز گرامی منزلت محترم ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے رسالۂ تحقیق کے اجرا (۱۹۸۸ء) سے علمی اور ادبی تحقیق کے لیے ایک ایسی داغ بیل ڈالی ہے جو قابل صد تحسین و آفرین ہے۔ اس رسالے کے اب تک جتنے شمارے شایع ہوئے ہیں وہ پاک و ہند کی علمی دنیا میں بہت مقبول ہیں ، کیونکہ عزیز محترم نے علم و ادب کے بعض ایسے گوشے ڈھونڈ نکالے ہیں جن تک عموماً مکمل رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اب انھوں نے ماشاءاللہ "گوشۂ تحقیق منسوبات" مرتّب کیا ہے جو اپنی نوعیت میں یکتا ہے اور بے حد اہم ہے ، کیونکہ اسمیں مختلف محققین کے متعلقہ کاموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

اس مفید اور اہم علمی کام کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اس قدر سخت کوشش کی ہے کہ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ مشک آنست کہ خود بوید۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کا اعلیٰ ذوق پیدا کر دیا ہے۔

______ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (۱۶/۱۶)۔

احقر: غلام مصطفےٰ خاں

اداریہ

یہ تحقیق کا خاص شمارہ ہے جسے سندھ یونیورسٹی (تاسیس اپریل ۱۹۴۷ء) کی پچاسویں سالگرہ تقریبات کی مناسبت سے پیش کیا جاتا ہے

فضلائے گرامی کا جنھوں نے قلمی تعاون فرمایا اور رفقائے محترم کا جنھوں نے کچھ بھی ہاتھ بٹایا، تہ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

• جو مقالات اس اشاعت میں شامل نہیں ہوسکے۔ آئندہ پیش کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

سابق پروفیسر اور وائس چانسلر

سندھ یونیورسٹی

نصف صدی سے بھی زائد عرصے کی علمی خدمات جلیلہ پر
ڈاکٹر صاحب کو تہنیت پیش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ : نمایاں خدمات و اعزازات ایک نظر میں

نمایاں خدمات

- پروفیسر آف ایجوکیشن اور ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن
- وائس چانسلر ، سندھ یونیورسٹی
- ڈائریکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ اسلام آباد
- وائس چانسلر اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد
- ایڈوائزر نیشنل ہجرہ کونسل اسلام آباد

اعزازات

- صدارتی اعزاز کمال (برائے اساتذہ)
- تمغہ پاکستان
- ستارہ قائد اعظم
- صدارتی تمغہ حسن کارکردگی

فاضل گرامی ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو (بزبان سندھی)
تلخیص و ترجمہ: ڈاکٹر ہدایت اللہ اخوند

جواں بخت محقق
ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

[ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو، سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس سندھ یونیورسٹی نے یہ مضمون سندھی زبان میں لکھ کر رسالہ نئی زندگی حیدرآباد سندھ میں چھپوایا تھا۔ موصوف کے شکریے کے ساتھ اس کا اختصار اردو میں پیش کیا جاتا ہے، اور مترجم کا شکریہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔ نجم الاسلام]

نبی بخش خاں بلوچ کا آبائی گاؤں جعفر خاں لغاری تعلقہ جھڈو ضلع سانگھڑ (سندھ) ہے۔ جہاں ان کی ولادت ہوئی ان کے دادا کا نام عرض محمد خاں تھا جن کے دو فرزند تھے، علی محمد خاں اور ولی محمد خاں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے بھائی علی محمد خاں کے فرزند ارجمند ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش خاں کے آباء و اجداد ڈیرہ غازی خاں کے علاقے میں رہائش پذیر تھے ان کا تعلق لغاری قبیلے سے ہے، وہاں سے اندازاً تین سو برس پہلے ترک وطن کرکے صوبہ سندھ کے تعلقہ جھڈو میں آکر آباد ہوئے۔

علی محمد خاں ۲۵ برس کی جواں سال عمر میں ۱۹۱۷ء میں فوت ہوئے۔ اس وقت ان کے فرزند نبی بخش خاں چار چھ ماہ کے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا سنہ ولادت ۱۹۱۷ء ہے۔

کمسنی سے ہی نبی بخش خاں جتنا پڑھنے میں تیز تھے، اتنا ہی کھیلوں کے شوقین بھی تھے۔

۱۹۲۹ء میں سندھ کے مشہور مدرسہ نوشہرو فیروز میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل ہوئے اور بورڈنگ ہاؤس میں قیام پذیر ہوئے۔ بقول ڈاکٹر صاحب، وہاں انھوں نے اپنی زندگی کے بہترین اور یادگار دن گذارے، تعلیم و تربیت، علم و عمل کا سلیقہ یہاں سیکھا۔

بورڈنگ ہاؤس میں ۱۲۰ طلبہ قیام پذیر تھے، بہترین اساتذہ موجود تھے۔ جناب عثمان علی انصاری صاحب پرنسپل تھے، مخدوم امیر احمد علمی ادبی سرگرمیوں کے سربراہ تھے، مدرسے میں

مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔

نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں یہ مدرسہ ایک بہترین ادارہ تھا۔ مدرسے کے دوران کی بھرپور زندگی، تعلیم و تربیت اور کھیلوں کے اس دور میں نبی بخش خاں بلوچ ایک ہوشیار اور زیرک طالب علم رہے۔ اسکول کی پڑھائی لکھائی کا کام دن میں ہی کر لیا کرتے تھے، رات کو نہیں پڑھتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، گریجویشن کے لیے نبی بخش خاں نے بہاء الدین کالج جونا گڑھ میں داخلہ لیا، ان کی تعلیمی کارکردگی نہایت ہی شاندار رہی اور نتیجہ بھی شاندار رہا۔ انھوں نے ۱۹۴۱ میں بی اے فرسٹ کلاس میں پاس کیا اور بمبئی یونیورسٹی میں تیسرے نمبر پر آئے۔ مزید تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوئے، ایم اے میں بھی بڑی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ کسی بھی معاملے کی تہ تک پہنچنے اور کسی بھی متن کے صحیح معنی حاصل کرنے کی جستجو قائم رکھتے۔ اس سلسلے میں سہ ماہی "مہران" کے سوانح نمبر ۳ ۔ ۴ / ۱۹۵۷ء میں ابن درید کے قصیدہ "مقصورن ابن درید" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ قصیدہ چھٹیوں میں اپنے وطن آ کر مخدوم امیر احمد صاحب سے پڑھا اور اس کے معنی اور مطلب جاننے کی پوری کوشش کی۔ ایم اے علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ کیا۔ اس زمانے میں برصغیر میں سیاسی مدوجزر اور ہیجان انگیز حالات تھے ہمارے جواں سال نبی بخش بھی ایک علمی ہیجانی کیفیت سے گذر رہے تھے۔ علی گڑھ میں ڈاکٹریٹ کا "مقالہ سند تحت سیطرۃ العرب" لکھنے کی ابتداء کر چکے تھے۔ لیکن ملکی صورتحال نے مذکورہ کام مکمل کرنے نہ دیا اور سندھ واپس آ کر کراچی میں کچھ عرصے کے لیے درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ قدرت نے اعلیٰ تعلیم کے لیے انکی علمی تشنگی کو ایک اور موقع فراہم کیا، وہ یہ تھا کہ کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) میں ریسرچ کا موقع ان کو ملا۔ وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۶ء کو بمبئی سے روانہ ہوئے دوران سفر اپنی معروف کتاب "بیلاین جابول" کی تالیف شروع کی۔

کولمبیا یونیورسٹی میں رہائش کے دوران ڈاکٹر صاحب نے "تعلیم" کو اپنا موضوع منتخب کیا اور وہاں سے ایم ایڈ اور ڈی ایڈ (ڈاکٹر آف ایجوکیشن) کی ڈگریاں حاصل کیں ڈاکٹریٹ کے دور میں انھیں تعلیم اور تحقیق کے بہترین مواقع ملے۔ کولمبیا میں طلبا کی تعلیم و تربیت اور فلاح کے لیے بہترین اساتذہ موجود تھے۔ جن پروفیسروں کی رہبری اور رہنمائی میں خاص نصابی

کام اور مقالہ تحقیق مکمل کیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ڈاکٹر کلیرنس لٹن جو کہ غیر ملکی طلبہ کے لیے خصوصی طور پر مقرر کیے گئے تھے انکی رہنمائی اور شفقت کی بڑے پیار سے اب تک ڈاکٹر صاحب یاد فرماتے ہیں۔ بین الاقوامی ثقافتی کورسز کرانے والے ڈاکٹر میوکسبری بھی ان کے ایک بہترین استاد تھے۔ ایک اور مہربان استاد ڈاکٹر تھامپسن تھے جو کری کیولم کورسز پر لیکچر دیا کرتے تھے اور تیاری کراتے تھے۔ اسی طرح ایک اور بہترین استاد ڈاکٹر کاونٹس تھے ڈاکٹر صاحب نے جو تحقیقی مقالہ تحریر فرمایا اس کا موضوع یہ تھا۔

A Programme of Teacher Education for New State of Pakistan

تحقیقی مقالے کی تیاری اور رہنمائی کے عمومی مشیر ڈاکٹر اے ایس ایوینٹون اور خاص مشیر ڈاکٹر کارڈ ڈبلیو بگلو تھے۔

ڈی ایڈ کی ڈگری ملنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو اقوام متحدہ میں ملازمت کی پیشکش ہوئی لیکن آپ طلبا کی خدمت کے جذبے سے سرشار واپس آگئے۔ ان سے جس ملازمت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ جب ملے تب تک ڈاکٹر صاحب نے خاکی رنگ کے دو جوڑے بنوا کر سارے سندھ کا کونا کونا چھان مارا۔ اس طرح وہ مئی ۱۹۴۹ء سے اگست ۱۹۵۰ء تک گاؤں گاؤں علمی کچہریاں کرتے رہے اور تاریخی مقامات کا مشاہدہ کرتے رہے

۱۹۴۹ء میں وطن واپس آنے کے بعد سے آپ کو ملازمتوں کی کئی پیش کشیں ہوئیں۔ شروع میں کچھ عرصے کے لیے حکومت پاکستان کے محکمۂ اطلاعات و نشریات میں ایک اسامی پر کام کیا۔ وہاں سے مرکزی پبلک سروس کمیشن میں کلاس ون میں منتخب ہوئے بعد میں فارین سروس میں مشرق وسطیٰ میں تعلقات عامہ کے شعبے میں پاکستان کے سفارت خانے میں مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کا قلبی میلان تعلیم و تدریس اور تحقیق کی طرف تھا اس وجہ سے بھی اور علامہ آئی آئی قاضی وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی کے اصرار پر وہ ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی میں تعلیم کے پروفیسر بنے۔ شعبہ سندھی کے پہلے استاد اور سربراہ بھی آپ ہی ہیں سندھی زبان و ادب کے شعبے میں تحقیق کی بنیاد بھی انھی کی کوشش کی مرہون منت ہے۔ یہاں کی ایم اے فائنل سندھی کے لیے مکمل مقالاتِ تحقیق (اصل یا ترجمہ) کا سلسلہ چل نکلا اور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۱ء تک کل ۵۰ تھیسس لکھے گئے جن میں ۳۵ مشہور انگریزی کتابوں کا ترجمہ، فٹ نوٹ اور حاشیے کے ساتھ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۸ء تک شعبۂ سندھی کے بھی سربراہ رہے ہیں۔ ان کے بعد کئی فضلاء نے اس شعبے کی رہنمائی فرمائی لیکن اس شعبے کی موجودہ علمی حیثیت کی بنیاد ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ معیار کی مرہون منت ہے۔

جامعۂ سندھ میں شعبۂ تعلیم جو ابتداً میں ایک ڈپارٹمنٹ تھا، پھر انسٹی ٹیوٹ بنا، اس میں ڈاکٹر صاحب پروفیسر تھے، پھر ڈائریکٹر بنے۔ یہ عرصہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۳ء تک کا ہے درمیانی عرصے میں دسمبر ۱۹۷۳ء سے جنوری ۱۹۷۶ء تک جامعۂ سندھ کے وائس چانسلر کے عہدے پر فرائض سرانجام دیے۔ ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر صاحب کو نیشنل میرٹ پروفیسر کا اعزاز عطا کیا گیا۔

۱۹۷۳ء سے ڈاکٹر صاحب کا اسلام آباد میں قیام رہا۔ وہاں علمی خدمات کا دوسرا دور شروع ہوا وہاں بھی نہایت تندہی سے کام کیا جتنا کہ جواں سالی میں سندھ میں کیا تھا۔ اس وقت یعنی ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹر صاحب کی عمر عزیز ساٹھ کے قریب تھی۔ اسلام آباد کے قیام کے دوران ان کی علمی خدمات کا تفصیلی ذکر بعد میں پیش خدمت ہوگا۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کام کرنے کی قوت ہمیشہ اعلیٰ درجے پر رہی۔

ڈاکٹر صاحب کو اسلام آباد میں وفاقی وزارت تعلیم میں افسر بکار خاص مقرر کیا گیا یہاں پر جنوری ۱۹۷۳ء سے اگست ۱۹۷۷ء تک خدمات سرانجام دیں۔ ستمبر ۱۹۷۷ء سے مارچ ۱۹۸۹ء تک وزارت ثقافت، کھیل اور سیاحت میں رہے پھر اپریل ۱۹۷۸ء سے جنوری ۱۹۸۹ء تک وفاقی بورڈ آف ریفیو کے ممبر رہے۔

یکم جولائی سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۹ء تک چیئرمین قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ و ثقافت کے فرائض سرانجام دیے۔ ڈاکٹر صاحب ۲۴ نومبر ۱۹۸۰ء کو (بین الاقوامی) اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے بانی وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر ۱۹۸۲ء تک فائز رہے۔

ڈاکٹر صاحب تاریخ و ثقافت کی تحقیق کے قومی کمیشن کے چیئرمین بھی اس درمیان رہے۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء سے ۱۸۸۲ء تک کمیشن کی نئی تشکیل کے بعد ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس ادارے کا نام نیشنل انسٹیٹوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ سے تبدیل کرکے انسٹیٹوٹ آف ہسٹری، کلچر اینڈ سولائیزیشن رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۰ء تک نیشنل ہجرہ کاؤنسل اسلام آباد کے مشیر تھے۔ اس سلسلے میں ان کے علمی کارناموں کا ایک علیحدہ باب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان کے علمی کارناموں کی وجہ سے کچھ قومی اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے جن میں تمغہ پاکستان اور ستارہ

قائد اعظم کے اعزازات شامل ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی بھی ملا۔ ڈاکٹر صاحب کا علمی مرتبہ اور کام ان تمغوں سے بہت اوپر اور اعلیٰ ہے جس کا احساس فقط قدر دان اور بیدار دل والوں کو ہی ہو سکتا ہے۔

تحقیق اور لکھنے پڑھنے کا دور ڈاکٹر صاحب نے ایک مہم جو شخص کی طرح گذارا ہے۔ جو بھی مقالہ، کتاب یا کوئی منصوبہ شروع کیا تو صبح سویرے آنکھ کھلتے ہی اس کی فکر میں تن دہی کے ساتھ مشغول ہو جاتے اور اس دن کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو دوپہر تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ دوپہر کو کھانے اور آرام کرنے کے بعد بھی تین گھنٹے کام کرتے اور جامعہ سندھ میں قائم لغت آفس اور لوک ادب کی کتابوں پر تین گھنٹے کام کرنا تو ان کا معمول رہا ہے۔ اس کے علاوہ رات کو ۱۲ بجے یا ایک بجے تک لکھنا پڑھنا اور تحقیق کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح علمی دنیا کے اس محنت کش اور ثقافت کے سربراہ نے کام کیا اور کبھی تھکنے کا نام نہ لیا۔ ڈاکٹر عبدالکریم سندیلو نے ایک سے زیادہ مرتبہ ڈاکٹر بلوچ صاحب کو "جواں بخت" اور "جواں سال" کے الفاظ سے نوازا ہے جو سو فی صد درست ہے۔

۱۹۸۵ء میں وہ سعودی عرب، کویت، شام، تیونس، الجزائر اور مراکش سے ہوتے ہوئے لندن پہنچے مگر سخت محنت اور سفر کی صعوبتوں کے باعث طبعیت خراب ہوئی اور ۱۰ مئی ۱۹۸۵ء کو ان کے دل کا آپریشن ہوا۔ الحمد للہ وہ مکمل صحتیاب ہو کر اپنے پروگرام کے تحت آ کر اپنے کار منصبی میں مصروف ہوگئے۔

اسلام آباد سے واپس حیدرآباد سندھ آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب حیدرآباد میں حکومت سندھ کے قائم کردہ مقتدرۂ زبان سندھی کے پہلے چیئرمین بھی رہے ہیں۔ علامہ آئی آئی قاضی پرفیسوریل چیئر پر ایک عرصۂ دراز سے فائز ہیں اور اس حوالے سے بھی علمی مشاغل جاری ہیں۔

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ :

مسلم بنگال کے فارسی ادب کی ایک اہم تصنیف کتاب "شرفنامہ احمد مُنیری"

غیر منقسم ہندوستان میں ہماری قومی، ثقافتی و علمی تاریخ کے ابواب جستہ جستہ لکھے گئے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ایک قومی منصوبہ بندی کے تحت یہ نہایت ضروری بلکہ لازمی ہوگیا ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان میں مسلمانوں کی آمد کے زمانے سے لے کر اس وقت تک علمی، فنی اور ادبی حیثیت سے عربی، فارسی، اردو اور مقامی زبانوں میں جو کچھ کام مختلف صوبوں میں ہوا ہے اس کا جائزہ لیا جائے۔ اس سلسلے میں فارسی ادبیات سے ایک مدت تک ہماری قوم کی دلچسپی رہی ہے۔ پاکستان کے مختلف صوبوں : سندھ، پنجاب، بنگال، سرحد، بلوچستان وغیرہ میں فارسی ادب کے سینکڑوں نوادر قلمی اور مطبوعہ صورت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان سب کو جمع کر کے ان سے ان صوبوں کی ایک علمی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بنگال کے فارسی ادب کے ایک شعبے پر اس مضمون میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

بنگال میں اسلامی اثرات کی ابتداء چھٹی صدی ہجری میں ہوتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلی چیز جو اس سلسلے میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ سنسکرت کتاب " امرت کنڈ " کا فارسی ترجمہ ہے جو غالباً بنگال و آسام میں فارسی کی سب سے پہلی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ " کامروپ " (۱) کا ایک برہمن جوگی شہر گور میں جو اس وقت مسلمان فرمانروا علی مردان کا پایۂ تخت تھا، وہاں کی جامع مسجد میں آیا اور اس نے مذہب اسلام کے متعلق چند سوالات کیے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ شہر کے قاضی رکن الدّین سمرقندی سے رجوع کرے۔ چنانچہ وہ جوگی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام سے متعلق چند سوالات پیش کیے جن کے جوابات قاضی صاحب نے تشفی بخش دیے اور بالآخر وہ جوگی مُشرّف بہ اسلام ہوا۔ اسلام لانے کے بعد اس

نے " فلسفۂ یوگ " پر اپنی سنسکرت کتاب " امرت کنڈ " قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کی جس کا اس وقت فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد فارسی سے اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ (۲) جس کا نام " مرآۃ المعانی فی ادراک العالم الانسانی " صاحب کشف الظنون نے بھی درج کیا ہے۔ فارسی میں اس کتاب کا نام " حوض الحیاۃ " ہے اور اس کا ذکر شیر خاں لودی نے " تذکرہ مرآۃ الخیال " میں کیا ہے اور کچھ اقتباس بھی دے دیا ہے (۳)۔

اس ابتدائی کتاب کے علاوہ بنگال کے دیگر مسلمان علما، مصنفین اور ان کی تصانیف کے حوالے تاریخ و تذکرہ کی متعدد کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً منتخب التواریخ (۴) میں مولانا عثمان بنگالی اور طبقات اکبری (۵) میں شیخ فرید بنگالی کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اگر بنگال کے ابتدائی زمانے کے ان بزرگوں کے حالات جمع کیے جائیں تو اسلامیان ہند کی تاریخ میں عموماً اور پاکستان کے ابتدائی ادبی تمدن میں ایک بیش بہا اضافہ ہوگا۔ کتاب " شرفنامہ احمد منیری " اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، کیوں کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لغت کی یہ اہم کتاب غالباً بنگال ہی میں لکھی گئی۔

کتاب " شرفنامہ احمد منیری "

اس مضمون کی بنیاد کتاب " شرفنامہ احمد منیری " کا وہ قلمی نسخہ ہے جو مولانا عبدالحق صاحب، صدر انجمن ترقی اردو کے ذاتی کتب خانے کی زیب و زینت ہے (۶) البتہ یہ نسخہ آخر میں ناقص ہے۔ کاتب بھی کچھ سمجھدار نہیں تھا لہذا کتابت میں متعدد غلطیاں رہ گئی ہیں، اور اسی وجہ سے بعض عبارتوں کو سمجھنے میں بالآخر ناکامی ہوئی ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں، مثلاً برٹش میوزیم (۷)، بوڈلین لائبریری، انڈیا آفس لائبریری، ببلیوتھیک برلن، کتب خانۂ میونچ، کتب خانۂ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، بوہار لائبریری، کتب خانۂ کلکتہ مدرسہ وغیرہ میں پائے جاتے ہیں (۸)۔

کتاب کا آغاز (نظم میں) حمد خدا، نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم، مدح شیخ شرف الدین احمد منیریؒ اور (نثر میں) ایک مختصر مقدمے سے اس طرح ہوتا ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بنام خداوند ہستی بہ است سر آغاز ہر نامہ را کہ ہست

خداوند انس و خداوند جان — خداوند جسم و خداوند (جان)

سپاس و ستایش فزون از قیاس — مر اورا کہ عقل آفرید (وکیاس)

کہ آرد برونش درون بحار — صدف را (نساده در آبدار)

ز گوہر بیاراست دکان کاں — ببازار کون آمر (کن فکاں)

عرش را بجوہر کند پایدار — بجرح (۹) فلک نیز بخشد (قرار)

پدید آورد بوالبشر را ز طین — ہمہ دیگران (را ز ماء معین)

دہان بتاں گوہر آگیں کند — دل بیدلاں نیز (غمگیں کند)

بجزع (۱۰) بتاں دل ربائی دہد — گدا را ہمو بادشاہی دہد

جبین را دہد رزق از راہ ناف — کسی را سخن (نے دریں بے گزاف)

بگل ناز بخشد بہ بلبل نیاز — ز روی حقیقت . . . . . .

خور آرد ز خاور سہیل از یمن — گل آرد ز گلبن . . . .

ہلال و قمر می شود نام مہ — دگر بدر و از . . . .

با نجم بر آزاید افلاک را — ہماں رجم شیطان ناپاک را

خداوندی او را مسلم بود — کہ از آب و خاکش . . . .

بہ شش روز در ہر چہ ہست آفرید — چہار و شش و ہفت آمد پدید

بسبزش چہا حلہ پوشد بباغ — شود خور بکاں گوہر شب چراغ

. . . . تقدس الہ ہمہ — نماید بہر سوی راہ ہمہ

یکی را کند نیک بخت ازل — بعون خود از قادر لم یزل

یکی را بہ میخانہ سازد مقام — یکی را بہ مسجد ہمہ شب قیام

یکی را بخود آشنای دہاد — چو بیگانہ بیند جدائی دہاد

یکی را کند بندۂ دلبرے — یکی را دہد شاہی کشورے

یکی را پریشان و بدبخت کرد | تبہ حال و آوارہ و روے زرد
یکی را دہد چشم بیناے خویش | یکی را کند کور و ہم گوش ریش
یکی را کہ در حضرتش بار نیست | یکی در دو عالم چو نو (؟) خوار نیست
یکی را کہ در سر ہواے سریست | گرش سر برین خط بود برتریست
یکی را کہ با او رگ گردنست | چو دلویش ہماں را سقر مسکنست
بچون و چرایش کسی دم کشاد | کہ بابار (۱۱) در دست ابلیس داد
بچون و چرایش کجا دم زند | کہ دم را ز حوا و آدم زند
اگر عالمی غرق بحر گناہ | ز عفوش ہماں قطرۂ عذر خواہ
براہیم گر غرق عصیاں بود | غمی نیست نامش چو رحماں بود

فی نعت النبی علیہ ما یستحقہ من افضل الصلواۃ و اکمل التحیات

حبیب خدا و شہ اصفیا | صفی جہان و جہان صفا
محمدؐ کہ لشکر کش انبیاست | کمین بندۂ او جہاں بادشاست
ہمش نام محمود و احمد نہاد | خدایش دگر ہر چہ میخواست داد
دو عالم طفیلیش خدا آفرید | ہر دو جہاں بوی زلفش رسید
شد از کمہ طالع خور دولتش | محیط محیط فلک رفعتش
خط استوایش چو یثرب شدہ | ہماں یثربش نیز مغرب شدہ
ز لولاک بر سر کلاہ شرف | ز دریاے فضلش نۂ افلاک کف
چو ذاتش نہ مقصود بودی نخست | کجا نظم افلاک گشتی درست
وجود ہمہ چیز ہر وی است | اگر ارتفاع ضمی و زی است
ہمہ انبیا خوشہ چین وی اند | بجلد برین اہل دین وی اند

طرف دار کونین و شاہ کرم　　که ہستش ملایک ز . . . .

ز امیدواران که رفتی برش　　بدادی ز بر جامہ و ہم زرش

درآں شب که معراج آں شاہ بود　　نہ شب بود بل روز با جاہ بود

ہمہ سروران و سپاہ ملک　　ز روی زمین تا باوج فلک

ہمہ سر بسر در رکابش بدند　　زہی شرف تا خاک رویش شدند

ہمہ انبیاء بہر کسب شرف　　سراپای او بوسہ دادند و کف

بگردند عرضش ہمہ کائنات　　نیامد بچشمش علیہ الصلوٰۃ

بگفتا بدون تو ہیچ است و ہیچ　　غلط گفتہ ام جملہ ہیچ است و ہیچ

نخواہم گذشت تو چیزی دگر　　توئی بہتر و خوشترم در نظر

درآں بزم محرم نبود ہیچ کس　　ہمو بود اللہ واللہ و بس

تمنائے موسیٰ بعین عیاں　　نمودش خداوند کون و مکاں

ز امت که بودش ز جمع عصاۃ　　بہ بخشید حقش علیہ الصلوٰۃ

خدائیش بگفتہ سرار . لبے　　که کم گفت آرا بر ہر کسے

دگر آنچہ در خورد گفتار بود　　بگفتا بیاراں که بادش درود

براہیم خواندہ ہر صبح و شام　　نوائے صلواتش علیہ السلام

برآں چار یارش فراواں سلام　　که بودند بعدش چو قائم مقام

یکی محض صدق و دگر عین عدل　　یکی صرف شرم و دگر کان بذل

ہر آنکس که با دو دانش بدست　　نیایدش جز نعت حق . . . بدست

درود خدا باد بر خاندانش　　سلام ملک باد بر پیروانش

ہر آنکس که او خصم سادات ہست　　نصیبش ہمہ جای عابات ہست

کرا مہر سادات افزوں بود　　زعابات در حفظ بیچوں بود

در مدح حضرت قطب الاقطاب العالم مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری

مغیث جہاں سرور منیر است — کہ خاک در روضہ اش عنبر است
گل روضہ اش ہر کہ بوسیدہ است — نگیرد گل باغ جنت بدست
کسی کو مجاور درآں روضہ است — بعین یقیں عرش را دیدہ است
کسی را کہ باشد درآں روضہ بار — بود روضۂ خلد پیشش چو خار
کنوں روضہ اش کعبۂ ثانی است — کہ باراں برو فیض رحمانی است
نسیمش کند روح را تازہ روح — دہد روح او روح را صد فتوح
ز خاک درش توتیا می سزد — غلط گفتہ ام بل چہا می سزد
ہمہ کاروانہا رواں میرسند — پئے خاک بوسش بجاں میرسند
کفیل نجات است خاک درش — خوشا آنکسی کش بود بر سرش
برآں شوشۂ (۱۲) تربتش آفریں — کزو نور تابد بچرخ بریں
سمّی نبی احمد منیری — کہ دارد بدو دین حق برتری
نبی را خلیفہ خدا را خلیل — نجوید دریں ہیچ بخرد دلیل
نبی را حبیب است و دیں را شرف — ازاں کرد بالش لقب چہ شرف
چنو مرشد کامل الحق نبود — کہ راہ خدا را بہر کس نمود
مریدانش افزوں ز حدّ عدد — ہمہ را ز فیض الٰہی مدد
چناں برگزیدش خدای کریم — کہ آمد عدیلش بعالم عدیم
مسیحش اگر خوانم الحق سزد — کند مُردہ ہا زندہ یکدم کہ زد
ہمہ ہرچہ گویم ورا می رسد — و گر راست پرسی چہا می رسد
ہر آنکس کہ در عصر او بودہ است — پس آنگہ جبیں بر درش سودہ است
ز ابدال و اوتاد اورا شمر — کسی را دریں نیست حقا نظر
زلطف و ز رحمت خدایش نرشت — ہزار آفریں بر چنیں سر نبشت

کسی را کہ باشد توسل بدو   تجرید یکی در توکل ازو
ز حق پارسی گر نبی آمدی   مکاتیبش الحق ہمی آمدی
مکاتیب او کان ایمان شمر   بود منکر او ز کافر بتر
تصانیف اورا ہمہ عرشیاں   بگیرند ازو ہمی حرز جاں
ہر آنکس کہ دارد تولا بدو   رنجد گہی حق تعالیٰ ازو
نبود و نخیزد چنو یکد گر   برون پیمبر جمیع بشر
سلام و صلواۃ خدا و ملک   رسد برسر تربتش از فلک
خدایا بحق جمال بشر   براہیم را از سگانش شمر
مکن دور او را ز جمع سگانش   مگر استخوانی بباید (۱۳) ز خوانش
ندارد روا قطب عالم مگر   کہ گردد سگ حضرتش در بدر

مُقدّمہ

"چوں بفضل اللہ تقدس و تعالیٰ و حسن تیسیر کمترین تلامذۂ اساتذۂ خداوندان معانی و فضایل، ابراہیم قوام فاروقی را کہ برکت ارغام اقدام زوار روضۂ متبرکۂ بندگی حضرت مخدوم جہاں قدس سرہ عاقبت و خاتمش بخیریت و ارتضاء حق مقرون و مشفوع باد، بالنبی و عترتہ الامجاد۔ از ملازمت خدمت عتبۂ علیاء حضرت عالیۂ استاذاں تغمدہم اللّٰہ بغفرانہ، در علم شعر و غزل و تتبع رموز معنی لغات و تفحص غموض نثر و مثنویات حظی اجزل و نصیبی اکمل بحصول موصول گشتہ این گلدستۂ بستان شرف یعنی۔ نظم

سراپا کہ مملو ز دری ست   شرفنامۂ احمد منیری ست

نفعاً للاخوان و عراضۃً للخلان در حیز جمع و تالیف آوردہ و در تصحیح اعراب بوسع امکان استقصا نمودہ، و لغات مترادف در تحت ہر لغتی بر سبیل تکرار ملیح در ضمن ابواب و فصول محل و ذکر کردہ۔ و ابداع و اختراع ایں صنعت جدید موجب تیسیر حفظ و شامل بسیار فواید

است نہ مستوجب انقباض طبع و سآمت خاطر عاطر خداوندان بصیرت ۔ چہ ہنگام تتبع یک لغت مستفیدان فنون یعنی ز فضل (؟) را مستجلب زیادت فوائد مستکمل مزید معانی خواہد بود ۔ و بعضی محل معنی بیت مستشہد کہ شعر بیت ام القصائد شاعران ماہرست از نتیجۂ طبع سقیم و وہم سخیف مرقم و مبین فرمودہ ۔ و در تحت ابواب پیش از و صول فصول اشعار خویش آوردہ و در اثنای اصول برخی از ابیات و بعضی از غزلیات بنشائت خود درج کردہ ۔ باعث و موجب آن غرض عرض ہنرست نہ تائید و استشہاد ۔ و اختصار تنبیہ مصطلحات شعرا بلفظ تعین معین گردانیدہ مقترح ۔ و درخواست از وفور عواطف وفر عوارف خداوندان معنی و استاذان سخن ، طابت شمائلہم ، آنکہ چون این مجموعۂ لغات را بنظر عاطفت و مرحمت مرموق و ملحوظ فرمایند مقابح و قبایح و سہو و غلط آنرا بخامۂ لطف و کرم اصلاح و تزیین دہند ۔ ثواب جمیل و ثمرات جزیل آن را در اثنائے حواشی نامۂ اعمال خویش مدخر گردانند ۔ نحمدہ و نصلی و نشہد ان لاالٰہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ "۔

مقدمے سے واضح ہوتا ہے کہ مصنّف " حضرت قطب الاقطاب العالم مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری " (۱۴) کے معتقد تھے لہذا اس کتاب کو ان کے نام نامی سے ہی منسوب کیا :

" سراپا کہ مملو ز در دری ست شرف نامۂ احمد منیری ، است "

اس مصرع سے کتاب کا پورا صحیح نام " شرفنامۂ احمد منیری " معلوم ہوتا ہے (۱۵) حالاں کہ کتاب کے متن میں دو جگہوں پر مصنّف نے خود " کتاب شرفنامہ " (زیر لفظ دوستگانی) اور " کتاب شرفنامۂ منیری " (زیر لفظ بیردج) بھی لکھا ہے۔ دوسرے مصنفین و مؤلفین نے اس کتاب کا نام کئی مختلف طریقوں پر " شرفنامہ " (۱۶) " شرفنامۂ منیری " (۱۷) (اور مصنف کی نسبت سے) " شرفنامۂ ابراہیمی " (۱۸) ، " فرہنگ شیخ ابراہیم بن قوام فاروقی " (۱۹) ، " فرہنگ ابراہیمی " (۲۰) ، فرہنگ شیخ ابراہیم بن قوام " (۲۱) ، " فرہنگ ابراہیمی " (۲۲) و " فرہنگ فاروقی " (۲۳) لکھا ہے۔

سنہ تصنیف

اندرونی شواہد کی بناء پر یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مصنف نے یہ کتاب سلطان باربک شاہ ، والی بنگالہ کے عہد (۸۶۲ھ تا ۸۷۹ھ / ۱۴۵۷ء تا ۱۴۷۴ء) میں لکھی ، حالاں کہ قطعی

طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مصنف نے یہ کتاب کس سنہ میں لکھنی شروع کی یا لکھ کر ختم کی۔ البتہ ریو (Rieu) نے اس کا سنہ تصنیف ۸۶۰ھ بتایا ہے (۲۴) اور بقول فاضل محمود شیرانی "سنہ ۸۶۲ھ میں ابراہیم فاروقی نے شرفنامۂ احمد منیر لکھا" (۲۵)۔

مصنّف

افسوس کہ فاضل مصنّف کے حالات کہیں سے بھی دستیاب نہ ہوسکے۔ اندرونی شہادت سے صرف اتنا یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نام ابراہیم، والد کا نام قوام تھا اور نسباً فاروقی تھے۔ ان کے دادا کے بھائی کا نام "مولانا بدر بن ابراہیم" تھا جو خود فن لغت کے عالم تھے اور اس فن میں ایک فرہنگ بنام "زفان گویا" لکھی جس سے ہمارے مصنف نے شرفنامہ لکھتے وقت استفادہ کیا۔ چناں چہ لفظ "ایازدہ" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"و دو معنی اخیر منقول است از فرہنگ زفان گویا کہ از مصنفات مولانا بدر ابراہیم برادر جد جامع شرف نامہ است" (۲۶)۔

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنّف کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا اور ان کے دادا کے بھائی مولانا بدر کو فن لغت میں خصوصی دسترس تھی۔ چناں چہ انھوں نے "فرہنگ زفان گویا" لکھی اور غالباً یہی کتاب ہمارے مصنف کے لیے بھی محرک بنی اور انھوں نے ایک جامع فرہنگ یعنی "شرف نامۂ احمد منیری" کو تصنیف کیا۔

مصنف کے وطن مالوف کے متعلق کوئی بھی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اندورنی شواہد کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ بہار، جون پور (؟) اور بنگالہ میں جدا جدا وقتوں میں رہے اور کتاب شرف نامہ انھوں نے بنگالہ میں ہی لکھی۔

○ بہار سے ان کی نسبت کا گمان زیادہ تر منیر (بہار) کے بزرگ شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ اور ان کے مرقد سے ان کی عقیدت مندی کی وجہ سے ہوتا ہے اور اسی بناء پر ڈاکٹر ریو سمجھتے ہیں کہ "مصنّف شہر بہار کے رہنے والے تھے" (۲۷)۔ ممکن ہے کہ ان کی ولادت بہار میں ہوئی ہو اور ابتدائی زندگی بھی وہاں گذری ہو اور ان سے تقریباً ایک سو برس پہلے کے بزرگ شیخ احمد منیری (وفات ۷۸۲ھ) سے عقیدت مندی موروثی اور آبائی ہو۔ چناں چہ ان بزرگ سے ان کی عقیدت ایک مقامی معتقد کی سی معلوم ہوتی ہے:

کنوں روضۂ اش کعبۂ ثانی است — کہ باراں بر او فیضِ رحمانی است "

مگر ساتھ ساتھ خود کو " زوّارِ روضۂ متبرک " (مقدمہ) بتاتے ہیں اور زوّار اکثر دُور دراز مقام کا باشندہ ہی ہوتا ہے ۔ ایک اندرونی شہادت سے البتہ یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف بہار میں رہے ہیں اور ان کو وہاں کا کافی تجربہ ہے۔ لفظ (بیروج) کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ہندی میں اس کو " گیاہ لکھمناں " کہتے ہیں جس کے متعلق مصنف نے خود اپنا ذاتی تجربہ " در ولایت بہار و کوہپایہا " بیان کیا ہے۔ یہی حکایت لفظ (استرنگ) کے ذیل میں بھی قلمبند کی ہے۔

○ لفظ (ہند) کے ذیل میں مصنّف نے اپنا ایک شعر نقل کیا ہے کہ :

از قدومت ہست حقا ، در ہمہ اقلیم ہند، — شہر جوناپور ما ، مانند لولو در عدن "

مصنّف کے وطن یا عارضی سکونت کے سلسلے میں یہ بیت نہایت اہم ہے ۔ اس بیت میں " جونا پور " کو وہ اپنا شہر بتاتے ہیں ، لیکن باقی تفصیلات مبہم ہونے کی وجہ سے یہ بیت اپنے لفظی معنی تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔ اول تو یہ معلوم نہیں کہ ممدوح کون ہیں۔ دوم کہ خود شہر " جونا پور " کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک فوری گمان شہر جون پور کا ہوتا ہے جس کی بنیاد سلطان فیروز تغلق نے ۷۷۲ھ (۱۳۷۰م) میں ڈالی اور جو ۷۹۶ھ سے ۸۸۱ھ (۱۳۹۴م - ۱۵۰۰م) تک سلاطین شرقیہ کا پایہ تخت رہا۔ اسی عرصے کے آخری دور میں بنگال کے سلطان باربک شاہ کے عہد (۸۶۲ - ۸۷۹ھ) میں ، مصنّف نے یہ کتاب لکھی ۔ کیوں کہ سلطان باربک شاہ خود ان کے ممدوح ہیں جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا ۔ اب یہ کچھ قرین قیاس نظر نہیں آتا کہ مصنّف کے خاص ممدوح سلطان بنگالہ ہوں اور وہ خود سلاطین شرقیہ کے پایہ تخت جونپور میں یہ کتاب لکھیں ، یا شہر جونپور کے گیت گائیں ۔ لہذا گمان غالب ہے کہ " جونا پور " سے مراد مشہور و معروف شہر جونپور نہیں بلکہ یہ کوئی اور قصبہ " جونا پور " یا " جھونا پور " ہے ، اور ذکر ممدوح کے لحاظ سے ممکن ہے کہ یہ قصبہ بنگالہ کے حدود میں کہیں واقع ہو ۔ مگر یہ مسئلہ ہنوز زیادہ تحقیق طلب ہے۔

○ غالباً فاضل محقق حافظ محمود شیرانی کا یہ قول صحیح ہے کہ " اس کتاب (شرفنامہ احمد منیری) کے مؤلف مولانا احمد فاروقی بنگالہ کے رہنے والے ہیں " (۲۸) اس قول کی تائید میں اندورنی شہادتیں موجود ہیں :

(الف) اول کہ بنگالہ کے سلطان باربک شاہ بن ناصر شاہ مصنّف کے ممدوح خاص تھے۔ "شرفنامہ" کے مکمل قلمی نسخوں کے آخر میں، خاتمے کے بعد، سلطان باربک شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ مرقوم ہے جس کا مطلع اور آخری بیت یہ ہیں:

مطلع :-

بوالمظفر باربک شہ شاہ عالم باد و ہست
در نگین او ہمیشہ ملکت جم باد و ہست

آخری شعر

دائما ورد زبان (ہم) فتح ہست و ہم ظفر
بوالمظفر باربک شہ شاہ عالم باد و ہست

ریو (۲۹)، مصنّف فرہنگ نظام (۳۰) وغیرہما نے سلطان باربک شاہ کے سلسلے میں فقط مصنّف کے اس آخری قصیدے کی طرف اشارہ کیا ہے، حالاں کہ کتاب کے متن میں "باب پ" کے شروع میں ایک پورا قصیدہ سلطان باربک شاہ کی تعریف میں موجود ہے۔ جس میں سلطان موصوف کو ان کی "کنیت" سے یاد کیا گیا ہے۔

ایا بہ ۔ ساٹلے فراوان اسپ	پیادگان را بخشیدہ صد ہزاران اسپ
ابوالمظفر والا جہان لطف کہ ہست	کمینہ بخشش عامت بگاہ احسان اسپ الخ (۳۱)

(ب) حرف الف کے شروع میں ایک قصیدہ حضرت جلال الدّین کی مدح میں ہے، اس قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح صاحب ولایت بھی تھے اور صاحب حکم بھی۔ چنانچہ اسی لحاظ سے ان کو حضرت سامی "جلال الدّین والدّنیا" کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ قصیدہ کے پہلے تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

"زہی در حوضہ جابت جنان (یک) گنبذ مینا	خطاب مستطاب بابت الحق جنۃ الماوا
گریزان دولت خصمت چو از کف آہوی باقل	گرفتہ رفتت سدہ چو دامق دامن عذرا
فراز عرش میگوند چوں من قدسیان ہردم	توی (ای) حضرت سامی جلال الدّین والدّنیا (۳۲)"

گمان غالب ہے کہ ممدوح وہی شاہ جلال ہیں جن کا ذکر مولانا عبدالحق دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں کیا ہے شاہ جلال اپنے وقت کے کامل ولی تھے اور گور و بنگالہ میں انھوں نے بادشاہوں کی طرح مسند نشین ہو کر ارشادات و احکام جاری کیے۔ لہذا بادشاہ گور نے انھیں

بالآخر شہید کروا دیا۔ "اخبار الاخیار" کی اصل عبارت یہ ہے :۔

"شاہ جلال گجراتی مرید شیخ پیارہ است از کاملان وقت بود۔ صاحب تصرف و کرامت و ظاہر و باطن مرتبہ عظیم و شانی رفیع داشت۔ گویند کہ وے باصل از ولایت گجرات است و در گور و بنگالہ بر تخت نشستی و حکم کردی ۔ چنانچہ بادشاہاں بنشیند و حکم کنند۔ بادشاہ گور اورا شہید کرد از جہت توہم ودغدغہ کہ بقول غرض گویاں بخاطر اوراہ یافت (۳۳) "

(ج) لفظ "دوستگانی" کے ذیل میں مصنف نے " میر زین الدین ہروی کہ ملک الشعرا است " سے اپنی ایک ندیمانہ مجلس کا ذکر کیا ہے۔ بتحقیق فاضل شیرانی مرحوم " امیر زین الدین ہروی ، المخاطب بہ "حسن خان" ... اس عہد میں ملک الشعرائے بنگالہ تھے (۳۴) "۔

ان اندرونی شہادتوں کی بناء پر کافی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے مصنف کا تعلق بنگالہ سے ہی تھا۔

شرفنامے کی ادبی اہمیت :۔

ادبی اعتبار سے " شرفنامہ " ایک نہایت قیمتی کتاب ہے ۔ اس کی ادبی اہمیت کے تین اہم اسباب ہیں جو فاضل مصنف کی علمی و ادبی صلاحیتوں مثلاً (الف) ان کی وسیع ادبی معلومات و ادبی ماحول (ب) ان کی فن لغت میں مہارت اور (ج) ان کی شاعرانہ قابلیت سے وابستہ ہیں۔

(الف) مصنف کا ادبی ماحول اور علمی معلومات :۔

اگرچہ مصنف کا خاص تعلق بنگالہ سے ہے لیکن ان کا علمی و ادبی ماحول وہی عام " ہندی ۔ اسلامی " ماحول ہے جو دوسرے علاقوں کے مسلم ادبا، و فضلاء کا ہوسکتا ہے ۔ وہ ایران کے جملہ سربرآوردہ شعرا سے بخوبی واقف ہیں اور ہندوستان کے مسلم شعرا اور مصنفین کے کلام و کتب سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔ تین موقعوں پر امیر خسرو کے اشعار نقل کیے ہیں

جن میں سے دو جگہوں پر اشعار قران السعدین سے لیے ہیں۔ قران السعدین سے مصنف کی دلچسپی کا ایک باعث یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی تصنیف کا تعلق بنگالہ سے ہے۔ چنانچہ امیر خسرو نے یہ کتاب سلطان ناصر الدّین بغرا خان والیِ بنگالہ اور ان کے فرزند سلطان معز الدّین کیقباد بادشاہ دہلی کی تاریخی ملاقات (۶۸۸ھ) کی یاد میں لکھی ۔ امیر خسرو کے علاوہ، مصنّف امیر حسن دہلوی کا نام بھی ایک جگہ لاتے ہیں اور ان کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ مشہور شاعر بدر چاچ (مصنّف " شاہ نامہ محمد بن تغلق ") کے متعدد اشعار بطور شواہد نقل کیے ہیں اور ان کو اکثر " بدر شاشی " لکھتے ہیں ۔ مصنفین میں سے مولانا حسن نظامی کی تاریخ " تاج المآثر " (تصنیف سنہ ۶۰۲ھ مطابق ۱۲۰۵.۶م) سے متعدد شواہد پیش کیے ہیں اور " طبقات ناصری " لسان الشّعرا (۳۵) وغیرہ ہندی مسلم علماء کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے (۳۶)۔

اندرونی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کا مقامی ادبی ماحول بھی بڑے پائے کا تھا۔ " شرفنامہ " میں مندرجہ ذیل ادباء و فضلاء کا ذکر آیا ہے جو سب مصنف کے مقامی معاصر تھے :۔

۱۔ شیخ واحدی :۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ واحدی ہمارے مصنف کے استاد تھے۔ چنانچہ ان کا نام نہایت احترام سے لیتے ہیں اور ان سے نقل کرتے وقت " از بندگی شیخ واحد " جیسے مؤدبانہ الفاظ لاتے ہیں " شرفنامہ " کی تصنیف کے دوران میں شیخ واحدی فوت ہوچکے تھے۔ لہذا مصنف نے بعض موقعوں پر ان کو " جعل الجنتہ مثواہ " (تحت لولی) " طاب ثراہ " (تحت لوری، کوتوال) اور قدّس اللہ سرّہ " (تحت برہمن) جیسے دعائیہ الفاظ سے یاد کیا ہے۔ ایک جگہ پر شیخ واحد کی ایک کتاب " حبل متین " کا حوالہ دیا ہے (تحت یزد)۔ اور کم از کم سات جگہوں پر شیخ، واحدی کے اشعار بطور شواہد نقل کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ واحدی نہ صرف لغت کے عالم تھے بلکہ شاعر بھی تھے۔ مصنف نے شیخ واحدی کے جو اشعار بطور سند پیش کیے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں :۔

پسر مرد تہی کیسہ مبادا زیبا   گرچہ از دولت او کیسہ کند پر بابا

(تحت بابا)

این زنک زشت را ترک کن اے واحدی   کیں زنک بے وفا کشتہ بسی شوہرک

عقد دو خواہر چہ ساں عقل تصور کند　　　طالب آں خواہری بگذر ازیں خواہرک

مالک زالک مبیں ، مارک او بیں کہ است　　　مالک عفریت را مارک او بر سرک

شنلک و شونک بود شاہد گر دلربا　　　قبلک عشو ، بر خوبک سیمیں برک

۲۔ امیر زین الدّین ہروی :۔ امیر زین الدین مصنف کے وقت میں " ملک الشعراء " بنگالہ تھے اور مصنف کا ان سے گہرا تعلق تھا۔ چنانچہ " شرفنامہ " میں (تحت دوستگانی) مصنف نے امیر زین الدین کی محفل اور ان سے اپنی ندیمانہ مجلس کا ذکر قلمبند کیا ہے۔

۳۔ امیر شہاب الدّین حکیم کرمانی :۔ امیر شہاب الدّین مصنّف کے معاصر اور بنگالہ کے بڑے حکیم تھے۔ چنانچہ مصنّف نے ان کو ایک جگہ پر " افتخار الحکما۔ شہاب الدّین کرمانی " کے لقب سے یاد کیا ہے (تحت آورد)۔ حکیم صاحب اور مصنف کے درمیان بالکل دوستانہ تعلقات تھے اور ملک الشعراء امیر زین الدّین کی مجلس میں ہمارے مصنف کے علاوہ حکیم صاحب " امیر شہاب الدّین " بھی موجود تھے (راجع تحت دوستگانی)۔ امیر شہاب الدّین لغت کے بھی بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ مصنّف نے " شرفنامہ " میں کم از کم بیالیس موقعوں پر الفاظ و معانی کی تحقیق کے سلسلے میں ان کی آراء کو بطور سند و تصدیق نقل کیا ہے۔ مصنف جب " شرفنامہ " لکھ رہے تھے اس وقت حکیم کرمانی زندہ تھے ، چنانچہ مصنّف نے ایک جگہ پر ان کو " عمرہ اللہ بعمر لقمان " کی دعا دی ہے (تحت ذو ۔ ذوا)۔

۴۔ منصور شیرازی :۔ منصور بھی ایک بلند پائے کے مقامی شاعر تھے اور کسی شیرازی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو بنگالہ میں آکر آباد ہوگیا تھا (۲۰)۔ منصور ہمارے مصنّف کے معاصر اور شاید مدِّ مقابل تھے۔ چنانچہ مصنّف نے " شرفنامہ " میں اپنے چار طویل قصیدے (تائیہ ، جیمیہ ، خائیہ) نقل کیے ہیں ، جو انہوں نے منصور کے جواب میں لکھے ہیں۔ ان قصیدوں میں سے تائیہ ، " محمد بن معین " کی مدح میں ہے اور متن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن معین شاید وزیر تھے ۔ اس اعتبار سے منصور اور ہمارے مصنّف دونوں وزیر محمد بن معیّن کے دربار سے

بھی وابستہ تھے۔ "شرفنامہ" میں مصنف نے کم از کم بیس اکیس موقعوں پر منصور کے اشعار بطور شواہد نقل کیے ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل اشعار دلچسپ ہیں:-

چو رست یاسمن صبح زین زمرّد شاخ — بخورد سنبل شب را غزال زرّین شاخ

درآمد از در من دلربای سنبل موی — شگفتہ برسمن عارضش چو گل بر شاخ

فتاد در سرش از بادہ شبینہ خمار — بنزم عیش صبوحی نہادہ برکف شاخ

زدہ بسنبل پرتاب شانہ و زغم او — چو شانہ سینہ صاحب دلاں شدہ صد شاخ

معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار منصور کے اسی خائیہ قصیدے کا "نسیب" ہیں جس کے معارضے میں مصنف نے اپنا خائیہ قصیدہ لکھا ہے کہ:-

زہے خود تو لبی خوبتر زگل بر شاخ — بیار بادہ گلرنگ پیش من برشاخ، الخ (۲۸)

ایک جگہ پر مصنّف نے قافیہ "گلناری" پر پہلے سلمان ساوجی کے اشعار نقل کیے ہیں بعد میں منصور کے اور پھر اسی قافیے میں اپنے اشعار قلم بند کیے ہیں جس سے شاید منصور کا معارضہ ملحوظ ہے۔ منصور اور مصنّف کے اشعار دلچسپی کے لیے یہاں درج کیے جاتے ہیں:-

منصور گوید

چو چشم ابر شد آبی و روی گلناری — در آبگوں قدح افگن شراب گلناری

بدور گل مئ گلگوں بیاور اے ساقی — کہ حیف باشد اگر می بدور گلناری

بسوخت لالہ صفت صد ہزار دل آں دم — کہ کرد ساقی ما چہرہ را چو گلناری

مصنّف شرفنامہ گوید

کسی کہ دارد بر کف شراب گلناری — چرا نسازد رنگ رخاں چو گلناری

شدست حوں رخ گلناری اے بت گلرخ — دریغ باشد اگر بادہ چو گلناری

خوشا کسی (کہ) چو تو گلرخے بود ساقیش — نہادہ جام بکف پر شراب گلناری

الغرض منصور شیرازی ایک نامور شاعر اور ہمارے مصنّف کے معاصر تھے اور اس وقت مسلم بنگالہ کے زمرہ ادباء و شعراء میں داخل تھے۔

۵۔ فیروز خاں :۔ یہ صاحب ہمارے مصنّف کے ممدوح ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ مقامی امراء میں سے تھے۔ "شرفنامہ" میں یہ دو اشعار موجود ہیں جو غالباً فیروز خاں کی تعریف میں مصنف کے لکھے ہوئے کسی قصیدے میں سے ہیں :۔

"چیست آں اکسیر اعظم کافتاب از وے کند　　لعل پیکانی و زر خانی اندر سنگ و کاں

غالباً درگاہ سجدہ می برد بر صبحگاہ　　گردی از عالی جناب حضرت فیروز خاں"

۶۔ ملک محمد بن یوسف :۔ یہ صاحب بھی شاید مقامی روساء یا امراء میں سے تھے اور ہمارے مصنّف کے ممدوح ۔ "شرفنامہ" میں لفظ "جہاں" کے ذیل میں مصنّف کے یہ دو بیت ملک محمد بن یوسف کی مدح میں پائے جاتے ہیں :۔

" ملک محمد بن یوسف (تو) ای جہان کرم　　ہر آنکہ ہست چو من شکر نعمت گوید

شرابدار شما با صراحی و بادہ　　چہ خوب باشد اگر سوے خانہ ام پوید "

۷۔ ملک یوسف بن حمید :۔ ممکن ہے کہ ملک یوسف مصنّف کے ممدوح ملک محمد نمبر ۶ کے والد ہوں۔ ملک یوسف مقامی شعراء میں سے تھے اور مصنّف نے دو موقعوں پر ان کے اشعار بطور شواہد نقل کیے ہیں

"ملک یوسف بن حمید فرماید" :۔　　(تحت رنجور)

دیر شد دیر کہ از خاک در تو دوری است　　دوری از خاک درت باعث رنجوری است

یار عیسی نفس و رنج تنم را لازم　　جام مے برکف و ما را الم مخموری است

• تحت "مہی"

"گفتہ بودم کہ من از شاہد و مے توبہ کنم　　للہ الحمد تواں گفت پشیماں شدہ ام "

۸۔ قاضی معین الدّین :۔ قاضی معین الدّین بھی مقامی فضلاء میں سے تھے اور ہمارے

مصنف کے ممدوح۔ "شرفنامہ" میں (تحت رس) مصنف نے اپنے یہ اشعار ان کی مدح میں نقل کیے ہیں۔ (رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ "شرفنامہ" کی تصنیف کے وقت قاضی صاحب فوت ہو چکے تھے)۔

فی مدح حضرت قاضی معین الدین رحمۃ اللہ علیہ:

اے مغیث خلق و عالم و اے معین الدین حق — جز تو نے در ماندہ را یاری دہ و فریاد رس

دارم امیدی کہ سازم خاکپایت توتیا — نیست مارا غیر ازیں در عمر خود چیزی ہوس

تا شوم شیریں سخن انداز ایں کان شکر — از قبولت شکری اندر دہان ایں مگس

عاجز و درماندہ ام از شر نفس و بخت بد — از کمال عاطفت درماندہ را فریاد رس

التماس بندہ را گرداں روا نیز از کرم — چوں برآید ہر کسی را ز جنابت ملتمس

مذکور شعراء، فضلاء اور ادباء کے علاوہ مصنّف نے سید جلال، سیّد محمد رکن اور سیّد حسین کے بعض اشعار بھی نقل کیے ہیں اور گمان غالب ہے کہ یہ حضرات بھی مسلم بنگالہ کے مقامی شعراء میں سے تھے۔ دل چسپی کے لیے ان کے اشعار بھی یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

۹۔ **سیّد جلال**:۔ (زیر لفظ دستگیر)۔

سر پائمال گشتہ و دل دستگیر و جاں — موقوف نوک ناوک آں چشم مست تست

ولہ (زیر لفظ "سرخاب")

تا بریزاند بت غم را دلی سرخاب نوش — بر سر سرخاب رو تا بنگری تبریز را

۱۰۔ **سیّد محمد رکن**:۔ (زیر لفظ "سنگ انداز")۔

صاحبا مرغ طرب در صدد پرواز است — زانکہ شعبان ہمہ دانند کہ سنگ انداز است

• زیر لفظ "کندلان"

کندلان عزت در عرصہ گیتی زدند — سایبان دولتت بر چرخ ازرق فام باد

۱۱۔ سید حسین :۔ (زیر لفظ "طوبی")۔

ہمیشہ گلبن آں باغ طوبی شگفتہ باد دربستان خوبی

ان جملہ فضلاء و ادباء کے مکمل حالات ابھی تک تحقیق طلب ہیں۔
ان سے مزید علمی تحقیق مسلم بنگالہ کے فارسی ادب کی تاریخ کے لیے نہایت قیمتی ثابت ہوگی۔

(ب) مصنّف کی فنِّ لغت میں مہارت :۔

"شرفنامہ" مصنّف کی علم لغت میں مہارت کا بین ثبوت ہے۔ لغت کا ذوق مصنّف کو گویا خاندانی ورثے میں ملا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے، مصنّف کے دادا کے بھائی مولانا بدرالدّین ابراہیم نے کتاب "زفان گویا و جہان پویا" لکھی جو بقول مصنّف - فرہنگ نظام، ہندوستان میں فارسی لغت کی پہلی کتاب تھی (۲۹)۔ گمان غالب ہے کہ اسی کتاب کے مطالعے نے مصنّف کو بھی ایک لغت کی کتاب لکھنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ مصنّف نے "شرفنامہ" لکھا اور اس کی تصنیف میں "زفان گویا" سے کافی استفادہ کیا (۳۰) دوسرے ہندی علماء کی لکھی ہوئی لغات سے بھی مدد لی مثلاً "اداۃ الفضلاء" (جو قاضی بدر الدین دہلوی نے سنہ ۸۲۲ھ میں تالیف کی) "مؤید الفضلاء" (۳۱) "فوائد الفضلاء" اور "لسان الشعراء" (۳۲)۔ علاوہ اس کے، مصنف نے الفاظ و معانی کی مزید تحقیق کے سلسلے میں، فن لغت میں اپنے دو ہمعصر ماہر استادوں یعنی شیخ واحدی اور امیر شہاب الدین حکیم کرمانی سے بہت کچھ دریافت کیا، سنا اور سیکھا۔ امیر شہاب الدین سے مصنّف نے کئی الفاظ کے معنی زبانی دریافت کیے۔ چنانچہ "شرفنامہ" میں مصنّف نے ہر موقع پر وضاحت کر دی ہے کہ "ایں تسامع است از" "ایں سماع است از" "ایں محقق است از۔ امیر شہاب الدین حکیم کرمانی" بعض جگہوں پر "از و محقق است" یا "از و مصحح است" لکھا ہے اور کم از کم بیالیس مختلف موقعوں پر حکیم کرمانی کی آراء کو بطور شواہد نقل کیا ہے۔ اس وقت تک امیر شہاب الدّین نے شاید لغت پر اپنی کوئی کتاب نہیں لکھی تھی ورنہ ہمارے مصنّف اس کا ذکر کرتے۔ مگر شاید "شرفنامہ" کی تصنیف کے بعد ہی امیر شہاب الدّین نے خود ایک فرہنگ لکھی جس کو بعد کے مصنفوں نے بطور ایک ماخذ کے استعمال کیا، چنانچہ عبدالرّحیم بن احمد سور نے اپنی تصنیف "کشف اللغات والاصطلاحات"

میں اس سے استفادہ کیا (۴۳)۔ بہرحال ہمارے مصنف نے "شرفنامہ" کو کافی محنت سے لکھا اور اس کے لیے اپنے پیشرووں کی لکھی ہوئی لغات کو بھی پیش نظر رکھا اور زندہ علماء لغت سے بھی کافی کچھ مدد لی اور اس طرح اپنی تصنیف "شرفنامہ احمد منیری" کو ایک جامع اور نسبتاً مستند اور مکمل فرہنگ بنا دیا۔

"شرفنامہ میں مصنف نے الفاظ کو ان کے پہلے اور آخری حروف کے لحاظ سے مرتب کیا ہے اور اکثر اسماء خاص، غرائب اللغۃ اور ترکی الاصل الفاظ کو کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ مصنف "فرہنگ نظام (جلد پنجم) نے جو ہندوستان میں لکھی ہوئی فارسی لغات گنوائی ہیں ان میں "شرفنامہ" کا نمبر تیسرا ہے۔ "شرفنامہ" درحقیقت ان ابتدائی فارسی لغات میں سب سے زیادہ جامع کتاب ہے اور یہی وجہ ہے کہ "شرف نامہ" متاخرین کے لیے فارسی لغت کے سلسلے میں سب سے اہم ماخذ بنا۔ بقول حافظ شیرانی مرحوم، مصنف نے شرف نامہ لکھا "جس کی اہل لغات میں بڑی قدر و منزلت تھی" (۴۴)۔ ہم یہاں بعض مشہور لغت کی کتابوں کے نام مثال کے طور پر درج کرتے ہیں جن کا ایک اہم ماخذ "شرف نامہ احمد منیری" ہے

۱۔ تحفۃ السعادت، جو محمود بن شیخ ضیاء نے سلطان سکندر لودی کے عہد (۸۹۴ - ۹۲۳ھ) میں ۱۰ صفر ۹۱۶ھ کو لکھ کر ختم کی۔

۲۔ مؤید الفضلاء، جو محمد لاڈ نے لکھی۔ مصنف نے دیباچے میں اقرار کیا ہے کہ "شرفنامہ" فرہنگی متاخر و جامع است" (جلد ۱۔ صفحہ ۲) اور متن میں شرفنامہ سے بکثرت حوالے نقل کیے ہیں (ملاحظہ ہو مؤید الفضلاء طبع نولکشور نومبر ۱۸۹۹ م)۔

۳۔ کشف اللغات والاصطلاحات، جو عبدالرحیم بن احمد سور نے لکھی (مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۳ء)۔

(۴) مدار الافاضل۔ جو اللہ داد فیضی بن اسد العلماء علی شیر سرہندی نے سنہ ۱۰۰۱ھ میں لکھی۔

علماء لغت کے علاوہ "شرف نامہ" ادیبوں اور شاعروں کے لیے بھی مشعل راہ بنا اور مسلم بنگالہ سے لے کر سندھ تک کے مصنفین نے اس سے استفادہ کیا۔ چنانچہ ٹھٹھ سندھ کے ایک ادیب مخدوم ابراہیم نے اپنی تصنیف "شرح مخزن الاسرار" (قلمی) کے مقدمے میں لکھا ہے کہ الفاظ و معانی کی تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے "فرہنگ ابراہیمی" یعنی شرف

نامہ سے بھی مدد لی ہے۔

مصنف "شرف نامہ" اپنی لغت دانی پر بجا طور سے فخر کرتے ہیں کہ

جزا بمعنی دارد مراد ابراہیم کسی کہ نیست محقّق و را فصیح لغات (۳۵)

"شرفنامہ" کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ مصنّف نے بسا اوقات فارسی الفاظ کے ذیل میں ان الفاظ کے ہم معنی "ہندی" الفاظ بھی دے دیے ہیں۔ شرف نامہ میں "ہندی" الفاظ کا یہ ذخیرہ اردو کے تاریخی ارتقاء کے مطالعے کے لیے نہایت اہم ہے۔ چنانچہ حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں شرف نامہ میں مذکور "ہندی" الفاظ کی ایک فہرست دی ہے جس کو "شرف نامہ" کے زیادہ گہرے مطالعے سے اور بھی مکمل کیا جاسکتا ہے۔

(ج) مصنّف بحیثیت شاعر:۔ گو شرفنامہ ایک لغت کی کتاب ہے، تاہم اس میں مصنف کے اشعار کا ایک کافی ذخیرہ محفوظ ہے جس میں ایک منظوم مقدمہ، ایک نعت، ایک مدح، نو طویل قصائد اور دو قصیدوں کے بعض حصے، آٹھ غزلیں یا غزلوں کے حصے، ایک رباعی، دو قطعات اور تقریباً چار سو چالیس مطلعے، مصرعے یا مثنوی ابیات شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مصنف کو شعر و شاعری سے ایک خاص شغف تھا۔ مصنّف "فرہنگ نظام" کے خیال میں ہمارے مصنّف کے حالات زندگی نہیں ملتے کیوں کہ شاید وہ "علماء بزرگ" میں سے نہ تھے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک "استاد شاعر" تھے (۱) "شرف نامہ" کے مصنّف یقیناً اپنے وقت میں مسلم بنگالہ کے سر برآوردہ شعرا میں سے تھے اور غالباً یہ ان کی بلند پایہ شاعرانہ قابلیت ہی تھی جس نے ان کو مسلم بنگالہ کے ملک الشعراء میں زین الدّین ہروی کا ندیم و ہم جلیس بنا دیا تھا۔

ان کے اشعار میں صنائع و بدائع لفظی اور معنوی، خصوصاً رعایت لفظی و تلازمہ، تشبیہات اور استعارات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اصطلاحات، محاورات اور امثال کی بھی کچھ کمی نہیں۔ چوں کہ وہ شاعر ہونے کے علاوہ لغت کے بھی عالم تھے، لہذا بسا اوقات غریب اور انوکھے الفاظ (ملاحظہ ہو قصید، پایہ) اور نجوم کی اصطلاحیں اپنے اشعار میں استعمال کر گئے ہیں اور ان غریب لغات اور شاذ قوافی کے استعمال نے ان کی نظموں کو پرتکلف بنا دیا ہے۔ اس لیے پڑھنے والے کو مجموعی طور سے یہی گمان ہوتا ہے کہ ان کے اشعار میں آمد نہیں بلکہ آورد

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوائے ان اشعار کے جو "شرف نامہ" میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے پاس مصنف کے اشعار کا اور کوئی ذخیرہ موجود نہیں جس سے ان کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قائم کی جاسکے۔ "شرف نامہ" میں اکثر ان کی وہ نظمیں اور ابیات ہیں جو عمداً بطور لغوی شواہد کے پیش کی گئی ہیں۔ لہذا ان میں تکلف ہی نظر آتا ہے۔ مگر کہیں کہیں ایسے مصرعے اور مطلعے بھی پائے جاتے ہیں جو ان کی اصلی غزلوں سے لیے گئے ہیں اور یہ اشعار ان کی حقیقی شاعری پر شاہد ہیں۔ "شرفنامہ" میں جو ان کے جملہ اشعار پائے جاتے ہیں وہ ہم نے ضمیمے میں دے دیے ہیں تاکہ قارئین کرام مصنف کی شاعری کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکیں

(رسالۂ اردو کراچی ۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء)

(سردست صرف پہلی قسط پیش کی جاتی ہے)

حواشی

(۱) اصل نسخے میں لفظ " کابر " (کذا) ہے۔

(۲) جس کا ایک قلمی نسخہ لیڈن کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ اس کا " روٹو گراف " عکس جناب قاضی احمد میاں اختر صاحب جونا گڑھی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ چونکہ یہ کتاب بنگال کی عربی تصانیف میں غالباً پہلی کتاب ہے لہذا اس کو ایڈٹ کر کے شایع کرنا مناسب ہوگا۔

(۳) دسویں صدی میں غالباً اصلی نسخے سے ۔ اکبر کے عہد میں حضرت غوث گوالیاری نے اس کتاب پر فارسی میں بحرالحیات کے نام سے ایک شرح لکھی جس کا ایک قلمی نسخہ احمد آباد کے پیر محمد شاہ کتب خانے میں موجود ہے۔ ایک نسخہ مدراس میں بھی شایع ہوچکا ہے۔ (ان معلومات کے لیے راقم قاضی احمد میاں اختر صاحب جونا گڑھی کا رہین منت ہے)۔

(۴) بدایونی : منتخب التواریخ ۳ ،۲۹۱، کلکتہ ایڈیشن۔

(۵) نظام الدین احمد : طبقات اکبری ۳ ،۲۹۱، کلکتہ ایڈیشن۔

(۶) یہ نسخہ راقم کو جناب شیخ محمد اکرام صاحب کی وساطت سے ملا اور انھی کی ایما پر یہ مضمون لکھا گیا۔ راقم اس میدان میں اپنی علمی بے بضاعتی کا معترف ہے اور جناب شیخ محمد اکرام صاحب ، جناب قاضی احمد میاں اختر صاحب اور مخدوم امیر احمد پرنسپل اورینٹل کالج حیدرآباد سندھ کا ممنون ہے جنھوں نے اس مضمون کے تیار کرنے میں اپنے قیمتی مشورے دیے۔ خصوصاً مخدوم امیر احمد صاحب نے اس ناقص قلمی نسخے کی بعض عبارتوں کو پڑھنے میں راقم کی کافی رہنمائی کی۔

(۷) ملاحظہ ہو چارلس ریو ۔ فہرست فارسی مخطوطات ، متحف برطانیہ ۲ ۹۳۰ ،۹۲ء۔

(۸) Ivanow, W: Concise Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts in the collection of the Asiatic Society of Bengal, Calcutta, 1924, No:1414

(۹) غالباً بچرخ صحیح باشد۔
(۱۰) جزع بالفتح مہر است یمانی منسوب بچشم۔
(۱۱) ماھار = مہار۔
(۱۲) علامت۔ نشان
(۱۳) غالباً "دربانہ"
(۱۴) شیخ شرف الدّین احمد بن یحییٰ، منیر (بہار) کے مشہور و معروف صوفی بزرگ تھے۔ سنہ ۷۸۲ھ (۸۱-۱۳۸۰ء) میں وفات پائی۔ آپ کی تصانیف میں سے "مکتوبات" جن کو زین بدر عربی نے جمع کیا، مشہور ہیں اور شایع ہو چکے ہیں۔ (راجع: مکتوبات حضرت شیخ شرف الدّین یحییٰ منیری قدّس اللہ سرہٗ، مطبوعہ نولکشور سنہ ۱۸۸۵ع مطابق ۱۳۰۳ھ)۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے "پنجاب میں اردو" صفحہ ۱۳۳ پر شیخ شرف الدّین احمد یحییٰ منیری کی تصانیف کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "شیخ شرف الدین مجاشا میں بھی شاعری کرتے تھے" جس سے گمان ہوتا ہے کہ فارسی کے تو شاعر تھے ہی، ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔
(۱۵) کذا۔ فہرست ریو۔ ۱۵۶۰۳ اور فہرست آئی وناف ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال نمبر ۱۴۱۴، ص۔ ص ۶۴۰-۶۴۳۔
(۱۶) ایضاً۔ د۔ مؤید الفضلاء، از محمد لاد، مطبوعہ نو لکشور ۱۸۹۹، جلد ۱) صفحہ ۳-۴ اور "فرہنگ نظام، مطبوعہ، حیدرآباد دکن، دیباچہ (ی)۔
(۱۷) ایضاً۔ اور حاجی خلیفہ۔ "شرفنامہ" فی اللغتہ الفارسیتہ للمنیری" (کذا)۔ کشف الظنون طبع استنبول ۲ ۵۸۲۔
(۱۸) اللہ داد فیضی۔ مدار الافاضل تصنیف ۱۰۰۱ھ۔
(۱۹) عبدالرّحیم بن احمد سور۔ کشف اللغات، مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۴م، دیباچہ ص ۳۔
(۲۰) محمود بن ضیا۔ تحفتہ السادہ (راجع۔ فہرست ریو۔ ۲ ۴۹۴)۔
(۲۱) کشف اللغات (مذکور)۔ دیباچہ ص ۴۔
(۲۲) فرہنگ نظام (مذکور) اور شرح مخزن الاسرار تصنیف مخدوم ابراہیم ٹھٹوی (قلمی)
(۲۳) فہرست بوہار لائبریری، نمبر ۲۳۸، جلد ۱ ص ۱۹۴۔ لکھا ہے کہ۔ نسخہ (کتابت سنہ

۱۰۳۹ھ) کے خاتمے میں، کتاب کا نام " فرہنگ فاروقی " لکھا ہے۔

(۲۴) راجع۔ فہرست ریو۔ ۳۔ ۱۱۵۶۔

(۲۵) رسالۂ اردو، جنوری سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۰۳۔

(۲۶) حافظ محمود خاں شیرانی نے " بدر ابراہیم فاروقی " کے بجاے " ملّا رشید " لکھا ہے، چنانچہ وہ " زفان گویا " کو از مصنّفات " ملّا رشید جدّ ابراہیم " بتاتے ہیں (رسالۂ اردو، جنوری سنہ ۱۹۴۳ع، ص ۱۰۳)۔ ان کا یہ بیان غالباً صحیح نہیں۔ دوسری طرف فرہنگ نظام کے مصنّف لکھتے ہیں کہ۔ " زفان گویا و جہان پویا " " بدر الدّین " کی تالیف ہے۔ بعد میں کہتے ہیں۔ " از فرہنگ ابراہیمی در ذیل لفظ، اپاردہ " معلوم می شود او عموزادہ، شرف الدّین علی یزدی معاصر تیمور است کہ ظفر نامہ را در ۸۲۰ ھ نوشت "۔ اھ (فرہنگ نظام، حاشیہ ج ۸، دیباچہ)۔ شاید مصنف سے تعبیر کیا یہ، حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ " جامع شرفنامہ " خود ہمارے مصنّف ابراہیم ہیں جنھوں نے کئی موقعوں پر " زفان گویا " سے معانی نقل کیے ہیں (دیکھو۔ زیر الفاظ " اندروا " ، " اردی بہشت " وغیرھا)۔

(۲۷) چارلس ریو۔ فہرست مخطوطات متحف برطانیہ (۱۸۸۱م) ج ۲ ص ۴۹۲۔

(۲۸) پنجاب میں اردو، صفحہ ۲۱۵۔

(۲۹) ملاحظہ ہو فہرست ریو (مذکور) ۲ ۴۹۲۔

(۳۰) فرہنگ نظام (مذکور) دیباچہ (ی)۔

(۳۱) براے مکمل قصیدہ راجع ضمیمہ

(۳۲) ایضاً (ضمیمہ)

(۳۳) " اخبارالاخیار فی اسرار الابرار " مطبوعہ، مجتبائی، دہلی، ص ۱۰۳۔

(۳۴) " پنجاب میں اردو " صفحہ ۲۱۵۔ حافظ شیرانی صاحب نے " المخاطب بہ فتح خاں " لکھا ہے۔ ہمارے قلمی نسخے میں " حسن خاں " لکھا ہوا ہے اور عبارت بھی بالکل صاف ہے۔

(۳۵) جو بقول محمود شیرانی صاحب " عہد مغول " کی تصنیف ہے۔ (رسالۂ اردو جنوری سنہ ۱۹۴۳، صفحہ ۱۰۳)

(۳۶) ملاحظہ ہو " پنجاب میں اردو " صفحہ ۲۱۵۔

(۳۷) شاید اس قبیلے کے ایک دوسرے عالم محمد شیرازی نامی بھی تھے جو بقول حافظ شیرانی ، ان زندہ لوگوں میں سے تھے جن سے مصنّف نے اس کتاب میں استفادہ کیا ہے ۔ (پنجاب میں اردو ۔ صفحہ ۲۱۵) ۔

(۳۸) دیکھو قصائد ، کے ذیل میں ۔

(۳۹) فرہنگ نظام مطبوعہ حیدرآباد دکن ، دیباچہ ، حاشیہ صفحہ ح ۸ ۔

(۴۰) ملاحظہ ہو " شرفنامہ " تحت الفظ : اردی بہشت استرنگ ، اندرو ، ایاردہ وغیرہا ۔

(۴۱) ملاحظہ ہو " شرفنامہ تحت لفظ عینا ۔

(۴۲) بقول شیرانی صاحب " مؤید الفضلاء " " فوائد الفضلاء " لسان الشعراء یہ سب کتابیں " عہد قبل مغل " کے مسلم مصنّفین کی تصانیف ہیں (رسالۂ اردو ، جنوری سنہ ۱۹۴۳ء ۔ صفحہ ۱۰۳) ۔

(۴۳) کشف اللغات کے مصنّف نے اس کتاب کا نام " فرہنگ امیر شہاب الدّین حکیم کرمانی " لکھا ہے (ملاحظہ ہو کشف اللغات و الاصطلاحات طبع نولکشور سنہ ۱۸۷۴ م ، دیباچہ صفحہ ۳) ۔

(۴۴) رسالۂ اردو جنوری سنہ ۱۹۴۳ء ، ص ۱۰۳

(۴۵) ملاحظہ ہو قصیدۂ تائیہ (ضمیمہ) ۔

(۴۶) حالات مؤلف از جائی بدست نیامدہ جہت این است کہ از کتابش مفہوم می شود (؟) از علماء بزرگ نبودہ و در تاریخ نیامدہ ۔ اما شاعر استاد بودہ " (فرہنگ نظام ۔ مذکور دیباچہ " ی ") ۔

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ:

ابن بطوطہ کا سفرنامہ اور اس کے گمنام گوشے

صنف سفرنامہ میں ابن بطوطہ کے سفرنامے کو کئی اعتبار سے دنیا کے اہم سفرناموں پر فوقیت حاصل ہے۔ ابن بطوطہ نے اس وقت کے معمورۂ ارض کے وسیع ترین خطوں کو دیکھا، زیادہ مفید معلومات فراہم کیے اور جو واقعات بیان کیے کافی حد تک صحت سے بیان کیے۔ ان کے اسفار کو فاس (مراکو) کے سلطان ابوعنان مگر بنی کی ایما، پر وہاں کے عالم اور وزیر ابو عبداللہ ابن بجری نے، ابن بطوطہ سے استفسار کرتے ہوئے مرتب کیا اور مرتب شدہ کتاب کو " تحفتہ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار " کا نام دیا۔ یہ پوری کتاب یا اس کے اجزاء و اقتباسات کئی زبانوں میں ترجمہ ہوچکے ہیں۔

علمی نقطۂ نگاہ سے، ابن بطوطہ کے اسفار کے اس مجموعے کو جسے ہم ایک عظیم سفرنامے سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے بعض گمنام گوشے تا ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ مثلاً جن شخصوں اور شہروں یا حالات و واقعات کا اس میں ذکر آیا ہے، ان سب کا محققانہ تجزیہ اب تک نہیں ہوسکا۔ اس زاویے سے " تحفتہ النظار " کا عربی میں یا تراجم میں، ایک تفصیلی محققانہ ایڈیشن ابھی تک ناپید ہے۔ البتہ آنجہانی پروفیسر ہیملٹن گب نے رحلۂ ابن بطوطہ کا انگریزی میں ترجمہ کئی سال پہلے شروع کیا تھا جس کی چوتھی جلد گذشتہ سال ۱۹۹۶ء ہیکلویت سوسائٹی (Hakluyat Society) نے لندن سے شائع کیا۔ اس کے تفصیلی حواشی و تعلیقات پر مشتمل پانچویں جلد پر لندن یونیورسٹی کے پروفیسر چارلس بیکنگھام کام کر رہے ہیں جو ہیکلویت سوسائٹی کی طرف سے آئندہ سال (۱۹۹۸ء) تک چھپ جائے گی۔ انگریزی ترجمے کے اس محقق نے ایڈیشن سے کافی مسائل حل ہونے کی امید کی ہے، تاہم صحیح تجزیہ اور تحقیق کا کام تب مکمل ہوگا جب ابن بطوطہ کے دیکھے ہوئے ہر ملک اور خطّے کے مقامی سکالرز مقامی طور پر ان اخبار و آثار کی تحقیق کریں جو کہ اس سفرنامے میں مذکور ہیں۔

ابن بطوطہ اپنے پانچویں طویل سفر میں " سندھ و ہند " میں آئے۔ ان کا یہ سفر فریضۂ حج کے بعد عرب سے شروع ہوا جس میں وہ بالآخر ماوراء النہر پہنچے جہاں سے واپسی پر کابل و

غزنی سے ہوتے ہوئے یکم محرم سنہ ۷۳۴ھ (۲ ستمبر ۱۳۳۳ء) کو سندھ پہنچے جہاں سے پنجاب سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ نو سال تک (۷۳۴ھ۔ صفر ۷۴۳ھ) ان کا دہلی میں قیام رہا اور وہاں سے ملیبار اور پھر مالدیپ سے ہوتے ہوتے چین تک جا پہنچے۔

تاریخی طور پر سندھ و ہند میں ابن بطوطہ کے یہ دس سال سلطان محمد بن تغلق کے دور حکومت میں گذرے جنہوں نے ان کو دہلی کا قاضی مقرر کیا اور بالآخر تحائف دے کر ان کو چین کی طرف اپنا سفیر کر کے بھیجا۔ ابن بطوطہ نے سندھ و ہند میں اس دس سالہ قیام میں اپنے سیر و سفر کا اور ملکی حالات اور تاریخی واقعات کا احسن طریقے پر ذکر کیا ہے۔ تاہم ان کا یہ بیان (جیسے کہ مؤلف و ایڈیٹر ابن جزی نے قلمبند کیا) جامع ہے۔ اور بغیر مزید تفصیل و تحقیق کے ہم آج اس دور میں اس سے کلی طور پر مستفید نہیں ہوسکتے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج سے ایک سو سال پیشتر۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں۔ ایک جواں سال محقق پیرزادہ محمد حسین (بعد کے خان بہادر مولوی محمد حسین پیرزادہ جج ہائی کورٹ ریاست کشمیر) نے ابن بطوطہ کے سفر سندھ و ہند (اور پھر آگے چین تک اور واپسی مراقش تک اور بعد کے اسفار تا دم حیات) پر تحقیقی کام کیا جو "عجائب الاسفار (سفر نامہ ابن بطوطہ)" کے عنوان سے پہلی بار ۱۸۹۸ء میں اور دوسری بار عکسی صورت میں ۱۹۱۸ء میں چھپا۔ اس کام کی اہمیت کے مدنظر یہ کتاب عجائب الاسفار، راقم الحروف کی سعی و اہتمام سے تیسری بار قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ابن بطوطہ کے سفر نامے کے سلسلے میں کسی ملک کے مقامی سکالر کی طرف سے دنیا بھر میں یہ پہلی مثالی تحقیق تھی۔ فاضل محقق پیرزادہ نے اپنی لکھے ہوئے حواشی میں کافی مسائل سلجھا لیے ہیں۔ ضروری تھا کہ ان کی اس پیش رفت کے بعد دوسرے سکالرز اُن کے اس کام کو اور آگے بڑھاتے۔ کہ "کار دنیا کسی تمام نہ کرد"۔ اس وقت ہمارے لیے ضروری ہے کہ کم از کم حدود پاکستان یعنی بلوچستان سندھ و پنجاب میں جن راستوں سے ابن بطوطہ گزرے۔ ان کو متعین کریں اور جو آثار انھوں نے دیکھے ہیں ان کی کھوج لگائیں اور جو حالات انھوں نے بیان کیے ان پر مزید تحقیق کریں۔

میں اپنے اس مقالے میں ایسی مزید تحقیق کی ابتداء کی طرف ایک چھوٹا سا قدم آگے بڑھا رہا ہوں یعنی کہ سندھ میں ان کے سفر کے بارے میں جو مسائل سامنے آتے ہیں ان میں سے بعض کو سلجھانے کی کوشش کروں گا۔

ابن بطوطہ نے سندھ میں اپنے سفر کا راستہ اور بعض متعلقہ حالات کو یوں بیان کیا ہے۔ سنہ ۷۳۴ ہجری کے ماہ محرم الحرام کی پہلی تاریخ تھی کہ ہم دریائے سندھ پر پہنچے اس دریا کو پنجاب بھی کہتے ہیں ... یہاں سے سلطان محمد شاہ مسلمان بادشاہ ہند و سندھ کی عمل داری شروع ہوتی ہے۔ جب ہم اس دریا پر پہنچے تو بادشاہ کے اخبار نویس ہمارے پاس آئے اور ہمارے آنے کی خبر انھوں نے فوراً قطب الملک حاکم ملتان کے پاس بھیجی۔ سندھ کا امیر بادشاہ کی طرف سے سرتیز تھا جو شہر سیوستان میں مقیم تھا ... جب ہم نہر سندھ سے عبور کر کے ایک بانس کے جنگل میں داخل ہوئے، جس میں سے ہو کر راستہ گزرتا تھا، تو ہم نے گینڈا دیکھا۔ ہم دو منزل چلے تھے کہ جنانی کا شہر آیا۔ یہ شہر وسیع اور خوب صورت ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کا بازار بہت خوش نما ہے۔ اس شہر میں سامرہ قوم کے آدمی آباد ہیں اور قدیم سے آباد چلے آتے ہیں (جیسا کہ محمد بن قاسم کی فتوحات کے بعد شیخ بہاء الحق زکریا ملتانی کے جدّ امجد و قریشی یہاں پر رہ گئے) ... شہر جنانی سے چل کر ہم شہر سیوستان پہنچے۔ (اس شہر میں بادشاہ کے دو ملازم افسروں، سامرہ قوم کے سردار ونار اور امیر قیصر رومی نے کچھ دن پہلے بغاوت کر کے بادشاہ کی طرف سے مقررہ کردہ حاکم ملک رتن کو جو ہندو تھا قتل کر ڈالا تھا۔ انھوں نے ونار کو اپنا حاکم مقرر کیا جس نے اپنا لقب "ملک فیروز" اختیار کیا پھر ونار کے دل میں خوف پیدا ہوا کیونکہ اس کا وطن اور قبیلہ وہاں سے دور تھا اور وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر اپنے قبیلے کی طرف چلا گیا، باقی لشکر نے رومی کو اپنا سردار مقرر کیا۔ بعد میں ملتان سے عمادالملک سرتیز لشکر لے کر آیا اور قیصر رومی اور ان کے حامیوں کو قتل کر ڈالا اور ان کی لاشوں کو شہر کی فصیل پر لٹکا دیا) اس واقعے کے بعد ہی میں اس شہر میں پہنچا اور ایک بڑے مدرسے میں اترا۔ مدرسے کی چھت پر میں سویا کرتا تھا۔ وہاں سے یہ نعشیں لٹکی ہوئی نظر آتی تھیں ... (قاضی علاء الملک جس کو بادشاہ نے لاہری بندر اور متصل علاقہ جاگیر میں دے دیا تھا، وہ بھی عمادالملک سرتیز کی مدد میں دریائے سندھ میں سے پندرہ جہازوں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ میں ان کے ساتھ ان کے جہاز میں لاہری بندر گیا) اور پانچویں دن ہم لاہری شہر میں پہنچے۔ یہ شہر بہت خوب صورت سمندر کے کنارے پر واقع ہے، اس کے پاس دریائے سندھ سمندر میں جا گرتا ہے۔ یہ شہر بڑا بندرگاہ ہے ... وہاں سے میں بکھر گیا۔ یہ شہر بھی خوب صورت ہے اور دریائے سندھ کی ایک شاخ اس کے بیچ میں سے گذرتی ہے ... بکھر سے چل کر ہم اوچہ کے شہر میں پہنچے۔ یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے ... اوچہ سے چل کر میں ملتان پہنچا

یہ شہر ملک سندھ کا دارالخلافہ ہے"۔

سندھ میں ابن بطوطہ کے اس سفر کے سلسلے میں کئی سوال سامنے آتے ہیں جن میں سے چار پر اس مقالے میں گفتگو ہو گی۔ وہ یہ ہیں:۱۔ ابن بطوطہ کہاں سے سندھ کے حدود میں داخل ہوا؟ ۲۔ اس وقت دریائے سندھ کا بہاؤ کہاں سے تھا؟ ۳۔ ابن بطوطہ نے کہاں سے دریا کو عبور کیا؟ ۴۔ شہر جنانی کہاں پر واقع تھا؟

۱۔ ابن بطوطہ کا حدود سندھ میں داخلہ

پیرزادہ محمد حسین مرحوم اپنی کتاب "عجائب الاسفار" کے مقدمے (صفحات ۱۳۔۱۴) میں رقمطراز ہیں کہ "ابن بطوطہ کابل سے کرماش ہوتا ہوا، جس سے مراد اغلباً درہ قرم ہے، دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر کسی جگہ بھکر کے قریب سنہ ۷۳۴ ہجری ماہ محرم میں جا پہنچا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا۔ گکھڑوں اور جنجوعوں کی شورش کے سبب سے جنھوں نے کئی صدیوں سے راستے کو بند کر رکھا تھا، لاہور ہو کر دہلی جانا تو مشکل تھا مگر اس کو براہ راست ملتان جانے سے کون سی بات مانع تھی۔ اغلباً اس نے سندھ کی سیر پہلے کرنی مناسب سمجھی ہو گی"۔

یہ پیرزادہ مرحوم کی اپنی سوچ تھی کہ ابن بطوطہ کابل و کرماش سے اور پھر ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ڈیرہ غازی خاں اور کشمور سے ہوتے ہوئے دریائے سندھ کے کنارے کہیں بکھرؔ کے قریب پہنچے سفر نامے میں ایسا کوئی ذکر نہیں۔ مگر اپنے اس گمان پر موصوف نے خود ہی شک کیا ہے۔ البتہ آخر میں وہ صحیح نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابن بطوطہ سب سے پہلے سندھ دیکھنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ اس لیے وہ کابل گئے مگر ہندوستان کی طرف درۂ خیبر کا رخ نہ کیا۔ وہ غزنی آ کر سندھ کو چلے گئے۔ سندھ کی طرف جانے والی شاہراہ براستہ قندھار اور کوئٹہ ہی ہو سکتی تھی۔ یہ دونوں شہر اس وقت بھی موجود تھے۔ کوئٹہ اس وقت کا شالا یا شالہ کوٹ تھا۔ شالا سے ابن بطوطہ درۂ بولان کے ذریعے شمالی سندھ میں پہنچ سکتے تھے مگر قافلوں کی سہولت یا رفقاء کی رفاقت کی وجہ سے پہلے وہ پائینِ سندھ پہنچے اور پھر شمال کی طرف گئے۔ شمال سے جنوب سندھ جانے والے قافلوں کی شاہراہ (جس کا سراغ ابن بطوطہ سے پہلے والے ماخذوں میں ملتا ہے) مستنج (مستنگ)، کیز کانان (قلات) اور قصدار (خزدار) سے تھی۔ یہ قرین قیاس ہے کہ خزدار سے ابن بطوطہ سارونہ۔ دریجی کے راستے ٹھٹہ اور سیوہن کے درمیانی خطے میں یعنی موجودہ تھانہ بولا

خانؔ کے مغرب میں کہیں سندھ کے حدود میں داخل ہوئے ہوں گے۔ یہ گمان اس لیے قرین قیاس ہے کہ شمال کی طرف سیوستان (سیوہن) کے خطّے میں بغاوت ہو رہی تھی ۔ دوسری طرف اس بغاوت کا سرغنہ " ونار" تھا جو سمّہ قبائل کا سردار (جام) تھا اور سمّہ قبائل کی جمعیت کا مرکزی شہر ساموئی تھا جو ٹھٹّہ کے نزدیک تھا ۔ یعنی ٹھٹّہ کا خطّہ بھی باغیوں کے ہاتھ میں تھا اور بغاوت کے بعد سردار " ونار" بھی وہاں جا کر اپنے قبائل سے ملا تھا۔ لہذا سیوستان اور ٹھٹّہ کے درمیانی خطّے میں سے ہی قافلے کے لیے سلامتی سے گزر جانے کا راستہ تھا۔

یہاں پر " ونار" نام کی توضیح و تصحیح ضروری ہے ۔ ابن بطوطہ کے سفر نامے " تحفۃ النظار" کے عربی متن اور تراجم میں یہ نام " ونار" لکھا ہوا ہے جو دراصل " اونار" کی مسخ شدہ صورت ہے۔ ابن بطوطہ نے صحیح طور پر " اونار" ہی کہا ہو گا۔ اونار مقامی سندھی تلفظ " اونار" کی عربی لہجے والی صورت ہے۔ اس وقت " اونار" کے بجاے معروف و مروج تلفّظ " انڑ" ہے " مکلی (نزد ٹھٹّہ) پر ایک کتبے میں " سلطان فیروزالدین شاہ" مرقوم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساموئی میں جا کر وہ اونار (جام انڑ) خود مختار بن گیا ۔ یعنی کہ " ملک فیروز " کے بجاے وہ " سلطان فیروز الدین شاہ" ہوا۔ وہ سمّہ قبائل کا سردار تھا اور سمّہ تھا نہ کہ سامری (سومرہ) جیسا کہ ابن بطوطہ نے بتایا۔

۲۔ دریاے سندھ کا مجرا کہاں سے تھا۔

یہاں پر تفصیلی بحث و دلائل کے لیے گنجائش نہیں ، مگر پہلی صدی ہجری کے آخر میں محمد بن قاسم کی فتوحات سے لے کر آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ کی آمد تک ، تاریخی جغرافیائی حوالوں کے تجزیے سے مجموعی طور پر جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں ۔ اس چھ سو سالہ مدت کے دوران ، وسط اور پائین سندھ میں ، دریاے سندھ اپنے آج کل کے بہاؤ سے کافی دور مشرق کو بہتا تھا ۔ اس مجرا کو مجموعی طور پر " ساکرہ ، جلوالی ۔ پران مجرا کہا جا سکتا ہے ۔ محمد بن قاسم نے سمندر سے کشتیوں کو " نالہ ساکرہ" کے ذریعے اندرون سندھ روانہ کیا تھا ، اور وسط سندھ میں برہمن آباد کے قریب انھوں نے دریاے " جلوالی" کے کنارے کنارے شمال کو کوچ کیا ۔ اسی مجرا پر بعد میں شہر منصورہ آباد ہوا ، اور یہی مجرا بعد میں اپنی دو بڑی شاخوں مغربی اور مشرقی میں بٹ کر چودھویں صدی تک بہتا رہا۔ مغربی شاخ اس وقت کے شہدادپور ، نصرپور

، ٹنڈو محمد خاں شہروں کے نزدیک سے گزر کر جنوب مغربی ڈیلٹا کی مختلف شاخوں میں سے سمندر میں گرتی تھی۔ ان شاخوں میں سے بگھاڑ دریا زیادہ دیر تک بہتا رہا اور اسی دریا کے سمندری نالوں میں سے ایک پر لاہری بندر قائم ہوا۔ مشرقی شاخ اور اس کے نالے موجودہ میرپورخاص، ٹنڈہ جان محمد ، جھڈو کے نزدیک سے گزر کر " مشرقی نارہ " سے جا کر ملتے تھے ۔ مشرقی بہاؤ " پران" کے نام سے مشہور ہوا اور جدا جدا وقتوں پر مشرقی پران ، مغربی پران ، بڈہری وغیرہ نجراؤں میں سے گزرا۔ سومرہ مملکت کی آبپاری اور آبادی کا انحصار کافی عرصے تک اس مشرقی بہاؤ " پران" کے پانی پر رہا۔ ابن بطوطہ نے حدود سندھ میں داخل ہونے کے بعد پہلے مغربی بہاؤ والے دریا کو عبور کیا اور پھر مشرقی بہاؤ پران دریا کے دو ۔ آبے تک پہنچا جہاں شہر جنانی واقع تھا۔

۲۔ ابن بطوطہ نے کس جگہ سے پہلے دریائے سند کو عبور کیا۔

تھانہ بولا خاں والے خطے میں سے گزر کر مشرق کو آتے ہوئے ، ابن بطوطہ دریائے سندھ کے مغربی بجرا پر پہنچا جو موجودہ شہر ٹنڈہ محمد خاں کے مشرق کو تھا۔ ابن بطوطہ نے غالباً سومرہ حکمرانوں کے شہر ٹھری سے عبور کیا جو اس بجرا پر واقع تھا اور جہاں سے شمال ، مغرب کو سلطان محمد بن تغلق کے سیوہن میں متعین صوبہ دار کا عمل تھا اور جنوب اور مشرق کو سومرہ حاکموں کی حکمرانی تھی۔ ابن بطوطہ نے جہاں سے دریا کو عبور کیا وہ بہرحال ایک اہم مقام تھا ۔ ابن بطوطہ نے بتایا ہے کہ :" یہاں سے سلطان محمد شاہ مسلمان بادشاہ سند و ہند کی عملداری شروع ہوتی ہے ۔ جب ہم دریا پر پہنچے تو بادشاہ کے اخبار نویس ہمارے پاس آئے اور ہمارے آنے کی خبر انھوں نے فوراً قطب الملک حاکم ملتان کو بھیجی ... سندھ کا امیر بادشاہ کی طرف سے ان دنوں میں سرتیز تھا ... جو شہر سیوستان میں مقیم تھا"۔

۳۔ شہر جنانی کا محل وقوع

دریا کو عبور کرنے کے بعد ابن بطوطہ نے شہر جنانی کا رخ کیا اور دو منزلوں کی مسافت کے بعد وہ وہاں پہنچا۔ اب یہ شہر جنانی کہاں پر واقع تھا؟ اس مسئلے پر تین گرانقدر رائیں موجود ہیں جن کا تجزیہ کرنا ضروری ہے ۔ا۔ سب سے پہلے پیرزادہ محمد حسین مرحوم نے لکھا کہ " میری

رائے میں یہ شہر کہیں اوچ اور سکھرؔ کے درمیان دریا کے جنوبی کنارے پر واقع تھا اور جیسا کہ حال ہی میں ڈیرہ غازی خان رفتہ رفتہ دریا برد ہو گیا اسی طرح یہ شہر بھی نیست و نابود ہو گیا ہو گا" (عجائب الاسفار، مذکور، صفحہ ۷)۔ ان کا یہ گمان صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر ان کی رائے کے مطابق ابن بطوطہ ڈیرہ غازی خاں کی طرف سے سندھ میں داخل ہوا اور اوچ اور سکھرؔ کے درمیان شہر جنانی میں پہنچا تو وہاں سے بعد میں وہ لامحالہ پہلے بکھرؔ پہنچتا اور اس کے بعد سیوستان (سیوہن) لیکن ابن بطوطہ کا بیان اس کے برعکس ہے۔ وہ جنانی کے بعد پہلے سیوہن پہنچا اور پھر ساحل سمندر پر لاہری بندر دیکھ کر شمالی سندھ کو روانہ ہوا اور بکھرؔ پہنچا ۲۔ دوسری رائے ہیگ (Haig) کی ہے جس نے شہر جنانی کو شہر بالائی سے تعبیر کیا (ملاحظہ ہو ایم۔ آر ہیگ کا مقالہ Ibn Batuta in Sind جرنل، رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، ۱۸۸۷ء، صفحہ ۳۱۲) شہر بالائی، بکھرؔ اور سیوہن کے درمیانی خطّے میں (موجودہ تعلقہ کنڈیارہ ضلع نوشہرہ فیروز) واقع ہے۔ در سوائے اس کے کہ بالائی بر وزن جنانی ہے' ہیگ کا یہ گمان صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ابن بطوطہ نے جنانی کو جاتے ہوئے دو دریاؤں کا ذکر کیا ہے (ایک جو اس نے عبور کیا اور دوسرا جس پر جنانی واقع تھا) اور نیز بانس کے جنگل کا۔ بالائی اگر کسی دریا کے کنارے پر تھا تو اس سے پہلے اور کوئی دریا نہ تھا جس کو عبور کیا جائے۔ بانس کا جنگل بھی جنوب سندھ میں ہی ہو سکتا تھا نہ کہ یہاں ہیں۔

۳۔ تیسری رائے ڈاکٹر عمر بن داؤد پوتہ مرحوم کی ہے۔ وہ ہیگ کی رائے کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "ہمیں شہر جنانی کو سیوہن اور ٹھٹہؔ کے درمیان فرض کرنا چاہیے۔ تاریخ مبارکشاہی کا مصنّف خان شہید سلطان محمد کی جاگیروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "جنانی شصت کروہ از تہتہ بیشتر برسر دریاست" (جنانی ٹھٹہ سے ساٹھ کوس آگے دریا کے کنارے پر واقع ہے) چونکہ ٹھٹہؔ اور سیوستان (سیوہن) کا درمیانی فاصلہ کم از کم ۷۰ کوس ہے اس لیے شہر جنانی سیوستان سے تقریباً ۱۰ کوس یا ۲۰ میل جنوب یا جنوب مشرق کی سمت میں واقع ہو گا۔ دریائے مہران کے ہمیشہ رخ بدلنے کی وجہ سے اب اس وقت اس مقام کا متعین کرنا کافی دشوار ہے۔ ہیگ نے اس کا محل وقوع بالائی قرار دیا ہے لیکن یہ شہر ٹھٹہؔ سے ۷۰ کوس سے بھی زائد فاصلے پر ہے۔

اس لیے ان کے قیاس کو غلط سمجھنا چاہیے۔ راقم الحروف کے خیال میں شہر سن ہی اس کا صحیح اور مناسب مقام ہو سکتا ہے (تاریخ معصومی، فارسی متن، مطبوعہ پونہ، ۱۹۳۸ء، حواشی و تعلیقات از ڈاکٹر داؤد پوتہ)۔ اس رائے پر اتنا کہنا کافی ہو گا کہ شہر سن دریا کے حالیہ بحرا کے

کنارے پر واقع ہے۔ ابن بطوطہ کے زمانے میں دریا کا بہاؤ مشرق کی طرف تھا۔ سن کے متصل پہاڑی علاقہ ہے اور اس گرم خشک خطے میں بانس کے جنگل کا ہونا ناممکن تھا جس کا جنانی کو جاتے ہوئے ابن بطوطہ نے ذکر کیا ہے۔

۴۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ "جب ہم نہر سند سے عبور کر کے ایک بانس کے جنگل میں داخل ہوئے، جس میں ہو کر راستہ گذرتا تھا، تو ہم نے گینڈا دیکھا۔ وہ گھاس چرتا تھا۔ ہم نے اس کو مارنے کا ارادہ کیا تو وہ بھاگ گیا ..... ہم دو منزل چلے تھے کہ جنانی کا شہر آیا ..... یہ شہر وسیع اور خوبصورت ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کا بازار بہت خوشنما ہے۔ اس شہر میں سامرہ کی قوم کے آدمی آباد چلے آتے ہیں۔ مؤرخ کہتے ہیں کہ جب حجاج بن یوسف کے وقت میں سندھ فتح ہوا تو اس قوم کے بزرگ اس شہر میں بستے تھے"۔

خاص طور پر بانس کے جنگل کے حوالے سے تصدیق ہوتی ہے کہ یہ علاقہ جنوبی سندھ میں تھا جہاں پر سمندر کی بخار آلودہ ہوائیں پہنچتی تھیں اور پانی کی بھی فراوانی تھی۔ یہ سومرہ قوم کا شہر تھا جس کو ابن بطوطہ نے سامرہ کہا ہے۔ ان شواہد کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر دریائے سندھ کے مشرقی مجرا، پران، کے دو آبے میں واقع تھا۔ سومروں کے شہر کے اعتبار سے اس کا مقامی نام جنن، تھا جسے ابن بطوطہ نے جنانی، بتایا۔ یہ نام اسی گرد و نواح میں ابھی تک چلا آ رہا ہے، چنانچہ اب بھی وہاں پر ایک چھوٹی بستی کا نام جنن ہے اور ریوینیو سرکل کا نام بھی جنن ہے۔ دریا ہے مشرقی پران کی ایک شاخ بڈبہری سے متصل (موجودہ شہر ننوں کوٹ کے قریب شمال کی طرف) قدیم آثار پائے جاتے ہیں جن کو اس وقت ولی راجپال کہتے ہیں، غالباً شہر جنانی یہیں پر واقع تھا۔ سومروں کا ایک دوسرا شہر جو ٹنڈو محمد خاں کے جنوب مغرب کو واقع ہے، وہ بھی ان کی قدیم بستی کے روایتی نام پھ' جنن سومرہ، کے نام سے مشہور ہے۔

(نقشہ منسلک ہے)
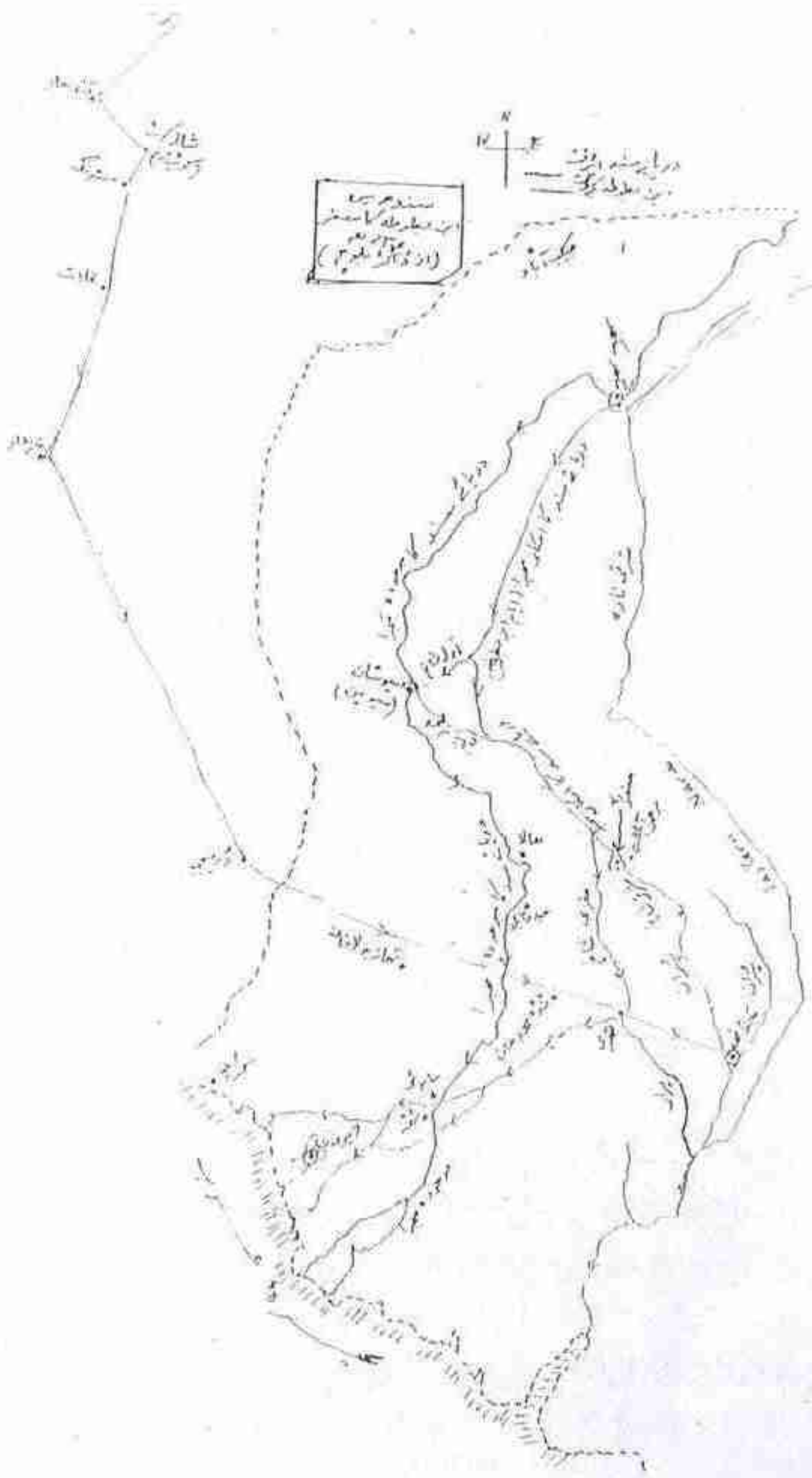
ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ:

شاہ جو رسالو میں الحاقی کلام

عرض مترجم:

[ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کا تازہ تحقیقی کارنامہ سندھی زبان کے شاعر اعظم شاہ عبداللطیف کے مجموعہ کلام "شاہ جو رسالو" سے متعلق تحقیقات پر مبنی ایک عظیم و ضخیم سلسلۂ مطبوعات ہے جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی دسویں جلد (۹۳۰ صفحات) الحاقی کلام کی تحقیق اور اس کے منہاج سے متعلق اہم اور مفید توضیحات کی حامل ہے۔ فاضل محقق نے اس جلد پر ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے جس کے اہم مطالب کا اردو ترجمہ ملخصاً ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ فہمیدہ شیخ]

خلاصۂ مطالب

شاہ عبداللطیف کے رسالے میں شامل بیرونی کلام:

موجودہ "شاہ جو رسالو" شاہ کی حاضری کے کلام کا کشکول ہے جس میں شاہ صاحب کی اپنی بیتوں اور وائیوں کے علاوہ دوسرے درویشوں کا کلام بھی شامل ہے جسے یا تو شاہ نے فقیروں کے سامنے پڑھا یا فقیروں نے شاہ کے سامنے (ص ۱)

اب سے پہلے جن فضلاء نے رسالے میں شامل بیرونی کلام کی بابت قلم اٹھایا، یا اس کلام کو جدا کرنے کی ترغیب دی یا خود اس کی کوشش کی، ان میں میر عبدالحسین سانگی مرزا قلیچ بیگ، لیلارام وتن مل لال وانی، ڈاکٹر گربخشانی، ڈاکٹر عمر بن محمد داود پوتا اور مولوی دین محمد وفائی کے اسماء قابل ذکر ہیں (ص ۲)

[اس کے بعد مصنف نے تفصیلاً ان کوششوں کا جائزہ پیش کیا ہے جو ص ۲ سے ص ۳۰ تک پھیلا ہوا ہے۔]

● شاہ کے کلام اور بیرونی کلام کے پرکھنے کا معیار :

۱۔ رسالوں کی تعداد کا معیار

۲۔ رسالوں کی قدامت کا معیار

۳۔ رسالوں کے تقابلی مطالعے کا معیار

۴۔ سندھی زبان و بیان کی نفاستوں کا معیار

۵۔ اعلیٰ شاعری کا معیار

۶۔ اعلیٰ فہم و فکر کا معیار

انھی معیارات کی بنیاد پر اس جلد میں شاہ کے کلام اور بیرونی کلام میں فرق کرنے اور انھیں جدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے (ص ۳، ۴)

رسالوں کی تعداد کے معیار سے مراد یہ ہے کہ رسالے کے زیادہ نسخے جمع کر کے مطالعے میں لایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کون سی ابیات اور وائیاں (اصناف سخن) کن کن رسالوں میں موجود ہیں۔ جو ابیات زیادہ نسخوں میں موجود ہیں، ان کے بارے میں کہا جائے گا کہ زیادہ حلقوں میں پڑھی گئی ہیں اور زیادہ مشہور رہی ہیں اس لیے ان کی اہمیت زیادہ ہے۔

قدامت کے معیار کے مطابق وہ بیتیں اور وائیاں جو قدیم نسخوں میں ہیں، زیادہ وزن رکھتی ہیں کیونکہ ان نسخوں کی کتابت شاہ لطیف کے دور سے قریب تر زمانے میں ہوئی ہے۔

تقابلی مطالعے کے تحت ہر بیت اور ہر وائی کا متن جیسا کہ جدا جدا نسخوں میں لفظی تغیرات کے ساتھ ہے، اس کی خامی یا پختگی تقابل کے ذریعے معلوم ہو سکے۔ اور یہ کہ کس نسخے میں بیت یا وائی میں مصرعے زیادہ ہیں یا کن اصل شاعروں کے نام موجود ہیں۔ اس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ بیت یا وائی کی صحیح و سالم صورت کیا ہے۔

زبان کا معیار ایک بنیادی معیار ہے۔ جن ابیات یا وائیوں میں زبان کے لحاظ سے نقص ہے، یعنی ان میں آنے والا لفظ یا محاورہ معیاری زبان کے مطابق نہیں تو وہ کلام شاہ عبداللطیف کے کلام کے معیار سے پست ہے۔ شاہ کی زبان ہر صورت صحیح اور معیاری ہے۔

شاعری کا معیار بھی بنیادی معیار ہے، اس لیے کہ وہ کلام جو شعر کے معیارات پر پورا نہیں اترتا، وہ شاہ کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔

بیان کا معیار بیان کی نفاستوں کا اعلیٰ معیار ہے۔ بیان کی نفاستوں سے مراد

زبان کی فطری مزاج داری، رونق اور روانی ہے۔

معنی اور مفہوم کے معیار سے مراد یہ ہے کہ ہر لفظ اور ہر مصرع معنی کے لحاظ سے صحیح ہو اور ان کا مفہوم واضح ہو۔

اعلیٰ فہم و فکر بھی اعلیٰ شاعری کی پرکھ کے لیے بنیادی معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی بھی کلام جو زبان اور شعر کے لحاظ سے صحیح ہے اور بیان کے لحاظ سے بھی مکمل ہے شاعری میں شمار ہو سکتا ہے مگر اعلیٰ سطح کے اعلیٰ شاعر کے کلام کے لیے ضروری ہے کہ وہ تخلیقی فہم و فکر کا حامل ہو۔

مذکورۂ بالا پہلے تین معیار بیرونی مددگار معیار ہیں یعنی ان کا تعلق متن میں موجود خوبیوں خامیوں سے نہیں، بلکہ متن سے باہر کے وہ معیارات ہیں جو متن کی سالمیت اور صحت کی پرکھ میں معاون ہیں۔ ان تین معیاروں کے وسیلے سے جدا جدا نسخوں میں کلام سالم اور صحیح تر صورت میں سامنے آجاتا ہے۔ بعد کے پانچ معیار، بذاتِ خود کلام میں سمائی ہوئی خوبیوں خامیوں کی پرکھ کے معیار ہیں، یعنی کلام کی اندرونی پرکھ کے " داخلی معیار " جن سے شاہ کے اصلی کلام اور الحاقی کلام میں تمیز کی جا سکتی ہے۔

یہ معیارات علمی و ادبی تنقید کے معیارات ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ جو محقق یا نقاد ان معیارات کی بنیاد پر کلام کو پرکھے وہ خود ان کی ماہیت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جہاں علمی و ادبی لیاقت معیار سے کم ہو وہاں یہ معیارات خاطر خواہ مدد کیا کر سکیں گے۔ زبان کے الفاظ، مصطلحات کی صحت کے ساتھ واقفیت، بیان کی نفاستوں کے بارے میں مکمل معلومات، سندھی، بیتوں اور وائیوں کے شاعرانہ معیار کا شعور، معنوی محاسن کی خبر اور فہم و فکر کی بلندی کا علم۔ یہ سب کچھ حاصل ہے تو معیارات کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھنا ممکن ہے ورنہ صحیح نتائج کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ شاہ کا کلام بیک وقت آسان بھی ہے، مشکل بھی۔ اس نوعیت کے کلام کو پرکھنے کے لیے بڑی واقفیت کی ضرورت ہے۔ میرا یہ احساس کوئی تیس برس کے طویل عرصے کے مطالعے کا نتیجہ ہے جو "شاہ جو رسالو" کے مطالعے میں گزارے ہیں۔ سندھی زبان کے کلاسیکی ادبی ذخیرے اور رسالوں کے مطالعات ، عوامی لوک ادب کی وسیع معلومات (ڈاکٹر صاحب سندھی لوک ادب کی ۴۰ جلدیں مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں۔ مترجم) جامع سندھی لغت کی تدوین پر سالہا سال کی محنت، سندھی ادب کی تاریخ سے متعلق تحقیقی مطالعے اور شاہ جو رسالو کے بارے میں زیادہ جان

کاری رکھنے والے فقیروں سے سالہاسال تک ملاقاتیں ــــــــــ ان سب کا نتیجہ ہے کہ شاہ کے کلام کی پرکھ کے معاملے میں کچھ شعور آیا ہے۔

اس بنا پر شاہ کی بیتوں اور وائیوں میں شامل الحاقی کلام کی شناخت مجھ پر آسان ہو گئی ہے۔ (ص ۳۰، ۳۰ تا ۴۰)

[اس کے بعد مصنف محترم نے تفصیلاً ان معیارات کے انطباق کی مثالیں پیش کی ہیں اور عملی طور پر بتایا ہے کہ اس نوعیت کا تجزیہ کرتے وقت کن امور کو پیش نظر رکھا جانا چاہیے (ص ۴۰ تا ۵۰) ۔ آخر میں اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ معیاری پرکھ سے نتائج اخذ کرتے وقت کیا نکات ذہن میں رکھنے ہوں گے۔ (ص ۵۰ تا ۵۲، -]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

University of Sind

Professorial Office Allama I. I. Kazi Chair

(عکسِ تحریر)

Dr. N. A. BALOCH
Hon. Professor

Old Campus,
Hyderabad City.

Ref. No.

Dated ۲ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ
18-7-90

مکرمی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ادام اللہ علینا الطافہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امابعد: میں ممنون ہوں کہ آپ نے باقیاتِ باقی کا نسخہ عطا فرمایا جس کو بڑی محبت سے آپ نے شروع تا آخر اپنے ہاتھ سے لکھا یعنی آپ کی کتابت اور املاء کی وجہ سے میں اس کو بطور ایک نادر نسخے کے سنبھال کر رکھوں گا۔

باقیاتِ باقی کے مطالعے سے نہ فقط میری ناقص معلومات میں صحیح طور پر اصلاح ہوئی بلکہ موضوع کے سلسلے میں کلی طور پر تسلی ہو گئی ہے۔ آپ نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے اعلائے اسلامی کردار کے سلسلے میں مجتہدانہ موافقت کا حق ادا کیا ہے اور مروان جیسے گستاخ صاحب حملہ ماخذوں پر بالفاظ نظر رکھتے ہوئے، جزئیاتی تفصیل و تجزیہ سے معیاری علمی تحقیق کی مثال پیش کی ہے۔ فاحسنت یا اخی!

شیخ محمد اکرام مرحوم سے میرے قریبی علمی روابط تھے۔ انہوں نے اسلامیانِ ہند کی تاریخ و کلچر کے مطالعے کے سلسلے میں کافی محنت و مشقت سے کام لیا، لیکن حالات و واقعات کو وہ اکثر اپنے مخصوص نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے۔ آپ نے ان کی اسی نقطۂ نگاہ پر بجا طور پر عالمانہ تنقید کی ہے اور اپنے علمی اجتہاد سے اعتراضات و شبہات کی حملہ دیواروں کو مسمار کر دیا ہے۔ بے شک باقیاتِ باقی علمی تحقیق کا شاہکار ہے اور دینی حمیت کا مینار۔ جزاک اللہ۔

کتاب Road to Pakistan حال ہی میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں احقر کے لکھے ہوئے دو ابواب شامل ہیں۔ ہندو قبل از اسلام (صفحات 28-33) اور سلطان محمود اور محمد بن غزنویان (صفحات 46-65) کو میں نے جس زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے اس پر تبصرہ فرمائیں۔ آپ نظر ڈال سکیں گے تو میری تشفی ہوگی۔ بالخصوص ہر حوالوں کے لکھنے میں نے آپ ہی کی محققانہ کتاب سے رجوع کیا تھا اور یہ حوالے صفحہ 78 پر (حواشی شمارہ 63 تا 67) موجود ہیں۔ فی الحال میں اس کتاب کی اپنی کاپی شرف نظر کے لئے خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

والسلام نیاز مند
مخلص
نبی بخش

عکسِ تحریر: مکتوب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ بنام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ:

ایامِ گذشتہ کے چند اوراق

[ڈاکٹر صاحب کے خود نوشت حالات ان کی چار مختلف تحریروں سے اخذ کر کے یکجا پیش کیے جاتے ہیں۔ جونا گڑھ میں اپنے قیام کے حالات اختر جونا گڑھی کے حوالے سے رسالہ تحقیق میں لکھے تھے، اور اس میں کچھ حالات قیام کراچی اور قیام حیدرآباد (سندھ) کے بھی آ گئے تھے۔ علی گڑھ میں قیام کے حالات ایام علی گڑھ کے عنوان سے علی گڑھ میگزین کے تازہ شمارے میں چھپے ہیں۔ امریکہ میں قیام کے حالات آزاد سبحانی کے حوالے سے ان کی کتاب "مولانا آزاد سبحانی" (لاہور، ۱۹۸۹ء) میں ملتے ہیں۔ ترکی میں اپنے علمی اسفار کی روداد رسالہ تحقیق کے شمارہ ہشتم میں چھپوائی تھی۔ نجم الاسلام]

(۱)

ایامِ جوناگڑھ

(۱۹۳۸ء۔۱۹۴۱ء)

۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۱ء جونا گڑھ میں قیام رہا کہ وہاں پر بہاء الدین کالج میں بی۔ اے کی ڈگری کے لیے داخلہ لے رکھا تھا۔ سندھ کے خشک میدانی ماحول کے برعکس جونا گڑھ کا خطہ سرسبز د آباد تھا، اور شہر تو پہاڑوں کی آغوش میں بسا ہوا تھا جس کو دیکھتے ہی تعجب اور تحیّر کی سی کیفیت طاری ہوتی۔ اس وقت ریاست کے نواب جناب مہابت خان جی تھے۔ برسوں پہلے، ریاست کے روشن دماغ وزیر با تدبیر جناب بہاء الدین کی مساعی جمیلہ سے ڈگری کالج قائم ہوا تھا جس میں طلبہ کے لیے ٹیوشن فیس معاف تھی۔ شہر و ریاست کے ہندو اور مسلمان طلبہ اور

طالبات کے علاوہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے غریب مسلمان طلبہ وہاں پہنچتے تھے ۔ ان کے لیے ہوسٹلوں میں رہنے کا انتظام تھا۔ کالج کی فضا پُر امن و پُرلطف تھی اور تعلیم پر پوری توجہ دی جاتی تھی ۔ پہلے سال کے نصف میں مقابلے کا ایک امتحان ہوا کرتا تھا جس میں اوّلیت حاصل کرنے والے کو آٹھ روپے فی ماہ وظیفہ ملتا تھا ۔ راقم نے جب یہ وظیفہ حاصل کر لیا تو سارے مسائل حل ہوگئے ۔ کھانے کے انتظام کے لیے ہوسٹلوں میں کلب تھے جو طلبہ خود چلاتے تھے ۔ میں نے جب دیکھا کہ دھاندلی ہو رہی ہے اور فی ماہ بِل اٹھارہ روپے تک جا پہنچا ہے تو مروّجہ سررشتے سے قطع تعلق کر کے ایک جداگانہ کلب قائم کرلیا ۔ تاکہ حتیٰ المقدور کم خرچ پر اچھا کھانا مہیا ہوسکے ۔ اس مقصد میں کامیابی ہوئی اور فی ماہ بل گیارہ روپے تک جا پہنچا ۔ کلب کے ممبروں کے لیے لازمی تھا کہ ہر نئے مہینے کی یکم کو وہ ماہانہ بل کی رقم پیشگی ادا کریں ۔ ہم نقد رقم دے کر ، کھانے پینے کی اشیاء کافی رعایت سے خرید کرلیتے تھے ۔ شہر کے مرکزی دیوان چوک کی بڑی دکانوں سے سودا لیتے ۔ بہترین چاول اٹھارہ روپے فی من ، خالص گھی ایک روپے کا ایک سیر تا سوا سیر ، دار جیلنگ چائے (سچانگ پیکو ، لپیل والی) نو روپے میں ایک پاؤنڈ وزن کا ڈبّہ ، ہر جمعے کو بریانی اور میٹھے کا حلوا پکتا تھا ۔ بس عیش ہی عیش تھے ۔

پہلا ایک ڈیڑھ سال تو زیادہ تر نئے ماحول اور نئی فضا سے مانوس ہونے میں لگا ۔ شہر کے گرد شہر پناہ کے طور پر پتھر کی مضبوط دیوار اور شہر کے اندر وسط میں قدیم قلعہ " اوپر کوٹ " ۔ یہی جھونا (قدیم) گڑھ تھا جس پر شہر کا نام پڑا ۔

شہر کے جنوب کو واقع اپنے ہوسٹل سے جب ہم شہر کو جاتے تھے تو " کالوا " گیٹ سے داخل ہوتے تھے۔اس دروازے کا نام " کالوا " ندی (برساتی نالہ) کے نام پر تھا ۔ نماز جمعہ کے لیے شہر کے اندر جامع مسجد میں جاتے تھے ۔ شہر کے مشرق کی طرف اونچے پہاڑ تھے ۔ جن کی وجہ سے ہماری ہوسٹلیں اور شہر کا مشرقی حصہ ، صبح کے سات آٹھ بجے تک سایے میں ڈھکے رہتے تھے ۔ جون تا ستمبر موسلا دھار بارشیں ہوتی تھیں اور ہم دور سے آبشاروں کو دیکھ کر پہاڑوں پر جا پہنچتے تھے ۔ ربڑ کے برساتی جوتے بارہ آنے (آج کے پچھتر پیسے) میں ملتے تھے جن سے چار مہینے تک گزارا ہوجاتا تھا ۔ ہوسٹلوں سے سیدھا مشرق کی طرف داتار پہاڑ تھا جس کے اوپر جمیل شاہ داتار ٹھٹوی کی چلہ گاہ تھی ۔ مجاور سندھی بول لیتے تھے ۔ بزرگ جمیل شاہ شہر ٹھٹہ سے بارہ میل جنوب کو " پیر آر " (پیر پٹھا) پر مدفون ہیں جہاں پر جمیل شاہ گرناری کے نام سے مشہور ہیں، یہاں سے وہ گرنار پہاڑ پر گئے اور پھر داتار پہاڑ پر چلہ کشی کی ۔ گرنار پہاڑ ، داتار

کے شمال کو واقع ہے جس کے اوپر جین دھرم کے مندر پائے جاتے ہیں ۔ گرنار ایک اونچا پہاڑ ہے ۔ اور جو لوگ وہاں جاتے تھے تو رات کو وہیں پر ٹھہر جاتے تھے۔ مالدار افراد خود کو ڈولیوں میں اٹھوا کر اوپر پہنچتے تھے ۔ مگر کالج کے طلبہ کا پہاڑی ٹولہ ، پہاڑوں پر چڑھنے اترنے میں اتنا مشاق ہوگیا تھا کہ ہم ایک ہی دن میں گرنار پہاڑ پر چڑھے اور واپس نیچے اترے ۔ شہر جونا گڑھ کے اطراف اور بعض دور دراز علاقوں کو جا کر دیکھتے تھے۔ دھو راجی ، راج کوٹ ، منگرول ، کتیانہ اور مانا وادر شہروں کے علاوہ ساحل سمندر پر ویراوال بندر پر پہنچے ۔ ویراوال سے سومناتھ کو گئے ۔ وہاں پر ایک قدیم قبرستان دیکھا جس میں ایک لمبی قطار ایسی قبروں کی نظر آئی جن پر پتھر میں تراشے ہوئے گھوڑوں کے سر استوار تھے ۔ ان کی نسبت یہ روایت سنی کہ یہ سلطان محمود غزنوی کے لشکر کے گھوڑے تھے جو یہاں پر مرے اور دفن ہوئے ۔ اس طرح کی تگ و دو سے پہلے ایک ڈیڑھ سال میں ہی ہم نے جونا گڑھ شہر اور اطراف کے ماحول کو اپنا لیا تھا۔

سنہ ۱۹۳۸ء کے آخر میں جب ذہن علم و فضل کی راہیں تلاش کرنے لگا تو بعض قدر آور شخصیتیں نظر آنے لگیں جن میں بالخصوص قاضی احمد میاں زیادہ نمایاں تھے ۔ بعض دوسرے بزرگ جو میری یادوں میں زندہ رہے ہیں وہ یہ تھے : کالج پرنسپل جناب ظہور الدّین احمد جو وضع قطع میں سو فی صد مسلمان اور طالب علموں پر مہربان تھے ۔ فلسفہ اور نفسیات کے عالم تھے اور ان علوم کے حوالوں سے کتابیں لکھی تھیں جن میں سے ایک دو اس وقت تک چھپ چکی تھیں ۔

کالج کے اساتذہ میں سے جناب طاہر علی صاحب ہمیں عربی پڑھاتے تھے اور لائق تھے ۔ جناب راؤ صاحب ہندو اساتذہ میں سے ریاضیات کے اچھے استاذ تھے ۔ میں نے انٹر میں منطق کے بجائے ریاضیات بطور اختیاری مضمون لے رکھا تھا ۔ راؤ صاحب کی ذہانت سے متاثر ہو کر میں نے اس مضمون میں خوب محنت کی اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے ۔ چنانچہ راؤ صاحب نے ترغیب دی کہ میں ریاضیات میں بی ۔ اے کروں ۔ لیکن ساتھ ہی عربی میں اچھے نمبر آئے اور جناب طاہر علی صاحب کی تلقین نے ان کی طرف کھینچ لیا۔ پروفیسر اوزا صاحب ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے ۔ معمر مگر شگفتہ طبع تھے اور کلاس میں ان کی اور طلبہ کی آپس میں خوب نوک جھونک رہتی تھی ۔ جناب ترمذی صاحب ہمیں فارسی پڑھاتے تھے (جو میرا اختیاری مضمون تھا)۔ ان کا طریقہ تدریس محققانہ اور استفسار پر مبنی تھا ۔ چنانچہ مجھے پہلی بار علمی تحقیق و تجسس کی کرنیں نظر آنے لگیں ۔ کالج سے باہر اور شہر میں جناب برہانی صاحب ، شہر کے رؤسا میں سے تھے یا ریاست کے کسی محکمے کے

سربراہ نیلی مسجد (؟) کے پیش امام عربی کے فاضل تھے اور میں فراغت میں ان کے ہاں جا کر ابن درید کا مقصورہ پڑھتا تھا۔ ریاست کے لانسرس (گھڑ سوار فوج کا رسالہ) کی مسجد کے حافظ عالم فاضل تھے، فرخ آباد کے رہنے والے تھے۔ رمضان میں تراویح پڑھاتے تھے اور میں اکثر وہیں نماز کے لیے جایا کرتا تھا۔ شہر کے تجارتی حلقوں میں ہاشم سیٹھ (میمن) ایک مُعزّز شخص تھے اور نواب صاحب کے ہاں مقبول تھے۔ دیوان چوک میں ان کی دکان تھی اور میں ان کے ہاں جا کر بیٹھتا تھا۔ فاروقی صاحب کا چھوٹا سا پریس تھا۔ قلندر صفت انسان تھے۔ اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ قرآن شریف کے گجراتی ترجمے کو شایع کرنے کا اہتمام کر رہے تھے اصل میں جبل پور کی طرف کے رہنے والے تھے۔ میں ان دنوں خاکسار تحریک میں تھا۔ فاروقی صاحب نے میری ہمت افزائی کی۔ میں چاہتا تھا کہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کے تصنیف کردہ کتابچے "اسلام کا عسکری نظام" کا گجراتی میں ترجمہ کر کے چھپوایا جائے۔ جناب فاروقی صاحب نے میرا یہ مسئلہ حل کر دیا اور ایک ہزار کاپیاں چھاپ کر تقسیم کی گئیں (اس کی پاداش میں، مجھے بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے کے لیے بہاء الدین کالج میں داخلہ نہ مل سکا اور پرنسپل ظہور الدین احمد صاحب کے مشورے سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی جا پہنچا) فتح محمد سندھی صاحب پولیس کے محکمے تھے اور بڑی رعب دار شخصیت کے مالک۔ جناب کامل جونا گڑھی ملک الشعراء تھے۔ جونا گڑھ ریاست کی تاریخ لکھی تھی۔ موسیقی کا صحیح علم رکھتے تھے۔

لیکن سب میں نمایاں اور جاذب شخصیت قاضی احمد میاں اختر صاحب کی تھی۔ اس وقت حسین جمیل جوان لگتے تھے۔ ترکی ٹوپی، شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس ایک شاندار وکٹوریا گاڑی میں سوار ہو کر آتے جاتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ جونا گڑھ ریاست کے روساء اور جاگیرداروں میں سے ہیں۔ راستے میں جب گاڑی میں بیٹھے ہوئے گزرتے تھے تو ہم ان کو گھور گھور کر دیکھا کرتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ قاضی صاحب کا خاندان سندھ سے جونا گڑھ آیا تھا۔ شہر کے قاضی واڑے میں ان کی شاندار حویلی تھی۔

کالج کی عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ مشرق سے تھا اور داخل ہوتے ہی سامنے سے کالج لائبریری کا بڑا وسیع ہال تھا۔ البتہ اندر کی جانب دروازے سے متصل بائیں کو ایک کمرہ تھا جس پر ریاست کے آثار قدیمہ آفس کا سائن بورڈ (Department of Archaeology کچھ مزید الفاظ کے ساتھ) آویزاں تھا۔ میں اکثر اس بورڈ کو دیکھا کرتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا

تھا کہ کس کا آفس ہے ۔ ایک دن دیکھا کہ چپراسی اس کمرے کا دروازہ کھول رہا ہے ۔ اندر دیکھا تو بڑے بڑے سائز کی ضخیم اور مجلد کتابیں خوبصورت الماریوں میں رکھی ہوئی نظر آئیں ۔ اسی اثناء میں باہر دروازے کے سامنے ایک وکٹوریا گاڑی آکر رکی اور قاضی احمد میاں صاحب اترے اور کمرے کے دروازے کی طرف آئے ۔ جب دیکھا کہ میں ان کی طرف تعجب سے دیکھ رہا ہوں تو پوچھا آپ پڑھتے ہیں ، کہاں سے آئے ہیں ؟ میں نے بتایا کہ میں سندھ سے آیا ہوں ۔ پھر مزید شفقت سے پوچھا کہ آپ یہاں کھڑے ہو کر کیا دیکھ رہے تھے ۔ میں نے کمرے کے بورڈ اور کمرے میں اندر کتابوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ کمرہ اور یہ کتابیں کس لیے ہیں ۔ فرمایا یہ ریاست جونا گڑھ کے آثار قدیمہ کا محکمہ ہے اور میں اس کا نگراں ہوں ۔ اس مختصر ملاقات کے بعد دوسری بار جب تشریف لائے تو میں ہمت باندھ کر اندر کمرے میں گیا ۔ میرے ہاتھ میں ابن صاعد اندلسی کی کتاب طبقات الامم کا اردو ترجمہ تھا جو کئی سال پہلے خود قاضی صاحب نے کیا تھا ۔ میں نے سلام عرض کیا اور کہا کہ آپ کا نام نامی دیکھ کر میں نے یہ کتاب لائبریری سے نکلوائی ہے اور اس کو پڑھ رہا ہوں ۔ سن کر خوش ہوئے اور مجھے مزید مطالعے کی ترغیب دی ۔

شہر سے مشرق رویہ ، گرنار پہاڑ کی طرف جاتے ہوئے ہم ایک تراشے ہوئے گول پتھر پر کندہ شدہ کتبے دیکھتے تھے ۔ ایک دن میں نے کچھ پوچھنے کا بہانہ بنایا تاکہ ان سے مل سکوں ۔ یہ جان کر خوش ہوئے کہ مجھے کتبوں سے بھی دلچسپی ہے ۔ پھر تفصیل سے سمجھایا کہ راجہ اشوک کے زمانے کے کتبے ہیں اور بہت ہی اہم ہیں ۔ بہرحال شروع میں اس طرح مجھے قاضی صاحب سے ملنے اور متعارف ہونے کے مواقع حاصل ہوتے ۔

بہاء الدّین کالج جونا گڑھ میں آل انڈیا مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے ۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک دو ایسے مشاعرے منعقد ہوئے ۔ دونوں مشاعروں میں جناب جگر مراد آبادی تشریف لائے ۔ متوسّط قدوقامت ، چھوٹی سی کالی داڑھی (سفید ریش نہیں ہوئے تھے)، شیروانی اور پاجامے میں ملبوس ، سرپر کالی ٹوپی ۔ وضع قطع میں لاابالی ، پان کا اتنا شوق کہ مونہہ کے دونوں اطراف گویا ریشہ آمیز ۔ جونا گڑھ کے روساء میں سے ایک خوبصورت نوجوان جو اپنا تخلص قمر کرتے تھے ان ہی کے ہاں جگر صاحب مہمان ہوتے تھے۔ مقامی شعراء میں سے ریاست کے ملک الشعراء تو حضرت کامل تھے جو البتہ معمر تھے ۔ ایک مجوبۂ روزگار جونجہ صاحب تھے ان کے آباء و اجداد کئی پشتوں سے سندھ ہجرت کر کے جونا گڑھ میں بس گئے تھے ۔ جونجہ صاحب مقامی جونا

گڑھی (گجراتی اردو آمیز) زبان میں خوب شعر کہتے تھے اور اس میں انھوں نے اپنا ایک جداگانہ دیوان بنا رکھا تھا۔ سب کو اپنے یہ اشعار شوق سے سناتے تھے۔ ایک غزل میں آخری قافیہ و ردیف والے الفاظ یہ تھے "۔۔۔ ہونے تو دو"۔ وہ شستہ اردو میں بھی معیاری شعر کہتے تھے۔

پہلا مشاعرہ جو ہم نے دیکھا وہ کالج کے اندر ہی منعقد ہوا۔ اس میں قاضی احمد میاں اختر صاحب منتظم اعلیٰ نظر آئے۔ بطور والینٹیر کے میں نے بھی انتظام میں حصہ لیا۔ معلوم ہوا کہ ان مشاعروں کے حقیقی محرک قاضی صاحب ہی تھے۔ دوسرے مشاعرے کے انتظام میں، میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قاضی صاحب مجھے کام میں مشغول دیکھ کر خوش ہوئے۔ جناب جگر صاحب مہمان خاص تھے۔ مصرع اس طرح تھا:

قدرت خدا کی ہے کہ خزاں ہے بہار میں

تقریباً چار گھنٹوں تک محفل جمی رہی۔ حضرت کامل جونا گڑھی کو اور حضرت جگر کو بڑے احترام سے سنا گیا۔ مجھے اعلیٰ اردو شاعری کی نزاکتوں سے اس وقت تک اتنی آگہی نہ تھی کہ اچھے اشعار ازبر ہوجائیں۔ البتہ جونجہ صاحب کی مزاحیہ نظم پر ہم نے خوب قہقہے لگائے۔ مصرع طرح کی تضمین کرتے ہوئے انھوں نے یہ شعر پیش کیا اور خوب داد حاصل کی:

بیٹھا ہوا رقیب ہے پہلوئے یار میں
قدرت خدا کی ہے کہ خزاں ہے بہار میں

بہرحال ان دنوں جناب قاضی احمد میاں اختر صاحب کی شخصیت جونا گڑھ کی علمی و ادبی محفلوں کا مرکز و محور تھی۔

میں سنہ ۱۹۴۱ء میں جونا گڑھ سے علی گڑھ پہنچا اور مسلم یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے لیے شعبۂ عربی میں داخلہ لیا۔ پروفیسر مولانا عبدالعزیز میمن شعبے کے صدر تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ میں جونا گڑھ سے آیا ہوں تو قاضی صاحب کے متعلق پوچھا اور فرمایا کہ وہ ہمارے دوست ہیں۔ اپنی گفتگو میں میمن صاحب قاضی صاحب کے علم و فضل کی داد دیا کرتے تھے۔ اور یہ سن کر مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ہم جونا گڑھ میں قاضی صاحب کو دیکھتے تو تھے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے فاضل ہیں کہ استاذ میمن صاحب جیسے جبل العلم بھی ان کی اتنی قدر کرتے ہیں۔

(۲)

ایامِ علی گڑھ
(۱۹۴۱ء ... ۱۹۴۵ء)

۱۹۳۷ء ... ۱۹۴۱ء کے دوران بہاء الدّین کالج جونا گڑھ سے بی اے آنرز کیا اور کالج میں پہلی پوزیشن آئی جس پر ایک سو روپیہ ماہوار " مہابت فیلو شپ " وظیفہ (بنام نواب مہابت خان جی والیِ ریاست) کا مستحق ہوا ۔ جون ۱۹۴۱ء میں خوشی کے مارے جب کالج پہنچا تو ایم اے میں داخلے کا دروازہ بند پایا ۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے کالج اور شہر میں خاکسار تحریک کا اجرا کیا تھا۔ لہذا جونا گڑھ کالج میں میرا داخلہ ممنوع ہوگیا تھا۔ البتہ یہ امتناعی حکم صیغۂ راز میں رہا اور پرنسپل جناب ظہور احمد صاحب مجبور تھے ۔ وہ مجھے چاہتے تھے ۔ انھوں نے مجھے بلا کر فرمایا کہ بمبئی یونیورسٹی سے تاریخ یا عربی میں ایم اے کرنے سے آپ کو اتنا فائدہ نہیں ہوگا ، بہتر ہوگا کہ آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے جائیں ۔ مزید تسلّی کے لیے ایک طویل سفارشی خط جناب ڈاکٹر ضیاء الدّین احمد صاحب کے نام تھا اور جس میں خاص طور پر ذکر تھا کہ میں نے کالج میں فرسٹ اور بمبئی یونیورسٹی میں تھرڈ پوزیشن حاصل کی ہے ۔ اس پر خود کو مجبور پا کر بے سرو سامانی کی حالت میں بادلِ ناخواستہ میں نے علی گڑھ کا رخ کیا ۔ لیکن وعسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم ۔ یہ تبدیلی آئندہ کے لیے نیک فال بنی ۔ جنّت نشاں جونا گڑھ کو چھوڑا تو ہمہ نشاں علی گڑھ کو اپنے سامنے پایا۔

ان دنوں داخلوں کا نظام خوب تھا۔ انتظامیہ کے دفاتر ایس ایس ہال کی دکھنی ونگ کے اوپر تھے ۔ داخلے سے وابستہ افسران ایک ہی صف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یکے بعد دیگرے سب کے یہاں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹے کے اندر اندر داخلے کے لوازمات پورے ہوگئے ۔ میں نے ایم اے کے لیے شعبہ عربی میں اور ایل ایل بی کے لیے شعبۂ قانون میں داخلے لیے ۔

رہائش کے لیے مجھے آفتاب ہوسٹل میں " سنگل روم " الاٹ ہوا ۔ معلوم ہوا کہ بی اے میں نمایاں کامیابی کی وجہ سے مجھے " اسکالر " شمار کیا گیا اور دستور کے مطابق اسکالرز ہوسٹل ، یعنی آفتاب ہوسٹل میں کمرہ دیا گیا۔

اس کے بعد پہلی کوہ پیما مشق شروع ہوئی ۔ چارپائی شہر سے خرید کر کے لائی تھی اور ساتھ ہی مچھر دانی ، کیوں کہ " ہیلی کاپٹر نما " مچھر برسرپیکار تھے ۔ شہر جانے کے لیے خاص الخاص سواری یکہ سے آشنائی ہوئی ۔ ایک مختصر سا تختہ جس پر ایک سواری کے بیٹھنے کی جگہ نظر آ رہی تھی اس پر ہم تین ساتھی شہر سے تین چارپائیاں لاد کر لائے ۔ بس یکہ نوجوانان قوم کی جوانی کا پاسبان تھا کہ شہر کے اونچے ریلوے پل کو پار کرتے ہوئے بال بال بچ جاتے تھے ۔ بہرحال اپنی خریدی ہوئی چارپائی پر سونے سے یقین محکم ہوا کہ ہم صحیح معنوں میں مسلم یونیورسٹی کے شہری ہیں۔ بعد میں شب تعارف (Introduction Night) کے ہوش ربا ہنگامے نے ہمیں صحیح معنوں میں علیگرین ، بنا دیا ۔

مجھے اپنے گذشتہ کالجوں اور مسلم یونیورسٹی کے انتظامی امور میں فرق نظر آیا ۔ ہر ہر محل و موقع پر انتظامیہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا ، یہاں پر انتظامیہ " پس پردہ " تھی اور اجتماعی زندگی کی وجہ سے توازن برقرار تھا ۔ وہاں پر نصابی تعلیم پر ہی توجہ مرکوز تھی ، یہاں پر پڑھنے والوں کے لیے غیر نصابی تربیت کے کئی مواقع موجود تھے ۔ ہر ہوسٹل کے اپنے مختصر جلسوں کے علاوہ یونیورسٹی کی سطح پر بڑے بڑے اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ مباحثوں ، مشاعروں اور کھیلوں کا ایک سلسلہ چلتا تھا، کرکٹ ، ہاکی اور فٹ بال کی ٹیموں کو اور خاص طور سے ان کے کپتانوں کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ رائڈنگ اسکول کے کپتان کے لیے جب گھوڑا لایا جاتا تھا تو لاٹ صاحب کا سماں نظر آتا تھا ۔ یونیورسٹی یونین کا الیکشن ایک آزاد ملک کی اسمبلی کے الیکشن کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ اور یونین کے صدر نشین کا ایک منفرد مقام تھا ۔ البتہ الیکشن میں کامیاب امیدوار اور ان کے ساتھیوں کو مبارک بادی کے تحائف اور ہارنے والے کے لواحقین کے لیے مرثیہ خوانی کے کوائف مہیا ہوتے تھے ۔ یہ روایت مسلم یونیورسٹی کی خاص الخاص روایت میں سے تھی ۔ یونیورسٹی کی حدود سے باہر ایک پر کشش سالانہ نمائش لگتی تھی جو طلبہ کے لیے خاص طور پر ایک بڑی تفریح گاہ بن جاتی تھی ۔ وہاں پر خان کے کباب پراٹھوں کی لذت اور خورجہ کے شلغم اچار کی خوشبو سے سال بھر کے کیلوریز کا اہتمام ہوجاتا تھا ۔

مسلم یونیورسٹی میں آکر مجھے کلاس روم کے تقدس کا احساس ہوا ۔ ایک قابل ستائش

روایت (جس کا پہلے والی درسگاہوں میں فقدان تھا) یہ تھی کہ کلاس روم میں طلبہ پڑھانے والے اساتذہ کا کلی طور پر احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ ہمہ تن گوش ہو کر لیکچر سنا جاتا تھا۔ اور اگر طوالت اور تکرار کی وجہ سے لیکچر بے مزہ ہوتا تو بھی ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کی جاتی تھی۔ مسلم یونیورسٹی میں آکر پہلی بار معلوم ہوا کہ پروفیسر کی اہلیت اور قابلیت کا معیار کیا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اچھا پڑھانے والے بعض اساتذہ دیکھے تھے لیکن ایسے بلند پایے کے پروفیسر نہیں دیکھے تھے جو اس وقت مسلم یونیورسٹی کے تدریسی اسٹاف کے روشن ستارے تھے۔ شعبۂ عربی کے پروفیسر استاذ عبدالعزیز میمن صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ شعبۂ فارسی کے پروفیسر ہادی حسن صاحب کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایران کے مختلف فارسی لہجوں میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ انگریزی میں بھی ایک اچھے خطیب کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ انگریزی میں شکنتلا کا ڈرامہ ڈرامائی انداز میں پیش کر کے مسحور کر دیتے تھے۔ جناب سیّد ظفر الحسن صاحب اپنے ڈھیلے ڈھالے جبے اور دراز ریش کے ساتھ شعبۂ فلسفہ (ایس ایس ایسٹ) کے سامنے آہستہ آہستہ خراماں ہوتے تھے تو فلسفے کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتے تھے۔ شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد حبیب صاحب کا نام نامی ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ کچھ پہلے انھوں نے سلطان محمود پر تنقیدی نگاہ سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا شہرہ ابھی باقی تھا۔ ان ہی کی ایما پر ان دنوں آل انڈیا ہسٹری کانگریس مسلم یونیورسٹی میں منعقد ہوئی۔ جس کا اسٹریچی ہال میں شاندار افتتاح ہوا۔ ڈاکٹر تارا چند الٰہ آباد سے تشریف لائے اور غالباً انھی نے صدارت فرمائی۔ شعبۂ اردو مباحثوں اور مشاعروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا حسرت موہانی اور دوسرے فضلاء اور شعراء تشریف لاتے تھے۔ ان دنوں شعبۂ اردو کے شگفتہ طبع استاذ رشید احمد صدیقی صاحب کی مزاح آمیز تحریروں کا چرچا تھا۔ شعبۂ طبیعیات کے پروفیسر چودھری صاحب صحیح معنوں میں سائنس داں مانے جاتے تھے۔ شعبۂ کیمیا کے حیدر خاں صاحب، حیوانیات کے بابر مرزا صاحب، نباتیات کے ڈاکٹر رفیق احمد خاں صاحب، اقتصادیات کے کریم لودھی صاحب اور جغرافیہ کے ڈاکٹر عباد الرحمن خاں (جو یونیورسٹی کے چیف پراکٹر بھی تھے) سب کے سب لائق فائق مانے جاتے تھے۔ ان دنوں یونیورسٹی کا انجینیرنگ کالج زیر تعمیر تھا اور جواں سال پروفیسر عبید اللہ خاں درّانی اپنی خاص مہارت سے مشینوں کو نصب کرنے میں مشغول تھے۔

طبیہ کالج بھی ان دنوں بن رہا تھا اور حکیم عبداللطیف صاحب اس کے سربراہ تھے۔ روزانہ باقاعدگی سے درس بھی دیتے تھے اور مطب بھی کرتے تھے۔ مجھے بھی ان کی تشخیص اور

تجویز کردہ جوارشات سے بہت افاقہ ہوا ۔ مجھے پہلے دن دیکھ کر فرمایا کہ کل قارورہ لیتے آئیں ۔ میں اس وقت اس خاص طبّی اصطلاح سے بے خبر تھا۔ ہوسٹل میں پہنچ کر احباب سے پوچھنے لگا کہ یہ قارورہ کیا ہوتا ہے ۔ قارورہ حکیم صاحب کی تشخیص کا جزو لاینفک تھا، لہٰذا سب سے یہی فرمائش کیا کرتے تھے ۔ احباب میں سے کسی نے کہا : کہ کہیں آپ حکیم عبداللطیف صاحب کے قارورہ کی تلاش میں تو نہیں ؟ میں ان کے مزاحیہ انداز کو سمجھ نہ سکا اور سنجیدگی سے جواب دیا کہ : ہاں انھی نے فرمایا ہے کہ کل قارورہ لیتے آنا ۔

اپنی عظمت کے باوجود اساتذہ طلبہ سے کلّی طور پر شفقت سے پیش آتے تھے ۔ میں نے عربی کتاب ، کلیلہ و دمنہ ، کے اصلی مآخذ پر انگریزی میں ایک لمبا چوڑا مقالہ لکھا اور شعبۂ انگریزی کے سربراہ انگریز پروفیسر فیلڈن صاحب کو بھیج دیا کہ یونیورسٹی کے انگلش میگزین میں چھپنے کے لیے منظور کیا جائے ۔ میں شعبۂ عربی کا طالب علم تھا تاہم انھوں نے مجھے بلایا ، بٹھایا اور بتایا کہ یہ تحقیقی نوعیت کا مقالہ ہے ، آپ اس کو اسلامک کلچر ، (حیدرآباد دکن) یا اور کسی ایسے جرنل میں چھپنے کے لیے بھیج دیں ۔ حقیقت میں یہ کوئی ایسا معیاری مقالہ نہ تھا اور نہ اس کی انگریزی ہی ٹھیک تھی ۔ لیکن یہ نہیں کہا بلکہ میری ہمّت افزائی کی ۔ شعبۂ عربی کی کلاس میں استاذ میمن صاحب سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ کے قدیم قلعے کا کتبہ محفوظ ہے اور اس وقت شعبۂ تاریخ کی دیوار پر نصب ہے ۔ چنانچہ میں شعبۂ تاریخ پہنچا اور وہاں پر جب کتبے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا تو پروفیسر حبیب صاحب وہاں سے گزرے اور میرا مدّعا سن کر بڑی شفقت سے کتبے کے بارے میں گفتگو کرنے لگے ۔ انھوں نے مجھے بٹھایا اور سندھ کے بعض تاریخی مقامات کے بارے میں سوالات کرنے لگے ۔ اتنے شفیق کہ اس ملاقات کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے میرے کرم فرما ہوگئے

آفتاب ہوسٹل میں قیام (۱۹۳۱ ۔ ۱۹۳۴) کے دوران طلبہ کی ہوسٹل لائف سے متعلق مجھے دو باتوں سے آشنائی ہوئی ایک طلبہ کی یاری دوستی اور تفنّنِ طبع کے لیے آپس میں چھیڑ چھاڑ جس کو ایکٹوٹی (Activity) کہا جاتا تھا ، اور دوم ان کے علمی ادبی مساعی ۔ یہ دونوں مشغلے دو سطحوں پر جاری و ساری تھے، ایک لوکل یعنی ہوسٹل کی سطح پر اور دوسرے نیشنل ، یعنی یونیورسٹی کی سطح پر ۔ شبِ تعارف ، یونیورسٹی سطح کی ایکٹوٹی تھی مگر ہر ہوسٹل میں اس کا اہتمام ہوتا تھا۔ اس طرح بعض صاحبان کو خاص الخاص اسماء اور القاب سے نوازا جاتا تھا جیسا کہ یونین کے صدر سعید انڈا ، جو اس وقت کا ایک مشہور نام تھا لیکن اس عرف پر سعید

صاحب نے کبھی برا نہیں مانا بلکہ اور زیادہ مشہور و معروف ہوگئے ۔ ایکٹوٹی کا جوہر اسی میں تھا کہ قطعاً برا نہ مانا جائے ۔ آفتاب ہوسٹل میں ایک نووارد حسین جمیل طالب علم بڑے ناز و انداز کے عادی تھے اور بہت کچھ بنتے تھے ۔ یار لوگوں نے ان کا نام "ہیٹر Heater " رکھ چھوڑا تھا لیکن یہ کوڈورڈ ، ہوسٹل تک محدود تھا ۔ علمی و ادبی مساعی کا مرکز آفتاب ہوسٹل کی شمالی ونگ کے اوپر وارڈن کا کوارٹر تھا۔ ان دنوں اس کے روح رواں خورشید الاسلام صاحب تھے جن کا تعلق شعبۂ اردو سے تھا اور غالباً ایم اے کر چکے تھے ۔ ان کے ہاں شعر و ادب کی محفلیں ہوتی تھیں ۔ شعبۂ اردو سے ایک شاندار میگزین شائع ہوا تھا جو خورشید الاسلام صاحب اپنے ساتھ لائے اور جس پر ایک نشست میں گفتگو ہوتی رہی ۔

آفتاب ہوسٹل میں بمشکل ایک سال میں مُشرّف بشرف " اسکالر " رہا۔ مجھے سنگل روم میں تنہائی محسوس ہوتی تھی ۔ دوسری تکلیف کھانے کی تھی ۔ میں دیر تک شعبۂ عربی میں بیٹھ کر پڑھتا تھا اور پیچھے بیرا کھانا کمرے میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا ، جو سردیوں کے موسم میں یخ ہوجاتا تھا اور کھایا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ یونیورسٹی کا جمہوری کھانا تھا جو محمود و ایاز کے لیے یکساں تھا۔ بعض طلبہ مل کر انگیٹھیاں رکھتے تھے اور عطا شدہ رزق کو گرم کر کے کھانے کے قابل بناتے تھے ۔ یا پھر اپنی ایڈیشنل ڈشز ، پکاتے تھے۔ اس مشق سے بعض تو ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے بھلے باورچی بن جاتے تھے ۔ بہرحال میری درخواست پر دوسرے سال مجھے پکّی بارک (ایس ایس ایسٹ کمرہ نمبر ۱۶) میں جگہ مل گئی ۔ جہاں سندھ کے غلام مصطفیٰ شاہ پہلے سے مقیم تھے ۔ ہم نے مل کرا نگیٹھی خرید لی ۔ کھانا گرم کرنا میرے ذمے تھا اور بیرے کو بلا کر کھانا منگوانا ان کے ذمے ۔ مگر وہاں کے بیرے طلبہ سے کچھ زیادہ ہی خود دار تھے اور اپنی مرضی سے ہی کام کرتے تھے۔ ہمارا بیرا مجید تھا۔ کسی نزدیکی گاؤں کا رہنے والا ۔ دھوتی لنگوٹی باندھتا تھا اور سر پر گاندھی جی والی سفید ٹوپی اوڑھتا تھا۔ غلام مصطفیٰ شاہ نے ان کو " خان بہادر " کے لقب سے نوازا اور بجائے " مجید " کے ان کو " خان بہادر " کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ تاہم وہ اپنے کردار کے ساتھ اپنی رفتار کا بھی خود ہی مالک تھا۔ غلام مصطفیٰ جب ان کو چیخ کر بلاتے تھے اور پوری فضا خان بہادر کی آواز سے گونج اٹھتی تھی تب جا کر کہیں مجید میاں نمودار ہوتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی کی ایک اہم اور قابل فخر روایت جو اس وقت تک چلی آ رہی تھی وہ یہ تھی کہ مختلف مکاتیب فکر کے زعماء کا احترام کیا جائے ۔ لہٰذا علماء و فضلاء اور سیاسی رہنماؤں میں سے اگر طلبہ کسی کو مدعو کرتے تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہوتی تھی ۔ اس وقت طلبہ میں

مسلم لیگ کے رہنما قائد اعظم محمد علی جناح صاحب کی مقبولیت کا رجحان بڑھ رہا تھا ۔ خاکسار تحریک بھی مقبول تھی ۔ کچھ طلبہ اور اساتذہ نیشنل کانگریس کے حامی تھے۔ ان رجحانات کے باوجود طلبہ میں کوئی تفریق یا تنازع نہیں ہوا۔ میں خاکسار ہونے کے باعث جو تا گڑھ سے نکلا تھا لہذا مسلم یونیورسٹی میں پہنچتے ہی خاکسار کا سرگرم رکن بن گیا۔ اس وقت یو۔ پی کے ایک معزز پٹھان خاندان کے لائق فائق فرزند اور یونیورسٹی کے طالب علم محترم محمد افضل خاں یونیورسٹی کے خاکساروں کے سالار اعلیٰ تھے اور یونیورسٹی کے چاق و چوبند دستوں کی پریڈ کا سلسلہ جاری تھا۔ کوئی ممانعت یا پابندی نہیں تھی ۔ یونیورسٹی کے خاکساروں کا ایک بڑا سہ روزہ اجتماع فوجی کیمپ کی صورت میں کول کے قدیم قلعے (یونیورسٹی کے شمال میں) ہوا جو فوجی نظم و نسق کا ایک کامیاب مظاہرہ ثابت ہوا، جس سے حوصلے بڑھے۔ مسلمانان ہند میں عملی زندگی کے ابھرتے ہوئے سورج کی کرنیں نظر آنے لگیں ۔ خاکساروں کے قائد علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی نے مسلم لیگ کے مقتدر رہنما جناح صاحب کو اشتراک عمل کی پیش کش کی ۔ ادھر جناح صاحب جب مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے تو خاکسار طلبہ نے ان کو اسٹریچی ہال کے سامنے سلامی دی لیکن سامراجی طاقت بھی سرگرم عمل تھی ۔ خاکساروں پر برطانوی حکومت نے تشدد کیا اور لاہور میں ان پر گولی چلی ۔ پھر بھی تحریک کی مقبولیت بڑھتی رہی تا آنکہ یہ وحشت ناک خبر آئی کہ کسی خاکسار نے بمبئی میں جناح صاحب پر حملہ کر دیا ہے ۔ ہم سب کو یقین تھا کہ کوئی خاکسار ایسی حرکت نہیں کرسکتا اور یہ کام حکومت کے کسی ایجنٹ کا ہے جو ہوسکتا ہے خاکساروں کی صف میں شامل ہو ۔ ایسی بگڑتی ہوئی فضا میں بھی مسلم یونیورسٹی میں زعما کے عزت و احترام کی روایت قائم رہی ۔ یونیورسٹی یونین کے جلسوں میں تو خاص طور پر اس روایت کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ (غالباً) بمبئی کے کامیاب مسلم لیگی اجلاس کے بعد جب نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب کو یونین کی طرف سے مدعو کیا گیا تو مسلم لیگی ، خاکسار اور دوسرے سب طلبہ نے مل کر ان کا یونین ہال میں خیر مقدم کیا۔ نوابزادہ صاحب کے ساتھ مولانا عبدالحامد خاں بھی تشریف لائے جنھوں نے اپنی تقریر میں خاص طور پر خاکساروں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ۔ لیکن ان کو خاموشی سے سنا گیا تا آنکہ انھوں نے جوش میں آکر کہا کہ علامہ مشرقی انگریز کے جاسوس ہیں ۔ ایسا الزام مسلم یونیورسٹی کے منافی تھا چنانچہ اس پر راقم نے پائنٹ آف آرڈر ، اٹھایا ۔ لیکن صدر نشین (طالب علم) نے ، اوور رول ، کر دیا کہ اوپر گیلری میں سے ، پائنٹ آف آرڈر نہیں اٹھایا جاسکتا ۔ اس پر نیچے ہال میں بیٹھے ہوئے طلبہ میں سے

بعض نے یکساں طور پائنٹ آف آرڈر، اٹھائے جو صدر نشین نے قبول کرلیا اور طالب علم نے غلام محمد بھٹی سے کہا کہ وہ آکر اپنا نقطہ نظر پیش کریں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹیج پر پہنچے اور کہا کہ ہمارے معزز مہمان نے جو تنقید کی اس پر ان پر کوئی حرف نہیں آتا لیکن ایک معزز مسلم رہنما (علامہ مشرقی) پر جو انھوں نے الزام لگایا ہے وہ ہماری روایات کے خلاف ہے۔ مولانا اپنے الفاظ واپس لیں اور معذرت کریں۔ سب طلبہ نے تائید کی اور مولانا نے معذرت کے الفاظ دہرائے۔ یہ ایک مثال ہے اس قابل فخر روایت کی جو اس وقت تک چلی آ رہی تھی۔ کچھ بعد میں مجھے یونیورسٹی میں خاکساروں کے سالار اعلیٰ کے فرائض سرانجام دینے پڑے۔ ان دنوں علامہ صاحب شہر علی گڑھ تشریف لائے۔ میں ان سے ملا اور بتایا کہ مسلم یونیورسٹی میں مختلف مکاتیب فکر کے احترام کی روایت چلی آ رہی ہے اور میں مسلم لیگی اور خاکسار تحریک کے سلسلے میں ایک اور بات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان دنوں یو۔ پی کے خاکساروں میں سے بعض دانشور تحریک میں فکری انقلاب لانا ضروری سمجھتے تھے۔ ان میں جناب پروفیسر کرار حسین صاحب اور جناب اختر حمید خاں صاحب پیش پیش تھے۔ کرار صاحب میرٹھ کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ اختر حمید خاں (آئی سی ایس) بنگال سروس میں ڈپٹی کمشنر تھے جہاں سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ آگئے تھے اور انھوں نے خدمت خلق کے ذریعے محنت کش طبقے میں رہ کر ان کو سربلند کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ذاتی طور پر میرے دل میں ان دونوں صاحبوں کے لیے بے حد عزت و محبت تھی۔ اختر حمید خاں صاحب زمین پر بیٹھ کر تالے بناتے تھے۔ کرار صاحب کبھی کبھار علی گڑھ آ جاتے تھے۔

ان کی سربراہی میں ماہانہ انگریزی اخبار Radiance کا اجراء ہوا اور کرار صاحب اپنے قلم سے اس میں خوب سے خوب تر اسلامی فکری اداریے لکھتے تھے۔ جب میں یونیورسٹی میں خاکساروں کا سالار اعلیٰ تھا تب انتظامیہ کی طرف سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی۔ طلبہ کے لیے ذہنی و فکری آزادی اور مثبت سیاسی عمل کے دروازے کلی طور پر کھلے ہوئے تھے۔ البتہ انگریز سرکار کے جاسوسوں نے مجھے گھیر لیا اور میرا سایہ بن گئے۔

خاکسار تحریک میں حصہ لینے، ہنّوٹ کھیلنے، تیرنے اور احباب کے ساتھ گھومنے کے ساتھ ساتھ کلاسوں اور کتابوں پر میری پوری توجہ رہی۔ بعض اساتذہ کے لیکچر پر از معلومات ہوتے تھے۔ شعبہ قانون کے سربراہ جناب خسرو صاحب، رومن لا، پڑھاتے تھے اور اپنے اسلوب و اظہار میں بے مثال تھے۔ وہ کلی طور پر بہرے تھے، لہذا اس طرح سہل انداز میں

مسائل کو پیش کرتے اور سمجھاتے کہ تعقید لفظی و معنی کا شائبہ نہ رہے۔ ان سے سوال کرنے کی نوبت ہی پیش نہیں آتی تھی کیوں کہ ان کے طریقۂ اظہار سے مسائل خود بخود حل ہوجاتے تھے طریقہ تعلیم و تعلّم کے اعتبار سے وہ ایک باکمال استاد تھے۔ سیّد محمود رضا صاحب انڈین پینل کوڈ پڑھاتے تھے اور کچھ مزاحیہ انداز میں اشاروں کنایوں سے کلاس کو تفریح گاہ بنا دیتے تھے۔ منظور صاحب قانون شہادت پڑھانے میں صنعت تکرار سے کام لیتے تھے اور توضیحات کو بار بار دہراتے تھے، اتنا کہ پھر کمرے میں جا کر پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ البتہ عبدالسّلام صاحب غالباً قانون عہد و پیمان (کانٹریکٹ ایکٹ) پڑھاتے تھے اور سست رفتار تھے، تاہم اساتذہ کے ادب و احترام والی روایت برقرار رکھتے ہوئے ان کو صبر کے ساتھ سنا جاتا تھا۔

شعبۂ عربی کے صدر عالی قدر پروفیسر استاذ عبدالعزیز المیمنی (میمن صاحب) تھے جو علم و فضل کے روشن مینار تھے۔ وہ درسی کتاب کی عبارت تو سمجھاتے لیکن اس سے آگے بڑھ کر اس عبارت کے مآخذ اور سیاق و سباق بیان فرماتے۔ اگر درس میں کہیں کوئی شعر آجاتا تو شاعر کے دیوان کا حوالہ دے کر اس سلسلے کے سب اشعار پڑھ کر سناتے۔ ایک بار انھوں نے رؤبۃ بن العجاج کا پورا ارجوزہ پڑھ کر سنا دیا۔ ان کے لیکچر کا انداز محققانہ ہوتا تھا، ٹیکسٹ تک محدود رہنے کے بجائے وہ وسیع معلومات مہیا کرتے تھے۔ شعبۂ عربی میں ہمارے دوسرے استاذ مولانا بدرالدین علوی تھے جو قدیم روایتی انداز میں پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر عابد علی اوکسفورڈ کے ڈی فل تھے اور انگریزی میں لیکچر دیا کرتے تھے۔ اس وقت سیّد محمد یوسف کو ڈاکٹری کی ڈگری مل چکی تھی، انھوں نے استاذ المیمنی کی رہنمائی میں اُموی دور کے مشہور جرنیل مہلب بن ابی صفرہ پر مقالہ لکھا تھا۔ خورشید احمد فارق ڈاکٹریٹ کے لیے زیاد بن ابیہ پر مقالہ مرتب کر رہے تھے۔ شعبۂ عربی میں کُلّی طور پر علمی ماحول تھا اور ہم نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اس وقت میرا مدعا وکیل بننے کا تھا تاکہ آزادانہ طور پر قومی آزادی کے لیے کام کر سکوں۔ لہٰذا شعبۂ قانون کے نصاب پر کچھ زیادہ توجہ رہی۔ ایم اے کے مضامین کو بھی کافی کچھ سمجھنے کی کوشش کی مگر ایم اے فائنل وائیوا (Viva) میں مجھے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب ممتحن تھے۔ مجھے ایک عبارت پڑھنے کو کہا جس میں لفظ "سکان" آیا تھا۔ سیّد صاحب نے "سکان" کے معنی پوچھے۔ میں نے اس لفظ کے معنی پر کبھی سوچا بھی نہ تھا کیوں کہ سندھی میں بھی سکان ہی کہا جاتا ہے۔ میں نے بتایا کہ یہ لکڑی کا ایک آلہ ہے جس سے کشتی کا رخ موڑ لیا جاتا ہے۔ لیکن سیّد صاحب نے فرمایا کہ اس کو کیا کہا جاتا ہے۔ میں اتنا

کنفیوز ہوگیا کہ انگریزی میں بھی نام بتا نہ سکا، اردو لفظ سے تو میں نابلد تھا۔ سیّد صاحب نے شفقت سے کہا کوئی بات نہیں، اس کو "پتوار" کہا جاتا ہے۔

اس تجربے کے بعد مجھے بین خوف و رجا، امتحان کے نتیجے کا انتظار رہا۔ ایل ایل بی کا نتیجہ فرسٹ ڈویژن میں آیا تو وکیل بننے کے امکانات روشن ہوئے۔ مگر بعد میں ایم اے کا نتیجہ، فرسٹ ڈویژن فرسٹ، میں آیا جس نے آئندہ کا رخ بدل دیا۔ اس وقت ایسی کامیابی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تین سال تک پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ استاذ میمن صاحب نے خوش ہو کر فرمایا کہ خورشید احمد صاحب اپنا کام مکمل کرنے والے ہیں اور اب آپ کی باری ہے۔ آپ رک جائیں اور پی ایچ ڈی کے لیے "السند تحت سیطرۃ العرب" پر کام کریں۔ میں نے آمنّا و صدقنا کہہ دیا۔ اس طرح مسلم یونیورسٹی میں تقریباً تین سال (۱۹۴۳ء - ۱۹۴۵ء) رہنے کا موقع ملا۔

اس پورے عرصے میں یونیورسٹی کے اندر میرے شب و روز کی زندگی کا بڑا حصہ مطالعے میں گذرا، اس قدر کہ گویا دنیا و مافیہا سے کنارہ کشی کرلی تھی۔ میرے اس مطالعے مین قبلہ استاذ المیمنی سے استفسار اور استفادہ کو اولیت حاصل تھی۔ لہٰذا صبح و شام ان سے ملنے کے لیے وقت نکالتا رہتا تھا جب بعض زعما باہر سے آتے اور یونیورسٹی میں خطاب فرماتے تو ان کو سننے کے لیے ضرور جایا کرتا تھا۔ چنانچہ مولانا حسرت موہانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علّامہ سید سلیمان ندوی اور نواب بہادر یار جنگ کو سننے کا شرف حاصل ہوا۔ نواب صاحب موصوف اردو میں خطابت کے بادشاہ تھے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں خاص طور پر کشمیر کا ذکر کیا اور اس حوالے سے جب کشمیریوں کے حسن کو اپنے چند جملوں کا موضوع بنایا تو بیان و معانی کی لطافت سے مسحور کر دیا۔ رحمہ اللہ

مطالعے اور تحقیق کے سلسلے میں استاذ محترم سے قریب تر ہونے کا شرف حاصل ہوا اور انھوں نے اپنی شفقت سے نوازا۔ ڈپارٹمنٹ میں خواہ گھر پر جب ضرورت ہوتی تھی ان سے جا کر مستفید ہوتا تھا۔ میرے لیے وقت نکالتے تھے حالانکہ ان دنوں وہ خود تحقیق و تصنیف میں مشغول تھے۔ ایک دن بغیر پیشگی اطلاع کے "میمن منزل" پہنچا اور نوکر کو اطلاع دی تو اندر اپنے کتب خانے میں بلالیا۔ تہمد باندھے ہوئے چٹائی پر بیٹھے تھے، اردگرد کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور حوالے تلاش کر رہے تھے۔ ان دنوں وہ بغدادی کی کتاب "خزانۃ العرب" پر حواشی لکھ رہے تھے۔ دو تین جلدیں پہلے چھپ چکی تھیں۔ فرمایا کہ آپ ہر وقت آسکتے ہیں لیکن بہتر

ہو گا کہ روزانہ شام کو آئیں اور ٹہلنے میں میرے ساتھ ہوجائیں، پھر اس وقت جو کچھ پوچھنا چاہیں پوچھ لیں ۔ استاذ محترم ہر شام پابندی وقت سے نابیناؤں کے اسکول نابینا ماسٹر سعید احمد کی بیٹھک پر آجاتے تھے، جہاں پر دو ایک اور اصحاب بھی پہنچ جاتے تھے اور حقّے کا دور چلتا تھا ۔ استاذ حقّے کے دلدادہ تھے۔ گھر پر حقّہ تیار رہتا تھا اور وہ خود بڑی احتیاط سے حقّہ تیار کرتے تھے ۔ نابینا ماسٹر کے ہاں شام کو حقّہ پیتے تھے لیکن وہ ان کے اپنے معیار کا نہیں تھا ۔ ان قریبی صحبتوں میں استاذ کی گفتگو سن کر محسوس ہوا کہ وہ شگفتہ طبع کے مالک تھے اور ان کی غیر رسمی گفتگو میں اعلیٰ ظریفانہ انداز ہوتا تھا ۔ ایک دن بدستور ہم قلعے کی طرف والے راستے پر جا رہے تھے، شدید گرمی کا دن تھا ۔ شیروانی کے نیچے پاجامہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا ۔ اس وقت ہمارے سامنے ایک لالہ جی جا رہے تھے اور دھوتی لنگوٹی باندھے ہوئے تھے ۔ دھوتی کا کنارہ ایک ہاتھ میں دبا رکھا تھا اور ہاتھ کو ہلاتے جاتے تھے جس سے دھوتی کے اندر کافی کشادگی آجاتی تھی ۔ اس پر میں نے استاذ سے عرض کیا کہ قبلہ پاجامے کی نسبت دھوتی کافی کھلی ہوئی اور ہوادار ہے ۔ جواب میں تصدیق فرماتے ہوئے میسون بنت بجدل (اعرابن بیوی جس کو امیر معاویہ نے محل میں آرام سے رکھا تھا لیکن وہ اپنے بادیہ نشینوں کے ہوادار گھروں کو یاد کرتی تھی) کا مندرجۂ ذیل شعر پڑھ کر کہا کہ یہ میسون بنت بجدل کے اس گھر کی مانند ہے جس میں ہوائیں چلتی رہتی ہیں

لبيت تخفق الارياح فيه

احب الى من قصر منيف

مطالعے اور تحقیق کے سلسلے میں مجھے استاذ المیمنی سے دو طرح کی رہنمائی حاصل ہوتی تھی ۔ ایک تو وہ خود ہر مسئلے میں رہنمائی فرماتے تھے، دوم یہ کہ میری گذارش پر دوسرے فضلاء کو سفارشی خط لکھ کر دیا کرتے تھے کہ میری مدد فرمادیں ۔ خود اپنی طرف سے ان کی کرم فرمائی تھی کہ انھوں نے مجھے اجازت دے رکھی تھی اور چابی میرے حوالے کر دی تھی کہ میں ان کے ذاتی کتب خانے کو دیکھوں اور جی بھر کر استفادہ کروں ۔ بات یہ تھی کہ السند والہند کے متعلق مجھے تاریخی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں سے بھی حوالے ملنے لگے ۔ اس پر تہیہ کرلیا کہ لٹن لائبریری میں جو بھی عربی و فارسی کتابیں محفوظ ہیں ان سب کو دیکھوں گا ۔ بہرحال جو کتاب دیکھ لیتا تھا اس کے خاتمے پر باریک حروف میں " عثمان السندی " لکھ دیا کرتا تھا تاکہ دوبارہ دیکھنے کی زحمت نہ ہو ۔ استاذ نے دو تین کتابوں پر ایسے اندراجات دیکھ لیے تھے اور

مطمئن تھے کہ میں کام کر رہا ہوں۔

باہر کے فضلا سے استفادہ کرنے میں استاذ محترم نے میری بہت کچھ مدد فرمائی۔ قاضی احمد میاں اختر (جونا گڑھ)، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ (سندھ)، پروفیسر محمد شفیع (لاہور) اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) کو میرے سلسلے میں خطوط لکھے۔ انھوں نے رامپور کے ریاستی کتب خانے کو دیکھنے کی ترغیب دی اور وہاں کے مہتمم جناب امتیاز علی صاحب عرشی کو ایک خاص خط لکھا جس پر نہ صرف مجھے کتب خانے سے استفادہ کرنے کی اجازت ملی بلکہ معزز مہمان کے طور پر نواب صاحب کے ریاستی مہمان خانے میں رہائش کا انتظام بھی ہوا۔ عرشی صاحب کی رہنمائی میں کتب خانے سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ ان دنوں ایک مقتدر شیعہ عالم سید رضی لکھنوی بھی ریاستی مہمان خانے میں مقیم تھے اور تفسیر قرآن لکھ رہے تھے۔ فلسفہ اور منطق میں یگانہ تھے انھوں نے مجھے وحدۃ الشہود کے مفاہیم سمجھائے اور خوب سمجھائے۔

جب بھی کوئی فاضل محقق مسلم یونیورسٹی میں آتا تھا اور استاذ المیمنی سے ملتا تھا تو مجھے بلالیتے تھے اور میرا تعارف کروا کر مجھے ان کی خدمت میں لگادیتے تھے تاکہ مجھے ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملے۔ اس طرح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور ڈاکٹر زاہد علی سے (جو حیدر آباد دکن سے تشریف لائے تھے) قریبی صحبتوں میں استفادہ کرسکا۔ ڈاکٹر زاہد علی نے ان دنوں اسماعیلی مذہب کی حقیقت کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب مرتب کرلی تھی جس کا مسوّدہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ میں چوتھی صدی ہجری کے "السند" میں فاطمی دعوت کو سمجھنا چاہتا تھا۔ میری استدعا پر ڈاکٹر زاہد علی نے وہ مسوّدہ میرے حوالے کر دیا جو تین روز تک میرے پاس رہا۔ اس میں فاطمی فقہ کی بعض قلمی اور نایاب کتابوں میں سے نقل کیا گیا مواد تھا جس میں تاویل پر بعض انوکھی عبارتیں موجود تھیں۔ میں نے کافی کچھ مواد نقل کیا جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔

غالباً ۱۹۴۴ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے انعقاد کی خبر آئی اور مسلم یونیورسٹی سے شعبۂ عربی کو اس کانفرنس میں شرکت اور نمائندگی کا شرف حاصل ہوا۔ استاذ المیمنی اور ان کے ساتھ ڈاکٹر سید محمد یوسف کے جانے کا فیصلہ ہوا تو میں نے گذارش کی کہ کچھ طلبہ بھی ساتھ ہوجائیں تاکہ ان کو بنارس ہندو یونیورسٹی جیسی بڑی درسگاہ کو دیکھنے کا موقع مل سکے۔ اس گذارش کو استاذ محترم نے بڑی شفقت سے مان لیا اور میرے علاوہ تین اور طلبہ کے لیے سفارش کر دی جو یونیورسٹی سے منظور ہوگئی۔ جب کالی شیروانیوں میں

ملبوس یہ قافلہ بالآخر ہندو یونیورسٹی پہنچا تو سب کی نگاہیں ہم پر مرکوز ہو گئیں ۔ ہمیں ایک ہوسٹل کے وسطی ہال میں گراؤنڈ فلور پر ٹھہرایا گیا ۔ ہم نے باجماعت نماز ادا کی تو دوسری منزل پر رہنے والے طلبہ اوپر بالکنی میں آکر دیکھنے لگے ۔ عشاء کے وقت جب ہمارے ایک نڈر ساتھی غلام محمد بھٹی نے بلند آواز سے اذان دے ڈالی تو بالکنی میں مجمع اور بڑھ گیا لیکن ہوسٹل کے ہندو طلبہ نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کیا کہ چار روز تک وہ بھٹی صاحب کی اذانیں بہ آواز بلند سنتے رہے اور انھوں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی ۔ دن کو کانفرنس کی نشستوں میں شمولیت اور شام کو شہر کی سیر ۔ الاستاذ المیمنی نے غالباً المفضل الضبی کی مشہور تالیف المفضلیات پر اپنا بصیرت افروز مقالہ پیش کیا تھا جس سے یہ انکشاف ہوا کہ اس کتاب میں شامل نظمیں غالباً امام ابراہیم باخرا نے منتخب کی تھیں ۔ میں نے ہندو یونیورسٹی کے استاد لالہ مہیش پرشاد صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو سے بھی استفادہ کیا ۔ جو عربی میں مولوی فاضل تھے اور عرب سیاحوں کی تصانیف سے بخوبی واقف تھے ۔ انھوں نے مہربانی فرما کر سلیمان تاجر کے سفر نامے کا پیرس میں چھپا ہوا ایڈیشن عاریۃً میرے حوالے کر دیا جو میں اپنے ساتھ لایا اور نقل کر کے اصل کتاب انھیں واپس بھیج دی ۔ کانفرنس کے دوران ایک دن ہم نے " صبح بنارس " دیکھنے کی ٹھان لی ۔ ایک دن پہلے ہوسٹل سے رکشاؤں کی سواری اور پھر گنگا ندی پر دو چھوٹی کشتیوں کی سواری کا انتظام کرلیا ۔ دوسرے دن علی الصباح بڑے جگن ناتھ مندر کے گھاٹ پر پہنچے جہاں پر بھٹی صاحب نے اپنے معمول کے مطابق اذان دے کر بڑے اطمینان اور دل جمعی سے نماز فجر ادا کی ۔ پھر کشتیوں میں بیٹھ کر گنگا کے وسط تک گئے جہاں سے مغرب کنارے شہر بنارس کا ہوش ربا خطِ آسمانی Sky-line نظر آنے لگا ۔ اور سورج طلوع ہوا تو شہر کی گنجان آبادی اور عمارت کے نقوش نمودار ہوئے ۔ ہم ایک شعر کو تھوڑی ترمیم سے دہراتے رہے کہ ۔

ذرا اس سمت میں دل سیر کرلے
دوبارہ پھر قدم آئے نہ آئے

بنارس جانے سے کافی عرصہ پہلے استاذ سے میں نے گذارش کی کہ آپ تو حبیب الرحمان شروانی کے کتب خانے کا اکثر ذکر فرماتے ہیں ۔ اگر ممکن ہو تو میں وہاں جاکر کتب خانے کو دیکھ لوں ۔ ان دنوں نواب صاحب کا قیام علی گڑھ میں تھا لیکن وہ اپنے گاؤں حبیب گنج بھی جایا کرتے تھے ۔ استاذ نے فرمایا کہ ہاں یہ ممکن ہے ۔ جب نواب صاحب حبیب گنج

جائیں تو آپ بھی ان کے ساتھ جائیں۔ ۴۴۔۱۔۱۸ کو نواب صاحب کے نام ایک خط قلم بند کر کے بھیج دیا۔ لیکن نواب صاحب پہلے ہی حبیب گنج جا چکے تھے۔ اس کے بعد اس سمت میں مزید پیش رفت نہ ہو سکی۔

لیکن نواب صاحب کے ہم نام ایک اور حبیب الرحمٰن تھے جن سے علی گڑھ میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ تھے پنڈت حبیب الرحمٰن شاستری جو یونیورسٹی ہائی اسکول میں اردو کے استاد تھے۔ انھوں نے سنسکرت میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اس مناسبت سے پنڈت کے لقب سے ملقّب تھے۔ ساٹھ سال کے قریب ان کی عمر ہوگی۔ وہ ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ پہلی ملاقات میں جب ان کو معلوم ہوا کہ میں سندھ سے ہوں تو بڑی شفقت سے پیش آئے۔ بتایا کہ ان کا خاندان حضرت عثمان سندھی کے سلسلے سے منسلک رہا ہے جن کا مزار لکھنؤ کے اطراف میں کہیں ہے۔ پنڈت حبیب الرحمٰن صاحب عالم فاضل تھے اور ان سے میری عقیدت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے کہا قبلہ مجھے افسوس ہے اور ہمیشہ کے لیے رہے گا کہ میں نے سنسکرت کیوں نہ پڑھی۔ اس پر میری تسلّی کے لیے فرمایا کہ سنسکرت ادب میں فلسفۂ رس یا انبساط جو کہ علم بدیع و معانی میں سے ہے مطالعے کے قابل ہے۔ اور اس پر میں نے سلیس اردو میں ایک کتاب لکھی ہے جو آپ کو دے رہا ہوں۔ آپ اس کو پڑھیں تاکہ اس پر مزید گفتگو ہو سکے۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ اور جب کتاب پڑھی تو محسوس کیا کہ اردو میں یہ مختصر کتاب فلسفۂ انبساط (رس) پر ایک شاہکار تصنیف ہے۔

قبلہ استاذ الیمنی کی قربتی صحبتوں میں مسلسل رہنمائی سے اور ساتھ ہی عربی و فارسی مصنّفات اور مستشرقین کی لکھی ہوئی کتابوں کے مطالعے سے ۱۹۴۵ء کے آغاز تک مجھے اپنے آپ میں اتنی استعداد محسوس ہوئی کہ کچھ لکھوں تو لکھ سکوں گا۔ چنانچہ اموی دور کے آخر میں ایک باغی قائد منصور بن جمہور کے السند پر تسلّط کے سلسلے میں کچھ لکھا مگر محسوس ہوا کہ میری انگریزی بہت کمزور ہے۔ اس وقت شعبۂ تاریخ کے شیخ عبدالرشید صاحب نے میری مدد فرمائی اور مسوّدے کی تصحیح کی۔ ساتھ ہی تحقیقی مواد سے متاثر ہو کر آئندہ کے لیے بھی اعانت کا وعدہ فرمایا۔ ان دنوں اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) میں کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر جناب محمد اسحٰق صاحب کا مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے "فتوح البلدان" کے مصنّف بلاذری کے اس بیان کو غلط قرار دیا تھا کہ دیبل (سندھ)، بھروچ (گجرات) اور تھانہ (نزد بمبئی) پر مسلمانوں کا پہلا بحری حملہ حضرت عمر کی خلافت میں سنہ ۱۵ ہجری میں ہوا۔ اس کے برعکس، میں اپنے

مطالعے کے دوران اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مورخ بلاذری کمال حد تک ثقہ ہیں اور ان کے حوالوں کو رد کرنا یا جھٹلانا آسان نہیں۔ لہذا میں نے فاضل پروفیسر کے دلائل کا جائزہ لینا شروع کیا اور ان کو رد کرتے ہوئے بلاذری کے حوالے کی تصدیق اور تائید میں ایک مقالہ تیار کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پہلے مقالے کی نسبت اس مقالے میں میری انگریزی کچھ بہتر تھی تاہم اپنے استاد بھائی سیّد محمد یوسف سے گذارش کی جنھوں نے پورے مقالے کو پڑھ کر میری کمزور عبارتوں کی تصحیح فرمائی۔ اس کے بعد جب یہ مقالہ اسلامک کلچر کے ایڈیٹر کو بھیجا گیا تو انھوں نے اشاعت کے لیے قبول کر لیا جس پر مجھے بہت بہت خوشی ہوئی اور اطمینان ہوا کہ میں اپنا ڈاکٹریٹ کی ڈگری والا مقالہ خیر خوبی سے لکھ سکوں گا۔ لیکن یہ مقصد پورا نہ ہوسکا۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ اور اولڈ علیگیرین جناب پیر الٰہی بخش صاحب کی کوشش سے کراچی میں مسلمانان سندھ کا پہلا اعلیٰ تعلیمی ادارہ سندھ مسلم کالج، قائم ہوا اور مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی کو اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ انھوں نے مجھے ترغیب دی کہ میں کالج میں آجاؤں۔ استاذ المیمنی نے فرمایا کہ اگر آپ وہاں گئے تو آپ کا مقالہ رہ جائے گا۔ میں رک گیا۔ مگر شاید ڈاکٹر امیر حسن صاحب نے پیر الٰہی بخش صاحب کو مشورہ دیا اور انھوں نے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدّین صاحب کے نام خط بھیجا کہ اس نئے کالج کے لیے اسٹاف کی ضرورت ہے اور مجھے کالج میں آنے کی ترغیب دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ خط استاذ محترم کو بھیج دیا جس پر انھوں نے فرمایا کہ اگر ان کو آپ کی ضرورت ہے تو پھر آپ جائیں۔ مجھے لیکچرر بننے پر جتنی خوشی ہوئی اس سے کچھ زیادہ ہی استاذ محترم سے مفارقت اور مسلم یونیورسٹی سے رخصت ہونے پر رنج ہوا۔

اس سرگذشت کے شروع میں مسلم یونیورسٹی کی ان دنوں کی انتظامیہ کے بارے میں میرے ایک ذاتی تاثر کا ذکر آچکا ہے کہ انتظامیہ پس پردہ تھی اور یونیورسٹی میں اجتماعی زندگی کی دیرینہ روایت سے طلبہ میں نظم و نسق قائم تھا۔ باوجود اس کے کہ انتظامیہ گویا غیر مرئی Invisible تھی تاہم بے خبر نہ تھی۔ کم از کم وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدّین صاحب کلی طور پر باخبر و بیدار تھے۔ وہ سینیر طلبہ میں سے اکثر کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور بعض کو ضرورت کے وقت اپنے ہاں بلا کر کوئی نہ کوئی کام ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ داخلے کے بعد میری ان سے دو سال تک کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ایک دن غیر رسمی طور پر ڈاکٹر صاحب ایس ایس ایسٹ (پکی بارک ہوسٹل کی مشرقی ونگ) کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ ہم چند طلبہ وہاں پر

کھڑے تھے تو آکر ہمارے سامنے رکے۔ ہم نے سلام کیا اور انھوں نے خیریت پوچھی ۔ وہ دن سخت سردی کے دن تھے ۔ ڈاکٹر صاحب ایک موٹی شیروانی پہنے ہوئے تھے جس میں اندر سے روئی بھری ہوئی تھی ۔ انھوں نے خاص طور پر مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ بھی میری شیروانی جیسی شیروانیاں بنوالیں ۔ اس کے اندر روئی بھری ہوئی ہے اور اس سے سردی نہیں لگتی ۔ پھر یہ سستی بھی ہے اور بنوانے میں زیادہ کچھ خرچ نہیں ہوتا ۔

باوجود اس کے کہ ڈاکٹر صاحب سے میری کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی، وہ غائبانہ طور پر میرے متعلق کچھ نہ کچھ جانتے تھے کہ ۱۹۴۳ء - ۱۹۴۴ء کے دوران انھوں نے دو بار مجھے بلایا ۔ پہلی بار ان کا پیغام ملا تو حیرانی ہوئی کہ وائس چانسلر صاحب مجھے کیوں بلا رہے ہیں ۔ جاکر ملا تو فرمایا کہ : ریاست جوناگڑھ کے دیوان (وزیر اعظم) شیخ عبدالقادر صاحب جو اصل سندھ کے ہیں، پرسوں یہاں پر آ رہے ہیں ۔ وہ ریاست کی طرف سے یونیورسٹی کے طبیہ کالج کے لیے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دیں گے ۔ضروری ہے کہ ان کو چائے پر بلایا جائے اور خوش آمدید کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ ان کو یہ چائے یونیورسٹی میں سندھ کے طالب علموں کی طرف سے دی جائے ۔ دعوت نامہ چھپوالیا گیا ہے اور چائے کا انتظام کرکٹ گراؤنڈ پر ہوگا ۔ آپ سندھ کے طلبہ کی تنظیم کے صدر کی خدمات انجام دیں ۔ سب طلبہ کو بلائیں ۔ آپ میرے ساتھ رہیں گے اور شیخ صاحب کو خوش آمدید کہیں گے۔ اس کے بعد آپ ان کو خطبہ استقبالیہ پیش کریں گے اور پھر طالب علم کا تعارف کروائیں گے ۔ چنانچہ میں نے یہ خدمت سرانجام دی اور ہمارے معزز مہمان شیخ صاحب بہت متاثر ہوئے ۔

دوسری بار ڈاکٹر صاحب کا پیغام آیا کہ میں شام کو ان سے ان کے گھر پر ملوں ۔ جب وہاں پہنچا تو مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا اور جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو چائے بھی آگئی ۔ اپنے ساتھ بٹھا کر چائے پلائی اور پھر فرمایا کہ آپ مسلم یونیورسٹی میں خاکساروں کے سالار اعلیٰ ہیں اور یونیورسٹی کے ایک ذمہ دار طالب علم بھی ۔ لہذا آپ یونیورسٹی کے حق میں اس موقع پر ہماری مدد کریں ۔ وہ یہ کہ میں نے سنا ہے کہ علامہ مشرقی صاحب شہر میں تشریف لائے ہیں اور وہ یونیورسٹی میں طلبہ کو خطاب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے (اس وقت دوسری عالمی جنگ چل رہی تھی) ۔ ہندوستان کے کمانڈر چیف یونیورسٹی میں آنے والے ہیں اور ہمارے طلبہ میں سے کئی نوجوانوں کو فوج میں اچھے عہدے مل جائیں گے ۔ آپ ابھی سے جاکر علامہ صاحب سے ملیں ۔ ان کو میری طرف سے گذارش کریں اور خود ہی ان کو

منوائیں کہ یونیورسٹی میں آنے اور خطاب کرنے کا پروگرام فی الحال ملتوی کردیں ۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا کوئی پروگرام نہیں ۔ بہرحال میں نے اپنی طرف سے ڈاکٹر صاحب کو یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ علامہ صاحب یقینی طور پر ان حالات کو مدِّنظر رکھیں گے اور میں ابھی جا کر ان سے ملتا ہوں ۔ چنانچہ میں جا کر ملا لیکن علامہ صاحب نے پہلے ہی یونیورسٹی میں آمد کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا پھر بھی میں نے ان کو ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہنچایا اور جو کچھ انھوں نے کہا تھا کہ وہ سب سنایا ۔ علامہ صاحب نے کہا کہ آپ جاکر وائس چانسلر صاحب کو کہیں کہ میں کل علی گڑھ سے روانہ ہونے والا ہوں اور یونیورسٹی میں آنے کا ارادہ نہیں ۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب خوش ہوئے۔

تیسری بار ڈاکٹر صاحب نے مجھے تب یاد کیا جب میں مسلم یونیورسٹی چھوڑ چکا تھا اور گورنمنٹ آف (برٹش) انڈیا کی سکالر شپ حاصل کر کے امریکہ میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں (۱۹۳۶ء - ۱۹۳۸ء) میں پڑھ رہا تھا ۔ علی گڑھ سے خط پہنچا کہ مجھے اور مدثّر حسین شمسی کو منتخب کیا گیا ہے کہ ہم فلاڈلفیا شہر میں امریکن اکاڈمی آف سوشل اور پولیٹکل سائنس کے خاص اجتماع میں مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی کریں ۔ چنانچہ ہم نے نمائندگی کی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض طلبہ جب یونیورسٹی سے چلے جاتے تھے تو بھی ان کو محل و موقع سے یاد کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم تو راقم کو اس وقت بھی نہیں بھولے جب نہ میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور نہ وہ وائس چانسلر تھے۔ سال ۱۹۴۸ء - ۱۹۴۹ء میں جب میں ابتدائی مراحل طے کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے مقالہ تیار کر رہا تھا تو جاپان سے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کا خط پہنچا کہ میں فلاں تاریخ کو نیویارک پہنچ رہا ہوں اور فلاں ہوٹل میں ٹھہروں گا ۔ آپ پہلے ہی دن صبح کو ۱۱ بجے میرے ہاں آئیں ۔ مقررہ وقت پر جا کر میں ان سے ملا ۔ بہت خوش ہوئے ۔ تین چار روز تک یا کچھ زیادہ ٹھہرے ۔ میں روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ۔ آخری دن ہوائی اڈے تک میں ان کے ساتھ رہا ۔ فرمایا کہ میں اب یہاں سے لندن جا رہا ہوں ۔ چنانچہ لندن پہنچنے کے بعد انھوں مجھے شکریے کا ایک مختصر محبت آمیز خط لکھا۔ اس کے بعد کوئی دو چار ہفتے گذرے تھے کہ خبر آئی کہ ڈاکٹر ضیاء الدّین لندن میں فوت ہوگئے ۔ رحمہ اللہ

میں ۱۹۴۹ء میں امریکہ سے واپس آیا ۔ تقریباً گیارہ برس کے بعد ۱۹۶۰ء میں انڈیا پاکستان کلچرل کانفرنس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت میں دلی پہنچا اور وہاں سے ایک دن کے لیے مسلم یونیورسٹی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں اپنے ایک پرانے ساتھی ڈاکٹر سیّد مقبول احمد کے یہاں یونیورسٹی سے باہر کہیں ٹھہرا اور وہاں سے صبح کو جب یونیورسٹی کی طرف آیا تو ایک انوکھا منظر

دیکھا وہ یہ کہ نقوی پارک جس کی داغ بیل ہمارے طالب علمی کے زمانے میں ڈالی گئی تھی وہ
اب بڑے بڑے درختوں کا باغ بن گیا تھا۔ شعبۂ تاریخ میں تحقیق کے نئے منصوبے جنم لے
رہے تھے ۔ شمال مشرق کی طرف مولانا آزاد لائبریری کی شاندار عمارت کچھ عرصہ پہلے بن چکی
تھی اور لائبریری کو اسٹریچی ہال کے نزدیک والی عمارت سے وہاں منتقل کر دیا گیا تھا۔ پروفیسر
حبیب صاحب ریٹائرڈ ہو چکے تھے ۔ ان کو میں نے پہلے ہی اپنی آمد کا خط لکھا تھا اور انھوں نے
چائے پر بلایا ہوا تھا۔ جب میں ان کی کوٹھی پر پہنچا تو اس وقت وہ اوپر والی منزل پر تھے ۔ ایک
لمحے میں جوانی والی رفتار سے کسی کے سیڑھی سے نیچے اترنے کی آواز آئی ۔ میں نے سمجھا کہ
ڈاکٹر عرفان حبیب ان کے جوان صاحبزادے ہوں گے ۔ اتنے میں حبیب صاحب سامنے آگئے ۔
بہت ہی شفقت سے ملے ۔ خیریت پوچھی ۔ چائے پلائی ۔ گاڑی نکلوائی اور مشفقانہ اصرار سے
مجھے اسٹیشن لے چلے اور جب گاڑی چل پڑی، تب ہاتھ ہلا کر مجھے خیر باد کہتے ہوئے باہر کی
طرف مڑے ۔ حبیب صاحب میں باوجود ریٹائرڈ ہونے کے جوانی کی لہریں موجزن تھیں ۔
بہرحال ایک دن کے اس تاثر اور تجزیے سے مجھے مسلم یونیورسٹی میں جا بجا پھلنے پھولنے کے
آثار نظر آئے جیسا کہ آتے ہی نقوی پارک کے تناور درختوں سے محسوس ہو رہا تھا ۔

(۳)

ایام امریکہ
(۱۹۴۶ء ۔ ۱۹۴۹ء)

یہ سال ۱۹۴۶ء کے نصف آخر کا ذکر ہے جب میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں طالب
علم تھا۔ عیدالاضحیٰ کا موقع تھا اور ہم نے سنا کہ ہندوستان سے ایک عالم دین آئے ہیں جو شہر
نیویارک میں مسلمانوں کو نماز عید پڑھائیں گے "انڈین سیمین کلب" کی مسلم جماعت کی طرف
سے ان کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ جماعت بنگال کے باشندہ مسلمانوں کی تھی۔

عید کے دن جب اس جگہ پہنچے جہاں نماز کا انتظام تھا تو معلوم ہوا کہ وہ عالم دین مولانا
آزاد سبحانی ہیں ۔ غالباً کلکتے میں عید کے موقع پر مولانا آزاد سبحانی کی امامت کی شہرت سے
متاثر ہو کر ان کو نیویارک میں امامت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ مولانا صاحب نماز عید کا خطبہ

عربی میں دینے والے تھے اور ضرورت اس بات کی تھی کہ اس خطبے کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ہی سنایا جائے۔ چونکہ میں عربی سے کچھ مانوس تھا لہذا یہ خدمت میرے سپرد کی گئی۔ مولانا نے بڑا موثر شاندار خطبہ دیا، البتہ کہہ نہیں سکتا کہ میں نے ترجمے کا حق کہاں تک ادا کیا؟ بہرحال یہ ایک سبب بنا کہ مولانا سے میری قریبی ملاقات ہو گئی۔ میں ان کی درویشانہ، مدبرانہ اور جاذب نظر شخصیت کا گرویدہ ہو گیا۔

نماز عید کے بعد ہم اپنے ہوسٹل واپس آئے اور دوسرے دن تعلیمی پروگرام میں مشغول ہوگئے۔ شاید دو روز گزر گئے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ مولانا صاحب کا پتا کرنا چاہیے کہ اب وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں اس ارادے سے، کچھ وقت بچا کر میں "انڈین سیمیں کلب" پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ وہاں اور تو کوئی بھی نہیں البتہ مولانا صاحب دروازے کے ساتھ ایک بنچ پر تن تنہا بیٹھے ہیں۔ میں نے مصافحہ کیا اور حال پوچھا۔ کہنے لگے سب خیر ہے، ہاں اس وقت آپ اگر مجھے تمباکو دلوا دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ مولانا صاحب ان دنوں پائپ پیتے تھے۔ پائپ ان کے ہاتھ میں تھا اور منہ کو لگا رہے تھے لیکن سلگا ہوا نہیں تھا۔ میں تمباکو کی ڈبیا خرید کر کے لایا اور مولانا پائپ سلگا کر بہت خوش ہوئے۔

بعد میں باتوں میں پتا چلا کہ کل صبح سے لے کر انھوں نے کچھ کھایا بھی نہیں اور نہ وہاں کوئی انھیں کھلانے والا تھا۔ میں نے حسب حال کچھ کھانے کا بندوبست کیا اور پھر ان سے یوں گزارش کی کہ:

"مولانا صاحب آپ یہاں اکیلے ہیں اگر اجازت ہو تو میں آپ کے لیے کہیں رہائش کا انتظام کر دوں جو کہ یہاں کے غریب مسلمانوں کے یہاں ہوگا۔"

یہ سن کر انھوں نے فوراً مان لیا۔ میں نے اسی شام اکیڈمی آف اسلام کے ایک رکن مختار احمد صاحب کے یہاں ان کی رہائش کا بندوبست کر دیا۔

یہ اکیڈمی "ہارلم" میں تھی۔ "ہارلم" حبشی نسل کے لوگوں کا مسکن ہے۔ اس اکیڈمی کی بنیاد کچھ سال پہلے عطیہ بیگم مرحومہ نے ڈالی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب عموماً کوئی باہر سے آنے والا مسلمان "ہارلم" کا نام تک نہیں لیتا تھا۔ لیکن عطیہ بیگم مرحومہ نے وہیں پر ایک اسلامی ادارے کی بنا ڈالی تھی۔ میں اور ایک دو طلبہ رفیق اتوار کے روز اکیڈمی آف اسلام میں جاتے تھے، نو مسلموں سے ملتے تھے اور ان کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ وہاں کے ایک سرگرم رکن محترم مختار احمد تھے جن کا اپنا گھر تھا۔ میں نے جب ان سے مولانا کی رہائش کے مسئلے کا ذکر

کیا تو محترم مختار احمد نے بخوشی قبول کر لیا کہ مولانا موصوف ان کے ہاں بطور مہمان ٹھہریں۔ چنانچہ میں مولانا صاحب کو ان کے گھر لے آیا اور مختار صاحب اور ان کی اہلیہ نے مولانا کے لیے ایک خاص کمرہ مخصوص کر دیا اور ان کی خاطر خواہ خدمت کرتے رہے۔ اس کے بعد مولانا صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ان کے تبحرِ علمی سے استفادہ کرتا رہا۔

مولانا موصوف کافی عرصے (غالباً تین چار مہینے) تک وہاں مقیم رہے۔ اس مدت میں وہ ہر اتوار اور کبھی دوسرے اتوار کو شہر نیویارک کی مسلم تنظیموں کو اپنے خطبات سے نوازتے تھے۔ مولانا کا خطاب عربی میں ہوتا تھا اور میں ان کے انگریزی مترجم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ایک روز فرمایا کہ۔

آج میں انگریزی میں تقریر کروں گا اور جہاں میرے الفاظ میں کمی محسوس ہو، وہاں مناسب الفاظ ڈال دیجیے گا اور جس جگہ میرے الفاظ مبہم لگیں وہاں ان کا آسان نعم البدل بیان کر دیجیے گا۔

انگریزی میں ان کا پہلا خطاب تھا تو انتہائی دلچسپ، مگر حاضرین ان کے مافی الضمیر کو سمجھ گئے۔ یونہی چار پانچ تقریریں کرنے کے بعد ان کے انگریزی انداز بیان میں کافی صحت اور معنویت پیدا ہو گئی اور ہم محو حیرت ہو کر ان کی ذہانت پر داد دینے لگے۔

بعد ازاں ایک بار مجھے فرمایا کہ میں فلسفۂ ربانیت کی روشنی میں اسلام کے متعلق انگریزی میں ایک کتابچہ لکھنا چاہتا ہوں جسے اگر آپ شائع کروا دیں گے تو یہاں پر رہنے والوں کے لیے کافی مفید ثابت ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے ایک دو روز میں مسودہ تیار کر لیا اور تصحیح کے لیے مجھے دے دیا۔ میں نے اس کی مناسب اصلاح کر دی اور ایک تعارفی نوٹ کا اضافہ کر کے اسے شائع کروا دیا۔ ان دنوں میں "عبداللہ عثمان السندی" کے قلمی نام سے لکھا کرتا تھا اور تعارف کے آخر میں بھی یہی نام لکھا ہوا ہے۔ اس وقت یونیورسٹی میں ہمارے ایک پروفیسر صاحب نفسیات کے گیسٹالٹ (Gestalt) نظریے کی توضیح و تفسیر کر رہے تھے اور فہم و ادراک (Learning) کے سلسلے میں فرما رہے تھے کہ ادراک بتدریج نہیں ہوتا بلکہ بہ یک وقت فوری طور پر ہوتا ہے۔ ہم نے مولانا صاحب کو ہوسٹل میں بلایا تھا۔ جہاں پر طلبہ ان سے علمی سلسلے کے سوالات پوچھ رہے تھے۔

چنانچہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آیا ادراک مجمل ہے یا مفصل؟ اس پر انھوں نے بڑی دقیق گفتگو فرمائی جو میری کتاب "مولانا آزاد سبحانی" کے صفحات ۲۷ - ۳۸ پر درج ہے۔

مولانا صاحب سے صحبتوں کا سلسلہ جاری رہا اور میں متواتر طور پر ان کے ہاں آتا جاتا

رہا۔ اچانک ایک روز فرمایا کہ اب میں یہاں سے رخصت ہونے والا ہوں۔ میں نے پوچھا کہاں جانے کا ارادہ ہے۔؟

فرمایا "مصر"۔ میں نے دریافت کیا کہ وہاں کون ہے۔ کس کے پاس جا کے ٹھہریں گے۔ تو فرمایا:

کئی اللہ کے بندے ہوں گے۔ کسی کے پاس چلا جاؤں گا اور کوئی نہ کوئی تو مجھے ٹھہرا ہی لے گا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ مصر سے ہوتے ہوئے ہندوستان چلا جاؤں گا اور وہاں جا کر جواہر لعل نہرو سے ملوں گا۔ یہاں جو کچھ دیکھا اور سمجھا ہے یہ ان کے گوش گزار کروں گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں گفتگو کروں گا تاکہ حصول آزادی کے بعد مسلمان وہاں پر عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔

میں نے پوچھا کہ اس کے بعد آپ کے کیا پروگرام ہوں گے۔؟

فرمایا:

"ہندوستان کے بعد روس جاؤں گا اور وہاں اپنے فلسفۂ ربانیت کی روشنی میں ان کو سوشلزم کے صحیح مفہوم کی طرف راہنمائی کروں گا۔

میرے خیال میں، مولانا سوشلزم کے بعض پہلوؤں کو اچھا تصور کرتے تھے، خاص طور پر یہ کہ سوشلزم میں کام کرنے والوں اور مزدوروں کو ایک مقام حاصل ہوا ہے۔ ان کے خیال میں یہ جذبہ اسلامی فکر کی روح میں سے ہے۔ فرماتے تھے کہ از روئے قرآن خود اللہ تعالیٰ کی ایک ذی شان صفت "ورکر" کی سی ہے کہ "کل یوم ہو فی شان" (الرحمان ۲۹)

چنانچہ اپنے اسی فکر کے پیش نظر انھوں نے اپنے انگریزی کتابچے میں بھی ایک باب اس عنوان سے باندھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ بحیثیت ایک ورکر کے"۔

جب مولانا کے "ہارلم" سے رخصت ہونے کی خبر وہاں کے مسلمانوں کو ملی تو وہ ان سے ملنے آئے اور پوچھا کہ کیا آپ کے پاس ٹکٹ آ گیا ہے؟

فرمایا:

"ٹکٹ نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کوئی صورت پیدا کر دے گا۔

اس پر اکاڈمی آف اسلام کے ممبروں نے مل کر رقم جمع کی اور مولانا کے لیے بحری

جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ ساتھ ہی ان کے لیے دو چار کپڑوں کے جوڑے جن میں ٹاپ کوٹ اور پینٹ شامل تھے، خرید لیے ایک ٹرنک اور ایک بیگ اور ان میں مولانا کے کپڑے اور مناسب سامان سفر بھر دیا گیا۔

مقررہ تاریخ پر ہم بندرگاہ پر مولانا کو الوداع کہنے گئے۔ ان کے لیے جمع کیا جانے والا زاد راہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ سامان دیکھ کر انھوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور فرمایا:

> "میں نے نہ کبھی پہلے سامان اٹھایا ہے اور نہ اب اٹھاؤں گا۔ اس روز میں نے اپنے بھائیوں کی دل شکنی کرنی مناسب نہ سمجھی تھی۔ اب میرے لیے جمع کیا جانے والا سامان یہیں پر رہنے دو تاکہ کسی ضرورت مند کے کام آ سکے۔"

... اور ہم سے مصافحہ کر کے اور جہاز میں چلے گئے۔

(۴)

ایام کراچی
(۱۹۴۹ء - ۱۹۵۱ء)

سنہ ۱۹۴۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا (کولمبیا یونیورسٹی) چلا گیا۔ وہاں سے سنہ ۱۹۴۹ء میں واپس کراچی پہنچا جو اب پاکستان کا پایۂ تخت تھا۔ میں ڈاکٹر تو بن کر آیا تھا لیکن ملازمت کے لیے دروازے بند تھے۔ ایک سال سے زیادہ عرصے تک پریشان حال رہا تا آنکہ مئی ۱۹۵۰ء میں مرحوم شیخ محمد اکرام نے (جو اس وقت منسٹری آف انٹیریر کی انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ ڈویژن میں جوائنٹ سیکرٹیری تھے) کہیں مجھے دیکھ کر درخواست دینے کو کہا اور اپنی ڈویژن میں "افسر بکار خاص" (O.S.D) کے طور پر منتخب فرمایا اور میں قدرت اللہ شہاب مرحوم (جو اس وقت ڈپٹی سیکرٹیری تھے) کے ماتحت کام کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے غالباً میرے مضامین دیکھے تھے۔ جو رسالہ "اسلامک کلچر" (حیدرآباد دکن) میں چھپے تھے۔ ایک دن مجھے اپنے آفس بلا کر کہا کہ انجمن ترقی اردو میں مولانا عبدالحق صاحب کے ذاتی کتب خانے میں "شرف نامۂ احمد منیری" نام کی فارسی کتاب کا ایک قلمی نسخہ ہے جو میں چاہتا ہوں کہ آپ دیکھیں اور اس پر ایک

مضمون لکھیں۔ آج شام آپ میرے ساتھ چلیں تاکہ مولانا صاحب سے مل کر یہ کتاب حاصل کی جائے۔ چنانچہ اکرام صاحب کے ساتھ میں انجمن ترقی اردو میں مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اکرام صاحب نے اچھے الفاظ میں میرا تعارف کرایا۔ مولانا نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کہاں تعلیم پائی ہے اور یہ کہ فارسی سے کتنا مانوس ہیں کہ اس قلمی کتاب کو پڑھ سکیں۔ میرے جواب سے پہلے اکرام صاحب نے انھیں مطمئن کر لیا۔ البتہ میں نے ان کو بتایا کہ قیام پاکستان سے پہلے میں یہاں پر کراچی میں انجمن ترقی اردو کی برانچ کی لائبریری کا ممبر تھا جو پاکستان چوک کے قریب واقع تھی۔ سن کر مزید مطمئن ہوئے۔ اتنے میں قاضی احمد میاں اختر صاحب آگئے۔ میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اٹھ کر مصافحہ کیا۔ بعد میں نیچے آکر (اتنا یاد پڑتا ہے کہ ہم مولانا سے ملنے یا کتاب نکلوانے کے سلسلے میں سیڑھی چڑھ کر اوپر گئے تھے) قاضی صاحب سے اپنا تعارف کروایا اور جوناگڑھ کی یادیں تازہ کیں۔ بہت بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں چاہوں گا کہ آپ کے علمی مشاغل سے باخبر رہوں۔ خاص موقعوں پر آپ مجھے یاد کریں اور میرے پاس آیا کریں۔ مجھے اپنے مکان کا پتا بتا دیا جو گاڑی کھاتے کے سامنے بندر روڈ پر ٹھٹائی کمپاؤنڈ بلڈنگ کی چوتھی منزل پر ایک "فلیٹ" تھا۔

شرف نامے کا یہ قلمی نسخہ کرم خوردہ اور بوسیدہ تھا۔ بعض عبارتوں کو پڑھنا اتنا آسان نہ تھا۔ شیخ اکرام صاحب کی ترجیحات کا مجھے کچھ اندازہ تھا۔ لہذا میں نے چاہا کہ کتاب کے تاریخی اور ثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں۔ ابتدائی مطالعے سے ہی معلوم ہو گیا۔ کہ مصنف ابراہیم قوام فاروقی نے اپنی کتاب کا انتساب بہار کے بزرگ شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کے نام نامی سے کیا۔ لیکن انھوں نے یہ کتاب بنگالہ میں لکھی۔ لہذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس زمانے میں بنگالہ کے تاریخی و علمی پس منظر پر روشنی ڈالی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ حالات جمع کیے اور پھر قاضی صاحب سے مشورہ کیا۔ میری کوشش کو دیکھ کر خوش ہوئے اور پھر اپنی معلومات سے نوازا جس کا ذکر خیر میں نے اپنے مضمون کے حواشی میں کر دیا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ مضمون مکمل ہو جائے تو شیخ محمد اکرام اور مولانا عبدالحق کے علاوہ ایک کاپی مجھے بھی دیجیے گا۔ تاکہ انجمن کے رسالہ اردو میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ میں نے ایک کاپی جناب قاضی صاحب کے حوالے کر دی اور انھوں نے اسے رسالہ اردو، بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۲ء اور بابت جنوری۔ اپریل ۱۹۵۳ء میں دو قسطوں میں شائع کروا دیا۔ عنوان ہے۔ "مسلم بنگال کے فارسی ادب کی ایک اہم تصنیف کتاب شرف نامۂ احمد منیری۔"

مئی ۱۹۵۰ء تا اگست ۱۹۵۱ء میں انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ ڈویژن میں بطور او۔ ایس۔ ڈی کام کرتا رہا۔ اور میرا قیام کراچی میں ہی رہا اس مدت میں جناب قاضی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان کا کتب خانہ بڑا تو نہیں تھا لیکن اس میں تحقیق و تجسس کے لیے کافی کچھ کام کی کتابیں موجود تھیں۔ میں اس وقت دیبل کے محل وقوع پر کام کر رہا تھا اور مجھے ایلیٹ ڈاؤسن کی مرتب کردہ تاریخی جلدوں میں سے پہلی جلد کی ضرورت تھی۔ قاضی صاحب سے ذکر کیا تو فرمایا میری کتابوں میں موجود ہے۔ پھر کتاب لے آئے اور میرے حوالے کر دی۔ ان دنوں ملازمت کی ذمے داریوں کے علاوہ میرے پسندیدہ مشغلے یہ تھے۔ ۱۔ کراچی میں ان نووارد فضلاء کو جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے سندھ کی تاریخ اور تاریخی آثار سے روشناس کروانا۔ ۲۔ حضرت شاہ عبداللطیف اور سندھی موسیقی کے تعارف کے سلسلے میں محفلیں منعقد کرنا۔ ۳۔ مرحومہ عطیہ بیگم کی ادبی ثقافتی محفلوں کا کاروبار سنبھالنااور ۴ "پین" (PEN) تنظیم (جس کے صدر جناب شاہد سہروردی تھے۔) کے زیر سایہ محفلوں کا انتظام سنبھالنا (جیساکہ مرحوم شہاب صاحب چاہتے تھے) ان سلسلوں کے خاص خاص موقعوں پر قاضی صاحب کو بلا ناغہ اطلاع دے کر ان کی رفاقت کی سعادت حاصل کرتا رہا۔ قاضی صاحب کو موسیقی سے خاص شغف تھا۔ اور موسیقی کی محفلوں میں بہت محظوظ ہوتے تھے۔ عرب ، اسلامی دور کی تاریخ کے سلسلے میں ، میں نے دیبل کے محل وقوع پر مقالہ لکھا اور محکمۂ آثار قدیمہ کے زیر انتظام ایک محفل میں اس کو پیش کیا۔ مرحوم ممتاز حسن (اس وقت فیڈرل مالی سیکرٹری) نے اور جناب قاضی صاحب نے بہت پسند فرمایا۔ اس مقالے میں، میں نے دیبل کو بھنبھور کے کھنڈرات سے مشخص کیا تھا۔ قاضی صاحب نے تقاضا کیا کہ میں رہنمائی کروں تاکہ بنبھور کے کھنڈرات دیکھے جائیں۔ اس مہم میں اور احباب بھی شریک ہوئے اور قاضی صاحب نے مولانا ہاشمی فرید آبادی کو جو اس وقت انجمن میں کام کرتے تھے شمولیت کی دعوت دی۔ اس طرح بعد میں ہم ٹھٹہ دیکھنے گئے۔

۱۹۵۱ء کے وسط میں پاکستان پبلک سروس کمیشن نے مجھے "پریس اتاشی" کے عہدے کے لیے منتخب کیا اور اگست میں دمشق میں میری تقرری کا فیصلہ ہوا۔ اب میں نے جا کر قاضی صاحب کو بتایا خوش تو ہوئے لیکن ساتھ ہی فرمایاکہ آپ کا باہر چلا جانا ہم پر گراں گزرے گا۔ ان کے یہ الفاظ میرے دل میں بس گئے۔ مجھے تیاری کا الاونس مل گیا اور دمشق جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ قبلہ علامہ آئی آئی قاضی، وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سے کراچی تشریف لائے اور پیغام بھیجاکہ میں ان سے ملوں۔ جاکر ملا تو پوچھا۔ کہ آج کل کیا کر رہے

ہیں۔ میں نے بتایا کہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے میرا انتخاب ہوا ہے اور دمشق جانے کی تیاری کر رہا ہوں کہ وہاں پر میری تقرری ہوئی ہے۔ سن کر انھوں نے زور دار ترغیب دی کہ میں رک جاؤں۔ اور سندھ یونیورسٹی میں "پروفیسر آف ایجوکیشن" کا عہدہ سنبھال لوں۔ قبلہ علاّمہ قاضی صاحب سے کالج کے دنوں سے عقیدت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ قبلہ میں خدمت تعلیم کو گورنمنٹ سروس پر ترجیح دیتا ہوں مگر سندھ یونیورسٹی تو ایک متحن یونیورسٹی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہاں سے کبھی بھی مجھے رخصت کر دیا جائے۔ فرمایا کہ میں سندھ یونیورسٹی کو ایک مثالی تربیت گاہ بنانا چاہتا ہوں۔ اب یہ "ریزیڈنشل ٹیچنگ یونیورسٹی" ہو گی اور یہ بسم اللہ آپ ہی کی تقرری سے ہوگی۔ مزید یہ کہ آپ کی تقرری کے آرڈر میں لکھ دیا جائے گا کہ رٹائمنٹ تک آپ کو سکیورٹی آف ٹینیور دی گئی ہے۔

یہ تو ان کی شفقت تھی البتہ میرے لیے صبر آزما صورت حال سامنے تھی، کہ دمشق جانے کو خیرباد کہوں۔ دو روز گزرے ہی تھے کہ قبلہ علاّمہ صاحب نے یکم ستمبر۱۹۵۱ء سے سندھ یونیورسٹی میں میری تقرری بطور پروفیسر آف ایجوکیشن کا آرڈر بھجوا دیا جس میں "ٹینیور" کا بھی اندراج تھا۔ یہ تیس اگست کا دن تھا۔ قبلہ علاّمہ صاحب کی ترغیب کے پیشِ نظر مجھے اتنی توفیق ہوئی کہ دوسرے دن یعنی ۳۱ اگست کو میں شہاب صاحب سے ملا اور ان کو اپنے استعفےٰ کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ دونوں نے سمجھایا کہ میں اتنی اچھی ملازمت نہ چھوڑوں لیکن میں نے انکو منوایا کہ میرا استعفیٰ قبول کر لیا جائے۔ دونوں کرم فرما پھر مجھے سیکرٹیری مسٹر جی۔ احمد کے پاس لے گئے جنھوں نے بعض مراعات کے حوالے سے مجھے ترغیب دی کہ میں ملازمت نہ چھوڑوں میں نے شکریہ ادا کیا اور گزارش کی کہ میں تعلیم کی خدمت کی خاطر یونیورسٹی کی ملازمت کو ترجیح دے رہا ہوں لہذا استعفیٰ قبول کر لیا جائے۔ اس پر جی۔احمد صاحب نے پوچھا کہ آپ کب جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا آج ہی۔ اس پر انھوں نے فائل پر دستخط کر دیے۔ اسی دن میں قاضی صاحب کے ہاں پہنچا اور کہا کہ قبلہ میں ایک خوشخبری لایا ہوں۔ اور وہ یہ کہ میں دمشق نہیں جاؤں گا۔ حیران رہ گئے کیوں کہ دو چار روز پہلے ہی میں ان کو بتا چکا تھا کہ ملک سے باہر جانے والا ہوں۔ جب انھوں نے سُنا کہ قبلہ علاّمہ قاضی صاحب کی ایماء پر میں سندھ یونیورسٹی جا رہا ہوں اور آج استعفیٰ دے کر آیا ہوں تو خوش ہو کر فرمایا کہ ہاں بھائی جاؤ اور ہمیں بھی لے جاؤ میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا کہ انشاءاللہ قاضی صاحب کو سندھ یونیورسٹی میں بلایا جائے گا۔

(۵)

حیدر آباد سندھ میں
(۱۹۵۱ء تا حال)

یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو جا کر میں نے سندھ یونیورسٹی حیدر آباد سندھ میں پروفیسر آف ایجوکیشن اور صدر شعبۂ تعلیم کی ذمّے داری سنبھال لی۔ اس طرح پاکستان کی تعلیمی تاریخ میں پہلی بار یونیورسٹی سطح پر شعبۂ تعلیم کا اجراء ہوا اور فیکلٹی آف ایجوکیشن قائم ہوئی۔ وائس چانسلر علامہ قاضی صاحب ایک باکمال مفکر ہونے کے علاوہ بڑے تعلیمی مدبّر و منتظم بھی تھے اور یونیورسٹی کو صحیح معنوں میں ایک اعلیٰ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھے کُلّی طور پر اپنے اعتماد میں لیا ہوا تھا۔ تعلیمی شعبوں کا اجراء، تجدید نصاب وغیرہ تعلیمی امور میرے سپرد تھے ۱۹۵۱ء ۱۹۵۲ء کے دوران شعبۂ تعلیم کے علاوہ حتیٰ المقدر فیکلٹی آف آرٹس کی تکمیل پیش نظر رہی۔ میں نے تین شعبوں، مسلم ہسٹری، سندھی اور اردو، کو اوّلیت دینے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی مسلم ہسٹری کے اجراء کے لیے قاضی احمد میاں صاحب کو بلانے کی تجویز پیش کی۔ قاضی صاحب کی ذاتی صفات اور علمی کارناموں کا ذکر کیا اور کتاب "طبقات الامم" کا اردو ترجمہ علّامہ صاحب کے سامنے رکھا جس کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ پھر مجھے اجازت دی کہ میں قاضی صاحب کو لکھوں تاکہ وہ اک دن کے لیے تشریف لائیں۔ چنانچہ میں نے قاضی صاحب کو لکھا اور وہ میرے ہاں حیدرآباد تشریف لائے اور ہم دونوں مل کر علّامہ صاحب سے ان کے گھر جا کر ملے۔ کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور علّامہ صاحب نے خوش ہو کر قاضی صاحب سے کہا کہ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ شعبۂ مسلم ہسٹری کے صدر اور پروفیسر کے طور پر ہمارے یہاں یونیورسٹی میں آ جائیں۔ قاضی صاحب نے قبول کر لیا اور رخصت ہو کر فی الحال واپس کراچی چلے گئے۔ البتہ یہ پوچھا کہ حیدرآباد میں ان کے رہنے کا انتظام کا کیا ہو گا۔ علّامہ صاحب نے دوسرے روز قاضی صاحب کی تقرری بحیثیت "پروفیسر آف مسلم ہسٹری" منظور کر لی

اور جو نئے کوارٹر بنے تھے ان میں سے ایک قاضی صاحب کے لیے مخصوص کر دیا۔ قاضی صاحب کو ان کی تقرری کا آرڈر ہاتھوں ہاتھ پہنچا دیا گیا اور وہ فوراً حیدرآباد پہنچے اور شعبۂ مسلم ہسٹری کے صدر اور پروفیسر کی ذمہ داری سنبھال لی۔

قاضی صاحب کی آمد کے بعد میں نے حتی المقدور کوشش کی کہ ان کو کوئی تکلیف پیش نہ آئے۔ ڈپارٹمنٹ کی ضروریات کے سلسلے میں رجسٹرار سے خط و کتابت اور مسائل کو حل کرانے میں قاضی صاحب سے میرا کلی طور پر تعاون رہتا تھا اور وہ ہر طرح مطمئن رہے۔ قاضی صاحب حضرت شاہ عبداللطیف کا مزار دیکھنا چاہتے تھے اور ہم ساتھ مل کر وہاں گئے۔ اس طرح، ٹھٹہ اور منگلی کو گئے۔ دوران گفتگو ذکر کیا کرتے تھے کہ ان کے آباء و اجداد ٹھٹہ سے جونا گڑھ آئے تھے۔ قبلہ علامہ صاحب کے ہاں ہم اکثر ساتھ ہی مل کر جایا کرتے تھے۔ علامہ صاحب قاضی صاحب کو چاہتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے۔

۱۹۵۳ء - ۱۹۵۴ء کے دوران اساتذہ اور طلبہ کی تربیت کے لیے ایکسٹینشن لیکچرس کا سلسلہ علامہ قاضی صاحب کی ایما، پر شروع ہوا۔ یہ لیکچرس ہر جمعہ کو (بعد از نماز جمعہ) مرکزی ہال میں منعقد کیے جاتے تھے اور علامہ صاحب صدارت فرماتے تھے۔ کوئی ایک پروفیسر یا صدر شعبہ اپنے تخصص کے دائرے میں سے کسی موضوع پر مقالہ پیش کرتا تھا اور بعد علامہ قاضی صاحب اپنا صدارتی خطاب فرماتے تھے۔ جب ان لیکچرس کا پہلا پروگرام مرتب ہوا تو قاضی صاحب (قاضی میاں صاحب) نے اپنے لیکچر کے لیے "مسلمانوں کے بعض سائنسی اختراعات" کا موضوع تجویز کیا انگریزی میں عنوان تھا۔

"Some Muslim Contributions to Scientific Inventions"

میں نے ان کی طرف سے یہی موضوع لیکچرس کے پروگرام میں لکھوا دیا۔ قاضی صاحب نے اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا اور بعض وضاحتیں فی البدیہہ کرتے گئے۔ یہ مقالہ ایک نئے انداز کا تھا اور دلچسپی سے سنایا گیا اور پسند کیا گیا۔ بعد میں قاضی صاحب سے کاپی لے کر ان کا یہ مقالہ میں نے پندرہ روزہ انگریزی اخبار The Torch مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۵۳ء میں چھپوا دیا

اسی اثنا، میں قاضی احمد میاں صاحب نے ایک اہم تجویز یہ پیش کی کہ بیرونی کی کتاب غرۃ الزیجات (کہ جو بیرونی نے سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کی تھی) کا واحد قلمی نسخہ احمد آباد میں پیر محمد شاہ کی مسجد کے کتب خانے میں پایا جاتا ہے۔ سندھ یونیورسٹی سے اس کا

عربی متن نیز اس کا انگریزی ترجمہ اور حواشی و تعلیقات شائع کیا جائے۔ ہم دونوں مل کر علامہ قاضی صاحب سے جا کر ملے علّامہ صاحب نے پوچھا کہ یہ مخطوطہ کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے اور یہ کہ کون اس کا انگریزی میں ترجمہ کرے گا اور حواشی لکھے گا۔ قاضی صاحب نے کہا : مخطوطے کے عکس حاصل کرنے کا انتظام میں کردوں گا۔ اور یہ کہ اس کے انگریزی میں ترجمے اور حواشی کا کام ایک صاحب بنام فضل الدّین قریشی کے سپرد کیا جاسکتا ہے جو لاہور میں یونیورسٹی یا کسی کالج میں طبعیات کے استاد ہیں وہ عربی سے مانوس ہیں اور یہ کتاب کا موضوع علم نجوم (Astronomy) ہے اور وہ اس کو سمجھ لیں گے۔ علّامہ صاحب نے قاضی صاحب کی یہ سفارش قبول کرتے ہوئے اس منصوبے کی منظوری دے دی۔ قاضی صاحب نے مزید وضاحت کی کہ ڈاکٹر بلوچ میرے ساتھ مل کر اس کام کی نگرانی کریں گے ہم دونوں خوش ہو کر واپس آئے لیکن قاضی صاحب بہت خوش ہوئے کہ علّامہ قاضی صاحب نے ان کی عملی تجویز کو فوری طور پر منظور کر لیا۔ کچھ دنوں کے بعد قاضی صاحب نے مجھے بتایا کہ مخطوطے کے دو تین عکس لیے گئے ہیں اور وہ کسی صاحب کی وساطت سے عنقریب کراچی پہنچنے والے ہیں۔ عکس پہنچے تو قاضی صاحب نے تجویز کیا کہ فضل الدّین قریشی کو بلایا جائے۔ وہ جب آئے تو یہ کام انھیں سپرد کیا گیا۔ قاضی صاحب نے جو ان کے لیے اتنی اچھی رائے دی تھی اس کے پیشِ نظر قریشی صاحب کو بعد میں بلا کر فزکس ڈپارٹمنٹ میں مقرّر کروایا تاکہ وہ یہاں پر اس کام کو پورا کر دیں۔ افسوس کہ وہ مقرّرہ مدّت میں یہ کام نہ کر سکے اور واپس لاہور چلے گئے۔ ان کو بار بار لکھا گیا لیکن انھوں نے ایفائے عہد کے بجائے تغافل سے کام لیا۔

قاضی صاحب کی وفاتِ ناگہانی

سال ۱۹۵۵ء کے شروع سے ہی قاضی احمد میاں صاحب کبھی کبھار علیل ہونے لگے لیکن یہ علالت ایک دن کی ہوتی تھی۔ اور دوسرے دن وہ آفس میں آ جاتے تھے۔ غالباً مارچ میں وہ ایک دن کے بعد دوسرے دن بھی آفس میں نہ آئے تو میں ان کے گھر جا کر ان سے ملا۔ چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور سرہانے کے دونوں طرف کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے مزاج پرسی کی اور کہا کہ کسی ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے۔ فرمایا کہ تشویش کی ضرورت نہیں۔ مجھے ایک عرصے سے قلب کا عارضہ " انجائنا " ہے، دوا میرے پاس ہے اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں (یہ کہہ کر چھوٹی سفید گولیاں دکھائیں) آرام کر لیتا ہوں تو طبیعت ٹھیک ہو جاتی

ہے چنانچہ دوسرے دن آفس تشریف لائے۔ اس کے بعد کبھی کبھی ایک دن ناغہ کر لیتے تھے۔ تو میں اس کو "نارمل" ہی سمجھتا تھا۔

۶ اگست علی الصباح قاضی صاحب کے گھر سے بچی دوڑتی ہوئی میرے گھر پہنچی اور مجھے کہا کہ آپ جلدی سے چلیں قاضی صاحب کو کچھ ہو گیا ہے میں فوراً چل پڑا۔ بچی کے ساتھ جب کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ قاضی صاحب اپنی چارپائی پر بالکل سیدھے لیٹے ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سو رہے ہیں۔ ایک ٹانگ بالکل سیدھی تھی اور دوسری زانو سے اندر کی طرف مڑی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ دائیں مڑے ہوئے سینے پر دھرے ہوئے تھے۔ میں نے ایک دو آوازیں دیں اور بعد میں ان کی ٹانگ کو اور ہاتھوں کو موڑ کر بازوؤں کو سیدھا کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ قاضی صاحب فوت ہو چکے ہیں لیکن اعضاء اتنی آسانی سے مڑ رہے تھے کہ امید ہوئی کہ ایسا شاید نہ ہو۔ اس امید پر بھاگ کر حکیم شمس الدّین صاحب کے داماد ڈاکٹر مجھرگوری کو بلا کے لایا۔ انھوں نے معائنہ کرکے بتایا کہ قاضی صاحب تقریب دو گھنٹے پہلے فوت ہو چکے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ۶ اگست کو صبح ۴ بجے کے قریب فوت ہوئے۔ دونوں ہاتھ جو ان کے سینے پر رکھے ہوئے تھے اس سے معلوم ہوا کہ عارضۂ قلب "انجائنا" جان لیوا ثابت ہوا۔

میں نے قاضی صاحب کے بچّوں کو فوراً کراچی روانہ کر دیا اور پھر غسل و تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ قبلہ علّامہ قاضی صاحب کو اطلاع دی۔ انھوں نے پوچھا کہ میّت کو کراچی پہنچانے کا کیا انتظام کیا گیا ہے۔ میں نے بتایا کہ حیدرآباد میمن جماعت سے "بس" ملنے کی امید ہے اور میں خود میّت کے ساتھ کراچی جاؤں گا۔ میں نے مزید کہا کہ مناسب ہے کہ پسماندگان سے ہمدردی کے طور پر یونیورسٹی سے ایک ریزولیوشن پاس کیا جائے۔ اور رجسٹرار کے دستخط سے بھیجا جائے۔ فرمایا کہ میں خود تعزیت کا پیغام یونیورسٹی کی طرف سے بھیجوں گا اور آپ اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ جماعت کی گاڑی دس بجے کے قریب ملی اور نماز جنازہ کے بعد قبلہ علّامہ صاحب سے تعزیتی پیغام لے کر میں اکیلا میّت کو سنبھالے ہوئے کراچی روانہ ہوا۔ اتّفاق سے اس دن جنوب مغرب سے جو روزانہ ہوا چلتی تھی اس نے بڑی شدّت [illegible] اختیار کر لی۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قاضی صاحب کی وفات پر فطرت بھی جنبش میں آگئی ہے۔ ان دنوں کراچی جانا ہوتا تھا تو براستہ ٹھٹہ جایا کرتے تھے۔ ہم نے جب دابجی کو کراس کیا تو گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا۔ پیٹرول تو ہم کافی لے کر چلے تھے لیکن سامنے کی ہوا کے غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے پیٹرول ختم ہو گیا۔ میں نیچے اترا اور گزرنے والی گاڑیوں کو ہاتھ دے کر روکنے لگا۔ موٹر

کاروں والے حضرات تو رک کر پھر معذرت کے ساتھ چل پڑتے تھے۔ بالآخر ایک ٹرک کا قلندر صفت ڈرائیور رکا۔ مجھ سے ہمدردی کی اور دو گیلن کے قریب پیڑول نلکی (پائپ) سے نکال کر دیا۔ جب آگے والے پیڑول پمپ پر پہنچا تو پیڑول ڈلوایا۔ اس طرح ان کے آخری سفر میں مجھے قاضی احمد میاں اختر کے ساتھ دو گھنٹے مزید رفاقت کا موقع ملا اور یہ صحبت ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون "۔

غرّۃ الزیجات:

قاضی احمد میاں فوت ہوئے اور بعد میں علامہ قاضی صاحب وفات پا گئے۔ میں لاہور جا کر فضل الدّین صاحب سے ملتا رہا اور یاد دہانی کرتا رہا۔ غالباً ۱۹۷۰ء میں یا اس کے بعد میں فضل الدّین قریشی سے آخری بار سمن آباد میں ان کے گھر پر جا کے ملا۔ میرے اصرار پر انھوں نے بتایا کہ وہ بیرونی کی غرّۃ الزیجات کا ترجمہ پورا کر چکے ہیں۔ یا پورا کرنے والے ہیں لیکن اشاعت کے لیے سندھ یونیورسٹی کو دینے میں ان کو تامل تھا۔ کہا کہ بھارت میں کوئی پنڈت ہیں جو اس کا مقدمہ لکھیں گے اور پھر یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہوگی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہنے لگے کہ انھوں نے اپنا ترجمہ یا کتاب کا متن کراچی میں صمد حسین رضوی صاحب کو بھیجا تھا اور انھوں نے شائع کر لیا ہے۔ بعد میں صمد حسین صاحب سے میری ملاقاتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ان کو ہندو مصنفین کی نجوم پر لکھی ہوئی قدیم کتابوں پر بڑی دسترس حاصل ہے۔ جب وہ اس موضوع کو خوب سمجھتے تھے تو ان کو قریشی صاحب کے ترجمے کو نقل کرنے کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ البتہ صمد حسین صاحب کو " غرّۃ الزیجات " کا متن قریشی صاحب سے ملا اور یہ اسی متن کا عکس تھا جو قاضی احمد میاں اختر نے احمد آباد سے حاصل کیا تھا اور قریشی صاحب کو دیا گیا تھا۔ عبدالصمد صاحب نے مصلحتاً یہ لکھا کہ انھوں نے کتاب کا عکس براہ راست احمد آباد سے حاصل کیا۔ بہرحال صمد صاحب نے کافی ذاتی خوشی کے ساتھ انگریزی میں غرّۃ الزیجات پر کامینٹری لکھی اور ان کا یہ کارنامہ ہمدرد فاؤنڈیشن سے شائع ہوا۔ فضل الدین قریشی کے کارنامے کا کیا ہوا، میں یہ معلوم نہ کر سکا۔ میں نے قاضی صاحب مرحوم کی یاد میں " غرّۃ الزیجات " کے عربی متن پر کام شروع کیا اور بیرونی کی آٹھ سو سالہ برسی کے موقع پر (جو یونیسکو کے پروگرام کے تحت پاکستان میں منائی گئی) اس کو ۱۹۷۳ء میں سندھ یونیورسٹی سے شائع کیا۔

(۶)

اسفارِ ترکی
(۱۹۶۴ء۔ ۱۹۸۸ء)

ترکی کے کتب خانے دوسرے مسلم ممالک کے کتب خانوں کے مقابلے میں زیادہ تر محفوظ رہے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ترکی یورپ سے قریب تر ہے۔ ترک عالموں نے اپنی کتابوں کو یورپ کی یلغار سے بڑی حد تک بچا لیا، جب کہ دوسرے مسلم ملکوں کی کتابیں سستے داموں بک گئیں۔

مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں استاد مرحوم پروفیسر عبدالعزیز میمن سے ترکی کے کتب خانوں اور وہاں پر محفوظ نایاب قلمی کتابوں کا تذکرہ سنا تو ان کو دیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ ایک مدت کے بعد جب ترکی جانے کا موقع ملا تو زیادہ وقت کتب خانوں کی تلاش میں صرف ہوا۔ چنانچہ دور دراز سفر کرکے بھی سب کے سب مشہور معروف کتب خانے دیکھے گئے۔ وہاں کے مہمان نواز نگرانوں کی مروّت و مہربانی سے نایاب قلمی نسخوں تک بھی رسائی ہوئی۔

پہلی بار جب سنہ ۱۹۶۴ء میں ترکی جانے کا اتفاق ہوا تو استنبول میں واقع کتب خانوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بھی پیرس سے آکر استنبول یونی ورسٹی میں تشریف فرما تھے۔ ان کی رہنمائی شامل حال رہی۔ سب سے پہلے استنبول کے ان کتب خانوں کو دیکھا جن کا تذکرہ خاص طور پر استاذ محترم پروفیسر میمن سے سنا تھا۔ وہ تھے کوپرولی زادہ، فاتح (سلطان فاتح کی مسجد کا کتب خانہ) اور سلیمانیہ کا کتب خانہ) ذخائر کی کثرت اور وقت کا شدید احساس ہوا۔ لہٰذا دوسری بار سنہ ۱۹۸۴ میں تین ہفتوں تک ترکی کے کتب خانوں کو دیکھنے کے لیے رخت سفر باندھا۔ اس بار سلیمانیہ کے علاوہ استنبول کے دو مزید مشہور و معروف کتب خانوں "نور عثمانیہ" اور "توپ کاپی سرای" (شاہی تاریخی محل) کو دیکھا۔ ایک ہفتے کے

لیے استنبول سے باہر کا سفر اختیار کیا۔ اور قونیہ ۔ برصا ۔ آک حصار ۔ منیسا ۔ اضمیر اور ایدر نے کے کتب خانے دیکھے ۔ تیسری بار ۱۹۸۸ میں ترکی جانے کا موقع ملا تو دور دراز کا سفر کر کے مشرقی ترکی کے شہر اماسیا میں سلطان بایزید مسجد کا کتب خانہ دیکھا۔ تاہم اس سفر میں زیادہ وقت سلیمانیہ میں محفوظ ذخائر کو دیکھنے میں صرف ہوا۔

سنہ ۱۹۷۴ء میں ایک اہم انتظامی قدم اٹھایا گیا جس سے سلیمانیہ کو مرکزی کتب خانے کا درجہ دے کر ، استنبول اور گرد و نواح میں واقع کتب خانوں کے ذخائر کو سلیمانیہ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ تاہم ان ذخائر کو ان کی اصلی فہرستوں کے ساتھ ان کے اصلی ناموں سے محفوظ کر دیا گیا۔ سلیمان خان کی تعمیر کردہ جامع سلیمانیہ کو پہلے ہی سے ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سلطان مرحوم نے جامع کو ایک وسیع رقبے پر بڑے اہتمام سے بنوایا اور مسجد کے ساتھ ساتھ مدرسہ ، کتب خانہ ، بیمارستان (ہسپتال) اور دوسری عمارتیں تعمیر کروائیں ۔ اس لیے مرکزی کتب خانے کی توسیع کے لیے سلیمانیہ میں کافی جگہ موجود تھی۔ البتہ نئی تنظیم کے تحت کتب خانے کو نئے سرے سے تشکیل دے کر پروان چڑھانے کا سہرا اس کے جواں سال منتظم جناب محمد معمرؔ الکر کے سر ہے۔ انتظامی صلاحیت کے علاوہ ان کے اعلیٰ اخلاق اور کتب خانے میں آنے والے قارئین و محققین کے ساتھ ان کے متواضع اور محبت آمیز برتاؤ نے ان کی شخصیت کو کتب خانے میں ایک روشن شمع بنا دیا۔ اور لکھنے پڑھنے والے پروانہ وار سلیمانیہ کا رخ کرنے لگے۔ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۸۸ء جتنی بار راقم کو سلیمانیہ میں کام کرنے کا اتفاق ہوا تو جناب محمد معمرؔ الکر نے میرے لیے مطالعے اور جستجو کے سب مرحلے آسان کر دیے اور ساتھ ہی مہمان نوازی اور محبت سے نوازا۔ ایسے پُرلطف ماحول میں کام کر کے جب سلیمانیہ سے واپسی ہوتی تو جی چاہتا تھا کہ پھر سے جایا جائے تاکہ مشفق و مہربان محمد معمرؔ سے ملنے کا شرف حاصل ہو۔

جس طرح استنبول میں سلیمانیہ کو مرکزی کتب خانہ بنایا گیا تھا، اس طرح بعض دوسرے بڑے شہروں میں بھی اسی قسم کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ شہر برصا میں سلطان عثمان خان کی " اولو جامع " سے متصل کتب خانے کو مرکزی پبلک لائبریری قرار دیکر گردونواح کے بعض کتب خانوں کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔ اس سے بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے ۔ خاص طور پر باہر سے آنے والے محققوں کے لیے جو ۔ اب برصا کے اس مرکزی کتب خانے میں وہ سب ذخائر دیکھ سکتے ہیں۔ جو پہلے فاصلوں پر منتشر تھے۔

اس نئے نظام کے ماتحت کتب خانوں کی فہرستیں رومن الف ۔ با میں نئے سرے سے

مُرتّب ہو رہی ہیں۔ جو حضرات عربی و فارسی کی کتابوں کے اسماء ردمن الف۔ بائیں پڑھنے کے عادی نہیں ان کو تھوڑی دِقّت ہو گی۔ لیکن عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی اصلی فہرستوں کو بھی سنبھال کر رکھ دیا گیا ہے تاکہ جس کو ضرورت ہو، وہ ان کو دیکھ سکے۔ بعض نئی فہرستوں میں اصلی فہرستوں کے نمبروں کا بھی اندارج کر دیا گیا ہے تاکہ پہلے والے حوالوں کو چیک کرنے میں آسانی ہو۔ راقم جب سلیمانیہ اور برصا کے مرکزی کتب خانوں میں کام کر رہا تھا، تب وہاں کے انتظامی عملے میں سے جو لوگ کتابوں کی دیکھ بھال اور شناخت پر مامور تھے، ان میں سے بعض گزشتہ دور کے فاضل تھے۔ وہ عربی خط سے بھی آشنا تھے۔ ان کی اعانت سے مطلوبہ مخطوطوں کا آسانی سے سراغ لگایا جا سکتا تھا۔

سلیمانیہ میں فاضل نادر رجال ادغلی (" سلیمانیہ کتب خانہ سی باش اوزمانی " بخطہٖ) اور کتب خانہ، عمومی برصا میں محمد اوز (" بورسہ ایل حلق کتب خانہ سی تصنیف ماموری " ۔ بخطہٖ) نے خاص طور پر راقم کی مدد فرمائی۔

مختلف علوم کے ماہرین و محقّقین کی یلغاروں کے باوجود، ترکی کے کتب خانوں میں محفوظ نوادرات کا احاطہ تاہنوز نہیں ہو سکا۔ مختلف ذخائر میں جو نادر مخطوطے موجود ہیں وہ سب کے سب تاحال سامنے نہیں آئے۔ ہر ایک متلاشی و محقّق خصوصاً اپنے ذوق کی کتابیں تلاش کرتا ہے۔ بسا اوقات فہرستوں میں جو نام لکھے ہوتے ہیں ان سے مُغالطہ ہوتا ہے اور مشہور و معروف نام دیکھ کر مخطوطے کو مزید مطالعے کے لیے نکلوایا نہیں جاتا۔ حالانکہ یہ ممکن ہے کہ نام لکھنے میں غلطی ہوئی ہو اور نام کچھ ہو اور متن کچھ اور ہو۔ بعض مُجلّدوں میں ایک سے زیادہ مخطوطے ایک ساتھ باندھ دیے گئے ہیں۔ مگر فہرست میں نام صرف پہلے نسخے کا ہو سکتا ہے بعض تصنیفات کے بے نام ٹکڑے بچ گئے ہیں۔ جن کی شناخت کے لیے وقت درکار ہے۔ جب تک ایک مخطوطے کے تفصیلی مطالعے سے ان کی محتویات کا اندراج سامنے نہ ہو تب تک محض فہرست میں لکھے ہوئے نام سے ان کی شناخت، مشکل ہو گی۔

ایک سو سال سے زیادہ عرصے کے دوران البتہ محقّقوں نے بعض نادر و نایاب کتابوں کا سراغ لگایا ہے۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

○ بیرونی کی محقّقانہ مصنّفات میں سے اکثر کے مخطوطے استنبول کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، جن میں سے بعض کے متون و تراجم کو پہلی بار گزشتہ صدی میں شائع کیا گیا۔ ۱۸۸۳ میں جرمن اسکالر ایڈورڈ سخاؤ " کتاب ماللھند (الخ) " کے ان نسخوں کا مقابلہ کیا جو نور

عثمانیہ اور کوپرولی میں محفوظ تھے اور متن کا مقدمہ لندن سے ۱۸۸۷ء میں شائع کیا۔

○ بیرونی کی دوسری اہم تصنیف "الآثار الباقیہ" کے مخطوطے ایا صوفیا (حالا در سلیمانیہ) نور عثمانیہ، بایزید اور توپ کاپی سرای کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں جن کی مدد سے ایڈورڈ سخاؤ نے ۱۸۹۰ء میں برلن سے کتاب کا عربی متن شائع کیا۔

○ ترک محقق مرحوم زکی ولیدی طوغان نے بیرونی کی کتاب "تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن" کا واحد مخطوطہ کتب خانۂ فاتح (نمبر ۳۳۸۶) میں دریافت کیا اور اس پر محققانہ مقالہ لکھا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں ہندوستان کے محکمۂ آثار قدیمہ کے "میمائر نمبر ۵۳" کے طور پر دہلی سے شائع ہوا۔ بعد میں طنجہ (مغرب) کے فاضل محقق مرحوم محمد بن تاویت الطنجی نے اس نادر مخطوطے کا پورا متن شائع کیا۔

○ بیرونی کی "کتاب الصیدنہ" کا سنہ ۶۶۸ھ میں لکھا ہوا قدیم نسخہ برصا کے مرکزی کتب خانے (رقم ۱۴۹) میں محفوظ ہے (۱) جس کے ساتھ مقابلہ کرکے ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان سے اس کا متن شائع ہوا۔ راقم نے کتب خانۂ برصا میں بیٹھ کر اس مخطوطے کو شروع سے آخر تک پڑھا اور اس میں جڑی بوٹیوں، عقاقیر اور ادویہ کے جو سندھی اور ہندی نام پائے جاتے ہیں ان کو ان کی صحیح صورتوں میں ضبط کرنے کی کوشش کی۔

بیرونی نے سنسکرت سے جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ان میں سے صرف دو باقی بچ گئی ہیں۔ ایک "پاتنجلی" اور دوسری "کرن تلک" (۲) پاتنجلی کا مخطوطہ (کتاب پاتنجل فی الخلاص من ارتباک) استنبول کے کتب خانہ کوپرولی زادہ میں (نمبر ۱۵۸۹ ورقہ ۶۸) محفوظ ہے جس کو جرمن مستشرق ہلمٹ رٹر نے دریافت کیا اور اس پر کام کیا۔

بیرونی نے ہندوؤں کے مذہبی اعتقادات کے سلسلے میں خصوصاً "بھاگ ود گیتا" اور پاتنجلی" کا محققانہ مطالعہ کیا اور ان اعتقادات کی فلسفیانہ بلکہ موحدانہ تشریح کی طرف توجہ دلوائی۔ کوپرولی زادہ میں محفوظ "کتاب پاتنجل الهندی" کے متن کے شروع والے الفاظ (بیرونی کے عربی ترجمے کی صورت میں) جو راقم نے مخطوطے سے قلمبند کیے، بصیرت افروز ہیں۔

" امجد لمن لیس فوقه شی وامجد من هو مبداء ؟ لا اله ؟)

(میں اس کی تمجید کرتا ہوں جس سے اوپر اور کوئی چیز نہیں اور اس کی تمجید کرتا ہوں جو معبودیت کا مبدا ہے)

ترجمے کے آخر میں بیرونی نے اپنے ارادے کا اظہار کیا ہے کہ وہ عن قریب ہندوؤں

کی تہذیب پر ایک تفصیلی کتاب لکھیں گے۔

و ساعمل باذن اللّٰہ کتابا فی حکایہ شرایعھم و الابانۃ من عقایدھم والاشارۃ الی مواضعاتھم و اخبارھم و بعض المعارف فی ارضھم و بلادھم یکون عدۃ لمن رام مداخلھم و مخاطبتھم ان یشاء اللّٰہ فی الاجل و کشف المواضع من المقام العلل۔

بیرونی نے بعد میں "کتاب الہند" لکھ کر اپنے اس ارادے کی تکمیل کر دی۔

بیرونی کی جواہرات کے متعلق "کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر" کا واحد مکمل مخطوطہ کتب خانۂ توپ کاپی سرای استنبول میں محفوظ ہے، جس کے ساتھ مقابلہ کرکے پروفیسر کرینکو نے اس کا متن سنہ ۱۳۵۵ھ میں حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔ بعد میں اس متن پر مبنی انگریزی ترجمہ جناب حکیم محمد سعید، صدر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کی مساعی جمیلہ سے تیار ہوا جو مزید تنقیح و تحقیق کے ساتھ راقم کے زیرِ نگرانی نیشنل ہجرہ کونسل اسلام آباد سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔

صنعت اصطرلاب پر بیرونی کی محققانہ تصنیف "کتاب استیعاب فی وجود الممکنۃ فی صنعۃ الاصطرلاب" کا مخطوطہ سلیمانیہ میں کتب خانہ اباصوفیا (رقم ۵۲۰۶) میں محفوظ ہے۔ راقم نے اس کا نسخہ ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۳ء کو کچھ لمحوں کے لیے دیکھا۔ شروع کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بیرونی نے ابوسہل عیسیٰ بن یحییٰ الطبری کے لیے لکھی۔

یہ تو بیرونی کی مصنّفات کا ایک موضوع تھا۔ جس پر ترکی کے کتب خانوں میں محفوظ نادر مخطوطوں کا تذکرہ ہوا۔ لیکن دوسرے علوم و فنون پر بھی نایاب قلمی نسخے محفوظ ہیں جن کی اہمیت کو ان علوم و فنون کے ماہرین سمجھ سکتے ہیں، مثلاً عربی شعر و ادب کے متعلق استاذ مرحوم پروفیسر میمن نے ان نادر مخطوطات کا سراغ لگایا جو استنبول کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ چند مثالیں جو استاذ مرحوم کی دستخط شدہ یادداشتوں سے منقول ہیں، ملاحظہ ہوں:

۱۔ دیوان امری القیس، بروایہ ابی ہلال خربنداز، کتب خانۂ ولی الدین افندی در بایزید (رقم ۲۲۸۳)

۲۔ تمثال الامثال، تصنیف قاضی القضاۃ جمال الدّین المحاسن محمد بن علی بن محمد بن ابی بکر القرشی العبدری الشیبی المکی الشافعی، سنہ ۸۳۵ھ کی تصنیف، کتب خانۂ نور عثمانیہ (رقم ۳۰۵۳)

۳۔ کتاب الایّام، تصنیف الفراء، کتب خانۂ لالہ لی (رقم ۱۹۰۳)

۴۔ مسائل نافع بروایت ابن الانباری، [illegible] تصنیف الفراء، کتب خانۂ ملا مراد (رقم ۳۰۹)

۵۔ کتاب طبقات النحویین و اللغویین والکوفیین تالیف الامام العلامہ ابی بکر محمد بن الحسین الزبیدی۔ کتب خانۂ نور عثمانیہ (رقم ۳۳۹۱)

۶۔ رسالہ الوزیرابی القاسم الحسین بن المغربی الی ابی العلاء ابن سلیمان المعری و واخیہ۔ کتب رسالہ الوزیر (رقم ۱۳۹۷، نسخہ جیدۃ و رقم ۱۲۷۲ حی رؤیۃ)

ایک جگہ پر استاذ نے یہ لکھا ہے کہ وقت کے بڑے ادیب ابو مسلم (۳۰۵ ھ ۳۹۹ھ) کی عملی و ادبی مجلسوں کے تذکرے "مجالس ابی مسلم" کا نایاب نسخہ کتب خانہ کوپرولی زادہ میں محفوظ ہے۔

حال ہی میں ترک محقق و صاحب معارف فواد سزگین نے (فرینکفورٹ سے) نادر اسلامی مخطوطات کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اور کئی جلدیں چھپ چکی ہیں۔ان میں کافی مخطوطات وہ ہیں جو ترکی کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ بہرحال۔ جو محقق و متلاشی ترکی کے کتب خانوں کو دیکھتا ہے تو اس کو اپنے علم و قیاس کی روشنی میں نایاب مخطوطے نظر آتے ہیں۔ اس کی ادنیٰ مثال راقم کی ہے۔جب مجھے علمائے سند و ہند کی مصنفات کی تلاش میں ترکی کے کتب خانوں کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تو مختلف موضوعات پر ایسی کتابیں نظر آئیں جو میرے محدود علم و قیاس کی روشنی میں گویا نوادرات میں سے تھیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

○ جدول السہام: یہ جدول ایک ورق (دو صفحوں) کا مخطوطہ ہے اور بیرونی کی تصنیف ہے۔ ۱۹۶۳ء میں میں نے اس کو کتب خانۂ عثمانیہ (رقم ۷ / ۸۸۳۲ / ۲۵۳۳) استنبول میں دریافت کیا غالباً اس سے پہلے یہ ورق کسی کے علم میں نہ آیا تھا۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں شائع کردہ "غرۃ الزیجات" کے ایڈیشن میں۔میں نے بیرونی کی تصنیفات کے سلسلے میں اس کی نشان دہی کر دی ہے۔

○ عجائب الدنیا تصنیف المسعودی، کتب خانہ حسین چلبی حالا درسلیمانیہ (رقم ۳۶، عموی)

○ مختصر من سیرۃ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تالیف عبدالرزاق۔ کتب خانۂ ایل خلق منیسا (رقم ۱۳۳۲) قدیم نسخہ۔ غالباً قرن سابع یا ثامن کا لکھا ہوا۔

معارف مولانا شمس الملۃ و الدین التبریزی سنہ ۷۰۱ء میں لکھا ہوا یہ مخطوط کتب خانۂ ایل خلق منیسا (رقم ۱۹۹) میں محفوظ ہے۔ شمس تبریزی کے اقوال پر مبنی ہے اور اس موضوع پر نہایت ہی اہم کتاب، میری دانست میں کسی محقق نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔لیکن بعد میں ایران کے فاضل دکتر ناصر الدین صاحب الزمانی کی تالیف بعنوان "خطِ سوم" (تہران۔ مرداد ماہ۔ ۱۵۳۱ شمسی ۱۹۷۲ء) نظر سے گزری یعنی "خطِ سوم دربارۂ شخصیتِ سخنان و اندیشہ ی شمس تبریزی" جس سے معلوم ہوا کہ دکتر ناصر الدین نے غالباً کتب خانۂ منیسا کے مذکورہ

مخطوطے سے فائدہ اٹھایا۔

○ احصا، الایقاعات : تصنیف فارابی یہ مجموعہ مخطوطات کتب خانۂ ایل حلق منیسا میں رقم ۱۷۰۵ پر محفوظ ہے۔ ایک ہی مجلّد میں، موسیقی پر دس مختلف رسائل کا مجموعہ ہے جس میں فارابی کا "احصا، الایقاعات" نمبر۲ پر ہے۔ اس میں تانوں کی تشریح ہے جو اس فن پر سب سے پہلی تشریح ہے بعض تانوں، ترانوں اور ان کے ادوار کو حروف صناعت سے واضح کیا گیا ہے مثلاً ایک نوٹیشن اس طرح ہے۔

تتن تتن تتن	تتن تتن تتن
الدور الاول	الدور الثانی
فقرۃ (؟) المجاز	فقرۃ (؟) الاعتماد

ہندوستانی موسیقی میں "تان" کا مفہوم عرب، ترک ایرانی موسیقی سے آیا جس کا خالق غالباً فارابی تھا۔ "تان" ہی کی مناسبت سے بعد میں لفظ "تال" (ضروب کے معنوں میں) استعمال ہوا۔

علمائے سندھ و ہند کی تصنیفات، ترکی میں

ان مصنفات کی فہرست ضمیمے کے طور پر آخر میں شامل ہے۔ (بہ نظر اختصار ضمیمہ حذف کیا جاتا ہے، رسالۂ تحقیق کے شمارہ ہفتم میں دیکھا جاسکتا ہے)۔ جن کتب خانوں میں یہ مصنفات محفوظ ہیں ان کتب خانوں کے ناموں اور ان کی فہرستوں میں مرقوم نمبروں سے ہر ایک کتاب کی شناخت کر دی گئی ہے۔ بعض مخطوطات کو راقم نے نکلوا کر دیکھا اور کتاب اور مصنف کے ناموں کی تصدیق کی۔ لیکن اکثر کے صرف نام جس طرح فہرستوں میں لکھے گئے تھے اسی طرح قلمبند کر لیے۔ ضمیمے میں بھی یہ نام اسی طرح لکھے گئے ہیں تاکہ فہرستوں کی ورق گردانی کرتے وقت شناخت میں آسانی ہو۔ البتہ کسی ایک ہی کتاب اور اس کے مصنف کا نام جداجدا فہرستوں میں مختصر کرکے کئی جداجدا صورتوں میں لکھا گیا ہے۔ ضمیمے میں بھی یہ نام ان ہی صورتوں میں دیے گئے ہیں، تاہم اہل علم کو کسی بھی کتاب یا اس کے مصنف کا صحیح نام سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

بعض اہم کتابوں میں سے، مثال کے طور پر چند کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ باوجود ان کی اہمیت کے، اہل علم کے ہاں بھی یہ کتابیں اتنی معروف نہیں۔

واردات فی التصوف: یہ حضرت غوث بہاء الدین زکریا کی تصنیف ہے اور کتب خانہ فاتح (حالا در سلیمانیہ) میں رقم ۲۸۹۰ پر محفوظ ہے۔ کتاب کے شروع میں مصنف کا نام جس ادب و احترام سے لیا گیا ہے اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ تصنیف حضرت غوث بہاء الدین زکریا کی ہے۔

الحمد لله رب العالمين و الصلوة على سيدنا محمد وآله الطاہرين قال الشيخ الامام العالم الكامل المحقق المدقق قطب الاولياء العارفين سلطان العلماء فى العالمين بهاء الملة و الحق و الدين قدس الله روح و نور ضريحه

تفسیر تبصیر الرحمان و تفسیر المنان: یہ بمبئی (میم) میں مدفون عالم الشیخ زین الدین علی بن علی الاموی المہایمی کی مشہور و معروف تفسیر ہے اور چھپ چکی ہے اس کا ایک قدیم مخطوطہ سلیمانیہ میں کتب خانہ داماد ابراہیم پاشا (رقم ۱۲۰) میں محفوظ ہے جو مصنف کی وفات (۸۳۵ھ) کے چونسٹھ سال بعد شوال ۸۹۹ھ میں لکھا گیا۔

شفاء المشتفی وکفایۃ المکتفی فی شرح خواص القرآن:

یہ مخطوطہ سلیمانیہ میں کتب خانہ آیا صوفیا میں (رقم ۳۸۲) کے تحت محفوظ ہے۔ یہ نویں صدی ہجری کا نسخہ ہے جس کے کاتب مفتی محمود بن محمد بن جلال الحسین نے جمعے کی شب ۱۹ رمضان سنہ ۸۴۸ھ میں لکھ کر ختم کیا۔ اصل تصنیف امام تمیمی (؟) کی تھی جس کی محمد بن عبداللہ بن محمد الحسینی نے اصلاح کی اور نئے سرے سے اس کو گیارہ ابواب میں مرتب کیا۔ مصنف حسینی مکران کے جید عالم تھے اور شہر تربت میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کم از کم آٹھویں صدی ہجری میں ہوئی گی۔ جس سے ظاہر ہے کہ شہر تربت اُس وقت اہل علم کا مولد و مسکن تھا۔ فاضل مصنف نے اپنی شرح و تفسیر کا مقدمہ اس طرح لکھا ہے:

" يقول العبد الراجى رحمة ربه الاحد ليجيره من سكرات الموت و ضيق اللحد ابواسحاق محمد بن عبدالله ابن محمد الحسينى المكرانى مسكناً و التربتى مولداً (فقد) وقع لى كتاب عتيق بخط انيق على قرطاس من قد اصابه

الاء وھوفی شرح بعض آیات القرآن العظیم تالیف الامام التمیمی رضی اللہ عنه وھو بردون بعض حکماء الھند فوجدته فی غایته السقامه و نهایه التحریف فبذلت مجھودی حتی حصل لی الوقوف علی بعض التصحیف فاردت مجھودی حق حصل لی الوقوف علی بعض التصحیف فاردت ان التقط منه کا کثرت الحاجته الیه ۔ ورتبة علیٰ مقدمه ما فتح بھا الکتاب یتلوہ احدی عشر باباً وسیمه شافاء المکتفی وکفایه المکتفد

ضوء القند فی قدح الزند : تصنیف سامورالھندی جو سلیمانیہ میں کتب خانہ بغدادلی دھی افندی (رقم ۹۰۲) میں محفوظ ۔ مجھے متاسفاً میں اس کتاب کے مخطوطے کا مطالعہ نہ کر سکا۔ سامور غالباً وہی نام ہے جو پرتگیزیوں کے یہاں " زامورتن " کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب اصل میں سامور نے ہندی (جنوبی ہند کی کسی زبان) میں لکھی اور صالح ابوالفتح المغربی المالکی مراکشی نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

کتاب جمع المناسک و نفع الناسک :

یہ علامہ رحمت اللہ بن القاضی عبداللہ السندی (وفات ۱۰۴۳ھ) کی مشہور و معروف تصنیف ہے۔ فاضل مصنف اصل میں سندھ کے تاریخی شہر دربیلہ (حالا ضلع نوشہرو فیروز) کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ایک سو سے زیادہ ماخذوں کے مطالعے سے یہ کتاب صفر سنہ ۹۵۰ھ میں لکھ کر پوری کی۔ اصل جامع متن کے علاوہ اس کتاب کے دو اور مختصر متن " المتوسط " اور " الصغیر " بھی متداول رہے ۔ ترکی کے ان کتب خانوں میں اس کتاب کے کئی مخطوطے پائے جاتے ہیں۔ ان میں اقدم اور جیّد نسخہ کتب خانہ جمع بایزید والا (رقم ۱۹۳۱) ہے جس کو کاتب احمد بن مصطفی العودی الرومی نے رجب ۱۰۰۹ھ میں لکھ کر پورا کیا۔

محاضراتِ میمنی

استاذ عبدالعزیز المیمنی (م ۱۹۷۸ء) کے مؤرّخ علمی ارشادات

تحریر کردہ

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ :

محاضراتِ میمنی

استاذ عبدالعزیز المیمنی (مرحوم) علمی دنیا میں ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ عربی لغت، شعر و ادب میں یکتائی روزگار تھے۔ دوسرے متعلقہ علوم و معارف میں بھی ان کی معلومات نہایت وسیع اور بالمانہ تھیں۔ علوم اسلامیہ و عربیہ کے انحطاط والے تشویشناک ماحول میں اس برصغیر میں استاذ عبدالعزیز میمن جیسے جبل العلم کا پیدا ہونا اور پنپنا ایک معجزے سے کچھ کم نہیں تھا۔ قوت حافظہ کچھ ایسا پایا تھا کہ اسّی برس کے لگ بھگ عمر میں بھی وہ ایک چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا تھے۔

آخری عمر بہادر آباد، کراچی میں گوشۂ تنہائی میں بسر کی۔ ۱۹۳۱ء میں جب کہ راقم الحروف ایم۔ اے عربی کے طالب علم کی حیثیت میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچا تو استاذ میمن اس وقت پروفیسر و صدر شعبۂ عربی تھے۔ بی۔ اے تک کالج کی تعلیم کا مرکز و محور چند درسی کتابیں تھیں جن کو ٹائم ٹیبل کے مطابق پڑھایا جاتا تھا اور ہم ان درسی کتابوں کو ہی رٹ کر امتحان میں اچھے نمبر لیتے تھے۔ شعبۂ عربی علی گڑھ میں جب استاذ میمن کے سامنے آئے تو ان کے لکچروں کا طریقہ کچھ اور پایا۔ درسی کتاب کا متن تو پڑھا لیتے تھے لیکن زیادہ وقت متن کے خاص نکات، اشعار و معانی کی تشریح و توضیح میں صرف کیا کرتے تھے۔ اور پھر بات سے بات نکلتی تھی اور عربی شعر و ادب کے وسیع میدان میں کہیں سے کہیں جا نکلتے تھے۔

متقدمین کے مصادر و ماخذوں کی نشان دہی کرتے اور کبھی مخطوطات و نوادر کے نایاب نسخوں کے عرض و جوہر کو بیان فرماتے۔ ایم۔ اے کے پہلی سال میں تو ہم میمن صاحب کے لکچروں کو کچھ ضرورت سے زیادہ محسوس کرنے لگے البتہ ایک سال کی صحبت کے بعد جب ہم ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے فائنل میں منتقل ہوئے تو جا کر ہوش سنبھالا کہ استاذ میمن ہی اعلیٰ تعلیم کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے صحیح معنوں میں ہمیں علمی مباحث و مصادر سے

روشناس کراتے ہیں بلکہ علم کا دریا بہا دیتے ہیں تاکہ کوئی بھی طالب علم تشنہ لب نہ رہ جائے۔

استاذ کا علم و فضل تو ہمارے احاطۂ ذہن سے باہر تھا لیکن راقم کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ عربی ادب کے متعلق استاذ کے ارشادات گرامی اتنے قیمتی ہیں کہ ان کو اپنی رہنمائی کے لیے قلمبند کرتا جاؤں۔ یہ خیال ایک مدت تک دامن گیر رہا لیکن دسمبر ۱۹۴۲ء میں، میں نے اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ چنانچہ شام کو ٹہلتے وقت استاذ کی صحبت میں جب کبھی علمی باتیں ہوتیں تو رات کو کمرے میں آکر جو کچھ یاد رہ جاتا تھا لکھ لیتا تھا۔

طالب علمی کے زمانے کا ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا یہ کاپی بک میرے ہاں محفوظ رہ گیا ہے ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک استاذ کی صحبتیں نصیب ہوئیں لیکن افسوس کہ بعد کی بالکل ہی چند صحبتوں کی یادیں اس ڈائری میں محفوظ رہ گئی ہیں۔

یہ ایک طالب علم کی ڈائری ہے جس میں وہ سب نقص موجود ہیں جو ایک ایم اے کے طالب علم کی لکھی ہوئی یادداشت کی خامیوں میں ہوسکتے ہوں۔ خاص طور پر ایسا طالب علم کہ جس نے ۱۹۴۱ء۔ ۱۹۴۲ء میں جو کچھ لکھا وہ استاذ نے املا نہیں کرایا بلکہ جس طرح ان سے سنا اور سمجھا گیا اس کو گھنٹوں بعد حافظے سے لکھا۔ لہٰذا اس یادداشت کو ایک طالب علم کی خامیوں پر محمول کیا جائے اور استاذ المیمنی کی طرف ان کو قطعی منسوب نہ کیا جائے۔

میں جناب ڈاکٹر نجم الاسلام کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس ڈائری کو بتمامہ اپنے بیش بہا مخزن تحقیق میں شائع کرنے کی ترغیب دی، خود ہی مسوّدے کو پڑھا، صاف کیا اور اس کو احسن طریقے پر شائع کیا۔ قبلاً اس کے صرف چند اجزاء چھپے تھے۔

۱۸ نومبر ۱۹۹۰ء

نبی بخش

دسمبر ۱۹۴۲ء

استاذ نے یہ اشعار پڑھے اور فرمایا کہ دمامینی کے ہو سکتے ہیں مگر غالباً متاخرین میں سے کسی کے ہیں۔ پھر یہ اشعار اپنے قلم سے لکھ کر دیے:

ایا علماء الھند طال بقاؤکم
و زال بفضل اللہ عنکم عناؤکم
رجوتم بعلم العقل فوز سعادۃ
و اخشی علیکم ان یخیب رجاؤکم
فلا فی تصانیف الاثیر ہدایۃ
ولا فی اشارات ابن سینا شفاؤکم
ولا طلعت شمس الھدی من مطالع
فاوراقھا دیجور کم لا ضیاؤکم
اخذتم علوم الکفر شرعا کانما
فلاسفۃ الیونان ہم انبیاؤکم

۲۸ دسمبر ۱۹۴۲ء

استاذ نے فرمایا کہ سیوطی نے اپنی تصانیف میں نقالی سے کام لیا ہے اور اس میں اس کے علم و فضیلت کا مبلغ زیادہ بلند نہیں۔ سیوطی کی تصانیف کا فائدہ اس وقت صرف یہ ہے کہ مصنف نے جن کتب سے حالات نقل کیے وہ آج کل معدوم ہیں۔ فرمایا کہ شرح شواہد المغنی از روے علم و نظر کچھ کام کی نہیں۔ جو اشعار کامل مبرد میں آئے ہیں ان کا بھی پتا نہیں لگا سکا۔ فرمایا کہ شواہد کے سلسلے میں عبدالقادر بغدادی کی تین تصانیف (خزانۃ الادب فی شرح کافیہ رضی، شرح شافیہ رضی، شرح مغنی اللبیب) بے نظیر ہیں حالانکہ بغدادی بہت بعد کا ہے (خزانۃ الادب فی شرح کافیہ رضی، اور شرح شافیہ رضی چھپ گئی ہیں۔ شرح مغنی اللبیب نہیں چھپی)۔ فرمایا کہ مرآۃ الزمان لسبط ابن الجوزی ایک بے نظیر کتاب ہے اور چھٹی صدی کے حالات اس میں لکھے گئے ہیں؛ اس کے متعلق مصنف ثقہ ہیں اور کوئی تصنیف ان حالات میں اتنی معتبر نہیں یعنی حروب صلیبیہ کے حالات جو اس جلد میں ہیں نایاب ہیں۔ ابن جوزی ان کے نانا تھے اور حنبلی تھے۔ سبط خود دمشق میں آگئے تو ملک معظم عیسیٰ سے وابستگی کی وجہ سے حنفی ہوگئے۔ فرمایا کہ مرآۃ الزمان، تاریخ کامل لابن الاثیر کے درجے کی ہے اور اس سے

کچھ کم نہیں۔ ابن الاثیر کے بعد تک کے کچھ حالات مرآۃ الزمان میں موجود ہیں۔ سبط دمشق میں اور ابن اثیر بغداد میں تھا

استاذ معجم الادبا، کے حواشی لکھ رہے ہیں (اب وہ مجمع العلمی دمشق میں ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۸ء میں چھپ چکے ہیں) استاذ نے فرمایا کہ ادبا، میں نے سات آٹھ مرتبہ پڑھی اور ابن خلکان پر اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس سلسلے میں بتایا کہ کیسے مارغیولوث نے رشید بن زبیر اور اس کے بھائی مہذب کے قصائد میں جو انھوں نے ایک دوسرے کے جواب میں لکھے فاحش غلطی کی ہے اور مہذب کے قصیدے کے مطلع کو رشید کے مطلع کے اول میں ضم کر دیا ہے۔ استاذ نے اس کی تصحیح اپنے بگینہ مسوّدے کے صفحہ ۲۰ پر کی ہے جو انھوں نے دکھائی اور رشید کا مقامہ " المنیۃ الالمعی و منیۃ المدعی " جو اور شر نے استاذ کو قسطنطنیہ میں دیا تھا وہ دکھایا۔ اس مقامہ کے نام میں بھی مارغیولوث پوری تحقیق نہیں کر سکا اور " منیہ المدعی" کے بدلے بُلغۃ المدعی لکھ دیا ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید بڑا علامہ وفاضل تھا۔ وقت کی سیاست میں ماہر تھا۔ اس مقامہ سے ظاہر ہے کہ وہ انشاء کا استاذ تھا اور اس قصیدے سے ثابت ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کا شاعر تھا۔ استاذ نے فرمایا کہ یہ قصیدہ (ادبا، میں) اتنا خوب صورت ہے کہ میں اس کی داد نہیں دے سکتا۔

میں انساب سمعانی میں اہل سند کے تذکرے دیکھ رہا تھا۔ استاذ نے فرمایا کہ سمعانی نے محدثین کے چند نام دیے ہوں گے اور فرمایا کہ وہ عربی علما، جن کا ہندو سند سے تعلق رہا ان کے متعلق اتنے منتشر معلومات ہیں کہ ان کو کہاں تک خیال میں رکھا جائے۔ فرمایا کہ فلاں نحوی اس کے متعلق میں نے کل ایک کتاب میں دیکھا کہ وہ ہندوستان میں آیا ہے حالانکہ یہ اطلاع اس کے متعلق صرف اسی ایک کتاب میں ہے، دوسری جگہ اس کے ترجمے میں یہ موجود نہیں۔ ابن نجار مورخ جس نے ذیل تاریخ بغداد لکھی وہ لاہور میں آیا تھا۔

تقریباً ۲۲ دسمبر ۱۹۳۲ء کو استاذ نے شعراء جاہلیت کے اشعار و دیوان کے متعلق یوں فرمایا۔

" اشعار ستہ " اعلم شنتمری کی کتاب پر مستشرق اہل ورڈٹ نے ڈاکہ ڈالا اور اس کو عقد یمین کا نام دے کر شایع کر دیا۔ اعلم نے ستہ کو منتخب کیا اور شرح لکھی۔ اشعار ستہ اندلس میں کورس میں داخل تھی چنانچہ ابو حیان غرناطی نے لکھا ہے کہ " اشعار ستہ " دیکھ رہے تھے۔ امرؤالقیس کے شعر کے متعلق اعلم شنتمری کی روایت نصف تک پہنچتی ہے۔ پوری روایت قدیم

ترین اور بہترین ابوالحسن الطوسی کی ہے جو ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں اور ایک دوسری روایت ابوسعید خربنداز عن ابی جعفر الکوفی المعروف بندان کی ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ چونکہ مجھے امرؤالقیس کے دیوان پر کام کرنے کا خیال تھا اس لیے میں دونوں روایتیں اپنے دوران سفر نقل کروا کے لایا تھا۔ لیکن ابھی فرصت نہیں کہ اس کام میں ہاتھ ڈالوں حالانکہ امرؤالقیس کے شعر دیوان وغیرہ کے متعلق جتنے معلومات میرے ہاں جمع ہیں غالباً اتنے اور کہیں نہیں ہیں اور جتنا درجہ امرؤالقیس کو دیا گیا ہے، اتنی بڑا کم توجہ اس کے شعر پر کی گئی ہے۔ دو سو برس پہلے اغانی کے (نقل کردہ) اشعار امرؤالقیس چھاپ دیے گئے۔ لیکن یورپ والوں نے پورا دیوان نہیں چھاپا۔ ضرورت ہے کہ طوسی کی روایت کو چھاپا جائے کیونکہ امالی کے مصنف بھی اس کو نقل کرتے ہیں، اور اس کا مقابلہ خربنداز کی روایت سے کیا جائے۔

۲۔ زہیر کے دیوان کی روایت شنتمری ایک تہائی تک پہنچتی ہے۔ دیوان زہیر مکمل مصر میں چھپ چکا ہے مع دیوان کعب بن زہیر کے

۳۔ عنترہ کا دیوان صرف اشعار ستہ سے مل سکتا ہے

۴۔ عروۃ کے دیوان کی ایک روایت اعلم اور ایک ابن سکیت سے ہے یہ دونوں چھپ چکے ہیں

۵۔ دیوان علقمہ صرف اشعار ستہ میں موجود ہے اور الجزائر سے علاحدہ بھی چھپ چکا ہے ابن ابی شنب نے اس کو ایڈٹ کیا ہے۔

۶۔ طرفہ: مکمل روایۃ ثعلب کوفی کی ہے۔ اشعار ستہ میں جو ہے اعلم شنتمری کی شرح کے ساتھ چھپ چکی ہے۔

شروح بر دواوین:۔

- امرؤالقیس (بطلیوسی کی شرح)
- نابغہ (خمس دواوین العرب میں چھپی۔ اعلم والی روایت چھوڑ دی گئی)
- طرفہ (اعلم کی روایت فرانس میں چھپ چکی)
- علقمہ (محمد بن ابی شنب الجزائری نے اعلم کی شرح چھاپی)
- عروۃ (ابن سکیت کی شرح)
- زہیر (لائیڈن میں اعلم والی شرح چھاپی گئی) نیز مصر میں ثعلب کوفی کی شرح دار الکتب والوں نے چھاپی۔
- لبید (ابوالحسن الطوسی کی روایت جس کی جلد دوم کو خالدی نے ویانا میں ایڈٹ کیا۔

پہلی جلد کو لیڈن میں ہوور نے چھاپا۔ ابھی کویت والوں نے چھاپ دیا ہے۔

○ شرح دیوان زہیر نسخہ خطیہ فی مکتبۃ الاسکوریال موجود ہے۔

○ شرح بطلیوسی جرتی ۱۱۹ ج ۲ ڈیرن بورغ نے فرانس میں چھاپی دوبارہ سادہ میں۔ جو چھٹی صدی میں کاتب نے لکھی اس کو اسی مستشرق نے شائع کرا دیا۔

○ امرؤ القیس اور نابغہ کی شرحیں جو بطلیوسی نے لکھیں چھاپ دی گیئں اور اعلم شنتری کو چھوڑ دیا گیا۔ شنتری Santa Maria ہے۔ جو پورچوگال میں ہے۔ "اعلم" کے معنی ہیں اوپر کا ہونٹ کٹا۔ "مخزوط الشفۃ العلیا"

عمرو بن کلثوم و حارث بن حلزہ دونوں کے نسخے سلطان محمد فاتح کے کتب خانے میں۔ کرنکو نے بیروت سے چھاپ دیئے۔ ماخلاالمعلقات (یعنی اصل نسخہ قسطنطنیہ والے میں بھی معلقات نہیں ہیں جو لکھا ہے کہ ماخلا المعلقات) اعشی: اسکوریال نسخہ بروایت ثعلب، گایر نے شائع کیا لیکن پوری طرح پڑھ نہیں سکا۔ استاذ نے فرمایا کہ گایر نے چالیس سال اس کتاب پر کام کیا اور اس کے طبع میں اس نے بسلسلہ اعشی اتنی کثیر تعداد میں کتابوں کے حوالجات دیئے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا کہ کسی نے بھی اپنی تصنیف میں اتنی کتب کو رجوع کیا ہو۔ لیکن یہ اس کا رجوع کرنا بالکل مہمل اور فائدے سے خالی ہے مثلاً وہ لکھتا ہے کہ فلانی فلانی کتب میں اعشی کا نام آیا ہے۔ اب اس سے کیا حاصل، ایسے حوالجات صرف حماقت

گایر کو خود استاذ نے کتب خانہ رامپور سے اعشی کے دیوان کے نسخے سے تقابلہ و تصحیح کر کے بھیجا تھا لیکن متن پہلے چھپ چکا تھا۔ گایر نے استاذ کا شکریہ ادا کیا ہے۔

استاذ نے فرمایا کہ میں آپ کو علم کا ایک خلاصہ اور راز بتا دیتا ہوں، وہ یہ کہ

۱۔ علم کو کتابوں کے مقابلے سے وسیع اور پختہ کرو، جو کچھ ہے وہ مقابلہ ہے بشرطیکہ مقابلہ غائر نظر سے کیا جائے، اس سے اصل حقیقت، مصنفوں کا علم میں درجہ، ان کی غلطیاں وغیرہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

۲۔ کسی کتاب کو حقیر مت سمجھو اور ضرور اس کو دیکھو کیونکہ نسبتاً دوسری تصنیف سے گھٹیا ہو لیکن جس وقت و ماحول میں وہ لکھی گئی ہے اس میں دوسری نہیں لکھی گئی۔ اس وجہ سے بہت سے فائدے اس کے مطالعے سے حاصل ہوں گے۔ فرمایا کہ مجھ جیسے انسان کو یہ ضرورت نہیں کہ شذرات الذہب جیسی کتاب کے حوالے دے لیکن میں

نے سوچا کہ شاید کوئی فائدے کی بات حاصل ہو جائے۔ اس لیے میں نے اس کو اٹھایا اور دیکھا کہ مصنّف کے سامنے ایک ابن اھدل نام کے شخص کی تاریخ بھی موجود تھی چنانچہ میں نے دیکھا کہ جو تحریر ابن اھدل سے نقل کی گئی ہے اس میں سے بہت اچھے معلومات حاصل ہو جاتے ہیں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۴۲ء

استاذ نے فرمایا کہ بعد کی جو یہ شروح شواہد لکھی گئی ہیں ان میں خزانۃ الادب ممتاز ہے اس سے پہلے علماء نے جو شروح شواہد لکھی ہیں وہ ضرور قابل قدر ہیں۔ فرمایا کہ شواہد کے اکثر ابیات رضی کی کافیہ میں آ جاتے ہیں، باقی کچھ تھوڑے دیگر کتب مثلاً مغنی اللبیب میں ملتے ہیں۔ سیبویہ کے شواہد نیز رضی (مغنی اللبیب) میں آ جاتے ہیں

تاہم سیبویہ کی کتاب کے شواہد پر پہلے غالباً ابو محمد ابن السیرافی نے لکھا ہے جس کا نسخہ قسطنطنیہ میں کتب خانہ محمد سلطان احمد ثالث میں موجود ہے۔ اسی کا رد ابو محمد اسود اعرابی نے لکھا ہے استاذ نے فرمایا کہ یہ میرے پاس موجود ہے اس کا نام (فرحۃ الادیب) ہے۔ مصر میں اصل موجود ہے۔ لیکن میرے ہاں زیادہ صحیح نسخہ ہے۔ اعلم شنتمری نے شرح لکھی جو مصر کے ایڈیشن میں خود متن کے ساتھ چھپی ہوئی ہے۔ پھر اندلس میں شواہد سیبویہ ابو محمد یوسف بن ابوسعید السیرافی نے لکھی جس کا نسخہ میں نے قسطنطنیہ میں دیکھا اور شاید ایک ہی نسخہ دنیا میں رہ گیا ہے۔ اس شرح پر ابو محمد اسود الاعرابی نے فرحۃ الادیب نام رد لکھا جو میرے ہاں موجود ہے۔

فرمایا کہ ملک النحاۃ حسن ابن صافی (شذرات الذھب) نیز ہندوستان میں آیا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ اس کا تذکرہ کہاں ملتا ہے فرمایا کہ میری تصحیح ارج ادباء سے سب پتہ چل جائے گا۔

سیبویہ کی کتاب میں ایک ہزار شواہد ہیں جن میں سے ۹۵۰ شواہد ان کے استاذ الجرمی(؟) کو معلوم تھے باقی پچاس ان کو بھی معلوم نہ تھے۔ دوسروں نے کوشش کی اور شنتمیلی نے ایک شعر کا پتہ چلایا۔ استاد نے پھر مزید دو کا پتہ چلایا

شاید شروع دسمبر ۱۹۴۲ء

حسب ذیل معلومات استاذ نے ایک روز اپنی گفتگو کے دوران میں بیان کیے تھے اور کچھ اشارات میں نے قلمبند کر لیے تھے لیکن صرف دلچسپی کے لیے۔ اب چونکہ میرا ارادہ ہے کہ جو کچھ بھی استاذ کی زبان سے عربی ادب سے متعلق نکلے قلمبند کر لوں لہذا میں ان اشارات کو

بھی یہاں قلمبند کر لیتا ہوں۔

فرمایا کہ دو پرانے علماء جن کا ہند سے تعلق رہا ہے بڑے علامۃ الدھر تھے۔ ایک ابوبکر دمامینی اور دوم امام صاغانی لاہوری

ابوبکر دمامینی مصر کے جیّد عالم تھے۔ ابن ہشام نے ابو حیان غرناطی کی کتاب کے مقابلے میں "مغنی اللبیب" لکھی ابوحیان اندلس چھوڑ کے مصر میں آیا اور اس کا وقار کافی بڑھ چکا تھا تاہم ابن ہشام نے اپنے حسد کا ثبوت دیا۔ ابوبکر دمامینی نے "مغنی اللبیب" کا رد لکھا۔ ابوبکر اپنے وقت میں مصر میں مالکیوں کا قاضی القضاۃ تھا۔ حوادثِ زمانہ سے مجبور ہو کر علیٰ وجہ سمندر کی راہ اختیار کی اور تقدیر نے اس کو ہندوستان پہنچایا۔ پہلے سورت میں اُترا۔ اس وقت گجرات کا حاکم احمد شاہ تھا، گجرات میں ہی بیٹھ کر اس نے المنہل الصافی فی شرح الوافی لکھی۔ بعد میں دکن چلا گیا اور گلبرگہ میں وفات کی اور وہاں ہی مدفون ہے۔ عروض و قوافی میں اس کی دنیا میں مشہور کتاب ہے اور مصر میں چھپ چکی ہے۔ دمامینی کا تذکرہ الدرالکامنہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب میں مل جاتا ہے۔

امام صاغانی لاہوری اعلیٰ ترین پایے کا لغوی تھا۔ مؤلف لسان العرب اس کا ہم عصر تھا لیکن لسان العرب کا مؤلف کوئی اعلیٰ لغوی نہیں تھا۔ اس نے صرف چار کتابیں جمع کر دی ہیں۔ کتاب غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ لسان العرب کی تنقید پر کام کی ضرورت ہے لیکن فارغ البالی ہو۔ دو اچھے خاصے عربی داں مدد کے لیے ہوں تاکہ غیر ضروری کام حسب اشارت کرتے رہیں اور امام صاغانی کی جملہ تصنیفات نیز سامنے ہوں۔ استاذ نے فرمایا کہ میں نے جو کچھ لسان کے حواشی سے متعلق کام کیا ہے وہ اطمینان سے نہیں کیا اور صرف احباب کے اصرار پر بغیر دلچسپی اور تعجیلاً کیا ہے۔ استاذ نے فرمایا کہ اگر لسان میں وارد اشعار کے معنی، اور ان کی از روئے شواہد حیثیت وغیرہ چیزوں کو لیا جائے تو مصنف کی ہر ایک جلد سے ہزاروں غلطیاں نکالی جائیں۔ فرمایا کہ میں نے لسان کے مطالعے سے اندازہ لگایا ہے کہ اگر اشعار کی غلطیاں لی جائیں تو کم از کم ایک ہزار غلطیاں فی جلد کے حساب سے بیس ہزار غلطیاں ضرور نکالی جائیں۔

امام صاغانی نے پہلے ۸ جلدوں میں صحاح کا تکملہ لکھا، مجموع البحرین لغت میں لکھی اور دونوں کو ملا کر "العباب الذاخر واللباب الفاخر" اعلیٰ ترین لغت کی تصنیف پیدا کر دی۔ العباب میں انھوں نے الفاظ (آخری حروف کے اعتبار سے) الف سے شروع کر کے میم کے لفظ "بکم"

تک پہنچائے تو انھوں نے وفات کی۔

استاذ نے اشعار پڑھے جن میں شاعر نے اس لفظ بکم، کو لے کر کہا ہے کہ اتنا بڑا امام بھی بکم پر آ کے خاموش رہ گیا۔

فرمایا کہ آٹھویں صدی میں مجدالدّین فیروز آبادی نے القاموس میں صاغانی کی کتابوں پر ڈاکہ ڈالا فرمایا صاغانی نے مسلم و بخاری کی متفقہ حدیثیں "مشارق الانوار" میں جمع کر دیں۔ مولوی خرّمی (خرّم علی بلہوری) نے "مشارق الانوار" کا اردو ترجمہ کیا۔

فرمایا کہ بغداد جانے کے بعد صاغانی مصر گیا اور بعد میں مکہ شریف میں سکونت اختیار کی اور خود کو "الملتجی الی حرم اللہ" لکھتے ہیں لیکن کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خانۂ کعبہ میں رہنے کے باوجود وہ یقیناً پھر ایک دو مرتبہ ہندوستان آئے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۴۲ء

آج استاذ نے بتایا کہ لوگ کیسے مروۃ سے خالی ہیں کہ دوسروں کے مایۂ علم پر ہاتھ صاف کرتے ہیں پھر بھی اس کا تذکرہ یا شکریہ نہیں کرتے بلکہ الٹا اگلے کو رنج پہنچاتے ہیں۔ فرمایا کہ مولوی سیّد سلیمان الندوی نے مجھ سے صقلیہ کی عربی تاریخ لی اور چھے برس کے بعد واپس کی اور کہا کہ ہم نے اسی کتاب کی بنا پر تاریخ صقلیہ اُردو میں لکھوا کر دی ہے۔ یہ تاریخ جو ریاست علی ندوی نے اردو میں شایع کی ہے، آج لائبریری میں میری نظر سے گذری۔ جس میں صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے مقدمۂ کتاب "بشار بن برد"، "ابن رشیق اور "الملتف" سے استفادہ کیا ہے، پھر بھی میمن صاحب کا ذکر نہیں کیا اور ان جملہ تحریروں کو اپنے رنگ میں ادا کیا ہے گویا کہ وہ اپنی طرف سے معلومات پیش کر رہے ہیں۔ نہ صرف اتنا بلکہ وہ معارف میں نکلی ہوئی بحث کا حوالہ دیتے ہیں حالانکہ اس میں انھوں نے معافی مانگ کر میرا آخری مضمون بھی شایع نہیں کیا۔ بعد میں استاذ نے یہ تاریخ صقلیہ منگوا کر ان صفحات کی طرف توجہ دلائی اور ورق گردانی میں دیکھا گیا کہ کتاب ازروئے محققین غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور استاذ نے فرمایا کہ جن کے علم کا مبلغ یہ ہے ان کے ساتھ بحث کرنا یا ان کے اوپر کچھ لکھنا میرے شایان شان نہیں۔ ڈاکٹر محمد یوسف نے کتاب کو دیکھ کے فرمایا کہ یہ صاحب (یعنی صاحب کتاب) مؤلف ہیں لیکن محقق نہیں اور نہ محقق ہونے کے لائق ہیں۔

(الف) آج استاذ نے حسب ذیل علماء کا ذکر کیا جو کہ ہندوستان آئے تھے۔

۱۔ دھلی (دھلوی) "ذیل تذکرۃ الحفاظ" بشرطیکہ یہ ذہلی کی تصحیف نہ ہو

۲۔ نزیل الھند تہذیب التہذیب ص ۱۹۱ ج ۱

۳۔ حدیث تہذیب التہذیب ص ۲۳ یا ۱۶ ج ۲

(ب) استاذ نے فرمایا کہ عربی کے الفاظ جری ۔ ضُحلی (کذا) عسل (بن ذکوان) ایسے ہی پڑھے جاتے ہیں

آج کتاب الافعال لابن القطاع کا ذکر آیا جو دائرۃ المعارف میں چھپی ہے ۔ استاذ نے فرمایا کہ مُلاّ مراد کے کتب خانہ کا نسخہ لیا گیا ہے جو ابن القطاع کے اصلی نسخے کی نقل ہے۔ اصلی نسخہ نہیں لیا گیا۔ فرمایا کہ میں نے اصلی نسخہ دیکھا ہے۔ فرمایا کہ اس کتاب پر دائرۃ المعارف نے بہت پیسہ خرچ کیا ہے لیکن پھر بھی ضرورت پوری نہیں ہوئی۔ حقیقت میں اگر کتاب الافعال چھپوانے کی ضرورت تھی تو " السر قسطی " کی "کتاب الافعال " چھپوائی جائے جو سب سے آخر ہے۔ یعنی افعال میں جملہ معلومات کو جمع کر لیا ہے یا مکمل تر ہے اور اس میں چھے ہزار افعال ہیں۔ فرمایا کہ السر قسطی کی کتاب الافعال کے دو نسخے ہیں جو میں نے دیکھے ہیں بس ، افعال پر یہ تین کتابیں " ابن القوطیہ ، ابن القطاع " اور " السر قسطی کی معتبر ہیں اور ان سب میں السر قسطی کی اس فن میں مکمل ہے جس کے بغیر اہل علم کی ضرورت ہرگز پوری نہیں ہو سکتی۔

افعال یا مصادر پر ایران میں بھی کتابیں لکھی گئیں۔ پانچویں چھٹی صدی میں لکھی گئی دو کتابیں قابل ذکر ہیں، مصادر زوزنی اور مصادر بیہقی جو چھپ چکی ہے، یہ مکمل ترین ہے اور اس میں چھ ہزار افعال ہیں۔

۱۱ جنوری ۱۹۴۳ء:

مولوی عبدالعلیم صدیقی صاحب میرٹھی نے سلسلۂ اسناد سے متعلق ایک تحریر عربی میں حال میں شائع کی ہے جس کی کاپی میں نے استاذ کو مطالعے کے لیے دی تھی۔ آج اس کے متعلق بات نکلی۔ استاذ نے فرمایا کہ مولوی صاحب موصوف کی یہ تحریر اپنی جگہ پر کارآمد ہے لیکن ایک عجیب و غریب چیز میں نے ان کے سلسلۂ اسناد میں پائی یعنی کہ عبدالعزیز الحبشی کی عمر ازروئے سلسلۂ اسناد مذکور گویا ۶۵۰ برس کے قریب پہنچتی ہے جو ناممکن ہے اور اس سلسلے کی خامی پر شاہد

فرمایا کہ ہمارے نزدیک اسناد کی صحت یا وقعت تیسری صدی ہجری تک ہی بالکل قابل وثوق و اعتبار رہتی ہے ۔ اور زیادہ میں زیادہ رعایت کے ساتھ تو دوسرے درجے میں چوتھی صدی تک۔ اس کے بعد سلسلۂ اسناد میں بڑی خامیاں پیدا ہو گئیں اور اس کی صحت کے

متعلق کچھ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا کہ یہ کافی ہے کہ بخاری یا مُسلم نے جس سلسلے سے حدیثیں نقل کی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں مگر بعد کے علما، حدیث نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہر حدیث کو خود سے لے کر مسلم تک اور مسلم سے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم تک اسناد بیان کرنے کی زحمت اٹھائی ہے، اس لیے بہت غلطیاں ہو گئی ہیں

فرمایا کہ بہرحال یہ اسناد کا سلسلہ فائدے سے خالی نہیں تھا اور اس لیے راویان حدیث بہت کچھ نقل حرکت کرتے تھے اور کم از کم نسبتوں سے روایت جمع کرتے تھے۔

فرمایا کہ بعد میں حدیث کے علم کا مرکز مکّہ رہا۔ اس میں روایت کے دو سلسلے ہوتے تھے۔ ایک سلسلۂ مشارق (علما، سندھ وغیرہ) کا جیسے کہ محمد عابد السندی اور دوسرا سلسلۂ مغاربہ (مغربی علما۔) کا جیسے کہ فلانی وغیرہ۔

۲۶ جنوری ۱۹۴۳ء

آج استاذ کے اعزاز میں طلبۂ پنجم و ششم کلاس کی طرف سے چائے پارٹی دی گئی جس میں ان کی تقرری بر منصب پروفیسر مسلم یونیورسٹی پر جذبۂ خوشی و محبت کا اظہار کیا گیا۔

استاذ نے اپنی جوابی تقریر میں حسب ذیل اشارات ہمارے استفادے کے لیے بیان فرمائے

۱۔ فرمایا کہ میں نے اپنی پچھلی ۲۹ سال کی زندگی میں کبھی کام کرنے سے گریز نہیں کیا۔ جس حالت میں رہا، خواہ تنخواہ تھوڑی تھی یا زیادہ، تصنیف کا کام لگاتار اسی محنت سے کرتا رہا۔

۲۔ فرمایا کہ علمی سلسلے کے آدمی میں ظاہری تکلفات کی کمی لازمی ہے۔ اگر وہ اپنی ظاہری حالت لباس، فیشن، اور ہر جگہ آنے جانے اور ٹانگ اڑانے کی کوشش کرے گا تو چاہے اور کتنی ہی شہرت اس کو حاصل ہو جائے لیکن اس کو "علم" نہیں مل سکتا۔

۳۔ فرمایا کہ میں نے کبھی خود کو عالم نہیں سمجھا۔ اگر میں خود کو عالم سمجھتا تو یقیناً مجھ میں کام کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ چاہے کوئی شخص کتنا ہی باخبر ہو لیکن لازمی ہے کہ اس کی معروفات کے مقابلے میں اس کی مجہولات زیادہ ہوں گی، تو بس اگر یہ حال ہے تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ خود کو "عالم" تصور کر کے اپنی جستجو کو ختم کر لیں۔

۴۔ فرمایا کہ یہ البتہ ہے کہ میں نے یہ کبھی نہیں مانا کہ کوئی خاص انسان مثلاً ایک گورے چمڑے والا علم میں زیادہ فضیلت حاصل کر سکتا ہے۔ کیونکہ فطرت نے ہر ایک کو کافی دماغ و وسائل دیے ہیں کہ کام کرے۔ فرمایا کہ آپ یہ کبھی مت سوچیں کہ علم عربی میں آپ کسی طرح یوروپی مستشرقین سے کم رہ سکتے ہیں، سب محنت کا پھل ہے۔ یوروپی مستشرقین علم عربی

کو دو تین مقاصد کے لیے پڑھتے ہیں: ۱۔ اپنے قومی استعمار کے لیے ۲۔ علمی فائدے کے لیے ۳۔ اس علم میں اپنی یادگار چھوڑنے کے لیے۔ مثلاً مارغیولوث عربی کا عالم تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کرسچین مشن کا بڑا لیڈر تھا۔ اسی مشنری کام کی خدمت کے لیے اس نے بڑے ناپاک الزام اسلام پر لگائے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چاہے یہ الزام جھوٹے ہوں تو کیا، صحیح ہوں تو کیا، لیکن پڑھنے والے میری علمی طاقت کی وجہ سے ضرور اس کو وقعت دیں گے۔ فرمایا کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے کہ نبوت سے پہلے وہ "لات" کی پرستش کیا کرتا تھا اور ثبوت کے لیے امام احمد ابن حنبل کی مسند سے حدیث پیش کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک عام شخص کے لیے ایسی دلیل کتنی ہیبت ناک ہوگی۔ لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ جب خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت کے سامنے بت پیش کرکے کہا کہ ہم حسب روایت پہلے اس کی پوجا کرتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وہم کو رد کر دیا اور انکار کر دیا اور کہا کہ میں ان کو نہیں پوجوں گا۔ اب مارغیولوث اس انکار کو اقرار بتانا چاہتے ہیں۔

۵۔ فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ کام کرتا رہے۔ آپ کو چاہیے کہ علم کے لیے خود کو وقف کر دیں اور اس خیال کو کبھی اپنے اندر نہ آنے دیں کہ آپ کو بڑی تنخواہ ملے یا آپ اونچے ہو جائیں یا لذیذ طعام کھائیں۔ رزق اللہ پر ہے۔ ہر حالت میں کام کرتے جائیں۔ فرمایا کہ میں نے لاہور میں پہلی مرتبہ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ رکھا لیکن میری بیوی اور بچے میرے کام میں مانع تھے۔ زیادہ دیر تک نہ رہ سکے۔ اس وقت چھ مہینے کے عرصے میں ابوالعلاء پر پوری کتاب لکھ ڈالی اور اس کے علاوہ ابوالعلاء کی تصانیف پر کام کیا اور ساتھ اپنے کالج کی ڈیوٹی اور گھر کا کام سنبھالتا رہا۔

نوٹ: استاذ کی پوری تقریر مجموعۂ فوائد تھی۔ میں نے اوپر چند اشارات قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲۸ جنوری ۱۹۴۳ء:

آج شام کی سیر کے وقت استاذ نے اپنے سفر کے حالات پر تبصرہ کیا۔ فرمایا کہ میں نے ایا صوفیہ میں "التذکرۃ السعدیہ" میں سے پانچ بیت کعب بن زہیر کے نقل کیے جو دیوان وغیرہ میں کہیں نہیں ملتے۔ فرمایا کہ یہ ایک واحد کتاب ہے جس میں حماسہ ابو ہلال عسکری اور حماسہ ابن فارس کے حوالجات ملتے ہیں۔ حماسہ بصریہ الملک الناصر صاحب حلب کے لیے لکھا گیا۔ ابو تمام کا ایک اور حماسہ ہے الحماسۃ الصغریٰ المعروف بہ ... آج سے ۵

سال پہلے دارالمعارف مصر میں چھپ چکا ہے۔

۲۹ جنوری ۱۹۴۳ء

(آج استاذ علم عروض کی تصنیفات کے متعلق کچھ بتا رہے تھے تو سلسلہ علماء ہند تک جا پہنچا۔ اشارات اجمالاً قلبند کیے جاتے ہیں۔ نبی بخش)

فرمایا ابوالفضل العروضی چھٹی صدی ہجری کے عالم تھے اور راضی باللہ کے استاذ تھے۔ فرمایا کہ اس فن پر قدیم تصانیف میں سے (۱) ابن القطاع الصقلی کی کتاب (۲) ابن جنی کی کتاب (۳) ابن حاجب کا قصیدۂ لامیہ (۴) اور اسنوی کی شرح قصیدۂ لامیہ پائی جاتی ہیں قصیدہ اور شرح دونوں رامپور لائبریری میں محفوظ ہیں۔

مطبوعہ کتب میں سے دمامینی کی کتاب شرح قصیدۂ خزرجیہ نفیس ہے اور دوسرے درجے میں دمنهوری کی شرح الکافی فی العروض والقوافی المعروف بحاشیۃ الکبریٰ۔

علماء ہند میں سے مفتی سعد اللہ (مراد آبادی م ۱۸۷۷ء) اس فن کے ماہر ترین انسان تھے بلکہ آج سے ۵۰ سال پہلے ہندوستان میں مفتی سعد اللہ کے پایہ کا کوئی عربی کا عالم نہ تھا پہلے وہ امجد علی شاہ والد واجد علی شاہ کی خدمت میں تھے وہاں انھوں نے تاج اللغات کی تصنیف میں حصہ لیا۔ اس کے چیف ایڈیٹر مولانا لندنی تھے مفتی سعد اللہ کی عربی میں "عروض باقافیہ" عربی عروض پر ان کی اعلیٰ تصنیف ہے۔ لیکن ان کی معرکۃ الآرا تصنیف اس فن مین فارسی عروض پر "میزان الاشعار و معیار الافکار" ہے جو طوسی کی فارسی شاعری پر تصنیف کی طرح ہے۔

لیکن اس سے بڑھ کر ان کا کارنامہ لغت میں، قاموس پر ردّ الموسوم بہ "القول المانوس فی صفات القاموس" ہے۔ اس ردّ کا ایک نسخہ نواب صدیق حسن خاں نے تیرہویں صدی کے زبردست ادیب احمد آفندی ادیب فارس کو بھیجا تھا اور احمد آفندی نے ایک ہولناک رد قاموس پر لکھا ہے جس کا نام "الجاسوس علی القاموس" ہے اس میں آفندی نے مفتی سعد اللہ کی کتاب کا ذکر کیا ہے۔ مفتی صاحب کی اس تصنیف کے دو تین نسخے علی گڑھ (یونیورسٹی لائبریری) میں موجود ہیں۔ اکثر کتب خانے اسی سے نقل حاصل کرتے ہیں۔

۲۔ ہندوستان کا دوسرا عربی کا بڑا عالم اوحد الدّین بلگرامی تھا۔ انھوں نے "النساء العالمات" یعنی عالم عورتوں کا تذکرہ لکھا ہے جو نواب صدر یار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ نیز فاضل مصنف نے "نفائس اللغات" اور "منتخب النفائس" دو کتابیں لغت پر

لکھیں۔ اوحد الدّین اردو فارسی اور عربی زبانوں کے ماہر تھے۔ وہ ہندی، اردو کے لفظ کو لے کر اس کا فارسی اور عربی مترادف بتاتے ہیں۔

۳۔ عربی کا بڑا عالم محمد بن احمد یمنی الشیروانی تھا جو باہر سے بلایا گیا تھا اور فورٹ ولیم کلکتہ میں پروفیسر تھا۔ دیوان متنبی اس نے پہلی مرتبہ ہندوستان میں شایع کیا۔

۴۔ مفتی صدر الدین دھلی کے بھی عربی کے بڑے ادیب فاضل تھے۔

۵۔ فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد میرے استاذ تھے جن کے استاذ شیخ ابراہیم ذوق تھے اور ڈپٹی نذیر احمد نے مجھے مولوی فضل حق خیر آبادی کے قصیدے کے یہ دو اشعار سنائے۔ ایک یہ:

"لاتصبغن الی البیض الاماليدی   فاحمر الموت فی اجفانہ السود"

مولوی فضل حق کے دیوان کا قلمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری اور کراچی میں حکیم نصیر میاں کے یہاں موجود ہے۔

۶۔ مولوی فضل حق صاحب دھلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاذ تھے۔ انگریزوں نے اس علّامہ کو کالے پانی بند کر رکھا تھا۔ انکے قصائد و رسائل کا مجموعہ میں نے مسلم یونیورسٹی لائبریری سبحان اللہ سیکشن میں دیکھا۔ جہاں مجھے اوپر والا پورا قصیدہ مل گیا۔ مولوی صاحب عربی کے بڑے ماہر تھے

۷۔ مفتی عنایت احمد صاحب نے غدر پر ایک عربی میں رسالہ لکھا جو نواب صدر یار جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور غدر پر اور انگریزوں کے مظالم پر نیز کافی قصائد لکھے ہیں۔ یہ عالم نیز مولوی فضل حق صاحب کالے پانی نظر بند کر دیے گئے تھے وہاں ایک افسر کریم بخش کے لیے فارسی صَرف میں اپنے حافظے سے علم الصیغہ کتاب لکھی۔ اردو میں وہاں "تواریخ حبیب الہٰ" (سوانح رسول صلعم) لکھی اور کالے پانی ہی میں وہاں "تقویم البلدان اور ابوالفداء" کی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مفتی عنایت احمد مولانا بدر الدین صاحب کے استاذ مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کے استاذ تھے۔ صنعت مہملہ میں کمال حاصل تھا حتیٰ کہ مکالمہ میں نیز بے تکلف بے نقط عربی الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ان کی کتابوں کے نام سے سنہ تصنیف کا پتا چلتا ہے۔ ۱۲۷۰ھ میں رہا ہوئے اور تقریباً ۱۲۷۹ء میں حج کو جا رہے تھے کہ جہاز غرق ہوگیا اور شہادت پائی۔

فروری ۱۹۴۳ء کا پہلا ہفتہ

استاذ نے فرمایا کہ علماء ہند تحریر کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ لگاتے ہیں جو ابجد کے حساب سے "حد" کے عدد ہیں۔ فرمایا کہ عربی کے قدیم علماء جب نیا مضمون شروع کرتے یا ایک ہی مضمون میں ایک سے خیال کا اظہار کرتے ہیں (جب کہ انگریزی میں نئی پیراگراف) تو سیاہی یا سرخی سے "بت" کا نشان لگاتے ہیں (= کاٹ دینا۔ یعنی پچھلی عبارت ختم ہو چکی) اور اگر کسی خاص نام وغیرہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے تو نیز (ــــ) ایسا ہی نشان لگاتے ہیں۔ اب اردو وغیرہ میں یہ نشان اکثر علم پر لگایا جاتا ہے

(۲) فرمایا کہ مصنف خزانۃ الادب کے متعلق اس وقت کے علماء کہتے تھے کہ کاش تم تیسری صدی ہجری میں پیدا ہوئے ہوتے، کیوں کہ وہ عربی کے بڑے عالم تھے لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ بیسویں صدی میں ہوتے۔ کیوں کہ ان کی ریسرچ کا وہی طریقہ ہے جس کو علماء یورپ نے اختیار کیا ہے۔

(۳) آج استاذ نے عربی سوسائٹی کے جلسے میں جہاں طلبہ نے اپنے مضامین پڑھے صدارت فرمائی اور آخر میں مختلف مضامین کی اصلاح دیتے ہوئے فرمایا کہ

- گو بدیع الزمان ہمذانی فن مقامات کی تکمیل کی رو، سے اس کے موجد تھے لیکن مقامہ لکھنے میں وہ سب سے اوّل نہیں تھے کیوں کہ ان کے استاذوں میں سے ابوبکر ابن درید نے مجالس لکھیں جو اسی فن کا پیش خیمہ ہیں۔ فرمایا کہ میں اس کتاب کو ممالک اسلام سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ فرمایا کہ اس کے بعد استاذ بدیع الزماں چوتھی صدی کے عالم تھے۔ نیز ابن فارس اللغوی نے اس رنگ کی کتاب لکھی، بہ نام "فتیا فقیہ العرب" جس کو ہمارے دوست ڈاکٹر علی محفوظ (بغداد) نے مجلۃ المجمع العلمی (دمشق) میں اب چھاپ دیا ہے۔

(۴) فرمایا کہ یورپ والوں کی تنقید میں بہت سی خامیاں ہیں جس سے ہمیں بچ کر رہنا چاہیے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ مقامات حریری کا درجہ بعد از قرآن ہے۔ یہ حماقت ہے اور خود قرآن پاک کی توہین ہے۔ فرمایا کہ حریری سے ہمذانی کی قابلیت ہزار بار برتر ہے کیوں کہ اس نے تو چلتے چلتے مقامات املاء کرا دیے لیکن حریری نے تو اپنی حیات کے پچاس سال اپنے مقامات پر صرف کیے۔ اگر اور علماء نیز درد سری کرتے تو یقیناً ایسے یا اس کے لگ بھگ مقامات تیار کر سکتے تھے۔

فرمایا کہ ہم حدیث نبوی کی بے مثال فصاحت و بلاغت سے کبھی حریری کے مقامات

کو پہلے نہیں رکھ سکتے۔ مضامین نگاروں کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا کہ

(۱) جو کچھ لکھو وہ اپنی محنت سے لکھو۔ نقالی سے قابلیت ہرگز نہیں بڑھے گی

(۲) کبھی حکم تام نہ لگاؤ، حکم تام لگانے کی شرط یہ ہے کہ جس پر ایسا حکم لگانا مقصود ہو اس کا مطالعہ مکمل کیا جائے اور اس کی تفتیش استقصائی ہو۔ ورنہ آئندہ چل کر دنیا ایسے حکم کو رد کر دے گی اور اس نظریہ یا تصنیف کی قیمت بالکل گر جائے گی۔

۲۰ فروری ۱۹۴۳ء

استاذ نے آج ابن الفارس اللغوی کے متعلق نہایت مفید معلومات دیئے:

فرمایا کہ ابن الفارس، ابن درید کے تھوڑے بعد کے ایک مصنف اور خدا پرست عالم تھے۔ ان کا ترجمہ "طبقات القراء" باخرزی کے دمیۃ القصر، معجم الادباء وغیرہ میں ملتا ہے۔

ان کی تصانیف میں سے مقاییس اللغۃ ایک بڑی بے نظیر کتاب لغۃ پر ہے۔ ابن الفارس نے الصاحبی فی فقۃ اللغۃ میں لغۃ کے اصول و قواعد سے بحث کی ہے اور مقاییس اللغۃ میں علم لغۃ پر گویا مبسوط تبصرہ کر دیا ہے اور تاریخ بنا دی ہے۔ فرمایا کہ الصاحبی کے بعد مقاییس اللغۃ کی وہی منزل ہے جو تاریخ ابن خلدون کی اس کے مقدمے کے بعد۔ یعنی کہ مقدمے میں فلسفۂ تاریخ ہے اور اس کے بعد تاریخ۔ ویسے ہی فقۃ اللغۃ میں فلسفۂ لغۃ ہے اور بعد میں لغۃ پر تصنیف و تفصیل

فرمایا کہ ابن فارس کے استاذ ابن القطان نے ثعلب سے پڑھا ہے۔ ابو عمر زاہد المطرز ان کے (ابن القطان کے) کلاس فیلو تھے۔ المطرز نے ثعلب کی فصیح اللغۃ پر فائت الفصیح لکھی اور ابن الفارس نے تمام الفصیح۔ فرمایا کہ مجمل اللغات (معاجم میں سے) ابن الفارس کی اچھی خاصی تصنیف ہے۔ فرمایا کہ اس کا ابتدائی حصہ ایک چوتھائی حصہ لڑائی سے پہلے مصر میں چھپ گیا تھا۔ ایک قدیم نسخے کا درمیانی حصہ جو تقریباً نصف ہو گا استاذ کے پاس موجود ہے، باقی مجمل کے عام نسخ عموماً کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں جن میں بعض بہت اعلیٰ قدیم العہد لنقتیں ہیں۔ پانچویں چھٹی صدی ہجرت کے نسخے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

فرمایا کہ ابن الفارس کی "فتاوی فقیہ العرب" پر حریری نے فقہی مقامہ کھڑا کیا

فرمایا کہ الصاحبی فی فقہ اللغۃ اپنی نوع کی بے نظیر کتاب ہے۔ اس رنگ پر دیگر تصانیف میں سے خصائص ابن جنی وسرّ الصناعۃ لابن جنی ہیں۔ ثعالبی نے فقہ اللغۃ، الصاحبی کے زیر اثر لکھی لیکن الصاحبی سے مختلف رنگ پر ہے۔ فرمایا کہ ابن فارس پہلے شخص

ہیں جنھوں نے لغت کے اصول و قواعد پر سنجیدگی سے مبسوط بحث کی ہے۔ فرمایا کہ ابن الفارس کی کتاب اللامات لبزک میں چھپ چکی ہے (اور اس کا رسالہ " کلا " خود میمن صاحب نے ایڈٹ کیا ہے)۔ فقہ اللغۃ کے ذیل میں فرمایا کہ اسمٰعیل صاحب بن عباد جو ان کے شاگرد تھے ان کے نام سے کتاب کو منسوب کیا۔

۷ نومبر ۱۹۴۳ء:

نوٹ: گذشتہ سطور سے لے کر آج تک معلوم نہیں کتنی حکمت کی باتیں استاذ سے سنیں لیکن ان کو قلمبند نہ کرسکا۔ آج مجملاً جو چیزیں دماغ میں رہ گئی ہیں وہ تحریر کیے دیتا ہوں

ایک دن فرمایا کہ علم کو علم کی خاطر پڑھیں۔ جس علمی کوشش میں دنیاوی مقاصد مضمر ہوتے ہیں وہ علم گندا ہوجاتا ہے۔ فرمایا کہ میں نے علم کسی ذاتی غرض یا مقصد کے لیے کبھی نہیں سیکھا البتہ علم کے طفیل جو کچھ اللہ پاک نے دیا اس کو بخوشی قبول کر لیا۔ فرمایا کہ جو لوگ علم کو ذاتی اغراض کے لیے پڑھتے یا استعمال کرتے ہیں ان کی سب علمی کوششیں خاک میں مل جاتی ہیں اور ان سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

ایک دن فرمایا کہ سیوطی کی تصانیف کی علماء کے نزدیک کچھ زیادہ وقعت نہیں۔ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی معلومات پیش نہیں کیے۔ جو کچھ دوسروں کی تصانیف میں ملا ان کو جمع کر دیا۔ ان کی تصانیف کی قیمت اب اگر ہے تو صرف اس لیے کہ ان کے ماخذ فنا ہوچکے ہیں۔

فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی بھی فن میں گہرا اترے تو اس کو ماہرین فن کی غلطیاں بھی نظر آجائیں گی۔ اپنی مثال دی کہ چوں کہ ادب عربی کے گوشے گوشے کو میں ٹٹول چکا ہوں لہذا ایسے بڑے امام ادب جیسے کہ مفضل الضبی، ابو علی قالی، ابو عبید بکری وغیرہ کی فروگذاشتیں نیز نظر آگئیں۔ فرمایا کہ ان غلطیوں سے متنبہ کرنے میں میں نے کوئی بڑا کارنامہ نہیں کیا۔ ان جیسی غلطیاں میری تصنیفات میں نیز ہو گئی ہوں گی لیکن ان غلطیوں سے آگاہ صرف وہی ہوسکتا ہے جس کی نظر نہایت وسیع ہو اور ادب عربی کی گہرائیوں تک اتر چکا ہو۔

[استاذ ہمیشہ اپنے گھر کی ضروریات خود ہی بازار جا کر پوری کرلیتے ہیں اور سبزی گوشت وغیرہ خود ہی خرید کر کے لاتے ہیں۔ بندہ بھی کئی مرتبہ ان کے ہمراہ شہر جاچکا ہے۔ شہر کی لین دین میں بھی استاذ کا تجربہ و فہم دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اسی سلسلے میں کئی مرتبہ فرمایا]

یہاں کئی لوگ اپنی جنٹلمینی کا شکار ہوگئے ہیں۔ میں اگر ان کی طرح رہوں اور نوکروں کے ہاتھ بازار کی سڑیل چیزیں منگوا منگوا کر کھاتا رہوں تو میری صحت چند دنوں میں تباہ ہوجائے گی اور

میں کسی کام کا نہ رہونگا ۔ باقی رہی لوگوں کی میری طرف انگشت نمائی اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں کفار مکہ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ نبی کیسے ہیں جو بازار میں خرید و فروخت کر رہے ہیں۔ (مالھذا الرسول یاکل الطعام و یمشی فی الاسواق) لہذا میں تو نبی کی سنت ادا کر رہا ہوں ۔ اور دیگر کہ میں علی گڑھ والوں کی تعریف خواہ مذمت سے آگے نکل چکا ہوں۔

(استاذ یہاں کے اکثر لوگوں کے برتاؤ سے نہایت شاکی ہیں) فرمایا کہ یہاں خلوص سچائی کے بدلے مکاری و غداری بھری ہوئی ہے۔ کہا کہ یہ خطہ کسی تمدن کا مرکز تھوڑے عرصے کے لیے رہا ہے لیکن بگڑے ہوئے تمدن کا ۔ اب یہاں غلامانہ ذہنیت نے خوب کام کیا ہے اور لوگوں کے اخلاق کو کلیتہً تباہ و برباد کر دیا ہے۔

فرمایا کہ علی گڑھ سے میں اتنا تنگ آیا ہوا ہوں کہ اگر دوسری کسی جگہ معقول روزگار بن جائے تو یہاں کی پروفیسر شپ اور تنخواہ کو نظر انداز کر کے چلا جاؤں

فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی میں سے علم کی قدر جاتی رہی۔آئندہ یہاں وہی لوگ اسٹاف میں آتے رہیں گے جو یہاں کسی سیاست کے سلسلے میں کارآمد ہوں گے، نتیجہ یہ نکلے گا کہ باہر سے قابل اور فاضل لوگوں کا آنا بند ہوجائے گا اور یہ یونیورسٹی کسی کام کی نہ رہے گی ۔ فرمایا کہ عربک ڈپارٹمنٹ میں جان اس وقت تک ہے جب تک میں یہاں ہوں، اس کے بعد امید نہیں کہ یہاں کوئی اطمینان بخش کام ہوسکے۔

۱۷ نومبر ۱۹۴۳ء

فرمایا کہ ہندوستان کے لوگوں نے پیسے اور تنخواہ کو علم پر مقدم رکھا ہے وہ انتظامی کام کو محض علمی محنت پر ترجیح دیتے ہیں، لہذا اگر کہیں زیادہ تنخواہ مل گئی تو اپنی علمی زندگی کو خیرباد کہہ دیں گے لیکن وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ پیسے کے عوض میں وہ زندگی کو بیکار بنا دیتے ہیں ۔

فرمایا کہ اخفش نام کے گیارہ شخص ہو گذرے ہیں لیکن ادب کے لحاظ سے تین قابل ذکر ہیں۔ ابوالخطاب الاخفش الاکبر جو کہ سیبویہ کے استاذ تھے۔ اگر کتاب سیبویہ میں کہیں الاخفش کا نام آئے تو اس سے مراد ابوالخطاب اخفش استاذ سیبویہ ہے۔ بعد کے علماء نے اگر کہیں الاخفش کا تذکرہ کیا ہو تو اس سے مراد سعید بن مسعدہ الاخفش ہے جو کہ سیبویہ کا شاگرد ہے جس کو بعض علماء نے الاخفش الاوسط (اور کبھی الاصغر) لکھا ہے۔ الکامل للمبرد میں جو الاخفش کا نام آیا ہے وہ ابوالحسن علی بن سلیمان الاخفش ہے جو المبرد کا شاگرد ہے ۔

فرمایا کہ اس مسئلے پر علماء نے بہت کچھ راء زنی کی ہے کہ "ابوھُریرہ" میں "ھریرہ" منصرف ہے یا غیر منصرف۔ فرمایا کہ ہمارے استاذ مولوی عبدالرحمان پنجابی مدرسہ حاجی علی جان دھلی اس کو منصرف پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ "ھُریرہ" تصغیر ہے "ھِرّۃ" کی جو خود منصرف ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہ کو لقب بلی اٹھاتے ہوئے دیکھ کر ہی دیا تھا۔ اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس کو غیر منصرف پڑھا جائے۔ استاذ نے فرمایا کہ مولوی نظیر احمد صاحب سسوانی نے نیز اس پر ایک رسالہ لکھا تھا جس کی ایک کاپی میں نے کتب خانۂ خدیویہ میں دیکھی تھی جس میں نیز مولوی صاحب نے اس کو منصرف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے

استاذ نے فرمایا کہ میری رائے ان بزرگوں کے خلاف ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ "ھُریرۃ" ہرۃ کی تصغیر ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوھریرہ کو بلی اٹھاتے ہوئے دیکھ کر ہی یہ کنیہ دیا تھا اور نیز یہ کہ "ھرّۃ" عربی میں منصرف ہے۔ لیکن ان بزرگوں کے دماغ میں یہ بات نہیں اتری تھی کہ عربی میں "ھریرۃ" عورت کا نام بھی ہوتا ہے اور اس اصحابی کی وجہ کنیّہ حالانکہ یہ بلّی کا واقعہ ہے لیکن اس کا مفہوم دراصل وہی نام "ھریرۃ" عورت کا ہے جس کی مناسبت اور واقعے کی موافقت سے یہ کنیّت دی تھی۔ اور "ھریرۃ" علَم اور تانیث کی وجہ سے غیر منصرف ہوجاتا ہے اور ادب عربی میں پچیسیوں مثالیں موجود ہیں جہاں "ھریرۃ" غیر منصرف ہو کر آیا ہے۔ مثال کے طور پر استاذ نے اعشیٰ کے قصیدے کا (جو کہ کبھی معلقہ بھی مانا جاتا ہے) شعر پڑھا جس میں صرف "ھریرۃَ" پڑھنے سے ہی شعر کا وزن برابر رہتا ہے اور "ھُریرۃٍ" سے وزن ٹوٹ جاتا ہے۔ مثلاً اعشیٰ کے بیتوں کے یہ ٹکڑے۔ تین مثالیں ہیں۔

(۱) وَدِّعْ ھُرَیْرَۃَ اِنَّ الرکبَ مُرتحلُ (اعشیٰ لامیہ)

(۲) صَدَّت ھُریرۃُ انّٰی ما تکلّمنا (اعشیٰ لامیہ)

(۳) ھُرَیْرَۃَ وَدِّعھا وَاِنْ لام لائمٌ (اعشیٰ میمیہ)

فرمایا کہ المبرد نے سیبویہ پر رد لکھا ہے وہ غیر مقبول ہے۔ لہٰذا ابن ولاد المصری کو المبرد کے رد کا جواب لکھنا پڑا۔

فرمایا میں نے اپنی زندگی کے سات برس نحو پر ضائع کیے جس پر مجھے افسوس ہے اور آخر میں میں نے نحو کو ترک کر دیا اور ادبیات کو لے لیا۔ مگر نحو کا احسان ہے کہ شواہد کی وجہ سے ادب کی طرف رجحان ہوا۔

۱۷ فروری ۱۹۴۴ء:

دنیا استاذ کے علم و فضل کی قائل ہو چکی ہے لہٰذا اس کی وضاحت و تشریح کی ضرورت قطعاً نہیں۔ ہم نے جو استاذ میں ایک خاص بات پائی وہ یہ کہ ان کو اپنا علم قریب قریب پورا حفظ ہے۔ جملہ محفوظات ان کے صدر میں ہیں اور مبرد کے قول کے مطابق "العلم ما حوضر بہ" کا اطلاق یقینی استاذ کے علم پر ہوتا ہے۔ استاذ کے محفوظات و محاضرات کے معجزات ہم نے کئی مرتبہ دیکھے ہیں۔ اور سُنے ہیں۔ چند یہاں دیے جاتے ہیں۔

(۱) ڈاکٹر عبدالستار الصدیقی پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی کو ہم نے اپنی عربک سوسائٹی میں گذشتہ سال بلایا۔ انھوں نے "سامی زبانوں کے چند خصوصیات" پر لکچر دیا۔ استاذ صاحب صدر تھے۔ ڈاکٹر ھادی حسن نیز موجود تھے۔ لکچر کے بعد استاذ نے اپنی تصریحات میں عجیب و غریب معلومات پیش کیں۔ خصوصاً فاضل مُقرِّر [illegible] کے نکتے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ فارسی میں "ذ" نہیں ہوتا لہٰذا "د" سے اس کی تعبیر ہوتی ہے۔ استاذ نے اشعار در اشعار فارسی زبان کے پیش کیے جن میں "ذال" موجود تھا غالباً انوری کے اشعار پڑھے:

آناں کہ بفارسی سخن می رانند در موقع دال ذال را بنشانند
ما قبل وی ار ساکنی جز وای بود دال است و گرنہ ذال معجم خوانند

۲۔ دست بہ سخا چوں ید بیضاء بنمود از جودش تو در جہاں جہانی افزوذ

میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر ھادی حسن استاذ کی طرف اس وقت نہایت تعجب سے دیکھ رہے تھے۔

(۲) استاذ سے سنا ہے کہ "مجلس مصنّفین" کے ایک جلسے میں مولانا طفیل احمد نے "بابلِ قدیم" پر مضمون پڑھا۔ نواب صدر یار جنگ "صدر" تھے۔ جلسہ حلیم صاحب کی کوٹھی پر ہوا۔ بابل کے صحیح تلفظ پر مضمون نگار نے کچھ لکھا تھا اور پڑھتے وقت حاضرین سے نیز رائیں لی گئیں۔ جناب صدر نیز انکو "بابِل" بتانے لگے۔ شاید حلیم صاحب نے میمن صاحب کی رائے طلب کی۔ استاذ صاحب نے کہا کہ میں حیران ہوں کہ بعد کی کتب میں سے حوالے دیے جا رہے ہیں اور آپ مسلمان علماء ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لفظ قرآن پاک میں آیا ہے "ببابِلَ ھاروت و ماروت" اور اس صریح ضبط کے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ استاذ کے اس محاضرے پر سب حیران ہوئے۔ بعد میں صدر صاحب مضمون ختم ہونے سے پیشتر چلے گئے اور استاذ کو صدارت دی گئی۔ مضمون ختم ہونے پر استاذ نے اپنی محفوظات سے "بابل" اور

اس کی حکومت و حکام کے متعلق وہ وہ معلومات پیش کیے کہ حاضرین حیران رہ گئے۔ پروفیسر شریف صاحب نے تو استاذ کو اتنا بھی کہہ دیا کہ "میمن صاحب آپ کے مقابلے میں ہم خود کو جاہل پاتے ہیں۔"

(۳) دسمبر ۲۸۔۲۹۔۳۰۔۳۱ سنہ ۱۹۴۴ء کو بنارس میں اورینٹل کانفرنس تھی۔ ہم استاذ کے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔ عربی و فارسی سیکشن کی میٹنگ میں مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی کے قریبی رشتہ دار نے جو کہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں حدیث کے استاذ ہیں، اپنا مقالہ "ہندوستان میں حدیث کی حفاظت" پر پڑھا۔ استاذ صاحب بیٹھے تھے اور اخیر میں مشافہۃً مولانا کے مضمون پر تبصرہ کیا اور جن کتابوں کے مولوی صاحب نے حوالے دیے تھے خود انھی کتابوں میں سے اپنی حفظ سے اقتباسات پیش کیے اور اس کے علاوہ کئی دیگر معلومات پیش کیں جن کو سن کر حاضرین حیران رہ گئے۔ ہم نے اس دن دیکھ لیا کہ اسلامیات کے متعلق استاذ کو زندہ انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بھی ان کے مبلغ علم سے کم ہے۔

(۴) ڈاکٹر رفیق احمد خاں سے سنا اور بعد میں خود استاذ صاحب سے دریافت کرنے پر بھی معلوم ہوا کہ ابھی ابھی مجلس مصنّفین میں لکھنؤ کے ایک فاضل نے "خطاطی" پر مضمون پڑھا۔ سامعین پر اتنا اثر ہوا کہ مضمون نگار کے ہاتھ چومنے لگے گویا انھوں نے کوئی معجزہ کر کے دکھایا۔ استاذ کو جلسے کے وقت صدر بنایا گیا اور بعد میں سکریٹری صاحب اُن کو لکھتے رہے کہ آپ اس مضمون پر ضرور کچھ کہیے تاکہ علی گڑھ کی لاج رہے۔ استاذ نے فرمایا کہ وہ اس موقع پر "علی گڑھ کی لاج" کی فکر میں پڑ گئے لیکن انھوں نے پیشتر صرف یہ اطلاع بھی نہ دی کہ مجھے صدارت کرنی ہے۔ بہرحال مضمون ختم ہونے پر استاذ صاحب اٹھے اور پہلے ہی حاضرین کے سامنے عمادالدین کاتب کی کتاب پیش کی جہاں سے مضمون نگار نے معلومات حاصل کیے تھے۔ اس کے بعد استاذ نے "خطاطی" پر وہ تصریحات بیان کیے کہ بقول ڈاکٹر رفیق احمد خاں "ہم سب مرعوب ہوگئے"۔ استاذ نے بعض نکات پر تو مضمون نگار کی اصلاح بھی کر دی کہ "ابن مقلہ" کو خط نسخ کا موجد نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی کتابیں خطِ نسخ میں موجود ہیں البتہ وہ اس خط کے مُزیّن، مُحسن اور سب ہی کچھ تھے اور اس خط کو انھوں نے ہی کمالیت پر پہنچایا لیکن موجد نہیں۔ دوّم کہ مضمون نگار شیعہ ہونے کی وجہ سے عمر خیام کو "عمروخیام" پڑھ رہے تھے استاذ نے نہایت اچھے طریقے پر واضح کر دیا کہ "تیس برس پہلے میں نے مولانا شبلی کی ایک کتاب غالباً شعرالعجم میں "عمرو" دیکھا تھا لیکن اپنی کم علمی اور مولانا شبلی کی تصنیف کی وجہ سے میں نے اس لفظ کو یونہی رہنے دیا۔ لیکن اس کے بعد آج تیس برس کے

مطالعے میں ، میں نے "عمروخیام" نہ کہیں دیکھا نہ سنا اور آج ہی پہلے موقع ہے کہ میں اس لفظ کو پھر "عمروخیام" سن رہا ہوں۔ خود عمر خیام کا اپنا مصرع ہے

ھم عُمَرِ خیّامی ، ھم عُمَرِ خطاب

اس کے بعد شک کی کیا گنجائش؛

استاذ کے ان تصریحات نے سب حاضرین میں ہیجان پیدا کر دیا اور اب تک علی گڑھ میں استاذ کی اس فاضلانہ تقریر کا چرچا باقی ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۴۴ء

آج استاذ نے اپنے بچّے عمر کا ختنہ کرایا۔ خون بند نہ ہونے کی وجہ سے نہایت پریشان رہے۔ شام کو میں اور ڈاکٹر یوسف استاذ صاحب کی معیت میں تقوی پارک کی سیر کو گئے۔ ہندوستان کے علماء کا ذکر آیا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ ہندوستان میں بیشک چند ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوئیں جن کو عربی پر عبور تھا لیکن اکثر علماء عربی کے کما حقہٗ ماہر نہ تھے ان کا رجحان فارسی کی طرف رہا۔ پھر کہا لیکن چند علماء عربی کے سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ اوحدالدّین بلگرامی۔ اس کی نفائس اللغات (جس میں اردو الفاظ کے معنی اور پھر فارسی اور عربی کے مترادفات دیے ہیں) ، اور عربی عورت شاعروں کا تذکرہ (عربی) سے واضح ہے کہ وہ عربی کے بڑے ادیب تھے۔ (استاذ شاگرد تھے مولانا بشیر احمد سہسوانی کے (وفات ۱۳۲۶ھ) اور وہ شاگرد اوحدالدّین بلگرامی کے)۔

۲۔ مولانا عنایت احمد صاحب جنہوں نے غدر پر عربی میں رسالہ لکھا جو کہ نواب صدر یار جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت فاضل تھے ، علم الصیغہ پر ان کی کتاب مشہور ہے

۳۔ مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی نیز قابل قدر علماء عربی میں سے ہیں۔ عربی میں اچھے قصائد لکھے ہیں لیکن "تجنیس" کی بھرمار کی وجہ سے ان کی قیمت کو کچھ کم ہی کر دیا ہے۔

۴۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ادبی معلومات اتنے وسیع نہ تھے لیکن ان میں ایک خوبی تھی کہ جو کتابیں انھوں نے پڑھی تھیں مثلاً مقامات حریری ، حماسہ متنبّی وغیرہ ان کے مصنّف کے لگ بھگ اور اسی اسلوب میں وہ خود تحریر کر سکتے تھے۔ محض حماسہ اور متنبّی پڑھ کر بھی وہ اتنے اچھے اشعار کہہ سکتے تھے

۵۔ مصنّف نفحۃ الیمن احمد بن محمد شروانی الیمنی کو علماء ہند نے جو جوابات دیے تھے ان میں

سے شاہ عبدالعزیز کا جواب بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کو عربی پر اچھا عبور تھا۔
۹۔ مفتی سعد اللہ رامپوری جو علم عروض کے پورے برصغیر میں ماہر ترین عالم تھے وغیرہ وغیرہ۔

۲۵ فروری ۱۹۴۴ء

مجلس مُصنّفین کے پچھلے اجلاس میں استاذ صاحب نے جو صدارتی تقریر فرمائی تھی اس شہرت کا چرچا ہر جگہ سننے میں آیا۔ لیکن حاسدوں کو صبر نہ آیا۔ سنا گیا کہ کنگی چڑیا کوٹی صاحب جو کہ لائبریری میں کام کر رہے ہیں انھوں نے مضمون نگار حضرت سے سازباز کر کے استاذ کی تقریر پر ایک تنقیدی نوٹ شیعہ حضرات کے ایک لکھنوی اخبار میں شایع کرایا۔ یہ نوبت کیوں آئی۔ پچھلے دن لائبریری کمیٹی نے استاذ صاحب کی رائے طلب کی کہ کتابوں کے نام وغیرہ درج کرنے میں اگر ایک آدمی کو لگایا جائے تو وہ ایک دن میں کتنے نام درج کر سکتا ہے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ بیس سے تیس تک کتابوں کے نام مع ضروری معلومات کے نوٹ کر سکتا ہے۔ اب اس پر کنگی چڑیا کوٹی کو بہت غصہ آیا۔ کہ میمن صاحب نے ان کے لیے کام بڑھا دیا اور اب یہ بے دلائل اور بے ہنگم تنقید لکھ کر غصہ جھاڑا شیعہ حضرات تو راضی ہو گئے کہ ان کے بیان کو چھاپ دیں کیوں کہ استاذ صاحب نے اس مضمون نگار کے ایک فعل کو مجلس کے سامنے آشکار کر دیا تھا وہ یہ کہ "عمر خیام" کو صرف اپنی آراء کی وجہ سے "عمرو خیام" پڑھنے لگے تھے۔ استاذ نے فرمایا کہ "عمر" کو "عمرو" صرف مولوی شبلی نے شعر العجم میں لکھا اور معلوم نہیں کس بناء پر۔ باقی دنیا بھر میں کسی کتاب میں "عمرو خیام" نہیں لکھا۔ اب کنگی صاحب نے اس سے باتیں بنائیں کہ میمن صاحب نے مولوی شبلی کی تنقیص کی۔ اور اپنے قسطنطنیہ کے سفر کو بیان کر کے اپنی فوقیت دکھانے لگے اور کہا کہ ابن مقلہ خطِ نسخ کا موجد نہیں تھا وغیرہ

آج پھر مجلس مصنّفین کی مجلس منعقد ہونے والی تھی۔

یادداشت: کتاب الحلبۃ (ابن کامل کی) ایوّبی خاندان کے لیے لکھی گئی تھی۔ مصنّف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔

۴ مارچ ۱۹۴۴ء

استاذ صاحب نے فرمایا کہ دواوین اشعار عربی صرف ایک تہائی باقی رہ گئے ہیں۔ فرمایا کہ عربی تصانیف میں سے بعض باقی ہیں لیکن ادباء کو ان کا پتا نہیں مل سکا۔ ایسی کتابیں بمشکل ایک فی صد ہوں گی۔

فرمایا کہ نایاب کتابیں خریدی نہیں جاسکتیں ۔ کتابیں صرف تجویز و عقل و محنت و جستجو سے مل جاتی ہیں۔

۳۱ مارچ ۱۹۴۴ء :

شام کو نقوی پارک ٹہلنے گئے ۔ استاذ صاحب سے کتب الخیل کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ اس فن میں بہترین کتاب ابو محمد الاسود الاعرابی کی ہے جو مصر میں دار الکتب میں موجود ہے اور جس کا کچھ حصہ "بلوغ الارب" والے نے نقل کیا ہے۔ فرمایا کہ "بلوغ الارب" والے کے متعلق میرا نظریہ کچھ مختلف ہے۔ یہ کتاب چھپی تو دنیا داد دے اٹھی لیکن میں نے جہاں تک اس کو غور سے دیکھا تو معلوم یہ ہوا کہ مصنف کے پاس نایاب معلومات بالکل کم ہیں ۔ اس نے اقرار کیا ہے کہ کتابوں کے نام تبدیل کر کے پڑھنے والوں کو شبے میں ڈال دیا ہے۔ جو کچھ تھوڑی سی معلومات اس کے پاس ہیں ان کے مقابلے میں اب شاید ہمارے پاس کئی گنا زیادہ معلومات ہیں ۔ فرمایا میرے پاس کتاب الخیل ابن الاعرابی اور ابن الکلبی کے نسخے موجود ہیں۔ کتاب الخیل ابن الاسود اعرابی کا نسخہ مصر میں موجود ہے ۔ افسوس کہ سفرِ مصر میں اس پر میری نظر نہ ہوسکی اب جیسے ہی لڑائی ختم ہوگی پہلے یہ کتاب نقل کرواؤں گا۔اس کے علاوہ ابوعبیدہ کی کتاب الخیل جس کا اصل نسخہ مدینہ منورہ میں ہے حیدر آباد سے چھپ چکی ہے۔ دوسری کتاب نہایت پُر معلومات "الاجیاد فی الصافات الجیاد" ہے۔

۴ مئی ۱۹۴۴ء

استاذ صاحب نے آج بتایا کہ ان کو حصول علم میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے علم کو بطور علم حاصل کیا اور یہ خیال کبھی نہ کیا کہ اس علم سے مجھے کیا مالی نفع حاصل ہوگا۔ نہ کبھی شہرت کا شوق ہوا ۔ فرمایا کہ میری اولاد و زوجہ میرے علمی مشاغل میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے اور ان کی پیدا کردہ تکالیف کی وجہ سے ان کو خوشی کے لمحے بالکل کم نصیب ہوئے۔

۶ مارچ ۱۹۴۴ء

استاذ صاحب کو عرض کیا گیا کہ وہ ڈاکٹر حسین بن فیض اللہ ہمدانی پروفیسر اسماعیلی کالج اندھیری کو خط لکھیں تاکہ وہ "اسماعیلی تعلقات بہ سند" کے متعلق ہماری رہنمائی کریں استاذ صاحب نے حسب ذیل لیٹر لکھا:

صدیقی الاستاذ الفاضل ح ۔ ف ۔ ب الہمدانی حرسہ اللہ

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و رضوانہ

ھذا اکتابی الیکم والحمد للہ علی الصحۃ والسلامۃ واعیالکم بمثلہا بعد طول الزمن بحیث یخشی فیہ علی عہد الود ان یتناسی و جعل الصفاء ان یخلق کر الجدیدین دیباجتہ ولکن اھل الحفاظ یحافظون و ازاک فی رعیلہم الاول

الطالب الراغب نبی بخش بلوص بعد حیازتہ علی شہادۃ المجستر راغب فی تقدیم اطروحۃ علی

العرب والسند

وھاھوذا امن یجمع من الزوایا خبایا و یثیر عن المعادن کی یفوز ببغیتہ

و معلوم ان الاسماعیلیین کانت لہم فی آخر القرن الرابع صلۃ بہذہ البقاع و کانت تتعرب بین دعاتہم بہاو ولاۃ مصر وخلفائہا مکاتبات عن اخبارھا و شؤنہا وھی من الاھمیۃ بمکان ولیس لہ الاصدیقی فانہ ابن بجدتہ وابن عذر ارضہ ارجوہ ان یسعفہ ببغیتہ و یجعل ذلک منۃ علی الی منہ

والسّلام

عبدالعزیز المیمنی

۹ - مایو سنۃ ۱۹۴۴ء

علیگڑھ

۱۵ مئی ۱۹۴۴ء:

پرسوں سے میری طبیعت خراب تھی۔ آج جب کہ میں طبیہ کالج کو دوا کے لیے جاچکا تھا تو استاذ صاحب بیمار پرسی کے لیے کمرے میں تشریف فرما ہوئے لیکن مجھے غیر حاضر دیکھ کر واپس چلے گئے۔ اس کے فوراً بعد میں واپس آیا۔ استاذ صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ آئے تھے۔ میں نے سمجھا کہ ابھی استاذ صاحب شاید لائبریری میں ہوں گے اور میں فوراً وہاں پہنچا۔ استاذ صاحب موجود تھے۔ آپ نے صحت کے متعلق پوچھا۔ اس کے بعد اور باتیں ہوتی رہیں۔

بالآخر ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے متعلق باتیں ہوئیں۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ وہ شکل کے سرخ سفید تھے۔ مزاج میں تیزی زیادہ تھی۔ اگر غصّے میں ہوتے تھے تو شیر ژیاں کی مثل گرجتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ اگر کسی کے ساتھ ان کی محبت ہوجاتی تھی تو اس کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کرتے تھے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ میرے ساتھ وہ خاص شفقت کیا کرتے

تھے۔ انھوں نے مجھے چند کتابیں بھی دی تھیں جن میں سے ایک " حماسہ " ہے جو ابھی تک میرے پاس موجود ہے۔ (بمبئی کا ایڈیشن جو اب سندھ یونیورسٹی میں آگیا ہے) ایک مرتبہ کہا کہ " شرح حماسہ تبریزی " لے جاؤ لیکن میں نے قبول نہ کیا اور عرض کیا کہ یہ آپ خود پڑھاتے ہیں اس وجہ سے آپ کے یہاں رہے تو بہتر ہے۔ پھر فرمایا کہ میرے کتب خانے میں سے جو کتاب تم چاہو وہ لے جاؤ۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ ان کی کتابوں کی دو الماریاں تھیں اور جو چاہتا تھا وہاں سے کتاب اٹھا لے جاتا تھا۔ تبریزی کے ذیل میں صراحت کی کہ کتب خانۂ قونیہ میں "مفضلیات" کی شرح تبریزی کا نسخہ خود تبریزی کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔

فرمایا کہ ان کے مکان کے دو حصے تھے۔ زیریں منزل میں تو ادھر ادھر کتابوں کے ڈھیر پڑے رہتے تھے جو وہ خود چھپواتے رہتے تھے۔ اور بالا خانے میں وہ گاؤ تکیہ لگائے لیٹے رہتے تھے، اور حقّہ سامنے رہتا تھا اور وہاں جو طالب علم پہنچتے تھے، ان کو بھی پڑھا دیتے تھے۔

فرمایا کہ ڈپٹی صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے ماہانہ کھانے پر کوئی پندرہ روپیہ لگتے تھے اور پانچ سات روپیہ حقّہ بھرنے والے نوکر کو دے دیا کرتے تھے۔ ویسے زندگی میں پیسہ بہت کمایا تھا۔ فرمایا کہ مجھے ڈپٹی صاحب نے بتایا کہ میری تنخواہ ایک وقت اٹھارہ سو روپیہ تک پہنچ چکی تھی۔ اور یہ بتایا کہ پہلے ہی میں **گورکھپور** - **محکمہ** بندوبست " میں کام کیا کرتا تھا۔ جب لارڈ کچنر آیا تو میں نے عربی میں ان کی تعریف میں ایک چھوٹا قصیدہ لکھا جس کی وجہ سے فوراً میری تنخواہ تین سو سے چھ سو روپے کر دی گئی۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ اس قصیدے کے چند شعر ڈپٹی صاحب نے ہمیں اس وقت سنائے تھے جب کہ ہم متنبی پڑھ رہے تھے اور " واتقعت تلونا " کے الفاظ آئے اس وقت کہا کہ میں نے بھی یہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور یہ شعر پڑھے جو اس قصیدے میں سے تھے :

وَلِیَ عمل بالبند و بست و محنۃٌ اکابدھا بالصبر منذ ثمان

فھذا بلائی واتقعت تلونًا وھذا مشیبی شبت قبل اوان

استاذ صاحب نے رامپور کے مشہور شاعر امیر اللہ تسلیم شاگرد غالب کے یہ دو شعر سنائے جو استاذ صاحب نے کہا کہ خود انھوں نے ان کو سنائے تھے

"آسمان گردش میں ہے میرے ستانے کے لیے چکیاں نو چل رہی ہیں ایک دانے کے لیے"

(دوسرا شعر درج نہ ہو سکا)

۱۹ مئی ۱۹۴۵ء :

استاذ نے ان کو ۱۹۱۱ء کے قریب دیکھا تھا۔ دبلے پتلے اور بہت بوڑھے تھے۔

جناب استاذ صاحب سے درخواست کی گئی کہ ڈاکٹر زاہد علی نظام کالج حیدرآباد دکن کو خط لکھیں تاکہ اسماعیلی لٹریچر میں سے کچھ حوالے نقل کر کے بھیجیں۔ استاذ صاحب نے فوراً ہی یہ خط لکھا:

مکرم و معظم جناب ڈاکٹر زاہد علی صاحب
پروفیسر نظام کالج حیدرآباد

صدیقی الکریم السلام علیکم

ایک عرصے سے خیریت مزاج معلوم نہیں ہوئی رعاکم اللہ

اس وقت ضرورت یہ پیش آئی ہے کہ ہمارے ہاں ریسرچ میں نبی بخش بلوچ ایک محنتی طالب العلم ہیں۔ وہ السند والعرب پر اپنا مقالہ طیار کریں گے۔ اس سلسلے میں جہاں بیسیوں مصادر سے کام لیا گیا ہے وہاں فاطمی داودی ادبیات میں جہاں کہیں اونکی الدعوۃ بالسند والدعاۃ و تاریخ السند و جغرافیتہا کے سلسلے میں چھوٹے بڑے جو حوالے آپ کی نظر میں ہوں ازراہ کرم اونکے اقتباسات احوالات بھیج کر ممنون فرمائیں۔

اونکے طرق دعوت اور ابتدائی مراکز وغیرہ کے سلسلے میں بھی کچھ روشنی ڈالیں۔

آپ کا شکریے کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔ والسلام

مخلص

عبدالعزیز المیمنی
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

۱۲ مئی ۱۹۴۴ء

پس نوشت: آج تصحیح کے لیے استاذ صاحب کے سامنے یہ تحاریر پڑھنا شروع کر دیں۔ استاذ صاحب حیدرآباد سندھ معید کے پاس آئے ہوتے ہیں، اگست ۱۹۶۸ء ن۔ب ا

۲ دسمبر ۱۹۴۵ء :

آج استاذ صاحب کی صحبت میں کافی وقت گذرا اور اس اثنا میں استاذ صاحب نے مولانا ابوبکر شیث مرحوم سابق پیش امام و ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کی حسنات و مکارم الاخلاق

پر گفتگو کی ۔

فرمایا کہ مولانا ابوبکر صاحب متعدد خوبیوں کے انسان تھے ۔ مجاہدانہ جذبہ ،کرم و سخاوت محبت و شفقت میں بے مثال تھے ۔ ہر وقت ان کے ہاں دوست و احباب کا ایک ہجوم رہتا تھا ۔ اور ہر قسم کے اشخاص ان کے یہاں آیا کرتے تھے ۔ بزرگان و مولوی صاحبان کے علاوہ بہت سے کوٹ پتلون والے نیز ان کے ہاں حاضر ہوتے تھے ۔ طلبہ کو بچوں کی طرح سمجھتے تھے ۔ مسجد کی مرمت اور سنگھار میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، شکار بھی کھیلا کرتے تھے ۔ اس کے ساتھ علم میں بھی وہ ممتاز تھے ۔ عربی ، فارسی ، اردو پر کافی عبور تھا ۔ نہایت نایاب کتابوں کا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ انھوں نے شرح القصیدۃ الحمیدیۃ کا قلمی نسخہ ہدیتہً مجھے پیش کیا اور مولانا کی اس علمی سخاوت پر مجھے نہایت تعجب ہوا اور ان کے لیے دل میں عزت پیدا ہوئی۔ تالیف نشوان حمیری ۔ یہ کتاب حال ہی میں صنعا والوں نے یمن میں چھاپی ہے یا مصر میں چھپ گئی ہے۔ مولانا نے جو نسخہ استاذ کو دیا وہ یمانی ہے۔ قصیدے کا پہلا شعر:

الامر جِدٌ و ھو غیر مزاح   فاعمل لنفسک صالحا یا صاح

اس میں حمیری نے یمن کے چھپے بادشاہوں کے نام گنوائے ہیں۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ وہ ہمیں نہایت عزیز سمجھتے تھے ۔ کبھی ان کے ہاں حاضر ہونے میں ناغہ ہوجاتا تھا تو پوچھتے تھے ۔ بیماری کے عرصے میں اتفاقاً مجھ سے ناغہ ہوگیا ۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ کیوں نہیں آیا کرتے اور یہ شعر پڑھا:

تمتّع من شمیم عرار نجد   فما بعد العشیۃ من عرار

یہ بیماری کا شروع تھا ، جب بول سکتے تھے ، بعد میں تو بول نہیں سکتے تھے، تکلّم بند ہو گیا۔ اس کے بعد استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں کوشش کر کے ان کے یہاں حاضر ہوا کرتا تھا ۔ اس بیماری میں صندل کا عطر منگوایا ۔ سب حاضرین کو خوشبو دی اور بعد میں مجھے اشارتاً کہا کہ یہ بوتل تم اپنے پاس رکھو ، استاذ صاحب نے فرمایا کہ یہ بوتل مع عطر آج تک میرے یہاں تبرکاً محفوظ ہے ۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ مولانا صاحب پر مرض غالب آگیا، متعدد علاجوں سے کچھ فائدہ نہ ہوا ۔ مرض دن بدن بڑھتا جاتا تھا ۔ مگر اس مرد خدا نے کبھی ناامیدی کا اظہار نہیں کیا۔ اگر کوئی اور شخص اس قسم کا اظہار کیا کرتا تھا تو اس کو فوراً ڈانٹ دیا کرتے تھے ، بڑے توکّل کے مالک تھے ۔

۱۸ جنوری ۱۹۴۵ء:

مُحَسِّین کُنّا فرّق الدھرُ بیننا — الی أبد والمرء لا یأمن الدھرا

ھذا الشعر بخط الاستاذ الکریم

استاذ صاحب نے پچھلی کسی ملاقات میں یہ شعر پڑھا تھا۔ اور شاید مولانا ابوبکر مرحوم کی وفات و مفارقت کے سلسلے میں، اور فرمایا کہ یہ شعر سیبویہ نحوی نے اپنی وفات سے پیشتر پڑھا، جب کہ اس کا بھائی اس کی مفارقت پر رو رہا تھا۔ آج بندے کی درخواست پر استاذ صاحب نے نابینا ماسٹر کے ہاں یہ شعر لکھ دیا۔

معنحین!

ز روئے یار خواہم عند شرقی — بہ تقلیب و بہ تصحیف و بہ تجنیس

بخط الاستاذ

شرقی۔ غربی۔ عربی۔ ربیع۔ بہار۔ نہار۔ یوم۔ موی۔ شعر۔ شعر۔ بیت۔ دار۔ راد
زاد۔ توشہ۔ بوسہ: (مأخذ شاید بحر الفصاحت لمولوی نجم الدین رامفوری)

اوپر کا شعر آج صبح استاذ صاحب نے دوران درس میں فضلیت ایر " کلاس کو پڑھ کر سنایا اس سلسلے میں کہ کبھی اشارتاً بات کہہ دی جاتی ہے اور سننے والا خود اس سے اندازہ لگا کر صحیح معنی معلوم کرتا ہے۔ استاذ صاحب کامل للمبرد پڑھا رہے تھے۔ ایک شعر میں " ذو " لفظ مستعمل تھا جس سے مبرد نے ظن کیا تھا کہ یہ شعر بنو طی میں سے کسی کا ہے " ذو " بمعنی الذی، یہ زبان بنو طی کی ہے۔

استاذ صاحب طالب علم کی اتنی دل کھول کر امداد کرتے ہیں کہ کئی غیر علمی مشکلات نیز آسان ہو جاتی ہیں اور ہمت و حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ آج خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ رامپور کتب خانے سے استفادہ کرنے کا ارادہ ہے۔ استاذ صاحب نے فوراً تائید کی اور ساتھ لے چلے اور اپنی کوٹھی پر دو خط لکھے، ایک جناب سید بشیر حسین صاحب زیدی مدار المہام ریاست رامفور کو اور دوسرا جناب امتیاز علی صاحب عرشی مہتمم کتب خانہ کو۔ دونوں خطوط روانہ کر دیے گئے۔ اور اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ جمعرات کو رامپور کو روانہ ہوں گا۔ وباللہ التوفیق

۲۲ فروری ۱۹۴۵ء:

استاذ صاحب کو اللہ پاک نے قوت حافظہ کی نعمت دل کھول کر عطا کی ہے۔

محترم قادر بخش نے ذکر کیا ڈاکٹر یوسف صاحب زھیر بن ابی سلمیٰ کے شعر پر ایک مقالہ پڑھ رہے تھے اور شواہد کے لیے دیوان میں سے قصائد ابیات نکال نکال کر پڑھ رہے تھے۔ استاذ صاحب مجلس کے صدر تھے انھوں نے یوسف صاحب کو فرمایا کہ دیوان کھولنے کی زحمت گوارا نہ کیجیے۔ آپ ابیات کا پہلا لفظ بتا دیں اور ہم پڑھتے رہیں گے اور اس طریقے پر استاذ صاحب شعر پڑھتے رہے اور ڈاکٹر صاحب مقالہ۔ مجھے یہ تعجب ہے کہ استاذ صاحب کی روزانہ گفتگو اکثر گھر کی ضروریات کے متعلق ہوتی ہے مثلاً: لکڑی، گیہوں، کوئلہ وغیرہ اور ان جنجال کے ہوتے ہوئے، اشعار و ادبی نکات وہ ہرگز نہیں بھولتے۔

۲۴ فروری ۱۹۴۵ء:

آج شام کو استاذ صاحب کی معیت میں شام کی سیر نصیب ہوئی۔ راستے میں حاذق صاحب ملے اور استاذ صاحب کو کہا کہ میں نواب بہاولپور کے ولی عہد کی شادی کے موقع پر ایک مدحیہ قصیدہ لکھ رہا ہوں جس میں ابونواس کے شعر

"لقد ضاء شعری علی بابکم کما ضاء عقد علی خالصه"

کے پہلے مصرع کو نیز لانا چاہتا ہوں البتہ آخری فقرے کو حسب ضرورت بدلنا چاہتا ہوں۔ آپ امداد کیجیے۔ استاذ صاحب نے ان کو ایک طریقہ ان کے قافیے کے حسب حال بتا دیا۔ اور آخر میں فرمایا کہ بہتر ہوگا اگر آپ اس شعر کو نہ استعمال کریں کیوں کہ اس میں ایک بڑی غلطی ہے، وہ یہ کہ فعل "ضاء" عربی میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ حاذق صاحب حیران رہ گئے مجھے بھی تعجب ہوا۔ استاذ صاحب نے تشریح کی کہ یہ فعل "اضاء" کی صورت میں آتا ہے اور "ضاء" کی صورت میں کسی کتاب میں نہیں آیا۔ یہ صرف یارھویں (گیارھویں) اور بارھویں صدی کے عربی دانوں کی ایجاد ہے۔ اور نفحۃ الیمن والے حضرت کی ایک بڑی غلطی کا ثبوت ہے۔

۷ مارچ ۱۹۴۵ء:

شام کو استاذ صاحب اور ڈاکٹر یوسف صاحب کی معیت میں سیر کی۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ احمد تیمور پاشا کو شریف ادریسی کے جغرافیے سے نہایت شغف تھا۔ لہذا انھوں نے جملہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ ٹکڑے جمع کیے۔ اور وہ جملہ ٹکڑے ان کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ احمد تیمور کا کتبخانہ دارالکتب المصریہ میں پہنچ گیا ہے اور محفوظ ہے۔

میں نے استاذ صاحب سے ان کا لکھا ہوا "مولانا ابو عبداللہ السورتی پر رد" مطالعے کے

لیے حاصل کیا۔ سورتی صاحب نے استاذ صاحب کے خلاف ایک غیر منصفانہ محاذ قائم کر کے اپنے علم کو گندا کر دیا۔ انھوں نے استاذ صاحب کی کتاب السّمط پر رد لکھ کر تفوق حاصل کرنے کی کوشش کی مگر استاذ صاحب کے جواب نے مرحوم کو ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔ استاذ صاحب نے ان کے علم کا پول کھول دیا۔ کاش کہ سورتی صاحب یہ حرکت نہ کرتے اور نہ رسوا ہی ہوتے۔ لیکن استاذ صاحب سے یہ معلوم کر کے اور بھی افسوس ہوا کہ مولانا سورتی کے حواریین نے سورتی صاحب کی وفات کے بعد پھر سورتی صاحب کی اس حرکت کی یاد تازہ کر دی۔ اور "اسلامک کلچر" میں مرحوم سورتی پر جو مضمون لکھا ہے اس میں ان کی تصنیفات میں سے "الرد علی السّمط اللآلی" کے نام کو نیز اچھالا ہے۔ حالانکہ وہ علمی رد نہیں بلکہ اپنے جہل کا اشتہار ہے۔

استاذ صاحب اپنی باتوں میں بندے کے متعلق اچھے اچھے الفاظ استعمال کر کے ہمیشہ ہمت افزائی کیا کرتے ہیں۔ اور سلسلۂ تجسس کی تعریف کر کے حوصلہ بلند کر دیتے ہیں۔ (حالانکہ می دانم کہ من کیستم۔ نبی بخش تجھے چاہیے کہ کچھ اور آگے بڑھ اور خود میں صحیح لیاقت پیدا کر۔ فاللّٰہم حقق الآمال)۔

۱۶ مارچ ۱۹۴۵ء:

استاذ صاحب نے السیوطی کے متعلق فرمایا کہ ہر فن مولیٰ بننے کی وجہ سے ان کے کام ادھورے رہ گئے ہیں۔ استاذ صاحب نے شرح شواہد مغنی نکال کر تقریبا دس ابیات ایسے دکھائے جن کا سیوطی پتا نہ چلا سکا لیکن استاذ صاحب نے سب کا پتا بتا دیا۔ اور ایسے کئی اشعار کا پتا بتا دیتے اگر ٹائم کی گنجائش ہوتی۔ حافظ مغلطائی کے متعلق ذکر آیا۔ فرمایا کہ ان کا علم الانساب اور حدیث میں نہایت بلند درجہ ہے۔ انساب و رجال میں اوّل درجے کے ہیں اور حدیث میں دوسرے درجے پر۔ لغات پر بھی ان کا اچھا خاصا عبور ہے۔ سیرت پر چھوٹی کتاب پورا روض الانف کا خلاصہ لیکن معلومات اس سے بھی زیادہ۔ روض الانف پر حاشیہ بھی لکھا۔ بانکی پور میں شرح سنن ابن ماجہ خود مغلطائی کے ہاتھ کی موجود ہے۔ دوسرا نسخہ استنبول میں موجود ہے۔ کتب خانۂ ملت استنبول۔ صرف ایک جلد۔ اسی طرح بانکی پور میں ایک جلد۔ غالبا کتاب دو چار جلدوں میں تھی۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۵ء:

آج فہرست سازی کے متعلق ذکر آیا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ گو یورپ والوں نے اس فن کو اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن علمائے اسلام نے نیز فہرستیں بنائی ہیں۔ فرمایا

کہ طباعت سے پیشتر فہرست سازی مفید بھی نہیں تھی۔ کتابیں نقل کی جاتی تھیں لہذا ہر عالم کے پاس جداگانہ نسخہ ہوتا تھا۔ فہرست اس وقت کام کی ہے جب پڑھنے والوں کے پاس ایک ہی ایڈیشن موجود ہے۔ یہ صرف طباعت کے بعد ممکن ہوا لیکن تاہم حسب ضرورت علماء نے فہرستیں بنائی ہیں۔ سیوطی نے "بغیۃ الوعاۃ" کتاب کے آخر میں انڈیکس دی ہے۔ نو، اخفش کے نام درج کرنے کے بعد پھر اخفش میں نو کے نو اسماء کو لاتا ہے تاکہ اخفش مطلوب فوراً تلاش سے مل جائے۔ اسی طرح، فرمایا کہ ابن حجر نے بھی اپنی کتاب "اصابہ" میں فہرست دی ہے۔ استاذ نے السمط میں فہرست عروف پر بنائی ہے۔ استاذ نے کہا کہ یہ کیونکہ مجھے سب کے عرف معلوم ہیں، دوسرے علماء یہاں تک نہیں پہنچتے۔ الزرکلی نے اپنی الاعلام میں علم کے اصول پر بنائی ہے۔

۲۹ اپریل ۱۹۴۵ء:

صبح کو ڈپارٹمنٹ میں استاذ صاحب تشریف لائے۔ کشف الظنون کا ذکر آیا۔ فرمایا کہ یہ محض اسماء کتب اور مؤلفین کی فہرست ہے باقی حالات از رد۔ صحت بالکل ناکارہ۔ فرمایا کہ ہر کتاب کے حالات میں اس کے مصنف، کتاب کے نام، فن وغیرہ اس کے ہر ایک بیان میں غلطی کا احتمال ہے۔ ممکن ہے کہ کتاب کا نام کچھ اور ہو۔ اس کے مصنف کا نام کچھ اور ہو وغیرہ صرف اتنا معلوم ہوگا کہ دراصل کچھ چیز ہے و بس۔ اسمعیل بابانی کی "ذیل کشف الظنون" کا بھی یہی حال ہے لیکن ایک ضرورت کو دونوں پورا کرتی ہیں۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ڈاکٹر یوسف صاحب کی معیت میں استاذ صاحب کے ہاں گئے۔ جمھرۃ الاشعار کا ذکر آیا۔ فرمایا کہ علی گڑھ سبحان اللہ کلیکشن والا نسخہ دنیا میں شاید قدیم ترین نسخوں میں سے ہے۔ باقی نسخے سب دسویں صدی کے عہد کے ہیں۔ فرمایا کہ ایک اورینٹلسٹ نے تقریباً ۱۵ نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کتاب پر مضمون لکھا ہے، جو اس کتاب کے متعلق ہونے کی وجہ سے حاصل کرنے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ میں نے کتاب پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا ہے۔ مقدمے میں اسناد نہایت غلط ہیں۔ کتاب یقینی پرانی ہے اور کوفیوں کی روایت ہے۔ تیسری صدی میں یہ کتاب جمع کی گئی۔ چوتھی صدی کے بعد ابن رشیق نے "عمدہ" میں اس مصنف کا حوالہ دیا ہے۔ مصنف کا نام بھی کچھ الٹا سلٹا لکھتے ہیں۔ فرمایا کہ مجھے گمان ہے کہ کتاب کا مصنف شاید محمد بن ابی الخطاب، سیبویہ کے استاد سے نسبت رکھتا ہو، حالانکہ نام میں غلطی ہے۔ فرمایا کہ محمد بن ابی الخطاب نے پہلی مرتبہ عربی اشعار جمع کر کے ہر ایک بیت کے نیچے اس کی شرح

لکھنی شروع کی جمہرۃ میں نیز یہی ترتیب پائی جاتی ہے۔ جزاہم اللہ۔ اس سے پہلے علماء پورا قصیدہ نقل کر کے پھر شرح لکھتے تھے۔ ملاحظہ ہو اشعار هذیل، پہلا ایڈیشن یورپ۔

۱۳ مئی ۱۹۴۵ء:

فاتک:۔ شاہی خاندان میں سے تھا۔ متنبی کو اس سے محبت تھی۔ کافور اخشیدی نے متنبی کا خیال نہ رکھا۔ کافور اخشیدی غلام پر مرثیہ لکھا۔

قُبحاً لوجھک یازمان فانہ وَجہٌ لہ من کلّ لوم برقعٌ

ایموت مثل ابی شجاع فاتک ویعیش حاسدہ الخصیّ الاوقعُ

فرمایا کہ ابو حنیفہ الدینوری بڑے فاضل آدمی تھے۔ کتاب النبات کا مصنف جو چھے جلدوں میں تھی بغدادی کو ملی تھی۔ شیراز کے ایک رئیس کے ہاں مبرد اور ابو حنیفہ جمع ہوئے "شاۃ مجثمہ" (حدیث میں ہے کہ جانور زمین پر بیٹھے تو گردن سے نہ کاٹا جائے) کے معنی کے متعلق ذکر آیا۔ مبرد نے معنی بتا کر شاہد پیش کیا۔ ابو حنیفہ نے صحیح معنی بتائے اور مبرد کے شاہد کے متعلق کہا کہ یہ شیخ نے خود گھڑا ہے۔ مبرد نے اعتراف کیا۔ (راجع ترجمہ ابی حنیفہ معجم الادباء یاقوت) ساری دنیا کا اجماع ہے کہ ایسی کتاب عربی زبان ہی میں نہیں۔

۲۴ مئی ۱۹۴۵ء:

استاذ صاحب عربی سیمینار کمرہ میں جہاں اس تعطیل کے زمانے میں میرا قیام ہے، تشریف لائے۔ ابو العلاء وما الیہ کی تصنیف کا سبب بیان فرمایا کہ شاید ۱۹۲۳ء میں کاٹھیاواڑ سے لاہور واپس آیا کہ ڈاکٹر عنایت اللہ نے مجھے بتایا کہ مولوی خلیل احمد صاحب کی وفات کی وجہ سے علی گڑھ میں عربی لیکچرر کی جگہ خالی ہوئی ہے اور آپ اپنی درخواست روانہ کریں اور خود بھی علی گڑھ پہنچیں۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں نے درخواست روانہ کر دی۔ اور علی گڑھ کا سفر اختیار کیا۔ اس وقت ابوالعلاء کی کتاب "لزوم ما لایلزم" کو دوران سفر میں دیکھ رہا تھا اور مجھے احساس ہوا کہ ابوالعلاء کو سمجھنا آج کل کے عربی خواندوں اور مستشرقوں کے امکان سے باہر ہے، اس لیے میں نے ارادہ کر لیا کہ ابوالعلاء کے متعلق لکھوں گا۔ لاہور پہنچتے ہی میں نے ابوالعلاء کے متعلق لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کیا صرف جو کچھ مارگیولیوث نے رسائل ابی العلاء کے مقدمے میں ابوالعلاء کے متعلق لکھا تھا یا جو طٰہٰ حسین مصری نے "ذکری ابی العلاء" میں لکھا تھا، قابل التفات نظر آیا باقی لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں اس قابل ہی نہیں تھیں کہ ان کی طرف کوئی توجہ کی

جائے۔ اور اسی لیے میں نے مقدمے میں ان کے متعلق حدیث شریف کے یہ کلمات کہہ دیے کہ "جُرح العجماء جبار"۔ اس کے بعد استاذ صاحب نے ابوالعلاء کی ترتیب کے متعلق سمجھایا

اسلامک کلچر میں ہندوستان پر عربوں کے اوائلی حملوں کے متعلق ایک مضمون ہے اس کا جواب آج ختم کر لیا اور استاذ صاحب کو دکھایا۔ لکھنے والے کی غلطیوں کے متعلق استاذ صاحب کو بتایا تو ان کی غلطیوں کو سن کر ان کے متعلق استاذ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

فان کنت لاتدری فتلک مصیبۃ وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

چنانچہ اس شعر کو نیز اپنے جواب میں جگہ دی گئی۔

کل اپنا اسکول میں استاذ صاحب نے عنقاء (سی مرغ) اور خالد بن صفوان عربوں کے نبی یعنی اصحاب الرس کے نبی کے متعلق کچھ بیان کیا۔ اور عنقاء کے متعلق ابوالعلاء کا یہ شعر پڑھا

أرى العنقاء تکبرُ أن تصادا فعاند من تطیقُ لہ العنادا

تعطیل گرما کے بعد یہ پہلی مرتبہ ہے کہ استاذ صاحب سے ادبی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ میں نے دریافت کیا کہ الزجاجی نے نیز آمالی لکھی تھی۔ فرمایا کہ اس نے تین آمالی لکھیں۔ صغری، وسطی، کبری۔ فرمایا کہ صغری چھپ چکی ہے اور طالب علمی کے زمانے میں میری حفظ کی ہوئی کتابوں میں سے ہے۔ الزّجاجی نے حرم شریف میں بیٹھ کر [illegible] پر "کتاب الجمل" لکھی اس نیت سے کہ مقبولیت حاصل کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور کسی زمانے میں یہ کتاب بے حد مقبول تھی فرمایا کہ کتاب یورپ میں چھپ چکی ہے۔ ہندوستان میں یہ چھپا ہوا نسخہ صرف رامپور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دنیا اس کو اب تک قلمی سمجھ رہی ہے۔ فرمایا کہ استانبول کے کتب خانے میں اس کی "کتاب السزال (؟)" پائی جاتی ہے۔ جس پر مجھے پہلے شبہ تھا کہ شاید یہ اس کی آمالی ہے لیکن معلوم کرنے پر آمالی صغری تو نہیں ممکن ہے کہ وسطی یا کبریٰ ہو فرمایا الزّجاجی بڑے خدا پرست آدمی تھے۔ ان کی نسبت الزّجاج کی طرف ہے جو مبرد کے شاگرد تھے۔

اس کے بعد کلام کا سلسلہ ابن دُرید تک پہنچ گیا فرمایا کہ ابن دُرید، المبرد و ثعلب کے شاگردوں کے دور کا ہے مگر علمیت میں ان سے کم نہیں۔ کیوں کہ ابن دُرید نے نیز سجستانی سے پڑھا جو مبرد کا استاذ ہے۔ فرمایا کہ ابن دُرید کا درجہ لغت میں بہت ہی اونچا ہے۔ یہ جو

کتاب جمہرۃ اللغۃ کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس نے کتاب العین سے چرائی ہے، محض ہزیان ہے اور وقتی رقابت کا نتیجہ ہے۔ فرمایا کہ کتاب الجمہرۃ بے نظیر کتاب ہے اور ابن دُرید نے یہ پوری کتاب اپنے حفظ سے املاء کرائی۔ فرمایا کہ ابن دُرید لغت کا امام ہوتے ہوئے، مقصورہ میں اس نے اپنے بے مثال شاعر ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے۔ استاذ صاحب نے مقصورہ کی بہت تعریف کی۔ فرمایا کہ ابن درید خارجیوں کے خاندان میں سے تھا۔ حال ہی میں مصر کے ایک اورینٹلسٹ اور خارجیوں کے سردار نے ایک کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ابن دُرید کا خاندان خارجیوں میں سے تھا جس کے دو ثبوت ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ فرمایا کہ ابو عبیدہ نیز خوارج کی طرف منسوب ہے اور ابو خلیفہ الجمحی جو بخاری کے استادوں یا اساتذہ کے اساتذہ میں سے ہے، وہ نیز خارجی تھا۔ فرمایا کہ فلاں نے ان کے کتب خانے میں دیوان عمران بن حطّان کا مطالعہ کیا۔ ابو خلیفہ نے ان سے پوچھا کہ کون سی کتاب دیکھ رہے تھے۔ اس شخص نے جواب دیا کہ "دیوان عمران بن حطّان" اس پر ابو خلیفہ نے طیش میں آکر اس شخص کو کہا کہ کہو "دیوان امیر المومنین حضرت عمران بن حطان لا ام لک"

۱۱ اگست ۱۹۴۵ء:

آنریبل پیر الٰہی بخش صاحب ایڈوکیشنل منسٹر سندھ گورنمنٹ اور ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی پرنسپل سندھ مسلم کالج کی طرف سے خط آئے کہ مجھے سندھ مسلم کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا جائے گا اگر میں اس پر راضی ہوں تو کراچی روانہ ہوجاؤں۔ دونوں خط استاذ کی خدمت میں رکھے۔ کیوں کہ اس نادر موقع کے باوجود میں استاذ صاحب کی رائے کے خلاف قدم اٹھانا پسند نہیں کرتا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ اس وقت یہ پوسٹ دے رہے ہیں تو آپ کے کام کی تکمیل پر تو یقینی یہ جگہ مل جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی قابلیت بڑھانے سے اچھے نتائج پیدا ہوسکتے ہیں (لیکن سندھ مسلم کالج والے مجھے ضرورت کی وجہ سے یہ جگہ دے رہے ہیں۔ میری علمی لیاقت کی وجہ سے وہ یقینی نہیں دے رہے) بہرحال استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں خود پیر الٰہی بخش صاحب کو خط لکھ رہا ہوں کہ وہ اس وقت آپ کو اپنے کام ختم کرنے کا موقع دیں۔ اور استاذ صاحب نے یہ خط پیر الٰہی بخش کے نام لکھا جو آج روانہ کر رہا ہوں۔ نبی بخش

۱۴ اگست ۱۹۴۵ء:

استاذ صاحب کا خط پیر الٰہی بخش صاحب کے نام

معظم و محترم جناب والا القاب پیر الٰہی بخش صاحب وزیر تعلیمات سندھ زاد فضلہ
السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

بغیر سابقہ تعارف کے میں آپ کو تصدیع دینے کی جسارت کر رہا ہوں۔ آج عزیزی مولوی نبی بخش بلوچ ایم اے ایل ایل بی ریسرچ اسکالر نے مجھے آپ کا کرمنامہ اور مکرم ڈاکٹر امیر حسن صاحب پرنسپل کا خط بیک وقت دکھائے۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ بلوچ صاحب کے مضمون پر قدرے روشنی ڈالی جائے

"سندھ زیر عرب" کے عنوان پر انتہائی عرق ریزی سے یہ ریسرچ سوا دو سال سے جاری ہے، کوئی آٹھ ماہ اور رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں آج تک گو سندھ و عرب پر متعدد کتابیں مسلمانوں اور غیر مسلموں نے لکھی ہیں مگر کسی نے اتنی جانفشانی سے عربی ادبیات کے پوشیدہ گوشوں سے یہ مواد نہیں نکالا جس کا کھوج لگانا بلوچ کے نصیب میں تھا۔ میں کاٹھیا واڑی میمن ہوں مگر اس کام کی تکمیل کے لیے بے تاب ہوں مگر آپ کا اور بلوچ کا تو سب کچھ سندھ ہے۔ فیھا تحیون و فیھا تموتون و منھا تخرجون۔ اگر اسی طرح آپ کی توجہ شامل حال رہی تو ملازمت تو پھر بھی مل رہے گی مگر یہ کام روز مرّہ نہیں ہوا کرتے۔

محض سندھ اور سندھ کے لیے میری آپ سے التماس ہے کہ آٹھ ماہ کے لیے کوئی عارضی انتظام کرلیجیے پھر بلوچ کو میں آپ کے حوالے کر دوں گا۔ اس سلسلے میں آپ کو عارضی ضرورت پوری کرنے کے لیے بہت سے آدمی مل جائیں گے۔ آپ کو سندھ کا واسطہ دلا کر پھر ملتمس ہوں کہ ڈاکٹر امیر حسن صاحب کو آپ خود سمجھایئے۔ اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر داؤد پوتہ صاحب کو میرا نیاز نامہ دکھا کر استصواب کیجیے۔

آخر میں آپ سے اس جسارت پر طالب عفو ہوں والسّلام

ناچیز
میمن عبدالعزیز

۲۴ اگست ۱۹۴۵ء:

آج ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی کا خط مع اسسٹنٹ پروفیسر کی تقرری کا آرڈر

پہنچا۔ نماز کے بعد قبلہ استاذ صاحب کے سامنے رکھے گئے۔ استاذ صاحب میرے یہاں رہنے کو کراچی جانے پر ترجیح دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یونیورسٹی والوں کی بے اعتنائی اور میری ضعیف مالی حالت کو استاذ صاحب نے قدرے محسوس کیا اور فرمایا کہ "اچھا آپ جائیں"۔ میں جانتا ہوں جو صدمہ استاذ صاحب کی جدائی کی وجہ سے میں لے رہا ہوں۔ افسوس کہ یونیورسٹی ایک شخص کو جو ڈیڑھ سو روپیہ نیز بخوشی چھوڑ دے، بشرطیکہ پچاس روپیہ اطمینان سے مل جائیں، یہاں رہنے کا موقع نہیں دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی کے پورے تکلیف دہ قیام میں صرف استاذ صاحب کا ہی سہارا رہا۔ اس کے بغیر کام کرنا تو درکنار شاید جینا بھی مشکل ہوجاتا۔

۳۰ اگست ۱۹۴۵ء:

استاذ صاحب سے ملاقات ۱۲ بجے دوپہر۔ فرمایا کہ ہمارے استاذ مولوی عبدالرحمٰن صاحب شاہ پوری (؟) کا انتقال ہوگیا۔ فرمایا کہ حدیث پر ان کی بڑی زبردست نظر تھی۔ علم سکھانے کا اتنا شوق تھا کہ ایک مرتبہ مجھے بخار ہوگیا تو تقریباً ایک میل خود چل کر آئے اور تقریباً ۱۲ صفحے صحیح بخاری کے پڑھا کر گئے۔ فرمایا کہ ہمیشہ ایک یا ڈیڑھ چپاتی کھانے پر کھایا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ کبھی نہیں کھایا۔ اور انھوں نے ۹۰ برس کی عمر پائی اور ابھی فوت ہوئے۔

اس کے بعد مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے اور دراسات اللبیب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے جید عالم تھے (اس وقت دراسات اللبیب استاذ کی چارپائی پر رکھی ہوئی تھی اور اس کو دیکھ رہے تھے۔ مخدوم محمد معین کا تذکرہ "تراجم علماء اہل حدیث ہند میں سے دیکھا تھا)" فرمایا کہ فتوحات مکیہ میں سے لیتے ہیں اور ایک جگہ پر "کشف المحجوب" کی عبارت نیز نقل کی ہے۔ فرمایا کہ دراسات میں امام ابو حنیفہ کی آراء میں سے کہیں کہیں جو اختلاف ہوسکتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ میں امام صاحب پر معترض ہوں بلکہ میں خود امام صاحب کے قول کی پیروی کر رہا ہوں کہ جہاں میرے قول کے مقابلے میں صحیح حدیث ملے تو اس کو ترجیح دو۔ اور پھر امام ابو حنیفہ کے مناقب پر ایک باب لکھا ہے۔ استاذ صاحب نے مخدوم محمد معین کے ترجمے کے متعلق دریافت فرمایا۔ شام کو میں نے استاذ صاحب کو "الوحید آزاد نمبر" میں سے مخدوم صاحب کا تذکرہ دکھایا۔ استاذ صاحب نے پھر مخدوم صاحب کی تعریف کی۔ کہا کہ دقت

کے بڑے عالم تھے اور مجھے آج کل کے کسی مولوی سے امید نہیں کہ وہ اتنا مبلغ علم رکھتا ہو۔
پھر فرمایا کہ بڑے جیّد عالم تھے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اگر "دراسات اللبیب" کی تصحیح کر دیں تو میں سندھ میں اس کے چھپوانے کا انتظام کروں۔ قبول فرمایا اور کہا کہ ساتھ ساتھ ہی عربی عبارات کی الجھنوں کو صاف کر دیا جائے گا تاکہ یہ کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کی طرح ایک مستقل کتاب بن جائے۔ پھر فرمایا کہ آج کل کا ذوق کچھ اور ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کروا دیا جائے تاکہ لوگ اس سے مستفید ہوں۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۵ء:

۳۱ اگست کو علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر سندھ مسلم کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر شامل ہونے کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ سب سے تکلیف دہ بات استاذ صاحب کا فراق تھا۔ لیکن ایک امید اطمینان بخش تھی کہ ۱۰ اکتوبر کو چھٹیوں میں علی گڑھ آؤں گا اور پھر مارچ ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ آؤں گا۔ لہذا علی گڑھ سے سلسلہ منقطع نہ ہوگا اور استاذ صاحب کی زیارت، محبت اور علم سے مستفید ہوتا رہوں گا۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر کو کراچی سے روانہ ہو کر آج ۱۲ کو علی گڑھ پہنچا۔ شام کو استاذ صاحب کے دولت خانے پر گیا، محمود ملے۔ استاذ صاحب ٹہلنے چلے گئے تھے۔ محمود تکلفاً چائے لائے۔ میرا یہ حال کہ کہیں سے بھاگ کر جاؤں اور استاذ صاحب کو جا کر ملوں۔ خیر چائے سے فارغ ہو کر نابینا ماسٹر کی طرف روانہ ہوا۔ دور سے استاذ صاحب کو دیکھا۔ جب قریب گیا تو استاذ صاحب نے بھی مجھے دیکھ لیا اور کرسی کو چھوڑ کر آگے آئے۔ اور آتے ہی گلے ملایا اور ملائے رکھا۔ اس محبت و خلوص کی انتہا سے مجھے آنسو آنے کے قریب تھے لیکن دل تھام کر نابینا ماسٹر سے ایک دو بات کرلی۔ استاذ صاحب کی مجلس اور رفاقت نصیب ہوگئی، شکر الحمد للہ۔ ایک مہینے کے لیے اس وصال کا موقع ملتا رہے گا۔

شام کو استاذ صاحب کے دولت خانے پر آیا۔ استاذ صاحب سے عرض کیا کہ عروض پر فائدہ مند کتاب کونسی ہے۔ فرمایا کہ قصیدہ خزرجیہ کی شرح لابی بکر دامینی ایک مبسوط کتاب ہے۔ مفتاح العلوم لسکاکی پر عروض و قوافی کا باب بے نظیر ہے۔ الکافی فی العروض والقوافی چھوٹی لیکن نہایت جامع اور مفید کتاب ہے۔ اس کا حاشیہ الکبریٰ الدمنہوری نے لکھا ہے فرمایا کہ ویسے تو ابن حاجب، تبریزی وغیرہ نے نیز عروض پر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ فرمایا کہ اس لحاظ سے تو مفتی سعد اللہ رامپوری کی کتاب عروض و قوافی پر نہایت مفید ہے۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۴۵ء

شام کو استاذ صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ میں نے عرض کیا کہ میرے لیے "سندھ عربوں کے ماتحت" موضوع ریسرچ کے لیے متعین کیا گیا۔ یہ گویا ۴۳۰ برس کی تاریخ ہے لیکن شروع میں یہی خیال تھا کہ مواد بالکل کم ہے؛ اس لیے اتنا وسیع عرصہ رہنے دیا گیا۔ لیکن اب گہرے مطالعے کے بعد کافی مواد مل چکا ہے اور ازاں رو، اتنے طویل عرصے کی تاریخ صرف پی ایچ ڈی کے لیے لکھنا مشکل ہے؛ لہٰذا اس موضوع میں ترمیم کی جائے اور اس کو "السند تحت بنی امیہ" متعین کیا جائے۔ استاذ صاحب نے اس خیال کی موافقت کی اور بعد میں فرمایا کہ جستجو کرنے والے کو سب کچھ مل جاتا ہے ۔ مثال طور اپنی تصنیف ابوالعلاء وما الیہ کا ذکر کیا، کہ اس سے پیشتر کئی تصنیفیں ابوالعلاء پر لکھی جا چکی تھیں ۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت اس موضوع سے متعلق دنیا میں مانگ ہے؛ لہٰذا ابوالعلاء سے دلچسپی نہ ہوتے ہوئے میں نے اس سے دلچسپی پیدا کر لی اور مولوی خلیل اسرائیلی کی وفات پر جب میں علی گڑھ میں ملازمت کے سلسلے میں حالات کو دریافت کرنے کے لیے علی گڑھ آ رہا تھا تو میں نے المعری کے "لزومیات" کو اپنے ساتھ لے لیا اور دوران سفر میں ان کے مطالعے سے یہ اندازہ لگایا کہ باوجود ابوالعلاء پر اتنی تصانیف کے، میرے لیے میدان وسیع ہے اور یورپ کے استشراق میں اتنی گنجائش نہیں کہ لزوم کو سمجھ سکے۔ تعجب ہے کہ وزیر ابوالقاسم المغربی ابوالعلاء کا بڑا دوست، اس کا پورا مرثیہ لزوم میں موجود ہے تاہم مستشرقین کو کچھ پتا نہیں۔ چنانچہ چار مہینے میں یہ کتاب لکھ ڈالی اور دنیا نے داد دی ۔ فرمایا کہ دارالکتب کے فروغ الادب میں بیٹھ کر اس سلسلے کی کتابیں دیکھا کرتا تھا جس سے وہاں کے منتظم میرے سلسلے کو سمجھ گئے اور ان کتابوں کی اہمیت کو نیز سمجھ گئے ۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے کافی اقتباسات ان کی کتابوں میں سے لے کر چھاپ دیے لیکن ابوالعلاء کے متعلق اس وقت تک ایک دو چیزیں میرے علم میں ایسی ہیں جس کا دنیا میں دوسرے لوگوں کو علم نہیں ۔ فرمایا کہ ایک تو خود ابوالعلاء کا غیر مطبوعہ رسالہ ہے المسمی "رسالہ الساھل والشاحج" جو نجف اشرف میں احمد سماوی نام شیعی صاحب کے یہاں موجود ہے۔ دوم یہ کہ ابوالعلاء کو زیادہ نزدیک سے دیکھنے اور سمجھنے والا ابن العدیم الحلبی تھا، جس نے ابوالعلاء کے متعلق کتاب العدل والتجری دفع الظلم والتجری علی ابی العلاء المعری " کتاب لکھی ہے ۔ ابن العدیم نے تاریخ حلب بیس جلدوں میں لکھی ہے جس میں "احمد" کے ذیل میں ابوالعلاء کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ مسٹر مرگیولوث نے بہت کوشش کی کہ فرانس کی لائبریری سے وہ کتاب ان کو

ملے لیکن احمد والی جلد وہاں معدوم تھی استاذ نے فرمایا کہ اس جلد کا میں نے پتا لگا لیا ہے۔ وہ احمد تیمور پاشا (؟) کے کتب خانے میں ہے جو ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔ میں نے اس کو کھلوا کر خود اپنی آنکھوں سے وہ کتاب دیکھی تو اس میں ایک سو صفحات پر مشتمل سوانح ابوالعلاء کی پائی۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ افسوس کہ عربی علماء نیز کبھی کبھی ادبی گوہروں کی قدر نہیں کر سکتے اور "ابولعلاء" میں استاذ صاحب نے جو ابولعلاء کا شعر نقل کیا ہے کہ

ولقد علمتُ فما التمضرُ نافعی   أنی سأتبع نیسباً لابنی سبا

اور یہ کہ کر "ان المراد بالتمضر ھنا التمعدد" ایک بڑے راز کو عام کر دیا ہے۔ ان کے متعلق ابولوحاب نجار نے کتاب کے آخر میں اپنی راے دیتے ہوئے "بجائے داد کے" اپنی جہالت کا اظہار کیا ہے اور بیجا تنقید کی ہے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ ان کی اتنی ہولناک غلطی پر میں نے خاموش رہنا واجب سمجھا اور اس کا سرے سے جواب ہی نہیں دیا۔ البتہ استاذ صاحب نے "ابوالعلاء" کا نیا نسخہ دکھایا جہاں انھوں نے عبدالوہاب نجار کی تحریر پر حواشی میں یہ عبارت لکھ دی تھی:۔

الاستاذ حفظہ اللہ لم یرای ذوق الادبی ولن تحصل علی العلم بالرکون الی المعاجم وھذا المرزبانی یقول فی معجمہ ۳۵۲ ان کان یزید بن اسید دعا قضاعۃ الی التمضر. فقال کلثوم بن وائل:

ما ولدتنا ولادۃ مضر   ولا لنا فی تمضر ارب

و انا للصمیم من یمن   وغرۃ الناس حین تنتسب

ولا لنا فی تمضر ارب وھذا ظاہر فلا حول ولا قوۃ الا باللہ ..... فجزاک اللہ فی الدارین خیراً ..... السندی

۲۶ اکتوبر ۱۹۴۵ء:

آج استاذ صاحب نے "ابوالعلاء وما الیہ" کی تصنیف کا پورا سلسلہ اور اس کی خواص سمجھائیں۔ میں نے اوپر کے حواشی کے متعلق عرض کیا کہ اگر آپ یہ حوالہ تصنیف کے وقت نقل کر دیتے تو عبدالوہاب نجار کے اعتراض کا راستہ بند ہو جاتا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ بھائی میرے ذہن میں یہ سب چیزیں موجود تھیں اور میرے نزدیک یہ نظریہ مکمل اور مضبوط ہے۔ لہٰذا میں نے دیانت داری سے یہ نظریہ پیش کر دیا۔ اب میرے لیے یہ مشکل تھا کہ حقائق پیش کرتے وقت ہر کہ و مہ کی الجھنوں کا پہلے ہی اندازہ بھی کر لیتا اور اس کے سلجھانے کا سامان بھی مہیا کرتا۔ "فرمایا کہ " حماقت کے راستے ہزاروں ہوتے ہیں عقل کا راستہ صرف

ایک ہی ہوتا ہے"۔

آج شام کو بعد نماز جمعہ استاذ صاحب کے ساتھ شہر جانا ہوا۔ ایک میری غلطی جو وعدہ کی تکمیل میں ذرا سی کمی کا باعث تھی اور اس کی وجہ سے کافی تکلیف پیدا ہوئی۔اس پر استاذ صاحب نے نصیحت آمیز الفاظ میں تنبیہ کر دی۔ فانقذنی من زلتی ولہم الشکر

نماز مغرب کے بعد حبیبی نورالحسن صاحب کی معیت میں استاذ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے نورالحسن صاحب نے اپنا وطن گلبرگہ بتایا جس پر استاذ صاحب نے ابوبکر بدرالدین الدمامینی مدفون بقلعۂ گلبرگہ کا ذکر کیا۔ اصل مصر کے افاضل میں سے تھے، ریشم کا کارخانہ تھا۔ قرض کی وجہ سے بھاگ کر یمن آئے اور حکومت نے قرضہ ادا کر دیا۔اس کے بعد ہندوستان کا رخ کیا اور مہائم (نزدیک بمبئی) میں شیخ المہائمی کی صحبت میں رہے (شیخ المہائمی تفسیر کے مصنف ہیں) یہاں رہ کر کافی کتابیں لکھیں ایک الوافی کی شرح "المنھل الصافی" تھی جس کا ہندوستان میں کافی چرچا رہا۔ علاوہ اس کے "تعلیقات علیٰ مغنی اللبیب" لکھی اور دوسری کتاب "فتح القریب علیٰ مغنی اللبیب" لکھ کر ختم نہیں کی تھی کہ فوت ہوگئے۔ قصیدۂ خزرجیہ کی شرح میں علم عروض پر استقصائی مباحث بھر دیے ہیں۔ ان کا تذکرہ "دررالکامنہ" لابن حجر العسقلانی میں موجود ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ "مات بکلبرجہ مسموما" اس کے بعد امام الصاغانی اللاہوری کا ذکر کیا۔ عباب فی اللغۃ تکملہ علیٰ صحاح الجوہری اور تکملہ اور صحاح کا جمع "مجمع البحرین" ان کی معرکۃ آرا تصانیف ہیں۔ جو استاذ صاحب نے فرمایا کہ خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میں نے دیکھی ہیں۔ عباب "بکم" کے مادے پر ختم ہوتی ہے جس کے متعلق استاذ صاحب نے شعر پڑھ کر سنایا۔

۵ نومبر ۱۹۳۵ء:

چونکہ ۱۴ نومبر کو واپس جانے کا خیال ہے، لہذا استاذ صاحب کے ارشاد کے مطابق دو چار دن سے روزانہ صبح و شام ان کی معیت میں سیر وتفریح کا پروگرام بنا ہوا ہے۔ کل آپ نے فرمایا کہ میں آج ان کے ہاں کھانا کھاؤں۔ صبح کو ۱۱ بجے ڈپارٹمنٹ میں جا کر استاذ صاحب سے ملا، جہاں سے لائبریری گئے اور مولانا احسن مرحوم مارہروی کا کلیکشن دیکھا۔اس میں ایک نسخہ العروض یحییٰ التبریزی کا نیز پایا جاتا ہے لیکن بے ترتیبی کی وجہ سے ہم ان کو دیکھ نہ سکے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ مصر وغیرہ میں اس کے نسخے پائے جاتے ہیں۔ مولانا احسن مرحوم شاعر تھے اور کیا شک کہ ان کے یہاں نیز اس کتاب کا نسخہ ہو۔ استاذ صاحب کے گھر گئے۔کرم فرما کر بڑا

پرتکلف کھانا کھلایا بعد میں بلاذری میں سے کچھ الفاظ میں بیٹھ کر پوچھنے لگا۔ عرجی کا ذکر آیا استاذ صاحب نے فرمایا کہ قسطنطنیہ میں میں نے ان کا دیوان دیکھا ہے۔ اور بعد میں رخصت لے کر کمرے میں پہنچا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ جوانی میں جب کہ انسان شہرت نہیں حاصل کرتا اس وقت تک اس کو خدمت کا معاوضہ بھی کم ملتا ہے۔ اس وقت چاہیے کہ وہ فوراً جو کچھ ملے وہ اپنی جان پر خرچ کر دے اور بچانے کا غم نہ پالے۔ تاکہ اس کی صحت وغیرہ ٹھیک رہے۔ جیسے جیسے دن گذرتے جائیں گے اس کی شہرت بڑھتی جائے گی اور معاوضہ بھی زیادہ ملنے لگے گا۔ اس وقت نیز فاضل پیسہ بچانے کی فکر کرے۔ باقی زیادہ تنگی نہ کرے کیوں کہ اس کی عمر اسی لحاظ سے گھٹتی جاتی ہے۔

۵ نومبر ۱۹۳۵ء

آج شام کو استاذ صاحب کی معیت میں قلعے کی طرف گھومنے کا موقع ملا۔ میں نے حریری کی درۃ الغواص کے متعلق پوچھا۔ فرمایا کہ حریری نے الفاظ کے عام غلط استعمال کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان کا صحیح استعمال دیا ہے۔ فرمایا کہ پڑھنے والا اس کو حریری کی کرامات سمجھے گا مگر در حقیقت انھوں نے اپنی تحقیق کے علاوہ زیادہ تر دوسری کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک پہلے کی کتاب" مالحن بہ الناس ؟ سے لیا ہے اور ابن سکیت سے لیا ہے اور زیادہ تر ابن قتیبہ کی ادب الکاتب میں سے لیا ہے۔ جو جو اعتراضات ان پہلی کتابوں پر ہوئے ہیں وہی حریری پر نیز ہوسکتے ہیں۔ فرمایا کہ درۃ الغواص کی بہترین شرح اور تنقیدیں لکھی گئیں۔ پہلے ابن بری اور ابوظفر صقلی نے اس پر تشریح و تنقید کی، مگر درۃ الغواص کی بہترین شرح و تنقید شہاب الدین خفاجی کی ہے جس میں انھوں نے اپنے پیش رو کی کتابوں کو نیز سامنے رکھا ہے کم از کم ابن بری کو تو لیا ہے اور درۃ پر بہترین فاضلانہ تشریح و تنقید لکھی ہے یہ کتاب اور درۃ الغواص دونوں مطبع جواب قسطنطنیہ میں چھپ چکے ہیں۔ فرمایا کہ اس تیرہویں صدی میں بغداد کے ایک اور شخص نے طرۃ علی درۃ (؟) تشریح لکھی ہے لیکن عامی ہے۔

فرمایا کہ ادب الکاتب کی شرح و تنقید جوالیقی اور محمد بن سید البطلیوسی نے لکھی، جوالیقی اشعار کی بہتر تشریح کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بطلیوسی کی شرح فاضلانہ ہے۔ اور صرف چونکہ وہ اندلس میں رہتے تھے لہذا جوالیقی جو خود عراق کے تھے ان کی زیادہ شہرت ہوگئی۔ فرمایا بطلیوسی بڑے فاضل تھے۔ سقط للمعری کی شرح خود مصنف سے کہیں بہتر لکھی ہے۔ ضرام السقط اس سے کم پایہ کی شرح ہے۔ سقط کی شرح خوبی نے نیز لکھی تھی۔ جب قاضی ابوبکر ابن العربی

مالکی اندلسی بغداد آئے تو انھوں نے ابوزکریا تبریزی جو خود معری کے شاگرد تھے ان سے سقط الزند پڑھی اور اسپین پہنچ کر بطلیوسی کی شرح پر اعتراضات کیے۔ فرمایا کہ قاضی ابوبکر دینی مسائل کے خواہ کتنے ہی بڑے امام ہوں، تاہم عربیت اور ادب کی رو سے بطلیوسی کے پائے کو ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ فرمایا کہ بطلیوسی نے قاضی ابوبکر پر رد لکھا جو دمیاط کے کتب خانے میں موجود ہے جہاں سے ایک کاتب نے اپنے لیے نسخہ نقل کیا اور اس سے نقل کر کر بیچ ڈالے فرمایا میں نے ان سے خود وہی اصلی نسخہ خرید لیا جو میرے پاس موجود ہے۔ فرمایا کہ اس رد میں نہایت مہذب الفاظ میں قاضی ابوبکر کے جملہ اعتراضات کو بری طرح رد کر دیا ہے۔ فرمایا کہ قاضی ابوبکر کی تصانیف کو دیکھتے ہوئے ان کی وقعت نظروں میں گر جاتی ہے۔ فرمایا کہ جب قاضی ابوبکر بغداد آئے اس زمانے میں پیچھے اندلس میں ابن حزم کا مذہب پھیل گیا۔ قاضی ابوبکر نے واپس آکر اس کے خلاف نہایت ناشایستہ الفاظ میں لکھا کہ "سخیف من سخیفة فلانة"۔ ابن حزم کے متعلق "سخیف" کا لفظ ناشایستہ ہے۔ اور کجا ابن حزم اس کا فضل اور ادب اور کجا قاضی ابوبکر۔ فرمایا کہ قاضی کی کتاب العواصم علی القواصم (؟؟) جو کہ ایک دینی سفر نامہ ہے اس میں قاضی ابوبکر کی فاطمیوں وغیرہ سے بحثیں وغیرہ موجود ہیں۔ فرمایا کہ قاضی ابوبکر نے ایک نہایت ردی فقرہ ایک جگہ لکھ دیا ہے کہ "قتل الحسین بسیف جده" یعنی شریعۃ النبی لانہ خرج علی الامام۔ فرمایا کہ یہ بہت زیادتی ہے اور اس لیے قاضی ابوبکر کے خلاف کافی لوگوں میں نفرت پھیل گئی اور خود ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ قاضی ابوبکر کے فضل کے باوجود یہ فقرہ بے معنی ہے۔

۶ نومبر ۱۹۴۵ء:

شام کو استاذ صاحب شہر تشریف لے گئے۔ لہذا ملاقات نہ ہو سکی۔ مغرب کے وقت ان کے دولت خانے پر ملاقات میسر ہوئی۔ فرمایا کہ مسلم بن محمود الشیزری ایک ادیب ہو گذرے ہیں اور میں نہیں جانتا کہ دنیا اس کو کماحقہ جانتی ہے۔ پشاور میوزیم میں اس کا رسالہ موجود ہے اور ایک صاحب نے مجھ سے اس کے متعلق دریافت کیا اور میں نے نہایت عجیب و غریب معلومات ان کو دیں۔ آج ان کا یہ خط موصول ہوا۔ (میں نے خط پڑھا۔ لکھا تھا کہ "آپ نے اپنے خط میں مجھے مسلم بن محمود الشیزری کے کلام کا پتا بتلایا تھا ... ناظم صاحب کتب خانۂ رام پور کی مہربانی اور سعی سے بروقت وہ نقل مل گئی۔ ان قصاید کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم بن محمود نے یہ قصاید ملک المعز اسمعیل بن سیف الاسلام طغتکین کی

مدح میں لکھے ہیں جس کے لیے اس نے " عجائب الاسفار " لکھی تھی نہ کہ الناصر لدین اللہ (خلیفہ بغداد) کی مدح میں۔ ممکن ہے کہ رامپور والی کتاب کے باقی قصائد الناصر لدین اللہ کی مدح میں ہوں۔ مسلم بن محمود کے قصاید الملک المعز طغتکین کی مدح میں ہیں جن کا علم محض آپ کی مہربانی اور اطلاع سے مجھے ہوا ہے اور آپ کی اس عنایت کے شکریے کے طور پر یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اس سلسلے میں بندے کو ہدایت فرماتے رہیں گے۔
خاکسار احمد حسن لائبریرین اسلامیہ کالج پشاور)

استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں نے ان کو لکھا ہے کہ آپ علی گڑھ تشریف لائیں تاکہ میں آپ کو اس رسالے کی مکمل تصحیح کر دوں اور باقی معلومات میں اضافہ کر دوں

مارچ ۱۹۴۶ء:

تاریخ ۱۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو کراچی سے علی گڑھ ریسرچ کے سلسلے میں آنا ہوا۔

استاذ صاحب کی کوٹھی پر قیام ہوا ہے۔ کرم فرما کر مشرقی کمرہ خالی کر دیا۔ پہلے دن کی ضیافت فرمائی۔ تقریباً ۱۸ مارچ کو نقوی پارک ٹہلنے گئے۔ قرآن شریف کے انڈیکس کے متعلق گفتگو ہوئی۔ فرمایا اورنگزیب کے زمانے میں فہرست بنائی گئی تھی۔ فرمایا کہ بنارس کے ایک پادری نے سب حرف کو تہجی پر مرتب کر دیا ہے جو غیر عالم کے لیے کافی مفید ہے۔ فرمایا کہ ترکی میں نیز ایک فہرست (مجھے اس کی تفصیل اور نام یاد نہیں رہا نبی بخش) بنائی گئی۔ فرمایا کہ لیکن سب سے بہتر فہرست فتح الرحمان فی آیات القرآن جو فلسطین کے ایک شخص نے بنائی ہے اور ہر ایک لفظ کے آگے پیچھے والے ایک دو الفاظ ضبط کر کے آیات کو مقید کر دیا ہے۔ فرمایا کہ باریک پیپر پر نہایت خوبصورتی سے چھپی ہے۔ فرمایا کہ فلوگل نے بھی بڑا کام کیا ہے اور کافی جان لڑا کر فہرست قرآن بنائی ہے۔

۲۴ فروری ۱۹۴۶ء:

استاذ صاحب کو خاندانی حالات (جاہل بھائیوں کی غیر منصفانہ روش۔ اپنی زوجہ کی خواہ مخواہ لڑائیاں) نے کافی ستایا ہے۔ سب قصے سنائے۔ فرمایا کہ یہ باتیں اگر اندر میں رکھی جائیں تو انسان گھل گھل کر مرجاتا ہے۔ آپ چونکہ رازداں ہیں لہذا میں آپ سے بیان کرتا ہوں کہ کس طرح والد صاحب نے دوسرے بھائیوں کے قبضے میں آکر قطع تعلقات کر رکھا ہے۔ ابھی ابھی ان کی بیماری کی اطلاع ملی تو بہت افسوس ہوا۔ میں ان کو خط لکھنے والا ہوں۔ فرمایا کہ ان کی اس روش سے حیاتی کم ہوتی جا رہی ہے۔

فرمایا کہ ۱۸ - ۱۹ برس کی عمر میں والد صاحب نے اصرار کر کے میری شادی کرائی۔ میرے انکار در انکار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ شادی میرے تایا جان کے گھر سے ہوئی۔ بعد میں والد صاحب کی تایا جان سے لڑائی ہوگئی تو مجھے کہا کہ آپ طلاق دے دو۔ میں نے پھر سمجھایا کہ پہلے تو آپ نے میری مرضی کے خلاف شادی کرائی۔ اب اس فعل کو میں بہتر نہیں سمجھتا اس کہنے پر بہت بگڑ گئے۔ اس حد تک کہ مجھے طلاق ہی دینی پڑی اور ساتھ یہ عہد کیا کہ آئندہ میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ اس کے بعد پھر والد صاحب نے اس سلسلے میں میری جان چھوڑ دی۔ مگر قیام پشاور کے زمانے میں کئی قسم کے امراض پیدا ہوگئے۔ حکیموں نے شادی کا مشورہ دیا۔ میں نے نہ مانا۔ لیکن حالت اتنی خراب ہوگئی کہ چاروناچار شادی کرنی پڑی۔ جس سے کئی جنجال پیدا ہوگئے۔ فرمایا کہ اگر مجھے گھر میں سکون نصیب ہوا ہوتا تو دنیا میری خدمات سے بہت کچھ مستفید ہوتی۔

استاذ صاحب نے پروفیسر زبید احمد صاحب کی کتاب عربی لٹریچر دی اور فرمایا کہ اس میں سے حسن صاغانی کے حالات پڑھو۔ پڑھ کر سنائے۔ فرمایا کہ یہ وہی معلومات ہیں جو سب کو معلوم ہیں۔ مصنّف نے خاص معلومات کا ذکر نہیں کیا۔ فرمایا تاہم مصنّف نے بڑی محنت سے کام کیا ہے اور یہ کتاب اہم ہے۔ شہاب خفاجی کے متعلق فرمایا کہ خزانۃ الادب کے مصنّف کے استاذ تھے۔ فرمایا کہ میں نے حسن صاغانی کی تصانیف تقریباً سب کی سب ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں۔

فرمایا مصر کے ایک عالم نے وزیر بہاء الدین جونا گڑھی کے نام ایک کتاب منسوب کی تھی اور چند اشعار کے ساتھ وہ کتاب وزیر کو بھیج دی تھی۔ ان اشعار میں سے اخیر کا ایک مصرع یوں ہے کہ:

"تعیش بہاؤ الدین فی عز جونکرہ"

شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب "ارشاد فی النحو" کا ذکر کیا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ اس میں یہ خوبی ہے کہ وہ مثالوں میں نحوی معنی کا استعمال دے دیتا ہے۔ فرمایا کہ اس کی کتاب "مُوَّاج" میرے ہاں موجود ہے۔

استاذ صاحب نے فرمایا کہ شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب "الشرح الھندی شرح الکافیہ" کی شرح کا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ فرمایا مُلّا جامی کی شرح اسی شرح الھندی سے لی گئی ہے۔

صبح کو ٹہلنے گئے جیسا کہ یہاں آتے ہی ہر روز صبوح کو استاذ صاحب نیند سے جگاتے ہیں اور سیر کے لیے قلعے کی طرف جاتے ہیں۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ یہ صبوح کا سیر حیاتی کو دراز کرنے والا ہے۔ فرمایا کہ انسان اگر کسی کام کا ارادہ کر لے تو یہ سیر کا وقت تضیع اوقات ہرگز ہرگز نہیں۔

۲۸ مارچ ۱۹۴۶ء:

شام کو نقوی پارک میں استاذ صاحب کی معیت میں ٹہلنے گئے۔ عربی کتابوں کی تجارت کے متعلق گفتگو رہی۔ فرمایا کہ ہندوستان میں عبدالتّار السورتی سب سے اولی العزم تاجر ہے فرمایا کہ اچھے مکتب کے لیے کم از کم ایک لاکھ روپے کے سرمایے کی ضرورت ہے۔ فرمایا قرش دو آنہ ایک پائی کے برابر ہوتا ہے۔ مصری پونڈ ایک سو قرش کے برابر ہے اور انگریزی پونڈ ساڑھے ستانوے قرش کے۔ فرمایا کہ سفید پیپر پر مصر کی نئی تازی چھپی ہوئی کتاب جو دو سو سے تین سو صفحے تک ہو اس کی قیمت دس سے لے کر پندرہ پونڈ تک ہوتی ہے۔ یہ ایک عام اصول ہے اور آپ یاد رکھیں فرمایا کہ اگر کوئی آدمی تجارت کرے تو ایک سال میں کم از کم دو تین مہینے کے لیے مصر جائے۔ وہاں صناداقیہ محلے میں کتابیں نہایت سستے داموں میں مل جاتی ہیں۔

۲۷ مارچ ۱۹۴۶ء:

استاذ صاحب نے امرؤ القیس کا شعر پڑھا: "رب رام من بنی ثُعَل مُتلجٍ کفیہ فی قُترہ"
میری استدعا پر یہ شعر میری ڈائری میں اپنے قلم سے لکھا
استاذ صاحب سے مندرجہ ذیل بیت کے معنی پوچھے:

"یُکلکزُ لنا البحران والسیفُ کلّہُ۔ وان یاتنا باسٌ من الھند کاربٌ"۔ فرمایا کہ یہ ابیات بہت مشہور ہیں اور مفضلیات، دیوان حماسہ اور میری کتاب السّمط میں آپ کو مل جائیں گے۔ میں نے ان قبل اسلام اشعار کی قدامت کے متعلق استفسار کیا تو فرمایا کہ اکثر اشعار جاھلیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے زمانے کے لگ بھگ کے ہیں۔ فرمایا کہ ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے یہ اشعار اسلام سے پچاس برس قبل تک جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ شعراء پرانے ہیں اور افوہ الاودی کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ مسیح کے زمانے کا ہے۔ فرمایا مگر ان اشعار کو زیادہ قدیم سمجھنا قرین قیاس نہیں۔ کیوں کہ امرؤ القیس قدیم شعراء میں مانا جاتا ہے تاہم اس کی قدامت کا یہ حال ہے کہ اس نے ایک تیر انداز کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور صحابہ میں سے تھا۔ یہ بنی ثعل قبیلے کا شخص تھا۔ اس کے حالات اصابہ میں مل جائیں گے۔

(امرؤالقیس والااوپر لکھا ہوا شعر پڑھا۔ اور پھر میری گذارش پر اپنے ہاتھ سے تحریر فرمایا)

۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء

استاذ صاحب نے اوپر کا حوالہ کتاب المعارف لابن قتیبہ میں سے نکال دیا: یوں ہے
عمرو بن المسیح الطائی رضی اللہ عنہ . وفد الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و کان ارمی العرب کلہا وھوالذی یقول فیہ امرؤ القیس رب رام من بنی ثعل ۔ مخرج کفیہ من سترہ (کذا) و عاش مایۃ و خمسین سنۃ ولست اقبض قبل وفاۃ النبی صلعم ام بعدہ. المعارف ص ۱۶۰

۲ اپریل ۱۹۴۶ء:

کل مسٹر فیضی پرنسپل لا، کالج بمبئی نے استاذ صاحب کو ایک خط لکھا کہ "دعائم الاسلام" للقاضی النعمان کو ایڈٹ کر رہے ہیں کہیں حدیث علی میں ایک لفظ "العکل، الحسکل، العنبکل" وغیرہ صورتوں میں آیا ہے جس کا کچھ بھی مطلب نہیں بنتا۔ لہذا استاذ اس پر روشنی ڈالیں۔ آخر میں لکھا تھا کہ آپ ایک بحرِ ذخار ہیں۔ اور افسوس کہ ہمیں آپ کے علم سے مستفید ہونے کا موقع نہیں ملتا وغیرہ۔ کل شام استاذ صاحب نے وہ خط دکھایا تھا۔ آج صبح کو کارڈ پر اس کا جواب لکھا۔ جو نقل کیا جاتا ہے:

۲ اپریل ۱۹۴۶ء:

صدیقی الاستاذ الفاضل اکرمکم اللہ بتقواہ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ و رضوانہ

وصلنی الکتاب الکریم فحمدت اللہ علی السلامۃ والعافیۃ و دعوت ان یدیمہما علیکم آناء الاسحار والاصال

واما سألتکم فانہا تحریفۃ او تصحیف فی اتعاب لیست الا واحو الا "الفسکل" وھو آخر افراس حلبۃ الرھان ویسمی السکیت ایضا (پھسڈی) وفی الحدیث علی مافی النہایۃ ومجمع البحار والتاج ان اسماء بنت عمیس قالت لعلی ان ثلثۃ انت آخرھم الاخیار فقال علی لاولادھا قد فسکلتنی امکم ای اخرتنی وجعلتنی کالفسکل وکانت تزوجت قبلہ بجعفر اخیہ ثم بابی بکر الصدیق بعد جعفر. اھ واما حدیث دعائم الاسلام فکم من احادیث مرفوعۃ عن اھل السنۃ فی مثل معناہ. والرجاء انی قد قضیت حاجتکم ولم یبق مجال فیہا للوولیت والسلام فی الختام

من الداعی

عبدالعزیز المیمنی جامعۃ علی گرہ

علی یوم من الایام الماضیۃ : (کسی گذشتہ روز)

میرے یہاں پہنچنے پر ایک دن مرحوم حافظ محمود شیرانی کی وفات کا ذکر آیا۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ افسوس کہ ہندوستان کے ایک بڑے فاضل جہان سے چل بسے۔ فارسی اور اردو پر بڑا عبور تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔

ابھی ابھی پانچ روز کا ذکر ہے کہ مولانا راغب صاحب نے مولانا سید طفیل احمد صاحب کی وفات کی خبر سنائی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا طفیل احمد صاحب ۳۰ مارچ ۱۹۴۶ء کو وفات فرما گئے۔ استاذ صاحب کو بہت افسوس ہوا۔ کہا کہ "بلوچ صاحب اپنے رفقاء و احباب کے چل بسنے پر دل کو بہت بڑا صدمہ پہنچتا ہے"۔

بندہ کی نیز مولانا طفیل احمد صاحب سے علی گڑھ میں گاہے بگاہے ملاقات رہی اور وہ اکثر میری ریسرچ کے متعلق دریافت فرمایا کرتے تھے۔ میں نے ان سے ان کی قابل قدر کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کو سندھی زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تھی جو انھوں نے خندہ پیشانی سے بڑی خوشی کے ساتھ دی۔ حقیقت ہے کہ مولانا طفیل احمد صاحب نہایت خلیق اور پابند شرع و نیک نیت فاضل تھے۔ اللہ ان پر رحمت فرمائے۔ا

۶ اپریل ۱۹۴۶ء:

آج صبوح کو حسب دستور استاذ صاحب کے ساتھ قلعے کی طرف سیر کو جانا ہوا فرمایا کہ "ہندوؤں کو پیسے پر گھمنڈ ہے۔ اور اپنے سرمایے کے زور پر مسلمانوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اور مسلمانوں کو پیسے سنبھالنے کا ڈھنگ نہیں اور دنیا میں مسافروں کی سی زندگی بسر کرنے کے عادی نہیں۔ پچھلے زمانے میں سپاہ گری پر ان کا دار و مدار تھا۔ اب وہ قوت ہاتھ میں ہی نہیں۔ غالب کا شعر پڑھا کہ "سو سال سے ہے پیشہ آبا سپہ گری"

اس پر میں نے عرض کیا کہ آج کل ایک گروہ ایسا ہے جو غالب کی شاعری کا منکر ہے۔ وہ تو میر ہی کو مانتے ہیں۔ فرمایا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر غالب سے پہلے تھا اور خود غالب کو میر کا اعتراف ہے اور یہ بیت پڑھا۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ　　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

بعد میں کہا کہ "جو غالب کو شاعر نہیں مانتے وہ خود لاشی ہیں۔ غالب نے اردو زبان کو ایک خاص اسلوب و قالب دیا جو آج تک مروج ہے۔ البتہ ان کے ہاں آج کل کی انگریزی

اصطلاحات سے نقل شدہ فقرے مثلاً میں پانی پی سکتا ہوں "Can I drink" نہیں ملتے۔ فرمایا یہ اصطلاحات بالکل فضول ہیں۔ ان سے پوچھو کہ اگر آپ کے ہاتھ میں سکت ہے اور پانی آپ کے حلق سے نیچے اتر سکتا ہے تو آپ پی سکتے ہیں۔ اس میں پوچھنے کی کیا گنجائش ہے۔ فرمایا کہ کہنا یوں چاہیے کہ مجھے پانی پینے کی اجازت ہے وغیرہ۔ فرمایا غالب نے اردو کو موجودہ رنگ دیا البتہ ان کے اشعار میں فارسی محاورات کے استعمال سے تکلف پیدا ہوگیا ہے۔ تاہم غالب کا شعر خیالات کی گہرائی، الفاظ کی بندش اور ترکیب میں بے مثال ہے گو ان کے شعر میں وہ نازک بیانی جو کہیں کہیں ذوق کے اشعار میں پائی جاتی ہے، نہیں۔ فرمایا کہ اپنے اسلوب کے اختراع کی وجہ سے غالب کی زبان میں لچک کی گنجائش نہیں اور وہ خوبی جو داغ، امیر مینائی اینڈ کو کی زبان میں پائی جاتی ہے وہ ان کے ہاں نہیں۔ لیکن یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک خوبی جو ایک شاعر میں ہے وہ دوسرے میں نہیں اور اس بناء پر کسی شاعر کی قدر و قیمت کو گرانا مناسب نہیں۔ اس کے بعد غالب کی یہ غزل مکمل پڑھی:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

فرمایا دیکھیے یہ زبان ہے یا ساحری اور پھر یہ غزل پوری پڑھی:

وہ اپنی خو نہ بدلیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

فرمایا کہ میں نے دونوں رنگ دیکھے ہیں اور سمجھتا ہوں کہ اردو زبان میں غالب کی وقعت، عربی زبان میں متنبّی سے زیادہ ہے۔ فرمایا متنبّی کو عربی ادب سے ہٹا لیجیے۔ کوئی فرق نہیں آئے گا۔ لیکن غالب کو اردو زبان سے ہٹانے پر زبان کی پوری عمارت زمین پر آن پڑے گی۔ بعد میں زبان اور معنی کی رو سے شعر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ

"عربی میں ابن ہانی کا دیوان بعض خوبیوں کی وجہ سے متنبّی سے بہتر ہے۔ فرمایا مثلاً ابن ہانی کا دیوان آپ پورا پڑھتے جائیں بغیر معنی پر توجہ کرتے ہوئے تو بہترین دیوان معلوم ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ ابن ہانی کے دو قصیدے واقعی لاجواب ہیں اور قصیدہ نونیہ اور فائیہ (جس میں ستاروں کا بیان ہے) پڑھے۔ نونیہ کے کچھ اشعار پڑھے اور فرمایا دیکھئے کہ زبان پر کیا ملکہ ہے لیکن از رو۔ معنی گوز شتر ہیں۔ نونیہ کے شروع کے اشعار پڑھے اور ان کی خوبصورتی بتائی اور فرمایا کہ اس طرح کہیں کہیں بہترین معنی بھی مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد فائیہ پڑھا اور

ستاروں کے معانی کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ ابن ھانی نے معز کی مدح میں استغراق کی وجہ سے اپنی شاعری کو ملوث کر دیا اور علماء نے اس کو پڑھنا مناسب نہ سمجھا، اس لیے ان کا دیوان مُروّج نہیں ہوا۔

۸ اپریل ۱۹۴۶ء:

صبح کی سیر میں استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں تکلّف کو بالکل ناپسند کرتا ہوں کیوں کہ "تکلّف کی وجہ سے انسان اپنے جوہر انسانیت کو کھو بیٹھتا ہے اور زندگی کے اصل مقصد سے ہٹ کر فضولیات میں پڑ جاتا ہے۔

شام کو بمبئی سے فیضی صاحب کا جوابی خط آیا:

جناب مکرم علامہ المیمنی صاحب، السّلام علیک، آپ کا جواب واقعی تشفّی کن ہے۔ کسی شخص نے یہ اصلاح نہیں کی تھی، لیکن خیال ہوتا ہے کہ عبارت کو "کالفسکل" پڑھنا چاہیے، عبارت کی حیثیت سے آپ اصلاح کیسے دیں گے۔ والسّلام

جائی استاذ ہمیشہ خالی است؛

خاکسار

آصف فیضی

۱۶ اپریل ۱۹۴۶ء:

سیّدنا طاہر سیف الدین پیر بواھرہ پرسوں یونیورسٹی میں آئے اور میڈیکل کالج کو ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا۔ آج ان کے عامل احمد علی صاحب، میمن صاحب کے ہاں آئے اور مُلّا صاحب کی مطبوعات پیش کیں اور نیز ۵۰ روپے مُلّا صاحب کی طرف سے پیش کیے۔ استاذ صاحب نے بتایا کہ کس طرح یہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچنے کی تدابیر کیا کرتے ہیں۔

۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء:

آج ڈاکٹر زاہد علی صاحب ریٹائرڈ پروفیسر عربی نظام کالج استاذ صاحب کے بنگلے پر تشریف لائے۔ شام کو ڈاکٹر یوسف صاحب کے مصر جانے پر سال دوّم کے طلبہ نے چائے کی دعوت کی تھی۔ استاذ صاحب نے ان کی طرف سے بندہ کو نیز دعوت دی۔ ڈاکٹر زاہد علی نیز شریک رہے۔ ایک طالب علم عزیز صاحب نے یوسف صاحب کی وداع کے متعلق شعر پڑھا جس میں ایک مصرع یہ تھا کہ مصر! تیری یہ عجیب خوش قسمتی ہے کہ "ملے یوسف تجھے ہندوستاں سے"۔ استاذ صاحب نے یوسف صاحب کے اوصاف حمیدہ پر وافر تبصرہ کیا۔ ایک

خاص بات یوسف صاحب کی ذہانت کے متعلق یہ فرمائی جو پوری تعریف کا لُبّ لباب ہے کہ "یوسف صاحب کا دماغ غلطی کی طرف جاتا ہی نہیں" یوسف صاحب نے استاذ صاحب کا ذکر کیا اور ایک نہایت گہری حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ:

"استاذ صاحب سراپا علم ہیں۔ اگر لوگ ان میں علم کے علاوہ دوسری چیزیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو نہیں ملیں گی۔"

۱۸ اپریل ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر زاہد علی صاحب ابو حاتم الرازی کی "کتاب الزینہ" فی غریب القرآن والحدیث ایڈٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کتاب کی نقل ساتھ لائے ہیں اور استاذ صاحب سے ابیات کی تخریج کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے۔ استاذ صاحب نے تقریباً اکثر اشعار دیکھے ہیں، ان کا نہ صرف پتا دیا بلکہ ہمارے سامنے ان ابیات کے پہلے پچھلے اشعار حافظے سے پڑھ کر سنائے۔ ڈاکٹر زاہد علی یہ دیکھ کر عش عش کرنے لگے اور سر دھنتے رہے۔ فرمایا کہ آپ زندہ کتاب ہیں

ڈاکٹر زاہد علی نے اپنی ایک نفیس مخطوط تصنیف المسمّیٰ بہ "ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام" دکھائی جس میں دعوت کی کتابوں سے ہی استدلال کر کے اس مذہب کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور ایک تاریک باب کو روشن کر دیا ہے۔ یہ تصنیف نہایت نفیس اور بے نظیر ہے اور مُصنّف کی مسلسل کوشش اور گہری نظر کا پتا دیتی ہے۔ اور مُصنّف نے اس کو نیک نیتی سے اور انصاف سے لکھا ہے۔ یہ ایک "گھر کا بول" ہے جو کھُل جاتا ہے لیکن یہ اہم علمی تحقیق ہے اور اسماعیلی دعوت کی متعلق دنیا کی آنکھیں کھول دینے والی ہے۔

۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء

استاذ صاحب نے حماسۃ البحتری الاب شیخو کا مطبوعہ کھول کر دکھایا کہ کس طرح اس احمق نے اصلی صحیح نسخے کو اپنی حماقت کی وجہ سے بگاڑ ڈالا۔ اور پھر دوسرے نسخے کی قراءات کی کتاب کھڑی کر کے ان اغلاط کی تصحیح کا سہرا اپنے سر پر لینا چاہا اس طرح کہ ان اغلاط کو اصلی نسخے کی طرف منسوب کرنا چاہا حالانکہ ھو الذی غلط الصواب فی النسخۃ الاصلیۃ

کتاب الزینۃ تصنیف احمد بن حمدان ابی حاتم الرازی نسخہ ڈاکٹر زاہد علی ص ۱۱۸ سے مصنف کی فارسی شاعری کی اہمیت واضح کی اور فرمایا کہ اسے نقل کر دیجیے۔ اور ساتھ ہی دیوان ابی تمام میں سے ان کے اشعار نکال کر دکھائے جو اس نے ابریشہر میں ایک فارسی رقاصہ کو

گاتے ہوئے سن کر لکھے تھے

اقتباس از کتاب الزینۃ جو استاذ صاحب کے لیے نیز نقل کیا گیا

ونقول انالم نجد لسائر الامم شعرا کما وجدنا للعرب موزونا مقفوا والذی قالتہ العجم فی الاغانی هو بین الشعر والکلام المنثور ولیس لہ وزن الشعرالعربی ولا تقویمہ بل هو کلام قد تسجعوہ و مثلوہ بالالحان و طربوا فی ابرازہ و ھذا القول بہ ولیس علی وزن الشعر و اقرانہ انما هو تطریب و تشویق لیس فیہ مدح ولاھجاء ولا افتخار ولافیہ ذکر الحرب والوقائع و تقیید الانساب و نشر / ۱۲۸ الاحساب والماثر والمناقب والمثالب و صفات الخیل والابل والوحش والضیافی والریاح والامطار والنجع و غیر ذلک مماجاء فی الشعر ویطول الشرح بہ والدلیل علی ان الشاعر لایوجدلہ اسم بالفارسیۃ وکذلک الشعرلا اسم لہ الا بالعربیۃ فقد کان الاعشی وفد علی کسری فسال عنہ فقالوا " سرود گو بتازی " یعنون بالعربیۃ فانشد

اَرِقتُ وما ھذا السُّھاد المُؤرِّقُ — وماَبیَ من سُقم ومابی مَعشَقُ

و فسر لہ قولہ فقال اذا هو لص ولم یعلم ان / ۱۲۹ قد یارق غیر السقیم والعاشق واللص وھوملک فاین مالحق الملوک من السھر لتفکرھم فی امرالمملکۃ والتدبیر والمھموم اشد سھرا من السقیم وغیرہ المذعور اشد سھرا منہ ومن اجل ذلک اتخذت الملوک سُمّاراً و محدثین حتی رویت عنھم الاسمار و مونث والسمر حدیث اللیل عند السھر وللسھر اسباب کثیرہ غفل عنھا ھذا العلج وخفیت علیہ وانما قیل لہ حین سال عن الاعشی " سرود گو بتازی " لانھم لم یوفوا للشاعر اسما و لاعرفوا الشعرولم یکن فیھم دیوان الشعر واماالذی احدقوہ الان / ۱۳۰ من الشعر بالفارسیۃ فھو کلام لامعنی لہ ولاحجۃ فیہ ولانفع بہ ولا دیوان لہ عندالعجم مثل دیوان الشعر عند العرب وکمافیہ من النفع الظاہر والفضل المبین وھو شیئ محدث غیر قدیم سمعوا الشعرالعربی فتکلفوہ و حذوہ علی ذلک المثال سمعت جماعۃ من اهل المعرفۃ یذکرون ان اول من قال الشعر بالفارسیہ رجل من اهل نیسابور منذ زمن قریب فاما القدیم من الاغانی بالفارسیہ فھو کلام غیر موزون ولا محذ وعلی القوافی علی نحوما وصفنا وانما معنی قولھم لکسری " سرود گو بتازی " معناہ مغنی بالعربیۃ والغناء غیر الشعر وھم اسم علی الانفراد وانما یسمی منہ غناء ماکان فی الرقیق والتشبیب بالنساء و یقصد بہ ذلک المعنی فقط والذی یحسنہ من الشعر مثل قول جریر

انّ العیونَ التی فی طرفھا حُورٌ — قتلننا ثم لم یُحیینَ قتلانا

والشعر فنون کثیرہ غیر الغناء کما ذکرنا من مذاہب العرب فی المدح والهجاء و غیر ذالک من الصفات الکثیرہ فی التحریض علی السعی فی امر المعاد و التقدم فی فعل الخیر و اصطناع المعروف و تجنب الآثام ومایکون فیہ هتک / ۱۳۲ الاستار علی رؤس الأشهاد اذا کشف الغطاء وظهرت الاعمال کقول لبید:

وکل امرئ یوماً سیعلم سعیہ ۔۔۔ اذا کشفت عند الالہ الحصائل

فهذا بعید من معنی الغناء الذی هو تحریض علی التقحیم فی الآثام وقلۃ المبالاۃ بارتکاب المحارم والتهتک فیہ والحض علی الانهماک فیہ کقول القائل:

اذا أنت لم تطرب ولم تشهد الغنا ۔۔۔ فکن حجراً من یابس الصخر جلمدا

فهذا وما اشبهہ یجوز ان یسمی غناء فاما ماسوی ذلک فلیس بغناء ولا یجوزان یسمی باسمہ / ۱۳۳ فان الملوک والنبلاء من الناس و الصالحین قد انشدوا الشعر وقالوہ ویجوز ان یعرفوا ذلک وهو ادب لهم و رفعۃ لمنزلتهم اذ عرفوہ ولایجوز ان یقال اذا انشدوا الشعر وقالوہ فلان مغن او قد غنی ویقول (کذا یقال ؟) فی هذا القول تهجین لہ اوضع منہ والفرق بین الشعر والغناء بین وقائل الشعر و منشدہ بعید من صفۃ المغنی رفیع الدرجۃ عن خاصۃ المغنین وسقوط منزلتهم عند اهل الفضل وذوی الالباب / ۱۳۴

فن کے غناء کی دلآویزی کے سلسلے میں استاذ صاحب نے ابو تمام کے یہ اشعار حافظے سے پڑھے اور پھر دیوان میں دکھائے:

وقال وقد سمع مغنیۃ تغنی بالفارسیۃ فاستحسن الصوت ولم یعرف المعنی

أیا سهری بلیلۃ أبرشهر ۔۔۔ ذممت إلیّ فی نومی سواھا

شکرتک لیلۃ حسنت و طابت ۔۔۔ أقام سرورها ومضی کراها

ونا شدنا مجمودہ و لکن ۔۔۔ قضی حاجات نفسی ما قضاها

إذا وخذات أرض کان فیها ۔۔۔ هواک فلا تجنّ إلی رُباها

سمعت بها غناء کان اولی ۔۔۔ بان یقتاد نفسی من غناها

ومسمعۃ یحار السمع فیها ۔۔۔ ولم تصمم لاقصم صداها

مرت أوتارها فشفت وشاقت ۔۔۔ ولو یسطیع حاسدها فداها

فما خلت الخدود کسین شوقا ۔۔۔ لقلبی مثل ما کسبت یداها

ولم افہم معانیہا ولکن ورت کبدی فلم اجہل شجاہا
فبت کاننی اعمی مُعنیً یُحبُّ الغانیاتِ ولا یَراہا

(دیوان طبع بیروت ۱۸۸۹)

۲۲ اپریل ۱۹۴۶ء:

عربی سوسائٹی کی طرف سے ڈاکٹر یوسف صاحب کی الوداعی پارٹی آفتاب ہوسٹل میں ہوئی ۔ گروپ فوٹو کا بھی انتظام تھا۔استاذ صاحب نے مدعو کیا، ساتھ ہی گئے۔ڈاکٹر زاہد علی صاحب نیز شریک تھے ۔ کھانے کے بعد پہلے سیّد ہادی عطا سال چہارم کے طالب العلم نے اپنا خطاب عربی میں کیا جو وہ لکھ کر لائے تھے ۔ لیکن بہت صحیح اور موزوں عبارت میں تھا ۔ استاذ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں پہلے عربی میں برجستہ جواب دیا ۔ اور پھر اردو میں تقریر فرماتے ہوئے سیّد ہادی عطا کی قدر کی اور فرمایا کہ ان کو جواب دینا عربی میں ضروری تھا ۔ لہٰذا عربی میں خطاب کیا ۔ دوسرے طلبہ کو نیز استاذ صاحب نے ہمت دلائی کہ وہ اس سلسلے میں آگے بڑھیں ۔ استاذ صاحب نے پھر یوسف صاحب کی لیاقت کا ذکر کیا اور مثال دی کہ کس طرح مصر والوں نے بغداد سے امام ... المالکی کو بلایا تھا اور پورا بغداد ان کو الوداع کرنے کو آیا آخر میں یوسف صاحب کی روانگی کے سلسلے میں استاذ صاحب نے شعر پڑھا کہ

ھیہات ... (شعر درج نہیں ہو سکا) ۔

۲۵ اپریل ۱۹۴۶ء:

حسب معمول صبح کو قلعے کی طرف گھومنے گئے اور معمول ورزش کی جو روزانہ درمیانی پل پر جا کر کرتے ہیں استاذ صاحب نے فرمایا کہ اس طرح ہم اس مشین کو کچھ درست کرتے ہیں تاکہ دن بھر کام دے سکے ۔ پھر فرمایا کہ بلوچ صاحب پرانے علماء اور ہمارے درمیان بڑا فرق ہے، وہ زندگی کے دوسرے رنگ پر تھے۔اس کا سبب یہی تھا کہ ان کو افکار زندگی کم تھے اور اتنا تشتت بال بھرنہ تھا ۔ اس وقت اسلامی حکومت تھی اور آج کل یورپی قومیں لوگوں کے سروں پر چڑھ آئی ہیں اور جینا مشکل کر دیا ہے، پھر اس زمانے میں علم کے پھلنے پھولنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پوری سوسائٹی کا یہی رنگ تھا ۔ مساجد میں نوجوان بیٹھتے تھے تو علم کا تذکرہ ہوا کرتا تھا ۔ فضلاء و وزراء اور امراء کی محفلوں میں علمی مباحث ہوا کرتے تھے ۔ دوسرا یہ کہ علم حاصل کرنے اور اس کو ترقی دینے کے وسائل موجود تھے ۔ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ

ابو عبید اللہ المرزبانی کے ہاں ستر اسّی لحاف زائد ہوا کرتے تھے اور ہم رات کو علمی مجلس کے بعد وہیں سو جایا کرتے تھے۔ فرمایا کہ بغدادی غریب لوگوں میں سے تھا۔ فرمایا کہ بہاء الدولہ کے وزیر سابور بن اردشیر نے بغداد میں بین السورین ایک دار الکتب القدیمہ بنایا تھا جس میں قدیم اساتذہ کی لکھی ہوئی پانچ ہزار کتابیں جمع کر دی تھیں۔ کتب خانے کے ساتھ کمرے بنوا دیے تھے تاکہ ادباء وہاں آکر ٹھہریں اور کتابوں سے استفادہ کریں۔ اس کتب خانے کا انچارج عبدالسلام البصری تھا جو ابو عبید اللہ المرزبانی کا شاگرد تھا اور ابو علی الفارسی سے نیز اس نے پڑھا تھا (؟) ابوالعلاء جب بغداد گیا تو وہ اکثر اسی کتب خانہ قدیمہ "دار سابور" میں جایا کرتا تھا اور عبدالسلام البصری اس کا بڑا دوست تھا۔ فرمایا کہ کتاب الحبشی کا حال سنیے۔ یہ کتاب خود عبدالسلام البصری نے اپنے استاذ المرزبانی کے نسخے سے نقل کی تھی اور اس سے وزیر مؤیّد الدّین ابن العلقمی نے ایک نسخہ نقل کروایا۔ یہ نسخہ میں نے قسطنطنیہ میں خود دیکھا ہے اور اس پر ابن العلقمی کی مہر ثبت ہے اسی نسخہ سے الشنقیطی نے اپنا نسخہ نقل کیا جس سے یہ کتاب چھاپ دی گئی ہے فرمایا کہ اس وقت بغداد میں علم کی فراوانی تھی ابوالعلاء کہتا ہے کہ بغداد میں جتنی علم کی کثرت ہے اتنی بصرہ میں کھجوروں کی بھی نہیں فرمایا کہ چوتھی صدی کی آخر فقہائے شوافع کا زمانہ ہے اور پانچویں صدی میں جا کر اس ماحول سے بڑے بڑے فضلاء پیدا ہوئے اسی سلسلے کی برکت تھی کہ ابوالمعالی امام الحرمین الجوینی پیدا ہوئے اور پھر غزالی نکلے۔ فرمایا کہ ابوالطیب البصری فقہاء الشوافع کا استاذ کبیر تھا اور اکثر فقہاء ان کے شاگرد تھے۔ فرمایا کہ یہ فقہاء آج کل کے معنی میں نہ تھے وہ فقہاء بھی تھے اور ادباء بھی۔ یہی وجہ کہ ابوالعلاء کی انھوں نے اتنی قدر کی۔ فرمایا کہ علم کا ذوق اس درجہ پر پہنچا کہ عوام بھی علمی تلمیحوں میں گفتگو کرتے اور جسر کا واقعہ سنایا جس میں ایک نوجوان نے "رحم اللہ علی بن الجہم" کہا جس کے جواب میں نوجوان لڑکی نے "رحم اللہ ابا العلاء المعری" کہا۔ فرمایا کہ آج کل کوٹ پتلون کا چرچہ ہے اور جو بن سنور کے نکلتا ہے اس کو بڑی عزت سے لوگ دیکھتے ہیں حالانکہ وہ "خر ابن خر" ہے۔ فرمایا کہ آج کل لوگوں کی نظریں ڈاکٹر ضیاء الدین جیسے نچاچرہ (جمع نچرا) کی طرف لگی ہوئی ہیں جو پروپیگنڈے کر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ یہاں جامع مسجد زہرا بننے والی ہے جو جامع ازھر کی مثال ہوگی (حالانکہ ازھر مذکر ہے اور اس سے زہراء مؤنث کہاں بڑھ سکتی ہے) مگر آج تک اس جامعہ زہراء کا نہ نام نہ نشان۔

یکم مئی ۱۹۴۶ء

مغرب کے بعد جب استاذ صاحب لیٹے ہوئے تھے تو میں نیز جا کر بیٹھ گیا۔ علمی سلسلے کی باتوں کے دوران میں کہا کہ اب اس وقت ضرورت ہے کہ کتابوں کا پیچھا چھوڑ کر زندگی کے عام مشغلوں میں دلچسپی لوں تاکہ صحت سالم رہے۔ فرمایا کہ کتابوں کا کام بھی خوب کیا اور سب کچھ آنکھوں کے سامنے تھا اور ہے۔ فرمایا کہ مولوی بدرالدین اور مسٹر کرنیکو بر المختار من شعر بشار کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ایک بیت آ گیا جس کی معنی سمجھ میں نہ آئی مسٹر کرنیکو نے تاج لسان وغیرہ دیکھ ماریں لیکن بیت سمجھ میں نہ آیا اتنے میں یہاں سے میں لائبریری میں داخل ہوا تو مولوی بدرالدین صاحب نے بلا لیا اور بیت سامنے رکھا۔ میں نے بیت دیکھتے ہی بتایا کہ یہ اس طرح ہے۔ تو مسٹر کرنیکو کہنے لگے کہ میں نے معاجم دیکھ لیے ہیں اور اس لفظ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آئی آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں کہ یہ لفظ یوں ہے علاوہ اس کے یہ بیت نہایت مجہول ہے۔ اس پر میں نے مسٹر کرنیکو کو کہا کہ عبارت کے لحاظ سے میں جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ لفظ اسی طرح ہونا چاہیے بلکہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ علاوہ اس کے یہ بیت جس کو آپ مجہول الذکر سمجھتے ہیں وہ ایک قصیدہ کا بیت ہے جو مجھے پورا یاد ہے۔ یہ کہہ کر میں نے پورا قصیدہ پڑھ دیا تو مسٹر کرنیکو حیران ہو کر کہنے لگے کہ کیا آپ کو پورا عربی شعر حفظ ہے؟ میں نے کہا کہ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کافی اشعار یاد ہیں تو کہا کہ کتنے یاد ہوں گے تو میں نے کہا کہ علی الاقل ایک لاکھ بیت یا اس سے زیادہ یاد ہوں گے۔ تو کہنے لگے کہ آپ نے کتنا وقت یاد کرنے میں صرف کیا۔ اس پر میں نے کہا کہ مسٹر کرنیکو میں نے کبھی اشعار یاد کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی بات یہ ہے کہ جب میں عربی کا طالب علم تھا تو پڑھتے پڑھتے شعر یاد ہو جایا کرتے تھے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ بلوچ صاحب میں نے "متنبی، حماسہ، معلقات اور چند اراجیز شاید عمداً یاد کیے ہوں۔ باقی اشعار خواہ مخواہ ذہن میں آ گئے ہیں۔ فرمایا کہ یاد کرنے کے معنی یہ کہ ان اشعار کو گاہے گاہے ذوق سے پڑھ لیا کرتا تھا و بس۔

۳ مئی ۱۹۴۶ء

آصف جاہ فیضی سیکریٹری اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کی طرف سے "لسٹ ممبران" پہنچی جس میں "Ordinary Fellows" میں استاذ کا نام اوّل مطبوعہ تھا۔ استاذ صاحب نے کہا کہ ان بیچاروں کو میں نے جواب تک نہیں دیا اور انھوں نے جواب کی امید پر نام چھاپ

دیا ہے؛ بہرحال ضروری ہے کہ ان کو شکریہ کا خط لکھ دیا جائے۔ میں نے انگریزی میں شکریہ کا خط لکھا اور استاذ صاحب نے اپنی مصنفات کی فہرست لکھی اور خط روانہ کیا گیا۔

۱۵ مئی ۱۹۴۶ء:

بعد طعام مغرب جب استاذ صاحب ٹہل رہے تھے تو اس وقت اس کے ساتھ رفاقت کی مجد الدین فیروز آبادی کی کتاب "تحفۃ ال .... لمن نسب الی غیرابیہ" کا ذکر آیا فرمایا کہ کتابوں میں سے ایک کتاب ہے باقی اس کی معلومات کچھ نہیں۔ فرمایا کہ اس سلسلہ میں مُلوانی کی کتاب "لمن نسب الی امہ" جو صاحب خزانہ کو ملی تھی نہایت ہی بےنظیر تھی۔ "لمن نسب الی امہ" ابن حبیب کی غنیمت ہے اور اس پر میں نے کام کیا ہے۔ فرمایا کہ ابن حبیب کی والدہ کا نام حبیب بتایا جاتا ہے۔ لہذا بعض لوگ حبیب کو غیر منصرف پڑھتے ہیں اور حبیب کو مؤنث سمجھتے ہیں اور بعض اس کو منصرف پڑھتے ہیں

محمد محمود الشنقیطی کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ امرؤ القیس کا دیوان بروایت کوفیین جو شنقیطی نے نقل کیا ہے کافی صاف ہے اور اس پر جا بجا تصحیحات کی ہیں تو فرمایا کہ اصلی نسخہ اس سے بھی صاف ہے اور شنقیطی کی یہ خامی ہے کہ اصلی نسخے جن سے انھوں نے یہ کتابیں نقل کی ہیں اور جو قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان کا ذکر نہیں کرتا۔ اور مصر والوں نے ان کی نقل شدہ کتابیں شنقیطی کے کتب خانے کے نام سے چھاپ دیں جو بڑی بددیانتی ہے۔ ان کتابوں کے اصل نسخے قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں جن سب کا میں نے سراغ لگایا اور اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھے افسوس ہے۔ مطبوعہ کتابوں میں ان اصلی نسخوں کا ذکر نہیں آتا جو سلاطین ترکیہ کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے۔ فرمایا کہ ترکوں کو بھی اس بات کا علم ہوگیا ہے اور اس وجہ سے مصریوں سے بگڑے ہوئے ہیں کہ یہ لوگ یہاں سے کتابیں نقل کروا کر چھاپتے ہیں اور ان کتب خانوں کا ذکر نہیں کرتے۔

فرمایا کہ شنقیطی ایک لائق آدمی تھا۔ متعدد کتابیں نقل کیں اور علم کی خدمت کی اس میں نقص یہ ہے کہ دھاندلی باز ہے۔ ایک بات جو اس کے دماغ میں آجاتی ہے وہ اس پر اڑ جاتا ہے۔ چنانچہ دیوان امرء القیس کے استنساخ میں اس نے عمر کو منصرف پڑھا ہے اور جا بجا اوپر سے صحیح صحیح لکھ رکھا ہے (میں نے خود دیکھا اور استاذ صاحب سے نیز پوچھا) حالانکہ عمر باتفاق علماء غیر منصرف ہے۔ فرمایا کہ ایسی دھاندلی بازیوں سے اس نے کہیں کہیں اپنے علم کو مکدر کر دیا ہے۔ فرمایا کہ مخصص لابن سید البطلیوسی پر شنقیطی نے حواشی لکھے ہیں؛ میں نے

ان کو غور سے پڑھا اور کہیں کہیں ان کی دھاندلی بازیاں دیکھ کر خیال آیا کہ انھوں نے جو لکھا اس کا مناقضہ کر دوں ۔ فرمایا کہ دھاندلی باز آدمی ہمیشہ گرفت میں آجاتا ہے ۔ فرمایا کہ ان حواشی میں سے اگر ان کی دھاندلی بازیوں کو نکال دیا جائے تو باقی معلومات کی قدر کرنی پڑے گی اور وہ شنقیطی کے علم و فضل کا پتا دیتی ہیں ۔ فرمایا کہ دھاندلی بازی میں شنقیطی اور سورتی ابو عبداللہ کی ایک ہی حالت تھی فرق یہ تھا کہ شنقیطی کا علم زیادہ مفید و وسیع تر تھا ۔

فرمایا کہ قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں بے نظیر قلمی کتابیں محفوظ ہیں اور یہ سب سلاطین ترکیہ کے وزراء کی عنایت سے ۔ فرمایا کہ یورپ والے خود مانتے ہیں کہ کتابیں اگر ہیں تو قسطنطنیہ میں ۔ یورپ میں بھی ان لوگوں نے جمع کر رکھی ہیں مگر اتنی نایاب نہیں ۔ فرمایا کہ میں نے ان سب کتب خانوں کا جائزہ لیا اور جملہ نوادرات کو آنکھوں سے دیکھ لیا ۔ فرمایا کہ ان کتب خانوں پر نظر وہی شخص ڈال سکتا ہے جس کا علم وسیع ہو کتابوں کے نام اور اہمیت اس کے سینے میں محفوظ ہوں، باقی یورپ والے کم علم و کاترہ تو ایک ہی کتب خانے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں ۔ فرمایا بلوچ صاحب ، مجھے ایک لاکھ کے قریب کتابوں کے نام یاد تھے جو اگلے پچھلے زمانے میں لکھی گئی ہیں اور ایک لاکھ سے زیادہ اشعار حفظ تھے لیکن ان نامناسب حالات ، امراد گھر کے نامناسب حالات اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نامناسب حالات ، نے کھیل بگاڑ کر رکھا ۔

فرمایا کہ قسطنطنیہ میں چند روزہ قیام کے زمانے میں ، میں نے ان جملہ نوادرات کا پتا لگا لیا جو ان کتب خانوں کی زیب و زینت بنے ہوئے ہیں اور جن میں سے اکثر کا یوروپ والوں خواہ دیگر دیکھنے والوں کو علم تک نہیں، وہ فہرست میرے پاس موجود ہے (بندے نے نیز دیکھی تھی جب استاذ صاحب یاقوت کی کتاب الادباء پر حواشی لکھ رہے تھے، اگر فرصت ملی تو لے کر نقل کرلوں گا ۔) فرمایا کہ غریب الحدیث کی اکثر کتابیں قسطنطنیہ میں محفوظ ہیں فرمایا کہ ابو سعید السیرافی ، امام الصاغانی اللاہوری وغیرہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں ۔

پھر فرمایا کہ ہندوستان میں نیز بعض نوادرات موجود ہیں ۔ آغا محمد علی پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے پاس :

(۱) شرح کتاب سیبویہ لابی سعید السیرافی خود ابو سعید کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود تھی جو انھوں نے مجھے دکھائی اور میں عش عش کرنے لگا ۔

(۲) اسی طرح دیوان صائب خود صائب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے ہاں موجود ہے ۔

(۳) اور شاید قاموس کا مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ انکے ہاں موجود ہے۔

۲۰ مئی ۱۹۴۶ء:

انشدنا الاستاذ لبعض شعراء عصر المامون العباسی۔ (استاذ نے عصر مامون کے ایک شاعر کے یہ اشعار پڑھے)

دعی بالکتابۃ یدعیہا کدعوی آل حرب فی زیاد

فدع عنک الکتابۃ لست منہا ولو سودت وجہک بالمداد

۲۱ مئی ۱۹۴۶ء:

استاد نے دوران گفتگو یہ اشعار پڑھے۔

الجود والغول والعنقاء ثالثۃ اسماء اشیاء لم توجد ولم تکن

الحماسی

وبالدیر اشجانی وکم من شج لہ دوین المصلی بالبقیع شجون

قال التبریزی د دوین تصغیر دون ای دون المصلی بقلیل

من شعر خلف بن خلیفۃ الاقطع۔ ——— شرح الحماسۃ للتبریزی جلد ۲ ص ۱۸۲)

۱۱ جون ۱۹۵۶ء:

استاذ نے یہ شعر پڑھا اور اپنے ہاتھ سے لکھا

اقدت بجران المطاعم صحۃ فما بی من داء یخاف ولا حبن المعری

بخط المیمنی ۱۱/۶/۵۶۔

قبلہ استاذ صاحب کراچی سے آج حیدرآباد تشریف لائے۔ کل ایم اے عربی کا وای وا لیں گے۔ بندے کے ہاں مقیم ہیں۔ آج ۴ سے ۶ بجے شام دوران گفتگو فرمایا کہ زندگی میں اگر کام کرنا ہو تو ان باتوں کا خیال رکھیں:

عورت کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔ کھانے کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔ غم آتے رہیں گے لیکن غم غلط کرنے کے راستے نکالیں اور دنیا بھر کا غم نہ پالیں۔ کھانے کے سلسلے میں اوپر والا شعر (اقدت الخ) پڑھا اور لکھا۔

۱۹۶۷ء:

استاذ صاحب سندھ یونیورسٹی میں تشریف لائے۔ تاریخ پر گفتگو ہوئی۔ فرمایا کہ عقد

الدولہ نے تاریخ ہند لکھوائی تھی جس کا حوالہ کتاب الھند میں موجود ہے۔ اب اس کا پتا چل گیا ہے لیکن جب تک نسخہ دیکھا نہ جائے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

فرمایا کہ مدینہ منورہ میں تاریخ گجرات مصنّف (؟) کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ موجود ہے

فرمایا امالی ابن دُرید ص ۸۲ میں ابو عطاء کے اشعار موجود ہیں

انشد الاصمعی لابی عطاء السندی

فما سالتک الا قلت تخذعنی ولا استعنتک الا قلت مشغول

اجل شغلت ولو اعطیت من سعتہ حتی یواری لحی راسک الحول

نسخہ خطیہ

۷ اگست ۱۹۶۸ء

(الف) فرمایا کہ میرے اور امام الشوکانی کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔ ۱۳۲۶ھ میں میں نے شیخ حسین ابن محسن سے روایت احادیث کا اجازہ حاصل کیا۔ انھوں نے امام الشوکانی کے لڑکے اور محمد بن ناصر الحازمی سے پڑھا تھا جو دونوں امام الشوکانی کے شاگرد تھے: میری ولادت ۱۳۰۶ھ کی ہے اور نواب صدّیق حسن خاں ۱۳۰۷ میں فوت ہوئے۔ اور ہم دونوں کے استاذ ایک ہی ہیں یعنی شیخ حسین بن محسن۔ (راجع ابجد العلوم)

(ب) فرمایا کہ کتاب الدلائل لقاسم ابن ثابت السرقسطی کی غریب الحدیث میں ایک معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ اس کی دو جلدیں "کتب خانۂ دائریہ" دمشق میں موجود تھیں۔ جلد اول تو غائب ہوگئی باقی ایک جلد باقی ہے جو قرطبہ کی لکھی ہوئی ہے۔ قرطبہ کا خاتمہ ۶۳۰ھ کے قریب ہوا۔ یہ کتاب اس سے کچھ پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ میں نے مرحوم عز الدین التنوخی کو کہا کہ اس کو چھاپ دیجیے۔ انھوں نے اس کے شایع کرنے کا اعلان بھی کیا لیکن حال ہی میں فوت ہوگئے۔ یہ کتاب قاسم نے لکھنا شروع کی وہ رخصت ہوئے تو ان کے والد ثابت نے تکمیل کی۔ ابوعبید اور ابن قتیبہ سے جو غریب الاحادیث رہ گئی ہیں ان کا تکملہ اس کتاب میں ہے۔

۸ اگست ۱۹۶۸ء

مراقش کے سفیر محمد السعدانی فی باکستان نے سمط اللآلی پڑھی تھی۔ چنانچہ پاکستان آئے تو اشتیاق سے استاذ صاحب سے ملے۔ استاذ سے حدیث کی روایت کا اجازہ طلب کیا۔

استاذ صاحب نے اجازہ دیا۔ (استاذ نے اجازہ حاصل کیا جیسا کہ اوپر الف میں موجود ہے)

۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء:

آج استاذ صاحب یہاں حیدر آباد میں میرے سندھ یونیورسٹی آفس میں تشریف لائے۔ کافی دیر تک ان کے علمی ارشادات سے بندہ مستفید ہوا۔ فرمایا کہ تصوّف میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد حسن البصری کا رسالہ پہلی تصنیف ہے اور میرے ہاں جو قلمی نسخہ ہے وہ نوادرات میں سے ہے حالانکہ قریبی زمانے میں لکھا گیا

بیت کے معانی پوچھے تو فرمایا کہ شعر کے معنی ہیں قصیدہ، یا دیوان، بیت، شعر کا ٹکڑا ہے۔ "بیت الشعر" کہا جاتا ہے۔ بیت یعنی دو مصراعوں کا مجموعہ، یہ قصیدہ کا ایک بیت ہے یا گھر ہوا۔ گویا قصیدہ ایک بڑی حویلی ہے

"ان احسن بیت انت قائلہ —— بیت یقال اذ انشدتہ صدقا،

فرمایا یہ حسّان کی طرف منسوب ہے۔ فلیتامل

فرمایا بیت، وتد، طنب (ج اطناب) عربوں کے گھر کے مصطلحات ہیں۔ علم عروض کے مصطلحات عربوں کے گھر سے لیے گئے ہیں۔ ابوالعلاء المعری نے سقط الزند کے پہلے قصیدہ میں کہا ہے۔

فالحسن یظھر فی شیئین رونقہ   بیت من الشعر او بیت من الشعر

کلمہ اور قافیہ: فرمایا شعر یا قصیدہ کے معانی میں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ

○ اصدق کلمۃ قالھا شاعر کلمۃ لبید: الا کل شیٔ ماخلا اللہ باطل۔ وکل نعیم لا محالۃ زائل

○ قال نابغۃ "اذود القوافی عنی ذیادا" (میں اشعار کو اپنے آپ سے ہٹاتا ہوں جب کہ وہ آتے ہیں)

گفتگو کے دوران نعمت خان عالی کا یہ شعر پڑھا اور میری استدعا پر اپنے قلم سے لکھا:

بر خر نمی توان ز غریت عتاب کرد

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کے

مطبوعہ علمی کاموں کی فہرست

(تصنیف، تالیف، تحقیق، تدوین)

(۱) اردو سندھی لغت: بہ اشتراک ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۶۰ء

(۲) سندھی اردو لغت:

(۳) جامع سندھی لغات: ۵ جلدیں ۳۰۸۰۰ صفحات، مابین ۸۸ - ۱۹۶۰ء

(۴) ایک جلد پر مشتمل سندھی لغت: برائے مقتدرۂ زبان سندھی، ۱۹۹۸ء

(۵) سندھی فارسی لغت موسوم بہ جواہر لغات سندھی ایکچار اخوند عباسی در حوالی ۱۸۳۵ء۔ ۱۸۵۲ء، مقدمہ از ڈاکٹر بلوچ، مقتدرۂ زبان سندھی، ۱۹۹۳ء

(۶) دیوان شوق افزا (اردو) معروف بہ دیوان صابر، تحقیق و مقدمہ، لاہور، ۱۹۸۴ء

(۷) دیوان ماتم (اردو)، تحقیق و مقدمہ

(۸) سندھ میں اردو شاعری۔ متعدد ایڈیشن

(۹) مولانا آزاد سبحانی (اردو)

(۱۰) طلبہ اور تعلیم (")

(۱۱) اردو زبان کی قدیم تاریخ از عین الحق فرید کوٹی پر مقدمہ

(۱۲) تحفۃ الکرام (اردو ترجمہ) پر مقدمہ و حواشی و تعلیقات اور تصحیح

(۱۳) تاریخ معصومی (اردو ترجمہ) پر مقدمہ و حواشی و تعلیقات اور تصحیح

(۱۴) فتح نامۂ سند (اردو ترجمہ) پر مقدمہ و حواشی و تعلیقات اور تصحیح

(۱۵) بیگلارنامہ: فارسی متن کی تدوین و تحقیق

(۱۶) فتح نامۂ سند (فارسی): معیاری تحقیقی اڈیشن، مع حواشی و تعلیقات اور انگریزی میں مبسوط مقدمہ

(۱۷) باقیات از احوال کلہوڑہ:

(۱۸) تاریخ بلوچی: (زوال حکومت کلہوڑہ و حکومت میران تالپور کی ایک معاصرانہ تاریخ: تحقیق و تدوین

(۱۹) منتخب من شعر عربی ابی العطاء السندی: اموی دور کے ایک سندھی الاصل عربی شاعر کے منتشر کلام کی ترتیب و تدوین

(۲۰) غرۃ الزیجات البیرونی: عربی متن کی تصحیح و تدوین، مبسوط انگریزی مقدمہ

(۲۱) سندھی موسیقی جی مختصر تاریخ:

(۲۲) شاہ جو رسالو: تحقیق و تدوین، دس ضخیم جلدوں میں

(بقیہ صفحہ ۱۷۶ پر)

ڈاکٹر مختار الدین احمد :

علامہ میمن کا ایک نہایت ممتاز شاگرد

سندھ کی جن چار شخصیتوں سے میں ان کے علم و فضل کی بناء پر متاثر ہوا، ان میں ایک ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ہیں۔ بقیہ تین شخصیتیں ڈاکٹر عمر بن محمد داود پوتہ (متوفی ۱۹۵۸ء) پیر حسام الدین راشدی (متوفی ۱۹۸۲ء) اور ڈاکٹر عبدالواحد حالی پوتا کی ہیں۔ بلوچ صاحب سے علی گڑھ میں بھی ملاقاتیں رہیں اور اسلام آباد اور کراچی میں بھی۔ داود پوتہ سے نہ ملاقات ہوئی نہ کبھی ان سے خط کتابت رہی۔ ان سے ان کی تصنیفات و تحریرات دیکھ کر متاثر ہوا۔ حسام الدین راشدی سے خط کتابت رہی، ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میں ایک بار کراچی پہنچا بھی تو ان کی وفات کے دوسرے دن ۳ اپریل ۱۹۸۲ء کو۔ ان سے ملاقات تو نہ ہوسکی لیکن مشفق خواجہ صاحب نے ان کی تربت کی زیارت کرادی۔ سندھ کے قدیم تاریخی قبرستان مکلی پہنچا اور ان کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر چلا آیا۔ ان کی بھیجی ہوئی کچھ کتابیں اور تحریرات اور چند خطوط ہیں جنھیں حرز جان بنائے ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر حالی پوتہ سے "میمن منزل" علی گڑھ میں ملاقات ہوئی جب وہ یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے چند دنوں کے لیے علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی پر انھوں نے ڈاکٹریٹ کی تھی۔ میمن صاحب سے اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور یہاں کے شعبۂ عربی کا حال پوچھتے رہے۔ حالی پوتہ صاحب سے بعد کو اسلام آباد میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور بہت مفصل۔ متعدد اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے۔ سندھ یونیورسٹی میں اسلامک کلچر کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے ڈائریکٹر اور بین الاقوامی اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد میں ریسرچ پروفیسر رہے۔ اب حیدرآباد سندھ میں خانہ نشین ہیں۔

میمن صاحب کے تلامذہ دو واضح حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک حصے میں وہ ہیں جنھوں نے ان کی نگرانی میں اپنا تحقیقی کام پورا کیا اور ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ دوسرے میں ان کے وہ شاگرد ہیں جنھوں نے بڑے ذوق و شوق سے کام شروع کیا لیکن بعد کو کوئی نہ کوئی رخنہ پڑا اور کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔

میمن صاحب علی گڑھ، کراچی اور پنجاب کی جامعات میں عربی کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ یہ عرصہ تیس پینتیس سال کو محیط ہے۔ اس عرصے میں ان کے صرف تین شاگردوں کو ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی اور تینوں کو علی گڑھ سے۔

ان کے پہلے شاگرد بھوپال کے سیّد محمد یوسف (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۶۸ء) ہیں۔ علی گڑھ سے ۱۹۳۹ء میں ایم اے (عربی) کر کے انھوں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ ان کا موضوع تھا "اثر أسرۃ عند المہلّب بن ابی صفرہ الازدی فی التاریخ الاسلامی"۔ مہلّب بن ابی صفرۃ، تاریخ اسلام کا ایک ممتاز جرنل تھا۔ ان کے مقالے کے ممتحن ڈاکٹر عظیم الدین احمد (۱۸۸۰ء، ۱۹۴۹ء) صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو پٹنہ یونیورسٹی تھے، جنھوں نے ان کے مقالے کی بہت تعریف کی تھی۔ شفوی امتحان کے لیے میمن صاحب اپنے شاگرد کو لے کر پٹنہ گئے تھے، اس لیے کہ ڈاکٹر عظیم الدین صاحب نے علی گڑھ آنے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی۔ مقالے کے کچھ ابواب اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں چھپے تھے، افسوس ہے کہ پورا مقالہ کتابی شکل میں اب تک شائع نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر سیّد محمد یوسف علی گڑھ (۱۹۴۳ء) کے بعد، قاہرہ اور سیلون کی جامعات میں استاد رہ کر کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہوئے۔ وہیں وہ پروفیسر اور صدر شعبۂ عربی مقرر ہوئے۔ کراچی سے سبکدوشی کے بعد نائجیریا کی جامعہ کے قسم دراسات المذہب والادیان سے منسلک ہوگئے تھے۔ ان کی وفات لندن میں ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ متعدد مضامین ان پر مستزاد۔ ان کی مرتب کردہ خالدی برادران کی کتاب الاشباہ والنظائر دو جلدوں میں قاہرہ سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ ان کی دوسری کتابیں بھی وہیں چھپی ہیں۔

ان کے دوسرے شاگرد ڈاکٹر خورشید احمد فارق (متولد ۱۹۱۶ء) ہیں۔ انھوں نے تاریخ اسلام کے ایک بطل جلیل عراق کے گورنر زیاد بن ابیہ (متوفی ۵۳ھ) پر مقالۂ علمیہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دن علی گڑھ میں لکچرر رہ کر ۱۹۴۳ء میں اینگلو عربک کالج دہلی چلے گئے۔ وہ ۱۹۵۳ء میں دہلی یونیورسٹی میں ریڈر اور پھر ۱۹۶۹ء میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں متقاعد ہونے کے بعد علی گڑھ میں مقیم ہیں اور علمی کاموں میں مصروف۔ ان کی مرتب کردہ کتاب المنمق لابن حبیب البغدادی دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن سے ۱۹۶۴ء میں، کتاب الاکتفاء للکلاعی البلنسی کے مقتبسات بنام تاریخ الردۃ دہلی سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ Ziyād b. Abīh (بمبئی ۱۹۶۶ء) The Story of an Arab Diplomat (دہلی ۱۹۷۶ء) اور History of Arabic Literature (دہلی ۱۹۶۸ء) ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

میمن صاحب کا تیسرا شاگرد راقم الحروف ہے جس نے ان کی نگرانی میں تاریخ اسلام کے بجائے عربی ادب کا موضوع اختیار کرنے پر اصرار کیا اور بالآخر صدر الدین علی بن ابی الفرج البصری (م ۶۵۶ھ) کی الحماسۃ البصریۃ کی تصحیح و تہذیب کی جس پر اسے ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ مقالے کے ایک ممتحن مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر فریتس کرینکو (۱۸۷۶ء - ۱۹۵۳ء) مقیم کیمبرج تھے۔ اسے ۱۹۶۵ء میں دو جلدوں میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن نے شائع کیا۔ عالم الکتب بیروت نے بھی اسے چھاپ دیا ہے۔ اس کی عربی کی بعض کتابیں ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ سے شائع ہوئیں۔

راقم ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۲ء تک لٹن لائبریری علی گڑھ میں شعبۂ مخطوطات کا ناظم رہا۔ جنوری ۱۹۵۳ء میں شعبۂ عربی میں لکچرر ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں آکسفورڈ میں پروفیسر ہملٹن گب (متوفی ۱۹۷۱ء) کی نگرانی میں ڈی۔ فل کیا۔ ۱۹۵۸ء میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں ریڈر ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں پروفیسر عبدالعلیم کے وائس چانسلر ہونے پر ڈائریکٹر مقرر ہوا۔ اسی سال شعبۂ عربی میں پروفیسر شپ اور صدارت تفویض ہوئی۔ ۱۹۷۵ء میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور یونیورسٹی اگزکٹو کونسل اور کورٹ کا ممبر مقرر ہوا۔ ۱۹۸۳ء میں سبکدوش ہوا۔ علی گڑھ ہی میں مقیم ہے اور بحمد اللہ لکھنے پڑھنے کا شغل جاری ہے۔

دوسری قسم ان فضلا کی ہے جو علامہ میمن کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے، ان سے قریب رہے، ان سے فیوض علمیہ حاصل کیے، لیکن کسی وجہ سے اپنا علمی مقالہ مکمل نہ کرسکے۔ ان میں نبی بخش بلوچ سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ شبیر احمد خاں غوری، نظیر الاسلام کاشمیری، مزمل حسین، عبدالرحمان اخوند کار، عبدالخالق صاحبان کے نام اس وقت یاد آتے ہیں۔

بلوچ صاحب کا ذکر قدرے تفصیل سے آگے آئے گا۔

شبیر احمد خاں غوری (متولد ۱۵ مارچ ۱۹۱۱ء) کو استاذ مرحوم نے الباخرزی کی دمیۃ القصر کی ترتیب و تصحیح کا کام دیا تھا۔ ریسرچ کے دوران انھیں ملازمت مل گئی۔ وہ عرصے تک حکومت کے قائم کردہ ادارۂ امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش (یو پی) کے نہایت کامیاب ڈائریکٹر رہ کر متقاعد ہوئے ہیں۔ علوم عقلیات کے ماہروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ان علوم پر سینکڑوں مضامین انھوں نے لکھے ہیں جن کا انتخاب کتبخانۂ خدا بخش بانکی پور سے شائع ہونے والا ہے۔ علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

محمد نظیر الاسلام کاشمیری سے الاستاذ نے الصولی کی اخبار ابی تمام اڈٹ کرائی۔ ابھی وہ اپنے کام کی تکمیل نہیں کرسکے تھے کہ اطلاع ملی کہ یہ کتاب قاہرہ میں دو مصری فضلاء نے مرتب کی ہے اور اب طباعت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس موضوع پر اب پی ایچ ڈی کرانا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ جس قدر کام نظیر الاسلام کرچکے تھے الاستاذ نے مصر بھیج دیا۔ قاہرہ سے اخبار ابی تمام ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ سر ورق پر مرتبین میں الاستاذ خلیل محمود عساکر، محمد عبدہ عزام اور نظیر الاسلام الهندی کے نام درج ہیں۔ کئی سال ہوئے الاستاذ خلیل محمود عساکر سے میری ملاقات ریاض میں ہوئی اور اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کا ذکر آیا تو انھوں نے نظیر الاسلام کے کام کا بہت اچھے لفظوں میں اعتراف کیا۔ علی گڑھ سے جانے کے بعد پھر نظیر الاسلام کا پتا نہیں چلا۔ غالباً عالم شباب میں وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ کشمیر میں ان کے حالات معلوم کرنے کی متعدد بار کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

مزمل حسین کے ڈاکٹریٹ کے کام کے لیے ابن حزم (۳۸۴ - ۴۵۶ھ) کی جمهرۃ انساب العرب کا انتخاب ہوا۔ انھوں نے کتب خانۂ خدا بخش بانکی پور، اور کتب خانۂ نواب رام پور کے نسخوں پر اپنے متن کی بنیاد رکھی۔ بعد کو استانبول سے نسخۂ ترکیہ کا عکس الاستاذ کی مساعی سے آگیا تھا اور انھوں نے اس نسخے سے اپنے مرتب کردہ متن کا مقابلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ابھی وہ مقالہ مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کے لیے پیش نہیں کرسکے تھے کہ جوانی میں رحلت کر گئے۔ استاذ ان کا ذکر محبت سے کرتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر اوٹو اشپیز (۱۹۰۱ء -) جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک علی گڑھ کے شعبۂ عربی سے منسلک رہے جب جرمنی واپس جانے لگے تو مزمل حسین مرحوم کا مسوّدہ اور نسخۂ استانبول کا عکس اپنے ساتھ لے گئے کہ کام کی تکمیل کرا کے اسے وہاں سے شائع کرا دیں گے۔ یہ کام نہ مکمل ہوا اور نہ شائع ہوا۔ ۱۹۵۳ء کے اواخر میں جب پروفیسر اشپیز سے جو اس وقت بون یونیورسٹی (جرمنی) میں شعبۂ عربی کے پروفیسر اور صدر تھے، میں نے مزمل حسین مرحوم کے تیار کردہ انساب العرب کے مسوّدے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کچھ نہ بتا سکے۔ ایسا اندازہ ہوا کہ وہ بیس سال پہلے کی بات بالکل فراموش کر چکے ہیں۔ میرا قیاس ہے کہ انھوں نے وہ مسوّدہ Bibliotheca Islamica النشرات الاسلامیۃ لجمعیۃ المستشرقین الالمان کے حوالے کر دیا ہوگا جہاں سے پروفیسر ہیلمٹ ریٹر (۱۸۹۲ء - ۱۹۷۱ء)

... کی نگرانی میں الصفدی کی الوافی بالوفیات اور بہت سے عربی متون شائع ہوئے ہیں ۔ لیکن کوئی شخص عربوں کے انساب سے دلچسپی لینے والا اس وقت موجود نہ ہوگا اس لیے اس کی تکمیل و اشاعت کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوئی ۔

اس کتاب سے ایک زمانے میں میرے دوست مسعود حسن (۱۹۲۰ء ۔ ۱۹۹۲ء) استاذ عربی جامعۂ کلکتہ کو دلچسپی ہوئی اور انھوں نے پروفیسر محمد زبیر صدیقی (متوفی ۱۹۷۶ء) اسو توش پروفیسر آف اسلامک کلچر کلکتہ یونیورسٹی کی نگرانی میں کام شروع کیا ۔ انھوں نے اس سلسلے میں میمن صاحب سے خط کتابت بھی کی ۔ (میں نے میمن صاحب کے خطوط مجلۃ المجمع العلمی الهندی کے میمن نمبر میں شائع کر دیے ہیں جلد ۱۰) لیکن اس کی تحقیق و اشاعت مصر کے مشہور عالم اور محقق الاستاذ عبدالسلام محمد ھارون کے لیے مقدّر ہوچکی تھی جسے انھوں نے دار المعارف قاہرہ سے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا ۔ اس کا دوسرا اڈیشن انھی کا مرتب کردہ جو پہلے سے زیادہ بہتر ہے مصر سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوگیا ہے ۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے ایک مستعد لکچرر عبدالرحمن آخوند کار ۱۹۳۷ء میں یہاں علی گڑھ آئے اور استاذ مرحوم کی نگرانی میں عربی اشعار کے ایک قدیم مجموعے پر ڈاکٹریٹ کے لیے کام شروع کیا ۔ لیکن وہ تکمیل سے پہلے ڈھاکا واپس چلے گئے ۔ استاذ فقید نے ۱۹۴۹ء میں شعبہ عربی اور اپنے شاگردوں کے بارے میں جو مختصر سی یادداشت مجھے لکھوائی تھی (مجلہ میمن نمبر ۱۰ /ص۳۰۲) اس میں اس مخطوطے کا نام درج نہیں ۔ اب میرا خیال ہے کہ یہ منتھی الطلب فی اشعار العرب لابن میمون البغدادی (۵۲۳ ۔ ۵۹۷ھ) ہوگی جس سے آخوند کار کے استاذ ڈاکٹر معظم حسین استاذ شعبۂ عربی ڈھاکا یونیورسٹی (۱۹۰۱ء ۔ ۱۹۹۱ء) اور استاذ مرحوم دونوں کی گہری دلچسپی تھی ۔ ڈاکٹر یحییٰ الجبوری اور ڈاکٹر حاتم صالح الضامن نے اس مجموعے سے کچھ قصائد بیروت سے ۱۹۸۲ء میں شائع کر دیے ہیں ۔

جس زمانے (۱۹۴۹ء ۔ ۱۹۵۱ء) میں ۔ میں الحماسۃ البصریۃ پر کام کر رہا تھا ، دو ریسرچ اسکالرز صفات احمد اور مجتبیٰ حسن بھی ریسرچ میں مشغول تھے ۔ صفات احمد کا موضوع تھا، حجاج بن یوسف " ریسرچ کے ساتھ انھوں نے ملازمت کی تلاش بھی جاری رکھی ۔ بالآخر اپنا

کام نا تمام ہی چھوڑ کر وہ سپر نٹنڈنٹ اسلامک اسٹیڈیز کے عہدے پر بہار چلے گئے ۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے پٹنہ میں سکونت اختیار کرلی ہے ۔ مجتبیٰ حسن ، علی گڑھ ہی کے رہنے والے تھے ۔ انکے والد ماجد کو میں نے دیکھا تھا ۔ کسی اچھے عہدے پر وہ سرفراز تھے ۔ نمائش گراونڈ سے پہلے CHASE اور MANOR کوٹھیوں کے قریب ان کا تعمیر کردہ نیا مکان تھا ۔ مجتبیٰ صاحب نے علی گڑھ سے عربی میں ایم اے کے بعد میمن صاحب کی نگرانی میں کام شروع کیا ۔ " اردو زبان میں عربی الفاظ ، ان کے تبدیل شدہ معانی اور ان کی صورتیں " ان کے مقالے کا موضوع تھا ۔ ابھی یہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا کہ وہ تقسیم ہند پر اپنے خاندان کے ساتھ کراچی چلے گئے ۔ بڑے مستعد طالب علم تھے ۔ انگریزی میں بھی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے ۔ ایک بار ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم و مغفور نے جو اس وقت علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے ، اپنے ایک دوست اور فرنچ اکیڈمی کے رکن پروفیسر Siegfried کے لیے جو توسیعی خطبہ دینے کے لیے علی گڑھ آئے ہوئے تھے مقدمۂ ابن خلدون سے چار پانچ ورق ترجمے کے لیے دیے ۔ انھوں نے برجستہ انگریزی میں ترجمہ کر کے ان کی خدمت میں پیش کر دیا ۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے ان کی انگریزی کی خاص طور پر تعریف کی تھی ۔ بہت محبت کرنے والے آدمی تھے ۔ مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے ۔ علی گڑھ میگزین (۱۹۴۹ء ۔ ۱۹۵۰ء) میں میں نے شعبۂ عربی کے اساتذہ و طلبا ، کا جو گروپ فوٹو شائع کیا ہے اس میں وہ موجود ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ ۱۹۴۹ء کے اواخر یا ۱۹۵۰ء کے اوائل تک ضرور علی گڑھ میں موجود تھے ۔ تقسیم ہند کے کوئی پچیس سال کے بعد کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو ان کے بارے میں استفسار کیا ، کچھ پتا نہیں چلا ۔ بعد کو بھی جب وہاں گیا ان کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی ، کامیابی نہیں ہوئی ۔ خیال ہے کہ شعبۂ عربی اور کراچی یونیورسٹی کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر سول سروس میں داخل ہوگئے ہوں گے ۔

صفات احمد اور مجتبیٰ حسن دونوں علی گڑھ میں مجھ سے سینئر تھے اور مجھ سے پہلے سے ریسرچ کے کام میں مشغول تھے ۔

استاذ مرحوم مجھ سے اپنی خاتون شاگردوں میں شاہ جہاں بیگم صوفی جنھوں نے جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے عربی میں ایم اے کیا تھا ، پاکستان کی شمیم افزا جنھوں نے قانون کی سند حاصل کی تھی ، اور اپنے دوست خلیل عرب (۱۸۸۶ء ۔ ۱۹۶۶ء) کی صاحبزادیوں رقیہ خلیل عرب اور عطیہ خلیل عرب کا اکثر ذکر فرماتے تھے ۔ رقیہ جن کا کچھ سال پہلے پاکستان میں

انتقال ہوا۔ استاذ سے بہت قریب تھیں اور جن کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے "ھی من بین نساء الھند علی معرفۃ ممتازۃ بالعربیۃ والعلوم الاسلامیہ"۔ عطیہ خلیل عرب جامعۂ کراچی کے شعبۂ عربی کی پروفیسر اور صدر رہ کر سبکدوش ہوئی ہیں۔ عربی تقریر پر انھیں قدرتِ تامّہ حاصل ہے۔ میمن صاحب نے جو سند انھیں لکھ کر دی ہے وہ مجلۃ المجمع کے میمن نمبر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان سے ایک بار علی گڑھ میں اور متعدد بار کراچی میں ملاقاتیں ہوئیں۔ میں اگست ۱۹۹۲ء میں "نیپا" کراچی میں مقیم تھا۔ اس زمانے میں وہ وصف المراۃ فی الشعر الجاہلی کے موضوع پر کام کر رہی تھیں یہ کام قریب تکمیل تھا۔ اب انھیں اس پر ڈاکٹریٹ مل چکی ہوگی۔ ان چاروں خواتین نے استاذ سے فیض حاصل کیا لیکن کسی نے ڈاکٹریٹ نہیں کی۔

علامہ عبدالعزیز میمن کے شاگردوں میں جن اصحاب نے علی گڑھ میں عربی میں ایم اے کیا ان کی تعداد خاصی ہوگی۔ اس لیے کہ وہ علی گڑھ کے شعبۂ عربی سے کم و بیش پچیس سال وابستہ رہے۔ جن اصحاب سے میں واقف ہوں ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر سیّد رفیع الدین (متولد ۱۹۱۸ء)۔ انھوں نے بعد کو ناگپور یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کیا اور اسی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی فارسی و اردو میں طویل علمی خدمت انجام دے کر متقاعد ہوئے۔ ناگپور ہی میں مقیم ہیں اور ہندوستان کی متعدد جامعات کی تعلیمی کمیٹیوں کے سرگرم رکن ہیں۔ نعت گوئی پر ان کا مقالۂ علمیہ پاکستان سے شایع ہوچکا ہے۔

ڈاکٹر سیّد احمد (۱۹۱۳ء - ۱۹۷۳ء) ایم اے کر کے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے منسلک ہوئے۔ حکومت بہار کے وظیفے پر ۱۹۵۲ء میں مصر گئے اور الاستاذ عبدالقادر قُط اور الاستاذ مہدی علاّم کی نگرانی میں "علی محمود طہ بین شعراء مصر المعاصرین" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر جامعۃ عین الشمس سے ۱۹۵۴ء میں ڈی لٹ حاصل کی۔ واپس آکر ۱۹۵۵ء میں ادارۂ تحقیق عربی و فارسی حکومت بہار کے ڈائریکٹر اور ۱۹۶۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ ان کا مقالۂ علمیہ شائع نہ ہوسکا۔ میں نے اس کے متعدد ابواب مجلۃ المجمع العلمی الھندی میں شایع کر دیے ہیں۔ ابن قدامہ الموفق ابو محمد عبداللہ بن احمد المقدسی

الدمشقی (م ۹۳۰ء) کی کتاب الوصیت مرتب کر کے انھوں نے ۱۹۵۹ء میں پٹنہ سے شائع کر دی ہے۔ پٹنہ ہی میں جون ۱۹۷۳ء میں انھوں نے وفات پائی۔ میں نے ان پر ایک مضمون مجلۃ المجمع کے شمارہ دوم (جون ۱۹۷۷ء) میں شائع کر دیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد صدرالدین فضا شمسی۔ علی گڑھ سے عربی میں ایم اے کر کے انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور پھر ڈی لٹ کیا۔ شعبۂ اردو کے ممتاز اساتذہ میں تھے۔ پٹنہ میں ۱۹۷۷ء کو انھوں نے وفات پائی۔ متعدّد کتابیں تصنیف کیں۔ عروض و بلاغت پر ان کی کتاب وہاں کے نصاب میں داخل ہے۔

محمد شمس الھدیٰ۔ علی گڑھ سے ایم اے (عربی) کر کے اپنے وطن آسام گئے اور وہاں محکمۂ تعلیم میں بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ کئی سال پہلے ان سے گوہاٹی یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔

یہ چاروں اصحاب علی گڑھ میں ایک ہی زمانے (۱۹۳۰ء - ۱۹۳۹ء) میں میمن صاحب کے شاگرد رہے۔ ان کے دوسرے اساتذہ ڈاکٹر عابد احمد علی اور مولانا سیّد بدرالدین علوی تھے۔

ڈاکٹر سیّد اختر امام نواب امداد امام اثر کے چھوٹے بھائی یوسف امام - کرائے پر سرایوی " کے حقیقی پوتے ہیں۔ علی گڑھ سے ایم اے کرنے کے بعد جرمنی گئے اور بون یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ پروفیسر اشپیپز کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کر کے واپس ہوئے۔ ان کا موضوع معلوم نہ ہوسکا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ پٹنہ میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انھوں نے حلب کے ایک قدیم شاعر الصنوبری (م ۳۳۴ھ) پر کام کیا لیکن جب ۱۹۵۴ء کے اواخر میں اس شاعر کا ایک نادر قصیدہ ہالینڈ کی لائیڈن یونیورسٹی لائبریری میں مجھے ملا اور میں نے ان سے، جب وہ سیلون میں تھے، استفسار کیا تو ان کا جواب مجھے نہیں ملا۔ کچھ دنوں کے بعد بون میں جب میں نے پروفیسر اشپیپز سے ان کے شاگرد کے موضوع کے بارے میں گفتگو کی تو انھیں الصنوبری پر کام کرانا یاد نہ آیا۔ انھوں نے ان کا موضوع اسلامی فلسفہ بتایا۔ اب میرا خیال ہے کہ انھوں نے پٹنہ میں مجھ سے الصنوبری سے دلچسپی کا اظہار کیا ہوگا۔ میں یہ سمجھا ہوں گا کہ انھوں نے اسی نے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ہے۔ اختر امام کا علمی و ادبی ذوق بہت اچھا تھا اور ان کا حافظہ بے پناہ۔ عربی و فارسی و اردو کے ہزاروں شعر انھیں ازبر تھے۔ دیوان غالب تو بالکل انھیں حفظ تھا۔ جرمنی سے واپسی کے بعد وہ پٹنہ کالج میں اور پھر کلکتہ یونیورسٹی میں عربی و اسلامیات کے لیکچرر ہوگئے تھے۔ مسعود حسن مرحوم اس زمانے میں کلکتہ میں زیر تعلیم تھے، مجھ

سے کہتے تھے کہ یونیورسٹی میں پہلے ہی دن جو کلاس میں لکچر انھوں نے دیا اس سے ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ معلومات کی فراوانی کے ساتھ ایسی خوبصورت زبان بول رہے تھے کہ ہم لوگ مسحور ہو کر رہ گئے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ کلکتہ سے اپنے گاؤں "کرائے پر سرائے" کے سارے لوگوں کے ساتھ کراچی منتقل ہوگئے اور کچھ دنوں کے بعد حکومت پاکستان کی وزارت خارجیہ سے منسلک ہوگئے۔ جن دنوں میں بغداد میں اپنی حکومت کے قونصل خانے میں تھے، انھوں نے ایک تفصیلی خط وہاں کے حالات پر مشتمل مدیر معارف (اعظم گڑھ) کو لکھا تھا اور انھوں نے شائع کر دیا تھا۔ بڑا پُر معلومات اور خوبصورت خط تھا۔ جس زمانے میں وہ نیروبی کے سفارت خانے میں تھے عبدالمالک آروی (متوفی ۱۹۵۳ء) سے ان کی خط کتابت تھی۔ اگست ۱۹۵۳ء کے لکھے ہوئے ان کے دو خط میں نے دیکھے ہیں۔ سید اختر امام پھر حکومت کی ملازمت سے مستعفی ہو کر سیلون یونیورسٹی میں عربی کے شعبے کے صدر اور پروفیسر مقرر ہوگئے تھے۔ سرزمین سیلون کا حسن اور وہاں کے لوگوں کا اخلاق انھیں اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے وہاں عرب نسل کی ایک خاتون سے شادی کرلی اور سیلون ہی میں آباد ہوگئے۔ لیکن وہ کراچی برابر آتے جاتے رہے۔ کراچی میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی کسی تصنیف کا علم نہ ہوسکا۔

عبدالخالق ایم اے کر کے دہلی کالج میں عربی کے لیکچرر ہوگئے۔ انھوں نے الاستاذ المیمنی کی نگرانی میں مسائل نافع بن الازرق پر کام شروع کیا تھا کہ انکا تقرر دہلی کالج میں ہوگیا اور وہ دہلی چلے گئے۔ ان کی وفات تقسیم ہند سے پہلے ہوئی۔

عبدالباسط ایم اے کر کے لاہور چلے گئے اور اسلامیہ کالج میں عربی کے استاذ مقرر ہوگئے۔

سیّد محمد عثمان۔ ان کا تعلق صوبۂ بہار سے تھا۔ علی گڑھ میں ایم اے کرنے کے بعد وہ مولانا محمد مبارک کریم (متوفی ۱۹۵۰ء) کی سبکدوشی پر حکومت بہار میں سپرنٹنڈنٹ آف اسلامک اسٹڈیز مقرر ہوئے۔

میمن صاحب کو اپنے شاگردوں میں دو بہت عزیز تھے۔ ان کی علمی دلچسپیوں کی وہ قدر کرتے تھے اور انھیں دل سے چاہتے تھے۔ یہ سیّد محمد یوسف اور نبی بخش بلوچ ہیں۔ یوسف صاحب پر مضمون لکھ چکا ہوں، اردو میں بھی (رسالۂ برہان دہلی ستمبر ۱۹۶۹ء) اور عربی میں بھی مجلۃ المجمع العلمی الھندی کے شمارۂ چہارم جون ۱۹۷۹ء میں۔ آج کی صحبت میں ان کے دوسرے چہیتے شاگرد ڈاکٹر نبی بخش بلوچ پر کچھ اظہار خیال کر رہا ہوں۔

نبی بخش بلوچ صاحب، بہاء الدین کالج جونا گڑھ سے بی اے (آنرز) کر کے، ۱۹۴۱ء

میں علی گڑھ آئے اور ایم اے (عربی) میں داخل ہوئے ۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق ایل ایل بی کے کورس میں داخلہ لیا۔ انھوں نے قانون کی تعلیم کی طرف عربی سے کچھ زیادہ ہی توجہ رکھی تھی ، اس لیے کہ آئندہ زندگی میں انھوں نے اپنے لیے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن جب دونوں امتحانوں کے نتائج نکلے تو ہر چند وہ قانون کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے تھے ، لیکن جب عربی میں ان کی فرسٹ پوزیشن آئی تو انھوں نے قانونی پیشہ اختیار کرنے کا خیال ترک کر دیا اور وکالت پر عربی میں پی ایچ ڈی کرنے کو ترجیح دی ۔

میمن صاحب ، بوجوہ ، عربی ادب سے زیادہ تاریخ اسلام پر کام کرانے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ چنانچہ انھوں نے بلوچ صاحب کے لیے " السند تحت سیطرۃ العرب الی عھد المتوکل " کا موضوع طے کیا اور انھوں نے نہایت محنت و تن دہی سے کام کرنا شروع کیا ۔ بلوچ صاحب مجھ سے علی گڑھ میں دو سال سینئر تھے ۔ وہ ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ آئے اور میں جولائی ۱۹۴۳ء میں ۔ میں ہر چند انٹرمیڈیٹ کی کلاس میں تھا لیکن مطالعۂ کتب کا شوق مجھے کشاں کشاں لٹن لائبریری لے جاتا رہا ۔ (جب ۱۴ نومبر ۱۹۵۵ء کو نئی عمارت کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں انجام پایا تو اس کا نام لٹن لائبریری کی جگہ اُن کے دوست اور رفیق کار کے نام پر مولانا آزاد لائبریری رکھا گیا جو اس وقت وزیر علوم و معارف تھے ۔ اب لٹن لائبریری اسی نام سے مشہور ہے) وہاں میں ایک صاحب کو اکثر تلاش کتب اور مطالعۂ کتب میں مصروف پاتا۔ کئی ماہ بعد غالباً ۱۹۴۴ء کے اوائل میں انھی صاحب کو وکٹوریا گیٹ سے اسٹریچی ہال کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ جو پشاوری چپل ، علی گڑھ کٹ پائجامے اور اچھی سلی ہوئی چست شیروانی میں ملبوس تھے ، سر پر بالوں والی رومی ٹوپی تھی ۔ جو بات انھیں عام طالب علموں سے ممتاز کر رہی تھی وہ یہ کہ وہ گردن میں اوسط تقطیع کا قرآن شریف حمایل کیے ہوئے تھے ۔ اُس وقت میرے ساتھ میرے ایک عزیز شہاب الدین محمد مغنی صاحب (۱۹۲۵ء - ۱۹۹۱ء) تھے وہ علی گڑھ میں مجھ سے سنیئر تھے اور فلسفے میں ایم اے کر رہے تھے ۔ میں نے ان سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں انھوں نے کہا یہ بلوچ صاحب ہیں ، نبی بخش بلوچ ، سندھ سے آئے ہیں ، عربی میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں ، اور انھوں نے فخریہ لہجے میں میرے معلومات میں اضافہ کیا کہ یہ خاکسار ہیں۔ (مغنی صاحب بھی ان دنوں خاکسار تحریک سے وابستہ تھے)۔ بلوچ صاحب سے اس وقت تعارف نہ ہوسکا اور ہم دونوں اسٹریچی ہال میں داخل ہوگئے جہاں ایک جلسہ ہو رہا تھا۔

بعد کو انھیں شعبے میں (جو اس زمانے میں ایس ایس ویسٹ کے کونے میں ملّا طاہر سیف الدین کے تعمیر کردہ ہالوں اور کمروں میں قائم تھا)، لائبریری میں، جلسوں میں دیکھتا رہا لیکن ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

میں علی گڑھ میں صرف طالب علم رہا، کسی مذہبی جماعت، کسی سیاسی پارٹی اور کسی گروپ سے وابستہ نہیں ہوا۔ خاکسار تحریک سے بھی نہیں، اگرچہ ان میں خدمت خلق کا جو جذبہ تھا اور اس کے ارکان کی زندگی میں جو سادگی اور خلوص تھا اور جو ان میں فرض شناسی تھی اس کی وجہ سے دل میں ان کی قدر تھی۔ مغنی صاحب کی وجہ سے ان کے ساتھ کبھی کبھی بعض خاکساروں کے یہاں جانا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں صوبۂ سرحد کے افضل خاں یونیورسٹی میں خاکساروں کے سالار اعلیٰ تھے۔ بلوچ صاحب کو کبھی وہاں اور کبھی اختر حمید خاں اور جنید اللہ خاں درانی کے یہاں دیکھتا تھا لیکن کبھی کبھی۔ بعد کو بلوچ صاحب خود سالار اعلیٰ ہوگئے تھے، لیکن اس تحریک سے وابستگی کے باوجود انھیں علمی و تحقیقی کاموں میں ہمیشہ منہمک پایا۔

ہمارے مغنی صاحب، کرّار حسین، اختر حمید خاں اور درّانی صاحب سے بہت متاثر تھے۔ یہ تاثر صحیح بھی تھا۔ کرار صاحب بہت پڑھے لکھے، اور ذہین آدمی ہیں۔ اس زمانے میں میرٹھ کے ایک کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ یہاں سے میرٹھ کا فاصلہ ہی کیا؛ وہ علی گڑھ آتے رہتے تھے اور تحریک سے دلچسپی رکھنے والوں کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ وہ اخبار Radiance کے کاموں کی نگرانی بھی کرتے رہتے تھے۔ اختر حمید خاںؒ نے استعفا دے کر خاکسار تحریک میں شامل ہوئے تھے۔ یہ علی گڑھ آنے سے پہلے کُھلنا (مشرقی بنگال) کے بہت کامیاب اور ہر دل عزیز ڈپٹی کمشنر تھے۔ یہ اور ان کے بعض رفقا علی گڑھ میں ریڈینس اخبار فروخت کرتے تھے اور زمین پر بیٹھ کر تالے بناتے تھے اور اس طرح رزق حلال حاصل کرتے تھے۔ درّانی صاحب کے یہاں مغنی صاحب کے ساتھ میرا جانا زیادہ ہوتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ طالب علموں سے جلد بے تکلف ہوجاتے تھے، ان سے دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ انجینیرنگ کالج سے آکر ایک وسیع، اونگھتے ہوئے نیم ویران سے مکان میں ایک ڈھیلے ڈھالے پلنگ پر لیٹ جاتے تھے (ان کی پیٹھ میں کچھ تکلیف تھی) اور بڑے مزے کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ کرّار حسین اب تو پاکستان کے تعلیمی ماہروں اور بڑے دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں، لیکن تقسیم ہند سے پہلے بھی وہ علّامہ سمجھے جاتے تھے، اور اختر حمید خاں بہرحال آئی سی ایس اور ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے اس لیے جونیئر طلبا عام طور پر ان دونوں سے ملنے میں "جھجکتے" تھے۔ درّانی

صاحب کے کمرے میں بے تکلفی کی فضا ہوتی تھی ۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ دونوں حضرات یونیورسٹی کے نہ تھے ان کا قیام بھی یونیورسٹی سے باہر تھا ۔ درّانی صاحب یونیورسٹی کے استاد تھے ۔ قیام بھی یونیورسٹی کے "بنگالی ہاؤس" (ہندوستان کے مشہور ریاضی داں اور علی گڑھ کے پروفیسر چکرورتی کے مکان میں تھا جو متعدد ہوسٹلوں سے قریب تھا اس لیے طلباء کا ان کے یہاں آنا سہل تھا ۔ وہ علی گڑھ کے انجینیرنگ کالج کے بانیوں میں تھے ۔ عمارت کی عدم موجودگی میں وہ درختوں کی چھاؤں میں کلاسیں لیا کرتے تھے ۔ درّانی صاحب سے میری دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہومیوپیتھک علاج بھی کرتے تھے اور دوائیں مفت تقسیم کیا کرتے تھے ۔ پھر وہ تصوّف کی طرف بھی مائل تھے اور میرے والد مرحوم مولانا ظفر الدین صاحب قادری (متوفی ۱۹۶۲ء) کے دوست مولانا سیّد سلیمان اشرف بہاری (متوفی ۱۳۵۱ھ) کے عقیدت مندوں میں تھے ۔ وہ ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ سے پشاور چلے گئے اور پھر بابا قادر اولیاء سے انھوں نے شرف بیعت حاصل کی ۔ درّانی صاحب نیم مجذوب سے کچھ کم تو علی گڑھ میں بھی تھے ۔ آخر عمر میں سنا ہے پورے مجذوب ہوگئے تھے ۔ ان کے ایک مرید ولی الدین نے ان کی سوانح عمری "دُرِّ عینی" لکھی ہے ۔ درّانی صاحب بڑے دلچسپ آدمی تھے ۔ دنیا کے عجیب و غریب لوگوں کی اگر فہرست بنائی جائے تو اس میں ان کی عدم شمولیت ظلم ہوگا ۔

بات بلوچ صاحب سے علی گڑھ کے خاکساروں کی طرف مڑ گئی ۔ ایم اے کے بعد ہی بلوچ صاحب کے لیے موضوع طے ہوگیا تھا اور انھوں نے کام کرنا شروع کر دیا تھا ، وہ کوئی سوا دو سال تک اپنے موضوع پر مواد جمع کرکے ترتیب دیتے رہے اور فرسٹ ڈرافٹ تیار کرتے رہے ۔ یہ ان کی سخت مصروفیت کا زمانہ تھا ۔ لٹن لائبریری میں عربی و فارسی کی ایسی جتنی کتابیں تھیں جن میں سندھ سے متعلق کچھ بھی معلومات تھے ، انھوں نے دیکھ ڈالی تھیں ۔ اس وقت تو نہیں لیکن بعد کو اپنے تحقیقی کاموں کے دوران بہت سی ایسی کتابیں میری نظر سے گزریں جن کے آخر میں "عثمان السندی" یا صرف "السندی" کے دستخط ثبت تھے ۔ یہ اس لیے کہ انھیں معلوم ہوجائے کہ اس کتاب سے انھوں نے اشارات تیار کرلیے ہیں ۔ اکثر کتابوں میں ، میں نے دیکھا کہ انھوں نے ان سارے صفحات کے نمبر درج کر دیے ہیں جن میں سندھ کا ذکر ہے ۔ یہ بھی دیکھا کہ وہ اشارات لیتے گئے ہیں ۔ ان کتابوں میں صرف تاریخی کتابیں ہی نہیں اور دوسرے موضوعات کی تصانیف بھی ان کے پیش نظر رہی ہیں ۔ مثال کے طور پر السمعانی کی کتاب الانساب ، یاقوت الحموی کی معجم البلدان ، دیوان الاعشی الکبیر کہ ان

ہیں اور ان جیسی اور کتابوں میں سندھ، اور سندھی علماء و ادباء و شعراء و مشاہیر کا ذکر استطراداً ملتا ہے۔ لٹن لائبریری کے علاوہ استاذ میمن کا کتب خانہ بھی ان کے لیے کھلا ہوا تھا۔ وہ انھیں رام پور، حبیب گنج اور دوسرے مقامات کے کتب خانوں سے نہ صرف استفادے کا مشورہ دیتے تھے بلکہ وہاں کے لیے انھیں تعارفی خطوط بھی دیتے تھے۔ بلوچ صاحب کے سلسلے میں صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی (۱۸۶۷ء - ۱۹۵۰ء) کو انھوں نے جو خط ۱۸ جنوری ۱۹۴۴ء کو لکھا تھا وہ مجلۃ المجمع میمن نمبر ۱۰ / ۴۹۹ میں شایع ہوا ہے۔ رام پور کے ریاستی کتب خانے سے استفادے کے لیے میمن صاحب نے مولانا امتیاز علی عرشی (۱۹۰۴ء - ۱۹۸۱ء) کو خط لکھا تھا۔ بلوچ صاحب میمن صاحب کا خط لے کر جب رام پور پہنچے تو انھیں اسٹیٹ گسٹ بنا کر شاہی مہمان خانے میں ان کی رہائش کا انتظام کیا گیا۔ عرشی صاحب کی رہنمائی میں انھوں نے بہت کچھ استفادہ کیا۔ بلوچ صاحب اپنے مضمون ایام علی گڑھ (علی گڑھ میگزین ۱۹۹۷ء) میں لکھتے ہیں:

"علی گڑھ سے باہر کے فضلاء سے استفادہ کرنے میں استاذ مرحوم نے میری بہت رہنمائی فرمائی۔ قاضی احمد میاں اختر (جونا گڑھ)، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ (سندھ)، پروفیسر محمد شفیع (لاہور) اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) کو انھوں نے میرے سلسلے میں خطوط لکھے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الاستاذ ان پر کس قدر شفقت فرماتے تھے اور ان کے علمی منصوبے کی تکمیل میں کس درجہ تعاون فرماتے تھے۔

افسوس یہ ہے کہ حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ بلوچ صاحب سندھ کی ابتدائی تاریخ پر اپنا مقالۂ علمیہ مکمل نہ کرسکے۔ اگر یہ مکمل ہوجاتا تو یقیناً شعبۂ عربی ہی نہیں یونیورسٹی کے اہم مقالوں میں اس کا شمار ہوتا۔

ہوا یہ کہ ۱۹۴۵ء میں پیر الٰہی بخش (متوفی ۱۹۷۵ء) وزیر تعلیم صوبہ سندھ کی مساعی سے مسلمانان سندھ کا پہلا اعلیٰ تعلیمی ادارہ سندھ مسلم کالج کراچی میں قائم ہوا اور علی گڑھ کے ایک سابق طالب علم ڈاکٹر امیر حسن صدیقی اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صدیقی کو کالج چلانے کے لیے اچھے اساتذہ کی فوری ضرورت تھی۔ دوسرے اصحاب کے علاوہ ان کی نظر نبی بخش بلوچ پر پڑی، جن سے وہ علی گڑھ میں واقف ہوچکے تھے اور جن کی صلاحیتوں کے بارے میں ان کی بہت اچھی رائے تھی۔ انھوں نے بلوچ صاحب کو سندھ مسلم کالج کی لیکچرر شپ پیش کی۔ انھوں نے میمن صاحب سے مشورہ کیا۔ انھوں نے ان کی ملازمت پر پی ایچ ڈی کی

تکمیل کو ترجیح دی ۔ ڈاکٹر امیر حسن بڑے مضبوط ارادے کے آدمی تھے ، وہ آسانی سے ہمت ہارنے والے نہیں تھے ۔ اب وہ وزیر تعلیم سندھ سے ملے ، انھوں نے ان سے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (۱۸۷۳-۱۹۴۸ء) کو خط لکھوایا کہ سندھ مسلم کالج کے لیے اچھے سٹاف کی ضرورت ہے ۔ نبی بخش بلوچ کو ترغیب دلائی جائے کہ وہ سندھ آکر کالج کی ملازمت اختیار کرلیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سندھ کے وزیر تعلیم کا خط صدر شعبۂ عربی میمن صاحب کو بھیج دیا اور زبانی ان سے گفتگو بھی کی ۔ میمن صاحب نے بلوچ صاحب سے کہا کہ کام نا تمام چھوڑ کر چلے گئے ، تو پھر اس کی تکمیل نہیں کر سکیں گے ۔ بلوچ صاحب بھی شفیق استاد کا آستانہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے ۔ لیکن کالج کے پرنسپل ، وزیر تعلیم اور بعض سندھی احباب و اعزہ کا اصرار بڑھتا گیا ۔ میمن صاحب ، بلوچ صاحب سے کس قدر محبت کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے بدون معرفت سابقہ ، وزیر تعلیم کو بڑی لجاجت سے ایک خط لکھا کہ براہ کرم بلوچ صاحب کو ریسرچ جاری رکھنے کی اجازت دیجیے اور کالج میں کسی اور کا تقرر کرا دیجیے۔ یہاں میمن صاحب کا خط درج کیا جاتا ہے یہ غالباً ۱۹ مئی ۱۹۴۵ء کا تحریر کردہ ہے:

استاذ المیمنی کا خط پیر الٰہی بخش کے نام

معظم و محترم جناب والا القاب پیر الٰہی بخش صاحب
وزیر تعلیمات سند ، زاد فضلہٗ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

بغیر سابقہ تعارف کے ، میں آپ کو تصدیع دینے کی جسارت کر رہا ہوں۔

آج عزیزی مولوی نبی بخش بلوچ ایم اے ایل ایل بی ریسرچ اسکالر نے مجھے آپ کا کرم نامہ اور مکرم ڈاکٹر امیر حسن صاحب پرنسپل کا خط بیک وقت دکھائے ۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ بلوچ صاحب کے مضمون پر قدرے روشنی ڈالی جائے۔

۱ ۔ "سند زیر عرب" کے عنوان پر انتہائی عرق ریزی سے یہ ریسرچ سوا دو سال سے ہو رہی ہے ۔ کوئی آٹھ ماہ اور رہتے ہیں ۔ میں جانتا ہوں ، ہندوستان میں آج تک گو سندو عرب پر متعدد کتابیں مسلمانوں اور غیر مسلموں نے لکھی ہیں مگر کسی نے اتنی جاں فشانی سے عربی ادبیات کے پوشیدہ گوشوں سے یہ مواد نہیں نکالا جس کا کھوج لگانا بلوچ کے نصیب میں تھا،

میں کاٹھیا واڑی میمن ہوں مگر اس کام کی تکمیل کے لیے بے تاب ہوں۔ مگر آپ کا بلوچ صاحب کا تو سب کچھ سند ہے۔ فیہا تحیون و فیہا تموتون و منہا تخرجون ۔ اگر اسی طرح آپ کی توجہ شامل حال رہی تو ملازمت تو پھر بھی مل رہے گی۔ مگر یہ کام روزمرہ نہیں ہوا کرتے۔

محض سند اور سند کے سلیے میری آپ سے التماس ہے کہ آٹھ ماہ کے لیے کوئی عارضی انتظام کر لیجیے۔ پھر بلوچ کو میں آپ کے حوالے کر دوں گا۔ اس سلسلے میں آپ کو عارضی ضرورت پوری کرنے کے لیے بہت سے آدمی مل جائیں گے۔ آپ کو سند کا واسطہ دلاکر پھر ملتمس ہوں کہ ڈاکٹر امیر حسن صاحب کو آپ خود سمجھائیے۔ اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر داود پوتہ صاحب کو میرا نیاز نامہ دکھا کر استصواب کیجیے۔

آخر میں، میں آپ سے اپنی جسارت پر طالب عفو ہوں۔

والسلام

ناچیز میمن عبدالعزیز

بالآخر ڈاکٹر امیر حسن کا اصرار غالب آیا اور بلوچ صاحب کراچی جا کر سندھ کالج میں لیکچرر ہوگئے ۔ کالج کے اصحاب اور ان کے احباب ان کی ترقی کے لیے اعلیٰ تعلیم مفید بلکہ ضروری سمجھتے ہوں گے چنانچہ کچھ ہی دنوں کے بعد انھیں حکومت ہند کی ایک اسکالر شپ مل گئی (اس وقت تک ملک تقسیم نہیں ہوا تھا) اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے نیویارک چلے گئے جہاں کولمبیا یونیورسٹی میں ان کا داخلہ ہوگیا۔ یہاں انھوں نے شعبۂ تعلیم میں ایم اے کیا اور اس مضمون میں ۱۹۳۹ء میں انھیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔

نبی بخش بلوچ صاحب سے مجھے ملنے ملانے کے مواقع کم ملے ۔ جو ملاقاتیں ہوئیں بھی تو مختصر ۔ میں نے اوپر لکھا ہے کہ علی گڑھ میں وہ مجھ سے سینئر تھے اور یہاں اس زمانے میں سینیئر کا بڑا احترام کیا جاتا تھا ۔ احترام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اس سے کم سے کم ملا جائے ۔ اگر کسی ضرورت سے ملنا ضروری ہو جائے تو ملاقات مختصر ہو ۔ میرے ورودِ علی گڑھ کے بعد وہ دو، سوا دو سال تک یہاں رہے ۔ اس عرصے میں اگر ان سے کہیں ملاقات ہوئی تو

اس کی کوئی واضح تصویر صفحۂ یاد داشت پر نہیں ابھرتی ۔ میرا اس وقت تک میمن صاحب سے کوئی خاص تعلق بھی قائم نہیں ہوا تھا ۔ میں جب ۱۹۴۸ء میں ایم اے (عربی) میں آیا اور میمن صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تو اس وقت بلوچ صاحب علی گڑھ چھوڑ کر سندھ اور پھر امریکہ جا چکے تھے۔

ان سے ایک ملاقات جو یاد آتی ہے وہ علی گڑھ کے شعبۂ عربی میں ۱۹۶۰ء میں ہوئی ۔ وہ انڈیا ۔ پاکستان کلچرل کانفرنس میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے دہلی آئے ہوئے تھے ۔ اور کچھ وقت بچا کر اپنی مادر درسگاہ آگئے تھے ۔ ان کا قیام ڈاکٹر سیّد مقبول احمد کے ساتھ تھا۔ جو اس وقت شعبۂ عربی و اسلامیات میں ریڈر تھے ۔ یہ دونوں بمبئی یونیورسٹی کے سابق طالب علموں میں تھے ۔ مقبول صاحب ، اس زمانے میں عظمت الٰہی زبیری صاحب ، (سابق رجسٹرار) کے تعمیر کردہ مکان " زبیری منزل " واقع دودھ پور میں قیام پذیر تھے۔ یونیورسٹی نے یہ مکان زبیری صاحب سے ان کی روانگی پاکستان کے وقت حاصل کرلیا تھا۔ بلوچ صاحب ایک رات یہاں گزار کر دوسرے دن شعبۂ عربی آئے اور مجھ سے اور ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب صدر شعبہ سے ملے ۔ شعبۂ عربی ، ایس ایس ہال سے اٹھ کر عثمانیہ ہوسٹل کی بالائی منزل پر شعبۂ انگریزی اور شعبۂ ہندی و سنسکرت کے کمروں کے درمیان آیا ، پھر ذاکر صاحب کے زمانے میں غالباً یکم اپریل ۱۹۵۲ء کو ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی توجہ سے ظہور وارڈ یعنی " بیوت الاطفال الصغار " میں پہنچا۔ چھوٹے بچوں کا ہوسٹل کہیں اور چلا گیا اور اس عربی میں لکھے ہوئے بورڈ کے اوپر شعبۂ عربی کی تختی لگ گئی ۔ بلوچ صاحب اور میں دونوں میمن صاحب کے شاگرد تھے ، اس طرح ہم دونوں خواجہ تاش تھے ، اسی لیے ہم دونوں میں زیادہ گفتگو میمن صاحب کے بارے میں ہوتی رہی جو اس زمانے میں " میمن منزل " بہادر آباد ، کراچی میں مقیم تھے۔ وہ مجھ سے میمن صاحب کی سرگزشت اپنے علی گڑھ چھوڑنے کے بعد اور ان کے کراچی پہنچنے تک معلوم کرنا چاہتے تھے اور میں ان سے اپنے استاد کے کراچی پہنچنے کے بعد کے حالات دریافت کر رہا تھا ۔ بلوچ صاحب کے اپنے وقت کے علی گڑھ ، سندھ مسلم کالج میں ان کی ملازمت اور امریکہ میں ان کے تمام حالات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ انھیں یاد آیا کہ انھیں پروفیسر محمد حبیب صاحب سے بھی ملنا ہے چنانچہ وہ ہم لوگوں سے رخصت ہو کر " بدر باغ " چلے گئے ۔ جہاں سے انھیں ریلوے اسٹیشن جانا تھا ۔

بلوچ صاحب سے دوسری ملاقات کراچی سے چالیس میل دور ایک قدیم مقام بھنبھور میں ہوئی ، جہاں کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں سندھ کا مشہور شہر دیبل واقع تھا ۔ ایک بڑے

وسیع و عریض شامیانے میں دیبل کی تاریخ و تہذیب و تمدن پر اجلاس ہو رہا تھا ۔ میں مشفق خواجہ ، ڈاکٹر جمیل جالبی اور لطف اللہ خاں صاحب کے ساتھ شدِّ رحال کر کے کراچی سے اس جلسے میں شرکت کے لیے وہاں پہنچا تو جلسہ شروع ہوچکا تھا اور ہمارے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب پاکستان کے بعض مشاہیر اور حکومت کے کچھ عہدہ داروں کے ساتھ شہ نشین پر متمکن تھے ۔ وہیں علی گڑھ کے ایک سابق طالب علم پروفیسر معصوم علی ترمذی سے (جو علی گڑھ میں مجھ سے سینئر اور آکسفورڈ میں میرے معاصر تھے) ملاقات ہوئی ۔ لنچ پر جب بلوچ صاحب کو معلوم ہوا کہ میں جلسہ گاہ میں موجود ہوں تو ملنے آئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ میں دیبل پر ان کی معلوماتی تقریر سے بہت متاثر ہوا ۔ دیبل بڑی شان و شوکت کا شہر تھا اور مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں تعلیم و ثقافت کا بڑا مرکز تھا ۔ بھنبھور کی جس سرزمین پر اس وقت ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق کئی سو سال پہلے دیبل یہیں واقع تھا ۔ ویسے ۱۹۶۰ء کی کھدائی سے اس امر کی قطعی شہادت نہیں ملتی کہ بھنبھور کے کھنڈر میں دیبل کے کھنڈر ہیں اس سلسلے میں پہلا قابل قدر مضمون شاید بلوچ صاحب ہی کا ہے جنھوں نے کے عنوان سے ایک مضمون ۱۹۵۲ء میں اسلامک کلچر ۲۶-۳ میں لکھا تھا ۔ بعد کو انھوں نے تحقیقات جاری رکھی اور ان کے نتائج شائع کرتے رہے ۔

تیسری ملاقات مئی ۱۹۸۳ء میں اسلام آباد میں ہوئی ۔ ہرچند ڈاکٹر وحید قریشی صاحب جو مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ تھے اس زمانے میں وہیں موجود تھے ، لیکن مشفق خواجہ صاحب نے میرے قیام کا انتظام جناب مہتاب ظفر کے یہاں کیا تھا جو اس وقت وفاقی محتسب کے ادارے میں ڈائرکٹر تھے اور بلوچ صاحب کے مکان کے قریب رہتے تھے تاکہ اپنے خواجہ تاش سے مجھے ملنے ملانے کے مواقع زیادہ حاصل ہوں ۔ انھیں میری آمد کی اطلاع ملی تو فوراً ملنے تشریف لائے اور دوسری شب کو انھوں نے اپنے یہاں مدعو کیا ۔ اس رات دیر تک ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوئیں ، انھوں نے بتایا کہ الاستاذ کے پاس جو عربی کے مخطوطات یا مخطوطات مصر و ترکیہ کی نقلیں تھیں ان کی تشریحی فہرست انھوں نے میمن منزل ، علی گڑھ میں بیٹھ کر ۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو بنائی تھیں ۔ انھوں نے وہ اوراق مجھے دکھائے اور میرے بڑھتے ہوئے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے دوسرے ہی دن ۱۰ مئی ۱۹۸۳ء کو اس کی عکسی نقل بنوا کر بھیج دی ۔ ان اوراق میں ستر ۷۰ عربی مخطوطات و مصورات کی تفصیلات ہیں اور میرے پاس اب بھی محفوظ ہیں ۔ آخر میں ڈائری کے دو صفحے اردو اور سندھی میں ہیں ۔ ، اور ۸ مارچ ۱۹۵۳ء اور ۲ مئی ۱۹۷۱ء کو استاذ

گرامی سے ملاقات کے دوران جو علمی گفتگو ان سے ہوئی ہے وہ بلوچ صاحب نے سپرد قلم کی ہے۔

بلوچ صاحب سے چوتھی ملاقات جولائی ۱۹۸۹ء میں اسلام آباد میں ہوئی جب وہ پاکستان ہجرہ کونسل کے سربراہ تھے اور بہت اچھی اچھی کتابیں بڑے اہتمام سے شایع کر رہے تھے۔ ایک دن انھوں نے ہجرہ کونسل کے دفتر میں مدعو کیا اور کونسل کی کارگزاریوں سے مجھے باخبر کیا۔ انھوں نے اپنی مرتّب کردہ، کونسل سے شایع شدہ ایک تازہ کتاب Great Books of Islamic Cinilization دستخط کر کے مجھے عنایت کی۔ یہ کتاب میری خوابگاہ کی الماری میں جہاں اہم کتابیں رکھتا ہوں، محفوظ ہے۔ اس میں ان کے قلم سے تحریر ہے

هدیه الی صدیقنا الاستاذ الفاضل مختار الدین آرزو و انا المحتاج الی رحمته تعالیٰ نبی بخش بلوچ
اسلام آباد ۳۔۷۔۸۹

میں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب صدر نشین مقتدرہ قومی زبان کے یہاں مقیم تھا۔ ایک شب ڈاکٹر محمد معز الدین سربراہ ہجرہ کونسل نے مجھے اور ڈاکٹر جالبی صاحب کو اپنے یہاں مدعو کیا اور مجھ سے ملاقات کے لیے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور ڈاکٹر قدرت اللہ فاطمی کو بھی مدعو کیا۔ یہ صحبت خاصی طویل رہی اور اسلام آباد کی علمی و ادبی کار گزاریوں سے واقفیت کا موقع ملا۔

پانچویں اور اب تک کی آخری ملاقات کراچی میں ۱۵ اگست ۱۹۹۳ء کی شام کو اس تقریب میں ہوئی جس میں سندھ کے ادب، تہذیب و ثقافت سے دلچسپی لینے والے حضرات مشہور سندھی شاعر عبداللطیف بھٹائی کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ جلسے کی صدارت حکیم محمد سعید صاحب کر رہے تھے جو اس زمانے میں سندھ کے گورنر تھے۔ مہمان خصوصی نبی بخش بلوچ صاحب تھے جو ان دنوں حکومت سندھ کے وزیر تعلیم تھے۔ جلسے کے اختتام پر ان سے مختصر ملاقات ہوئی۔ میں پروفیسر ریاض الاسلام صاحب، حکیم مسعود احمد برکاتی اور ذوالفقار مصطفےٰ صاحب کے ساتھ ایک اور جلسے میں جا رہا تھا۔ بلوچ صاحب نے کہا یہ ملاقات کچھ نہیں، میں آپ سے ملنے آپ کی قیام گاہ - نیا ' آؤں گا وہاں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ اس ملاقات کی تفصیلات اب یاد نہیں لیکن اتنا سب لوگ جانتے ہیں کہ علی گڑھ کے دو طالب علم جب ملتے ہیں تو زیادہ تر ذکر و اذکار علی گڑھ کا ہی ہوتا ہے اور اس ملاقات میں بھی یہی ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اسلام آباد، حکومت پاکستان کے اعلیٰ علمی عہدوں پر سرفراز رہے۔ وہاں کی دو جامعات (سندھ یونیورسٹی اور جامعۂ اسلامیہ اسلام آباد) کے وائس چانسلر ہوئے۔ ہجرہ کونسل، سندھی ادبی بورڈ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ اور دوسرے علمی اداروں کے بڑے کامیاب سربراہ رہے۔ ان کی زندگی ترقیوں اور کامرانیوں سے معمور ہے۔ پاکستان میں کون صاحب علم و صاحب ذوق ایسا ہے جو ان کے علمی کارناموں سے واقف نہیں۔ ان کے کارنامے نہ سہی ان کارناموں کی خوشبو سرحدوں کو عبور کرتی ہوئی یہاں بھی پہنچی۔ ان کے علمی کارناموں پر رسالۂ تحقیق کے "گوشۂ بلوچ" کے لیے مشہور حضرات نے مضامین لکھے ہوں گے۔ یہاں میں زیادہ تر ہندوستان کے حوالے سے چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

بلوچ صاحب کی مضمون نویسی کی ابتدا، اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب وہ علی گڑھ میں ایم اے کے طالب علم تھے۔ انھوں نے مشہور عربی کتاب کلیلہ و دمنہ کے اصل ماخذ و مصادر پر انگریزی میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جسے شعبۂ انگریزی کے پروفیسر اور صدر شعبہ F.J.FIELDEN نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اسے اسلامک کلچر (حیدرآباد) میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے اموی دور کے ایک بانی قائد منصور بن جمہور کے سندھ پر تسلّط کے متعلق ایک مضمون سپرد قلم کیا۔ شیخ عبدالرشید استاد شعبۂ تاریخ نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ تیسرا قابل ذکر مضمون دیبل (سندھ) پر عربوں کے پہلے حملے کی تاریخ سے متعلق تھا۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق (استاذ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی) نے ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ فتوح البلدان کے مصنّف البلاذری کا یہ قول کہ دیبل (سندھ)، بھروچ (گجرات) اور تھانہ (نزد بمبئی) پر عربوں کا پہلا حملہ ۱۵ھ میں ہوا قرین صواب نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حملہ حضرت عثمان بن عفّان کی خلافت میں ۲۴ھ میں ہوا۔ بلوچ صاحب نے ان کے مفروضے کی تردید کی اور تاریخی دلائل و شواہد سے ثابت کیا کہ یہ بحری حملہ حضرت عمر کے عہد میں ۱۵ھ ہی میں ہوا ہے اور البلاذری اور دوسرے مورخوں کا بیان بالکل صحیح ہے۔ یہ مضمون اسلامک کلچر میں شائع ہوا اور لوگوں نے اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا۔

اپنے ریسرچ کے دوران انھیں عربی کے مشہور سندھی شاعر ابو عطاء افلح بن یسار السندی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ یہ خلیفہ عباسی منصور کے عہد کا شاعر ہے۔ ابو تمام، البحتری، صدر الدین علی بن ابی الفرج البصری نے اپنے مرتب کردہ حماسوں اور ابو الفرج اصفہانی، ابن قتیبہ،

المرزبانی ، البغدادی ، ابو علی القالی، البکری، بدرالدین العینی اور ابن خلکان نے اپنی اپنی تصانیف میں اس سندھی شاعر کا ذکر کیا ہے اور بعضوں نے اس کے مقطوعات درج کیے ہیں ابن خلکان ، اس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابو عطاءالسندی بہت اچھے شعراء میں ہے ۔ کتاب الحماسۃ میں اس کے کچھ مقطوعات درج ہیں ۔ طوالت اور موضوع کے دور ہوجانے کا خوف نہ ہوتا تو اس کے سارے اشعار اپنی کتاب میں درج کردیتا۔ ابو عطاء السندی کا دیوان شعر اگر کبھی مرتب ہوا تو اب مفقود ہے۔ دیوان کے وجود کی اطلاع ابن الندیم کے یہاں بھی نہیں ملتی ۔ ڈاکٹر بلوچ نے استاذ گرامی کی تشجیع اور ان کے مشورے سے کمال محنت سے اس کے اشعار جمع کیے جو عربی کی امّہات کتب کے بطون میں چھپے ہوئے تھے ۔ انھوں نے تمہید میں شاعر کی زندگی کے حالات لکھے ، پھر حروف معجم کی ترتیب سے اس کے اشعار درج کیے اور ان اشعار کے مصادر کے حوالے دیے ، اور اشاعت کے لیے اسلامک کلچر میں بھیج دیے ۔ یہ علمی کام انھوں نے علی گڑھ کے قیام کے آخری زمانے میں انجام دیا تھا۔ جب اس کی اسلامک کلچر میں طباعت کی نوبت آئی ، اس وقت بلوچ صاحب امریکہ میں تھے ۔ ڈاکٹر عبدالمعید خاں (۱۹۱۰ء ۔ ۱۹۸۳ء) کی درخواست پر الاستاذ نے اس کے پروف پڑھے اور کچھ ترمیمات بھی کیے ۔ یہ دیوان ، مضمون کی شکل میں اسلامک کلچر کے جولائی ۱۹۳۹ء کے شمارے میں چھپا۔ کوئی پندرہ سال کے بعد یہ کتابی شکل میں لجنۃ احیاء الادب السندی کے زیر اہتمام ۱۹۶۲ء میں کراچی میں شایع ہوا جس پر الاستاذ کا مختصر لیکن قیمتی مقدّمہ شامل ہے ۔

ان کا دوسرا علمی کام علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی کی تصنیف " فتح نامۂ سند " معروف بہ ، " چچ نامہ " کی دوبارہ تصحیح و تہذیب و تحشیہ ہے ۔ چچ نامہ ، عربوں کے حملہ سندھ (۷۱۲۔۷۱۵ء) کی ایک مستند اور مفصل تاریخ ہے ۔ جو معلومات ایک نامعلوم عرب مصنف نے المدائنی (۱۳۵ ۔ ۲۲۵ھ) کی تصانیف اور سندھ کے مقامی خبراء سے حاصل کر کے اس میں جمع کیے گئے ہیں وہ اب تک کی معلوم شدہ کتب تاریخ میں نہیں ملتے۔ المدائنی کی وہ تصانیف ظاہراً ضائع ہوچکی ہیں، اس لیے چچ نامہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔

علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی نے اس عربی کتاب کا (جو اس وقت مفقود ہے) ۶۱۳ ہجری کے لگ بھگ فارسی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ (م ۱۹۵۸ء) نے اسے پانچ قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا جسے مجلس مخطوطات فارسی حیدرآباد نے لطیفی پریس دہلی سے ۱۹۳۹ء میں چھپوا کر شایع کیا۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا موضوع " سندھ عربوں کے تحت " تھا، اپنی

ریسرچ کے دوران جب انھوں نے یہ کتاب دیکھی تو اس کی اہمیت کی بنا پر ان کا ارادہ اسے انگریزی میں منتقل کرنے اور کتاب کے جغرافیائی اور تاریخی مسائل پر مفصل تعلیقات لکھنے کا ہوا۔ بعد کو انھیں اس اہم تاریخ کے دو نئے قلمی نسخوں کا علم ہوا جو برٹش میوزیم اور کتب خانہ خدا بخش کے نسخوں کی ام (اصل) ہیں اور اب علی الترتیب کتب خانۂ عالیہ رام پور (اب رضا لائبریری رام پور) اور کتب خانۂ امرائے تالپور (حیدرآباد سندھ) میں محفوظ ہیں تو انھیں اس کے ایک نئے اڈیشن کی ضرورت کا احساس ہوا۔

ڈکٹر نبی بخش بلوچ نے چچ نامے کے اپنے اڈیشن کی تمہید میں لکھا ہے کہ اس کا ابتدائی اور بنیادی کام ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں شروع ہوا جو ۱۹۵۴ء تک جاری رہا۔ حواشی و تعلیقات کا بیشتر حصہ چچ نامے کے سندھی اور اردو ترجموں میں استعمال ہوا۔ یہ دونوں ترجمے سندھی ادبی بورڈ (حیدرآباد) سے علی الترتیب ۱۹۵۴ء اور ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئے۔ بعد کو فارسی متن کی ترتیب و تصحیح، اختلاف نسخ کے اندراجات اور حواشی و تعلیقات میں ترمیم و اضافے ہوتے رہے۔ اس کام کے دوران انھیں استاذ گرامی سے مدد ملتی رہی۔ یہ اڈیشن، ادارۂ تاریخ و ثقافت و تمدن اسلامی، جامعۂ اسلامیہ، اسلام آباد سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا وہ چچ نامے کے عربی اور انگریزی ترجمے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ خدا انھیں اس کام کی تکمیل کی توفیق دے۔

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بلوچ صاحب نے اس کتاب کی تصحیح اور تحشیے کا کام سخت محنت، پوری توجہ اور نہایت دیدہ ریزی سے کیا ہے۔ الاستاذ عبدالعزیز المیمنی کے ایک ممتاز شاگرد سے ایسے ہی اعلیٰ معیار کے کام کی توقع تھی۔

اچھی کتابوں کی خوشبو کس طرح دور دور پہنچتی ہے اور روح کو بالیدگی بخشتی ہے۔ چچ نامے کا یہ اڈیشن ۱۹۸۳ء میں اسلام آباد پاکستان میں چھپا، مارچ ۱۹۸۴ء میں انھوں نے کتاب کی اہمیت کے پیش نظر فارسی زبان و ادب کے مشہور محقق پروفیسر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کو بطور ارمغان علی گڑھ بھیجی، اور اب دسمبر ۱۹۹۷ء میں ان سے مستعار منگوائی ہوئی یہ کتاب میری میز پر رکھی ہوئی مشام جاں کو معطر کر رہی ہے۔

مختار الدین احمد
۶ دسمبر ۱۹۹۷ء

"ناظمہ منزل" ۴-۲۸۶، امیر نشاں روڈ
علی گڑھ - ۲۰۲۰۰۲

(صفحہ ۱۷۵ کا بقیہ)

(۲۳) سندھی لوک ادب : جمع و ترتیب و تدوین ۔ ۴۲ جلدوں میں

(۲۴) Advent of Islam in Indonesia (Monograph)

(۲۵) Sindh: Studies in History Vol.1, pp.373.

(۲۶) Lands of Pakistan, Perspectives, Historical & Cultural pp. 301.

(۲۷) Development of Music in Sindh.

(۲۸) The Book of Knowledge of Ingenious Mechanical Devices:
English translation of Al-Jazari's book, pp.285

(۲۹) Some Aspects of Music Inheritance of Iran, Pakistan and Turkey

(۳۰) Education in Sindh Before the British Conquest and the Educational
Policies of the British government

(۳۱) 100 Great Books of Islamic Thought, Culture and Civilization:
A Brief Statement of the Project, pp. 44

(۳۲) Great Books of Islamic Civilization, pp. 221

چند اہم محققانہ مضامین :-

1. In Search of the Indus Culture Sites in Sindh.
2. A Farman of Abul Baqa.
3. The Concept & Criteria Under lined in the Holy Quran for the "Book" that Guides & Educates
4. Early Advent and Consolidation of Islam in the Lands of Pakistan.
5. Beruni and His Experiment at Nandana.
6. Maulana Jalaluddin Rumi and Shah Abdul Latif of Sindh.
7. Measurement of Space & Time in the Lower Indus Valley of Sindh.

(۸) شرف نامہ

(۹) عربی ادب : اشارات و تصریحات استاذ الیمنی

(۱۰) مقدمۂ تاریخ زبان اردو تصنیف عین الحق فرید کوٹی

(۱۱) سندھی زبان و ادب

(۱۲) مقالہ بر منصورہ (اردو انسائیکلوپیڈیا)

ذخیرۂ مخطوطات

قلمی کتابوں کی فہرست مرتبہ خضر نوشاہی ۔ صفحات ۱۳۹ ۔ غیر مطبوعہ

منہاجِ تحقیق

نگینہ پروین:

واپسی ترجمہ تکنیک

بین الثقافتی ریسرچ میں ترجمے کا ایک طریقہ کار

کسی قوم نے اس وقت تک ترقی نہیں کی جب تک سائنسی علوم کو قومی زبان میں منتقل نہیں کیا۔ "اردو زبان میں ترجمے کے مسائل روداد سیمینار" میں مقبول احمد خاں (۱۹۸۶) لکھتے ہیں کہ " انسان جس قدر آسانی سے اپنی زبان میں افہام و تفہیم کرسکتا ہے دوسری زبان میں اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ضروری ہے کہ ان علوم کو اپنی زبان میں ڈھال دیا جائے تاکہ عام سطح کی ذہانت رکھنے والا شخص بھی سمجھ سکے اور قومی ترقی میں حصہ لے سکے۔ اسی کتاب میں مظفرؔ علی سیّد اپنے مقالے کی ابتداء گوئٹے کے قول سے کرتے ہیں۔

" جملہ امور عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ بھی شامل ہے"۔

گوئٹے کا یہ قول ترجمے کی اہمیت کو بڑی اچھی طرح اجاگر کرتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد ترجمے میں خیال اور زبان دونوں کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی کا قول نقل کرتے ہیں کہ " ترجمے کی اہمیت یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کے ذریعے نئے خیالات زبان میں داخل ہوتے ہیں اور دوسری طرف زبان کی قوت اظہار میں نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں" (صفحہ ۲۵)۔

"فن ترجمہ کے اصولی مباحث" پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد لکھتے ہیں کہ "

> " دراصل ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری اقوام کے احوال ہم پر کھلتے ہیں۔ لیکن جدید عہد میں یہ ایک اہم انسانی ضرورت بھی ہے جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنے، اسے دیگر علوم سے واقف کرانے اور جدید ٹیکنالوجی کا ساتھ دینے کے لیے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت ہے"۔

ترجمے کے اقسام:

ایک ماہر لسانیات کاساگرانڈ (Casagrande,1954)نے ترجمے کی چار اقسام کا ذکر کیا ہے۔

1- عام بول چال کی زبان میں ترجمہ: (Pragmatic Translation)

اس طریقے کے تحت کیے جانے والے ترجمے میں محض اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ مطلوبہ زبان میں منتقل ہونے والی معلومات عام بول چال کی زبان میں ہو مگر ساتھ ساتھ مفہوم کی صحت کا بھی خیال رکھا جائے۔

2- جمالیاتی شاعرانہ ترجمہ: (Aesthetic -Poetic Translation)

جمالیاتی شاعرانہ ترجمے میں ترجمان قارئین کے لیے مطلوبہ مواد میں وہی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اصل میں موجود ہے

3- نسلی جغرافیائی ترجمہ: (Ethnographic Translation)

نسلی جغرافیائی ترجمے میں اصل اور مطلوبہ زبان کے ثقافتی سیاق و سباق کی تشریح پر زور دیتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ترجمان دونوں ثقافتوں کے ساتھ گہری مانوسیت رکھتا ہو اور اسے ہر دو زبان میں مہارت بھی حاصل ہو۔ جغرافیائی مواد کے ترجمے میں در پیش اہم مسئلہ یہ ہوسکتا ہے۔ کہ یہ مطلوبہ زبان کے بالکل مساوی نہ ہو۔

4- لسانی ترجمہ: (Linguistic Translation)

لسانی ترجمے میں دوسری زبان کی لسانیات کے جزو ترکیبی کے مساوی معنی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لسانی ترجمے کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ محض لسانی معنویت کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ لسانی ساخت اور گرامر کے اعتبار سے بھی مساوی ہو۔

اس مقالے کا مقصد " واپسی ترجمہ تکنیک " کو اردو داں حلقوں میں متعارف کرانے کی ایک کوشش ہے۔

دوئم۔ بین الثقافتی ریسرچ میں دلچسپی رکھنے والے سوشل سائنسداں بشمول ماہرین نفسیات جنہیں ترجمے کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ ایک کوشش ہے تاکہ یہ حضرات ان

مسائل پر قابو پاسکیں۔

بین الشقافتی ریسرچ میں ترجمے کے مسائل :

قبل اس کے کہ " واپسی ترجمہ تکنیک " پر بحث کی جائے ، بین الشقافتی نفسیات کے حوالے سے ان مسائل پر روشنی ڈالی جائے جو ماہر نفسیات کو دوران ترجمہ پیش آتی ہیں۔ ان مسائل کے احوال درج ذیل ہیں :۔

۱۔ ہر زبان کی مخصوص ساخت اور ترکیب ہے۔ کسی زبان میں مختلف اقسام کے رشتوں اور ناقوں کی وضاحت کے لیے مختلف اصطلاحات اور الفاظ کا استعمال ہوتا ہے اور کسی زبان میں ایک ہی لفظ یا اصطلاح کو کئی طرح کے رشتوں کے لیے یکساں طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ، اردو زبان میں چچا زاد ، ماموں زاد ، تایا زاد اور خالہ زاد بھائی وغیرہ کی اصطلاحات مختلف رشتوں کی وضاحت کے لیے رائج ہیں۔ اس اعتبار سے اردو میں بہت زیادہ وسعت ہے۔ جب کہ انگریزی زبان میں صرف ایک لفظ " Cousin " مذکورۂ بالا تمام رشتوں کے لیے یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے ، چنانچہ ایسے اردو الفاظ کا ترجمہ انگریزی میں ممکن نہیں۔ اسی طرح انگریزی میں بھی کچھ ایسے الفاظ ہیں۔ جن کا اردو میں ترجمہ مشکل ہے۔ مثلاً

" I love Sindh " کا اردو ادب کے لحاظ سے ترجمہ ہوگا کہ " مجھے سندھ پسند ہے " جب کہ ترجمے میں " I love " کا اصل مفہوم واضح نہیں ہوسکا بلکہ "I like Sindh" سے مفہوم واضح ہوا۔

۲۔ جب ماہر نفسیات مختلف ثقافتوں میں تحقیق کے دوران وہاں کے علاقائی لوگوں کو سوالنامہ دیتا ہے تو وہ افراد جوابات اپنی علاقائی زبان میں دیں گے۔ ان جوابات کا انگریزی ترجمہ ایک مشکل امر ہے۔ کیوں کہ مختلف زبانوں کے اپنے مخصوص الفاظ اور تصورات ہیں اور کسی دو زبانوں کے درمیانی تصورات مماثلت یعنی (Conceptual equivalence)[۳] قائم ہونا بہت مشکل امر ہے۔ سیکرسٹ ، فے اور زیدی (Sechrest, Fay and Zaidy 1972) نے ایک اچھی مثال دی ہے ، مثلاً " میں ایک گل فروش ہوں انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا " I am a florist " یورپ میں گل فروش کا تصور مؤنث جنس سے وابستہ ہے جب کہ پاکستان میں یہ تصور مذکر جنس سے وابستہ ہے

۳۔ مختلف ثقافتوں میں مختلف معاشرتی مراتب کے لیے مختلف تصورات اور الفاظ ہیں۔ جن کا ترجمہ آسان نہیں ہے۔ مثلاً ، انگلینڈ میں ایک " استاد " کا معاشرتی مرتبہ اور وقار بہت بلند ہے۔ جس کی مثال بہت سے ممالک میں نہیں ملتی۔ پاکستانی معاشرے میں بھی اسکول ، کالج ،

یونیورسٹی اور مدرسہ سے وابستہ اساتذہ کے مختلف معاشرتی اور اقتصادی مراتب ہیں جس کی وجہ سے بین الثقافتی ماہر نفسیات کو ترجمے میں مشکل ہوگی۔

۴۔ ترجمے کے لیے عموماً لغت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن لغت میں دی گئی زبان عام بول چال میں استعمال ہونے والی زبان نہیں ہوتی۔ لہذا اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے ترجمان کی مدد لی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ بھی چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اس لیے وہ بھی ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو معیاری اور ادبی نوعیت کی ہوتی ہے۔ لہذا دوران ترجمہ ہم معنی الفاظ تلاش کرنا جو عام فہم بھی ہوں ایک مشکل امر ہے۔

۵۔ ہر ثقافت میں گفتگو کا ایک اہم حصہ "محاورات" پر مشتمل ہے۔ دو مختلف زبانوں میں بالکل ہم معنی اور یکساں مفہوم رکھنے والے محاورات کا استعمال قدرے ناممکن ہے۔

(6) قواعد حرف و نحو (Grammar) کے لحاظ سے بھی دو مختلف زبانیں کبھی بالکل یکساں نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے یہ پہلو بھی ترجمہ کرتے وقت بڑی مشکل پیدا کرتا ہے

۷۔ مختلف ثقافتوں میں مختلف اشیاء یا لوگوں کے لیے جو احساسات، جذبات اور تجربات وابستہ ہیں ان کے اظہار کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ دو مختلف ثقافتوں میں مساوی نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے ترجمے کی صورت میں احساسات و جذبات میں وہ شدت اور تاثر باقی نہیں رہتا جو کہ اصل زبان میں ہوتا ہے۔

۸۔ "اردو زبان میں ترجمے کے مسائل" (۱۹۸۶) میں بلال احمد زبیری لکھتے ہیں کہ،

> "جملہ انسانی علوم جو کہ انسانی ذہن اور اس کے اعمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مسائل کا تجزیہ کسی نہ کسی قسم کے فلسفے کا ضرور حامل ہوتا ہے اس لیے نفسیات سمیت تمام سماجی علوم کے ترجمے میں، سائنسی علوم کی طرح اصطلاحیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں بلکہ ہر عبارت کے مترادف اپنی زبان میں پیش کرنے کے لیے ایک ایک لفظ کا مفہوم ادا کرنا ہوتا ہے جو کہ کافی دقت طلب مرحلہ ہے"۔

ترجمے کے مسائل کے ذکر کے بعد ماہر نفسیات نے ترجمے کے مختلف طریقے بتائے ہیں۔ ترجمے کے مختلف طریقوں کا ذکر درج ذیل ہے۔

براہ راست ترجمہ تکنیک: (Direct translation technique)

بین الثقافتی تحقیق کے آغاز میں ترجمے کے لیے اس طریقے کو استعمال میں لایا گیا۔

میں دو زبانوں کے ماہر ترجمان " (Bi-lingual translation) " شامل ہوتے ہیں۔ یہ ترجمان اصل زبان (Source language) اور مطلوبہ زبان (Target language) دونوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک زبان سے دوسری زبان میں بہتر سے بہتر ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں ایک محقق بھی شامل ہوتا ہے۔ جو ترجمے کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے اور اس کی خامیاں دور کر کے اسے آخری شکل دیتا ہے۔

مجلسی طریقۂ کار : (Commitee approvch)

مجلسی طریقۂ کار میں تین، چار یا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ ماہر زبان شامل ہوتے ہیں، جو کہ آپس میں مل کر اصل زبان مثلاً، انگریزی سے کسی مطلوبہ زبان مثلاً، اردو یا سندھی میں سوالنامے، ہدایات یا اسی قسم کے تحقیقی مواد کا ترجمہ کرتے ہیں۔

وارنر اور کیمپل (Warner and Campbell,1970) نے مذکورۂ بالا تکنیک کو ایک ناکافی اور نامکمل تکنیک قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں جو ماہر زبان اس تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے ترجمہ کرتے ہیں، ضروری نہیں کہ ان کو دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل ہو۔ اس کے علاوہ جس ثقافتی زبان میں وہ ترجمہ کرتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ اس کے " ثقافتی نمائندہ " (Cultural Representative) بھی ہوں۔ ایسی صورت میں وہ اس زبان سے واقف تو ہوتے ہیں، لیکن تصوراتی اور تجرباتی لحاظ سے اس کی وسعت اور گہرائی سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں یہ ترجمہ اتنا زیادہ قابل بھروسہ نہیں ہوتا۔

واپسی ترجمہ تکنیک : (Back translation tecnique)

یہاں برسلن (Brislin,1976, 1980) کا نام سرفہرست ہے۔ برسلن (Brislin,1970) نے ترجمے کے لیے " واپسی ترجمہ تکنیک " کی ابتدا، کی اور اس کو فروغ دیا جو کہ ترجمے کی دیگر اقسام سے واضح طور پر بہتر اور قابل بھروسہ ہے۔ اس طریقے کے تحت پہلے ایک یا ایک سے زائد ترجمان کسی مواد کا ترجمہ اصل زبان سے مطلوبہ زبان میں کرتے ہیں۔ مثلاً انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دوسرا ترجمان یا ترجمانوں کا گروہ پہلے سے کیے گئے ترجمے کا دوبارہ واپس اصل زبان میں کرتا ہے، مثلاً، اردو سے واپس انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا ہے ان دونوں مراحل کے بعد اصل انگریزی زبان اور ترجمہ کی گئی انگریزی زبان کے درمیان موازنہ

کیا جاتا ہے۔ جس سے دونوں میں فرق کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً، انگریزی میں ایک بیان ہے کہ،
" I get tense before examination " اس کا اردو میں ترجمہ ہوگا کہ، " مجھے امتحانوں سے قبل تناؤ ہوتا ہے "۔ اس جملے کا واپس انگریزی میں ترجمہ یہ ہوگا کہ،

"I get excited before examintion "

مذکورہ تکنیک کے تحت اصل بیان اور واپس ترجمہ کیے گئے بیان کے درمیان ایسا فرق ترجمانوں کو اس بات کی طرف مائل کرتا ہے کہ وہ اس طریقے سے بار بار ان بیانات کا ترجمہ کریں حتیٰ کہ ترجمہ کیے گئے آخری بیان کا مفہوم قابل اطمینان حد تک اصل بیان کے مفہوم کے قریب تر پہنچ جائے۔ حالانکہ اس طریقے کے تحت کیا گیا ترجمہ بڑی حد تک قابل بھروسہ ہوتا ہے۔ اور یہ طریقہ ترجمے کے سلسلے میں درپیش مسائل کو کسی حد تک حل کرتا ہے۔ لیکن اس طریقے کی بھی ایک خامی ہے وہ یہ کہ اس کے تحت اصل بیان اور واپس ترجمہ کیے گئے بیان میں جو فرق ہوتا ہے، اس کو دور کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس فرق کے ظاہر ہونے کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔

۱۔ اصل زبان کا جس مطلوبہ زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے، اس ترجمے پر اسی مطلوبہ زبان کی ثقافت اثرانداز ہوتی ہے مثلاً، جب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس پر ہماری ثقافت کا عکس پڑتا ہے۔ اس اردو ترجمے کو جب واپس انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں۔ تو لازماً اس پر بھی ہماری ثقافت کا جزوی طور پر عکس باقی رہتا ہے۔

۲۔ دوسرا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ابتداء میں جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا وہ ناقص ہوسکتا ہے یا جس ترجمان نے اردو میں سے واپس انگریزی میں ترجمہ کیا اس نے اردو الفاظ کے مساوی اور ہم معنی انگریزی الفاظ کا درست استعمال نہیں کیا۔

۳۔ تیسرا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ جو ترجمان ابتداء میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہیں وہی دوبارہ واپس اردو سے انگریزی میں ترجمہ نہیں کرتے بلکہ یہ کام دوسرے ترجمان انجام دیتے ہیں اور ترجمانوں کے ان دونوں افراد میں انگریزی الفاظ کو استعمال کرنے کی خاصیت اور عادت مختلف ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اصل مواد اور ترجمہ کیے گئے مواد میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔

برسلن (Brislin,1976) نے مذکورۂ بالا اسباب پر قابو پانے کے لیے مشورہ دیا کہ " واپسی ترجمہ تکنیک " کے تحت اصل مواد اور ترجمہ کیے گئے مواد کو مساوی اور ہم معنی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ابتدائی ترجمے اور واپسی ترجمے کا بار بار جائزہ لیا جائے اور ان کی خامیاں دور کر

کے ان کی اصلاح کی جائے جس کے لیے برسلن نے قبل آزمائش (Pre-testing) کے طریقے کے استعمال پر زور دیا جس میں محقق کا شامل ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے خیال میں اگر اس طرح دونوں ترجموں کا محتاط طریقے سے جائزہ لیا جائے اور غلطیاں دور کر کے اس کی تصحیح کی جائے تو اس کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں اور بالآخر ترجمان ایسا ترجمہ کرسکتا ہے جو کہ اصل مواد کے مساوی ہوتا ہے۔ ماہرین کے خیال میں واپسی ترجمہ تکنیک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ یہ ایک مقطر (Filter) کی طرح عمل کرتا ہے جس میں سے غیر مساوی الفاظ آسانی سے نہیں گذر سکتے۔

وارنر اور کیمپل (Warner and Campbell,1970) نے "واپسی ترجمہ تکنیک" کے ضمن میں "مرکز سے دوری" (Decentering) کا تصوّر دیا۔ جس سے مراد یہ ہے کہ تحقیق میں استعمال کیے جانے والے مواد کو کسی ایک ثقافت یا زبان تک مرکوز اور محدود نہیں ہونا چاہیے، بلکہ "واپسی ترجمہ تکنیک" کے تحت ہم کسی مواد کو اپنی زبان میں منتقل کر رہے ہیں تو بالکل لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی بجائے اپنی ثقافت کی اصل روح و رنگ کو بھی شامل ترجمہ کریں۔ ثقیل اور کتابی اصطلاحات کی بجائے عام بول چال میں رائج اصطلاحات کا استعمال کریں جو ثقافتی مزاج کی حامل ہوں ۔ مرکز سے دوری کے تصوّر کے تحت ترجمہ تصنّع سے پاک اور ثقافت کی اصل فطرت اور خاصیت کے عین مطابق ہوگا۔ ترجمے میں ثقافتی عناصر اس طرح داخل کیے جائیں کہ اس میں روانی اور سادگی پیدا ہو اور وہ بآسانی سمجھ میں آسکے۔ اس طرح ادبی نوعیّت کا ثقیل ترجمہ کرنے کی بجائے آزاد ترجمہ کیا جائے جو کہ عام فہم ہو ۔ مثلاً، اردو کی اصطلاح "اونچی ناک" (جو عموماً غرور کی طرف اشارہ کرتی ہے) کا انگریزی میں لفظ بہ لفظ ترجمہ "Nose high" ہوگا۔ لیکن "مرکز سے دوری" کے تصوّر کے موجب اس کا ترجمہ "Pride" ہوگا جو کہ آزاد ترجمہ ہے ۔ اس طرح تحقیقی مواد کو ایسی صورت میں ڈھالا جاتا ہے جو کہ مخصوص ثقافت اور زبان کے بارے میں مکمل اور عام فہم معلومات فراہم کرنے کی اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے ۔

برسلن (Brislin,1980) نے واپسی ترجمہ تکنیک کو بہتر قرار دیتے ہوئے بتایا کہ، واپسی ترجمے کے طریقے میں "مرکز سے دوری کے تصوّر" کے ساتھ سلسلہ عبارت کی بھی اہمیت ہے۔

سلسلۂ عبارت (Context) کی اہمیت :

بہت سے ماہرین کی رائے ہے کہ مشکل اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے عبارت کا باقاعدہ سلسلہ فراہم کرنے کا اصول اختیار کرنا چاہیے۔ وارنر اور کیمپل (Werner and Campbell, 1970) نے

بتایا ہے کہ کسی اصطلاح یا لفظ کو واحد لفظ کی صورت میں واضح کرنا مشکل ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس کو سلسلۂ عبارت سے منسلک کر کے واضح کرنا چاہیے۔ کسی اصطلاح کے معنی و مفہوم کی گہرائی کا تعین اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ باقاعدہ سلسلۂ عبارت کے اندر موجود ہو۔ لہٰذا ترجمے میں بھی اسی اصول کو اختیار کرنا چاہیے۔

برسلن (Brislin,1976) نے بتایا کہ "ترجمہ بہتر اور واضح اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس کا ہر لفظ ایک جملے کا حصہ ہو اور زیادہ بہتر اس وقت ہوسکتا ہے جب اس کا ہر جملہ ایک پیرا گراف کا حصہ ہو۔"

مزید یہ کہ ایک لفظ کو اس وقت سمجھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے جب وہ کسی جملے کے اندر واقع ہونے کی بجائے، واحد لفظ کی صورت میں ہوتا ہے

• برسلن اور رفقاء (Brislin and Associates) نے ترجمے کو آسان بنانے کے لیے چند اصول اختیار کرنے کی تجویز پیش کی ہے تاکہ ترجمہ بآسانی ہوسکے اور ترجمان، ترجمے میں درپیش مسائل پر قابو پاسکے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ مختصر اور سادہ جملوں کا استعمال کیا جائے جو ۱۶ سے کم الفاظ پر مشتمل ہوں۔

۲۔ مفعول (Passive) سے زیادہ فعال (Active) الفاظ کا استعمال کیا جائے۔

۳۔ ضمیر (Pronoun) کے بجائے اسم (Nouns) کا استعمال کیا جائے۔

۴۔ استعارہ (Metaphor) اور محاوروں کے استعمال سے گریز کریں۔ کیوں کہ ایسے الفاظ اور فقرے مطلوبہ زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد اصل زبان کے بہت کم مساوی ہوتے ہیں

۵۔ احتمالی حالت (Subjunctive mood) سے گریز کریں مثلاً ہوسکتا تھا، ہوسکے گا وغیرہ۔

۶۔ ایسے جملوں کو استعمال کریں جو سلسلۂ عبارت کے لیے کلیدی خیالات مہیا کریں۔ غیر ضروری طور پر دہرائے جانے والے الفاظ یا فقروں کو ہر بار نئے انداز میں لکھیں۔

۷۔ "کب" اور "کہاں" بتانے والے حرف جار (Preposition) اور متعلق فعل (Adverb) کے استعمال سے گریز کریں

۸۔ جہاں تک ممکن ہو حالت اضافی (Possessive form) سے گریز کریں۔

۹۔ عام اصطلاحات کی بجائے خصوصی اصطلاحات کا استعمال کریں۔ (مثلاً، عام اصطلاح، پالتو یا گھریلو جانور کی بجائے، جانور کا مخصوص نام جیسے گائے، مرغ، بکری وغیرہ لکھیں)

۱۰۔ کسی چیز یا واقعے کے لیے ابہام پیدا کرنے والے الفاظ کے استعمال سے گریز کریں ۔ مثلاً ، امکان ہے ، اکثر ، عموماً وغیرہ)

۱۱۔ جتنا ممکن ہوسکے ، ترجمان معروف اور جانے پہچانے الفاظ کا استعمال کریں۔

۱۲۔ دو مختلف افعال (Verbs) پر مشتمل جملے جو دو مختلف اعمال کی نشاندہی کرتے ہوں ان کا استعمال ترک کریں۔

اگر ترجمہ ہونے سے قبل مواد کو تحریر کرتے وقت مصنّف مذکورہ بالا تمام اصول و تدابیر پر عمل کرے تو "واپسی تکنیک" کے ذریعے "مرکز سے دوری کے تصور" کے ساتھ مواد کا ترجمہ کرنے کا مرحلہ ترجمان کے لیے بہت آسان ہوجائے گا۔ اس طرح ترجمہ کی گئی عبارت اکثریت کے لیے قابل فہم ، قابل قبول اور قابل استعمال ہوگی۔ جس کے ذریعے اکثریت کا ردِعمل معلوم کر کے زیادہ درست اور قابل بھروسہ تحقیقی نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

حوالہ جات

اردو زبان میں ترجمے کے مسائل : روداد سیمینار (مرتبہ : اعجاز راہی) مقتدرہ قومی زبان ، اسلام آباد ۱۹۸۶ء

Brislin, R. W.: Back-translation for Cross-cultural Research, Journal of Cross-cultural Psychology, 1970,1, 185-216.

Brislin, R. W.: Translation, Research and its Applications An Introduction. In R. Brislin (Ed.). Translations Applications and Research, New York, Wiley/Halsted, 1976.

Brislin, R. W.: Translation and Content Analysis of Oral and Written Materials. In H. C. Triandis, & J. W. Berry (Eds.) Handbook of Cross-cultural Psychology (Vol. 2): Methodology. Boston: Allyn & Bacon, 1980.

Brislin, R., Lonner, W., & Thorndike, R.: Cross-cultural Research Methods. New York: Wiley, 1973.

Casagrande, J.: The ends of Translation. International Journal of American linguistcs, 1954, 20, 335-340 (Cited in: R. Bontempo. Translation fidelity of psychological scales. Journal of Cross-cultural Psychology, 1993, 24, 149-166.

Sechrest, L., Fay, T.L., & Zaidi, S. M. H.: Problems of Translation in Cross-cultural research. Journal of Cross-cultural Psychology, 1972. 3, 41-56.

Werner, O., & Campbell, D.: Translating, Work through interpreters, and the Problem of Decentering. In R. Naroll & R. Cohen (Eds.). A Handbook of Method in Cultural Anthropology, New York: Natural History Press 1970.

زاہد منیر عامر:

تدوین ـــــ معیاری اسلوب کی تلاش

زندہ قومیں ، تہذیبی اور تمدنی عرفان کے لیے قدیم علمی ذخائر کی طرف رجوع کیا کرتی ہیں۔ لیکن ہم بحیثیت مجموعی اپنے علمی ذخائر سے بے نیاز ، نا آفریدہ جنتوں کے خیال میں گم ہیں۔ دہانۂ آتش فشاں پہ بیٹھ رہنے کی اس کیفیت کا تجزیہ کیا جائے تو اپنے قدیم علمی و ادبی ذخائر کی تلاش و تدوین (تحقیقِ مخطوطات) کے باب میں ہماری بے اعتباری کے چند اسباب فوری طور پر ہویدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ متون کی تدوین ، عام تحقیقات کی نسبت صبر آزما ، محنت طلب اور دشوار گزار گھاٹی ہے اور ایک سہل پسند اور آسان کوش معاشرے میں دشوار گزار کاموں سے اجتناب عام ہوتا ہے۔

۲۔ موجود متون عام طور پر دسترس سے دور ہیں۔ کتب خانوں کی فضا ہمت شکن ہے مخطوطات کی جامع اور راہ نما فہرستیں دستیاب نہیں ہیں۔

۳۔ متون کی حالت الّا ماشاء اللہ بہت سقیم ہے۔ قاضی عبدالودود نے البیرونی کے ہندوستانی متون کی حالت کے سقیم ہونے کی شکایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ زندہ ہوتا اور اسے متون کی موجودہ حالت پر اظہار رائے کے لیے کہا جاتا تو ہمیں ترقیِ معکوس کی داد دیتا۔

تاہم - دیا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے "، اس صورت حال کے علی الرغم جو کوہ کن ، کوہ کندن کے سفر پر نکلتے ہیں یہاں ان کے سفر کے راہ نما اصولوں سے بحث ہے۔

مخطوطات کے کسی بھی محقق کے لیے سب سے پہلا سوال مخطوطے کے انتخاب کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات زیرِ تحقیق موضوع پر ایک ہی مخطوط دستیاب ہوتا ہے اور بعض اوقات اس سے زائد ... ایک ہی مخطوطے یعنی منحصر بہ فرد نسخے کی صورت میں کام کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور ایک سے زائد نسخوں کی دستیابی اس نوعیت کو یکسر تبدیل کر دیتی ہے ، مختلف محققین نے اپنی اپنی دانست میں مخطوطے کے انتخاب کے قواعد سے بحث کی ہے۔ ان تمام خیالات کو اگر مختصر کیا جائے تو جملہ افکار ، روشِ کار کے دو اسالیب میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ مصنف کے دستخطی نسخے کی عدم موجودگی میں دستیاب نسخوں میں زمانی اعتبار سے آخری

نسخے کا انتخاب کیا جائے۔ دوّم اقدم قلمی نسخہ جو مصنّف یا اس کے عہد سے قریب ترین ہوتا ہے۔

گزارش یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں میں تعیین صداقت کا سفر چند در چند رکاوٹوں سے مجرا رہتا ہے۔ زمانی اعتبار سے آخری نسخہ ضروری نہیں کہ صحیح ترین نسخہ بھی ہو۔ دوّم اقدم قلمی نسخہ ان اضافوں، ترامیم اور اصلاحوں سے محروم ہوتا ہے جو بعض اوقات خود مصنّف نے کی ہوتی ہیں اور یوں بھی زمانی قدامت، قربِ مصنّف کی لازمی دلیل بھی نہیں ہے جیسا کہ ڈاکٹر کاترے کے شجرہ بنانے والے طریقے سے معلوم ہوتا ہے "یہ ضروری نہیں کہ قدیم ترین نسخہ مصنّف کے قریب ترین ہو اور اس باعث صحیح ترین بھی ہو۔" (۱)

اس الجھن کو رفع کرنے کے لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ زمانی قدامت یا جدّت کو معیار انتخاب نہ بنایا جائے بلکہ موجود نسخوں میں سے کامل تر اور صحیح تر نسخے کا انتخاب کر لیا جائے اور پھر اس کی مدد سے متن کی تصحیح کی جائے۔ ہماری رائے میں اس کامل تر نسخے کو معروف معنوں میں "نسخۂ اساسی" بنانا بھی بہت مفید نہیں ہو سکتا، جس قدر کہ اس نسخے کو بنیاد بنا کر دیگر قراءتوں کی مدد سے ایک معیاری متن کی تیاری مفید ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں مقصود کسی ایک مخطوطے کا تحفظ نہیں بلکہ معیاری متن (Standard text) کی تیاری ہو گا۔ تاہم دیگر نسخوں کے اختلافات جہاں تہاں "نسخۂ اساسی" کے متن میں درج ہوں، پاورق میں ان کی صراحت کی جاتی رہے۔ اس طرح ایک حد تک نسخۂ اساسی کی شکل قائم بھی رہ سکتی ہے۔ تاہم اس کے تحفظ کا بہت زیادہ خیال بھی ایک طرح کی شدّت ہے جیسے ڈاکٹر سیّد حسن نے دیوان رکن صائن ہروی میں باوجود ایک متوازن راستہ اختیار کرنے کے نسخۂ مادر (copy text) کو تا بحد امکان برقرار رکھنے کی کوشش روا رکھی ہے۔ (۲)

مخطوطے کے تحفظ کی راہ البتہ منحصر بہ فرد نسخوں میں نکلتی ہے جن میں موازنے کے لیے کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں ہوتا، وہاں پیش نظر مخطوطے کی ترتیب اور تقسیم کو علیٰ حالہٖ قائم رہنا چاہیے۔ چونکہ یہاں اصول بدل جاتا ہے اور مقصود معیاری متن کی تیاری نہیں بلکہ ایک مخطوطے کی تدوین ہوتا ہے لہذا متن میں صحیح ترین لفظ کے اندراج کی خواہش بھی مفید نہیں رہتی۔ البتہ یہاں ایک امر قابل توجہ ہے کہ اجنبی اور بے معنیٰ الفاظ کی جگہ کیا درج ہو گا؟ یہ حقیقت تو بہر حال واضح رہنی چاہیے کہ ہر اجنبی لفظ لازماً بے معنیٰ نہیں ہوتا۔ اجنبی اور بے معنیٰ الفاظ کی جگہ مصنّف نے کیا لکھا ہو گا؟ مرتّب کی محنت و تدقیق کا میدان ہے اور یہاں قیاس سے کام لینا ہو گا۔ ذرا ٹھہریں، قیاسی تصحیح کی ترکیب ہمارے ہاں بہت معروف ہے

۔آگے بڑھنے سے پہلے اس ترکیب پر بھی غور کرلیجیے۔ تصحیح، تنقید کا نتیجہ ہوتی ہے جبکہ مرتب متن کا منصب تنقید نہیں تحقیق متن ہوتا ہے (اگرچہ تحقیق متن میں اس کی تنقیدی صلاحیت ضرور بروئے کار آتی ہے) اس لیے ہمیں اس ترکیب کی بجائے اور ترکیب مثلاً قیاسی تکمیل یا قیاسی اضافہ یا کچھ اور استعمال میں لانی چاہیے۔

تحقیق متن کا مقصود متن کو زیادہ قابل مطالعہ بنانا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو متن کی خواندگی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے، تاہم جہاں تک خواندگی کی تمام مساعی ناکام ہوجائیں وہاں ہمیں تحقیق متن کے قدامت پسند مکتب فکر کی رائے سے اختلاف کرنا ہوگا کہ "مشکوک متن مشکوک تصحیح سے بہتر ہے" کیونکہ زمانوں کی گرد تلے دبے ہوئے متون کی تکمیل و تصحیح سو فیصد یقینی تو نہیں ہو سکتی البتہ مصنف کے مزاج، اس کے عہد اور متن زیر تحقیق کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے غور و تدبر کے ساتھ جو لفظ ہو اسے بہر حال مشکوک متن پر فائق سمجھنا چاہیے۔ تدوین متن کی بعض اچھی مثالیں اسی روش کا نمونہ پیش کرتی ہیں مثلاً احمد علی خاں یکتا کی دستور الفصاحت جسے مرتب کرتے ہوئے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے "متن میں جو الفاظ رہ گئے تھے انھیں اپنی طرف سے پورا کیا ہے، جہاں کوئی لفظ بڑھانا پڑا ہے وہاں اضافے کو بریکٹ میں لکھا ہے" (۳)

البتہ اس اضافے کے لیے متن کا یقینی طور پر ناقص ہونا ضروری ہے اور یہ اضافہ متن میں ہونا چاہیے نہ کہ پاورق میں۔ ہاں غلط متن کو پاورق میں محفوظ کر دینا چاہیے اور (R.W.CHAPMAN) کی یہ بات ہمیشہ مدوّن کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ "قیاسی تصحیح" مدوّن کا پہلا نہیں آخری فرض ہے۔ (۴)

ایسے مقامات جہاں مُرتّب کا قیاس بھی کام نہ دے وہاں مناسب وضاحت کے بعد خلا بھی چھوڑے جا سکتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے واحد خطی نسخے کی تدوین میں کیا ہے۔ ۵

بعض بزرگوں کے نزدیک متن میں خلا کا رہ جانا تدوین کا بڑا عیب ہے، جب کہ ہمارے خیال میں تدوین کا عمل ایک فرد پر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ زمانہ اسے کروٹ دیتا ہوا آگے بڑھاتا ہے۔ ہوسکتا ہے آج ایک مرتب کو جو لفظ نہیں سوجھ سکا کل اس کا کوئی قاری اسے دریافت کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ اس خیال کے تحت اس نا مانوس یا نا معلوم لفظ کو

پاورق میں درج کر دینا چاہیے ..... کار دنیا کسی تمام نہ کرد

متون میں در آنے والے تصرّفات کا ایک بہت بڑا سبب املائی پیچیدگیاں ہیں۔ اردو میں بائے فارسی، جیم فارسی، زائے فارسی، کاف فارسی ایک زمانے تک ب ج ز اور ک کی شکلوں ہی میں لکھے جاتے رہے اور یوں بھی ہماری زبانوں کا املائی نظام کچھ ایسا سادہ نہیں ہے اس لیے قدیم متون کی تدوین تصرّفات کا شکار ہوتی رہی ہے۔ علاوہ ازیں عقیدتوں اور بے احتیاطیوں کے شاخسانے اس پر مستزاد ہیں جنھوں نے یوسف زلیخا کو فردوسی، قصۂ چہار درویش اور خالق باری کو امیر خسرو، اور مظہر العجائب اور حیدر نامہ کو عطّار کی تصانیف قرار دینے میں تامل نہیں کیا۔ حامد کی پگڑی محمود کے سر باندھنے کی یہ روش ایک طرف، متون کی داخلی ہیئت کذائی کا تو ذکر ہی کیا جس میں عمر خضر، ملک خضر میں، دامش آوردم بکف، دو لتش آوردم بکف میں، زلف سنبل، زلف سوسن میں، راہ خیال، راہ چناں .. بیان عزیزم، جام عزیزم میں بدلتی رہی ہے ..... (۶)

تدوین مخطوطات میں املا کے پیچ در پیچ مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے مشرق و مغرب کے محققین بالکل متضاد خیالات کے حامل ہیں۔ سر والٹر گریگ نے املا کے مسئلے کو دو الگ حصوں میں تقسیم کر کے انھیں Substantives (الفاظ اظہار یا مغز دار اجزاء) اور Accidentals (اضافیے/ہجے، اوقاف، لفظوں کی تقسیم اور حد بندی) کے نام دیے ہیں اور کہا ہے کہ Substantives یعنی مغز دار اجزاء (جن کا تعلق طریق اظہار یا تلفّظ سے ہو) انھیں قدیم صورت پر برقرار رکھا جائے جب کہ اضافیوں/اتفاقیوں (اردو میں صرف تین یعنی ہجے، اوقاف اور لفظوں کی حد بندی) میں زمانہ حاضر کے املا کے مطابق تبدیلی کر لی جائے۔ بیٹ سن اور دوسرے انگریز محققین بھی اس خیال سے بہت حد تک اتفاق کرتے ہیں (۷) جب کہ باورس کے خیال میں محققین اور عوام کے لیے الگ الگ ایڈیشن تیار کرنے چاہییں۔ محققین کے لیے تیار کیے گئے ایڈیشن کا املا قدیم اور عوامی ایڈیشن کا املا جدید ہونا چاہیے (۸)

ارباب اردو کے ہاں بھی اس موضوع پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بہت سے بزرگوں کے خیال میں قدیم املا کو برقرار رکھنا چاہیے (۹) ڈاکٹر گیان چند نے غالباً گریگ سے متاثر ہو کر قدیم املا کو فرسودہ املا اور فرسودہ تلفّظ کے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور فرسودہ املا کو تبدیل کر دینے کی ضرورت پر زور دیا ہے مثلاً اوس، فرسنک، خوشے، ساتھی کو بالترتیب اس، فرسنگ، خوشی اور ساتھی لکھا جائے، جب کہ ایسے مقامات جہاں فرسودہ املا فرسودہ تلفّظ کی

ترجمانی کرتا ہو اور جسے بدلنے سے مصنّف کا پیش کردہ تلفّظ بدل جانے کا اندیشہ ہو وہاں مخطوطے کا اصل املا برقرار رکھا جائے مثلاً کوں، سوں، کبھو، جد، تد، تلپھنا وغیرہ جنھیں جدید کر کے کو، سے، جب، تب، تڑپنا ہرگز نہ لکھا جائے (۱۰)

رشید حسن خاں اس باب میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ مصنّف کے مختارات املائی معلوم کرنے پر زور دیتے ہیں اور اگر مصنّف اپنے عہد کے املا سے انحراف کا بھی مرتکب ہوا ہو تو بھی وہ اس کے املا کی پیروی چاہتے ہیں اور ایسے مصنّفین جن کے مختارات املائی معلوم نہ ہوں ان کی روش املا کا تعین ان کے معاصرین کی تحریروں سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری دانست میں ان تمام احتیاطوں کا مقصد منشائے مصنّف کا قرب ہے اور منشائے مصنّف اپنے عہد کے قاری سے خطاب ہوتا ہے۔ جب عہد بدل گیا تو قاری کا "ذوق سماعت" بھی بدل گیا۔ اب اسی مصنّف کا پیغام پہنچانے کے لیے تبدیل شدہ "ذوق سماعت" کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

جہاں تک بادرس کے اس خیال کا تعلق ہے کہ کتاب کے، محققین کے لیے الگ اور عوام کے لیے الگ ایڈیشن تیار کیے جائیں تو ہمیں اپنے قومی منظر نامے میں تو یہ محض ایک خوش کن خیال معلوم ہوتا ہے اور بس۔ البتہ ہماری دانست میں ایک صورت ایسی ہے جسے اختیار کر لینے سے عوام اور خواص یکساں مستفید ہو سکتے ہیں اور مدوّن پر کسی خرابی کی صورت میں مخطوطے کو مسخ کرنے کا الزام بھی نہیں آسکتا، وہ یوں کہ ہر مدوّن کیے جانے والے متن کے ساتھ مقابل کے صفحوں پر خطی نسخے کا عکس شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ (اگر تمام مخطوطے کا عکس شائع کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم ناخوانا مقامات/ صفحات کے عکس مدون متن کے ساتھ شائع کر دیے جائیں) اگر اس طریقۂ کار کو ایک اصول کے طور پر اختیار کر لیا جائے تو مستقبل میں تدوین متن کی بہت سی راہیں کشادہ رہ سکتی ہیں اور جدید نظام طباعت میں اس نوع کی عکسی اشاعت کا اہتمام کچھ دشوار بھی نہیں ہے۔ اس طریق کار کو اختیار کر لینے سے کسی متن کی اشاعت پر وہ تبصرہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی جو قاضی عبدالودود نے دیوان معروف (دیوان الٰہی بخش خاں معروف مرتبہ شاہ عبدالحامد قادری بدایونی) پر کیا تھا کہ "اس سے تو دیوان کا پردۂ گمنامی میں ہی پڑا رہنا بہتر ہے"۔ (۱۱)

حوالہ جات و حواشی

S.M. Kattre: Introduction to Indian Textual Criticism (Poona, 1941)

بحوالہ ڈاکٹر خلیق انجم، "متنی تنقید"، دہلی، الجمعیتہ پریس، ۱۹۶۷، ص ۴۶

(۲) سید حسن، ڈاکٹر (مرتب): دیوان رکن صاین ہروی، پٹنہ پوسٹ گریجویٹ سٹڈیز انسٹی ٹیوٹ

(۳) عرشی، امتیاز علی خاں (مرتب): دستور الفصاحت مصنفہ احمد علی خان یکتا، رام پور، ہندوستان پریس، ۱۹۴۳، ص ۳

(۴) R.W.Chapman. The Textual Criticism of English Classics, George Watson P.93

بحوالہ ڈاکٹر گیان چند، تحقیق کا فن، لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۹۰ پندرھواں باب

(۵) جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب): مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راؤ پدم راؤ مصنفہ فخردین نظامی، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۳

(۶) قزوینی، محمد و قاسم غنی: دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی، تہران، انتشارات زوار پاییز، ۱۳۶۹، ص ۱۲۳

(۷) Scholar Criticism (۸) The Aims and Methods of Scholarship

دونوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو

ڈاکٹر گیان چند، محولۂ بالا

(۹) ان اصحاب میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی، رشید حسن خاں، عبدالرزاق قریشی اور مبارز الدین رفعت کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ملاحظہ ہو

تدوین متن کے مسائل (خدا بخش سیمینار رپورٹ)، پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۹۸۲

(۱۰) ڈاکٹر گیان چند، محولۂ بالا ص ۴۰۰

(۱۱) قاضی عبدالودود، مطبوعات جدیدہ در رسالۂ "معیار" بانکی پور (پٹنہ) مارچ ۱۹۳۶، ص ۰

مقالات

ڈاکٹر نذیر احمد :

فخر مدبّر اور اس کا شجرۂ نسب

سلطان شمس الدین التتمش کے عہد (۶۰۷- ۶۳۲) کی مشہور کتاب " آداب الحرب والشجاعہ " کا مصنّف محمد بن منصور ہے جو فخرِ مُدبّر کے لقب سے معروف ہے۔ لیکن ایک دوسری روایت میں فخرِ مُدبّر کے بجاے اس کا لقب فخر مدیر (۱) ہے۔ اس کی دو مشہور کتابیں ہیں۔ ایک تو " آداب الحرب والشجاعہ " ہے جو ۶۲۶ھ کے کچھ بعد مکمل ہوئی اور سلطان التتمش (۶۰۷- ۶۳۲ھ) کے نام معنون ہوئی۔ یہ فن حرب پر نہایت اہم اور نادر تصنیف ہے۔ آداب الحرب کی ایک دوسری روایت ہے جو آداب الملوک و کفایہ الملوک کے نام سے ہے۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتاب خانے میں ہے۔ اس میں اور آداب الحرب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ آداب الحرب میں ۳۴ ابواب ہیں اور آداب الملوک میں چھے باب زائد ہیں۔ ان چھے زاید ابواب کو الگ کرکے آقاے سرور مولائی نے " آئین کشور داری" کے نام سے بنیاد فرہنگ ایران (تہران) کی طرف سے ۱۳۵۴ شمسی میں شایع کردیا ہے۔ آداب الحرب والشجاعہ کے ۳۴ باب آقاے سہیلی خوانساری ۱۳۴۶ شمسی میں تہران سے چھاپ چکے تھے۔ قابل تذکرہ امر یہ ہے کہ آقاے خوانساری کو انڈیا آفس کے نسخہ آداب الملوک و کفایہ الملوک کا علم تھا لیکن وہ اس کا غایر مطالعہ نہ کرسکے تھے۔ اس بنا پر وہ اسے آداب الحرب والشجاعہ سے الگ کتاب سمجھے تھے مگر واقعہ یہی ہے کہ آداب الملوک آداب الحرب کا دوسرا ایڈیشن ہے جس میں کافی تجدید نظر ہوئی۔ جگہ جگہ عبارتوں میں تبدیلی اور مطالب میں کمی بیشی کی گئی اور چھے ابواب کا اضافہ کرکے اس کا دوسرا عنوان قرار دیا گیا۔ آقای سرور مولائی نے بھی اپنے دیباچے میں اس بات کی پوری توضیح کردی ہے کہ آداب الملوک آداب الحرب کی دوسری روایت ہے۔ راقم السطور بہت پہلے " راہنمای کتاب" کی جلد ششم شمارہ ۳- ۵ میں اس امر کی طرف اشارہ کرچکا تھا کہ آداب الملوک اور آداب الحرب ایک ہی کتاب کی دو روایتیں ہیں۔

فخر مدبّر کی دوسری کتاب شجرۃ الانساب ہے۔ اس کو دوسرے اور نام بحرالانساب سے بھی موسوم کیا گیا ہے لیکن ایڈورڈ ڈینیسن راس (E. Denison Ross) جن کے پاس اس اہم کتاب کا واحد نسخہ تھا اور جس کو انھوں نے پروفیسر براون کو پیش کی جانے

والی کتاب میں ایک مقالے کے ذریعے ۱۹۲۲ء میں متعارف کرایا تھا۔ انھوں نے اس کتاب کا کوئی مخصوص نام درج نہیں کیا تھا۔

شجرہ الانساب کی تالیف کی وجہ خود کتاب کے دیباچے میں صراحت سے بیان ہوئی ہے۔ فخر مدبر کہتا ہے کہ ہمارے خاندان کا شجرہ ہندوستان منتقل ہوتے وقت غزنی میں رہ گیا۔ تھا۔ اہل خاندان کو خصوصاً فخر مدبر کو اس کے حصول کی بڑی آرزو تھی، مگر وہاں کے حالات خراب تھے، اور اس بنا پر غزنی جانے کی صورت نہیں نکلتی تھی۔ جب معز الدین محمد بن سام نے ۵۸۲ھ یا ۵۸۳ھ میں خسرو ملک کو شکست دے کر فیروز کو وہ اپنے بھائی مغیث الدین محمد بن سام کے پاس بھیج دیا، تو حالات کچھ بہتر ہوئے اور فخر مدبر کو غزنی جانے اور کچھ خاندانی کاغذات اور شجرہ مذکور کے حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوگیا۔ اس شجرے کو دیکھ کر فخر مدبر کو شجرہ الانساب مرتب کرنے کا حوصلہ ہوا۔ پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ، پھر عشرہ مبشرہ کے شجرے، یہاں تک سینکڑوں حکمرانوں اور دوسرے ممتاز خاندانوں کا شجرہ شامل کرکے شجرہ الانساب کے ضخیم مجلدات مرتب کیے۔ ۶۰۲ھ میں شجرہ مکمل ہوا تو معز الدین محمد بن سام کی خدمت میں پیش کرنا چاہا، مگر اس میں کچھ رکاوٹ ہوگئی، یہاں تک کہ اس کا انتقال ہوگیا، جب قطب الدین ایبک تخت نشین ہوا تو یہ ضخیم کتاب اس کی خدمت میں پیش کی گئی۔ مؤلف نے نہ صرف کتاب کی تیاری کی بلکہ سلطان کی خدمت میں پیش کیے جانے کی پوری تفصیل بھی مقدمہ کتاب میں بیان کردی ہے۔ خاتمے کے چند جملے قابل ملاحظہ ہیں:

> و روز آدینہ کہ ملک اسلام غازی دام ملکہ بہ سبب نماز جمعہ بکوشک سپہ سالار اجل کبیر کریم اسدالدّولہ و الدّین سیّد الرّجال الغ داد بک علی محمد ابو الحسن نزول کردہ بود و اتفاق بر آن جملہ بود کہ چون ملک بر آدینہ کہ بہ نماز جمعہ خواستی رفت بدان کوشک نزول فرمودی و از آنجا بہ نماز رفتی، دعا گوی را پیش بردند و شجرہ نمودند و شرف دست بوس و سعادت معرفت حاصل گشت و دعا گوی را بنشاندند و با ہریک نسبت از آدم علیہ السلام تا نسبت پیغمبر علیہ التحیہ و السلام و خلفای بنی عباس و آنچہ پس از ایشان بودند بر ولاد ترتیب بر رای رفیع ملک معظم عزنصر تقریر کردہ آمد و پسندید و مثال فرمود تا از جہت کتابخانہ خاص نبشتہ شود و در جلد آید فرمان مثال

را امتثال نمودہ آمد و نوشتہ شد و بخدمت رسانیدہ آمد

(ص ۴۳، ۴۵)

فخر مدبر نے اپنی دونوں کتابوں میں بلکہ آداب الحرب و الشجاعہ کی دونوں روایتوں میں اپنا یہ شجرہ درج کیا ہے۔

شریف محمد
|
منصور
|
سعید
|
ابو الفرج
|
خلیل
|
احمد
|
ابونصر
|
خلف
|
احمد
|
شعیب
|
طلحہ
|
عبداللہ
|
عبدالرحمن
|
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

ذیل میں اس شجرے کی نسبت سے چند ضروری باتیں درج کی جارہی ہیں۔ کتاب

شجرہ الانساب کے دیباچے میں جو شجرہ ہے اس میں "محمد" نام کے ساتھ "شریف" کا لفظ نہیں، اور ابو الفرج کے بجائے ابو الفرح اور خلیل کے بجائے جلیل ہے۔ لیکن ابو الفرج کا نام ابراہیم غزنوی کے عہد میں قحط سالی کے ضمن میں آداب الحرب والشجاعہ میں کئی بار آیا ہے (ص ۱۰۴) اور ابو الفرج نام کے ساتھ "شریف" ملتا ہے۔ اس شجرے کے حسب ذیل افراد سے فخر مدبر نے اپنی کتابوں میں اپنے تعلق کا ذکر کیا ہے:

۱۔ حضرت ابو بکر صدیق، جہاں تک فخر مدبّر کا سلسلہ پہنچتا ہے بلاشبہ فخر مدبّر کے جدّ اعلیٰ تھے جیسا کہ شجرۃ الانساب کے مقدمے میں ہے (ص ۶۴)

"و پیشوای ایشان امیر المومنین ابوبکر رضی اللہ عنہ دعا گوی نسبت بدو دارد"

۲۔ ابو مسلم خراسانی، اس کا نام عبدالرحمٰن تھا، وہ اموی حکومت کے خاتمے کا ذمے دار تھا، مرو میں اس نے ۱۲۹ھ میں علم بغاوت بلند کیا یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے میں خراسان اور ماوراء النہر کے سارے علاقے فتح کر کے آل عباس کی خلافت کے لیے زمین ہموار کر دی۔ چنانچہ ۱۳۲ھ میں ابو العباس سفاح پہلا عباسی خلیفہ مقرر ہوا، وہ چار سال بعد ۱۳۶ھ میں راہی ملک بقا ہوا اس کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور خلیفہ مقرر کیا گیا۔ اس نے دوسرے سال ہی ۱۳۷ھ میں ابو مسلم کو قتل کر ڈالا اس وقت ابو مسلم کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔ یہی ابو مسلم فخر مدبّر کے جد میں تھا۔ آداب الحرب (باب ۱۱، ص ۲۶۶) میں ہے: "و ابو مسلم صاحب دعوت عباسیاں کہ از اسلاف مولف کتاب است بہ تیر جنگ کردی و تیر و دشنہ او بیست من بود"

(شجرے میں اس کا نام نہیں، پھر کس طرح اس کے اسلاف میں ہوگا؟ اس کا جواب مشکل ہے)

۳۔ خلف بن احمد، اگرچہ فخر مدبر نے آداب الملوک و کفایۃ المملوک (ورق ۳۳ ب) میں اس کا نام صرف امیر خلف لکھا ہے لیکن شجرے میں اس کے باپ کا نام احمد درج ہے۔ فخر مدبر کے الفاظ یہ ہیں۔

"این خبر بہ امیر خلف رسید، وکیل را بخواند و خلعت داد و در اسلام ہیچ پادشاہ ازو عالمتر نبودہ و او تفسیر بیان کردہ است صد مجلد، او ہم از اسلاف این کاتبست"

تاریخ یمینی میں ہے کہ خلف نے قرآن مجید کی تفسیر لکھوائی تھی جو سو مجلدات پر مشتمل تھی، تاریخ یمینی کے مترجم ابو شرف ناصح جرباد قانی نے اس کے ایک نسخے کا حوالہ دیا

ہے جو مدرسہ صابونی نیشاپور میں تھا۔ بعد میں وہی نسخہ اصفہان میں جربادقانی کی نظر سے گذرا تھا۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

۴۔ ابو الفرج جس کا ابراہیم غزنوی (۴۵۱ھ۔ ۴۸۱ھ) سے بہت گہرا تعلق تھا، فخر مدبر کے اسلاف میں تھا۔ آداب الحرب ص ۴۰۱ میں ہے:

"شرف بوالفرج فرجد پدری کاتب و مصنف بوده است"

یہ امور تو فخر مدبّر کے پدری شجرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مصنف نے اپنے مادری انساب کی نسبت سے لکھا ہے: "امیر بلکاتکین (۱۲) کہ از پس حاجب بزرگ البتگین (۱۳) پادشاہ غزنین شد و چہار سال (۱۴) ملک بود و خسرو سلطان یمین الدّولہ محمود غازی نور اللہ قبرھما کہ کاتب و مؤلف کتاب را جد مادر گان باشد (۳۷۔ ۲۳۶)

اب تک فخر مدبر کے پدری اور مادری جد کے بارے میں خود اس نے جو کچھ لکھا وہ درج کیا گیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ فخر مدبّر کو دنیا جہان کے خانوادوں اور مختلف افراد و اشخاص کے بارے میں اتنا گہرا علم تھا۔ لیکن خود اس کا تیرہ پشت کا شجرہ نقص سے پاک نظر نہیں آتا۔ ذیل میں اس سلسلے کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔ فخر مدبر کے شجرے پر نظر ڈالنے سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ یہ شجرہ چھے سو سال سے کچھ اوپر کا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ۱۳ ہجری میں ہوئی اور فخر مدبّر کی ۶۲۶ھ (۱۵) کے کافی بعد۔ لیکن یہ طویل مدت صرف ۱۳ پشتوں کو حاوی ہو۔ یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ درمیان سے کچھ پشتیں درج ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اور خود فخر مدبر نے لکھا ہے کہ عباسی خاندان کے داعی ابو مسلم خراسانی (۱۶) ان کے اسلاف میں تھے۔ لیکن ان کا نام شجرے میں نہیں۔ ان کی پیدائش ۱۰۲ھ اور وفات ۱۳۷ھ میں ہوئی اس بنا پر اس شجرے میں ان کے نام کی جگہ شعیب کے نزدیک ہونی چاہیے۔ میرے اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ آخر کی چار پشتیں طلحہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تک شکوک سے پاک ہیں۔ تاریخوں اور انساب کی کتابوں سے واضح ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بڑے بیٹے عبدالرحمٰن ان کے دو بیٹے محمد اور عبداللہ تھے۔ عبداللہ کے چار بیٹے طلحہ۔ ابو بکر۔ عمران اور عبدالرحمٰن تھے۔ (ابن حزم جمرۃ انساب العرب ص ۱۲۷۔ ۱۲۸) بخوبی ممکن ہے کہ طلحہ کے بیٹے شعیب ہوں۔ یہ زمانہ اوائل دوسری صدی کا ہوگا۔ اسی بنا پر اسی کے قریب ابو مسلم متوفی ۱۳۷ھ کا نام آنا چاہیے۔

اس سلسلے کی دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ فخر مدبّر کے پدری اسلاف میں

خلف بن احمد تھا جس کا نام شجرے میں بھی درج ہے اور جس کو اس نے آداب الملوک میں مشہور فرمانروا بتایا ہے جو فضلیت علمی سے متصف اور قرآن کی سو جلدی تفسیر کا مصنف تھا، یہ تفصیلات سیستان کے فرمانروا خلف پر منطبق ہوتی ہیں۔ فخر مدبّر کے خاندانی شجرے میں خلف کے باپ کا نام احمد اور بیٹے کا ابو نصر ہے۔ تاریخ سیستان کا یہ آخری فرمانروا تھا جو ابو جعفر احمد کا بیٹا تھا اور اس کا خود کا بیٹا ابو نصر تھا۔ ذیل میں خلف بن احمد کے کوائف درج کیے جاتے ہیں۔ دراصل کچھ سال پہلے راقم السّطور کے دو مقالے، ایک اردو میں نذر مختار الدین احمد مرتبہ مالک رام اور دوسرا مجلہ ایران شناسی (۱۸) واشنگٹن ڈی۔ سی۔ فارسی میں شایع ہوئے تھے، انھی کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس مقالے میں حسب ذیل دو شجرے درج ہیں۔ یہ شجرے تاریخ سیستان کی روشنی میں راقم نے تیار کیے ہیں:

دوسرا شجرہ یعقوب لیث اور عمرو لیث کا ہے۔

بابان

حاتم

معدل

لیث

یعقوب ۲۶۵ھ — عمرو مقتول ۲۸۹ھ عزل ۲۸۷ھ — علی

(عمرو کی اولاد:) طاہر — محمد

(محمد کی اولاد:) بانو (دختر) — طاہر — یعقوب

طاہر: ابوالعباس بن طاہر

یعقوب: ابوحفص عمرو بن یعقوب

(علی کی اولاد:) ابو علی محمد — معدل — لیث — ابوالحسین

ابوالحسین: محمد

محمد: دختر عائشہ (مادر طاہر بو علی)
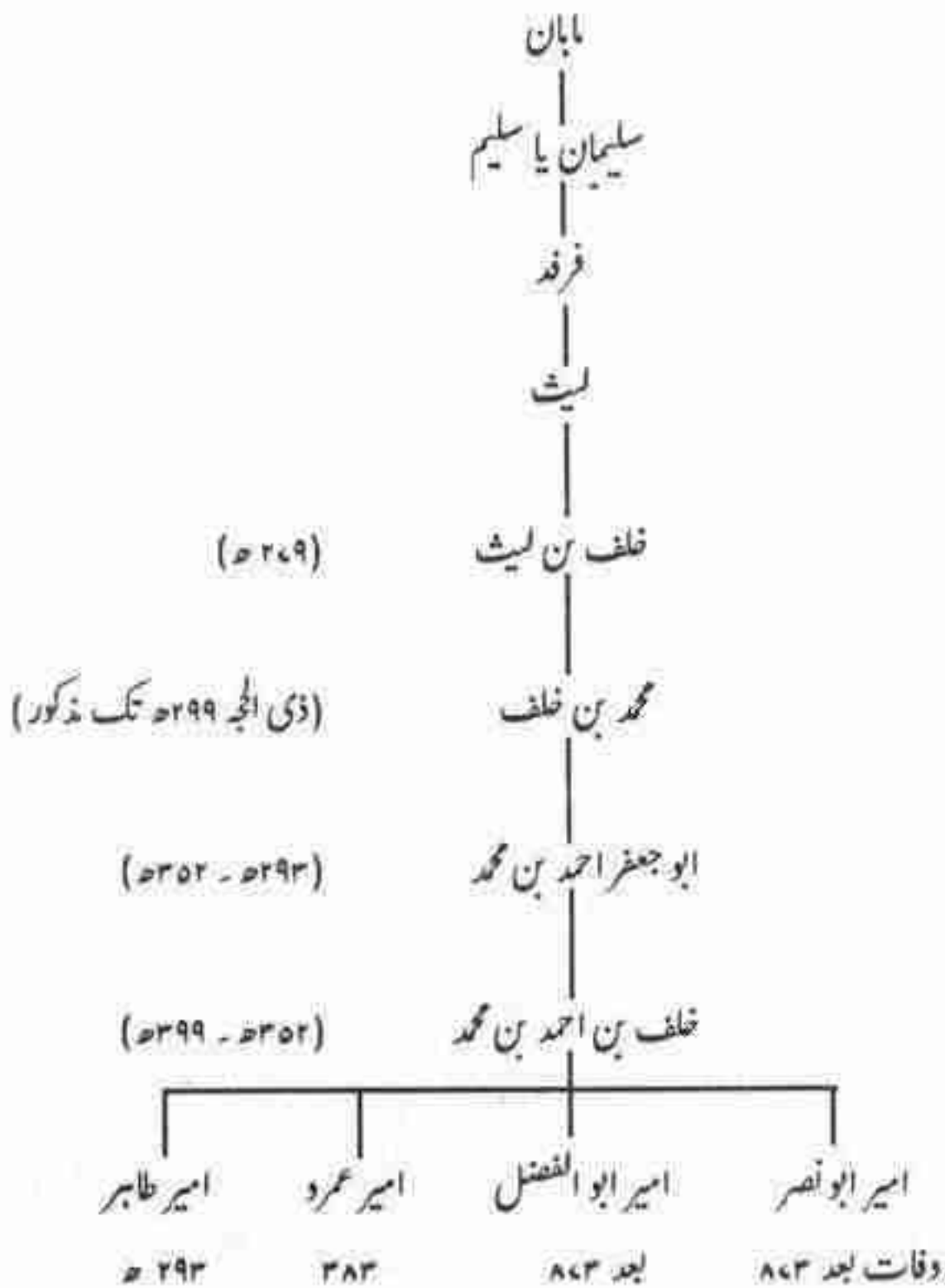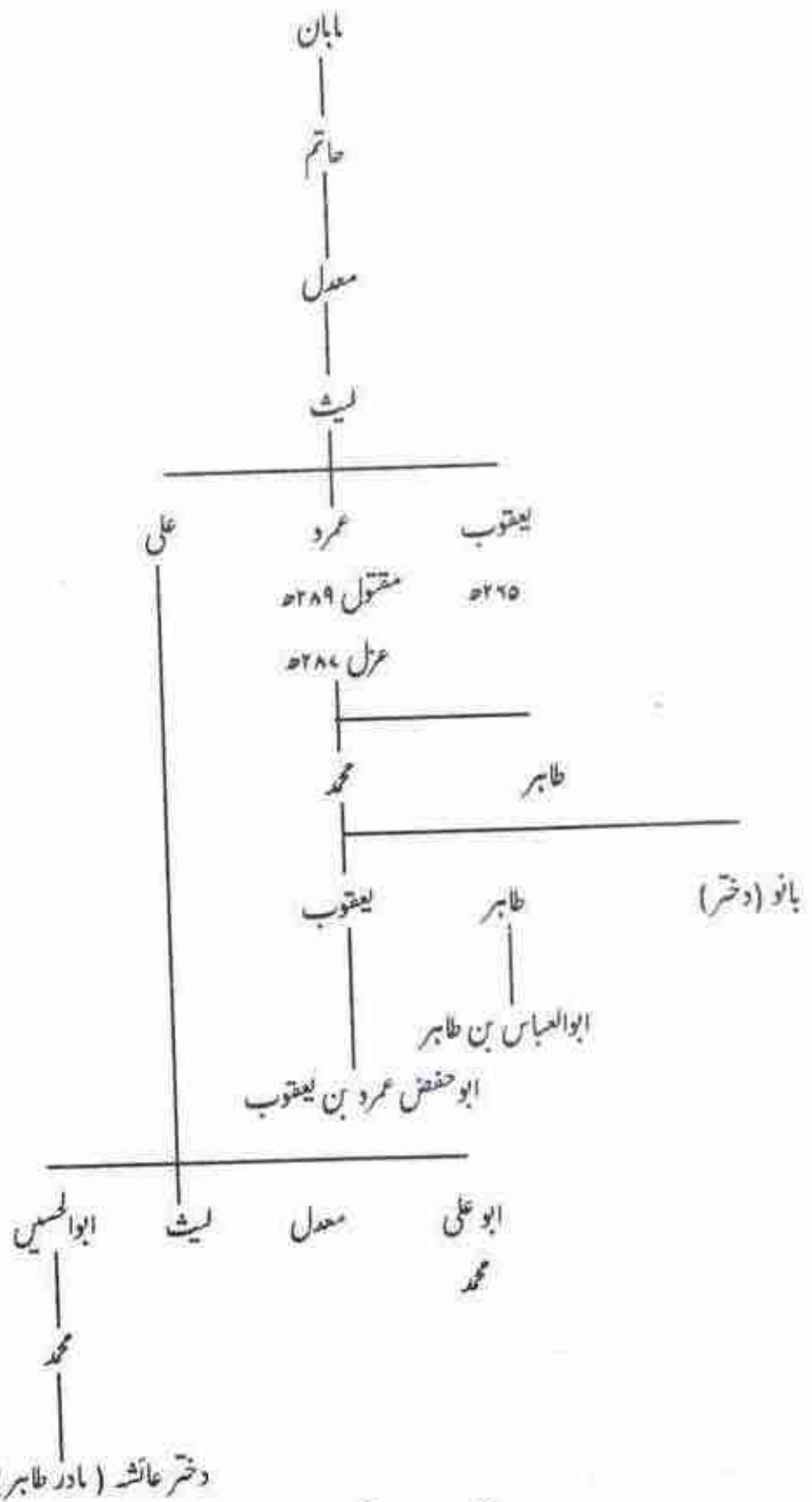
اب (۱۹) امیر خلف کے خاندان کے چند افراد کا مختصر حال درج کیا جاتا ہے۔

خلف بن لیث امیر خلف کے دادا کا باپ تھا اور یعقوب لیث کے عہد (۲۴۷ھ - ۲۶۵ھ) کا معزز امیر تھا۔ یعقوب بن لیث کی وفات پر عمرو لیث تخت نشین ہوا۔ کچھ دنوں بعد خلف عمرو لیث سے باغی ہوکر خلیفہ بغداد سے جا ملا۔ آخر میں پھر عمرو لیث سے آملا۔ اس کی وفات ۲۷۹ھ میں ہوئی۔

محمد بن خلف ۔ خلف بن لیث کا بیٹا اور امیر خلف بن احمد کا دادا تھا۔ امیر عمرو لیث کی وفات (۲۸۹ھ) پر امیر کے دو پوتے طاہر و یعقوب اس کے جانشین ہوئے۔ محمد بن خلف کی وہ بہت عزت و تکریم کرتے۔ ۲۹۱ھ میں دونوں بھائیوں نے اپنی بہن بانو کی شادی محمد بن خلف سے کردی۔ امیر خلف بن احمد کا باپ ابو جعفر احمد بن محمد بانو ہی کا بیٹا تھا اور اسی وجہ سے امیر خلف خلف بانو کہلاتا ہے جیساکہ چہار مقالے کی ایک حکایت میں ہے۔

ابو جعفر محمد بن محمد بن خلف ۔ امیر خلف بن احمد کا باپ تھا۔ اس کی ماں بانو عمرو لیث کی پوتی تھی۔ ابو جعفر ۲۹۳ھ میں پیدا ہوا۔ یہ زمانہ صفاری خاندان کی ابتلا کا زمانہ تھا۔ عمرو لیث کے عزل (۲۸۷ھ) کے فوراً بعد صفاری خاندان والوں میں سیستان کی حکومت کے لیے خانہ جنگی شروع ہوئی۔ بالآخر عمرو لیث کی جگہ اس کے دونوں پوتوں یعنی طاہر اور یعقوب نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ ۲۹۶ھ میں ان کا زوال ہوا تو عمرو لیث کے بھتیجے لیث بن علی کا اقتدار شروع ہوا۔ ان کے سپہ سالار سبکری (۲۰) نے طاہر و یعقوب کو قید کرلیا اور دونوں بغداد بھیج دیے گئے ۔ لیث بن علی اگرچہ سیستان پر قابض ہوچکا تھا۔ لیکن اس کو سبکری کی طرف سے اندیشہ تھا۔ بہرحال ۲۹۸ھ میں اس نے سبکری کو پکڑ کر بغداد بھیج دیا۔ اسی سال لیث کا بھائی معدل امیر منتخب ہوا لیکن چند ہی دنوں بعد رجب ۲۹۸ھ میں احمد بن اسماعیل سامانی نے اسے قید کرلیا۔ اس طرح سامانیوں کا سیستان پر قبضہ ہوگیا۔ احمد بن اسماعیل سامانی (۲۹۵ھ - ۳۰۱ھ) نے اپنے چچا زاد بھائی منصور بن اسحاق (۲۱) کو سیستان کا حاکم مقرر کیا لیکن وہاں وہ ناکام رہا۔ یہی منصور محمد زکریا رازی (م ۳۱۱ھ) کا ممدوح تھا اور رازی نے اپنی کتاب "منصوری" (۲۲) اسی سامانی امیر کے نام پر لکھی ہے۔

منصور بن اسحاق کے بعد صفاری خاندان کا ایک رکن ابوحفص عمرو بن یعقوب (۲۳) رمضان ۲۹۹ھ میں امیر سیستان مقرر ہوا لیکن کچھ ہی دنوں میں وہ برطرف ہوا اور یکے بعد دیگرے چند اور امیر مقرر ہوئے ۔ آخر کار محرم ۳۱۱ھ میں مردم سیستان نے عزیز بن عبداللہ کو سیستان کی حکومت سے ہٹاکر چند روز بعد امیر خلف کے نامور پدر ابو جعفر احمد کو

سیستان کا امیر مقرر کیا، اس وقت اس کی عمر ۱۸ سال سے زیادہ نہ تھی، شروع میں عزیز بن عبداللہ نے مزاحمت کی ۔ بالآخر وہ گرفتار ہوا۔ اسی درمیان میں ابو جعفر بغاوت فرو کرنے کے لیے بست گیا، بغاوت فرو کر کے لوٹا ہی تھا کہ وہاں دوبارہ بغاوت ہو گئی یہاں تک کہ رجب ۳۱۴ھ میں سرداروں نے عزیز بن عبداللہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، رمضان میں ابو جعفر بست کی طرف روانہ ہوا تو عزیز سیستان کے حدود میں داخل ہوا ۔ یہاں اسے ابو جعفر کے نائب نے شکست دی ۔ غرض ابو جعفر ۳۲۰ھ ۔ ۳۲۱ھ تک مملکت کے مسائل جنگوں کے ذریعے حل کرتا رہا۔ ص ۳۲

ابو جعفر کے ماکان (۲۴) کے پاس سفیر بھیجنے کا واقعہ سیستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ابو جعفر نے ابو الحسین خارجی کو ماکان کے پاس بطور سفیر بھیجا ۔ ماکان نے اس کی بڑی تکریم کی، لیکن ایک روز مستی کی حالت میں اس کی داڑھی مونڈنے کا حکم دے دیا۔ جب وہ اپنے حواس میں آیا تو اپنی اس حرکت پر بہت نادم ہوا ۔ قاصد سے بڑی معذرت کی اور جب تک سفیر کی داڑھی معمول کے مطابق نہیں بڑھی اس کو سیستان لوٹنے کی اجازت نہیں دی، امیر سیستان کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوا ۔ اور بنفس نفیس ماکان پر شبخون مارا اور ماکان کو گرفتار کر لیا اور سیستان لے آیا اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس نے سفیر کے ساتھ کیا تھا۔ سامانی امیر نصر بن احمد کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ ابو جعفر کی جوانمردی سے بہت متاثر ہوا، ایک جشن قایم کیا اور بڑے تحفے تحایف بخارا سے سیستان بھیجے اور رودکی شاعر نے ایک طویل قصیدے میں جو ۹۴ شعر پر مشتمل ہے ابو جعفر کی خوبیاں (۲۵) بیان کی ہیں ۔ یہ قصیدہ تاریخ سیستان میں درج ہے، چند ابیات اس طرح پر ہیں:

مجلس باید بساختہ ملوکانہ — از گل و ز یاسمین و خیری الوان
نعمت فردوس گستریدہ ز ہر سو — ساختہ کاری کہ کس نسازد چو نان
یک صف میران و بلعمی نشستہ — یک صف حران و پیر صالح دہقان
خسرو بر تخت پیشگاہ نشستہ — شاہ ملوک جہان امیر خراسان
خود بخورد نوش و اولیاش ہمیدون — گوید ہریک چو می بگیرد شادان
شادی بوجعفر احمد بن محمد — آن مہ آزادگان و مفخر ایران
آن ملک عدل و آفتاب زمانہ — زندہ بدو داد و روشنائی گیہان

آنکہ نبود از نژاد آدم چو او　　تیز نباشد اگر نگوئی بہتان
حجت یکتا از خدای و سایہ اوست　　طاعت او کردہ واجب آیت فرمان
خلف ہمہ از خاک و آب و آتش و بادند　　وین ملک از آفتاب گوہر سامان
گر تو فصیحی ہمہ مناقب او گوی　　ور تو دبیری ہمہ مدائح او خوان

لیکن ایسا جوہر قابل بھی گردش آسمان سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی۔ بغاوت کا سرغنہ اس کا ماموں زاد بھائی ابو العباس بن طاہر بن محمد بن عمرو لیث تھا، پروپیگنڈہ کچھ اس طرح ہوا کہ ابو العباس اس نسب پدری کے اعتبار سے بادشاہ زادہ ہے جبکہ ابو جعفر نسب مادری کے اعتبار سے۔ اس پروپیگنڈے کی بنیاد اس پر تھی کہ عمرو لیث ابو العباس کا جدامجد (پدری) تھا اور ابو جعفر کا جد مادری۔ اگرچہ فتنہ کسی طرح فرو ہو چکا تھا کہ اسی درمیان ابو جعفر ۲۰ ربیع ۳۵۲ھ کو ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہو گیا، تو ابو جعفر کے دوسرے ماموں زاد بھائی ابو حفص نے صفاری تخت کے حصول کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا، ابو جعفر کا بیٹا خلف ابن احمد باپ کے قتل کے پچاسویں روز ۰۵ جمادی الاول ۳۵۲ھ کو امیر سیستان مقرر ہوا۔ خلف بن احمد (۲۶) ۔ یہی خلف بن احمد ہے جس کو فرمدبر نے اپنے اسلاف میں شمار کیا ہے اور جس کا نام فرمدبر کے خاندانی شجرے میں ہے۔ اس کے نام کے ساتھ اس کے باپ احمد کا بھی ذکر ہے جس کی کنیت ابو جعفر تھی اور جس کا ذکر ہو چکا ہے اور جو ایک غلام کے ہاتھوں ۳۵۲ھ میں قتل ہو گیا تھا۔ پھر خلف کے نام کے ساتھ اس کے بیٹے ابو نصر کا نام شجرے میں موجود ہے۔ ابو نصر کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

خلف نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو اس کے تعلقات ابوالحسن طاہر سے جو صفاری خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور خلف کے باپ کے زمانے میں خراسان کا حاکم تھا اتنے استوار ہوئے کہ خلف نے اس کو حکومت میں برابر کا شریک ٹھہرایا۔ خلف کو ابھی ایک سال بھی نہیں گذرا تھا کہ ۳۵۳ھ میں وہ حج پر روانہ ہو گیا اور ۳۵۷ھ میں تقریباً چار سال بعد سیستان واپس ہوا۔ طاہر نہایت لائق اور مدبر امیر اور بڑا صاحب علم و فضل تھا۔ اس نے خلف کی غیر حاضری میں سلطنت کا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے کر ایک مقبول عام حکمران کی حیثیت سے عوام و خواص کے دلوں پر اپنی محبت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اس بنا پر خلف بن احمد کو حکومت کی واپسی آسان نظر نہ آئی تو امیر بخارا منصور بن نوح (۳۴۹ھ - ۳۶۵ھ) کی

مدد سے رجب ۳۵۸ھ میں حکومت چھین لی، لیکن طاہر نے دوبارہ فوج جمع کرلی اور سیستان پر حملہ کیا اور خلف کو شکست دی۔ لیکن بد قسمتی سے ۲۰ شوال ۳۵۹ھ کو طاہر کی دفعۃً وفات ہوگئی۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا حسین بن طاہر امیر سیستان مقرر ہوا، خلف بن احمد نے اس پر حملہ کرکے اس کو سیستان سے بھگا دیا اور طاہر اور حسین کے متعلقین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن حسین ہمت نہ ہارا اور اس نے پھر ۶ شعبان ۳۶۱ھ کو امیر خلف کو ہیر مند کے معرکے میں شکست دی۔ خلف بن احمد بھی دھن کا بڑا پکا تھا، اس نے حسین کو چین نہ لینے دیا۔ یہاں تک کہ وہ بخارا چلا گیا، وہاں ۳۶۲ھ تا ۳۶۸ھ رہا۔ اسی درمیان امیر منصور بن نوح کی وفات ہوچکی تھی۔ امیر کا بیٹا نوح بن منصور ۳۶۵ھ میں امیر بخارا مقرر ہوا، اس نے حسین کو ایک بڑا لشکر دے کر خلف بن احمد پر حملہ کرا دیا، لیکن محرم ۳۶۹ھ میں حسین کو شکست ہوگئی، امیر بخارا نے ہر چند کوشش کی کہ خلف بن نوح کو ہٹاکر سیستان کے تخت پر طاہر کے بیٹے حسین کو بٹھا دیں مگر اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ درمیان میں ابو الحسن سیجوری کی کوششوں سے خلف بن احمد اور حسین بن طاہر میں صلح ہوئی، صلح نامے پر چند دن عمل رہا، پھر خلف نے حسین پر حملہ کردیا، امیر سبکتگین کی وساطت سے دونوں میں رجب ۳۷۳ھ میں صلح ہوئی، لیکن حسین صلح نامے سے فائدہ اٹھائے بغیر راہی ملک بقا ہوا، اب خلف کا راستہ صاف ہوگیا اور وہ بلا کھٹکے سیستان اور اس کے نواح پر حکومت کرنے لگا۔

خلف بن احمد کے چار بیٹے تھے امیر بانصر (= ابو نصر) امیر ابو الفضل، امیر عمرو، امیر طاہر، امیر عمرو جو امیر بخارا کے پاس بطور گرو کے تھا، وہاں سے اس کی واپسی مدت کے بعد ۳۷۸ھ میں ہوئی۔ کچھ دنوں بعد وہ اپنے باپ خلف بن احمد سے باغی ہوگیا۔ خلف نے اپنے بیٹے ابو نصر کو اس سے مقابلے کے لیے بھیجا۔ ۵ ذی الحجہ ۳۸۳ھ کو امیر عمرو گرفتار ہوا اور قید ہی کی حالت میں محرم ۳۸۴ھ میں فوت ہوا۔ خلف کے دو اور بیٹے یعنی ابو نصر اور ابو الفضل بھی باپ کی حیات میں فوت ہوچکے تھے۔ بس ایک بیٹا طاہر بن خلف باقی تھا، وہ نہایت بہادر اور جری تھا۔ اس کی وجہ سے مملکت کے حدود میں اضافہ ہوا۔ اور سبکتگین کو ابو علی سیجوری کے خلاف مدد پہنچائی۔ لیکن سبکتگین نے احسان فراموشی کی اور اپنے بھائی بغرا جوق کی سرکردگی میں طاہر پر حملہ کرنے کے لیے بارہ ہزار فوج مہیا کی لیکن وہ طاہر سے مقابلہ نہ کرسکی۔ طاہر نے اس کو گرفتار کیا اور اس کا سر کاٹ کر خلف کے پاس بھیج دیا۔ بغرا جوق کی شکست کے بعد امیر خلف کوہ سپہد گیا، اس کے ساتھ حرم کے علاوہ تھوڑے سے خدمتگار تھے۔ سلطان محمود کا اس

طرف سے گذر ہوا تو اس نے خلف پر حملہ کردیا اور اس کو صلح پر مجبور کردیا، خلف نے سو ہزار درم تاوان ادا کیے اور خطبہ پڑھا اور سکہ ڈھالا، یہ واقعہ جمادی الآخر ۳۹۰ھ کا ہے، امیر خلف کو امید تھی کہ طاہر محمود پر شب خوں مارے گا، مگر ایسا نہ ہوا، خلف طاہر سے بہت خفا ہوا، اور اس کے ساتھ سختی سے پیش آیا۔ طاہر باغی ہوا اور باپ سے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ باپ کو شکست ہوئی۔ شعبان ۳۹۰ھ میں طاہر کرمان چلا گیا۔ طاہر کرمان سے واپس آکر خلف سے معافی کا طلبگار ہوا، مگر خلف نے قاصد کے ساتھ ناروا سلوک کیا، اس کی بنا پر طاہر خلف کے مقابلے میں آ کھڑا ہوا۔ خلف ہار گیا۔ طاہر محرم ۳۹۱ھ کو سیستان میں داخل ہوا اور پورے شہر پر اس کا قبضہ ہوگیا، خلف نے اپنے خواص طاہر کے پاس بھیج کر عذر خواہی کی، طاہر نو عمر تھا، دھوکے میں آگیا۔ تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ باپ سے ملنے گیا، باپ نے بد عہدی کی اور بیٹے کو گرفتار کرلیا۔ قید ہی میں طاہر جمادی الاول ۳۹۲ھ میں فوت ہوا۔

طاہر کے ساتھ خلف کی بد عہدی کے واقعے سے اہل سیستان میں خلف کے خلاف شورش کا جذبہ پیدا ہوا، یہاں تک کہ انھوں نے محمود غزنوی کو اپنے ملک پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور اس کے پہنچنے سے پہلے ہی محمود کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا، محمود نے موقع سے فائدہ اٹھا کر سیستان پر حملہ کردیا۔ خلف میں مقابلے کا حوصلہ نہ تھا، وہ قلعے سے نیچے اترا اور اپنے کو محمود کے حوالے کردیا، محمود نے اسے جوزجان جانے کی اجازت دے دی، یہ واقعہ ۱۲ صفر ۳۹۳ھ کا ہے، بعد میں اسے گردیز منتقل کردیا گیا اور وہیں ۳۹۹ھ میں خلف کا انتقال ہوگیا، محمد قزوینی نے "چہار مقالہ" میں بطور تعلیقات (۲۷) لکھا ہے کہ باوجود تمام فضایل کے قساوت قلبی میں خلف کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اپنے بیٹے کو توہم کی بنا پر اپنے ہاتھ سے قتل کیا پھر غسل دیا اور دفن کیا، عتبی اگرچہ محمود سے وابستہ تھا لیکن خلف کی مدح سے وہ باز نہ رہ سکا۔ وہ لکھتا ہے:

> "امیر خلف دنیا کے عظیم بادشاہوں میں تھا، سخاوت، داد و دہش، عظمت و جلال میں مشہور زمانہ تھا، اہل علم اور ارباب ہنر کے ساتھ اس کے فیاضانہ سلوک کی داستان دنیا بھر میں مشہور ہے۔ بڑے بڑے شعرا نے اس کی مدح میں اشعار لکھے ہیں، اس کے فضائل و کمالات کی داستان خاص و عام کی زبان پر ہے۔ اس کا دربار علما و فضلا کا مرجع تھا، اسی امیر کی توجہ سے قرآن مجید کی

ایک ضخیم تفسیر سو جلدوں میں لکھی گئی ...."

اس تفسیر کا اصل نسخہ نیشا پور کے مدرسہ صابونی میں حادثۂ غز یعنی ۵۴۵ھ تک محفوظ تھا اور پھر آل خجند کے کتابخانے (اصفہان) میں منتقل کیا گیا۔ تاریخ یمینی کا فارسی مترجم ابو شرف ناصح جرباذقانی اصفہان میں اس تفسیر کے مطالعے سے مشرف ہوا تھا۔

ان امور کی روشنی میں نظامی عروضی سمرقندی کا چہار مقالے کا یہ بیان کہ فرخی سیستانی کو سیستان میں کوئی ممدوح نہ ملا تو وہ امیر چغانیاں کے دربار کی طرف متوجہ ہوا۔ کچھ عجیب سا ہے۔ فرخی کا باپ جو لوغ امیر خلف ابن احمد کا غلام تھا اور اس کا خسر بھی۔ خلف ہی کے دربار سے منسلک تھا۔ اور خلف خود فاضل اور شعرا و فضلا کا قدردان تھا۔ ابو الفتح لبستی، بدیع ہمدانی وغیرہ اس سے وابستہ تھے۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ سیستان میں دہقانوں اور ان کے امرا کے علاوہ کوئی اور نہ تھا جو شعرا و فضلا کی قدر دانی کرتے ہوں۔ صحیح نہیں۔

ان تفصیلات کے بعد ہم پھر فخر مدبر کے خاندانی شجرے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس میں آخر کی چار پشتیں یعنی حضرت ابو بکر تا طلحہ کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ بھی ممکن کہ طلحہ کا بیٹا شعیب ہو۔ اس طرح پانچ پشتیں درست ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ شعیب کا بیٹا احمد ہو جو امیر خلف کا باپ دکھایا گیا ہے۔ خلف کا باپ بلاشبہ احمد تھا۔ احمد کی کنیہ ابو جعفر ہے جس کے کارنامے سیستان کی تاریخ کے روشن باب ہیں۔ اس کے باپ کا نام محمد۔ دادا کا خلف اور پر دادا کا لیث تھا۔ غرض شجرے کا یہ حصہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی تصدیق تاریخ سیستان کے بدیہی واقعات کی طرف سے رو گردانی کے مترادف ہوگی۔ اسی طرح یہ بات بھی مشکوک ہے کہ خلف کے بیٹے ابو نصر کے بیٹے کا نام احمد ہے جیسا کہ فخر مدبر نے شجرے میں درج کیا ہے۔ ابو نصر کی وفات ۴۰۸ھ کے کچھ بعد لیکن ۳۹۲ھ سے جو ابو نصر کے بھائی طاہر کی تاریخ وفات ہے۔ کافی پہلے ہوئی تھی۔ یہیں سے شجرے کا وہ نقص عیاں ہوتا ہے کہ ایک خالص ایرانی خاندان (صفاری) کا رشتہ حضرت ابو بکر سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں ہم ایک عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہیں۔ ایک طرف تو فارسی زبان کا ایک اہم ادیب، مصنف اور مورخ فخر مدبر ہے جو خلف بن احمد کو اپنے اسلاف میں شمار کرتا ہے۔ پھر اپنا اور اپنے باپ اور بیٹے کے نام فہرست میں درج کرتا ہے۔ اور دوسری طرف اپنے کو حضرت ابو بکر کی اولاد میں شمار کر کے یہ ثابت کرتا ہے کہ خلف بن احمد کا بھی تعلق حضرت ابو بکرؓ ہی سے تھا۔ جو اس لحاظ سے ناممکن ہے کہ خلف خالص ایرانی الاصل

ہے، صفاری ہے۔ جس کا شجرہ بابان سے جا ملتا ہے۔ وہ عربی النسل نہیں اور نہ حضرت ابو بکر کی اولاد میں ہے۔ موجودہ معلومات سے اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا ہے اور اسی بنا پر فخر مدبرؔ کا تیار کیا ہوا خاندانی شجرہ مشکوک ہوجاتا ہے۔ لیکن شجرہ نویسی کے ایسے متخصص کے بارے میں جس نے ۱۳۶ شجرے ۲۱ سال میں تیار کیے ہوں، خود اس کے اپنے خاندان کے تیار کیے ہوئے شجرے میں ایسی فاحش غلطیوں کا وجود حیرت خیز معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں اور موجودہ معلومات کی روشنی میں کوئی اور نتیجہ نہیں نکال سکتے۔

حواشی

(۱) آداب الحرب والشجاعہ کے نسخوں میں مصنف کا نام فخر مدبّر ہے۔ لیکن سر ڈینسن راس نے شجرۃ الانساب کے حوالے سے فخر مدیر (Introduction, p. vi) یہی نام انڈیا آفس کے نسخۂ کتاب الملوک و کفایۃ الملوک (ورق ۴۳ ب) میں ہے۔ لیکن چونکہ ان دونوں ناموں میں "ب" اور "ی"۔ کے نقطوں کی وجہ سے تفاوت ہوا ہے اس لیے یقین سے کہنا ممکن نہیں ہے کہ فخر مدبّر صحیح ہے یا فخر مدیر۔ البتہ اوّل الذکر (مدبّر) مدیر کی بہ نسبت زیادہ متداول ہے۔ اس لیے زیادہ لوگوں نے مدیر پر مدبّر کو ترجیح دی ہے۔

(۲) دراصل یہ التتمش کے نام پر ہے۔ اور اس میں اس سلطان کے منجملہ اور خطابات کے اس کو ناصر امیر المومنین لکھا ہے۔ اور یہ لقب خلیفۂ مصر المستنصر باللہ کی طرف سے ۶۲۶ھ میں عطا ہوا تھا۔ اور اس سنہ میں بغداد کے سفراء آئے ہوئے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے قند پارسی ص ۲۵۸ ۔ ۱۹۸۲۔ آقای سہیلی خوانساری نے مجلّۂ راہنمای کتاب سال ۵۔ شمارہ ۳ میں آداب الحرب کی تاریخ تالیف "حدود ۶۱۵ھ تا ۶۲۰ھ قرار دی تھی۔ لیکن راقم نے مجلّۂ راہنمای کتاب شمارہ ۴ ۔ ۵ میں المستنصر باللہ کے پیش کردہ خطاب کا ذکر کیا کہ چونکہ یہ خطاب ۶۲۶ھ میں ملا۔ اس لیے اس کی تاریخ ۶۲۶ھ کے بعد کی ہوگی۔ سہیلی خوانساری نے میرے مقالے کے نئے مواد کی روشنی میں مقدمۂ آداب الحرب مطبوعہ میں اپنے پچھلے بیان کو صحیح کر لیا ہے۔
(مقدمہ ص ۱۰ ۔ ۱۱)

(۳) مقدمۂ آداب الحرب والشجاعہ ص ۹

(۴) ایضاً ص ۶۰۵

(۵) دیکھیے تاریخ فخر الدّین مبارک شاہ۔ تصحیح ڈینسن راس۔ طبع ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۲۷ء۔ مقدمہ ص ۷، یہ دراصل مقدمۂ شجرۃ الانساب ہے۔ راس نے ۔ کتاب کے مؤلف فخرالدین مبارک شاہ کو فخرالدّین مبارک شاہ مرورودی قرار دیا ہے۔ حالانکہ مبارک شاہ،

مرورودی فخرالدین مبارک شاہ معروف بہ فخرِ مدبّر سے الگ شخصیت ہے۔ دیکھیے میرے مجموعۂ مضامین بنام قند پارسی ص ۲۸۶۔ نیز مقدمۂ آداب الحرب مطبوعہ از سہیلی ص ، ۰ یاد داشتہای قزوینی ج ۔ ۵۔ ۶ ص ۹۵ ۔ ۹۹۔

(۶) تاریخ فخرالدین مبارک شاہ ص ۶۲

(۷) ایضاً ص ۱ ، ۲ ۔

(۸) ایضاً ص ۴۳ ۔ ۵ ،

(۹) ابو مسلم کے حالات کے لیے دیکھیے زین الاخبار ۔ تصحیح عبدالحی حبیبی ۔ بنیاد فرہنگ ایران ۱۳۳۰ شمسی ۔ ص ۱۱۸ بعد ، ۲۱۰

(۱۰) یہ حملے آداب الحرب میں نہیں ۔ بعد کے اضافے ہیں ۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آداب الملوک و کفایۃ الملوک جس کا نسخہ انڈیا آفس میں ہے ۔ بعد کی روایت ہے ۔ ابھی کسی محقق نے دونوں کے متن کا مقابلہ نہیں کیا ہے ۔ البتہ کچھے اضافی ابواب سرور مولائی نے چھاپ دیے ہیں ۔ لیکن نہ انھوں نے آداب الملوک کا مقدمہ درج کیا اور نہ دونوں کے متنوں کا مقابلہ کیا ہے ۔ اس سے معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف نے دوسری روایت میں کتنا ردوبدل کیا ہے ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آداب الملوک کا تنقیدی متن شایع ہو ۔

(۱۱) ترجمۂ تاریخ یمینی ۔ باہتمام دکتر جعفر شعار ۔ بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب ، تہران ۱۳۴۵ ۔ ص ۲۱۳

(۱۲) یہ سبکتگین کے قبل غزنی کا امیر تھا ۔ الپتگین کا بیٹا ابو اسحاق ۳۵۵ ھ میں فوت ہو گیا تو امرا نے بلکا تگین کو تخت نشین کرایا ۔ اس نے دس برس حکومت کی ۔ اس کی وفات پر سبکتگین امیر غزنی مقرر ہوا ۔ اس کے نام اور مدّت حکومت میں اختلاف ہے ۔ طبقات ناصری ج ۱ ص ۲۲۸ میں بلکاتگین ہے لیکن راورٹی نے Balkategin لکھا ہے ۔ ڈاکٹر ممتاز صاحب کے یہاں بائے مکسور ہے ۔ دیکھیے Some Persan Prose Writing" ، مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۰ ، ص ۵۵ ۔ نیز راورٹی ترجمۂ طبقات ج ۱ ص ۳۷ ، ۳۰ ، ۷۹ وغیرہ

(۱۳) سامانیاں کے امرا میں تھا ۔ پہلے احمد بن اسماعیل سامانی کا غلام تھا ۔ ترقی کرتے کرتے امیر خراسان ہوا ۔ ۳۵۰ ھ میں وفات پائی ۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابواسحاق دو

سال امیر رہا۔ اس کے بعد یلکا تگین۔ رک آداب الحرب و الشجاعہ ص ۲۶۶ ح

(۱۴) تمام تاریخوں میں دس سال ہے۔ دیکھیے حاشیہ ۱۱

(۱۵) آداب الحرب والشجاعہ میں التتمش کے القاب میں ناصر امیرالمومنین ہے۔ اور یہ خطاب المستنصر باللہ کی طرف سے اسی سنہ میں ملا تھا۔ دیکھیے حاشیہ ۲

(۱۶) آداب الحرب والشجاعہ ص ۲۶۶۔ نیز دیکھیے حاشیہ ۲

(۱۷) ص ۱۵۳ - ۱۸۹

(۱۸) ایران شناسی۔ از انتشارات بنیاد کیہان Bethesda Maryland U.S.A. ۔ سال اوّل شمارہ اوّل ص ۸۸ - ۱۱۴ -

(۱۹) دیکھیے نذر مختار ص ۱۶۱ بعد۔ اس سلسلے کی تفاصیل تاریخ سیستان۔ تصحیح ملک الشعراء بہار۔ تہران ۱۳۱۴ سے لی گئی ہیں۔

(۲۰) یہ صفاری عہد کا بڑا مشہور سپہ سالار اور امیر تھا۔ اس کے حالات سے تاریخ سیستان کے اوراق پر ہیں۔

(۲۱) دیکھیے تاریخ سیستان ص ۲۹۳ - ۲۹۶ ، ۳۰۱ ، ۳۱۴ و زین الاخبار ۱۳۷ - ۱۳۹ ۔ منصور بن اسحٰق اور محمد بن زکریا رازی کے تعلق سے راقم نے ایک مقالہ انگریزی میں لکھا تھا لیکن یاد نہیں آتا کہ وہ کہاں چھپا تھا۔

(۲۲) یہ علم طب پر ایک مشہور کتاب ہے جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ محمد بن زکریا نے اس کو منصور بن اسحاق بن احمد بن اسد حاکم رے کے نام پر لکھا تھا۔

منصور ۲۹۰ھ میں اپنے چچا زاد بھائی احمد بن اسماعیل بن احمد بن اسد۔ (دوسرا سامانی امیر) کی طرف سے حاکم رے مقرر ہوا ۶۰ سال تک اس خدمت پر مامور رہا۔ بظاہر اسی مدت میں (یعنی منصور کی حکومت رے۔ ۲۹۰ھ تا ۲۹۶ھ) محمد بن زکریا رے میں مقیم تھا اور اسی وقت اس نے کتاب منصوری تالیف کی۔ منصور نے ۳۰۲ھ میں تیسرے سامانی بادشاہ نصر بن احمد کے خلاف بغاوت کی تھی (حواشی چہار مقالہ بقلم میرزا محمد قزوینی ص ۲۳۱ - ۲۳۲)

(۲۳) رک: نذر مختار ص ۱۹۳ - ۱۹۶

(۲۴) ماکان بن کاکی دیلمی باتفاق جمہور مورخین امیر ابو علی احمد بن محتاج چغانی کے

ہاتھوں ۳۳۹ھ میں جرجان و رے کی مہم میں مارا گیا۔ نظامی عروضی نے سہواً اس کا قتل سپہ سالار تاش کے ہاتھوں بتایا ہے۔ رک تعلیقات چہار مقالہ ص ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۶۴

(۲۵) تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ سیستان ص ۳۱۶ ۔ ۳۲۴ ذیل عنوان حدیث نصر بن احمد با امیر ابوجعفر۔ پورا قصیدہ تاریخ سیستان میں درج ہے۔

(۲۶) دیکھیے نذر مختار ص ۱۸۲ ۔ ۱۹۰

(۲۸) تعلیقات چہار مقالہ ص ۱۹۲ ۔ ۱۹۳ قزوینی نے یہاں خلف کے متعلق مفید اطلاعات بہم پہنچائی ہیں جو مختصراً درج کی جاتی ہیں:

(چہار مقالہ میں اس کو امیر خلف بانو کہا گیا ہے) امیر ابواحمد خلف بن احمد بن محمد بن خلف بن لیث صفاری خاندان کا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو خلف بانو (بہ اضافہ نام مادر) کہتے ہیں۔ وہ فضلاء و علمائے عصر میں تھا۔ اور زمانے کے بڑے سخیوں میں اس کا شمار تھا۔ بدیع الزماں ہمدانی اور ابوالفتح لبتی نے اس کی مدح میں قصائد (عربی) لکھے ہیں۔ یہ اشعار تاریخ یمینی و یتیمۃ الدھر ثعالبی میں درج ہیں۔ اس کے حکم سے علمائے عصر نے ایک عظیم تفسیر قرآن لکھی۔ اس پر بیس ہزار دینار صرف ہوئے۔ اس کا نسخہ مدرسۂ صابونی میں تھا۔ ان فضائل کے باوجود قساوت قلبی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا الخ

نذیر احمد
۶۳۵/۳ سرسید نگر۔ علی گڑھ
۱۸ اپریل ۱۹۹۵ء

ڈاکٹر نذیر احمد:

مقدمۂ جامع دیوان حافظ کے بارے میں ایک مختصر گزارش

حافظ پر مغرب اور مشرق میں خاصا کام ہوا، مشرق میں ان کے کلام کے تعین کی زیادہ کوشش ہوئی۔ اس سلسلے میں الحاق کی بحث سامنے آئی۔ علامہ قزوینی پہلے دانشور ہیں جنھوں نے حافظ کے کلام کا انتقادی متن تیار کرنے کا اقدام کیا، اور یہ اقدام ایک ایسے نسخے کی دریافت کا نتیجہ تھا جس کی تاریخ کتابت ۸۲۷ھ ہے اور اس وقت تک کا دریافت شدہ سب سے قدیم کامل نسخہ تھا۔ لیکن ان کے معروضے سے بعض غلط نتیجے برآمد ہوئے۔ خاص طور پر الحاق کے تعین کے اصول کے بارے میں۔ اس سلسلے میں کافی لکھا جاچکا ہے۔ اس لیے ہمارے اس مقالے کا یہ موضوع نہیں ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں مقدمۂ جامع دیوان حافظ کے بارے میں مختصر سی گزارش ہے۔ حق بات یہ ہے کہ کلام حافظ کے تعین کی کوشش ہوئی لیکن نہ مقدمۂ جامع دیوان اور نہ خود جامع دیوان کے بارے میں قابل ذکر کام ہوا۔ اس امر خاص میں علامہ قزوینی کا نام آتا ہے۔ انھوں نے مقدمۂ جامع دیوان کا ایک انتقادی متن تیار کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے دو تین اہم نتائج کی طرف توجہ کی، اول یہ کہ جدید نسخوں میں جو مقدمہ ہے وہ قابل اعتبار نہیں، اس میں الحاق ہے۔ دوم یہ کہ جامع مقدمۂ دیوان جیساکہ نسبۃً جدید تر نسخوں میں محمد بن گل اندام = گلندام ملتا ہے۔ غلط ہے۔ دراصل جامع مقدمۂ دیوان کی شخصیت مجہول ہے۔ تیسرے یہ کہ جدید نسخوں کے مقدمے میں حافظ کی تاریخ وفات ۷۹۱ھ مع ایک قطعہ شعر کے درج ہے (۱) یہ تاریخ غلط ہے۔ حافظ ۷۹۲ھ ہے میں مرے۔ ان امور پر گفتگو کرنے سے قبل ہم مقدمے کے مآخذ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہیں گے۔ علامہ قزوینی نے ۱۸ نسخوں کی مدد سے دیوان حافظ کا انتقادی متن ۱۳۶۰ھ میں تیار کیا، ان سارے نسخوں کی تفصیل انھوں نے درج کردی ہے۔

علامہ نے گیارہویں بارہویں صدی کے نسخوں کی مدد سے مقدمۂ جامع دیوان چھاپ دیا ہے۔ قدیم نسخے جن میں مقدمہ شامل تھا، وہ علامہ کو نہ مل سکے۔ برٹش میوزیم کا نسخہ جو ۸۲۱ھ کا

مکتوبہ تھا اور جس میں مقدمہ (۲) شامل تھا۔ اور جس کا انھیں علم تھا۔ بعض موانع کی وجہ سے وہ نسخہ دستیاب نہ ہوسکا۔ خلاصہ یہ کہ علّامہ نے گیارہویں اور بارہویں صدی کے نسخوں کی بنیاد پر مقدّمۂ جامع دیوان کا ایک انتقادی متن مفید حواشی کے ساتھ چھاپ دیا ہے۔ اور جن نسخوں پر ان کے انتقادی متن کی بنیاد ہے اُن کی تفصیل علّامہ نے درج کردی ہے۔ اس ضمن میں ان نسخوں کا بھی ذکر آجائے گا جو دیوان کی تنقید و تصحیح میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور جن میں سے بعض میں مقدمہ جامع نہیں ہے:۔

۱۔ نسخۂ خلخالی "خ" ۸۲۷ھ کا مکتوبہ اور اُس وقت تک سب سے قدیم نسخہ۔ اس میں مقدّمہ نہیں۔

۲۔ نسخہ "نخ"۔ تاریخ کتابت درج نہیں لیکن خط۔ املا وغیرہ کی ساری خصوصیات اس نسخے میں پائی جاتی ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ نسخہ خود حافظ کے عصر سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ اس میں مقدّمہ نہیں۔

۳۔ نسخہ "ر"۔ اس میں تاریخ کتابت درج نہیں ہے لیکن خط کی وضع سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ قدیم ہے اور عصر حافظ کے نزدیک کا ہے۔ اس میں مقدّمۂ جامع نہیں۔

۴۔ نسخہ "ق"۔ اس میں تاریخ کتابت درج نہیں لیکن املا اور خط سے ظاہر ہے کہ اواخر قرن نہم یا اوائل قرن دہم کا نسخہ ہے۔ مقدّمہ فی الحال موجود نہیں (انھی چار نسخوں پر دیوان حافظ کے انتقادی متن کی بنیاد ہے)۔

۵۔ نسخہ "ل"۔ تاریخ کتابت درج نہیں۔ یہ نسخہ اوایل قرن یازدہم کا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں مقدمہ موجود نہیں۔

۶۔ نسخہ "م"۔ اس میں تاریخ کتابت نہیں ہے۔ یہ نسخہ قرن یازدہم کا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں مقدمہ نہیں پایا جاتا ہے۔

۷۔ نسخہ "س"۔ تاریخ کتابت شامل نہیں۔ یہ نسخہ عام نسخوں سے مختصر ہے۔ یہ نسخہ مقدمۂ جامع دیوان سے عاری ہے۔ قرن یازدہم کا نسخہ ہے۔

۸۔ نسخہ "ی"۔ تاریخ کتابت درج نہیں۔ گیارہویں صدی ہجری کی کتابت ہوگی۔ اس میں مقدمۂ جامع دیوان موجود ہے۔

۹۔ نسخۂ "تقوی" (اول)۔ تاریخ کتابت ۱۴ شعبان ۱۰۲۶ھ ہے۔ مقدّمہ اس میں موجود ہے

۱۰۔ نسخۂ "تقوی" (دوم)۔ تاریخ کتابت ۱۱۱۲ھ ہے اس میں مقدّمہ موجود ہے۔

۱۱۔ نسخۂ "حن" ۔ اواخر قرن یازدہم کا ہے لیکن بہت قدیم نسخے سے نقل ہوا ہے۔ چنانچہ نسخے میں اصالت و سادگی اور حذف زواید کی علامتیں ملتی ہیں۔ اس میں مقدمۂ دیوان موجود ہے۔ اس کے ذیل میں علامہ کی حسب ذیل عبارت پائی جاتی ہے:

این نسخہ یکی از نسخ چہار گانہ ایست (حن ۔ ہندی ۔ دبیر خاقان، باء کہ چون ہمہ دارای ہمین خصوصیات مذکورہ می باشند ما آنہارا اساس طبع مقدمۂ جامع دیوان خواجہ قرار دادہ ایم و آنہارا جزو طبقۂ اول تحریر این مقدمہ باید محسوب داشت ہم اولیت زمانی وہم اولیت رتبہ و باقی نسخ ہشت گانہ آتی الذکر را جزو طبقۂ دوم تحریر ہمان مقدمہ یعنی جزو نسخی کہ از بعضی عبارات الحاقی و تصرفات جدیدہ کہ بعدہا در نسخ متاخرہ این مقدمۂ داخل شدہ خالی نیستند و اغلب نسخ خطی جدید و جمیع نسخ چاپی ایران و ہندوستان وغیرہ از ہمین طبقۂ اخیر اند۔

۱۲۔ نسخۂ "ہندی" ۔ یہ نسخہ بے تاریخ ہے۔ شاید اواخر قرن دوازدہم یا اوائل قرن سیزدہم ہو، اس میں مقدمہ موجود ہے، یہ نسخہ بہت صحیح اور حشو و زاوید سے پاک ہے۔ اس سے واضح ہے کہ کسی قدیم نسخے کی نقل ہے۔

۱۳۔ نسخۂ "نواب" ۔ ۱۲۵۱ھ کا لکھا ہوا ہے، صحت و سقم کے اعتبار سے متوسط درجے کا ہے۔ اس میں مقدمہ شامل ہے۔

۱۴۔ نسخۂ "دبیر خاقان" ۔ اس میں تاریخ کتابت درج نہیں، لیکن شاید باباشاہ اصفہانی (م ۱۰۱۲ھ) کے خط میں ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو یہ نسخہ برٹش میوزیم کے نسخے (ریو، جلد ۲ ص ۶۲۸) سے قدیم ہے، برٹش میوزیم کا نسخہ ۹۲۱ھ کا ہے جس میں مقدمہ شامل ہے لیکن وہ علامہ قزوینی کو نہ مل سکا۔ یہ نسخہ مقدمۂ جامع کی تصحیح میں بنیادی نسخوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مقدمے میں دو تین ورق غائب ہیں۔

۱۵۔ نسخۂ "باء" ۔ اس کا زیادہ حصہ قرن دہم کا ہے، اس کا مقدمہ اگرچہ خط جدید میں ہے لیکن قدیم نسخے کی نقل ہے، اور اس لیے بہت معتبر ہے۔ اس مقدمے کے تنقیدی متن متن میں اسے نسخۂ اساس کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۶۔ نسخۂ "الف" ۔ اس نسخے کا مقدمہ طبقۂ دوم کی تحریر کا جزو ہے۔

۱۷۔ نسخۂ "سپ" ۔ ۱۰۲۷ ہجری کی کتابت، کاتب عرب شاہ بن شاہ محمد حسینی۔ اس میں

مقدمہ ہے، لیکن یہ طبقۂ دوم کی تحریر کا نمایندہ ہے۔

۱۸۔ نسخۂ ملک " ۰ تاریخ کتابت نہیں ہے دسویں صدی کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل کا نسخہ ہوگا۔ کاتب کا نام ہدایت اللہ ہے ۰ یہ بھی طبقۂ دوم کی تحریر کا نمائندہ ہے۔

تفصیلات بالا سے واضح ہے کہ علامہ قزوینی کو مقدمۂ جامع دیوان کا نہ کوئی قدیم نسخہ اور نہ کوئی تاریخ دار نسخہ ملا۔ (اور بعض وجوہ سے برٹش میوزیم کا ۹۴۱ھ کا نسخہ بھی دستیاب نہ ہوسکا) اس لیے جو متن انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کیا ہے۔ وہ رطب و یابس سے پاک نہیں اور باوجود اس کے کہ انتقادی ذہن قدم قدم پر نمایاں ہے، لیکن بعض جگہ وہ صحیح متن کی ترتیب میں ناکام رہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ تقریباً تیس پینتیس سال قبل مجھے کئی سال کی کوشش کے بعد (اس کی تفصیل مجلۂ ایران نامہ ۰ واشنگٹن ڈی سی ۰ سال پنجم میں درج ہے) ایک ایسے نسخے کے حصول میں کامیابی ہوئی (جو نسخۂ گورکھپور کے نام سے تہران میں ۱۹۷۱ء میں شایع ہوا، اس کے بعد اس کی چھے یا سات اشاعتیں ہوئیں)۔ یہ نسخہ ایک مجموعے میں ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ دیوان سعدی بنام مصلح الدّین مصلح، ورق ۱ تا آخر مجموعہ

۲۔ حاشیہ ۰ ورق ۱ تا آخر نسخہ ۰ شامل منظومات زیر۔

(الف) مثنوی جمشید و خورشید	ورق ۱ تا ۴۴ ب
(ب) دیوان حافظ	ورق ۴۵ الف تا ۱۴۰ الف
(ج) دیوان جلال عضد	ورق ۱۴۱ الف تا ۲۱۱ ب
(د) منتخب دیوان کمال خجند	ورق ۲۱۲ الف تا ۲۶۳ ب

دیوان حافظ کے خاتمے پر (ورق ۱۴۰ الف) کاتب کا نام اس طرح آیا ہے۔

" تم الدیوان بعون الملک المنان بید الفقیر الرّاجی الی رحمۃ ربہ الباری محمد بن سعید بن عبداللہ القاری عفر اللہ لہ ولصاحبہ الخ"

اور سعدی کے دیوان کے آخر میں یہ عبارت ہے:

"تمت الدیوان من کلام ملک المشایخ و العلماء افضل الشعرا الملح المتکلمین افصح المتاخرین قدوۃ السالکین مشرّف الدّین سعدی بن مصلح الشیرازی عفر اللہ لہ الخ"

آخری ورق کے حاشیے میں کاتب نسخہ کے نام کی تکرار اور تاریخ کتابت درج ہے:

- تم الکتاب المتن و الحاشیۂ انتخاب الدیوان الشیخ العارف الفاضل الکامل ملک الشعراء المتاخرین عمدۃ السالکین کمال الملۃ والدین الجندی روح اللہ روحہ علیٰ یدی العبد الضعیف المحتاج الیٰ رحمۃ ربہ الباری محمد بن سعید بن عبداللہ الحافظ القاری اصلح اللہ احوالہ فی سلخ ذی الحجہ اربع عشرین و ثمانمائۃ الہجریہ الصلوۃ علیٰ نبیہ محمد و آلہ اجمعین۔

حافظ کے دیوان کے شروع میں مقدمۂ جامع دیوان شامل ہے جس میں پہلا ورق غائب ہے۔ یہ دیوان مع مقدمۂ جامع دیوان کے ۱۹۷۱ء میں پہلی بار شائع ہوا اور ساتواں ایڈیشن ۱۳۷۰ (۱۹۹۲ء) میں امیر کبیر تہران سے شائع ہوا اور اس کا مقدمہ علامہ قزوینی کے مقدمے سے کافی متفاوت ہے۔ لیکن جہاں تک میرا علم ہے اب تک کسی حافظ شناس نے اس مقدمے کی اصالت و اہمیت کے بارے میں ایک سطر نہیں لکھی۔ میں اس بے توجہی کی وجہ نہیں جانتا لیکن یہ بات کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ فارسی کے محبوب ترین شاعر کے بارے میں سب سے اہم بنیادی مأخذ کی طرف سے بے اعتنائی اگر قابل ملامت نہیں تو قابل گرفت تو ضرور ہے۔ اس اہم اساسی مأخذ کی دریافت کا تعلق ایک ہندوستانی سے ہے۔ اس بے اعتنائی و عدم اعتراف کی وجہ شاید ملی احساس کمتری ہو۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اس مقدمے کا پہلا ورق غائب ہے۔ چنانچہ یہ پہلا ورق نسخہ گورکھپور کے ایڈیشن میں مقدمۂ قزوینی سے ماخوذ ہے۔ باوجود اس کے کہ دونوں نسخوں میں شائع شدہ مقدموں کی عبارت میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اہم امور میں اتحاد ہے۔ مثلاً قزوینی کے نسخے میں ص صو حاشیہ ۴ میں ہے: در بعضی نسخ خطی جدید و در اغلب نسخ چاپی بعد ازیں بیت عبارت ذیل را علاوہ دارند:

خصوصاً امام المشارق و المغارب جامع اصناف حقایق و معارف قائل کلمۂ انا کلام اللہ الناطق اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب۔

شہنشہی کہ سحر گاہ روز فطرت بود   غرض وجود شریفش ز خلقت انسان

بکری کہ ز لطف قدیم لم یزلی   حدیث منقبتش گشتہ زیور قرآن

امیر ملک ولایت کہ شد ز مبدأ حال   برائی مدحت او مستعد نطق زبان

اطلاعاً عرض ہے کہ نسخۂ گورکھپور میں عبارات بالا غائب ہیں، اس لیے اس کے الحاقی قرار دینے میں کوئی امر مانع نہیں۔ علّامہ قزوینی نے عبارت بالا نقل کرکے اس طرح محاسبہ کیا ہے:

ولی در ہیچیک از نسخ قدیمہ مانند حن و ہندی و ملک و نسخۂ آقای رشید یاسمی و دبیر خاقان و نسخۂ آقای تقوی شمارہ ۲ بیچ وجہ من الوجوہ از جملۂ مزبور اثری نیست و بدون شک الحاقی می باشد از متاخرین در عہد صفویہ بقصد اینکہ خواجہ را نظر بہ بعضی مصالح شیعہ قلمداد کنند (حاشیہ ص صز)

نسخۂ گورکھپور، ص ۳:

"امّا بعد بر نقّادان رشتۂ بلاغت و جوہریان روز بازار فضل و براعت"

اکثر نسخوں میں رشتۂ بلاغت ہے، لیکن علّامہ قزوینی نے آقا ملک کے نسخے کی بنیاد پر رستۂ بلاغت لکھا ہے اور یہ توجیہ پیش کی ہے: وچنیں است یعنی رستہ باسین مہملہ در نسخۂ آقای حاج حسین آقا ملک و بدون شبہہ ہمان صواب است لاغیر بقرینۂ فقرۂ معادلہ آن در سجع بعد "وجوہریان روز بازار فضل و براعت" چہ رستہ بفتح راء و سکون سین مہملہ نیز بمعنی بازار است ، سایر نسخ رشتہ (باشین معجمہ) و آن تصحیف است۔

"امّا تفنّن اسالیب کلام تراکیب نثر و نظام"

اور تمام نسخوں میں دوسرا فقرہ اس طرح ہے:

تنوّع تراکیب نظم و نثر

علّامہ قزوینی لکھتے ہیں:

و بقرینۂ اینکہ تمام فقرات این مقدّمہ بدون استثنا مسجع است ، اینجا نیز برای سجع با کلام بدون شک نظام بطبق نسخۂ آقای یاسمی انسب است از "نظم و نثر" سایر نسخ و نظام مرادف نظم بہمان معنی است یعنی شعر و کلام منظوم (منتہی الارب)

نسخۂ گورکھپور (ص ۳) میں یہ فقرہ اس طرح ہے:

"وتنوّع تراکیب و نظام"

اس سے علّامہ کے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔

نسخۂ گورکھپور ص ۶ : موافق رسوم و اوضاع بود، در تقبیح و تحسین و نفرین و آفرین بہ اعتبار مقتضیات مقام و اعتنا و اہتمام بشان افتراض و اغتنام ہنگام ایراد کلام فصل و وصل و تعریف و تنکیر و تقدیم و تاخیر و ابہام و توضیح و کنایت و تصریح و ایجاز و اطناب و خواص افادت در ہرباب بریں یک مسئلہ مبتنی و متکلم علی الحقیقہ برعایت این دقیقہ معتنی

علّامہ قزوینی اس عبارت اضافی (در متن این عبارت نیامدہ) کے بارے میں حاشیہ (ص صط) میں لکھتے ہیں : بعضی نسخ جدیدہ عبارت ذیل را اینجا علاوہ دارند " در تقبیح و تحسین ... این دقیقہ معتنی" ولی در نسخ قدیمہ مانند حن و ہندی و دبیر خاقان و تقوی ۲ و باء کہ اساس طبع این مقدمہ اند از جملہ مزبور اثری نیست۔

واضح ہے کہ علّامہ کا یہ قیاس کہ عبارت بالا صرف جدید نسخوں میں ہے، غلط ہے، یہ سب سے قدیم مکشوف نسخے میں موجود ہے، دوسرے یہ قیاس کہ یہ عبارت الحاقی ہے، غلط ہے۔ یہ مقدمۂ جامع کی اصل عبارت ہے۔

نسخۂ قزوینی " (ق) میں ہے :

مخلص این کلمات و متخصص این مقدمات ذات ملک صفات مولانا الاعظم السعید المرحوم الشہید مفخرالعلما ، استاد نحاریر الادباء ...

حاشیہ میں ہے : متخصص کے بجائے اکثر نسخوں میں متقص یا مخصص یا ملخص ہے۔ نسخۂ گورکھپور میں ملخص ہے۔ (نسخۂ گورکھپور ص ۵)

" الشہید " پر علّامہ کا حاشیہ یہ ہے :

چنین است در اغلب نسخ موجود نزد انجانب (از یازدہ نسخہ) و مقصود ازین کلمہ درین جا یعنی در مورد خواجہ درست معلوم نشد کہ بچہ مناسبت اطلاق کلمۂ " شہید " بر او شدہ است۔

تعجب ہے کہ علّامہ قزوینی کا ذہن اس طرف کیوں نہ منتقل ہوا کہ شہید بمعنی داتندہ بے گمان (دستور الاخوان) آنکہ از علم او چیزی فوت نہ شود، واللہ شہیدٌ، ای لایغیب من علمہ شیٔ (ناظم الاطبا) آنکہ از علم او ہیچ غائب نباشد (منتخب و غیاث) عالم بغایب و حاضر (فرہنگ معین)

قزوینی (ص ق س ہ) در درج انشا درج کردہ کے بعد : " گاہ سرخوشان کوی محبت را... منم آلودہ دامنم چہ عجب ہمہ عالم گواہ عصمت اوست . لاجرم رواحل" ص قدس ، بقدر ساڑھے تین صفحہ عبارت متن میں ہے، اور حاشیے میں ہے : "از اینجا تا ابتدائے سطر ، از صفحہ "قد" تا کلمہ رواحل غزلہای جہانگیرش، از چہار نسخۂ ملک و تقوی ۲ و باء و نسخۂ رشید یاسمی ایکلی ساقطست" چونکہ دوسرے اور نسخوں میں یہ عبارت ہے، اس لیے علامہ نے اس کو متن میں درج کر کے اس کی صداقت پر مہراثبات ثبت کردی ہے، لیکن چونکہ قدیم ترین نسخۂ گورکھپور مکتوبہ ۸۲۴ھ میں یہ ساڑھے تین صفحے والی عبارت موجود نہیں ، اس لیے اس کے الحاقی ہونے میں شبہے کی کم گنجایش ہے ۔ بہرحال متن میں اس کے شامل ہونے کا موقع نہیں۔

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ساڑھے تین صفحے والی اضافی عبارت میں یہ جملہ ہے : و رشحات اقلام خضر خاصیتش بر سریر سخن ید بیضا نمودہ (قزوینی ص قب) اس پر علامہ قزوینی نے یہ حاشیہ لکھا ہے:

این عبارت بکلی ساختگی و فاسد بنظر می آید چہ معجزۂ ید بیضا را حضرت موسی در مصر در مقابل تخت فرعون ابراز نمودہ نہ در کوہ طور کہ در شبہ جزیرۂ سینا ، ما بین مصر و شام واقع و موقع مناجات حضرت موسی بودہ با حضرت احدیت ۔ پس چگونہ کلیم کلام معجز نظامش در طور سخنوری ید بیضا نمودہ است !

جہاں یہ اضافی عبارت نسخۂ قزوینی میں ختم ہوتی ہے (ص قد) اس کے حاشیے میں علامہ قزوینی نے ساری عبارت کے الحاقی ہونے کا احتمال ظاہر کیا ہے۔ کہتے ہیں :

از اواسط سطر ہ در ص قا از کلمۂ " گاہ سرخوشان کوی محبت را " چنانکہ در ہمان جا نیز بدان اشارہ شد تا اینجا بکلی از چہار نسخۂ ملک و تقوی ۲ و باء و ی ساقطست و بعید نیست تمام این جملہ طویل الحاقی باشد چہ نوع مطالب آن و طرز انشاء آن و مخصوصاً عدم تقید تام آن بسجع با سایر قسمتہای این مقدمہ تا درجۂ متفاوت بنظر می آید ۔

نسخۂ قزوینی ص قو :

" اما بواسطہ محافظت درس قرآن و ملازمت بر تقویٰ و احسان و بحث کشاف و مفتاح و مطالعۂ مطالع و مصباح و تحصیل قوانین ادب و تجسس دواوین عرب بجمع اشتات غزلیات نپرداخت و بہ تدوین

اثبات ابیات مشغول نشد "

اور اس نسخے کے حاشیے میں یہ عبارت علامہ قزوینی نے لکھی ہے:

این عبارت اخیر یعنی " و ملازمت بر تقویٰ و احسان" مطابق حن و بندی و نسخۂ آقای دبیر خاقان است کہ اقدم و اصح نسخ دارای این مقدمہ می باشد ۔ سایر نسخ جدیدہ و نسخ چاپی بجای آن و ملازمت شغل سلطان یا و ملازمت تعلیم سلطان ــــــ و این نسخۂ بدل برای شرح احوال حافظ خالی از اہمیت نیست چہ بنابر نسخ جدیدہ حافظ ملازمت شغلی از اشغال سلطانی را می نمودہ یا معلم سلطان بودہ است در صورتی کہ بنا بر سہ نسخہ قدیمی مذکور ابداً چنین چیزی در بین نبودہ و خواجہ جز بمحافظت درس قرآن و ملازمت بر تقویٰ و احسان و تحصیل علم و ادب و تجسس دوادین عرب بشغلی دیگر از اشغال دنیوی نمی پرداختہ است۔

بحث کشاف و مفتاح پر علامہ قزوینی نے یہ حاشیہ لکھا ہے:

چنین است صریحاً و واضحاً در ہمان سہ نسخۂ مذکورہ ۔ نسخ جدیدہ و تحشیہ کشاف و مفتاح ۔ و این نسخۂ بدل بہمان لحاظ مذکور بی اہمیت نیست چہ بنا بر نسخ جدیدہ ۔ حافظ حواشی بر کشاف و مفتاح نگاشتہ بودہ در صورتیکہ بنا بر سہ نسخۂ اول خواجہ فقط بہ بحث و تدقیق و مطالعۂ کتب مذکور می پرداختہ است۔

ان دونوں حواشی کا خلاصہ یہ ہے کہ دیوان کے قدیم اور معتبر نسخوں کے اعتبار سے حافظ تقویٰ و احسان سے جڑا ہوا تھا (ملازم) اور کشاف و مفتاح کی بحث و تدقیق اور مطالع و مصباح کے مطالعے میں مشغول رہا کرتا تھا، اور جدید نسخوں اور مطبوعہ دیوان کے اعتبار سے حافظ بادشاہ کی تعلیم پر متعین تھے اور کشاف اور مفتاح پر حواشی لکھے تھے۔ دراصل یہ آخری امور جو مطبوعہ اور جدید قلمی نسخوں سے متعلق بتائے گئے ہیں، وہ سب سے قدیم نسخۂ گورکھپور مکتوبہ ۸۲۴ھ میں موجود ہیں۔ چنانچہ اس قدیم نسخے کی عبارت یہ ہے:

بلی محافظت درس قرآن و ملازمت شغل تعلیم سلطان و تحشیہ کشاف و مفتاح و مطالعۂ مطالع و مصباح و تحسین قوانین ادب و تحسین دوادین عرب از جمع اثبات غزلیاتش مانع آمدی و از تدوین و اثبات ابیاتش وازع گشتی ۔ (ص ۶)

مقدمۂ جامع دیوان سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کی تعلیم کے علاوہ ان کا چار کتابوں سے خصوصی تعلق تھا۔ وہ چار کتابیں یہ ہیں :-

کشّاف ، مفتاح ..... ان پر حاشیہ لکھا۔

مطالع و مصباح ..... ان کا دقیق مطالعہ کرتے تھے ۔

کشّاف : محمود زمخشری کی عربی زبان میں تفسیر ہے جس کا عنوان الکشّاف عن حقیقۃ التنزیل ہے۔ اس تفسیر میں صرفی و نحوی امور ، شان نزول آیات و قراءت و مسائل اعتقادی معتزلہ سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کی متعدد شرحیں اور اس پر متعدد دانشمندوں نے حواشی لکھے ہیں۔ انھی میں سے ایک الکشف ہے جو سراج الدین عمر بن عبدالرحمٰن قزوینی (وفات ۷۴۵ھ) کی تالیف ہے ۔ مؤلف کتاب مولانا قوام عبداللہ کے شاگرد تھے ۔ حافظ بھی انھی قوام الدین عبداللہ کے شاگرد تھے۔ مگر دونوں شاگردوں کی تاریخوں میں اختلاف ہے۔ سراج الدین عمر مولانا قوام الدّین کے شروع کے شاگردوں میں ہوں گے اور حافظ بعد کے۔ کشف الکشّاف کے نسخے کے لیے دیکھیے حاشیہ شد الازار ص ۸۶ بقلم علامہ قزوینی کشّاف علیٰ الکشّاف تالیف شیخ الاسلام سراج الدّین عمر بن اسلان بلقینی ۔ زمخشری کی کتاب پر حاشیہ ہے (فرہنگ معین ج ۶ ص ۱۵۰۹)، نیز رک : کشف الظنون مادہ کشف۔

مفتاح : مفتاح نام کی متعدد کتابیں ملتی ہیں ۔ کشف الظنون میں مفتاح نام کی چند کتابوں کا ذکر ہے۔ ان میں سب سے مشہور مفتاح العلوم سکّاکی (م: ۶۲۶ھ) کی ہے جس پر متعدد فضلاء نے حواشی اور شرحیں لکھیں۔ شارحین میں حسام الدّین الموذنی خوارزمی (م: ۷۳۲ھ) ۔ قطب الدّین بن محمود بن مسعود بن مصلح الشیرازی (م: ۷۱۰ھ) تحشیہ نگاروں میں سعد الدین تفتازانی (م: ۷۹۱ھ) ۔ سیّد شریف جرجانی (م: ۸۱۶ھ) ہیں۔ مولانا قوام الدّین عبداللہ کے استاد مولانا قطب الدّین (م: ۷۲۱ھ) نے سکّاکی کی مفتاح العلوم کا درس اپنے شاگرد صاحبِ شیراز نامہ کو دیا تھا۔ اور خود توضیح کشّاف جو مولانا قطب الدّین فالی کی تالیف ہے۔ اسے شیراز نامے کے مصنف نے خود مولانا قطب الدّین سے پڑھا تھا ۔ (شیراز نامہ ص ۱۹۲) (نیز رک شدّ الازار ص ۳۳۲- ۳۳۵) ۔ خلاصہ یہ کہ مفتاح العلوم سکّاکی حافظ کے استاد قوام الدّین عبداللہ کے درس میں شامل تھی۔ بخوبی ممکن ہے کہ اسی کتاب سے حافظ کی بھی دلچسپی رہی ہو ۔ ویسے کشف الظنون میں مفتاح نام کی کئی تصانیف کا ذکر ہے (ج ۲ ص ۱۷۶۲- ۱۷۷۱)

مطالع : اس نام کی چند کتابوں کا نام کشف الظنون (ج ۲ ص ۱۶۱۱۔ ۱۶۱۶) میں آیا ہے۔ مثلاً
مطالع الاسرار (الانوار) شرح مشارق الانوار۔
مطالع الانوار تالیف عبدالرزاق بن رزق اللہ بن ابی بکر بن خلف بن ابی الہیجا الحنبلی (م ۶۶۱ھ)
مطالع الانوار فی المنطق تالیف قاضی سراج الدین محمود ارموی (وفات ۶۸۲ھ)
مطالع الدقایق فی الفقہ تالیف جمال الدین عبدالرحمٰن بن حسن بن علی الاسنوی الشافعی (وفات ۷۷۲ھ)

لیکن معلوم نہیں کہ حافظ کے مطالعے میں کون سی مطالع رہی ہے۔ چونکہ یہ معاملہ خاصا مشکل ہے۔ اس لیے علامہ قزوینی نے اس مسئلے کو ایسا ہی چھوڑ دیا ہے۔

مصباح : اس نام کی کئی کتابیں کشف الظنون (ج ۲ ص ۱۷۰۳۔ ۱۷۱۱) میں مذکور ہیں۔ جیسے

۱۔ المصباح ی شرح الحاوی الصغیر (۱۷۰۰)
۲۔ المصباح فی فروع الشافعیہ و الحنفیہ تالیف محمد بن احمد القاضی بخاری (وفات ۶۰۴ھ)
۳۔ المصباح تالیف ابو الحسن سلامہ بن عیاض بن احمد النحوی (شامی) (متوفی بعد ۵۳۲ھ)
۴۔ المصباح فی النحو تالیف امام ناصر بن عبید اللہ المطرزی النحوی (وفات ۶۱۰ھ)

اس میں پانچ باب ہیں۔

باب اول : اصطلاحات نحوی
باب دوم : عوامل لفظیہ قیاسیہ
باب سوم : عوامل لفظیہ سماعیہ
باب چہارم : عوامل معنویہ
باب پنجم : فصول من العربیہ

شرحیں : شرح احمد بن محمود الجندی یا محمود بن عمر الجندی۔ موسوم بالمقالید
شرح شیخ علاء الدین علی بن محمد بسطامی مشہور بمصنفک وغیرہ

بہت ممکن ہے کہ حافظ اسی المصباح فی النحو ہی کے مطالعے میں مصروف تھے۔ بہرحال ایسا کوئی قرینہ نہیں جس سے حافظ کے دقیق مطالعے کی کتاب کا تعین ہوسکے۔

نسخۂ قزوینی میں ہے : مسود این ورق عفا اللہ عنہ سبق الخ
اس پر علامہ قزوینی نے حاشیے میں مسوّد ورق کے سلسلے میں لمبی بحث کی ہے۔ وہ

لکھتے ہیں کہ گیارہ نسخوں میں یہ مقدمہ نقل ہے۔ ان میں سے حسب ذیل سات نسخوں میں جو قدیم تر ہیں، بقیہ چار نسخوں سے زیادہ صحیح ہیں۔ حن۔ ہندی۔ نسخۂ دبیر خاقان۔ نسخۂ رشید یاسمی۔ نسخہ دوم آقای تقوی۔ نسخۂ آقای ملک و نسخۂ باء۔ جملہ دعائیہ عفا اللہ عنہ ماسبق کے بعد جامع مقدمہ کا نام مطلق نہیں ہے۔ نہ ان میں محمد گلندام کا نام ہے اور نہ کسی اور کا۔ جب کہ بقیہ چار دوسرے نسخوں میں ... نسخۂ الف، سپ، نواب و تقوی اول، اور سارے مطبوعہ نسخوں میں (قزوینی ایڈیشن سے قبل کے) کلمۂ "ماسبق" کے بعد "اقل انام محمد گل اندام" (گلندام) کا اضافہ ہے اور یہ فقرہ بقیہ سات نسخوں میں جامع دیوان کا نام مطلقاً نہیں آیا۔ اس لیے اس نام کی اصالت میں شک پیدا ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقدمے میں جامع دیوان کے نام کی عدم موجودگی سے کسی متاخر گمنام شخص نے فائدہ اٹھاکر اپنا نام درج کرلیا جو بعد کے نسخوں میں تواتر کے ساتھ نقل ہوتا رہا۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دولت شاہ سمرقندی کے تذکرے میں جو حافظ سے تقریباً سو سال کے اندر ۸۹۲ھ میں مرتب ہوا) کسی مرتب کا نام درج نہیں۔ ایک تیسرا قرینہ یہ ہے کہ شرح سودی میں جو ۱۰۰۲ھ میں لکھی گئی جامع دیوان کا نام نہیں ملتا۔

علامہ قزوینی کی رائے کی مزید تائید اس بات سے ہو جاتی ہے کہ نسخۂ گورکھپور میں جس کی کتابت حافظ کی وفات کے ۳۲ سال کے اندر ہوتی ہے۔ اس میں جامع دیوان کا نام نہیں ملتا۔ لیکن اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ محمد گل اندام کے نام کا اندراج بہت پہلے ہوا ہے، اس لیے کہ نسخۂ دیوان حافظ مملوکۂ دستالیشکر جو ۹۹۴ھ کا کتابت شدہ ہے۔ اس میں مرتب دیوان کا نام محمد گل اندام درج ہے۔ اس سے علامہ قزوینی کے اس قیاس کی تردید ہوجاتی ہے کہ اس نام کا اضافہ بارہویں صدی ہجری میں یا اس کے بعد ہوا (علامہ قزوینی کے جن نسخوں میں یہ نام ہے وہ گیارہویں بارہویں صدی ہجری کے ہیں)۔

بہرحال علامہ قزوینی کو محمد گلندام کو جامع دیوان حافظ ماننے سے انکار ہے۔ چنانچہ شد الازار کے حاشیے میں ہے (ص ۸۸):

> و بہ تحریض و تشویق ہمین مولانا قوام الدین عبداللہ بودہ است کہ جامع مجہول الاسم دیوان حافظ کہ درین اواخر بغلط مشہور بہ محمد گلندام شدہ در صدد جمع اشعار متفرقہ وی از گوشہ و کنار برآمدہ و مدتی پس از وفات خواجہ این دیوان فعلی اورا ترتیب دادہ است۔

اس سلسلے میں ایک امر کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ راقم الحروف نے حال ہی میں کہیں دیکھا ہے کہ حافظ کے زمانے میں محمد گلندام نام کی ایک اہم ادبی شخصیت گذری ہے، جس کے قصیدے کے کچھ اشعار ایک ہم عصر بیاض میں نقل ہیں۔ بہرحال محمد گلندام کے بارے میں ہماری تحقیق تشنہ ہے۔

مقدمۂ جامع دیوان میں جامع دیوان اور حافظ دونوں کے مشترک استاد مولانا قوام الملۃ والدّین عبداللہ کا ذکر ہے جن کی خواہش پر جامع دیوان نے حافظ کے اشعار جمع کیے اور دیوان کی شکل میں مرتب کیا۔ حافظ کے استاد کے سلسلے کی یہ نفیس اطلاع بہت اہم ہے؛ چنانچہ راقم نے مولانا قوام الدّین عبداللہ پر ایک تفصیلی مقالہ تیار کر لیا ہے جو عنقریب کسی مجلّے میں شایع ہوگا۔ مولانائے مذکور کا سب سے اہم دوسرا مآخذ شد الازار ہے جس میں استاد کے مختصر حالات اس طرح درج ہیں:

مولانا قوام الدّین ابوالبقا عبداللہ بن محمود بن حسن شیرازی، استاد امام، علامہ اور قدوۂ ائمہ روزگار تھے، ایسے فاضل کی مثال کسی اور دور میں نہیں ملتی، وہ جواہر علوم سے پر ایک سمندر تھے، دبدبے، ہیبت اور جلال والے بزرگ تھے، سُنّت کی پیروی میں بڑے راسخ تھے، سچ بولنا اور حق پر عمل کرنا ان کا شعار تھا۔ تعلیم و تعلّم اور ارشاد و تفہیم کی طرف راغب تھے، دین کی راہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کرتے۔ ابتدا میں ادب کی تعلیم اپنے والد مولانا نجم الدین محمود ملقب بہ فقیہ سے حاصل کی، تصوف میں شیخ ظہیر الدین عبدالرحمٰن کے پیرو ہوئے، اور قرآت سبعہ کی تعلیم شیخ محب الدین جعفر موصلی سے حاصل کی۔ ان کی بیٹی سے مولانا کا نکاح ہوا۔ علم فقہ کا حصول مولانا قطب الدین فالی سے ہوا، وہ تقریب، شرح لباب اور اعراب کے مصنّف ہیں۔ یہ تینوں کتابیں مولانا ہی سے پڑھیں۔ اس طرح سارے علوم معقول و منقول میں کمال حاصل کرلیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ دور دور سے علم کی جستجو میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے، پھر مولانا قوام الدین عبداللہ حج بیت اللہ پر گئے۔ اس فراغت کے بعد تبریز پہنچے اور اکابر علما سے صحبت رہی، وہاں سے اپنے وطن شیراز واپس ہوئے اور درس و تدریس کی مجلس منعقد کی، دو تہائی شب گزرتے تک ان کی مجالس قایم رہتیں، کبھی کبھی صبح تک یہ مجلس قایم رہتی، فجر کی نماز کے بعد درس قرآن اور ذکر کی محفل شروع ہوجاتی، اس کے قراءت

سبعہ کا درس ہوتا، آخر میں علوم شرعیہ اور قواعد ادبیہ میں مشغول ہوتے، گویا دن اور رات کے سارے اوقات درس و تدریس میں گذرتے۔ جامع عتیق میں جمعے بعد ان کا وعظ ہوتا۔ اس طرح وہ علمائے کبار کے مرجع بن گئے۔ انھی میں سراج الدین عمر بن عبدالرحمٰن تھے، جنھوں نے ان سے چار ماہ میں کشّاف پڑھ ڈالی، پھر انھی کی برکتوں سے کتاب " الکشف" مکمل کر ڈالی جس میں اپنے استاد کے فوائد اور حواشی سے استفادہ کیا ہے۔

پھر مولانا قوام الدین کتاب " بسط " کی تصنیف میں مصروف ہوئے اور دو سال میں اس کے دو مجلّد تیار کر لیے۔ اس کے بعد آنکھوں کی بینائی متاثر ہو گئی۔ آخر عمر میں وہ پالکی میں بیٹھ کر جمعے کی نماز کو جاتے اور یہ پالکی علما اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتے تھے۔ معین الدین جنید شیرازی آٹھ سال تک ان کی خدمت میں رہے تھے۔ ان کی وفات ۷۷۲ھ میں ہوئی اور اپنے والد کے پہلو میں شیخ کبیر کے روضے میں دفن ہوئے۔

طبقات القرا، کی روایت کے مطابق مولانا قوام الدین کے اجداد اصفہان کے تھے، لیکن مولانا کی پیدائش شیراز کی ہے۔

حبیب السّیر میں شاہ شجاع (وفات ۷۸۶ھ) کے دور میں صرف ایک عالم کا ذکر ہے اور وہ قوام الدّین عبداللہ ہیں جن سے خود سے بادشاہ نے شرح مختصر ابن حاجب پڑھی (چاپ تہران ۱۳۶۲۔ ج ۳ ص ۳۱۵) اس امر کی تائید تاریخ آل مظفر تالیف محمود گیتی سے ہو جاتی ہے (ذیل واقعات ۷۶۰ھ)۔

مقدمۂ جامع دیوان نسخۂ قزوینی میں تاریخ وفات حافظ ۷۹۲ھ درج ہے:

" تا در تاریخ سنہ اثنی و تسعین و سبعمائہ ودیعت حیات بموکلان قضا و قدر سپرد"

علاّمہ قزوینی نے لکھا ہے کہ اگرچہ بعض جگہ تاریخ وفات ۷۹۱ ہے۔ ۷۹۲ صحیح ہے۔ اور اس کے لیے حسب ذیل دلائل پیش کیے ہیں:

فصیح خوافی صاحب مجملِ فصیحی حافظ کا معاصر تھا (اس کی تاریخ پیدائش ۷۷۲ھ ہے) اس نے ۷۹۲ھ کے ذیل میں حافظ کی وفات درج کی۔ اور ساتھ ہی وہ مشہور قطعہ لکھا ہے جس میں با۔ صاد۔ ذال (= ۷۹۲) سے تاریخ نکالی گئی ہے۔

نفحات الانس میں بھی یہی تاریخ ہے۔

۳۔ حبیب السیر میں تاریخ وفات ۹۲، ھ ہے۔

۴۔ شرح سودی ۔ مجالس المومنین اور کشف الظنون تینوں میں یہی تاریخ ہے ۔ گویا مؤرخین معاصر و قریب العصر نے تاریخ وفات ۹۲، ھ لکھی ہے ۔ اسی کو صحیح سمجھنا چاہیے ۔

لیکن اکثر جدید العصر نسخوں میں ۹۱، ھ ہے ۔ اور یہی تاریخ متعدد تذکروں میں بھی درج ہے ۔ علامہ قزوینی کا خیال ہے کہ اس غلط تاریخ کی بنیاد وہ قطعہ ہے جس کے آخری مصرعے کے الفاظ " خاک مصلیٰ " سے تاریخ ۹۱، نکلتی ہے۔

اس سلسلے میں یہاں چند امور کا ذکر مفید ہو گا۔

۱۔ نسخۂ گورکھپور میں تاریخ وفات لفظوں میں تو اس طرح ہے :

" تا در تاریخ شهور سنہ احدی و تسعین و سبعمائہ ودیعت حیوۃ بہ موکلان قضا و قدر سپرد "

لیکن اس کے بعد مشہور قطعہ ہے :

بسال با و صاد و ذال ابجد ز روز ہجرت میمون احمد
بسوی جنت اعلیٰ روان شد فرید عصر شمس الدین محمد
بخاک پای او چون برگذشتم نگہ کردم صفا و نور مرقد

اس قطعے کے حروف بے ، صاد ، ذال سے ۹۲، برآمد ہوتے ہیں ۔ اور اوپر لفظوں میں ۹۱، ہے ۔ ایک ہی جگہ اس اختلاف کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ بات واضح ہے کہ لفظوں میں غلطی کا امکان ہے کہ اثنین احدی لکھ گیا ہو، لیکن قطعے سے جو تاریخ نکلتی ہے۔ اس میں فرق نہیں ہوسکتا ۔ چونکہ قطعے میں غلطی ممکن نہیں ۔ اس لیے لفظوں میں ۹۱، (احدی و تسعین و سبعمائہ) صحیح نہیں ۔ احدی کے بجائے اثنین ہونا چاہیے ۔

البتہ ایک بات واضح ہے کہ حافظ کی وفات کا اختلاف غالباً اس وقت موجود تھا ۔ اور یہ قیاس کہ یہ غلط تاریخ " خاک مصلیٰ " والے قطعے (۳) کا نتیجہ ہے صحیح نہیں ۔ اس لیے کہ گورکھپور کے نسخے میں ۹۲، والا قطعہ ہے۔ خاک مصلیٰ والا نہیں ۔ ۹۲،ھ کی تائید میں ایک بات یہ ہے کہ حافظ کا تذکرہ شدّ الازار میں نہیں آیا، اور آخری تاریخ جو اس کتاب میں ہے وہ ۹۱، ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس وقت تک خواجہ حافظ فوت نہیں ہوئے تھے، ورنہ ان کا تذکرہ اس کتاب میں ہوتا ۔ اس لیے کہ اس تذکرے کے مؤلف یعنی جنید شیرازی اور حافظ پیر بھائی

تھے، دونوں مولانا قوام الدّین عبداللہ کے شاگرد تھے۔ اس امر کی طرف علاّمہ قزوینی نے مقدمہ (ص ج) میں اشارہ کیا ہے۔

حواشی

(۱) بجو در خاک مصلیٰ یافت منزل
بجو تاریخش از خاک مصلیٰ

(۲) برٹش میوزیم کے نسخہ مکتوبہ ۹۲۱ ھ میں مقدمہ موجود ہے لیکن بعض حالات کی وجہ سے علامہ قزوینی کو یہ نسخہ نہ مل سکا (مقدمۂ قزوینی ص فج)۔ نیز رک فہرست ریو ج ۲ ص ۶۲۸۔

(۳) قطعہ یہ ہے:

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ
کہ شمعی بود از نور تجلیٰ
بجو در خاک مصلیٰ یافت منزل
بجو تاریخش از خاک مصلیٰ

ڈاکٹر نذیر احمد :

گاہ گاہی باز خوان
(تاریخ ایران کی تین نامور خواتین کے قابل یادگار کارنامے)

تاریخ میں کبھی کبھی ایسی نامور خواتین مل جاتی ہیں جن کے کارنامے قابل یادگار ہوتے ہیں۔ ایسی ہی تین خواتین کے بارے میں مختصر یادداشت قلم بند کی جارہی ہے۔ وہ تین خواتین یہ ہیں:

۱۔ مادر حسنک

۲۔ مادر ارسلان بن طغرل

۳۔ ماہ ملک بنت غیاث الدین محمد بن سام

[۱] حسنک کا واقعہ قتل اور اس کی ماں کا تاثر

امیر حسنک نیشا پوری سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کا وزیر تھا۔اس کا تعلق نیشاپور کے ایک ممتاز علمی گھرانے سے تھا جو تاریخ میں آل میکال (۱) یا میکالیان(۲) کے نام سے بہت معروف ہے۔ اس خانوادے میں ایسے افراد گذرے ہیں جو ایران کی علمی تاریخ کے روشن باب ہیں۔

امیر حسنک کا پورا نام ابو علی حسن بن میکال تھا، جو حسنک کے نام سے شہرت رکھتا ہے، کہتے ہیں کہ محمود غزنوی نے اس کے نام حسن کی رعایت سے اسے حسنک کہنا شروع کیا تھا۔ سلطان محمود کے دور میں اس کا ستارۂ اقبال طلوع ہوتا ہے، پھر نصف النہار پر پہنچتا ہے اور سلطان مسعود کے زمانے میں غروب ہوجاتا ہے۔ پہلے وہ سیستان کی بریدی پر مامور ہوا(۳) اور اس کے حسن انتظام سے اس خطے کی بڑی ترقی ہوئی، فرخی سیستانی نے ایک قصیدے (۴) میں سیستان کی ترقی میں اس کی انتظامی صلاحیت کا تذکرہ کیا ہے، اسی درمیان حسنک نے سلطان سے حج پر جانے کی اجازت (۵) حاصل کی۔ حج کی سعادت سے فارغ ہوکر وہ شام کے راستے سے لوٹ نہ سکا۔ یہ راستہ مخدوش تھا تو اس کے قافلے نے مصر کا راستہ اختیار کیا۔ اس زمانے میں مصر پر فاطمی خلفا کی حکومت تھی، وہ قرمطی (۶) تھے۔ خلیفہ (۷) نے حسنک کو خلعت سے نوازا اور بہت تحفے تحائف دیے۔ محمود غزنوی قرمطیوں سے سخت عداوت

رکھتا تھا. لیکن حسنک کی مجبوری کے پیش نظر اسے سلطان نے نہ صرف معاف کیا بلکہ وہ اس معاملے میں اس کو بالکل بے قصور سمجھتا تھا. خلیفۂ بغداد بھی قرامطہ کا سخت دشمن تھا، جب اس نے حسنک کی خلعت کا قصہ سنا تو غضبناک ہوا۔ محمود کو لکھا کہ حسنک کو سولی پر چڑھا کر اس کا سر بغداد بھجوانا ضروری ہے. مگر سلطان اس کو بے قصور سمجھتا تھا، اس نے خلیفہ کی بات رد کردی اور وہ یہاں تک کہہ گیا کہ (۸) " وی را من پرورده ام و با فرزندان و برادران برابر است و اگر وی قرمطی است، من ہم قرمطی می باشم"۔ غرض محمود کے زمانے میں یہ فتنہ دبا رہا۔ یہاں تک کہ سلطان محمود نے احمد بن حسن میمندی کی برطرفی پر ۴۱۵ھ میں حسنک کو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز کردیا۔

ابو الفضل بیہقی امیر حسنک کے واقعے سے خاصا متاثر تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تاریخ میں ایک باب " ذکر بر دار کردن امیر حسنک" (۹) کا اضافہ کیا ہے اور اس میں اندرونی اور بیرونی سازشوں کی قلعی کھولی ہے. خلیفہ قادر باللہ کے اصرار پر سلطان محمود کو یہ کہنا پڑا کہ "وی را من پرورده ام و با فرزندان و برادران برابر است ۔ واگر وی قرمطی است من ہم قرمطی باشم"۔ غرض محمود کے زمانے میں یہ فتنہ دبا رہا لیکن مسعود غزنوی کی تخت نشینی کے بعد پھر یہ فتنہ بڑی تیزی اور شدت کے ساتھ اٹھایا گیا۔ فتنہ پردازوں کا سرغنہ بوسہل زوزنی تھا۔ باوجود امام زادہ اور فاضل و ادیب ہونے کے شرارت ، کینہ پروری اور حسد اس کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا (۱۰)۔ اس کا سلطان مسعود پر اتنا دباؤ پڑا کہ یہ معاملہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا، حسنک کی طرف سے سلطان کا دل اس کی پچھلی حرکتوں کی وجہ سے صاف نہ تھا (۱۱) ۔ پھر بھی سلطان گومگو میں تھا۔ اس کو حسنک کی برأت کا احساس ہوتا تو امرائے سوء کے اصرار سے یہ احساس بروئے کار نہ آسکتا ۔ گو دربار میں کچھ ایسے امیر بھی تھے جن کو یقین تھا کہ اس فتنہ پردازی کا حقیقت سے کوئی سروکار نہ تھا، ان میں خواجہ احمد حسن میمندی تھے جو وزارت کا عہدہ (۱۲) سنبھال چکے تھے اور ابو نصر مشکان (۱۳) جیسے باثر امیر شامل تھے۔ اس کا نتیجہ اتنا تو ہوا کہ اس امر پر کافی گفت و شنید ہونے لگی اور امیر محمود کے زمانے میں بھی ایک بار تو یہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو خلعت امیر حسنک کو ملی تھی اور جو تحائف امیر محمود کے پاس مصر سے آئے تھے وہ سب خلیفۂ بغداد کے پاس بھیج دیے جائیں اور بغداد میں نذر آتش کردیے جائیں (۱۴) لیکن اس سے خلیفہ مطمئن نہیں ہوا تھا یہاں تک کہ امیر محمود کا انتقال ہوگیا۔

اگرچہ سلطان مسعود دباؤ میں آکر حسنک کے سولی پر چڑھانے پر بادل ناخواستہ

راضی ہوگیا تھا لیکن اس فیصلے پر عمل درآمد ہونے سے قبل خواجہ احمد حسن نے سلطان کے ایما پر ایک بہت بڑا جلسہ بلایا جس میں سارے امرا و عمایدین شریک تھے۔ حسنک آیا تو خواجہ بزرگ نے اس کی خیریت پوچھی اور دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ تم بد دل نہ ہو، زندگی میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں، امیر نے جو فرمایا اس کی بجا آوری لازم ہے، جب تک آدمی زندہ ہے آرام و سکون کی امید رکھنا چاہیے۔ بوسہل زوزنی وزیر کے تسلّی آمیز کلمات سن کر تلملا اٹھا اور کہنے لگا: ایسے قرمطی کتّے سے جو پھانسی پر چڑھانے کا مستحق ہے اس طرح کی ملاطفت آمیز باتوں کا کیا موقع ہے۔ خواجہ نے بوسہل کو غضبناک نظروں سے دیکھا، حسنک بوسہل سے یوں کہنے لگا: سگ ندانم کہ بودہ است، خاندان من و آنچہ مرا بودہ است از آلت و حشمت و نعمت جہانیان دانند، جہان خوردم و کارہا راندم و عاقبت کار آدمی مرگ است اگر امروز اجل رسیدہ است کس باز نتوان داشت کہ بر دار کشند یا جز دار کہ بزرگتر از حسین علیؓ نیم، این خواجہ کہ مرا این گوید، مرا شعر گفتہ است و بر در سرای من ایستادہ است، امّا حدیث قرمطی بہ ازیں باید کہ اورا باز داشتند نہ مرا۔ (۱۶)

۔[میں نہیں جانتا کہ کتّا کون ہے، میرے خاندان کے اور میرے مرتبے، وقار اور شان و شوکت کو ساری دنیا جانتی ہے، دنیا کو خوب خوب برتا، بڑے بڑے کام انجام دیے، ہر آدمی کا انجام موت پر ہے، اگر آج موت ہونی ہے کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا، خواہ پھانسی پر لٹکائیں یا کسی اور طرح سے موت آئے حضرت امام حسین بن علی سے تو بزرگ نہیں ہوں، یہ حضرت جو آج مجھے کتّا کہتے ہیں میری مدح میں اشعار لکھ چکے ہیں اور میرے دروازے پر کھڑے رہے ہیں، رہی قرمطی کی بات تو اس جرم میں ان کو موقوف کیا گیا ہے مجھے نہیں]

جب مجلس برخاست ہوئی تو خواجہ نے بوسہل کو بڑی ملامت کی، اور اس نے خواجہ سے بہت معافی مانگی۔ جب امیر کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو بوسہل کو بلایا اور بہت لعنت ملامت کی۔

بوسہل را بخواند و نیک مالید کہ گرفتم کہ برخون این مرد تشنہ، وزیر ما را حرمت و حشمت بنا ستی داشت، بوسہل گفت ازان ناخویشتن شناسی کہ وی باخداوند در ہرات کرد در روزگار امیر محمود یاد کردم خویشتن را نگاہ نتوانستم داشت و بیش چنین سہو نیفتند (۱۸)۔ اس کے بعد بیہقی نے بڑی تفصیل کے ساتھ اور نہایت درد ناک انداز میں سولی پر چڑھنے اور سنگسار کیے جانے کی داستان لکھی ہے اور اس کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

" اینست حسنک (۱۸) و روزگارش و گفتارش رحمہ اللہ علیہ ۔ این بود کہ گفتی کہ مرا دعاے نیشا پوریان نسازد و نساخت و زمین و آب مسلمانان بہ غصب بستد ۔ نہ زمین ماند نہ آب و چندان غلام و ضیاع اسباب و زر و سیم و نعمت ہیچ سود نداشت، او رفت و این قوم کہ این مکر ساختہ بودند نیز رفتند رحمہ اللہ علیہم، و این افسانہ ایست با بسیار عبرت و این ہمہ اسباب منازعت و مکاوحت از بہر حطام دنیا بہ یکسوی نہادند۔ احمق مردا کہ دل درین جہان بندد کہ نعمتی بدہد و زشت باز ستاند ۔ رودکی گوید :

بہ سرای سپنج مہمان را	دل نہادن ہمیشگی نہ رواست
زیر خاک اندرونت باید خفت	گرچہ اکنونت خواب بر دیباست
با کساں بودنت چہ سود کند	کہ بگور اندرون شدن تنہا ست
یار تو زیر خاک مور و مگس	بدل آنکہ گیسوت پیرا ست

و آن روز کہ حسنک را بر دار کردند استادم بونصر روزہ نکشاد و سخت غمناک و اندیشہ مند بود چنانکہ ہیچ وقت اورا چنان ندیدہ بودم و می گفت چہ امید ماند ؟ و خواجہ احمد حسن میمندی ہم بر این حال بود و بہ دیوان ننشست"۔

حسنک کی لاش (۱۹) پانچ سال تک تختے پر لٹکی رہی ۔ سر تو کاٹ کر پہلے ہی خلیفۂ بغداد کے پاس بھیجا جاچکا تھا۔ جسم سوکھ کر تقریباً نابود ہوچکا تھا۔ پھر جب سرکاری حکم ہوا تو اسے دفن کیا گیا۔ لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ سر کہاں ہے اور جسم کہاں۔ دو تین ماہ تک یہ واقعہ حسنک کی ماں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ پھر اس کو جب معلوم ہوا تو نہ روئی اور نہ چلائی ۔ صرف اتنا کہا کہ میرے بیٹے کی بڑائی کا کیا کہنا، محمود جیسے بادشاہ نے اس کو یہ دنیا دی اور مسعود نے وہ دنیا۔ اس اولوالعزم خاتون کے بارے میں بیہقی کے الفاظ کا درج نہ کرنا بے انصافی ہوگی:

و مادر حسنک زنی بود سخت جگر آور ۔ چنان شنودم کہ دو سہ ماہ ازو این حدیث نہان داشتند ۔ چون بشنید جزعی نکرد چنان کہ زنان کنند

بلکہ بگریست بدرد چنانکہ حاضران از درد وی خون گریستند ۰ پس گفت : بزرگ مرد کہ این پسرم بود کہ پادشاہی چون محمود این جہان بدو داد و پادشاہی چون مسعود آن جہان ۰ دماتم پسر سخت نیکو بداشت و ہر خردمند کہ این بشنید بپسندید و جای آن بود ویکی از شعرای نیشاپور این مرثیہ بگفت اندر مرگ وی و بدین جای یاد کردہ شد :

بریدسرش را کہ سران را سر بود ۔۔۔ آرایش دہر و ملک را افسر بود

گر قرمطی و جہود یا کافر بود ۔۔۔ از تخت بدار شدن منکر بود

حسنک کے پھانسی پر چڑھنے کا واقعہ ۴۲۲ھ کا ہے۔ حسنک کی ماں کی یہ بات اتنی مشہور ہوئی کہ دوسرے اور مظلومین نے ظلم کے موقع پر اسی بات کو دہرایا ہے۔ راحۃ الصدور (ص ۱۱۰) میں طغرل بک کے وزیر عمید الملک ابو نصر کندری کے بارے میں ہے کہ جب الپ ارسلان نے اس کو وزارت سے معزول کیا تو بے قصور قتل کر ڈالا ۔ کہتے ہیں کہ ابونصر کندری سلاجقہ کا پہلا باقاعدہ وزیر تھا، اور وزیروں کے قتل کیے جانے کا سلسلہ جو ایرانی تاریخ میں عام تھا، اسی وزیر سے شروع ہوا ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس وزیر کا قتل نظام الملک الحسن بن علی بن اسحاق طوسی کے حکم سے ہوا جو تاریخ ایران میں اپنے علم و فضل ۔ ذہانت و ذکاوت ۔ عدل و انصاف میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ راحۃ الصدور کا مؤلف لکھتا ہے:

(ترجمہ) ملک شاہ کے چچا طغرل بک کی وفات پر ملک شاہ نے عمید الملک کو جو اس کے چچا (طغرل بک) کا وزیر تھا کو پکڑا (گرفتار کیا) اور وزارت نظام الملک کے سپرد کی اور عبدالملک الپ ارسلان کی تخت نشینی کے قبل وزیر مذکور اس کی خدمت میں رہ چکا تھا، اور اس نے (عمید الملک) بو نصر کندری کو ایک سال تک اپنے ساتھ پھرایا تھا، ۴۲۵ھ میں شہر نسا میں عمید الملک کے قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اور نظام الملک نے اس کے قتل کیے جانے کی کوشش کی تھی اور وہ اس پر راضی تھا۔

راحۃ الصدور کا مصنّف (راوندی) آگے لکھتا ہے کہ

میں نے سنا کہ جب جلاد اس کے سامنے آیا تو اس نے مہلت

مانگی، اور وضو کیا، دو رکعت نماز پڑھی اور جلاد کو قسم دے کر کہا
کہ جب تو بادشاہ کا حکم بجا لاچکے (یعنی مجھے قتل کرچکے) تو میرا
ایک پیغام بادشاہ کو اور ایک پیغام وزیر کو پہنچادے۔ سلطان سے
کہنا کہ مجھ پر آپ کی یہ مبارک خدمت ہے۔ آپ کے چچا نے یہ
دنیا مجھے دی کہ میں نے اس کے مطابق حکم چلایا اور آپ نے وہ
دنیا دی کہ مجھے شہادت نصیب ہوئی۔ اور آپ ہی کی خدمت کی
وجہ سے مجھے دنیا اور آخرت دونوں ملیں۔ اور وزیر تک یہ پیغام
پہنچانا کہ آپ نے دنیا میں وزیر کشی کی بری بدعت و قابل نفرین
رسم کی بنیاد رکھی ہے۔ امید ہے کہ یہ رسم آپ اپنے حق اور اپنی
اولاد کے حق میں ضرور جاری پائیں گے۔

من احب نفسہ اجتنب الاثام و من احب ولدہ رحم الایتام

(جو اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے اس کو گناہوں سے پرہیز کرنا
چاہیے اور جو اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے اس کو یتیموں پر رحم
کرنا چاہیے)۔

اس سلسلے میں چند باتوں کا ذکر مفید ہوگا۔

۱۔ حسنک کو ۴۲۵ھ میں پھانسی دے دی گئی اور ابو نصر کندری کو ۳۱ سال بعد ۴۵۶ھ میں۔ حسنک کی بے گناہی اور دربار کی سازشوں کی تفصیل تاریخ بیہقی سے مل جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے حسنک کے واقعے کو بڑی شہرت ملی۔ لیکن ابو نصر کو کوئی مؤرخ نہ ملا، جو اس قتل کے پیچھے جو سازش تھی اس کا پردہ چاک کرتا۔ راوندی اس پر سے سرسری طور پر گذر گیا ہے۔ ابونصر بے گناہ تھا، اور اس بے گناہ کے قتل کی ذمہ داری جہاں ملک شاہ کے سر ہے، وہیں نظام الملک طوسی بھی اس ذمے داری سے بچ نہیں سکتا۔ اسی طرح جیسے حسنک کے قتل کے تین ذمے دار تھے، ایک سلطان مسعود اور دوسرے خلیفہ بغداد اور تیسرے بوسہل زوزنی۔

۲۔ ابو نصر نے نظام الملک اور اس کے خاندان کے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی وہ سرتاسر صحیح ثابت ہوئی۔ نظام الملک طوسی بڑھاپے میں بیدردی سے قتل ہوا گو ایک فدائی کے ہاتھوں، اسی طرح اس کے بیٹے اور پوتے بھی قتل سے بچ نہ سکے۔ واقعی وزیر کشی کی جس رسم کی بنیاد ملک شاہ اور نظام الملک کے ہاتھوں پڑی وہ تاریخ ایران میں مدتوں جاری رہی۔ البتہ

ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ ابونصر کندری نے اس رسم کی بنیاد ڈالنے والوں میں صرف ملک شاہ اور نظام الملک کا نام لیا۔ حالانکہ اس سے ۳۱ سال قبل مسعود غزنوی نے اپنے درباریوں کی۔ اور خصوصاً خلیفۂ بغداد کے اصرار اور روزنی کی سازش کی بنا پر حسنک کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا تھا۔

۳۔ ایران کی تاریخ میں وزیر کشی کی جیسی شرمناک روایت کسی اور معاشرے میں نہیں ملتی۔

[۲] مادر ارسلان بن طغرل سلجوقی

ارسلان بن طغرل سلجوقی سلاجقۂ عراق کا آٹھواں فرماں روا (۲۰) تھا، جس نے ۵۵۵ھ تا ۵۷۱ھ حکومت کی۔ سلاجقۂ عراق کا دار الخلافہ ہمدان اور شمالی جنوبی اور مغربی ایران پر ان کا تسلّط تھا۔ اس بنا پر بغداد پر ان سلجوقی حکمرانوں کا بہت دباؤ تھا۔ چنانچہ خلفائے عباسی سلاجقہ کے سیاسی امور میں بڑے دخیل رہتے تھے۔ ارسلان کا باپ سلطان طغرل (۲۱) اس خاندان کا دوسرا فرماں روا تھا، وہ عین جوانی میں ۲۵ سال کی عمر میں (۲۲) فوت ہوا۔ نوجوان طغرل علم و فضل کا بڑا قدر داں اور علما و فضلا و شعرا (۲۳) کا بڑا مربّی تھا، اس نے ہمدان میں ایک عالیشان مدرسہ بنوایا تھا (۲۴)۔ یہ مدرسہ عرصے تک قایم رہا۔ تین سال کی حکومت کے بعد ۵۲۹ھ میں ارسلان کی وفات ہوئی تھی، اس سے واضح ہے کہ وہ مدرسہ اس تاریخ کے کچھ پہلے تعمیر ہوا ہوگا اور راحۃ الصدور کی تصنیف کے وقت (۵۹۹ھ کے قریب) مصنف محمد بن علی راوندی کے ایک دوست علاء الدین مجد الاسلام ملک العلما اس مدرسے میں درس و تدریس میں مصروف تھے (۲۵)۔ اسی نوجوان سلطان کے دربار سے فارسی کا مشہور شاعر عمادی شہر یاری منسلک تھا، چنانچہ عمادی کے پانچ قصیدے اس کی مدح میں ہیں۔ ان میں سے دو راحۃ الصدور میں (ان میں سے ایک لباب الالباب میں بھی) نقل ہیں۔ اس علم دوست حکمران کی بیوی بھی بڑی علم دوست تھی، اسی نامور خاتون کے بارے میں ایک گزارش یہاں درج کی جارہی ہے، لیکن قبل اس کے کہ اس موضوع کے متعلق کچھ لکھیں سلاجقۂ عراق کا شجرہ درج کیا جارہا ہے۔

شجرۂ سلاجقۂ بزرگ و سلاجقۂ عراق
۱۔ سلطان طغرل بک (جلوس ۴۲۹)
۲۔ سلطان ارسلان (جلوس ۴۵۰)
۳۔ سلطان ملک شاہ (جلوس ۴۶۵)
۴۔ سلطان برکیارق ملک شاہ (۲۲)
(جلوس ۴۸۶)
۵۔ سلطان محمد بن ملک شاہ
(جلوس ۴۹۸ - ۵۱۱ ھ)
۶۔ سلطان بحر بن ملک شاہ
(۵۱۱ - ۵۵۲)
سلاجقۂ عراق
۱۔ سلطان محمود
بن محمد
۵۱۱ - ۵۲۵
۳۔ سلطان تغرل
بن محمد
۵۲۵ - ۵۲۹
۴۔ سلطان مسعود
بن محمد
۵۲۹ - ۵۴۷
۷۔ سلطان سلیمان شاہ
بن محمد
۵۵۳ - ۵۵۵
۲۔ داود بن محمود
۵۲۵ - ۵۲۶
۵۔ ملک شاہ بن محمود
۵۴۷ - ۵۴۸
۶۔ محمد بن محمود
۵۴۸ - ۵۵۳
۸۔ سلطان ارسلان بن طغرل
۵۵۵ - ۵۶۱
۹۔ سلطان طغرل بن ارسلان
۵۶۱ - ۵۹۰

سلاجقۂ عراق کے فرمانرواؤں کے سلسلے میں دو تین امر قابل توجہ ہیں۔ اوّل یہ کہ ان میں سے اکثر کم عمری میں تخت نشین ہوئے۔ اس بنا پر ان کے اتابکوں اور دوسرے طبقوں کا بڑا زور رہا۔ درباری سازشیں زیادہ ہوئیں۔ پھر خلفائے عباسی کی دخالت سے سلاجقہ کے سیاسی امور میں پیچیدگیاں بڑھیں۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان فرمانرواؤں کی عمر بھی کم رہی۔ تیسری بات یہ بھی کہ سارے بادشاہ علم دوست تھے۔ اس وجہ سے اس دور کے بڑے فضلا و شعرا ان بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے ہیں۔ ایران کی ادبی و ثقافتی تاریخ میں یہ خاندان غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

سلطان ارسلان کے باپ سلطان طغرل نوجوانی ہی میں فوت کرگئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ ان کی بیوی کی عمر اس سے بھی کم ہوگی۔ گویا وہ کم عمری ہی میں بیوہ ہو گئیں۔ تو طغرل کے بھائی سلطان مسعود نے اپنے بھائی کی کم عمر بیوہ (۲۸) کی شادی اتابک شمس الدّین ایلدگز (۲۹) سے کردی۔ ایلدگز سلطان مسعود کا غلام تھا۔ وہ اپنی جودت طبع سے سلطان کا منظور نظر ہوا۔ پھر آذربائیجان کا خطّہ اس کے حوالے کردیا گیا۔ اس وقت سے وہ اور اس کے دو بیٹے محمد اور قزل ارسلان۔ اور محمد کے بیٹے سلاجقہ کے خاتمے تک سارے سیاسی امور میں بری طرح دخیل رہے۔ ان میں سے بعضوں کے خاتمے کی ذمہ داری بھی اسی خاندان پر ہے۔ سلطان ارسلان کی ماں اپنے دوسرے شوہر ایلدگز کے ساتھ سارے سیاسی اور تہذیبی و علمی امور میں برابر کی شریک رہی۔ ۵۵۵ ھ میں امرائے عراق نے سلیمان شاہ کو معزول کردیا تو موقع سے فائدہ اٹھا کر ایلدگز نے اپنے سوتیلے بیٹے ارسلان کو تخت نشین کرا دیا۔ اور بات بالکل واضح ہے کہ یہ سب کچھ اس کی ماں کے اشارے کے بغیر انجام پذیر نہ ہوا ہوگا۔

ارسلان اپنے باپ طغرل کی وفات کے وقت ایک سال کا بچہ تھا۔ اس بچے کی پرورش اس کے چچا سلطان مسعود نے کی (۳۰)۔ پھر جب اس کی ماں کا عقد ثانی ایلدگز سے ہوا تو ارسلان کی پرورش ایلدگز کے زیر سایہ (۳۱) ہونے لگی اور جب وہ سترہ سال کا ہوا تو اپنی ماں اور اپنے سوتیلے باپ ایلدگز کی کوشش سے وہ شاہی تخت کا وارث بھی بن بیٹھا۔ پھر کیا تھا۔ سارے امور میں اس کی ماں اور اتابک اعظم شمس الدّین ایلدگز کا بے پناہ عمل دخل (۳۲) ہوگیا۔ اور آخر الذکر کی معیت میں ارسلان کی ماں کی صلاحیت میں زبردست قسم کا اضافہ ہوا۔ ارسلان کی حکومت کے دوران اس کی والدہ اور اتابک اعظم کا بے حد اثر بڑھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اتابک اعظم کے دونوں بیٹوں یعنی نصرۃ الدین محمد اور مظفر الدین قزل ارسلان نے اپنا اثر و

رسوخ بہت بڑھا رکھا تھا۔ ۵۶۱ھ میں پہلی بار ارسلان کی والدہ کا ذکر راحۃ الصدور (ص ۲۹۳) میں اس طرح آیا ہے:

> روز سہ شنبہ ہفتم ماہ رجب سنہ ۵۶۱ والدہ سلطان و امیر سپاہ سالار کبیر مظفر الدولہ و الدین قزل ارسلان (۳۳) از لشکر گاہ حرکت فرمودند بر عزیمت نخجوان و ببالای طہران فرود آمدند و روز سہ شنبہ پانزدہم ماہ رجب سنہ احدی و ستین و خمسمائۃ (۵۶۱ھ) اتابک اعظم (۳۴) و امرائے دولت بجانب فیروز کوہ رفتند۔

نخجوان آذربائیجان کا صدر مقام تھا۔ آرمینیا کا حکمران سلجوقیوں کے زیر اثر تھا۔ البتہ ابخاز کا فرمانروا مخالف تھا۔ اور وہ مخالفت کا جھنڈا بلند کرتا رہتا تھا۔ والدہ سلطان ابخاز کے فرمانروا کی نقل و حرکت کو دیکھ رہی تھی، اور جب اس کو یقین ہوگیا کہ آخر الذکر بغاوت اور جنگ پر آمادہ ہے تو وہ ارسلان کو واقعے کی اطلاع کرنے کے لیے پھر دارالخلافہ آئی تھی (۳۵) لیکن اس سے پہلے ۵۶۵ھ کے اواخر میں اصفہان آتی نظر آتی ہے۔ راحۃ الصدور (۳۶) میں ہے:

> و در آخر سنہ خمس و ستین و خمسمائۃ سلطان از ساوہ باصفہان آمد و اتابک اعظم و امیر حاجب کبیر پہلوان (۳۷) و امیر اسفسالار مظفر الدین قزل ارسلان و والدۂ سلطان جملہ باصفہان آمدند و خواجہ جلال الدین قوام الدین (۳۸) باصفہان وزیر شد و دولت پیش او نہادند و بہ محلت تیماورد در سرای پدر می بود

آخری بار بقول صاحب راحۃ الصدور سلطان کی والدہ ۵۶۹ھ کے آخری دنوں میں ہمدان آئی۔ اس کی تفصیل (۳۹) اس طرح ہے:

۵۶۹ ہجری کے آخر میں زمان کے درمیان سلطان کی والدہ آذربائی جان سے ہمدان کی طرف روانہ ہوئی۔ وہ بادشاہ کو یہ ضروری اطلاع دینا اور اسے بلانا چاہتی تھی کہ ابخاز (۴۰) کا فرمانروا کچھ نئی حرکت کرنے والا ہے۔ جب موسم کچھ خوشگوار ہوا تو سلطان آذربائی جان کی طرف متوجہ ہوا اور درمیان کہیں زیادہ ٹھہرا بھی نہیں، عید اضحیٰ نخجوان میں منائی گئی، وہاں سے مرغزار پارسی بازار گئے۔ اتابک اعظم و امیر حاجب کبیر نصرۃ الدنیا و الدین (۴۱) اور امیر اسفسالار مظفر الدین قزل ارسلان (۴۲) وہیں تھے اور یہ انتظام کر رہے تھے کہ دوسرے روز سلطان سارے لشکر کے ساتھ ابخاز کی طرف چل دیے۔ ابخاز وہاں سے تین منزل کی دوری پر

تھا۔ اسی درمیان سلطان بیمار پڑ گیا۔ تین روز ٹھہرے رہے۔ لیکن بہتری کی صورت نظر نہ آئی اور وہاں سے روانہ ہونے کی صورت نہ ہوئی۔ سلطان کو ان کی والدہ کے ساتھ قلعہ کیلیا بھیجا گیا۔ اور خواجہ اتابک، امرائے لشکر کے ساتھ ابخاز کی مہم پر روانہ ہوگئے۔ سلطان کی بیماری بڑھتی گئی، قلعہ کیلیا (۴۳) سے باددن (۴۴) لائے گئے سلطان اسی طرح بیمار پڑا رہا، چالیس روز کے بعد ارس (۴۵) آگئے۔ وہاں لشکر میں وبا پھیل گئی، اتنی بڑی وبا کہ لشکر میں سو میں ایک صحیح سالم نہیں بچا، بہت سے افراد وبا کے شکار ہوگئے۔ سلطان بیماری کی حالت میں ارس سے نخجوان لایا گیا، باقی بیمار کچھ راہ میں اور کچھ نخجوان آکر ہلاک ہوگئے۔ ادھر اتابک اعظم ایک بڑے لشکر کے ساتھ ابخاز کے فرمانروا کے مقابل نبرد آزما تھا، آرمینیا کا حکمراں سلطان کی خدمت میں تھا، ابخازی حکمراں مقابلے کی تاب نہ لاکر پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ گزیں ہوا، لشکر اسلام راستے کی تنگی کی وجہ سے پہاڑوں اور جنگلوں میں ابخازیوں کا تعاقب نہ کر سکا۔ بالآخر اسلامی لشکر نے آق شہر کو جو کہ ابخازیوں کا بنایا ہوا بہت بڑا شہر تھا، لوٹا اور جلایا اور مملکت کو برباد کرکے رکھ دیا۔

سلطان ارسلان پچاس دن نخجوان میں رہ گیا، وہاں اس نے شاہ ارمن (آرمینیا) اور دوسرے امرا کو خلعت سے سرفراز کیا، پھر ہمدان کی طرف روانہ ہوا، جب تبریز پہنچا تو خبر آئی کہ نخجوان میں سلطان کی والدہ (۴۶) فوت کر گئی لیکن سلطان سے یہ خبر پوشیدہ رکھی گئی، جب شاہی قافلہ ہمدان پہنچا تو سلطان کو اس کی ماں کے مرنے کی خبر دی گئی۔ وہاں اس نے تعزیت اور ماتم کے رسوم ادا کیے۔

بقول راوندی (۴۷) وہ خاتون ایسی تھی کہ حکومت کا پورا نظام اسی کی وجہ سے چل رہا تھا" پنداری نظام آن دولت و قوام آں مملکت بدان خاتونی سعیدہ بود"۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ عورت جو سلجوقی حکومت کو سنبھالے ہوئے تھی وہ کس پائے کی ہوگی، ایسی سیاسی سوجھ بوجھ کے علاوہ وہ بڑی دیندار، نکو کار اور خدا ترس تھی۔ علماء کی تربیت، زہاد پر صدقات اور انعامات کی پیشکش اس کا شعار بن چکا تھا۔ اس کے پسندیدہ کاموں میں ایک کام یہ ہوا کہ جب ابخازیوں سے مقابلے کی غرض سے سلطان کو آذربائی جان لے جا رہے تھے تو سلطان کی ماں نے خواجہ امام شیخ الاسلام ظہیر الدین بلخی (۴۸) کو جو تمام مملکت میں سب سے زیادہ محترم اور سب کے پیشوا تھے، بلاکر کہا کہ میری خواہش ہے کہ ائمۂ دین اور علمائے اسلام کے تدوم کے برکات خداوند عالم کے لیے ساتھ ہوں، چاہیے کہ ائمۂ کبار

میں چند حضرات منتخب ہوں جو آپ کے ساتھ آئیں اور جہاد کی برکتوں میں حصّہ لیں۔ شیخ الاسلام نے دس حضرات کو معین کیا۔ اس دیندار خاتون نے دس خچر ان کے سامان کے لیے اور دس ہی خچر دوسرے سامانوں۔ مطبخ کے برتن اور پانی کے سامان فرش فروش کے لیے بھیجے۔ اس کے علاوہ اتنی رقم جو سفر کے اخراجات کے لیے کافی ہو عنایت کی۔ علاوہ بریں ہزار اشرفیاں فوری خرچ کے لیے حاضر کیں اور یہ بھی کہا کہ ہر منزل پر جو جو سامان درکار ہوں گے انہیں مہیا کیا جائے گا۔ جب دشمن کے مقابل پہنچے اور دشمن کی فوج مقابلے کے لیے دو بدو ہوئی تو لشکر اسلام میں سستی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ ایسے نازک وقت پر اس خاتون کی تجویز مفید ثابت ہوئی۔ امام ظہیر الدین بلخی نے نعرہ لگایا اور ایسا زبردست حملہ کیا کہ رستم زال بھی اس طرح کا حملہ نہ کرسکتا۔ اتابک اعظم اور سارے امرا نے اس کی پیروی کی۔ اس طرح ابخازی شکست خوردہ ہوکر بھاگے۔ اور لشکر اسلام کو ایسی فتح ہوئی جس کی توقع نہیں تھی۔ اس نیک خاتون نے علمأ کی تربیت اور زہاد کے لیے صلات و انعامات کی بڑی پیشکش کے سلسلے میں قابل یادگار کارنامے انجام دیے ہیں۔

سلطان ارسلان کی ماں کی وفات کے ایک ماہ کے اندر اس کے شوہر اتابک اعظم ایلدگز کے نخجوان ہی میں فوت ہونے کی خبر آئی۔ شوہر اور بیوی کی لاشیں ہمدان لائی گئیں جہاں وہ اپنے تعمیر کردہ مدرسے میں دفن ہوئے۔

روایت ہے کہ ہمدان میں جب وہ مدرسہ تیار ہوا اور اس میں تدریس کے لیے امام صفی الدّین کا انتخاب عمل میں آیا تو ایک بڑی تقریب منعقد ہوئی جس میں ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا گیا۔ اس میں شہر کے سارے علما و ائمہ مدعو تھے۔ انواع و اقسام کے کھانے اور مٹھائیاں دستر خوان پر چاندی کے برتنوں میں چنی گئیں۔ اتفاق سے ایک بزرگ نے ایک پیالہ اپنی آستین میں چھپالیا۔ خوان سالار تاڑ گیا۔ اس نے پیالہ چھیننا چاہا۔ وہ نیک دل خاتون یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ تو اس نے حکم دیا کہ سارے پیالے علما کو نذر کردیے جائیں۔

یہ قابل یادگار کارنامہ اس خاتون کا ہے جو آج سے تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال قبل گذر چکی ہے۔

۰ [۳] جلال الدّنیا و الدّین ماہ ملک
بنت سلطان غیاث الدّین محمد بن سام

ملکہ ماہ ملک جو جلال الدّنیا و الدّین کے لقب سے ملقب تھی یسلطان غیاث الدین محمد بن سام (۴۹) کی نامور بیٹی تھی۔ غیاث الدّین بڑا فاتح سلطان گذرا ہے جس نے اپنی مملکت کو بہت زیادہ وسیع کردیا تھا۔ اس کا دارالحکومت غور تھا۔ اس نے اکتالیس (۵۰) یا تینتالیس (۵۱) سال کی حکومت کے بعد ۵۹۹ھ میں ہرات میں (۵۲) وفات پائی اور وہیں مدفون ہوا۔ اس کا چھوٹا بھائی معز الدّین محمد بن سام (۵۳) ہے جو ہندوستان میں شہاب الدّین غوری(۵۴) کے نام سے موسوم ہے۔ وہ ہندوستان پر حملہ کرکے دلّی سے اجمیر (۵۵) تک کے علاقے پر پوری طرح قابض ہوگیا تھا۔ وہ ۶۰۲ھ میں (۵۶) دمیک کے مقام پر شہید کر ڈالا گیا۔ اس کی وفات پر اس کے سپہ سالار (۵۷) قطب الدّین ایبک نے دلّی میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

ماہ ملک اپنے اوصاف اور کمالات کی وجہ سے ایران کی تاریخ میں خاصی شہرت کی حامل ہے۔ وہ غیاث الدّین محمد کی بیٹی ، معز الدّین محمد بن سام کی بھتیجی اور علاءالدّین جہاں سوز(۵۸) کی نواسی تھی۔ منہاج سراج نے اسی کے دامن عاطفت میں پرورش پائی تھی ، اس بنا پر طبقات ناصری میں چند بار اس کا ذکر ملتا ہے ۔

ماہ ملک منہاج سراج کی ماں کی ہم مکتب اور ہم شیر تھی ، اسی وجہ سے منہاج کی پرورش شاہی محل میں ہوئی۔ وہ وہیں پلا بڑھا اور سن بلوغ کو پہنچا تھا۔ ایک بار طبقات ناصری (ج ا ص ۳۱۹) میں وہ لکھتا ہے :

> احقر نے اس کتاب کو (نسب نامۂ سلاطین غور (۵۹) تالیف فخر الدّین مبارکشاہ مروزی) خداوند ملکۂ جہاں زبیدۂ عصر و الزمان جلال الدّنیا و الدّین سلطان الملکات فی العالمین ماہ ملک بنت سلطان السعید غیاث الدنیا و الدین ابو الفتح محمد بن سام قسیم (۶۰) امیر المومنین انار اللہ برہانہ کے حرم محترم میں سنہ ۶۰۲ھ میں ان کے تخت معظم کے سامنے دیکھا تھا اور اس ملکۂ جہاں نے اس فقیر کو حرم شاہی میں اپنے بیٹوں کی طرح شاہانہ انداز میں پرورش کی تھی، یہ احقر صغر سن میں ان کے حرم میں رہتا اور انھی کی نظر مبارک

کے سامنے اس کی تربیت ہوئی تھی، ملکۂ جہاں بہت سے اوصاف و کمالات کی مالک ہیں۔ اول وہ حالت بکر میں دار فنا سے دار بقا منتقل ہوئیں۔ دوم حافظ کلام اللہ تھیں۔ سوم سارے اخبار شہادت ان کو حفظ تھے۔ چہارم ہر سال ایک بار ساری رات کھڑی رہتیں اور پورا کلام اللہ دو رکعت نماز میں ختم کر ڈالتیں۔ پنجم اپنے والد بزرگوار سلطان غیاث الدّین محمد بن سام کی وفات سے سات سال تک ان پر سورج کی روشنی نہیں پڑی۔ وہ پوری مدّت مصلّے پر بیٹھی رہتی تھیں اور اس طرح گوشہ نشین ہوگئی تھیں"۔

خلاصۂ کلام یہ کہ فخر الدّین مبارک شاہ نے اس نسب نامے کو سلطان علاء الدّین حسین جہانسوز کے نام پر منظوم کیا تھا، اور اس روایت کی ابتدا میں اس حقیر نے ملکہ جلالی سے سنا تھا کہ جب نسب نامے کے بعض حصے منظوم ہوچکے تو شاعر کے مزاج میں کسی وجہ سے تغیر پیدا ہوا اور اس نے منظوم نامہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر جب غیاث الدّین محمد بن سام تخت نشین ہوا تو فخر الدّین مبارک شاہ نے یہ منظومہ غیاث الدّین کے نام معنون کیا۔

دوسری جگہ پھر اسی تاریخ (۶۱) میں آیا ہے:

ملک علاء الدّین ملک شجاع الدین علی (۶۲) کا بیٹا اور سلطان غیاث الدّین اور سلطان معز الدّین کا چچا زاد بھائی تھا اور ان دونوں بھائیوں سے سن میں بڑا تھا، حج کی سعادت (۶۳) سے مشرف ہو چکا تھا اور غزوات میں شامل رہ چکا تھا، سلطان غیاث الدین اور معز الدّین اس کو خداوند (۶۴) کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ سلطان غیاث الدّین کی بیٹی ماہ ملک جو جلال الدنیا والدین کے لقب سے سرفراز تھی اور سلطان علاء الدّین جہاں سوز (۵۴۴ھ - ۵۵۱ھ) کی بیٹی کے بطن سے تھی (۶۵) اس کے نکاح میں تھی، وہ ملکہ بڑی باوصف تھی۔ قرآن مجید کی حافظ تھی۔ اخبار شہادت اس کو ازبر تھے۔ خط ایسا تھا جیسے دُرِّ شاہوار ہو۔ ہر سال

ایک بار دو رکعت نماز میں سارا کلام مجید ختم کر ڈالتی اور باوجود شادی شدہ ہونے کے حالت بکر میں فوت ہوئی۔ صورت یہ ہوئی کہ ملک ضیاء الدّین (ملک علاء الدّین کا پہلا نام) (۶۶) کے پاس ایک ترک کنیز تھی۔ اس سے ایک لڑکا تھا۔ اس کنیز سے ملک ضیاء الدّین نے نکاح کرلیا تھا۔ اس بنا پر اس ملکہ سے زناشوئی کے تعلقات قایم نہ رہ سکے۔ ملکہ حسن و جمال، عفت و پادسائی، زہد و تقویٰ کے اعتبار سے ساری دنیا میں بے مثال تھی۔ احقر کی والدہ ملکہ کی ہم شیر اور ہم مکتب تھیں۔ چنانچہ ملکہ ہی نے اس حقیر کی پرورش اپنے زیر سایہ حرم میں کی تھی اور حد بلوغ تک وہ حرم ہی میں رہا تھا۔ میرے ماموں اور نانا کے خاندان والے اس کی اور اس کے والد محترم کی بارگاہ اور حرم سے متعلّق رہے تھے۔

اس ملکہ کے نہ جانے کتنے احسانات اس حقیر کے سر ہیں۔ خدا اسے جزائے خیر دے۔ اس کی شہادت عراق میں کنار کے حادثے میں ہوئی رحمۃ اللہ علیہا۔

منہاج سراج نے اپنے پہلے بیان میں ملکہ ماہ ملک کی پانچ صفات گنائی ہیں۔ ان پر اور بھی اضافہ ہوسکتا ہے: اوّل یہ کہ حسن و جمال، عفّت و پاکیزی، زہد و تقویٰ میں بے مثال تھی۔ دوم یہ کہ بے مثال خطاط تھی۔ سوم بڑی دوست نواز تھی۔ اسی دوست نوازی کا نتیجہ ہے کہ اس کی اپنی ایک دوست کے لڑکے کی پرورش شاہی محل میں ہوئی۔ چہارم بڑی علمی فضلیت رکھتی تھی، نسب نامۂ سلاطین غور سے دلچسپی اس کے علمی ذوق کی دلیل ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ خود منہاج سراج کی تاریخ طبقات ناصری ج ۱ ص ۳۰۲ سے معلوم ہوا کہ ملکہ جلالی (۶۷) کی بظاہر پہلی شادی سنجر شاہ بن طغان شاہ سے ہوئی تھی۔ سنجر شاہ کو سلطان تکش (۶۸) نے قید کرلیا تو فقۂ شافعی کی رو سے اس ملکہ کی شادی ٹوٹ گئی۔ سلطان غیاث الدّین نے اپنے چچا زاد بھائی ملک ضیاء الدّین (ملک علاء الدّین) کے ساتھ کردی تھی۔ طبقات کے الفاظ (۶۹) یہ ہیں:

چون طغان شاہ بہ تخت نیشاپور نشست با ملوک غور اتصال معارف فرستاد و دختر سلطان غیاث الدّین محمد سام طاب ثراہ بجہت پسر خود سنجر شاہ بخواست و اکابر و علما نیشا پور بیامدند و آن

عقد منعقد کردند، چون طغان شاہ برحمت حق پیوست تکش خوارزم شاہ لشکر بہ نیشاپور آورد و نیشاپور را ضبط کرد و سنجر شاہ رابگرفت و بخوارزم سلطان غیاث الدّین ملکہ جلالی را پای کشاد بر قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ و بہ ملک ضیا الدّین در غور داد و سنجر شاہ بخوارزم در گذشت۔

تاریخ ایران کے مطالعے کے دوران ان تین نامور خواتین کے کارناموں سے میں متاثر ہوا تو ان کے کارناموں کا اجمالی تذکرہ اس مقالے میں کردیا ہے۔ تاریخ میں اس طرح کی متعدد خواتین گذری ہوں گی جنھوں نے قابل یادگار کارنامے چھوڑے ہوں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی خواتین کے بارے میں یادداشتیں لکھی جائیں جن سے اس حقیقت کا انکشاف ہو کہ اسلامی معاشرہ خواتین کے کارناموں سے خالی نہیں۔

نذیر احمد

سرسید نگر۔ علی گڑھ ۲۸۔ اپریل ۱۹۹۵ء

حواشی

(۱) نیشاپور و بیہق کے اس خانوادے کے مورث اعلیٰ کا نام میکال بن عبدالواحد بن جبرئیل تھا۔ اس کا شجرۂ نسب ساسانی فرمانروا بہرام گور (۴۲۱ تا ۴۳۸ء) تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان کا ایک نامور امیر ابوالعباس اسماعیل بن عبداللہ بن محمد بن میکال (م: ۳۹۲ھ) تھا۔ مقصورہ ابن درید اس کے اور اس کے والد کے نام پر ہے۔ ابونصر احمد بن علی میکالی جس کا مفصل ذکر تاریخ یمینی (ترجمہ ص ۴۵۳ بعد) میں آیا ہے، وہ شاعر، ادیب اور شعرا و ادبا کا بڑا قدردان تھا۔ ابوبکر خوارزمی اور ابوطمعان کے مدحیہ اشعار اور خود ابونصر کے اشعار اور نثر کے نمونے تاریخ یمینی میں نقل ہیں۔ اس کی ایک فصل شمس المعالی قابوس کے نام پر ہے۔ اس کے دو نامور فرزند تھے، ابوالفضل اور ابو ابراہیم۔ ابوالفضل عبیداللہ بن احمد کئی کتابوں کا مصنف ہے۔ اس کے نظم و نثر کے نمونے تاریخ یمینی میں موجود ہیں۔ اس کے تین بیٹے تھے، امیر حسین، امیر علی، امیر اسماعیل۔ امیر علی صاحب دیوان شاعر گذرا ہے۔

(۲) قاضی صاعد نے خاندان میکائیلیان کا امیر مسعود سے اس طرح ذکر کیا ہے:
بادشاہ کو بخوبی معلوم ہے کہ خاندان میکائیلیان پُرانا خاندان ہے۔ اس شہر (نیشاپور) میں ان کو خصوصیت حاصل ہے، اور ان کے آثار ہر طرف ظاہر ہیں۔ خدا کے فضل اور اس خاندان کی برکت علم کی بدولت میں ایسا ہوا ہوں۔ ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ اور ان پر بڑا ستم ہوا کہ ان کی جائدادیں موقوف ہو کر رہ گئی ہیں ... (تاریخ بیہقی ص ۴۰)

(۳) تاریخ بیہقی ص ۱۳۶ (۳)

(۴) اس قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں

بر شہ ایران حدیث سیستان پوشیدہ ماند — بیشتر شغلی گرفت از شغل خواجہ بیشتر

عاملان را باز خواند و مردمان را بازداد — شوی با زن گشت و زن با شوی و مادر با پسر

خانہ ہا آباد گشت و کارہا بر پای شد — با خطر شد بار دیگر باغہای بی خطر

روزگار سیستان را بانکوئی عدل او   باز نشناسم ہمی از روزگار زال زر
شہر را بسیار دارد خواجہ در زیر قلم   تو بہر شہری کنون ہم زین قیاس اندر نگر

(دیوان ص ۱۹۴)

(۵) تاریخ بیہقی ص ۲۰۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنک ۴۱۴ھ میں حج پر جاتا ہے۔ احمد حسن میمندی حسنک کی واپسی پر وزارت کے عہدے پر فائز تھا۔ اس سے ظاہر ہے حسنک کی وزارت حج سے واپسی پر شروع ہوتی ہے۔ حسن کی برطرفی اور اس کو پھانسی پر چڑھانے کے بجائے اس کی وزارت پر تقرری خلیفۂ بغداد قادر باللہ کے غیض و غضب کی موجب ہوئی ہو گی۔ بہرحال یہ کرم باہمی مکاتبات کے خاتمے پر منتج ہوا۔

(۶) قرمطی فرقۂ اسماعیلی کی ایک شاخ ہے۔ اس کا بانی حمدان الاشعث ہے جس کا ظہور ۲۸۰ھ میں ہوا۔ اس کے داعیوں میں زکرویہ بن مہرویہ اور ابوسعید جنابی تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ محمد بن اسماعیل امام ہفتم اور صاحب الزماں ہیں۔ قرمطیوں نے اپنے عقاید کی ترویج میں قتل و غارت کو ضروری قرار دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں اواخر تیسری صدی سے پانچویں صدی ہجری تک عراق و ایران میں قرمطیوں اور دوسرے فرقوں میں بڑی آویزش رہی۔ چنانچہ اسماعیلی فدائیوں اور قرمطیوں کے ہاتھوں ہزاروں مسلمان موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ ایران کی تاریخ قتل و غارت کے ان واقعات سے بھری پڑی ہے (رک: فرہنگ معین ۶: ۵۰ - ۱۴۴۹ - لغت نامہ دہخدا، مادہ قرمطیان

قرمطی اکثر حج بیت اللہ کے مسافروں کو اپنی دہشت گردی کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ زین الاخبار گردیزی میں خلیفہ المعتضد باللہ (م: ۲۸۹ھ) کے زمانے کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ قرمطی بحرین آ گئے اور ریگستان میں پھیل گئے۔ اور حاجیوں کا راستہ روک کر فتنہ و فساد میں مصروف ہوئے۔ یہاں تک کہ مکہ جانے کا راستہ مسدود کر دیا۔ چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ اور اس نے قرمطیوں کو قید کر کے خلیفہ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں وہ سولی پر لٹکا دیے گئے۔ (ص ۸۲) مکتفی کے دور میں زکرویہ بن مہرویہ نے جو قرمطی داعی تھا، بڑا فتنہ پھیلایا تھا۔ مکتفی نے چند بار فوج بھیجی جو فتنہ روکنے میں ناکام رہی۔ آخر میں خلیفہ اس کو مع دوسرے داعیوں کے پکڑنے اور

قتل کرنے میں کامیاب ہوا۔ محمود غزنوی کے زمانے میں ملتان قرمطیوں کا بڑا مرکز بن گیا۔ سلطان نے ان پر حملہ کر کے ان کا زور ختم کر دیا تھا (زین الاخبار ص ۱۸۰)

(۷) خلفائے فاطمی کی حکومت ۲۹۷ھ تا ۵۶۷ھ رہی۔ اس مضبوط حکومت کا خاتمہ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں ۵۶۷ھ میں ہوا۔ حسنک کا واقعہ ساتویں فاطمی خلیفہ ظاہر علی (۴۱۱ھ - ۴۲۶ھ) سے تعلق رکھتا ہے۔

(۸) تاریخ بیہقی ص ۱۸۳

(۹) ص ۱۷۹ تا ۱۹۷

(۱۰) ایضاً ص ۱۷۹

(۱۱) "امیر رضی اللہ عنہ مرا بخواند و گفت خواجہ احمد رابگوی کہ حال حسنک بر تو پوشیدہ نیست کہ بروزگار پدرم چند درد در دل ما آوردہ است و چون پدرم گذشتہ شد چہ قصدہا کرد بزرگ در روزگار برادرم (بیہقی ص ۱۸۱)

(۱۲) احمد بن حسن میمندی (م: ۴۲۴ھ) ۴۱۵ سے ۴۲۱ تک قلعۂ کالنجر میں قید رہے۔ سلطان مسعود کے زمانے میں ۴۲۲ میں پھر یہ عہدہ سنبھالا (بیہقی ص ۱۳۸ بعد)

(۱۳) ابوالفضل بیہقی کا استاد اور صاحب دیوان رسالت تھا۔ باوجود درباری سازشوں کے اس نے نہایت عزت و حرمت کی زندگی گذاری۔ ۴۳۱ھ میں وفات پائی۔

(۱۴) بیہقی ص ۱۸۳

(۱۵) ایضاً ص ۱۸۳

(۱۶) بیہقی ص ۱۸۳

(۱۷) ایضاً ص ۱۸۵-۱۸۶

(۱۸) بیہقی ص ۱۸۷ - ۱۸۸

(۱۹) ایضاً ص ۱۸۹

(۲۰) راحۃ الصدور جو سلاجقۂ عراق کی سب سے معتبر تاریخ ہے اور جو ۵۹۹ ہجری میں لکھی جانی شروع ہوئی۔ اس میں یہ ساتواں فرمانروا بتایا گیا ہے

(۲۱) اس کے حالات کے لیے دیکھیے راحۃ الصدور ص ۲۰۸ بعد

(۲۲) ایضاً ص ۲۰۸

(۲۳) اس کے دربار سے وابستہ شاعروں میں عمادی شہریاری بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اس

بادشاہ کی تعریف میں اس کے پانچ قصیدے ہیں لباب الالباب نفیسی ص ۲۳، دو قصیدے راحۃ الصدور (ص ۲۱۰ تا ۲۱۴) میں نقل ہیں۔ ان میں سے ایک لباب الالباب میں ہے (ص ۳۳۳ ۔ ۳۳۴)

(۲۴) راحۃ الصدور ص ۲۰۹

(۲۵) ایضاً

(۲۶) سلطان برکیارق سے پہلے سلطان محمود بن ملک شاہ چند ماہ کے لیے تخت نشین ہوا تھا۔ مگر اس کا نام راحۃ الصدور کی فہرست میں نہیں۔ مگر معین نے دیا ہے۔ فرہنگ معین ج ۵ ص ۸۱،

(۲۷) سلاجقۂ بزرگ کی حکومت سنجر کی حکومت کے خاتمے تک (۴۲۹ ھ ۔ ۵۵۲ھ) ۱۲۳ سال ہوتی ہے اس میں چھے فرمانروا ہوئے ہیں۔ اور سلاجقۂ عراق کی حکومت ۵۱۱ ھ سے ۵۹۰ ھ تک۔ کل ۸۰ سال کی ہوئی جس میں ۹ بادشاہ ہوئے۔ ان میں ایک داود بن محمود کا نام راحۃ الصدور میں نہیں۔

(۲۸) صفا: تاریخ ادبیات در ایران ص ۲۷

(۲۹) اتابک ایلدگز اتابکان کے ایک ایسے دستے کا سرغنہ تھا جس نے ۵۳۱ ھ تا ۶۲۲ ھ آذربائیجان میں حکومت کی۔ شمس الدین ایلدگز اتابک اعظم کی حیثیت سے سلطان مسعود اور ارسلان کے عہد میں غیر معمولی قدرت حاصل کر چکا تھا۔ اسی کے اثر و نفوذ کے نتیجے میں سلطان ارسلان ۵۵۵ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس وقت سے لے کر اپنی وفات ۵۶۸ ھ تک اتابک اعظم کی حیثیت سے سارے امور پر حاوی رہا۔ ابخاز کی فتح اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا محمد جہاں پہلوان اس کا وارث ہوا۔ وہ ۵۸۱ ھ تک برسراقتدار رہا۔ اس کے بعد اس کا بھائی قزل ارسلان آذربائیجان کا بادشاہ مقرر ہوا۔ وہ شعرا کا بڑا قدردان تھا۔ اور ظہیر فاریابی کا یہ شعر جو ضرب المثل بن گیا ہے۔ اسی قزل ارسلان کے لیے تھا:

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پای   تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

آخر میں قزل ارسلان کا سیاسی اقتدار اتنا بڑھا کہ وہ سلاجقہ کی حکومت کا خواب دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ خلیفۂ بغداد نے اس کے لیے خلعت اور تشریف بھیجی۔ لیکن انھی دنوں میں وہ ۵۸۷ھ میں امراء کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ انھی ایام میں جہاں پہلوان کے

تین بیٹے: قتلغ اینانج، اتابک نصرۃ الدین ابوبکر، اتابک ازبک افق سیاست پر بڑی آب و تاب سے ابھرے۔ قتلغ تو ۵۹۲ھ میں قتل ہوا، باقی دونوں بیٹوں کا اقتدار باقی رہا، یہاں تک کہ ۶۲۲ھ میں خاندان ایلدگزیان کا خاتمہ ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قزل ارسلان کے زمانے ہی سے ان کی سیاسی سرگرمیاں خانوادۂ سلاجقہ کے لیے انتہائی مضر رہیں، لیکن ایلدگزیان بڑے علم و ادب دوست تھے، اور اس عہد کے فارسی شعراء ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ (دیکھیے راحۃ الصدور صفحات مختلف

(۳۰) راحۃ الصدور ص ۲۸۳: پدر او سلطان طغرل محمد فرمان یافت اوراکم از یک سال بود عم زادہ او ملک شاہ بن سلجوق بن محمد ہم درین حد بود۔ سلطان مسعود ایشان را تربیت فرمود ... تا در سال ۵۴۰ ... از دارالملک ایشان را بقلعۂ تکریت فرستاد

(۳۱) راحۃ الصدور ص ۲۸۵: سنقر ہمدانی درخدمت ملک بنزدیک اتابک ایلدگز آمد کہ والدہ ملک در حبالہ اوبود و تقربی دانست این خدمت والحق تقربی بود عظیم بزرگ و ذخیرہ مغتنم، و ملک ارسلان باعزاز و اکرام بنزدیک اتابک ایلدگز کہ بمحل پدر بود و والدہ بماند

(۳۲) دیکھیے راحۃ الصدور صفحات مختلف

(۳۳) قزل ارسلان ایلدگز کا بیٹا غالبا والدہ سلطان کے پیٹ سے تھا

(۳۴) یعنی اتابک ایلدگز

(۳۵) راحۃ الصدور ص ۲۹۸

(۳۶) ایضاً ۲۹۷

(۳۷) یعنی نصرۃ الدین محمد جہان پہلوان شمس الدین ایلدگز کا بڑا بیٹا، بظن قوی یہ مادر سلطان کے بطن سے تھا۔

(۳۸) جلال الدین قوام الدین ابوالقاسم کا بیٹا تھا، آخرالذکر سلطان سنجر کا وزیر تھا، حکیم سنائی نے اس کے نام دو خط لکھے تھے، اس میں وزیر کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکنے کا عذر پیش کیا تھا، اسی موضوع کے تعلق سے اس کا ایک قصیدہ بھی ہے۔ وزیر کے حالات کے لیے دیکھیے تعلیقات مکاتیب سنائی بقلم نگارندہ ص

(۳۹) راحۃ الصدور ص ۲۹۸

(۴۰) موجودہ ابخازیہ جس کو جارجیا سے ملا کر روسیوں نے ایک ریاست بنایا اور روسی جمہوریہ میں شامل کر لیا تھا۔ اب یہ خطہ جارجیا سے علیحدگی چاہتا ہے اور اس سلسلے

ہیں دونوں خطوں میں کئی جنگیں بھی ہوئیں

(۴۱) یہی لقب اس کے بیٹے اتابک ابوبکر کا بھی تھا۔

(۴۲) جہاں پہلوان کا بیٹا ازبک یا اوزبک بھی اسی لقب سے مشہور تھا۔

(۴۳) آذربائیجان میں نخجوان کے اطراف میں تھا

(۴۴) اس کی قرات مشتبہ ہے

(۴۵) ارس نام رودی بزرگ است کہ از کوہ ہای ارزن الروم آید و بر صحرای نخجوان و از آنجا اران رود و بچندین بخش گردد و بہ دریای آبسکون منتہی شود۔

آرس را در بیابان جوش باشد بدریا چون رسد خاموش باشد

(نظامی)

ای صبا گر بگذری بر ساحل رود ارس بوسہ زن برخاک آن وادی و مشکین کن نفس

(حافظ)

(۴۶) صفا نے تاریخ ادبیات در ایران ج ۲ ص ۲۰ پر اتابک ایلدگز کی تاریخ وفات ۵۶۸ھ لکھی ہے۔ لیکن راحۃ الصدور سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ارسلان کی ماں کی آذربائیجان سے ہمدان آنے کی تاریخ اواسط زمستان ۵۶۹ ھ درج کی ہے۔ سلطان موسم خوشگوار ہونے پر آذربائیجان روانہ ہوتا ہے اور عید اضحیٰ کے موقع پر نخجوان پہنچتا ہے گویا محرم ۵۷۰ ھ میں سلطان اور اس کی والدہ ان اطراف میں تھے۔ سلطان کی بیماری کئی مہینے طول کھینچ گئی۔ اسی درمیان سلطان ہمدان کی طرف واپس ہوا۔ تبریز پہنچا تو اس کی والدہ کی وفات کی خبر آئی۔ یہ ۵۷۰ ہجری کے وسط سے پہلے کا واقعہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایلدگز کا انتقال ایک ماہ بعد ہوا۔ اس لحاظ سے یہ تاریخ ۵۷۰ ھ کے پہلے کی نہیں ہو سکتی۔

(۴۷) راحۃ الصدور ص ۲۹۹

(۴۸) راحۃ الصدور ۲۹۹ ۔ ۳۰۰۔ سلطان طغرا بن ارسلان ان سے بڑی ارادت رکھتا تھا۔ اور ہر رات ان کے پاس صلاح مشورے کے لیے جاتا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راحۃ الصدور ص ۳۳۸، ۳۳۹، ۲۵۱۔ لیکن خلاصہ راحۃ الصدور میں ظہر الدین کے بجائے فخرالدین ہے بہ لیکن بظن قوی فخرالدین بلخی یہاں غلط ہے۔ فخرالدین بلخی ظہرالدین بلخی

سے متاخر عالم تھے، اس لیے کہ آخرالذکر ۵۶۹ ھ کی جنگ میں شریک تھے، اور فخرالدّین محمد بن علی راوندی کے استاد تھے۔ راوندی اواخر چھٹی صدی ہجری اور اوائل ساتویں صدی ہجری کے دانشمند تھے۔ اس بنا پر قیاس ہوتا ہے کہ ظہرالدّین بلخی فخرالدّین سے مقدّم ہوں گے۔ بالفاظ دیگر فخرالدّین بلخی کی ۵۶۹ ھ کی جنگ میں شرکت مشتبہ ہے۔

(۴۹) دیکھیے طبقات ناصری طبع کابل ج ۱ ص ۳۵۳، ۳۶۹

(۵۰) علّامہ قزوینی نے حواشی چہار مقالہ ص ۹۱ پر غیاث الدّین محمد کا سال جلوس ۵۵۸ھ درج کیا ہے، اس حساب سے مدت حکومت ۴۱ سال ہوتی ہے۔ نیز دیکھیے طبقات ج ۱ ص ۳۶۱ ح ۸۔

(۵۱) یہ عمر طبقات ج ۱ ص ۳۶۱ پر درج ہے۔

(۵۲) ایضاً

(۵۳) طبقات ج ۱ ص ۳۹۵، ۴۰۷ھ۔

(۵۴) تخت نشینی کے قبل اس کا لقب شہاب الدّین اور بڑے بھائی کا شمس الدّین تھا دیکھیے طبقات ج ۱ ص ۳۹۹۔ ۴۰۰

(۵۵) رائے پتھورا والی اجمیر پر اس نے ۵۸۸ ھ میں حملہ کرکے سارے شمالی مغربی ہندوستان پر اپنا قبضہ جما لیا تھا

(۵۶) غزنی جاتے ہوئے ایک فدائی کے ہاتھ شہادت پائی (طبقات ج ۱ ص ۴۰۳، ۴۰۴)

(۵۷) طبقات ناصری (ج ۱ ص ۴۵۹، ۴۰۷) کی رو سے معز الدین کے چار سپہ سالار جو غلام تھے، فرمانروا ہوئے ہیں۔ تاج الدّین یلدز غزنی میں، ناصر الدّین قباچہ ملتان میں، قطب الدّین ایبک دِلّی اور لاہور میں، غیاث الدّین عوض خلجی لکھنوتی (بنگال) میں

(۵۸) اس کے حالات کے لیے دیکھیے طبقات ناصری ج ۱ ص ۳۴۱۔ ۳۴۹، اس کے لقب جہانسوز کے لیے دیکھیے چہار مقالہ طبع قزوینی ص ۲۹۔ تعلیقات ص ۹۲، ۱۵۶ وغیرہ۔ بہرام شاہ غزنوی نے علاء الدّین جہانسوز کے دو بھائیوں کو یعنی قطب الدّین ملک الجبال اور سیف الدّین سوری کو قتل کر دیا تھا، علاء الدّین نے بہرام شاہ سے بدلہ لینے کی غرض سے غزنی پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سات دن قتل عام جاری رہا اور پورا شہر برباد کر ڈالا، اس سلسلے میں "چہار مقالہ" میں ایک دلچسپ واقعہ درج ہے کہ علاء الدّین حسین کے حکم سے غزنیں شہر ڈھا دیا گیا۔ کسی کی مجال نہ تھی

کہ غزنوی سلاطین کو سلطان کہتا لیکن وہ خود شاہنامے کے یہ شعر پڑھتا تھا:

چو کودک لب از شیر مادر بشست ز گہوارہ محمود گوید نخست

بتن زندہ پیل و بجان جبرئیل بکف ابر بہمن بدل رود نیل

جہاندار محمود شاہ بزرگ بہ آبشخور آرد ہمی میش و گرگ

اس کے بعد نظامی عروضی صاحب چہار مقالہ نے نکتے کی بات درج کی کہ یہاں حشمت محمود نہیں تھی بلکہ حرمت فردوسی یہ اشعار پڑھوا رہی تھی۔(چہار مقالہ طبع قزوینی ص ۲۹)

(۵۹) فخرالدین مبارک شاہ مرورودی جو مروزی، مروی اور غوری بھی کہلاتا ہے۔ اس کا ایک ہمنام معاصر بنام فخر مدبر مبارک بن منصور المعروف بہ مبارک شاہ ہے۔ وہ شجرۂ انساب مبارک شاہی اور آداب الحرب والشجاعہ کا مؤلف ہے۔ اوّل الذکر قطب الدّین ایبک کے نام اور آخرالذکر التتمش کے نام پر لکھی گئی ہے۔ سر ڈینسن راس نے فخر مدبر کو فخرالدّین مبارک شاہ مرورودی سے جا ملایا ہے (مقدمہ تاریخ مبارک شاہی 'چاپ لندن' ۱۹۲۷ء) لیکن یہ غلط ہے۔ فخر مدبر فخرالدّین مبارک شاہ مرورودی سے الگ ہے۔ اس کے وجوہ یہ ہیں:

۱۔ مرورودی کی تاریخ وفات ۶۰۲ھ ہے۔ اور فخر مدبر التتمش کے عہد میں (۶۰۷ھ۔ ۶۳۳ھ) زندہ تھا۔

۲۔ اوّل الذکر کے باپ کا نام حسن اور آخرالذکر کے باپ کا نام منصور تھا۔

۳۔ اوّل الذّکر مرورودی یا مروزی ہے۔ اور سلاطین غور سے متعلق ہونے کی وجہ سے غوری بھی کہلاتا ہے۔ فخر مدبر کی یہ نسبت نہیں بلکہ غزنوی ہے۔

۴۔ مرورودی کی کتاب نظم میں تھی اور فخر مدبر کی نثر میں۔ فخرالدین مبارک شاہ اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا۔ فخر مدبر کا شاعری سے تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی دونوں کتابیں نثر میں ہیں۔

اس موضوع پر حسب ذیل نگارشات قابل توجہ ہیں:

۱۔ یاد داشتہای قزوینی، مرتبہ ایرج افشار ج ۵ ۔ ۶، ص ۹۵۔ ۹۹

۲۔ تعلیقات طبقات ناصری بقلم عبدالحی حبیبی ج ۲ ص ۳۹۷۔ ۸۹۳

۳۔ مقدمۂ نزہۃ المجالس بقلم محمد امین ریاحی طبع تہران ۱۳۶۶، ص ۸۸ ۔ ۸۹
۴۔ مقالۂ آداب الحرب و الشجاعہ ۔ بقلم نویسندہ این سطور ۔ قند پارسی (مجموعہ گفتار ادبی تاریخی از نذیر احمد بکوشش دکتر سیّد حسن عباس ۔ تہران ۱۳۷۱) ص ۲۸۳۔ ۲۸۸۔ این مقالہ قبلاً در تہران چاپ شدہ بود ۔

فخرالدّین مبارک شاہ مسلم الثبوت شاعر تھا ۔ اس کے جو اشعار ملے ہیں یا جو بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں :

۱۔ ہفت اقلیم امین احمد رازی ۔ دو قصیدے سیف الدّین غوری (م: ۵۵۸ھ) کی مدح میں
۲۔ روضات الجنات تالیف معین اسفزاری ج ۱ ص ۲۵۹ (طبع دانش گاہ علی گڑھ ۱۹۶۱) چھے شعر ، جو بظاہر قوی نسب نامہ کے ہیں ۔
۳۔ حبیب السیر ۲ / ۱۵۵ میں ایک منظوم کتاب علم نجوم میں المدخل المنظوم فی بحر النجوم اس کی بتائی گئی ۔ لیکن ابھی تک اس کے کسی نسخے کا علم نہیں
۴۔ رحیق التحقیق ایک اخلاقی مثنوی کا پتا زکی ولیدی طوغان نے ایا صوفیہ کے کتاب خانے میں (شمارہ ۴۷۹۲) دیا تھا ۔
۵۔ تقریباً ۵۴ رباعیات نزہۃ المجالس میں مندرج ہیں (مقدمۂ نزہۃ المجالس ص ۸۹)
۶۔ ایک دلچسپ رباعی طبقات ناصری چاپ کابل ج ۱ ص ۳۶۵ پر درج ہے ۔ جس کی وجہ سے سلطان غیاث الدّین شکار پر جانے سے رک گیا تھا ۔

راقم الحروف کو رحیق التحقیق کے تین نسخوں کا پتا چلا ہے جن کے عکس تہران یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہیں ۔ ان میں ایک قدیم نسخے کا عکس راقم کے پاس موجود ہے اور اس کی اشاعت کا انتظام ہو رہا ہے ۔

(۶۰) یہ لقب اکثر سلاطین کا ہے ۔ لیکن معز الدّین محمد کا قسیم امیر المومنین اور ناصر امیر المومنین دونوں ہے ۔ رک طبقات ج ۱ ص ۳۹۵ ، ۴۰۵

(۶۱) ج ۱ ص ۳۶۳۔ ۳۷۰۔

(۶۲) شجاع الدّین کے حالات کے لیے دیکھیے طبقات ج ۱ ص ۳۳۰۔ ۳۱۔ ملک علاء الدّین کی ماں ملک الجبال قطب الدّین محمد (مقتول در غزنی ۵۳۱ھ) کی بیٹی تھی (طبقات ایضاً)

(۶۳) اپنی ماں کے ساتھ حج پر گیا تھا۔ مکہ میں خانقاہ بھی بنوائی تھی (ایضاً ص ۳۳۱)

(۶۴) طبقات ج ۱ ص ۳۶۹۔

(۶۵) اس کا نام جوہر ملک تھا (دیکھیے شجرۂ غوریان۔ طبقات چاپ کابل مقابل ص ۳۲۲۔

(۶۶) طبقات ج ۱ ص ۳۳۰۔ ج ۱ ص ۳۸۲۔ اس کو شروع میں ضیاء الدّین کہتے تھے۔ جب وہ غیاث الدّین کے بعد فیروز کوہ کے تخت پر بیٹھا تو علاء الدّین کہلایا۔

(۶۷) اس ملکہ کا یہی لقب طبقات ج ۱۔ ص ۳۱۹ کے علاوہ ص ۲۰۳ پر بھی موجود ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں جگہ یہی ملکہ جلال الدّنیا و الدّین مراد ہے۔ جو منہاج سراج کی مُربّیہ تھی۔ اس سے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ ملکہ کی پہلی نسبت طغان شاہ کے بیٹے سنجر شاہ سے ہوئی تھی۔ مگر وہ سلطان تکش کی گرفت میں آیا۔ اور اس نے اسے خوارزم میں قید کر دیا۔ وہیں وہ فوت ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ فقۂ شافعی کی رو سے ملکہ پر اس شادی کی پابندی نہیں رہ گئی۔

(۶۸) سلطان تکش (علاء الدّین) ایل ارسلان (م ۵۶۸ھ) کا بیٹا تھا جس نے ۵۶۸ھ تا ۵۹۶ھ حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا علاء الدّین محمد (۵۹۶ھ تا ۶۱۷ھ) سریر آرا رہا۔ اسی علاء الدین کا نامور پسر جلال الدّین منکبرنی (۶۱۷ تا ۶۲۸ھ) ہے جس نے منگولوں سے پے در پے جنگ کی۔ آخر ۶۲۸ھ میں شہید ہوا۔ ایران کی تاریخ اس کے کارناموں سے پُر ہے۔

(۶۹) ج ۱ ص ۲۰۳۔ طبقات میں ملک موید۔ طغان شاہ اور سنجر شاہ کو ملوک سنجریان نیشاپور قرار دیا ہے۔ ملک موید سلطان سنجر کا ترک غلام تھا۔ جسے نیشاپور کا علاقہ سپرد کیا گیا تھا۔ سنجر کی وفات ۵۵۲ھ کے بعد وہ آزاد فرمان روا کی شکل میں ابھرا۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں :

دیوان احمد جام کا ایک جائزہ

شیخ الاسلام ابو نصر احمد (معروف بہ احمد زندہ پیل) بن ابوالحسن ، نامق (قریہ جامی) میں ۴۴۱ھ / ۱۰۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں ۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء میں فوت ہوئے۔ ان کے فارسی دیوان کے دو مطبوعہ نسخے دستیاب ہیں۔ ایک نسخہ نول کشور (لکھنؤ) نے ۱۹۲۳ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں ۳۰۶ غزلیں (مع متفرقات) ہیں۔ دوسرا نسخہ شیخ الٰہی بخش نے لاہور سے شائع کیا تھا۔ (تاریخ درج نہیں)۔ اس میں ۴۵۸ غزلیں ہیں (۱)۔ یہ نسخہ (جیسا کہ سر ورق میں لکھا ہوا ہے) افغانستان کے والی امان اللہ خاں کے عہد میں شائع ہوا ۔ سر ورق میں احمد جام کے اخلاف کے نام بھی دیے گئے ہیں۔ طباعت کے وقت خواجہ عبدالرحمٰن خاں زندہ تھے اور ان کی فرمائش پر مولوی عبداللہ (خطیب سردستان) نے یہ نسخہ مرتب کیا تھا۔ اخلاف کے نام اس طرح درج ہیں ۔ خواجہ عبدالرحمٰن بن خواجہ فیض محمد خاں بن خواجہ شیر محمد بن خواجہ عبدالرحمٰن بن خواجہ یعقوب بن خواجہ امین (ساکن قریہ سردستان ۔ ہرات) جو شیخ الاسلام احمد جام کے پوتے تھے۔

مولانا نور الدین عبدالرحمٰن جامی (م ۸۹۸ھ) نے شیخ الاسلام احمد جام اور شہر جام کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

مولد جام و رشحۂ قلم   جرعۂ جام شیخ الاسلامیست

لاجرم در جریدۂ اشعار   بدو معنی تخلصم جامیست

ہمارے ملک (پاک و ہند) میں احمد جام کے چند اشعار بہت شہرت رکھتے ہیں۔ ایک شعر تو وہ ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ (م ۶۳۳ھ) اس کو سن کر وجد میں آگئے تھے اور اسی حال میں ان کا وصال ہوگیا تھا۔ شعر یہ ہے :-

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زماں از غیب جانے دیگر است

دوسری وہ غزل (بطور مناجات) مشہور ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے :-

مفلسانیم آمدہ در کوے تو   شیئاً للہ از جمال روے تو

احمد جام کے بعض اشعار سے ان کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ ایک شعر میں انھوں نے اپنے زندہ پیل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

سراسر جملہ عالم پُر ز فیلاں ولے چوں احمدی فیلِ خدا کو ؟

ایک شعر میں انھوں نے اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے۔

شد موے سفید از سیاہی قلب تو نہ شد سفید کاری

ایک شعر میں اپنی غریبی کا ذکر بھی کیا ہے

احمدا اندر غریبی غم مخور دل شاد باش کہ دریں غربت بتقدیر خدا افتادہ ایم

ایک غزل میں اپنے شہر والوں کی بے وفائی کا ذکر کرتے ہیں۔

اے دل وفا ز طائفۂ بے وفا مجوی تریاقِ جاں فزا ز لبِ اژدہا مجوی

در شہر ما وفا بہ مثل کیمیا شدہ در تنگنائے دہر ز کس کیمیا مجوی

ایک اور شعر ہو۔

احمد وفا مخواہ ز یارانِ بے وفا مہر و وفا چو از ہمہ اہلِ وفا گذشت

ایک غزل میں نکو نامی کو عشق میں پسند نہ کرتے ہوئے بدنامی پر زور دیا ہے کہ۔

ع نام نیکوے عشق بدنامی ست

اسی غزل میں ابو سعید ابوالخیر (م ۴۴۰ھ) اور بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کو عشق کی دنیا کا مرغ اور باز کہا ہے

مرغِ او بوسعید بوالخیر است باز او بایزید بسطامی ست (۲)

احمد جام شطحیات کے لیے مشہور ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کجا ست چشم خدا بیں کہ روے ما بیند عیاں ست صورت ما در وجود ایں اشیا

احمد چو بخویش گشت عاشق معشوق و عشق درمیاں چیست

مئے توحید را در جام کردند بہ مستان الست اعلام کردند

در مذہب ما دوئی نہ گنجد ما جملہ جہاں یکے شماریم

اے احمدی از یقین ببینی دانی بہ یقین کہ ما خدائیم

نقاش ہر نقشم عیاں من ملحد دیرینہ ام　　دیگر کسے نہ درمیاں من ملحد دیرینہ ام
ما از نسل خاک و باد و آب و آتش نیستیم　　کل موجودات مائیم و خلیفہ زادہ ایم

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت بھی لکھی ہے بلکہ خلفائے راشدین اور ائمۂ دوازدہ کی منقبت بھی لکھی ہے، لیکن

ع　ماجلہ رایکے شماریم ...... کے تحت ایک شعر ایسا بھی ہے جس کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی

در مذہب عاشقان یک رنگ　　شیطان و محمد است ہم سنگ (۳)

مولانا جامی نے نفحات الانس (۴) میں احمد جام کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں کہ وہ امّی تھے لیکن سراج السائرین کتاب لکھی تھی۔ اور حضرت ابوسعید ابوالخیر (م ۴۴۰ھ) کا خرقہ (بمطابق وصیت) ان کو ملا تھا۔ وغیرہ۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے شاعرانہ کلام پر علمائے عصر نے اعتراض نہیں کیا۔ لیکن ان کی شطحیات کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے جس پیر کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے وہ محض استعارے ہیں (نفحات الانس میں ان کے دنیوی پیر کا کوئی ذکر نہیں)۔

شیخ شیوخ جہاں، احمد قطب زماں　　بندۂ وے انس جاں، سرور عالی جناب
در نظرش ہر دو کون ذرّہ بود فی المثل　　در کف دریائے او قطرہ نما بحر آب
تختۂ اسرار غیب خواندہ بہ درس ازل　　پیر جہاں گیر بیں آمدہ از حق خطاب
مقتدائے نسل آدم رہنمائے عاجزاں　　آنکہ گردوں سر بزیر پاش دروا افگند
آں کس کہ سرا پردہ بصحرائے عدم زد　　ہر حرف کہ بر تختۂ ہستی ست رقم زد

حواشی

(۱) ایک عکسی نسخہ ڈاکٹر عابد علی خاں (سابق صدر شعبۂ فارسی ۔ کراچی یونیورسٹی) کے پاس ہے لیکن وہ مکمل نہیں ہے۔

(۲) ایک شعر میں نظامی گنجوی (۵۳۵ھ تا ۵۹۹ھ) ذکر ہے جو ظاہر ہے کہ الحاق ہے۔ کیوں کہ نظامی ایک سال کے تھے جب احمد جام فوت ہوئے۔ وہ شعر یہ ہے :۔

منشی سخن در ہمہ جا خواجہ نظامی ست   کو خیمہ گفتار بہ بستان ارم زد

(۱) یہ شعر لاہوری ایڈیشن میں ہے لیکن لکھنوی ایڈیشن میں دوسرا مصرع اس طرح ہے :۔

ع بادی و مصلیٰ است ہم سنگ

قلندر کے اوصاف میں ان کی ایک غزل بیالیس اشعار کی ہے :۔

قلندر پرتو نور الہیٰ است   قلندر پرتو انوار شاہی ست

(۲) نفحات الانس (مطبع اسلامیہ اسٹیم پریس ۔ لاہور ۱۳۲۵ھ)۔ صفحہ ۲۳۶ بعد۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں :

نکات الشّعراء سے مُتعلّق چند یاد داشتیں

[آج سے ۳۵۰۳۰ سال قبل کی چند یاد داشتیں اشاعت کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ اب اتنا دماغ نہیں کہ انھیں مستقل مضمون کی شکل دی جائے۔ غلام مصطفےٰ خاں۔]

۱۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے نکات الشعراء کے مقدّمے میں لکھا ہے :

"ایک معاملہ البتہ سمجھ میں نہیں آیا۔ میر صاحب نے اس تذکرے میں اپنے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کا بڑے ادب احترام سے ذکر کیا ہے اور مرزا مظہر کے حال میں ان کو "اوستاد پیر مرشد بندہ" کے الفاظ سے یاد فرمایا ہے لیکن ذکر میر میں انھوں نے خان آرزو کی بد سلوکی، بے مروتی اور دل آزاری کی ایک ایسی درد انگیز داستان لکھی ہے کہ جسے پڑھ کر نہایت افسوس اور رنج ہوتا ہے۔ (اور) ان دو متضاد بیانات کو پڑھ کر آدمی گونگو میں پڑ جاتا ہے......"

(میر کی عمر تذکرے کے وقت ۲۹ سال کے قریب تھی)

۲۔ میر سے جس نے خوش اخلاقی سے گفتگو کی اس سے وہ خوش ہوئے جیسے قزلباش خاں امید۔

۳۔ میرزا مظہر کو اکبر آبادی لکھا ہے، اس لیے تعریف کی ہے۔

۴۔ رائے آنند رام مخلص فارسی کے شاعر تھے اور خان آرزو کے شاگرد تھے، اردو کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔

۵۔ لیکن نجم الدّین شاہ مبارک آبرو بھی سراج الدّین علی خاں کے شاگرد تھے اس لیے ان کے یک چشم ہونے کے متعلق بھی خوش اسلوبی سے تذکرہ کیا ہے "از چشم پوشی روزگار دجال شعار یک چشمش از کار رفتہ" ان ایک شعر کی میر نے اصلاح کی ہے۔

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقط   اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

میر لکھتے ہیں کہ "اگر بجائے اس قدر، کس قدر می گفت ایں شعر برآسماں می رسید" اگر واقعی

میر نے "اس قدر" لکھا تو میر کی اصلاح ضرور صحیح ہے لیکن "اس قدر" بھی استعجاب کے لیے صحیح ہے۔ آبرو بہت اچھا کہتے ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

○ دور خاموش بیٹھ رہتا ہوں اس طرح حال دل کا کہتا ہوں

○ عالم آب سے آساں نہیں اسے شیخ گزر خوف سے غرق کے یاں بحر ہے کشتی میں سوار

○ تجھ اُپر خون بے گناہوں کا چڑھ رہا ہے شراب کی سی طرح

○ کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد روح پتھّر سے سر پٹکتی ہے

۶۔ خان آرزو کے ایک اور شاگرد شرف الدین مضمون تھے لیکن جاج مؤ (متصل اکبر آباد) کے تھے اور میر نے ان کو آخر زمانے میں دیکھا تھا۔ ان کے اشعار کو نقل کیا ہے۔

○ میرا پیغام وصل اے قاصد کہیو سب سے اسے جدا کرکر

اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اتفاقاً اشعار الیشاں را انتخاب می زدم، میاں محمد حسین کلیم (میر کے بہنوئی تھے) ... نشستہ بودند من این شعر را پیش مشار الیہ می خواندم، و شعر ایں قسم بود

○ میرے پیغام کو تو اے قاصد کہیو سب سے اسے جدا کرکر

چوں ایں حرف موافق سلیقۂ شعرا بود ہم چناں نوشتہ آمد" (نکات الشعرا، صفحہ ۱۶ میں مضمون کے دو مبتذل شعر بھی میر نے معلوم نہیں کس مصلحت سے نقل کیے غلام مصطفےٰ خاں) پھر مضمون کا ایک شعر یہ بھی نقل کیا ہے۔

○ مضموں تو شکر کر کہ ترا اسم سن رقیب غصے سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

اس شعر کے متعلق میر لکھتے ہیں شاعر مسطور بجائے اسم، نام موزوں کردہ بود، اسم اصلاح زیرا کہ اہل دعوت اسم می خوانند نہ نام فافہم۔" یہاں میر نے خان آرزو کی اصلاح پر اعتراض کیا لیکن اس موقع پر شفیق نے چمنستان شعراء (ص ۱۰۲) میں لکھا ہے۔

"راقم سطور گوید کہ ہر کسے استاد بجہت اصلاح دادن و نقص گرفتن مقرّری کند و ایں خود معلوم کہ سخن صاف و شستہ بے اصلاح استاد از زبان سرزند، پس درین صورت تحریر این امر خالی از خوردہ چینی نیست چنانچہ حضرت شیخ سعدی شیرازی قدس سرہ درباب ہشتم گلستان می فرماید متکلم را تا کسے عیب نگیرد سخنش اصلاح نہ پذیرد۔

پھر شفیق نے یہ شعر لکھ کر بات ختم کر دی ہے۔

بلبلو شور چمن میں نہ کرو کون سنتا ہے تمہاری فریاد

۷۔ مصطفیٰ خاں یکرنگ کے متعلق میر نے لکھا ہے " یک رنگ ، شاعر کے ایک شعر کی اصلاح کی ہے ۔ یکرنگ کا شعر تھا۔

○ سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے راستی ہے گی دار صورت

میر کہتے ہیں کہ یہاں " حق کہے " ہوتا تو بہتر تھا۔ ان کے ایک شعر کی اور اصلاح کی ہے ، شعر تھا۔

○ اس کو مت بوجھو سجن اوروں کی طرح مصطفیٰ خاں آشنا یکرنگ ہے

میر کہتے ہیں کہ یہ شعر میرا ہوتا تو میں پہلا مصرع اس طرح لکھتا۔

مت تلون اس میں کچھے آپ سا

معلوم نہیں یہ اصلاح صحیح ہے یا نہیں ، جب کہ " مت تلون " میں عیب تنافر پیدا ہو گیا ہے (نکات سخن میں حسرت نے میر کے ایسے شعر نقل کیے ہیں جن میں عیب تنافر ہے)

۸۔ محمد شاکر ناجی مرحوم (جوانی میں مر گیا) کا ایک یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

○ دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم لب صدف کے تر نہیں ہرچند ہے گوہر میں آب

اس کے بعد لکھتے ہیں : بہر متامل پوشیدہ نیست کہ پیش مصرع این چنیں می بایست

ع مت رکھے چشم کرم دولت سے اپنے خورد کی

۹۔ میاں احسن اللہ کے سلسلے میں کہا ہے کہ وہ ایہام کی طرف مائل ، تھے اس لیے ان کا کلام بے رتبہ ہو گیا۔

۱۰۔ عطا کے لیے لکھا ہے کہ وہ اوباش تھا عہد عالم گیر میں (ص ۲۹)

۱۱۔ سودا کے لیے لکھا ہے کہ مصرع برجستہ اش را سرو آزاد بندہ ، پیش عالیش طبع عالی شرمندہ ، چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اورا شاید۔

۱۲۔ میر سجاد اکبر آباد کے ہیں لیکن میاں آبرو کے شاگرد ہیں (ص ۱۰)

میر سے دوستی بھی ہے کیونکہ اکبر آباد کے ہیں ، لیکن ان پر اعتراض ہے کیونکہ آبرو کے شاگرد ہیں۔ سجاد کا شعر ہے

○ کافر بتوں سے دادنہ چاہو کہ یاں کوئی مرجا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا

میر کے نزدیک کافر کی جگہ باطل چاہیے (حق کی رعایت سے)

سجاد کا شعر بہتر معلوم ہوتا ہے۔

○ میرا جلا ہوا دل مژگاں کے کب ہے لائق   اس آبلے کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو۔

میر کہتے ہیں کہ کانٹوں میں گھسیٹنا محاورہ ہے۔

سجاد کے اس شعر کو میر نے بہت پسند کیا ہے (ص ۲۷)

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے   جو یہ کشتی ترے تو بس ڈوبے

۱۳۔ حاتم کو جاہل کہا ہے اور مغرور بھی (اس کا دیوان میم تک مجھے ملا ہے۔)

حاتم کا ایک شعر نقل کیا ہے (ص ۵۷)

○ بانے بیدرد سے ملا کیوں تھا   آگے آیا برے کیا میرا

میر نے جل کر پہلا مصرع اس طرح دہرایا "بستلا آتشک میں ہوں اب میں"

شفیق نے میر کی اس اصلاح کی بڑی خوبی سے توجیہ سے کی ہے کہ "اگرچہ مضمونش اعلیٰ است لیکن کلمہ بد را با خود نسبت دادن از آئین عقل بعیدی نماید"

پھر حاتم کا ایک شعر دیا ہے (ص ۵۸)

○ دیکھ طور اس دور کا حاتم نے کی ترک شراب   یاد کر کر سبزہ رویاں کو وہ اب پیتا ہے بھنگ

اس شعر کے متعلق میر لکھتے ہیں کہ "در لفظ سبزہ رویان تامل کردن ضرور است زیرا کہ آشنائے گوش این ہیچ مدان نیست

فارسی میں سبز حسن اور حسین دونوں کے لیے آتا ہے، بھنگ کے لیے بھی آنند راج میں ہے اور ملا تشبیہی کا شعر دیا ہے۔

○ دو چار من نہ شدآں سبز چہرہ طالع بیں   کہ برگ سبز ازایں بوستان بمن نہ رسید

بہرحال یہ اس حاتم نے کہا ہے جس کو میر نے جاہل قرار دیا تھا۔ شفیق نے (ص ۱۴۳) اس موقع پر لکھا ہے کہ لفظ سبزرویاں کہ دریں مصرع خلاف محاورہ افتادہ در خاطر فقیر بہ تغیری رسد۔

ع   یاد کر کر خط کی سبزی کو وہ اب پیتا ہے بھنگ

۱۴۔ انعام اللہ خاں یقین کا ذکر ہے۔ میر نے یقین کے دادا سے سرہند میں ملاقات کی تھی جنھوں نے میر کی دعوت بھی کی تھی لیکن یقین سے میر خوش نہیں کیونکہ وہ ان کے قول کے مطابق مغرور تھے اور انھوں نے اس قدر پوچ اور لچر کلام لکھا ہے کہ ہر شخص لکھ سکتا ہے۔ ملاقات سے معلوم ہوا کہ وہ "شعر فہمی" کی صلاحیت نہیں رکھتے، انھوں نے میرزا مظہر سے

چوری کی ہے۔ آخر میں یہ لکھتے ہیں کہ " با بندہ آشنائی سرسری دارد " پھر شہاب الدین ثاقب کی روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ امتحان کے طور پر ثاقب نے پوری غزل ایک موقع پر لکھ دی اور یقین ایک مصرع بھی نہ لکھ سکے۔

۱۵۔ پھر اسی ثاقب کا میر نے جب حال لکھا ہے تو وہاں اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ " در ہمہ چیز دست دارد و ہیچ نمی داند۔ " یعنی جب ثاقب کچھ نہیں جانتا تو پھر اس کی رائے کو یقین کے سلسلے میں کیوں اہمیت دی ہے؟

۱۶۔ میر نے لکھا ہے کہ یہ ثاقب گو کہ میاں آبرو کے شاگرد تھے لیکن اب خان آرزو سے اصلاح لیتے ہیں۔

۱۷۔ مولوی عبدالحق نے چمنستان شعرا، کے مقدمے میں یقین سے متعلق میر کی طرفداری کی ہے۔

۱۸۔ میر نے یقین کے خلاف محمد حسین کلیم کا ایک شعر (ص ۳۸) نقل کیا ہے، اسی وجہ سے میر نے کلیم کی خوب تعریف کی ہے۔ کلیم میر کے بہنوئی بھی تھے۔

۱۹۔ اس کے بعد محمد علی حشمت (استاد تاباں) کا ذکر ہے کہ وہ ہم لوگوں کے شعر پر اعتراض کیا کرتا تھا اور خود اردو شعر " پاچیانہ " لکھتا ہے لیکن اس کے شاگرد تاباں کی خوب تعریف کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ از چندے کہ بسبب اختلاطی کدورتے بمیان آمدہ بود، اجلش مہلت نہ داد کہ تلافیش کردہ اید۔

۲۰۔ پھر محمد یار خاکسار کا ذکر ہے جس سے میر خوش نہیں، وہ میر سے کینہ رکھتا تھا (گویا میر کینہ نہیں رکھتے تھے، اس لیے میر نے محمد یار (جس کا نام کلو بھی تھا) کے لیے محمد معشوق کنبوہ کا مصرع نقل کیا ہے۔

ع کُتّا ہے دربار کا، کلّو اس کا نام

اس کے متعلق میر نے یہ بھی لکھا ہے کہ "تقلید مرزا جان جان مظہر در ہر امری کند" ..... "ہر امر" سے میر نے کیا کیا مراد لی ہے، وہ وہی جانتے ہوں گے۔

پھر خاکسار کے وہ اشعار لکھتے ہیں جو " از و نیست " یعنی دوسروں نے لکھ کر دے دیے ہیں (سہو کتابت کے سبب سے ازو ایست ازو نیست ہو گیا ہو یہ بھی ہو سکتا ہے۔) ان اشعار میں ایک شعر یہ ہے

○ خاکسار اس کی تو آنکھوں کے کنے مت لگیو مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

اس شعر پر اعتراض کرتے ہوئے میر لکھتے ہیں کہ بر متتبع ایں فن پوشیدہ نیست کہ

بجائے بیمار کیا ۔ گرفتار کیا می بایست " ۔ میر یہاں گرفتار کیا بہتر سمجھتے ہیں حالانکہ آنکھوں اور خانہ خرابوں کی رعایت سے " بیمار کیا " مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شفیق نے اس شعر میں "بیمار کیا" نقل کیا ہے۔

۲۱۔ لالہ ٹیک چند بہار (ص ۳۲۱) بھی سراج الدّین علی خاں کے شاگرد اور " صاحب تصانیف بسیار " تھے ان کا ایک شعر یہ بھی نقل کیا ہے۔

○ تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس   یہ عجب منظر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

اس کے متعلق لکھتے ہیں ہیں کہ " بہ اعتقاد بندہ بجائے اشارت قریبہ و استعجاب کہ اول مصرع دوم بکار بردہ است اگر حسن کیا می گفت ۔ این شعر واضح تر می شد فافہم " یعنی دوسرا مصرع اس طرح ہوتا ۔

ع   حسن کیا منظر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

(بے شک اچھی اصلاح ہے)

۲۲۔ محمد حسن محسن تخلص (ص ۱۳۹) میر کا بھتیجا ۲۰ سال کا ہے، میر سے اصلاح لیتا ہے، تعریف کی ہے۔

۲۳۔ قدر کے متعلق لکھا ہے (ص ۱۴۰) کہ " اوباش وضع ، زبان او بزبان لوطیان می ماند ۔"

۲۴۔ عاجز (ص ۱۴۰) شخصے لوطی است ۔

۲۵۔ تذکروں سے فائدے :۔ جس سال وہ تذکرہ لکھا گیا اس وقت معاصرین اور خود مصنف کی وہ غزلیں مرتب ہو چکی ہوں گی ۔ جن کے اشعار تذکرے کے انتخاب میں آچکے ہیں۔ انتخاب سے خود مصنف کے مزاج اور مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۶۔ مولوی عبدالحق فرماتے ہیں " تذکرہ ریختہ گویاں (سیّد فتح علی گردیزی نے ۱۱۶۶ھ میں لکھا) انھوں نے (گردیزی نے) میر کا نکات الشعرا ضرور دیکھا تھا، کیونکہ دیباچے میں انھوں نے تذکرہ نویسوں کے خلاف زہر اگلا ہے اس کا ہدف نکات الشعرا ہی ہے اور میر نے ریختہ کی فصاحت وغیرہ کے متعلق جو خیالات اپنے تذکرے کے آخر میں ظاہر فرمائے ہیں ۔ ہو بہو وہی گردیزی نے اپنے تذکرے کے دیباچے میں نقل کر دیے ہیں البتہ کہیں کہیں الفاظ کا تغیر ضرور پایا جاتا ہے۔

○ گردیزی نے حشمت اور میر کے متعلق ایک جیسی عبارت لکھی ہے۔

○ گردیزی نے حزیں کے حال میں لکھا ہے کہ بنگال کی طرف چلا گیا تھا اور وہاں فوت ہوا (حضرت مظہر سے معلوم ہوا کہ وہ عشق میں گرفتار ہو گیا تھا)۔

○ خاکسار کے حال میں گردیزی نے لکھا ہے کہ بعض نے (یعنی میر نے) اسے زمرہ شعرا سے خارج کیا ہے تو یہ بات ستم ظریفی اور ناانصافی ہے (میر کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے اور یقین کے بکثرت اشعار دیے ہیں۔ اسے کیا کہا جائے۔

نجم الاسلام:

دو موضح قرآن

شاہ عبدالقادر دہلوی کی اردو نثر "موضح قرآن" (اسم تاریخی ۱۲۰۵ھ) کے دو مختلف متن پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو منسوب بتایا گیا ہے۔ اصلیت جاننے کے لیے ذیل میں ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اردو تفسیر ایک قدیم نثری نمونے کے بطور اردو ادب کی تمام ہی قابل ذکر تاریخوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے اور نصابوں میں بھی شامل ہے۔ اولاً موضح قرآن کے مختلف قدیم و جدید، قلمی و مطبوعہ نسخوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

موضح قرآن کے قدیم قلمی نسخے

۱۔ مخطوطۂ کتب خانۂ آصفیہ

موضح قرآن کا قدیم ترین خطی نسخہ جس کا ہمیں علم ہو سکا، کتب خانۂ آصفیہ کا ہے جو ۱۲۲۳ھ کا مکتوبہ ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۳ × ۹ کے سائز میں ۵۴۰ صفحات پر مشتمل ہے (۱۸ سطر فی صفحہ)۔ اس میں مکمل قرآن پاک کا ترجمہ نہیں صرف نصف کا ہے۔ یہ مخطوطہ سورۃ الکہف (سولہواں پارہ) کی آخری آیت کے ترجمے پر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ مخطوطہ اگرچہ مصنف (شاہ عبدالقادر) کی حیات کا نہیں ہے لیکن شاہ عبدالعزیز کی حیات کا ہے اور کاتب نے ترقیمے میں اس کی صراحت بھی کر دی ہے۔ نیز وہ شاہ صاحب کا روشناس بھی ہے۔ ترقیمہ یہ ہے۔ "نصف تفسیر کلام اللہ است در زبان ہندی گفتہ حضرت مولوی صاحب قبلہ شاہ عبدالقادر صاحب برادر حضرت مولوی صاحب قبلہ مولوی عبدالعزیز صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بہ دستخط بندہ گنہگار خاک پائے ایشاں بلکہ نعل کش ایشان محمد شرف الدین چشتی تحریر یافت بتاریخ نہم در شہر جمادی الاول ۱۲۲۳ھ در زمان محمد اکبر بادشاہ متع عمرہ سلطنت ۱۴ جلوس ہر کہ خواند بہ دعائے خیر یاد کند"

(نصیر الدین ہاشمی، "کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات" جلد دوم ص ۲۹) ہاشمی صاحب نے وضاحتی فہرست میں اس مخطوطے کے آغاز و اختتام کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں جو یہ ہیں۔

آغاز:

" الٰہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے کہ ہماری زبان کی اپنی نام کر اور دل کو روشنی دی اپنی کلام کر اور امت میں کیا اپنے رسول مقبول کی جو اشرف الانبیاء اور نبی الرحمت جس کی شفاعت سے امیدوار ہیں کہ پاویں دو جہاں کی نعمت ....

اختتام:

" تو کہہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم، حکم آتا ہے مجھ کو کہ تمھارا صاحب ایک صاحب ہے، پھر جس کو امید ہو ملنے کی اپنے رب سو کرے کچھ کام نیک اور ساجھا نہ رکھے اپنی بندگی میں کسی کا۔

" تمام شد "

(یہ سورۃ الکہف کی اس آخری آیت کا ترجمہ ہے۔ قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الٰھکم الہ واحد ..... ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا)

۲۔ مخطوطہ حکیم نورالدین خلیفہ قادیان طبیب شاہی ریاست جموں و کشمیر (متوفی ۱۹۱۴ء)

اس مخطوطے کا دیباچہ اور سورہ فاتحہ کا ترجمہ مع فوائد جناب اسماعیل پانی پتی نے نقوش ۲۰۱ میں اصل کے حرف بحرف اور لفظ بلفظ مطابق نقل کر کے چھپوایا تھا۔ جس کے قدیم طرز املا سے مخطوطہ کا قدیم ہونا اگرچہ بخوبی ظاہر ہے لیکن صاحب مضمون (۱) نے یہ صراحت نہیں کی کہ اس کا کاتب کون ہے اور سال کتابت کیا ہے۔ آیا مخطوطہ میں ترقیمہ ہے یا نہیں ؟۔ اس لیے کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطے پر اسے مقدم خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اس مخطوطے کے دیباچے کی عبارت، کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطے سے مطابقت رکھتی ہے۔ سورہ فاتحہ کے ترجمے اور فوائد کی نقل نقوش کے حوالے سے ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس سے واضح ہوگا کہ ترجمہ اول فارسی شاہ ولی اللہ کا اور پھر ہندی شاہ عبدالقادر کا درج کیا ہے، ایک فائدہ متن کے ساتھ ہے اور باقی حاشیے پر۔ تحریر کا انداز یہ ہے کہ متن کے ٹکڑے نقل کر کے ان کا ترجمہ اور فائدے لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

" سورۃ الفاتحہ مکیہ و مدنیہ وھی سبع آیات

سورہ فاتحہ مکے مدینہ میں نازل ہوا سات آیات کا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم بنام خدای بخشایندہ مہربان ہندی شروع اللہ

کے نام سے جو بڑا مہربان نعمت دینے والا الحمد للہ رب العلمین۔ ستایش خدای راست پروردگار عالمہا یعنی عالم انس و عالم جن و عالم ملایکہ وعلی ھذا القیاس ہندی سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہاں کا الرحمن الرحیم بخشایندہ مہربان ہندی بہت مہربان نہایت رحم والا ملک یوم الدین خداوند روز جزا ہندی مالک انصاف کے دن کا ایاک نعبد وایاک نستعین ترا می پرستیم واز مدد می خواہیم ہندی تجھ ہی کو ہم بندگی کریں اور تجھی سے مدد چاہیں۔ اھدنا الصراط المستقیم بنما مارا راہ راست ہندی چلا ہم کو راہ سیدھی صراط الذین انعمت علیھم راہ آناں کہ انعام کردہ برایشان ہندی راہ ان کی جن پر تونے فضل کیا غیر المغضوب علیھم والاالضالین بجز آناں کہ خشم گرفتہ شد بہ آنہا و بجز گراھان (گمراھان) ہندی نہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بھٹکنے والے ف یہ سورہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ اس طرح کہا کریں .... "

فوائد بر حاشیہ:

مراد از آناں کہ انعام کردہ شد بر آنہا چہار فرقہ نبیین و صدیقین و شہداء وصالحین و مراد از آناں کہ خشم گرفتہ شد برانہا یہود اند واز گراھان (گمراہان) نصاریٰ آمین کن دعا مارا ف جن پر تونے فضل کیا ان سے چار فرقے مراد ہیں نبیین و صدیقین و شہداء وصالحین اور جن پر غصہ ہوا ان سے یہود اور گمراہوں سے نصاریٰ مراد ہیں ف۔

۲۔ انڈیا آفس لائبریری میں موضح قرآن کے قلمی نسخے

انڈیا آفس لائبریری میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم قرآن مجید کے کئی مخطوطات ہیں (مخطوط نمبر ۴ تا مخطوط نمبر ۱۱ مطابق فہرست بلوم ھارٹ)۔ بلوم ھارٹ نے مخطوط نمبر ۵ کے آغاز کی عبارت یوں نقل کی ہے۔

" شروع اللہ کے نام سے جو مہربان ہے رحم والا الحمد للہ رب العلمین سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہاں کا۔

موضح قرآن کے بعض مطبوعہ نسخے

۱۔ قدیم ترین مطبوعہ نسخہ۔ برٹش میوزیم میں ہندوستانی مطبوعات کی فہرست مرتبہ بلوم ہارٹ میں موضح قرآن کے متعدد نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے جو برٹش میوزیم میں موجود ہیں ان میں قدیم ترین ایڈیشن ۱۸۲۹ء کا ہے جو کلکتہ میں چھپا تھا۔ تعداد صفحات ۸۵۰ ہے۔ یہ امکاناً سیرامپوری نسخہ ہے جس کا ذکر ذیل میں آتا ہے۔

۲۔ سیرام پور کا مطبوعہ نسخہ۔ میر بہادر علی حسینی میر منشی فورٹ ولیم کالج کے بیٹے سید عبداللہ (۲) نے مطبع احمدی کے نام سے سیرام پور میں ایک مطبع قائم کرلیا تھا۔ سید احمد شہید کے سفرحج کے موقع پر انھوں نے سید صاحب کی ایما سے موضح قرآن کی نقل مکہ معظمہ میں حاصل کی۔ یہ نقل اس قلمی نسخے سے کی گئی ہے جو سید صاحب کے بھانجے سید احمد علی سفرحج سے قبل ستر روپے میں خرید کر لائے تھے۔ سفرحج سے واپسی پر مولانا عبدالحیؒ، مولانا محمد اسحٰق اور مولوی حسن علی لکھنوی کی ایما اور استصلاح سے سید عبداللہ نے اسکی طباعت پر کمر ہمت باندھی۔

سید عبداللہ نے موضح قرآن کے خاتمۃ الطبع میں ان حالات کا بیان خود کیا ہے۔ چھاپے کے وقت جو تبدیلیاں سید عبداللہ نے کیں، وہ یہ ہیں۔

- ترجمہ بطور تفسیر لکھا ہوا تھا (یعنی متن کے ٹکڑے نقل کر کے ان کی تفسیر کی گئی تھی) سید عبداللہ نے بین السطور لکھوایا۔
- فایدوں کو حاشیے میں حرف فا کے برابر رکھا مگر جہاں جگہ نہ ملی تو ہندسہ حوض اور حاشیے میں دے دیا کہ اس کے فائدے کا ٹھکانا ہاتھ لگ جائے۔
- کہیں فائدہ اصل کتاب سے بھی زیادہ لکھا۔ خصوصاً شان نزول تیسویں سپارے میں، سو اس کی پہچان کو کتاب کا نام وہاں ذکر کر دیا۔
- مشکوک مقامات کی تصحیح تفسیر عزیزی، تفسیر حسینی، ایک ترجمہ ہندی اردو کی زبان میں جو سید عبداللہ کے والد منشی سید بہادر علی (میر منشی فورٹ ولیم کالج) اور کئی فاضلوں نے مل کے کلکتے میں کیا تھا، ان نسخوں کی مدد سے کی
- ہندی عبارت کو یہاں (کلکتے۔ سیرام پور) کے مروّج قاعدے سے لکھا یعنی یاے معروف و مجہول، واو معروف و مجہول کے املا میں تفریق کی۔ کھ جھ تھ بھ وغیرہ کو دو چشمی ھ کے ساتھ لکھا)

○ آیات کے شمار کے لیے ہر آیت کے آخر میں ہندسہ لکھا۔

۳۔ نسخہ مطبوعہ مطبع حسنی میر حسن رضوی دہلی:۔ یہ مطبوعہ نسخہ اسٹیٹ بینک کراچی کی لائبریری میں راقم کی نظر سے گذرا۔ سنہ طباعت اس پر درج نہیں ہے۔ لیکن نسخہ ہے قدیم (۳)۔ صفحات ۹۱۰۔ اس میں دیباچہ موجود ہے جو مذکورہ قدیم قلمی نسخوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ ترجمہ اور فوائد بھی وہی ہیں۔ موضح قرآن کے موجودہ ایڈیشنوں میں تاج کمپنی والا موضح قرآن ترجمہ اور فوائد میں اسی سے مطابقت رکھتا ہے البتہ تاج کمپنی کے ایڈیشن میں دیباچہ نہیں ہے۔

۴۔ نسخہ مطبوعہ ممتاز علی فی المطبع مجتبائی دھلی ۱۲۹۳ء:۔ یہ نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں نظر سے گذرا۔ اس میں متن میں شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ اور شاہ ولی اللہ کا فارسی ترجمہ ہے اور حاشیے پر موضح قرآن بغیر دیباچہ۔

اس نسخے کے موضح قرآن میں سورہ فاتحہ کی شان نزول میں مولانا یعقوب چرخی کی روایت بھی نقل کی ہے، جو موضح قرآن کے مذکورہ بالا دیگر قدیم تر نسخوں میں نہیں پائی گئی۔

سورہ فاتحہ کی حد تک ترجمہ اور فوائد کا مقابلہ مطبع میر حسن رضوی دھلی والے نسخے سے کیا گیا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا گیا۔

۵۔ نسخہ مطبوعہ اسلام پریس کلکتہ جلد اول ۱۲۵۴ھ:۔ اس میں ترجمہ شاہ رفیع الدین کا ہے جو طابع کے دعوے کے مطابق اس صورت میں پہلی بار چھپا ہے اور فوائد شاہ عبدالقادر کے ہیں۔ مصحح مولوی احمد کبیر ہیں جو مجدد الف ثانی کی اولاد سے ہیں۔ یہ نستعلیق ٹائپ میں چھپا ہے۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔

اس کے فوائد مذکورہ نسخوں سے مطابقت رکھتے ہیں (موجودہ ایڈیشنوں میں تاج کمپنی کا موضح قرآن بھی مطابقت رکھتا ہے)

موضح قرآن کے مشکوک ایڈیشن

موضح قرآن کے تین ایسے ایڈیشن نکلے ہیں جو مذکورہ بالا تمام معتبر نسخوں سے مختلف پائے گئے۔ وہ تین ایڈیشن یہ ہیں۔

۱۔ مطبوعہ مطبع خادم الاسلام دھلی ۱۳۰۷ھ سات جلدوں میں ذیل کے باقی دو ایڈیشن اسی کے مطابق ہیں۔

۲۔ مطبوعہ جوہر ہند پریس دہلی۔ طبع دوم ۱۹۰۵ء۔ مخزونہ انجمن ترقی اردو کراچی و مجلس علمی میری ویدر ٹاور کراچی۔ یہ بھی سات جلدوں میں ہے۔

۳۔ نسخہ مطبوعہ شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۴۹ء۔ اس کا متن بعینہ وہی ہے جو مطبع خادم الاسلام اور جوہر ہند پریس کے ایڈیشنوں کا ہے۔ یہ جلدوں پر منقسم نہیں ہے۔ یکجا پیش کیا گیا ہے۔

تبصرہ:۔ یہ تینوں ایڈیشن متن کے اعتبار سے یکساں ہیں اور ان میں قدیم ترین مطبع خادم الاسلام والا ایڈیشن ہے۔ کوئی ایسا قلمی نسخہ، باوجود تلاش بسیار کے، راقم کو نہیں مل سکا جو ان تینوں ایڈیشنوں سے مطابقت رکھتا ہو۔ پروفیسر محمد ایوب قادری نے پہلے رسالے "الرحیم" حیدرآباد میں اور پھر "مجموعہ وصایا اربعہ" کے مقدمے میں خاندان شاہ ولی اللہ سے منسوب جعلی تصانیف پر بحث کرتے ہوئے، سید ظہیر الدین احمد ولی اللہی کے تحریر کردہ "التماس ضروری" (مشمولہ انفاس العارفین) کا ایک اقتباس پیش کیا ہے، جس میں علاوہ دیگر تین تصانیف کے "تفسیر موضح القرآن مطبوعہ خادم الاسلام دہلی" کو بھی جعلی قرار دیا گیا ہے۔

قادری صاحب نے مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے

> "تفسیر مولانا شاہ عبدالقادر المعروف بہ موضح القرآن کے نام سے ایک تفسیر ابو محمد ثابت علی اعظم گڑھی اور غلام حسین مونگیری نے ۱۳۰۸ھ میں مطبع خادم الاسلام دہلی سے طبع کرا کے شائع کی۔ یہ کتاب سات جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ اسکی دوسری جلد پر شمس العلماء میاں نذیر حسین دہلوی متوفی ۱۹۰۲ء کے داماد مولوی سید شاہجہاں کی تقریظ ہے اور آخر کتاب میں اشتہار ہے کہ شہر دہلی پھاٹک حبش خان مدرسہ سید محمد نذیر حسین صاحب سے طلب فرمائیں اس تفسیر کی طرف سید ظہیر الدین نے اشارہ کیا ہے"
>
> (مجموعہ وصایا اربعہ۔ مقدمہ ص ۲۶)

اگرچہ تحریر مذکورہ بالا میں مطبع خادم الاسلام والے ایڈیشن کو صریحاً جعلی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ امر ہمارے لیے موجب حیرت ہے کہ

کہ ازبان نسبتہً قدیم تر معلوم ہوتی ہے۔

شاہ عبدالقادر نے موضح قرآن کو بطور تفسیر کے لکھا تھا۔ مطبع خادم الاسلام کا ایڈیشن بھی اسی طور پر ہے۔ (صرف یہی نہیں بلکہ اس کے دیباچے میں بھی صراحت کی گئی ہے۔ کہ "آیت لکھ کر معنی لکھے ہیں" جب کہ دیگر نسخے اس کے برخلاف اس طور پر ہیں کہ ترجمہ بین السطور لکھا گیا ہے اور فوائد حاشیے میں۔ سید عبداللہ سیرام پوری نے اپنے طبع کردہ ایڈیشن کے خاتمۃ الطبع میں خود اقرار کیا ہے کہ انھوں نے متن کی ترتیب بدلی ہے اور اضافے وغیرہ بھی کیے ہیں)

یہ ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحب ترجمہ اور تفسیر زبانی بولتے جاتے ہوں گے، حاضرین نے اپنے اپنے طور پر قلم بند کیا ہوگا اور ترمیم کرلی ہوگی پھر مختلف مطبعوں نے شاہ صاحب کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

اس صورت میں یہ امر بعید از امکان نہیں کہ مطبع خادم الاسلام والا ایڈیشن بھی کسی قدیم قلمی نسخے پر مبنی ہو جسے شاہ عبدالقادر نے خود یا ان کے زمانے میں کسی نے اس طور سے قلمبند کیا ہو۔

ذیل میں اول مطبع حسنی میر حسن رضوی (م تاج کمپنی) اور مطبع خادم الاسلام (م شیخ غلام علی اینڈ سنز) والے ایڈیشنوں کے بعض نمایاں اختلافات پیش کیے جاتے ہیں۔ پھر جدا جدا دونوں کے مختصات نثر کا جائزہ۔ سراست مختصات نثر کا بخوف طوالت حذف کیا جاتا ہے)۔

موضح قرآن کے دیباچوں کا تقابل

مطبع حسنی میر حسن رضوی دہلی والا ایڈیشن	مطبع خادم الاسلام دہلی والا ایڈیشن
الہی شکر تیرے احسان کا ادا کروں کس زبان سے	الہی شکر تیرے انعاموں کا اور احسانوں کا کس زبان سے کریں
کہ ہماری زبان گویا کی اپنے نام کر	جو زبان ہی کو تونے بولنے والی بنایا اپنا نام لینے کو
اور دل کو روشنی دی اپنے کلام کر	اور دل کو روشنی دی اپنا کلام پڑھنے کو
اور امت میں کیا اپنے رسول مقبول کے	اور امت میں پیدا کیا ہم کو اپنے رسول مقبول

جو اشرف انبیاء اور نبی الرحمت

اللہ علیہ وسلم کی جو سب نبیوں سے بزرگ اور بہتر امت پر اور بخشانے والا ہے چھڑانے والا ہے عذاب سے اپنی اپنی امت کو قیامت کے دن۔

جس کی شفاعت سے امیدوار ہیں کہ پاویں دو جہاں کی نعمت

اور امیدوار ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل دونوں جہاں کی نعمت پاوے۔

الہی اس نبی امت پرور کو اپنی رحمت کامل سے درجات اعلےٰ نصیب کر

الہی اپنے نبی امت کے پالنے والے کو اپنے فضل و کرم سے درجہ بہت بلند دے۔

بر حد نہ کسی مخلوق کی

ایسے جو کبھی اپنے بندے کو نہ دیے ہوں

اور اپنی عنایت اس پر ہمیشہ افزوں رکھو دنیا اور آخرت میں

اور اپنی مہربانی اس پر ہمیشہ زیادہ کر دونوں جہاں میں

اور اس کی آل اطہار پر اور اصحاب کبار پر اور اس کی امت کے علمائے مقتدا پر

اور اس کی آل پاک پر اور اس کے یاروں خاصوں اور اس کی امت کے عالموں پر جو آگے چلنے والے دین کی راہ میں

اور اولیاء باصفا پر اور غربا و ضعفا پر سب پر آمین یا الہ العالمین

اور اپنے دوستوں پر اور غریبوں پر عاجزوں پر ان سب پر مہر کر اے پروردگار تمام خلقت کے آمین یا الہ العالمین

بعد ازیں سنا چاہیے کہ مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے رب کو پہچانے

اب سنو اس کام کی بات کو جو سب مسلمانوں کو مقرر چاہے کہ اپنے رب کو پہچانیں

اور اسکی صفات جانے اور اس کے حکم کو معلوم کرے

اور اسکی صفتیں جانیں اور اسکے حکم معلوم کریں

اور مرضی و نامرضی تحقیق کرے کہ بغیر اس کے بندگی نہیں

اور تحقیق کریں کہ خدا تعالیٰ کون سی باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کون سے کاموں سے غصہ ہوتا ہے جو ان باتوں کا جاننا ضروری ہے اور اس کی خوشی کے کام کرنے بندگی ہے

اور جو بندگی نہ لاوے وہ بندہ نہیں

اور جو بندگی نہ کرے سو بندہ نہیں

اور اللہ سبحانہ کی پہچان آوے بتانے سے

اور بندگی اسے کہتے ہیں جو صاحب کہے اس کام کو

بے تکرار کرے اور اس کام کی بھلائی برائی میں عقل نہ دوڑائے کس واسطے کہ کہا ماننا ہی بھلائی ہے اور حجت لانا حکم میں کم بختی ہے۔

آدمی پیدا ہوتا ہے محض نادان سب چیز سیکھتا ہے بتانے سے

(آدمی بزار انجام پیدا ہوتا ہے پھر سب چیز سکھانے سے سیکھتا ہے اور بتانے سے جاتا ہے) اسی طرح جو بات خداے تعالی کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں۔

اور بتانے والے ہر چند تقریر کریں اس برابر نہیں جو اللہ تعالی نے آپ بتایا

اسکے کلام میں جو ہدایت ہے دوسرے میں نہیں

بتانے والے بہتیرا بتائیں جیسا خدا تعالی نے قرآن شریف میں آپ بتایا ہے ویسا کوئی نہیں بتا سکتا اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا تعالی کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں۔

یہ کلام پاک اس کا عربی زبان میں ہے اور ہندوستانی کو اس کا ادراک محال

پر کلام پاک خدایتعالی کا عربی زبان میں ہے ہندوستانیوں کو اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے۔

اس واسطے اس بندہ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا

اس واسطے اس بندہ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا

کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم محدث دھلوی ترجمہ فارسی کر گئے ہیں سہل و آسان اب ہندی زبان میں قرآن شریف کو ترجمہ کرے۔

کہ جس طرح ہمارے بابا صاحب بہت بڑے حضرت شیخ ولی اللہ عبدالرحیم صاحب کے بیٹے سب حدیثیں جاننے والے ہندوستان کے رہنے والے نے فارسی زبان میں قرآن کے معنی آسان کر کے لکھے ہیں اسی طرح عاجز نے ہندی زبان میں قرآن شریف کے معنی لکھے۔

الحمد للہ کہ سنہ بارہ سے پانچ میں میسر ہوا۔

الحمد للہ کہ یہ آرزو بارہ سو پانچ ہجری میں حاصل ہوئی اب کئی باتیں معلوم کیا چاہیے۔

اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بلفظ ضرور نہیں کیوں کہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے اگر بعینہ وہ ترکیب رہے تو معنے مفہوم نہ ہوں

پہلی یہ کہ اس جگہ معنی ہر لفظ کے جدا جدا ضرور نہیں کس واسطے کہ محاورہ ہندی زبان کا اور عربی زبان کا اور عربی زبان کا ہرگز موافق نہیں اگر جس طرح قرآن

شریف میں ہے اسی طرح جدا جدا لفظوں کے معنی لکھے تو ہر گز کسی کی سمجھ میں نہ آویں اس واسطے آیت لکھ کر معنی لکھے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف تا عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔

دوسرے یہ کہ ہندی معنی آسان ہیں ہر ایک سے پڑھے جاتے ہیں پر اسے بھی استادی سند چاہیے کہ معنی قرآن شریف کے بغیر سند کے اعتبار نہیں رکھتے۔

تیسرے یہ کہ ہر چند ہندوستانیوں کو معنی قرآن اس سے آسان ہوئے لیکن اب بھی استاد سے سند کرنا لازم ہے اول معنی بغیر معتبر نہیں دوسرے ربط کلام ما قبل وما بعد سے پہچانتا اور قطع کلام سے بچنا بغیر استاد نہیں آتا کیوں کہ قرآن زبان عربی ہے۔ اور عرب بھی محتاج استاد تھے۔

اور تیسری ملانا اگلی اور پچھلی آیتوں کے معنوں کو اور بات کا کٹ جانا بغیر استاد کے معلوم نہیں ہوتا کہ قرآن شریف عرب کی زبان میں ہے وہاں کے لوگوں کو اپنی اپنی زبان کا محاورہ معلوم ہے استاد کے محتاج نہیں اور بہت بڑے معانی اور خوبیاں قرآن کی تو بڑے عالم اور اللہ صاحب کے لوگ سمجھتے ہیں اس میں نہیں لکھیں یہ ہندی زبان میں کم سمجھنے والوں کے واسطے آسان کر کے بیان کیے ہیں پر تب بھی بغیر استاد نہ سمجھا جائے گا۔

چوتھے یہ کہ اول فقط ترجمہ قرآن ہوا تھا بعد اس کے لوگوں نے خواہش کی تو بعض نے فوائد زاید بھی متعلق تفسیر داخل کیے اس فائدے کے امتیاز کو حرف ف نشان رکھا اگر کوئی مختصر چاہے صرف ترجمہ لکھے اگر مفصل چاہے فواید بھی داخل کرے باقی فواید (مہ) خط ہندی لکھنے میں طول ہے استاد سے معلوم ہوں گے۔

البتہ ہندی میں بعضی چیز لکھتے ہیں کہ فارسی میں نہیں اس سبب سے فارسی خوان اول اٹکتا ہے۔

اور کتنی چیزیں ہندی زبان لکھتے ہیں جو فارسی میں نہیں ہیں اس سبب سے فارسی خواں آدمی

دو جز دیکھے تو ماہر ہو جائے	انکتا ہے جب دو ایک جز سمجھ کر پڑھے تو واقف ہو جائے
اور اس کتاب کا نام موضح قرآن ہے اور یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ ہے	اور اس کتاب کا نام موضح قرآن یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ ہے۔
الہی و سیدی مولائی عنایت ہے اور تو ہی قبول کر اپنے فضل سے یا رؤف یا رحیم یا مالک الملک یا ذوالجلال والاکرام	الہی تو صاحب اور مالک ہے میرا اور سب کا تیرا ہی فضل ہے مجھ پر اور سب پر اور تو قبول کر اپنے کرم سے اپنے بخشنے والے مہربان اے بڑے بادشاہوں کے بادشاہ یا ذوالجلال والاکرام

ترجمے کا اختلاف

(الف) سورہ فاتحہ

تاج کمپنی (۴)	غلام علی اینڈ سنز ۱۹۴۹ء (۵)
شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم ولا ہے	شروع اس کتاب کا اللہ صاحب کے نام سے ہے جو اللہ صاحب بہت مہربانی کرنے والا ہے۔
سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہاں کا بہت مہربان نہایت رحم والا مالک انصاف کے دن کا تجھی کو ہم بندگی کریں اور تجھ ہی سے مدد چاہیں چلا ہم کو راہ سیدھی راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا نہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والی	سب تعریفیں اور بڑائیاں خاصی سے خاصی اور ستھری سے ستھری اول سے آخر ملک جو ہوئی ہیں اور ہوں گی تمام خدا تعالی ہی کو لائق ہیں جو پیدا کرنے والا اور پالنے والا سب طرح کی ساری خلقت کا ہے جو بہت مہربان اور نہایت مہربانی کرنے والا ہے مختار انصاف کے دن کا تیری ہی بندگی کرتے ہیں ہم دل اور جان سے سب کو چھوڑ کر اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ہم سب سے منہ موڑ کر اور بتا اور بچھا ہم کو سیدھی راہ ہر بات اور ہر **کام میں** جس راہ سے تو خوش ہو اور نہ بہکے ہوئے گمراہوں کی راہ دکھا ہم کو

(ب) آغاز سورہ الجمعہ

تاج کمپنی	شیخ غلام علی
اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں	نہایت ستھرائی اور پاکیزگی سے یاد کرتے ہیں خدائے

بادشاہ پاک ذات زبردست حکمت والا	تعالیٰ کو سب جو کچھ کہ ہے آسمانوں اور زمین میں پھر وہ کیسا خدائے تعالیٰ ہے کہ ہمیشہ سے بادشاہ اور ہمیشہ بادشاہ رہے گا جو پاک سب عیبوں سے اور نقصانوں سے زبردست ہے حاکم ہے درست حکم کرنے والا

(ج) سورہ انعام۔ معنوی اختلاف کی ایک مثال (اھلکنا من قبلھم من قرن)

تاج کمپنی	شیخ غلام علی
ہلاک کیں ہم نے پہلے ان سے سنگتیں	ہلاک کیے ہیں آگے ان سے سو برس کی مدت کے زمانوں سے

نوٹ۔ اوّل الذکر میں قرن کا ترجمہ سنگت (بمعنی گروہ) کیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر میں سو برس کی مدت

فوائد کا اختلاف

شیخ غلام علی والے ایڈیشن میں نہ صرف یہ کہ ترجمے تک میں مترادفات بکثرت ہیں اور اطناب کی طرف رجحان ہے جیسا کہ اوپر آغاز سورہ الجمعہ کے ترجموں کے تقابل سے ظاہر ہے بلکہ طویل فوائد بھی موجود ہیں جو اکثر قرآنی قصص کی تفصیلات بیان کرتے ہیں اور ان میں بہت سے، دوسری کتب تفاسیر (۹) کے حوالے بھی دیے گئے ہیں، اشعار بھی پیش کیے گئے ..... جب کہ تاج کمپنی والے ایڈیشن میں تفسیری فوائد بہت مختصر ہیں۔ اور تکرار لفظی و معنوی سے خالی۔

شیخ غلام علی والے ایڈیشن میں کچھ منتخب مختصر تفسیری فوائد ایسے بھی حاشیے میں دیے گئے ہیں جو تاج کمپنی والے ایڈیشن کے فوائد سے بالکلیہ مطابقت رکھتے ہیں۔ ان فوائد کے خاتمے میں "منہ رحمہ اللہ تعالیٰ" کی صراحت کی گئی ہے۔ کہیں ایسا بھی ہے کہ تاج کمپنی والے ایڈیشن میں ایک مقام پر تفسیری فائدہ موجود ہے اور شیخ غلام علی والے ایڈیشن میں اس مقام پر کوئی تفسیری فائدہ درج نہیں، جس سے ظاہر ہے کہ مؤخر الذکر جداگانہ تصنیف کی شان رکھتی ہے۔

پس نوشت

○ آخر میں مطبع خادم الاسلام دہلی والے ایڈیشن کے کچھ کوائف [illegible] نقل کیے جاتے ہیں جن سے بخوبی ظاہر ہوجاتا ہے کہ اصل موضح قرآن میں تغیرات و اضافات کے ذمے دار کون

ہیں اور وہ تغیرات و اضافات کس نوعیت کے ہیں اور ان کا زمانہ کیا ہے ؟

۱۔ مادّہ ہائے تاریخ طباعت :

(الف) مادّۂ تاریخ از حکیم میر شاہ جہان المتخلص بہ کامل ۔ خویش مولانا نذیر حسین دہلوی ۔ " موضح القرآن کیا اچھی چھپی " (۱۳۰۷ھ)

(ب) مادّۂ تاریخ از مولوی محمد محمود رونق دہلوی۔

" یہ کیا عمدہ تفسیر اچھی چھپی" (۱۳۰۷ھ)

۲۔ خاتمۃ الطبع (بصورت اشتہار) :

" ... ہم نے وارثان مصنف رحمہ اللہ علیہ سے اجازت لے کے ۔ بعد ازاں بکمال سعی و اہتمام مدت مدید میں چند نسخے بہم پہنچا کے ۔ مقابلہ و صحت سے درست کر کے جا بجا حواشی و فواید چڑھائے اور بصرف زر کثیر مطبع احمدی میں چھپوائی ہے اور رجسٹری ہمارے ہو گئی ہے ... مدرسہ مولانا سید محمد نذیر حسین سلمہا اللہ تعالے سے طلب فرمائیں...

المشتہر : ابو محمد ثابت علی اعظم گڑھی و سید غلام حسین مونگیری "

تبصرہ : حضرات مشتہرین نے صراحت نہیں فرمائی کہ " وارثان مصنف رحمہ اللہ علیہ سے ان کا اشارہ کس طرف ہے یعنی طباعت کے وقت مصنف شاہ عبدالقادر کے وارثوں میں کون زندہ تھے؟ جو نسخے بہم پہنچائے ان کی کیفیت نہیں لکھی ۔ متن کی درستی کی کیفیت نہیں لکھی ۔ تاہم غنیمت ہے کہ جا بجا حواشی و فواید چڑھانے کا اقرار کیا ہے۔ مطبع خادم الاسلام والے ایڈیشن کے خاتمۃ الطبع میں اس کے مطبع احمدی میں چھپوانے کا ذکر ہے۔ مطبع احمدی کے نام کے ساتھ مقام کی صراحت موجود نہیں۔ لیکن قیاساً یہ ۱۳۰۷ھ میں دہلی کا کوئی مطبع احمدی ہو گا۔ اسے اس قدیم مطبع احمدی سے کچھ تعلق نہیں ——— جسے میر بہادر علی (فورٹ ولیم کالج) کے بیٹے عبداللہ نے سیرام پور (من مضافات کلکتہ) میں قائم کیا تھا اور جہاں موضح قرآن پہلی بار طبع ہوا تھا۔

ایک " مطبع احمدی" دہلی میں ظہیرالدین احمد ولی اللہی کا تھا اور یہ وہی ہیں جنھوں نے اپنے اعلان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان سے غلط طور پر منسوب مصنفات میں اس " موضح القرآن" کو بھی شامل کیا ہے جو مطبع خادم الاسلام دہلی سے چھپی تھی (رجوع کیجیے مجموعہ وصایا، اربعہ پر محمد ایوب قادری کا مقدمہ)۔

حواشی

(۱) صاحب مضمون نے یہ بھی لکھا ہے کہ "جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے یہ دیباچہ پہلے ایڈیشن میں چھپا ہو بعد کے ایڈیشنوں میں میری نظر سے تو نہیں گذرا۔" یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ موضح قرآن کا دیباچہ پہلی بار نقوش میں نہیں چھپا ہے۔ موضح قرآن کا پہلا مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۲۹ء، جو برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ اس کے بارے میں تو کچھ علم نہیں البتہ سید عبداللہ سیرام پوری کے ایڈیشن اور مطبع حسنی میر حسن رضوی والے ایڈیشن میں دیباچہ موجود ہے۔
خادم الاسلام پریس دھلی، جوہر ہند پریس دھلی اور شیخ غلام علی والے ایڈیشنوں میں بھی (جو تحریف شدہ بتائے جاتے ہیں) اختلافات متن کے ساتھ دیباچہ موجود ہے۔

(۲) سید عبداللہ اور ان کے والد میر بہادر علی حسینی کے وطن کے سلسلے میں بعض محققین کو شبہ ہے (دیکھیے ارباب نثر اردو، نیز کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر وحید قریشی)۔ ایک تصریح کے مطابق وہ سوانا کے رہنے والے تھے جو تھانیسر سے تیرہ کوس دکھن اور دہلی سے پانچ منزل مغرب میں واقع ہے۔ یہ علاقہ میر بہادر علی حسینی کے اجداد میں سے حضرت شاہ زید شہید سالار نے لاہور سے مع اپنی برادری آکر وہاں کے ہندو راجہ سے جہاد کر کے فتح کیا تھا۔

(۳) اس کے آخر میں ایک رسالہ رموز القرآن (۳۱ صفحات) یکجا ہے۔ اس پر مطبع کا نام نہیں ہے مگر سنہ طباعت و تالیف ۱۲۷۷ھ ہے۔

(۴) تاج کمپنی کا موضح قرآن قدیم قلمی و مطبوعہ نسخوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان کی صراحت پیشتر کی جا چکی۔

(۵) یہ مطبع خادم الاسلام اور جوہر ہند پریس کے مطابق ہے۔

(۶) ان کتب حوالہ کے نام ایڈیشن مذکور کے تفصیلی تجزیے کے ذیل میں درج کیے جائیں گے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام :

اقبال کا ایک مکتوب اور اس کا مأخذ

یہاں اقبال کے ایک ایسے انگریزی مکتوب کا متن، اردو ترجمہ اور تعارف پیش کیا جاتا ہے جو تقریظ کے طور پر لکھا گیا تھا۔ یہ غیر مطبوعہ تو نہیں ہے کیوں کہ یہ جس کتاب کی تقریظ ہے اس کے آخر میں شامل ہو کر ایک بار چھپ چکا ہے۔ لیکن غیر مدوّن ضرور ہے۔ یہ مکتوب Letters & Writings of Iqbal مُرتّبہ بی اے ڈار میں شامل نہیں ہے، اور جہاں تک معلوم ہوسکا، اقبال کی غیر مدون تحریروں کے اردو مجموعوں میں بھی اس کا ترجمہ یا تذکرہ نہیں ملتا۔ جناب بی اے ڈار ہی کی ایک دوسری کتاب انوار اقبال میں اقبال کی متعدد تقاریظ شامل ہیں۔ ان میں خواجہ حسن نظامی کی کتاب قرآن (کا) آسان قاعدہ، فتح محمد خاں جالندھری کی مصباح القواعد، نجم الغنی خاں کی اخبار الصنادید، اسمٰعیل میرٹھی کی قواعدِ اردو، امرناتھ مدن ساحر دہلوی کی کفر عشق، میر ولی اللہ کی لسان الغیب پر اقبال کی مختصر آرا، یا تقاریظ شامل ہیں۔ غرض یہ کہ اقبال کی تقریظ نگاری کا جائزہ لینے پر ارباب قلم کو آمادہ کرنے کے لیے کچھ مسالا موجود ہے، لیکن جس تقریظی مکتوب کا تعارف مقصود ہے اس کا ترجمہ یا تذکرہ اس میں بھی نہیں ہے۔ اقبال نامہ مُرتّبہ شیخ عطاء اللہ میں اقبال کے متعدد انگریزی مکتوبات کے تراجم بھی پیش کیے گئے ہیں لیکن اس خاص مکتوب کا ترجمہ اس میں بھی شامل نہیں ہے، اسی طرح دوسرے مجموعوں میں بھی یہ تقریظی مکتوب نہیں ملتا۔ اقبال کے غیر مدون مکاتیب کی جمع و ترتیب کی ایک تازہ تر اور کامیاب کوشش خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی کی صورت میں سامنے آئی ہے جس میں اقبال کے ایک سو گیارہ غیر مدوّن مکاتیب شامل ہیں یہ کتاب ۱۹۷۶ء میں لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے قبل مرتّب موصوف کی مرتّب کردہ متعدد غیر مدوّن تحریراتِ اقبال، صحیفہ لاہور کے اقبال نمبر میں بھی شائع ہوئی تھیں۔ اور ان میں بھی یہ مکتوب شامل نہیں ہے۔ بہرکیف، اقبال کی غیر مدوّن تحریروں کے ان مجموعوں کے ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اقبال کا جو مکتوب یہاں پیش کیا جا رہا ہے اس کا جواز موجود ہے۔

انجمن ترقی اردو کے سلسلۂ تراجم کا پہلا کارنامہ ہربرٹ اسپنسر کی مشہور کتاب "ایجوکیشن" کا اردو ترجمہ تھا۔ جس کے مترجم مولانا حالی کے نواسے یعنی خواجہ غلام الحسنین پانی پتی تھے۔ اس کتاب (۱۹۰۳ء) کا ایک نسخہ راقم کے پاس ہے جس کے آخر میں متعدد ممتاز ارباب قلم کی تقریظیں بھی شامل ہیں (۱) ان میں خواجہ غلام الحسنین کے نام اقبال کا ایک تقریظی مکتوب بھی شامل ہے جو انگریزی میں ہے۔ انگریزی زبان میں دوسرا تقریظی مکتوب "مولوی خواجہ سجاد حسین بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر (مدارس) راولپنڈی سرکل" کا ہے۔

ان انگریزی مکتوبات کے علاوہ، اردو میں بھی کچھ تقریظیں ہیں۔ پہلی تقریظ "شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ۔ فیلوالہ آباد یونیورسٹی" کی ہے۔ دوسری تقریظ "شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی" کی ہے۔ تیسرے نمبر پر اقبال کے انگریزی مکتوب کا اردو ترجمہ درج ہے اور اس پر صاحب تقریظ کا نام بطور عنوان یوں درج ہے "از جناب مولوی محمد اقبال صاحب ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور" چوتھے نمبر پر تقریظ "جناب مولوی سیّد وحید الدین سلیم سابق لٹریری اسسٹنٹ ٹو سر سیّد احمد خان و سابق ایڈیٹر معارف" کے قلم سے ہے جو اصول تبصرہ نگاری کے اعتبار سے غالباً دوسرے تبصروں سے بہتر ہے کیوں کہ اس میں اور کئی ضروری باتوں کے علاوہ، مترجم کی تدوین کو بھی بخوبی سراہتے ہوئے، مترجم کے خلاصۂ مطالب، فٹ نوٹ، مارجنل نوٹ، اور مجمل و مفصّل فہرست مطالب کے اضافے کا ذکر کیا ہے۔ اور اس بات کی تعریف کی ہے کہ مترجم نے ترجمہ بھی کیا ہے اور اپنے ترجمے کو ایڈٹ بھی کیا ہے۔ پانچویں نمبر پر خواجہ سجاد حسین کے انگریزی مکتوب کا اردو ترجمہ ہے اور آخر میں چھٹے نمبر پر "شمس العلماء ڈاکٹر مولانا حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی بالقابہ" کی تقریظ ہے اور صرف یہی ایک تقریظ مؤرّخ ہے اس پر ۱۰ دسمبر ۱۹۰۴ء کی تاریخ درج ہے اور چونکہ اس رائے پر فٹ نوٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ رائے ہمارے پاس اس وقت پہنچی ہے جب کہ دیگر حضرات کی رائیں کاپی نویس تحریر کر چکا تھا۔ اس لیے یہ صاف ظاہر ہے کہ اقبال کی رائے مقدّم ہے یعنی ۱۰ دسمبر ۱۹۰۴ء سے پہلے کی ہے۔ کتاب میں تقریظوں کے بعد مترجم کا "شکریہ" بھی شامل ہے جس میں وہ صراحت کرتے ہیں کہ "مندرجۂ بالا رائیں ان نامور بزرگانِ قوم کی ہیں جنھوں نے اس کتاب کو اشاعت سے پہلے ملاحظہ فرمایا تھا۔" ان رایوں کا ذکر مترجم نے اپنے "دیباچۂ مترجم" میں بھی کیا ہے۔ اس کا

ایک اقتباس اس مضمون میں شامل ہے۔

ان تقریظات میں اقبال کا مکتوب خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ اس زمانے میں اقبال کی منظومات کی شہرت مخزن کے ذریعے ہو چکی تھی اور اقبال کی ۔ علم الاقتصاد " نے بھی علمی حلقوں کو متاثر کیا ہو گا۔ ان تقاریظ میں وہ ذکاء اللہ ۔ حالی ۔ نذیر احمد اور وحید الدین سلیم جیسے محسنین اردو اور ممتاز ارباب علم کی صف میں نظر آتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ابتدائی دور میں بھی اقبال علمی حلقوں میں کیسا ممتاز و محترم مقام حاصل کر چکے تھے۔

خواجہ غلام الحسنین کا یہ ترجمہ اگرچہ مطبوعہ ہے۔ لیکن ایک بڑی حد تک بھلا دیا گیا ہے اور کم یاب ہے۔ شاید اسی لیے اقبال کی نثر یا غیر مدوّن تحریروں کے کسی مجموعے میں نہ تو اقبال کا اصل انگریزی مکتوب شامل ہو سکا اور نہ اس کا ترجمہ ۔ اقبال کے اس مکتوب کے مشمولات سے شبلی اور اقبال کے روابط ۔ بالخصوص نظامت انجمن ترقی اردو کے عہد کے روابط پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ابتدائی دور میں اردو کی علمی صلاحیتوں کے متعلق اقبال کی رائے بھی سامنے آتی ہے۔ اب ذیل میں۔ انگریزی مکتوب کی نقل کے علاوہ ۔ اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس کے متعلق خیال ہے کہ یہ ترجمہ بھی خواجہ غلام الحسنین ہی نے کیا ہو گا۔

Review on the Urdu translation of Herbert Spencer's "Education". M. Muhammad Iqbal M.A., Government College, Lahore writes:-

My dear Khwaja Sahib,

I have looked through a part of your Urdu translation of Spencer's "Education". When Moulana Shibli asked me, last year, whether some parts of Spencer's "Synthetic Philosophy" could be translated into urdu, I wrote to him that such an attempt would fail, largely on the ground that the vessel was too narrow for the contents. But your translation has brought home to me that my judgment was due to my ignorance of the possibilities of the most beautiful and progressive language. With all the

flexibility of Arabic and its wonderful power of making compounds which it shares with other synthetic languages, recent translations of Western Scientific ideas into that language sometimes, show signs of affectation and effort; while the easy flow of your sentences, considering the primary stage of the development of our language is simply surprising. Had Herbert Spencer been a Hindustani, he could not have adopted a better style. That such a translation is possible in Urdu, shows not only your power and ability, but also reflects on the genius of the young and promising Urdu.

I may notice here another feature of your valuable translation. you have added to your work a running analysis of the whole book which shows how keen is your faculty of seizing the salient points of a problem. I hope your book would be widely read and the analysis would facilitate the understanding and appreciation of Spencer's views.

مکتوب اقبال کا ترجمہ:

"میرے عزیز دوست خواجہ صاحب!

میں نے آپ کے ترجمۂ کتاب "ایجوکیشن" مصنفہ ہربرٹ سپنسر کا ایک حصّہ دیکھا ہے۔ سال گذشتہ جب مولانا شبلی نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ آیا سپنسر کی سنتھیٹک فلاسفی (فلسفۂ ترکیبی) کے بعض حصوں کا اردو میں ترجمہ ہونا ممکن ہے یا نہیں۔ تو میں نے ان کو لکھ دیا تھا کہ اس ارادے میں زیادہ تر اس وجہ سے ناکامیابی (ناکامی) ہوگی کہ (اردو کا) ظرف اس قدر تنگ ہے کہ اس میں مظروف (فلسفیانہ خیالات) کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ مگر آپ کے ترجمے نے یہ بات میرے ذہن نشین کردی

کہ میری اس رائے کی بنیاد اس امر پر تھی کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس نہایت ہی خوبصورت اور ترقی کرنے والی زبان (اردو) میں ایسے مضامین کے ادا کرنے کی قوت کہاں تک موجود ہے۔ باوجود یہ کہ عربی میں مثل دیگر السنۂ ترکیبی کے ادائے مطالب کی پوری قابلیت اور مرکب الفاظ وضع کر لینے کی عجیب و غریب طاقت موجود ہے۔ تاہم مغربی علوم کے جو ترجمے آج کل عربی زبان میں ہوئے ہیں۔ ان میں بعض اوقات تکلّف اور تصنّع کی بو پائی جاتی ہے۔ مگر جب اس بات پر غور کی جائے کہ ہماری زبان ابھی ترقی کے پہلے ہی زینے پر ہے۔ تو آپ کے ترجمے کی بے تکلف روانی بالکل حیرت انگیز ہے اگر ہربرٹ سپنسر ہندوستانی ہوتا۔ تو وہ بھی (اردو میں) اس سے بہتر طرز تحریر اختیار نہ کرسکتا۔ یہ بات کہ اردو میں ایسا ترجمہ ممکن ہے، اس سے نہ صرف آپ کی لیاقت اور قدرت بیان ظاہر ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعمر اور ہونہار اردو میں ادائے مطالب کی کس قدر قابلیت موجود ہے۔

میں اس موقع پر آپ کے قابل قدر ترجمے کی ایک اور خصوصیت بیان کرتا ہوں۔ آپ نے اپنے ترجمے کے دیباچے میں تمام کتاب کے مطالب کا ایک مسلسل خلاصہ درج کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسئلے کی اہم اور ضروری باتوں پر حاوی ہوجانے کی کیسی زُود رَس قوت آپ میں موجود ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ آپ کی کتاب کو بہت سے لوگ پڑھیں گے اور آپ کے خلاصے سے ناظرین کتاب کو سپنسر کے خیالات کے سمجھنے اور ان کی قدر کرنے میں بڑی سہولت ہوگی۔"

اور اب اس مکتوب سے متعلق چند تصریحات پیش کی جاتی ہیں۔

اس میں مولانا شبلی کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن ترقی اردو، اور اردو کے سلسلے میں اقبال سے شبلی کی خط و کتابت رہی ہے۔ اور انجمن سے اقبال کا تعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دور نظامت کا نہیں بلکہ پہلے کا ہے۔ اقبال سے مولوی عبدالحق اور

انجمن کے روابط پر روشنی ممتاز حسن مرحوم کی کتاب "اقبال اور عبدالحق" میں بڑی خوبی کے ساتھ ڈالی گئی ہے۔ اور اسی میں ایک سرسری ذکر اقبال کی ابتدائی دور کی کتاب علم الاقتصاد کے سلسلے میں یہ بھی آتا ہے کہ مولانا شبلی نے اس کتاب کو اشاعت سے پہلے دیکھا تھا اور اس کتاب میں اقبال نے جو نئی اصطلاحیں اردو میں استعمال کی ہیں۔ ان کے استعمال میں شبلی کی منظوری کو بھی شامل سمجھنا چاہیے۔ شبلی اور اقبال دونوں کے حالات زندگی کی تحقیق میں جو کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں ان میں ان حضرات کے باہمی علمی روابط پر اب تک کماحقہٗ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مواد بھی کم ہی دستیاب ہے۔ شبلی کے نام اقبال کا صرف ایک مکتوب اقبال نامے میں درج ہے۔ دو مقامات پر اقبال نے سلیمان ندوی کے نام اپنے مکتوب میں شبلی کا ذکر کیا ہے۔ اس کمی کو شاید ہم عصر اخبارات و رسائل کی فائلوں کے مطالعے کی مدد سے کسی حد تک دور کیا جاسکے لیکن ان کا فراہم ہوجانا بھی آسان نہیں۔

اقبال کے اس مکتوب میں دوسری قابل توجہ بات اردو سے متعلق ان کی رائے ہے۔ خواجہ غلام الحسنین کے ترجمے کے مطالعے کے بعد اقبال نے اپنی اس رائے میں تبدیلی کی ہے کہ اردو کا ظرف فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے تنگ ہے اور تسلیم کیا ہے کہ اس نو عمر اور ہونہار اردو میں ادائے مطالب کی قابلیت موجود ہے۔ مرزا غالب کے عنوان سے بانگ درا میں جو نظم ۱۹۰۵ء تک کلام کے تحت درج ہے اس میں بھی اردو سے متعلق اقبال کا یہ مشہور شعر آتا ہے۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

یہ نظم بھی کم و بیش اسی زمانے کی ہے جس زمانے کا تقریظی مکتوب ہے۔

ایک اور چیز جو اس مکتوب میں قابل غور ہے' یہ ہے کہ جہاں بعض تقریظ نگاروں نے ترجمے کی خوبیوں کے ساتھ اصل کتاب اور اصل مصنف کو بھی بہت سراہا ہے، اقبال نے اصل مصنف اور تصنیف پر اپنی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ دوسرے تقریظ نگاروں میں مولوی ذکاء اللہ، مولانا حالی اور وحید الدین سلیم نے اصل مصنف کو بالترتیب "انگلستان کے ارسطو" "انگلستان کے نامور حکیم" اور فائق ترین علامہ اور استاذ فلسفہ کے القابات سے یاد کیا ہے۔ اور اس کی کتاب کی بھی بہت کچھ تعریف کی ہے۔ جہاں تک مترجم کی کامیاب کوشش کا

تعلق ہے سب ہی نے سراہا ہے اور اس پر انجمن ترقی اردو کو مبارک باد دی ہے۔

۴

اور اب چند ضمنی تصریحات کتاب کے دوسرے اور عمومی پہلوؤں سے متعلق پیش کی جاتی ہیں۔ یہ مطبوعہ کتاب انجمن کے ابتدائی دور کی کتابوں میں سے ہے جب کہ رموزِ اوقاف اور املا وغیرہ کے وہ اصول انجمن نے مقرر نہیں کیے تھے جو بعد کو مولوی عبدالحق کے دور نظامت میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی وغیرہ کی مدد سے طے پائے اور جن کے طے پانے کی روداد رسالۂ اردو کے ابتدائی دور کے شماروں میں ملتی ہے۔ اس کی کتابت میں املے کا اہتمام نہیں ہے، البتہ رموزِ اوقاف کی پابندی، پوری کتاب میں ہے۔ اصل مصنف کا نام الف کے بغیر سپنسر آتا ہے جسے بالفعل مترجم نے درست تر سمجھا ہے۔ درمیانی ہائے ہوز کو بغیر زائد علامت (بکہ/ آویزہ) کے اس طرح لکھا گیا ہے جیسا کہ فارسی میں آج بھی رائج ہے۔ لیے کو ہمزہ کے ساتھ ہر جگہ لئے لکھا ہے جیسا کہ اس وقت کا رواج تھا۔ اور الفاظ ملا کر بھی لکھے ہیں۔ غرض کہ اس لحاظ سے اس قدیم مطبوع کتاب میں اردو زبان کے طالبان تحقیق کے لیے کچھ مواد ہے، نیز دوسرے اکابر کی تقاریظ بھی ان کی غیر مدون تحریروں کی حیثیت سے افادیت رکھتی ہیں۔

مکتوب اقبال کے اس مأخذ یعنی خواجہ غلام الحسنین کے اردو ترجمے "فلسفۂ تعلیم" کا ذکر "پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی (کراچی ۱۹۵۳ء) میں بھی نظر آتا ہے۔ انجمن کے ابتدائی دور کی تاریخ بیان کرتے ہوئے "علی گڑھ کا دور سنہ ۳ تا ۱۲ء" کے تحت بتایا گیا ہے کہ مولانا شبلی انجمن کی تاسیس (اجلاس دہلی جنوری ۱۹۰۳ء) سے لے کر دسمبر ۱۹۰۵ء تک انجمن کے سکریٹری رہے۔ سکریٹری بنائے جانے کے وقت وہ علی گڑھ سے جاچکے تھے۔ پہلے حیدرآباد رہے پھر ندوۃ العلماء کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ انجمن کی انتظامی مجلس کے اکثر ارکان حیدرآباد میں تھے۔ اور اس کا پہلا مستقر عملاً حیدرآباد دکن ہوگیا تھا لیکن ایجوکیشنل کانفرنس کا شعبہ ہونے کے باعث انجمن کی کتابوں کی طباعت اور اشاعت علی گڑھ سے ہوئی تھی۔ مولانا شبلی کی ڈھائی تین سال کی نظامت یا معتمدی میں صرف دو ترجمے شائع کیے گئے۔ ۱۔

خواجہ غلام الحسنین کا مذکورہ ترجمہ "فلسفۂ تعلیم" ۲۔ منشی نرائن پرشاد ورما کا ترجمہ "رہ نمایان ہند"۔

مولانا شبلی کے زمانۂ معتمدی میں انگریزی اور عربی فارسی سے ترجمہ کرنے کے لیے آٹھ دس کتابیں منتخب کی گئی تھیں، ان میں سے فلسفۂ تعلیم کی سب سے پہلے اشاعت ہوئی۔ اس کا ذکر ہاشمی فرید آبادی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"انجمن ترقی اردو نے سنہ ۳ سے سنہ ۱۲ء کے اخیر تک سات نئی کتابیں بہ ترتیب ذیل شائع کیں ۱۔ فلسفۂ تعلیم ۲۔ القمر ۳۔ القول الاظہر ۴۔ رہ نمایان ہند ۵۔ نپولین اعظم ۶۔ امرائے ہنود ۷۔ تاریخ تمدن جلد اول۔ ان میں سے پہلی ہربرٹ اس پین سر کی کتاب "ایجوکیشن" کا ترجمہ ہے۔ انیسویں صدی میں جدید سائنس کی ترقی نے یورپ کو علوم تجربی کا بے حد گرویدہ و معتقد بنا دیا تھا۔ اس پین سر اسی عہد کا انگریزی فلسفی گذرا ہے کہ اخلاقیات و تمدن کی اقلیم میں بھی سائنس کا حکم چلانا چاہتا تھا۔ پچاس ساٹھ برس قبل اس کی تصانیف ہندوستان کے انگریزی خوانوں میں کافی مقبول تھیں۔ بنائے انجمن کے بعد چند انگریزی کتابیں ترجمے کے لیے منتخب اور مشتہر کی گئیں، ان میں ایک اس کا یہ رسالہ "ایجوکیشن" بھی تھا۔ خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی ان دنوں ریاست حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم سے منسلک تھے۔ ان کا ترجمہ "فلسفۂ تعلیم" کے نام سے جت پسند اور انجمن کی طرف سے شائع کیا گیا۔ رائے دینے والوں میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نام بھی تحریر ہے۔ جنھوں نے مترجم کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ ترجمے میں خود اسپین سر کی اصل تحریر کا رنگ جھلکتا ہے۔ کتاب کے مطالب کا خلاصہ اور مصنف کے حالات بطور دیباچہ فاضل مترجم نے اضافہ کیے اور کہیں کہیں ذیلی حاشیے لکھ دیے ہیں۔ یہ کتاب تیسری بار ٹائپ میں بہ مقام اورنگ آباد سنہ ۱۹۳۲ء میں طبع ہوئی تھی اور ہنوز قابل مطالعہ ہے۔"

(پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۲۲، ۲۳)

اس کتاب کے دیباچۂ مترجم میں انجمن ترقی اردو کی تاسیس اور "فلسفۂ تعلیم" سے

متعلق مفید معلومات ملتی ہیں۔ یہ دیباچہ انجمن کی ۱۹۰۳ء کی سالانہ روداد مرتب مولانا شبلی کے بعد انجمن کی تاسیس سے متعلق معلومات کے سلسلے میں دوسرا قدیم ترین مأخذ ہے۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا انجمن سے تعلق اس کے بالکل ابتدائی دور سے ہے، چنانچہ "ایجوکیشن" کے جو ترجمے بطور نمونہ موصول ہوئے تھے ان کے بارے میں آتا ہے کہ "یہ تمام ترجمے شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب، خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب، شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے، مسٹر آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور دیگر ممبروں کے پاس اظہار رائے کے لیے بھیجے گئے" (ص ۳)۔ یعنی اقبال کو بھی ممبروں کے ذیل میں مذکور کیا گیا ہے۔ ان حضرات میں آرنلڈ تو انجمن کے پہلے صدر تھے اور نذیر احمد، حالی اور ذکاء اللہ نائب صدر انجمن، اور اقبال ممبر ہوں گے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اس میں آرنلڈ کی تشویق کو بھی دخل ہوسکتا ہے۔ بہرکیف اب دیباچے کا وہ ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو جس میں انجمن کی تاسیس اور "فلسفۂ تعلیم" کا ذکر ہے:

دیباچۂ مترجم

اس دیباچۂ مترجم کے ایک فٹ نوٹ میں مولانا شبلی کی پیش کردہ سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ۱۹۰۳ء کا حوالہ دیکھ کر، اس رپورٹ کو دیکھنے کا خیال ہوا۔ لیکن انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتاب خانے میں یہ رپورٹ نہیں مل سکی۔ البتہ اس کا ایک حوالہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کراچی ۱۹۰۷ء کی مطبوعہ روداد میں ملا۔ اس کانفرنس کی روداد میں انجمن ترقی اردو کی رپورٹ "مولوی حبیب الرحمان صاحب آنریری سیکریٹری اردو سیکشن (مولانا حبیب الرحمان شروانی) کے قلم سے ہے۔ اس میں اوّل وہ یہ بتاتے ہیں کہ "اس انجمن کی بنیاد ۱۹۰۳ء کے آغاز میں اس نامور شہر میں پڑی جو زبان اردو کا مولد و منشا ہے یعنی دلی۔ دو سال تک یہ انجمن ترقی کرتی رہی۔ اس کے بعد مختلف اسباب سے ترقی رکی، رکنے کے بعد تنزل شروع ہوگیا ..." پھر وہ لکھتے ہیں کہ

> "جو رپورٹ سیکریٹری سابق (مولانا شبلی) نے ۱۹۰۳ء کی کارروائی شائع کی تھی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حسب ذیل ترجمے یا تالیفات اس وقت زیر قلم تھے (۱) ترجمہ ایجوکیشن ہربرٹ اسپنسر (۲) ترجمہ کان فلکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس از ڈریپر (۳) ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ از کارلائل (۴)

میکس مولر لیکچرز (۵) کتاب النبات (۶) نامۂ دانشوران (۷) معارف ابن قتیبہ (۸) رہنمایان ہند (۹) القمر (۱۰) مصباح القواعد (۱۱) تاریخ تمدن (۱۲) سوانح عمری امیر خسرو دہلوی (۱۳) قدیم فارس (۱۴) سوانح عمری میر انیس مرحوم (۱۵) طریقۂ حکومت انگریزی۔ اور اس کے بعد ان سب کی رفتار ترقی کی کیفیت بھی بیان کی ہے جو انجمن کی ابتدائی تاریخ کی تدوین میں مفید ہو سکتی ہے۔ اسی سلسلے میں مولانا شروانی نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ روداد مذکورہ کے بعد تعلیم (فلسفۂ تعلیم ترجمہ ایجوکیشن) اور مصباح القواعد اس وقت (۱۹۰۰ء) تک زیر سرپرستی انجمن شائع ہو گئیں۔

مولانا شبلی کی اصل رپورٹ مل جانے کے بعد شاید اقبال سے انجمن کے ابتدائی دور کے تعلق پر کچھ اور روشنی پڑ سکے۔

حاشیہ

۱۔ متن ترجمہ ص ۲۷۹ پر تمام ہوا ہے اور اردو تقریظیں ص ۲۹۹ سے ص ۳۰۶ تک ہیں یہ نسخہ ناقص الاول ہے اس لیے مقام طباعت اور سنہ طباعت کی تفصیلات اس میں نہیں ہیں۔ جنھیں معلوم کرنے کے لیے دوسرے نسخوں کے دیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ سندھ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں طبع ثانی کا ایک نسخہ ہے جو مولوی عبدالحق کے ابتدائی دور نظامت انجمن کا ہے (جیسا کہ اس میں درج اشتہار کتب سے اندازہ ہوا۔) اور جس میں کتاب کے آخر میں رائیں درج نہیں ہیں اس کی صراحت دیباچہ مترجم کے صفحہ ۴ پر ایک فٹ نوٹ میں یوں کی گئی ہے "ان کو طبع ثانی میں حذف کر دیا گیا ہے"۔ اسی طرح طبع سوم (مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) میں بھی جو ٹائپ میں ہے یہی صورت ہے کہ رائیں محذوف ہیں اور اس کی صراحت دیباچہ مترجم کے مذکورہ فٹ نوٹ میں موجود ہے۔ تیسرے ایڈیشن کا ذکر ہاشمی فرید آبادی کی "پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو" میں بھی ملتا ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتاب خانے میں "فلسفۂ تعلیم" کا ایک اور قدیم ایڈیشن بھی

۱۱ جو عرش تیموری کی یادگار کے طور پر انجمن کو ۱۹۶۳ء میں دیا گیا تھا۔ یہ نسخہ مکمل ہے
اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسے ڈپوٹی بک ڈپو مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے ۱۹۰۶ء میں مطبع
مفید عام آگرہ میں چھپوایا تھا۔ اس کے انگریزی مکتوبات پر داموور پرنٹنگ ورکس آگرہ
کیٹ کا نام درج ہے۔اس کا متن ترجمہ صفحہ ۲۹۳ پر ختم ہوجاتا ہے اور صفحہ ۲۹۵ تا
۳۰۳۔ اردو تقریظیں درج ہیں'۔ یہ اگرچہ ضخامت اور صفحات کے شمار میں راقم کے نسخے سے
مختلف ہے۔ اور ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ راقم کے نسخے کے انگریزی مکتوبات پر پریس
کا نام بھی درج نہیں ہے۔ تاہم کتاب کے متن اور مشمولات میں یا حواشی میں اور کوئی
فرق نہیں معلوم ہوتا۔ انہی دو قدیم ایڈیشنوں میں سے ایک طبع اول اور دوسرا طبع دوم
ہوگا اور اس طرح درحقیقت ۱۹۳۲ء تک اس کتاب کے تین نہیں بلکہ چار ایڈیشن ملتے
ہیں۔

پس نوشت:

یہ مضمون ایک رسالے کے اقبال نمبر کے لیے لکھا گیا تھا جو کم و بیش دس برس
گزر جانے کے بعد بھی التوا کا شکار ہے۔ اس دوران سید مظفر حسین برنی کی مرتب کردہ عظیم و
ضخیم "کلیاتِ مکاتیبِ اقبال" کی تین جلدیں (۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۳ء) اردو اکادمی دہلی کی طرف سے
شائع ہوئی ہیں۔ جلد اول میں صفحہ ۸۵ پر خواجہ غلام الحسنین کے نام اقبال کے اس خط کا (جو
ہمارے مضمون کی بنیاد ہے) صرف ایک دو فقرے "انوارِ اقبال" سے اقتباس کیے گئے ہیں۔ پورا
خط فاضل مرتب کی دسترس سے دور رہا ہے۔

ڈاکٹر آصف زمانی :

"غالب کے غیر متداول کلام کی واحد مکمل شرح"

غالب نے پیش گوئی کی تھی کہ

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

آج یہ حقیقت بن کر سامنے آگئی ہے۔ غالب کے متعلق جس قدر لکھا جا چکا ہے یا لکھا جا رہا ہے، بہت کم شعرا کو یہ اوج شرف نصیب ہوا۔ غالب کی ہزار شیوگی کی دریافت برابر جاری ہے۔ ان سے متعلق صدہا کتب و مضامین نیز شرحیں لکھی جا چکی ہیں اس کے باوجود سخن شناسوں کو ایسا لگتا ہے کہ ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ نیز غالب کے ہزار معنی سربستہ کا راز ہنوز باقی ہے۔

غالب نے ابتدائی سن تمیز ہی سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ اس سلسلے میں مختلف حضرات مثلاً سلطان غلام محمد بہادر، (۱)، قدر بلگرامی (۲) اور شاکر (۳) وغیرہ کو لکھے گئے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دس، بارہ یا پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ محققین نے ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء، ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء، اور ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء کی درمیانی مدت کو ان کی ابتدائی سخن سرائی کا زمانہ قرار دیا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے دس برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا، اس کی تائید ان کے ہمجولی، لالہ کنھیا لال کے بیان سے بھی ہوتی ہے جسے حالی نے "یادگار غالب" میں نقل کیا ہے (۴)۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مرزا کی شاعری کا آغاز ریختہ سے ہوا۔ اس کی تائید "گل رعنا" (۵) کے دیباچے اور نساخ (۶) و شاکر نیز (۷) نواب شمس الامرا، وزیر اعظم حیدرآباد دکن کو لکھے گئے اُن کے اُردو و فارسی خطوط سے ہوتی ہے۔ ۲۵ سال کی عمر کے بعد وہ فارسی زبان کی نظم و نثر کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔

مرزا اپنے اس ابتدائی دور میں بیدل، شوکت اور اسیر کے طرز پر ریختہ لکھتے رہے۔

مرزا کے اس دور کا تمام کلام پیچیدہ خیالی اور مغلق تشبیہات و استعارات پر مشتمل ہے۔

یہی وہ دور ہے جب لوگوں نے ان کی بیدلانہ ترکیبات و اصطلاحات پر پھبتیاں کسنا شروع کیں اور ان کے اشعار کو "مہمل" اور "بے معنی" قرار دیا۔ سخنورانِ کامل کی طرف سے بھی آسان کہنے کی فرمائش ہوتی تھی۔ چنانچہ جیسے جیسے ان کی ادبی استعداد میں جلا ہوتی گئی انھیں خود اپنے کلام میں عیوب نظر آنے لگے۔ چونکہ مرزا کے اُردو و فارسی کلام کی جمع و ترتیب کا ابتدائی کام خود انھی کے ہاتھوں انجام کو پہنچا تھا لہذا اس کی تہذیب و تنقیح کا کام بھی انھوں نے از خود انجام دیا۔ بہت سی غزلیں قلم زد کیں۔ فقرے، مصرعے اور شعر تبدیل کیے۔ ان کی مُرتّب کی ہوئی ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء کی وہ بیاض جسے ان کے دیوان کی روایت اوّلیں سمجھنا چاہیے، نسخۂ غالب بخط غالب کی شکل میں دریافت ہو چکی ہے۔ تہذیب و تنقیح کا یہ عمل ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء تک جاری رہتا ہے جو سفرِ کلکتہ سے پہلے ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں ختم ہوتا ہے۔ یہ نسخہ بھی عرصے تک دستیاب نہ ہوسکا۔ یہ وہی نسخہ ہے جسے نسخۂ بھوپال کے نام سے جانا جاتا ہے، جو اس کی کتابت کے تقریباً سو سال بعد یعنی ۱۹۲۱ء میں مفتی انوار الحق مرحوم کی تصحیح اور ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے مُقدّمے کے ساتھ "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا۔ "نسخۂ شیرانی"، نسخۂ بھوپال کا مُبتیضہ ہے کیوں کہ اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں۔ (۹)

دوسرا اہم نسخہ وہ ہے جو مرزا نے قیام کلکتہ کے دوران (۱۸۲۸ء۔ ۱۸۲۹ء) مولوی سراج الدین احمد (ایڈیٹر ہفتہ دار فارسی اخبار "آئینۂ سکندری" کلکتہ) کی فرمائش پر اپنے اردو و فارسی کلام کے انتخاب کے طور پر تیار کیا تھا جو "گُلِ رعنا" کے نام سے موسوم ہوا۔ ۱۹۵۷ء میں مالک رام کو "گُلِ رعنا" کا ایک مکمل نسخہ دستیاب ہوا۔ اس میں ۴۵۳ منتخب اشعار ہیں، سال، ناقص ہے، حال ہی میں اس کے ۲ خطّی نسخے دستیاب ہوئے۔ ایک نامکمل ہے دوسرا مکمل ہے جو خواجہ محمد حسن کی ملکیت ہے۔ اس میں تاریخ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء درج ہے

مولانا عرشی نے غالب کے سات قدیم ترین قلمی نسخوں (۱۰) نیز سات قدیم ترین مطبوعہ نسخوں (۱۱) کی مدد سے کئی سال کی عرق ریزی کے بعد غالب کا ایک انتہائی معتبر اور مستند نسخہ "دیوان غالب اُردو نسخۂ عرشی" کے نام سے ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقّی اردو علی گڑھ کی طرف سے شائع کیا جو تین حصوں میں منقسم ہے۔

اول : <u>گنجینۂ معنی</u> : اس حصے میں وہ تمام اشعار مندرج ہیں جو نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی میں

موجود ہیں۔ مگر ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۳ء کے مُرتب کردہ دیوان سے مرزا نے انھیں خارج کر دیا۔

دوم : نوائے سروش : یہ حصہ اس کلام پر مشتمل ہے جو مرزا نے اپنی زندگی میں لکھوا کر اور چھپوا کر تقسیم کیا اور عام طور پر " دیوان غالب " کے نام سے مشہور اور متداول ہے۔

سوم : یادگار نالہ : اس حصے میں وہ کلام ہے جو دیوان غالب کے کسی نسخے کے متن میں نہ تھا لیکن بعض نسخوں کے حاشیوں، خاتمے یا خطوط اور دوسروں کی بیاضوں میں پایا گیا اور وقتاً فوقتاً رسائل وغیرہ میں شائع ہوا۔

یوں تو غالب کے کلام کی اب تک ۳۰ سے زائد شرحیں لکھی جا چکی ہیں لیکن نسخۂ حمیدیہ کی شکل میں مطبوعہ طور پر نسخۂ بھوپال کے سامنے آجانے کے بعد غالب کے ۱۶۶۲ قلم زد اشعار میں سے کچھ حصے کی شرحیں بھی لکھی گئیں جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ مولانا عبدالباری آسی نے نسخۂ حمیدیہ میں شامل قلم زد کلام کے ۱۶۶۲ شعروں میں سے صرف ۱۰۹۳ اشعار کی شرح لکھی لیکن انھوں نے اسے مکمل شرح کلام غالب کا نام دیا۔ یہ شرح ۱۹۳۱ء میں صدیق بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

۲۔ شیر علی خاں سرخوش نے " عطائے معنیٰ " کے عنوان سے غالب کے متداول دیوان کی شرح دو جلدوں میں شائع کی، تیسری جلد ضمیمہ ہے جو قلم زد کلام کے ۱۹۹ شعروں کی شرح ہے۔

۳۔ وجاہت علی سندیلوی نے باقیاتِ غالب میں ۱۸۳ شعروں کی شرح کی۔ انھوں نے " نشاطِ غالب " میں مُروّجہ اشعار کے ساتھ چند قلم زد اشعار کی بھی شرح کی ہے۔

۴۔ اُردو کے ایک معتبر اور سنجیدہ مُحقِق پروفیسر گیان چند نے بھی تفسیرِ غالب کے نام سے غالب کے غیر متداول کلام کی شرح لکھی جو ۱۹۷۱ء میں پہلی بار اور ۱۹۸۶ء میں دوسری بار سرینگر سے شائع ہوئی۔ یہ شرح کئی معنوں میں غالب کے غیرِ متداول کلام کی دوسری شرحوں سے افضل ہے۔ اشعار کی تعداد کے لحاظ سے یہ آسی، سرخوش اور سندیلوی سے کہیں زاید ہے۔

پروفیسر گیان چند نے نہ صرف " گنجینۂ معنی " (نسخۂ عرشی) میں شامل کل ۱۶۶۲ قلم زد اشعار کی شرح لکھی بلکہ انھوں نے نسخۂ عرشی کے تیسرے جز " یادگارِ نالہ " میں سے ۱۱۸ مشکل اشعار کا انتخاب کر کے اس کی بھی شرح کی۔ مولانا عرشی کو نسخۂ عرشی کی اشاعت کے بعد غالب کا کچھ متفرق کلام بھی ملا، جسے ان کے صاحبزادے اکبر علی خاں نے " نقوش " لاہور شمارہ

۱۰۱ بابت نومبر ۱۹۶۴ء میں ضمیمۂ عرشی کے نام سے شائع کیا۔ اس میں چھے قلم زد اشعار بھی شامل تھے جو خود نوشت دیوان (۱۲) کے بعد اور کسی نسخے میں نہیں آئے۔ پروفیسر گیان چند نے ان چھے اشعار کو بھی اپنی شرح میں شامل کیا۔ پروفیسر گیان چند نے ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۶ء کی مرتب کی ہوئی غالب کی بیاض بخطِ غالب سے بھی ۱۶۹ اشعار شامل کیے اس طرح نسخۂ عرشی سے الحاقی یا مشکوک اشعار کو نظر انداز کر کے کُل اشعار کی جو شکل سامنے آئی وہ آسی، سرخوش اور سندیلوی سے نسبتاً زاید ہے، جسے مندرجہ ذیل جدول میں واضح کیا جا رہا ہے:

گنجینۂ معنی

شارح	قصیدہ	غزل	رباعی	میزان
آسی:	صفر	۱۰۵۱	۱۲	۱۰۲۳
سرخوش:	-	۱۹۶	صفر	۱۹۶
سندیلوی:	۶	۱۷۷	-	۱۸۳
گیان چند:	۱۴۳	۱۵۰۸	۱۲	۱۶۶۳

دیگر

شارح	یادگار نالہ	خود نوشت دیوان	ضمیمۂ نسخۂ عرشی	کل میزان بشمول میزان بالا
آسی	صفر	صفر	صفر	۱۰۶۳
سرخوش	-	-	-	۱۹۶
سندیلوی	-	-	-	۱۸۳
گیان چند:	۱۰۸	۱۶۹	۶	۱۹۵۶

اس جدول سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی چیز مانع نہیں کہ پروفیسر گیان چند کی یہ شرح غالب کے متداول کلام کی واحد مکمل شرح ہے۔ واحد اس لیے کہ اس شرح کے بعد اب

تک غالب کے غیر متداول کلام کی کوئی دوسری مکمل شرح سامنے نہیں آئی۔

غالب کے یہ قلم زد اشعار چوں کہ ان کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں جب وہ بیدلانہ بھول بھلیوں میں الجھے ہوئے تھے اور ۲۵ برس تک مضامین خیالی باندھا کیے۔ لہٰذا بے حد مغلق اور ادق ہیں جنھیں سمجھنا بقول پروفیسر گیان چند لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ غالب کے ایسے اشعار میں روح شاعری مفقود ہے لیکن عبدالباری آسی اور وجاہت علی سندیلوی نے ان اشعار کو شاعرانہ حیثیت سے اُتنا ہی مرتبہ دینے کی کوشش کی ہے جتنا متداول دیوان کو۔ عبدالباری آسی نے اپنی شرح کے مقدمے میں لکھا ہے کہ

"... میں وثوق اور کامل وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غالب کے اس کلام میں وہ جوہرِ کمال پنہاں ہیں جو ہندوستان کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ... ان مشکل شعروں میں وہ شعر بھی ملے ہوئے ہیں جو ان کے موجودہ دیوان سے کسی طرح کم نہیں۔ (۱۳)

اور وجاہت علی سندیلوی "باقیاتِ غالب" میں آسی سے ایک قدم آگے نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"... پوری ذمہ داری سے کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے غیر متداول کلام سے ... جس کو عرف عام میں قلم زدہ سمجھا جاتا ہے صرف دس بیس نہیں بلکہ بہت کافی تعداد میں ایسے اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جو ان کے منتخب دیوان کے بہت سے اشعار کے ہم پلّہ بلکہ زیادہ تر ان سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔ (۱۴)"

پروفیسر گیان چند اس قسم کی رائے کو "ہیرو پرستی" سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت ہی سنبھلی ہوئی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "اس دیوان میں سے تقریباً دو سو اشعار اس قابل ہیں کہ انھیں متداول دیوان کے دو سو اشعار کے ساتھ بدل لینا چاہیے" (۱۵) جہاں تک ان اشعار کے مشکل ہونے کا سوال ہے اس سے تو انھیں انکار نہیں البتہ جہاں تک ان کے مہمل ہونے کا سوال ہے اس کے وہ منکر ہیں۔ لکھتے ہیں

"مطالعے اور غور و خوض سے مجھے اندازہ ہوا کہ پورے کلام میں ایک شعر بھی مہمل نہیں (۱۶)

چلیے کم از کم اس سے غالب کی مہمل گوئی کے بہتان کی تردید تو ہوئی۔

اب ہم اس شرح کی نوعیت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

پروفیسر گیان چند نہ صرف ایک بلند پایہ محقق ہیں بلکہ ایک صاحب نظر نقاد بھی ہیں۔ شعر فہمی اور نکتہ سنجی ان کے مزاج کا جزو ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ خود شاعر ہیں بلکہ بیسیوں شعراء کا کلام ان کی نظر سے گذر چکا ہے ان کے لیے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ "عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں" لہذا نہ صرف شعر کے جزئیات پر ان کی نظر رہتی ہے بلکہ شعر کی فضا، اس کی قرا،ت، اس کا وقفہ، اس کی اضافت غرض ہر چیز پر غائر نظر رکھتے ہیں مثال کے طور پر غالب کا ایک شعر یہ ہے:

کھینچوں ہوں آئینے پر خندہ گُل سے مسطر نامہ عنوان، بیانِ دلِ آزردہ نہیں

لکھتے ہیں۔

"نسخہ عرشی میں قرا،ت ہے ع نامہ عنوانِ بیانِ دلِ آزردہ نہیں

میری رائے میں اس طرح معنی نہیں نکلتے۔ میں مندرجہ بالا قرا،ت تجویز کرتا ہوں۔ (۱۷)

ایک دوسرا شعر ہے

جنت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر جوہر، سواد جلوہ مژگان حور تھا

تشریح سے پہلے لکھتے ہیں

نسخہ عرشی میں سواد بغیر اضافت ہے اور اس کے بعد وقفہ ہے۔ بہتر ہے کہ جوہر کے بعد وقفہ ہو اور سواد کو اضافت دی جائے (۱۸)

تشریح کا مطلب ہے کسی بات کی وضاحت۔ پروفیسر گیان چند نے اس کا خاص دھیان رکھا ہے جب کہ آسی عموماً شعر کی انھی الفاظ میں نثر کر دیتے ہیں مثال کے طور پر یہ شعر ہے بہار تیز رو گلگون نکہت پر سوار یک شکستِ رنگ گل صد جُنبشِ مہمیز ہے

آسی لکھتے ہیں:

"بہار نہایت تیزی کے ساتھ خوشبو کے گھوڑے پر سوار ہو کر چلی جارہی ہے اور ایک شکست رنگ سے سینکڑوں جنبش مہمیز کا اثر پیدا ہوتا ہے۔" (۱۹)

اس کے بالمقابل پروفیسر گیان چند کی تشریح ملاحظہ ہو:

"گلگوں، گھوڑا، شکستِ رنگ، رنگ اڑنا

بہار بڑی تیزی سے چلی جاتی ہے۔ یہ خوشبو کے تیز گھوڑے پر سوار ہے۔
پھول کا رنگ جیسے ہی ذرا ٹوٹتا ہے یہ بہار کو مہمیز کا کام کرتا ہے
اور وہ اُڑن چھو ہوجاتی ہے۔ پھول کے رنگ و رونق میں کمی آئی اور بہار غائب (۲۰)

پروفیسر گیان چند کو اگر کسی جگہ پر آسی یا سندیلوی یا سرخوش سے اختلاف ہو تو اسے مکمل بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر اس شعر کو لیجیے:

تا صبح ہے بہ منزلِ مقصد رسیدنی   دُودِ چراغِ خانہ غبارِ سفر ہے آج

اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"شاعر منزلِ مقصود" کہنا چاہتا تھا لیکن وزن کی مجبوری سے منزلِ مقصد باندھ گیا۔ کوئی کچے راستے پر سفر کرتا ہے تو گرد اٹھتی جاتی ہے۔ چراغ کا اُڑتا ہوا دھواں بھی غبار راہ کے اُڑنے سے مشابہ ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ چراغ بھی کسی سفر میں گامزن ہے۔ اسے صبح تک منزلِ مقصود پر پہنچنا ہے رات، بھر چلتا رہے گا۔ منزلِ مقصود کیا ہے؟ سفر حیات کے بعد موت۔ جو چراغ کے بجھنے کی شکل میں نمودار ہوگی۔ (۲۱)

آسی کی تشریح ہے:

"صبح کے وقت تک مجھے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنا ہے۔ گھر کے چراغ کا دھواں مجھے غبارِ سفر معلوم ہوتا ہے۔ منزلِ مقصود خواہ صبح کے ہونے کو قرار دے دیجیے خواہ موت کو کہ صبح تک میں تمام ہوجاؤں گا اور اپنی زندگی کا سفر تمام کردوں گا۔ (۲۲)

پروفیسر گیان چند آسی اور سندیلوی سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آسی نے پہلے مصرعے کو انسان کے سفر حیات سے متعلق کیا ہے اور سندیلوی نے بیمار کے رات کاٹنے، سے میری عرض ہے کہ پہلے دونوں مصرعوں کو چراغ کے بارے میں لے لیجیے اس کے بعد دونوں مصرعوں کی انسانی زندگی پر تطبیق کر دیجیے۔ اس طرح پورا شعر تمثیلی ہوجائے گا (۲۳)۔

ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اس کا   صبح، موجۂ گُل کو نقشِ بوریا پایا

رات میں نے خواب میں اس کے خرام کا روح پرور نظارہ دیکھا۔ صبح اٹھ کر خیاباں میں پھولوں کی لہر دیکھی۔ مقابلتاً ایسی پھیکی دکھائی دی جیسے بوریے کا نقش ہو۔ آسی اور سندیلوی نے لکھا ہے کہ صبح ہم نے اپنے نقشِ بوریا کو موجۂ گل پایا۔ حالانکہ شعر میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے۔ سندیلوی نے ایک اور بات یہ بھی پیدا کی ہے کہ رات کو خواب میں جو کچھ موجۂ گل تھا آنکھ کھلنے پر نقش بوریا کے سوا کچھ نہ تھا لیکن صحیح معنی وہی ہیں جو میں نے ابتدا، میں درج کیے (۲۴)۔

اس ضمن میں ایک شعر اور پیش کرنا چاہوں گی:

یہ اُمّیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت، مبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطف عام اس کا

لکھتے ہیں: محمل کش ہونا کسی عمل میں مشغول ہونا۔ کسی کام کو آگے بڑھانا۔ عناں گیر۔ چلنے سے باز رکھنا۔ اُردو کے شاعر اور عاشق کا مزاج ساری دنیا سے الگ اور اُلٹا ہوتا ہے۔ وہ حسرت کو پسند کرتا ہے۔ اس لیے محبوب کے تغافل کو اس کے لُطف پر ترجیح دیتا ہے۔ مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنی عام مروّت کی عادت کے تحت مجھ سے تغافل کرنے سے باز رہے۔ یہ بُرا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ پر نگاہِ خاص کر کے مجھے اپنی مہربانی سے معاف رکھے اور تغافل برتے تاکہ میرے لیے حسرت کا اہتمام ہوسکے۔ لطفِ عام سے محروم رہنے میں ایک خصوصیت ہے۔

اس شعر کے معنی۔ سرخوش اور وجاہت علی سندیلوی تینوں نے درج کیے ہیں اور افسوس کہ تینوں میں سے کوئی اسے سمجھ نہ سکا، تینوں نے لکھ دیا کہ شاعر کو یہ حسرت ہے کہ محبوب اس کے ساتھ تغافل نہ کرے۔

اکثر جگہ شعر کے دو مطلب برآمد ہوتے ہیں:

ایسے موقع پر انھوں نے دونوں طرح تشریح کی ہے۔ مثلاً یہ شعر

رات دل گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ تھا، رنگِ روے شمع برقِ خرمنِ پروانہ تھا

تشریح: یہ پہلو دار شعر ہے اور اس کے دو معنی ہیں۔

۱۔ رات میں محبوب کے جلوے کا تصور کر رہا تھا، خیال جلوہ کو رنگ روے شمع کہا اور خود کو پروانہ۔ اس کا رنگِ رخ یعنی خیالِ جلوہ میرے خرمن پر برق کا کام کر رہا تھا یعنی مجھے جلائے دیتا تھا۔

۲۔ میں نے محبوب کے جلوے کا خیال کیا، اس کی وجہ سے شمع کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا

پروانے نے جب دیکھا کہ اس کے محبوب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا ہے یعنی وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے تو اس کے خرمن پر برق گر پڑی۔

اس میں دو رائیں نہیں کہ غالب اُردو سے زیادہ فارسی کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو کے مقابلے میں ہمیشہ اپنی فارسی گوئی پر ناز کیا۔ ابتدائی اردو کلام پر تو فارسی کا غلبہ اور بھی زیادہ ہے۔ اکثر اُردو کے اشعار تو ایسے ہیں جس میں سوائے فعل " ہے " کے سب کچھ فارسی ہے اگر اسے " است " سے تبدیل کر دیا جائے تو شعر فارسی کا کہلائے۔ ایسے اشعار کی گرہیں بھی پروفیسر گیان چند نے باقدرت کمال کھولی ہیں۔

بسانِ جوہرِ آئینہ از ویرانیِ دل ہا   غبار کوچہ ہائے موج ہے، خاشاکِ ساحل ہا

تشریح: شعر کے مختلف اجزا، کی بندش کو حل کر کے یوں پیش کیا جائے گا۔

ویرانی دل ہا سے خاشاک ساحل ہا کوچہ ہائے موج میں جو ہر آئینہ کی طرح غبار کا کام کرتا ہے۔

جوہر فولاد، آئینے میں دھاریوں کی شکل میں ہوتا ہے، اگر آئینے میں جوہر کے خطوط دکھائی دیں تو یہ اس کی صفائی میں حارج ہوتا ہے۔ جوہر کی مماثلت خس و خاشاک سے ہے۔ کسی کوچے میں گرد و غبار ہونا عیب ہے۔ اب شعر کے مطلب کی طرف۔ آیئے انسان ساحل دریا پر سیر کو اس لیے جاتا ہے کہ موجوں کی روانی دیکھ کر اس کا دل شگفتہ ہو۔ لیکن اگر اس کا دل ویران اور اُداس ہوگا تو اُسے موج و ساحل میں کوئی دلکشی نہ دکھائی دے گی بلکہ وہ اس منظر کی خامیوں پر جزبز ہوگا۔ مثلاً ساحل پر تنکے پڑے ہیں، صفائی نہیں ہے وہ کہے گا" یہاں سے چلو، یہاں کتنی گندگی ہے ؟ " کوچہ ہائے موج لہروں کے درمیان کی نالیوں سے بنتے ہیں، ساحل کے خاشاک اس کے لیے کوچۂ موج کا غبار بن جائیں گی یعنی پانی کی موجیں جاذبِ نظر نہ رہیں گی۔ بالکل اُسی طرح جیسے آئینے میں جوہرِ آئینہ دھندلا پن پیدا کر دیتا ہے۔ (۲۵)

سلاستِ طرزِ ادا اور خوبیِ بیان ملاحظہ ہو، ایسا لگتا ہے جیسے کوئی استاد سامنے بیٹھا اپنے شاگردوں کو ایک ایک نکتہ سمجھا رہا ہو۔ یہ بات صرف پروفیسر گیان چند ہی میں پیدا ہو سکتی ہے کیوں کہ وہ ساری زندگی اُستاد رہے ہیں۔

ظاہر ہے یہ شرح ایک ایسے محقق نقاد کی دقیق فکر کا نتیجہ ہے جس پر اُنگلی رکھنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ لیکن دو جگہ تشریح سے مجھے کسی قدر اختلاف ہے جس کا اظہار کم از

کم اپنی اصلاح کے لیے ضروری سمجھتی ہوں۔ اول یہ شعر

مرحبا سالِ فرخی آئیں عید شوال و ماہِ فروردیں (۲۶)

پروفیسر گیان چند نے اس شعر کی تشریح میں لکھا ہے عیدِ شوال: عید الفطر جو یکم شوال کو ہوتی ہے ماہ فروردیں: ایرانی شمسی سال کا پہلا مہینہ جو مارچ میں شروع ہوتا ہے۔ یہ مبارک سال کتنا اچھا ہے کہ ابھی عیدالفطر ہوئی اور اس کے کچھ ہی بعد ماہ فروردیں جو بہار کا مہینہ ہے شروع ہو رہا ہے۔

عرض ہے کہ یہاں ماہ فروردیں سے صرف بہار کا مہینہ مراد نہیں بلکہ ۱۲ مارچ ہے ایرانی شمسی مہینے فروردیں کا آغاز ہوتا ہے اور اس دن ایرانی سال نو کا جشن بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں جو تیرہ دن تک چلتا ہے۔ چونکہ یہ مہینہ سال نو کا آغاز بھی ہے لہذا یہ خوشی سے منسوب ہے جیسے شوال کا مہینہ خوشی سے تعبیر ہے۔

دوم یہ شعر:

پشتِ لب تہمتِ خط کھینچے ہے بے جا یعنی سبز ہے موجِ تبسم بہ ہوائے گفتار (۲۸)

اس کی تشریح میں لکھتے ہیں، چونکہ ایران میں کالا اور نیلا رنگ منحوس سمجھا جاتا ہے اس لیے ان رنگوں کی اشیا، کو سبز کہتے ہیں، چرخِ اخضر اور خطِ سبز کی یہی وجہ ہے۔ ہونٹوں کے اوپر خط کے بال کہنا ایک تہمت ہے۔ دراصل بولنے کی خواہش میں موج تبسم سبز ہو گئی ہے۔"

عرض ہے کہ کالا رنگ غم کی نشان دہی کرتا ہے منحوسیت کی نہیں۔ اسی لیے ماہ محرم میں سانحہ کربلا کی یاد میں کالا لباس زیب تن کرتے ہیں جو غم کی نشانی ہے نہ کہ منحوسیت کی۔ میں نے ایک ایرانی سے بھی اس کی تصدیق چاہی، انھوں نے بھی سیاہ رنگ کے لیے منحوسیت کی علامت سے انکار کیا۔

بحیثیت مجموعی غالب کا یہ غیر متداول کلام، تعقّل کی شعبدہ بازی اور چیستان زار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لق و دق خار زار کو سر کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہاں صبر و تحمّل اور قوتِ برداشت کی سخت ضرورت ہے۔

پروفیسر گیان چند کو اس بحرِ زخّار کی شناوری میں کیا کچھ پاپڑ نہیں بیلنے پڑے، اس کا اندازہ اس کتاب کے دیباچے سے لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ایک ایک لفظ، ایک ایک

فقرے اور ایک ایک اصطلاح پر گھنٹوں سر دُھنا ہے۔ شارحین کی شرح سے موازنہ بھی کیا ہے اور مختلف نُسخوں کو بھی کھنگالا ہے۔

انھوں نے اس اُلجھی ہوئی ڈور کو اس سلیقے سے سلجھایا ہے کہ کہیں کوئی گرہ باقی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس شرح کو سرخوش، آسی اور سندیلوی کی شرح کے مقابل رکھا جاتا ہے تو ان کی شرحیں اس کے آگے پانی بھرتی نظر آتی ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تأمل نہیں کہ اگر نسخۂ عرشی مولانا عرشی کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے تو پروفیسر گیان چند کی یہ کاوش اس عرق ریزی کی عرق ریزی ہے۔

بلاشبہ انھوں نے اس ساگر منتھن سے جو امرت نکالا ہے وہ غالب کے غیر متداول کلام کو حیاتِ جاوداں عطا کر گیا۔

آخر میں اتنا اور عرض کردوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس سے پہلی بار غالب ایوارڈ کی ابتداء ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں پروفیسر گیان چند کو تحقیق کے سلسلے میں "تفسیر غالب" پر غالب ایوارڈ سے نوازا گیا اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ سلیکشن کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے قاضی عبدالودود جیسے سخت گیر محقق نقّاد نے اسے قابلِ اعتناء سمجھا۔

حواشی

(۱) سلطان غلام محمد بہادر کو لکھتے ہیں "در دہ سالگی آثار موزونی طبع پیدائی گرفت (کلیات نثر پنج آہنگ ص۔ ۳۳۹۔)

(۲) قدر بلگرامی کو ۵۰ء میں تحریر کیا ہے "بارہ برس کی عمر سے کاغذ، نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔ باسٹھ برس کی عمر ہوئی ...... " (خطوط ا۔ ۱۰۰)
قدر بلگرامی کو دوبارہ ۶۸ء میں لکھتے ہیں "پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں، ساٹھ برس بکار۔ نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد" (خطوط ۔ ۱۹۸)

(۳) شاکر کو بھی یہی تخمینہ تحریر فرماتے ہیں "۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا" (عود۔ ۱۵۹)

(۴) یادگار غالب ص ۱۰۰۔

(۵) "در آغاز خار خار جگر کاوی شوقم بہ صرف نگارش اشعار اُردو زبان بودی" (کلیات فارسی، ۴۰۳)

(۶) نساخ کو لکھتے ہیں "خاکسار نے ابتدائی سن تمیز میں اُردو زبان میں سخن سرائی کی ہے (اُردوی معلّیٰ۔ ۲۰۳ و عود۔ ۱۲۵)

(۷) شاکر کو لکھتے ہیں ابتدائے فکر سخن میں ...... ریختہ لکھتا تھا۔ (عود۔ ۱۵۹)

(۸) نواب کو ایک فارسی خط میں لکھا ہے "در آغاز ریختہ گفتی و بہ اُردو زبان غزل سرای بودی" (کلیات نثر آہنگ: ۱۹۴)

(۹) اس کے حاشیے پر دو غزلیں ایسی درج ہیں جو مرزا نے باندہ (بندیل کھنڈ) سے بھیجی تھیں جو سفرِ کلکتہ کی ایک منزل تھی۔ ظاہر ہے یہ نسخہ سفر کلکتہ سے پہلے ہی مرتّب نہ ہو گیا ہوتا تو اس کے حاشیوں پر سفر کے دوران کہی گئی غزلیں نہ ہوتیں۔ اس کا زمانہ قیام قیاساً ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۶ء بتایا جاتا ہے

(۱۰) قلمی نسخے: نسخۂ بھوپال ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء، نسخۂ شیرانی ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء، گل رعنا ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء، نسخۂ رامپور ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۳ء، نسخۂ لاہور ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء اور نسخۂ رامپور جدید ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء

(۱۱) مطبوعہ نسخے: غالب کا پہلا مطبوعہ نسخہ جو مطبع سیّد الاخبار دہلی میں شائع ہوا۔ ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء، دوسرا ایڈیشن مطبع دارالسلام دہلی میں ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء کو شائع۔ تیسرا ایڈیشن

۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء ۰ چوتھا ایڈیشن ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۳ء مطبع نظامی کانپور، پانچواں ایڈیشن ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء ۰ چھٹا ایڈیشن نسخۂ حمیدیہ اور ساتواں ایڈیشن لطیف ایڈیشن (ڈاکٹر عبداللطیف حیدرآبادی)

(۱۲) خود نوشت دیوان سے مراد نسخۂ امروہہ (۱۲۳۱ھ ۰ ۱۸۱۶ء) یا نسخۂ غالب بخط غالب ہے جس کی تفصیل نقوش لاہور غالب نمبر (حصہ دوم) اکتوبر ۱۸۶۹ء میں دیکھی جا سکتی ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کے بہت سے اشعار جو مہمل معلوم ہوتے تھے نسخۂ امروہہ کے سامنے آجانے سے درست ہو گئے۔

۱۲ غزلیں حاشیوں پر اضافہ ہیں جو نسخۂ بھوپال کے متن یا حواشی میں نہیں ہیں۔

(۱۳) مکمل شرح کلام غالب " مولوی عبدالباری آسی، صدیق بک ڈپو، امین آباد لکھنؤ ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۲"

(۱۴) " باقیات غالب " وجاہت علی سندیلوی۔ ۱۹۶۰ء صفحہ ۳۲۔

(۱۵) مضمون " غالب کا صحیفۂ منسوخ (از مجموعۂ مضامین "حقائق ") پروفیسر گیان چند ۰ نیشنل آرٹ پریس الہ آباد۔ ۱۹۶۸ء صفحہ ۳۲۵۔

(۱۶) تفسیر غالب (دیباچہ) پروفیسر گیان چند ۰ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۱۔

(۱۷) تفسیر غالب صفحہ ۳۵۔

(۱۸) تفسیر غالب صفحہ ۹۹۔

(۱۹) مکمل شرح کلام غالب ۰ آسی، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ

(۲۰) تفسیر غالب صفحہ ۳۱۵۔

(۲۱) تفسیر غالب صفحہ ۱۸۲۔

(۲۲) مکمل شرح کلام غالب صفحہ ۳۰۱۔

(۲۳) تفسیر غالب صفحہ ۱۸۲۔

(۲۴) تفسیر غالب صفحہ ۶۹۔

(۲۵) تفسیر غالب صفحہ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔

(۲۶) تفسیر غالب صفحہ ۵۰۲۔

(۲۷) تفسیر غالب صفحہ ۲۰۔

سید محمد سلیم:

صفوۃ العرفان بمطالب آیات القرآن
(قلمی)

صفوۃ العرفان بمطالب آیات القرآن، عربی زبان میں مولانا محمد اسماعیل (م ۱۹۰۰ء شکارپور سندھ) کی ایک قابل قدر اور عظیم و ضخیم تصنیف ہے۔ تصنیف اور صاحب تصنیف کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا محمد اسماعیل کو علی گڑھ کے مختصر سے قیام کے دوران مولانا عبداللہ سورتی اور مولانا اسلم جیراج پوری کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا۔ اس سے ان کی عربی زبان اور لغت کے ذوق کو جلا مل گئی۔ وطن (سندھ) آکر وہ ساری زندگی اسی ذوق کی تکمیل کرتے رہے۔ قرآن مجید کی زبان، آیات کا مفہوم اور مطالب سمجھنے میں انھوں نے ساری عمر صرف کر دی۔ اس سلسلے میں لُغاتِ متداولہ کا مطالعہ کیا، صرفی لُغوی بحثوں کو سمجھا، مشکلات کو حل کیا، مستند تفاسیر کا مطالعہ کیا، ہر جہت سے اپنے مطالعے کی تکمیل میں کوشاں رہے۔

عمر کے آخری ایّام میں ان کو خیال آیا کہ حاصلِ مطالعہ کو کتاب کی صورت میں قلم بند کرنا چاہیے۔ اس لیے، انھوں نے "صفوۃ العرفان بمطالب آیات القرآن" تصنیف کی۔ دورانِ تسوید کئی مقام پر وہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ اُن کی عمر میں اتنی مہلت دے دے کہ وہ اِس کتاب کو مکمل کر سکیں۔ پھر بھی آخر کے دو حرف ("و" اور "ی") وہ صاف نہ کر پائے تھے کہ پیغام اجل آگیا۔

بصورت موجودہ، یہ لُغت کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ اس لیے اس کو لُغات القرآن کہنا زیادہ مناسب ہے۔ مگر عام طور پر لُغوی کو مفرد الفاظ کے معنی بیان کرنے سے دل چسپی ہوتی ہے۔ اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مؤلف کے پیش نظر مزید کئی امور ہیں۔ وہ الفاظ کی اصلیت تلاش کرتے ہیں، مثلاً: فردوس کی اصلیت فارسی لفظ پردیزہ ہے، برزخ کی اصلیت فارسی لفظ بردہ ہے، وغیرہ۔ عربی زبان میں صلات کے استعمال کے ساتھ مفہوم تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس لیے وہ اس لفظ کے استعمال کے تمام مقامات جمع کرتے ہیں اور مختلف صِلات کے ساتھ ان آیتوں کا مفہوم متعین کرتے ہیں۔ اس میں وہ خاصی محنت کرتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی کی لغات القرآن کا دائرہ اس کے مقابلے میں کم تر ہے ۔ زمخشری کی اساس البلاغہ کا البتہ یہ میدان ہے۔ مولف صفوۃ العرفان کتاب میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں۔

لفظ کو آیت میں قاریوں نے کس کس طرح پڑھا ہے ؟ وہ عشرہ قرءت کا حوالہ دیتے ہیں ۔ اس سے مختلف قرءتوں سے مفہوم اور مطالب کی توضیح یا تائید ہوتی ہے ۔ مضمون سے متعلق احادیث بھی درج کرتے ہیں ۔ اس لیے کہ بعض جگہ حدیث آیت کے مفہوم کو اچھی طرح بیان کرتی ہے ۔ ان کی ساری دل چسپی آیت کا مفہوم متعین کرنے سے اس اعتبار سے ہے کہ تفسیر ہے ۔ اور چونکہ لفظ کا مفہوم بیان کرتے ہیں ۔ اس اعتبار سے لُغت ہے ۔ چونکہ یہ کتاب لُغت کے انداز پر لکھی ہوئی ہے ۔ تفسیر کے انداز پر لکھی ہوئی نہیں ہے ۔ اس لیے اس کو لغت میں شمار کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے

اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ ، مصنّف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ، مصنّف کے فرزند حکیم عبداللہ مُومرہ کے پاس ہے ۔ میں نے ان سے اس کی عکسی نقل حاصل کی اور پھر اس کی اشاعت کے لیے کوشش کی ۔ متعدد اداروں اور افراد سے رابطہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا ۔ عربی کے ایک استاد اس میں قرءت اور لُغت اور احادیث کی تخریج کر رہے ہیں ، تاکہ اس کو پنجاب یونیورسٹی میں اپنی ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کریں ۔

احوال مصنّف :

مولانا محمد اسماعیل شکارپور سندھ کے رہنے والے اور مُومرہ قبیلے کے فرد تھے ۔ ان کے والد مولانا نبی بخش تھے ۔ ان کی والدہ مستونگ (بلوچستان) کے عالم مولانا محمدؐ صدیق پٹھان کی بھتیجی تھیں ۔ وہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں شکار پور میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد نبی بخش ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے تھے ۔ نبی بخش نے ابتدائی تعلیم مولانا عبدالغفور ہُمایونی کے مدرسے واقع ہُمایوں (شکار پور سندھ) میں پائی ۔ مزید تعلیم کے لیے پنجاب کا رخ کیا ، پھر پانی پت پہنچے ، وہاں مولوی راغب اللہ کے مدرسے میں قیام کیا ۔ تکمیل تعلیم کے بعد واپس شکار پور آگئے ۔ یہاں ۸۸ سال کی عمر میں ۱۹۵۴ء میں ان کا انتقال ہوا ۔ ان کے سات لڑکوں میں سے چھ لڑکے درس نظامی کے فارغ ہوئے ۔ سب نے اپنے والد سے تعلیم حاصل کی ۔ ساتواں لڑکا حافظ قرآن تھا ۔ متاخرین میں بہت کم علماء ایسے ملیں گے جنھوں نے اپنی اولاد کو خود تعلیم دی ہو اور تکمیل کرائی ہو ۔

مولوی نبی بخش کے فرزند اکبر مولانا محمد اسماعیل تھے۔ وہ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں

شکارپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی جہان خاں درّانی کے مدرسے میں حاصل کی۔ پھر اپنے والد مولوی نبی بخش سے درس نظامی کی تکمیل کی اور ۲۱ سال کی عمر میں سندھ کی مشہور بزرگ شخصیت مولانا تاج محمود امروٹی کے ہاتھوں دستار بندی ہوئی۔ سلسلۂ تلمذ یہ ہے:

مولانا محمد اسماعیل نے مولانا نبی بخش سے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے مولانا راغب اللہ پانی پتی سے تعلیم کی۔ انھوں نے قادری عبدالرحمٰن پانی پتی سے تعلیم حاصل کی۔ قاری صاحب نے شاہ محمد اسحاق دہلوی سے تعلیم حاصل کی۔ شاہ اسحاق نے شاہ عبدالعزیز سے تعلیم کی۔ شاہ عبدالعزیز نے شاہ ولی اللہ سے تعلیم کی۔ اُن کا سلسلہ مشہور و معروف ہے۔

حصولِ تعلیم کے لیے سفر کرنا مسلمانوں کی روایت ہے جو قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ سندھ میں تحریکِ خلافت کے روحِ رواں مولانا تاج محمود امروٹی نے، جو مولانا محمد اسماعیل کے والد کے مرشد تھے، انھیں ہندوستانی علما کے نام چند تعارفی خط لکھ کر دیے۔ مولانا محمد اسماعیل سب سے پہلے دارالعلوم علی گڑھ پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت تحریک کے زیرِ اثر یہاں مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۴ جنوری ۱۹۳۱ء) نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بالمقابل جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ قائم کی تھی۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے مبارک ہاتھوں سے اس جامعہ کا افتتاح ہوا تھا۔ وہ ابھی ابھی مالٹا کی اسیری سے رہا ہو کر آئے تھے۔ خواجہ عبدالمجید شیخ الجامعہ مقرر ہوئے تھے اور ملک کے نامور اہلِ علم مدرّس مقرّر ہوئے تھے۔

شعبۂ عربی میں مولانا محمد سورتی اور مولانا اسلم جیراجپوری جیسے متبحّر عالم مقرّر ہوئے تھے۔ مولانا محمد اسماعیل نے چھے ماہ اس جامعہ میں رہ کر ان بزرگوں سے اکتسابِ فیض کیا۔ عربی لُغت اور ادب کا ذوق مولانا محمد سورتی سے حاصل کیا اور تحقیقِ قرآن کا ذوق مولانا اسلم جیراجپوری سے حاصل کیا۔ پھر زندگی بھر وہ تحقیق اور اجتہاد کے دوگونہ جذبوں کے تحت کام کرتے رہے۔

وہ علی گڑھ سے سہارنپور مدرسۂ مظاہر العلوم میں آگئے۔ وہاں سے دارالعلوم دیوبند گئے۔ دیوبند میں چھے ماہ رہ کر وہاں کے علما سے استفادہ کیا جن میں مولانا انور شاہ کاشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی شامل تھے، پھر ندوۃ العلما، لکھنؤ گئے، وہاں سے دہلی آئے، مدرسہ امینیہ میں مفتی کفایت اللہ سے ملاقاتیں کیں اور دہلی کے آثارِ قدیمہ دیکھے۔ یہ علمی سفر دو سال جاری رہا۔ اس کے بعد واپس شکارپور آگئے۔ یہاں پہنچ کر گوٹھ حسن خاں میں سہراب خان سرکی کے مدرسے میں مُعلّمی قبول کرلی۔ ۸ سال تک مستقل مزاجی سے اس دیہاتی مدرسے میں تدریس کا کام کرتے رہے۔ بیسیوں طلبہ نے اس عرصے میں سندِ فراغ حاصل کی۔ اس کے بعد گوٹھ باران

خاں میں ایک مدرسہ قائم کیا اور چند سال وہاں تعلیم و تدریس کی مسند بچھائی۔ یہاں سے بھی دو طلبہ فارغ التحصیل ہوئے۔

۱۹۴۳ء میں مولانا واپس شکار پور آگئے۔ محلّہ خیر شاہ میں ایک مکان خرید کر قیام اختیار کیا اور تدریس کا سلسلہ جاری کر دیا۔ یہاں بھی متعدد طلبہ نے سند فراغ حاصل کی جن میں ۸ کے نام راقم کو معلوم ہیں۔ مولانا نے اپنی ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری۔ اضلاع جیکب آباد و شکارپور اور صوبۂ بلوچستان میں اُن کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد پھیلے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو صرف و نحو کی تعلیم دیے بغیر، قرآن مجید کا لفظی ترجمہ پڑھانے کا بھی ایک عجیب و غریب سلسلہ جاری کیا تھا کہ عمر رسیدہ لوگوں کو آیت کا ترجمہ ایک ایک لفظ پر انگلی رکھ کر پڑھاتے تھے۔ گھر میں عورتوں کو بھی اسی طرح ترجمہ سکھا دیتے تھے۔ بہت سوں نے اسی طرح پورا قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھ لیا تھا۔

۲۹ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۹۷۰ء کو یہ آفتاب علم و عرفان غروب ہوگیا۔

نجم الاسلام :

دیوانِ غمگین کے تعاقب میں

دیوان غمگین کا ایک مخطوطہ رام پور میں ہے جسے بصورت عکس محسن برلاس رامپوری مرحوم نے اپنے بزرگوں کی نشانی سمجھ کر، اپنے مقدّمے کے ساتھ ۱۹۹۴ء میں لاہور سے شائع کرایا تھا اور اسے اپنے جدّ اعلیٰ کے برادرِ بزرگ عبدالقادر غمگین رامپوری، صاحب وقائع عبدالقادر خانی سے منسوب کیا تھا۔ اس غلط انتساب کا جائزہ راقم الحروف نے ایک مضمون میں لیا جو رسالۂ تحقیق کے شمارۂ مشترکہ ہشتم و نہم میں شامل ہو کر چھپ چکا ہے۔ اس میں انتساب کے مسئلے کو بإخراج (Elimination) کے طریقے پر حل کیا گیا تھا، مراد یہ کہ ملکیّت کے تین دعویداروں یعنی غمگین تخلص کے تین شاعروں کی فہرست میں سے ایک ایک کر کے اُن دو غمگینوں کو خارج کیا گیا جو داخلی شہادتوں سے مطابقت نہ رکھتے تھے اور اُس باقی ماندہ غمگین کے حق میں ملکیّت کا دعویٰ تسلیم کیا گیا جو داخلی شہادتوں سے مطابقت رکھتا تھا، یعنی میر سیّد علی غمگین۔

اس کے بعد، اس نتیجے کے حق میں، جو ایک نوع کی ذہنی ورزش سے وجود میں آیا تھا، دو مجسم، موجود، طبعی شہادتیں ۱۹۹۰ء کے وسط میں سامنے آگئیں۔ ان میں سے ایک تو بلاشبہ حیرت انگیز طور پر سامنے آئی۔

حیدرآباد سندھ کے ایک مقامی کالج کے استاد، جو پُرانی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کو جمع کرنے کا ذوق رکھتے ہیں، اپنا ایک مخطوطہ لے کر مخدومی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے پاس پہنچے۔ اُس میں تخلص کے علاوہ مصنف کے نام کی صراحت کہیں نہیں تھی۔ اپنی ناسازیِ طبیعت اور ضُعفِ پیری کے سبب ڈاکٹر صاحب محترم نے اس مخطوطے کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے اور مصنّف کی شناخت کرنے سے معذرت چاہی، اور موصوف کو راقم الحروف کے پاس بھیج دیا۔ مخطوطے کی جستہ جستہ ورق گردانی کے دوران ہی راقم کو محسوس ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ میر سیّد علی غمگین کے دیوان کی ابتدائی شکل ہے۔ بالاستیعاب مطالعے سے اس کی توثیق ہو گئی۔ صاحبِ مخطوطہ نے کرم فرمایا اور ایک عکسی نقل اس مخطوطے کی عنایت فرما دی، بلکہ میری ترغیب و تشویق پر ایک مختصر تعارفی مضمون بھی لکھا جو غالباً ابھی تک کہیں چھپا نہیں

ہے، تاہم موصوف نے اس مضمون کی ایک عکسی نقل بھی میرے فائدے کے لیے عنایت فرما دی ہے۔

اب راقم کو دیوان غمگین کے اس مخطوطے کی تلاش ہوئی جو مرحوم افسر صدیقی امروہوی کے مطالعے میں آیا تھا اور جس سے اُخذ کر کے سعادت یار رنگین کی وفات کا قطعۂ تاریخ انھوں نے اپنی تالیف "تاریخ مسعود" میں نقل کیا تھا۔ اس قطعۂ تاریخ کے مأخذ کا ذکر راقم الحروف نے دیوان غمگین پر اپنے مطبوعہ مضمون کے آخر میں "پس نوشت" کے تحت کر دیا تھا۔ معمولی سی کوشش کے بعد یہ دیوان غمگین قلمی نیشنل میوزیم کراچی کے ذخیرۂ انجمن میں مل گیا اور اس کی عکسی نقل بھی حاصل ہو گئی۔ پہلا امکان یہی تھا کہ افسر مرحوم نے دیوان انجمن کے ذخیرے میں دیکھا ہو، کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ ضُعفِ پیری کے سبب سے برسہا برس اُن کی ساری علمی تگ و دو انجمن کے کتب خانۂ خاص میں اپنی میز کے ارد گرد تک محدود رہی۔ اس طرح میر سیّد علی غمگین کے دیوان کی تین ارتقائی شکلیں بصورت عکس ہمارے پیش نظر ہیں۔ جنھیں بہ لحاظِ ارتقا، نسخۂ اوّل، نسخۂ دوّم، نسخۂ سوّم کہہ سکتے ہیں یعنی ایک ہی دیوان کی تین ارتقائی شکلیں کہ ان میں کلام کچھ مشترک ہے اور بہت کچھ براحل بڑھتا گیا ہے۔ یہ صورت حال غیر معمولی ہے، اور تقابلی مطالعہ نتیجہ خیز اور سود مند ثابت ہوسکتا ہے۔ نسخۂ دوّم نسخۂ اوّل کے مقابلے میں، اور نسخۂ سوّم، نسخۂ دوّم (طبع لاہور) کے مقابلے میں بہتر اور برتر ہے۔ تینوں کو سامنے رکھ کر اور انجمن کے نسخے کو بنیاد بنا کر دیوانِ غمگین کی عمدہ طور پر تدوین کی جا سکتی ہے کیوں کہ انجمن کا نسخہ اس دیوان کی آخری ارتقائی شکل ہے جو سابقہ دو نسخوں کی طرح، مُصنّف کی زندگی میں، اُن کے تصرف یا اجازت و ایما سے تیار ہوئی ہے۔

(۲)

اب ذیل میں دیوان کی ان تینوں ارتقائی شکلوں کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ جنھیں ہم نے نسخۂ اوّل، نسخۂ دوّم، نسخۂ سوّم کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کیوں کہ "دیوان سابق" اور "دیوان دیگر" کی تصریح تو خود مُصنّف میر سیّد علی غمگین کی تحریر میں بھی ملتی ہے۔

نسخۂ اوّل:

یہ دیوان غمگین کی ابتدائی شکل ہے۔ جس کا مخطوطہ جناب حمید الدین شیخ مقیم

حیدرآباد سندھ کے پاس ہے۔ انھوں نے اپنے ایک غیر مطبوعہ مضمون میں، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اپنے اس مخطوطے کو بیاض قرار دیا ہے کیوں کہ ایک تو غزلوں کے ردیف وار اندراج میں کہیں کہیں تسلسل نہیں ہے، دوسرے بعض اشعار میں اصلاحیں بھی ہیں۔ مُصنّف میر سیّد علی غمگین نے اپنی ایک اور تصنیف "مکاشفات الاسرار" (مجموعۂ رباعیات) کے مقدمے میں اس دیوان کا ذکر، اپنے دیوان دیگر کے ساتھ یوں کیا ہے:

"در زمان سابق یک دیوانِ ریختہ گفتہ بودم و آن را دور کردم والحال کہ بہ شصت سالگی رسیدہ آنچہ کہ واردات و برمن غالب بودند و موافق آنہا دیوان دیگر در حالات و واردات و ذوق و شوق عشق حقیقی و مجازی خود ترتیب دادم و بعضے غزلیات مخصوصۂ دیوان سابق درین دیوان لاحق مندرج ساختم"۔

ہمارا قیاس ہے کہ جناب حمید الدین شیخ کا مخطوطہ وہی "دیوان سابق" یا دیوان اوّل ہے جسے، میر سیّد علی غمگین نے دور کر دیا تھا اور جس کی کچھ غزلیں اپنے دوسرے دیوان میں داخل کرنے کا ذکر عبارتِ منقولۂ بالا میں کیا ہے۔

اس میں ۲۱۸ غزلیں اور پانچ رباعیاں ہیں۔ غزلوں کے ردیف وار اندراج میں کہیں کہیں عدم تسلسل ہے جس کو صاحبِ مخطوطہ جناب حمید الدین شیخ نے اپنے غیر مطبوعہ مضمون میں بخوبی ظاہر کر دیا ہے۔ اس مخطوطے کے متن میں بعض اصلاحیں بھی موجود ہیں۔ مضمونِ مذکورۂ بالا میں ان کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔ اور خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ مخطوطہ جسے وہ بیاض قرار دیتے ہیں خود میر سیّد علی غمگین کے قلم سے ہے، اس لیے کہ بعض مصرعوں میں تبدیلی کئی بار کی ہے اور یہ سب متبادل مصرعے بھی اسی شانِ خط کے ساتھ ہیں جو مخطوطے کی ہے۔

نسخۂ دوم:

یہ وہی دیوان ہے جو لاہور سے بصورت عکس عبدالقادر غمگین رامپوری سے منسوب ہو کر شائع ہوچکا ہے۔ اس کی اصل رامپور میں ہے، اور جیسا کہ رامپور سے موصولہ ایک خط بنام راقم میں بتایا گیا ہے، ایک اسکالر اسے دیوان عبدالقادر غمگین کے بطور مرتّب کر رہے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ میر سیّد علی غمگین دہلوی کا دیوان ہے جو گوالیار میں بس گئے تھے۔

اس نسخے میں ۳۳۰ غزلیں ہیں۔ آخری غزل کے بعد "تمّت تمام شد" کی صراحت موجود ہے۔ غزلیات کے بعد بلاعنوان مفردات، ابیات و قطعاتِ تاریخ، چھے مخمسات، چھیاسی

رباعیات اور آخر میں دو مزید قطعاتِ تاریخ درج ہیں۔

نسخۂ سوم:

یہ انجمن کے ذخیرے کا قلمی نسخہ ہے۔ یہ دیوان کی تیسری اور آخری ارتقائی شکل ہے جسے نسخۂ دوم کے کلام میں اضافی کلام شامل کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ مخطوطے کا آغاز اس تصریحی فقرے سے ہوتا ہے

"فہرست دیوان جناب حضرت جی صاحب قبلہ
ردیف وار نوشتہ شد"

اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس دیوان کی ترتیب اور کتابت میر سید علی غمگین کی زندگی میں ان کے کسی معتقد کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ غمگین "حضرت جی" کے لقب سے ملقب تھے، اور آج تک اسی لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ ان کی خانقاہ گوالیار میں اب تک موجود ہے۔ یہ لقب یہاں تک رائج ہے کہ ان کے اخلاف اپنے ناموں کے ساتھ اس لقب کو بھی لاحق کرتے ہیں، مثلاً محمد رضا حضرت جی۔

اس تصریحی فقرے کے بعد "فہرست دیوان" درج ہے یعنی بطور فہرست ردیف وار غزلوں کے ۸۲۱ مطلعے دیے ہیں جو ۳۵ اوراق (۶۹ صفحات) پر پھیلے ہوئے ہیں۔ فہرست کے مطابق دیوانِ سوم میں شامل غزلوں کی تعداد ۸۲۱ ہے، آخر میں سات اردو مخمسات کے علاوہ عنوان "تاریخات" کے تحت اردو و فارسی قطعاتِ تاریخ بھی درج ہیں۔ نسخۂ رامپور میں ۷۳۳ غزلیات ہیں، مگر نسخۂ کراچی (نسخۂ انجمن) میں یہ تعداد بڑھ کر ۸۲۱ ہو گئی ہے۔ اسی طرح نسخۂ رامپور میں چھے اردو مخمسات درج ہیں، نسخۂ کراچی میں مزید ایک اردو مخمس ملتا ہے۔ مفرد اشعار اور رباعیات جو نسخۂ رام پور میں ہیں نسخۂ کراچی میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔ نسخۂ رامپور میں شامل متعدد مفرد اشعار پر غزلیں کہہ کر انھیں نسخۂ کراچی میں شامل کر لیا گیا ہے۔ قطعات تاریخی کے تحت نسخۂ کراچی میں جو اضافے ملتے ہیں وہ بھی توجہ طلب ہیں۔ نسخۂ رامپور میں دیوان کی تکمیل کی تاریخ شامل نہیں ہے، جب کہ نسخۂ کراچی میں "تاریخات" کے تحت سب سے پہلے وہی درج کی گئی ہے۔ اس قطعۂ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ دیوان کا نام "مخزن اسرار" ہے، گو کہ یہ اسم تاریخی نہیں کیوں کہ تاریخ پورے مصرعۂ تاریخ کے اعداد پر چار کے اضافے سے نکلتی ہے:

فکر میں تاریخ کی دیوان کے یوں کہا ہاتف نے کیوں بیزار ہے
از سر دیوان اے غمگین . ترا " آج دیواں مخزن اسرار ہے "
۴

۴ + ۱۲۴۹ = ۱۲۵۳ھ

ایسا ہی ایک اضافی قطعۂ تاریخ سعادت یار خاں رنگین کی وفات کا ہے جو شعر و شاعری میں غمگین کے استاد تھے ۔ غمگین کے بڑے بھائی شاہ نظام الدین احمد قادری مرہٹہ گردی کے زمانے میں دلی کے ناظم رہ چکے تھے ۔ غمگین نے حیدرآباد دکن سے واپسی پر گوالیار میں مستقل قیام اختیار کرلیا تھا ۔ اس مرہٹہ ریاست نے غمگین کی سرپرستی کی ۔ اس حوالے سے جو اضافی قطعات تاریخ ملتے ہیں ۔ اُن کے عنوانات یہ ہیں :

۱۔ " تاریخ وفات مہاراجہ عالیجاہ دولت راؤ سندھیا بہادر "
۲۔ " تاریخ جلوس جنکو راؤ سندھیا بہادر "
۳۔ " تاریخ تکیۂ خود کہ در زیر قلعہ تعمیر شد "
۴۔ " تاریخ باغیچہ کہ در تکیہ کنانیدہ بودم "
۵۔ " تاریخ وفات حکیم میر اسد علی خاں اوجینی در سرکار مہاراجہ عالیجاہ بہادر بسیار ممتاز بودند "
۶۔ " تاریخ وفات ہمت بہادر فوجدار دکنی در سرکار مہاراجہ عالیجاہ بہادر کہ از قدیم در رسالداراں کلاں بود " ۔
۷۔ تاریخ وفات مہاراجہ جنکو راؤ سندھیا بہادر ... "
۸۔ " تاریخ گرفتار شدن و بروں کردن از لشکر دادا خاصگی والہ را "
۹۔ " تاریخ شکست لشکر مہاراجہ جیاجی از صاحبان انگریز "

نسخۂ رامپور کے بعض قطعاتِ تاریخی کا ابہام نسخۂ کراچی میں مندرج تصریحات سے دور ہوجاتا ہے ۔ کسی احمد خاں کی وفات کا قطعہ نسخۂ رامپور میں بلا تصریح درج ہے ۔ نسخۂ کراچی میں قطعے سے پہلے شخصیت کے نام اور عہدے کی صراحت موجود ہے ۔ اسی طرح متعدد قطعات جو نسخۂ رامپور میں بلا صراحت درج ہیں ۔ نسخۂ کراچی میں تصریحی فقروں کے ساتھ آئے ہیں جن سے شخصیتوں کی شناخت ہوجاتی ہے ۔ نسخۂ کراچی کی انھی تصریحات کے باعث گوالیار میں میر سید علی غمگین کے بعض رفیقوں کی نشاندہی بھی ہوجاتی ہے جن کی وفات کے قطعات لکھے ہیں ۔

ڈاکٹر قمر جہاں مرزا

تالپور والیانِ سندھ اور
ان کے ورثاء کا کتاب خانہ

سندھ میں تالپور حکومت کی ابتداء ۱۷۸۳ء میں میر فتح علی خاں تالپور سے ہوئی۔ وہ نہ صرف ایک بہادر سردار تھے بلکہ علم و ادب اور شعر و سخن سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ ان کی علم دوستی کی وجہ سے، ان کے دربار میں علم و ادب کا چرچا رہتا تھا۔ اندرون ملک کے تمام ممتاز ادیب ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ بیرون ملک سے بھی کئی اہل قلم کھنچ کر ان کے دربار میں پہنچے۔ یہی ذوق تھا جس کے سبب سے ان کے ذاتی کتب خانے میں ہر موضوع پر کتب کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ ان کے دربار میں شاہنامۂ فردوسی اکثر پڑھا جاتا تھا۔ (۱)

میر فتح علی خاں کے انتقال کے بعد، ان کے بھائی میر غلام علی خاں ۱۸۱۲ء میں، میر کرم علی خاں ۱۸۱۶ء میں، میر مراد علی خاں ۱۸۲۸ء میں یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ یوں یہ سلسلہ خاندانی روایت اور حکومتی قواعد کے تحت چلتا رہا۔ (۲)، تاآنکہ ۱۸۴۳ء میں کچھ باہمی اختلافات اور کچھ انگریزوں کی بدنیتی سے تالپوروں کا دور حکومت ختم ہوگیا۔

اس ساٹھ سالہ دور حکومت میں سندھ کو خاصی ترقی ملی۔ لوگ پُرامن اور خوشحال زندگی گذارتے تھے۔ حکمرانوں کی توجہ اور دل چسپی کے باعث تعلیم و تربیت اور علم و ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ خود حکمرانوں میں میر کرم علی خاں کرمؔ، میر مراد علی خاں علیؔ، میر صوبدار خاں میرؔ، میر نصیر خاں جعفریؔ، میر حسین علی خاں حسینؔ، میر حسن علی خاں حسنؔ، میر عباس علی خاں مومنؔ، میر شہداد خاں حیدریؔ، میر محمد علی خاں بہروَرؔ (بہرہ ور)، میر عبدالحسین خاں سانگیؔ بڑے بڑے ممتاز شاعر تھے۔

ان میں اکثر صاحب دیوان تھے۔ یہ تمام مسودات، مخطوطات، تالپور حکمرانوں کی دیگر اشیاء، شاہی، خاندان کے ذاتی استعمال کی اشیاء اور مخطوطات آج بھی ان کے ورثاء کے قائم کردہ

ایک چھوٹے سے عجائب گھر واقع ٹنڈو میر نور محمد (لطیف آباد نمبر ۴، حیدرآباد سندھ) میں موجود ہیں۔ ان اشیاء میں قابل ذکر ان کا فرنیچر ہے جو خصوصی طور پر شاہی ہنرمندوں نے بنایا تھا۔ متعدد طلائی تمغے ہیں جو دیگر ممالک کے فرماں رواؤں سے تحفتہً ملے تھے۔ (۳)

کتب خانے کی کتب اور مسودات / مخطوطات میں سب سے اہم قرآن حکیم کا وہ قلمی نسخہ ہے جو ہرن کی کھال پر تحریر ہے اور جس کے متعلق ایک روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا تحریر کیا ہوا ہے۔ یہ کوفی خط میں خطاطی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ کئی دیگر اہم نسخے بھی کتاب خانے میں موجود ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ قرآن مجید کلاں:

اس قرآن پاک کے کاتب کا نام سید محمد جعفر ابن سید محمد باقر الحسینی ہے۔ تاریخ کتابت ماہ شعبان ۱۱۶۳ھ ہے۔

۲۔ قرآن مجید با معنی:

کاتب: خواجہ مرتضیٰ علوی الہروی

۳۔ قرآن مجید با معنی:

کاتب: مرزا کوچک متخلص بہ وصال شیرازی۔ ۱۲۴۰ھ۔ یہ کلام پاک میر کرم علی خاں کو شاہ ایران نے تحفتہً بھیجا تھا۔

۴۔ قرآن مجید کلاں:

کاتب: سید علی بن حسن شیرازی۔ سنہ کتابت ۱۲۵۰ھ۔

۵۔ قرآن پاک مع تفسیر

کاتب: حافظ محمد

قرآن حکیم کے علاوہ دیگر قابل ذکر کتب یہ ہیں:۔

تفسیر، حدیث اور تاریخی کتب:

۱۔ تفسیر جواہر البحر "مکتوبہ ۱۰۳۴ھ"۔

۲۔ تفسیر خلاصۃ المناہج "۔ اس نسخے پر مغل فرماں روا شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے

دستخط موجود ہیں ۱۰۸۰ھ

۴۔ "تفسیر حسینی" ۱۱۰۰ھ۔

۵۔ "تفسیر کبیر۔

۶۔ نہج البلاغہ حضرت علی علیہ السلام" ۱۰۰۰ھ

۷۔ صحیفۂ سجادیہ ۱۰۱۰ھ۔

۸۔ غنیۃ الطالبین ۱۱۹۰ھ

۹۔ صحیح مُسلم (عربی)

۱۰۔ صحیح البخاری (عربی)

۱۱۔ صواعق محرقہ

۱۲۔ بحار الانوار

۱۳۔ معارج النبوہ

۱۴۔ تاریخ فرشتہ

۱۵۔ طبری

۱۶۔ توزک تیموری

۱۷۔ ظفر نامۂ تیمور گورگانی

۱۸۔ اکبر نامہ

۱۹۔ آئین اکبری

۲۰۔ اقبال نامۂ جہاں گیری

۲۱۔ فتوحات صاحب قران مصور

۲۲۔ دہ سالۂ عالم گیری

۲۳۔ وقائع بادشاہان (گلبرگہ)

۲۴۔ مرآۃ سکندری

۲۵۔ بادشاہ نامہ

کتب ادب۔ یہ کتب مصور، منقش اور خوش خط ہیں۔

۲۶۔ شاہنامۂ فردوسی۔ اس شاہنامے کے آخری صفحے پر یہ عبارت تحریر ہے۔

- شاہ نامۂ فردوسی بہ خطّ ولایت بقلم بہزاد مصوّر تصویرات چہل دسہ مجلس مع سر لوح کہ شاہ عبّاس بادشاہِ ایران بہ ایلچی بادشاہ ہندوستان وقت رخصت عطا فرمودہ ۔ قیمت پانصد تومان ولایت انجام کہ تاریخ ہجری بہ ہشت صد و بست و نہ رسید ۸۲۹ھ۔

۲۷۔ کلّیات جامی دو جلد ۸۸۲ھ اس کلّیات پر شاہجہاں اور اورنگ زیب کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں۔

۲۸۔ گلستان سعدی با تصویر ۹۶۹۰ھ۔

۲۹۔ دیوان حافظ با تصویر ۹۷۰ھ

۳۰۔ رامائن مصوّر (پہلے صفحے پر شہنشاہ جہانگیر کی رنگین تصویر ہے

۳۱۔ سلسلۃ الذہب جامی ۹۶۲۰ھ۔

۳۲۔ حدیقۃ الحقائق مصور ۱۰۱۲ھ

۳۳۔ مثنوی مولانائے روم ۱۰۹۸ھ۔

۳۴۔ لیلیٰ مجنون

۳۵۔ خسرو شیریں

۳۶۔ ہفت پیکر

۳۷۔ سکندر نامہ مصور

تذکرے :-

۱۔ تذکرۂ شعرائے فارسی

۲۔ آتش کدۂ لطف علی آذر

۳۔ تذکرۂ حسینی

۴۔ ریاض الشعراء

۵۔ تذکرۂ غلام علی بلگرامی

۶۔ محک خسروی

۷۔ محک محسن

۸۔ محک فخری۔

۹۔ مقالات الشعراء

۱۰۔ تکملہ مقالات الشعراء

دواوین فارسی و اردو۔

۱۔ دیوان خاقان

۲۔ دیوان صبا

۳۔ دیوان قاسمی

۴۔ دیوان ظہوری

۵۔ دیوان نظیری

۶۔ دیوان وصال

۷۔ دیوان فرخی

۸۔ دیوان آذری

۹۔ دیوان جامیؒ

۱۰۔ دیوان صائب

۱۱۔ دیوان امیر خسرو

۱۲۔ دیوان بیدل

۱۳۔ دیوان غالب

۱۴۔ دیوان حسن دہلوی

۱۵۔ دیوان جرأَت

۱۶۔ دیوان انوری

۱۷۔ دیوان پیام

۱۸۔ دیوان میر

۱۹۔ دیوان سودا

۲۰۔ دیوان انشا

۲۱۔ دیوان عطار

۲۲۔ دیوان نیازی

۲۳۔ دیوان طالب

۲۴۔ دیوان کلیم

۲۵۔ دیوان نعمت خان عالی

۲۶۔ دیوان فیضی

۲۷۔ دیوان جویا

۲۸۔ دیوان ناظم (۴)

سندھ کے شعراء اور نثر نگاروں کی کتب:۔

۱۔ چچ نامہ

۲۔ تواریخ معصومی

۳۔ تواریخ طاہری

۴۔ تاریخ سندھ قاسم شاہ

۵۔ بیگلر نامہ

۶۔ تحفۃ الکرام

۷۔ تاریخ بلوچی مصنفہ عبدالمجید مجیدی جوکھیو۔

۸۔ کلہوڑا نامہ سید ثابت علی شاہ فارسی نظم میں

۹۔ تذکرۂ نغز (نامۂ نغز) مصنفہ باغ علی فارسی نظم میں۔ کلہوڑوں کے بارے میں

۱۰۔ حملۂ حسینی مصورہ محمد محسن ٹھٹوی

۱۱۔ دیوان محسن ٹھٹوی

۱۲۔ مختار نامہ علی شیر قانع ٹھٹوی

۱۳۔ فتح نامۂ سندھ عظیم ٹھٹوی

اور بھی کتابیں اور دواوین کتاب خانے میں ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

قصائد و غزلیات:۔

۱۔ بدر چاچی۔ اس شاعر کے قصائد محمد تغلق سے متعلق ہیں۔ یہ مخطوطہ سنہ ... ہجری میں لکھا گیا ہے۔ نسخہ بہت بوسیدہ ہوچکا ہے۔

۲۔ دیوان سرفراز عبّاسی فارسی۔ اس دیوان کی کتابت میاں محمد عالم ابن محمد پناہ نے ۱۱۸۰ھ میں کی۔ دیوان کے پہلے صفحے پر میاں غلام شاہ کلہوڑو کی اس شادی کا ذکر ہے جو انھوں نے کچھ کے راجا کی بیٹی کے ساتھ کی تھی۔ اس کے بعد میاں غلام شاہ کی وفات کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

گشت از فضلِ ایزدِ داور روی گیتی چو آسماں انور
شاہِ دوراں غلامِ شاہِ نجف مظہرِ لطفِ ایزدِ داور
حضرتِ داد گر میاں صاحب آں شہِ پاک زاد پاک گہر
راجۂ کچھ کہ ہمچو او در جاہ نبود ہیچ راجۂ دیگر
ڈول آمد چو از نواحیِ کچھ بہزار احترام و صد مفخر
چوں شب بست و ہشت از شعبان بود این شادیِ خجستہ تر
لا جرم گشت سالِ تاریخش "بہ بود این قران شمس و قمر" (۱۱۶۹ھ)

(مصرعۂ تاریخ سے ۱۱۶۰ھ بر آمد ہوتے ہیں۔ گو کہ ہندسوں میں ۱۱۶۹ھ درج ہے۔)

دیوان سرفراز عباسی ٹنڈو میر نور محمد کے کتاب خانے میں موجود ہے۔

تالپور امیروں کی تصنیفات۔

میر فتح علی خاں فاتح سندھ خود شاعر یا ادیب نہیں تھے مگر سخن فہم اور شاعروں کے قدر دان تھے۔ انھوں نے اپنے دور میں بہت سی کتابیں لکھوائیں۔ ان کا بہت اچھا کتاب خانہ تھا۔

میر غلام علی خاں، میر فتح علی خاں کے بھائی تھے۔ اُمورِ حکومت میں شامل تھے۔ میر فتح علی خاں کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے۔ یہ بھی سخن فہم اور علما، کے قدردان تھے۔ ان کے دور میں بھی متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔ کتاب خانے میں متعدد کتابیں ایسی ہیں جن پر ان کا نام درج ہے۔ وفات ۱۲۲۰ھ میں ہوئی۔

ان کے بعد، ان کے بھائی میر کرم علی خاں تخت نشین ہوئے۔ میر صاحب حافظ قرآن تھے اور شاعر تھے۔ اس خاندان کی شاعری کا آغاز میر کرم علی خاں سے ہوا۔ یہ تالپور امیروں میں پہلے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے دربار میں اہلِ علم اور باکمال شعرا، کی بڑی

تعداد موجود رہتی تھی (۵)

میر کرم علی خاں کا " دیوانِ کرم " فارسی شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ٹنڈو میر نور محمد کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ دیوان کے دیباچے میں اپنے خواب کا ذکر ان اشعار میں کیا ہے۔

یک شب اندر خواب بودم سربہ بالین قرار
دیدۂ دل محو حیرت در خیالِ روی یار
ناگہاں آمد ندائے ہاتفے در گوشِ من
گفت اے مدّاح شاہِ دیں امیرِ شہریار
شاہِ دیں شیرِ خدا ابنِ عمِ خیر الوریٰ
آں وصیِ مصطفیٰ و نائب پروردگار
واقفِ علمِ لدنّی ، محرمِ اسرارِ حق
صاحبِ سیف و علم ، شاہنشہِ دُلدُل سوار (۶)

اس خواب سے میر صاحب نے شاعری کا آغاز کیا۔ میر صاحب اردو زبان میں بھی شاعری کرتے تھے۔ ایک قلمی مسوّدے موسومہ " انتخابِ لاجواب " میں ان کے اردو اشعار کچھ اس طرح ہیں۔(۷)

صبح دم (یاد) مجھے چاکِ گریباں آیا
پھر تصوّر میں مرے وہ رُخِ تاباں آیا
سیرِ گلشن میں نظر میری پڑی غنچوں پر
دل میں پھر میرے خیالِ لبِ خنداں آیا

میر کرم علی خاں کے بعد ، اس حکمراں خاندان کے دوسرے شاعر میر مراد علی خاں علی تخلص تھے۔ آپ کی دو تصنیفات ہیں ۔ ایک دیوان علی فارسی (۷) دوسری طب مراد فارسی ۔ آپ کے اردو کلام کے نمونے بھی دستیاب ہیں

میر صوبدار خاں میر تخلص اس شاہی خاندان کا تیسرا شاعر تھا۔ تصنیفات جن کے مخطوطات کتاب خانے میں موجود ہیں، یہ ہیں

۱۔ دیوان میر فارسی ۱۲۴۰ھ

۲۔ مثنوی فتح نامۂ سندھ فارسی ۱۲۳۴ھ

۳۔ مثنوی سیف الملوک فارسی ۱۲۴۰ھ

۴۔ مثنوی خسرو شیریں فارسی ۱۲۵۱ھ

۵۔ مثنوی قصۂ ماہ و مشتری فارسی ۱۲۵۲ھ

۶۔ مثنوی جدائی نامہ فارسی ۱۲۶۰ھ

ان سبھی مخطوطات کی کتابت، کاتب صیانت اللہ نے کی

میر صاحب کا فارسی دیوان نظر سے گذرا جس کے دیباچے میں صراحت کرتے ہیں کہ میرے تین دیوان کھو گئے ہیں۔ آپ نے اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نمونے دستیاب ہیں۔ سندھی زبان میں بھی خاصے اشعار کہے ہیں۔

میر نصیر خاں متخلص بہ جعفری، آخری فرماں روائے سندھ، جو میر مراد علی خاں کے چھوٹے صاحب زادے تھے، فارسی تصانیف کے علاوہ اردو، سندھی، سرائیکی میں بھی کلام کے نمونے دستیاب ہیں۔ تصانیف جن کے مخطوطات موجود ہیں، یہ ہیں:

۱۔ دیوان فارسی، مکتوبہ ۱۲۳۳ھ

۲۔ مثنوی مرزا صاحبان فارسی، مکتوبہ ۱۲۲۵ھ، نقاشی از میر حسین شیرازی

۳۔ مثنوی مختار نامہ فارسی، مصوّر نسخہ مکتوبہ ۱۲۴۱ھ، نقاشی از میر حسین شیرازی

۴۔ سفر نامۂ جعفری، فارسی، منظوم ۱۲۶۰ھ

۵۔ دیوان جعفری اردو ۱۲۶۱ھ

۶۔ مکاتیب جعفری فارسی

میر حسین علی خاں متخلص بہ حسین اس خاندان کے چھٹے شاعر تھے۔ فارسی ادب کے علاوہ اردو اور سندھی ادب سے بھی گہری وابستگی تھی۔ آپ کی متعدد تصنیفات تالپوروں کے کتاب خانے واقع ٹنڈو نور محمد میں موجود ہیں:

۱۔ "مناقب علوی" فارسی نثر میں

۲۔ "شاہد الامامۃ"۔ فارسی نثر میں

۳۔ "لب لباب" فارسی نثر میں

۴۔ دیوان فارسی و اردو

۵۔ دیوان اردو مصور

میر یار محمد خاں تالپور ابن مراد علی خاں اس خاندان کے ساتویں فارسی اہل قلم تھے ان کا "فرنیر نامہ" فارسی نثر میں ہے۔ اس کا قلمی نسخہ تالپوروں کے کتاب خانے میں موجود ہے۔

میر محمد علی خاں تالپور اس خاندان کے آٹھویں شاعر تھے۔ یہ میر صوبدار خاں کے بیٹے تھے۔ ان کا تخلص "بہرور" (بہرہ ور) تھا۔ فارسی، اردو، سندھی میں شعر کہتے تھے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کی ایک مثنوی "قصۂ رزم شیر" بہت مشہور ہوئی جو ۱۱۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے چند ابیات نقل کیے جاتے ہیں جن مثنوی کے نام، تاریخ تصنیف اور شاعر کے نام و تخلص کی صراحت موجود ہے:

کہ این رزم شیر ثریاں رُخ نمود	بتاریخ شش ماہ ذیقعد بود
ہزار و دو صد بود ہشتاد ویک	پس از ہجرتِ شاہِ انس و ملک
چو این قصۂ نغز انجام یافت	ز درگاہِ داور دلم کام یافت
اگرچہ بود اولین شعرِ من	ولے بشگفاندم چوں جنت چمن
نماند ہمیں نسخہ در دہر	ز میر محمد علی بہرور

میر حسن علی خاں تالپور متخلص بہ حسن اس خاندان کے نویں شاعر اور نثر نویس تھے۔ یہ میر نصیر خاں والی سندھ کے صاحب زادے تھے۔ مرثیہ گوئی میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ تصنیفات یہ ہیں:

۱۔ لسان الحق فی میزان الصدق، فارسی نثر میں، ۱۳۰۸ھ میں مطبع سلطانی لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب پادری سی جی فاؤنڈر کی کتاب میزان الحق کا جواب ہے جو ۱۸۶۲ء میں لندن سے شائع ہوا۔

۲۔ مختار نامہ ثقفی، سندھی نظم میں، جلد اول ۱۸۹۲ء میں جلد دوم ۱۸۹۵ء بے نظیر پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

۳۔ رویائے صادقہ، فارسی نثر اور نظم میں، جلد اول مطبع دبدبہ حیدری کراچی اور دوسری جلد مطبع اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور میں ۱۳۲۲ھ میں طبع ہوئی۔ میر صاحب نے جو خواب دیکھے ان کی تفصیل دی ہے۔

۴۔ نہر البکا، ۱۳۲۶ھ میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور میں طبع ہوئی۔ اس میں شہدائے کربلا کی خدمت میں سلام کہے ہیں۔

۵۔ مثنوی فتح نامۂ سندھ، سندھی میں لکھی ہوئی، ۱۹۳۸ء

۶۔ احسن البیان ۔ اردو نثر میں ۔ یہ کتاب پادری عماد الدین پانی پتی کے رسالے "تحقیق الایمان" کا جواب ہے۔

۷۔ رد خوارج ۔ سندھی میں ۔ میر محمد علی خاں ساکن ٹنڈو محمد خاں کے ۳۲ سوالوں کا جواب ہے، جو انھوں نے "عزاداری" کے سلسلے میں میر صاحب سے کیے ہیں۔

۸۔ مجموعۂ خطوط فارسی ۔ پادری جی سی فاونڈر نے میر صاحب کو خطوط لکھے تھے۔ ان خطوط کو میر صاحب نے تاریخ وار جوابوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

۹۔ شکاریات، دو جلد، میر صاحب جہاں بھی شکار کے لیے گئے، اس کی تفصیل تاریخ وار لکھی ہے۔

۱۰۔ مثنوی حملۂ حیدری یا شہنشاہ نامہ ۔ سندھی ۔ اس کتاب میں حضرت علی علیہ السلام کی جنگوں کا بیان ہے۔

۱۱۔ بیاض مناجات و منقبت

۱۲۔ بیاض قصائد چہار دہ معصومین

۱۳۔ کلیاتِ مرثیہ

یہ سب قلمی اور مطبوعہ کتابیں ٹنڈو میر نور محمد کے کتاب خانے میں موجود ہیں۔

میر عباس علی خاں متخلص بہ مومن اس خاندان کے دسویں شاعر تھے۔ یہ والیِ سندھ میر نصیر خاں کے صاحب زادے تھے۔ مخدوم ابراہیم خلیل تکملۂ مقالات الشعرا میں لکھتے ہیں کہ "دیوان مومن فارسی در ذخیرۂ پسرش میر عبدالحسین خاں بود۔ ولے آں ہمہ ذخیرہ بعد از وفات میر عبدالحسین خاں برباد رفت، معلوم نہ شد کہ آں دیوان چہ شد۔" (ص ۴۰۰)

میر صاحب کا دیوان (دیوان مومن) تو ٹنڈو میر نور محمد والے کتاب خانے میں کہیں نظر نہ آیا مگر آپ کی ایک مثنوی ایک بیاض سے ملی جس میں کل ۹۰ اشعار ہیں۔ چند بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:

بنام الٰہی کہ گرداں سپہر | بر افراخت و افروخت ناہید و مہر

فروزندۂ ماہتاب بلند | بر آرندۂ حاجتِ دردمند

زمین و فلک را بلندی ازو ست | ازو ہست ما را تن وجان و پوست

[دیوان مومن فارسی کا ایک قلمی نسخہ ایران کے کتاب خانۂ مرکزی دانش گاہ تہران میں جا پہنچا ہے جس کی اطلاع ڈاکٹر سید حسن عباس کے مقالے " ایران میں اردو مخطوطات " مشمولۂ رسالۂ تحقیق، شعبۂ اردو ، سندھ یونیورسٹی ، شمارۂ پنجم ، ۱۹۹۱ء میں ملتی ہے۔ اس فارسی دیوان میں تین اردو غزلیں بھی ہیں۔ اسی سبب سے مقالے میں اس فارسی دیوان کا ذکر آیا ہے۔ مدیر]

میر عبدالحسین خاں متخلص بہ سانگی اس خاندان کے آخری شاعر ، عالم ، ادیب تھے۔ یہ میر عباس علی خاں مومن کے صاحب زادے تھے۔ سانگی سندھی شاعری میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک نغز گو شاعر تھے۔ ان کے پاس نہ صرف یہ کہ سندھی غزلوں کا سرمایہ اوروں سے زیادہ ہے بلکہ انھوں نے عاشقانہ مزاج ، وسیع تجربے، اور انداز بیان کی خوبی سے سندھی غزل میں رنگینی اور چاشنی بھر دی ۔ انھیں اردو ، سندھی ، فارسی ، سرائیکی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں

۱۔ دیوان سانگی جلد اوّل ، ۱۹۰۳ء میں جلد اول طبع ہوئی
۲۔ دیوان سانگی جلد دوّم ، ۱۹۰۴ء میں جلد دوم طبع ہوئی
۳۔ دیوان سانگی جلد سوّم ، قلمی ، مخزونہ کتاب خانۂ ٹنڈو میر نور محمد ۔
۴۔ لطائف لطیفی، قلمی مخزونہ کتاب خانۂ مذکورۂ بالا
۵۔ بیاض سانگی ، قلمی مخزونہ کتاب خانۂ مذکورۂ بالا
۶۔ ایک لاجواب فارسی مثنوی ، قلمی مخزونہ کتاب خانۂ مذکورۂ بالا۔

مشہور محقق ، عالم ، ادیب ، ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے بہت محنت کر کے سانگی کے جملہ کلام کو سمیٹ کر ایک کلیات موسومہ " کلیات سانگی " مرتب کیا جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوچکا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو سانگی کا تیسرا دیوان (یا جلد سوّم) قلمی میر علی احمد تالپور کے یہاں دیکھنے کو ملا تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے مقدمے میں کیا ہے۔

حواشی

(1) james Burnes: "A Narrative of a visit to the Court of Sind"

(2) Ibid, p

(۳) مقالہ نگار کا ذاتی مشاہدہ

(۴) یہ سب دواوین مذکورہ، ٹنڈو میر نور محمد کے کتاب خانے میں موجود ہیں۔

(۵) ابراہیم خلیل، تکملۂ مقالات الشعراء، کراچی، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۵۸ء، ص ۲۸۔

(۶) دیوان کرم قلمی مخزونہ کتاب خانۂ ٹنڈو میر نور محمد۔

(۷) "انتخاب لاجواب" از میر کرم علی۔ قلمی مخزونہ کتاب خانۂ مذکورۂ بالا

ڈاکٹر نجم الاسلام

جام شورو کے مخطوطات سے متعلق چند یادداشتیں

۱۔ سندھی ادبی بورڈ کے اردو مخطوطات:۔

نمبر شمار	۲۹۹	پنچھی باچا	(۲۹۰)
نمبر شمار	۳۰۰	دیوان ولی دکنی	(۹۴)
نمبر شمار	۳۰۱	صادق التواریخ	(۴۰)

۲۔ سندھی ادبی بورڈ کے اردو آمیز مخطوطات:۔

۱۔ نمبر ۱۲۹ بیاض محمد معین۔

(موسوم کلیات میر فتح علی خاں تالپور بعہد ۱۲۱۶۔ ۱۱۹۸۔)۔ آخری باب ۴۸۳ بعض ابیات ہندی مذکورہ فہرست مشمولات۔ لیکن یہ باب غائب ہے)

۲۔ نمبر ۹۲ دیوان صاحب۔ غزل ریختہ (FDLA) پانچ شعر میں فر (پھر) موجود رہتا ہوں دنیا کا درد سہتا ہوں سدا دن رین کہتا ہوں کہ آخر خاک ہو جاناں

۳۔ نمبر ۱ بیاض مائل۔ سلام از مائل ع ای صاجا درمدینہ مصطفےٰ کوں کہ سلام ۲۱ب تا ۲۲۔ الف

قائل ع رسول خدا پہ ہزاروں سلام ۳۸ ب تا ۳۹۔ ب

مرثیہ مربع از مائل ثابت علی شاہ ع سر ہو سانپر و جگر و دل سین ان اپنے ؟ چار شعر ۵۰ الف تا ۵۰ ب مرثیہ عظیم ع واسے مدینہ چھوڑ چلا ہائے ہائے ہائے۔ ۷۰۔ الف تا ۷۱۔ الف

مرثیہ عظیم ع شہ مدینے سے سردھارا آہ واویلا حسین ۷۲۔ ب تا ۷۳۔ الف

مرثیہ مائل ع پھر ہوا ہے مہ عزائے حسین ۷۸۔ ب تا ۷۹۔ ب

۴۔ نمبر ۳ بیاض مائل (دیگر) متفرق اشعار: ابوتراب کامل۔ مخمس درمنقبت حضرت علی ع یا علی میں غلام تیرا ہوں ۳۳۔ ب تا ۳۹۔ ب

۵۔ نمبر ۱۹ بیاض مائل (دیگر) اردو مرثیہ از صابر ع مہمان کربلا ہے ہے ہے حسین میرا۔ دس شعر۔ ورق ۲۔ ب
عظیم ع جب مدینے سوں چلا ہے شور گھر گھر یا حسین ۱۱۔ الف۔ ب
عظیم ع آج جگ میں ظلم کا بنیاد ہے ۱۱۔ الف۔ ب
ع محرم چاند نکلا ہے جگت کے دل جلانے کوں۔ ۱۱۔ ب تا ۱۲۔ الف
ع رو کہی حضرت بتول ہائے پیاسا ہے حسین۔ ۱۲۔ الف۔ ب
ع فریادے رو کے حضرت زہرا بر حسین ۱۲۔ ب تا ۱۳۔ الف
مائل ع اے صبا جا در مدینہ مصطفا کوں کہہ سلام ۱۲ ب تا ۱۵ الف
ع حق نے ۔۔ از چمن حسین ۱۷۔ ب تا ۱۸۔ الف
ع سب مصطفا کے پیارے ہیں کربلا سدھارے۔۔۔
ع والی مدنیا چھوڑ چلا ہائے ہائے ۱۸۔ ب تا ۱۹۔ الف
عزلت ع آج جگ میں ہے اندہارا آہ واویلا حسین ۱۹۔ الف۔ ب
شاہ صالح ع ہے شہ کا غم ہے افسوس ۱۹۔ ب
عظیم ع یا شاہ نجف اپنے یتیموں کی خبر لے ۲۲۔ ب
عظیم ع نبی کا گھر ہوا خالی سدھارے شاہ واویلا ۲۲۔ ب تا ۲۳۔ الف
عظیم ع شاہ زمیں زمن کے ہیں مہمان کربلا۔ ۲۳۔ ب
کربلا میں آج شہ مہمان ہے۔ ۲۳۔ ب تا ۲۴۔ الگ

اردو سلام ع سر گروہ مرسلین اوپر سلام۔ ۲۹۔ الف۔ ب (اختتام: کہ ولی اس مہ جبین اوپر سلام)

۶۔ نمبر ۲۰۱ حدیقہ غلبا (بیاض قانع بخط قانع): اردو شعر:
کامل کے ۱۵ شعر۔ فضائل علی خاں ۲ شعر۔ کامل کے مزید دو شعر۔ محمد شاہ بادشاہ نادر تخلص کا ایک شعر اور ایک فرد۔ ورق ۱۳۰۔ الف

۷۔ نمبر ۲۱ بیاض بخط ضیا۔ اردو غزل از ضیا۔ ع مرے دل میں وہ دلبر یاد ہے مجھ
اردو غزل از ضیا۔ ع دیکھ کر رخ کوں ایظالم چھپاوگے تو کیا ہو گا۔ ورق ۷۔ الف
سودا: (بعنوان غزل مظر سودا) ع ساون کے بادلوں کے ...
جل بھرے ہوئے۔ ورق ۲۶۔ الف

۸۔ نمبر ۲۲ بیاض مراثی عظیم۔ اردو مرثیہ از تقی: ع ہے ہے حسین مرا ہے ہے حسین میرا۔ ورق ۱۰۔ ب تا ۱۱۔ الف

اردو مرثیہ از تقی: مقطع   دو اے شاہ حوض کوثر کرنا مدد تقی پر

جو ہے غلام تیرا ہے ہے حسین میرا۔

اردو مرثیہ از تقی: کربلا میں آج شہ مہمان ہے ورق ۱۱ الف تا ۱۲ الف

اردو مرثیہ از عظیم: مسدس اردو فارسی مخلوط) ع رفت از سرما سایہ بابائے سکینہ ورق ۲۲۔ الف۔ ب۔

اردو مرثیہ از عظیم: یا شاہ نجف اپنے یتیموں کی خبر لے۔ ورق ۳۲۔ ب

کربلا موں آج شہ مہمان ہے (دوبند) ۲۰۔ الف۔ سی نکر۔ ورق ۲۰۔ ب پر

آج ہے باغ امامت میں شہادت کا بہار۔ ۲۹ تا ۳۱۔ الف

نمبر ۲۳ بیاض نامعلوم۔ مرثیہ از علوی: ہے ہے قاسم کی سیج اکیلی۔ ۰۵۔ الف تا ۰۰۔ ب

فائز: مارے ہے بیگناہ یتیمان فاطمہ۔ ۹۵۔ تا ۹۶۔ الف

محفوظ: آج جگ میں پکا واویلا۔ ۱۰۳۔ ب ۱۰۳۔ الف

عزت اللہ: ارے شامیاں چھپاؤ حق نہیں۔ ۱۰۳۔ الف ۱۔ ب

۱۰۔ نمبر ۲۶ بیاض بخط ضیاء۔ اردو غزل از ضیاء، تم بنا شام سیں گذرتی ہے۔

ورق ۱۰۔ب (شاہ عالم ثانی کے قطعے کے طرز پر)

۱۱۔ نمبر ۳۰ بیاض مرزا جعفر

اردو غزل: ع مخمور چشموں کے تبرید کر نکوں شبنم ہے سرداب شور نکے مانند ورق ۱ الف

اردو مرثیہ (کمتر): اول امام اپنے کوں اکبر لکا (لکھا) کروں۔ ۳۔ الف تا ۵۔ الف

اردو غزل   : دل مرا اس شفع پر شیدا نہ ہوتا کاشکے۔ ۵۔ الف

منقبت از میرن سبزواری:

ہم نام تجھے حضرت سبحان سنا ہے۔ ورق ۵۔ الف تا ۶۔ ب

اختتام۔ حیدر کو جو امت کا نگہبان سنا ہے۔

(فقیر؟) : ایدل میں دو عالم کا مدد گار سنا ہے۔ ورق ۶۔ ب تا ۸۔ ب

اختتام۔ میں تجکوں نزا دھارد کا آدار سنا ہے۔

تخلص کا امکان۔ آخری بند کا پہلا مصرع: آیا ہے فقیر آج تیرے دوار کے اوپر

اردو غزل تقی: السلام اے علی ولی اللہ۔ ۸۰۔ ب تا ۹۰۔ الف

تخلص: اس تقی کون قبول کر اللہ۔

اردو مرثیہ میرن سبزواری (بطرز ترجیع بند): اے مونس بنے مردہ دلاں غور رسی
فریاد کروں کس سے فریاد رسی

: مخمس: کچھ طور زمانے کا نظر آتا ہی بد ہے ۱۵۔ ب تا ۱۶۔ الف ب تا ۱۵۔
الف اختتام۔ یا حضرت عباس علی وقت مدد ہے

: رسول سرور سالار سید الثقلین ۱۶۔ ب تا ۱۷۔ ب

: اختتام تمام شد مناقب میرن سبزواری (ورق ۱۴ تا ۱۷)

: (بطرز ترجیع بند) اے دل دل سی تو قاضی حاجات کا ۱۷۔ ب تا ۱۹۔ الف
تخلص: میرن سبزواری کھے خدمت (میں) تیری بادشاہ

اردو منقبت از میرن سبزواری: اگر ہے تو یاد خدا لے۔ ورق ۱۹۔ ب
اختتام: اے میرن سبزواری چھوڑ دو جگ
خدا لے مصطفےٰ لے مرتضیٰ لے

اردو مفرد اشعار: تین شعر

اردو منقبت از نامعلوم: اول (د) آخر بتاؤ کون ہے غیر از علی: ورق ۲۰۔ ب تا ۲۱۔ ب
مخمس از ولی:

اختتام: اونکی محبت کا ولی دل میں وطن سب (دن) اچھو... تیرے قدم کے فرش پر میرے نہیں دن اچھو
ورق ۲۳۔ الف / ب

واسوخت (۳۵ بند) (پہلے ۱۸ بطرز مثمن) از حشمت:
کیوں رے دل جا ہی پھنسا میں نہ تجھے کہتا تھا

اختتام: ظلم کے قید میں عاشق کو نہ بھولو پیارے ورق ۲۳۔ ب تا ۲۸۔ ب

اس شاعر کا فارسی کلام (منقبت) بھی شامل ہے۔

اردو منقبت از قمر اللہ شاہ (میر قمر اللہ شاہ درویش) (ہفت بعنوان ہر بند میں ۱۳ مصرعے):
السلام اے جایگاہ (جایگاہت) برتر از عرش بریں۔ ورق ۲۸۔ ب تا ۳۲۔ الف۔

(دیگر) از (بطرز مسدس ۱۱۰ بند): محبت میں علی کی بس الم۔ ورق ۳۳ ب تا ۳۴۔ ب

(دو سو سال پہلے سندھ میں جو لسانی صورت حال سامنے آئی تھی۔ ایک بار پھر مہاجرت ۱۹۴۷ء کے بعد اسی طرح کی جھلکیاں مقامی اردو میں دیکھنے میں آئی ہیں)

اردو غزل از ولی: رع کتاب حسن کا ۔۔۔۔ یہ صفا تیرا صفا دستا ورق ۹۶۔ ب

رع ہے قد ترا سراپا معنی ناز گویا ورق ۹۶۔ ب

اردو عربی آمیز کبت از روحل (Ruhal)یہ

کماتبی تموتم تحشبرون گو ناگوں عالم کوں الے سبزداری کو

اختتام یہ کن فیکون کے بچار سین ؟؟ فیہ من روحی روحل پہنچا دیکو ورق۔ ۹۰۔ ب

۱۲۔ نمبر ۳۱ انتخاب شعرائے فارسی (بخط قانع):

اردو شعر (پڑھنے میں نہیں آتا) ۔۔ تھی اس میں ہمیں کچھ ۔۔ پیا ۔۔ ورق ۱

چار دوہے اور ایک ایک اردو فرد: بالا پھیرت جگ کیو اور ۔۔۔ ورق ۳۔ الف ۔۔

عجب سینا ہے تیرے بات بچے کا ہنر درزن

لگا کر بات سون دکھا عجب کچھ تیرا سینا ہے ورق ۳۔ الف

مکتوبہ یا مولفہ امیر امین الدین خاں ۔۔ یہ نام درج ہے۔

مزید تین دوہے۔ "دو ہر با کبیر" ۔: ورق ۴۔ الف

ولی اور دیگر شعرا کے اردو اشعار: ورق ۷۔ الف تا ۸۔ ب

اردو فرد : ورق ۱۱۔ الف

۱۳۔ نمبر ۳۲ بیاض مراثی: اردو سلام صابر شاہ السلام ای شاہ صفدر الوداع۔ ورق ۲۔ ب

اختتام: اشک ہے لبریز احمر الوداع

اردو مرثیہ از: جب حشر میں حسین کون لیاویگی فاطمہ۔ ۳۔ ب

اردو سلام از مرزا صالح: ای شاہ مظفر سلام علیک ۸۔ الف / ب

اختتام: وہ کہتا ہے تجھ پر سلام علیک

اردو سلام از ولی: سر گروہ مرسلین اوپر سلام۔ ۸۔ ب تا ۹۔ الف

اختتام: کہ ولی اس مہ جبیں اوپر سلام

اردو مرثیہ از شیخ محفوظ: کربلا میں آج شہ مہمان ہے۔ ورق ۱۱۔ الف تا ۱۲۔ الف

اختتام: قبر سوں تک سر اٹھا احسان ہے۔

اردو مرثیہ از آصمی (بطرز مسدس): جب دشت میں ان کے ہو زخمی گرے سرور۔ ۱۲۔ الف تا ۱۴ / ب

اردو مرثیہ از عظیم: چلا یادگار پیمبر حسین۔ ورق ۱۵۔ الف تا ۱۶۔ الف

اختتام: دیکھوں کہہ ترا روز محشر حسین

اردو مرثیہ از رجا: ای ریاض دیں کے صد برگ بہاری یا حسین۔ ۱۹۔ب تا ۱۰۔ الف

اختتام: ہے ترے در کا ہمیشہ جو بھکاری یا حسین۔

اردو مرثیہ فائز: مارے ہیں بے گناہ یتیمان فاطمہ ورق ۱۹ ۔ الف

اختتام: ای نور مرتضی گل بستان فاطمہ

اردو مرثیہ از آقا صالح: سنسار موں دل توڑ کر جاتے حسینا کربلا۔ ۲۱ب تا ۲۲۔ الف

اختتام: دل کوں جلا کے خاک کر جاتے حسینا کربلا

اردو مرثیہ از فائز: الوداع ای جان دل زہرا کی پیارے الوداع ۲۳۔ الف / ب

اختتام: الوداع اے برگزیدہ حق کی پیارے الوداع

اردو مرثیہ از آقا صالح: ہائے شہ کا غم ہے افسوس (فعلن فعلن، فعلن فعلات): ۱۳/ ب تا ۲۵ / الف

اختتام: ہائے افسوس، افسوس افسوس

تخلص: شاہ صالح تیرا خادم

اردو مرثیہ از ندیم: اے صبا غم کی خبر گھر گھر کوں کہہ۔ ۲۵ ۔ الف / ب

اردو مرثیہ از صابر: مہمان کربلا ہے ہے ہے حسین میرا۔ ۲۵۔ب تا ۲۶۔ الف

اردو مرثیہ از دلی: نبی مصطفی پر سلام علیک۔ ۲۶۔ ب تا ۲۷۔ الف / ب

اردو مرثیہ از آقا صالح: جگ سین پیاسے (پیارے) کہاں سدھارے حسینا۔ ۲۷۔ الف / ب

اردو مرثیہ از قادر: کہ تجھ پہ سبحاں سلام علیک ۲۷ ۔ تا ۲۸ ۔ الف

اردو مرثیہ از مرزا (بطرز مخمس): حسین بن علی پر سلام علیک ۲۸ ۔ الف

مقطع: ترا مدح مرزا کے ایمان کا ... ہوا زیب و زیور سلام علیک

اردو مرثیہ از دلی: شرع کے فلک کا توں چندر حسین ۲۸ ۔ تا ۲۹ ۔ الف

اردو مرثیہ از بندہ علی: ان میں آجت موں کہے خاتون سرور کیا ہوا۔ ۲۹۔ الف / ب

مقطع: بندہ آل محمد پر علی کے واسطے ... یک نظر رحمت کی کر اے بندہ پرور کیا ہوا

اردو مرثیہ از حسینی: رو کہے خاتون جنت آج محشر کیا ہوا۔ ۲۹۔ ب تا ۳۰۔ ب

اردو مرثیہ از دلی: صابر درد و بلا اے شاہ زین العابدین۔ ۳۷ب تا ۳۸۔ الف

اختتام: کر دلی اوپر نظر اے شاہ زین العابدین

اردو مرثیہ از قائم: کیوں جا بلند ہوا ہے الحان فاطمہ کا۔ ۳۸ ۔ الف / ب

قائم رہا ہے کیونکر افسوس اے فلک تون ... ہے آج کربلا میں مہمان فاطمہ کا

اردو مرثیہ از قادر: سبی پھر کہ آج جگمیں ہوا غل حسین کا۔ ۳۹۔ الف

مقطع: عاشور یوجگ یہ قیامت سے قادرا ... کیا زلزلہ پڑا یوا اٹھا غل حسین کا

اردو مرثیہ از اظہر: قتل کی صبح آئی ہے یتیموں کے رولانے کوں۔ ورق ۴۱۔ ب

اردو مرثیہ از (نامعلوم): کربلا جا پھر نا آیا واحسین۔ ورق ۴۱ ب۔ ۴۲۔ ب

اردو مرثیہ از روحی: آیا نبی کون جس وقت فرمان رب العالمین۔ ۴۴۔ الف / ب

جب گھر منیں نہ پائے پیارے حسین کون۔ ۴۴۔ ب تا ۴۵۔ الف

اردو مرثیہ حسینی: مکھ چاند کہاں چھپایا ہے ہے حسین میرا۔ ۴۵۔ الف تا ۴۶۔ الف

مقطع: ہیگا حسینی تیرے ماتم میں زار حیران۔

تجھ غم جگر جلایا ہے ہے حسین میرا

اردو مرثیہ صابر (مرثیہ کلام میر صابر): ماہ محرم رسید قتل شہیداں ہوا ۴۶۔ ب

اردو مرثیہ از عظیم: آج ہے باغ امامت میں شہادت کا بہار۔ ۴۸۔ الف

اردو مرثیہ از عظیم: "منقبت مصر شاہ" (حضرت شاہ ؟):

مشکل کشا ہمارا وہ شاہ صفدری ہے۔ ۵۰۔ الف تا ۵۱۔ ب

اردو مرثیہ مع نعت و منقبت: نبی دو عالم حبیب خدا ہے۔ ورق ۵۱ ب تا ۵۳ الف

اردو مرثیہ عزلت تتوی: آج جگمیں ہے اندہار واویلا واحسین۔ ۵۵۔ ب

مقطع: اے عزیزاں غم ہوا بھاری سنو عزلت ستی۔

رو کہا باصد پکارا واویلا واحسین

اردو منقبت صابر: مدح توشہار طائر رحماں سیں سنا ہوں۔ ۵۹۔ ب ۶۲۔ ب

(۶۰ خالی ہے مگر منقبت اس کے بعد جاری ہے)۔

اردو منقبت صابر: مدح تو شہا طائر رحماں سیں سنا ہوں۔

۶۵۔ ب (یہاں صرف ایک بند مکرر درج ہے)

اردو مناجات صابر: الحمد تجکوں، دمبدم (رکھیو) مجھے ثابت قدم۔ ۶۷۔ ب۔

اختتام: جی جان میرے بابکر دوجا جوان عادل عمر

عثمان علی ہے تاج سر حقا مر افریاد سن

۱۴۔ نمبر ۴۴ بیاض مراثی سندھی۔ اردو مرثیے کا ایک جزو

سنگ ماتم سیں تسے (ستی سین تھی) اب شیشہ دل چور کرو۔ ۳۲۔ ب

اردو مرثیوں کا اثر ب میر صوفی مرثیہ ہندی چھپوا ہے سوزناک

تنکے علوی سوزمون سندھی کیو آہے درد ناک ... ۶۶ ب۔

اردو مرثیہ از علوی : کربلاکوں شہ سدھارا ہائے ہائے ۴۔ الف تا ۶۔ ب

اختتام : رو رو علوی کر پکارا ہائے ہائے

اسکندر کے مرثیے کا سندھی ترجمہ۔

واقعو ہندی زبان ے جو چیو اسکندر

تہ کہے علوی جو اے سندی جو سندی کیو آ ہے اظہر ۹۱۔ الف

۱۵۔ ۳۶ انتخاب عظیم ٹتوی : اردو غزلیں : سجن جلوا جمالی مجہ دکھاؤ گے تو کیا ہوگا۔ ۳۵۔ الف

برہمن جسکے دل میں آرزو ہے ہر کے درشن کا۔ ۳۵۔ ب

نعت کے انداز میں ہندوانہ مضامین۔ غزل میں

تجہ بن میں بیقرار سدا بحر و بر میں ہوں۔ ۳۵۔ ب تا ۳۶۔ الف

اس غزل میں میر فتح علی اور میر غلام علی کی مدح میں اشعار بھی ہیں۔

وہ گھڑی رام سین گذرتی ہے۔ ۳۶۔ الف تا ۳۷۔ الف

۱۶۔ نمبر ۵۱ دیوان جعفری : اردو غزلیں : بعنوان " غزلیات ہندی "

۶۸۔ الف تا ۱۷۳ (درمیان خالی اوراق بھی ہیں)

مجھ سے جب آرام جاں جانے کی رخصت مانگتا۔ 690

تیرے ہی عشق اے یار سب کا ہے چلن بگڑا

69a b,709a,79b,84b,89b,....

ناسخ، آباد اور گدا کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

93b,118b,119 a`b,13ob,131ab,132a.

۱۷۔ نمبر ۵۲ بیاض سرخوش (ٹتوی)

اردو غزلیں : اردو غزل از دکی۔ ریختہ :

گفتی شوخ زمن خانہ دروں چھپنا کیا ۳۴۔ ب

یہی نکرر بر ورق ۱۳۱ الف

اردو فردیات: بعنوان "فرد ہندی"

10b, 13a b, 31b, 32b, 41a, 44a, 66 b

اردو مثنویات: "باب دربیان بخیل، ارے دل بخیلی ترا کام ہے۔ 46a

: کریما کرم کر مرے حال پر۔ 51a

باب در بیان کرم: کرم کر یتیماں کے پر اے عزیز۔ 51a, b

باب دربیان سخاوت: ارے دل سخاوت کا پیشہ کرو۔ 51b

۱۸۔ نمبر ۵۳ بیاض کنتر: اردو شعر در آغاز حصہ اشعار:

یا مرتضا علی بجی دنیا میں غم نہو 156a
لیکن غم حسین مرے دل سے کم نہو۔

(اس میں ایک قطعے تاریخ قائم شاہ مثاری (مثیاری) کا کہا ہوا ورق 266a ؟

۱۹۔ نمبر ۵۰ دیوان ولی لغاری: فارسی دیوان (مرتبہ ۱۲۲۲ھ) ہے۔ مگر اس میں ایک اردو غزل یہ بھی درج ہے۔

ع اس شاہ کج کلہ کوں ہمارا سلام ہے۔ 99a'b

اردو قطعہ: 1a

اردو مخمس از صابر: لگے سوں لگ کے موہن کے جو میں سوتا تو کیا ہوتا (نوبند) fa1.113

اردو غزل از ولی: ناز سوں گھر مرے توں آرے سجن۔ ۱۱۳۔

اردو غزل از رضا Raza چپ چپاتے رات کوں مجھ گھر میں آتا یار جب۔ ۱۱۳۔

اردو غزل از میر صابر: اے چاند کبھی بنس کے تو گھونگٹ کوں اٹھا جا۔ ۱۱۳

دل تیرے ہجراں سوں خوں ہے الغیاث

دیوان ولی لغاری کا ایک اور خطی نسخہ ذخیرہ شیرانی پنجاب یونیورسٹی میں بھی ہے جو اول و آخر سے ناقص ہے

۲۰۔ نمبر ۵۸ دیوان صائب: اضافی تحریروں میں ایک "غزل ریختہ" ہے جس میں ۵ شعر ہیں اور وہ یوں شروع ہوتی ہے:

ع میں فر (پھر) موجود رہتا ہوں دنیا (جہاں) جہاں کا درد سنتا ہوں
سدا دن رین کہتا ہوں کہ آخر خاک ہو جاناں۔ fa1.1a

۲۱۔ نمبر ۷۰ مقدمۃ الصلوٰۃ:

اردو نعت: اسکی صفت کہوں کیا وہ تو حبیب رب کا۔ ۹۲۔ ب تا ۹۳۔ ب

اردو نظم: عمرہ تمام گذر گئی عمل نہ ہوا (کذا)

اختتام: جب رایت زیر سمیں دری تب سمجھ پری۔ 95a'b

اردو نعت: پل پل منے جی جان سے قربان تج پر یا نبی۔ 109a'b

اردو نظم: تن یار ہو ہمارے تیرا فراق مارے 109b-110a

نظم ریختہ: توں نن پی ہو؟...اختتام از رشتہ جان بج من جانپہ جو سر تو مار کا 110b-111a

نعت ریختہ: اسکی صفت کہوں کیا وہ تو حبیب رب کا 114b-115a (مکرر از ورق 92b-93a)

اردو قطعہ: اگر موسی تھا عالم اور اگر فرعون تھا ظالم۔ 121a'b

نظم ریختہ: ای گل خندان من وے شہ خوبان من۔

اختتام: تابکے ایں غم خورم باز ملاقات کے 123b-124a

اردو نعت: دو جگ سر جنت تری کا۔ اختتام واللیل گیسوی نام محمد۔ 127a:b

مرثیہ ثابت: اچ فاطمہ فردوس میں کی آتی تیاری۔

اختتام: نہیں حشر میں محشورتوں در محفل شہدا۔

تخلص والا آخری بند: ای ثابت زوارتوں کر مرثیہ خوانی۔ 135a-140a

۲۲۔ نمبر ۳، مناقب غوث پاک و تذکرۃ الطالبین۔

مخطوطے میں کاتب منصور عالم چشتی تتوی نے صراحت کی ہے کہ ایک قدیم نسخے سے نقل کیا جو ۱۱۸۹ھ کا تھا اور مولوی محمد عارف تتوی کی ملکیت تھا۔ یہ ایک شعر fol. 1a پر آتا ہے جس پر "فقیر منصور عالم عفی عنہ" کے دستخط بھی ثبت ہیں

شعر: سفلہ خوش پوش کی (کیا) قدر کرتا ہے ضرور

کفش زریں ہو تو کیا سر پر (ہی) رکھناچاہیے۔

۲۳۔ نمبر ۸، گلزار دانش: محمد احسن (مکتوبہ ۱۱۵۹ھ)۔ فارسی انشاء کی تعلیم پر رسالہ۔ اس میں یہ اردو اشعار بھی آتے ہیں:

ع گلا کرے جو ہمارا میت ہمارا (سوئے)

آپ پوے نرک میں پاپ ہمارے دو۔ (دھوئے) fol. 4b

غفلت میں وقت اپنا نکھو ہشیار ہو ہشیار ہو
کب لگ رہے گا خواب میں ۰ بیدار ہو بیدار ہو 17a
چاہے کہ ذکرت حق کند ۰ در محفل قدسیاں
توں بھی ہر دم سہر حق ذکار ہو ذکار ہو 17a
جم درچی چھدی توں پلہ پران رون
جھیر و اجھو انجو بہترو نہ بابا نرو fol.21a
بیکار مباش کچھ (کذا) کیا کر fol.23b
نہ کھیچے کان نہ پریے ضمان ۰
نہ کھیلیے جوا نہ پھاندیے کوا fol.28b
پرین ری سانجای توری ہو لکن سین
نہ کر اجہاری پاسکو سکیں ہترا 36b

۲۴۔ نمبر ۹۱ بیاض بندہ علی رضوی: ایک منتر اردو نثر میں 65b
۱۰ اسی بیاض میں مخدوم معین تتوی کی بیاض سے ایک رسالہ موسیقی نقل کیا ہے اور وہ شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے ۔
اردو فردیات: میر کامل: ع میر کامل سدا ہی عشق میں تم
پیر (کامل) ہو بلکہ (اکمل) ہو 8a
ع اپنی کملی سے کام لے کامل ... گر تجھے محمل و نبات نہیں 8a
اردو مرثیہ از مہر علی خواجہ و مہری: یا علی تیرے (تجھ) دلکے جانی آج زخمی بے شمار 116b
مقطع: ع: کچھ نہ بول اس حال سوں مہر علی خاموش رہ
رو رو غم سوں رات اور دن اپنے سر پر ہاتھ مار
اردو سلام از ولی: سرگروہ مرسلین اوپر سلام 117b
اردو مرثیہ از عظیم: (۱۶ بند): آج جگ میں ظلم کا بنیاد ہے 118a
خطاب بحضرت علی از نقد علی خاں آباد: یا مرتضا سن التجا میری خدا کے واسطے 127b
اختتام: مطلب فقیر اپنے کا کر جلدی خدا کے واسطے
مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا دوہا: 65b

بیاض کا دوسرا حصہ (۱۶۰ ورق) زیادہ تر اردو۔
مسکین 38b-36a علی رضا 34b-31b، فراق 31b-27a۔
لطف علی 27a-24a، مسکین 24a-20b، مسکین "20a-12b
مسکین 12b-8b، میر صوفی 1b,2a,2b,8a، اشرف الدولہ 63b-60b،
ہوشدار 60b-56b، مسکین 56b-53b، ہوشدار 53a-52a۔
لطف علی، اسد 52a-48a، لطف علی 48a-44b مسکین 44b-38b۔
مرثیہ چار بند 88a-88a، سلام از صوفی 82a-82a، مسکندر 81b-78b،
محزوں 78b-74b، احمد 74a-70a، شرف 70a-66a، نامعلوم 65a-63b—
و منقبت 91a-90a، منقبت از مین غلام امام سبزواری Fa11.1-167 89b-88b

۲۵۔ نمبر ۹۳ دیوان ولی دکنی

"این کتاب ولی مالک ... غلام الرسول ولد قاضی ابوالقاسم بن قاضی ابوالبقا محتسب بلدہ تتہ"

۲۶۔ نمبر ۱۳۰ محک کمال (جلد دوم): خاتمہ (ناتمام): ع سوخت زہد خشک خاموشی دماغ صبر را
شوق ہے بے طاقتی ہے گریہ ہے فریاد ہے۔ 97b

۲۷۔ نمبر ۲۲۸ بیاض سندھی کافیاں: اردو غزل: آتی تھی ایک حور مجھے دیکھ ہٹ گئی 11a
دیگر مطلع ع دشت غربت میں مسافر کوں وطن (یاد) آیا۔
بلبل ... کوں قفس میں جو چمن (یاد آیا) 11a
چپل ع کہا کر سرانا ہو کا سر میدان (میں) آؤں گا۔ 121a
۔مولا بخش کٹوہر Katohar ع کرم سے آپنے آدمیرے گھر یارسول اللہ 130a
مطلع: ع گر سیر چمن میں ہمیں بلوائے تو آویں
سو منتیں اور چین سے بتلاوے تو آویں 132b
غزل سید گنبل شاہ ع چمن کے وطن پچتا ہوں دلدار کی نے دکھیا 135a
کافی از یوسف یا بیکس ع پیچ شوخی کا چرا نادیکا خلقی خدا ملکی خدا 31a

(۲۸) نمبر ۲۱۵ بیاض کافیاں سندھی: اردو مشمولات:

25a,b,28b,29a,45b-46a,55a,55b,61b,61b-62a,62a,b,68a,70a,
70b-71b,75a,75a,75b-76a,83a,83a,b,83b,84a,86a,b,

۳۔ ذخیرۂ راشد برہانپوری (سندھ یونیورسٹی) کے اردو مخطوطات

نام اے ای سی نمبر مصنف و سنہ تصنیف کاتب و سنہ کتابت کیفیت

۱۔ نمبر ۲۹ مجموعہ مختصر معہ نعت اردو (26551) حسن ۔ اردو نعت ۔ فقیر الہٰی ۱۱۲۶ھ چند دردو اور ایک طولانی اردو نعت

۲۔ نمبر ۵۱ مجموعہ (جس میں معرفت الغیوب از شاہ برہان الدین جام بھی ہے جو حضرت میراں جی شمس العشاق کے خلیفہ تھے۔ کتابت سنہ ۶ ؟

۳۔ نمبر ۹۳ شرح فقہ اکبر ۲۶۵۰۵ ۔ سید محمد گیسودراز ۔ کاتب سید شریف ہمدانی ۱۰۹۵ء بمقام گلبرگ آستانہ مبارک ۔

۴۔ نمبر ۹۲ روضۃ الشہدا ۔ دہ مجلس ۲۶۶۰۲ ۔

۵۔ نمبر ۹۳ سیرۃ النبی ۔ کاتب سید محمد قادری برہانپوری

۶۔ نمبر ۹۴ روضۃ الاحباب ۲۶۶۰۳ عطاء اللہ ابن فضل اللہ جمال الحسینی ۸۹۰ ۔ کتابت احمد عالمگیر ثانی ؟ کئی کاتبوں نے نقل کیا ہے کافی قدیم ہے

۷۔ نمبر ۱۰۵ مجموعہ انشا ۔ ترجمہ اردو ۔ فرہنگ اردو ۔ چند نظم اردو ۔

۸۔ نمبر ۱۸۱ مفرح القلوب ہندی سے فارسی ۸۱۰ ۔ تاج محمد منقنی ؟ الملکی ۔ میر شجاعت علی کاتب ۱۲۵۰ء فارسی ترجمہ اور نواب آصف الدولہ کا ایک الگ رقعہ جس میں اردو اشعار ہیں

۹۔ نمبر ۲۲۲ درج گوہر

۱۰۔ نمبر ۲۲۳ بیاض ۔ ذخیرہ ۔ مشاہیر شعرائے قدیم

۱۱۔ نمبر ۲۲۴ بیاض خزینہ ۔

۱۲۔ نمبر ۲۲۵ بیاض سفینہ ۔

۱۳۔ نمبر ۲۲۶ بیاض یادگار ۔

۱۴۔ نمبر ۲۲۷ بیاض مختصر ۔

۱۵۔ نمبر ۲۲۸ بیاض مجموعہ ۔

۱۶۔ نمبر ۲۲۹ بیاض نگینہ

۱۷۔ نمبر ۲۳۰ بیاض گنجینہ

۱۸. نمبر ۲۳۷ مجموعہ رفاعیہ : ۱۱۹۴ کا مکتوبہ ۔ ۲۰ سے زیادہ اردو نظمیں ۔ (اس مجموعے کے اندراجات پر راشد برہانپوری نے تبصرہ لکھا ہے جو نوائے ادب بمبئی، جولائی تا اکتوبر ۱۹۵۱ء کے ص ۲۸ تا ۳۹ پر شائع ہوا ہے)

۱۹. آخری صفحے نمبر ۹۱ پر : نمبر ۱ ولادت نامہ امین برہان پوری ۔ نظم اردو۔

۲۰. نمبر ۲ وفات نامہ ۔ آٹھ سو اشعار ع موت کو سر پر تمھاری جانوں دنیاں خواب کی یاری جانوں

۲۱. صفحہ نمبر ۹۲ پر نمبر ۳ قیامت نامہ ۔ طالب

۲۲. نمبر ۳ وفات نامہ ۔ فیض ۱۱۱۹ء، مکتوبہ ۱۱۹۳ء

۲۳. نمبر ۵ شرح لوائح جامی ۔ اردو نثر ۔

۲۴. نمبر ۶ فقہ اردو نثر

۲۵. نمبر ۷ مجموعہ مختصر (پیم کہانی) از محمد غالباً ملک محمد جائسی ۔ اردو

۲۶. نمبر ۸ مجموعہ نظم اردو (گیارہ نظمیں) ۔ سید قاسم ، غلامی ، کافی ، ادب ، شہاب الدین ، شرفو ، مظلوم ، فاضل وغیرہ ۔

۲۷. صفحہ ۹۴ پر ترجمہ گلستاں

۲۸. ۹۵ پر ۔ قصہ لعل و گوہر از عاجز

۲۹. نظم اردو ۔ پنچھی باچا ۔

۳۰. مجموعہ ۔ مراثی اردو ۔ تین ، حافظ ، جعفر ، فائز ۔ ....

۳۱. مجموعہ ۔ اس میں اردو بھی ہے ۔

۳۲. مسائل فقہ منظوم اردو ، رحمت اللہ ۔ ۱۰۸ شعر ۴۴ مسائل فقہ حنفی

۳۳. مجموعہ ۔ لغت اردو ، شہید و گویا ۔

۳۴. پیم کہانی ۔ ہندی فارسی شیخ برہان الدین راز الٰہی برہان پوری ۱۰۸۳ء ۔ ہندی دوہوں کی فارسی شرح ۔ کتابت ۱۲۰۶ء

۳۵. مجموعہ مراثی ۔ ضخیم ۱۲۸ ورق ۔ اردو ظہیر ، دبیر ، عاشق ، خان ، سیفی ، مونس ، سلیس ، عشق

۳۶. اردو منظومات ۔ نگراں ، مشہدی ، ابر ، مجروح ، مظلوم ۔ مختصر مجموعہ ، ہر ایک شاعر کی

ایک ہی نظم ہے۔

۳۰۔ مجموعۂ نظم و نثر اردو (توتا نامہ نظم، وجود نامہ، چار پیر ۱۴ خانوادے، لگن نامہ) مرید برہان شاہ، شیخ محمود، چشتی حسین۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے مقالے "اردو املا کی تاریخ" میں اس ذخیرے کے حسب ذیل مخطوطات کا ذکر آیا ہے

۱۔ شیخ بہاء الدین باجن (۹۱۲۴ھ) کے دوہرے۔ کتب خانہ مولانا راشد برہان پوری۔

۲۔ ۱۰۹۶ھ کی ایک بیاض۔ مختلف شعراء کے دوہے۔ اہتمام خاں، احمد، افضل، فاضل، نول رام، موہن لال وغیرہ ص ۱۶، ۱۹۔

اسی میں ریختہ

۳۔ ۱۱۰۴ھ کا مکتوبہ سولہ ورقی رسالہ پریم کہانی (ملک محمد جائسی) ...

۴۔ وفات نامہ (گیارہویں صدی کا) صفحہ ۲۱

۵۔ ایک اور وفات نامہ ۱۱۱۱ھ کا مرتب شدہ فیض شاعر کا۔

۶۔ گلستان سعدی کا دکھنی زبان میں ترجمہ صفحہ ۲۵

۷۔ شرح لوائح جامی صفحہ ۲۶

۸۔ رحمت اللہ گجراتی (غالباً بارہویں صدی ہجری) قصیدۂ غوثیہ منظوم صفحہ ۲۷۔

گوشۂ تحقیق منسوبات

مسئلۂ ملکیتِ تصنیف کے بارے میں رچرڈ ایلٹیک کی تصریحات

(تعارف و ترجمانی از نجم الاسلام)

۱۔ رچرڈ ایلٹیک، پروفیسر اوہایو اسٹیٹ یونیورسٹی، مصنف کتاب "دی آرٹ آف لٹریری ریسرچ، دی اسکالر ایڈونچرس، اے پری فیس ٹو کریٹیکل ریڈنگ وغیرہ۔

۲۔ کتاب "دی آرٹ آف لٹریری ریسرچ" کے باب سوم "چند علمی مشاغل" کے تحت ذیلی عنوانات: متنی مطالعہ، مسئلہ ملکیّت تصنیف، ماخذ کی تلاش، شہرت اور اثرات کی کھوج، شعور ماضی کی پرورش۔

۳۔ ملکیّت تصنیف کی تحقیق کے تین خاص مقاصد ہوتے ہیں:

○ گمنام یا جعلی تصانیف کے لکھنے والوں کی شناخت (یا غلط انتسابات کا شکار ہو جانے والی کتابوں کے اصل مصنفوں کی تلاش)،

○ ایک تصنیف دو یا زیادہ مصنفوں کی لکھی ہوئی ہے تو اس کا تعین کہ کون سا حصہ کس کے قلم سے ہے،

○ اور، کسی مصنّف کی تصانیف کی دستیاب فہرست میں سے ان اجزاء کو خارج کرنا جو اس کے قلم سے نہیں ہیں تاکہ اس کا تصنیفی سرمایہ آمیزشوں سے پاک ہو جائے (ص ۳۰)۔

۴۔ غور طلب بات یہ ہے کہ تصانیف غلط انتسابات کا شکار کیوں ہو جاتی ہیں، اور اصل مصنفین گمنام کیوں ہو جاتے ہیں۔ مشہور مصنفین کی تصانیف کے بارے میں ہماری سوچ اتنی مثبت ہوتی ہے کہ خیال ہی نہیں آتا کہ ادبی تاریخ میں ایک کثیر تعداد ایسی تصانیف کی بھی ہے جن کی ولدیت سے متعلق کسوں کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہو پایا ہے۔ ایک زمانے میں حالات ایسے رہے ہیں جو اصل مصنف کے نام کا اخفا کرنے پر اکساتے تھے۔ نشاۃ ثانیہ کے دور سے قبل، نظم نگار کم اہمیت رکھتا تھا، نظم میں کیا کہا گیا ہے اور اس کے اثرات کیا ہیں، اسی بات کو سب کچھ اہمیت حاصل تھی، اور انسانی شخصیت کو نظرانداز کر دیا جاتا تھا جو اسے تخلیق

کرتی تھی۔ پھر ٹیوڈر عہد میں ایسا ہوا کہ قارئین مصنفین کو بھی اہمیت دینے لگے۔ لیکن قارئین کے اس تجسس کو اس وقت دھچکا لگا جب کہ مصنفوں نے افادۂ عام کے لیے کی جانے والی طباعتوں کو غیر شائستہ سمجھ کر، اپنی تصانیف کے خطی نسخوں کو پھیلانے پر اکتفا کیا۔ جب ان خطی نسخوں کی بنیاد پر ترتیب پانے والے منتخبات اشعار کے مجموعے چھپے تو بہت سی مفرد نظموں کے ناظمین کے نام، اگر وہ پہلے ہی گمنام نہیں تھے تو اب چھپا دیے گئے یا دوران طباعت چھپ گئے۔ بعد کے ایڈیشنوں میں غلط انتساب کا مسئلہ اور گہرا ہوتا چلا گیا۔

۵۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواسط تک آتے آتے، نمایاں ترین ادبی شخصیتوں کی لکھی ہوئی کتابوں اور کتابچوں میں مناظراتی اور نزاعی نوعیت کی بحثوں نے مصنفوں کے ناموں کو پوشیدہ رکھنے اور مجہول کتابوں کو سامنے لانے کو بہترین پالیسی بنا دیا۔ یہ کتابیں ڈرائیڈن، ڈیفو، سوئفٹ اور فیلڈنگ نے لکھی تھیں، اور پھر مذہبی و سیاسی آرا، کو دبانے کی گھٹن سے چھٹکارا پانے کی کوشش کے طور پر ایک ایسی جدید قوت ابھری جس نے اولاً مصنف کے نام کو چھپانے پر آمادہ کیا اور بالآخر صحافت کی صورت میں نمودار ہوئی جس کی طرف اعلیٰ پائے کے مصنفین بھی آہستہ آہستہ متوجہ ہوئے مگر وہ اپنی ادبی شخصیتوں کو جدا رکھنا چاہتے تھے، اس لیے فرضی ناموں سے لکھنے کا طریقہ اپنایا۔

۶۔ لیکن ایسا بھی ہوا کہ کئی مصنفوں کے نام ان کی خواہش کے برخلاف ان کی تصانیف سے الگ ہو گئے یا ایسی تصانیف سے وابستہ ہو گئے جو ان کے قلم سے نہ تھیں۔ ایسے غلط انتسابات کو پھلنے پھولنے کا موقع ایلزبتھ کے دور سے لے کر اٹھارہویں صدی کے وسط تک سیاسی تحریروں کے مجموعوں میں بکثرت آتا رہا ہے۔

۷۔ غلط انتسابات کا ایک اور سرچشمہ منتخبات و مقتبسات پر مبنی کتابیں ثابت ہوئیں جن میں صاحبان کتاب اپنی نظموں کے علاوہ دوسروں کی نظمیں بھی شامل کر لیا کرتے تھے۔ سانیٹ بعنوان "دی پوئیٹ" کو اسی سبب سے کیٹس کی طرف منسوب کر دیا گیا کہ وہ منتخبات کے ایک ایسے مجموعے میں چھپا تھا جس میں کیٹس کی متعدد مستند نظمیں منقول تھیں۔

۸۔ غلط انتسابات کا ایک سبب کبھی کبھی وہ مجلدات بھی ثابت ہوتے ہیں جن میں کئی مصنفوں کی تصانیف یکجا مجلّد ہو گئیں، جن میں ایک معلوم مصنف کے ساتھ نامعلوم مصنفوں کی تصانیف بھی یکجا ہوتی تھیں، اس طرح وہ معلوم مصنّف کی طرف نسبت کر لی جاتی تھیں۔

۹۔ اٹھارہویں صدی کی صحافت میں ایک روایت یہ بھی چلی کہ ایڈیٹر صاحبان کو

جہاں خالی جگہوں کو پر کرنے کے لیے کوئی نظم لگانی پڑتی تھی، وہ اس پر کسی مشہور شاعر کا نام ڈال دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ چھاپنے والے تجارتی جلب منفعت کی خاطر منتخبات اشعار نمایاں ناموں سے منسوب کرکے ایسی نظمیں بھی شامل کر لیتے تھے جو ان کی نہ ہوتی تھیں۔ عیار قسم کے ناشرین کبھی کبھی اپنے زمانے کے کسی مضمون نگار کی شہرت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے مجموعۂ مضامین چھاپتے وقت دوسروں کے مضامین بھی اپنی طرف سے شامل کر لیا کرتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں Sterne کی مقبولیت اس کا سبب بنی کہ کوئی نوّے مطبوعات اس کے نام سے چھپ کر منظرعام پر آئیں۔ اور یہی نہیں بلکہ دسیوں جعلی خطوط بھی اس کے نام سے مجموعوں میں شامل ہوگئے۔

۱۰۔ ایسا ہی تاجرانہ مُحرّک اس کا سبب بنا کہ ایلزبتھ اور جیکب کے ادوار کے مطبوعہ ڈراموں کے سرورق پر غلط مصنفوں کا نام ڈالا گیا، جن کی وجہ سے ملکیّت تصنیف کے بعض سربستہ رازوں نے جنم لیا جو ابھی تک حل طلب چلے آتے ہیں۔ Beaumont اور Fletcher کے باون ڈراموں میں بارہ سے بھی کم تو ان شریک مصنّفوں کے ہیں۔ باقی یا تو صرف Fletcher کے ہیں یا اس نے Massinger کی شراکت میں یا دیگر ڈراما نگاروں کی شراکت میں لکھے ہیں۔ ان ڈراموں اور ڈراما نگاروں کے تقابل کی کوششیں اور اس کا تعین کہ کس شریک مصنف کا کتنا حصہ ہے، ابھی تک ڈرامے کے ماہر محققین کی توجہات کا مرکز چلا آتا ہے۔

۱۱۔ قدیم فہارس کتب بھی غلط انتسابات کا ایک مستقل سرچشمہ بنی رہی ہیں۔ سولہویں صدی کے وسط میں Bale کی Maloris Brytanniae Scriptotum Illustrium سے لے کر Biographia Britanica کے چھے مجلّدات (66-1746) تک، انگریز مصنفوں کی متعدد لغتوں میں شامل ببلیوگرافیاں غلط انتسابات سے بھری ہوئی ہیں۔ یہی صورت سترہویں صدی میں کتابوں کے تاجروں اور ذخیرہ اندوزوں کی کیٹلاگوں کی ہے جو ہر مشکوک مقام پر مشہور مصنّفوں کا نام ڈال دینے کا افسوس ناک رجحان رکھتے تھے۔ ان کیٹلاگوں کے بعض مرتبین چھان بین میں ناکام رہے ہیں جس کی وجہ سے غلط انتسابات کو ایک ناروا استناد اور نامناسب زندگی حاصل ہو گئی۔ اس کی ایک قابل ذکر مثال سوئفٹ کا وہ ایڈیشن ہے جسے سر والٹر اسکاٹ نے مرتب کیا تھا۔

۱۲۔ ان سب مذکورۂ بالا تصریحات کے پیش نظر، یہ امر قابل توجہ ہے کہ ریکارڈ کو درست رکھنے کے لیے کتنی پیش رفت کی گئی ہے۔ ملکیّت تصنیف کے معاملات میں ہم اپنے اجداد سے

زیادہ بہتر معلومات رکھتے ہیں۔ اب سے سو سال پہلے تک یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ چوسر نے

The Testament of Love

The Cuckoo and the Nightingale,

The Court of Love

اور دوسری نظمیں لکھی تھیں جو صدیوں تک اس کے نام کے ساتھ وابستہ رہیں۔ یہ اب مسترد ہو چکی ہیں، اور ایک اور نظم The Romance of Rose معرض شک میں ہے۔ برخلاف اس کے، اس بات کا یقین کر لینے کی وجہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۱ء میں پیٹر ہاؤس کالج کیمبرج کی لائبریری میں ملنے والا علمی رسالہ چوسر کا ہو سکتا ہے گو کہ اس کے بارے میں شہادت حتمی نہیں ہے۔ شیکسپیر کے ایک درجن سے بھی زیادہ ڈرامے اس کے کلّیات سے خارج کیے جا چکے ہیں، اور کچھ کے بارے میں معما حل طلب ہے۔

۱۳۔ ڈینیل ڈیفو کی تصنیفی پیداوار کی مقدار، جسے ناقابل لحاظ تو کبھی خیال نہیں کیا گیا، ہر نسل کے مطالعات میں بڑھ بڑھ کر اور زیادہ بھاری کبھی جاتی رہی ہے۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں George Chalmer، نے اسے ۹۹ تصانیف کا اعزاز بخشا، جن میں سے ۲۲ یقیناً اس کی نہیں تھیں، سنہ ۱۸۳۰ء میں Walter Wilson نے یہ تعداد ۲۱۰ تک بڑھا دی۔ ۱۹۱۲ء کے آتے آتے، W.P. Trent ۱۶۰ کے نام گنوا سکا اور ۱۹۶۰ء میں John Robert Moore نے، جو اس موضوع پر اپنی علمی زندگی کے ۳۰ سال صرف کر چکا تھا، اعلان کیا کہ کل تعداد ۵۷۰ تک پہنچ گئی ہے جو یا تو ڈیفو کے تحریر کردہ اجزاء ہیں یا جن کے بارے میں گمان غالب ہے کہ اس کے ہیں۔ دیگر ماہرین نے مور کی اعلان کردہ اس کل تعداد کو مبالغہ آمیز قرار دیا ہے لیکن قدامت پرستانہ اندازوں کی رو سے آج بھی ڈیفو کی تخلیقیت کو فوق الانسانی ہونے کے اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔

۱۴۔ کچھ انتسابات ایسے راز ہائے سربستہ ہیں جو شاید کبھی حل نہ ہو سکیں۔ سیموئل جانسن کی معمولی نوعیت کی تحریریں اس کی مثال ہیں۔ ان کی بازیافت اس پر منحصر ہے کہ اٹھارہویں صدی کے جن اخبارات و رسائل میں یہ تحریریں چھپی تھیں وہ کب دریافت ہوتے ہیں۔

۱۵۔ معاصر اخبارات و رسائل کی ورق گردانی سے بعض مشہور مصنفین کی غیر معروف تحریروں کو جمع کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ مثال میں Dickens کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۶۔ A Tale of a Tub کس کی تصنیف ہے؟ جب اس کی اشاعت عمل میں آئی تو ناشر (Edmund Curll) نے دعویٰ کیا کہ یہ سوئفٹ اور اس کے کزن تھامس کی مشترک

تصنیف ہے۔ لیکن سوئفٹ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ کر اس کا رد کر دیا کہ اگر کوئی کتاب میں تین سطریں بھی اپنے قلم کی شامل ہونے کا دعویٰ ثابت کر دے تو سامنے آئے۔ چونکہ Curll ایک نامعتبر گواہ کی حیثیت سے بدنام تھا۔ اس لیے بعد کے اسکالروں نے زیادہ مشہور کزن یعنی سوئفٹ کے حق میں واحد مصنف ہونے کا دعویٰ تسلیم کر لیا۔ تھامس کی محشیٰ کاپی اب کارنیل میں محفوظ ہے اور اس سے Curll کے دعوے کو تقویت ملتی ہے۔ لیکن تھامس کی گواہی کیا Curll کے مقابلے میں زیادہ قابل انحصار ہے؟ یہی وہ مسئلہ تھا جسے Robert M. Adams سلجھانے پر آمادہ ہوا اور مختلف نوعیتوں کی داخلی اور خارجی شہادتوں میں ربط و تعلق قائم کرکے اس نتیجے پر پہنچا کہ ۱۶۱ صفحات کی کتاب میں کم سے کم ۵۵ سطریں تو ضرور ایسی ہیں جو تھامس کی ہیں اور کتاب کے ایڈیشن میں موجود ہیں۔

۱۷۔ ملکیت تصنیف کی تعیین میں، داخلی اور خارجی دو قسم کی شہادتوں میں سے داخلی شہادت زیادہ پھسلن رکھتی ہے۔ اس کے استعمال میں یہ مقدمہ (قیاس کا پہلا درجہ) کارفرما ہوتا ہے کہ مصنف کی تصنیف میں اسلوب کا ایک مخصوص و منفرد رنگ ہوتا ہے، مثال کے طور پر دیسی الفاظ کے بجائے لاطینی کو ترجیح دینا، یا اظہار کی بعض ایسی شکلیں جنھیں وہ دہراتا ہے، اگر خصوصیات تحریر میں ملتی ہیں تو بلا شبہ اس کی تحریر ہے۔ پھر اسی دلیل کو آگے بڑھایا جائے۔ ایسی دوسری تحریریں جن کے لکھنے والے کے نام کی صراحت موجود نہیں یا جن کی ملکیت کے بارے میں سوالات اٹھتے ہیں، اگر وہی اسلوبی خصوصیات رکھتی ہیں جو معلوم مصنف کی تحریروں کا خاصہ ہیں تو یہ بے نام یا معرض شک میں آنے والی تحریریں بھی اسی کے ساتھ انتساب پا جانے کی معقول بنیاد رکھتی ہیں۔ اس کی ایک قابل ذکر مثال De Quincey پر Tave کے کام میں ملتی ہے۔ De Quincey کی کتنی بہت سی ایسی تحریریں ہیں جو رسائل کے مجلدات میں مدفون تھیں جن کے بارے میں خود لکھنے والے کو بھی یاد نہ رہا ہوگا۔ ایک بار ان تحریروں کی قیمت وصول کر لینے کے بعد اس نے فراموش کر دیا اور کوئی ایسی خارجی شہادت باقی نہ رہی جس سے یہ عقدہ کھلتا کہ یہ بے نام تحریریں De Quincey کی ہیں۔ Tave نے کم سے کم دو اخبارات کی حد تک (ایڈنبرگ سنڈے پوسٹ اور ایڈنبرگ ایوننگ پوسٹ ۱۸۲۷-۲۸) سے عقدہ حل کر لیا اور اس کی بنیاد وہ ہزاروں اندرونی حوالے (Cross-references) تھے جنھیں اس نے De Quincey کی مستند کتابوں سے حاصل کرکے انھیں اخبارات کی فائلوں کے زیر تحقیق مضامین کے حوالجات سے ملا کر مطابقتیں تلاش کرنے میں استعمال کیا۔

یہ مہم سرکرنی صرف اس لیے ممکن ہوئی کہ اس نے اپنے ذہن کو سراغ رسانی کی ایک ایسی مشین میں بدل دیا تھا جو De Quincey کے خیالات و تصورات کی خصوصیات اور اسلوبی اختصاصات سے لبریز ہو۔

۱۸۔ ملکیتِ تصنیف کے مسئلے پر کیے جانے والے بعض مطالعات ، بالخصوص اواخر انیسویں صدی اور ابتدائی بیسویں صدی میں ، سائنسی سخت گیری کے دعوے کے ساتھ پیش کیے گئے اور اعداد و شمار کی جدولوں اور چارٹوں کی بھرمار کے ساتھ شایع کیے گئے۔ F.G.Fleay کی تصنیف Shakespeare Manual (1878) اس قسم کے کاموں کی ایک سہل الحصول مثال ہے۔ اس نوعیت کے تفصیلی ایباتی جائزے اور ذخیرہ الفاظ کے ٹیسٹ بہرطور ، صرف مقداری (Quantitative) نوعیت کے ہوتے ہیں نہ کہ معیاری (Qualitative) نوعیت کے۔ یہ مطالعات ایک غیر پختہ اور تخیل سے عاری ڈھنگ کے حامل ہوتے ہیں۔

۱۹۔ قافیہ پیمائی اور ذخیرۂ الفاظ یہ خاص زمرے ہیں اسالیبی شہادت کے۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ایک اور کا اضافہ ہوا یعنی Imagery (تشبیہیں، استعارے اور علامتیں) ۱۹۳۵ء میں Caroline Spurgeon نے اپنی کتاب Shakespeare's Imagery شائع کرائی جس میں ایک منظم و مرتب انداز میں بتایا گیا کہ شیکسپیر کو بعض خاص تشبیہیں اور استعارے یا ان کے مجموعے (Clusters) زیادہ مرغوب تھے جنھیں وہ بار بار استعمال میں لاتا تھا ، اور یہ چیز اس کے اسلوب خاص کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ بعد کو اسی انداز پر بیکن ، مارلو ، ڈیکر وغیرہ کے اسالیبی تجزیے بھی سامنے آئے۔ منفرد ایمجری کا یہ طریقہ قابل قبول نتائج دے سکتا ہے مگر اس میں کچھ نمایاں خطرات بھی ہیں، کیونکہ تشبیہوں اور استعاروں کی دوسرے اسالیبی زمروں کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے نقالی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ایمجری جو کچھ نتائج دے انھیں فیصلہ کن حیثیت نہیں دینی چاہیے بلکہ دوسرے نتائج کے ساتھ ملا کر تائیدی حیثیت دینا مناسب ہو گا۔

۲۰۔ ملکیتِ تصنیف کے مسئلے کو حل کرنے میں اسالیبی شہادت کی مدد لیتے وقت ایک اسکالر کو اس طرح کے سوالات اٹھانے چاہییں کہ مصنف کی مستند تصانیف سے اخذ کر کے جو معیارات قائم کیے گئے ہیں وہ کہاں تک معتبر ہیں۔ شعر گوئی کے انداز اور زبان اور ایمجری کی وہ خصوصیات کیا صرف اسی مصنف کا خاصہ ہیں یا دوسروں کے کلام میں بھی ملتی ہے یا کسی خاص دبستان سے وابستہ ہیں۔ کبھی کبھی ایک تصنیف کے شریک مصنفوں کے

اسلوب میں اس حد تک حیرت انگیز مشابہت بھی ملتی ہے کہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

۲۱۔ کسی مصنف کی متنازع اور مستند دونوں تصانیف کو پہلو بہ پہلو رکھ کر، باقاعدہ مقابلہ کرنے کی صورت میں مسئلے کے حل کی راہ میں ہم کچھ فاصلہ طے کر سکتے ہیں، لیکن یہ کبھی مکمل طور پر تاثراتیت کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ تاثراتی فیصلوں کی بھی ان ادبی مطالعات میں اپنی جگہ ہے بشرطیکہ ان کی ٹھوس بنیاد علم اور جمالیاتی بصیرت پر ہو۔ دقت نظر کے ساتھ کسی مصنف کی تصانیف کا طویل عرصے تک مطالعہ کرنے سے جو بصیرت و مہارت حاصل ہو جاتی ہے، کسی میکانکی تجزیے سے وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ تاہم اسے حتمی خیال کرنا تو مناسب نہ ہوگا، البتہ ایک محترم توجہ کی مستحق ضرور بھی جا سکتی ہے۔

۲۲۔ یہ بات بھی نظر میں رکھنی چاہیے کہ اگرچہ کسی مصنف کی تصنیف میں ایسی خصوصیات کا نہ پایا جانا جو بالعموم اس کی دوسری مستند تصانیف میں ملتی ہیں، اس تصنیف کو مصنف کی تصانیف میں شامل کرنے کے خلاف ایک نکتہ ہو سکتا ہے، لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی مصنف ہمیشہ ایک ہی انداز پر مستقل قائم رہنے والا نہیں ہو سکتا، اور کوئی ایسی نظم یا ناول بھی لکھ سکتا ہے جو اس کی دوسری تصانیف سے مختلف ہو۔

۲۳۔ خوش قسمتی سے داخلی شہادت کی ایک اور قسم بھی دستیاب ہے جس سے اسالیبی شہادت کے نتائج کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے یا تائید مزید حاصل کی جا سکتی ہے، اور وہ ہے تصورات و خیالات کی شہادت۔ متنازع تصنیف میں ظاہر کردہ تصورات و خیالات میں کسی مصنف کی مستند تصانیف کے تصورات و خیالات سے مشابہت ہو سکتی ہے۔ اس مشابہت کو متنازع ملکیت کی تصنیف کے بارے میں فیصلہ کرنے میں کتنی اہمیت دی جائے اس کا انحصار اس پر ہوگا کہ مشابہتیں کس تعداد میں ملتی ہیں اور یہ بھی کہ کس درجے کی مشابہتیں ہیں، مراد یہ کہ مخصوص زاویہ کیا ہے اور زور کس پر ہے جو اس مصنف کو بالعموم اس جیسی سوچ رکھنے والے دوسروں کی آرا سے ممتاز و منفرد بناتا ہے۔ سرپرست اور قریبی احباب اور دوسرے اشخاص کے بارے میں حوالے بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ متن میں ایسے واقعات کے حوالے بھی مددگار ہو سکتے ہیں جو اس کے لیے زیادہ معنی خیز ہوں اور کسی اور مصنف نے انھیں اتنی صحت کے ساتھ نہ بیان کیا ہو جتنا کہ وہ بیان کرتا ہے۔ کبھی اس کی اپنی ایسی غیر مطبوعہ تصانیف کے حوالے مل سکتے ہیں جن سے اس وقت وہی واقف ہو سکتا ہو، کوئی اور واقف نہ ہو۔ یہ چند مثالیں ہیں مخصوص معلومات سے متعلق تنقیح کی، جسے اسالیبی تجزیے ہی کا

ایک ضمنی نتیجہ کہنا چاہیے۔ اسالیب کے حوالے سے اگر سوال یہ بنتا ہے کہ ۔ کیا کوئی مصنف اس طرح لکھ سکتا تھا؟ " تو یہ طریقہ مزید یہ سوال اٹھاتا ہے کہ ۔ کیا کوئی اور مصنف یہ کچھ جان سکتا تھا جو یہ مصنف جانتا ہے ؟"۔ اگر ان سوالات کا جواب " ہاں " میں ہے تو پھر ثبوت کے لیے متن کے علاوہ کہیں اور دیکھنا ہوگا ۔ یعنی خارجی شہادت کی طرف توجہ مبذول کرنی ہوگی۔

۱۴۔ درست انتساب کی تحقیق کے لیے خارجی ذرائع کی چھان بین بھی ضروری ہے شاید مصنف نے اپنی کسی نجی دستاویز یا کسی دوسری تصنیف میں کوئی ایسی بات لکھی ہو جو انتساب کے مسئلے کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ چاسر نے اپنی دو منظومات کی تمہیدات میں اپنی نظموں کی قیمتی فہرستیں چھوڑی تھیں۔ بالعموم اگر کوئی مصنف یہ لکھے کہ اس نے یہ اور یہ تصانیف لکھی ہیں تو ہم اس پر یقین کر سکتے ہیں ۔ گو کہ بعض لکھنے والے ایسی کتابوں کے لکھنے کا دعوی کرتے ہوئے ملتے ہیں جو انھوں نے نہیں لکھیں اور جنھیں ماننے سے دوسرے انکاری ہیں ۔ یا کوئی واقف حال صراحت کر دیتا ہے کہ فلاں نظم یا مضمون تو فلاں کی ہے ۔ مثال کے طور پر ملٹن کے Nephew اور شاگرد ایڈورڈ فلپس نے اپنے انکل کی تصانیف کی ایک قیمتی فہرست چھوڑی۔ ایسے بیانات درست ہوں تو بے شک مفید ہیں لیکن شہادت کے اصولوں کے مطابق ان کی قدروقیمت کا تعین کیا جانا چاہیے (ان اصولوں کی تصریح رچرڈ ایلٹیک نے اپنی کتاب کے باب دوم میں کی ہے)۔ سوالات اٹھنے چاہییں کہ شہادت دینے والا کیا سچ جاننے کی پوزیشن میں تھا؟ اس کا بیان صحیح صحیح معلومات پر مبنی ہے یا سُنی سُنائی باتوں پر ؟ کوئی سبب ایسا تو موجود نہیں تھا کہ اس نے سچ کا اظہار خود نہ کرنا چاہا ہو؟ وغیرہ وغیرہ ۔ سولہویں صدی سے لے کر اٹھارہویں صدی کی Common place کتابوں میں ایسی شخصی یادداشتیں اور مکتوبات مل سکتے ہیں جن کی وجہ سے اس دور کی نظمیں غلط یا مشکوک انتسابات کا شکار ہوئیں۔

۱۵۔ ناشرین کا ریکارڈ ، اگر موجود رہ گیا ہو ، گمنام یا جعلی کتابوں کی ملکیت کے مسئلے پر کبھی کبھی معلومات بہم پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح رسائل میں شائع ہونے والی بے نام تحریروں کے لکھنے والوں سے متعلق معلومات بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ مدیران و ناشرین کی فائلوں اور حسابات کے رجسٹروں نے ہمیں اس قابل بنایا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے Monthly Review اور انیسویں صدی کے Edinburgh Quarterly اور بعض دوسرے رسائل کے قلم کاروں کو شناخت کر سکیں۔ اور جہاں ایسے ریکارڈ دستیاب نہیں وہاں بھی اس کا امکان ہے کہ اگر رسائل میں پہلی بار بغیر نام کے اشاعت عمل میں آئی ہو تو بعد کے کتابی شکل میں چھپنے والے

مجموعوں میں نام درج کیا گیا ہو۔ ٹائمز لے ادبی ضمیمے میں چھپنے والے تبصرے بے نام تھے مگر ان میں سے کئی کا انکشاف ہو گیا۔ جب ٹی ایس ایلیٹ، مڈلٹن مری، ورجینیا وولف اور ایڈمنڈ بلنڈن کے مضامین مجموعوں میں شامل ہو کر دوبارہ ان کی اشاعت عمل میں آئی۔

۲۶۔ ملکیت تصنیف کے یہ سب واضح سراغ بھی ناکام رہیں تو واقعاتی شہادت کی متعدد صورتیں ایسی ہیں جن سے کچھ نہ کچھ نتائج نکل آتے ہیں، وہ زیادہ بہتر نہیں تو بظاہر معقول یا ممکن تو ہوتے ہی ہیں۔ اگر کسی مصنف کے بارے میں علم ہو کہ اس نے کسی خاص رسالے میں کسی معلوم مدت کے اندر مضامین لکھے ہیں تو اخراج (Elimination) کے طریقے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ خاص اس مصنف کا مضمون کون سا ہے۔ ہم ہر کیس میں شہادتوں کا جائزہ لے کر اپنی تحقیق کے دائرے کو تنگ کرتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ زیر تحقیق مضمون کا کوئی ایک امیدوار رہ جاتا ہے۔ مزید یہ کہ اگر کوئی بے نام اور جعلی تصنیف کسی ایسے ناشر نے چھاپی ہے جو ہمارے گمان میں آنے والے مصنف کی دوسری اصلی کتابوں کا ناشر بھی ہے تو گویا تلازمہ خیال کی ایک کڑی ہمارے پاس ہے جو اگر نتیجہ خیز نہ بھی ہو تو معنی خیز اور محرک خیال تو ہے ہی۔

۲۷۔ ٹیکنیکل ببلیو گرافیوں سے حاصل ہونے والی شہادت بھی مصنف کے انتساب کی تعیین میں مددگار ہو سکتی ہے۔ کئی برس پہلے کی بات ہے کہ Spectator کی اولین طباعت کے ورقوں میں موجود نقشوں اور متنی مواد، حتیٰ کہ اشتہارات کی چھان بین کرتے ہوئے، Donald F. Bond نے دریافت کیا کہ دو مختلف طابع اس کی اشاعتوں کو باری باری چھاپتے تھے تاکہ مانگ پوری کرنے کے لیے کافی تعداد میں کاپیاں چھاپ سکیں۔ ظاہر ہے کہ ہر طابع کا قلم کاروں کا ایک گروہ تھا۔ Spectator 555 میں ایک قلمکار Budgell کی ستائیس تحریریں ایک طابع کی چھاپی ہوئی شناخت کی گئی ہیں، اب یہ ایک منطقی بات ہے کہ اس قلم کار کی دوسری تحریریں بھی اسی طابع نے چھاپی ہوں۔ باری باری طباعتوں کے اس نظام کی دریافت کے بعد عین ممکن ہے کہ مضامین کے انتساب کا مسئلہ حل کرنے میں اور زیادہ آسانی ہو جائے، کیونکہ امکاناً ایڈیسن کے دوستوں کی تحریریں طباعت کے لیے ایک طابع کو بھیجی گئی ہوں گی تو اسٹیل کے دوستوں کی تحریریں دوسرے طابع کو۔

۲۸۔ کسی کتاب یا کتابچے کا سرورق، یا پایئن صفحہ کسی مضمون کے خاتمے پر نام کا اندراج، داخلی و خارجی شہادت کے بین بین کی چیز ہے۔ اس طرح کے بہت سے نام فرضی

بھی ملتے ہیں مثلاً پیٹر پارلے (اصلی نام گڈ رچ) وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی اور امریکی لٹریچر کے طالب علم کو اکثر فرضی ناموں سے واسطہ پیش آتا ہے، اور ایسی گمنام کتابوں سے بھی جن کے مصنفوں کے ناموں کی شناخت ہو گئی ہے۔ اس نوعیت کی معلومات Halkert اور Laing کی نو جلدوں پر مشتمل معیاری کتاب حوالہ

Dictionary of Anonymous & Pseudonymous English Literature

میں ہیں۔ کتاب ایسے قابل اعتماد اور معیاری حوالوں کی مدد سے تیار کی گئی ہے جن میں شناختیں عمدہ طور پر کی گئی ہیں اور ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۸۔ اب تک یہ اندازہ ہو چکا ہو گا کہ کسی انتساب کا اعتبار داخلی و خارجی دونوں شہادتوں کے مجموعی وزن سے قائم ہوتا ہے۔ صرف اسلوب یا Content یا دونوں ملا کر بھی شاذ و نادر ہی کسی مشکوک کتاب کی نسبت کسی خاص مصنف کے ساتھ قائم کرنے میں کافی ثبوت فراہم کر سکتے ہیں۔ اسی طرح جہاں داخلی شہادت مشکوک یا معدوم ہو، وہاں خارجی شہادت ثبوت کے صرف قریب پہنچانے کا کام کر سکتی ہے۔ درست تر یہ ہے کہ مختلف قسم کی شہادتیں جب کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں، تبھی تصنیف کی ملکیت کے بارے میں حتمی استدلال ہاتھ آتا ہے۔

اضافہ:

تصریحات بالا میں ایک جگہ شہادتوں کی چھان بین کا حوالہ آتا ہے، جس پر ایلٹیک نے اپنی اس کتاب کے باب دوم میں روشنی ڈالی ہے۔ اس میں چند خاص خاص نکتے یہ ہیں کہ مصنفوں کے خود نوشت سوانحی مواد کو ہرگز من و عن قبول نہیں کر لینا چاہیے۔ جب کسی واقعے کے بارے میں چشم دید گواہوں یا اس واقعے میں شریک لوگوں یا معاصرین کی معلومات کو استعمال میں لا رہے ہوں، تب بھی جرح کے چند سوالات ذہن میں رکھنے چاہئیں جیسا کہ عدالت میں ایک اٹارنی کسی گواہ سے کرتا ہے: مثلاً یہ کہ بیان کی درستی کے معاملے میں اس آدمی کی عام شہرت کیسی ہے؟ کسی اور معاملے میں جھوٹ پکڑا گیا ہے؟ ایسے آدمی کی شہادت از خود تو مسترد نہیں ہو جاتی لیکن اس کے معاملے میں معمول سے زیادہ احتیاط ضروری ہے، وغیرہ وغیرہ۔ تعصب اور جانبداری سے بھی شہادت داغدار ہو سکتی ہے۔ اصولی طور پر صرف خصومت و عناد ہی کو واحد سبب کسی معاصر بیان کو مشکوک ٹھہرانے کے لیے خیال کر

لینا مناسب نہ ہو گا۔ کچھ اور ذاتی نوعیت کے ملفوظات بھی ہو سکتے ہیں۔ اثر انداز ہونے والے تعصبات کا ایک طویل سلسلہ ہے جنھیں جدا جدا کر کے سمجھنے کی صلاحیت کے واسطے، حقائق جاننے کے علاوہ سے علم نفسیات سے ماہرانہ واقفیت بھی چاہیے۔ ہم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں تو ایسے مفروضات پر نظر رکھ سکتے ہیں جو پروان چڑھ رہے ہوں۔ ذمے دار قسم کے اسکالر ایسے غلط بیانات کی تصحیح کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تاکہ ان کے جڑ پکڑنے اور پھیلنے سے پہلے ہی تدارک ہو جائے۔ چونکہ اس سائنٹفک دور میں بھی، گواہوں سے درست بیانی کی توقع لگا لینا حد سے زیادہ کی توقع ہے، اس لیے حال کے مصنفوں کے بارے میں بھی اسکالروں کو اسی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے جو وہ ملٹن اور شیکسپیئر کے بارے میں بیان کی جانے والی داستانوں کے معاملے میں برتنے کے عادی رہے ہیں۔ بنیادی شہادتوں کی قدروقیمت کو جانچنے کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب کہ یکساں اعتبار کی حامل اولین شہادتیں آپس میں اختلاف رکھتی ہوں۔ صحیح صحیح طور پر کس نے کیا کہا، یہ سوالات اہم ہیں، اور یہ بھی کہ کب کہا، مگر اسی قدر کافی نہیں، یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کس طرح اور کن حالات کے تحت کہا۔ آخر میں، ان فوری حالات پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے جن کے تحت کوئی بیان صادر ہوا ہو۔ اس سے بیان کی صداقت کا سراغ مل سکتا ہے۔
انیسویں صدی کی بے شمار سوانح عمریاں ایسے سوانحی خاکوں اور یادداشتوں سے گرانبار ہیں، جو ان شخصیتوں کی بیواؤں اور اولادوں کی فرمایش پر قریبی دوستوں نے لکھی ہیں جو صرف ایک حد تک ہی حقیقت کا اظہار کر سکتے تھے۔ اور دل خوش کن فضا تخلیق کرنے کے لیے کسی قدر جھوٹ ملا سکتے تھے۔ اسی طرح کسی خط کا مطالعہ بھی اس سے حاصل کی جانے والی فوری غرض اور کاتب و مکتوب الیہ کے تعلقات و مراسم کو نظر میں رکھ کر کیا جانا چاہیے۔ مکتوب نگار اپنے طرز عمل کو درست ثابت کرنے کے لیے جواز کی تلاش میں ہے، یا اپنی غرض کے مدنظر ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا ہے، یا کسی خاص عملی اقدام کے لیے دوسرے کو ترغیب دلانا چاہتا ہے؟ ہو سکتا ہے، کسی بھی وجہ سے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہا ہو۔ اور جسے خط لکھا ہے کیا وہ ایسا دوست ہے جس کے سامنے سینہ کھول کر رکھ دینے کا عادی ہو، یا تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ خط لکھنے والے نے دل کا حال چھپانے اور نادانستہ حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کی کوشش کی ہو۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں :

دیوان حضرت عبدالقادر جیلانیؒ

حضرت غوث اعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرّہ (م ۵۶۱ھ) سے منسوب ایک فارسی دیوان نول کشور نے کان پور سے ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۳ء (بار پنجم) شائع کیا تھا۔ عزیز محترم ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کی خواہش ہے کہ اس پر نظر ڈالی جائے۔ راقم الحروف اپنی ضعیفی اور صحت کی خرابی کی وجہ سے اب زیادہ غور نہیں کرسکتا، تاہم کوشش ہے کہ کوئی بات کام کی نکل آئے۔

۱۔ حضرت عبدالقادر جیلانی قدس سرّہ حسنی حسینی سیّد تھے۔ لیکن موجودہ دیوان کی اس غزل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا سیّد نہیں تھا۔

غلامِ حلقہ بگوشِ رسولِ ساداتم   زہے نجات نمودن حبیب و آیا تم

کفایت ست ز روحِ رسول ، اولادش   ہمیشہ در دو جہاں جملۂ مہماتم

ز غیرِ آلِ نبی حاجتے اگر طلبم   روا مدار یکے از ہزار حاجاتم

دلم ز محبّ محمدؐ پرست وآل مجید   گواہِ حالِ من ست ایں ہمہ حکایاتم

چو ذرّہ ذرّہ شود ایں تنم بخاکِ لحد   تو بشنوی صلوات از تمیع ذرّاتم

کمینہ خادمِ خدّام خاندانِ تو ام   ز خادمیِ تو دایم بود مباہاتم...

۲۔ حضرت عبدالقادر جیلانی قدس سرّہ کا لقب "محی الدّین" ہوا ، معلوم نہیں ان کی زندگی میں یا بعد میں۔ بہرحال یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ اگر انھوں نے شاعری کی ہوتی تو دوسروں کے دیے ہوئے لقب کو کبھی اپنا تخلص نہ بناتے۔ اس پورے دیوان میں تخلص "محی" ہے۔

۳۔ شاعر نے یہ دیوان اپنی پیری اور آخرِ عمر میں لکھا تھا۔

نظرے کن بہ عنایت تو دریں آخرِ عمر   سوے ایں بندہ کہ در عین بلا افتادہ ست

بخدا در نظر محی تو پیوستہ دلت   طالب فقر و محبت فقرا[1] افتادہ ست

شدم پیر از غم تو ، کز جوانی بردہم گر جان ۔ آخر بندۂ پیری ، پسر آزاد باید کرد

می چوں درمو سفیدی دید گفت آہ و دریغ نامۂ دارم سیہ تر از شب تاریک رنگ

حضرت عبدالقادر جیلانی کی ضعیفی میں بھی شعر و شاعری کرنے کا کوئی واقعہ کسی مستند کتاب میں نہیں ملتا۔ گلستان سعدی (باب دوم) میں ان کی خشیت و خضوع کا یہ واقعہ مرقوم ہے:۔

"عبدالقادر گیلانی را دیدند (رحمۃ اللہ علیہ) در حرم کعبہ ، روے بر حصا نہادہ بود و می گفت اے خداوند بخشای داگر مستوجب عقوبتم مرا روز قیامت نابینا بر انگیز تا در روے نیکاں شرمسار نہ باشم (۲)

ایسے بزرگ سے توقع نہیں کہ وہ بڑھاپے میں ایسی شاعری کرنے لگے ہوں گے۔

۴۔ ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شاعر نے شادی نہیں کی۔ اس کے برعکس حضرت عبدالقادر جیلانی کے کئی صاحبزادے تھے۔ وہ شعر اسی طرح ہے

عاشقاں نے حور خواہند نے بہشت از بہر آں فارغ اند از کتخدائی ، خانماں کردہ خراب (صفحہ ۰)

۵۔ کئی اشعار ایسے ہیں کہ جن میں دال وزن سے خارج ہے لیکن اس شاعر کے یہاں جائز ہے۔ حضرت جیلانی قدس سرہ کے عہد میں ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔

ایک شعر تو وہی ہے۔ یعنی عاشقاں نے حور خواہند نے بہشت از بہر آں...

گر تماشاے جمال حق بناشد در بہشت کنند مستان حضرت، قصر یارا خشت خشت (صفحہ ۸)

حور چو آرا کنند رو بسو ، ما کنند چشم نگہدار ازاں دوست بود بس غیور (صفحہ ۲۹)

تا قیامت می خواہد خواند ایں ابیات را خلق و عالم ہم بپاے می روند ہم پاندار (صفحہ ۲۸)

حضرت اونیم شب گوید کہ اے ابوالعجب ہیچ مکن آشکار کردۂ پنہاں خویش (صفحہ ۳۴)

کے بود آیا کہ بنمائی جمال باکمال زندہ گردند ماہیانِ مردہ از آب زلال (صفحہ ۵۳)

می گریزند زاہدان خشک از تر دامنی ما بر خورشید خود یا دامن ترمی رویم (صفحہ ۴۴)

۶۔ خیال ہے کہ حضرت عبدالقادر گیلانی کے زمانے میں "سیاہ پوشی" ماتم کے لیے استعمال نہیں تھی ۔ اس شاعر کے یہاں ہے۔

مُرد می و سیہ پوشید بہر ماتمش ہر کجا ورقے بود اوراق دیوان من ست (صفحہ ۱۰)

بعد میں طالب آملی (م ۱۰۳۵ھ) کے یہاں بھی مستعمل ہے۔

بہ مرگ ، اشک سیہ پوش گشتہ دیدہ کجاست لباس خون دل کز عزا بدول آید

ایک جگہ ہمارے شاعر نے پوشیدہ رہنے کے لیے بھی "سیاہ پوشی" استعمال کی ہے

تاکہ بینم دوست را ایں حلہ اے پوشم سیاہ از میان حلہ ہای رنگ رنگ اندر بہشت (صفحہ ۸)

۸۔ بنگ کا لفظ اس شاعر نے استعمال کیا ہے :۔

بندہ ای گر بنگ خوردی در شراب توبہ کن آمرزمت بے پیچ و تاب (صفحہ ۹)

فرہنگ آنند راج میں کمال خجندی اور شفائی (م ۱۰۳۷ھ) کے اشعار دیئے گئے ہیں جن میں لفظ "بنگ" مستعمل ہے۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع (م ۱۹۶۳ء) نے مجھ سے فرمایا تھا کہ "بنگ" لفظ حضرت عبدالقادر جیلانی کے زمانے میں نہیں تھا۔

اور میرے بزرگ استاد پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے فرمایا تھا کہ یہ دیوان محی لاری (م ۹۳۳ھ) کا ہے۔ وہ فتوح الحرمین (درمناسک و آداب حج) کے مصنف تھے۔

یہ مختصر سا جائزہ ہے جو مجھ حقیر سے ہوسکا۔ ہمارے فضلاء اس سے بہتر لکھ سکتے ہیں

حواشی

(۱) کوئی اور لفظ رہا ہوگا۔

(۲) اقبال نے بھی خوب کہا ہے : گر عذاب من بنا شد ناگزیر ۔ از نگاہ مصطفےٰ پنہاں بگیر

شاعر نے ایک شعر میں سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) کے فیل محمودی کا ذکر کیا ہے

فیل محمودی فرد ماند اگر بیند بخواب بار سنگینی کہ از درد تو مارا بر دل ست (صفحہ ۱۲)

ایک شعر میں چند صوفیہ کا ذکر بھی ہے۔

محی بابا دار خود را بے ریاضت تا ترا چوں جنید و بایزید و شبلی و ذوالنون کنم (صفحہ ۳۴)

ڈاکٹر نذیر احمد:

حافظ شیرازی کے دیوان میں غلط انتسابات کی مثالیں

حافظ شیرازی فارسی کا وہ مشہور شاعر ہے جس کے کلام کی تحقیق و تدقیق میں سیکڑوں محققین اور دانشوروں نے حصہ لیا ہے اور حق بات تو یہ ہے کہ ان سارے محققین کی تمام کوششوں کے باوجود ابھی حافظ کا ایسا کوئی دیوان شایع نہیں ہوا ہے جو ہر طرح کے الحاق سے پاک ہو۔ ادھر ڈاکٹر خانلری کا مرتبہ دیوان طبع ہوا ہے جو اگرچہ اب تک کے شایع شدہ دیوانوں میں سب سے معتبر سمجھا جاتا ہے، لیکن وہ بھی تحقیق کے معیار پر ہر طرح سے پورا نہیں اترتا۔ راقم نے اس سلسلے میں انگریزی (۱) اور فارسی (۲) میں الگ الگ مقالے چھاپے ہیں جن میں اس مسئلے پر کافی بحث کی ہے۔

حافظ کے کلام میں الحاق کی بحث سب سے پہلے علامہ قزوینی نے شروع کی، چنانچہ ایک تنقیدی دیوان ۱۳۲۰ شمسی / ۱۳۶۰ھ میں شایع کیا جس کی بنیاد نسخۂ خلخالی پر تھی جو ۸۲۷ھ کا مکتوبہ ہے اور اس وقت کے معلوم شدہ قلمی نسخوں میں سب سے قدیم تھا۔ علامہ نے ایک نظریہ یہ قایم کیا کہ یہ قدیم نسخہ الحاق سے پاک ہے، اور اس میں جو کلام ہے وہی حافظ کا ہے۔ نہ کم نہ بیش، اور جو کچھ زاید کلام بعد کے نسخوں میں ہے، خواہ وہ قلمی ہوں یا مطبوعہ۔ وہ سب الحاقی ہے۔ اس کا حافظ سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے انتقادی متن کی بنیاد نسخۂ خلخالی پر رکھتے ہوئے سارے زاید کلام کو خارج کردیا۔ علامہ کا یہ مشہور بیان مقدمہ دیوان میں درج ہے جس کا ترجمہ (۳) ذیل میں پیش ہے:

"چونکہ نسخۂ "خ" (خلخالی) جس کی کتابت ۸۲۷ھ میں ہوئی ہے۔ موجودہ صورت میں جب تک کوئی دوسرا قدیم تر نسخہ مکشوف نہ ہو۔ اس کو دیوان حافظ کا دنیا بھر میں سب سے قدیم تاریخ دار نسخہ قرار دیا جائے، لہذا (دیوان حافظ کی ترتیب میں) میں نے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے کہ خصوصاً کمیت اشعار یعنی غزلیات کی تعداد اور ہر غزل کے اشعار کی تعداد کے لحاظ سے اس کتاب کی ابتدا سے انتہا تک صرف اسی نسخے کو اپنے کام کی بنیاد قرار دے رہا ہوں، اور جو کچھ اس نسخے میں موجود ہے۔ خواہ غزلیات ہوں یا مقطعات یا مثنویات یا رباعیات۔ تمام کی تمام

بغیر کمی بیشی کے انھیں اس کتاب میں شامل کروں گا۔ اور جو اس نسخے میں موجود نہیں، خواہ مستقل غزلیں یا بعض غزلوں کی متفرق ابیات وغیرہ انھیں کالعدم سمجھتے ہوئے پوری طرح ان سے صرف نظر کروں گا۔ اس لیے کہ یہ نسخہ یعنی نسخۂ خ دیوان حافظ کا کامل نسخہ ہے۔ اس کا خلاصہ یا انتخاب نہیں۔ پس جو اس نسخے میں شامل نہیں قوی احتمال ہے بلکہ تقریباً قطعی و یقینی ہے کہ وہ الحاقی ہے اور دوسرے شاعروں کے اشعار ہیں جو بعد میں دیوان خواجہ (حافظ) میں شامل کرلیے گئے ہیں"۔

اس نظریے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مروجہ دیوان کی کئی سو غزلیں (۴) اور کئی سو متفرق اشعار حافظ کے دیوان سے نکال دیے گئے اور علامہ قزوینی کے فیصلے کے مطابق وہ حافظ کے اشعار نہیں ہوسکتے۔

حسن اتفاق سے حافظ کے دیوان کے دو قدیم نسخوں تک میری رسائی ہوئی۔ ان میں سے ایک آصفیہ لائبریری (۵) کا نسخہ تھا جو باوجود اس کے کہ اس کی تاریخ کتابت ۸۱۸ھ کی ہے، وہ خلاصہ دیوان حافظ ہے۔ اس میں ۳۵۷ غزلیں، ۱۲ قطعے، ۲۰ رباعیاں ہیں۔ ان میں سے نو غزلیں، پانچ قطعے اور تین رباعیاں نسخۂ خلخالی میں نہیں۔ نسخۂ گورکھپور ۸۲۴ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس میں کل ۴۳۲ غزلیں ۱۸ قطعے، ۲۷ رباعیاں، اور ۵ فرد نسخۂ خلخالی میں نہیں۔ آصفیہ اور گورکھپور کے زاید منظومات میں کچھ دونوں میں مشترک ہیں۔ ان کو نکال کر دونوں نسخوں میں جو زاید منظومات ہیں ان کی نوعیت (۶) یہ ہے:

غزلیات ۱۳، قطعات ۱۰، رباعی ۷، فرد ۲

ان زاید منظومات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ قزوینی کے قرارداده الحاقی منظومات میں سے نسخۂ آصفیہ اور نسخۂ گورکھپور کے زاید منظومات خود علامہ کے اصول (یعنی قدیم نسخے کے مندرجات الحاق سے پاک ہیں) کی بنا پر حافظ کا اصیل کلام ہیں۔ ان کو الحاقی قرار دینا خود علامہ کے اصول کے مطابق بالکل غلط ہے، حالانکہ وہ خود ایسا کرچکے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ حافظ کے دیوان میں الحاقی کلام کا تعین تقریباً ناممکن ہے، اور اب تک اس سلسلے کی ساری کوششوں کا نتیجہ بے سود ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم غزل کا مسئلہ تقریباً لاینحل سا ہوگیا ہے (۷)۔ "مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف" سیف جام ہروی کا مرتب کیا ہوا مجموعہ ہے جس کی ترتیب میں بڑی مدت صرف ہوئی۔ مرتب نے یہ کام ہندوستان میں فیروز شاہ تغلق کے عہد (۷۵۲ھ - ۷۹۰ھ) میں

شروع کیا تھا (اس کا ذکر خلد اللہ ملکہ سے کرتا ہے) اور ۸۰۲ھ (عہد مبارکشاہ شرقی) کے بعد تک اس کی ترتیب میں مشغول رہا۔ اس میں حسب ذیل منظومہ (بعنوان قصیدہ) شامل ہے:

ای وصل جان نوازت معمار خانہ دل و ای جان و دل زلعلت مقصود کردہ حاصل

قصر حیات باشد زندان جان شیرین گر وصل تو ندارد سر در خرابہ داخل

صحن سرای دل را شستم ز آب دیدہ در دی غمت جو شادی جانان جو کرد منزل

از سوز سینہ ہر شب جان راست دست بر دل وز آب دیدہ ہر دم دل راست پای در گل

جانا بہ بحر عشقت بی آشنا و رہبر کشتی دل فگندم تا کی رسد بساحل

در جان و دیدہ دل ای مشتری شمایل مہر تو سیر دارد جون ماہ در منازل

باز آی تا بنوشد جان شرتی ز وصلت ای من ز جام ہجرت نوشیدہ زہر قاتل

صد خون بگردن جان داری، چہ باشد آخر گر بیدلی کند دست در گردنت حمایل

از روی دلنوازی با ما اگر بسازی جان پروریم باہم در عہد شاہ عادل

قطب سپہر شاہی دریا دلی کہ دستش کرد از سحاب احسان سیراب جان سایل

تا ہست جوہر جان محمود باد سلطان گشتہ ز دل غلامش ہر دم ہزار مقبل

خانلری صاحب، آقائی مجتبیٰ مینوی اور بعض دوسرے ایرانی محقق اس منظومے کو حافظ کا ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ مجتبیٰ مینوی میرے استدلال سے کہ چونکہ یہ نظم مجموعۃ لطایف کے دو الگ الگ نسخوں میں موجود ہے، ساتھ ہی اس مجموعے میں حافظ کی ۱۲۶ اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ مزید کہ قطب شاہ برادر شاہ شجاع شیراز کا حکمراں بھی رہ چکا ہے (۷۶۵ھ تا ۷۶۶ھ) وہ خاموش ہوگئے لیکن ڈاکٹر خانلری نے بڑی شدت سے اس انتساب کو رد کیا۔ اگرچہ ایرانی دانشوروں کا یہ قول کہ یہ منظومہ حافظ کے منظومات کے مقابلے میں نہایت فروتر ہے بالکل صحیح ہے لیکن تاریخی شواہد کے پیش نظر سوائے اس کے کہ اسے حافظ کا قرار دیں کوئی چارہ نہیں۔ ڈاکٹر مسعود فرزاد نے اس منظومے کی دو بیتیں کتاب "حافظ۔ گزارش از نیمہ راہ" میں چھاپی ہیں لیکن اس کے اصیل ہونے میں شبہے کا اظہار کیا ہے۔ اور انھیں ایسی غزلوں کے ساتھ رکھا ہے جن کا حافظ کی طرف انتساب مشکوک (۸) ہے۔

اوپر جتنی بحث ہوئی ہے وہ حافظ کے کلام میں الحاق سے متعلق ہے۔ کلام کے غلط

انتساب کی بحث اس میں شامل نہیں، گو الحاق کلام بھی غلط انتساب کی ایک شکل ہے، لیکن الحاقی کلام کے ناظم یا ناظموں کا تعین نہیں ہوسکتا، اس لیے غلط انتساب کا مقصد ایک حد تک فوت ہو جاتا ہے۔ غلط انتساب میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اول یہ کہ کوئی کلام، شعر یا دیوان یا کوئی اور کتاب ہو جو کسی نہ کسی مصنف یا شاعر کے نام سے ہو اور یہ انتساب غلط ہو، دوم یہ کہ کلام، شعر، دیوان یا اور کوئی کتاب ہو، اس کے اصل ناظم یا مصنف کا پتا لگایا جاسکتا ہو۔

حافظ کے دیوان میں غلط انتسابات کی واضح مثالیں مل جاتی ہیں، یہ غلط انتساب رباعیوں میں ہے۔ حال ہی میں فارسی رباعیات کا ایک ضخیم مجموعہ نزہت المجالس نام کا کشوف ہوا ہے۔ اس کا مرتب جمال خلیل شروانی ہے۔ اس میں کل ۱۶ باب ہیں، سولہواں باب عمر خیام کی رباعیات سے متعلق ہے لیکن اس کے ذیل میں دوسرے شاعروں کی بھی رباعیات منقول ہیں۔ کل شاعروں کی تعداد ۲۸۰ اور رباعیات کی ۴۱۳۹ ہیں۔

جمال شروانی علاء الدین شروان شاہ فریبرز سوم پسر گشتاسب (۶۲۲ھ - ۶۳۹ھ) (۹) سے وابستہ تھا اور اسی نسبت سے اپنے اس مجموعے کے آخری حصے میں بادشاہ مذکور کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس نظم سے اس امر میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ یہ مجموعہ ۶۲۲ھ اور ۶۳۹ھ کے درمیان مرتب ہوا ہوگا، اور اس پر نظر ثانی بعد تک ہوتی رہی ہے جس کا ثبوت اس سے فراہم ہوتا ہے کہ اس میں ایسے شعرا کی بھی رباعیاں ہیں جو ۶۳۹ھ کے بعد کے ہیں، گو یہ بھی قابل ذکر ہے کہ متذکر الصدر شعرا کی وفات ۶۳۹ھ کے بعد کی ہے۔ امکان ہے کہ ان کا کلام ان کی زندگی کے دور اواسط کا ہو جو ۶۳۹ھ کے حدود میں پڑتا ہو، بہرحال اس مجموعے کو ۶۳۹ھ کے قریب کا ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ اس مجموعے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے جو ترکی سے حاصل ہوا (۱۰) اس کی کتابت ۷۳۱ھ کی ہے، اور ترقیمہ اس طرح پر ہے:

"تمت نزہۃ المجالس (۱۱) فی الاشعار بحمد اللہ الواہب القہار علیٰ ید العبد الضعیف الراجی الی رحمۃ ربہ اللطیف اسماعیل بن اسفندیار بن محمد بن اسفندیار (۱۲) الابہری اصلح اللہ شانہ عمن شانہ فی یوم الخمیس وقت الظہر من خامس عشرین شوال سنۃ احدی وثلثین و سبعمائۃ والسلام علی من اتبع الہدیٰ"

اس مجموعے پر راقم الحروف کا ایک مقالہ مجلہ تحقیق میں شائع ہوچکا ہے۔ اس لیے اس پر اور زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اس مجموعے پر راقم رباعیات کا مطالعہ معاصر شاعروں کی رباعیات کی اصالت کے تعین میں نہایت ضروری ہے۔ اس کے مقیاس (۱۳) پر حافظ کی رباعیات کی اصالت پرکھی جاسکتی ہے۔ حافظ کا انتقال ۷۹۲ھ میں۔ اور ان کی پیدائش آٹھویں صدی کے ربع اول کے قریب ہوئی ہے چنانچہ بعض لوگ ۷۲۰ھ حافظ کی تاریخ پیدائش ٹھہراتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ حافظ کی پیدائش سے تقریباً پون صدی پہلے مرتب ہوا ہوگا۔ اور اس کی کتابت کے وقت حافظ چار سال کے بچے رہے ہوں گے۔ اس لیے اس مجموعے میں حافظ کی رباعیوں کے شامل ہونے کا سوال نہیں ہوتا۔ لیکن حافظ کے دیوان مرتبۂ قزوینی کی آٹھ رباعیاں اس مجموعے میں شامل ہیں جن میں سے حسب ذیل چار رباعیاں کمال اسماعیل کے نام ہیں:

امشب زغمت میان خون خواہم خفت　　وز بستر عافیت برون خواہم خفت
باور نکنی خیال خود را بفرست　　تا در نگرد کی بی تو چون خواہم خفت

(ص ۳۷۷)

لب بازیگر یک زمان از لب جام　　تا بستانی کام جہان از لب جام
در جام جہان چو تلخ و شیرین بہمست　　این از لب یار خواہ و آن از لب جام

(ص ۳۸۲)

خوبان جہان صید توان کرد بزر　　خوش خوش براز ایشان بتوان خورد بزر
نرگس کہ کلہ دار جہانست ببین　　کو نیز چگونہ سر در آورد بزر

(ص ۳۸۰)

آن جام طرب شکار بردستم نہ　　و آن ساغر چو نگار بر دستم نہ
آن می کہ چو زنجیر بپیچد برخود　　دیوانہ شدم بیار بر دستم نہ

(ص ۳۸۴)

یہ چاروں رباعیاں کمال اسماعیل کی ہیں۔ اور علاوہ نزہت المجالس کے۔ دیوان کمال مرتبہ آقای دکتر بحرالعلومی تہران ۱۳۴۸ میں موجود ہیں۔ دیکھیے ص ۸۲۶، ۸۲۲، ۹۰۹، ۹۱۰۔ ان میں دو رباعیاں نمبر ۲۰۱ نسخۂ گورکھپور میں بھی نقل ہیں اور واضح ہے کہ ان کا انتساب حافظ کی

طرف غلط ہے۔ وہ حافظ کی نہیں۔ کمال اسماعیل کی ہیں۔

حسب ذیل رباعی نزہۃ المجالس میں عائشہ سمرقندی کے نام سے ہے۔ اس انتساب کی تائید بعض تذکروں سے بھی ہوتی ہے:

گفتی کہ ترا شوم مدار اندیشہ دل خوش کن و بر صبر گمار اندیشہ
کو صبر و چہ دل کانچہ دلش می خواند یک قطرہ خونست و ہزار اندیشہ

(ص ۳۸۲)

حسب ذیل رباعی نزہۃ المجالس میں فتوحی کے نام سے نقل ہے:

ہر روز دلم بہ زیر باری دگر است در دیدہ من ز ہجر خاری دگر است
من جہد ہمی کنم قضا می گوید بیرون ز کفایت تو کاری دگر است

(ص ۳۷۷)

یہ دونوں رباعیاں نزہۃ المجالس میں ہیں۔ لیکن شاعر کا نام درج نہیں:

فی قصۂ آن شمع چگل بتوان گفت فی حال دل سوختہ دل بتوان گفت
غم در دل تنگ من ازانست کہ نیست یک دوست کہ با او غم دل بتوان گفت

(ص ۳۷۸)

این گل ز بر ہمنفسی می آید شادی بدلم ازو لبی می آید
پیوستہ از آن روی کنم ہمدمیش کز رنگ ویم بوی کسی می آید

(ص ۳۷۹)

ان میں سے نمبر ۵ اور ۶ دیوان مرتبۂ نذیر احمد وجلالی نائینی بھی حافظ ہی کے نام سے ہیں۔ لیکن جیسا شروع میں عرض کیا جاچکا ہے یہ آٹھوں رباعیاں حافظ کی نہیں اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ یہ مجموعۂ نزہۃ المجالس میں شامل ہیں جو حافظ کی پیدائش سے قبل کا ہے۔

حواشی

(۱) انڈو ایرانیکا، ایران سوسائٹی کلکتہ۔

(۲) ایران شناسی، واشنگٹن ڈی۔ سی، اور تحقیقات اسلامی، تہران۔ ۱۳۷۰۔

(۳) مقدمۂ دیوان حافظ، چاپ سینا، تہران، ص لط، اس سلسلے میں علامہ کے پورے مقدمے کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

(۴) قزوینی کے دیوان میں کل ۴۹۵ غزلیں ہیں، جب کہ ہندوستانی مطبوعہ دیوان میں ان سے کہیں زیادہ غزلیں ہیں۔ بقول علامہ ایک دیوان ایسا ملا جس میں آٹھ سو سے زیادہ غزلیں ہیں (مقدمہ ص "لہ")

(۵) اس سلسلے میں دیکھیے راقم کا مقالہ "دیوان حافظ کا ایک قدیم مخطوطہ"۔ مجلۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۱۔ ۱۹۶۲۔

(۶) راقم نے اس سلسلے میں تین مقالے لکھے، پہلا انگریزی میں جو انڈو ایرانیکا کلکتہ میں شائع ہوا (اسی مجلّے کے شمارہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں مجموعۂ لطایف کا تفصیلی تعارف ہے)۔ دوسرا مجلۂ ایران شناسی، واشنگٹن ڈی۔ سی، امریکا، اور تیسرا تحقیقات اسلامی تہران شمارہ ۱، ۲، ۱۳۷۰ (یادبود نامہ دکتر احمد طاہری عراقی ص ۳۳۰، ۳۵۱۔

(۷) دیکھیے انڈو ایرانیکا کلکتہ ستمبر ۱۹۶۶ء، فکر و نظر ۱۹۷۲ء دکتر نازیہ بلقیس بر ہمیں موضوع۔ راقم نے مجموعۂ لطایف کی ۱۲۰ غزلوں کا ایک انتقادی متن تیار کیا تھا جو "غزلہای حافظ" کے عنوان سے خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، دہلی کی طرف سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے، اس کے مقدمے میں اس مجموعے پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۸) دیکھیے "غزلہای حافظ"، دہلی نو ۱۹۹۱ء، ص ۲۴۔

(۹) تاریخ تالیف کی بحث کے لیے دیکھیے نزہت المجالس مقدمۂ مصحح (محمد امین ریاحی) ص ۳۶۔ ۳۸۔

(۱۰) دیکھیے مقدمۂ مصحح ص ۳۸، کتابخانہ سلیمانیہ استنبول، شمارہ ۱۶۶۷ء۔

(۱۱) مقدمۂ مصحح ص ۱۵ میں آخری صفحے کا عکس دیا ہے۔

(۱۲) نزہۃ المجالس ص ۶۱۷ میں ترقیمہ چھپا ہے۔ اس میں اسفندیار بن اسفندیار ہے، اور ہونا

چاہیے اسفندیار بن محمد بن اسفندیار۔

(۱۳) دکتر ریاحی نے مقدمے میں (ص ۳۲ ۰ ۳۳ پر) رباعیات سرگرداں کے ذیل میں حافظ کی رباعیوں پر بحث کی ہے لیکن اس میں نسخے کی تاریخ کتابت ۸۳۱ھ (جو خاتمے میں لفظوں میں درج ہے) کے بجائے ۸۳۲ھ درج کی۔ اور حافظ کی عمر ۲ سال کے بجائے ۱۲ سال لکھ دی ہے (ص ۳۳)

ڈاکٹر نذیر احمد

عمید لویکی کے کلام میں غلط انتسابات کی نشان دہی

عمید لویکی کا نام فضل اللہ ہے، تخلص عمید اور نسبت لویکی ہے۔ ساتویں صدی ہجری کا ہندوستانی فارسی شاعر ہے۔ اس کے دیوان میں سلطان علاء الدین مسعود بن سلطان التتمش اور سلطان ناصر الدین محمود بن التتمش کے مدحیہ اشعار ہیں۔ علاوہ بریں شمسی ملوک میں بعض کی مدح میں عمید کے اشعار ہیں۔ عزالدین بلبن کشلو خاں کے بیٹے نصیر الدین محمد سے اس کی وابستگی مسلم ہے۔ تاج الدین سنجر کریت خاں اور تاج الدین ابوبکر پسر ایاز ہزار مردہ اس کے ممدوح تھے۔

لویکی نسبت کا صحیح تعین

لویکی کچھ عجیب لفظ ہے، اس لیے یہ نسبت مختلف صورتوں میں ملتی ہے جیسے تولکی، لوکی، کولی، بوکی، بوکی، تولکی، نونکی، دیلمی، لیکن یہ ساری صورتیں غلط ہیں، صحیح صورت لویکی ہی ہے۔ منتخب التواریخ میں عمید لویکی کے آٹھ قصیدے نقل ہیں، لیکن اس میں اس شاعر کی نسبت تولکی ملتی ہے۔ یہ نسبت تولک سے منسوب ہے جو افغانستان میں ایک شہر تھا، راقم حروف نے اپنے ایک مقالے میں جو فکر و نظر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا، اس میں مختلف قرائن سے تولکی نسبت کے صحیح ہونے پر استدلال کیا، بلکہ اسی رسالے کے ۱۹۶۱ء کے ایک شمارے میں عمید کے کلام کا کچھ تعین کیا ہے، اس میں بھی عمید کو تولکی ہی لکھا ہے۔ عمید کے دیوان کے مکشوف ہونے کے بعد یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ تذکروں اور تاریخوں میں مندرج ساری نسبتیں غلط ہیں۔ صحیح نسبت لویکی ہے، جو خاندانی نسبت ہے۔ کسی مقام سے اس کا تعلق نہیں۔ دیوان میں عمید کا ایک قصیدہ ہے جو مجموعۂ لطائف و سفینۂ ظرایف میں نظامی گنجوی کے نام سے درج ہے، گنجینۂ گنجوی میں یہ قصیدہ نظامی کے نام سے ہے، لیکن مرتب کتاب کے بقول اس قصیدے کا انتساب نظامی کی طرف مشکوک بلکہ غلط ہے، اس کی بحث آگے آئے گی۔

عمید کے دیوان میں مندرج اس قصیدے میں ایک شعر آیا ہے جس سے یہ

اختلافی مسئلہ بڑی خوش اسلوبی سے حل ہوگیا۔ شعر یہ ہے (۱) :

نسب از عمر پذیرم حسب از تبار لویک   بکدام سلک دیدی دوگہر چنین منظّم

اسی بیت کے بعد قصیدۂ مذکور میں یہ بیت آئی ہے جس میں عمید نے اپنی نسبت لویکی درج کی ہے :

فلکا بزیر سقفت چو عمید لویکی کس   نہ نہد بکاخ معنی ز چنین قصیدہ سلّم

لویکی ایک خاندان کا نام تھا جو یقیناً کسی شخص کے نام پر مشہور ہوا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت کابل اور غزنین (غزنی) پر یہی خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کی فرمانروائی الپتگین کے زمانے تک باقی تھی، چنانچہ ایرانی تاریخ میں اس خاندان کا نام برابر ملتا ہے، یہاں تک کہ نظام الملک طوسی کی مشہور کتاب سیاست نامے میں یہ نام اس عبارت میں آیا ہے:

> الپتگین با امیر بامیان کہ شیر بامیک نام داشت جنگید و شیر را بگرفت و ازو در گذشت، پس ازین بر کابل حملہ آورد و بچۂ کابل شاہ را بگرفت کہ شہزادۂ کابل داماد لویک بود و درہمین ایام امیر غزنی لویک ہم گرفت و بہ سرخس رفت، چون الپتگین بدر غزنی شد لویک بیرون آمد و جنگ کرد دیگر بار پسر امیر کابل گرفتار آید و امیر غزنین بہزیمت شد
>
> (سیاست نامہ تصحیح قزوینی، تہران ۱۳۳۴، ص ۱۲۳)

طبقات ناصری میں الپتگین کے ضمن میں امیر غزنین کا ذکر آیا ہے، لیکن لویک کے بجائے انوک ہے جو یقیناً لویک کی تصحیف ہے (طبقات ج ۱ ص ۲۲۹ - ۲۲۰)

مجمل فصیحی میں حوادث سال ۳۵۴ھ کے ذیل میں آیا ہے:

> حرب اسحاق بن الپتگین ترک بالویک کہ پیشتر والی غزنی بود و الپتگین اورا بردن کردہ بود، چون اسحاق بن الپتگین بہ سرقند رفت و او بغزنی آمدہ بود و فرار لویک مذکور۔   (ج ۲ ص ۷۰)

استاد عبدالحی حبیبی نے کرامات سخی سرور کے حوالے سے لویکان غزنہ (۱۳۳۱) میں لکھا ہے کہ اس خانوادے کا نام اصلاً لویک تھا، جو کلمہ لوی بمعنی بزرگ سے بنا ہے۔ اس کے آخر میں "یک" (کاف تجلیل) کا اضافہ ہوا ہے جیساکہ افغانستان میں بعض کلمات پر

بھی آیا ہے مثلاً بارک، ہونک ، خنک ، شنیک ، خورک وغیرہ ۔ استاد حبیبی کے بقول بغلان کے کتبات میں لویک بطور لوغ مندرج ہے۔ استاد مذکور نے لویک نسبت کے دس ناموں کا پتا چلایا ہے۔ اور اگر عمید لویکی کا نام بڑھا دیا جائے تو گیارہ نام سامنے آتے ہیں۔

ہودی والا نے انوک ، ابوک ، کوبک کے ساتھ لویک بھی درج کیا ہے ۔اس سے واضح ہے کہ پہلی تین صورتیں لویک کی تصحیف ہوں گی (حواشی ہودی والا ، نقد تاریخ ایلیٹ ۲/ ۲۶۳)۔ اس سلسلے کی مزید تفصیل لویکان غزنہ کے علاوہ تعلیقات طبقات ناصری نوشتہ عبدالحی حبیبی، ج ۲ ص ۳۹۱ ۔ ۳۹۳ سے حاصل ہوگی۔

قصیدۂ تاج الدّین سنجر

دیوان لویکی (ص ۲۵۹ ۔ ۲۶۲) میں ایک قصیدہ کشتی ردیف کا مندرج ہے۔ اس قصیدے کا ایک ہی مأخذ منتخب التواریخ بداونی (ج ۱ ص ۱۱۳ ۔ ۱۱۶) ہے ۔ اس کا انگریزی ترجمہ رینکنگ نے کیا ہے (ص ۱۶۵ ۔ ۱۶۹)۔ مطلع یہ ہے :

مراست دیدہ محیط و خیال جان کشتی　　　برآب دیدہ ز غم می کند روان کشتی

ممدوح کا نام اس طرح آیا ہے :

امان ز بحر غم آنکہ طلب کہ دانی ساخت
چو من ز لوح مدیح خدایگان ، کشتی
مدار مملکت برّ و بحر تاج الحق
کہ بہر قلزم غم ساخت از امان، کشتی
سپہر مرتبہ سنجر کہ فتنہ زد یلہ کرد
بسوی معبر دریای قیروان کشتی

(دیوان ص ۲۶۰ ۔ ۲۶۱)

سیّد صباح الدّین عبدالرحمٰن نے بزم مملوکیہ (ص ۱۹۹) میں سنجر تبر خاں کے نام یہ قصیدہ منسوب کیا ہے، جو درست نہیں ہے۔ دراصل یہ قصیدہ سنجر تبر خاں کے بجائے سنجر کریت خاں کا ہے۔ لویکی کے زمانے میں سنجر نام کے کئی ملوک ہوئے ہیں، جیسے تاج الدین سنجر کزلک خاں شمسی (طبقات ۲/ ۳) تاج الدّین سنجر قتلق (ایضاً ۲۵) تاج الدّین سنجر کریت خاں (ایضاً ۲۷) ، تاج الدّین سنجر تبر خان (ایضاً ۲۸) تاج الدّین ارسلان سنجر (ایضاً ۳۳) ۔ سیّد صباح

الدین نے لوکی کے قصیدے کو تاج الدّین سنجر تبر خاں (کذا) (۲) کے نام قرار دیا ہے۔ لیکن اس ترجیح کی کوئی معقول وجہ نہیں لکھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ - تاج الدّین تبر خاں گرجی ترک تھا۔ ناصرالدین محمود کے دربار میں نائب امیر اور جنجانہ کا حاجب تھا۔ پھر وہ کسمندی اور مندیانہ اور برن کا اقطاع دار ہوا۔ کچھ دنوں وکیل در بھی رہا۔ پھر اودھ کا اقطاع دار مقرر ہوا۔ دوسرا تاج الدّین بیانہ کا اقطاع دار مقرر ہوا۔ پھر وکیل در ہوا۔ پھر اودھ۔ تبرمندہ کا اقطاع دار نامزد ہوا۔ پھر کڑہ کا۔ آخر میں لکھنوتی بھیجا گیا۔ لیکن درمیانی اور آخری دور میں اس کے تعلقات دربار شاہی سے استوار نہیں رہے۔ گمان یہی ہے کہ عمید نے یہ قصیدہ تاج الدین تبر خاں کے نام لکھا ہوگا"۔

خلاصہ یہ کہ بزم مملوکیہ کے مصنّف نے تاج الدّین سنجر نام کے چار امرا میں سے صرف دو کا ذکر کیا ہے۔ ایک کو اس بنا پر خارج کردیا ہے کہ آخر میں اس کے تعلقات درگاہ سے اچھے نہیں رہے تھے۔ اس لیے جو دوسرا باقی بچا وہی عمید کا ممدوح ٹھہرا۔ نہ جانے کیوں صباح الدین طبقات ناصری کے بیان کو نظر انداز کرگئے، جہاں دو کے بجائے چار تاج الدین سنجر کے نام کے ملوک مذکور ہیں۔

اور جیساکہ اوپر اشارہ کرچکا ہوں کہ عمید کا مخاطب امیر تاج الدّین سنجر کریت خاں تھا۔ پہلے اس کی زندگی کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے ممدوح عمید ہونے کے وجوہ بیان ہوں گے۔

کریت خاں (۳) ترک قنچاق تھا۔ دلیری و مردانگی کے ساتھ عقل و فرزانگی میں یکتائے عہد تھا۔ اس پائے کا سوار تھا کہ دو گھوڑوں پر ایک ہی وقت میں سواری کرتا۔ تیر اندازی میں ضرب المثل ہوگیا تھا۔ وہ یوز۔ باز یا شکاری کتّے شکار میں ساتھ نہ رکھتا۔ تیر سے شکار کرتا۔ اور کبھی اس کا وار خالی نہ جاتا۔ وہ شحنۂ بحر و کشتی تھا۔ منہاج سراج صاحبِ طبقات ناصری سے دوستی تھی۔ ۶۴۰ھ میں امرائے ترک نے مہذّب الدین وزیر کو اس کی ترک دشمنی کی وجہ سے قتل کر ڈالا تو اس بغاوت میں ترکوں کا سردار کریت خاں ہی تھا۔ اس واقعے کے بعد کریت خاں شحنۂ پیل۔ پھر سر جاندار۔ اس کے بعد برن کا اقطاع دار۔ پھر اودھ کا مقطع۔ آخر میں بہار کی طرف اس کی تعیناتی ہوئی۔ دفعتہً ایک موقع پر بہار کے قلعے کے نیچے سے کسی نے تیر چلایا اور وہ تیر کے زخم سے ہلاک ہوا۔

اس تفصیل سے کریت خاں کی چند خصوصیات کا پتا چلتا ہے جن میں دو قابل

ذکر ہیں:

۱۔ شکار سے بے پناہ لگاؤ

۲۔ بحر و کشتی کا شحنہ ہونا

تاج الدّین سنجر نام پر لویکی نے دو قصیدے لکھے۔ ان میں ایک کی ردیف آہو، اور دوسرے کی کشتی ہے۔ یہ دونوں قصیدے ایک ایسے ممدوح سے مناسبت رکھتے ہیں جس کو شکار کا شوق ہو اور جو بحر و کشتی کا شحنہ رہ چکا ہو۔ ذیل میں پہلے آہو ردیف کے قصیدے سے چند شعر، پھر کشتی ردیف والے کے چند شعر نقل کیے جائیں گے:

زہی ز نرگس مست تو پُر خمار آہو ز بند نافۂ مشک تو شرمسار آہو

بحیرتست دران چشم دیدۂ نرگس بحیرتست دران زلف مشکبار آہو

حدیث عنبر زلف تو تا رسیده بدو فگند قصّۂ نافہ در اختصار آہو

نجستہ شیر کمین تاج دین حق سنجر کہ شرزۂ فلکش ہست در شمار آہو

صواب دید کہ سوی خطا ز خاک درش برد شمامۂ کافور یادگار آہو

زہی شہاب خدنگی کہ از تو دیو دلان حذر کنند کہ از ضیغم الحذار آہو

جہاں گشایا بہ بتیم بامتحان، چو شتر بگرد مدح تو بر سی و سہ قطار آہو

ردیف مدح تو صد بارہ زیبد آہوی مشک زکرمت حو فرستادہ ام دو بار آہو

گشاد نافۂ حکمت عمید در مدحت حو نافہ ای کہ برآن کرد افتخار آہو

(دیوان ص ۲۲۷۔ ۲۳۰)

دوسرے قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

مرا ست دیدہ محیط و خیال جان کشتی بر آب دیدہ ز غم می کند روان کشتی

در آب دیدہ شب و روزم و چگونہ بود فراز و شیب ز خون موج و درمیان کشتی

درین محیطم اگرچہ روان و ساکن ہست ز چار لنگر و زین ہفت بادبان کشتی

چہ سود دارم از آن بادبان و آن لنگر چو شد ز موج اجل غرق ناگہان کشتی

امان ز بحر غم آنگہ طلب کہ دانی ساخت حومن ز لوح مدیح خدایگان کشتی

مدار مملکت برُ و بحر تاج الحق کہ بہر قلزم غم ساخت از امان کشتی

سپہر مرتبہ سنجر کہ فتنہ زد یلہ کرد — بسوی معبر دریای قیروان کشتی
چو عزم بحر کند مقدم ہمایونش — صدف مثال ز دریا دہد نشان کشتی
گشادہ خنجر تو سینہ حسود چنانک — ز روی پشت گشاید لب و دہان کشتی
بقصد مالش دشمن دران زمان کہ شود — گران رکاب صبا و سبک عنان کشتی
ازین غدیر طلب کرد کشتی خسرو — کہ ہست لایق این لجۂ مر فلان کشتی
کشیدمش ز سر طوع پیش آن دریا — اگرچہ درخور دریا نبود آن کشتی
چو بحر خاطر من موج می زد از مدحت — ردیف ساختم از بہر امتحان کشتی
کس از بحور افاضل بہ از عمید کہ راند — ز نیل فضل درین قلزم بیان کشتی

(دیوان ص ۲۵۹۔۲۶۲)

نصیر الدین محمد کے قصاید

نصیر الدّین محمد کے نام کے دو اہم قصیدے دیوان عمید لویکی میں موجود ہیں اور یہ دونوں تاریخ بداؤنی سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان دونوں کو نصیر الدّین کے بجائے غیاث الدّین بلبن کے بیٹے کے نام سمجھا گیا ہے جو غلط ہے، دراصل نصیر الدین محمد دوسرے شمسی ملک عزالدّین بلبن کشلو خان کا بیٹا تھا۔ دونوں قصیدوں کے چند شعر ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں،
پہلا قصیدۂ حبسیہ ہے، اس وقت لکھا گیا جب وہ مشرف کے فرائض کی بجاآوری میں کوتاہی کے جرم میں قید کردیا گیا تھا۔ "بند" ردیف اسی واقعے کی یاد دلاتی ہے:

ای از بنفشہ بر سمنت صد ہزار بند — وز لعل تست بر گہر آبدار بند
زلف زرہ گری است کہ ہر دم در آورد — بر سوسنت ز سلسلۂ مشکبار بند
سوسن بزیر حلقۂ سنبل نکوتر است — کو جنبش زلفت بر مدار بند
گفتی مگر ہم از گل و لالہ است در نظر — خط معنبر تو بران لالہ زار بند
مشرف (؟) نبود عارضت از خط چرا کشد؟ — چون من بدور دولت این شہریار بند
شاہ جہان کشای نصیر الحق آنکہ حق — بر دست و پای بخل زجودش ہزار بند
والا محمد بلبن کز کمند قہر — بر سرکشان نہد بہ گہہ کارزار بند

ای خسرو زمان کہ بہ یمن تو برگشاد — گنجور قدرت از صدف کان یسار بند
در عہد تو سزد کہ نہ بیند کسی بہ عمر — جز ساق سرو و پنجہ دست چنار بند
بندی است عقدہ ذنب و راس در فلک — بین داگشای از فلک بیقرار بند
ہرگز کس از ملوک بر اہل سخن نہاد — روزی ز راہ سلطنت و گیر و دار بند
من طوطی سخنورم آخر نہ جرّہ باز — در پای طوطیان غلط آمد شکار بند
نامم ز شرق دغرب گشت از سخنوری — واجب کند بپای چنین نامدار بند
می گفت پیش ازین بہ نصیحت مرا خرد — خود را بہ آستان شہ کامگار بند
بودم برآن امید کہ خود شاہ لطف کرد — چون خوشیان نہاد برین سوگوار بند

(دیوان ص ۹۷ - ۱۰۲)

دوسرے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

قد چو ناردنش کرد خیزران روزہ — ز ارغوانش برون دادہ زعفران روزہ
چو غنچہ گرچہ لب از روزہ بستہ بگشائی — چو من ز خوان مدیح خدائگان روزہ
محیط فیض نصیرالحق آنکہ بگشادند — ز گرد سفرۂ اکرامش انس و جان روزہ
قضا طلیعہ محمد کہ بند نیزۂ او — بخون خصم کشاد از سر سناں روزہ
سفند یار یمینی کہ از یاسر کفش — گشادہ دہر برین روی بنفتوان روزہ

(دیوان ص ۲۵۳-۲۵۸)

حسب ذیل بیت میں یہ نام پھر آیا ہے :

ملک نصیر دول آنکہ بار صولت او — مدار ملک محمد کہ صولت ہمہ گیر

(دیوان ص ۳۷۱)

لوکی کے معاصرین میں ایک شاعر عزالدین علوی تھا، وہ بھی نصیر الدین محمد کا مداح تھا اور اس کی دو نظمیں اس ملک کی مدح میں مونس الاحرار کلاتی میں درج ہیں، وہ دونوں نظمیں نہایت مختصر ہیں، وہ بڑی نظم کا خلاصہ ہیں:

" سید عزالدین علوی کہ لقب ممدوح و پدر بر می آید از اوّل و آخر

مصرعہ با بدین دوبیت

ای بحق خرد سکندر فن   دُرِّ دریای عزّ دین بلبن
شہ نصیر دول محمد راد   از کف جود تو زمین گلشن
ایا شہی کہ ز کوست رسد بچرخ صدا   شگفت گلبن فتح تو در صباح و مسا"

(مونس الاحرار ۔ نسخۂ علی گڑھ ص ۳۴۶)

دوسری نظم یہ ہے:

شد مصفا جمال استفتاح   شد توفا کمال استنجاح
شہر یار عجم نصیر دول   افتخار امم امیر نواح
خسرو دین محمد بلبن   پہلوی کین موید فتاح
ہم ترا عز جاودان مقرون   ہم ترا عز ذوالبنان مداح

(ایضاً ص ۱۳ ۔ ۱۱۱۲)

راقم کے اس ضمن میں کئی مطالعے ہیں ۔ پہلا "فکر و نظر" اکتوبر ۱۹۶۱ء میں (ص ۱۵۔ ۵۳) اس مقالے میں مونس الاحرار کلاتی کا تعارف ہے۔ اس میں عزالدّین علوی کی منظومات بھی درج کردی گئی ہیں ۔ وہاں ممدوح کو سلطان بلبن کا بیٹا سلطان محمد بتایا گیا ہے جو صحیح نہیں ۔ اس کی بحث آگے آتی ہے۔ یہی مقالہ میرے ایک چھوٹے سے مجموعے میں جس کا عنوان "تاریخی و ادبی مطالعے" ہے بغیر کسی ردّو بدل کے شامل ہے۔ پھر عمید لویکی کے دیوان کے مقدمے میں سیّد عزالدین علوی کی مندرجۂ بالا نظموں کا اندراج ہے۔ اور ان کا مخاطب سلطان محمد پسر سلطان قرار دیا گیا ہے۔

عمید لویکی کے قصائد جو اوپر نقل ہوچکے ہیں ۔ ان کے تعین میں سیّد صباح الدین عبدالرحمن "بزم مملوکیہ" میں اور ڈاکٹر اقبال حسینؔ اپنی کتاب Early Persian Poets of India میں بُری طرح ناکام ہوئے ہیں ۔ ان کے مباحث کے نقل کرنے کا موقع نہیں۔ لیکن ادھر چند دن قبل ممدوح کے تعین میں مجھے بفضلہٖ کامیابی ہوئی ہے۔ چنانچہ کچھ دن قبل ایک مقالہ نصیر الدّین پسر بلبن پر انگریزی میں تیار کرلیا ہے جو شایع نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ مقالے کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں جو نفیس اطلاع درج کی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:
"شمسی بندہ زادوں میں چند ایسے ہیں جن کے والد کا شمار بڑے ملوک

(خانان) میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کا نام محمد رکھا تھا ان میں سے ہر ایک اپنی فضلیت کی بنا پر لوگوں میں بڑا نامور تھا۔ چنانچہ محمد کشلو خان تیر اندازی کی فضلیت کے لحاظ سے خراسان اور ہندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ محمد کشلی خان جس کو علاء الدین کہتے تھے بخشش و سخاوت میں حاتم طائی کا ثانی تھا۔ محمد ارسلان خان جس کو تتر خاں کہتے تھے بادشاہ لکھنوتی ہوگیا تھا۔ محمد سلطان پسر سلطان بلبن دوسرے ہمناموں سے زیادہ مودّب و مہذّب تھا"۔

واضح ہے کہ پہلا محمد کشلو خاں (عزّالدین بلبن) کا اور دوسرا، کشلی خاں کا، تیسرا ارسلان خاں اور چوتھا سلطان بلبن کا بیٹا تھا۔ عزّالدّین بلبن کا ذکر تفصیل سے آتا ہے۔ کشلی خان الغ خاں یعنی غیاث الدین بلبن کا حقیقی بھائی تھا (طبقات ناصری ج ۲ ص ۴۵) اور اس کا بیٹا محمد علاء الدین باپ کی وفات پر (۶۵۴ھ میں) امیر حاجب مقرر ہوا (ایضاً ج ۱ ص ۴۹۵)۔ ارسلان خان (تاج الدین سنجر) لکھنوتی پر قابض ہوگیا تھا۔ لیکن آخر میں اس کو شکست ہوئی (طبقات ج ۲ ص ۳۵) اس لیے ارسلان خاں کے بیٹے کا بادشاہ لکھنوتی ہونا غلط ہے۔ خود ارسلان بادشاہ یا حکمران لکھنوتی ہوگیا تھا۔ چوتھا محمد سلطان غیاث الدّین بلبن کا نامور بیٹا تھا جو ملتان میں منگولوں کے ہاتھ شہید ہوا تھا۔ اس دور کے دو عظیم شاعر امیر خسرو اور حسن دہلوی اسی شہزادے کے ساتھ پانچ سال ملتان رہے اور اس کی وفات پر پُرسوز مراثی لکھے۔

مذکورۂ بالا چاروں ہمنام ملوک ہیں۔ امیر لویکی کا تعلق محمد بن عزالدین بلبن سے ہے۔ اول اول یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس بلبن کا الغ خان معظم سے (جو غیاث الدین بلبن کے نام سے بادشاہ ہوا) صرف اتنا تعلق ہے کہ دونوں کا شمار شمسی ملوک میں تھا۔ چنانچہ طبقات میں دونوں کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔ عزالدّین بلبن کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے:

ملک عزّالدّین بلبن اصلاً قبچاق سے تعلق رکھتا تھا۔ بڑا بہادر اور دلیر تھا۔ نیک سیرت ملک تھا۔ علماء و صلحاء و زہاد کا معتقد تھا۔ قلعۂ مندور میں سلطان ایلتتمش نے اسے خریدا تھا۔ بادشاہ کی خدمت کے صلے میں گوالیار کا اقطاع دار ہوا۔ کچھ عرصے بعد برن بھی اس کے حوالے کیا گیا۔ شمسی حکومت کے خاتمے پر جب امرائے ترک باغی ہوئے تو ان کا سرگردہ عزالدین ہی تھا۔ عہد رکنی کے بعد سلطان رضیہ کے عہد میں ملک جانی و ملک کوچی کے مقابلے میں سینہ سپر ہوکر گرفتار ہوا لیکن خلاصی پر سلطان رضیہ کا معتمد ہوا۔ رضیہ کی وفات پر

معزالدین تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں وہ بدستور سابق معزز و محترم رہا۔ ۶۴۰ھ میں معزالدین کو برطرف کرانے میں آگے آگے رہا۔ جب شہر پر امرا، کا قبضہ ہوگیا تو اس کی سربراہی کا اعلان ہوگیا۔ لیکن چند دوسرے امرا، کی مداخلت سے یہ فتنہ رک گیا اور علاء الدین کو تخت نشین کرایا گیا۔ جب ملتان پر منگولوں نے حملہ کیا۔ اور سلطان علاء الدین بنفس نفیس ملتان روانہ ہوا تو عزّالدین بلبن جو ناگور کا حاکم مقرر ہوا تھا، منگولوں سے لڑنے ملتان آیا۔ منگولوں کی شکست پر ملتان بلبن کے حوالے کردیا گیا۔ سلطان ناصر الدّین محمود تخت نشین ہوا تو بلبن کو اچہ اور ملتان کا حاکم برقرار رکھا گیا۔ لیکن ناگور سے بڑی دقت سے وہ دست بردار ہوا۔ اسی درمیان حسن قرلغ نے بنبان سے آکر ملتان پر حملہ کردیا۔ اس حملے میں قرلغ قتل ہوگیا۔ لیکن اس کے قتل کو پوشیدہ رکھ کر قرلغیان نے بلبن سے ملتان حاصل کرلیا۔ ایک مدت کے بعد ملک شیر خاں قرلغیوں سے ملتان چھیننے میں کامیاب ہوا۔ کچھ دنوں بعد بلبن اُچہ سے ملتان آور ہوا۔ اس میں اس کو ناکامی ہوئی اور وہ اُچہ لوٹ گیا۔ ملک شیر خاں نے اُچہ پر حملہ کردیا اور بلبن کو مجبور کردیا کہ وہ اُچہ کو شیر خاں کے حوالے کردے۔ اس کے بعد بلبن دلی لوٹا۔ یہاں سے فوج اُچہ روانہ ہوئی۔ شیر خاں ترکستان بھاگ گیا۔ اور اُچہ اور ملتان پھر بلبن کے پاس آگیا۔ اس کے بعد بلبن کے دل میں مرکزی حکومت کے خلاف ارادہ مستحکم ہوا تو وہ ۶۵۵ھ میں اُچہ اور ملتان کی افواج کے ساتھ ممالک دہلی کی سرحد کی طرف بڑھا۔ الغ خاں امرا و ملوک کے ساتھ بلبن کی فوج کے مقابلے میں آگے بڑھا۔ ۱۵ جمادی الاول ۶۵۵ھ کو کہرام اور سامانہ کے حدود میں دونوں لشکر ایک دوسرے کے قریب آپہنچے۔ اسی وقت دہلی کے دستار بندوں اور کلاہ داروں کی طرف سے بلبن کے پاس عریضہ پہنچا کہ وہ لوگ اس کو دلّی سپرد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ۲۰ جمادی الاول ۶۵۵ھ کو بلبن کی سپاہ دلّی پہنچ گئی۔ یہاں معلوم ہوا کہ جس جماعت کی طرف سے مکتوبات بھیجے گئے تھے وہ شہر بدر کردی گئی۔ اس لیے بلبنی سپاہ کے حوصلے پست ہوگئے اور انھوں نے واپس آنے کا ارادہ مصمم کرلیا۔ لیکن اسی حالت میں بلبن کی سپاہ اس سے الگ ہوکر شاہی لشکر میں مل گئی۔ تھوڑے ساتھی رہ گئے۔ ان کے ساتھ ملک بلبن اُچہ پہنچا اور کچھ ہی دنوں میں خراسان جانے کی تیاری کر ڈالی۔ اور منگول سردار جو ترکستان میں مقیم تھا اس کے پاس پہنچا اور اپنے قاصد کو ممالک سند کے شحنہ کے ساتھ دلّی (۵) روانہ کیا (طبقات ۲: ۳۶-۴۰)

تاریخ عصامی میں ہے کہ ملتان پر الغ خاں کے حملے سے بلبنؔ زر (بلبن کو اسی نام سے لکھتا ہے) قلعے کو اپنے بیٹے محمد کو سپرد کرکے پنجاب چلا گیا۔ محمد الغ خاں کے حملے کی تاب نہ

لاسکا، وہ راہ فرار تلاش کر رہا تھا، اس میں ایک ہفتہ گذر گیا، مجبوراً اس نے الغ خاں سے اماں مانگی، الغ خاں نے اسکو پناہ دی، خلعت سے نوازا اور اہل قلعہ کے ساتھ نوازش و احسان کا برتاؤ کیا، لیکن محمد کو اطمینان نہ تھا، وہ وہاں سے بھاگ نکلا اور اپنے والد عزالدین بلبن کے پاس پہنچا اور اسے سارے حالات سے باخبر کیا۔ بلبن نے سوچا کہ اب وہاں کا قیام مناسب نہیں، اس لیے وہ پنجاب چھوڑ کر بنبان پہنچا اور منگولوں سے مل گیا اور انھیں ملتان پر حملے کرنے کے لیے ورغلاتا رہا، اس کے نتیجے میں منگولوں نے دو بار یورش کی مگر ناکام رہے"۔

اس کے بعد کا حال معلوم نہیں، البتہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ منگولوں نے سلطان محمد کو ہندستانی مقبوضات کا حاکم مقرر کر رکھا تھا، چونکہ طبقات ناصری سے معلوم ہوتا ہے کہ عزالدین بلبن ۶۵۸ھ میں سند اور ملتان میں موجود ہے، اس بنا پر اس کے بیٹے کی سیاسی برتری کا دور اس تاریخ کے بعد شروع ہوتا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عمید لویکی کی قید ۶۶۰ھ کے بعد شروع ہوئی ہوگی۔

عمید لویکی کے بعض منظومات جو بیاضوں اور شعراء کے تذکروں میں منقول ہیں، ان کی نسبت کہیں کہیں غلط ہے، مثلاً ایک قصیدہ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں، الحاقی کلام ہے:

آہن و نی چون پدید آمد ز صنع کرد گار	درمیان تیغ و کلک افتاد جنگ و کارزار
تیغ گفتا فخر من زانست کاندر شان من	گاہ وحی آمد " و انزلنا الحدید " از کرد گار
کلک گفتا لون من لون سپہر آمد درست	ہست ازین معنی مرا برگردن مردان گذار
ہر دو زین معنی ابی گفتند و آخر یافتند	قیمت و مقدار خویش از دست شاہ روزگار
سایۂ یزدان ملک شاہ آفتاب خسروان	شہریار کامران و پادشاہ کامگار

یہ قصیدہ تذکرۂ خلاصۃ الاشعار میں (۶) دوبار اور مونس الاحرار کلاتی میں (۷) ایک بار عمید کے نام سے نقل ہے لیکن یہ انتساب غلط ہے، اس کا ناظم مشہور فارسی شاعر امیر معزی (وفات ۵۴۲ھ) ہے۔ یہ قصیدہ آخر الذکر کے دیوان (۸) میں شامل ہے اور ملک شاہ سلجوقی کے نام سے ہے، نیز سوزنی (۹) نے اس قصیدے کی پہلی بیت کی تضمین کی ہے۔

تذکرۂ خلاصۃ الاشعار میں دو بار اور مونس الاحرار میں ایک بار عمید کے نام سے ایک قصیدہ درج ہے جس کے چند شعر یہ ہیں:

زلف نگار گفت کہ من از قیر و چنبرم — شب صورت و شبہ صفت و مشک پیکرم
ترکیبم از شب است و ز روز است مرکبم — بالینم از گلست و ز لالہ است بسترم
گہ درمیان ماہ بود روز و شب تنم — گہ بر کنار ماہ بود سال و مہ سرم
با روز ہمنشینم و با آفتاب جفت — با زہرہ در نبردم و با مہ مجاورم
ہم در جوار مشکم و ہم در پناہ گل — ہم مایۂ عبیرم و ہم رشک عنبرم
ہندو نیم مجاور آن خال ہندویم — کافر نیم مرافق آن چشم کافرم
ہمچون دل مخالف صاحب شکستہ ام — مانند عیش دشمن و عمرش مکدرم
رخ تیرہ سر بریدہ نگونسار و مشکبار — گوئی کہ نوک خامہ دستور کشورم
عالی مجیر دولت کایام گویدت — من دولت ترا بدل و طبع چاکرم
من بندہ تا بمدحت تو عزم کردہ ام — با خاطر منیرم و طبع منورم
گوید ہمیشہ مشتری از روی افتخار — در طالع مجیرم از آن سعد اکبرم

یہ مشہور قصیدہ کمالی بخارائی (۱۰) کا ہے۔اور عوفی نے لباب الالباب ج ۱ ص ۸۹۔۹۰ میں اس طویل قصیدے کی گیارہ ابیات نقل کی ہیں، یہی انتساب مجمع الفصحا ج ۱ ص ۴۸۶ میں بھی ہے، اور حدائق السحر (ص ۳۲) میں یہ عبارت آئی ہے:

"کمالی گوید نیکو و از صفت قلم بمدح ممدوح می آید و این تخلص کمالی خوبست و اعتقاد من آنست کہ در عرب و عجم ہیچکس بہ ازین تخلص نکردست و ایں از کار ہای کمالی بدیع است:

رخ تیرہ سر بریدہ نگونسار و مشکبار — گوید کہ نوک خامۂ دستور کشورم"

کمالی کی یہ بیت اتنی مشہور ہوئی کہ عہد اکبری کے پہلے صاحب دیوان شاعر سراجی خراسانی (۱۱) نے دو بار اس سے استفادہ کیا ہے:

روی تیرہ سربریدہ مشکبار و گل سپر — راست ہمچو کلک صدر کامران بینم ترا

(دیوان ص ۴)

روی تیرہ سر بریدہ ، مشکبار و گل سپر — ہمچو ہنگام کتابت کلک دستور آمدست

(دیوان ص ۳۰)

مجلۂ ارمغان ج ۱ ص ۴۹۸ بعد میں عمید کے نام ایک قصیدہ درج ہے، لیکن یہ قصیدہ عمید کا نہیں بلکہ معزّی کا ہے ۔ اور دیوان معزّی میں شامل ہے ۔ ۱۳۱۹ شمسی میں آقای وحید دستگردی نے ایک پرانی بیاض کی بنیاد پر اس قصیدے کو عمید کا بتایا تھا ۔ حالانکہ اس سے ایک سال پہلے آقای دکتر عباس اقبال کی تصحیح سے ۔جو دیوان معزّی طبع ہوچکا تھا اس میں یہ قصیدہ (۱۲) شامل ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ شمس قیس رازی کی کتاب المعجم فی معائیر اشعار العجم (۱۳) میں یہ قصیدہ معزّی کے نام درج ہے۔ اس قصیدے کے چند ابیات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

گفتم مرا (۱۴) دو بوسہ دہ ای ماہ دلستان   گفتا کہ ماہ بوسہ کرا داد در جہان
گفتم فروغ روی تو افزون بود بشب   گفتا بشب فروغ دہد ماہ آسمان
گفتم بہ بر ہمی دو شب از من نہان مشو   گفتا کہ مہ بہر مہ باشد دوشب نہان
گفتم عجب بود کہ در آگوش گیرمت   گفتا کہ بس عجب نبود ماہ در کمان

مجلۂ ارمغان (۱۵) میں متعقباً ایک قصیدہ جس کے چند شعر ذیل میں درج ہیں، اور منقول ہے۔ چونکہ قصیدۂ بالا کی نسبت عمید کی طرف غلط ہے اس لیے یہ قصیدہ بھی عمید لویکی کا نہ ہو گا:

ای خط مشکین حمائل روی تو سیمین سپر   از حمائل دلستان و از سپر عاشق شپر؟
خطّ و خدّ تو دو چیزند از دو معنی ہر دو ضد   ہمچو روز و شب ولیکن درپناہ یکدگر
خطِ او دود است لیکن ہست برنارش مقام   خطِّ او نار است لیکن ہست دودش را مقر
چار چیزِ خوب داری سال و مہ بر چار چیز   کس نہ بیند زان چہارِ خوب ہرگز خوب تر
ماہ داری برصنوبر شاخ داری بر سمن   مشک داری بر بنفشہ لالہ داری بر قمر

راقم نے حسب ذیل چار قصیدوں کو اپنے مقالے (شامل فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۴ء) میں الحاقی قرار دیا تھا :

۱۔ گفتم چہ سر داری گفتا سروفا الخ
۲۔ چونست حال من بمن امروز یار گفت الخ
۳۔ پیام دادم نزدیک آن بت دلبر الخ
۴۔ اگر نہ مست شد بلبل فغان چندین چرا دارد الخ

لیکن ابوالحسن فراہانی شارح مشکلات انوری (۱۶) نے ان میں سے دوم اور چہارم کو صراحۃً عمید کا بتایا ہے، اور چونکہ یہ قصاید تسلسل کے ساتھ عمید کے ذیل میں نقل ہیں، اس لیے انھیں بحالت موجودہ عمید ہی کا سمجھنا چاہیے۔

عمید لویکی کے دیوان میں ایک حکیمانہ قصیدہ ہے جس کے چند ابیات درج ذیل ہیں:

چہ دہد مرا زمانہ بکف از چمانۂ غم — بہ بساط بزم گیتی قدح ستم دما دم

چہ کشم ز دور گردون چو قرابہ سر بمہر است — بدل گلاب شادی ہمہ عمر بادہ غم

بامید نقد گنجی نہدم بکام افعی — ز پی کباب گوری دہدم بچنگ ضیغم

زتموز آفتابم دل و سینہ تفتہ یکسر — زسموم حادثاتم لب و دیدہ خشک و پرنم

فلک ار ز بہر خونم سر آستین بہ بر زد — زشفق چرا ست آنگہ سر آستینش معلَم

کف من زشاخ طوبی چو بریدہ گشت، ماندہ — ز پل صراط حرمان نقرم سوی جہنم

زحوادث زمانہ شدہ تیرہ جام خسرو — بہ امید ملک بردہ کف دیو خاتم جم

دل کیست آگہ اینجا ز نہان سرِ حکمت — کہ بدیو نقل چون شد زجمش نگین خاتم

چمن بہار ہمت بخزان دی رسیدہ — ز نوا بماندہ بلبل زحدیث طوطی ابکم

ز در مدیح سفتن بہزار گونہ صنعت — نہ بدوستم زیادت نہ زمحنتم بجوی کم

در مدح و ذم چندم ز رہ قسم در آیم — قسمی چنان موکّد کہ بود وصال ہمدم

بخم کمند جعدش کہ ز بار ہجر دارد — قد صد ہزار عاشق چو قد سپہر پرخم

بکمان ابروی او کہ بہ تیر غمزہ دوزد — دل خستگان پرغم تن بیدلان درہم

بہ ضمیر روشن من کہ ز عکس پرتو او — شب و روز برفلک شد رخ مہر و ماہ معجم

بہ سحاب خاطر من کہ نگاہ درفشانی — زمیان بریدہ عقدی صد فی شکافتہ نم

بنوای صیت نظمم کہ صدای او گرفتہ — چہ طنین ساز عنقا چہ نوای نالۂ بم

بہمین قصیدۂ من کہ درد ز دُرج حکمت — چہ لآلی است مضمر چہ جواہر است مدغم

کہ نوانم و نیارم ابسر زبان خاطر — سخن مدیح سازی جز وصف یار محرم

نگرم ضرورت افتد کہ دمی زنم ز مدحت ‏ ‏ بره طمع و لیکن نزنم قدم در آن دم

سخنم ہر آنکہ جوید نرود بہ نظم دیگر ‏ ‏ لب کوثر آنکہ یابد نکند حدیث زمزم

پس ازین بہ شعر تنہا نکنم مفاخرت من ‏ ‏ کہ بہ جنب فضل دیگر بود آن سخن مرادم

نسب از عمر پذیرم حسب از تبار لیکن ‏ ‏ بکدام سلک دیدی دو گوہر چنین منظم

فلکا بزیر سقفت چو عمید لوکی کس ‏ ‏ نہ نہد بکاخ معنی زچنین قصیدہ سُلّم

چہ قصیدۂ کہ بوسد ز سپہر ہفت پایہ ‏ ‏ سر مطلعش عطارد مش از دو دیدہ محکم

بہ لطافتی رسید این سخنم ز لطف ایزد ‏ ‏ کہ بافرین کشاید فلکش نفس بملک ہم

قسمی بہزل راندم بزبان کہ در جوانی ‏ ‏ اگرم رود خلافی نشوم ز اثم ماخم

دگرم ز جد برآید قسمی درو نگہ کن ‏ ‏ تن عقل کل مصور دم جان جان موسم

بہ سخن طرازی من چہ حسد بُرد حسودم ‏ ‏ کہ نہ لعل خیزد از کان نہ دُرِّ منضد ازیم

چہ فسونگر است طبعم کہ بسحر کاری خط ‏ ‏ سخن خیال از دی سپرد بنای محکم

چہ خیال چون عرض شد کہ بقا نباشد اورا ‏ ‏ چو بنظم گشت جوہر رسدش خطاب اوجم

اگر از اجل امانی بودم بہ نعت و توحید ‏ ‏ ادب سخن نمایم بہ سخنوران عالم

رخ ہر کہ منصف آمد چو سدید باد تازہ ‏ ‏ ز سخنوران عالم گل باغ نسل آدم

(دیوان ص ۱۹۵-۲۰۳)

یہ قصیدہ تین جگہ منقول ہے ۱۰۔ دیوان میں ہے جس کا ایک مختصر قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے کے لیے بمبئی کے ایک شخص سے خریدا گیا تھا۔۲۔ مجموعۂ لطائف و سفینۂ ظرائف میں جس کا ایک ناقص الاوّل نسخہ برٹش میوزیم (فہرست ریو ضمیمہ) میں ہے، اور دوسرا کابل یونیورسٹی میں ۳۰۔ گنجینۂ گنجوی (ص ۲۴۱-۲۴۲) نظامی گنجوی کے اشعار کے ضمن میں جو صریحاً الحاقی قرار دیے گئے ہیں۔

دیوان میں یہ قصیدہ پورا نقل ہے، لیکن بقیہ دونوں جگہوں پر آخر کے اشعار نہیں۔ مجموعۂ لطائف میں آخر کے ۲۲ شعر اور گنجینۂ گنجوی میں آخر کے دس شعر نہیں ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں وہ شعر محذوف ہے جس میں شاعر نے اپنا حسب نسب درج کیا ہے، اور جس شعر

میں عمید لویکی تخلص درج ہے اس کو اس طرح بدل دیا گیا ہے : ملکش بزیر سقفت چو نظام گنجہ کس نی؟

خلاصہ یہ کہ یہ قصیدہ نظامی گنجوی کا نہیں۔ بلکہ عمید لویکی کا ہے۔ اور مجموعۂ لطایف اور گنجینۂ گنجوی میں اس کا اندراج سراسر غلط ہے۔ صاحب گنجینہ کو اس غلطی کا احساس ہے۔ لیکن مجموعۂ لطایف میں اس کا شمول اس کے مرتب سیف جام ہروی کی غلط اطلاع پر مبنی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عمید کی نسبت کی متعدد صورتیں ملتی ہیں۔ جو کسی نہ کسی مقام سے نسبت رکھتی ہیں۔ یہ ساری نسبتیں غلط ہیں۔ صحیح نسبت لویکی ہے جو لویک سے ماخوذ ہے۔ اور لویک ایک قدیم خاندان کا نام تھا جو مدّت سے حاکم کابل و غزنی وغیرہ تھے۔ اور اس بات کا تعین عمید لویکی کے ایک شعر سے ہوا جو دیوان میں مندرج ہے۔

عمید کے دو قصیدے تاج الدّین سنجر کے نام سے ہیں۔ صباح الدّین عبدالرحمٰن نے ان قصیدوں کا ممدوح ایک دوسرا تاج الدّین سنجر بتایا ہے۔ دراصل داخلی شہادت سے ثابت ہوا کہ ان دونوں قصیدوں کا مخاطب دوسرا شخص ہے۔

عمید کے دو قصیدے نصیر الدّین محمد کی مدح میں ہیں۔ راقم حروف، اور ڈاکٹر اقبال حسین اور صباح الدّین عبدالرحمٰن کبھی اسے سلطان بلبن کے بیٹے کا مدّاح اور کبھی اور کا بتاچکے ہیں۔ اس مقالے میں صحیح ممدوح اور ان کی شخصیت کا تعین ہوگیا ہے۔ عمید کے چند قصیدے جو الحاقی سمجھے جاتے تھے، اب طے ہوگیا ہے کہ وہ عمید ہی کے ہیں

عمید کا ایک مشہور قصیدہ مجموعۂ لطایف میں نظامی گنجوی کے نام ہے۔ گنجینۂ گنجوی میں بھی اس کو نظامی کے کلام میں الحاقی قرار دیا گیا ہے۔ یہ عمید کے دیوان میں شامل ہے اور اس میں ایسے شعر ہیں جن سے طے ہوجاتا ہے کہ یہ عمید لویکی کا ہے۔ نہ کہ کسی اور کا۔

حواشی

(۱) عمید لویکی کا دیوان راقم الحروف کی ترتیب و تصحیح سے ۱۹۸۵ء میں مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ شعر ایک قصیدے میں ہے جو نظامی گنجوی کی طرف بھی منسوب ہے۔ اس کی بحث آگے آئے گی۔ شعر کے لیے دیکھیے دیوان ص ۲۰۲۔

(۲) راورٹی کے نزدیک ترخان صحیح نسبت ہے۔

(۳) طبقات ناصری، ج ۲ ص ۳۷۔

(۴) یہ شعر طنز کی بہترین مثال ہے۔ عمید اپنے ایک دوسرے قصیدے میں بھی "شغل اشرافی" کے بجا طور پر انجام نہ دینے کے الزام کا نتیجہ حبس وقید بتایا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

منکہ چون سیمرغ در یک گوشہ مسکن کردہ ام ماورای مرکز خاکی نشیمن کردہ ام

تنگ بر مرغی درین بوم از چہ معنی می کشم رفتہ ام عنقا صفت در کوہ مسکن کردہ ام

نو عروس بکر معنی را بنور معرفت در شبستان خرد چون روز روشن کردہ ام

رہ درین یک برج بی روزن نمودندم ولی من بہمت رہ برون از ہفت روزن کردہ ام

ہمہ مانم ہر کسی در شغل و من در بند حبس حاش للہ زین سخن تنہا گنہ من کردہ ام

کار بر عکس است ورنہ خود کہ روز بد کشد شغل اشرافی کہ من بر وجہ احسن کردہ ام

(دیوان ص ۲۰۶ - ۲۱۰)

(۵) طبقات ج ۲ ص ۳۵ میں ہے کہ عزالدین بلبن مقطع لکھنوتی تھا۔ لیکن (ص ۸۰) دوسری جگہ پر مقطع کا نام عزیز الدین بلبن یوزبکی ہے۔ الغ خان لکھنوتی سے ۶۵۷ھ میں واپس ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ عزیز الدین بلبن؟ ان تاریخوں میں لکھنوتی میں تھا۔ جب عزالدین بلبن کشلو خان اُچہ اور ملتان میں ملتا ہے۔ اس بنا پر آخر الذکر مقطع لکھنوتی سے الگ شخصیت ہے۔

(۶) نسخۂ خدا بخش پٹنہ ۲۸۶ / الف ۳۳۸۰ / ب۔

(۷) نسخہ مولانا آزاد لائبریری ۔ علی گڑھ ۸۳۱۰/ الف ۔

(۸) دیوان معزّی ۔ تہران ایڈیشن ص ۲۲۷ ۔ ۲۲۸ ۔

(۹) دیکھیے دیوان سوزنی ۔ تہران ایڈیشن ص ۶۶ ۔

(۱۰) رک : صفا ۔ تاریخ ادبیات ج ۲ ص ۶۸۱ ۔ ۶۸۵ ۔ قصیدہ زیر بحث کے ۱۱ شعر صفا نے نقل کیے ہیں۔

(۱۱) نیز رک : دیوان سراجی ۔ تعلیقات ص ۳۵۷ ۔ ۳۶۰ ۔

(۱۲) دیوان معزّی ص ۵۹۵ ۔

(۱۳) المعجم چاپ مدرّس رضوی ص ۲۰۰ ۔

(۱۴) معزّی سے قبل عنصری اور فرخی دونوں نے صنعت سوال و جواب میں قصیدے لکھے تھے ۔ معزّی کا قصیدہ انھی کے جواب میں ہے ۔ عنصری کے قصیدے کا مطلع یہ ہے

گفتم نشان دہ از دہن ترک دلستان — گفتا ز نیست، نیست نشان اندرین جہاں

(دیوان عنصری ص ۱۲۹)

فرّخی کا مطلع یہ ہے :

گفتم مرا سہ بوسہ دہ ای شمسۂ بتان — گفتا ز حور بوسہ نیابی درین جہان

(دیوان ص ۲۷۱)

(۱۵) ج ۲۱ ص ۵۰۳ ۔

(۱۶) مشکلاتِ انوری ص ۱۶۰ ۔ ۱۶۲ ۔

حکیم محمد موسیٰ امرت سری :

کیا رسالۂ کشف الاسرار داتا گنج بخش رح کی تصنیف ہے؟

حضرت داتا صاحب قدس سرہ کی آخری تصنیف کشف المحجوب کے مطالعے سے ان کی نو دیگر تصانیف کے نام معلوم ہوتے ہیں، مگر ان میں سے ایک بھی دستیاب نہیں۔ بعض کے سرقے اور دوسروں کا اپنی طرف منسوب کرلینے کا واقعہ حضرت نے خود لکھا ہے۔ بہرحال ان نو تصانیف کے نام یہ ہیں :

۱۔ دیوان : اس دیوان کو کسی نے اپنی طرف منسوب کرلیا (کشف، ص ۲) مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ مجموعہ اشعار عربی میں تھا یا فارسی میں، اور اپنا تخلص بھی ظاہر نہیں فرمایا۔ اس کے باوجود کشف الاسرار کے واضع نے ان کا علی تخلص گھڑ کر ایک غیر معیاری غزل اور چند اشعار بھی شامل کر دیے ہیں۔

۲۔ کتاب فنا و بقا : مسئلہ فنا و بقا میں (کشف، ص : ۶۸)

۳۔ اسرار الخرق و المونات : ظاہری اور باطنی مرقعہ کے آداب میں (کشف، ص: ۶۳) اس کتاب کا نام فارسی کے تمام ایڈیشنوں میں یہی لکھا ہے مگر ژوکوفسکی ایڈیشن میں اسرار الخرق و الملونات درج ہے۔

۴۔ الرعایت بحقوق اللہ تعالیٰ : مسائل توحید پر (کشف، ص : ۳۶۰) اس نام کی ایک تصنیف شیخ احمد بن خضرویہ متوفی ۲۴۰ھ کی بھی ہے جو کشف المحجوب کے ماخذوں میں شامل ہے اور اسی نام کی ایک کتاب ابوعبداللہ الحارث بن اسد المحاسبی (م ۲۴۳ھ) کی تصنیف بھی ہے جو لندن سے چھپ چکی ہے۔

۵۔ کتاب البیان لاہل العیان : در معنی جمع و تفرقہ (کشف، ص : ۳۳۳)

۶۔ نحوالقلوب : مسئلہ جمع پر مفصل کتاب ہے (کشف، ص : ۳۳۳)

۷۔ منہاج الدین: طریقت تصوف اور مناقب اصحاب صفہ میں ہے اور حسین بن منصور حلاج کا حال بھی بیان کیا ہے (کشف، ص: ۱۹۲،۹۶۲) دیوان کی طرح اسے بھی کسی نے اپنی طرف منسوب کرلیا۔

۸۔ ایمان: ایمان اور اثبات اعتقاد مشائخ میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام نہیں بتایا (کشف، ص: ۳۶۸)

۹۔ شرح کلام منصور: حسین بن منصور حلاج کے کلام کی شرح (کشف، ص: ۱۹۲)

ژوکوفسکی کا سہو۔ فاضل موصوف نے حضرت شیخ کی تصانیف میں ایک نام فرق فرق دیا ہے۔ (۱) حالانکہ یہ ان کی کسی مستقل تصنیف کا نام نہیں ہے بلکہ یہ کشف المحجوب کے ایک باب کا نام ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت داتا صاحب نے بغداد شریف کے نواح میں ملاحدہ کا ایک ایسا گروہ دیکھا جو حضرت حسین بن منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ سے محبت کا مدعی تھا اور ان کے کلام سے اپنی زندیقیت کو سہارا دیتا تھا، اور حلاج کے معاملے میں مبالغہ کرتا تھا جس طرح کہ روافض حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی محبت میں غلو کرتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"اندر رد کلمات ایشان بابی بیاورم اندر فرق فرق انشاء اللہ عزوجل (۲)

"بابی بیاورم" سے ژوکوفسکی کا ذہن ایک مستقل تصنیف کی طرف منتقل ہوگیا حالانکہ اس کی مصحح و محشی کشف المحجوب کا تیرھواں اور مطبوعہ سمرقند کا یہ چودھواں باب ہے۔

"باب فی فرق فرقہم و مذاہبہم وآیاتہم ومقاماتہم وحکایاتہم"

کشف الاسرار:

آٹھ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ حضرت داتا صاحب کی طرف منسوب ہے جو غالباً پہلی بار مطبع محمدی لاہور میں طبع ہوا۔ (۳) پھر اس کے متعدد اردو ترجمے شائع ہوئے۔ طرفہ یہ کہ اکثر محققین نے اسے حضرت داتا صاحب کی تصنیف سمجھ لیا اور اس سے استناد کرتے رہے، حالانکہ یہ رسالہ بزبان حال اپنے وضعی ہونے کی خود شہادت دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں سیر حاصل مقالہ پھر کبھی لکھا جائے گا، سردست اس کی صرف نقاب کشائی کرنا مقصود ہے۔

(الف) کشف الاسرار کے جعلی ہونے کا بین ثبوت یہ ہے کہ یہ سبک ہندی میں ہے اور

کشف المحجوب کی نثر دور اول یعنی دور سامانیاں کی ہے اور ان دونوں کی زبان میں فرق کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

(ب) اس کا مولف اپنے پراگندہ خیالات کو ایک مشہور و معروف بزرگ کے نام سے مشتہر دیکھنے کا خواہاں تھا، یا اپنے کسی بڑے (جیسا کہ حسام الدین کا نام لیا ہے) کو داتا صاحب سے پہلے کا بزرگ ثابت کرکے اپنی دکان چمکانا چاہتا تھا۔(۵) علمی اعتبار سے بھی بے مایہ ہے۔

(ج) یہ تاریخی حقیقت ہے کہ پنج ہزاری اور ہفت ہزاری خطابات مغلیہ دور میں ایجاد ہوئے یعنی حضرت داتا صاحب کے کئی سو سال بعد۔ مگر کشف الاسرار کا واضع لکھتا ہے

"بفہم اگر ہفت ہزاری گردی چہ شد مشت گرد ہستی (۶)۔

ہفت ہزاری کی بات تو کچھ ایسی ہے کہ آج کوئی صاحب اپنے ابا جان کا تذکرہ لکھنے بیٹھیں تو یہ بیان فرمائیں کہ وائسرائے ہند نے انھیں اعلیٰ خدمات کے صلے میں ستارہ خدمت کا خطاب عطا کیا تھا۔

(د) لکھا ہے .... پسری تولد شد امام بخش نام نہادند .... " (۷)

ظاہر ہے کہ داتا صاحب کے زمانے میں ایسے نام رائج نہ تھے۔

(ہ) آخر رسالہ میں تحریر ہے:

"از گفتہ من رنجی نہ کنی و غصہ نہ کنی کہ من راست گفتہ ام ع

بر رسولاں بلاغ باشد و بس (۸)

سعدی کا مصرعہ داتا صاحب کا نقل کرنا کرامت ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

(و) لکھا ہے:

"اے علی ترا خلق می گوید گنج بخش دانہ پیش خود نہ داری در دل

خود جا مدہ کو پنداراست گنج بخش ورنج بخش حق است (۹)۔

کشف الاسرار پر اعتماد کرنے والے مؤلفین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت شیخ علی ہجویری اپنی زندگی ہی میں اس لقب سے ملقب ہوگئے تھے مگر یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ حضرت شیخ اس صحیح اور جائز لقب سے قریباً پانچ سو سال بعد ملقب ہوئے۔ مفتی غلام سرور نے جو یہ لکھا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ نے انھیں گنج بخش کہا، قدیم تذکروں اور ملفوظات خواجگان چشت سے ہرگز ہرگز اس کی تائید نہیں ہوتی۔

(ز) اس وضاع (مولف کشف الاسرار) کی دین سے خبرداری ملاحظہ ہو:

"در تفسیر آمدہ است واز حسام الدین لاہوری شنیدم اگر
مردی برگور مادر پدر سجود کند کافر نمی شود" (۱۰)۔

اب کشف الاسرار اور کشف المحجوب کے بیانات میں تضاد ملاحظہ ہو:

کشف الاسرار:-

از قبلہ خود شنیدہ بودم زاد من ہجویر است (۱۱)

کشف المحجوب:-

علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی ثم الہجویری
یعنی ہجویران کا دوسرا مسکن تھا۔

کشف الاسرار:-

"...... معشوق بگزیں و جان خودرا فدای او کن و بگوکہ اگر جان
درراہ او فداشو بہ استہ" (۱۲)

کشف المحجوب:-

"من کہ علی بن عثمان الجلابی ام از بس آنکہ مرا حق تعالیٰ یازدہ
سال از آفت تزویج نگاہ داشتہ بودہم بہ تقدیر دی بفتنہ اندر افتادم و
ظاہر و باطنم اسیر صفتی شد کہ بامن کردند بی آن کہ ردیت بودہ
دیک سال مستغرق بودم چنانکہ نزدیک بود کہ دین برمن تباہ شود تا
حق تعالیٰ بہ کمال لطف و تمام فضل خود عصمت را باستقبال دل
بیچارہ من فرستاد و برحمت خلاصی ارزانی داشت والحمد للہ علی جزیل
نعمائہ۔ (۱۳)

حضرت داتا صاحب عشق مجازی سے نجات پر خدا کا شکر بجا لا رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں دین کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا مگر صاحب کشف الاسرار معشوق پر فدا ہونے کی تلقین کر رہا ہے۔ اگر اس سے عشق حقیقی مراد ہو تو بھی یہ داتا صاحب کا انداز بیان نہیں ہے۔

کشف الاسرار:-

چوں در ہندوستان آمدم نواحی لاہور راجنت مثال یافتم (۱۴)

کشف المحجوب :-

من اندر دیار ہند در بلدہ لہانور کہ از مضافات ملتان است درمیان
ناجنساں گرفتار شدہ بودم (۱۵)

کشف المحجوب کی عبارت تو یہ واضح کر رہی ہے کہ حضرت داتا صاحب لاہور میں اپنے آپ کو ناجنسوں میں قید سمجھ رہے ہیں اور کشف الاسرار ان کے لیے اس ماحول کو جنت مثال قرار دے رہی ہے اور داتا صاحب کے زمانے میں لاہور کو لہانور یا لہاور وغیرہ لکھا جاتا تھا لاہور اس وقت نہیں لکھا جاتا تھا۔

کشف الاسرار :-

" بیت و اشعار بسیار گفتہ ام دیوانی گفتم بسیار مطبوع و پسندیدہ واز
نظر خود گزیناں برآمدہ " اے طالب من ہر روز برائے دیدن دیدار
می ردم لیکن گاہی گاہی بنظر من آن ماہ خنداں می آید ودیوان
رابدیں حالت گفتہ بودم وقتی کہ روی یار دیدی غزل ازدہانم بے
فکر برآمدی دراں فکرے کردہ ام (۱۶)

کشف المحجوب :-

" .... مرا ایں حادثہ افتاد دوبار یکی آنکہ دیوان شعرم کسی بخواست
و باز گرفت و اصل نسخہ جزآں نہ بود، آن جملہ بگردانید و نام من از
سرآں بیفگند، ورنج من ضائع گردانید تاب اللہ علیہ۔ " (۱۷)

کشف الاسرار کے ان اقتباسات سے واضح ہے کہ یہ انداز بیان اور طرز زندگی صاحب صحو داتا صاحب کا نہیں ہے اور انھوں نے اپنے دیوان کے سرقے کا ذکر بڑے دکھ کے ساتھ کیا ہے نیز پوری کشف المحجوب میں اپنا کوئی شعر درج نہیں کیا۔ مگر اس وضاع نے ایک غیر معیاری غزل اور دو شعر بھی ان کے سر منڈھ دیے ہیں۔

قارئین کرام کی تفریح طبع کے لیے ایک اور اقتباس نقل کرکے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

" پیری بود شیخ بزرگ نام اوشان مرا گفتند کہ اے علی کتابی درین
عمر تصنیف بکن کہ یادگاری تو بماند گفتم یاایہا الشیخ ان لاایعلم من

علم بسیار چسپید سن من الحال اثنا عشر کہ ہستند، درمیان ہمیں عمر در بلدہ ہجویر تصنیف کردہ ام ۔ او را دادم او مرا گفت کہ تو بزرگ خواہی شد .... (۱۸)

اس زبان کی خوبیاں اور لطافتیں تو عیاں ہی ہیں مگر کشف المحجوب میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تفریح طبع کا سامان اس میں یہ ہے کہ اس کا مؤلف چونکہ لاہور کا باشندہ ہے اور یہاں بے حد اصرار کرنے والے کو کہتے ہیں "چمڑای گیا اے" یعنی چمٹ ہی گیا ہے۔ لہٰذا اس نے شیخ بزرگ کے بہت زیادہ اصرار کو "بسیار چسپید" کے ذریعے واضح کیا ہے۔

حواشی

(۱) مقدمہ کشف المحجوب از ژوکوفسکی ۔ طبع تہران ۔ ص ۵۰ ۔

(۲) کشف المحجوب ۔ طبع تہران ۔ ص ۱۹۲ ۔

(۳) ایضاً ۔ ص ۲۱۸ ۔

(۴) اس رسالے پر سن اشاعت تحریر نہیں ۔ مگر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کا بیان ہے کہ چھے ورق کا ایک رسالہ فقر نامہ مشہور بہ کشف الاسرار کے نام سے کشف المحجوب ہی پر مبنی کر کے شاید ۱۸۸۰ء میں لاہور ہی میں شائع ہوا۔ (مقالات دینی و علمی حصہ اول ص : ۲۲۸)

(۵) حضرت داتا صاحب کے مزار کی مرجعیت کے پیش نظر کئی اور مزاروں کے مجاوروں نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ داتا صاحب کے پہلے کے بزرگ ہیں اور داتا صاحب یہاں حاضری دیتے رہے ہیں ۔ چنانچہ سید احمد توختہ ترمذی کی صاحبزادیوں کے مزارات (قبور بی بیاں پاک دامن) کے مجاوروں نے دور آخر کے مؤلفوں سے یہ لکھوا دیا کہ یہ سید زادیاں کربلا کے حادثہ فاجعہ کے بعد لاہور آ گئی تھیں ۔ اسی طرح حضرت پیر مکی کے مجاوروں نے عوام میں یہ مشہور کر رکھا ہے کہ داتا صاحب کا فرمان ہے کہ میرے پاس آنے سے پہلے ان کے مزار پر حاضری دیں۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ بعض لوگ تو حضرت پیر مکی کو حضرت داتا صاحب کا استاد کہنے سے بھی نہیں چوکتے

وغیرہ وغیرہ۔

(۶) کشف الاسرار، طبع لاہور، ص ۳۔

(۷) ایضاً، ص ۷۔

(۸) ایضاً، ص ۸۔

(۹) ایضاً، ص ۵۔

(۱۰) ایضاً، ص ۳۔

(۱۱) ایضاً، ص ۳۔

(۱۲) ایضاً، ص ۲۔

(۱۳) کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص ۳۲۷۔

(۱۴) کشف الاسرار، ص ۳۔

(۱۵) کشف المحجوب، طبع سمرقند، ص ۱۵۱۔

(۱۶) کشف الاسرار، ص ۷۔

(۱۷) کشف المحجوب، ص ۲۔

(۱۸) کشف الاسرار، ص ۳۔

ڈاکٹر سید حسن عباس

آزاد بلگرامی سے منسوب آثار

میر غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶ھ ۱۲۰۰ھ) ہندوستان کے ان علما و فضلا اور شعرا و ادبا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جنھوں نے مختلف میدانوں میں علمی خدمات انجام دیں اور شعر وادب کے بیش بہا نمونے یاد گار چھوڑے ہیں۔ انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں نثر و نظم دونوں میدانوں میں ایسے گرانقدر علمی سرمایے فراہم کیے ہیں جن سے ان کی عالمانہ شخصیت اور فضل و کمال کے جوہر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ عربی میں سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان اور فارسی میں ماثرالکرام ، روضۃ الاولیا ، سرو آزاد ، خزانۂ عامرہ ... علمائے ہند ، فضلا و فقرا و مشایخ اور شعرا کے تذکرے ہیں اس مختصر سے مقالے میں آزاد بلگرامی کے احوال و آثار کے ذکر سے صرفِ نظر کر کے ان سے منسوب ایسے آثار کا تذکرہ مقصود ہے جن کے بارے میں اس سے پہلے کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

۱۔ اردو شاعری:

ہر چند آزاد نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ انھوں نے بزبانِ ہندی (اردو) کوئی شعر نہیں کہا (۱) اور نہ اس زبان میں نثر میں کوئی چیز لکھی ہے پھر بھی بعض تذکرہ نویسوں نے ان کے کچھ اردو اشعار نقل کیے ہیں۔ اس سلسلے میں آزاد کا بیان قابلِ غور ہے:

> "من ہیچدان با زبان عربی و فارسی و ہندی آشنایم و از ہر سہ میکدہ بقدر حوصلہ قدحی می پیمایم در عربی و فارسی عمرہا مشق سخن کردم و نور سان معانی را در آغوش فکر پروردم۔ مشق سخن ہندی ہر چند اتفاق نیفتاد و فرصت تسخیر سبزان این قلمرو دست بہم نداد اما سامعہ را از نوای طوطیان ہند حظی وافر است۔" (۲)

سبحۃ المرجان میں مسعود سعد سلمان کے حال میں لکھتے ہیں:

> "و او (مسعود سعد سلمان) مثل من شناسا است ہر سہ زبان را و صاحب

سہ دیوان است عربی و فارسی و ہندی و من صاحب دو دیوان ہستم عربی و فارسی و مرا در ہندی دیوان نیست و لیکن بہ اشعار ہندی ماہرم و بہ معرفت حسن و قبح او قادرم۔" (۳)

مقبول احمد صمدنی "حیاتِ جلیل" میں لکھتے ہیں:

"آزاد ہندی یا ہندوستانی (ریختہ یا اردو) میں شعر نہیں کہتے تھے۔ وہ اس کو اپنے مرتبہ عالی سے پست و دون سمجھتے تھے۔ اپنے تذکروں اور احوال میں وہ اپنی ہندی شاعری سے انکار کرتے ہیں جو غزل ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس کی روایت بے اصل اور غیر مستند ہے ان کو قائم چاند پوری کا شاگرد بنانا محض بہتان و اتہام ہے اور ان کے خاندان کی خصوصیات و محفوظ روایات کے بالکل منافی۔" (۴)

ان سب بیانات کے باوجود اسد علی تمنا اورنگ آبادی نے جو آزاد بلگرامی کے شاگرد تھے، گل عجائب (سال تالیف ۱۱۹۲ اور ۱۱۹۴ھ) میں آزاد کے اردو کے دو اشعار درج کیے ہیں اور لکھا ہے کہ

"اشعاری کہ از دیوان فصیح البیان التقاط و اقتباس یافتہ، برنظار گیان این سیر گاہ ... عرض می شود"۔ (۵)

صاحب تذکرۂ سخن شعرا، صاحب خم خانۂ جاوید اور صاحب جلوۂ خضر نے بھی آزاد کے اردو اشعار نقل کیے ہیں اور ان سب اقوال کے پیش نظر محققِ شہیر جناب جمیل جالبی صاحب نے خان آرزو کے ایک قول سے استنباط کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مجمع النفائس کے ایک بیان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے خان آرزو نے مجمع النفائس میں لکھا ہے کہ (آزاد) نے قصیدہ عربی کے ہمراہ ایک ہندی غزل جواب میں بھیجی (۶)

جبکہ خان آرزو کی اصل عبارت یہ ہے۔

"..... بافقیر آرزو اخلاص غائبانہ دارد سابق از کمال شوق ہندوی جوابی فرستاد، طلب اشعار و احوال فقیر نمودہ، یک دو غزل فارسی و قصیدہ عربی در

کمال بلاغت و فصاحت فرستادہ بود درینولا ہندوی جواب فرستاد سہ جزو از غزلیات خود نوشتہ مشق بخشش رسیدہ۔ تلاشہای بالا دست دارد " ۔(۷)

اس عبارت سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آزاد نے خان آرزو کو ایک ہندی غزل بھیجی تھی، جیساکہ جناب جمیل جالبی نے تحریر فرمایا ہے (۸) البتہ حاکم لاہوری نے لکھا ہے:

" ... فقیر از لاہور بہ جہان آباد وارد شدہ۔ روزی بہ خانہ خان مغفور آرزوی مرحوم اتفاق افتاد درہمان ایام ہندوی ایشان (آزاد) مع سہ جزو نقل برداشت و درنسخۂ مسمیٰ بہ انتخاب حاکم مرقوم نمود " ۔ (۹)

ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ ہندوی، ہندی (اردو) کے معنی میں استعمال نہ ہوا ہو بلکہ ہنڈی ہو۔ زمانہ قدیم میں اس کا رواج تھا اور اب بھی ہے لیکن موجودہ صورت، سابق کی حالت سے بدلی ہوئی ہے۔ فرہنگوں میں بھی یہ لفظ ملتا ہے:

ہندوی: بالکسر و ضم دال ہندی آنست کہ زر بہ صراف دہند و ازو تنخواہ بجای دیگر نویسانده گیرند و این رسم ہندوستان و لفظ ہندی است و آن را بفارسی سفتہ گویند و سفتج معرب آنست

(فرہنگ آنند راج ۷ / ۴۶۲۶)

بکسر ہا و سکون نون و دال ہندی بوا و رسیدہ و تحتانی بہ تحتانی دیگر رسیدہ آنست کہ زر بہ صراف دہند و بجای دیگر نویانند و بگیرند و موافق نرخ مرسوم و صداین را بہ صراف عائد سازند و ... دراصل این زبان ہندی بضم ہا و سکون نون و دال بہ یا رسیدہ

(غیاث اللغات، ۱۲۵۴ - ۱۲۵۵)

آزاد بلگرامی نے بھی خزانۂ عامرہ (ص ۲۰۱، ۳۵۱) میں حاکم لاہوری اور واقف بٹالوی کے ترجموں میں لکھا ہے کہ "فقیر قدری زر بر سبیل ہندوی، بر ہر دو عزیز فرستاد"

صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر جلد اوّل ص ۱۰۰ پر کچھ اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد اردو میں بھی شاعری کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

حضرت آزاد اگرچہ عربی اور فارسی کے زبردست شاعر تھے مگر زمانے کے مذاق کے مطابق کبھی کبھی بھاکا میں بھی کچھ کہہ لیتے تھے چنانچہ ایک فارسی قطعہ سیّد علی مصطفےٰ بن

سید نور الہدیٰ کی پیدائش پر کہا جس کے آخر میں ایک شعر عربی اور ایک بھاکا کا ہے کبھی کبھی حسب زمانہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے چنانچہ تذکرۂ سخن شعرا میں ایک اردو شعر بھی نقل ہوا ہے (یہ عبارت ہو بہو صغیر کی نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم ہے، اس وقت جلوۂ خضر یا اردو ادب کی تاریخ پیش نظر نہیں ہے۔)

پروفیسر نثار احمد فاروقی استاد زبان و ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی کو آزاد کی ایک ایسی بیاض دستیاب ہوئی جو غالباً سالار جنگ میوزیم حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے اور یہ بیاض سفرِ حج میں آزاد کے ساتھ تھی پھر کافی عرصے تک نواب صدیق حسن خاں کے پاس بھی رہی۔ پروفیسر فاروقی نے اس بیاض سے آزاد کے دو اردو اشعار کو منادی دہلی میں ان کی فارسی کتاب روضۃ الاولیا کے اردو ترجمے کے ہمراہ شائع کر دیا ہے بعد کو ان کے ترجمہ کردہ روضۃ الاولیا کا ایک خوبصورت ایڈیشن رام پورسے چھپا۔ اس کے مقدمے میں انھوں نے یہ دونوں اشعار شائع کیے ہیں اس میں ایک شعر تو وہی ہے جو گلِ عجائب (ص ۳) میں پہلے شائع ہو چکا تھا البتہ دوسرا شعر شاید پہلی بار شائع ہوا ہے، اس طرح اب تک آزاد کے نام منسوب اردو اشعار کی تعداد ۱۲ ہو گئی ہے۔ "لب" ردیف والی غزل (۹اشعار)، دو اشعار جو گلِ عجائب میں آئے ہیں اور ایک شعر جو پروفیسر فاروقی نے روضۃ الاولیاکے اردو ترجمے کے مقدمے میں شائع کیا ہے اور ایک بھاکا شعر جو خزانۂ عامرہ میں ہے ان اشعار کو دیکھتے ہوئے قیاس کہتا ہے کہ آزاد نے مذاقِ زمانہ کے مطابق ممکن ہے اردو میں بھی کبھی کوئی شعر کہا ہو لیکن اس کی ٹھوس دلیلیں موجود نہیں ہیں اور نہ آزاد کا کوئی بیان ایسا ملتا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

۲۔ دلگشا نامہ:

فارسی کی ایک طولانی نظم ہے جس کا موضوع حضرت مختار کا قاتلان حسین سے انتقام لینا ہے اسکا سنہ تصنیف ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء ہے ریو نے اس کو آزاد بلگرامی سے منسوب کر دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ نظم، حملہ حیدری مصنفہ باذل مشہدی کا تکملہ ہے (۱۰)

در واقع دلگشا نامہ میرزا ارجمند متخلص بہ آزاد و جنون کشمیری (م ۱۱۳۴ھ / ۱۷۲۱ء) کی تصنیف ہے آزاد بلگرامی کی عمر سنہ ۱۱۳۱ھ میں جب یہ مثنوی مکمل ہوئی تھی پندرہ سال ہو گی۔

۳۔ حظیرۃ الجنان برائے اہل ایمان:

آقا میرزا محمد علی نے مذکورہ کتاب کو آزاد بلگرامی کی تصانیف میں شمار کیا ہے

(۱۱) اور اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے جبکہ کسی تذکرہ نویس یا خود آزاد نے جنھوں نے اپنی مختلف کتابوں میں اپنے مختصر حالات اور کتابوں کے ناموں کا ذکر کیا ہے۔ اس نام کی کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔

۴۔ عماد السّعادت:

ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم (۱۹۰۶ - ۱۹۸۶ء) نے اس کتاب کو آزاد سے منسوب کیا ہے اور یقیناً یہ سہوِ قلم ہوگا۔ (۱۲) درحقیقت یہ مشہور کتاب غلام علی خاں نقوی کی تالیف ہے اس کا سنہ تالیف ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء ہے یعنی یہ کتاب آزاد کے انتقال کے ۲۳ سال بعد لکھی گئی ہے۔

۵۔ گُربہ نامہ:

کلیلہ و دمنہ کے طرز پر بلّی اور مرغ کی ایک کہانی ہے جو اردو میں لکھی گئی ہے اور کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو آزاد بلگرامی کی تصنیف بتایا ہے مثلاً لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں، نجم الغنی خاں رامپوری نے بحر الفصاحت میں، مقبول احمد صمدنی نے حیاتِ جلیل ۲ / ۱۰۶ میں، سرفراز علی نے انجمن ترقی اردو کراچی کے مخطوطات کی فہرست میں اور وجاہت حسین نے جرنل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (۱۳) میں۔

لیکن ڈاکٹر نجم الاسلام نے نہایت دِقّت کے ساتھ دلائل و شواہد سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ گُربہ نامہ آزاد بلگرامی کی نہیں بلکہ غلام علی امروہوی کی تصنیف ہے (۱۴)۔ آزاد نے اپنی کتابوں کے تذکرے کے دوران گربہ نامے کا نام نہیں لیا ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام نے اپنی کتاب "مطالعات" میں گربہ نامے کی چار اشاعتوں کا ذکر کیا ہے میرے پاس بھی اس کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے جو مطبع مطیع الرحمٰن شاہجہاں آباد میں ۸ شوّال ۱۲۶۸ء کو چھپا تھا۔ اس پر بھی مؤلف کے نام کے طور پر غلام علی آزاد درج ہے ڈاکٹر نجم الاسلام نے جن مطبوعہ نسخوں کی نشان دہی کی ہے ان میں مذکورہ مطبوعہ نسخہ شامل نہیں ہے۔

حواشی

۱۔ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی جلد اوّل ص ۳۱۸ میں آزاد بلگرامی کے عنوان سے جو مقالہ شامل ہے اس کے مقالہ نگار نے لکھا ہے:

آزاد بہ زبانھای فارسی، عربی و اردو آثار فراوان بہ نظم و نثر دارد۔

حالانکہ اردو زبان میں ان چند اشعار کو چھوڑ کر، جن کے بارے میں ابھی کوئی حتمی دلیل نہیں مل سکی ہے، اردو میں کوئی چیز نہیں لکھی ہے۔

۲۔ سرو آزاد ص ۵۱:

۳۔ ترجمہ فارسی سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ص ۱۰۶ مخطوطہ موجود در کتابخانۂ خدا بخش پٹنہ۔

۴۔ حیاتِ جلیل ۲ / ۱۴۵ ۔ ۱۴۶

۵۔ گلِ عجائب ص ۳

۶۔ تاریخِ ادبِ اردو جلد دوم ص ۱۶۳

۷۔ مردم دیدہ ۔ حاکم لاہوری ص ۳۳

۸۔ تاریخِ ادبِ اردو جلد دوم ص ۱۶۳

۹۔ مردم دیدہ ص ۳۵

۱۰۔ فہرستِ مخطوطاتِ فارسی برٹش میوزیم جلد ۲ ص ۷۱۹، ریو کے علاوہ الذریعہ ۸ / ۲۵۵ مکارم الآثار جلد ۱، ۲ / ۱۱۳ ۔ ۱۱۵ اور دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی ۱ / ۳۱۹ میں اسے آزاد بلگرامی سے منسوب کیا گیا ہے۔

۱۱۔ مکارم الآثار جلد ۱، ۲ / ۱۱۳ ۔ ۱۱۵ علاوہ ازیں طبقاتِ اعلام الشیعہ (قرن ۱۲) میں بھی اسے آزاد سے منسوب کیا گیا ہے۔

۱۲۔ ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ ص ۸۹ ۔ اس کتاب کے فارسی ترجمے میں بھی اس سہوِ قلم کو دور نہیں کیا گیا ملاحظہ ہو۔ ادبیاتِ فارسی درمیان ہندوان ص ۹۰

۱۳۔ J.R.A.S.B.Vol. II No:3 P.119-130

۱۴۔ مطالعات از ڈاکٹر نجم الاسلام ص ۲۳۷ ۔ ۲۹۱ ۔

ڈاکٹر نجم الاسلام:

"رسالۂ تنقید بر کلام شہید" کا مُصنّف کون ہے؟

انجمن ترقّی اردو پاکستان کے ذخیرۂ مخطوطات (مخزونہ قومی عجائب گھر، کراچی) میں ایک مخطوطہ "شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان" مولفہ مرزا جان طپش کا ہے، جس کا نمبر ق۔ الف ۳ / ۵۹، ہے۔ اس میں ترقیمہ موجود ہے، جو یہ ہے۔

"للہ الحمد والمنۃ کہ این نسخۂ نادر البیان مسمیٰ بشمس البیان فی المصطلحات ہندوستان (کذا) من تالیف ابلغ البلغائی زمان متخلص بطپش مرزا جان بتاریخ سیوم ماہ جمادی الاول سنہ یکہزار و دو صد و ہشتاد و سہ ہجری من ہجرۃ النبویہ (سنہ ۱۲۸۳) در بلدۂ حیدرآباد فرخندہ بنیاد واقع محلہ علیا باد بوقت یکپاس روز برآمدہ از دست میر احمد علی عصر از کتاب منشی محمد حسن علی صاحب باتمام رسید فقط۔"

(ورق ۴۹۔ ب تا ۵۰۔ الف)

اس کے بعد اسی شانِ خط کے ساتھ چند اضافی اوراق بھی ہیں جس میں ایک مختصر رسالہ بھی ہے، جس کو حسبِ مطالب کسی نے "رسالۂ تنقید بر کلام شہید" کا نام دیا ہے۔ خود اس رسالے کے اوراق میں نام کی جگہ دیباچے میں چھوٹی ہوئی ہے مگر نام کتابت نہیں ہوا ہے جیسا کہ عنوان سرخ کے لیے جگہ خالی رکھی جاتی ہے۔ رسالے کے مُصنّف کے نام کی صراحت بھی کہیں نہیں ملتی۔ لیکن قرائن و شواہد اس کے حق میں ہیں کہ یہ رسالہ اسی کاتب میر احمد علی عصر کی تصنیف ہے جس کا نام اوپر درج شدہ ترقیمے میں آتا ہے، اور وہ یہ ہیں

۱۔ رسالہ کی شانِ خط وہی ہے جو شمس البیان مکتوبہ میر احمد علی عصر کی ہے، اور زمانہ کتابت بھی وہی ۱۲۸۳ھ ہونا چاہیے جو شمس البیان کے مخطوطے کا ہے۔

۲۔ میر احمد علی عصر، حیدرآباد دکن کے ایک معلوم شاعر اور مصنّف ہیں، چنانچہ

(الف) میر احمد علی عصر صاحبِ دیوان تھے۔ ان کے دیوان موسوم "دیوان عصر" کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ اس مخطوطے کا ذکر نصیر الدین ہاشمی نے "کتب خانۂ آصفیہ کے اردو مخطوطات" جلد اول (حیدر آباد دکن ۱۹۶۱ء) میں کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت شمس الدّین فیض کے شاگرد تھے۔ فیض کا دیوان بھی کتب خانۂ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ فیض کے اجداد دہلی سے دکن آکر بس گئے تھے۔ فیض کی پیدائش دکن میں ہوئی۔ شاعری میں تلمذ مشتاق دہلوی سے تھا جو درد کے شاگرد تھے۔ اس طرح عصر کا سلسلۂ تلمذ دو واسطوں سے درد تک پہنچتا ہے۔

(ب) ۱۲۸۲ھ میں عصر نے اپنا دیوان مرتب کیا جو نصیر الدین ہاشمی کی صراحت کے مطابق ۷۹۴ صفحات کو محیط ہے۔ پھر وہ یہ بھی صراحت کرتے ہیں کہ عصر نے چار دیوان مرتب کیے۔ غالباً یہ ضخیم "دیوان" ان کا کلّیات ہے جس میں چاروں دیوان یکجا شامل ہوں گے۔

(ج) کتب خانۂ آصفیہ میں عصر کی ایک مذہبی تصنیف "بوارق حقّیہ" کا قلمی نسخہ بھی ہے جو ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں طریقۂ نقشبندیہ پر طریقۂ قادریہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ "بوارق حقّیہ" کا ذکر نصیر الدین ہاشمی کی مذکورہ فہرست مخطوطات کی جلد دوّم میں آتا ہے۔ یہ عصر کے ایک شاگرد اور مرید میر بندہ علی حسینی کا مکتوبہ ہے۔ بوارق حقّیہ کا سنہ تصنیف ۱۲۹۰ھ ہے اور یہ قلمی نسخہ ۱۲۹۲ھ میں کتابت کیا گیا ہے۔

ان تفصیلات سے میر احمد علی عصر کی علم و فن پر دسترس اور تصنیف و تالیف کے شغل کی طرف رجحان ظاہر ہے۔ ان کا کتابت کردہ ایک قلمی نسخہ تو یہی انجمن کا مذکورۂ بالا مخطوط شمس البیان ہے۔ دیگر دو قلمی نسخوں پر بھی بحیثیت کاتب میر احمد علی عصر کا نام ملتا ہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے ذخیرۂ مخطوطات کے دو نسخوں پر میر احمد علی عصر کا نام کاتب کی حیثیت سے آتا ہے۔ یہ دونوں نسخے تذکرۂ فردوس الاذکار کے ہیں جن کے مؤلف نصیر الدّین نقش حیدر آبادی ہیں اور وہ بھی عصر کی طرح میر شمس الدین فیض کے شاگرد تھے۔ افسر صدیقی نے انجمن کے ایک اور مخطوطے کو بھی امکاناً میر احمد علی عصر کا مکتوبہ نسخہ بتایا ہے۔ (دیکھیے "مخطوطات انجمن" مرتبہ افسر صدیقی۔ جلد چہارم ص ۱۳۲)۔ یہ عصر کے استاد بھائی بے باک حیدر آبادی کا دیوان ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۲۸۳ھ ہے۔ اور یہی اس قلمی نسخے کا سنہ کتابت بھی ہے۔ تین قلمی نسخے ایسے بھی ہیں جن پر عصر کی مہر ملتی ہے۔ ایک تو یہی

انجمن کا نسخہ شمس البیان. دوسرے انجمن کے ذخیرے کا ایک قلمی نسخہ کلیات جرأت کا۔ (مخطوطات انجمن. ج ۲. ص ۱۱۵) تیسرے دیوان بےباک (ایضاً. ص ۱۳۳)۔ مہر کی موجودگی سے افسر صدیقی نے قیاس کیا ہے کہ وہ ایک کتاب خانہ بھی رکھتے تھے (ایضاً. ص ۱۳۳)۔

۳۔ رسالۂ تنقید بر کلام شہید کی داخلی شہادت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اس کا مصنّف کوئی دکنی ہے جو ہندوستانیوں کی تعلّی کا رد. تعریض کے ساتھ کر رہا ہے۔

(الف) نسخۂ زیر نظر میں ورق ۵۰/ب سے رسالۂ تنقید بر کلام شہید کا متن شروع ہوتا ہے۔ ورق ۵۲/الف پر تعریضاً آتا ہے۔

"میاں ہندوستانی وہ جو جناب مولوی صاحب نے قصّۂ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ رقم فرمایا ہے ......"

(ب) ورق ۲۵/ب پر کلمات تعریض یوں آتے ہیں:

"کیوں میاں ہندوستانی کہو تو ان روایات سے حضرت بلال کا مدینۂ منورہ میں انتقال کرنا کہاں ثابت ہوتا ہے۔ اگر سوائے اس کے روایت ہے تو لکھا لاؤ میں بھی دیکھوں۔"

(ج) اسی فقرے کے ذیل میں یہ بھی آتا ہے

"میاں ہندوستانی یہ تو روایت کی غلطی تھی. اب وہ غلطیاں بتاتا ہوں کہ جناب مولوی صاحب (مولوی غلام امام شہید) نے باوصف اہلِ لسان ہونے کے اپنی زبان خاص میں کی ہیں (کذا)۔"

غرض کہ بخوبی واضح ہے کہ اس رسالے کا مصنّف کوئی ہندوستانی نہیں ہوسکتا۔ وہ دکن کا باشندہ ہوسکتا ہے جیسا کہ میر احمد علی عصر تھے کہ ان کی پیدائش حیدرآباد دکن میں ہوئی تھی (گوکہ آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے)۔

ان تصریحات کے بعد ہمارا یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ رسالے کے مصنف. خود کاتب نسخہ میر احمد علی عصر حیدرآبادی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

علی رضا ذکاوتی قراگزلو:
مترجم: نجم الاسلام

کچھ کتاب "سرّ العالمین" کے غزالی سے انتساب کے بارے میں

کتاب "سرّ العالمین و کشف ما فی الدّارین" کے بارے میں اب غالب نظریہ یہ ہے کہ محمد غزالی کی طرف اس کے انتساب کو رد کرتے ہیں (۲) لیکن گذشتہ فضلاء اس خیال کے حامل تھے اور یہاں وہاں اب بھی کوئی کوئی ہیں کہ اس کتاب کو محمد غزالی کی تحریر کردہ سمجھتے ہیں۔ (۳) ظاہر ہے کہ بحث جو اس کتاب کے مطبوعہ نسخے کے بارے میں ہے یہ احتمال رکھتی ہے کہ غزالی نے اس نام کی کوئی کتاب لکھی جو اس مطبوعہ نسخے پر کلاً و بعضاً منطبق نہیں ہوتی۔ مسئلے کو جو چیز حسّاس بناتی ہے یہ ہے کہ کتاب سرّ العالمین لکھنے والے کا اعتقاد تشیع پر ہے اور اگر کتاب کو غزالی سے غلط منسوب کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آخر عمر میں غزالی کو تسنّن میں اصرار کرنے پر پشیمان ظاہر کرتے ہیں (در آخر عمر پشیمان از لجاج در تسنن وانمود کنند)

مرحوم جلال ہمائی ان میں سے ہیں جو اس کتاب کے غزالی سے انتساب کو قطعی طور پر رد کرتے ہیں: مُسلّم ہے کہ کتاب سرّ العالمین کو عمداً غزالی کے نام سے گھڑا گیا ہے اور شہرت دی گئی ہے اور مقاصد کچھ اس قبیل کے ہیں کہ غزالی کو باطنیہ اور شیعہ کا طرف دار بنا کر پیش کیا جائے یا ان کو جعل، خرافات اور اعتقاد موہوسات کے ذریعے بے اعتبار کیا جائے اس کتاب کے مقالۂ چہارم میں خلافت بلا فصل علی و غصب دیگراں و حدیث غدیر خم کے متعلق تصریح اس دعوے پر دلیل قاطع شمار کی گئی ہے۔ شیعہ مؤلفین کے ایک گروہ نے اسی ایک کتاب سے غزالی کا تشیع ثابت کر ڈالا ہے اور یہ استنباط کیا ہے کہ وہ مذہب سنّت و جماعت سے برگشتہ ہو گئے تھے اور خالص شیعہ بن گئے تھے

اس کے بعد مرحوم ہمائی بعض ان تناقضات کی طرف جو کتاب میں موجود ہیں اشارہ

کرتے ہیں (۴)

اس کتاب کے اوایل میں ہم پڑھتے ہیں : اول من استنسخہ و قراہ علی بالمدرسۃ النظامیۃ سراً من الناس فی النوبۃ الثانیہ بعد رجوعی من السفر. جعل من ارض المغرب یقال لہ محمد بن تومرت من اہل سلمیہ ... (ص ۹) یہ ظاہرا وہی محمد بن تومرت (۴۸۵ تا ۵۲۴ھ) ہے جو متمہدی (مدعی مہدویت) اور " دولتِ موحدین " کا بنیان گذار ہے۔ اس نکتے پر توجہ کرنے سے کہ اس کتاب میں سیاسی توطئہ گری ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ اس کتاب کے محرک اور الہام بخش ابنِ تومرت نے اپنے دعوے کے حق میں لکھا ہو؛ برائے نمونہ یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

" .... فقال (بعض المتصوفہ) .... ساجرب نفسی فی طلب المملکۃ وکان فیہ آلۃ من علم و ادب وکان محلا قابلا للملک فوثب للفراشین فخدم معھم و فشا امرہ فی السیرۃ الحمیدۃ . ثم مات مھتارھم (= مہر دار ہم) فصار مکانہ. ثم عبث بادیوان حتی انتقل الی مکان رئیسھم فلما انتشر شکرہ وداع خیرہ و ذکرہ. قبض الوزیر و رتب مکانہ اقساس الرعیۃ و اظہر العدل و غلق ابواب الظلم و استراح الناس من ثقل ماکانوا فیہ. حتی مات الملک فسور ادر اصل : فصور امکانہ و تزوج با بنتہ (ص ۵۱)۔

ایک مستعد آدمی جو علم و ادب کی دولت سے بہرہ ور بھی ہے۔ دربار میں فراشی کی خدمت پر وارد ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وزیر کا مہردار (یا مہتر فراشان) بن جاتا ہے۔ تب دیوان تک راہ پاتا ہے اور رئیسِ دیوان ہوجاتا ہے۔ اور اس مقام پر از خود اس طرح مردم داری کا مظاہرہ کرتا ہے کہ شاہ وزیر کی باز داشت کرتا ہے اور اسے اس کی جگہ پر متمکن کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے ہیرو کی کاردانی اور داد گری ظاہر ہوتی ہے۔ شاہ کے فوت ہوجانے کے بعد، وہ شاہ کی دختر سے شادی کرلیتا ہے اور تختِ شاہی پر بیٹھتا ہے۔

یہ داستان ہے بطورِ نمونہ؛ جس کی تاریخ اسلام و ایران میں بھی نظیریں ہیں اور جسے ہم کتاب سرّ العالمین میں بھی دیکھتے ہیں۔ رستم اور شہر یار دیلمی باہم معارضہ رکھتے ہیں۔ پھر دونوں پر حملہ کر کے دونوں کی عورتوں کو اسیر کرلیتا ہے اور راہ گیروں اور سپاہیوں کے اختیار میں دے دیتا ہے ... فقتل رستم و قبض علی شہریار و امر السیف علی قتلین ... فجعل النساء علی ما قبل فکانا للمارہ و للمبارزہ ... " (ص ۲)۔ بعید ہے کہ ایک مسلمان اور شیعہ ایسی نسبت

سلیمان کے ساتھ   دے؛ جو نص قرآن سے پیغمبر ہے؛ (۵)

اس کتاب میں خرافاتی مضامین بھی ہیں۔ مرحوم ہمائی نے اس کتاب کے غزالی سے انتساب کے رد میں جو دلائل دیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

"این کتاب مطالبی راجع بہ جن گیری و تعویذات و عزایم و کیمیا و سیمیا و طلسمات و خواص اشجار و نباتات دارد کہ ہرگز از نویسندہ احیاء العلوم و المنقذ من الضلال و تہافت الفلاسفہ نتواند بودہ۔ باید گفت در احیاء العلوم کراماتی بہ بعضی از زہاد و صوفیہ نسبت دادہ شدہ کہ دست کمی از این مرجوعات ندارد و در زمان غزالی "علوم غریبہ" را از جملہ دانشہا محسوب می داشتہ اند۔

اس کتاب میں کلمہ "عشق" عرفانی معنوں میں لایا گیا ہے (ص ۱۲۸، ۱۳۸) اور کلمہ "مشاہدہ" بھی جیسا کہ ادبیات فارسی میں استعمال ہوتا ہے۔

"فھذہ الطائفۃ الالہیہ ..... لیسوا کالطائفۃ المنقولۃ بالعلوم و الشہوات و صرفوا ھمومھم الی القیل والقال (ص ۱۶۲)۔

یہ دونوں فقرے نشان دہی کرتے ہیں کہ لکھنے والا ایرانی عربی نویس ہے۔ کلمہ "شاوش" ("جاوش" ص ۱۳۲) اور چلّہ" (=اربعین ص ۱۶۲) بھی اسی قبیل سے ہے۔

کلمہ "قدم" کا استعمال مستراح کے معنوں میں بھی مستحدثات میں سے ہے اور عربی قدیم و فصیح سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ "تم آداب دخول القدم، تقدم الرجل الیسری فی الدخول الیمنی فی الخروج" (ص ۸۳)

دلائل اباحیہ میں سے دو یہاں نقل کرنا مناسب ہوگا۔ ایک دلیل نقلی کہ آیت ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعا (بقرہ ۲۹) سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ بنائے اصلی حالتِ طبیعی پر ہے نہ کہ تحلیل و تحریم پر، اس واسطے کہ انبیاء تحلیل و تحریم لے کر آئے ہیں۔ دوسری دلیل عقلی کہ انبیاء کا خطاب موجودین (یعنی معاصر انسان) سے ہوتا ہے نہ کہ ان سے جو اس زمانے میں موجود نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ معدوم کو موردِ خطاب قرار نہیں دیا جاتا (ص ۴۹، ۵۰)۔ یہ دو نکتے ان چیزوں پر اضافہ ہیں جو "ردِّ اباحیہ" میں محمد غزالی لائے ہیں۔"

اس کتاب میں ایک فقرہ ابوحیان توحیدی سے نغمہ سرای کی تجویز میں بھی آیا ہے۔ یہ کہ اونٹ حدی خوانی کے شوق میں بیابانوں کو طے کرتا ہے (ص ۱۶۲) جالب توجہ ہے کہ مرحوم

ہمائی نے سبکی سے نقل کیا ہے کہ غزالی نے تصوف میں ابوحیان توحیدی کی روش کی پیروی کی ہے۔

(معارف تہران ، جنوری ۱۹۹۱ء)

یاد داشتیں

(۱) سر العالمین و کشف ما فی الدارین، تالیف حجۃ الاسلام ابی حامد الغزالی، النجف الاشرف، مطبعہ النعمان ۱۳۸۵ / ۱۹۶۵ء۔

(۲) فہرست آثار ہای غزالی، کامران فانی، معارف ویژہ نامۂ غزالی۔ آذر۔ اسفند ۶۳، ص ۲۱۰۔

(۳) عبدالرحمٰن بدوی سر العالمین کو غزالی (م ۵۰۵ھ) کی تصنیف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ۵۰۳ھ تا ۵۰۵ھ کے دوران لکھی ہے۔ ملا محسن فیض بھی اس طرف رجحان رکھتے ہیں کہ غزالی آخر عمر میں تشیع کی طرف مائل ہوگئے تھے اور سند میں سر العالمین کو لاتے ہیں (رک عبدالکریم سروش ، " جامۂ تہذیب برتن احیا"۔ مجلۂ فرہنگ بہار و پاییز ۱۳۴۸، ص ۹۲۰۲)

(۴) غزالی نامہ چاپ دوم، ص ۲۷۱۔

(۵) و نیز رک۔ ص ۱۲۔ ۱۳

(۶) " کتاب بذکر فیہ جماعۃ اہل الاباحۃ " از تصانیف غزالی چاپ شدہ در مجموعۂ زمینۂ ایران شناسی بہ کوشش جنگیز پہلوان۔ وحید نوشیروانی و نیز کیمیای سعادت چاپ خدیو جم۔ ج ۱، ص ۷۰۔ ۴۵ ج ۲ ص ۴۸۔ ۴۲

جمال الیاس:
مترجم: نجم الاسلام

رسالۂ نوریہ کس کی تصنیف ہے؟

[دانش گاہ تہران سے شائع ہونے والے مجلّے "معارف"، ج ۱۳، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۹۶ء میں جناب جمال الیاس (ایمہرسٹ کالج میساچوسیٹس) کے قلم سے تعارف و تصحیح کے ساتھ، رسالۂ نوریہ کا متن شائع ہوا ہے۔ مصحح کی تعارفی تحریر میں رسالۂ نوریہ کے انتساب پر بھی مختصر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے نسخوں کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔]

شیخ رکن الدین احمد محمد بن احمد علاء الدولہ سمنانی (۶۵۹ھ تا ۷۳۶ھ مطابق ۱۲۶۱ء۔ ۱۳۳۶ء) قرن ششم و ہفتم کے مہم ترین مشائخ صوفی اور بزرگان عرفان میں سے ہوئے ہیں۔ انھوں نے سلسلۂ کبرویہ کے بارے میں متعدد آثار تصنیف کیے ہیں جو صوفیہ کے دیگر مسالک میں، جو بعد میں ایران، افغانستان اور ہندوستان میں متداول ہوئے، بطور خاص و عام زیادہ تاثیر رکھتے ہیں۔ (۱)

سلسلۂ کبرویہ اور اس کے جانشینوں کی مشخص علامتوں میں ان احوال و مشاہدات کی شرح ہے جن سے صوفی حضرات طریقت کے مختلف مراحل کے دوران دوچار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کے بڑے شیوخ۔ مثلاً شیخ نجم الدین کبریٰ اور شیخ نجم الدین دایہ رازی نے اس قبیل کے مشاہدات کی تفسیر میں رسائل تحریر کیے ہیں جن کی قدر و منزلت بعد کے محققین اور صوفیہ کی نظر میں بہت زیادہ ہے۔

ان مہم ترین رسائل میں سے ایک رسالۂ نوریہ یا رسالۃ الانوار ہے۔ یہ رسالہ فہرستوں میں اور تصوف کی کتابوں میں شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی اور شیخ سیّد علی ہمدانی کے ناموں سے مذکور ہوا ہے۔ لیکن کہنا چاہیے کہ یہ رسالہ شیخ علاء الدولہ سمنانی سے تعلق رکھتا ہے۔ رسالۂ نوریہ کی شرح حال میں آیا ہے کہ یہ کتاب محمد خرد کے تقاضے پر تصنیف کی گئی ہے اور محمد خرد شیخ علاء الدولہ کے مرید و ہم مسلک ہوتے ہیں۔ پھر، رسالے میں

جو افکار و آراء موجود ہیں وہ شیخ علاء الدّولہ سمنانی کی تمام تالیفات سے ہم آہنگ ہیں۔ اس بناء پر کوئی شک نہیں کہ رسالہ نوریہ شیخ علاء الدّولہ سمنانی کی تالیفات میں سے ہے۔

رسالۂ نوریہ کے کل چار نسخے مطالعہ و تحقیق کے لیے راقم کے پیش نظر رہے ہیں، اور رسالہ حاضر انھی چار مذکورۂ بالا نسخوں کا تصحیح شدہ نسخہ ہے۔ ان کی توضیح یہ ہے کہ تین رسالے تو ایک ہی منبع کے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے

۱۔ ان میں سے ایک سیّد علی ہمدانی (متوفی ۷۸۶ھ / ۱۳۸۵ء) کے نوشتہ جات پر مبنی مجموعے کا ہے، جو شیخ علاء الدولہ کے مریدوں میں سے تھے۔ (۲)۔ موجودہ نسخہ سال ۷۴۳ھ (مطابق ۱۳۳۸ء) کا تنظیم شدہ ہے۔ یہ کتاب خانۂ گنج بخش اسلام آباد میں موجود خطی نسخوں (شمارہ ردیف ۴۰۰۹) کی سند پر قدیم ترین موجود نسخہ ہے۔ مذکورۂ بالا رسالہ واضح اور روشن طریقے سے تدوین شدہ ہے لیکن اس میں نقائص زیادہ ہیں، اور اس کے تحریر کرنے والے نے ان نقائص کو متن میں روشن کر دیا ہے اور انتخاب نے اپنے تصحیح شدہ رسالے میں۔ میں اس کا مختصر نام "گنج" رکھا ہے۔

۲۔ منبع اول کے دیگر دو نسخے ناقص ہیں۔ ایک، محقق محترم عارف نوشاہی کے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے (علامتی نام "نو")۔ یہ نسخہ محمد غنی کی کوشش سے ماہ ذی الحجہ ۱۰۳۱ھ میں مرتب ہوا ہے جو اخوند درویزہ ننگر باری (متوفی ۱۰۴۸ھ / ۱۶۳۸ء) کے مریدوں میں سے تھے۔ لیکن یہ بہت ناقص ہے۔

۳۔ ایک نسخہ نمبر ردیف ۳۲۷۳ ہے جو کتاب خانۂ دانش گاہ تہران میں موجود ہے (علامتی نام "دا")۔ اگرچہ یہ نسخہ کامل ہے لیکن اس پر تاریخ تنظیم درج نہیں، البتہ اسی رسالے کی جو دانش گاہ تہران میں موجود ہے آقای نجیب مائل ہروی کے کے اہتمام سے تصحیح و طباعت عمل میں آچکی ہے۔ (۳)

بلاشبہ رسالۂ نوریہ کا بہترین نسخہ وہ ہے جو کتاب خانہ وسلیمانیہ استنبول کے ذخیرۂ جار اللہ افندی کے خطی نسخوں میں نمبر ردیف ۱۱۰۵ پر موجود ہے۔ یہ منبع دوم کا تنہا نمائندہ رسالۂ نوریہ ہے۔ یہ خوش خط، کامل اور واضح نسخہ ماہ شعبان سال ۷۹۹ھ (مطابق مئی ۱۳۹۳ء) میں تیار ہوا ہے۔

حواشی

(۱) شیخ علاء الدولہ سمنانی کے احوال و آثار و افکار کے لیے دیکھیے سیّد مظفر صدر، ۔ شرح احوال و آثار و افکار شیخ علاء الدولہ السمنانی ۔ تہران، دانش، ۱۹۵۵ء۔

(۲) افکار و نوشتہ ہای سیّد علی ہمدانی سے آگہی کے لیے دیکھیے محمد ریاض، ۔ احول و آثار اشعار میر سیّد علی ہمدانی (اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی، ۱۹۸۵ء)

(۳) مصنفات فارسی، نوشتۂ علاء الدولہ سمنانی (تہران، شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، ۱۹۹۰ء)

نصر اللہ حکمت:
مترجم: نجم الاسلام

آیا کتاب "السّعادۃ والاسعاد" ابوالحسن عامری کی تصنیف ہے

مدخل:

کتاب "السّعادۃ والاسعاد" اور ابوالحسن عامری کی اور سب تالیفات میں اخلاق سے متعلق حصّوں کی چھان بین کے دوران علم ہوا کہ السّعادۃ کے اخلاقی تصورات اور عامری کے دیگر سب آثار میں موجود اخلاقی تصورات کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے، اور اس کا قوی امکان ہے کہ کتاب السّعادۃ ابوالحسن عامری کی نہ ہو۔ اس احتمال کی تائید میں جو دلائل سامنے آئے انھیں قلم بند کرنے سے پہلے کتاب السّعادۃ پر نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

اس کا پورا نام "السّعادۃ والاسعاد فی الشیرۃ الانسانیۃ" ہے۔ اس کا ایک قدیم نسخہ کتاب خانہ چیسٹر بیٹی (۱) ڈبلن میں ہے جو قرن پنجم ہجری کا ہے۔ اسے پہلی بار ۱۹۲۹ء میں محمد کرد علی (۲) نے مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق میں اس کی توصیف کی (۳)۔ اس کے بعد محققین نے اس رسالے سے شناسائی حاصل کرنے کی طرف توجہ دی۔ یہ نسخہ کتاب چیسٹر بیٹی کے ذخیرے میں ہے۔ یہ قدیم نسخہ اول و آخر سے ناقص ہے، اوراق ضائع ہوگئے ہیں، اور درمیان سے بھی اوراق گم ہیں۔ بالفعل اس میں ۲۲۳ اوراق ہیں۔ مرحوم مینوی نے اسی نسخے کو سامنے رکھ کر رو نویسی کی ہے لیکن بقول راوسون نسخۂ اصلی کی ترتیب صفحات کو محفوظ نہیں رکھا ہے (۴)۔ حواشی کتاب میں اس طور سے تصحیحات انجام دی ہیں کہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ حاشیہ مینوی کے نسخے سے مربوط ہے یا نسخۂ اصلی سے۔ مینوی نے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کی تکمیل اس نسخے کی رو سے کی جو ڈاکٹر اصغر مہدی، کے تصرف میں تھا، اور چند صفحات کا اس پر اضافہ کیا اور وہ عبارت ہیں صفحات ۲، ۱۳، ۱۴، ۱۲ سے (۵) جو دانش گاہ تہران کے توسط سے

آفسٹ کیے ہوئے نسخے سے لیے ہیں۔

جو نسخہ آقای مہدوی کے اختیار و تصرّف میں تھا، ایک باوثوق راوی کے بقول، سیّد جمال الدین اسد آبادی کا مملوکہ تھا جنھوں نے قریب نوّے برس پہلے اپنے قیام مصر کے زمانے میں کسی سے نسخۂ اصلی کی نقل اپنے لیے تیار کرائی تھی، پھر اسے اپنے ساتھ تہران لائے تھے۔ وہ تہران میں مدتوں حاجی امین الضرب کے مکان پر مقیم رہے۔ اور جب جانے لگے تو کسی وجہ سے وہ نسخہ مع نوشتہ جات و اوراق دیگر وہیں چھوڑ دیے۔ بعد میں، یعنی سال ۱۳۲۸ش کے لگ بھگ آقای مہدوی نے انھیں کتاب خانۂ شورای ملّی کے سپرد کر دیا۔ اس طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آقای مہدوی کا نسخہ، دانش گاہ تہران کے مطبوع نسخے سے کچھ تفاوت نہیں رکھتا، بجز اس کے کہ نسخۂ اخیر میں مرحوم مینوی کی تصحیحات کا اضافہ بھی ہے۔

اس نسخے میں چھے فصلیں ہیں۔ چار فصلوں کے شروع میں کتاب کا نام "السّعادۃ و الاسعاد فی السّیرۃ الانسانیۃ" کی صورت میں، اور فصل چہارم کے شروع میں "السّعادۃ والاسعاد فی ... الانسانیۃ" کی صورت میں آیا ہے۔ اور فصل اوّل کے شروع میں عنوان کتاب گم ہے۔ ان چھے فصلوں میں سے صرف فصل اوّل و پنجم میں مؤلف کا نام آیا ہے۔ فصل پنجم میں بصورت "ابوالحسن ابن ابی ذرہ" اور فصل اوّل میں بصورت "ابوالحسین یوسف بن ابی ذرہ" جسے مرحوم مینوی نے بصورت "ابوالحسین محمد بن یوسف ذرہ" تصحیح کر دیا ہے۔ یہ تبدیلی کہ ابوالحسین کو ابوالحسن سے بدل دیا ہے موجہ و مقبول ہے، اس لیے کہ کتاب میں سر تا سر مؤلف کا نام بصورت "قال ابوالحسن" آیا ہے۔ لیکن "محمد" کا اضافہ اور جا بجا "ابن" گردینے کی کوئی وجہ نہیں، بجز اس کے کہ مینوی نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ کتاب اس ابوالحسن عامری کی ہے جو نیشاپور کا تھا یعنی ابوالحسن عامری نیشاپوری۔

اس بنا پر مینوی نے بغیر اس کے کہ تصریح کریں اور سند دیں اور بات کو خوب تنقیح کر دائے دیں، پہلی بار اس کتاب کو ابوالحسن عامری سے منتسب کر دیا ہے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ کتاب الاعلام تالیف خیر الدّین زرکلی میں اس رسالے کا نام عامری کے آثار کے زمرے میں آیا ہے۔ پہلی نظر میں یہ قول مینوی پر تقدّم رکھتا ہے لیکن تحقیق کرنے پر ظاہر ہوجاتا ہے کہ فقط چوتھے ایڈیشن میں جو سال ۱۹۶۹ / ۱۳۸۹ھ ق میں چھپ کر شائع ہوا ہے، یہ نام ملتا ہے (۹)۔ اور قبل کے مطبوعہ نسخوں میں اس رسالے کا نام عامری کے آثار کے ضمن میں نہیں آیا ہے (۱۰)۔ یہ اثر خیر الدّین زرکلی کی وفات کے بعد، بغیر ماخذ کی صراحت کے،

عامری کے آثار میں بڑھا دیا گیا ہے۔ احتمال ہوتا ہے کہ یہ ناشر کے ہاتھوں ہوا ہے۔

مینوی کے بعد کسی نے بھی اس کتاب کے عامری سے منسوب ہوجانے پر چوں و چرا نہیں کی ہے، اور اس وقت تک جس کسی نے بھی عامری کے بارے میں مطالعہ اور غور و فکر کیا ہے، کتاب السّعادۃ کے اسی کی تالیف ہونے پر اتفاق کیا ہے (۸)، سوائے رادسون کے جو کہتا ہے کہ : مجھے کتاب السّعادۃ اور عامری کے دوسرے آثار کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ملی۔ مسکویہ کے اقوال میں جو عامری کے منتخب کیے ہوتے ہیں ایک عبارت ہے۔ جو کلمہ بہ کلمہ السّعادۃ کے مطابق ہے (۹) لیکن در حقیقت یہ تعریف مشہور ارسطو کی ہے ...(۱۰)

جیسا کہ ملاحظہ ہوا، رادسون نے دو نقطوں میں علامت سوال رکھی ہے اور تردید کی ہے ایک یہ کہ السّعادۃ اور عامری کے موجود آثار میں کسی نوع کا تطابق عبارات دیکھنے میں نہیں آتا، سوائے ایک مقام کے کہ اولاً جیسا کہ رادسون نے اشارہ کیا، یہ عبارت مشترک، سعادت کے بارے میں ارسطو کی مشہور تعریف ہے اور ترجمے کے وقت کے حکماء اور مؤلفوں میں رائج رہی ہے۔ ثانیاً یہ کہ تطابق قابل ذکر و قابل اعتنا، نہیں ہے ....

آخر میں، کتاب مزبور دکتر احمد عبدالحلیم عطیہ، استاذ دانش گاہ قاہرہ کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے ۔ انھوں نے اس پر ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے اور چند نکات کی توضیح کی ہے، لیکن متن کتاب کی تصحیح درستی کے ساتھ نہیں کی، اور بہت سے مقامات پر نسخۂ خطی کی غلطیاں بکثرت ان کی نظر سے چوک گئیں، اس پر مستزاد یہ کہ اکثر صفحات میں طباعت کی غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔

مسئلے کے حل کی راہ کیا ہے؟

معلوم ہوا کہ عامری کی طرف اس کتاب کے انتساب کا آغاز مرحوم مینوی سے ہوا۔ اور انھوں نے اس انتساب کی صحت پر کوئی دلیل بھی نہیں دی ہے۔ اب کیا کیا جائے ؟

اس بات کی تردید نہیں ہو سکتی کہ عامری کی زندگی اور اس کے احوال ظاہری کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں اور اس بات پر سب متفق ہیں۔ اب ہمارے پاس دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ عامری کے بارے میں واقفیت کم ہونے کی بناء پر، اس کے آثار موجود کی سیر کریں اور ان کی تطبیق کتاب السّعادۃ سے کریں، شاید اس سے کوئی راہ نکلے اور کسی نتیجے

پر پہنچیں۔ ہماری نظر میں یہ راہ بہترین اور مطمئن ترین ہے۔

دوسری راہ یہ ہے کہ مقایسہ (قیاس) و مقابلہ کو چھوڑ کر، متن آثار کے بیرون کو مورد تحقیق بنائیں۔ راہ اوّل مسدود ہو تو راہ دوم پر چلنا کہ یہ بھی تحقیق کے اصول و قواعد کے مطابق ہے، ناگزیر ہے۔ لیکن راہ اوّل کو چھوڑنا جب کہ دسترس میں ہو اور نسبۃً ہموار ہو، اور دوسری راہ کو اپنا لینا جو ناہموار اور سنگلاخ ہے، مناسب نہ ہوگا۔

اس مقالے میں راقم نے راہ اوّل کو اپنایا ہے جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوجائے گا۔
لیکن ایک اردنی مصنّف، ڈکٹر سحبان خلیفات نے، جنھوں نے کتاب "رسائل ابی الحسن عامری و شذراتہ الفلسفیۃ" کی تدوین کی ہے، دوسری راہ کو طے کیا ہے۔ اس کتاب کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ مشتمل ہے عامری کے اساتذہ اور شاگردوں کے احوال و آثار کی شرح پر۔ اور دوسرا حصّہ عامری کے چند تصحیح شدہ رسائل کو محتوی ہے اور اس کے ساتھ عامری کی وہ پراگندہ تحریریں بھی ہیں جو فراہم ہوئیں اور ان کے ذیل میں مؤلف کی تحلیلات و توضیحات بھی ہیں۔

دوسرے حصے میں مؤلف کی سعی قابل قدر ہے، اس لیے کہ تلاشِ بسیار اور دقّتِ وافر کے ساتھ عامری کی تحریروں کی تصحیح و تحقیق کی ہے، اور اس کے متفرق آثار کے اجزاء کی گرد آوری کی ہے۔ لیکن پہلے حصے پر کچھ کہنے کی گنجائش ہے، کہ مؤلف خود شروع میں معترف ہے کہ ہماری واقفیت عامری کی زندگی کے بارے میں بہت کم ہے (۱۱)۔ لیکن پڑھنے والا اس حصے کے آخر میں، جو کم و بیش ۲۰۰ صفحات کا ہے، متوجہ ہوتا ہے کہ عامری کے بارے میں مؤلف کی اطلاعات کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ در حقیقت مؤلف نے کوشش کی ہے کہ اپنے میلان کے مطابق ایک "ابوالحسن عامری" کی تخلیق و تجمیل کر ڈالے (۱۲)، اور اس مقصد کے لیے کل تاریخ کو شکست و ریخت کر کے جعل و الحاق و تحریف کے ساتھ ایک قالب میں ڈھال دے۔
البتہ اس کام سے پہلے مؤلف نے ایک نگاہ آثار پر بھی ڈالی ہے اور وجہ تشابہ کے تین ایسے مقامات جو چنداں ہم تشابہ نہیں ہیں، السّعادۃ اور آثار عامری کے مابین دریافت کر لیے ہیں، اور بتاتا ہے کہ ان تینوں مقامات کا تعارف اس مقالے کے آخر میں آئے گا۔

اس نکتے کا اضافہ کرنا مناسب ہوگا کہ آذری اور رادسون نے بھی، ایسے قرائن پیدا کرنے کے لیے کہ کتاب کے مؤلف حقیقی کے انکشاف کو کمک پہنچے، راہ اوّل اختیار کی ہے۔ اور بیشتر اثر اور تمام موجود آثار پر تکیہ کیا ہے۔ آذری کہتا ہے (۱۳): "و نام ہیچ مؤلفے مربوط بہ بعد از قرن چہارم دریں کتاب نیامدہ است۔" اور رادسون کہتا ہے (۱۴): "و کلمۂ رمزی

العارف چہار بار در کتاب السّعادۃ و یک بار در منقولات مسکویہ از عامری۔ در جاویدان خرد او۔ آمدہ است "

وہ شواہد جو السّعادۃ کے عامری سے انتساب کی صحّت کو مخدوش کرتے ہیں، یہ ہیں:

۱۔ عامری سے اس کتاب کے انتساب کی عمر کو چند عشروں سے زیادہ نہیں گذرے ہیں، اور آغاز میں بھی کوئی ایسی مضبوط دلیل اور سند اس انتساب کی صحّت کے حق میں نہیں آئی ہے۔

۲۔ ابوالحسن عامری کا نام تمام ماخذوں کی شہادت کے مطابق "محمد بن یوسف" ہے، جب کہ کتاب السّعادۃ کے مؤلف کا نام "یوسف بن ابی ذرہ" ہے اور کوئی دلیل موجہ اس نام کے اس سے بدل جانے کی موجود نہیں۔ حتیٰ کہ دکتر خلیفات بھی اسی روش پر چلے ہیں اور کہتے ہیں: "بعد از تمام این مباحث، نکتہ ای باقی می ماند کہ ناچاریم توجہ پژوہش گران را بہ آن جلب کنیم۔ شاید آنچہ را ما نتوانستیم بیابیم، آنہا بیابند۔ روشن کردیم کہ "ابوالحسن" کنیت ہمان فیلسوف مورد بحث یعنی عامری ایست و نام پدر او "ابوذر محمد بن یوسف" است۔ اکنون چگونہ می توان گفت کہ فیلسوف ما دفعۃً بہ ہمان اسم پدر یعنی "محمد بن یوسف" مشہور است؟ اعتراف می کنیم کہ تا این لحظہ ما ہیچ راہ حلی برای این مسئلہ نیافتہ ایم"۔ (۱۵)

۳۔ کتاب "الامد علی الابد" کے آغاز میں، جہاں عامری نے اپنے آثارِ موجود کی فہرست درج کی ہے، وہاں کتاب السّعادۃ کا نام نہیں لایا ہے۔ (۱۶)، دراں حالے کہ

(الف) کتاب الامد عامری کے اواخرِ عمر کی تحصیلات میں سے ہے (یعنی سال ۳۷۵ھ ق اور عامری سال ۳۸۱ھ میں فوت ہوا ہے)

(ب) اس فہرست سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ عامری کو اصرار ہے اس پر کہ تمام آثار یعنی اپنے کارناموں اور عمر کے حاصل کو تحریر میں لا رہا ہے، چنانچہ اپنے رسالات کا ذکر کرنے کے بعد، مختصر تحریروں، حتیٰ کہ مکتوبات کو بھی جو مسائل کے بارے میں لکھے تھے باعنوان کلی یاد کرتا ہے۔

(ج) تمام محققوں نے، جنھوں نے عامری پر تحقیق کی ہے، اعتراف کیا ہے کہ کتاب السّعادۃ بھی، کیا بہ لحاظ حجم اور کیا بہ لحاظ موضوع کہ وہ اخلاق و سیاست ہے، بہت اہمیت کی حامل ہے، اور اگر وہ عامری کی ہوتی تو اپنے اہم ترین اثر اور اہم ترین آثار میں سے ایک کی حیثیت سے یاد کرتا۔

۴۔ عامری کے معاصرین کے آثار میں اس کتاب کا نام نہیں آیا، کوئی عبارت اس کی

قول عامری کے عنوان سے نقل نہیں ہوئی۔

۵۔ عامری معمولاً ب ب ت مباحث مطروحہ کے دوران اپنی کتابوں میں ایک اثر کا نام دوسرے میں لاتا ہے ۔ اس طرح عامری کے مفقود آثار کی بھی اطلاع مل سکتی تھی مگر اس کی موجود تالیفات میں کتاب السّعادۃ و الاسعاد کا نام ، یا کتاب السّعادۃ میں موجود تالیفات کا نام مذکور نہیں ، جس سے ظاہر ہے کہ کتاب السّعادۃ اور موجود آثار عامری کے کوئی رابطہ و پیوند اس نوع کا نہیں ، اور انقطاع و انفصال برقرار ہے۔

۶۔ آثار عامری مانند الاعلام بمناقب الاسلام ، الامد علی الابد ، انقاذ البشر من الجبر و القدر وغیرہ پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے بھی یہ نکتہ آشکار ہوجاتا ہے کہ عامری تقریر مباحث کے دوران بہت دقیق اور منظم ہے اور اس کا شیوۂ نگارش محکم و استوار ہے یعنی اس سے پہلے کہ لکھنا شروع کرے، تمام محتوای کتاب کو اجمالاً ذہن میں جما کر پھر اس مجمل کو تفصیل کا جامہ پہناتا ہے ۔ بحث و استدلال میں بہت مرتب انداز میں آگے بڑھتا ہے۔ لیکن کتاب السّعادۃ وحدت تالیف اور روانی تحریر سے بے بہرہ ہے۔ اکثر صفحات میں بطور مکرّر اور کبھی بے وجہ اور بے مناسبت ، عبارت "قال و اقول " مذکور ہے، اور اس حد تک کہ نقض غرض کا موجب ہے اور معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا قول کس کا ہے ۔ کبھی مطالب ارسطو کو ہم قولِ ابوالحسن پڑھ جاتے ہیں، کبھی ابوالحسن کی آراء کو ارسطو کی زبان سے سنتے ہیں ، کبھی سخنِ ارسطو افلاطون کے منہ میں ہے، تو کبھی اس کے برعکس۔

۷۔ کتاب السّعادۃ میں موجود مولف کے اخلاقی نظریوں میں سے بہت سے ، عامری کے آثار موجود کی اخلاقی آراء سے متفاوت ہیں۔

۸۔ عامری کی نثر کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ کلمہ " منقس " بجائے " منقسم " لاتا ہے ۔ یعنی اپنی کتابوں میں معمولاً "ینقسم " کی جگہ " ینقس " لکھتا ہے۔ ڈکٹر احمد عبدالحمید غراب مصحح کتاب " الاعلام بمناقب الاسلام " نے بھی اس نکتے کا ذکر کیا ہے (۱۷) یہ کلمہ عامری کے تمام آثار موجود میں آیا ہے، دراں حالے کہ کتاب السّعادۃ میں ایک بار بھی نہیں آیا۔

۹۔ علی بن ابی طالب (ع) کا نام ایک بار " الامد علی الابد " میں (۱۸)، ایک بار " انقاذ البشر من الجبر و القدر " میں (۱۹)، اور دو بار " الاعلام بمناقب الاسلام " میں (۲۰) اس صورت میں آیا ہے : " الامام الاجل علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام " ، اور ایک بار الاعلام میں (۲۱) اس صورت میں الامام الاجل علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ " آیا ہے اور ایک بار اسی جگہ نام کے

بغیر اس طرح لکھا ہے : "وقال الامام الفاضل" (۲۲)۔ ان مذکورہ مقامات کے علاوہ اور کہیں نہیں آیا ہے جب کہ کتاب السّعادۃ میں ۲۵ بار بصورت "قال علی" آیا ہے۔

۱۱۔ کتاب السّعادۃ میں ارسطو کا نام ہمیشہ "ارسطو طیلس" کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔ دکتر سحبان خلیفات کی نقل کے مطابق عامری کے رسائل منطقی میں سے ایک میں ارسطو کا نام تکرر بشکل "ارسطو طالیس" آیا ہے (۲۳)۔ دکتر غلام حسین صدیقی قائل ہیں کہ نسبتہ درست نام ارسطو کا اس طرح ہے جیسا کہ کتاب السّعادۃ میں ذکر ہوا ہے یعنی "ارسطو طیلس" جو اریستو تلس سے نزدیک ہے (۲۴)۔

۱۲۔ کتاب السّعادۃ میں دو بار عبارت "قال بعض الحدث من المتفلسفین" (۲۵) آیا ہے۔ جو وہن (شستی) سے خالی نہیں۔ مرحوم مینوی حاشیے میں لکھتے ہیں: "ظاہراً مراد فارابی است" اور فارابی کا ذکر بصورت دگر نہیں ہوا ہے۔ دراں حالے کہ عامری نے اپنی تالیفات منطقی میں فارابی کا نام بصورت "ابونصر فارابی" ارسطو طالیس، فرفوریوس، ابوبشر متی، ابوالحسن عامری اور دوسروں کے ساتھ لایا ہے (۲۶)

۱۳۔ کتاب السّعادۃ میں محمد بن زکریا کا نام سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ساتھ آیا ہے (۲۷)۔ مگر عامری اپنی کتاب - الامد علی الابد میں محمد بن (زکریا) رازی کو، قدمائے خمسہ اور ارواح فاسدہ کے مقام پر ہذیان گوئی سے متہم کیا ہے (۲۸)۔

۱۴۔ عامری نے کتاب الامد میں ایک فصل حکماء کے باب میں قائم کی ہے اور اس کا قائل ہے کہ ہم پانچ "حکیموں" سے زیادہ کو نہیں مانتے جو یہ ہیں: لقمان، فیثا غورس، سقراط، افلاطون اور ارسطو، اور ان کے علاوہ کسی کو "حکیم" نہیں کہنا چاہیے۔ حتی کہ بقراط، ارشمیدس، دیو جانس، دیمقراطیس، جالینوس اور محمد بن زکریائے رازی کو بھی "حکیم" کے اطلاق کا سزاوار نہیں سمجھتا، اور تعجب کرتا ہے کہ اس کے زمانے کے لوگ کسی کو یوں ہی "حکیم" کیسے کہہ دیتے ہیں۔ اور خود اپنے اساتذہ کسی کو یوں ہی "حکیم" کیسے کہہ دیتے ہیں۔ اور خود اپنے اساتذہ ابوزید احمد بن سہل بلخی اور اس کے استاد یعقوب بن اسحق کندی کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ لوگ موجود نہیں تھے، ان کی غیر موجودگی میں کسی نے ان کو "حکیم" کہا، اور ابو زید بلخی کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا زمانے پر رونے کا مقام ہے کہ مجھ جیسے ناقص فرد کو حکمت کے ساتھ منسوب کرتے ہیں (۲۹)۔ اس سے ظاہر ہے کہ عامری بہت دقیق ہے اور لفظ حکیم کے اطلاق میں محتاط طریقے پر کاربند ہے۔ وہ ہر کسی کو حکیم نہیں کہتا، لیکن کتاب السّعادۃ میں

اصطلاح " حکیم " سخاوت کے ساتھ مصرف میں لائی گئی ہے اور بہتوں کو حکیم کہا گیا ہے ۔ ان میں سے ایک نام معاویہ کا ہے جو پانچ بار (۳۰) حکماء و اہل حکمت کے عنوان کے تحت لایا ہے اور افلاطون و ارسطو کے پہلو بہ پہلو بٹھایا ہے۔

السّعادۃ اور عامری کے آثار میں تشابہ : دکتر خلیفات کی نظر سے

دکتر سحبان خلیفات نے تین مقامات پر " وجہ تشابہ میان السّعادۃ و آثار عامری " کے عنوان سے ذکر کیا ہے (۳۱) جسے ہم ذیل میں نقل و نقد کرتے ہیں۔

۱۔ مؤلف کتاب السّعادۃ و الاسعاد ، افلاطون کا قول اس طرح نقل کرتا ہے : " اوّل المرقاۃ الی الخیر مفارقۃ الشرّ " اور کتاب " النسک العقلی و تصوف الملّی " میں (جو عامری کے آثار میں سے ہے) ، اس طرح آیا ہے : " الانفصال من الشرّ مفتح الخیر " اور دوسری جگہ کہتا ہے : " ھجر القاذورات مدرجۃ الی الخیرات " اور " مبدأ " وصال الاحسن ھجران الاقبح "۔

۲۔ اور افلاطون کہتا ہے: " ہم چار چیزوں سے ترکیب پائے ہوئے ہیں: ان، و لا ان، و نعم الان، و بئس الان۔ کہتا ہے: کہ زندگی طبیعی مارا " ان " قرار دادہ است، مرگ طبیعی مارا " لا ان " انتخاب زندگی مارا " بئس الان " ، و انتخاب مرگ مارا " نعم الان " قرار دادہ است ا بہ نقل از السعادہ ، ص ۴۴ ا

جس عبارت میں مسکویہ " الحکمۃ الخالدہ " میں عامری کا قول نقل کرتا ہے ، اسی طور پر آیا ہے : " واز این رو گفتہ اند ان " لا ان " خیر من بئس الان و مقصود شان این است کہ لاحیات بہتر از حیاتِ بد است " اور یہ عبارت جو منحصر بہ فرد ہے، غرابت الفاظ کے علی الرغم ، اپنی تفسیر کو ، کتاب السّعادت والاسعاد میں جو کچھ آیا ہے ، پالیتی ہے۔ اور یہ دو پیش ترین عبارتیں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اور یہ قوی ترین دلیل ہے کہ کتاب السّعادۃ والاسعاد کا انتساب ابوالحسن عامری کی طرف صحیح ہے۔

۳۔ " اور (افلاطون) کہتا ہے : و منزلت او ھمانند شخص مفلوج است چراکہ ہر گاہ بخواہد، بہ سوی حرکت کند ، بدنش بہ سوی دیگری رود۔ پس دانش اینان نہ تنہا مفید نیست بل در اکثر موارد زیاں بار است و آن چنین است کہ خداوند یاری کند کسی را کہ نفس خود را درحال کہ زندہ است بکند سپس این را بہ گونہ ای دیگر منشور سازد (بہ نقل از السّعادۃ، ص ۱۸، ۱۹)

اس عبارت کے مشابہ عبارت ذیل ہے جو عامری کی ہے:

"قوۃ تمیزیہ ہرچہ بہرہ اش از تمیز" بیشتر و از پلیدی و شوائب پاکتر باشد، پیروی اش از عقل بیشتر است وھرگاہ شرور بہ او رسد، نسبت او با عقل ھمانند نسبت اعضای مفلوج بہ بدنی توی و نیرو مند می گردد۔ پس ہمان طور کہ اعضای مفلوج۔ براثر عروض آفت جسمانی بر آنہا۔ ھرگاہ بہ طرف راست حرکت دادہ شوند بہ طرف چپ می روند۔ ھمین گونہ است حال شخص آزمند، ستم زدہ، مستور و ترسو۔"

دکتر خلیفات مطالب بالا کے آخر میں یہ کہتے ہیں: ہمارا اعتقاد ہے کہ یہ نصوص سہ گانہ، ہماری تحلیل کے ساتھ جو مؤلف کی شخصیت کے بارے میں کی گئی ہے، کافی ہیں اس امر کے لیے کہ اس کتاب کو ہم قطعاً ابوالحسن عامری کی سمجھیں۔ (۳۲)

نقد و بررسی:

ان نصوص سہ گانہ کو کتاب السّعادۃ اور آثار عامری میں وجہ تشابہ عنوان قرار دینے کا، اور پھر اس بنیاد پر ان کا مؤلف ایک ہونے کا حکم لگانے کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ کہنا چاہیے کہ سحبان خلیفات نے ۲۵۰ صفحات کے لگ بھگ کی ضخامت کی کتاب سے تین ایسے مقامات دریافت کرلیے ہیں جو عامری کے آثار سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اگر وجہ تشابہ کے یہ تین مقامات بفرض قبول بھی کرلیے جائیں تو یہ حکم لگانے کے لیے کہ کتاب السّعادۃ عامری کی ہے، کیا اسی کو کافی سمجھ لیا جائے؟ اب ایسی قلیل بلکہ اقلّ مقدار وجہ تشابہ کی تو بہت سی کتابوں میں موجود ہے۔ عامری نے عبارت میں افلاطون و ارسطو کے اقوال کو نقل کیا ہے، اور وہ بھی ایسے زمانے میں کہ متون یونانی کے ترجمے کے رواج کا دور دورہ تھا۔ اس زمانے کا ہر مؤلف یونانی آثار کے ترجمے سے آشنائی رکھتا تھا۔ ان مآخذ سے مطالب اخذ کرسکتا تھا اور نقل کر سکتا تھا۔ اس لیے دو نکتے مشابہ مطالب کے، ممکن ہے کہ تیسرا مأخذ رکھتے ہوں۔ راو سون نے بھی اس نکتے کی تصریح کی ہے۔ وہ کہتا ہے: یک عبارت (کوتاہ از السّعادۃ با عبارتی از منقولات مسکویہ، از عامری درجاویدان خرد مطابقت دارد کہ این عبارت تعریفی مشہور است از ارسطو دربارۂ سعادت کہ در اخلاق نیکو اخس آمدہ است (۳۳)۔ اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ عامری نے بھی اور مؤلف السّعادۃ نے بھی اس عبارت کو وہیں سے اخذ کیا ہے مثلاً پہلی والی مشابہ عبارت کو جسے سحبان خلیفات کتاب السّعادۃ اور کتاب النسک العقلی سے لائے ہیں، ابوسلیمان

منطقی سجستانی نے کتاب صوان الحکمۃ میں قول افلاطون سے نقل کیا ہے ، اور دکتر عبدالرحمٰن بدوی نے اس کو کتاب افلاطون فی الاسلام کے بخش افلاطون میں جگہ دی ہے (۴۴)۔ ابوسلیمان کی عبارت یہ ہے :

" قال (افلاطن) فعل الانسان الخیر والشر، واول الشر ترک الخیر "(۴۵)۔

اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ افلاطون سے منسوب کوئی کتاب ہاتھ میں ہوگی اور اس ساری نقل اقوال کا ماخذ وہی ہوگی۔

عبارت دوّم کے معاملے میں بھی یہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں ، ان دو عبارتوں میں ، نہ صرف یہ کہ باہم کچھ تشابہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک دوسرے سے متفاوت ہیں۔ دکتر غلیفات کی نقل کے مطابق ، افلاطون سے منقول عبارت اس طرح ہے :

" نحن مرکبون من اربعۃ : ان ولا ان ونعم الان و بئس الان " ۔

البتہ السّعادۃ کے متن میں " نعم الان و بئس الان " آیا ہے اور افلاطون کے قول کے بطور اس عبارت کی تفسیر اس طرح نقل ہوئی ہے : " حیات طبیعی مارا بہ صورت " لان " و مرگ طبیعی بہ صورت " لاان " قرار دادہ است اختیار حیات را " بئس الان " و اختیار مرگ مارا " نعم الان " قرار دادہ است (۴۶)۔

یوں نظر آتا ہے کہ قائل کی مراد یہ ہے کہ انسان بہ لحاظ حیات طبیعی " مشروط " ہے اور بہ لحاظ مرگ طبیعی " غیر مشروط " ۔ نتیجے میں اگر زندگی کا انتخاب کرتا ہے کہ مشروط ہے وہ " لحظہ خوب " ہے۔ اور اگر مرگ کا انتخاب کرتا ہے کہ نامشروط ہے تو " لحظہ بد " ہے۔

اس عبارت مذکور کو بہ لحاظ لفظ و معنی مقابلہ کیجیے اس سے جو مسکویہ عامری کے قول سے نقل کرتا ہے : " ان لاان خیر من بئس الان " کہ اس جگہ قائل کے اپنے قول کے مطابق کے مطابق " لاان " سے مراد " لاحیاۃ " ہے ..... عبارت مذکور کے معنی یہ ہیں کہ زندہ نہ ہونا بہتر ہے زندگانی بد سے۔ اور یہ مطلب اس سے جو افلاطون سے السّعادۃ میں نقل ہوا ہے بہ لحاظ معنی تفاوت رکھتا ہے۔ اور ان کے الفاظ بھی سوائے اشتراک حرفی کے ، کوئی اور تشابہ باہم نہیں رکھتے۔ ایک عبارت میں " ان و آن " آیا ہے اور دوسری عبارت میں " ان " ۔ کیوں کر کہا جاسکتا ہے ان کے درمیان تفاوت نہیں ہے ؟

لیکن عبارت سوّم کے معاملے میں کہا جاسکتا ہے کہ وجہ مشترک ان دو عبارتوں کی

"مقلوح" سے استفادہ ہے، بعنوان "مشبّہ بہ" یعنی ایک تمثیل کا دونوں میں آنا، اور ایک تشبیہ و تمثیل کا لانا (جو ہر جگہ رائج اور شائع ہے) کسی طور بھی ایک مؤلف ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

ضمناً اس نکتے کا ذکر لطف سے خالی نہیں ہے کہ کتاب السّعادۃ میں آیا ہے "قال و منزلتہ ..." (۳۸)۔ مؤلف السّعادۃ نے قائل کے نام کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ اس سے پہلے، ایک مطلب کو "و قال افلاطن" کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس کے بعد مورد بحث عبارت لایا ہے۔ سحبان خلیفات نے دوسرے "قال" کے بعد ایک "افلاطن" کرو شے میں رکھ دیا ہے لیکن ظاہراً مطلب مذکور آن ارسطو ہے (۳۹) نہ کہ افلاطون۔

اس بناء پر ان تینوں وجوہ تشابہ کے معاملے میں (اگر انھیں تشابہ فرض بھی کرلیا جائے تو) دو نکتے کلّی و مشترک کہے جاسکتے ہیں:

۱۔ تینوں عبارتیں جو کتاب السّعادۃ میں آئی ہیں افلاطون یا ارسطو سے منقول ہیں اور احتمال ہے کہ عامری نے (بفرضے کہ وہ کتاب السّعادۃ کا مؤلف نہیں ہے) اس عبارت کو کتاب السّعادۃ سے نقل کیا ہے یا کسی ایسے ماخذ سے لیا ہے جہاں سے السّعادۃ میں نقل ہوا ہے یا برعکس۔

۲۔ وجوہ تشابہ ہمیشہ فریب دینے والی ہوتی ہیں۔ لازم ہے کہ ہوش سے کام لیا جائے۔ چند مقامات تشابہ دو آثار میں دیکھ کر ان کے موثر کو ایک نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ خود عامری نے تشابہ کے خطر کو گوش زد کیا ہے۔ نیشاپور میں شیخ صوفی کے بارے میں خبردار کیا ہے کہ تشابہ کی بنیاد پر قضاوت کرتا ہے (۴۰)۔ دکتر خلیفات بھی عامری کی اس تحذیر کو کتاب توحیدی سے لائے ہیں، لیکن خود عامری کی نصیحت کو گوش قبول سے نہیں سنا ہے اور پذیرائی نہیں کی ہے۔ عامری اس شیخ صوفی سے کہتا ہے:

> "بہ ہوش باشید، عجولانہ قضاوت مکنید، چرا کہ میان عامۂ مردم و خواص در بسیاری از رفتار بہ ظاہر مشابہ تفاوت است و ایں تفاوت را کسی در می یابد کہ خداوند باب سرّ را بر او بگشاید گاہ دو تن کاری مشابہ انجام می دھند اما یکی کارش پسندیدہ است و آن دیگری ناپسند مثلاً گاہ دو تن رو بہ قبلہ نماز می گزارند یکی قلبش لبریز از ظاہرش منگرید، مگر آنکہ بہ باطنش رہ یافتہ باشید۔" (۴۱)

نتیجہ

ابوالحسن عامری نیشاپوری کے بارے میں اب تک کی جو تحقیق ہے، اور وہ بہت

تھوڑی ہے، دو راہیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

۱۔ پہلی راہ یہ ہے عامری کی علمی و تصنیفی زندگی کے سلسلے میں ہم دو ادوار کے قائل ہوں۔ ایک وہ مدت کہ فکری و فلسفیانہ کمال میں مطلوب حد کو ابھی نہیں پہنچا ہے اور اگرچہ عمومی معلومات کے لحاظ سے قوی ہے لیکن ان معلومات کو ایک تالیفِ مطلوب کی شکل میں لانے کی قوّت نہیں رکھتا۔ عامری اس دوران قوی استعداد، اچھا حافظ رکھتا ہے، مختلف دستیاب کتابوں کے مطالعے سے علاقۂ وافر رکھتا ہے۔ دوسرا دور وہ ہے کہ جس کے دوران وہ پختگی اور کمال فکری کو پہنچتا ہے۔ اس دوران وہ اپنے قبل کے مطالعات کو تحقیق و انتقاد کے ذریعے پروان چڑھاتا ہے اور ذہنی اندوختوں کے سروسامان سے بہتر بناتا ہے اور انھیں رواں کرتا ہے۔ اس ترتیب کے مطابق کتاب السّعادۃ والاسعاد اس کی علمی زندگی کے دور اوّل کی ہے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو کہنا چاہیے کہ عامری نے اپنی بعد کی زندگی میں اس کتاب کو دل خوش کن نہ سمجھا ہوگا۔ اور اپنی طرف اسے منسوب کرنے سے امتناع کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے آثار کی فہرست میں اس کا نام نہیں لایا ہے اور اپنی تمام تحریروں میں اس کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا ہے، اور کوشش کی ہے کہ انتساب کا پتا بتانے والے ہر نشان کو مٹا ڈالے۔ جو یہ راہ انتخاب کرتا ہے تو، علاوہ نکتۂ مذکور کے التزام کے، اُسے چاہیے کہ ان دلائل و شواہد کا جو اس انتساب کو مخدوش کرتے ہیں، اور ان کا ذکر اوپر آچکا ہے، مناسب جواب دے۔

۲۔ دوسری راہ یہ ہے کہ ان دلائل و شواہد پر توجہ دیتے ہوئے ہم یہ کہیں کہ "ابوالحسن یوسف بن ابی ذرہ" مؤلف کتاب السّعادۃ والاسعاد مغایرت رکھتا ہے "ابوالحسن محمد بن یوسف عامری" مؤلف کتاب الامد علی الابد، الاعلام بمناقب الاسلام وغیرہ سے۔ اگر ایسا ہے تو، علاوہ اس کے کہ اس مبحث کے تمام اشکالات کو ہم دور کرچکے ہیں، یہ کہنا چاہیے کہ بہت سے مطالب جو دکتر خلیفات نے ابوالحسن عامری کی شخصیت کے بارے میں بیان کیے ہیں، ابوالحسن یوسف بن ابی ذرہ پر منطبق ہوتے ہیں، اور کوئی ایک اشکال بھی ظاہر نہیں ہوتا، حتیٰ کہ وہ ایک اشکال بھی جو پدر و پسر کے نام میں تشابہ سے تعلق رکھتا ہے، درمیان سے اٹھ جاتا ہے، اس لیے کہ پدر کا نام "محمد بن یوسف" ہے اور پسر کا نام "یوسف بن محمد" اس تفاوت کے ساتھ کہ یہ "یوسف بن محمد" وہی "ابن ابی ذرہ" یعنی السّعادۃ کا مؤلف ہے، دوسرا ابوالحسن محمد بن یوسف عامری نیشاپوری نہیں ہے۔

ان سطور کا لکھنے والا پہلی بار اعلام کرتا ہے کہ۔ جو کچھ مذکور ہوچکا ہے اس پر توجہ کر

کے ۔ اسج یہ ہے کہ کتاب السّعادة کو ہم اس ابوالحسن عامری نیشاپوری کی نہ جانیں۔ اس طور پر اس معاملے کے تمام اشکالات رفع ہوجائیں گے۔

(معارف تہران ۔ جلد ۱۴ شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۹۷ء)

حواشی

(۱) Chester Beatty

(۲) M. Kurd Ali

(۳) مینوی ۔ مجتبیٰ : مقدمۂ کتاب السّعادة والاسعاد ۔ چاپ دانش گاہ تہران ۔ نیز نقد حال ۔ بخش مربوط بہ ابوالحسن عامری

(۴) دیکھیے مقدمۂ راوسون بر متن عربی و ترجمہ و شرح انگلیسی کتاب الامد علی الابد تحت عنوان A Muslim Philosopher on the Soul and its Fate, p. 16.
(اس کے بعد ۔ اختصار کی غرض سے کتاب کے نام کے پہلے تین کلمے آئیں گے۔)

(۵) مینوی ۔ مجتبیٰ : مقدمۂ کتاب السّعادة

(۶) زرکلی ۔ خیر الدّین : " الاعلام " المجلد السابع ۔ الطبع الرابع بیروت ۔ ص ۱۲۸

(۷) ایضاً : المجلد الثامن ۔ الطبع الثالث ۔ ص ۲۱ ۔ ۲۲

(۸) مثلاً دیکھیے :

الف۔ خلیفات ۔ دکتر سحبان : رسائل ابی الحسن العامری و شذرات الفلسفیۃ عمان ۱۹۸۸

ب۔ عطیہ ۔ دکتر احمد عبدالحلیم : مقدمۃ السّعادہ والاسعاد فی السیرة الانسانیۃ۔ چاپ مصر ۔ الثقافۃ للنشر والتوزیع بدون تاریخ

ج۔ غراب ۔ دکتر احمد عبدالحمید : مقدمۃ الاعلام بمناقب الاسلام ۔ تہران ۔ مرکز نشر دانش گاہی ۔ ۱۳۶۷

د۔ ابوزید ۔ دکتر علی احمد : الانسان فی فلسفۃ الاسلامیۃ ۔ بیروت ۔ الموسسۃ الجامعۃ للدراسات ۱۹۹۴

ھ۔ انصاری ۔ عبدالحق : The Ethical Philosophy of Maskawaih, Aligarh Muslim University (India), 1964

و۔ کریمر: جوئل ۔ ل: احیای فرہنگی در عہد آل بویہ ۔ مترجم محمد سعید حنائی کاشانی ۔ تہران مرکز نشر دانش گاہی ۔ ۱۳۷۵۔

ز۔ طباطبائی ۔ دکتر سید جواد : زوال اندیشہ سیاسی در ایران ۔ انتشارات کویر ۔ چاپ دوم ۔ ۱۳۷۵۔ ہمچنین جلد پنجم ۔ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی ۔ شرح حال عامری ۔

متاسفانہ ۔ شرح حال عامری کا ماخذ اصلی دکتر خلیفات کی کتاب ہے۔
شایان ذکر ہے کہ کبھی تو عبدالرحمن بدوی نے اس باب میں سکوت کیا ہے (دیکھیے : صوان الحکمۃ و ثلاث رسائل ابوسلیمان منطقی سجستانی ۔ انتشارات بنیاد فرہنگ ایران ۔ تہران ۱۹۷۴ ۔ کتاب الحکمۃ الخالدہ ابو علی مسکویہ ۔ انتشارات دانشگاہ تہران ۱۳۵۸) اور کبھی اس کو عامری کے ساتھ نسبت دی ہے (دیکھیے افلاطون فی الاسلام ۔ تہران ۱۳۵۳)

(۹) بہتر ہے کہ جس عبارت کی طرف راوسون نے اشارہ کیا ہے اسے ہم یہاں نقل کر دیں۔ کتاب السّعادۃ (ص ۱۰، س ۱۱، ۱۲) میں اس طور پر آیا ہے "قال ارسطو طیلس السّعادۃ فعل للنفس بفضیلۃ کاملۃ" ... و تسمی سعادہ ادنی وحدھا فعل للنفس بفضیلۃ کاملۃ خلقیۃ .... " کلمہ بہ کلمہ انطباق سے راوسون کی مراد چار کلموں سے زیادہ نہیں ہے یعنی ۔ فعل للنفس بفضیلۃ کاملۃ " جو سعادت کے بارے میں ارسطو کی ایک مشہور تعریف ہے ۔ اور ان چار کلموں کو ہم چھوڑ دیں تو دو عبارتوں کا سیاق ایک دوسرے کے ساتھ دقیق انطباق نہیں رکھتا۔

(۱۰) A Muslim Philosopher, p. 16

(۱۱) خلیفات ۔ دکتر سحبان : رسائل ابی الحسن العامری وشذراتہ الفلسفیۃ ۔ عمان ۔ ۱۹۸۸ ۔ ص ۱۳ اس کے بعد " رسائل " کے نام سے ذکر آئے گا۔

(۱۲) کتاب مذکور مرکز نشر دانش گاہی کے اہتمام سے ترجمہ ہوئی ۔ طباعت جاری ہے ۔ شائع ہونے کے بعد اس پر نقد و تبصرہ پیش کروں گا۔

(۱۳) A.J. Arberry, "An Arabic Treatise on Politic" A Muslim Philosopher, p.16

(۱۴) A Muslim Philosopher, p. 16

(۱۵) رسائل، ص ۱۲۳

(۱۶) A Muslim Philosopher, p. 52, 54

(۱۷) الاعلام بمناقب الاسلام، پاورقی ص ۹۰، متن عربی

(۱۸) الامد علی الابد، تصحیح اورت ک. راوسون، چاپ بیروت، ص ۵۹

(۱۹) رسائل، ص ۲۳۵

(۲۰) الاعلام، ص ۹۲، ۲۱۷ متن عربی

(۲۱) ایضاً، ص ۱۲۷

(۲۲) ایضاً، ص ۱۰۰

(۲۳) رسائل، ص ۲۳۱ بعد

(۲۴) ارسطو: اصول حکومت آتن، ترجمہ باستانی پاریزی، مقدمۂ دکتر غلام حسین صدیقی، کتابہای جیبی، تہران، ۱۳۷۵، ص.

(۲۵) السعادة، ص ۲۷۱ بعد

(۲۶) السعادة، ص ۹۷

(۲۸) الامد علی الابد، ص ۷۵

(۲۹) A Muslim Philosopher, p. 76

(۳۰) السعادة، ص ۲۲۱، ۲۳۸، ۲۹۲، ۳۰۵، ۳۸۰

(۳۱) رسائل، ص ۱۲۳

(۳۲) ایضاً، ص ۱۲۳

(۳۳) A Muslim Philosopher, p. 16

(۳۴) بدوی، دکتر عبدالرحمٰن: "افلاطون فی الاسلام" ص ۳۰۰

(۳۵) منطقی سجستانی، ابوسلیمان: صوان الحکمۃ، حققہ وقدم لہ الدکتور عبدالرحمٰن بدوی، ص ۱۲۹

(۳۶) السعادة، ص ۴۴

(۳۷) ایضاً

(۳۸) ایضاً، ص ۱۸

(۳۹) ارسطو: "الاخلاق" ترجمہ اسحق بن حنین، حققہ وقدم لہ الدکتور عبدالرحمٰن بدوی، وکالۃ المطبوعات، کویت، ۱۹۷۹ م

(۳۰) توحیدی، ابوحیان المتاع المؤانسۃ، ج ۳، ص ۹۴ بعد، منشورات الشریف الرضی، قم، بدون تاریخ۔

(۳۱) ایضاً، ص ۹۴

سید جاوید اقبال :

امیر مینائی سے منسوب، ایک قصیدہ

"مضامین اختر جونا گڑھی" قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے اِکیس (۲۱) مضامین کا مجموعہ ہے. جو انجمن ترقی اُردو، پاکستان نے ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔ اس مجموعے کا ایک قابل ذکر مضمون "مرزا غالب اور امیر مینائی" ہے، جو اس وقت زیرِ بحث ہے۔

اختر نے اس مضمون میں ایک بیانیہ قصیدے کو امیر احمد امیر مینائی لکھنوی (۱۹۰۰ء - ۱۸۲۹ء) سے منسوب کیا ہے۔ قصیدے سے پہلے مرزا اسد اللہ خاں غالب (۱۸۶۹ء - ۱۷۹۷ء) اور امیر کے تعلقات پر اظہار خیال کیا ہے۔ امیر اور غالب کے تعلقات کے ذیل میں فاضل مضمون نگار کا بیان گنجلک کا شکار ہے۔ چنانچہ زیرِ تحریر مضمون میں غالب اور امیر کے روابط کو زیرِ بحث لایا جائے گا۔ پھر امیر سے منسوب قصیدے کی بابت تسامحات پر تفصیلی اظہار خیال کیا جائے گا۔

۱

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں (جو انھوں نے ۱۲۔ جون ۱۸۵۹ء کو اپنے شاگرد منشی شیونرائن کے نام لکھا تھا) امیر کا ذکر کیا ہے۔ اختر جونا گڑھی نے اسی خط کی بنیاد پر غالب اور امیر کے تعلقات وضع کیے ہیں۔ ذیل میں غالب کا خط درج کیا جاتا ہے۔ (۱)

"...... اب کے تمھارے "معیار الشعرا" میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں۔ ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور نواب صاحب کے پاس ہیں ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں، میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو۔ یعنی

غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں۔ اور اس کے لکھنے سے ان کا نام اور حال معلوم ہوا۔ نام اور حال جو میں اوپر لکھ آیا اس کو اب "معیار الشعراء" میں چھاپ کر دو ورقہ یا چہار ورقہ رام پور ان کے پاس بھیج دو اور سرنامے پر یہ لکھو کہ در رامپور بر در دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد تخلص برسد۔ مجھ کو اس کی اطلاع دو اور اس امر کی بھی اطلاع دو کہ رامپور کو تمھارا اخبار جاتا ہے یا نہیں۔ یکشنبہ ۲۱ جون ۱۸۵۹ء" (۲)

اختر جوناگڑھی کے اس مضمون میں اکثر معلومات بغیر تحقیق کے پیش کر دی گئی ہیں۔ اور بہت سی باتیں محض قیاس پر مبنی ہیں۔ بیشتر مقامات پر ان کے بیان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ غالب امیر کی وجاہت اور فن شعر گوئی میں ان کی قابلیت کے معترف تھے"۔ (ص ۲۸۱) اُن کے اپنے بیان کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس خط میں غالب نے امیر کی ذاتی وجاہت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور نہ کوئی تعریفی کلمہ استعمال کیا ہے۔" (ص ۲۸۳) یا یہ کہ پہلے وہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ "ان دونوں بزرگوں میں جو دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے، ان سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ مرزا صاحب کے ان خطوط سے ان تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ (ص ۲۸۱) پھر یہ بیان دیتے ہیں۔ "امر تعجب خیز ہے کہ ان دونوں کے مکاتیب میں جو چھپ کر شائع ہوچکے ہیں، ایک دوسرے کے نام کوئی مراسلت نہیں پائی جاتی"۔ (ص ۲۸۳) اور یہ بھی کہتے ہیں: مرزا کے تمام مکاتیب میں کوئی مکتوب امیر کے نام نہیں پایا جاتا (ص ۲۸۲)۔ لیکن غالب کا خط درج کرنے کے بعد ان کی رائے یہ ہوتی ہے "اس خط سے ظاہر ہوتا ہے غالب کے رامپور جانے سے قبل ہی ان کی خط و کتابت نواب صاحب کے کلام کے سلسلے میں رہی ہوگی"۔ (ص ۲۸۳)۔ اسی طرح ایک اور موقع پر لکھتے ہیں "غالباً ان دونوں کے تعلقات کا آغاز ۱۸۵۸ء سے ہوتا ہے۔ جب کہ ان کا تعلق دربار رامپور سے تھا اور قیام رام پور کے زمانے میں ان دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔" (ص ۲۸۲) دوسرے پیراگراف میں فرماتے ہیں "مرزا صاحب ۱۸۶۰ء میں رامپور تشریف لے گئے۔ اس سے پہلے امیر سے ان کی ملاقات نہ ہوئی ہوگی۔" (ص ۲۸۲)

یہ امر بہت واضح ہے کہ جب مرزا ۱۸۶۰ء میں پہلی مرتبہ رامپور تشریف لے گئے اور یہیں پر دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی، تو پھر تعلقات کی ابتدا ۱۸۵۸ء میں کس طرح ہوگئی۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ملاقات تو پہلی تھی لیکن شاید خط و کتابت بہت رہی ہو تو اس کا بھی

ثبوت نہیں ملتا اور اس کا اعتراف بھی اختر اپنے بیان میں کرتے ہیں۔ پھر اس قیاس کی بھی کوئی بنیاد نہیں کہ غالب نواب صاحب کے کلام کے سلسلے میں امیر سے صلاح و مشورہ کرتے تھے اور یہ بیان محض تخیل پر مبنی ہے کہ امیر نے رسالۂ "معیار الشعراء" میں اپنے کلام کی اشاعت کے بارے میں مرزا کو لکھا ہوگا۔ جس کی بناء پر غالب نے اپنے شاگرد کو یہ ہدایت کی ہے۔ (ص ۲۸۳) جب کہ یہ حقیقت تو مذکورۂ بالا مکتوب سے عیاں ہوجاتی ہے کہ منشی شیونرائن نے معیار الشعراء میں یہ کہا تھا "امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے" (ص ۲۸۲) غالب نے یہ اعتراض پڑھ کر منشی شیونرائن کو خط لکھا اور کلام کی سفارش کی۔ گویا اختر کا یہ بیان محض تخیل کی پیداوار ہی نہیں بلکہ امیر کی ذاتی وجاہت پر الزام بھی ہے۔ امیر کی تمام زندگی میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ پتا چلے کہ وہ اپنا کلام شائع کرانے کے لیے سفارشیں کراتے ہوں گے۔ وہ ابتداء ہی سے استادانہ شان رکھتے تھے۔ امیر کے استاد اسیر نے بھی دو ڈھائی سال سے زیادہ ان کے کلام پر اصلاح نہیں دی اور یہ کہہ دیا کہ "اصلاح کی ضرورت نہیں۔" اسی مضمون میں اختر، رقم طراز ہیں، "امیر غالب کو سخن دانی، فارسی و ادب اور لغت میں استاد مانتے ہیں۔" (ص ۲۸۱)۔ اس سلسلے میں بھی فاضل مضمون نگار کوئی ثبوت فراہم نہ کرسکے۔ اگر امیر غالب کو سخن دانی اور فارسی شعر و ادب میں بڑا مانتے تھے تو یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں، غالب غالب تھے، ہزاروں شعراء میں یہ جذبہ موجود تھا اور جہاں تک لُغت نویسی میں استاد ماننے کا سوال ہے تو اگر غالب زندہ ہوتے (امیر کی باقاعدہ لغت نویسی ۱۸۸۴ء سے شروع ہوتی ہے) یقیناً امیر کو فن لُغت نویسی میں بڑا مانتے۔ کیوں کہ لُغت نویسی کے باب میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ امیر جدید اردو لُغت نویسی کے بانی ہیں۔ انھوں نے پہلی مرتبہ اُردو لغت نویسی کو ایک منظم، سائنٹفک انداز سے روشناس کیا۔ (۴)

غالبیات کے باب میں اختر اپنے قیاس کی بنیاد پر ایک اور اطلاع فراہم کرتے ہیں، وہ یہ کہ "۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں ناظم مرزا غالب کے شاگرد ہوچکے تھے۔" (ص ۲۸۲)۔ جب کہ غالبیات کے ماہر مالک رام لکھتے ہیں:

"۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء کو مرزا غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی کی تحریک پر فردوس مکاں محمد یوسف علی خاں والی رامپور کو قصیدۂ مدحیہ بھیجا۔" (۵)

مالک رام مزید رقم طراز ہیں:

"نواب صاحب نے ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو خط میں شکریہ ادا کیا ...... اسی دن نواب فردوس مکاں میرزا کے شاگرد ہوئے"۔ (۶)

اس کے علاوہ شیخ محمد اکرام نے حیات غالب (۷) میں اور امتیاز علی عرشی نے مکاتیب غالب (۸) میں، غالب اور دربار رامپور کے تعلق پر تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں، جن سے مالک رام کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس تمام جائزے اور بحث کے بعد یہ سوال ابھی باقی ہے کہ غالب اور امیر کے تعلقات کب سے شروع ہوئے؟ اور اُن کی نوعیت کیسی تھی؟ اس باب میں دیگر علماء فضلاء کیا کہتے ہیں، ذیل میں انھی امور پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

"مطالعۂ امیر" میں (۲) ڈاکٹر ابو محمد سحر نے منشی شیونرائن کو لکھے گئے مذکورۂ بالا خط کی بنیاد پر دونوں کے تعلقات کی بنیاد استوار کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ تذبذب کا شکار ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"پتا نہیں چلتا کہ غالب نے امیر کو اپنا دوست کیوں لکھا اور امیر کی غزلیں ان کے پاس کب اور کس طرح پہنچیں، کیوں کہ یہ خط ۲۱ جون ۱۸۵۹ء کا ہے۔
اس وقت تک دونوں میں رابطے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ۱۸۶۰ء میں جب غالب وارد رام پور ہوئے تھے تو ضرور دونوں میں ملاقاتیں رہی تھیں۔" (۹)

عبدالرؤف عروج نے بھی منشی شیونرائن کو تحریر کردہ، غالب کے اس مکتوب کو تعلقات کی بنیاد قرار دیا ہے۔ جس میں غالب نے امیر کے کلام کو شائع کرنے کی سفارش کی ہے۔ عروج کا خیال ہے کہ

"غالب اور امیر مینائی میں دوستانہ تعلقات تھے ان کا آغاز رامپور سے ہوا ہوگا" (۱۰)

امیر نے "انتخاب یادگار" (۱۱) میں غالب کے حالات زندگی اور تصانیف اور کلام کے بارے میں نسبتاً مفصل تحریر کیا ہے۔ لیکن پُرتکلف دوستی کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اسی طرح امیر کے سوانح نگاروں اور تحقیقی مقالات تحریر کرنے والوں نے بھی، سوائے ڈاکٹر ابو محمد سحر کے، کبھی اس کی بابت کوئی صراحت نہیں کی۔ (۱۲) پھر یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ ممکن ہے اس وقت تک امیر کے دواوین شائع ہوگئے ہوں اور غالب کی نظر سے گزرے ہوں، لیکن ۱۸۵۹ء تک امیر کا کوئی دیوان شائع ہونا تو درکنار مرتب بھی نہ ہوا تھا۔ امیر کا پہلا

دیوان " مرآۃ الغیب " ۱۸۷۳ء میں جب کہ دوسرا " صنم خانۂ عشق " ۱۸۹۰ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا (۱۳)

اکثر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ دونوں کے تعلقات کی ابتداء دربار رامپور سے ہوئی تو اب اس امر کا جائزہ لینا چاہیے کہ دونوں مشاہیر کب اور کیسے رامپور سے وابستہ ہوئے۔

دربار رامپور سے غالب کا تعلق جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تحریر کیا گیا کہ ۱۸۵۰ء میں قائم ہوا، گو کہ کوئی تنخواہ مقرر نہیں ہوئی تھی، نواب صاحب جب چاہتے کسی بہانے کچھ بھیج دیتے۔ (۱۴)

مئی ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی شروع ہوئی۔ جنگ آزادی کا دور غالب پر بہت سخت گزرا۔ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

" غدر ...... کے دو برس بعد نواب یوسف علی خاں مرحوم رئیس رامپور نے سو روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مرزا کے واسطے مقرر کر دیا جو نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی بدستور مرزا کے آخری دم تک جاری رکھا " (۱۵)

غالب کی دربار رامپور سے وابستگی کے بارے میں اختلافی آرا نہیں ہیں جب کہ امیر کے یہاں کچھ اختلاف ملتا ہے۔ میکش حیدر آبادی، " یادگار مینائی " میں لکھتے ہیں کہ:

" ۱۲۷۵ھ کے ماہ رمضان المبارک میں آپ لکھنؤ سے دارالسرور ریاست رامپور روانہ ہوئے۔ " (۱۶)

ممتاز علی آہ نے اضافے کے ساتھ میکش کے بیان کا اعادہ کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ

" فردوس مکاں نے رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ میں حضرت کو نہایت اشتیاق اور آرزو سے بلایا اور اپنا مہمان خاص کیا۔ " (۱۷)

جب کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں:

" نواب یوسف علی خاں ناظم نے ۱۲۷۵ھ کے آخر میں ان (امیر) کو طلب کیا "۔(۱۸)

اس کے علاوہ ڈاکٹر کریم الدین احمد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ " امیر ۱۸۵۹ء میں رامپور پہنچے (۱۹)

ڈاکٹر ابو محمد سحر کی معلومات سے جو اختلاف پیدا ہوا اس کا پس منظر یہ ہے کہ نواب صاحب نے امیر کو رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ میں یاد کیا اور امیر بفرمائش نواب صاحب رامپور پہنچے۔ تقویم کی رو سے رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ کی مطابقت مارچ ۱۸۵۹ء سے بنتی ہے۔

امیر نے کچھ عرصہ رامپور میں قیام کیا۔ یہاں شعر و سخن کی بزم آراستہ کی گئی۔ نواب یوسف علی خاں امیر کے اخلاق اور قادر الکلامی سے متاثر ہوئے اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ امیر، مولوی کرم محمد مینائی کے صاحبزادے ہیں، جن سے انھوں نے لکھنؤ میں عربی پڑھی تھی تو بہت خوش ہوئے اور ملازمت کی پیشکش کی۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں:

"حضرت ملازمت کر لینے پر تو آمادہ ہوئے مگر شاعری کے سلسلے میں نوکری کرنے سے انکار کر دیا اور یہ چاہا کہ کوئی ملکی خدمت لی جائے۔ اس کے ضمن میں شعر و سخن کا بھی سلسلہ رہے گا۔ اس کو فردوس مکاں نے خوشی سے منظور فرمایا اور سو روپے ماہوار پر عدالت دیوانی کا مفتی مقرر کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت مخدوم صفی ردولوی کے عرس میں حسب معمول شرکت کی غرض سے حضرت نے وطن جانے کے لیے رخصت مانگی۔ نواب صاحب نے بہت خوشی سے اجازت دی ..... اور اصرار کے ساتھ ارشاد ہوا کہ واپسی میں اپنے بھائیوں اور والد وغیرہ کو اپنے ساتھ لے آئیے گا ..... بڑے بھائی مولوی طالب حسن صاحب اور والدہ اور بڑی اور منجھلی بھاوج کو حضرت اپنے ساتھ لے آئے ..... غالباً یہ ۱۸۶۰ء تھا (۲۰)

اس جائزے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ امیر مارچ ۱۸۵۹ء میں نواب صاحب کی دعوت پر پہلی مرتبہ رام پور پہنچے اور نواب صاحب کے کہنے پر امیر نے نوکری قبول کرلی۔ پھر وہیں رہائش اختیار کی، بعد ازاں وہ چھٹی لے کر دوبارہ لکھنؤ آئے اور گھر والوں کے ساتھ ۱۲۷۵ھ کے آخر (ابو محمد سحر کے بیان کے مطابق) یا ۱۸۶۰ء میں دوبارہ رام پور آئے (۲۱)۔ کیونکہ امیر نے ۱۲۷۶ھ کے کسی ماہ کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے ۱۲۷۶ھ کی عیسوی مطابقت ۱۸۵۹ء یا ۱۸۶۰ء سے ہوتی ہے۔ اس نتیجے کی روشنی میں ممتاز علی آہ کا بیان جو ۱۸۶۰ء کی مطابقت میں ہے گو کہ شک کے ساتھ ہے لیکن درست معلوم ہوتا ہے۔

امیر کی رامپور میں آمد سے متعلق غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ سوانح نگاروں اور محققین نے (سوائے آہ) امیر کے یکے بعد دیگرے سفر رامپور کے بارے میں معلومات نہیں دیں۔ اکثر محققین نے ایک سفر جانا جس سے معمولی نوعیت کا اختلاف پیدا ہوگیا۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ امیر مارچ ۱۸۵۹ء میں رامپور پہنچ چکے تھے۔ اور نوکری قبول کرلی تھی۔

"مکاتیب غالب" مرتبہ امتیاز علی عرشی کے دیباچے میں بشیر حسین زیدی کہتے ہیں:

"۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک دربار رامپور اور مرزا غالب کے درمیان سلسلہ مراسلت جاری رہا"۔ (۲۱)

اسی ذیل میں ایک خط نواب یوسف علی خاں کے نام ملتا ہے جو ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء کا ہے۔ اس خط میں غالب لکھتے ہیں:

نواب مرزا (داغ) نے دِلّی آکر پہلے نوید بزم آرائی سُنائی، چاہتا تھا کہ اس کی تہنیت لکھوں۔ (۲۲)

رامپور میں یہ وہ دور ہے کہ جب امیر کے علاوہ اسیر، منیر، ذکی، قلق، جلال، عروج، ملال، حیا، جان صاحب اور داغ وغیرہم اپنا رنگ پیش کر رہے تھے۔ لکھنؤ اور دِلّی اُجڑنے کے بعد رامپور علم و ادب کا مرکز بن رہا تھا۔

داغ نے غالب سے رامپور کی انھی بزم آرائیوں کا ذکر کیا ہوگا۔ جس میں دِلّی اور لکھنؤ کے شعراء اپنا اپنا جوہر سخن پیش کر رہے تھے، جن پر غالب خوش ہوئے اور نواب صاحب کی تہنیت لکھنے کا ارادہ کیا۔

داغ کی وابستگی کسی نہ کسی طرح نواب رام پور کے ہاں امیر سے پہلے کی ہے۔ امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں:

نواب مرزا خاں، داغ تخلص ..... نواب فردوس مکاں کے عہد میں ان کی پھوپھی عمدہ خانم ریاست سے وظیفہ پاتی تھیں یہ اُن کے توسط سے ابتداءً مورد انعام و عنایات رہے۔ بعد ازاں تعلّقِ خدمت بھی ہوگیا۔ (۲۳)

غالب کے مذکورۂ بالا خط کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جب داغ نے رامپور کی بزم آرائیوں کا ذکر کیا تو امیر کا ذکر بھی کیا ہوگا۔ اور اس ذکر کی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ امیر کا لکھنوی ہونا۔

۲۔ اسیر کا شاگرد ہونا۔ کیوں کہ اسیر سلسلۂ مصحفی کے ایک بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔

۳۔ نواب صاحب کا استاد زادہ ہونا۔

علاوہ ازیں مذکورۂ بالا خط ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء کا ہے۔ جب کہ امیر اسی ماہ رامپور پہنچ چکے

تھے۔ تو یہ گمان غالب ہے کہ امیر کے بارے میں پہلے پہل داغ کے توسط سے غالب تک اطلاعات پہنچیں۔

اس کے علاوہ غالب کے وہ مکتوبات جو رام پور کے نوابین کے نام ہیں، ان میں اس قسم کی شہادتیں ملتی ہیں کہ لوگ رامپور سے دلی جاتے تو غالب کو یہاں کا احوال دیتے یا یہ کہ دربار سے وابستہ لوگ غالب کو مکتوب لکھتے تو یہاں کی سرگرمیوں کے بارے میں تحریر کرتے تھے۔ مثال میں داغ کے حوالے سے غالب کے خطوط سے اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔

مکتوب بنام نواب کلب علی خاں، مورخہ ۱۳ اگست، ۱۸۶۵ء

"کل برخوردار مرزا خاں داغ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت کا مزاج اقدس ناساز ہوگیا تھا۔ اب خدا کے فضل و کرم سے افاقت ہے۔ نواب مرزا نے مجھ پر یہ ستم کیا کہ پہلے سے یہ حال نہ رقم کیا"۔ (۲۴)

مکتوب بنام نواب کلب علی خاں مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۸۶۶ء

"افسوس کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے میرا حال سامعۂ اقدس پر عرض نہ کیا۔" (۲۵)

مکتوب بنام کلب علی خاں مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۶۶ء

"کل برخوردار نواب مرزا خاں داغ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت کا مزاجِ اقدس ناساز ہوگیا تھا۔" (۲۶)

ممتاز علی آہ نے غالب اور امیر کے تعلق کے ضمن میں ایک واقعہ درج کیا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں، اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"انھی دنوں میرزا نوشہ (غالب) مغفور کی یہ غزل دہلی سے رامپور آئی تھی۔ (۲۷)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا　　　اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا۔" (۲۸)

گو مرزا صاحب کا کلام جن انمول جواہر سے مالا مال ہے، ان کے سامنے یہ غزل کچھ زیادہ آب و تاب نہیں رکھتی۔ مگر اس کا چرچا اور شہرت تھی۔ فردوس مکاں کے ارشاد سے حضرت (امیر) نے بھی یہ غزل کہی۔

مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا　　　یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب   مرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا (۲۹)

ممتاز علی آہ مزید رقم طراز ہیں کہ:

نواب صاحب غزل سن کر خوش ہوئے اور بہت تعریف کی۔ جب غالب (مرحوم) رامپور تشریف لائے تو یہ غزل ان کو بھی سُنوائی۔ مرزا صاحب نہایت خوش ہوئے اور دل کھول کر دادِ سخن دی۔

ممتاز علی آہ اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

حضرت (امیر) میرزا صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے اور خوردانہ ادب کرتے تھے۔ ایک دن ملاقات کو گئے تو مرزا صاحب نے فرمایا، "آج کچھ رات رہے سے آپ کا یہ شعر:

دل بجی نہ رہا امید کیسی   جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

خود بخود وردِ زباں ہے اور ہر مرتبہ لطف اور لذّت بڑھتی جاتی ہے"۔ (۳۰)

۵

گذشتہ صفحات کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ غالب کا دربار رامپور سے تعلق فروری ۱۸۵۷ء میں قائم ہوگیا تھا جب کہ امیر کا تعلق مارچ ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء کے ایک خط سے یہ شہادت ملتی ہے کہ داغ نے دہلی جا کر غالب کو رامپور کی بزم آرائیوں سے آگاہ کیا۔ جس پر خوش ہوکر غالب نے تہنیت لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس طرح امیر کا غائبانہ تعارف ہوا۔ غالباً اسی وجہ سے غالب نے ۱۲ جون ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں منشی شیونرائن کو امیر کی غزلیں "معیار الشعراء" میں شائع کرنے کی سفارش کی۔ اس زمانے میں غالب کی مشہور غزل ع یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا، کسی ذریعے سے رامپور کے دربار میں پہنچی۔ امیر نے نواب صاحب کی فرمائش پر اس زمین میں دو غزلیں کہیں۔ جب غالب جنوری ۱۸۶۰ء میں پہلی مرتبہ رامپور آئے تو امیر کی غالب سے پہلی ملاقات ہوئی اور سخن فہمی کی محفل میں دونوں نے شرکت کی۔ دوسری مرتبہ دونوں کی ملاقات کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔

غالب، امیر کو تین حوالوں سے جانتے تھے۔ اوّل، امیر لکھنؤ کے ایک معزز علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، دوّم شاعری میں ان کا تعلق مصحفی سے تھا، سوّم، دربار رامپور سے

ان کی وابستگی تھی۔ اور کیوں کہ غالب کا تعلق بھی دربار رامپور سے تھا اس لیے مروتاً منشی شیو نرائن کو خط میں امیر کے لیے یہ لکھا کہ "وہ میرے دوست ہیں"۔ حالانکہ جس زمانے کا یہ خط ہے، دونوں کی عمروں میں فرق ملتا ہے۔

غالب اور امیر کے تعلقات محض رسمی تھے۔ غالب کے سفر رامپور میں امیر سے ملاقاتیں رہیں۔ پھر امیر نے غالب کی زمین میں غزلیں بھی کہیں، اور سنائیں اور دونوں دربار سے وابستہ بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود ایسا کوئی عندیہ نہیں ملتا کہ جس بناء پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ دونوں کے دیرینہ تعلقات تھے۔ سوائے ممتاز علی آہ کے، امیر کے کسی شاگرد، سوانح نگار اور دیگر محققین نے اس ذیل میں معلومات فراہم نہیں کیں۔ اگر دونوں کی دوستی کی کوئی مضبوط بنیاد ہوتی تو جگہ جگہ شہادتیں ملتیں۔ اس لیے کہ غالب ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ اگر امیر پر لکھنے والے اس پر خاموش ہیں تو غالبیات کے ماہر تو دونوں مشاہیر کی دوستی کی کوئی مضبوط شہادت دیتے، جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کے تعلقات محض رسمی تھے۔

اس ساری بحث اور جائزے میں ایک قابلِ ذکر اطلاع یہ بھی ملتی ہے کہ داغ کی غالب سے خط و کتابت تھی۔ لیکن اس بارے میں کسی محقق نے اظہار خیال نہیں کیا۔ اور نہ دونوں میں سے کسی کا کوئی خط (جو ایک دوسرے کے نام ہو) ابھی تک منظر عام پر آیا ہے۔

۶

اب ہم اس مضمون پر اپنے دوسرے اعتراض کی طرف آتے ہیں۔ اختر جونا گڑھی نے ایک قصیدۂ بیانیہ کو منشی امیر احمد امیر مینائی سے منسوب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امیر کا ایک قطعہ غالب کی حمایت میں شائع ہوا" (ص ۱۸۴) اور اس قطعے کا پس منظر یہ بیان کرتے ہیں" ۱۸۶۳ء میں جب غالب نے "برُہانِ قاطع" کے رد میں "قاطع برہان" لکھی اور اس کی تردید میں غالب کے مخالفین نے بھی کئی رسالے اور نظمیں تصنیف کر کے چھپوائیں تو غالب کے شاگردوں اور طرفداروں نے ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور یہ بحث اس وقت کے اخباروں میں ایک مُدّت تک چلتی رہی اور سخن نے ایک رسالہ "ہنگامۂ دل آشوب" کے نام سے لکھا جو ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۳ھ میں آرہ سے منشی بسنت پرشاد کے مطبع میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس رسالے میں انھوں نے میر آغا صاحب شمس لکھنوی کے ایک مضمون کا ذکر کیا ہے۔ جو غالب کے رد میں اودھ اخبار میں چھپا تھا۔ اس مضمون کا جواب امیر نے لکھا جو اسی اخبار میں شائع ہوا اور

ایک قطعہ اُردو میں غالب کی حمایت میں لکھا تھا۔ جو اس رسالے میں موجود ہے۔ (ص ۱۸۳)

مذکورۂ بالا پس منظر کے بعد ایک مختصر تعارف درج کیا گیا ہے۔ یہ تعارف "ہنگامۂ دل آشوب" میں قصیدے کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"قطعہ من نتائج طبع دبیر بے نظیر منشی محمد امیر صاحب متخلص بہ امیر رئیس لکھنؤ سلمہ اللہ دار تقاء علیٰ مدارج الاعلیٰ کہ از اودھ اخبار نقل نمودہ شد"۔ (ص ۱۸۳)

تعارف کے بعد ۲۶ اشعار پر مشتمل قصیدۂ بیانیہ ہے۔ ذیل میں چند اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

بلا تعلّیِ مضمون لکھے ہیں چند اشعار	یہاں مبالغۂ شاعری نہیں درکار
یہ کھانے والے ہیں دن رات سکھی مچھلی کے	کہاں یہ سنگِ رخام و کہاں دُرِ شہوار
خرابی ان سے ہوئی اُردوئے مُعلّیٰ کی	عفونت ان کی زبان سے نہیں گئی زنہار
یہ ان کے اب جد فاسد کی بگڑی ہے ابجد	بنائیں وہ کوئی نام اس مقام پر زردار
زمانہ ہم کو بھی کہتا ہے مُنصِف الدولہ	فہیم شہر ہیں البتّہ شاعری دشوار
لکھا ہے ہم نے بھی ایک مختصر جہاں آشوب	کہے ہیں اس میں قلم بند ہفت صد اشعار
جو سرگذشت کہیں کی نئی سنی، لکھی	لکھا امیر نے یہ واقعہ بھی آخر کار

۷

مذکورۂ بالا بیانیہ قصیدے کو امیر سے منسوب کرنے کی بنیاد وہ تعارف ہے جو قصیدے کے ساتھ اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ جو کہ گذشتہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔ اختر جونا گڑھی نے بنیادی غلطی اسی موقع پر کی ہے۔ اس تعارف میں شاعر کا نام "منشی محمد امیر صاحب متخلص بہ امیر" (ص ۱۸۳) درج کیا گیا ہے۔ جب کہ امیر مینائی کا پورا نام منشی امیر احمد متخلص بہ امیر ہے۔ ادبی تاریخوں، تذکروں، اور سوانح میں یہی نام ملتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ

"اس قطعے کے عنوان میں امیر احمد کے بجائے محمد امیر لکھا ہے جو غالباً دبیر بے نظیر کے قافیے کی رعایت سے درج ہوا ہے کیوں کہ امیر تخلص کا کوئی

دوسرا شاعر لکھنؤ میں مشہور نہیں ہوا"۔ (ص ۱۸۰)

بہت ممکن ہے نام کے حوالے سے اختر کی یہ رائے درست ہو لیکن اُس زمانے میں امیر کی شہرت اتنی نہیں تھی کہ ان کو بہ حیثیت شاعر ان القاب سے پکارا جاتا۔ البتہ اس زمانے میں امیر نامی کئی شاعر تھے

گارسیں د تاسی نے اپنے تذکرے میں امیر تخلص کے چودہ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اس تذکرے کا اردو ترجمہ (از لیلیان تندرو۔ مخزونہ کتاب خانہ شعبہ اردو۔ کراچی یونیورسٹی) ہمارے پیش نظر ہے۔ ان چودہ شاعروں میں منشی امیر احمد مینائی کے علاوہ۔ ایک شاعر محمد امیر تخلص امیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو اردو اخبار "نجم الاخبار" میرٹھ کے ایڈیٹر تھے۔ لیکن اس شاعر کے حالات بھی زیر بحث قصیدے کے ناظم پر صادق نہیں آتے۔ مختصر یہ کہ اس قصیدے کے ناظم کا طبعی طور پر موجود ہونا "ہنگامہ دل آشوب" سے باہر کسی طور ثابت نہیں ہوتا۔ اور شبہ وارد ہوتا ہے کہ وہ کوئی فرضی اور جعلی شخصیت تو نہیں تھے۔ جنھیں نزاعی بحثوں کے پیش نظر تخلیق کر لیا گیا تھا۔ غالب کے کیمپ میں مجہول تصنیف لطائف غیبی کی روایت موجود ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ امیر احمد امیر مینائی کا لکھا ہوا نہیں بلکہ محمد امیر کا ہے اور امیر مینائی سے جو باتیں منسوب کی گئی ہیں، ان کی کوئی بنیاد نہیں۔ مزید تشفی کے لیے عرض کیا جاتا ہے کہ غالب اور امیر کے تعلقات کی نوعیت محض رسمی تھی۔ جہاں نوعیت رسمی تعلقات کی ہو وہاں کوئی کسی کی لڑائی میں نہیں پڑتا اور ایسے میں جب ایک لکھنؤ کا شاعر ہو اور دوسرا دہلی کا اور دبستانی تعصب کے اس دور میں کہ جب سیّد فخرالدّین دہلوی لکھنؤ والوں کے لیے اس قسم کے جملے تحریر فرما رہے ہوں:

"لکھنو کے خواص و عوام۔ وضیع و شریف، ادنیٰ اور اعلیٰ، ہندو مسلمان، شیخ، سید، مغل، پٹھان، اکثر داڑھی منڈواتے ہیں۔ یقین جانو زنانی اورک معلوم ہوتے ہیں۔ سب امرد نظر آتے ہیں۔ کہتے ہو کہ دلّی والوں کو ... کی عادت ہے۔ میں کہتا ہوں لکھنؤ والوں میں یہ علت

ہے"۔ (۴۳)

یہی نہیں اس طرح کے اور بے شمار حملے، علمی اعتراضات کی بھرمار اس معرکے میں نظر آتی ہے۔ ایسے میں بھلا امیر، غالب کا ساتھ کیوں دینے لگے۔ اس صورت حال میں وہ یقیناً غالب کے خلاف لکھیں گے۔ لیکن اگر اس کے برعکس وہ غالب کی حمایت میں لکھتے تو سیّد فخر الدین دہلوی تلمیذ مرزا غالب، اکمل الاخبار میں ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۲ء کے عرصے میں امیر، امیر اللغات، لکھنوی محاورات اور شاعری کے خلاف کیوں مضامین لکھتے اور لکھواتے۔

سچی بات یہ ہے کہ امیر اس ڈھب اور مزاج کے انسان ہرگز نہیں تھے، جب ان کی شاعری پر اعتراضات کی بھرمار ہوئی کہ امیر شاعری میں داغ کی پیروی کر رہے ہیں یا جب کہ امیر اللغات کا پہلا حصہ منظر عام پر آیا (۱۸۹۱ء) تو دو طرح کے الزامات سے واسطہ پڑا کہ امیر اللغات ارمغان دہلی کا چربہ ہے اور دوسرا یہ کہ امیر اللغات لکھنؤ والوں کے لیے ہے۔ الغرض امیر کی مخالفت میں بے تحاشا مضامین لکھے گئے۔ لیکن امیر نے نہ خود ان کا جواب دیا اور نہ اپنے تلامذہ کو اس جھگڑے میں پڑنے کی اجازت دی۔ امیر کی وفات کے بعد داغ کے بیشتر تلامذہ نے (سوائے علامہ اقبال) امیر اور ان کے تلامذہ پر بڑے رکیک حملے کیے۔ لیکن تلامذۂ امیر کی طرف سے کبھی اخلاقی سطح سے گرا ہوا جواب نہیں آیا۔ اور بلاشبہ امیر کے تلامذہ علمی اور اخلاقی لحاظ سے ہمیشہ داغ کے شاگردوں پر چھائے رہے۔ یہ امیر کی بڑائی کا پہلو ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف علمی لحاظ سے بلکہ اخلاقی لحاظ سے ہمیشہ داغ کے شاگردوں کی بہت عمدہ تربیت کی تو بھلا وہ غالب کے اس جھگڑے میں کیوں پڑتے اور اخلاق سے گرے ہوئے اشعار کیوں کہتے۔ امیر کا تمام شعری سرمایہ اور ان کا معاصریّت کے ساتھ رویّہ اور معاصریّت کا ان کے ساتھ رویّہ، خاص کر داغ کے ساتھ امیر کے تعلقات اس بات کو تقویّت دیتے ہیں کہ امیر ایک بااخلاق اور جھگڑے فساد سے دور رہنے والے فطرۃً نیک انسان تھے۔

اس ذیل میں ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ امیر کی دو سوانح ان کے شاگردوں کی تحریر کردہ ہیں۔ بعد کے محققین نے ان کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ کسی جگہ بھی امیر کے اس جھگڑے میں ملوث ہونے کی شہادت نہیں ملتی۔

امیر سے منسوب اس قصیدے کے آخری اشعار سے ایک اہم اطلاع یہ بھی ملتی ہے کہ انھوں نے (امیر نے) ایک مختصر جہاں آشوب تحریر کیا تھا۔ جو سات سو اشعار پر مشتمل تھا۔

امیر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ذخیرے میں اس تصنیف کا نام بھی نہیں ملتا اور نہ امیر پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والے فضلاء نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

اس طرح اختر نے امیر سے منسوب قطعے کے پس منظر میں یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ امیر نے غالب کی حمایت میں ایک مضمون بھی تحریر کیا تھا۔ جو اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ صاحب مضمون نے یہ صراحت نہیں کی کہ امیر کے مضمون کی اشاعت کا ماہ و سال کیا ہے ؟ یا یہ معلومات انھوں نے کہاں سے سے حاصل کیں ؟ گمان غالب ہے کہ اختر کو اس سلسلے میں بھی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ امیر احمد مینائی کا کوئی مضمون جو غالب سے متعلق ہوتا تو یقیناً "ہنگامۂ دل آشوب" کی زینت بنتا یا بعد میں امیر کی نثر نگاری کے ذیل میں کہیں تو تذکرہ ہوتا۔

مذکورۂ بالا مختصر "جہاں آشوب" اور غالب کی حمایت میں لکھا جانے والا مضمون قصیدے کی طرح یقیناً محمد امیر کا ہوگا، جو ایک غیر معروف شاعر گزرا ہے۔ امیر احمد امیر مینائی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

کتابیات

۱ آہ، ممتاز علی: "امیر مینائی" لکھنؤ، ادبی پریس، ۱۹۴۱ء
۲ اختر جونا گڑھی، قاضی احمد میاں: "مضامین اختر جونا گڑھی"۔ کراچی، انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۸۹ء
۳ امداد صابری: گلدستۂ صحافت" دہلی، نعمانی پریس، ۱۹۸۴ء
۴ امیر احمد علوی: "مخزنِ امیر" لکھنؤ، انوار المطابع، ۱۹۲۸ء
۵ امیر، امیر احمد مینائی: "انتخاب یادگار" لکھنؤ، اترپردیش اکادمی، ۱۹۸۲ء
۶ جلیل مانک پوری: "سوانح امیر مینائی" ۔ حیدرآباد دکن، مطبع سیّدی، ۱۳۳۰ھ
۷ حالی، الطاف حسین: "یادگار غالب" کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۲ء
۸ حکمت، سید عبدالحکیم: "دبدبۂ امیری" پٹنہ، برقی پریس، ۱۹۳۰ء
۹ خویشگی، نصراللہ خاں: "گلشن ہمیشہ بہار" ۔ مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی، کراچی، انجمن ترقیِ اردو ۔

۱۹۶۷ء

۱۰ سحر، ابو محمد: "مطالعہ امیر" لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۳ء
۱۱ شیخ محمد اکرام: "حیات غالب" طبع دوم، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۱ء
۱۲ عروج، عبدالرؤف: "بزم غالب" کراچی، ادارۂ یادگار غالب، ۱۹۶۹ء
۱۳ غالب: "مکاتیب غالب" مرتبہ امتیاز علی عرشی، طبع اول، بمبئی، مطبعہ قیمہ، ۱۹۳۷ء
۱۴ غالب: "غالب کے خطوط" جلد سوم، مرتبہ خلیق انجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۰ء
۱۵ غالب: "غالب کے خطوط" جلد چہارم، مرتبہ خلیق انجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۰ء
۱۶ قدرت نقوی، سید: (مرتب) "ہنگامۂ دل آشوب" کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۶۹ء
۱۷ کریم الدین احمد، ڈاکٹر: "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ" لاہور، آئینۂ ادب ۱۹۸۲ء
۱۸ مالک رام: "فسانۂ غالب" لاہور، مکتبۂ شعر و ادب، سنہ ندارد
۱۹ میکش، شمس الحق سجاد علی شاہ: "یادگار امیر مینائی" دہلی، مطبع رحمانی، ۱۹۰۳ء

رسائل

۱ تحقیق، شعبۂ اردو، جامعۂ سندھ جامشورو، شمارہ ۴
۲ تحقیق، شعبۂ اردو، جامعۂ سندھ جامشورو، شمارہ ۵

حواشی

(۱) شعر و شاعری کا یہ گلدستہ آگرے سے نومبر ۱۸۴۸ء کو جاری ہوا ..... مالک و ایڈیٹر مولوی محمد ابوالحسن تھے ..... یہ گلدستہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد بھی جاری رہا ..... (پھر) "معیار الشعراء" مطبع مفید خلائق آگرہ میں چھپنے لگا۔ اس پریس کے مالک منشی شیونرائن تھے ..... منشی شیونرائن مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ مرزا غالب کے پاس "معیار الشعراء" جاتا تھا۔ مرزا غالب اپنے دوستوں کو اس کا خریدار بھی بناتے تھے۔

(گلدستۂ صحافت، امداد صابری، دہلی، نعمانی پریس ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۷ تا ۱۲۳)

(۲) "غالب کے خطوط" جلد سوم، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۴۳،
"خطوط غالب"، مرتبہ غلام رسول مہر، طبع چہارم، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور،
۱۹۶۸ء، ص ۲۱۳، میں اس خط کی تاریخ چہار شنبہ ۲۷ اپریل ۱۸۵۹ء ملتی ہے

(۳) تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ ہوں، راقم کے مضامین، "دفتر امیر اللغات"۔ شعبہ جاتی مجلہ "تحقیق" شمارہ ۴۔ شعبۂ اردو جامعۂ سندھ ۱۹۹۰ء اور "معتمدین" دفتر امیر اللغات کے مکتوبات۔ "تحقیق"۔ شمارہ ۵۔ ۱۹۹۱ء

(۵) مالک رام: "فسانۂ غالب" لاہور، مکتبۂ شعر و ادب، سنہ ندارد، ص ۱۳۳۔

(۶) ایضاً

(۷) شیخ محمد اکرام "حیات غالب"، طبع دوم، لاہور، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ۱۹۹۱ء، ص ۲۸۱ تا ۲۹۱

(۸) غالب: "مکاتیب غالب" مرتبہ امتیاز علی عرشی، طبع اول، بمبئی، مطبعہ قیمہ، ۱۹۳۷ء

(۹) ڈاکٹر ابو محمد سحر: "مطالعۂ امیر" لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۳ء، ص ۸۵۔

(۱۰) عبدالرؤف عروج: "بزم غالب" ادارۂ یادگار غالب، ۱۹۶۹ء، ص ۹۳۔

(۱۱) امیر احمد امیر مینائی: "انتخاب یادگار" اُتر پردیش اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء

(۱۲) امیر مینائی کی پانچ سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ یادگار امیر مینائی از شمس الحق سجاد علی شاہ میکش حیدرآبادی، مطبع رحمانی، دہلی، ۱۹۰۳ء "سوانح امیر مینائی، از جلیل مانک پوری، مطبع سیدی حیدرآباد دکن ۱۳۴۷ھ۔ امیر مینائی از شاہ ممتاز علی آہ، ادبی پریس لکھنؤ، ۱۹۳۱ء۔ "تذکرۂ امیر از امیر احمد علوی، انوار المطابع، لکھنؤ ۱۹۲۸ء، "دبدبۂ امیری" از سید عبدالحکیم حکمت، پٹنہ۔ برقی پریس لکھنؤ صبائے مینائی از آفتاب احمد صدیقی، ڈھاکہ، مکتبۂ عارفین ۱۹۵۸ء، پی ایچ ڈی کے مقالات میں پہلے ڈاکٹر ابو محمد سحر کا مقالہ مطالعۂ امیر شائع ہوا۔ پھر ڈاکٹر کریم الدین احمد کا "امیر مینائی اور اُن کے تلامذہ" مطبوعہ آئینۂ ادب لاہور، ۱۹۸۲ء

(۱۳) "امیر مینائی اور اُن کے تلامذہ" ص ۱۰۰۔

(۱۴) "فسانۂ غالب"۔ ص ۱۳۵۔

(۱۵) الطاف حسین حالی: "یادگار غالب" کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۲ء، ص ۵۱۔

(۱۶) "یادگار امیر مینائی" ص ۷۔

(۱۷) امیر مینائی ص ۲۰۔

(۱۸) مطالعۂ امیر ص ۸۳۔

(۱۹) امیر مینائی اور ان کے تلامذہ ص ۲۱۔

(۲۰) امیر مینائی ص ۳۰۔

(۲۱) غالب۔ "مکاتیب غالب" ص ۸۔

(۲۲) مکاتیب غالب ص ۶۔ خلیق انجم اس خط سے متعلق اپنی تفصیلی رائے یہ درج کرتے ہیں۔
غالب نے تاریخ میں سنہ نہیں لکھا۔ یہ سنہ ۱۲۷۵ھ اور سنہ ۱۸۵۹ء ہے۔ کیوں کہ اس خط میں نواب یوسف علی خاں نے ناظم کی والدہ کے انتقال پر قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے۔ مکاتیب غالب کے پہلے ایڈیشن میں ۲۸ مارچ درج ہے۔ مولوی مہیش پرشاد نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے۔ لیکن مرقع غالب میں شامل اس خط کے عکس میں "مکاتیب غالب" کے چھٹے ایڈیشن میں یہ تاریخ ۲۰ مارچ ہے جو درست ہے۔ کیوں کہ تقویم کی رو سے یکشنبہ ۲۱ شعبان اور ۲۰ مارچ ہی کو تھا۔
"غالب کے خطوط" جلد سوم، مرتبہ خلیق انجم "، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۹۸۷ء۔ ص ۱۳۸۵۔

(۲۳) مکاتیب غالب۔ ص ۱۹۔

(۲۴ تا ۲۶) - غالب کے خطوط - ص ۱۲۱۱۔

(۲۷) اس غزل کا رام پور پہنچنا غالب کے مکتوبات سے ثابت نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب اپنے طور پر دستی لائے ہوں۔

(۲۸) اس غزل کے بقیہ اشعار طوالت کی وجہ سے درج نہیں کیے گئے۔

(۲۹) اس غزل کے بقیہ اشعار طوالت کی وجہ سے درج نہیں کیے گئے۔

(۳۰) امیر مینائی ص ۴، تا ۶۔

(۳۱) نصر اللہ خاں خویشگی۔ "گلشن ہمیشہ بہار" کراچی۔ انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۷ء۔ ص ۰۔

(۳۲) Garcin De Tassy:

(۳۳) سیّد قدرت نقوی "ہنگامۂ دل آشوب" مضامین مشمولہ سیّد فخر الدین دہلوی، کراچی۔ انجمن ترقی اردو ص ۲۰۹۔

|یادداشت :۔ مقالہ نگار نے "مضامین اختر جوناگڑھی" (طبع انجمن کراچی ۱۹۸۹ء) کے حوالے سے اختر جوناگڑھی کے مضمون کا رد لکھا ہے۔ امیر مینائی ان کا خاص موضوع ہے۔ اس لیے امیر مینائی کے حوالے سے عمدہ تفصیلات پیش کی ہیں۔ اختر جوناگڑھی کا مضمون اولاً نوائے ادب بمبئی بابت اکتوبر ۱۹۵۴ء میں چھپا تھا اور اس کا اجمالی رد بھی اسی رسالے میں جنوری ۱۹۵۵ء میں مالک رام کے قلم سے چھپ گیا تھا۔ مالک رام کا خاص موضوع غالب تھا۔ ان کا تردیدی مقالہ گوشۂ تحقیق منسوبات کے دوسرے حصے میں شامل کیا جائے گا۔ نجم الاسلام|

سید علی میر افضلی:
تلخیص و ترجمہ: نجم الاسلام

خیّام کی اصیل رباعیاں کون سی ہیں ؟

(تلخیص)

اس مقالے کا مقصد خیّام کی اصیل رباعیوں کی بہتر شناخت کے لیے ایک معیار و میزان کی نشان دہی ہے، جو نسخہ شناسی، زبان شناسی، معنا شناسی کے علاوہ ہے۔ یہ مقالہ اس نکتے کے اثبات میں ہے کہ خیّام سے منسوب رباعیوں میں وہ رباعیاں زیادہ تر صحت و اصالت رکھتی ہیں جن کی بنا چار قافیوں پر ہے، اس لیے کہ رباعی کی یہ شکل خیّام کے زمانے میں رائج شیوۂ سخنوری سے زیادہ سازگاری رکھتی ہے۔

یہ ادّعا یا نظریہ اولاً تاریخی طور پر محکم ہے، ثانیاً رباعیات خیام کے اوّلین اور قدیم تر دستیاب منابع بھی اس کی صحت پر دلالت کرتے ہیں۔

یہاں یہ صراحت مناسب ہوگی کہ یہ نظریہ پہلی بار پیش نہیں کیا جا رہا ہے، پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے لیکن ہمارے اس مقالے کا شیوۂ اثبات زیادہ محکم اور زیادہ مستدل ہے۔

پانچویں اور چھٹی ہجری میں رباعی کے قافیوں کا انداز:

رباعی کے قافیوں کی بنا، آغاز پیدائش و رشد میں، چار پر رہی ہے جیسا کہ بیشتر محققوں نے بتایا ہے، یعنی چاروں مصرعوں میں قافیے کی رعایت۔ ظاہرا خواجہ نصیرالدین طوسی نے کتاب معیارالاشعار میں سب سے پہلے یہ نکتہ اٹھایا تھا

> ["ترانہ را قدما چہار بیت می گرفتہ اند و آن را چہار بیتی خواندہ و بہ عربی رباعی، و در ہر چہار قافیہ آوردن لازم می شمردہ، اما بہ نزدیک متاخران چوں مربعات این اوزان مستعمل نیست و این اوزان متروک است۔ ہر بیتی را از این ابیات مصراعی می شمارند و رباعی را دو بیتی می خوانند و مصراع سیم را خصی خوانند و قافیہ شرط نمی دانند"]

اصطلاح "چہار خانہ" جسے ظہیری سمرقندی نے رباعی کے برابر رکھا ہے اور اصطلاح "چہار دانہ" جو دیوان شرف شاہ دولابی میں آئی ہے۔ ان معنوں کی تائید کرتی ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ رباعی کی پیدائش کے زمانے کی کوئی رباعی دستیاب نہیں۔ جو رباعیاں کہ صوفیہ مانند بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) سے نسبت کی جاتی ہیں معتبر سند نہیں رکھتیں۔ چوتھی صدی ہجری کے شاعروں میں سے کسی کا دیوان شعر دستیاب نہیں۔ ان کے اشعار منتشر طور پر تذکروں، جُنگوں، فرہنگوں اور بھی تاریخی کتابوں میں موجود ہیں۔ جو دیوان رودکی سے منسوب ہے گیارہویں صدی ہجری کا ساختہ ہے۔ جو مقدار شعر آج رودکی کے کلام کی فراہم شدہ ہے وہ بھی متاخرو نامعتبر تذکروں اور سفینوں پر تکیہ کر کے لی گئی ہے۔ جن کے طرز کلام میں یک رنگی نہیں ہے۔ سعید نفیسی جو خود ان اشعار کے جمع کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔ رودکی سے منسوب رباعیات کے بارے میں کہتے ہیں۔

"بیشتر این رباعیہا در سفینہ ہا و کتابہای متاخران آمدہ است و بہ ہمین جہت در انتساب آنہا بہ رودکی شک دارم چنان کہ دربارہ ای از آنہا کلمات و ترکیبات و معانی ہست کہ بہ سخن رودکی نمی ماند۔"

نفیسی کا شک کاملاً بجا ہے۔ اس دور کے دیگر شاعروں مثل دقیقی و کسائی و شہید بلخی و منجیک وغیرہ پر بھی یہی حکم لگائیں تو روا ہے۔

یہ پریشانی اور بے سروسامانی پانچویں صدی کے نصف کو بھی شامل ہے۔ اگرچہ اس صدی کے اغلب شعراء کے دواوین بدست ہیں۔ لیکن اس صدی کے نصف اول کے شاعروں میں سے کوئی ایک دیوان بھی ایسا نہیں جو تحریف و تغیّر اور کمی بیشی کا شکار نہ ہو۔ فرخی و منوچہری و عنصری و عسجدی اور دیگر کسی شاعر کے دیوان کا کوئی نسخہ دسویں اور گیارہویں صدی ہجری سے پہلے کا دستیاب نہیں۔ فردوسی اور ناصر خسرو اور فخرالدین اسد گرگانی اور اسدی طوسی کی بھی کوئی رباعی معتمد منابع میں روایت نہیں ہوئی ہے۔

لیکن پانچویں صدی ہجری کے نصف دوم کی یہ حالت نہیں ہے۔ اس دور میں شعراء کے دواوین کے معتبر نسخے ملتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہماری بحث و نظر بھی اسی دور سے متعلق ہے۔ اس نصف دوم کی سو میں ۹۰ سے بھی زیادہ رباعیاں چار قافیوں کے ساتھ ہیں قافیۂ رباعی کی وضعیت کو ہم قبل کے زمانوں میں دریافت کر سکتے ہیں۔ قرائن بھی اسی نتیجہ پر پہنچاتے ہیں۔ رباعیات طبری زبان میں سے کہن ترین وہ ہے جو قابوس نامے میں باقی رہ گئی ہے اور وہ چار

قافیے والی ایک رباعی ہے جو مولف کتاب کی ہے۔ دیگر رباعیات طبری بھی چار قافیوں والی ہیں ... رباعیات عربی بھی جو قدیم فارسی رباعیوں کے طرز پر ہیں اور زیادہ تر فارسی بولنے والے تازی گویوں کی لکھی ہوئی ہیں، چار قافیوں والی ہیں۔

ذیل میں ایک جدول کے ذریعے، پانچویں صدی ہجری کے نصف دوم اور چھٹی صدی ہجری کے ربع اول میں تین اور چار قافیوں والی رباعیوں کی صورت حال کو واضح کیا جاتا ہے۔

شمارہ نام شاعر مع سال مرگ:		کل رباعیاں:	۳ قافیوں والی:	۴ قافیوں والی
۱۔ ازرقی ہروی،	۴۶۵ھ	۶۰	۶	۵۴
۲۔ قطران تبریزی، بعد از ۴۸۱ھ		۱۵۱	۲۰	۱۳۱
۳۔ ابوالفرج رونی،	۴۹۲ھ	۴۶	۴	۴۲
۴۔ مسعود سعد سلمان،	۵۱۵ھ	۴۵۴	۶	۴۴۸
۵۔ امیر معزی، حدود	۵۲۰ھ	۱۰۴	۴	۱۰۰
۶۔ سنائی غزنوی،	۵۳۵ھ	۲۵۰	۴۵	۲۰۵
۷۔ ادیب صابر	۵۴۶ھ	۸۱	۴	۷۷
۸۔ عثمان مختاری	۵۴۹ھ	۱۹۹	۱	۱۹۸
۹۔ عبدالواسع جبلی،	۵۵۵ھ	۱۱۴	۲۱	۹۳
جمع		۱۴۵۸	۱۱۱	۱۳۴۷

[مقالہ نگار نے اس جدول کی تیاری میں جن نسخوں سے استفادہ کیا ہے
ان کی تفصیل بھی درج کی ہے جسے حذف کیا جاتا ہے۔]

جدول بالا خود کافی طور پر بتا رہی ہے کہ اس دور کے ۹ شاعروں کی رباعیوں میں سے ۹۲.۰۳ فی صد چار قافیے والی رباعیاں ہیں، یعنی ہر دس میں سے نو رباعیاں۔ قاعدے سے خیام کی رباعیوں کو بھی الگ نہیں ہونا چاہیے، اور ان کی اکثریت و اصالت کو بھی چار قافیوں والی رباعیوں کی طرف نسبت کرنا چاہیے۔ لیکن خیام کی رباعیوں کے مجموعوں کی صورت حال کیا ہے؟ فروغی کے ایڈیشن میں کل ۱۷۹ رباعیوں میں سے صرف ۵۱ رباعیاں چار قافیوں والی ہیں۔

یہ تعداد اس دور کے طریقے کے بالکل برخلاف ہے۔

قدیم متون و منابع میں رباعیات خیام کی شناخت و بازیافت۔

یہ متون و منابع دو طرح کے ہیں:

۱۔ کتابیں اور جنگیں اور قدیم مجموعے، جن میں ایک یا چند رباعیاں خیام کے نام سے آتی ہیں، اور ان کی قدروقیمت خیام کے زمانے سے فاصلے کی نسبت سے ہے مثلاً رسالۂ امام فخر رازی (م ۶۰۶ھ)، مرصاد العباد نجم الدین رازی (۶۲۰ھ) الاقطاب القطبیہ تالیف عبدالقادر ابہری (۶۲۹ھ) نزہتہ المجالس جمع کردہ جمال خلیل شروانی (نیمۂ سدۂ ہفتم)، مجموعۂ خطی مورخ ۷۸۱ھ کتاب خانۂ اسماعیل صائب ترکیہ، مونس الاحرار محمد بن بدر جاجرمی (۷۴۱ھ)، تاریخ گزیدہ نوشتہ حمد اللہ مستوفی (۷۳۰ھ) اور آٹھویں صدی ہجری کے دیگر متون اور مجموعوں کی ایک تعداد۔

۲۔ ایسی قدیم کتابیں جن کے مختلف مطالب نظم و نثر میں ایسی رباعیاں نام کی طرف اشارہ کیے بغیر درج ہوئی ہیں جن کو خیام کی رباعیوں کی حیثیت سے شناخت کیا جاتا ہے۔ یہ قدیم کتابوں میں ضبط شدہ رباعیاں خیام کے زمانے سے نزدیکی کے سبب سے کمتر تحریف و تغیر سے دوچار ہوئی ہیں۔ ان قدیم کتابوں میں، روح الارواح سمعانی (۵۳۴ھ)، سندباد نامہ اور اغراض السیاسہ ظہیری سمرقندی (۶۰۰ھ سے قبل)، مرموزات اسدی نوشتہ نجم الدین رازی (۶۲۱ھ)، مرزبان نامہ دراوینی (۶۲۲ھ)، راحۃ الصدور راوندی (۵۹۹ھ)، تاریخ جہانگشای جوینی (۶۵۸ھ)، اخلاق الاشراف عبید زاکانی (۷۳۶ھ سے قبل)، اور دوسری کتابیں آتی ہیں۔

یہ خیام کی وفات سے ۲۰ تا ۱۵۰ سال کا فاصلہ رکھتی ہیں۔ ان منابع میں قدیم ترین کتاب روح الارواح سمعانی ہے جو بے گماں ۵۳۴ ہجری سے قبل کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں ناظم کے نام کی صراحت کے بغیر، دو بار یہ رباعی آئی ہے جو خیام کی مستند رباعیوں میں سے ہے۔

آن را کہ بہ صحرای علل تاختہ اند   بی علت کار او برپرداختہ اند

امروز بہانہ ای در انداختہ اند   فردا ہمہ آن بود کہ دی ساختہ اند

یہ رباعی نزہتہ المجالس اور چند دوسری کتابوں میں خیام کے نام سے آئی ہے اور چار قافیوں والی ہے۔

ظہیری کاتب سمرقندی کتاب سند باد نامہ میں خیام کے نام کی صراحت کے بغیر پانچ

رباعیاں ایسی لایا ہے جو مستند طور پر خیام کی ہیں۔ ضبط کہن سے ان کی اصالت کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بھی چار قافیوں والی ہیں۔

[مقالہ نگار نے یہ پانچوں رباعیاں نقل کی ہیں ۔ اسی طرح بعد کے ماخذوں میں رسالہ التنبیہ امام فخرالدین رازی (م ۶۰۶ھ) کی ایک رباعی جو خیام کے نام سے ہے ۔ اور دوسرے منابع مرصاد العباد نجم الدین رازی ۔ کتاب الاقطاب القطبیہ عبدالقادر اہری ۔ رسالۂ امام فخر رازی ۔ تاریخ جہانگشای جوینی میں مندرج رباعیات خیام بھی نقل کی ہیں ۔ اور وہ بھی چار قافیوں والی ہیں۔ یہ کل ۱۱ رباعیاں ہیں ۔ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے مقالہ نگار لکھتے ہیں :]

ان گیارہ رباعیوں میں ایسی معنوی پیوستگی اور لفظی ہم آہنگی ۔ ساخت کی ہم گونی دیکھنے میں آتی ہے کہ گویا سب کی سب ایک ذہن و طبع سے صادر ہوتی ہیں ۔

نزہۃ المجالس اور مونس الاحرار کا معاملہ اور ہے اور اسے ہم مقالے کے آخر میں زیر بحث لائیں گے۔

خیام کی چار قافیوں والی رباعیوں میں تحریف و تغیر ۔ اور تین قافیوں میں بدل جانے کی مثالیں :

ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد جب تین قافیوں والی رباعی کو پسند کیا جانے لگا تو زمانے کے گذرنے کے ساتھ خیام کی رباعیوں میں مصراع سوم کے قافیوں کے ساتھ دستکاری کی جانے لگی اور چار قافیوں والی رباعی کو تین قافیوں میں بدلنے کا رجحان ہوا۔ چند نمونے یہ ہیں۔

خیام ایک رباعی (بیاض تاج الدین احمد وزیر ۷۸۲ھ)

وقت سحر است خیز ای مایہ ناز نرمک نرمک بادہ دہ و چنگ نواز

کانہا کہ بجایند نپایند دراز و آنہا کہ شدند کس نمی آید باز

اس کی تحریف شدہ شکل کو ۔ رباعیات خیام کے نسبتاً دو موثق منابع نزہۃ المجالس ۔ ص ۴۰۴) اور مونس الاحرار (ص ۱۱۴۴) میں ہم یوں پاتے ہیں

وقت سحر است خیز ای مایہ ناز نرمک نرمک بادہ خور و چنگ نواز

کانہا کہ بجایند نپایند بسی و آنہا کہ شدند کس نمی آید باز

پہلی روایت کی برتری ہر جہت سے آشکار ہے۔ تغیر کے انداز کو قید قدیمی " دراز" کی

جگہ تازہ تر اور مانوس تر - "بی" - لانے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

دوسرا نمونہ خیام کی یہ رباعی ہے جو نزہۃ المجالس (ص ۱۰۹) میں آتی ہے

در کار گہ کوزہ گری رفتم دوش دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش

از دستہ ہر کوزہ برآوردہ خروش صد کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

یہ رباعی متاخر مجموعوں میں یوں آتی ہے

در کارگہ کوزہ گری بودم دوش دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش

ہر یک بزبان حال با من گفتند کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

(ترانہ ہای خیام، صادق ہدایت)

اصولاً یہ ترکیب "زبان حال" نسخہ سازوں کی پسندیدہ ترکیب ہے۔ بہت سی مشکوک رباعیوں میں نظر آتی ہے۔

اسی طرح، رسالۂ امام فخر رازی اور سند باد نامہ میں خیام کی چار قافیوں والی رباعیاں ہیں جو متاخر مجموعوں میں تین قافیوں والی ہو گئی ہیں۔

مشابہت رکھنے والی رباعیاں:

مثلاً ذیل کی دو رباعیوں میں سے، کہ دونوں لطیف ہیں اور کئی جہات سے ہم شبیہ، کس کو خیام کی کہی ہوئی مانا جائے، کس کو اس کے کلام سے مستفاد؟

چوں ابر بہ نوروز رخ لالہ بشست برخیز و بہ جام بادہ کن عزم درست

کین سبزہ کہ امروز تماشا گہ تست فردا ہمہ از خاک تو برخواہد رست

....

ابر آمد و باز بر سر سبزہ گریست بی بادہ گلرنگ نمی شاید زیست

این سبزہ کہ امروز تماشا گہ ماست تا سبزۂ خاک ما تماشا گہ کیست

(طرب خانہ ص ۷۰)

بے شک ان کی شناخت کا ایک طریقہ وہی رباعی کا چار قافیوں والی ہونا ہے۔ دوسرا طریقہ نسخوں کی قدامت کا ہے۔ اس لحاظ سے پہلی رباعی کے حق میں اصالت و قدامت کا حکم

لگے گا۔ پھر ترکیب "بادہ گلرنگ" کہ دوسری رباعی میں آئی ہے۔ ان ترکیبوں میں سے ہے جو عراقی کے اسلوب میں شعر کہنے والے شعراء مثلاً خواجوی کرمانی، ناصر بخارای، اوحدی مراغہ ای اور حافظ کے یہاں رائج تھیں۔ خیام کے دور کے اسلوب سے اس کو مناسبت نہیں۔ [مشابہ رباعیوں کی دوسری مثالیں بھی درج ہیں جن کو حذف کیا جاتا ہے]۔

نزہۃ المجالس اور مونس الاحرار میں شامل خیام کی رباعیوں پر ایک نظر:

یہ دونوں کتابیں نصف صدی پہلے سے اب تک رباعیات خیام کے اہم مراجع میں شمار کی جاتی رہی ہیں۔

نزہۃ المجالس مجموعہ ہے فارسی کی قدیم رباعیوں کا جسے جمال خلیل شروانی نے ساتویں صدی ہجری کے وسط میں جمع کیا تھا۔ اس کا تنہا موجود نسخہ کتاب خانۂ سلیمانیہ استنبول کا ہے جسے اسمٰعیل بن اسفندیار بن اسفندیار ابہری نے ۷۳۱ھ میں کتابت کیا ہے۔ اس کے باب ۱۵ میں "معانی حکیم عمر خیام" کے عنوان کے تحت کل ۳۱ رباعیاں خیام کے نام سے درج ہیں، اور ایک تعداد ان کی رباعیوں کی بھی ہے جو خیام سے منسوب ہیں مگر انھیں بغیر نام کی صراحت کے درج کیا ہے یا دوسرے اشخاص کے نام سے۔

مونس الاحرار فی دقائق الاشعار مختلف اشعار کو حاوی ہے جو قصیدہ و غزل و قطعہ و رباعی سے متعلق ہیں اور جنھیں محمد بن بدر جاجرمی نے ۷۴۱ھ میں فراہم کیا ہے۔ اس کی فصل ہجم رباعیات میں "رباعیات ملک الحکماء عمر خیام رحمۃ اللہ علیہ" کے عنوان سے خیام کی ۱۳ رباعیاں شامل کی ہیں۔ اس کتاب کے چند نسخے موجود ہیں جن میں سے پاکیزہ ترین نسخہ وہ ہے جسے کتاب کے سال تدوین ہی میں کتابت کیا گیا ہے اور احتمالاً یہ خود مؤلف کے خط میں ہے۔ اس کا عکس تہران کے کتاب خانوں میں موجود ہے۔

ان دونوں کتابوں کی رباعیات تعداد اور کیفیت کے لحاظ سے بہت سے جُنگوں اور مشابہ مجموعوں پر برتری رکھتی ہیں، لیکن ان دونوں میں خیام سے منسوب تمام کی تمام رباعیوں کو بے چون و چرا قبول کر لینا بینش و بصارت سے خالی ہے۔ پہلا نکتہ جو پریشان کرتا ہے ان میں موجود تین قافیوں والی رباعیوں کی چار قافیوں والی رباعیوں کی نسبت سے متعلق ہے۔ دونوں کتابوں کی ۴۳ رباعیوں میں (مشترک و مکرر رباعیوں کا حساب کیے بغیر) ۲۵۰ رباعیاں تین قافیوں والی ہیں۔ ہمارا ارادہ نہیں ہے کہ ان کتابوں کی رباعیوں کے باب میں موشگافی

کریں کیونکہ یہ خود ایک اور بحث ہے۔ البتہ چند بنیادی امور کو ہم نے نظر میں رکھا ہے۔ ایک یہ کہ رباعیوں کے درمیان تضاد و تناقض و تباین معنوی نہ ہونا چاہیے۔ جن رباعیوں میں ایک مضمون مشترک کو چند شکلوں میں بیان کیا گیا ہو، بجز اس کے کہ ان میں کوئی تازہ نکتہ ہو، ناچار ایک کو اصیل فرض کر کے باقی کو الحاقی و اقتباسی جاننا چاہیے۔ جو رباعیاں کہ باوثوق منابع میں دوسرے شاعروں کے نام سے آئی ہیں ان سے چشم پوشی کرنا چاہیے۔ اور جو رباعیاں خیام کی فکر اور زبان سے بیگانگی رکھتی ہیں ان پر شک روا ہو گا۔ [اس کے بعد مقالہ نگار نے ان نکات کی وضاحت کے لیے مثالیں بھی دی ہیں جو سردست حذف کی جاتی ہیں]۔

اگر نزہۃ المجالس کی ان رباعیوں کو جو مشکوک نظر آتی ہیں اور خیام کی فکر عالی سے کچھ علاقہ نہیں رکھتیں، تو بے شک پھر اتنی ہی رباعیاں بچ رہیں گی جو ہمارے اس مقالے کے بنیادی نکتے سے مطابقت رکھیں گی۔ نزہۃ المجالس کی ایک رباعی ایسی بھی ہے۔

دشمن بغلط گفت کہ من فلسفی ام　　ایزد داند کہ آنچہ او گفت نی ام

لیکن چو دریں غم آشیاں آمدہ ام　　آخر کم از آنکہ من بدانم کہ کی ام

کہ بظاہر تین قافیوں والی ہے مگر دراصل وہ چار قافیوں والی ہے کہ اس کے مصراع سوم میں "آمدہ ام" کو اس طرح پڑھ سکتے ہیں کہ وہ باقی تین قافیوں سے ہم آہنگ ہو۔

مونس الاحرار کی ۱۳ رباعیوں میں سے دو رباعیوں (برسنگ زدم دوش سبوی کاشی ... می خور کہ فلک کہ بہر ہلاک من وتو ...) سے اوپر کے دلائل کی بنا پر ہم چشم پوشی کریں اور ان دو رباعیوں وقت سحر است خیزاے مایہ ناز ... ای آنکہ نتیجہ چہار و ہفتی ... اپنی اصلی شکل میں نظر میں لائیں تو چار قافیوں والی رباعیوں کی تعداد ۸ بنتی ہے اور تین قافیوں والی رباعیوں کی تعداد ۳۔ یہ تناسب معقول تر اور مقبول تر بھی لگتا ہے۔

اس تحریر کو اس توقع پر ختم کیا جاتا ہے کہ اس سے خیام کی اصیل رباعیوں کی شناخت میں مدد مل سکے گی، یا کم سے کم خیام شناسی کے ماہرین اس سے تحرک تازہ حاصل کریں گے۔

(نشر دانش، تہران، جلد ۱۵، شمارہ ۵، اگست ستمبر ۱۹۹۵، ص ۴ تا ۱۶ ملخصاً)

یادداشت از مترجم:

- مقالہ بکثرت حواشی سے مزین ہے جنھیں اختصار کے خیال سے حذف کیا جاتا ہے

- مقالے کے آغاز میں صراحت موجود ہے کہ یہ ادّعا یا نظریہ (کہ خیام سے منسوب رباعیوں میں وہ رباعیاں زیادہ تر صحت و اصالت رکھتی ہیں جو چار قافیوں والی ہیں) انھوں نے پہلی بار پیش نہیں کیا ہے۔ پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے لیکن ان کے مقالے کا شیوۂ اثبات زیادہ محکم اور مستدل تر ہے۔ معلوم نہیں اس نظریے کے پہلی بار پیش کرنے والے کا نام انھوں نے بصراحت کیوں نہیں لیا، حالانکہ اس اخفاء کا موقع نہ تھا۔
- ہماری معلومات کے مطابق، اس فضیلت کے مستحق اور مدعی ڈاکٹر محمد اقبال (م ۱۹۴۸ء) پروفیسر فارسی، اورینٹل کالج لاہور ہیں۔ ان کا مقالہ "رباعیات خیام کی تعیین" کے عنوان سے اورینٹل کالج میگزین لاہور اگست ۱۹۳۱ء میں چھپا تھا۔ اسے گوشۂ تحقیق منسوبات کے دوسرے حصے میں نقل کیا جائے گا۔ اس مقالے میں وہ صراحت کرتے ہیں کہ انھوں نے اس نظریے کو ۱۹۳۳ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس بڑودہ میں اپنے مقالے میں پیش کیا تھا، بعد میں زیادہ وضاحت کے ساتھ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "خیام" میں، اور پروفیسر محمود خاں شیرانی نے اپنے فاضلانہ مضمون میں جو انھوں نے رباعی کے اوزان پر گزشتہ سال (۱۹۳۰ء) اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا تھا، بیان کیا ہے۔
- افسوس کہ ڈاکٹر محمد اقبال کا مجموعۂ مقالات ابھی تک ترتیب پا کر سامنے نہیں آیا، جس کی وجہ سے ان کی علمی فضیلتیں دھندلا رہی ہیں۔
- "کلیات آثار پارسی حکیم عمر خیام" (تہران، کتاب فروشی بارانی، ۱۳۳۸ شمسی) کے مرتب محمد عباسی نے صراحت کی ہے کہ ان کی مرتب کردہ کلیات کی رباعیاں ایک قدیم قلمی نسخے کی اساس پر ہیں جو ۶۰۳ھ کا ہے (یعنی سفینۃ المجالس سے بھی پہلے کا ہے)۔ اس قدیم نسخے کی اصالت و قدامت کو، اور (مثبت نتیجے کی صورت میں) اس کے حوالے سے بھی، چار قافیوں والی رباعیوں کی روایت کو زیر بحث لایا جاتا تو بہتر تھا۔

حنا عنبرین:

خدا بخش لائبریری جرنل
میں
تحقیقِ منسوبات سے متعلّق مضامین

○ قاضی عبدالودود مرحوم نے " دساتیر طبع اول " کو سامنے رکھ کر اپنا مضمون " کچھ دساتیر کے بارے میں " تحریر کیا ہے " دساتیر " خالص فارسی زبان میں لکھی ہوئی ایک ایسی کتاب بتائی گئی ہے جس کا زند و اوستا کی قدیم زبان سے خسرو پرویز کے عہد میں کسی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا، پھر یہ مخفی ہو گئی اور انگریزوں کے زمانے میں ملّا فیروز پارسی نے اسے دوبارہ شائع کر کے شہرت دی اور اپنے مذہب کی خدمت کے طور پر دنیا کی قدیم کتابوں میں اسے شمار کیا۔ مگر قاضی عبدالودود نے اوّل اوّل " نقوش " (۱۹۶۷ء) میں یہ مضمون لکھ کر اس کتاب کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔

یہ مضمون بعد میں جرنل کے شمارہ نمبر ۲۰ میں شامل ہوا۔ قاضی صاحب کی تحقیقات کا حاصل یہ ہے کہ یہ کوئی قدیم کتاب نہیں بلکہ یہ ایک جعلی کتاب ہے، مضمون میں دلائل کچھ اس ترتیب سے پیش کیے گئے ہیں کہ، سب سے پہلے قاضی عبدالودود نے " دساتیر طبع اول " کے مرتب و ناشر ملّا فیروز کا اک طویل فارسی اقتباس نقل کیا ہے تاکہ ناشر کا نقطۂ نظر اور اس کے دعوے سامنے آ سکیں۔

پھر اپنے قارئین کی آسانی کے لیے وہ ملّا فیروز کی ان عبارات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جس میں دعویٰ ہے کہ خسرو پرویز کے عہد میں اس کا ترجمہ زند و اوستا کی زبان سے فارسی میں ہوا۔ اس کے بعد وہ " دساتیر " کی جلد اول کی فہرست مندرجات درج کرتے ہیں۔ پھر انھوں نے جلد دوم کا تعارف پیش کرتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے سے تفصیلات درج کی ہیں۔

ان تمہیدی اور تعارفی کلمات کے بعد قاضی عبدالودود مرحوم اپنے مخصوص انداز

تحریر پر آجاتے ہیں اور نکتہ بہ نکتہ ان تمام مسائل کو لیتے ہیں جو " دساتیر کے ناشر، اس کے مصنف، اس کے عہد تصنیف اور مخصوص الفاظ اور شہرت وغیرہ سے متعلق ہیں۔

صاحب مقالہ نے ان تمام نکات پر اس طور سے روشنی ڈالی ہے کہ دستیاب شدہ معلومات کی مدد سے یہ بات بخوبی پایہ تحقیق کو پہنچتی ہے کہ یہ کتاب " دساتیر " جعلی ہے جسے انگریزوں کے عہد میں ملا فیروز نے شایع کرکے شہرت حاصل کرنا چاہی تھی ۔

قاضی عبدالودود کی تحقیقات کے مطابق قرائن قوی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ دساتیر کوئی قدیم کتاب نہیں بلکہ خود آذر کیوان " دساتیر " کا مصنف ہے جو عہد اکبری میں ایران سے ہندوستان آیا اور کچھ دن پٹنہ میں مقیم رہ کر ۱۰۲۷ھ میں فوت ہو گیا۔

اس طرح ملّا فیروز کی پھیلائی ہوئی دانستہ غلط فہمی کا ازالہ قاضی عبدالودود مرحوم کے فاضلانہ مضمون سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ اس مضمون کا انداز تحریر بھی قاضی صاحب کے دوسرے مضامین کی مانند کچھ الجھا ہوا اور گنجلک ہے، لیکن اس کی شکایت ہی کیا کہ یہی انداز ان کی تحریر کی شناخت بھی ہے۔

○ خدا بخش لائبریری جرنل کے شمارہ نمبر ۲۸ میں جناب رضوان احمد خاں کا ایک خالص تحقیقی مضمون شایع ہوا جو اپنی نوعیت کا ایک دلچسپ مضمون ہے۔

اس مضمون میں سید سجاد حیدر یلدرم کے ایک پرلطف انشائیے " مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ " سے متعلق تحقیق کی گئی ہے ۔ یہ انشائیہ یلدرم کے افسانوی مجموعے " خیالستان " میں شامل ہے جو پہلی بار ۱۹۱۰ء میں شایع ہوا اور آج بھی خدا بخش اورینٹل لائبریری کے ذخیرۂ کتب میں یہ ایڈیشن محفوظ ہے۔

فروری ۱۹۸۲ء کے اوائل میں رضوان احمد صاحب کی نظر سے ایک ایسا ہندی مضمون گزرا جو نہ صرف بلحاظ عنوان بلکہ نفسِ مضمون کے حساب سے بھی یلدرم کے مذکورۂ بالا انشائیے کے ساتھ یکسانیت رکھتا تھا۔

دورانِ تحقیق معلوم ہوا کہ یہ ہندی مضمون جو کئی سالوں سے بربگھا کالج کے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں شامل ہے ضلع بجنور کے پدم سنگھ شرما نے " مجھے میرے متروں سے بچاؤ " کے عنوان سے تحریر کیا ہے، ہندی ترجمے کا فرق صرف اتنا ہے کہ بیشتر اردو

فارسی الفاظ و مرکبات جوں کے توں دیوناگری رسم الخط میں نقل کر دیے گئے ہیں۔

جس نکتے نے رضوان احمد خاں صاحب کو حقائق کی تلاش پر مجبور کیا وہ سجاد حیدر یلدرم اور ہندی مضمون نویس پدم سنگھ شرما کے انداز کی یکسانیت ہے۔ یلدرم کی مہلت حیات ۱۸۸۰ء تا ۱۹۴۳ء ہے جب کہ پدم سنگھ کا عرصہ حیات ۱۸۷۶ء تا ۱۹۳۲ء پر محیط ہے لہذا یہ بات جاننے کے لیے کہ پدم سنگھ شرما اور یلدرم میں سے کون اس مضمون کا مصنف ہے؟ اور کون مترجم؟ جناب رضوان احمد نے تحقیق کے اصول و ضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے حقائق تک رسائی حاصل کی۔ اور اس حقیقت پر یقین واثق ہو گیا کہ یہ انشائیہ جو بقول یلدرم کے خود ان کا بھی طبع زاد نہیں بلکہ انگریزی ادب سے ماخوذ ہے، اوّل اوّل سجاد حیدر یلدرم کے افسانوی مجموعے "خیالستان" کی زینت بنا اور بعد میں پدم سنگھ شرما نے اس کا ہندی ترجمہ اس وضاحت کے ساتھ شایع کیا کہ یہ یلدرم کے مضمون سے مترجم ہے۔

رضوان احمد صاحب نے اس مضمون کے آخر میں اس انشائیے کو اردو اور ہندی زبان میں بالمقابل تحریر کیا ہے تاکہ باآسانی الفاظ و تراکیب کی تبدیلی کا اندازہ لگایا جا سکے

اس مقالے کو پڑھ کر تحقیق کی راہ میں درپیش دشواریوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک شک کو یقین میں تبدیل کرنے کے لیے کن کن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔

○ شمارہ ۴۰ میں "کیمیائے سعادت" کے نسخۂ دہانکی پور پر ابو سعادت جلیلی نے قلم اٹھایا ہے۔ اس نسخے کے بارے میں (نسخے میں موجود) ایک تحریر کی بنا پر ایک طویل مدت تک یہ فرض کیا جاتا رہا کہ یہ نسخہ خود امام غزالی کے خط مبارک کی یادگار ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور امام غزالی کے معاصرین کے طریق املا اور طریق کتابت سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً نسخے کی کتابت کے زمانے میں یعنی پانچویں اور چھٹی صدی ہجری تو کیا، اس کے بعد بھی گاف (گ) کو دو مرکز سے نہیں لکھا جاتا تھا، اس کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ یہ نسخہ بہت بعد کا ہے۔

اس طرح کے پندرہ نکات وہ زیر بحث لاتے ہیں، پھر اس کے بعد "ذال معجمہ اور "دال مہملہ" کے مباحث آتے ہیں۔ اس کے تحت بھی انھوں نے عمدہ طور پر ایسے

نکات پیش کیے ہیں جو اس مخطوطے کی اصلیت جاننے میں مدد کرتے ہیں۔

اس بحث میں انھوں نے خاص طور پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی لسانی تصریحات سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے اس سلسلے میں ایران کے علامہ قزوینی، قاضی عبدالودود مرحوم اور پروفیسر سید حسن سے فیض حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے جب کہ دوران بحث، مقالہ نگار نے پروفیسر نذیر احمد کے افادات بھی پیش کیے ہیں۔

ان سب کی آرا، صاحب مقالہ نے اس مضمون کے آخر میں شامل کی ہیں۔ جس سے ان نسخے کے بارے میں آسانی سے ایک نتیجے پر پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

مقالے کے بعد "نسخۂ خدا بخش کے بارے میں" کے عنوان سے خدا بخش لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین جناب سلیم الدین احمد کا ایک نوٹ ہے جس میں نسخے کے بارے میں بعض کوائف کو صحیح طور پر نقل کیا ہے اور مزید معلومات درج کی ہیں۔

○ جرنل کے شمارہ ۷، ۴ میں ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک مقالہ شامل ہے جو خالص تحقیقی نوعیت کا حامل ہے۔ تحقیق کا موضوع ہے "حیدرآباد کا پرانا نام بھاگ نگر"۔ صاحب مقالہ کے پیش نظر صرف یہی بات تحقیق طلب نہ تھی کہ، آیا حیدرآباد کا پرانا نام بھاگ نگر ہی تھا؟ بلکہ انھوں نے مختلف تاریخی کتابوں اور محققوں کے حوالے سے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ نام کی یہ تبدیلی کب عمل میں آئی۔

ابتداء میں ڈاکٹر صاحب نے ان تمام تاریخی کتابوں کے اقتباسات پیش کیے ہیں جن سے نہ صرف بھاگ نگر سے متعلق واقعے کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ "بھاگ نگر" کے نئے نام "حیدرآباد" کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

اس سلسلے میں انھوں نے فیضی کی "انشای فیضی" نظام الدین بخشی کی "طبقات اکبری"، محمد قاسم فرشتہ کی "تاریخ فرشتہ" عبدالباقی نہاوندی کی "مآثر رحیمی"، خافی خاں کی "منتخب اللباب" اور منشی قادر خاں بیدری کی "تاریخ فرخندہ" سے شواہد اخذ کیے ہیں۔ ان تمام کتابوں میں بھاگ نگر کو موجودہ حیدرآباد کا پرانا نام تسلیم کیا گیا ہے، لیکن سنین کے اختلاف کے ساتھ۔

اس مقالے کا سب سے اہم اور دلچسپ حصہ پروفیسر ہارون خاں شیروانی کے رسالے "بھاگ متی کا افسانہ" سے متعلق ہے۔ اس رسالے میں شیروانی صاحب نے بھاگ متی کے قصے کو جعلی قرار دیتے ہوئے حیدرآباد کے قدیم نام "بھاگ نگر" کی صحت سے بھی

انکار کیا ہے اور اس سلسلے میں "تاریخ فرشتہ" کے مؤلف محمد قاسم فرشتہ کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔

صاحب مقالہ نے نہایت استدلال کے ساتھ پروفیسر شیروانی کے تمام اعتراضات کی نکتہ وار تنقید و تردید کی ہے، یہاں تک کہ انھوں نے فرشتہ پر لگائے جانے والے الزام کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"افسانہ بھاگ متی کے گھڑنے کا الزام محمد قاسم فرشتہ پر لگایا گیا ہے، اس کی تاریخ ۱۰۱۷ ہجری میں لکھی گئی اور اس سے ۱۲ سال قبل فیضی بھاگ متی اور بھاگ نگر کا ذکر کر چکا ہے۔" (۱۱)

فیضی کا بیان چونکہ ایک سفیر کا بیان ہے جو اس نے احمد نگر سے لکھی گئی ایک عرضداشت میں بنام اکبر بادشاہ تحریر کیا تھا، لہذا یہ نہایت مصدّقہ بیان ہے۔

پورے مضمون میں اور بالخصوص پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی تردید کے دوران، ڈاکٹر نذیر احمد کی تحقیقی بصیرت قابل داد ہے۔

○ جرنل کے شمارہ ۴۹ ہی میں جناب ریاض الرحمٰن قدوائی کا ایک ایسا مضمون بھی شامل ہے جو اگر اس جرنل میں شامل نہ ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ ایک ناقص مضمون ہے جس میں صاحب مقالہ نے تین ایسی مثنویوں کا تعلق میر تقی میر کی ذات سے ظاہر کیا ہے جن کا ذکر اس سے قبل کسی اور محقق نے نہیں کیا، گویا میر کے شعری سرمائے میں زبردستی تین مثنویوں کا اضافہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک غیر مناسب بات ہے۔

اس سلسلے میں چند شکوک و شبہات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تیسری مثنوی کے آخر میں کاتب نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ

"تمت بالخیر مثنوی میر تقی بتاریخ سیزدہم اکتوبر ۱۸۳۶ء بعجلت تمام بروز پنج شنبہ۔"

(۱) پہلا شبہہ یہی ذہن میں آتا ہے کہ کیا اس زمانے میں انگریزی مہینے اور سنین کے حوالے سے تاریخ لکھی جاتی تھی۔

(۲) مندرجۂ بالا ترقیمے میں صاف ایک مثنوی کا تعلق (مثنوی میر تقی درج ہے) میر تقی سے ظاہر ہوتا ہے، لہذا مقالہ نگار کا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ "فی الحال تو یہی کہا جا سکتا ہے

کہ یہ تینوں اردو مثنویاں ایک ہی ہاتھ کی تحریر کردہ ہیں، اس لیے میر تقی تینوں مثنویات کے مصنف ٹھہرتے ہیں"۔ محض گمان اور قیاس ہی معلوم ہوتا ہے جس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) مقالہ نگار نے سنین کی مطابقت سے تو بالکل بھی کام نہیں لیا، نہ یہ دیکھا کہ اکتوبر ۱۸۳۶ء میں کون سا ہجری سن تھا، نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس وقت میر تقی میر حیات تھے یا نہیں، نہ ان چند اصحاب کے سن وفات معلوم کرنے کی کوشش کی جو امکاناً تقی نام کے اس دور میں موجود تھے۔

(۴) مقالہ نگار نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ میر تقی میر کی دیگر معلوم و مشہور مثنویوں میں کیسی زبان ملتی ہے اور کیا اسالیب ملتے ہیں اور اس لحاظ سے ان تین مثنویوں کا کیا رنگ ہے۔

(۵) دوسری مثنوی "جشنی نامہ" بظاہر میر کے رنگ سے بالکل جدا ہے۔ "بسم اللہ" کی جگہ "لاحول" لکھنا، یہ رنگ تو رنگین اور انشاء کے دیوان ریختی کا سا ہے۔ میر سے اس قسم کی حرکت کا سرزد ہونا بعید ہے کیونکہ وہ ایک متین و سنجیدہ شخص تھے نہ کہ رنگین و انشاء کی طرح شوخ۔

(۶) مثنوی جس کو "شراب نامہ" کا نام بھی خود مقالہ نگار نے ہی دیا ہے، میر کے مزاج سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔

(۷) آخر میں مقالہ نگار کے اس اختتامی جملے کی تعریف کرنا چاہیے کہ انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ "میری تحقیق میر کے کلام پر بہت زیادہ گہری نہیں ہے"

مزہ تو یہ ہے کہ انھوں نے ایک غلط کام کا آغاز کر دیا، اب قارئین اس کی درستی کے کام کا آغاز کریں۔

مقالے کے اختتام پر جرنل کے ادارے کی طرف سے "قصۂ تاجر" کے میر سے انتساب کو غلط ٹھہرایا ہے اور شبہہ ظاہر کیا ہے کہ یہ بسمل کی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یقین کی حد کو پہنچتی ہے کہ بسمل بطور تخلص استعمال ہوا ہے، ملاحظہ ہو:

اگر تو نے جہاں سے رنج کھینچا
تو بسمل کر یقیں دولت کو پہنچا

اگر "بسمل" کو تخلص کے بجائے عام لفظ تصور کیا جائے تو شعر کا مطلب ہی خبط

ہو جاتا ہے۔

مقالے کے بعد ریاض الرحمن قدوائی نے "مثنوی شراب نامہ" کا عکس بھی پیش کیا ہے اور اس کے بعد "ذخیرۂ ریاض الرحمن قدوائی" کے عنوان سے اس ذخیرے کے فارسی مخطوطات کی فہرست بھی شامل کی ہے، اس کے ذیل میں "قصۂ تاجر"، "جھنگی نامہ" اور "شراب نامہ" کا بھی اندراج ہے اور ان کا مصنف، فہرست نگار نے میر تقی میر کو ٹھہرایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نام میں میر تخلص کا اضافہ فہرست نگار کی زیادتی ہی ہے۔

گوشۂ تحقیقِ منسوبات

کا

دوسرا حصّہ

اس حصّے میں شبلی کے زمانے سے اب تک کے فضلاء اور ان کے
متبعین کے ایسے منتشر اردو مقالات یکجا کیے جاتے ہیں
جو تحقیق منسوبات سے متعلق ہیں۔

توضیحات

ڈاکٹر نذیر احمد:

قدیم متنوں میں تصرّفات و تحریفات کے وجوہ

متنوں میں تصرّفات دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک الحاق کی شکل میں، دوسرے متن کی زبان میں تغیّر، ترمیم و اصلاح۔ اوّل الذکر حالت میں دوسروں کا کلام شامل ہو جاتا ہے اور آخرالذکر صورت میں مصنّف کی زبان میں طرح طرح کی تبدیلیاں دانستہ اور بے دانستہ طور پر عمل میں آتی ہیں۔ محقّق دونوں طرح کے تصرّفات کا تعین کرتا ہے اور متن کو کانٹ چھانٹ کر درست متن متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ متن میں تصرّفات مختلف اسباب کی بنا پر عمل میں آتے ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔

الحاق کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کبھی کبھی مختلف شاعروں کی ایک ہی زمین والی غزلوں اور ان کی متنوں میں خلط ملط ہو جاتا ہے۔ عبدالرحیم خلخالی نے مقدمۂ دیوان حافظ میں ایسی بہت سی ابیات کی نشاندہی کی ہے جو دیوان حافظ کے اس وقت کے دریافت شدہ نسخوں میں سب سے قدیم نسخے (مکتوبہ ۸۲۴ھ) میں شامل ہیں۔ اس طرح کا الحاق صنف غزل میں زیادہ ہوا ہے۔

۲۔ ایک ہی تخلّص کے شاعروں کے کلام میں التباس عام ہے۔ ظہیرفاریابی کے کلّیات میں غزلیات کا تقریباً تمام حصّہ صائب کے ایک شاگرد ظہیر کی تخلیق ہیں۔ جو مصنّف سے تقریباً پانچ سو برس بعد میں ہوا ہے۔

۳۔ قدما کے یہاں تخلّص کا استعمال کم ہوتا تھا۔ اگر کل دیوان، خصوصاً منتخب کا سرورق جس پر شاعر کا تخلّص صراحتاً درج ہوتا تھا، الگ ہو جاتا تو سہل پسندی یا جعل غلط فہمی کا راستہ ہموار کر دیتا۔

۴۔ بیاضوں کے ولہ، منہ، ایضاً جیسی علامتوں کے غلط لگ جانے سے ایک شاعر کا کلام دوسرے کی طرف بآسانی منسوب ہو جاتا۔ کبھی کبھی نسخوں کے اوراق کی بے ترتیبی اور اوراق پر ہندسوں کے نہ ہونے سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۵۔ ایک شاعر جو کسی خاص صنف میں اور کسی مخصوص طرز کے لیے مشہور ہو گیا، تو اس کے مشابہ بہت سی چیزیں جو دوسروں کی ہوتی ہیں، وہ مخصوص شاعر کی طرف منسوب ہو جاتی ہیں۔ فارسی میں رباعیات میں اس طرح کا الحاق بکثرت ہے۔ عمر خیام اور ابوسعید ابوالخیر کا کلام اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

۶۔ منتخب دیوانوں کا مجموعہ بھی بڑا التباس پیدا کرتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ درمیان سے وہ ورق نکل جاتے ہیں جن پر شاعر کا نام درج ہوتا ہے، تو سارا کلام اس سے پہلے شاعر کے نام منسوب ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسا کلام جو کم تخلص آتا ہے۔ قصیدوں اور رباعیوں میں الحاق کی بڑی وجہ یہی ہے۔

۷۔ کبھی کبھی باپ اور بیٹے کے کلام میں سہل انگاری کی بنا پر التباس ہو جاتا ہے۔ اور یہ التباس غلط انتساب کا سبب بن جاتا ہے۔ اس سلسلے کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ لطف اللہ مہندس کا ایک رسالہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ ذخیرۂ سبحان اللہ (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں موجود ہے۔ رسالے کی ابتداء اس طرح ہوتی کہ اما بعد می گوید فقیر لطف اللہ بن استاد احمد معمار الخ۔ لیکن رسالے کے اوپر کسی نے رسالۂ استاد احمد معمار درج کر دیا ہے۔ فہرست نگار نے سہل پسندی میں یہی اطلاع فہرست میں درج کر دی۔ اتفاق یہ ہے کہ استاد احمد (م ۱۰۵۹ھ) معمار تاج کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکا ہے لیکن اب تک اس کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چلایا جا سکا ہے۔ مشہور فہرست نگار اسٹوری کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی مشہور کتاب "پرشین لٹریچر" میں استاد احمد سے متعلق جتنی اطلاعات سامنے آ چکی تھیں۔ ان سب کو اپنی کتاب میں بڑی غیر معمولی قابلیت اور کاوش سے جمع کیا اور جب نسخے کا ذکر آیا تو ذخیرۂ سبحان اللہ کے فہرست نگار کا حوالہ دے کر لکھا DETAIL LACKING۔ غور فرمائیے کہ ایک غلط اطلاع سے نہ جانے کتنی مزید غلط فہمیوں کا دروازہ کھل گیا۔

۸۔ کبھی کبھی کسی خاص مقصد کے ماتحت الحاق عمل میں آتا ہے۔ مثلاً مقدمۂ دیوان حافظ میں مدح رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کے نسخوں میں یہ عبارت بڑھائی گئی ہے۔

"خصوصاً امام المشارق و المغارب، جامع اصناف حقایق و معارف، قایل کلمۂ انا کلام اللہ الناطق، اسد الغالب، علی ابن ابی طالب الخ۔"

اس سلسلے میں مرزا محمد قزوینی لکھتے ہیں

"ولی در ہیچیک از نسخ قدیمہ ہیچ وجہ بہیچ الوجوہ از جملہ مزبور اثری نیست

و بدون شک الحاقی می باشد از متاخرین در عہد صفویہ بقصد این کہ خواجہ را در نظر بعضی مصالح شیعہ قلمداد کنند "۔

۹۔ کبھی کبھی محبوب ہستی کے مرتبے کے پیش نظر بعض دوسری کتابیں ان کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں یوسف زلیخائے فردوسی، بعض مثنویات عطارؒ، دیوان خواجہ معین الدّین چشتی بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

(نقوش لاہور، شمارہ ۹۷ ۱۹۶۴ء)

ڈاکٹر خلیق انجم:

غلط انتسابات کے اسباب و وجوہ

(چند تصریحات مع امثلہ)

[ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب "متنی تنقید" اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں عنوان "متن مستند ہے یا غیر مستند" کے تحت غلط انتسابات کے اسباب و وجوہ پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس بحث کی پہلی تصریح سرقاتِ شعری کے بارے میں ہے، جسے سردست چھوڑتے ہیں۔ باقی تصریحات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں، اور ان کے ساتھ درج کردہ مثالوں کی نشان دہی بھی اشارۃً کی جاتی ہے۔ تفصیلی بحث کو کتاب مذکور میں صفحات ۱۱۱ تا ۱۲۵ دیکھا جاسکتا ہے۔ نجم الاسلام]

۱۔ پبلشر کی غلطی:

کبھی پبلشر کی غلطی سے بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مصنّف کی کتاب پر دوسرے مصنّف کا نام آجاتا ہے۔

مثالیں:- ● "کہانی رانی کیتکی کی" شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے دوسرے ایڈیشن پر غلطی سے مُرتّب مولانا امتیاز علی عرشی کے بجائے مولوی عبدالحق کا نام چھپ گیا ہے۔ ● اسی طرح، خطوطِ غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد، شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند کے دوسرے ایڈیشن پر، جس کی نظرِثانی مالک رام نے کی تھی، مُرتّب کی حیثیت سے بھی مالک رام کا نام ہے۔

۲۔ مُصنّفین کے ناموں کی مماثلت:

اگر ایک ہی نام کے دو مُصنّف ہوں تو اس کا امکان رہتا ہے کہ ایک مُصنّف کی کتاب دوسرے مُصنّف سے منسوب کر دی جائے۔ عام طور پر اُس مُصنّف سے زیادہ منسوب کیا جاتا ہے جو نسبتاً زیادہ مشہور ہو۔

مثالیں :۔ (الف) ایک ہی تخلّص کے دو شاعروں کا کلام ایک دوسرے سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ ● غالب نے ۔ اسد " تخلص ترک ہی اس لیے کیا تھا کہ ان کے ایک ہم عصر شاعر اسد کی غزل ان سے منسوب کر دی گئی تھی۔ ● محسن ... نے کسی اور یقین کے شعر (پڑتا ہے پاؤں اس بت کافر کے بار بار ....) کو انعام اللہ خاں یقین کا لکھ دیا ہے۔

(ب) پوری تصنیف کسی اور ہم نام مصنف سے منسوب ہوگئی ہے ۔ مثلاً ● دیوان معین الدّین فراہی منسوب بہ خواجہ معین الدّین اجمیری ● دیوان محی منسوب بہ حضرت غوث الاعظم ملقّب بہ محی الدین ● محی لاری کی مثنوی فتوح الحرمین منسوب بہ حضرت غوث الاعظم محی الدّین ● دیوان مخفی رشتی منسوب بہ زیب النساء بیگم مخفی ● ضیاء الدین خسرو کی حفظ اللسان منسوب بہ امیر خسرو

۳۔ مذہبی اختلاف :

مذہبی اختلاف کی وجہ سے بعض مشہور لوگوں کے نام سے کچھ کتابیں تصنیف کی گئی ہیں ۔ اس کی سب سے اچھی مثال فرید الدّین عطّار سے منسوب "مظہر العجائب" ہے ... اس کتاب کا اصل مُصنّف کوئی اور شخص تھا ۔ جس کا مقصد عطّار کو شیعہ ثابت کرنا اور شیعہ مذہب کو تقویت پہنچانا تھا۔

۴۔ عوام کی عقیدت :

بعض لوگوں سے ، اور خاص طور سے مذہبی رہنماؤں سے عوام کو اتنی عقیدت ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ کم معروف یا غیر معروف مُصنّفین کی تصنیفات اُن سے منسوب کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی انتساب کا یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہتا ہے۔

مثال :۔ ابو سعید ابوالخیرؒ (م ۴۴۰ھ) انھی بزرگوں میں ہیں جن سے مختلف شاعروں کی رباعیاں منسوب کر دی گئی ہیں۔

۵۔ مُصنّف کی شہرت کا ناجائز فائدہ :

بعض لوگ خود کچھ نثر ، یا نظم تصنیف کر کے مشہور مُصنّفین کے نام سے شائع کرتے ہیں ۔ ایسا کرنے سے ان کا مقصد بحیثیت محقق شہرت حاصل کرنا ہے ۔ کسی مشہور مُصنّف

کی کوئی غیر مطبوعہ تصنیف مُرتّب کر کے شائع کرنا ایک ادبی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس میں جعل سازی کا امکان رہتا ہے۔

مثال :- "نادر خطوطِ غالب" مُرتّبہ سیّد محمد اسماعیل رسا ہمدانی، شائع کردہ کا شانۂ ادب، لکھنؤ، ۱۹۴۹ء۔ اس کے ۲۰ خطوں میں سے صرف سب سے آخری خط اصلی ہے۔ باقی سب جعلی ہیں جنھیں خود مُرتّب نے تصنیف کیا ہے۔

۶۔ بعض اوقات مُصنّف اپنا نام چھپا لیتا ہے:

ایسا عام طور پر ادبی معرکوں میں ہوتا ہے۔

• مثال :- ایک ہجویہ قصیدے کا مطلع ہے:

کیا حضرتِ سودا نے کی اے مصحفی تقصیر — کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

یہ قصیدہ کلیّاتِ سودا میں موجود ہے۔ لیکن اصل مُصنّف کا نام کہیں نہیں ملتا۔ قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ یہ قصیدہ مرزا احسن کی تصنیف ہے جو سودا کے شاگرد تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس قصیدے کا مُصنّف کوئی ایک شاعر نہیں تھا بلکہ یہ امکان زیادہ ہے کہ اس کے مُصنّف فخرالدّین ماہر، محمد رضا اور مرزا احسن تینوں ہوں۔

۷۔ کبھی مُصنّف خود کسی اور کے نام سے لکھتا ہے:

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی مشہور مُصنّف اپنے کسی ہم عصر کے نام سے لکھتا ہے۔ اگرچہ ایسا کرنے میں دوسری مصلحتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن عام طور پر مالی مصلحت کار فرما ہوتی ہے۔

مثالیں :- بعض مشہور شاعر اپنا کلام فروخت کیا کرتے تھے۔ (مصحفی کے متعلق محمد حسین آزاد کی روایت)۔ مہربان خاں رند، نواب فرخ آباد کے دیوان تھے۔ ان کے دیوان میں تمام میر سوز کی غزلیں ہیں۔ غالباً میر سوز نے رند کو غزلیں کہہ کر دی تھیں۔ لیکن جب ان سے علیحدگی اختیار کرلی تو وہ تمام غزلیں اپنے دیوان میں شامل کرلیں۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ظفر کا بیشتر کلام ذوق کا کہا ہوا ہے۔

دوسرا محرک ادبی معرکہ ہوتا ہے۔ عام طور پر مشہور شاعر اپنے شاگرد کے نام سے اپنے حریف کی ہجو یا ادبی معرکے سے متعلق کوئی تصنیف لکھتا ہے۔ اس سے دو مقصد ہوتے ہیں۔

ایک تو شاگرد کے نام سے اپنی تعریف اور دوسرے حریف کی باتوں کا جواب ● قاطع برہان کے ادبی معرکے میں غالب نے اپنے شاگرد میاں داد خاں سیّاح کے نام سے لطائف غیبی لکھی تھی۔

۸۔ جعلی نسخے:

بعض لوگوں کے لیے نایاب کتابیں جمع کرنا ایک دل چسپ مشغلہ ہوتا ہے۔ اس لیے قلمی یا نایاب مطبوعہ کتابوں کی مانگ ہمیشہ بہت زیادہ رہی ہے۔ لوگوں کے اسی شوق سے فائدہ اٹھا کر پرانی کتابوں کے کاروبار کرنے والوں نے طرح طرح کی جعل سازیاں کی ہیں۔

یہاں میں چشتیہ سلسلے کی کچھ کتابوں کا ذکر کروں گا۔ اس سلسلے کی صرف ایک کتاب فوائد الفواد ہے۔ جو ہر طرح کے شک و شبہ سے بالا تر ہے۔ یہ شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں جو ان کے مرید امیر حسن سجزی نے ۷۰۷ھ اور ۷۲۱ھ کے درمیان لکھے ہیں۔ امیر حسن لکھتے ہیں کہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی ... آگے چل کر امیر حسن لکھتے ہیں کہ "شیخ نظام الدین نے کہا " نہ میں نے کوئی کتاب لکھی " نہ شیخ الاسلام فرید الدّین نے " نہ شیخ الاسلام قطب الدّین نے " نہ خواجگان میں سے کسی نے اور نہ میرے سلسلے کے پہلے کسی بزرگ نے۔"

ان اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ چشتیہ سلسلے کے کسی بزرگ نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن اس سلسلے سے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں ہندوستان میں ملتی ہیں

۱۔ انیس الارواح۔ منسوب بہ شیخ معین الدّین اجمیری
۲۔ دلیل العارفین۔ منسوب بہ شیخ قطب الدّین بختیار کاکی
۳۔ اسرار الاولیاء۔ منسوب بہ مولانا بدر اسحق
۴۔ راحت القلوب۔ منسوب بہ شیخ نظام الدّین اولیاء
۵۔ افضل الفوائد۔ منسوب بہ امیر خسرو
۶۔ مفتاح العاشقین۔ منسوب بہ شیخ محب اللہ
۷۔ دیوان قطب الدّین بختیار کاکی
۸۔ تذکرۃ الاولیاء۔ منسوب بہ شیخ فرید الدّین عطّار

پروفیسر محمد حبیب نے ثابت کیا ہے کہ یہ تمام کتابیں جعلی ہیں۔

[Muhammad Habib: "Chishti Mystics, Record of the Sultanate Period", Medieval India Quarterly, Aligarh, Oct, 1950, pp 12 - 30]

ان میں سے کسی کتاب کا چشتیہ سلسلے کے بزرگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے کا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہیں۔ کتابوں کا کاروبار کرنے والوں نے معمولی صلاحیتوں کے لوگوں سے یہ کتابیں لکھوائی ہیں۔

[ڈاکٹر خلیق انجم نے آخر میں ایک مثال جعل سازی کے ایک ایسے واقعے کی بھی درج کی ہے جو انگریزی ادب سے تعلق رکھتا ہے اور لندن میں ہوا تھا، اور تفصیلاً بتایا ہے کہ کس طرح یہ جعل سازی پکڑی گئی۔]

ڈاکٹر گیان چند :

الحاق اور غلط انتساب

(تدوین متن کے حوالے سے چند تصریحات)

مشمولات متن کی تحقیق :

تدوین میں ایک اہم تحقیقی پہلو یہ ہوتا ہے کہ مشمولات جامع و مانع ہوں ۔ جامع سے یہ مراد ہے کہ مصنف کی کوئی تخلیق یا زیر تدوین کتاب کا کوئی جزو شامل ہونے سے نہ رہ جائے مثلاً اگر کسی مصنف کا کلیات زیر تدوین ہے تو مختلف ذرائع سے لے کر اس کی جملہ تخلیقات کو شامل کیا جائے۔ کوئی تذکرہ یا دیوان یا مجموعۂ مراثی زیر تدوین ہو تو اس کے تمام تخلیقات کو شامل کیا جائے ۔ کوئی تذکرہ یا دیوان یا مجموعۂ مراثی زیر تدوین ہو تو اس کے تمام حصے جمع کر دیے جائیں ۔ مانع سے یہ مراد ہے کہ کوئی بھی ایسا جزو شامل نہ ہونے پائے جو اس مصنف کی تخلیق نہ ہو .... یعنی نہ حذف ہو نہ الحاق ۔ (ص ۴۴۰)

کلام کے مجموعوں میں الحاق و حذف دونوں کا اندیشہ رہتا ہے ، حذف کا زیادہ الحاق کا کم ۔ الحاق یعنی دوسرے کی تخلیق کو شامل کر دینا تحقیقی اعتبار سے بڑی تقصیر ہے۔

دور قدیم سے مصنفوں کے جو دیوان ، کلیات اور دوسرے عبدالودود نے اپنے مضامین میں اور ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر تنویر علوی نے اپنی کتابوں میں انگریزی ، فارسی اور اردو کے الحاقات کی دلچسپ تفصیل دی ہے۔ فارسی کے الحاقات کو (مثلاً شاہنامے میں گر شاسپ نامے کا شمول ، دیوان انوری یا کلیات ظہیر فاریابی وغیرہ میں الحاق) نظر انداز کر دیا جائے ، اور بات اردو تک محدود رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ کلیات سودا میں بکثرت الحاق ہے ، میر کے نام سے دوسروں کے قطعات ، غزلیں اور اشعار منسوب ہوگئے ہیں مثلاً کیا بود و باش ... والا قطعہ ، " چشم پر آب ہیں دونوں" والی غزل ، " شکست و فتح " والا شعر۔

غلط انتساب :

بیاضوں، قواعدوں اور لغات میں سند کے اشعار میں غلط انتساب بہت عام ہے کیوں کہ وہاں تحقیقی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی ۔ دقت یہ ہے کہ مجموعے کو جامع بنانے کی کوشش کی جائے تو اس میں الحاق کا اندیشہ ہوجاتا ہے ۔ کلیات میر یا کلیات سودا کے مختلف نسخے دیکھیے ۔ اگر کسی میں کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جو دوسرے کسی نسخے میں نہیں تو اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے ؟ کیا اسے نئی دریافت مان کر شامل کیا جائے یا شک کی نظر سے دیکھ کر نظر انداز کر دیا جائے ۔ میں نے انجمن ترقی اردو ہند کے ایک مخطوطے " مثنویات میر " میں ایک مثنوی جوان و عروس تلاش کی ۔ اسی طرح کلیات میر کے ایک نسخہ مخزونہ رام پور میں ایک مثنوی مورنامہ ہاتھ آئی ۔ بعد میں ڈاکٹر اعجاز حسین کے پاس کلیات میر کا حیات میر کا ایک مخطوطہ ملا اس میں یہ دونوں مثنویاں شامل تھیں ۔ سالار جنگ لائبریری حیدر آباد میں کلیات سودا کے ایک نسخے میں ۱۲ شعروں کی " بھنگی کی حکایت " ہے جو میرے علم کی حد تک کسی دوسرے نسخے میں نہ تھی ۔ اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا ۔ ایسے مقامات پر دھوکا کھانے کا خاصا اندیشہ رہتا ہے ۔

نسخۂ عرشی کے جزو " یادگار نالہ " میں بہت سی چیزیں ، بعض بیاضوں مثلاً بیاض علائی سے لی ہیں ۔ اگر متفرق مآخذ کی مختلف چیزوں سے یک قلم انکار کر دیا جائے تو مجموعے کی جامعیت کا در بند ہوجائے گا ۔ اگر آنکھ موند کر سب کچھ قبول کرلیا جائے تو الحاقی چیزیں در آجائیں گی مثلاً کسی رسالے میں لاہور کے کسی منشی پریم چند کی کہانی چھپی ۔ حال میں بعض لوگوں نے اسے مشہور مصنف پریم چند کی سمجھ لیا ۔

نو دریافت چیزوں کی اصالت :

نو دریافت چیزوں کی اصلیت طے کرنے کے لیے داخلی اور خارجی دونوں شہادتوں پر توجہ کیجیے ۔ خارجی شہادت یہ ہے کہ اسے کس شخص نے دریافت کیا ہے ، کس ذخیرے سے ملی ہے اور کس مجموعے یا رسالے میں پائی گئی ۔ ان سب کا پایۂ اعتبار طے کیجیے ۔ اگر اس کو شامل کرنے والا مخطوطہ (مثلاً کلیات یا دیوان) عام طور پر معتبر ہے ، قدیم ہے ، اس میں دوسری تمام چیزیں اسی شاعر یا نثر نگار کی ہیں تو بڑی حد تک امکان ہے کہ وہ اسی تخلیق کار کی ہو ۔ داخلی شہادت اس کا موضوع ، اس کا اسلوب ، لفظیات ، دروبست اور ادبی روایت ہیں ۔

انھیں دیکھ کر فیصلہ کیجیے کہ کیا یہ اس مصنّف کی دوسری تخلیقات سے ہم آہنگ ہیں۔ ان تمام شہادتوں کو دیکھ کر مدون اپنے تجربے اور نظر کے سہارے کچھ فیصلہ کرے گا۔

صفدر مرزا پوری نے ۱۹۲۳ء میں ایک مجموعہ "نیچرل شاعری" کے نام سے شائع کیا۔ اس میں اقبال کی کئی نظمیں شامل ہیں ان میں دو ایسی ہیں جو اور کہیں نہیں ملتیں، "گل خزاں دیدہ" اور "عیش جوانی"۔ گل خزاں دیدہ کا موضوع تو اقبال کا پسندیدہ مضمون ہے لیکن عیش جوانی ایسی جنس زدہ نظم ہے جسے اقبال سے منسوب کرتے ہوئے تأمل ہوتا ہے لیکن یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوئی اور مجھے کوئی علم نہیں کہ اقبال نے کہیں اس کی تردید کی ہو۔ دوسری طرف مجھے اقبال کا ایک مخطوطہ "کلام اقبال" انور خاں طالب علم جامعۂ ملّیہ اسلامیہ ۱۹۲۳ء کا ملا۔ اس میں دو نظمیں "قطرۂ اشک" اور "عورت" ہیں۔ مأخذ درج نہیں۔ قطرہ اشک ہر طرح سے اقبال کی ہو سکتی ہے۔ عورت کا موضوع بالکل وہی ہے جو ان کی نظم "محبت" کا ہے لیکن اس میں فنّی خامیاں ہیں۔ بیاض معتبر ہے۔ اس نے کہیں دھوکا نہیں دیا۔ پھر بھی نظم "عورت" کے بارے میں پورے یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

انتحال:

الحاق ہی سے ملتا جلتا مسئلہ انتحال کا ہے۔ انتحال کے معنی غلط نسبت کے ہیں۔ یہ اصطلاح ان صورتوں میں استعمال ہوتی ہے جہاں کوئی سارق کسی دوسرے کی تخلیق کو اپنا مال بنا کر پیش کرتا ہے۔ مثلاً انجمن ترقی اردو ہند میں غلام حسین بخشی کی قلمی مثنوی معدن یاقوت (۱۲۲۱ھ) ہے۔ اس کو قدرے مختصر کر کے محمد ناصر خاں رام پوری نے نسخۂ یاقوت (۱۲۳۳ھ) نام دے کر اپنی تصنیف بنالیا۔ یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری میں ہے۔ محمد عبداللہ عطا ساکن چرکھاری نے اقبال کی نظم نیا شوالہ (۱۹۰۵ء) کو رسالۂ شاہد سخن حیدرآباد، دسمبر ۱۹۱۳ء میں اپنا مال بنا کر شائع کر دیا ہے۔ ان چوریوں کی شناخت کا کوئی اصول نہیں۔ محقق کا مطالعہ اور علمی تجربہ ہی اس کی رہنمائی کرے گا۔

جعل:

اس کے مقابلے میں وہ جعل ہیں، جن میں کوئی خود تصنیف کر کے دوسرے کے نام سے شائع کر دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو میرا مضمون "کچھ جعلی کتابوں کے بارے میں" ہماری زبان

۲۲۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء۔ اس قسم کی کچھ مثالیں یہ ہیں۔

۱۔ محمد حسین آزاد نے بہت سی غزلیں اور قصیدے تصنیف کر کے دیوان ذوق میں شامل کر دیے۔

۲۔ صراط مستقیم عرف سیدھا راستہ تمنا عمادی مجیبی پھلواروی نے تصنیف کر کے عماد الدین قلندر پھلواری سے منسوب کر دی۔

۳۔ عبدالباری آسی نے ۲۶ غزلیں تصنیف کر کے غالب کے نام سے چلا دیں۔

۴۔ محمد اسمٰعیل رسا گیاوی نے "نادر خطوط غالب" کے نام سے غالب کے کچھ خطوط تصنیف کر دیے۔

۵۔ شرافت نوشاہی نے حاجی نوشہ متوفی ۱۰۶۴ھ سے منسوب کر کے دو کتابیں مثنوی گنج الاسرار اور انتخاب گنج شریف وضع کر دیں۔

ایسی چیزوں کی تفصیلی اور جزئیاتی پرکھ کی ضرورت ہے۔ تبھی ان کے وضعی ہونے کا سراغ مل سکتا ہے۔ جعل ساز جتنا عالم ہوگا، جعل کے پوشیدہ رہنے کا اتنا ہی زیادہ امکان ہوگا۔ بعض لوگوں نے ۱۹۶۹ء میں دریافت شدہ دیوانِ غالب بخطِ غالب پر بھی جعل کا الزام لگایا ہے لیکن اس کی فرسودگی اور مختلف نسخ کو دیکھ کر یقین ہوجاتا ہے کہ آج ملک میں ایسا کوئی عالم شاعر نہیں جو اس قسم کی قدیمی روایت تصنیف کر سکتا۔

التباس:

متون کی تدوین میں ایک اور اندیشہ ہوتا ہے کہ مخطوطے کے اوراق آگے پیچھے نہ ہوگئے ہوں یا ایک جلد میں مجلد دو کتابوں کو (جن میں سے پہلی ناقص الآخر اور دوسری ناقص الاول ہو) ایک ہی کتاب نہ سمجھ لیا جائے جو مخطوطے ابتداء یا آخر میں ناقص ہوتے ہیں ان میں مصنف اور کتاب کے التباس کا بہت اندیشہ رہتا ہے کچھ مثالیں

الف۔ ایک ہی مصنف کی تخلیق میں بے ربطی:

۱۔ ہندی کے شاعر ملّا داؤد کی چندرین ناپید سمجھی جاتی تھی۔ اس کے اوراق کم از کم چار جگہوں سے ملے جنھیں دو مدوّنوں نے مرتب کیا۔ ڈاکٹر پرکاش مونس لکھتے ہیں۔

"چندرین کے مختلف اوراق مختلف جگہوں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان پر نمبر صفحات پڑے ہوئے نہیں ہیں اور اکثر میں ترک بھی غائب ہے۔ ان اوراق کو مختلف

محققوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ترتیب دیا ہے ۔ اس طرح چندرین نامی جو کتاب مرتب ہوتی ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ زنجیر کی بعض کڑیاں غلط جگہ جڑی ہوتی ہیں اور بعض سرے سے غائب ہیں۔ قصّے میں بعض جگہ تسلسل بھی باقی نہیں ہے (اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر ۔ ص ۲۳۵)

۲۔ دکنی صوفیہ کے بعض رسالوں کے درمیانی اوراق غائب ہوتے ہیں ۔ بعض جگہ جلد بندی میں صفحات کی غلط تقدیم و تاخیر ہوجاتی ہے ۔

۳۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کو میر فضل رسول کے لیے لکھا ہوا فسانۂ عجائب کا مخطوطہ ملا۔ میں نے اس کا عکس دیکھا۔ اس میں کسی نے مسلسل اوراق کے نمبر ڈال دیے ہیں لیکن ایک جگہ دو اوراق کی تقدیم و تاخیر الٹی ہے ۔ دو ایک جگہ ایک ایک ورق کم ہے ۔

۴۔ لکھنؤ کے مرثیہ گویوں کا عام طریقہ تھا کہ مجلس میں مرثیہ پڑھتے وقت اپنے ایک مرثیے کے بندوں میں حسب منشا انتخاب کرتے تھے دو مرثیوں کو ملا کر پسندیدہ بند پڑھ دیتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی مرثیے کے مختلف نسخوں میں اختلاف ملتا ہے اور بعض اوقات مطلع کے فرق کی وجہ سے کسی مطبوعہ مرثیے کو غیر مطبوعہ سمجھ لیا جاتا ہے ۔

۵۔ حیدرآباد کے عبدالصمد خاں نے عماد الملک کے ذخیرے سے کلام اقبال کا ایک مخطوطہ خریدا ۔ اس میں ایک جگہ ایک جزو علیحدہ سے رکھا ہے ۔ اس میں اقبال ہی کی نظمیں ہیں ۔ اسی کاتب کے قلم کے معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا تعلق کس مقام سے ہے واضح نہیں ہوتا۔ اس فاضل جزو کے آخر میں ایک نظم نامکمل رہ گئی ہے ۔ (ہندی ادب کا اثر ۔ ص ۲۳۵)

ب۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مختلف مصنفوں کی کتابوں میں خلط ہو جائے۔ مثالیں :

۱۔ اسپرنگر کو ایک نسخہ ملا جس میں پہلے محبوب عالم کی مثنوی محشر نامہ تھی بعد میں عبدی کی فقہ ہندی ۔ اس نے دونوں کو محبوب عالم سے منسوب کر دیا۔

۲۔ سروری صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی کے مخطوطات کی فہرست میں شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے ایک رسالے کا ذکر کیا جو ان کے مطابق نثر و نظم دونوں پر مشتمل ہے ۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے تصحیح کی کہ یہ دراصل تین کتابوں پر مشتمل ہے ۔ شروع میں ایک ناقص الاول نثری نسخہ ہے ۔ اس کے بعد دو مختلف شعرا کی دو مثنویاں ہیں ۔

۳۔ بنگلور یونیورسٹی کے ڈاکٹر نورالدین سعید نے انڈیا آفس لندن سے ایک اردو مثنوی شکار نامہ کا عکس حاصل کیا۔ اس میں شکار نامے کی دو دکنی مثنویوں کو ملا دیا گیا ہے ۔ پہلا

مثنوی کسی نا معلوم شاعر کی تصنیف ہے، دوسری میراں جی شمس العشاق سے منسوب ہے۔ دونوں ناقص ہیں۔ دونوں کی بحر مختلف ہے لیکن دونوں اس طرح ایک سلسلے میں لکھی ہیں گویا ایک شاعر کی ایک مثنوی ہو۔ (ص ۳۳۱ تا ۳۳۶)

("تحقیق کا فن" ص ۳۳۰ تا ۳۳۶)

ڈاکٹر نذیر احمد :

غلط انتسابات سے متعلق محمود شیرانی کی تحقیقات

۰[ڈاکٹر نذیر احمد نے، جو تحقیقِ منسوبات کے میدان میں خود بھی ایک بڑا درجہ رکھتے ہیں، اپنے ایک مقالے " فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کی تحقیقات" (رسالۂ اردو، کراچی بابت اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۰ء) میں غلط انتسابات کی تحقیق سے متعلق شیرانی کے کام پر عمدہ تصریحات پیش کی ہیں، جنھیں ذیل میں اقتباس کیا جاتا ہے۔ نجم الاسلام]

○ محمود شیرانی نے ادبی دنیا میں اوہام و مفروضات کے پچاسوں بت توڑے ہیں۔ فردوسی کی طرف یوسف زلیخا کا انتساب، فردوسی کی ہجوِ محمود، فارسی دیوان کا حضرت شیخ معین الدین چشتی کی طرف انتساب، پرتھی راج راسا منسوب بہ چند بردائی، امیر خسرو کی طرف منسوب خالق باری وغیرہ موضوعات پر انھوں نے جیسی دقیق نظری سے بحث کی ہے اور جعلی انتساب کا پردہ چاک کیا ہے، وہ تحقیقی دنیا کے شاہکار ہیں۔ (ص ۳۲)

○ (داستان بیژن پر مُفصّل اور محققانہ و عالمانہ بحث کے بعد) حافظ شیرانی صاحب کا دوسرا اہم کارنامہ فردوسی کی طرف منسوب ہجویہ اشعار کی تنقیح و تردید ہے، اور اس سلسلے میں انھوں نے جو دادِ تحقیق دی ہے) وہ ہر طرح کی ستائش سے مُستغنی ہے۔ پہلے اشعارِ ہجو میں ہر شعر کی اصل سے بحث کی گئی ہے اور یہ پتا چلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا مأخذ کیا ہے۔ اس بحث کے سلسلے میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہجو کے اکثر اشعار مصنوعی اور جعلی ہیں۔ کچھ اشعار شاہنامے میں دوسرے مواقع پر لکھے گئے تھے۔ ان کو ایک تسلسل میں پیش کر کے ہجو کی روایت کی توثیق کی گئی ہے، کچھ اشعار دیگر اساتذہ سے لیے گئے ہیں۔ کچھ اشعار ایسے ہیں جن کی اصلیت واضح نہیں ہو سکی ہے۔ ہجو کی روایت جب تراشی گئی تو چند ہی شعر ہجویہ متعین ہوئے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ (۳۶، ۳۷)

○ پروفیسر شیرانی نے ہجو کے اشعار پر جو مُفصّل بحث کی ہے، وہ کتاب کے کم و بیش

سو صفحات کو حاوی ہے ۔ اس میں جو اصول مدِّنظر رکھے گئے ، اس کے بنیاد پر اس مقالے کو تحقیق ادبی کا شاہکار سمجھنا چاہیے ۔ اسی لیے تو ایرج افشار جیسے جہاں گرد اور جہاں دیدہ محقق نے بھی شیرانی کے فردوسی سے متعلق پانسو صفحات پر مشتمل مواد کو اس طرح نظر انداز کیا ہے کہ سوائے ان کے اس چھوٹے سے مقالے کے جو مقدمۂ شاہنامۂ قدیم سے متعلق ہے ۔ "کتاب شناسی فردوسی" میں کسی کا ذکر نہیں ۔ (ص ۴۷، ۴۸)

○ شاہنامے کے تعلق سے شیرانی صاحب کا سب سے معرکۃ الآرا کارنامہ یوسف زلیخا کے فردوسی کی طرف انتساب کا بطلان ہے ۔ شیرانی صاحب نے آج (۱۹۸۰ء) سے ۵۸ سال قبل، رسالۂ اردو ، اپریل ۱۹۲۲ء میں شائع کیا ۔ یوسف زلیخا کی نسبت فردوسی کی طرف ایک ایسی مُسلّم حقیقت بن چکی تھی جو ہر قسم کے شبہے سے پاک سمجھی جاتی تھی ۔ مغرب کے فضلاء کی تحقیق نے اس پر ایسی مُہرِ اثبات ثبت کر رکھی تھی کہ اس بارے میں کسی کو شک کرنے کا موقع نہ تھا ۔ یورپی محققین میں اتھے، نولدیکے، پروفیسر براؤن وغیرہ نے واضح طور پر اس مثنوی کو فردوسی کی تصنیف قرار دیا ہے ۔ چنانچہ اوّل الذکر کے مقدّمے کے ساتھ یہ کتاب ۱۹۰۸ء میں آکسفورڈ (انگلستان) سے شائع ہو چکی ہے ۔ متاخر تذکرہ نویسوں نے بھی ان کا انتساب فردوسی کی طرف کیا ہے ۔ دورِ جدید کے مشرقی فضلاء کی بھی یہی رائے تھی ۔ ایسی مسلّمہ بات کے خلاف قلم اٹھانا ایسا جرأت مندانہ اقدام ہے کہ اس کی مثالیں فارسی ادبی تاریخ میں شاذ ہیں۔ ... جدید دور کے اکثر نقاد مثنوی یوسف زلیخا کو فردوسی کی تصنیف نہیں مانتے لیکن یہ ادھر چند سالوں کی بات ہے ۔ یہ آواز سب سے پہلے ہندوستان میں شیرانی نے اٹھائی اور اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسے محکم دلائل پیش کیے کہ آج تک ان پر کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوسکا ہے۔ (ص ۵۲، ۵۳)

○ مثال کے طور پر میں داخلی شہادت کو لیتا ہوں ۔ شیرانی صاحب نے شہادتِ کلام کے تحت حسب ذیل ، ذیلی عنوان قائم کیے ہیں :

> اسالیبِ خصوصی ، افعالِ متعدی بیک مفعول، اسالیبِ مقامی ، اسالیبِ آیا ہی ، ادائے مطلب ، توصیفات ، عربیت، عربی الفاظ کی تراکیب ، عربی فارسی الفاظ کی ترکیب ، اضافت کا استعمال ، فارسی حروف کے ساتھ عربی الفاظ کا استعمال۔

ان عنوانات کے تحت ، یوسف زلیخا اور شاہنامے کے کوئی سو اشعار پیش کر کے

دونوں کے فرق کو نمایاں کیا ہے۔ اور یہ دل چسپ اور ٹھوس بحث جو قدم قدم پر امثلہ سے موشح کی گئی ہے۔ تقریباً سو صفحات کو حاوی ہے۔ ان کے عالمانہ اور محققانہ مباحث کے سامنے سارے ایرانی ناقدین کی تحریریں پھُس پھُسی اور بے وقعت نظر آتی ہیں۔ (۵۴۰۵۳)

○ دیوانِ مجعولِ رودکی:

رودکی کی شاعری پر بحث کے دوران شعر العجم شبلی میں رودکی کے نام سے قطران تبریزی کے کچھ اشعار درج ہوگئے۔ کچھ اشعار تو رودکی کے ہیں لیکن زیادہ منظومات، قطران کے ہیں ... دراصل دیوانِ رودکی کے نام سے ایک دیوان متعدد قلمی نسخوں کی شکل میں مختلف کتاب خانوں میں پایا جاتا تھا، جس میں کچھ اشعار رودکی کے اور بقیہ قطران تبریزی کے منظومات شامل تھے ...

دورِ جدید میں مشرق و مغرب کے تمام محققین میں سب سے پہلے پروفیسر شیرانی نے (تنقید شعر العجم میں) رودکی کی طرف قطران کے منظومات کے انتساب کا مسئلہ چھیڑا اور کامیابی کے ساتھ اس کا حل پیش کیا۔ ان کے بعد ڈینی سن راس نے صراحتہً دیوانِ رودکی کے جعل پر بحث کی ("Rudaki & Pseudo-Rudaki" رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل، اکتوبر ۱۹۲۳ء)۔ اس کے کئی سال بعد پروفیسر نفیسی کی تحقیقات سامنے آئی۔ اور اب یہ طے ہوچکا ہے کہ متداول دیوان کا رودکی کی طرف انتساب غلط ہے۔ شیرانی صاحب نے اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے تھے

> "یہ دیوانِ رودکی، رودکی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، اگرچہ ایک قصیدہ اور بعض قطعات رودکی کے بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کا نام اگر دیوان قطران تبریزی ہوتا تو موزوں تھا۔" (تنقید شعر العجم: ص ۲۸۔ ۲۹)

○ دو اسدی:

دو اسدیوں کا نظریہ (اسدی کلاں اور اسدی خرد) دولت شاہ سمرقندی کے غلط بیان کی وجہ سے وجود میں آیا، چنانچہ اتھے اور براؤن وغیرہ یورپی نقّادوں نے اس پر اعتماد کر کے اس نظریے کو کافی آگے بڑھایا ... شیرانی صاحب کو دو اسدی کے نظریے پر بنیادی طور پر شک تھا۔ لیکن دو باتوں کی وجہ سے وہ اس کے قائل ہوگئے تھے، اوّل یورپی محققین کی تحقیق کا نتیجہ، دوّم نظامی کا شعر۔ لیکن نظامی کی بیت (اسدی را کہ جود او بنواخت ...) میں "جوداو" کی

جگہ "بودلف" ہے، اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسدی والی بیت کا تعلق محمود والی بیت سے نہیں ہے۔ اس بنا پر اسدی کو محمود سے منسوب نہیں قرار دینا چاہئے۔ ... خلاصہ یہ کہ دو اسدی کے نظریے میں شیرانی صاحب سے چوک ہوگئی۔ لیکن جیسا کہ ذکر ہوچکا ہے، یہ چوک ایسی نہیں جو بے بنیاد ہو۔ بہرحال جدید نظریہ یہی ہے کہ اسدی ایک ہی ہے۔ اس کا تعلق فردوسی سے استاد شاگرد کا نہ تھا۔ وہی قصائد مناظرہ کا مُصنّف ہے۔ اُسی نے گرشاسپ نامہ لکھا، اور اُسی کے قلم سے لُغت فرس نکلا جو فارسی کا سب سے پہلا مکشوف لُغت ہے۔ اُسی اسدی کے قلم کی یادگار دنیا میں محفوظ مفردات طب کی پہلی فارسی کتاب "الابنیہ عن حقائق الادویہ" ہے۔ (ص ۶۶ تا ۶۸)

○ دیوانِ انوری میں الحاق:

پروفیسر شیرانی کا نہایت شاندار تحقیقی کارنامہ دیوان انوری کی رو سے التمش کے دور کے ایک شاعر تاج ریزہ دہلوی کے قصائد کا تعیّن ہے۔ ان کی تحقیق سے ایک شاعر کے مفقود کلام کی بازیافت ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ دو شاعروں کے کلام کے گڈمڈ ہوجانے پر ان کی شناخت اور ایک دوسرے سے الگ کرنے کے کیا اصول ہوسکتے ہیں۔ میرے خیال میں متنی تحقیق کا یہ شاہکار ہے، اس لیے کہ دو شاعروں کے ملے جلے منظومات میں بغیر کسی واضح قرائن اور سابقے کے، دونوں کے کلام کا جدا جدا تعین ایک علمی دریافت کے مترادف ہے۔ (ص ۷۱)

○ عطّار نیشاپوری کی طرف منسوب کتابیں:

عطّار کے مختلف حالات زندگی اور شاعری پر تبصرے کے بعد، شیرانی صاحب عطّار کے کلام کی تعیین کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مختلف منابع سے ان کی طرف منسوب جن کتابوں کی فہرست تیار کی ہے، ان کی تعداد ۳۵ ہے۔ ان میں حسب ذیل دس عطّار کی ہیں، بقیہ جعلی ہیں:

"اسرار نامہ، الٰہی نامہ، پند نامہ، دیوان، تذکرۃ الاولیا، خسرو نامہ، شرح القلب، منطق الطیر، مصیبت نامہ، مختار نامہ۔"

بقیہ ۲۵ جعلی کتابوں میں سے شیرانی صاحب نے حسب ذیل ۱۴ کتابوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان کتابوں کی نسبت عطّار کی طرف صحیح نہیں:

"آغاز عشق ، اسرار الشہود ، اسرار نامہ (جو اسرار نامہ اصلی سے الگ بحر میں ہے) ، کنز الحقائق ، مفتاح الفتوح ، وصلت نامہ ، منصور نامہ یا حلّاج نامہ ، بے سر نامہ ، خیّاط نامہ ، کنز الاسرار ، وصیّت نامہ ، مظہر العجائب ، چار مذہب ، جواہر الذات ، اور ہیلاج نامہ "۔

ان مباحث میں مظہر العجائب پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ، وہ خصوصیّت سے قابل ذکر ہے ۔ ... شیرانی صاحب نے اس کے جعل کے سلسلے میں تازہ دلیلیں دی ہیں:

۱۔ اس کی زبان و بیان کو عطّار کی دوسری کتابوں سے کوئی مناسبت نہیں ۔

۲۔ اس میں تاریخی غلطیاں پائی جاتی ہیں جو عطّار جیسے فاضل کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتیں ۔ شیخ نوری کو جو جنید کے معاصر تھے ، چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کا بزرگ بتایا ہے

۳۔ عطّار سنی تھے ، لیکن مظہر کا مُصنّف شیعہ مسلک کا پیرو تھا ۔ (شیعہ پاک است عطّار اے پسر ... تین شعر)۔ اس کے برخلاف ، ان کی ہر تصنیف میں خلفائے اربعہ کے ساتھ نہایت ارادت مندانہ اعتقاد کا اظہار کیا گیا ہے ۔

۴۔ عطّار کی کسی تصنیف میں الہام و کرامت کا دعویٰ نہیں ملتا ، کتاب اس طرح کی لغویات سے پُر ہے ۔

۵۔ صوفیانہ ترک و تجرید و فنا کے بجائے بغض و حسد کے جذبات اس مثنوی میں موج زن ہیں ۔ اس تضاد کی توجیہ ممکن نہیں ۔

۶۔ وہ سو کتابوں کی تصنیف کا مدعی ہے ، جب کہ عطّار کی تصانیف ۱۵ ، ۱۶ سے آگے نہیں بڑھیں۔

۷۔ جواہر الذات کو اپنی آخری تصنیف قرار دیتا ہے ۔ یہ غلط ہے ، اس لیے کہ معاً اس کے بعد مظہر العجائب لکھتا ہے ۔ زبان و انداز کلام کا اختلاف دونوں کتابوں کو عطّار کی تصنیف قرار دینے میں حائل ہے۔

۸۔ مظہر العجائب میں تومان یا تومن کا ذکر ہے جو چنگیزیوں کے ساتھ ایران میں آتا ہے ۔ پہلے فوجی اصطلاح کے معنوں میں مستعمل ہے اور بعد میں مالیات کی اصطلاح بن گیا ۔ عطّار کے دور میں یہ اصطلاح کہاں ؟

۹۔ شیخ عطّار اپنی تصنیف میں نظامی کا ذکر نہیں کرتے ۔ مظہر کے مُصنّف کا دعویٰ ہے کہ نظامی نے مجھ سے کسب فیوض کیا ۔

۱۰۔ مظہر کا مُصنّف پیشین گوئی کا مُشتاق ، عطّار نیشاپوری کے بیانات پیشین گوئیوں سے خالی ہیں ۔

۱۱۔ مولانا روم کی بابت پیشین گوئی صاف پتا دے رہی ہے کہ مُصنّف مولانا روم کے بعد کی شخصیت ہے ۔

۱۲۔ اپنے اشعار میں شعر حافظ اور شعر قاسم کا ذکر کرتا ہے ۔ حافظ سے حافظ شیرازی اور قاسم سے قاسم انوار کے علاوہ اور کوئی مراد نہیں ہوسکتا۔ حافظ کی وفات ۷۹۲ھ میں اور قاسم انوار کی ۸۳۵ھ یا ۸۳۷ھ میں ہوئی ۔ واضح ہے کہ مظہر کا مُصنّف اس کے بعد کا ہے ۔ (ص ۷۷ تا ۸۰)

شیرانی نے لسان الغیب پر تفصیلی تنقید نہیں کی تھی ۔ گو وہ اس کے جعلی ہونے کے بالکل قائل تھے ۔ لیکن مقالات شیرانی (ص ۳۳) کے ایک حاشیے سے معلوم ہوا کہ بعد میں ان کو اس کتاب کے مطالعے کا موقع ملا ، اور اس سے اس کتاب کے جعلی ہونے کا خیال اور بھی مستحکم ہوا ۔ (ص ۸۱)

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ شیرانی کا انداز تحقیق نہایت عالمانہ ہے ۔ اس لیے ان کے ہاں بیشتر داخلی شہادت سے استشہاد ہوا ہے اور چونکہ انھوں نے عطّار کے اصلی اور ان کی طرف منسوب کلام کے ہزاروں صفحات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا ۔ اس لیے انھوں نے ہر جعلی کتاب کے مأخذ کا بھی پتا لگالیا ہے ۔ ان میں سے بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن مندرجات دوسری کتابوں میں ہو بہو شامل ہیں ۔ اس سلسلے میں ہیلاج نامہ اور جوہرالذات پر جو تنقید ہوئی ہے ، وہ قابل توجہ ہے ۔ (ص ۸۱ ۔ ۸۲)

دیوانِ معین الدّین چشتی :

شیرانی صاحب کا ایک نہایت شاندار کارنامہ دیوانِ معین الدّین چشتی کے صحیح مُصنّف کا تعین ہے ۔ ... شیرانی صاحب نے اپنی دقیق نظری سے (خواجہ معین الدّین چشتی اجمیری سے) اس کے انتساب کا بطلان کیا اور اپنے دعوے پر ایسے مستحکم دلائل پیش کیے کہ ان کے دعوے کی تصدیق و توثیق کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں اور اب ان کا نتیجہ ایسی مُسلّمہ حقیقت بن چکا ہے کہ اس کے بارے میں شک و شبہ کی کوئی ذرّہ برابر گنجائش باقی نہیں رہی ہے ۔ من جملہ اور دلائل کے ایک ٹھوس دلیل یہ ہے کہ اس دیوان کے بیشتر اشعار معین

مسکین ہروی ، صاحب معارج النبوہ وغیرہ کی دوسری تصانیف میں مختلف موضوعات کی تشریح کے ضمن میں خود معین مسکین کے نام سے نقل ہوئے ہیں ۔ اتفاق سے شیرانی صاحب کے پیش نظر ان کی مدارج النبوہ کے ایک نسخے کے علاوہ دوسری کتاب اعجاز موسوی تھی ۔ ان دونوں کتابوں میں بیسیوں غزلیں لمولفہ ۔ غفراللہ لہ ، مولف فی ہذا المعنی وغیرہ فقرات کے ساتھ نقل ہوئی ہیں جن سے یہ راز کھلتا ہے کہ کتاب کا مولف اور شعر کا لکھنے والا ایک ہی شخصیت ہے ۔ ان بیسیوں منظومات کے علاوہ ، جو مُصنّف کا قطعی طور پر تعین کرتی ہیں ، متعدد ایسی مثالیں ان کتابوں میں ہیں جو مطبوعہ دیوان میں شامل ہیں ۔ جب دیوان کی اتنی غزلیں معین الدّین فراہی کی ہیں تو بقیہ غزلوں کو انھی کا سمجھنا چاہیے ۔ شیرانی صاحب نے مضمون کے خاتمے پر لکھا ہے کہ ممدوح کثیر التعداد تصانیف کے مالک ہیں ۔ اگر ان کی تصانیف میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین واثق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا ان میں پتا لگ جائے گا جو دیوان کے حجم کو المضاعف کر دیں گی ۔[اس ذیل میں لکھے ہوئے دو مقالات، ایک پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کا (رسالۂ اردو کراچی ، جولائی ۱۹۵۰ء)، دوسرا پروفیسر محمد اسلم کا ، فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کی نظر میں ہیں جن کا حوالہ دیا ہے۔ مزید یہ کہ مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود معین الدین فراہی کی تین کتابوں (۱۔ تفسیر سورۂ یوسف، ۲۔ حضرت موسیٰ کے حالات میں بطرز سوال و جواب ، ۳۔ نعوت احمد) کے قلمی نسخوں سے بھی استناد کیا ہے جن میں دیوان معین میں شامل کلام نقل ہوا ہے ۔ نجم الاسلام]

○ شرح مخزن الاسرار :

(بحر الفضائل مُصنّفہ محمد بن قوام کرئی پر شیرانی کے مقالے بحث کے تحت) میں محمد بن قوام کرئی کی دوسری تالیف ۔ شرح مخزن ۔ سے بھی بحث کی گئی ہے ۔ دراصل نول کشور پریس میں یہ شرح ایک دوسرے شارح ظہور الحسن بھوری کے نام سے شائع ہوگئی ہے ۔ شیرانی صاحب نے متعدد دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ دراصل شارح کا نام محمد بن قوام بن رستم کرئی ہے ۔ ظہور الحسن بھوری نے جعل کیا ہے ۔ اور مطبع والے اسی جعل کا شکار ہوگئے ہیں ۔ ... معارف اعظم گڑھ بابت جولائی اگست ۱۹۴۱ء میں محترم عرشی صاحب (امتیاز علی عرشی) کا ایک مضمون بعنوان ”ظہور الاسرار نامی اور مظہر گڑھ“ شائع ہوا ۔ اس میں عرشی صاحب نے اس کے جعلی

شارح ظہور الحسن بتھوری کی قلعی کھولی ہے جس کے نام سے نول کشور شرح مخزن " ظہور الاسرار " کے عنوان سے چند بار شائع ہو چکی ہے ۔ عرشی صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ دراصل اس شرح مخزن کا شارح بدرالدین بن قوام بن رستم البلخی الکرئی ہے ۔ جس نے ۸۹۵ھ میں یہ شرح لکھی ہے ۔ اس کے بعد انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شارح فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ ۔ ۷۹۰ھ) کے دور کا شاعر مطہر کڑہ ہے جس کا دیوان کافی شہرت رکھتا ہے ۔ یہ قیاس سراسر بے بنیاد ہے ۔ دراصل شیرانی صاحب کا مضمون جو ۱۲ سال قبل چھپ چکا تھا ۔ مولانا عرشی صاحب کی نظر سے نہیں گذرا ورنہ وہ اس طرح کی غلط فہمی میں نہ پڑتے ۔ بہرحال عرشی صاحب کے مضمون کے پہلے حصے کے وہی نتائج ہیں جو شیرانی صاحب کے ہیں یعنی یہ کہ مخزن کا شارح بلخی کرئی ہے (گو نام میں اختلاف ہے) عام طور پر وہ محمد بن قوام بن رستم کے نام سے مشہور ہے ۔ لیکن عرشی صاحب کے یہاں بدر الدین مطہر بن قوام ملتا ہے)۔ اور یہ کہ وہ فیروز تغلق کے دور کا مصنف ہے ، یعنی آٹھویں صدی ہجری کا ، گیارہویں صدی کا نہیں ہو سکتا مگر مضمون کے دوسرے حصے کا نتیجہ کہ شارح اور مطہر کڑہ ایک ہی ہیں غلط ہے ۔ عرشی صاحب یہ معلوم نہ کر سکے کہ شارح مخزن کی ایک دوسری تالیف بحرالفضائل نامی فرہنگ بھی ہے [اس کے بعد مقالہ نگار نے عرشی مرحوم کے دلائل کا رد بھی کیا ہے جسے یہاں اختصار کے مدنظر حذف کیا جاتا ہے] (ص ۹۰-۹۸)

نجم الاسلام :

کچھ منسوبات کچھ تحقیق منسوبات کے بارے میں

۱۔ منسوبات سے ہماری مراد ایک ایسی قابل قبول اصطلاح ہے جس میں (وسیع معنوں میں) سرقہ، الحاق، التباس، انتحال، جعل اور ملکیت تصنیف سے متعلق اسی نوعیت کے امور وغیرہ اور اشکالات آ جاتے ہیں۔ جو تصنیف یا کلام اپنی اصل کے علاوہ کسی اور طرف منسوب ہو یا اپنی اصل حالت پر نہ رہے اور دوسروں کا کلام اس میں مخلوط ہو یا کر دیا گیا ہو، اسے منسوبات کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی تحقیق لازم ہے تاکہ تاریخ علم و ادب شفاف رہے اور مطالعہ علم و ادب سے حاصل ہونے والے نتائج اغلاط سے پاک اور صاف رہیں۔

۲۔ اس کے تحت غلط انتساب کی تحقیق اور درستی تو آتی ہی ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ درست انتساب کا بطلان کر دیا جاتا ہے اور ارباب تحقیق کو اس بطلان کا بطلان کر کے انتساب کو پھر اسی پہلی اور درست حالت پر لانا پڑتا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے "بھاگ متی کا افسانہ" کے باب میں کیا ہے۔ پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے اپنے اس نام کے رسالے میں بھاگ متی کے قصے کو جعلی قرار دیتے ہوئے، حیدرآباد (دکن) کے قدیم نام بھاگ نگر کی صحت سے بھی انکار کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں تاریخ فرشتہ کے مؤلف محمد قاسم فرشتہ کو مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مقالے "حیدرآباد کا پرانا نام بھاگ نگر (خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۲۰) کے ذریعے پھر اسی حالت کو بحال کر دیا۔ اور بتایا کہ تاریخ فرشتہ (۱۰۱۸ھ) سے ۱۲ سال قبل فیضی بھاگ متی اور بھاگ نگر کا ذکر کر چکا ہے۔ فیضی کا بیان چونکہ ایک سفیر کا بیان ہے جو اس نے احمد نگر سے لکھی گئی ایک عرض داشت میں بنام اکبر بادشاہ تحریر کیا تھا، لہذا یہ ایک نہایت مصدقہ بیان ہے۔

۳۔ منسوبات کی اس وسیع تر اصطلاح میں ان غلط انتسابات کی بھی گنجائش ہے جو تصنیفات اور کلام ہی نہیں، اشخاص و اماکن سے متعلق ہوتے ہیں۔ دو اسدی کا نظریہ جس کا بطلان شیرانی نے کیا ہے، اور دو عمادی کا نظریہ جس کا رد ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے کیا ہے،

بھی منسوبات کے ذیل میں آتے ہیں ۔ یا اس کے برعکس ۔ کہ ولی کو ایک سمجھ کر دوسرے ولی کا کلام بھی اس ایک ولی کے حصے میں شامل کر دیا گیا تھا ۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے دوسرے ولی (ولی ویلوری) کو بھی متعارف کرایا اور حق حقدار کو پہنچایا ۔

۴۔ اردو میں تحقیق منسوبات کی پہلی کوشش شبلی کی تحریر ہے جو ان کی تصنیف " الغزالی " میں " امام غزالی کی بحوث فیہ تصنیفات " کے عنوان سے آتی ہے ۔ یہ تحریر شامل اشاعت ہے ۔ یہ محض نقش اول ہے ۔ ایک وسیع میدان کی طرف پہلا قدم ۔ اس تحریر میں " سر العالمین " سے متعلق اجمالی تصریحات کو جدید دور کے ایرانی عالم علی رضا ذکاوتی قراگزلو کے مفصل اور مستدل تر مقالے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو منسوبات کی تحقیق میں قدیم و جدید کا فرق بخوبی سامنے آ جاتا ہے ۔ اس ایرانی عالم کے محولہ بالا مقالے کا اردو ترجمہ بھی شامل اشاعت ہے ۔ تاہم ، اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس میدان میں تقدم کی فضیلت شبلی کے حصے میں آئی جنھوں نے امام غزالی سے منسوب چار تصنیفات کے انتساب کا جائزہ لیا ہے ۔

۵۔ باوجود اس کے کہ شبلی کی فضیلت تقدم ہمیں تسلیم ہے ۔ مقدار و معیار اور منہاج کے اعتبار سے حافظ محمود شیرانی کہیں آگے ہیں ۔ اگر انھیں جدید تحقیق منسوبات کا بانی قرار دیا جائے تو بجا ہے ۔ اردو ۔ فارسی ۔ ہندی (پرتھی راج راسو کے حوالے سے) سب ان کی تحقیقاتِ منسوبات کے دائرے میں شامل ہیں ۔ اس میدان میں ان کی فضیلتوں اور ان کے کارہای نمایاں کی جھلک ڈاکٹر نذیر احمد کی اس تحریر میں دیکھی جا سکتی ہے جو " غلط انتسابات سے متعلق محمود شیرانی کی تحقیقات " کے عنوان سے شامل اشاعت ہے اور جسے ڈاکٹر نذیر احمد کے ایک طویل تر مقالے سے اقتباس کیا گیا ہے ۔ محمود شیرانی اس میدان میں اب بھی ، جب کہ ان کی وفات کو نصف صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے ، سرفہرست ہیں ۔

۶۔ شیرانی کے بعد دو فضلا اس میدان میں زیادہ نمایاں ہیں جنھیں تحقیق منسوبات سے زیادہ دل چسپی رہی ہے ۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (متولد ۱۹۱۲ء) اور ڈاکٹر نذیر احمد (متولد ۱۹۱۵ء) ۔ بفضلہٖ دونوں فضلا سرگرم تحقیق ہیں اور تحقیق منسوبات کے سرمائے میں مسلسل اضافہ کرنے میں مشغول و منہمک ۔

۷۔ تحقیق منسوبات سے متعلق زیادہ تر مقالات تو وہ ہیں جو کسی تصنیف یا کلام کے انتساب کی تحقیق میں پہل کرنے والے ہیں ۔ یعنی ان سے قبل کسی نے اس زیر تحقیق غلط

انتساب کا بطلان نہیں کیا۔ دوسری قسم ان مقالات کی ہے جو یا تو غلط انتساب کا بطلان کرنے والے کسی مقالے کی تائید میں اضافی معلومات کے ساتھ لکھے گئے ہیں، یا پھر اس مقالے کی جزوی یا کلّی تردید میں۔ اس قسم کے مقالات کو متعاقب تحریریں کہہ سکتے ہیں۔ تیسری قسم متوازی تحریروں کی ہے۔ ان میں تحقیق منسوبات سے متعلق وہ تحریریں شامل ہیں جن میں ایک ہی موضوع پر داد تحقیق دی گئی ہے مگر اس طرح کہ ایک محقق کو دوسرے کے تحقیقی کام کی اطلاع نہ پہنچی اور ہر ایک نے آزادانہ طور پر اپنی تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ایسے متوازی مقالے دو مختلف مزاج و منہاج کے عکاس ہوتے ہیں مگر ان کے نتائج یکساں ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کا تقابلی مطالعہ بہت کچھ سودمند ہو سکتا ہے۔ ایسے چند متوازی مقالے گوشۂ تحقیق منسوبات میں یکجا کیے گئے ہیں، مثلاً "دیوان قطب الدین" پر اوّلاً ڈاکٹر نذیر احمد نے رسالۂ معارف اعظم گڑھ میں قلم اٹھایا تھا۔ پھر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے بھی۔ اور جب ان کا مقالہ مکمل ہو چکا تھا تو ان کے علم میں آیا کہ ڈاکٹر نذیر احمد اس موضوع پر قلم اٹھا چکے ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کے اس مقالے کو ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مرتّبہ "فخرالدّین علی احمد یادگاری مجلے میں شامل کیا ہے۔ دونوں مقالات مزاج و منہاج میں مختلف مگر نتیجے میں یکساں ہیں۔ اسی طرح، کلکتے کے پروفیسر محمد محفوظ الحق کا مقالہ بعنوان "زیب النسّا، اور دیوان مخفی" (رسالۂ معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۲۴ء)۔ اسی نوعیت کی، اسی موضوع پر تحقیق ڈاکٹر سیّد امیر حسن عابدی (دلی یونیورسٹی) نے بھی کی ہے۔ ان کا مقالہ "دیوان مخفی" کے عنوان سے چھپا ہے، اور سابقہ کام کی اطلاع نہ ہونے کی بنا پر، آزادانہ طور پر لکھا گیا ہے۔ ایک اور مثال قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے ایک مقالے بعنوان "مرزا غالب اور امیر مینائی" (نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۵۴ء) کا اجمالی رد ہے جو مالک رام نے غالب سے غیر معمولی دل چسپی کی بنا پر نوائے ادب بمبئی (جنوری ۱۹۵۵ء) میں شائع کرایا تھا۔ پھر قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کا یہی مقالہ جب "مضامین اختر جونا گڑھی" (انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۸۹ء) میں شامل ہو کر چھپا، تو سیّد جاوید اقبال (شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی) نے بھی، امیر مینائی سے خصوصی دل چسپی کے حوالے سے اس کا ایک مفصل رد لکھا۔ وہ مالک رام کی تحریر سے واقف نہ تھے۔ نتائج کے اعتبار سے یہ دونوں مقالے بھی متوازی تحریروں کے تحت آتے ہیں، اور شامل اشاعت ہیں۔

۸۔ تحقیق منسوبات کی ایک اہم شاخ وہ ہے جس کے تحت شاعروں کا کلام مخلوط ہو جانے کی صورت میں کوئی منہاج اور اصول متعین کر کے ہر شاعر کے کلام کی جدا جدا شناخت کر لی جاتی ہے جیسا کہ دیوان انوری کے ذیل میں شیرانی نے کیا ہے اور جس کی بجا طور پر پرزور تحسین ڈاکٹر نذیر احمد اپنے مقالے میں کر چکے ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال تفسیر کبیر اور اس کے تکملے کی ہے جس میں امام فخرالدین رازی کی تفسیر کا متن تکملہ نگار کے متن سے مخلوط ہو گیا ہے، سبب یہ کہ، جیسا کہ محقق عبدالرحمٰن المعلمی کو دوران تحقیق معلوم ہوا، امام رازی نے اپنی تفسیر سورتوں کی ترتیب کے مطابق مسلسل نہ لکھی تھی، بلکہ درمیان میں کچھ خالی گوشے بھی تھے جنھیں تکملہ نگار نے پورا کیا۔ محقق عبدالرحمٰن المعلمی نے شناخت کے لیے ایک منہاج مقرر کر کے مفسر اور تکملہ نگار کی تحریروں کی جدا جدا شناخت کر لی۔ عبدالرحمٰن المعلمی کا یہ مقالہ عربی میں تھا جسے مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اردو میں منتقل کیا۔ یہ ترجمہ شامل اشاعت ہے (عربی ادب سے متعلق مزید مقالوں کے تراجم بھی شامل کیے جاتے ہیں۔

۹۔ تحقیق منسوبات کی ایک اور منہاج وہ ہے جو ہمیں مسعود فرزاد کی کتاب "اصالت و توالی ابیات در غزلہای حافظ" (شیراز ۱۳۵۴) میں ملتی ہے جس کا ایک نسخہ محب مکرم محمد رضا ملک اہوازی، پروفیسر زبان و ادبیات فارسی شیراز یونیورسٹی (سابق وزیٹنگ پروفیسر سندھ یونیورسٹی) نے ارسال فرمایا ہے۔ اس کتاب میں فرداً فرداً ہر غزل کے ابیات کی اصالت کو مستند نسخے متعین کر کے جدول وار زیر بحث لایا گیا ہے (اور ہر غزل میں ابیات کی ترتیب کو بھی)۔ فاضل گرامی ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے بھی "شاہ جو رسالو" کے ابیات کی اصالت کی تحقیق کے لیے فرداً فرداً ہر بیت کو زیر بحث لانے کا طریقہ اپنایا ہے۔ اس کا ایک تعارف "گوشہ بلوچ" میں شامل ہے جس کا سندھی سے اردو میں ترجمہ محترمہ فہمیدہ شیخ (شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی) نے کیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق منسوبات کی ایک اور منہاج اسالیبی تجزیہ و تقابل ہے، جس کی ایک نمایاں مثال مشکوک ملکیت والی فارسی کتاب "مینا بازار" پر ڈاکٹر نذیر احمد کا مفصل تجزیاتی مقالہ ہے جو تین قسطوں میں رسالۂ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا، اور جس کا اختصار شامل اشاعت ہے۔ غالباً کسی مشکوک ملکیت والی اردو کتاب پر یہ عملِ جرّاحی ابھی تک نہیں آزمایا گیا ہے۔

۱۱۔ ایک اور توجّہ طلب گوشہ نامور ادیبوں اور فاضلوں کے لکھے ہوئے وہ صحافتی مقالات ہیں جو وہ اپنے نام کی صراحت کے بغیر چھپواتے رہے ہیں۔ اصل مضمون کے ساتھ ان کی نسبت تحقیق طلب ہوتی ہے اور کبھی کبھی اختلافی نوعیت اختیار کر لیتی ہے جیسا کہ الہلال کی ایک بے نام تحریر ابوالکلام آزاد اور سیّد سلیمان ندوی کے درمیان مبحوث فیہ رہی ہے۔ مغربی محققین نے ایسی بے نام تحریروں کی تحقیق پر بھرپور توجہ دی ہے اور حسب ضرورت، تحقیق کے مؤثر اصول اور طریقے متعیّن کرکے قابلِ تقلید دادِ تحقیق دی ہے۔ اردو صحافت کی تحقیق کا یہ گوشہ ابھی تک بہت کچھ توجّہ طلب ہے۔

۱۲۔ مغرب کی جو قومیں کئی صدیوں سے علم و آگہی میں آگے نکل گئی ہیں، ان کے فضلاء کو تحقیق منسوبات کی طرف غیر معمولی شوق و شغف رہا ہے۔ ایک فاضل زندگی بھر کسی ایک مصنّف کے افکار و اسلوب پر تخصّص حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور اس مصنّف کی تصانیف سے متعلق منسوبات کے مسائل کو بخوبی حل کر لیتا ہے۔ یہ سرگرمی یہاں تک وسیع پیمانے پر فروغ پا چکی ہے، اور صدیوں سے جاری ہے کہ ان تحقیقات سے حاصل ہونے والے نتائج کی روشنی میں ایک ایسی کتاب حوالہ تیار کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے جو مجہول و مجعول تصانیف سے متعلق مستند معلومات کو لغت کے اصولِ ترتیب کے مطابق مرتّب کرنے کی طرف توجّہ مبذول کراتی ہے۔ ایسی ایک لغت کا حوالہ رچرڈ ایلٹیک کی کتاب میں ملتا ہے جس کی تصریحات اس شمارے میں شامل ہیں۔

۱۳۔ مخطوطات میں جعل کو سائنسی طریقوں سے گرفت میں لانے کے لیے بوڈلین لائبریری میں مستعمل اِنفرا ریڈ مشین اور وڈیو اسپیکٹرل کمپریٹر اور ادبی مخطوطات میں ان کے استعمال کے تعارف پر مبنی ایک تحریر کا ترجمہ تحقیق کے ایک اوّلین شمارے میں پیش کیا جا چکا ہے جس کے لکھنے والے کناڈا کے انگریزی زبان و ادبیات کے پروفیسر نارمن ایچ میکنزی تھے۔ ہماری درخواست پر انھوں نے اپنی اس تحریر کو اپ ڈیٹ بھی کیا تھا۔ غالباً برصغیر میں منسوبات کی تحقیق کے لیے ابھی تک کہیں یہ طریقہ آزمایا نہیں گیا ہے۔

مقالات

شبلی نعمانی:

امام غزالی کی مبحوث فیہ تصنیفات

امام صاحب کے نام سے جو تصنیفات مشہور ہیں ان میں بعض ایسی بھی ہیں جن کی نسبت بعض بزرگوں کا بیان ہے کہ در حقیقت وہ امام صاحب کی تصنیف نہیں۔ اس قسم کی چار کتابیں ہیں: منخول، مضنون بہ علیٰ غیر اہلہ، کتاب النفخ والتسویہ، سر العالمین۔ چنانچہ ہم ہر ایک کے متعلق تفصیل کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔

منخول: یہ کتاب اصول فقہ میں ہے۔ کشف الظنون میں اس کو ردّ ابی حنیفہ کے نام سے لکھا ہے اور قلاید العقیان کے مصنف کا قول نقل کیا ہے کہ "وہ امام غزالی کی نہیں بلکہ محمود معتزلی کی تصنیف ہے" شمس الائمہ کروری نے اس کتاب کا رد بھی لکھا ہے۔

اس کتاب میں امام ابوحنیفہ پر نہایت سختی سے حرف گیری کی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ "امام ابو حنیفہ کے مسائل فی صدی ۹۰ غلط ہیں" چونکہ امام صاحب نے احیاء العلوم میں امام ابو حنیفہ کی نہایت مدح کی ہے، اس کے علاوہ ائمہ دین کو برا کہنا، امام صاحب کی شان سے یوں بھی بعید ہے، اس لیے یہ خیال کیا گیا کہ وہ امام غزالی کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف اس دلیل کی بناء پر یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اولاً تو رجال و تاریخ کی تمام کتابوں میں وہ امام صاحب ہی کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

ثانیاً امام صاحب کے ابتدائی حالات جس نے غور سے پڑھے ہیں وہ سمجھ سکتا ہے کہ ابتداء میں امام صاحب کا مزاج کس قدر مجادلہ پسند اور نکتہ چیں واقع ہوا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ امام صاحب ابتداء میں نہایت جاہ پسند، خود پرست اور مغرور تھے لیکن اخیر میں ان کی حالت بدل گئی اور وہ کچھ سے کچھ ہوگئے (۱)۔ منخول اسی ابتدائی زمانے کی تصنیف ہوگی۔ ہم نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔ خود اسکی طرز عبارت بتاتی ہے کہ وہ نشہ شباب کے زمانے کی تصنیف ہے۔

مضنون بہ علیٰ غیر اہلہ: اس کتاب کی نسبت محدث ابن الصلاح اور علامہ ابن السبکی کا دعویٰ ہے کہ امام صاحب کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ دلیل یہ ہے کہ اس کتاب کا مصنف قدم

عالم، انکار علم جزئیات اور نفی صفات کا قائل ہے اور ان میں سے ہر عقیدہ کفر کا مستوجب ہے۔ اس بحث کے تصفیے کے لیے ہم کو اثبات و نفی دونوں جانب کی شہادتوں کا موازنہ کرنا چاہیے۔ رجال کی جس قدر مستند کتابیں ہیں سب میں اس کتاب کو امام صاحب کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود امام صاحب نے جواہرالقرآن میں جو ان کی مسلمہ تصنیف ہے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

نفی کی جانب صرف یہ قیاس ہے کہ اس میں بعض مسائل ایسے مذکور ہیں جو علامہ ابن الصلاح و ابن السبکی کے نزدیک موجب کفر ہیں، اگر انکار کے لیے صرف اس قدر قرینہ کافی ہوسکتا ہے تو احیاء العلوم میں بہت سی باتیں مذکور ہیں جو بعضوں کے نزدیک کفر کی مستوجب ہیں، مثلاً یہ مسئلہ کہ موجودہ عالم سے بہتر پیدا کرنا ممکن نہیں ہے، بہت سے ائمہ حدیث کے نزدیک صاف کفر ہے اور اسی بناء پر بہت سے لوگوں نے امام کی تکفیر کی، لیکن احیاء العلوم میں یہ مسئلہ نہایت تصریح سے مذکور ہے۔ چنانچہ علامہ شعرانی نے خاص اس مسئلے پر ایک کتاب لکھی جس کا نام الاجوبۃ المرضیۃ عن ائمۃ الفقہاء والصوفیہ ہے۔ (۲)

اس کے علاوہ جن مسائل کو موجب کفر قرار دیا ہے وہ جس حیثیت سے موجب کفر ہیں اس کا کوئی قائل نہیں اور جس کے لوگ قائل ہیں وہ موجب کفر نہیں۔ مثلاً صفات کا جو لوگ انکار کرتے ہیں اس کے یہ معنی قرار نہیں دیتے کہ خدا بصیر و علیم و سمیع نہیں ہے بلکہ یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ خدا کی ذات ہی بصر و علم و سمع کے لیے کافی ہے، یہ صفات ذات سے علیحدہ نہیں ہیں جیسا کہ انسان اور حیوانات میں ہیں۔ اس طرح کے انکار صفات کو کون کفر کہہ سکتا ہے، اسی طرح قدم عالم اور نفی علم جزئیات کا مسئلہ ہے۔

لطف یہ کہ یہ مسائل مضنون بہ علیٰ غیر اہلہ میں سرے سے مذکور ہی نہیں، علامہ ابن الصلاح و ابن السبکی نے معلوم نہیں کن الفاظ سے یہ مسائل مستنبط کیے۔ یہ کتاب عام طور پر شائع ہوچکی ہے اور ہر شخص خود دیکھ کر اس کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

کتاب النفخ والتسویۃ : شرح احیاء العلوم میں علامہ مرتضیٰ حسینی نے اس کتاب کو جعلی قرار دیا ہے لیکن کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں پیش کی نہ کسی اور شخص کا قول اس کی تائید میں نقل کیا ہے۔

سرّ العالمین : ہمارے نزدیک یہ کتاب بے شبہ جعلی ہے۔ اس کی طرز عبارت اور انداز تحریر امام صاحب کے طریقہ تحریر سے بالکل الگ ہے۔ جعلی بنانے والے نے ایک چالاکی یہ کی ہے کہ جا بجا امام الحرمین کی استادی کا ذکر کیا ہے اور اپنی دانست اس کتاب کے اصلی ثابت کرنے کی یہ بڑی تدبیر خیال کی۔ لیکن صرف یہی امر کتاب کے جعلی ہونے کی کافی دلیل ہے۔ امام صاحب کی یہ خاص عادت ہے کہ وہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کا ذکر مطلق نہیں کرتے۔ ان کی تصنیفات میں بہت سے ایسے مواقع ہیں جہاں استاد یا شیخ کا ذکر کرنا ضروری تھا، لیکن وہ بالکل پہلو بچا جاتے ہیں اور تصریح کا کیا ذکر کنایہ تک نہیں کرتے۔ منقذ من الضلال میں نہایت ضروری موقع پر صرف اس قدر کہہ کر رہ گئے کہ شیوخ سے جس طرح میں نے تعلیم پائی ہے اس کے مطابق مراقبہ اور مجاہدہ میں مشغول ہوا۔

(الغزالی، ص ۴۹ تا ۵۲)

حواشی

(۱) تبیین کذب المفتری لحافظ ابن العساکر

(۲) شرح احیاء العلوم مطبوعہ مصر جلد اول صفحہ ۳۲

تحقیق منسوبات کے سلسلے میں حافظ محمود خاں شیرانی کا کام سب سے نمایاں ہے۔ اردو میں شبلی کے بعد انھی کو تقدم کی فضیلت حاصل ہے۔ یہاں ان کے دو اہم ترین مقالات پیش کیے جاتے ہیں جن سے شیرانی کے انداز استدلال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے اپنی فاضلانہ کتاب " حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات " کی جلد دوم (لاہور، ۱۹۹۵ء) میں عنوانات متنی تعین، تصنیفات کے غلط انتسابات کی تردید اور اصل مصنف کا تعین، تصنیفات کا عصری تعین کے تحت منسوبات کی تحقیق سے متعلق شیرانی کے جملہ کاموں کا عمدہ طور پر تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے۔ نجم الاسلام

حافظ محمود خاں شیرانی :

دیوان خواجہ معین الدّین اجمیریؒ

کیا یہ دیوان انھی کی ملکیت ہے؟

(از رسالہ "اردو" بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۴ء)

کسی زبان کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعے کے وقت بعض عجیب و غریب باتیں ایک محقق کی نظر سے گزرتی ہیں۔ مصنّفین کے سلسلے میں بعض ایسی ہستیاں نظر آئیں گی، جو بغیر کسی استحقاق کے، بزم ادب کے مشاہیر میں شمار ہوکر اصلی اور حقیقی مستحقین کے دوش بدوش کھڑی ہیں۔ حقیقتہً اس بزم میں ان کی باریابی کسی نامعلوم بے انصافی یا کسی اتفاقی غلطی اور غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے جس کی اصلی حقیقت ہم عصر تاریخ کی یاد سے محو ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک راز سربمہر بن گئی ہے۔ ان میں بعض ایسے بے رحم ہیں، جو نہایت بے دردی اور سنگدلی کے ساتھ غیر لوگوں کے کلام پر قبضۂ مالکانہ جما کر ان کی تمام عمر کی محنت اور جانکاہی کے نتیجے کو اپنا بناکر مشہور کردیتے ہیں۔ ایسے حضرات کو اگر "ادبی قزاق" کے نام سے موسوم کیا جایے تو موزوں ہوگا۔ بعض وقت ان کا راز طشت از بام ہوجاتا ہے لیکن اکثر اوقات نہیں ہوتا۔ ادبی قزاق ہر قوم اور ہر زبان میں پاے جاتے ہیں۔ صاحب کشف المحجوب، کا ایک واقعہ ہے کہ ان کا دیوان جس کی ان کے پاس صرف ایک نقل تھی، کسی شخص نے مستعار مانگا اور یہ ستم ظریفی کی کہ مطالعے کے بعد بجاے واپسی کے اصل کتاب سے ان کا نام خارج کرکے اس کو اپنے نام سے مشتہر کردیا۔ اسی طرح تصوّف میں آپ کی ایک اور تالیف منہاج الدین نامی ایک شخص نے عاریتہً دیکھنے کو لے کر اپنی طرف منسوب کردی۔

انوری کا قصہ مشہور ہے کہ ایک روز بلخ کے بازار سے گزرتے ہوے کسی مقام پر اس نے لوگوں کا ہجوم دیکھا بھیڑ چیر کر اندر گیا تو دیکھتا ہے کہ خود انوری کے اشعار ایک شخص مجمع میں سنا رہا ہے۔ شاعر نے بڑھ کر اس سے پوچھا کہ "یہ اشعار کس کے ہیں؟" اس شخص نے جواب دیا "انوری کے!" دوبارہ سوال کیا کہ "انوری کو جانتے بھی ہو؟" اس شخص نے

جواب دیا: "چہ خوش ؛ جانتا کیسا، میں خود انوری ہوں۔" انوری نے ہنس کر کہا "شعر دزد" سنتے آئے ہیں لیکن "شاعر دزد" آج ہی دیکھا (۱)

یہی انوری اپنے قصیدے میں کسی نامی گرامی شاعر کے متعلق گویا ہے:

کس دانم از اکابر گردن کشان نظم
کورا صریح خون دو دیوان بگردنست

شادی آبادی (۲) اس شعر کی شرح میں لکھتا ہے کہ امیر معزّی نے مولانا احمد ساوی اور مولانا حمید اسفانی (؟) کے دیوانوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔

دوسرا گروہ اس گروہ سے کم خطرناک نہیں لیکن نوعیتِ عمل میں بالکل متضاد ہے۔ اخلاقی نظر میں ان کا فعل چنداں مذموم نہ مانا جائے لیکن ادبی اخلاق، اخلاق مروّجہ سے مختلف ہیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے ان کا جرم اسی قدر سنگین اور اہم ہے جس قدر سابق الذکر گروہ کا، اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے ان کے جرم کے مختلف مدارج ہیں۔ جس طرح کوئل کوّے کے گھونسلے میں اپنے انڈے چھوڑ آتی ہے، یہ گروہ اپنی تصانیف کو دوسروں کے سر تھوپ دیتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابلِ نفریں وہ طبقہ ہے جو گزشتہ بزرگانِ دین کے نام پر اپنے دماغی کارناموں کو شہرت دیتا ہے کیونکہ اس کا مقصد بعض مذہبی مسائل پر رجحانِ عام کی تبدیلی ہوتی ہے یا کسی خاص فرقے کی آرا کو مقبولِ عام بنانا اصلی مقصود ہوتا ہے

بعض امیر اور رئیس ادبیاتِ لطیفہ کے دل دادہ ہوتے ہیں، لیکن چونکہ تصنیف کی قابلیت کا جوہر ان میں مفقود ہوتا ہے، اس لیے کرایے کے ٹٹّو ان کے لیے یہ کام کرتے ہیں بعض لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ اپنا کلام دیگر مشاہیر کی طرف مضاف کر کے زبان زد عام ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ سیاسی اغراض کی تکمیل کی غرض سے اکثر مجہول تصانیف پیدا کی جاتی ہیں۔ سلف پرستی ایک اور شکل ہے جس میں معتقدین اپنے پیر و مرشد کے اصلی جوہر کو زیادہ فروغ اور رونق دینے کی غرض سے ادب و شاعری وغیرہ کے اضافی کمال ان کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

تیسری صورت مغالطہ ہے جس میں بہ وجہ ہم نامی، یا محض اتفاقیہ غلطی کی بناء پر ایک شخص کا کلام دوسرے کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ ہم نامی کی وجہ سے تاریخ میں اکثر غلطیاں پیدا ہوجاتی ہیں لیکن مغالطہ اور سلف پرستی کا فرق دریافت کرنا بعض اوقات ایک مؤرخ کے لیے نہایت دشوار ہوجاتا ہے کیونکہ وہ معلول کو دیکھتا ہے اور علّت اس کی نگاہ سے

چھپی رہتی ہے۔ نتیجہ اس کے پیش نظر ہے لیکن اس نتیجے کو بر روے کار لانے والی ہستیاں آنکھوں سے غائب ہیں یہاں مغالطہ یا سلف پرستی کی مثال میں دیوان حضرت خواجہ معین الدّین چشتیؒ کے متعلق ایک تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

یہ دیوان مطبع نولکشور میں سب سے پہلی مرتبہ سنہ ۱۲۸۸ھ مطابق سنہ ۱۸۷۱ء میں طبع ہوا۔ جب سے اب تک کئی بار چھپ چکا ہے اور کتب فروشوں کے ہاں عام طور پر ملتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا جلال الدّین الٰہی بخش تاجران کتب لاہور نے نیا ایڈیشن نکالا ہے۔ اس کے قلمی نسخے بھی وقتاً فوقتاً نظر سے گزرتے ہیں لیکن اکثر گزشتہ صدی یا قرن ماسبق سے تعلق رکھتے ہیں اور لوگ خواجہ صاحب کا کلام سمجھ کر نہایت عزیز رکھتے ہیں۔

کار پردازان مطبع نولکشور نے، اس دیوان کے متعلق، اشاعت بار اوّل میں خاتمے پر یہ بیان دیا ہے:

"آج تک کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت خواجہ صاحب قدّس سرّہ با دیگر کمالات صوری و معنوی، مذاق شعر و شاعری بھی رکھتے تھے۔ حسن اتّفاق سے ہم کو ایک مختصر دیوان حضرت صاحب کا بمنزلۂ کلّیات کتب خانۂ مستجمع کمالات جناب منشی مردان علی خاں صاحب رعنا، نائب دیوان سرکار مارواڑ سے نصیب ہوا اور اس پر مواہیر فیضی و ابو الفضل ثبت تھیں۔ معلوم ہوا کہ وہ کتب خانۂ اکبر بادشاہ کا تھا اور شہنشاہ ممدوح از بس معتقد حضرت خواجہ صاحب قدّس سرّہ کا تھا۔ اس نے اپنے عہد دولت میں بہم پہنچایا اور شکر خدا کہ ہم کو گھر بیٹھے بے منّت ہاتھ آیا۔ چونکہ یہ نعمتِ غیر مترقّب تھی اس لیے ہم نے واسطے یادگار حضرت کے طبع کیا تاکہ بطور تبرّک کے لوگ اسے حرز زبان بنائیں اور ہم بھی اس سعادت سے ثمرہ خیر پائیں"۔

اس میں پہلا بیان تو صریحاً غلط ہے۔ دیوان مذکور ممکن ہے کہ اس قدر قدیم ہو، جیساکہ دعوىٰ کیا گیا ہے لیکن یہ بیان کہ اکبر نے کوشش کرکے بہم پہنچایا، ثبوت کا محتاج ہے۔ اگر اس قسم کا کوئی ذکر اس نسخے میں تھا تو کارپردازان مطبع کا فرض تھا کہ اسے بھی دیوان کے ساتھ شائع کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ بہ وجہ حضرت شیخ سلیم چشتی شہنشاہ جلال

الدّین اکبر ایک زمانۂ خاص تک خواجۂ اجمیر کا بہت معتقد رہا ہے۔ چنانچہ فتحپور سے اجمیر تک پا پیادہ سفر بھی کیا ہے۔ اس کے بعد کار پردازان مطبع کا بیان ہے:

"جناب خان صاحب موصوف سے ہم نے دریافت کیا کہ آپ کو کس جگہ سے یہ نسخۂ اکسیر ہاتھ آیا؟ خان صاحب ممدوح نے یہ روایت بیان کی کہ ایک شب میں نے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بمقام لکھنؤ، سنہ ۱۸۶۵ء میں، رویائے صادقہ میں دیکھا کہ حضرت صاحب میرے مکان پر تشریف لائے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ایک نقش تبرکاً مجھ کو عنایت ہو۔ چنانچہ حضرت صاحب نے عنایت فرمایا۔ اس کی تعبیر یہ ہوئی کہ اسی کے قریب ایک دست فروش میرے پاس یہ دیوان ایک پرانی ردی کتاب جان کر گھر بیٹھے فروخت کر گیا۔"

خواب کے متعلق رائے زنی کرنا ایک ادبی نقّاد کے منصب میں داخل نہیں، کیونکہ اس کے موضوع واقعات ہیں نہ (کہ) ظنّیات، اس لیے راقم اس کی معمّا کشائی سے اعراض کر کے، اسی گزارش پر اکتفا کرتا ہے کہ میں یہ قصّہ قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ اس لیے کہ مردان علی خاں رعنا اور منشی نول کشور پہلے حضرات نہیں ہیں جنھوں نے سب سے پیشتر اس دیوان کا سراغ نکالا ہے، بلکہ ان کے عہد سے ایک صدی پیشتر تک کے اہل علم کو کم از کم اس کا ضرور علم تھا اور جیسا کہ سابق میں گزارش کر چکا ہوں، یہ دیوان اس قدر نایاب بھی نہیں تھا۔ چنانچہ اسی دیوان کے متعلق تذکرۂ روز روشن صفحہ ۹۳۷ پر، حضرت خواجہ معین الدّین کے حالات میں، مصنّف نے یہ دیوان حضرت خواجہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے:

"دیوانی مختصر از ملفوظات آن قدوۂ عرفای کرام و اسوۂ اولیای عظّام پیش نظر است و این چند اشعار منتخب ازان مختصر کہ در دی جای معین و جای معینی تخلص می فرماید۔"

انتخاب میں صاحب تذکرہ نے چھیالیس بیت اور ایک رباعی دی ہے۔ ان میں سے موجودہ دیوان نولکشور میں قریباً سترہ اشعار، جو دس مختلف غزلوں سے تعلق رکھتے ہیں، موجود نہیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ صاحب تذکرۂ روز روشن کے زیر نظر اس مطبوعہ دیوان کا اصل

نسخہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور قلمی نسخہ ہے جس میں اس نسخے سے زیادہ غزلیات ہیں۔

تذکرۂ مخزن الغرائب (سنہ ۱۲۱۸ھ) میں حضرت خواجہ کے نام صرف دو رباعیاں درج ہیں۔ یہ مصنف دیوان کے وجود سے بے خبر معلوم ہوتا ہے۔ وہ رباعیاں یہ ہیں:

۱۔ عاشق ہمہ دم فکر رخ دوست کند
معشوق کرشمہ کہ نیکوست کند
ما جرم و گنہ کنیم و او لطف و عطا
ہر کس ہر چیز لایق اوست کند

۲۔ ای بعد نبی بر سر تو تاج نبی
دی دادہ شہان ز صولتت باج نبی
آنی تو کہ معراج تو بالا تر شد
یک قامت احمدی ز معراج نبی

پہلی رباعی "روز روشن" میں بھی درج ہے۔ مردان علی خاں مبتلا نے اپنے تذکرۂ منتخب الاشعار، میں، جو سنہ ۱۱۶۱ھ میں تصنیف ہوا ہے، صرف پچھلی رباعی حضرت خواجہ کے نام پر لکھی ہے اور مصرعۂ دوم کو مصرعۂ اوّل کی بجائے لکھا ہے یعنی ترتیب بدل دی ہے۔

میر حسین دوست "تذکرۂ حسینی" میں جو سنہ ۱۱۶۳ھ میں مرقوم ہوا ہے، خواجہ معین الدّین چشتی کے حالات بالتفصیل دیتا ہے اور آخر میں ان کے دیوان سے ایک رباعی اور غزلوں کے بعض اشعار نقل کرتا ہے۔ "آتشکدہ آذر" میں صرف گزشتہ دو رباعیاں ملتی ہیں اور مجمع الفصحا، میں رباعیوں کے علاوہ یہ دو بیت بھی خواجہ کے نام پر دیے ہیں:

سیل را نعرہ ازانست کہ از بحر جداست
وآنکہ با بحر در آمیختہ خاموش آمد
نکتہا دوش دلم گفت و شنید از لب یار
کہ نہ ہرگز بزبان رفت نہ در گوش آمد

کتب خانۂ بانکی پور کی فہرست میں اس دیوان کے متعلق یہ الفاظ ہیں:

"اس اعتقاد کے تسلیم کرنے کا، کہ یہ دیوان مشہور و معروف خواجہ معین الدّین چشتی سے علاقہ رکھتا ہے، ہمارے پاس صرف یہ ذریعہ ہے کہ تقی اوحدی عرفات میں اور والہ ریاض الشعراء میں

اس دیوان کے بعض اشعار نقل کرکے ان کو حضرت خواجہ کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ لیکن نہ یہ دونوں مؤلف اور نہ کوئی اور مصنّف صاف طور پر ذکر کرتا ہے کہ خواجہ کی یادگار کوئی دیوان بھی ہے "۔

اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے بھی یہ دیوان خواجہ معین الدّین چشتی کی طرف منسوب کردیا ہے اور اب وہ عام طور پر انھی کے نام سے مانا جاتا ہے ۔ لیکن ایک محقق اور منتقد کی نظر میں یہ شہادت اور بیانات اس دیوان کا تعلق خواجۂ اجمیر سے وابستہ کرنے کے لیے کافی معلوم نہیں ہوتے، کیونکہ سب سے مقدّم یہ سوال پیش آتا ہے کہ حضرت خواجہ کے عہد سے ان بزرگوں کے عہد تک ، جس کے درمیان پانچ صدیوں سے زیادہ کی مدت حائل ہے ، یہ دیوان گنجِ مخفی کی طرح کہاں غائب رہا اور خواجہ کے سوانح نگاروں کی نظروں سے کیوں کر بچا ۔

خواجہ معین الدّین چشتی کے حالات اور کمالات ، ان کے زمانے سے لے کر اب تک ، ہر عہد میں دنیا کی نظر میں رہے ہیں ۔ تمام شائقین کے علاوہ اصحاب تصوّف کو ان کے واقعات و مقالات سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی ہے ۔ پھر ایسی مشہور از آفتاب ہستی کا کلام اس عرصۂ دراز تک دنیا کی نگاہ سے کیوں کر پوشیدہ رہا ؟ آپ کے دیوان سے گزشتہ قرون کے مصنّفین کا بے خبر رہنا ایک دشوار امر معلوم ہوتا ہے ۔ ہر عہد میں اور ہر دور میں خواجہ کے واقعات لکھے اور پڑھے گئے ہیں ۔ لیکن ان تصنیفات میں خواجہ کے دیوان یا شاعری کا مطلق ذکر نہیں آتا ۔ آپ کی تصنیف انیس الارواح موجود ہے جس میں آپ نے پیر و مرشد حضرت عثمان ہارونی کے ملفوظات جمع کیے ہیں ۔

خود آپ کے ملفوظات حضرت خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی قدس سرّہ نے دلیل العارفین کے نام سے شائع کیے ہیں ۔ سیر العارفین میں ، جو نصیر الدّین ہمایوں بادشاہ کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے ، آپ کے کافی حالات ملتے ہیں ۔ ابوالقاسم فرشتہ نے مشائخ ہند کے احوال میں سب سے مقدّم آپ کا ذکر کیا ہے اور آپ کے متعلق تمام واقعات جمع کردیے ہیں ۔ علاوہ بریں اہل تصوّف کے تذکروں میں آپ کے حالات اکثر موجود ہیں ۔ لیکن ان تمام کتابوں میں نہ صرف آپ کے دیوان بلکہ آپ کے ذوق شعر تک کا ذکر نہیں ملتا ۔ بابو لال صاحب نے ہدایت المومنین کے ایک حصّے کا ترجمہ سنہ ۱۸۰۹ء میں شائع کیا، جس میں خواجہ

صاحب کے مبسوط حالات ملتے ہیں۔ لیکن آپ کے دیوان سے یہ مصنّف بھی اجنبی ہے۔ دیوان فی نفسہ اس سوال پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا۔ اس میں کوئی ایسی شہادت یا تلمیح موجود نہیں جو اس کو خواجہ صاحب کی ذات سے انتساب دے۔ اگرچہ بعض شہادتیں اس انتساب کی تردید کے حق میں، جیساکہ آئندہ معلوم ہوگا، موجود ہیں۔ دیوان ۹۱ صفحات پر ختم ہوجاتا ہے جس میں غزلیات کے سوا کوئی اور صنف نظم موجود نہیں۔ غزلوں کی تعداد ایک سو اکیس ہے اور ابیات کا شمار گیارہ سو بارہ سو کے درمیان ہے۔ شاعر اپنا تخلص دو طرح سے لاتا ہے یعنی معین، اور معینی۔ متعدد غزلیں حمد و نعت میں ہیں۔ کلام سر تا پا عشق و عرفان کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور عشق کا جذبہ بہت غالب ہے۔ رندی اور سرمستی کے مضامین خال خال موقعوں پر نظر آتے ہیں۔ خمریات کا جوش، جب کہ عراقی اور حافظ کے ہاں بہت غالب ہے، یہاں بالکل دبا ہوا ہے۔ شوخی مطلق نظر نہیں آتی بلکہ متین اور سنجیدہ خیالات قدم قدم پر دامن گیر نظر آتے ہیں۔ مذہب سے عداوت نہیں ہے اور نہ شیخ و زاہد کا استخفاف منظور ہے۔ تجرید اور ترک تعلق شاعر کا اصل موضوع ہے، یہاں تک کہ بہشت و خلد، جو زہاد کی غایت مقصود ہے، دام گاہِ علائق بنا دی گئی ہے۔ کلام میں متانت اور شیرینی نظر افروز ہے۔ خیالات میں نزاکت اور خوش اسلوبی، جو متاخرین کا دست مایۂ ناز ہے، غلبہ پائے ہوئے ہے۔ زبان میں کچھ اس قسم کی گھلاوٹ اور لطافت موج زن ہے جو خواجہ معین الدّین کے ایام میں قطعی نامعلوم تھی۔ نا تمام بندشیں اور ترکیبیں متاخرین کے طرز کی پائی جاتی ہیں۔ ادائگی خیالات کے لیے الفاظ کے بوقلموں پیرائے شاعر کے قبضے میں ہیں، جس سے معلوم ہوتا کہ غزل کی زبان اس عہد تک ترقی اور وسعت، بدرجہ کمال پاچکی تھی مثلاً ہستی انسانی یا وجود انسانی کا مقصد ادا کرنے کے لیے شاعر نے یہ ترکیبیں اختیار کی ہیں۔

زنگ تن، نقاب حدوث، پردہ تن، دلق ہستی، زندان تن، لباس حدوث، پردہ آب و گل، شبستان بدن، پردہ خاک وغیرہ وغیرہ۔

کلام کا عام جوہر سادگی، سادہ بیانی اور سادہ خیالی ہے، تکلفات سے عام طور پر احتراز ہے۔ خیالات کی بوقلمونی اور تنوع غزل کا تمغائے امتیاز ہے لیکن اس دیوان میں بیرونی اور اجنبی خیالات بہت کم چھیڑے گئے ہیں، نفس مضمون پر توجہ مائل ہے، اس لیے اشعار میں ایک قسم کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ حقائق و دقائق، تصوف، واردات سلوک، تجرید و توحید، فنا و بقا، نفی و اثبات، اشتیاق دیدار، بیان عشق وغیرہ کے اظہار پر شاعر کی تمام شاعری مبذول

ہے۔ مضمون کی اس تنگی سے کلام میں ایک خفیف سی اداسی کی جھلک نمودار ہے۔ جدّت اور آمد اچھے خاصے پیمانے پر ہے۔ بعض ابیات ایسے صاف اور ہموار نکل آئے ہیں کہ دل میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا کلام معلوم ہوتا ہے جو جذبات عشق الہیٰ سے سرشار اور رسول عربیؐ کا عاشق زار ہے۔ مسافر منازل طریقت ہے لیکن شریعت کی روشنی میں۔ عشق ہے لیکن متانت کے ساتھ، دیوانگی میں بھی دانائی کی ادا موجود ہے۔ مسائل معرفت کے ساتھ فلسفۂ تصوف کی اصطلاحات کو نہایت بے تکلفی اور خوش اسلوبی کے ساتھ برتا گیا ہے جو عراقی اور حافظ کو بھی نصیب نہیں۔ ان دقائق نے کلام کو بعض وقت دقیق اور پیچیدہ کر دیا ہے۔ حکیم سنائی غزنوی کے ہاں زاہدی اور تصوف میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ان کا بیان تصوف، پند و موعظت، اخلاق و حکم اور زہد و تقویٰ پر منحصر ہے۔ عطار نے مثنوی کے علاوہ غزل کو خصوصیت کے ساتھ دقائق و نکات معرفت و سلوک کی اشاعت کا میدان بنایا۔ عطار کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جذبۂ عشق، کیفیات روحانی اور واردات حقیقت کی ترجمانی کے لیے اپنے ہم عصر شیخ محی الدّین ابن عربی کی طرح مجاز کی زبان اختیار کی اور اس غرض سے مے و جام، پیمانہ و میخانہ، بت و مغ، ترسابچہ و گبر، دیر، مینا، ناقوس، چلیپا، شاہد و شمع، زنار و خرابات وغیرہ وغیرہ کو خاص معنی دے کر غزل سے آشنا کردیا۔ حقیقت و مجاز کے اتحاد نے غزل میں ایک خاص حلاوت و ملاحت پیدا کرکے اس کے خط و خال کو قصیدے سے بالکل ممیز کردیا۔ حقیقت کا اظہار مجاز کے پیرائے میں فرید الدّین عطار سے شروع ہوتا ہے عطّار کے تتبّع میں مولانا روم نے اس زمین کو زیادہ وسعت دی۔ عراقی نے غزل کی شراب کو زیادہ تیز اور سر جوش کردیا۔ حافظ نے اس کے رنگ کو شوخ اور کیف کو زیادہ لطیف بنا دیا اگرچہ غزل نے اس طرح خرابات کی آب و ہوا اور تصوف و عرفان کی آغوش میں پرورش پائی اور حقیقت و مجاز کی دو عملی میں ہوش سنبھالا لیکن فلسفۂ تصوّف کا خلعت اس کو جامی اور مغربی عطا کرتے ہیں۔ یہی آخری رنگ اس دیوان میں ہے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ دیوان میں مسئلۂ ہمہ اوست پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ذیل میں بعض مثالیں درج ہیں:

کسی کہ عاشق و معشوق خویشتن ہمہ اوست
حریف خلوت و ساقی خویشتن ہمہ اوست
اگر تو خرقہ ہستی خویش پارہ کنی
نظر کنی کہ درین زیر پیرہن ہمہ اوست

گو کہ کثرت اشیا نقیض وحدت گشت
تو در حقیقت اشیا نظر فگن، ہمہ اوست
چو نائے کہ نہد بر زبان نی لب خویش
نہادہ بر دہن عاشقان دہن ہمہ اوست
چہ جای بادہ و جام و کدام ساقی مست
خموش باش معینؔ و دم مزن، ہمہ اوست

دیگر

جمال یار می خواہی بذرات جہان بنگر
کہ ہر ذرہ است مرآتی کزو دیدار می تابد

دیگر

صفات و ذات چو از ہم جدا نمی بینم
ہر چہ می نگرم، جز خدا نمی بینم

متعدد موقعوں پر شاعر نے اپنے آپ کو "مسکین معین" لکھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر مسکین کا لفظ اپنے تخلص یا نام کے ساتھ استعمال کرنے کا عادی تھا۔ اس قسم کی بعض امثال حوالۂ قلم ہیں:

در آ بہ مجلس مسکین معین شوریدہ
کہ نقل و بادہ ز گفت و شنید خود بینی

دیگر

مسکین معین در یک غزل بنمود اسرار ازل
بشنو کلام لم یزل در کسوت گفتار او

دیگر

چون دل مسکین معین آئینہ تست ای کریم
آئینہ خود را صفائی دہ ز نور خویشتن

دیگر

گنگ شو مسکین معین ہم خود ثنای خود مگو
بہتر آن باشد کہ من گویم بدین سان حمد تو

دیگر

در مجلس مسکین معین یک دم نشین صد در بچین
بنگر چه در هاي ثمین داده است دریای دلم

دیوان کے تتبع سے اس قدر اور پایا جاتا ہے کہ شاعر اپنی زندگی میں واعظ ضرور رہا ہے کیونکہ بعض مقطعوں میں اس نے منبر، مجلس اور وعظ کی طرف کئی مقامات پر تلمیح کی ہے۔ چنانچہ ذیل کی امثال شاہد ہیں:

بزم خاص است معین بادہ وحدت پیش آر
بان کہ مستی تو بر مجلسیان تافتہ است

دیگر

معین آئی بہ منبر، بگوئی نکتہ عشق
کہ بلبل چمن عشق در زمانہ توئی

دیگر

گرچہ شاہان را بہ تخت و تاج زینت می دہند
جلوہ مسکین معین بر تاج و منبر کردہ اند

دیگر

معینی گر ہمی خواہی کہ سرش بر زبان رانی
مقام آن سر دار ست، بر منبر نمی گنجد

دیگر

بیا بہ وعظ معینی رموز عشق شنو
کہ از حکایت او بوی دوست می آید

دیگر

معین را در صغر آنکس بہ منبر در سخن آرد
کہ در گہوارہ طفلی قرین ابن مریم شد

دیگر

خلق گویندم معین این رمز بر منبر مگوی
آہ کین آتش ہزاران واعظ و منبر بسوخت

ان اشعار سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ شاعر کا پیشہ وعظ گوئی تھا۔ گزشتہ مشاہدات کی روشنی میں اس دیوان کو خواجہ معین الدین چشتی کی طرف منسوب کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے گزشتہ دلائل کو مختصراً یہاں پھر دہراتا ہوں:

۱۔ تاریخ خواجہ صاحب کی شاعری اور ان کے دیوان سے ناواقف محض ہے۔

۲۔ اس دیوان کی زبان خواجہ صاحب کے عہد کی زبان ہرگز نہیں بلکہ متاخرین کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ دیوان میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی رو سے اس کا تعلق خواجہ صاحب سے قائم کیا جائے۔

۴۔ دیوان سے اس قدر ظاہر ہے کہ اس کا قائل کوئی واعظ ہے۔ چونکہ داخلی شہادت سے اس قدر مفہوم ہوتا ہے کہ وہ کسی واعظ کا کلام ہے، اس لیے ہمیں واعظین کے سلسلے میں اس کے مصنف کی تلاش کرنی چاہیے۔ اس غرض سے میں مولانا معین الدّین بن مولانا شرف الدّین حاجی محمد الفراہی، صاحب، معارج النبوت، اور مشہور واعظ کا نام پیش کرتا ہوں۔

مولانا اپنی تصنیفات میں اپنے آپ کو مسکین معین، لکھنے کے عادی ہیں۔ آپ سلطان ابو الغازی حسین کے عہد کے زبردست فاضل ہیں اور مولانا جامی کے ہم عصر۔ آپ اپنے عہد کے مشہور واعظ اور صاحب تصنیفات کثیرہ ہیں۔ دنیاوی تعلقات سے اس قدر بیزار تھے کہ جب سنہ ۹۰۰ھ میں آپ کے بھائی مولانا نظام الدّین قاضی ہرات نے اس عالم فانی سے رحلت کی تو آپ نے سلطان حسین کی استدعا اور اصرار پر بہ دقّت تمام اپنے بھائی کا منصب قبول کیا اور ایک سال کے بعد ہی اس سے دست کش ہوگئے۔ آپ کا درجہ علم و فضل اور زہد و تورع میں نہایت ممتاز تھا۔ طبیعت میں بلندی اور دنیا کی طرف سے بے پروائی لبی ہوتی تھی۔ جامع مسجد ہرات میں ہر جمعے کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے وعظ میں اثر، تقریر میں تاثیر اور بیان میں دلکشی تھی۔ ہزاروں مستمعین آپ کے وعظ سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ ان مجالس تذکیر میں بڑے بڑے جلیل القدر امراء بھی شریک ہوتے تھے اور مولانا ان کی وجاہت دنیاوی کی ذرا پروا نہ کرکے، برسر منبر ان کے افعالِ قبیحہ پر سرزنش کرتے تھے۔ وہ سنتے تھے اور اُف نہیں کرسکتے تھے۔ سچ کہا ہے:" حق کا مرتبہ دولت اور حکومت سے بالا ہے۔" تاریخ حبیب السّیر میں مولانا معین الدّین کے حالات میں (صفحہ ۳۳۸، جلد سوم، جزو سوم) یہ عبارت

ملتی ہے:

"مولانا معین الدین الفراہی برادر ارشد قاضی نظام الدین بود و بسیاری از فضایل و کمالات اظہار وقوف می نمود۔ در زہد و تقویٰ درجۂ علیا داشت و اکثر خطوط را در غایت جودت بر صحیفہ تحریر می نگاشت۔ در ایّام جمعہ بعد از نماز در مقصورۂ مسجد جامع ہرات وعظ در کمال تاثیر می گفت و درر غرر معانی آیات و احادیث را بہ الماس طبع لطیف می سفت ۔ با عاظم امراء و نوئینان کہ در مجلس وعظ می نشستند ملتفت نمی گشت و در وقت نصیحت آن طائفہ سخنان درشت برز بانش میگذشت و آن جناب بعد از فوت برادر بموجب تکلیف خاقان والا گہر مدت یک سال صاحب قضا بود، آنگاہ ترک آن امر دادہ، ہر چند دیگر مبالغہ نمودند قبول نفرمود۔ از آثار قلم لطافت نگار مولانا معین الدّین، معارج النبوت، درمیان مردم مشہور است و اکثر وقائع و حالات سیّد کائنات علیہ افضل الصلواۃ و اکمل التحیّات برو آیات مختلفہ در ان مسطور و مولانا معین الدّین در شہور سبع و تسعمائۃ مریض شدہ در گذشت و در مزار متبرک حضرت باری خواجہ عبداللہ انصاری پہلوی برادر خود قاضی نظام الدّین مدفون گشت۔"

مولانا معین الدّین نے چالیس سال کامل وعظ و تذکیر میں صرف کیے ہیں۔ وعظ سے جو وقت بچتا تھا، تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا تھا۔ آپ نے فن تذکیر کو، بر خلاف ہمارے علمائے عہد کے رویے کے، حتی الوسع دلچسپ اور شگفتہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے مواعظ اور تصنیفات مذاق شعر سے پر ہیں۔ ان میں عشق و تصوف کا رنگ نہایت شوخ ہے۔ شعر میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ طبیعت میں زود گوئی بہت معلوم ہوتی ہے۔ آپ کا مرتبہ شعرائے متصوفین میں عراقی اور مغربی کے مساوی مانا جائے تو مبالغہ نہیں کہا جاسکتا۔ شعر کا مذاق فن تذکیر کی طرح خاندانی ہے۔ آپ کے والد مولانا شرف الدین حاجی محمد، جو مرزا ابو القاسم بابر کے عہد کے مشاہیر فقہا میں شمار ہوتے تھے، خود بھی شاعر تھے۔ میں تبرکاً ان کے چند اشعار یہاں درج کرتا ہوں:

نقاش قصر فطرت ، بی صورت و ہیولیٰ
بر صدر لوح حکمت نقشی کشید زیبا
شہباز جان نشستہ بر قبہ معانی
عنقای عقل جستہ بر قاف قرب ماویٰ
برداشت قبضۂ گل، بنگاشت پیکر دل
از نور اوست حاصل ، خورشید اوج اعلیٰ
مجموعۂ عجائب ، اعجوبۂ غرائب
پاک از ہمہ شوائب ، از جسم و جان معرّیٰ

مولانا معین الدّین تصانیف کثیرہ کے مالک ہیں ۔ ان کی کتابیں اور رسالے بے شمار ہیں لیکن جو مجھے معلوم ہو سکیں، ذیل میں درج ہیں:

۱۔ تفسیر بحر الدّرر۔

۲۔ تفسیر حدائق الحقائق فی کشف اسرار الدّقائق۔

۳۔ واضحہ فی اسرار الفاتحہ۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے

۴۔ معارج النبوۃ فی مدارج الفتوہ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل سوانح عمری ہے جس میں آپ کے اجداد امجاد یعنی ساتوں انبیائے اعظم کے بھی حالات درج ہیں ۔ سنہ ۸۹۱ھ میں اس کتاب کی ابتداء ہوئی اور کئی جلدوں میں اس میں ایک مقدمہ، چار رکن اور ایک خاتمہ ہے۔ کتاب کو جا بجا اقوال، آیات نکات اور اشعار سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شعراء میں سنائی، عطار، مولانا روم، اوحدی، عراقی اور مولانا جامی کے ابیات موقع بہ موقع استعمال کیے ہیں۔ اس کے سوا شاعر نے اپنے اشعار بھی کثرت کے ساتھ نقل کیے ہیں۔

۵۔ روضۃ الواعظین فی احادیث سید المرسلین، چار جلدوں میں ہے۔

۶۔ تفسیر سورۂ یوسف علیہ السلام۔

۷۔ اعجاز موسوی۔ یہ وہی کتاب ہے جس کو مخزن الغرائب میں معجزات موسوی لکھا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں ایک مبسوط تصنیف ہے جو مطبع عمدۃ المطابع میں سنہ ۱۲۷۲ھ میں چھپ بھی چکی ہے۔

ان کے علاوہ اور رسالے اور کتابیں کثرت سے ہیں، جو مولانا معین الدّین کے قلم

سے نکلی ہیں۔ جن کی ہیں سراغ رسانی نہیں کر سکا۔ نظم میں آپ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ آپ کا کلام از قسم رباعی و غزل و مثنوی کثرت سے ملتا ہے۔ ایک رسالہ مثنوی میں بھی آپ نے لکھا ہے۔

میرا ایسا خیال ہے کہ اکبری عہد کے مؤرخین کو مولانا کے متعلق صحیح معلومات تھیں لیکن بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان کے حالات سے بہت کم اعتنا کی ہے۔ مجھے صرف ایک مختصر بیان مولانا کے متعلق تذکرۂ مخزن الغرائب میں ملا ہے جس نے میرے تمام شکوک کو یقین کے درجے تک پہنچا دیا۔

مجھے نہایت رنج اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ نایاب اور ضخیم تذکرہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے۔ مولانا معین الدّین کے حالات صاحب تذکرہ کو تین مختلف ذرائع سے ملے ہیں۔ چونکہ وہ نہایت ہی ناکافی اور غیر معیّن تھے اس لیے نتیجہ یہ ہوا کہ مخزن الغرائب میں مولانا کی ذات واحد اقانیم ثلاثہ میں تبدیل کرلی گئی اور ایک معین کے تین معین بن گئے۔

اس تذکرے میں سب سے مقدم مولانا معین الدّین ہروی ہیں جن کے واسطے مصنّف تذکرہ کے الفاظ ہیں:

"مولانا معین الدّین هروی فاضل تحریر و دانش مند کامل بوده۔ کتاب ، مدارج النبوه ، و ، معجزات موسوی، (اعجاز موسوی) و تفسیر قرآن ازو در عالم مشهور است، و در تفسیر آن قدر نکات و عجائبات بیان کرده که در ہیچ تفسیر دیده نشد، و در نظم و نثر کمال مهارت داشته ، علی الخصوص در انشای محمدؐ (کذا)۔ این چند بیت از ذہن مستقیم اوست:

چو من ز بادۂ شوق تو مست و بی خبرم
ہمہ جمال تو بینم ہر چہ می نگرم
تو ہر حجاب کہ خواہی فرو گذار کہ من
بہ نعرۂ کہ زنم صد حجاب را بدرم"

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ غزل، جس کا مطلع اور ایک شعر مخزن الغرائب میں درج ہے، موجودہ دیوان (طبع نولکشور سنہ ۱۲۸۸ھ) میں صفحہ ۵۶ پر پائی جاتی ہے، جس کے کل سات شعر ہیں۔ یہی غزل مولانا کی تصنیف ، معارج النبوت، (مقدمہ و فصل اوّل ، تمہید

الاول) میں پوری کی پوری درج ہے ۔ اس طرح موجودہ دیوان کو مولانا معین الدّین کی طرف منسوب کرنے کے لیے ہمیں یہ پہلا مگر یقینی سراغ ملتا ہے۔

۲۔ دوسرے معین فراہی ہیں جن کے لیے منقول ہے:

"معین فراہی راست:

گر فصل بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد
گر وصل نگار آمد کہ دل با عیش ہمدم شد"

دیوان میں رجوع کرنے سے علم ہوتا ہے کہ یہ پندرہ شعر کی غزل ہے اور صفحات ۲۲ و ۲۳ پر ملتی ہے۔ اس غزل کے آٹھ شعر مع مطلع بالا کتاب "معارج النبوۃ" (رکن اوّل، باب ہفتم، فصل چہارم) میں ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ معین فراہی اور معین الدّین ہروی ایک ہی شخص ہیں۔ نیز یہ کہ موجودہ دیوان کے بھی یہی مالک ہیں ۔ ۳۔ تیسرے ملّا معینی ہیں۔ ان کے متعلق "الغرائب" میں تحریر ہے:

"ملّا معینی در زمان اکبر پادشاہ بودہ است:

اگر از خواب غفلت سر بر آری آن زمان بینی
کہ خورشید تجلی بر در و دیوار می تابد"

دیوان میں یہ غزل ۳۵ پر ملتی ہے جس کے چودہ بیت ہیں ۔ اس غزل میں شعر بالا بھی موجود ہے، اس فرق کے ساتھ کہ قافیے میں "در و دیوار" "دل بیدار" ہے ۔ اس غزل کا مطلع ہے:

چنان از روزن دل نور آن دلدار می تابد
کہ خورشید جمالش از در و دیوار می تابد

یہ مطلع کتاب "معارج النبوۃ" (رکن دوم، باب سوم، فصل سوم، صفحہ ۶۲، طبع نولکشور) میں بھی ملتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ملّا معینی اور مولانا معین الدّین ایک ہی ہستی ہیں ۔ مولانا، جیسا کہ دیوان اور ان کی دیگر تصانیف سے معلوم ہوتا ہے، اپنا تخلص دونوں طرح لاتے ہیں ۔ اس غلط خیال کی، کہ وہ اکبر کے عہد میں تھے، تردید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، اس لیے کہ ان کے متعلق صحیح اطلاع گذشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے ۔

ذیل میں "تذکرۂ حسینی" اور "تذکرۂ روز روشن" کے انتخابیہ اشعار، جو خواجہ معین الدّین چشتی کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، مطالعہ کرتا ہوں:

ز پیش خویش برافگن نقاب دعویٰ را
ببین بہ دیدۂ صورت جمال معنیٰ را
بحق او کہ بہ کونین دیدہ نکشایم
کہ تا نخست نہ بینم جمال مولیٰ را
اگر در آتش عشقت بسوختم چہ عجب
کہ کوہ تاب نیاورد یک تجلیٰ را
معین بہ چشم خرد حسن دوست ننماید
بہ بین بہ دیدۂ مجنون جمال لیلیٰ را

دیوان میں اس غزل کے سات شعر ہیں اور صفحہ ۵ پر ملتی ہے۔ لیکن اس غزل کا دوسرا شعر یعنی۔ بحق او کہ بکونین الخ، کتاب، معارج النبوۃ، رکن اوّل، باب سوم، فصل دوم، لطیفہ رابع عشرہ کے تحت میں مندرج ہے اور دوسرا شعر کتاب، اعجاز موسوی، (صفحہ ۲۲۹، عمدۃ المطابع، سنہ ۱۲۷۲ھ) میں ملتا ہے اور ظن غالب یہی ہے کہ یہ غزل مولانا معین الدّین کی ہے۔

تذکرۂ روز روشن، از مظفر حسین صبا، صفحہ ۲۳۸ - ۶۳۰، طبع سنہ ۱۲۱۶ھ۔ اس تذکرے میں خواجہ معین الدّین چشتیؒ کے دیوان سے جو اشعار انتخاب ہوئے، ان میں ایک شعر یہ ہے:

این چہ نور است کہ بر کون و مکان تافتہ است
نور عشق است کہ از مطلع جان تافتہ است

دیوان میں یہ نو اشعار کی غزل ہے اور صفحہ ۹ پر ملتی ہے۔ کتاب، معارج النبوۃ، (مقدمہ، فصل اوّل، تمہید عاشر) میں اس غزل کے سات اشعار مع مطلع درج ہیں اور سب سے اہم یہ امر ہے کہ مصنّف نے غزل کی ابتداء میں دعویٰ کیا ہے کہ یہ میری غزل ہے۔ چنانچہ اس کے الفاظ ہیں:

"للعبد الضعیف نوّر اللہ قلبہ۔"

یہ غزل بھی مصنّف کی اپنی شہادت پر معارج النبوۃ کے مصنّف مولانا معین الدّین کی طرف منسوب کرنا چاہیے، نہ (کہ) خواجہ معین الدّین چشتیؒ کی طرف:

درون قصر دل دارم یکی شاہی کہ گہ گاہی
ز دل بیرون زند خیمہ بہ بحر و بر نمی گنجد

دیوان میں اس غزل کے گیارہ شعر ہیں اور صفحہ ۲۵ پر ملتی ہے اور مطلع ہے۔

مرا در دل بغیر از دوست چیزی در نمی گنجد
بخلوت خانہ سلطان کسی دیگر نمی گنجد

معارج النبوۃ (رکن اول، باب ہفتم، فصل سیزدہم، لطیفۃ الثانیہ) میں اسی غزل کے چار شعر مصنف نے لکھے ہیں جن میں شعر بالا بھی موجود ہے۔

راہ بکشای کہ دل میل بہ بالا دارد
پردہ برگیر کہ جان عزم تماشا دارد

دیوان میں صفحہ ۲۹ پر یہ غزل ملتی ہے جس کے نو شعر ہیں۔

"معارج النبوت" (مقدمہ، فصل سوم، البحث التاسع) کے خاتمے پر کامل غزل مرقوم ہے۔

اندر آئینہ جان عکس جمالی دیدم
ہمچو خورشید کہ در آب زلالی دیدم

دیوان میں صفحہ ۴۸ پر یہ غزل ہے جس میں کلہم نو شعر ہیں۔ اسی غزل کے نو شعر مع مطلع معارج النبوت، رکن اول، باب ہفتم، فصل یازدہم، لطیفہ خامسہ کے اختتام پر موجود ہیں۔

صفات و ذات چو از ہم جدا نمی بینم
بہر چہ می نگرم ، جز خدا نمی بینم

یہ آٹھ ابیات کی غزل ہے اور دیوان میں صفحہ ۵۲ پر ملتی ہے۔ "معارج النبوۃ" میں رکن سوم، باب چہارم، فصل بست و چہارم، صفحہ ۲۱۹ (نولکشور) پر اس غزل کے چھے شعر مع مطلع و مقطع مرقوم ہیں۔

میں بخوف طوالت مضمون "روز روشن" کا مطالعہ ختم کرتے ہوئے گذارش کرتا ہوں کہ اس تذکرے کے اشعار کا مولانا معین الدین کی تصنیف میں پایا جانا دلیل ہے اس دعوے کی کہ یہ اشعار مولانا معین الدینؒ کے ہیں، نہ (کہ) خواجہ معین الدینؒ کے۔

اب میں صرف ان اشعار کا ذکر کروں گا جو دیوان اور "معارج النبوت" میں عام ہیں اور ان میں سے بھی وہی اشعار لوں گا جن کے مصنف ہونے کا مولانا معین کو دعویٰ ہے:

چشم بکشای کہ آفاق پر از نور خداست
خالی از نور خدا در ہمہ آفاق کجاست

دیوان میں صفحہ ۰ پر یہ غزل ہے اور سات شعر کی ہے ۔ اسی غزل کے تین شعر معارج النبوت ۰ (مقدمہ فصل اوّل، تمہید السابع) میں پائے جاتے ہیں ۔ مصنّف ان کی ابتدا میں لکھتا ہے "لعبد الضعیف"۔

آتشی افروخت عشق و جسم و جان من بسوخت
گفتم آہی بر کشم کام و زبان من بسوخت

اس غزل کے گیارہ ابیات ہیں اور دیوان میں صفحات ۱۱ ۔ ۱۲ پر ملتی ہے۔ اس غزل کے نو شعر مع مطلع کے "معارج النبوت" میں (مقدمہ ، فصل اول، تمہید العاشر کے خاتمے پر) موجود ہیں ۔ ان کے واسطے مصنف لکھتا ہے :

"لمؤلفہ غفر اللہ لہ ۔"

یہی غزل اس تصنیف کے رکن اوّل، باب ہفتم، فصل ہشتم کے اختتام پر پھر پائی جاتی ہے جس میں آٹھ شعر ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل مصنّف کو بہت مرغوب تھی۔ کیونکہ وہ اس کی دوسری تصنیف "اعجاز موسوی" میں پھر دہرائی گئی ہے، جہاں صفحہ ۹۷ ۔ ۹۸ پر ملتی ہے اور مصنف ابتدا، میں لکھتا ہے : "چنانچہ فقیر گوید" ۔ اسی غزل کے چھے بیت اسی اعجاز موسوی میں صفحہ ۳۶ پر پھر پائے جاتے ہیں، جن کے لیے دعویٰ کیا ہے "ابیات مؤلفہ"۔

آتشی آمد پدید و جسم و جان یکسر بسوخت
دل درون سینہ ام چون عود در مجمر بسوخت

اس غزل کے سات شعر ہیں اور دیوان میں صفحہ ۱۲ ۔ ۱۳ پر ملتی ہے ۔
اعجاز موسوی میں پوری غزل صفحہ ۹۲ موجود ہے اور مصنّف کا دعویٰ ہے :

"لمؤلفہ فی ہذا المعنی۔"

کسی کہ عاشق و معشوق خویشتن ہمہ اوست
حریف خلوت و ساقی خویشتن ہمہ اوست

یہ گیارہ شعر کی غزل ہے اور دیوان میں صفحہ ۱۳ پر نظر آتی ہے۔ معارج النبوت میں (مقدمہ ۔ فصل اول، تمہید الثامن کے آخر میں) تمام غزل مرقوم ہے اور "لمؤلفہ" مصنّف کا دعویٰ ہے۔

یارب این صورت کہ در مرآت جان پیداست کیست؟
آنچنان حسنی درین پردہ نہان پیداست کیست؟

دیوان میں صفحہ ۱۴ پر سات شعر کی یہ ایک غزل ہے۔ "اعجاز موسوی" میں یہی غزل صفحہ ۲۵۹ پر موجود ہے۔ اس کی ابتداء میں صاحب کتاب "لمولفہ" کہہ کر اپنی غزل ماننا ہے۔

حمدیکہ ہمچو بحر کرم بیکران بود
حمدیکہ شکر نعمت ہر دو جہان بود

دیوان میں صفحات ۱۶ - ۱۹ پر یہ حمدیہ قصیدہ ملتا ہے جس میں ایک کم پچاس اشعار ہیں۔

یہ تمام قصیدہ، معارج النبوت، مقدمہ، فصل اول، تمہید الثانی عشرہ میں پورا موجود ہے۔ اس کی ابتداء میں صاحب معارج کے الفاظ ہیں: "قال مؤلف الکتاب ختم اللہ آمالہ بالرشد و الصواب۔" اسی قصیدے کے چند اشعار، اعجاز موسوی، کے صفحہ ۵۸ پر نظر آتے ہیں اور ان کی ابتداء میں مصنف کا دعویٰ ہے: "چنانچہ فقیر گوید۔"

چشم بکشای کہ دیدار خدا جلوہ نمود
دیدہ شو یکسر و بربند در گفت و شنود

یہ چودہ شعروں کی غزل صفحہ ۲۳ پر دیوان میں ملتی ہے۔ (فصل پنجم باب دوم، رکن اول)۔ "معارج النبوہ" میں اس غزل کے چار شعر ہیں جن کے واسطے مصنف کہتا ہے: "چنانچہ معین دیوانہ تو گوید"۔ اسی غزل کے بارہ شعر مع مطلع و مقطع اسی کتاب کی تمہید الخامس، فصل اول، مقدمے میں مرقوم ہیں۔

وقت آنست کہ دل واقف اسرار شود
جای آنست کہ جان طالب دیدار شود

دیوان میں صفحہ ۲۰ پر یہ غزل ہے۔ اس میں ۲۱ ابیات ہیں۔ اس غزل کے سات شعر "معارج النبوۃ" (رکن اول، باب دوم، فصل پنجم) میں آتے ہیں۔ ابتداء میں مؤلف گویا ہے: "چنانچہ معین دیوانہ تو گوید"۔ اسی غزل کے پانچ شعر مع مطلع "معارج النبوۃ" (مطبوعہ) میں (رکن سوم، باب چہارم، فصل بست و چہارم، در لطائف و اشارات) صفحہ ۲۹۱ پر پائے جاتے ہیں اور حسب معمول شاعر ابتداء میں کہتا ہے: "چنانچہ فقیر تو گوید۔"

نفحہ عشق گزان سوی جہان می آید
بہ مشام دلم از عالم جان می آید

یہ صفحہ ۳۴ - ۳۵ پر دیوان میں سترہ ابیات کی غزل ہے۔ اسی غزل کے چھے بیت مع مطلع، فصل پنجم، باب دوم، رکن اول، معارج النبوت، میں نظر آتے ہیں۔ ان کے لیے مصنف گویا ہے: "چنانچہ فقیر گوید مولوی معین۔"

اگر بی پردہ نتوانی کہ بینی پرتو ذاتش
بذرات جہان بنگر کہ ہر ذرہ است مر آتش

یہ دیوان میں صفحہ ۴۳ پر سات بیتوں کی غزل ہے۔ "معارج النبوت" (رکن اول، باب دوم، فصل پنجم) میں اس کے دو شعر ملتے ہیں۔ اور یہی اشعار مقدمہ، فصل دوم، مناجات الثالث "معارج النبوۃ" میں بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں شاعر کہتا ہے: "لمولفہ۔"

بیا در بزم "او ادنی" یکی حرفی زمن بشنو
وزان اسرار "ما اوحیٰ" یکی طرزی سخن بشنو

یہ سات شعروں کی غزل دیوان میں صفحہ ۸۰ پر آتی ہے۔ معارج النبوہ (مطبوعہ) میں (رکن سوم، باب چہارم، فصل دوم) صفحہ ۱۰۷ پر اس کے چھے شعر پائے جاتے ہیں اور مصنف ان کے لیے "مولفہ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

از مطلع دل زد علم یک لمعہ از رخسار او
شد ذرہ ذرہ ہستیم در پردۂ انوار او

صفحہ ۹۰ پر دیوان میں یہ پندرہ ابیات کی غزل ملتی ہے۔ مقدمہ "معارج النبوہ" فصل اول، تمہید ثانی کے خاتمے میں اس کے دس شعر موجود ہیں جن کو مصنف نے "لمولفہ" کے ذیل میں درج کیا ہے۔ اسی غزل کے تین شعر اسی کتاب کے رکن اول، باب سوم، فصل دوم کے اختتام پر پائے جاتے ہیں جن کے شروع میں مولانا معین فرماتے ہیں: "و فقیر ترا درین باب معنی بخاطر گذشتہ چنانچہ فقیر تو گوید۔"

ہستی طلیعہ ایست ز نور وجود او
کونین شبنمی است ز دریای جود او

دیوان میں صفحہ ۸۰ - ۸۱ پر یہ غزل درج ہے جس کے گیارہ بیت ہیں۔ "معارج

النبوۃ" میں (مقدمہ فصل اول، تمہید السادس کے خاتمے میں) یہ پوری غزل درج ہے اور ابتدا میں "لمؤلفہ" آتا ہے۔

پیش ازان کاستاد فطرت فرش ایوان ساختہ
پایہ قدرت فراز کون امکان ساختہ

یہ غزل دیوان میں صفحہ ۸۱ اور ۸۲ پر ملتی ہے جس میں پندرہ اشعار ہیں۔ معارج النبوہ کے مقدمے، فصل سوم، نعت دوازدہم میں اس غزل کے نو شعر نظر سے گذرتے ہیں۔ مصنف ان کے متعلق کہتا ہے "قال مؤلف الکتاب ہدی اللہ طریق الصواب فی نعت۔"

اس سے زیادہ مثالیں بہم پہنچانا قارئین کرام کی زحمت کا موجب ہوگا۔ بیسیوں اور ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں مولانا معین الدّین کے ہاں اور موجودہ دیوان میں وہی اشعار موجود ہیں، بلکہ بعض وقت پوری پوری غزلیں عام ہیں۔ جب اس دیوان کی اس قدر غزلیں مولانا معین الدّین کی ثابت ہوتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ باقی غزلوں کو مولانا کی زادۂ طبع نہ مانیں، اور کل دیوان کو انھی کی طرف منسوب نہ کریں، جس کے حقیقت میں وہ جائز مستحق ہیں۔ اب تک مولانا معین الدین کی دو تالیفیں میری نظر سے گذری ہیں، پہلی یہی "معارج النبوۃ" اور دوسری "اعجاز موسوی"۔ بد قسمتی سے "معارج النبوۃ" کا کامل نسخہ ہم نہ پہنچا صرف مقدمہ اور تین رکن میری نظر سے گذرے ہیں۔ باقی رکن چہارم اور خاتمہ مجھے دستیاب نہیں ہوئے۔ ممدوح کثیر التعداد تصانیف کے مالک ہیں۔ اگر ان کی تالیفات میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین واثق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا اس میں پتا لگ جائے گا بلکہ اس کے علاوہ اور سینکڑوں نئی غزلیں ہاتھ آئیں گی جو دیوان کے حجم کو المضاعف کردیں گی۔

حافظ محمود شیرانی:

کیا فارسی قصۂ چہار درویش امیر خسرو کی تصنیف ہے

(تلخیص)

چہار درویش ہمارے ملک کے مشہور افسانوں میں سے ہے۔ جس میں آزاد بخت پادشاہ روم اور چار درویشوں کا قصہ مع دیگر ذیلی کہانیوں کے ملتا ہے۔ موجودہ افسانوں میں اس کا پایہ نہایت بلند ہے اور الف لیلیٰ کے بعد قصۂ حاتم طائی کے ساتھ بہترین افسانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہ قصہ ہمارے ہاں فارسی سے آیا ہے۔ سب سے پہلے محمد حسین عطا خاں تحسین اس کو مُکلّف اُردو میں لکھ کر نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ کے نام پر معنون کرتے ہیں۔ ان کی تالیف کا نام نو طرز مرصّع ہے۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے ایک انعامی اشتہار کی بناء پر میر امّن نے اس کو ٹھیٹ اردو محاورے میں لکھ کر بقائے دوام کا خلعت حاصل کیا۔ میر امّن کی یہ تالیف جس کا تاریخی نام "باغ و بہار" ہے۔ اُردو زبان کی زندۂ جاوید مصنّفات میں شمار ہونے کے قابل ہے...

فارسی میں چہار درویش کے قصّے پر مختلف شخصیتوں نے قلم اٹھایا ہے۔ نثر کے علاوہ نظم میں بھی اس پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کے مؤلفین میں سے صرف دو شخصوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔

(۱) حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں

(۲) انجب جس کا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرے میں کیا ہے ..(تذکرۂ عقد ثریا: ۱۱۹۹ھ - قصۂ چار درویش در نثر" ... ہمہ بہ گذدی رفتہ ")

ہمارا خیال ہے کہ چہار درویش کم از کم اب تک تین منازل ارتقاء ختم کر چکی ہے یعنی ابتدائی۔ درمیانی اور آخری۔ یہ قصہ اپنی ابتدائی حالت میں نہایت سیدھی سادی اور روکھی پھیکی عبارت میں ملتا ہے۔ جس میں زبان آرائی اور رنگینی کی چاشنی قریب قریب مفقود ہے

اور واقعات کی ترتیب بھی چنداں دلاویز نہیں ہے۔ لیکن اپنے ارتقاء کے آخری دور میں پہنچ کر حک و اصلاح و ترمیم و تنسیخ کے بعد گوناگوں دلچسپیوں کا مرکز بن جاتا ہے اور زبان و بیان کے اعتبار سے شگفتہ اور خوش آیند معلوم ہوتا ہے۔ ہم اپنا تبصرہ اس آخری اصلاح یافتہ چہار درویش سے شروع کرتے ہیں جو ہمارے ملک مین بے حد مقبول ہے اور اُردو ترجموں کا ماخذ ہونے کے علاوہ امیر خسرو سے بھی منسوب ہے اور متعدد بار طبع میں آچکا ہے۔ بمبئی میں میر احمد خلف شاہ محمد نے اس کی ترتیب دی ہے اور قاضی محمد ابراہیم بن قاضی نور محمد نے چھاپا ہے (۱) اسی کی ایک اور اشاعت کے ذمہ دار شیخ الہٰی بخش محمد جلال الدین تاجر کتب کشمیری بازار لاہور ہیں یہی نسخہ باختلاف قلیل مطبع محمدی بمبئی نے ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰-۱۹۰۱ء میں طبع کیا ہے۔ اس میں تکملۂ بختیار نامہ بھی شامل ہے اور میر احمد کا دیباچہ نکال دیا گیا ہے۔ اس کے دو سو چوہتر صفحات اور اکیس سطریں فی صفحہ ہیں۔ اصل قصہ صفحہ ۲۲۰ پر ختم ہوتا ہے۔ باقی ماندہ صفحات میں بختیار نامہ ہے۔

اس نسخے میں قصّے کی تالیف امیر خسرو کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ میر امّن نے بھی اس روایت کو قبول کیا ہے (۲)۔ اگرچہ میر محمد حسین عطا خاں نو طرز مرصّع میں اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے جس سے ظاہر ہے کہ یہ روایت ان ایّام میں اس قدر عالمگیر نہیں تھی۔ بہرحال روایت مذکور عبارت ذیل پر تعمیر پاتی ہے

"باعث تصنیف این داستان از رازپژوہان اخبار پیشینیاں باین نوع مفہوم گردید کہ بارے طبع مقدس جناب سالک مسالک طریقت و ناسک مناسک شریعت قدوۃ العارفین و زبدۃ الصالحین حامی دین متین چراغ ہدایت شمع یقین حضرت شیخ نظام الدین قدس سرّہ العزیز بعارضہ علیل بودند۔ حضرت امیر خسرو دہلوی مدام این قصّہ را زیب رقم فرمودہ بحضور پیر و مرشد خودے خواندی تاآنکہ حضرت موصوف غسل صحت فرمودند این دعاے نمودند کہ یارب ہر کس کہ این قصّہ را بخواند یا بشنود از علّت امراض نجات یابد" صفحہ ۳۰۳۔

اس عبارت سے مفہوم ہوتا ہے کہ اصل قصّہ امیر خسرو کی تالیف ہے اور یہ مختصر دیباچہ مع حمد و نعت کسی نے بعد میں اضافہ کر دیا ہے

۱۔ باوجودے کہ اس قصّے کے ایک سے زیادہ متن ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کی زبان بھی ایسی نہیں جسے امیر خسرو یا ان کے عہد کی زبان کہا جاسکے۔ امیر خسرو کی نثر کے نمونے کافی سے زیادہ ہمارے پاس موجود ہیں۔ جن کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امیر

صنائع و بدائع، دقت پسندی اور پیرایۂ کلام کو پیچ دے کر دشوار فہم بنانے کے عادی تھے۔ لیکن یہ نسخہ نہایت سادہ و سلیس اور خوش مذاقی کی حد تک مقفیٰ و رنگین عبارت پر مرقوم ہے۔ اس کی املا و انشا، پیرایۂ بیان بالکل اُسی اسلوب میں ہے جو ہمارے ہاں گذشتہ اور اس سے قبل کی صدی میں رائج تھا۔

۲۔ چہار درویش کے جو قلمی نسخے ہم تک پہنچے ہیں ان میں قدیم ترین وہی ہیں جو بارہویں صدی ہجری کے مصنف تک ہمیں لے جاتے ہیں۔ اس سے آگے ان کی سراغ رسی نہیں کی جاسکتی۔ نہ اس عہد سے پیشتر کوئی اہل قلم اس تالیف سے آشنا معلوم ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں جہاں اپنے عہد کے مُروّجہ افسانوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً کلیلہ ددمنہ، نل دمن، رامائن، رزم نامہ اور قصۂ امیر حمزہ، ان میں چہار درویش کا نام نظر نہیں آتا۔

۳۔ ادھر شیخ نظام الدین اولیاء کے حالات و مقالات و ملفوظات پر متعدد کتب و رسائل موجود ہیں جو خود اسی عہد کے مشاہیر نے مُرتّب کیے ہیں۔ بعض کے نام یہاں درج کرتا ہوں:۔

فوائد الفواد مرتبہ حسن دہلوی سجزی

* افضل الفوائد مرتبہ امیر خسرو دہلوی
* انوار المجالس از خواجہ محمد بن بدرالدین اسحٰق
* تحفۃ الابرار از خواجہ عزیز الدین صوفی
* سیر الاولیاء از سیّد محمد بن سیّد مبارک کرمانی

ان ملفوظات و مؤلفات کے ذریعے سے شیخ کی زندگی کے تقریباً روزانہ حالات و واقعات پر اطلاع بہم پہنچ سکتی ہے۔ لیکن ان کتابوں میں چہار درویش اور اس کے سبب تالیف کا کوئی مذکور نہیں۔

۴۔ اسی طرح امیر خسرو کے حالات و تصنیفات بالتفصیل معلوم ہیں۔ لیکن نہ مؤرخین نہ تذکرہ نگار اس نام کی کوئی تالیف ان کی تصنیفات میں شمار کرتے ہیں۔

۵۔ جب ہم اصل قصۂ چہار درویش کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس میں متعدد ایسے وجوہ اور قرائن موجود پاتے ہیں جو ایک طرف امیر خسرو سے اس کے تعلق کی تردید اور دوسری طرف اس کے جدید الاصل ہونے کی تائید کرتے ہیں

اس نسخے کو مختلف شعراء کے کلام سے موقع و محل کے مناسب ابیات لاکر آراستہ کیا گیا ہے۔ جس میں باستثناء بعض، اکثر ایسے شعراء داخل ہیں جو امیر خسرو کے بعد کے زمانے

سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً خواجہ حافظ جن کو کثرت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ صفحات ۹، ۲۰، ۵۳، ۵۹، ۶۲، ۶۵، ۹۲، ۱۳۱، ۱۳۵، ۱۹۵، ۲۰۶ پر ان کے اشعار اور غزلیں ملتی ہیں۔ حافظ کے علاوہ فغانی کا یہ شعر منقول ہے۔

سرو قدش کہ از چمن جان بر آمدہ شاخ گُلے بصورت انسان برآمدہ صفحہ ۶۱

اور نظیری کا شعر۔

محبت بادل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد چراغے راکہ دودے ہست در سرزود در گیرد صفحہ ۹۸

غیرتی کی غزل کے تین بیت۔

زدیدہ قطرۂ اشکے رواں نمے آید کہ یک دو لخت جگر درمیاں نمی آید صفحہ ۴۳

عرفی کی غزل سے دو شعر۔

دو عالم سوختن نیرنگ عشق است شہادت ابتدائی جنگ عشق است صفحہ ۹۴

شاپور کی غزل کے چار شعر۔

مے نماید تپش دل رہ پرواز بمن مے روم تا چہ کند نالۂ ناساز بمن صفحہ ۳۰

اور عرفی کی غزل سے دو شعر۔

گو بگواں راکہ مے جستم بداماں یافتم ہم چو صبح ایں دولت از چاک گریباں یافتم صفحہ ۷۰

حافظ کے بعد سب سے زیادہ شیخ سعدی کے اشعار و اقوال ملتے ہیں۔

اللہ کہ روز روشن شمع کافوری نہد زود باشد کش بہ شب روغن نہ بینی در چراغ صفحہ ۱۲

مر او را رسد کبریا و منی کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی صفحہ ۱۳۱

در بیابان خشک و ریگ رواں شلغم پختہ بہ کہ نقرۂ خام صفحہ ۱۴۹

تو خواہی از سخنم پند گیر و خواہ ملال صفحہ ۱۳۹

درویش و غنی بندۂ ایں خاک درانند آناں کہ غنی ترند محتاج ترند صفحہ ۱۵۰

"دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" صفحہ ۲۰۶

۲۔ اب ہم بعض الفاظ کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ امیر خسرو کے عہد میں ان کا وجود نہ تھا

صفحہ ۲۳ "بہزار تومان خریدم"

صفحہ ۲۵ "دوسہ اشرفی بہ غلاماں تواضع کردم"

ہم نے صرف ان دو مثالوں پر قناعت کی ہے۔ ورنہ تومان اور اشرفی کا ذکر اس تالیف میں بکثرت موجود ہے۔ اوّل الذکر ایرانی اور آخر الذکر ہندوستانی سکّہ ہے۔ تومان اور اشرفی بحیثیت اصطلاح زر مروّجہ بالکل جدید الاستعمال ہیں۔ ساتھ ہی الفاظ آیندہ پر بھی غور ہو۔

صفحہ ۱۰۶، ۱۰۰ قورچیان، صفحہ ۳۳۱ کشکچیاں، صفحہ ۱۶۸ کشک خانہ، صفحہ ۱۹۸، اشک آقایان؟ صفحہ ۱۵۵ وکیل السلطنہ۔ صفحہ ۲۲۵ خزانہ دار صفحہ ۳۳۲۔ امیر آخور۔ اب یہ تمام اصطلاحات ہندوستان میں مغلوں کی آمد کے بعد رواج پائی ہیں۔

۷۔ اس تالیف میں دوربین کا بھی ذکر آتا ہے۔ خواجہ سگ پرست اپنے اونچے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا زیر دامن صحراد دریا کے نظارے میں مصروف ہے دور میدان میں اسے دو صورتیں نظر آتی ہیں جنھیں وہ پہچان نہیں سکتا۔ دوربین منگوا کر دیکھتا ہے

"ناگاہ سیاہی دو نفر دیدم کہ در بیاباں مے آمدند۔ دوربین راطلبیدم و نیک ملاحظہ کردم" صفحہ ۱۳۵

اب دوربین یورپ میں بھی جو اس کا وطن ہے سترہویں صدی عیسوی میں رائج ہوتی ہے۔

۸۔ مؤلف کئی موقعوں پر حضرت علی کا ذکر کر رہا ہے۔ مگر ذیل کے مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ فرقۂ اثنا عشری کا ایک رکن ہے:

صفحہ ۱۰۲ "کیشم محبت دوازدہ امام است و ادائے صلوٰۃ و صیام"

صفحہ ۱۵۱ "و تو باید کہ بہ مصلحت وقت تقیّہ کنی و بے مضائقہ بُت را سجدہ کنی۔"

اب وہی نسخہ جو امیر خسرو کو اپنی تالیف کا ذمہ دار قرار دیتا ہے یہ شہادت بھی پیش کر رہا ہے کہ اس کا مؤلف شیعہ جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس صغریٰ و کبریٰ سے یہ نتیجہ نکلا کہ امیر خسرو شیعہ تھے۔ لیکن امیر ایسے پکے سنی ہیں کہ قاضی نور اللہ جیسے شیعہ تراش بھی ان کو مجالس المومنین میں داخل کرنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ حالانکہ وہ سنائی، عطار، مولانا روم، سعدی و حافظ جیسے سنیّوں کی شیعیت کا فتوے دے چکے ہیں۔ چونکہ امیر خسرو کا تسنّن یقینی ہے اور یہ کتاب شیعی جذبات و احساسات کی حامل ہے۔ اس لیے امیر کی تالیف نہیں مانی جاسکتی۔

۹۔ یہ عقدہ کہ یہ افسانے اصلاً ایران میں لکھے گئے ہیں، یا ہندوستان میں کتاب میں اس کے

متعلق متضاد شہادت موجود ہے۔ مؤلف کا اکثر اوقات اپنے افراد کو "مرد عجمی" بیان کرنا۔ ان کے فارسی نام، تومان کا استعمال اور ایرانی شہروں کا زیادہ ذکر دلالت کرتے ہیں کہ مؤلف ایرانی ہوگا۔ مگر ذیل کے امور سے خیال ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے:

صفحہ ۱۶۹۔ "حال ہم در ہند قاعدہ چناں است کہ ہر کس یک لک روپیہ دارد یک بیرق بر سو دیوار خانہ ے بندد"۔

صفحہ ۱۸۳۔ "در بلاد ہندوستان جزیرہ ایست خوش آب و ہوا بہ کیفیت و صفا مشہور۔ بہ جزیرہ حکیم بداں، اعتبار کہ جوگی در آں جزیرہ باغے ساختہ"۔

جنوں کے متعلق اس کا عقیدہ ہے کہ ان کے پاؤں بکری کے سم کی طرح چرے ہوتے ہیں:

صفحہ ۲۰۰۔ "اما پا ہیہائے ایشاں مانند گوسفند سم شگافتہ"۔

الفاظ رومال اور اشرفی کئی مقام پر اس تصنیف میں لائے گئے ہیں۔ جو استعمال ہند کے ذیل میں مشمول ہیں۔

چہار درویش میں روم، قسطنطنیہ، یمن، شام، بیت المقدس، بصرہ، بغداد، آذربائیجان، فارس، عجم، نیم روز، نیشاپور، ترکستان، بخارا، ہندوستان، زیرباد اور بلاد فرنگ کا ذکر آتا ہے۔ مصنّف کی جغرافیائی معلومات جیسا کہ افسانوں کا دستور ہے۔ ناقص ہیں۔ زیر باد جس سے اس کی مراد ملک برما ہے۔ اس کے بیان کے مطابق فرنگستان کے قریب واقع ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے

"بہ شہرے رسیدیم کہ درمیانہ فرنگ و زیر باد بود" (صفحہ ۱۲۰)

اسی طرح ایک آذر بائیجانی نوجوان کے قصّے میں لکھا ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا۔ یہاں سے باپ بیٹے زیر باد پہنچے۔ وہاں سے فارغ ہو کر فرنگ کے ارادے سے جہاز میں سوار ہوگئے۔ صفحہ ۱۴۶۔

ہم سوچتے ہیں کہ یہ کیسا برما ہے جہاں سے انسان براہ راست فرنگ پہنچ جاتا ہے۔ اس فرنگ سے مصنف کی مراد کہیں پرتگالیوں اور دیگر مغربی اقوام کے وہ مقبوضات تو نہیں جو گیارہویں بارہویں صدی ہجری میں جزائر شرق الہند اور ہند کی دیگر بندرگاہوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

درویشِ اوّل یمن کا رہنے والا ہے۔ اس کی بہن روپیہ دے کر تجارت کے لیے اسے ملک شام بھیجتی ہے۔ جب شام کے دارالخلافے میں پہنچ جاتا ہے۔ شام کی شہزادی کو ایک صندوق میں زخمی اور بے ہوش پاتا ہے۔ علاج کے لیے جرّاح کو بلا کر لاتا ہے۔ جرّاح خیال کرتا

ہے کہ خود درویش نے اس کو زخمی کیا ہے۔ کہتا ہے ظالم کہیں یوں گھائل کرتے ہیں درویش معذرت میں کہتا ہے " یہ عورت میری بہن ہے۔ ہمارا سارا کنبہ یمن سے جو ہمارا وطن ہے بیت المقدس کی زیارت کو نکلا۔ کل رات جنگل میں ہمارے قافلے پر قزاق آگرے۔ میرے خاندان کے تمام لوگ مارے گئے۔ صرف بہن بچی۔ اسے بھی بُری طرح گھائل کرگئے۔ میں اٹھا لایا ہوں "۔ (صفحہ ۱۹)

اب سوچنے کا مقام ہے کہ ایک شخص یمن سے بیت المقدس کے ارادے سے چلتا ہے۔ اس کو شام کا دارالخلافہ (دمشق) جو بیت المقدس سے بھی شمال میں واقع ہے کیسے مل سکتا ہے

۱۰۔ چہار درویش کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فرنگیوں کے ساتھ کثرت سے ارتباط و اختلاط کے تعلقات دکھائے گئے ہیں۔ دو قصّوں میں وہ حصّہ لیتے ہیں 'دربار روم میں ان کا سفیر وزیر روم کی جان بچاتا ہے۔

فرنگیوں کے متعلق مصنّف کی اطلاعات بعض صحیح اور بعض غلط ہیں۔ وہ نعمان سیاح کو راہبوں کے سیاہ لباس میں ملبوس بیان کرتا ہے۔ (صفحہ ۵۲)

اس کو معلوم ہے کہ فرنگیوں کے ہاں سر برہنہ ہو کر سلام کرنے کا دستور ہے

صفحہ ۵۳۔ " سر برہنہ کردہ پیش رفتم و سلام گفتم

برہنہ پیش تو آیم برسم و راہ فرنگی   کہ من گدائے فرنگم تو بادشاہ فرنگی

وہ جانتا ہے کہ کتّے ان کے ہاں نجس نہیں مانے جاتے۔

صفحہ ۹۶۔ " سگ در ہمہ مذہب نجس است مگر بہ مذہب کفّار فرنگ "

اسے علم ہے کہ شاہ روم کے ہاں فرنگی سفیر متعین ہے۔ وہ فرنگیوں میں کرسی کے رواج سے باخبر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کتاب میں اکثر جگہ کرسی اور صندلی کا مذکور آتا ہے۔ پادشاہ، ملکہ، شہزادے اور شہزادیاں، افسر اور تاجر سب کے سب کرسیوں پر بیٹھے دکھائے گئے ہیں

امیر خسرو کے عہد میں فرنگیوں کے متعلق یہ اطلاع مشکل سے بہم پہنچ سکتی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ امور اس تالیف کے جدید العہد ہونے کی دلیل ہیں۔

فرنگی ملکہ اور دیگر لوگ مسلمانوں کو " مسلمی " کے عجیب خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحہ ۵۷، ۵۹، ۹۱، ۱۳۳۔

جہاں تک ان کی پرستش کا تعلق ہے مؤلف کتاب ان میں اور ہندوؤں میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ ان کے عبادتی تذکرے میں اس نے بھول کر بھی حضرت عیسیٰؑ کا نام نہیں لیا

ہے۔ چہ جائیکہ دیگر بزرگان دین سے واقف ہو۔ نہ وہ انھیں عیسائی اور نصاریٰ کے نام سے یاد کرتا ہے اس کے بیان کے مطابق ان کے عبادت خانے بت خانے کہلاتے ہیں۔ صفحہ ۱۳۲، ۱۴۳، ۱۵۱، وہ بُتِ بزرگ کو پوجتے ہیں۔ صفحہ ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۹، ۱۴۰، لات و منات بھی ان کی پرستش میں داخل ہیں۔ صفحہ ۱۲۹، ان کے پجاری کشیش اور برہمن کہلاتے ہیں۔ صفحہ ۱۲۹، ۱۵۲، ۱۵۱،

ایک مادرِ مومناں کا ذکر آتا ہے جس کی عمر ۱۱۸ سال ہے۔ دیارِ فرنگ میں یہ عورت نہایت مقبول و محبوب ہے۔ فرنگیوں کے ہاں ناقوس کا بھی رواج ہے صفحہ ۱۳۱، صفحہ ۱۵۳،

یہ بعض امور ہیں جو اس کتاب کے سرسری مطالعے کے وقت ہماری نظر سے گزرتے ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر ایسا مواد ہے جو کتاب کو امیر خسرو کے ساتھ وابستہ کرنے کے بجائے اس کے جدید العہد ہونے کی شہادت پیش کر رہا ہے۔

۱۱۔ اب تک ہم نے چہار درویش کے ایسے نسخے کا مطالعہ کیا ہے جو اس افسانے کی تعمیر کی سب سے آخری اور ارتقا یافتہ کڑی ہے۔ اب ہم اس کی ابتدائی کڑی کا معائنہ شروع کرتے ہیں جس چیز کو ہم ابتدائی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ایسی تالیف ہے جو دیگر مؤلفات کے مقابلے میں بہ لحاظ سادگی عبارت و ادائے مضمون و اختصار پسندی یقیناً قدیم ہے۔ اس میں امیر خسرو کے ساتھ انتساب کا قصہ مذکور نہیں ہے۔ بلکہ مصنف کا دعوے ہے کہ وہ اس کو زبان ہندی سے فارسی میں منتقل کر رہا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم اس کتاب کے مصنف اور اس کے زمانۂ تالیف سے واقف ہیں۔

مصنف کا نام حکیم محمد علی المخاطب بہ معصوم علی خاں ہے۔ وہ محمد شاہ پادشاہ مابین (۱۱۳۱ھ و ۱۱۶۱ھ) کے عہد میں گزرا ہے۔ آوزلی اپنی فہرست میں اس کا نام محمد علی معصوم لکھتا ہے (صفحہ ۳۱۸)

محمد علی کا بیان ہے کہ ایک روز میں نے محمد شاہ پادشاہ کی خدمت میں کسی تقریب پر درویشوں کی ایک کہانی بزبان ہندی سنائی جسے اعلیٰ حضرت نے بے حد پسند کیا اور حکم دیا کہ اسے ہندی عبارت سے فارسی زبان میں ترجمہ کر دو۔ تعمیل ارشاد عالی میں میں نے اسے فارسی زبان میں منتقل کر دیا...

محمد علی کے بیان کے سامنے کہ اس نے محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے اس کتاب کا ہندی سے ترجمہ کیا ہے یہ بیان کہ - امیر خسرو ان قصّوں کو رقم کرکے اپنے پیر و مرشد کو سناتے رہے جب آں حضرت نے غسل صحت فرمالیا اس وقت دعا کی کہ الٰہی جو شخص بھی ان

قصّوں کو پڑھے یا سُنے وہ ہمیشہ بیماریوں سے مامون و مصئون رہے کسی وقعت کا مستحق نہیں۔ اس روایت سے نہ صرف محمد علی نا واقف ہے بلکہ محمد حسین عطا خاں تحسین بھی اس سے بے خبر ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت سب سے پہلے طبع شدہ فارسی نسخے سے شروع ہوئی (۳) اور میر امّن نے اس سے نقل کی۔ باغ و بہار کے بیان نے اس کو شہرت دے دی۔ بحالیکہ اس کی صحت کے حق میں کسی کی دلیل بھی باوجود تلاش نہیں ملتی۔ مسلمانوں میں قصّوں اور افسانوں کے متعلق ہر زمانے میں تعصّب رہا ہے۔ علمائے کرام مخرّب اخلاق قصّوں کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ فسانۂ وامق و عذرا اورویس و رامین اسی بناء پر ممنوع تھے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر امیر خسرو کو اس کا مصنّف بنا کر اور نظام الدین اولیاء سے تبریک دلوا کر مرتّب قصّہ نے اس کو مقبول عام بنانے کی غرض سے دروغ مصلحت آمیز ولاحیلہ تراشا ہو۔ نیم مذہبی قصوں میں مصنّفین قاری و سامع کو ثواب دارین کی بشارت اکثر دیا کرتے ہیں۔

(یہ مقالہ اولاً سالنامۂ کارواں لاہور میں چھپا تھا۔ پھر مقالات شیرانی" طبع لاہور، ۱۹۴۸ء اور "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد ششم مرتبہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، طبع لاہور میں شامل کر بھی چھپا)

حواشی از نجم الاسلام

(۱) میر احمد خلف شاہ محمد کے دیباچے والا یہ پہلا مطبوعہ ایڈیشن خوش قسمتی سے راقم الحروف کے پاس ہے۔ یہ "فارسی چہار درویش" کے نام سے ۱۲۹۵ھ میں مطبع حیدری بمبئی سے لیتھو گراف ہوا ہے۔ یہ ایڈیشن فاضل محقق کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے ایک ضمنی خرابی راہ پاگئی ہے، یعنی یہ کہ انھوں نے اس ایڈیشن کو جو ۱۲۹۵ھ کا ہے، میر امن کی باغ و بہار سے اقدم تصور کرکے۔ یہ غلط نتیجہ اخذ کرلیا کہ امیر خسرو والی روایت سب سے پہلے اس طبع شدہ فارسی نسخے سے شروع ہوئی۔ حالانکہ ان جیسے دقیقہ رس اور نکتہ شناس کے لیے اس پہلے ایڈیشن کے سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی، اسے میر امن کی باغ و بہار سے اقدم قرار نہ دینے کے لیے یہی کافی تھا کہ باغ و بہار سے قبل کے دور میں بمبئی طباعت کا مرکز نہ تھا اور یہ کہ قاضی محمد ابراہیم بن قاضی نور محمد کا مطبع مطبع حیدری تو بہت بعد کا ہے۔ اس اولین مطبوعہ ایڈیشن کی نایابی کے پیش نظر میر احمد کے دیباچے کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس سے بخوبی علم ہوجاتا ہے کہ میر احمد کے پیش نظر میر امن کی باغ و بہار تھی اور امیر خسرو والی حکایت باغ و بہار سے لی گئی ہوگی کیوں کہ فارسی قصہ چہار درویش کے کسی مخطوطے میں اس حکایت کا وجود نہیں پایا جاتا۔ اب میر احمد کے اس دیباچے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

اما بعد این خوشہ چین (ارباب) معانی ... العاصی میر احمد ابن شاہ محمد غفر اللہ لہمای گوید ... کہ دریں ایام خریداران ایں کتاب فیض انتساب کہ نایاب بلکہ کمیاب بود بہ چار سوی عالم شتافتند اما نشانی نیافتند و دامن ہمت بہ کمر ذمت بستہ جستجوے مطلب خود سر کردند امائی بجائی نبردند و مشتریان این داستان ہر چند کہ بر دکاکین ہر شہر و مطابع جلیل القدر بہند تلاش نمودند لیکن کسی در جواب آنہا بلفظ نعم نہ پرداخت و از شرق تا غرب ادیم زمیں در نور دیدند مگر سبیل مطلوب شان نتافت لہذا جناب ملایک انتساب فیض مآب برگزیدۂ بارگاہ رب کریم الحاج قاضی محمد ابراہیم صاحب ابن حاجی الحرمین الشریفین جناب قاضی نور محمد صاحب و ملا نور الدین بن جیوا خان بہ نظر رفاہ عام بتلاش بے حد کوشش بے عد بہ تفحص بسیار و تجسس بے شمار

و صرف رقم کثیر و زر خطیر چند نسخ قلمی بہم رسانیدند امّا بسبب اندراس و کہنگی یک نسخہ از آنہا سالم و صحیح نہ برآمد یکی دو جزو از سر ندارد و دیگری از پا غرض کہ ہمہ بوسیدہ و کرم خوردہ پس بکمال محنت و جانفشانی باہم ارتباط دادہ و اجزای از ہم پاشیدہ خلط نمودہ و از نسخۂ اردو ترجمہ میر امّن دہلوی نیز مقابلہ کردہ بمقتضای عالی ہمتی خویش خواستند کہ نہ تنہا باین نعمت غیر مترقبہ بذات خود مستفیض شویم بلکہ جمیع برادران از مطالعہ اش بہرہ وافی وحظ کافی اندوزند این بستان مندرسہ راکہ از جا بجا گلہای حرفش پژمان بودند و روشہای سطورش مسمار و خراب نمودند آبشاری طبع سیراب فرمودند " (ص ۵۰۳)

(۲) شیرانی مرحوم کا یہ تحریر فرمانا کہ "(میر احمد والے) نسخے میں قصے کی تالیف امیر خسرو سے منسوب کی گئی ہے، میر امّن نے بھی اس روایت کو قبول کیا ہے" میر احمد کے مذکورۂ بالا دیباچے کی روشنی میں ناقابل قبول قرار پاتا ہے۔ اب تک کی معلومات کی روشنی میں تو یہ حکایت میر امن ہی سے چلی ہے اور وہی اس غلط انتساب کے مرتکب قرار پاتے ہیں

قصۂ چہار درویش پر اپنے اس مقالے کے ابتدائی حصے میں (جو بہ نظر اختصار یہاں محذوف ہے) شیرانی مرحوم نے میر امّن کو مولوی عبدالحق کے اس الزام سے بھی بری قرار دیا ہے کہ "میر امّن نے فارسی کتاب اور اس کے ترجمے کاتو ذکر کیا مگر نو طرز مرصع کا ذکر صاف اڑا گئے" اور سرورق کی اس عبارت کو بنیاد بنایا ہے جس میں صراحت کی گئی تھی "... ماخذ اس کا نو طرز مرصع ..." حالانکہ یہ عبارت میر امّن کی نہیں بلکہ طابع و ناشر کی ہے۔ اس سے طابع و ناشر تو بری الذّمہ قرار پاتے ہیں لیکن مولوی عبدالحق کا عائد کردہ وہ الزام دور نہیں ہوتا جو اپنے دیباچے میں نو طرز مرصع کا ذکر نہ کرنے کی وجہ سے میر امّن پر آتا ہے

(۳) شیرانی مرحوم نے یہاں، اپنے مقالے کے آخر میں، اپنی اس رائے کو پھر دہرایا ہے کہ امیر خسرو والی روایت طبع شدہ فارسی نسخے سے چلی اور میر امن نے اس سے نقل کی۔ نادرستی واضح ہے، اور اس کا سبب مطبوعہ فارسی نسخے کے اس پہلے ایڈیشن کا بدست نہ ہونا ہے جس میں مطبوعہ فارسی نسخے کے مرتب میر احمد کا دیباچہ شامل تھا۔

واضح رہے کہ اس ضمنی فرو گذاشت سے شیرانی مرحوم کے اس مدلّل اور بے مثل انداز تحقیق پر کوئی حرف نہیں آتا جو انھوں نے قصۂ چہار درویش کے امیر خسرو سے غلط انتساب کی تحقیق میں برتا ہے۔

آئندہ شمارے میں

"گوشۂ تحقیق منسوبات" سے متعلق مزید کچھ مقالات پیش کیے جائیں گے۔

○ اسی نوعیت کے ایک اور گوشے "گوشۂ تحقیق ماخذات" کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔

پروفیسر محمد محفوظ الحق (کلکتہ):

زیب النّساء اور دیوانِ مخفی

عام طور پر مشہور ہے کہ " دیوان مخفی " زیب النّساء کی یادگار ہے، اور عوام کیا خواص کا بھی اب تک یہی ایمان ہے، چنانچہ جتنے جدید تذکرے یا تاریخیں ہیں عموماً ان سب میں یہ دیوان اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس طرح " تذکرہ شمع انجمن " " صبح گلشن " " ریاض الاذکار " " تذکرۃ الخواتین " وغیرہ میں اس دیوان کو زیب النّساء بیگم ہی کی یادگار بتایا گیا ہے اور عرفاً و تقلیداً یورپین مستشرقین مثلاً ڈاکٹر اسپرنگر (۱)، ڈاکٹر ریو (۲)، مسز وسٹبروک (۳) وغیرہ نے بھی اس دیوان کو زیب النّساء کے نام سے منسوب کیا ہے، علاوہ بریں جتنی سوانح عمریاں یا مضامین اس فاضلہ کے متعلق لکھے گئے ہیں عموماً ان سب میں " دیوان مخفی " کی داد زیب النّساء کو دی گئی ہے، لیکن یہ امر تحقیق طلب ہے کہ کیا واقعی یہ بیگم دیوان ہذا کی مؤلفہ ہے ؟ اس امر کا جواب یکایک نفی یا اثبات میں نہیں دیا جاسکتا اور نہ زمانے کے فیصلے کو فوراً دو لفظوں میں مسترد کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس کے متعلق کماحقہٗ تحقیق کرنی ہوگی اور اس دریافت و تحقیق کا جو نتیجہ ہوگا اس کو پیش نظر رکھ کر اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ " دیوان مخفی " زیب النّساء کا کلام ہے یا نہیں ؟ اس لیے اب میں اس تحقیق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، اور پہلے " بیرونی " شہادتیں پیش کرکے دکھانا چاہتا ہوں کہ دیوان مذکور کو زیب النّساء کے نام منسوب کرنے کے لیے کوئی " تاریخی " ثبوت موجود نہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ اس بیگم کے کمالات علمی کا عام طور پر اعتراف کیا گیا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ علم و فن میں یکتا تھی اور علماء، فضلاء اور شعراء کی قدر کرتی تھی، چنانچہ خود مآثر عالمگیری اس کے متعلق یوں گویا ہے (۴):

> " واز تحصیل علوم عربی و فارسی بہرۂ تمام اندوختہ واز اقسام خطوط نستعلیق و نسخ و شکستہ نصیبۂ وافی حاصل کردہ واز بسکہ ہمّت قدسی نہمت آن قدر شناس رتبۂ علم و ہنر بجمع کتب و تصنیف و تالیف مصروف بود و عنان توجہ بترفیہ حال ارباب فضل و کمال

معطوف، در سرکار علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بنظر ہیچ کیے در نیامدہ باشد و بسیارے از علما، فضلا و صلحا و شعرا، منشیان بلاغت وثار و خوشنویسان سحر نگار باین ذریعہ کامیاب افضال آن صدر آرای مشکوی عزت و جلال بودند، چنانچہ ملاّ صفی الدین اردبیلی بموجب امر علیہ در کشمیر سکونت گرفتہ بخدمت ترجمۂ تفسیر کبیر کہ مُسمّیٰ بزیب التفاسیر است (۵) اقتدام داشت و دیگر رسائل و کتب بنام نامیہ ترتیب یافتہ است"

اسی طرح دوسری ہم عصر تاریخیں مثلاً مرآت العالم (۶) اور تاریخ عالمگیری (۷) المعروف بہ مرآتِ جہان نما بھی اس کے کمالات علمی کو سراہتی ہیں لیکن تعجب ہے کہ نہ صرف ان تاریخوں بلکہ اس عہد کی دوسری تاریخوں اور تذکروں میں بھی اس کی شاعری یا اس کے "تخلص" کا کہیں ذکر تک نہیں اگر وہ واقعی صاحبِ دیوان ہوتی اور مخفی تخلص کرتی تو شیر خان لودی (مولف مرات الخیال) اور افضل الدین سرخوش (مولف کلمات الشعرا) جیسے معتبر اور معاصر تذکرہ نویس اس کا ذکر کیے بغیر نہیں رہتے۔ پھر یہ کہ صرف عالمگیر کی آفیشیل ہسٹری (آثر عالمگیری) اگر خاموش رہتی تو خیر لیکن حیرت تو یہ ہے کہ عالمگیر نامہ (مولفہ خافی خان) اور منتخب اللباب (مولفہ کاظم بن امین) تک نے اس امر کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اگر زیب النسا، اس فن (شاعری) کو بھی سراہتی اور وہ واقعی صاحبِ دیوان ہوتی تو اس کے معاصر اس لطیف ذکر میں بھی پیش پیش رہتے لیکن تعجب ہے کہ وہ تو اشارۃً بھی اس امر کے متعلق کچھ نہیں کہتے لیکن ہمارے جدید تذکرہ نویس اور مولفین حیاتِ زیب النسا، اس بیگم کا تخلص مخفی اور اس کو دیوان مخفی کا مولف کہہ کر۔ بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا کے مصداق بن رہے ہیں، آخر اس کی وجہ کیا؟ یہاں اس کے جواب کا موقع نہیں۔ لیکن اس قدر ضرور متحقق ہے کہ کوئی مستند "بیرونی" شہادت دیوان مذکورہ کو زیب النسا۔ کے نام سے منسوب کرنے کے لیے نہیں پیش کی جاسکتی۔

اب اگر اس دیوان کو بغور دیکھا جائے تو اس کا انداز خود کہہ دے گا کہ اس بیگم پر وہ زیب نہیں دیتا لیکن مزید برآں بعض "اندرونی" شہادتیں ایسی ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ہرگز یہ دیوان زیب النسا، کی یادگار نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں "اندرونی" شہادتوں پر بحث کروں اور دیوان ہذا سے اسناد پیش کروں مجھے یہ بتا دینا ضرور ہے کہ دیوان

کے قلمی و مطبوعہ نسخے عام طور پر ملتے ہیں اور بظاہر ان میں چنداں اختلاف نہیں، چنانچہ مضمون ہذا کی تحریر کے وقت "دیوان مخفی" کے پانچ نسخے میرے پیش نظر ہیں ۰۰ جن میں تین قلمی اور بقیہ دو مطبوعہ ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں ایک نولکشور پریس کا ہے اور دوسرا مجیدی پریس کانپور کا چھپا ہوا ہے۔ لیکن ناظرین کی سہولت کے لیے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ کسی مطبوعہ نسخے کا حوالہ دوں۔ اس لیے آئندہ اوراق میں جو حوالہ (متعلق بالصفحات) ہوگا وہ زیادہ تر کانپور کے مطبوعہ نسخے سے (جو نولکشور سے زیادہ صحیح ہے) ہوگا۔

اس ضمنی بیان کے بعد اب میں ان "اندرونی شہادتوں" کو پیش کرتا ہوں جن کا ذکر میں نے گذشتہ صفحات میں کیا ہے وہو ہذا۔

"دیوان مخفی" منسوب بہ زیب النساء کے ص ۱۱۸ پر ہے:

بوعلی روزگارم از "خراسان" آمدہ ۔۔۔ از پے "اغراض" "بردرگاہ" "سلطان" آمدہ

حیرتے دارم کہ یارب اندرین گرداب ہند ۔۔۔ طوطی فکرم پے شکّر ز رضوان آمدہ

بسکہ در یاد وطن نادیدہ ماتم داشتم ۔۔۔ تا بدامانِ دلم چاک گریبان آمدہ

یہ اشعار صاف کہتے ہیں کہ یہ "مخفی" کوئی اور ہے جو اپنے "اغراض" لے کے خراسان سے ہندوستان آیا ہے۔ لیکن زیب النسا، تو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں مری، اس کو خراسان سے کیا نسبت۔ ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

یہی مخفی دوسری جگہ اپنے وطن کو صاف طور پر بتادیتا ہے۔ کہتا ہے (ص ۱۰۶):

تو از ملکِ خراسانی یا صطرخ از وطن داری ۔۔۔ بخوابِ شب اگر درد و غمِ ہندوستان بینی

صرف انہی اشعار پر موقوف نہیں بلکہ اس "دیوان" میں بیسیوں شعر آپ کو ایسے ملیں گے جن سے یہ امر اچھی طرح واضح ہوجائے گا کہ یہ مخفی کوئی اور ہی غریب الوطن ہے جو وارد ہند ہے اور تمنائے وطن میں مضطرب ہے۔ اس مضمون کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

مخفیا (ص ۲۶) چند بدل حسرت دیدار وطن ۔۔۔ عنقریب است کہ درخاک فنایت وطن است

گرفتارے (۵۳) کہ مرغ دل بزیر پیرہن دارد ۔۔۔ زخون دیدہ دامان راہ از رشک چمن دارد

زخان و مان چہ بگذشتی چہ در گلشن چہ در گلخن ۔۔۔ گرفتار محبت ہر کجا افتد وطن دارد

دلِ تم دیدہ مخفی زبارِ غم ہمی نالد ۔۔۔ فغان از ناتوانی ہائے جانِ خویشتن دارد

مذکورہ

نادان (ص ۶۱) اگر نبودے در ملک ہند مخفی — اجزائے عمر خود را شیرازہ گم نمی کرد

بر چہرۂ (ص ۶۵) مراد خود آن رانقاب گیر — مخفی بیا بعرصۂ دیوان ملک ہند

در دل (ص ۶۸) اہل دلے شاید کند مخفی اثر — در نشاپورک نوائے راست را آہنگ ساز

زبحرک (ص ۷۰) معصیت مخفی بسی آلودہ دامانم — نگیرد از تجالت دامنم را در سقر آتش

آفرین (ص ۷۵) بر جگرم باد کہ در کشور ہند — سکۂ نقد سخن رائج ایران زدہ ام

وجود (ص ۱۰۳) بے وجود من بمن ہموارہ در جنگ است
کہ مشت استخوانش را برم سوی خراسانش

دل (ص ۱۰۳) آشفتۂ مخفی لبن خود ارسطویست — بہند افتادہ است امّا خراسانست یونانش

درین کشور زبونیہاے طالع ناقصش دارد — وگرنہ در ہنرمندی نباشد ہیچ نقصانش

امشب (ص ۱۱۴) شب عید است ومرا من بحاق است
مخفی نظرم سوئی خراسان و عراق است

یقین ہے کہ اشعار بالا کو پڑھ کر، زیب النسا، کو مخفی کے نام سے منسوب کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی بلکہ ماننا ہوگا کہ یہ مخفی کوئی اور ہے جو ہندی نہیں بلکہ ایرانی ہے، اور اس کا وطن باصطرغ ہے، اور خراسان سے ہندوستان آیا ہے، اور یہاں آنے کی غرض جلب منفعت ہے، چنانچہ خود کہتا ہے:

از پے "اغراض" بر درگاہ "سلطان" آمدہ

اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ یہ "سلطان" ہے کون؟ اس کا جواب بھی خود دیتا ہے:

بر در سلطان عصر حیف ندارم دگر — تاکہ رساند بعرض مقصد ارکان او

ثانی صاحبقران بادشہ انس و جان — آنکہ فلک سر نہد بر خط فرمان او

یہ "صاحبقران ثانی" شاہجہان ہے، جس کے عہد میں مخفی ہندوستان آیا، لیکن اس غریب الوطن کو یہاں کی ہوا راست نہیں آئی اور دوران قیام میں طرح طرح کی مصیبتیں اٹھائیں، جب یہ مصیبتیں ناقابل برداشت ہو گئیں تو مجبوراً وطن مالوف کو لوٹ جانے پر آمادہ ہوا، چنانچہ کہتا ہے:

وجودِ بےوجود من ہمن ہموار در جنگ است   کہ مشتِ استخوانش را برم سوئی خراسانش

مگر یہاں کی سرزمین شاید بہت سخت گیر تھی کیوں کہ عرصے تک اس کو پکڑے اور جکڑے رہی۔ اسی غربت میں اس بیچارے پر ایک نئی مصیبت نازل ہوئی، وہ یہ کہ دشمنوں نے اس کے خلاف سازشیں کرنا شروع کیں، اور یہ غریب الوطن ان ریشہ دوانیوں کا شکار ہوا اور بالآخر نوبت قید تک پہنچی۔ اس قید خانے میں بیٹھ کر مخفی نے بہت سی غزلیں کہیں۔ اور ان میں اپنا دُکھڑا رو دیا۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں (ص ۶۳) :

مشق سودائے جنونم باز دامنگیر شد   رشتۂ دانائیم درپائے من زنجیر شد

شد چنان کوتہ عمر عافیت در دورِ ما   کز فراق دیدن روئے جوانی پیر شد

مژدہ دہ بادِ صبا از ما بارباب نشاط   کز سرشکِ ما زمینِ ہند چون کشمیر شد

نیست اُمّید رہائی تا بروزِ رستخیز   خاک غربت ہر کرا در مہد دامنگیر شد

دوسری جگہ کہتا ہے (ص ۰۳)

کشاید ہر کہ بندد در برویت   مخور مخفی غم و مردانہ می باش

اور غالباً اسی اسیری سے تنگ آکر اس نے یہ شعر بھی کہا ہے (ص ۷۷) :

از گدایانِ تو ام "شاہِ خراسان" مددے   کہ چو مرغانِ حرم در حرمت جاگیرم

لیکن یہ شعر بعض حیثیتوں سے اہم ہے کیوں کہ اس سے مخفی کے مذہب پر روشنی پڑتی ہے اور یہ امر اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ وہ اثنا عشریہ تھا، کیوں کہ "شاہِ خراسان" سے یقیناً حضرت امام رضا مراد ہیں(۸) اور زیب النّسا، چونکہ سُنّی (اورنگزیب کی بیٹی) تھی، اس لیے یہ شعر اس کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

اسی سلسلے میں چند شعر اور ملاحظہ ہوں:

دردا کہ ز قیدِ ستم آزاد نگشتم   یک لحظہ ز غمہائے جہان شاد نگشتم

شکوہ از بیگانگان و آشنایاں چون کنم   مخفیا روزِ ازل بخت زبونم دادہ اند

دگر مخفی چہ فکر نام و ننگ است   حریفان ہمچون ترا بدنام کردند

لیکن لطیفہ یہ ہے کہ اس مخفی (خراسانی) کی اسیری کی غزلیں زیب النّسا، کے واقعۂ اسیری (۹) کے ساتھ منسوب کی گئی ہیں اور مؤلف "حیاتِ زیب النّسا،" تو ان کو زیب النّسا،

ہی کی زبان سے پڑھتے ہیں یہ روایت مان لی جاتی لیکن اشعارِ بالا کو اگر گذشتہ اشعار کے ساتھ پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ ان میں جو شکایت کی گئی ہے اسی کا رونا ان غزلوں میں بھی ہے' پھر مندرجۂ ذیل اشعار سے جن میں مخفی خانِ دوراں فیروزہ خاں سے ہم وطنی کا واسطہ دے کر قید سے رہائی کی درخواست کر رہا ہے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ یہ مخفی زیب النساء نہیں بلکہ کوئی اور ہے (ص ۱۰۸) :

سپہر منزلتا صاحبا بداد آور | شکوہِ دولت و فیروزہ خانِ دورانی
ز روی لطف تقصیرِ من قلم درکش | کہ با تو ہست مرا نسبتِ خراسانی

اب اگر دیوان کے اور اشعار کو دیکھا جائے تو ان سے معلوم ہوگا کہ مخفی کی یہ درخواست قبول ہوئی اور وہ رہا کر دیا گیا۔ کہتا ہے (ص۱۰۳) :

بہ تہمت کردہ در زندان مرا دشمن، بحمداللہ | بزورِ صبر بشکستم کلیدِ قفلِ زندانش
بکن آشفتگی کن یاد ایامِ گرفتاری | کہ از زندانِ دلگیری بروں آرد رفیقانش
مشو دل شاد اے مخفی ز مرگِ دشمنانِ خود | بیاد آور ازاں روزے کہ خود را درمیان بینی

اس قید سے رہائی کے بعد مخفی بنگالہ چلا آیا۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتا ہے :

جستجو کردم بسی مخفی چو در گردابِ ہند | نشۂ آسودگی جائے بجز بنگالہ نیست

لیکن دوسرے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کو جب زمینِ ہند تنگ نظر آئی تو اس کی نگاہیں "بیت الحرم" پر پڑنے لگیں۔ اور وہیں امان کی صورت نظر آئی۔ چنانچہ ایک شعر میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہتا ہے (ص ۱۱۵) :

بستہ ام از دل و جان نیتِ طوفِ حرمت | گر دہد پیکِ اجل فرصت ازین طوفانم
یا رسولِ عربی جذبۂ شوق کہ چو ابر | سالہا شد بہ تمنائے درت گریانم

یہ تمنا بالآخر پوری ہوکر رہی اور مخفی کو زیارتِ کعبہ نصیب ہوئی۔ کہتا ہے :

از درِ حجرۂ تو تا بدرِ روضۂ خلد | صف زدہ خیلِ ملک بہرِ شفاعت بنگر
مخفیِ عاصی دعا جز بتو دارد امید | نیست جز درگہِ تو پشت و پناہی دیگر

این سیہ رو کہ بامید عطا آمدہ است
بامیدت ز کجا تا بکجا آمدہ است

ص ،، مقصد تو ئی ز کعبہ و دیر نکردے ہرگز   مخفی ز بہرِ خانہ قطع این قدر منازل

ص ۸۴ اگر در گلشن عشرت ندارم راہ ای مخفی   بحمد اللہ کہ بارے گوشۂ بیت الحزم دارم

مندرجۂ بالا اشعار کو پڑھ کر اب کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مخفی زیب النّسا ہے اور یہ "دیوان" اس کی یادگار ہے؟ بلکہ یقین ہے کہ وہ لوگ بھی جو ضرورت سے زیادہ "قدامت پسند" واقع ہوئے ہیں ان بدیہیات سے انکار نہیں کریں گے۔ لیکن اس جگہ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ دیوانِ مذکور میں ایک غزل اور ایک رباعی ایسی ضرور ہے جو بہرحال اس مخفی کے نام منسوب کی جا سکتی ہے' اس غزل کا مقطع ہے:

دخترِ شاہم و لیکن رو بفقر آوردہ ام
زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النّساست

اس مقطع میں مخفی تخلص کا نہ ہونا اس شبہے کو اور بھی متیقن کرتا ہے کہ زیب النّسا، مخفی تخلص نہیں کرتی تھی بلکہ اگر وہ واقعی غزلیں کہتی تھی تو ان میں اپنا نام دیتی تھی۔ لیکن ہمیں تو اسی میں شبہہ ہے کہ وہ غزلیں کہتی بھی تھی یا نہیں۔

اور مذکورہ رباعی (کذا) یہ ہے:

بلبل از گُل بگذرد گر در چمن بیند مرا   بُت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

در سخن پنہاں شدم مانند بو در برگِ گُل   ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے کتب خانے میں دیوان مخفی کا ایک قابل قدر قلمی نسخہ ہے جو بعض حیثیتوں سے دیوان مذکورہ کا بہترین مُصوّر نسخہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں یہ مشہور رباعی (کذا) بھی درج ہے:

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد   کور بہ چشمے کہ لذّت گیرِ دیدارے نشد

صد بہار آخر شد و ہر گُل بفرقی جا گرفت   غنچۂ باغ دلِ ما زیبِ دستارے نشد

لیکن آخر الذّکر دو رباعیوں کے متعلق بھی شبہہ ہے کہ وہ زیب النّسا کی ہیں یا نہیں۔ کیوں کہ یہ دونوں رباعیاں ناصر علی وغیرہ کے سلسلۂ واقعات میں شامل ہیں۔ اس لیے ان کی صحت میں شبہہ ہوتا ہے اور بعید از قیاس نہیں کہ قصّہ نویسوں نے اپنے فسانوں کو چمکانے کے لیے ان کو زیب النّسا کے نام منسوب کر دیا ہو۔ بہر کیف یہ دو رباعیاں اور وہ

ایک غزل اگر زیب النسا۔ کی مان بھی لی جائے تو اس دیوان کا بقیہ کلام کسی طرح کلامِ زیب النسا۔ مانا نہیں جاسکتا۔ اور اس ایک غزل اور ان دو رباعیوں کا دیوانِ مذکور میں ملنا اس امر کا ثبوت ہے کہ لوگوں نے محض خوش عقیدگی کی بنا پر " دیوانِ مخفی " کو زیب النسا۔ کا کلام سمجھ کے ان اشعار کو بھی جو اس کے نام سے منسوب تھے یا خود اس کے تھے، اس مجموعے میں شامل کرلیا۔

جب یہ امر متحقق ہے کہ "دیوانِ مخفی" کلامِ زیب النسا۔ نہیں تو اب یہ دریافت کرنا ہے کہ یہ مخفی ہے کون؟ اس نام کے بہت شاعر ہوئے ہیں لیکن دیوانِ مذکور ان میں سے کسی ایک کے نام سے منسوب نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس صورت میں بعض تاریخی دقتیں پیش آجاتی ہیں اور "اندرونی" شہادتیں اس کے خلاف ہوتی ہیں اس لیے ہمیں ایک ایسے شاعر کی تلاش ہے جو "شاہجہاں" کا ہم عصر ہو۔

اکثر تذکروں اور کتب تواریخ مثلاً مرات آفتاب نما، مجمع النفائس، ریاض الافکار، تذکرہ وتقی اوحدی، صبح گلشن، اور ریاض الشعرا۔ وغیرہ میں اس عہد کے ایک شاعر مخفی رشتی کا ذکر آتا ہے کہ وہ امام قلی خاں، حاکم فارس کے دربار میں رہ چکا تھا۔ والہ داغستانی ریاض الشعرا۔ میں اس کی نسبت یوں تحریر کرتا ہے(۱۰):

مولانا مخفی رشتی۔ سام مرزا مغفور در تذکرۂ تحفتہ السامی این قطعہ را از وے ذکر کردہ ...... و مرزا طاہر نصر آبادی نیز در تذکرۂ خود ذکر وے باین طرز نمودہ کہ درخدمت امام قلی خان سلگیر بیگی، بے فارس می بود، چون بسیار حقیر جثہ بود بکوکنار عادت مفرطے داشت کہ آن نیز علاوہ ضعف سبب کاہش بدنش گشتہ بود۔ روزی خان بوے کہ بیشتر موجب کاہش جسم شما مداومت کوکنار است، وے در جواب بعرض رسانید، لسبب کوکنار نیست جہت آن این است کہ از بس مردم در صدر مکاتیب بیگ، ذکر می نویسند - مخفی نمانا "ولہذا بنفرین خلق باین صورت شدہ ام دتقی اوحدی در تذکرۂ کعبۂ عرفان نوشتہ کہ درین اوقات درہند باشد۔ جمع دراحوال اقوال اینہا باین نحو می تواند شد کہ از زمان شاہ طہماسپ مغفور تا زمان شاہ عباس مبرور بایران بودہ شد و بلند از مصاحبت امام قلی بند آمدہ باشد۔

دوسرے تذکروں کا بھی کم و بیش یہی بیان ہے اور ان سب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مخفی عرصے تک امام قلی خاں کی مصاحبت میں رہا اور عہد شاہجہاں میں ہندوستان آیا۔ شاہجہاں نے ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۶۸ھ (مطابق ۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء) تک شاہی کی، اور امام قلی خاں نے

۱۰۴۲ھ (مطابق ۱۶۳۲ء) میں قضا کی، اس لیے اس حاکم فارس کے بعد مخفی کا عہد شاہجہاں میں ہندوستان چلے آنا بالکل قرین قیاس ہے اور اس کا ثبوت مندرجۂ بالا اشعار میں موجود ہے جس کا ایک مصرعہ ہے۔ ثانی صاحبقران بادشہِ انس و جان، اس لیے یہ بات بہت زیادہ متقین ہے کہ یہی "دیوان مخفی" کا مالک ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمام قدیم تذکرہ نویسوں نے مخفی رشتی کے حالات لکھنے کے بعد اس کا جو کلام نقل کیا ہے وہ موجودہ دیوان میں موجود ہے؛ اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ موجودہ "دیوان مخفی" بحیثیت مجموعی اسی مخفی رشتی کا ہے اور چونکہ دربار ہند میں وہ غریب پوچھا نہ گیا اس لیے اس کا کلام اوروں کی طرح مشہور نہ ہوسکا اور ایک حد تک مخفی مگر محفوظ رہا۔ وہ دیوان ادھر کے غیر محقق مصنفین کے ہاتھ لگا اور اسے دیکھے اور سمجھے بغیر غالباً محض مخفی کی رعایت کی بنا پر اس بیگم کے نام منسوب کر دیا!!

عجب نہیں کہ اس انکشاف سے ہمارے شاعرانہ جذبات کو صدمہ پہنچے اور ہمارے حسن عقیدت میں کچھ کمی ہوجائے لیکن بدیہیات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اور گو ہمارے دماغ میں زیب النسا، کے خدوخال کی تصویر کیسی ہی ہو لیکن یہ ماننا ہوگا کہ "تاریخی" زیب النسا، ہمارے نگارخانۂ خیال سے بالکل مختلف ہے۔ اور گو یہ امر افسوس ناک ضرور ہے کہ آج اس کی تالیفات و تصنیفات کا ایک ورق بھی موجود نہیں، لیکن یہ اس سے زیادہ قابل افسوس ہے کہ کسی غیر کی تالیف کی داد ایک غیر مستحق کو دی جائے۔

لیکن ناظرین کو سن کر حیرت ہوگی کہ "دیوان مخفی" کی داد تو زیب النسا، کو مل ہی رہی تھی، اب کچھ عرصے سے "مونس الارواح" کی تالیف کی داد بھی اس کو دی جا رہی ہے۔ اور اس انکشاف جدید کا سہرا آگرہ کے مجلۂ علمیۂ ادبیہ کے رئیس القلم حضرت نیاز فتحپوری کے سر ہے لیکن ہمارے مولانا کو شاید معلوم نہیں کہ "مونس الارواح" جہان آرا (دختر شاہجہاں) کی مشہور تالیف ہے۔ اور دراصل اس اخلاص و عقیدت کا ثمرہ ہے جو اس فاضلہ کو حضرت نظام الدین اولیا، سے تھی، اس لیے "مونس الارواح" کو زیب النسا، کے نام سے منسوب کرنا سخت ظلم ہے، اور جہان آرا کے ساتھ سراسر ناانصافی!

(معارف، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۲۳ء)

حواشی

(۱) فہرست کتب (قلمی) موجودہ کتب خانۂ شاہ اودھ صفحہ ۳۸۰

(۲) فہرست کتب فارسی (قلمی) موجودہ برٹش میوزیم لندن صفحہ ۷۰۲

(۳) اس خاتون نے "دیوان مخفی" کی اوّل پچاس غزلوں کا انگریزی ترجمہ مع دیباچہ وزڈم آف دی ایسٹ سیریز (Wisdom of the East Series) میں "دیوان زیب النسا" کے نام سے شائع کیا ہے۔

(۴) مآثر عالمگیری مؤلفہ مستعد خاں مطبوعہ کلکتہ (۱۸۷۱ء) صفحہ ۵۳۸

(۵) اس تفسیر کے متعلق عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ اب ناپید ہے۔ لیکن یہ ایک حد تک غلط ہے کیونکہ اس کے اجزاء اب بھی باقی ہیں چنانچہ بوڈلین لائبریری (آکسفورڈ) میں اس ضخیم تفسیر کا پانچواں حصہ موجود ہے اور ۲۱۶ صفحات پر ختم ہوا ہے خاتمے پر تاریخ درج ہے:

... بہر تاریخ گفتا کہ شد   زلطف ازل جلد پنجم تمام

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حصہ ۱۰۸۱ ہجری میں مکمل ہوا اور بوڈلین لائبریری میں جو نسخہ ہے وہ بھی ۱۰۸۱ ہجری کا لکھا ہوا ہے اس لیے ڈاکٹر ایتھے کا (جنھوں نے اس کتاب خانے کی فہرست شائع کی ہے) خیال ہے کہ یہ نسخہ خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

(۶) مرات العالم قلمی موجودہ بوہار لائبریری کلکتہ صفحہ ۲۵۸

(۷) مرات جہاں نما قلمی موجودہ بوہار لائبریری کلکتہ صفحہ ۵۰۸

(۸) امام رضا کو عموماً اسی لقب (شاہ خراسان) سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور فارسی و اردو شاعری میں اس کی مثالیں عام ہیں۔ اس وقت اردو فارسی کی صرف ایک ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ حضرت عطار، لسان الغیب میں فرماتے ہیں:

"شہ من" در خراساں چوں دفین شد   ہمہ ملک خراساں انگبیں شد

بوقت کودکی من سیزدہ سال   بہ مشہد بودہ ام خوش وقت خوشحال

مرزا دلگیر ایک مرثیے میں کہتے ہیں:

کیا - شاہ خراساں - کی زیارت کا شرف ہے

فردوس کا رخ زائر مولا کی طرف ہے....

(۹) ۱۰۹۱ ہجری میں شہزادہ اکبر باغی ہو کر راجپوتوں سے مل گیا۔ عالمگیر کو شبہ ہوا کہ زیب النسا بھی اس سازش میں شریک ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر اس کو قلعہ سلیم گڑھ (دہلی) میں نظر بند کر دیا۔

(۱۰) ریاض الافکار قلمی موجودہ بوہار لائبریری صفحہ ۵۸۶۔

پروفیسر نکلسن (کیمرج):

فیہ مافیہ

[ملفوظات جلال الدّین رومی کے انتساب و استناد سے متعلق ایک جائزہ (۱)]

جس نامور شاعر کی مثنوی اور دیوان شمس تبریز سے تصوف فارسی کے تمام طلبہ مانوس ہیں اُس کی جانب ایک رسالۂ نثر موسوم بہ فیہ مافیہ بھی منسوب ہے۔ رضا قلی خاں نے دیوان مطبوعہ تبریز کے دیباچے میں اس کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ اس میں زیادہ تر معین الدین پروانہ، رومی سے خطاب ہے، تین ہزار بیت کے مساوی حجم ہے اور اس کے قلمی نسخے نایاب ہیں۔ میرے علم میں اب تک اس سے زائد معلومات نہ تھے، پچھلے سال مسیو لوئی مسینا نے حلاج پر جو اپنی تالیف شائع کی ہے، اس میں یہ اطلاع درج ہے، کہ قسطنطنیہ میں اس کے دو نسخے موجود ہیں۔

اس درمیان میں ایک ہندوستانی فاضل، مولوی عبدالماجد (دریا آباد، بارہ بنکی) میرے علم میں تین اور نسخے لائے، جن میں سے ایک کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد کا ہے۔ ایک سرکاری کتب خانۂ رامپور کا ہے اور ایک نواب سالار جنگ حیدرآبادی کے کتب خانے کا۔ مولوی عبدالماجد کا قصد اس رسالے کے طبع کرانے کا ہے اور اس غرض سے انھوں نے ان تینوں نسخوں کی نقلیں حاصل کرلی ہیں۔ چند ہفتے ہوئے انھوں نے بکمال عنایت کتب خانۂ آصفیہ والے نسخے کی نقل مجھے بھی عنایت کی تھی، میں اس موقع پر بہ مسرت ان کی اس عنایت کا نیز ان کی دیگر اہم خدمات کا، جو وہ میرے زیر ترتیب ایڈیشن مثنوی کے سلسلے میں کر رہے ہیں، شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

اس وقت تک میرا خیال یہ ہے کہ فیہ مافیہ سے تفہیم و دقیق مثنوی کی شرح مطالب میں اچھی خاصی مدد ملے گی، لیکن ابھی اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کرنا قبل از وقت ہوگا۔ سردست رسالے کو دیکھ کر جو سرسری خیالات پیدا ہوئے ہیں، انھیں بیان کرنا اور اس کے مضامین پر ایک اجمالی نظر کر دینا ہے۔

یہ امر کہ اس رسالے کا موضوع تصوف ہے، اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے جس کے لفظی معنی ہیں : "اس میں ہے جو کچھ اس میں ہے" یہ عنوان جیسا کہ مسینا نے خیال کیا ہے، منصور حلاج کی کتاب الطواسین کی ایک عبارت سے ماخوذ ہے جس میں الفاظ "فیہ مافیہ" سالک فانی فی الحق سے متعلق استعمال کیے گئے ہیں، اگرچہ ظاہری معنی کے لحاظ سے بھی یہ عنوان ایسے رسالے کے لیے نہایت موزوں ہے جو اس قدر غیر مرتب و منتشر ہے۔

فیہ مافیہ، در حقیقت جلال الدین کے کلام یعنی ان کے اقوال و ملفوظات کا ایک مجموعہ ہے۔ دیباچے میں تصریح ہے کہ الفاظ ان کی زبان سے سن کر ("در اثناء مجلس او") ان کے فرزند سلطان بہاء الدین ولد نے قلمبند کیے ہیں، لیکن خاتمے میں یہ درج ہے کہ رسالہ معین الدین پروانہ کے فراہم کردہ اقوال کا مجموعہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسالے میں بعد جلال الدین کے، مرکزی و نمایاں حیثیت پروانہ ہی کی ہے۔ اور وہ چونکہ حسن عقیدت میں باسول (۲) سے کم نہیں، اس لیے یہ امر اس سے ذرا بھی بعید نہیں، جو اس نے اپنے مرشد کے تعلقات یگانگت کی مستقل روداد چھوڑ جانا چاہا ہو۔ کم از کم حیدر آبادی نسخے سے محمد فواد (صاحب "ادبیات و تصوف ترکیہ") کے اس قول کی مطلق تائید نہیں نکلتی کہ فیہ مافیہ کو جلال الدین نے تصنیف کرکے پروانہ کے نام معنون کر دیا ہے۔ رسالہ یقیناً کسی دوسرے شخص کی جمع و تالیف کا نتیجہ ہے، اور اگر دیباچہ (جس کی ابتداء تذکرے سے ہوتی ہے) جعلی نہیں تو اس کا الحاق یقیناً کسی شخص نے جلال الدین کی وفات کے بعد کیا ہے جو ۱۲۷۳ء میں واقع ہوئی۔ پروانہ کو سزائے موت، اس واقعے کے ۵ سال بعد اباقہ کے حکم سے ملی۔

رسالے میں جو ملفوظات درج ہیں، ان کے استناد میں گفتگو کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ میری رائے میں ان کا بیشتر حصہ صحیح و مستند ہے، گو شاید ہر موقع پر لفظ بلفظ منقول نہ ہو۔ مثنوی کے ناظرین کو اس میں بہت کچھ مانوس باتیں ملیں گی۔ عام موضوع سخن بالکل وہی ہے۔ معجزانہ بیان وہی ہے۔ خیال میں وہی زور و روانی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آگ کا شعلہ زقند بھرتا جا رہا ہے اور اپنی تیزی سے اپنے تئیں اور مشتعل کرتا جاتا ہے۔ براہین منطقی کے بجائے وہی شاعرانہ تخیل کی کار فرمائی ہے اور تشبیہات و تمثیلات کی وہی حیرت انگیز افراط ہے۔ افسانے اور حکایات اکثر شامل کیے گئے ہیں، جو اگرچہ عموماً بعینہ وہ نہیں ہیں، جو مثنوی میں مندرج ہیں تاہم ایک حد تک ان سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک معنی کر کے، فیہ مافیہ، توقعات سے

فرد تو ہے۔ یعنی اگرچہ مثنوی کے تکملے، نیز ایک حد تک شرح کا کام اس سے نکل سکتا ہے تاہم میرا خیال یہ ہے کہ ۔ مثنوی سے جو سوالات حل طلب پیدا ہوتے ہیں ۔ ان کا حل اس سے نہیں ہوتا۔ ان کے حل کے لیے ہم کو مصنف کے معتقدات مذہبی سے اس سے زیادہ متعین اور قطعی واقفیت درکار ہے، جتنی مجموعۂ ملفوظات سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ملفوظات جو عموماً پروانہ یا کسی اور کے سوالات کے جوابات ہیں کسی مرتب نظام کی صورت میں نہیں بلکہ غیر مرتب طور پر صاحب ملفوظات کے آزادانہ خیالات کی رو کا ذخیرہ ہیں۔ اس بناء پر تلخیص مطالب بے سود ہوگی ۔ اور اگر تفصیل بیان کی جائے تو بھی اس کی حیثیت کلید یا سود سے زائد نہ ہوگی۔ کتاب کی روح اور نوعیت کا بہترین اندازہ اس طریقے سے ہو سکتا ہے کہ چند اقتباسات نقل کردئے جائیں لیکن میں جن اقتباسات کا ترجمہ دے رہا ہوں وہ قدرۃً مختصر ہیں اور اس لیے ان سے جلال الدین کے طرز استدلال کا پورا اندازہ نہ ہو سکے گا۔ اس کے لیے بہتر صورت یہ ہے کہ خود مثنوی کی جانب رجوع کیا جائے۔

ہم لوگ تقریر و تحریر میں فرق کرتے ہیں اور مکالمے اور تصنیف کو بالکل دو مختلف چیزیں قرار دیتے ہیں۔ لیکن جلال الدین کے لیے یہ دونوں ۔ ملفوظات ہی کے حکم میں ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ایک نثر میں ہے۔ ایک نظم میں ۔ مثنوی و دیوان دونوں کی بابت روایت ہے کہ وہ دوستوں کو املا کراتے گئے تھے۔ اور ان لوگوں نے اسی ارشاد زبانی کو مکتوبی صورت میں جمع کر دیا۔ جلال الدین کی شاعری ۔ ملفوظات کے مقابلے میں سلامت رکھتی ہے۔ اور ان کے ملفوظات کو ان کی شاعری کے ٹکر کے نہیں ۔ تاہم ایک شاعر کی زبان سے نکلے ہوئے ضرور معلوم ہوتے ہیں ۔ پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک اتھاہ چشمہ ابل رہا ہے ۔ اور جو الفاظ مثنوی میں کثرت سے آتے ہیں ، وہ شاعر کے لیے معانی سے لبریز ہیں کہ "این سخن پایان ندارد"۔

اقتباسات ذیل کو سیاق سے علیحدہ ہیں تاہم جو شخص عقاید صوفیہ سے مانوس ہے اسے ان کے سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔

۔ سخن سایۂ شخص است چون سایۂ اورا جذب کرد حقیقت بطریق اولیٰ ۔ سخن بہانہ است آدمی را با آدمی از جزو مناسبت جذب میکند بلکہ اگر صد ہزار معجزہ و کرامات می بیند چون او را ازان نبی اولی جزوی بناشد تناسب سودے ندارد آن جزو است کہ او را در جوش و بیقراری میدارد۔ در کاہ اگر ا۔ کہربا جز دے بناشد ہرگز سوی کہربا نرود آن چیست میان ایشان

جنسیت است. آدمی را خیال هر چیز که در فکرش آید بسوی آن چیزش برد خیال باغ بباغ خیال
دکان بدکان اما درین خیال تزویر پنهان ست نمی بینی که فلان جایگاه میروی پشیمان می شوی و
میگوئی پنداشتم که خیر باشد بلکه این خیالات بر مثال چادر اند و درچادر کسی پنهانست هر گاه که
این خیالات از میان برخیزد و حقائق روی نماید بے چادر، قیامت باشد، یوم تبلی السرائر آنجا که
حال چنین باشد پشیمانی سود ندارد هر حقیقت که ترا جذب می کند چیزی دیگر غیر آن نباشد همان
حقیقت باشد که ترا جذب کرد لیکن می گویم که در حقیقت کشنده یکی ست نمی بینی که آدمی را صد
چیز آرزو است و لیکن اصلش گرسنگی است که یکے ست و چون سیر شد میگوید که هیچ نمی خواهم۔
۔مگو که کثیر پیدا کرده ام تو راستی پیشه کن که هیچ کثرے نماند. راستی همچو عصاے موسیٰ
ست و کثرها چون سحر ها چون راستی روی نماید همه را بخورد واگر بدی میکنی یا خودی کنی ضرر
بدیگرے نمی رسد بیت

مرغے بسر کوه نشست و برخاست بنگر که درو ...... چه افزود و چه کاست

آدمی اصطرلاب حق است اما منجمی باید که اصطرلاب را بداند........

مراد ازین اشارت ها آنست که مصطفیٰ صلی الله علیه وسلم فرمود من عرف نفسه فقد
عرف ربه، همچنانکه اصطرلاب مسین، افلاک ست و آینه اوست، وجود آدمی که لقد کرمنا بنی آدم
اصطرلاب حق است چون حق سبحانهٗ و تعالیٰ اورا بخود عالم گرداند از اصطرلاب وجود خود تجلّی
بیچون را و جمال حق را بے کیفیت دمبدم بیند و ابداً آن جمال ازین آئینه خالی نباشد۔"

"یاران سوال کردند که از نماز چیزے نزدیکتر بحق راهی هست فرمود که نماز و لیکن
نماز نه همین صورت تنها نیست این قالب نماز است زیراکه این نماز اوّل و آخری ست هر چیز
که در حرف و صوت در آید اورا اوّل و آخر بود و آن صورت و قالب باشد جان بیچون و بے
نهایت بود اورا اول و آخر نباشد آخراین نماز را انبیاء پیدا کردند .... استغراق و بیهوشی
این نماز است که این همه صورتها بیرون می ماند نمی گنجد جبرئیل نیز که معنی محض است هم نمی
گنجد چون در وقت استغراق عقل مسلوب است شاید که توان گفتن که تکلیف برخیزد چنانچه
مجنون را در اوقات جنون تکلیف نیست اگر در روزی چند بار استغراق پیدا شود و عقل مسلوب
گردد در آن وقت تکلیف نبود پس معلوم شد که جان نماز استغراق ست در وحدت."

"تن همچون مریم است و یکے عیسیٰ داریم اگر ما را درد پیدا شود عیسیٰ ما بزاید واگر درد نباشد عیسیٰ

ہم ازان کہ راہ شاہی می آمد باز باصل خود رود دا محرم ایم ۔ ....

این سخن برائے آنکس است کہ او بسخن محتاج است کہ ادراک کند اما آنکہ بے سخن ادراک می کند بادے چہ حاجت است آخر آسمان و زمین سخنست پیش آنکس کہ ادراک می کند و زائیدہ از سخن است کہ کن فیکون۔

فیہ مافیہ میں تین مقامات پر مشہور صوفی حلاج کا ذکر ہے جو انا الحق کا قائل گزرا ہے۔ اور جسے بغداد میں ۹۲۲ء میں دار پر موت نصیب ہوئی ان میں سے سب سے زیادہ اہم و مفصل موقع کی عبارت حسب ذیل ہے :

" عجب آنکہ کس بالای پرورش جنبد چون درانگبین غرق شود ہمہ اجزاے او یکسان گردد ہیچ حرکت نہ کند استغراق آن باشد کہ او درمیان نباشد اورا جہد حرکت نماند ہر فعل کہ ازو آید آن فعل او نباشد۔ اگر ہنوز در آب دست وپاے می زند اورا غرق نگویند اگر بانگی زند کہ آہ غرق شدم این رانیز استغراق میگویند

آخراین انا الحق گفتن ہم ازین معنی است مردم می پندارند کہ دعوی بزرگ ست، انا العبد دعوی بزرگ است انا الحق تواضع عظیم است آنکس کہ او انا العبد میگوید دو ہستی رااثبات می کند یکے خود را و یکے خدا را اما آنکہ انا الحق میگوید خودرا عدم کرد و باد برداد می گوید انا الحق یعنی من نیستم ہمہ اوست جز خدا را ہستی نیست واین غایت تواضع افگندگی ست خودرا "

مسیو مسینا نے جس دقت نظر کے ساتھ حلاج کے اصول و عقائد کی تشریح کی ہے، اس سے واقف ہونے کے بعد مشکل ہی سے باور ہو سکتا ہے کہ حلاج کا وہ مسلک تھا، جو اقتباس بالا سے ظاہر ہوتا ہے۔ جلال الدین کا مسلک جو کچھ بھی ہو، وحدت وجود بہرحال نہ تھا، میں نے اپنی ایک دوسری تصنیف (۳) میں اس مسئلے پر بحث کی ہے، کہ مثنوی کے مصنف کو وحدت وجود کا قائل کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے اور اس لیے یہاں اس بحث کو نہیں چھیڑتا، البتہ یہاں اس جدید رسالے سے ایک عبارت نقل کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوگا کہ جلال الدین ایک خاص حد تک بقاو روح شخصی کے قائل تھے۔

آدمی یار خود را زود گم میکند نہ بینی کہ درین عالم چون باشخصے دوست شدہ و در نظر تو یوسفیست بیک فعل قبیح از نظر تو پوشیدہ شود و اورا گم می کنی وصفت یوسفی درو بصفت گرگی مبدل می شود، کہ درآن زمان اورا یوسفی میدیدی اکنون بصفت گرگش می بینی ہر چند کہ

صورت او میول نشد و ہماں است کہ میبینی باین یک حرکت عارضی اورا گم کردی فردا کہ حشر ظاہر گردد این ذات بذات دیگر میبدل شود چون اورا نیک نشناختہ باشی و در ذات وے نیک نرفتہ باشی چونش خواہیش شناختن حاصل آنکہ ہمدیگر رانیک نیک بباید دیدن و از اوصاف بد و نیک کہ در ہر آدمی مستعار است گذر گذشتن و در عین ذات اوفتن و نیک نیک دیدن کہ این اوصاف کہ مردم از ہمدگر می بیند اوصاف اصلی ایشان نیست "

فیہ مافیہ ۔ اگرچہ اغلباً بہ حیثیت مجموعی مستند ہے تاہم بعض مقامات مشتبہ بھی ہیں مثلاً یہ باور کرنا دشوار ہے کہ جلال الدین نے کبھی یہ الفاظ لکھے ہوں :-

" من از کجا، شعر از کجا ؟ واللہ کہ من از شعر بیزارم کہ ازین دون تر چیزے نیست این یاران کہ نزد من می آیند ۔ از بیم آنکہ ناملول نہ شوند شعرے می گویم ۔ تا بآن مشغول شوند "

لیکن اس مضمون میں تنقید مقصود نہیں خاتمے پر دو حکایات درج کرتا ہوں جن سے ظاہر ہوگا کہ جلال الدّین بغیر شعر گوئی کے بھی احباب کو خوش دل رکھ سکتے تھے۔

حکایت اوّل ۔ اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمثیل میں ہے کہ جو شخص دین میں در آتا ہے ۔ اسے خلاصی نہیں ملتی تا وقتیکہ وہ ما سویٰ سے بالکل آزاد نہ ہوجائے۔

" معلّمے از غایت بے نوای در زمستان دراعہ کتان پوشیدہ بود مگر خرسے را سیلاب ربودہ بودہ میرفت سرش در آب پنہان بود کودکان گفتند اے استاد برگیر از آب معلّم خواست کہ اورا برگیرد خرس اورا برگرفت کودکان گفتند ای استاد زود باش و پوستین را بیرون آر ورنہ بگذار گفت من اورا رہا کردہ ام او مرانمی گذارد۔

دوسری حکایت قانون مکافات عمل پر روشنی ڈالتی ہے اور اس امر کے ثبوت میں ہے۔ کہ بالفاظ جلال الدّین ۔ یہ عالم مثل پہاڑ کے ہیں ۔ خیر و شر جو کچھ ہمارے منہ سے نکلتا ہے اسی کی صدائے بازگشت سُننا پڑتی ہے۔

" شخصے از درخت میوہ میریخت خداوند باغ آمد و گفت چرا چنین میکنی از خدا نمی ترسی گفت چرا ترسم درخت ازان خدا و باغ ازان خدا و من بندۂ خدا بندۂ خدا می خورد مال خدا گفت ساعتے صبر کن تا ترا جواب گویم فرمود رسن بیارید و اورا بر درخت بندید و می زنید تا جواب ظاہر گردد چوب بسیار بخورد و فریاد بر آورد کہ آخر از خدا نمی ترسی مرا بنا حق کشت گفت چرا ترسم تو

بندۂ خدا و این چوب خدا، چوب خدائی زخم بر بندۂ خدا، کل من عند اللہ۔ (علم ۳۰)

(معارف، مئی ۱۹۲۳ء)

حواشی

(۱) یہ مضمون، کیمبرج کے مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن کے صد سالہ جلسے کے موقع پر پڑھا تھا۔

(۲) جانسن کا مشہور سوانح نویس (مترجم)

(۳) کتاب موسوم ص ۵۸ ۔ ۶۳ Idea of Personality in Sufism

[یادداشت: یہ معارف بابت مئی ۱۹۲۳ء میں، جس میں یہ ترجمہ شامل ہے، کوئی تصریح مترجم کے نام کی نہیں ملتی۔ مگر ترجمے کی خوبی اور روانی اشارہ کرتی ہے کہ یہ عبدالماجد دریا بادی کے قلم سے ہو گا۔ جن کے قلمی روابط نکلسن کے ساتھ تھے۔ نجم الاسلام]

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں:

دیوانِ قطب الدّین

حضرت قطب الدّین بختیار کاکی قدس سرہٗ (م ۶۳۲ ھ) سے منسوب فارسی دیوان، جو بار دوم ۱۲۹۹ ھ / ۱۸۸۲ء سے شائع ہوا تھا، اس کے آخر میں عبارت اس طرح ہے:

"چو نسخۂ صحیحۂ دیوان متبرک بتجسس تمام دستیاب شد آن را از مغتنمات لاریب انگاشتہ برای افادات خواص و عوام انام، ابر نیسان ہمت و مروت، سرچشمۂ دانش و فتوت، جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہٗ بذل ہمت فرمودہ بہ کتابت کاپی خوش نویس فہیم صاحب استعداد و ذہن سلیم منشی شیو پرشاد صاحب مینجر مطبع اودھ اخبار رخصت داد. امّا در حالت کتابت بر ثبوت سند دیوان موصوف و بہ شیوع اثر تصرف اہل باطن احوالے قابل استماع مستمعین بہ روی کار آمد. یعنی در مطلع سر دیوان کہ

ای لال در ثنای صفاتت زبان ما
ای در صفات وحدت تو لال عقل ما

خوش نویس فہیم را در کتابت تکرار قافیہ مفہوم شد جایش خالی گذاشتہ بحیر ماند. بہ آخر بخدمت استاذ الشعرا، جناب آفتاب الدولہ بہادر قلق (۱) رفتہ ماجرا عرض کرد، فرمود کہ این کلام اہل ظاہر نیست کہ دخل را شاید، بلکہ کلام اہل اللہ و صاحب باطن عالی شان است، مبادرت بہ تصرف روا نبود، و مینجر صاحب را ہمراہ گرفتہ بحضور مرشد خویش عالم علوم صاحب مذاق مولانا مولوی محمد عبدالرزاق صاحب (۲) دام فیضہ کہ از آن حضرت ارادت و بیعت داشتند باہمی حاضر آمدہ باصد خضوع آن مقام مشتبہ را وا نمودند. ہم آن دم حضرت مولانا فرمود کہ توقف کنید و خود

اندرون حجرہ پا نہادند و بعد ساعتے بر آمدہ فرمودند کہ حضرت خواجہ مصرع ثانی مطلع چنیں فرمودہ کہ

دی در صفات وحدت تو عقل نارسا

چنان چہ ہمان لفظ نوشتہ شد ۔ فی الجملہ دیوان متبرک کہ موصوف بمزید استبداد شائقین چشمہائے دو تیرکاں ۔ صحت یا انکہ بار دوم در مطبع عالی بمقام لکھنؤ محلہ حضرت گنج در کوٹھی ناشی مالک مطبع بماہ اگست ۱۸۸۲ء مطابق ماہ رمضان ۱۲۹۹ھ بہ رونق انطباع بر آراستہ گردید ۔ فقط ۔

اس عبارت میں ہے کہ مولانا عبدالرزاق نے فرمایا کہ "حضرت خواجہ مصرع ثانی مطلع چنیں فرمودہ" ۔ میرا خیال ہے کہ یہاں فرمودہ باشند ہوگا یعنی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ نے ایسا فرمایا ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے اہل اللہ (حتی الامکان) کشف کی بات کا اظہار نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو اسے خواب سے تعبیر کر دیتے ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ صوفیہ کو اور بالخصوص چشتی صوفیہ کو شاعری سے بہت مناسبت تھی ۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ کو بھی شعر سے مناسبت تھی بلکہ ان کا وصال بھی احمد جام (۵۳۶ھ) کی ایک غزل کے اس شعر کے سماعت فرمانے پر ہوا تھا کہ

کشتگان خنجر تسلیم را

ہر زمان از غیب جانی دیگر است

حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ (م ۶۳۳ھ) کی زبان مبارک سے جو اشعار ادا ہوئے تھے، ان کا ذکر دلیل العارفین میں آتا ہے۔ فوائد السالکین میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے اشعار میں ایک مثنوی کا ایک شعر ہے (ص ۱۲) ، جو کسی درویش سے انھوں نے سنا تھا اور ایک رباعی (ص ۲۰) کا ذکر بھی آتا ہے ۔ مثنوی کا وہ شعر یہ ہے :

ہر آن ملکے کہ وا پس می گذارم   دو صد ملکے دگر درپیش دارم

اور رباعی یہ ہے:

ذکر خوش تو ز ہر دہنی می شنوم   شرح غم تو ز خویشتن می شنوم
گر ہیچ نہ باشد کہ یکے نشنام   تا نام تو می گوید و من می شنوم

اور راحت القلوب ص ۱۶ میں ہے کہ بابا فرید شکر گنج قدس سرہ (م ۶۶۸ھ) نے

یہ شعر حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہ سے سنا تھا:

گر نیکِ تو ام از ایشان گیرند　　　ور بد باشم مرا بدیشان بخشند

اسرار الاولیا (ص ۶) میں بھی ایک شعر ملتا ہے جو حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہ کی زبانی سنا گیا تھا:

تا نفس من ز عشق دوست زدم　　　ذات از ما بجز دوئی جز دوست

صفحہ ۹ میں بھی چار اشعار ان کی زبانی مروی ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:

من آن نیم کہ ز عشق تو پائے پس آرم　　　اگر بہ تیغ کشندم در تو نگزارم ۔۔۔

صفحہ ۲۹ میں بھی ایک شعر کے ان کی زبان مبارک سے سے جانے کا ذکر ہے:

دیدۂ کو جمال دوست بدید　　　تابود زندہ ء مبتلا باشد (۳)

صفحہ ۵۵ میں ایک رباعی بھی ہے جو ان سے سنی گئی تھی:

اصل ہمہ عاشقی ز دیدار آید　　　چون دید بدیدہ آنگہ در کار آید

در دام بلا نہ مرغ بسیار آید　　　پروانہ بشمع نور در نار آید

ان اشعار کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ کو بھی اشعار سے خاص مناسبت تھی لیکن مطبوعہ دیوان جو آپ سے منسوب کیا گیا ہے وہ آپ کا نہیں ہوگا۔ اس کے اسباب یہ ہیں:

اس مطبوعہ دیوان میں ۱۴۲ غزلیں اور ۸۹ رباعیاں ہیں۔ غزلیں بڑی تعداد میں حضرت حافظ شیرازی م ۷۹۱ھ کے تتبع میں ملتی ہیں یا ان کی زمینوں میں ہیں۔

(الف) حافظ فرماتے ہیں:

دل می رود ز دستم صاحب دلان خدارا
دردا کہ راز پنہان خواہد شد آشکارا

اس دیوان میں ہے:

عقل از سرم رمیدہ مجنون شدم خدارا
زنجیر زلفش آرید بر پا نسید مارا

(ب) حافظ کی ایک غزل اس طرح شروع ہوتی ہے:

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما
مطرب بگو کہ کار جہان شد بکام ما

دیوان میں ہے:

تا عکس روے یار در افتد بجام ما
ساقی بیار جام مے لعل فام ما

(ج) حافظ فرماتے ہیں:

صبح دولت می دمد کو جام ہمچون آفتاب
فرصتے زین بہ کجا یابم بدہ جام شراب

دیوان میں ہے:

گر ہمی خواہی براندازد نگار از رخ نقاب
از خودت بگریز تا بینی جمال بے حجاب (۴)

(د) حافظ فرماتے ہیں:

روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست
منت خاک درت بر بصرے نیست کہ نیست

دیوان میں ہے:

خالی از نقشہ ذوق تو سرے نیست کہ نیست
کشتہ عشق تو در رہ گذرے نیست کہ نیست (۵)

(ہ) حافظ فرماتے ہیں:

کارم ز دور چرخ بہ سامان نمی رسد
خون شد دلم ز درد بہ درمان نمی رسد

دیوان میں ہے:

دردیست در دلم کہ بدرمان نمی رسد
راہیست پیش من کہ بہ پایان نمی رسد

(و) حافظ فرماتے ہیں:

ہر کرا با خط سبزت سر سودا باشد
پاے زین دائرہ بیرون ننہد تا باشد

دیوان میں ہے:

ہر کہ اورا بجہان دیدہٗ اعمیٰ باشد
نزد اہل سخنان ناقص و رسوا باشد

(ز) حافظ فرماتے ہیں

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور
کلبۂ احزان شود روزے گلستان غم مخور

دیوان میں ہے:

اے دل از دوری تو از دیدار جانان غم مخور
درد تو شاید رسد روزے بہ درمان غم مخور

(ح) حافظ فرماتے ہیں:

عید است و موسم گل و یاران در انتظار
ساقی بروے شاہ ببیں ماہ و مے بیار

دیوان میں ہے:

ساقی بیار بادہٗ گلرنگ بے خمار
زان مے کہ باشد او ز مئے جام عشق یار

(ط) حافظ فرماتے ہیں:

بر نیاید از تمنائی لبت کارم ہنوز
بر امید جام لعلت دُردِ آشامم ہنوز

دیوان میں ہے:

در ازل یک رہ ترا دیدم طلب کارم ہنوز
نیست ممکن کز جمالت دیدہ بردارم ہنوز

(ی) حافظ فرماتے ہیں:

فکر بلبل ہمہ آنست کہ گُل شد یارش
گُل در اندیشہ کہ چون عشوہ کند در کارش

دیوان میں ہے:

ہر کرا از ستم یار بود آزارش
ذوق و شوقے نبود در دل او از یارش

اس طرح بکثرت غزلیں حافظ کی زمینوں میں موجود ہیں ۔ اس لیے ظاہر ہے کہ دیوان کے مصنف ضرور حافظ کے بعد ہوں گے ۔

پھر بعض اشعار بھی حافظ شیرازی وغیرہ کے مضامین سے قریب ہیں ۔ مثلاً حافظ فرماتے ہیں:

هرگز نمیرد آنکه دلش زنده شد بعشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

دیوان میں ہے:

هرگز نمیرد آنکه شود مست جام عشق
آن کس که مست عشق بود جاودان بود

حافظ فرماتے ہیں:

آنان که خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود که گوشهٔ چشمے بما کنند

دیوان میں ہے:

صاحب دلے اگر نظرے سوی ما کند
مس وجود ما ز نظر کیمیا کند

حافظ کا ایک مشہور شعر ہے:

مباش درپے آزار و هر چه خواهی کن
که در شریعت ما غیر ازین گناهے نیست

دیوان میں ہے:

عزیز من بشنو یک سخن ز قطب الدین
مباش درپے آزار بندگان خدائے (۶)

امیر خسرو م (۷۲۵ھ) کا مشہور شعر ہے:

از سر بالین من برخیز اے نادان طبیب
درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

دیوان میں ہے:

رو طبیبا از سر بالین من ، زحمت مکش
زانکه بیمار غم او را دوای دیگر است

امیر خسرو کا مشہور شعر ہے:

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

دیوان میں ہے:

دلبرے دارم کہ رائم رائی اوست
درمیان جان شیریں جائی اوست

بالی (م: ۹۳۹ھ) کا مشہور شعر ہے:

گر میل کند سوے بالی عجبے نیست
شاہان چہ عجب گر بنوازند گدا را

دیوان میں ہے:

در رہگذار جانان ہر روز آیم از جان
شاید کہ شاہ خوبان بنوازد این گدا را

ناصر علی سرہندی (م: ۱۱۰۸ھ) کی رباعی ہے:

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدہ
ہر چند کہ آخر بظہور آمدہ
اے ختم رسل قرب تو معلومم شد
دیر آمدہ ز راہ دور آمدہ

دیوان میں ہے:

گرچہ بصورت آمدی بعد از ہمہ پیغمبران
امّا بہ معنی بودہ سر خیل جملہ انبیا

لیکن اس شعر کا مضمون ایسا نہیں ہے کہ تتبع یا توارد کہا جاسکے۔

حضرت سعدی (م: ۶۹۱ھ) کا مشہور شعر ہے:

خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زان پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

اور بابر (م ۹۳۷ھ) کا شعر ہے:

نو روز و نو بہار و مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دو بارہ نیست

دیوان میں ہے:

پیش از اجل بکوش و غنیمت شمار عمر
عمر عزیز زانکہ کسے را دوبارہ نیست

کتاب دلیل العارفین میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کے ملفوظات ہیں ، جو حضرت قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ نے جمع کیے ہیں ۔ اس کتاب کی مجلس ہشتم میں جو اوراد ہیں وہ حضرت قدس سرہ کے قول کے مطابق ان کے خواجگان سلسلہ کے معمولات میں سے ہیں۔ ان کی تفصیل ہے اور مجلس نہم میں یہ بھی ہے کہ خواجگان چشت کے خاندان میں بعض نے پندرہ درجے مقرر کیے ہیں جن میں [illegible] نحواں درجہ کشف و کرامات کا ہے۔ ہمارے خواجگان فرماتے ہیں کہ جب تک پندرہویں درجہ [illegible] نہ پہنچ جائے اپنے تئیں ظاہر نہ کرے۔ پھر کامل ہوگا۔

لیکن اس دیوان میں اس طرح ہے:

سالک بیا کہ رمزے گویم ز کار دانان | روشن کنم بیابان از راہ اہل عرفان
این راہ را نشانے از ہر مقام گویم | توفیق گر بخشد پروردگار خلقان
زین رہ آمدی تو اینست قدرت یار | لیکن بشد فراموش پُرنور راہ ایشان
امروز گر نہ کردی زنہار عبور بے شک | فردای روز محشر حسرت بود بجیوان
آن گاہ طور دل دان گویم ازو نشانے | گاہے شگوفہ بینی گہ میوہ ہای الوان
گاہے ثواب بینی گہ جاہہای روشن | گاہے ستارہ باشد گہ مہر و مہ درخشان
من بعد سر الطور است یعنی ز سرِّ باطن | یابی ازو نشانہا از ہر چہ ہست پنہان
ہر چیز حضرت حق در عالم آفریدہ | باشد تمام آنہا در اندرون انسان
زانہا دگر نشانے در نفس خود بیابی | باید کہ ہمچو مردان دائم حذر کنی زان
گہ حال زندہ دانی گہ حال مردگان را | بے پرتو جمالے زینہا عبور نتوان
برشو دگر ببالا یک یک مقام میرو | سیرے بکن چو مردان بالائے چرخ گردان
اندر مقام ہشتم کان را بود خفی نام | شاید خوری چو مردان جامے ز آب حیوان

در وے چو حفظ آری از خویشتن بمیری	وانگاہ زندہ گردی از اسمائے جانان
طور خفی چو دیدی از خویش وارہیدی	رنجے اگر کشیدی گشتی ز اہل عرفان
خاصیتش بگویم لیکن محال باشد	آنجا بشو چو مردان موصوف اسم رحمٰن
ہر اسم را مسمّیٰ آنجا پدید آید	اندر غلط نباشی از روی عقل می دان

ایسے تیس اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ اصل نسخے میں ان سے زیادہ رہے ہوں۔ اوپر کے بارہویں شعر میں سلوک کے مقام ہشتم کو خفی کہا گیا ہے۔ یہ بات دلیل العارفین یا چشتیہ سلسلے کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتی۔ بلکہ دوسرے سلسلوں میں بھی خفی کا یہ مقام نہیں ہے (۷)

دیوان میں تصوف کی بعض اصطلاحات بھی ملتی ہیں مثلاً تنزّلات کا ذکر ہے کہ:

اے قطب دین تو تکیہ مکن بر سلوک خویش
می دار ترس در دلِ خویش از تنزّلات

تنزّلات و تردلات دراصل توحید جودی کا ایک عنوان ہے (۸)۔ دیوان میں اس توحید وجودی (ہمہ اوست) کی تائید بھی ہے:

ہمہ اوست در دیدۂ اہل دید
دگر نقش کون و مکان چیست ہیچ

نقشبندیہ سلوک کی ایک اصطلاح سفر در وطن (۹) کا ذکر بھی دیوان میں ہے لیکن اس طرح ہے:

ہر کو سفر نہ کرد بملک وجود خویش
حالات ملک باطن و لطف سفر مپرس

نقشبندی سلوک میں اندراج النہایت فی البدایت، سیرالی اللہ ہے جو حضرت بہاء الدین نقشبند بخاری قدس سرّہ (م ۷۹۱ھ) سے شروع ہوا۔ (۱۰)

دیوان میں ہے:

صد سال اگر وصف جمال تو کند کس
ہرگز نہ رساند بدایت بہ نہایت

شاید اسی وجہ سے حسین بن منصور حلّاج (م ۳۰۹ھ) کے مسلک کے متعلق دیوان میں ہے:

خامے کہ زند دم از اناالحق
بر دار زنیش ہمچو حلاج

قطرہ منصور در بحر تو گم ناگشتہ بود
زد اناالحق تا بری روزے ورا بر دار خویش (۱۱)

صاحب دیوان کو اپنے سلسلے پر ناز ہے۔ فرماتے ہیں:

چون این طریق خاص مسلسل بہ مصطفیٰ ست
عشاق چنگ در روش قطب دین زند

اور اس کے حصول کے لیے وہ ایک شیخ کامل کی نظر کرم پر یقین رکھتے ہیں:

در عمر خویش تجربہ کردیم ہیچ کس
بے لطف یک عزیز ، عزیز خدا نہ رفت

اور اس عزیز ہی کے ذریعے عشق حاصل ہوتا ہے جو ہر چیز سے بے نیاز کر دیتا ہے

ما را بغیر عشق نہ مذہب نہ ملّت است
داند کسے کہ گوش کند داستان ما
ما را مزن تو طعنہ بہ رندی و عاشقی
ما از برای عشقیم و عشق از برای ما (۱۲)

پیر کی تعلیم یہ تھی کہ:

مرا ز پیر طریقت ہمین سخن یاد است
کہ رست از دوجہان ہر کہ از خود آزاد است
از علائق سر بسر مہر دل خود را ببر
زانکہ در کویش نیابد رہ کسے کو مرد نیست

اور اس مرد کی شان یہ ہے کہ:

زمین و آسمان نبود حجاب روی آن سالک
کہ از نعلین مردے گرد او را بر جبین باشد

"پندار" سے ان کو نفرت تھی، جگہ جگہ اس کے خلاف لکھا

پردۂ پندار دور افگن ز سر گر طالبی

کآدمی را ہیچ چیزے بدتر از پندار نیست
از پئے پندار بیرون آ کہ بینی وصل دوست
پیش رویش قطب دین این چہرۂ پندار تست
عنکبوتے ست کہ بر روی خودش پردہ تند
ہر کجا در پئے پندار خودش بوالہوس است

اسی لیے وہ ایسے نمازی کو بھی نمازی نہیں سمجھتے جو پندار رکھتا ہو اور نیاز (خلوص) سے خالی ہو۔ بارہا فرماتے ہیں:

زہّاد را نیاز نہ باشد نماز چیست
فارغ ز درد عشق چہ داند نیاز چیست
نزد خدا چو تحفۂ بہ از نیاز نیست
پس ہر کرا نیاز نہ باشد نماز نیست
اے قطب دین نیاز درین راہ پیشہ کن
زیرا کہ قرب حضرت حق از نماز نیست

ایک جگہ یوں ہے:

با زاہد دہر خویشتن بین
از روزہ و از نماز گویم
حاجی کہ در آید از در من
با او سخن از حجاز گویم

ریا کار اور خود بیں زاہدوں سے گریز چاہتے ہیں:

مرد بحلقۂ زہّاد دہر قطب الدین
کہ از دہان تو بوی شراب می آید

وہ کعبۂ مقصود کے حصول کے لیے عشق اور نیاز مندی ہی کو ...

جائے کہ ہست کعبۂ مقصود قطب دین
محتاج را مشقت راہ حجاز چیست
قطب دین از کوی تو کے می رود جای دگر
کعبۂ مقصود او غیر از سر کوی تو نیست(۱۳)

گر ہوس داری رسی در کعبہ مقصود خویش
در بیابانش مثال مرغ طیران بایدت

یہ شاعر پیر سال تھے جیساکہ ایک شعر میں اشارہ ہے:

آفتاب عمر من رو در زوال آوردہ است
با اجل دست و گریبانم خدایا دست گیر

اور معاشی تنگی بھی تھی فرماتے ہیں:

قطب دین از مفلسی غمگین مشو
چون صدف قانع شو؛ پُر دانہ باش

ایک جگہ فرماتے ہیں:

اے قطب دین چو یار برند التجا ہم
تو در پناہ شاہ جہان آفریدہ باش

دیوان کی زبان صاف اور رواں ہے اور شروع سے آخر تک عشق حقیقی کی ترجمانی ہے۔ لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ملامتی" جماعت سے صاحب دیوان کا تعلق رہا ہوگا۔

ایک جگہ یوں ہے:

گر بظاہر نماز نگذارند
جان عشاق در نماز بود
زاہدان گر حجاز می طلبند
طالب عاشقان حجاز بود

ایک اور غزل ہے:

تا مست و عاشق رخ جانانہ گشتہ ام
با درد عشق ہمدم و ہم خانہ گشتہ ام
بیگانہ ہم ز خویش شدم ہم ز آشنا
رسوا میان خلق چو دیوانہ گشتہ ام
از عاقلانِ دہر گرفتہ کنارۂ
مانند وحشی از ہمہ بیگانہ گشتہ ام
دنیا و آخرت ہمہ برباد دادہ ام

در عشق یار ساکن میخانہ گشتہ ام
سر حلقۂ ملامتیان جہان شدم
در خانقاہ و مدرسہ افسانہ گشتہ ام
گنج نہانِ خویش بہ ویرانہ یافتم
ساکن ازان بہ گوشۂ ویرانہ گشتہ ام
نبود عجب کہ سوختہ باشم چو قطب دین
بر گردِ شمع وصل چو پروانہ گشتہ ام

ایک شعر اس طرح بھی ہے:

قلندرانِ خرابات عشق را بنگر
کہ می دہند ز شوقِ وصالِ تو جان را

نماز نہ گزارنا اور سر حلقۂ ملامتیاں بن جانا وغیرہ اگر استعارہ نہیں ہے تو خیال ہوتا ہے کہ صاحب دیوان شاید قلندر رہے ہوں گے۔ تاہم وہ فرماتے ہیں،

نیم شب برخیز عرض حال خود کن پیش دوست
درد دل شب خود علاج درد مندان می کند
دلا وقت سحر می باش بیدار
سر از بالین خواب ناز بردار
بہ کنج خلوت تاریک بنشیں
گرت باید تجلّی از رخ یار
ہمیشہ باش ساکن بر در دوست
مشو غافل زمانے بہر دیدار (۱۴)

ایک اور غزل میں پھر مقامات کا ذکر کرتے ہیں:

در مقامے کہ دران روز نماید شب تار
از تجلّی رخش مرد شود برخوردار
عکس دلدار در آئینۂ جان در یابد
محو گردد کہ ازو ہیچ نماند آثار
بعد ازان چون برندش بہ مقامے دیگر

بدرد پردہ و بینند بے عاشق زار

چون شود فانی آن نور شود عاشق مست

نام او گشت درین کوی دگر عاشق یار

رویش از پرتو انوار شود ہمچون عشق

وان مقامے است کہ باشد بہ مثل چون گلزار

حال او گشت دگر گون و ز خود بیخود شد

ظاہرش با من و تو باطن او با دل دار

عاشقان سر این کوی چنین تا باشد

قطب دین ما و من خویش درین کو بگذار

دیوان کے شروع میں تین غزلیں حمد میں ہیں۔ پھر ایک نعت ۳۰ شعروں پر مشتمل ہے اور اس میں چاروں خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) کی منقبت بھی ہے۔ وہ نعت اس طرح شروع ہوتی ہے:

اے از شعاع روی تو خورشید تابان را ضیا

آنی کہ ہستی از شرف بالاتر از عرش علا

دوسری نعت اس طرح شروع ہوتی ہے:

یا محمدؐ مہر و مہ را نور چون روی تونیست

کور بادا آنکہ اورا چشم دل سوی تو نیست

مقطع یوں ہے:

یا محمدؐ ہر کسے را کعبہ جای دیگر است

قطب دین را کعبۂ مقصود جز کوی تو نیست

ایک اور نعت اس طرح شروع ہوتی ہے:

آنجا کہ آفتاب لقای محمدؐ است

خورشید ذرہ ز ضیای محمدؐ است

دیوان میں ایک غزل کا مطلع ہے:

بجز دان طریقت جماعتے دگرند

کہ زندہ اند ز یار و ز خویش بے خبرند

محمد غوثی شطاری مانڈوی کی گلـزار ابرار ۔ جس کی تکمیل و تصحیح ۹۹۱ھ سے ۱۰۲۲ھ تک ہوئی اور جس کا اردو ترجمہ لاہور سے ۱۳۹۵ھ میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس کے صفحہ ۶۰ میں دیوان کا وہ شعر اس طرح ہے:

مجردان طریقت جماعتے دگرند
چنان صفت کہ تو داری بدان صفت نبرند

یہ شعر اس ذیل میں ہے کہ حضرت بدیع الدین شاہ مدار (م ۸۰۰ھ) کے مقلدین نے حالت تجرید کی یہ گت بنا رکھی ہے کہ چار انگشت کی لنگوٹی پر اکتفا کیا ہے۔ اس شعر کا دوسرا مصرع دیوان کے دوسرے مصرع سے مختلف ہے۔یہی شعر اس تذکرے (گلـزار ابرار) کے صفحہ ۵۳۶ میں بھی ہے، لیکن دوسرے مصرع میں صرف ایک لفظ میں فرق ہے، یعنی

باین صفت کہ تو داری بدان صفت نبرند

اور وہاں اس شعر سے پہلے نزہت لکھا ہوا ہے یعنی یہ شعر نزہت کا ہے۔ پھر صفحہ ۲۱۳ میں بھی ملک شیر ظلوتی (م ۱۰۰۵ھ) کی وفات کا ذاکر کرتے ہوئے نزہت کا ذکر اس طرح آتا ہے:

نزہت کہ وصال باد جانش

نزہت غیر معروف شاعر ہیں لیکن صاحب تذکرہ سے قریب ہوں گے اور ان کا زمانہ بھی ان کے قریب رہا ہوگا، تاہم صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ شعر مذکور (جس کا پہلا مصرع بالکل وہی ہے جو اس دیوان میں ہے) کب لکھا گیا ۔ یعنی صاحب دیوان نے پہلے لکھا یا نزہت نے پہلے لکھا۔ بہر حال اندازہ یہی کیا جاسکتا ہے کہ دونوں کا زمانہ قریب قریب کا ہوگا اور یہ دیوان گیارہویں صدی ہجری سے پہلے کا نہیں ہے۔ (۱۵)

وللہ غیب السموات والارض

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

حواشی

(۱) ۱۲۹۶ھ میں آفتاب الدّولہ قلق کی مثنوی طلسم الفت خود ان کی تصحیح سے شائع ہوئی تھی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس کے بعد انتقال ہوا ہوگا۔ دیکھیں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا مقالہ "لکھنؤ کا دبستان شاعری" صفحہ ۲۸۵ (علی گڑھ ۱۹۴۴ء)

(۲) مولانا عبدالرزاق سے مولانا حسرت موہانی (ولادت ۱۲۹۵ھ) نے سب سے پہلے بیعت کی تھی، پھر ان کے صاحب زادے مولانا عبدالوہاب سے بیعت کی۔ دیکھیں پروفیسر عبدالشکور کی کتاب "حسرت موہانی" صفحہ ۳۵۔۳۰ (آگرہ ۱۹۳۶ء)

(۳) مطبوعہ دیوان میں ایک غزل اسی زمین میں ہے اور اس طرح شروع ہوتی ہے:

ہر کہ از خویشتن فنا باشد با خدائے خود آشنا باشد۔

اس دیوان کی کئی غزلیں قوالوں نے حضرت قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ سے منسوب کردی ہیں۔ یہ غزل بھی۔

شب نیاید خواب اندر دیدۂ بیدار من
شب ہمہ شب زانکہ باشد فکرِ عشقش کار من

(۴) حافظ کی غزل ہے:

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب
کہ آمد ناگہاں دل دارم امشب

دیوان میں بحر کچھ مختلف ہے:

بے خود از بادہ یارم امشب
نیست آرام و قرارم امشب

(۵) حافظ کی غزل ہے:

درد ما را نیست درماں الغیاث
ہجر ما را نیست پایاں الغیاث

دیوان میں بحر مختلف ہے:

سوخت جانم از غمت اے شاہ خوباں الغیاث

الغیاث از آتش جان سوز ہجران الغیاث

(۶) گلـزار ابرار غوثی (اردو ترجمہ ، ص ۳۱۳) میں اس سلسلے کا یہ اچھا شعر ملتا ہے :

نیازارم ز خود ہرگز دلے را
کہ می ترسم درو جاے تو باشد

(۷) نقشبندی سلسلے میں یہ مقام چہارم ہے۔ دیکھیں مولانا زوّار حسینؒ کی عمدۃ السلوک ، حصۂ دوم، صفحہ ۱۳۰ (کراچی ، ۱۳۷۹ھ)

(۸) توحید وجودی کا ایک عنوان نزولات (یا تنزّلات) خمسہ (یا ستّہ) ہے یعنی ذات احدیت اور انسان کے درمیان نزولات ذات پانچ ہیں اور چھٹے مرتبے میں حضرت انسان ہے جو ان پانچوں مراتب کا مظہر ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں مولانا زوّار حسینؒ کی عمدۃ السلوک، حصۂ دوم صفحہ ۷۷ تا ۸۵ (کراچی ۱۳۷۹ھ)

(۹) یہ سلوک نقشبندیہ کی آٹھ اصطلاحات میں سے ایک ہے۔ یہ حضرت عبدالخالق غجدوانی رحمتہ اللہ علیہ (م ۶۱۷ھ) کی قائم کردہ اصطلاحات ہیں۔

(۱۰) دیکھیں مولانا زوّار حسین کی کتاب مذکورۂ بالا

(۱۱) اکبر الہ آبادی کہتے ہیں :

حضرت منصور انا بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ
دار تک تشریف لے آئیں گر اتنا ہوش ہے

(۱۲) عشق سے متعلق بہت اشعار اور متعدد غزلیں ہیں ، مثلاً صفحہ ۳۰ ، ۳۷ ، ۳۸ ، ۵۱ وغیرہ۔ ایک شعر ہے :

عشق آمد و تیغ تیز در دست
بر ہر کہ زدش ز خویش وارست

(۱۳) کعبۂ مقصود کی طرح صاحب دیوان کو قابل کا لفظ بھی بہت پسند ہے ، مثلاً

قابلے نیست کہ عشق تو نہ دارد در دل
ہر کہ عشق تو نہ دارد بخدا قابل نیست
فانی ز خویش گشتہ و باقیش باخداست
آن قابلے کہ بار امانت کشیدہ است
در نماز عشق ہر جا دیدہ ام من قابلے
روی دل او را بجز در طاق ابروے تو نیست

از راہ بیخودی ہمہ از خود بریدہ اند
گر مرد قابلی تو ہم از خود بریدہ باش

علی الدّوام کی ترکیب بھی متعدد اشعار میں ہے۔

(۱۴) ایک غزل میں ہے:

اے ماندہ بخویشتن گرفتار
از راہ حجاب خویش بگزار
غافل منشیں ز خود زمانے
از ہستی خویش شو تو بیزار

ایک جگہ یہ ہے:

تا نہ میری ، بوصل او نہ رسی
وصل گر بایدت ز خویش بمیر

ایک شعر یہ ہے:

جان نثار یار کن گر بایدت دیدار او
تا کسے از خود نمیرد لائق دیدار نیست

(۱۵) یہ مضمون پورا ہوا تو محترم ڈاکٹر نذیر احمد کا فاضلانہ مقالہ اسی موضوع پر نظر افروز ہوا۔ تاہم اپنی اس حقیر کاوش کو بھی محفوظ رہنے دیتا ہوں کہ شاید کوئی بات قارئین کو مفید نظر آجائے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں:

دیوان ظہیر اور اس کا مصنّف

فارسی کے مشہور شاعر ظہیر فاریابی (المتوفی ۵۹۸ ھ) سے غزلیات کا ایک دیوان بھی منسوب کر دیا گیا ہے جو نول کشور پریس، لکھنؤ سے ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا اور اس کے سرورق پر اس شاعر کی تعریف کا ایک مشہور شعر درج ہے:

دیوان ظہیر فاریابی　　در کعبہ بدزد اگر بیابی

لیکن اگر ان غزلیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ظہیر یقیناً بعد کے عہد سے تعلق رکھتا ہوگا۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں:

۱۔ ہر غزل میں مقطع (شاعر کا تخلص) موجود ہے، جو چھٹی صدی ہجری میں عموماً رائج نہیں تھا۔ سنائی (م ۵۳۵ ھ) جو فارسی غزل کے بانی کہے جا سکتے ہیں اپنی غزلوں میں شاذ و نادر ہی تخلص لاتے ہیں۔ یہی حال سیّد حسن غزنوی (م ۵۸۶ ھ)، فلکی شروانی (م ۵۰۰ ھ)، انوری (م ۵۸۵ ھ)، جمال الدین اصفہانی (م ۵۸۸ ھ) وغیرہ کا ہے۔ صرف خاقانی (م ۵۹۵ ھ) کے یہاں تخلص کا التزام نظر آتا ہے۔ لیکن پھر کمال الدین اسمٰعیل (م ۶۳۵ھ) کے یہاں نہیں ہے۔

۲۔ شاعر نے بعد ایسی کتابوں کا استعارۃً ذکر کیا ہے جو ظہیر فاریابی سے بہت بعد کی ہیں۔ مثلاً کیمیاے سعادت (غزالی، م ۵۰۵ ھ)، مخزن اسرار (نظامی۔ م ۵۹۹ ھ)، گلشن راز (محمود شبستری۔ م ۷۱۰ ھ) اور مطوّل (تفتازانی۔ م ۷۹۸ ھ) کا ذکر ان اشعار میں آتا ہے:

اکسیر کیمیاے سعادت دل من است　　گو گرد احمرم کہ طلا را کند نحاس

مخزن اسرار معنی ابر گوہر بار ماست　　در درج معرفت لعل لب گفتار ماست

شرح ابروش ز دیباچۂ آن چہرہ ظہیر　　شاہ بیتی ست کہ از گلشن راز آوردم

شرح مطوّل سر زلف تو برہم است　　پنداشت دل چو رمز لبت مختصر شود

اس ظہیر کا ایک قلمی دیوان اسلامیہ کالج پشاور کے کتاب خانے میں ہے جس میں

ایک جگہ شاعر نے حافظ شیرازی (۷۹۱ھ) کا ایک مصرع تضمین کیا ہے:

بگوے دوست ظہیر آن چنان کہ حافظ گفت　　　تمسّے کن و جان بین چگونہ می سپرم

۳. دیوان میں شاہ عباس اعظم (م ۱۰۳۸ھ) کے چہار باغ کا ذکر بھی آتا ہے جو اس بادشاہ نے زایندہ رود کے قریب ۱۰۰۶ھ میں اصفہان میں تعمیر کرایا تھا:

ز سیر چار باغ از دیدہ ام زایندہ رود آمد　　　صفاہان بر من بےچارہ زندان است در واقع

۴. شاعر نے گاؤ تکیہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو شاید گیارہویں (۱۱) صدی ہجری سے پہلے نہیں تھا۔

ردّ و ضعیف و مفلس و بے قیمتم ظہیر　　　فارغ چو گاؤ تکیہ بہ دیوار دادہ ام

۵. اب ہم ایک قطعی ثبوت کی طرف آتے ہیں۔ شاعر نے ایک شعر میں صاف طور پر خود کو صائب اصفہانی (م ۱۰۸۰ھ) کا شاگرد کہا ہے:

بہ شعر فخر ازان می کند ظہیر کہ سر　　　چو خامہ بر خط تعلیم صائبا دارد

اتفاق سے پژمان کا مجموعہ "بہترین اشعار" (تہران، ۱۳۱۳، صفحہ ۸۶۵) دیکھا تو اس میں جو اشعار ظہیر "اصفہانی" کے درج ہیں وہ سب کے سب مذکور الصدر مطبوعہ دیوان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس طرح قطعی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ ظہیر اصفہان کا تھا۔ اور وہ یقیناً ظہیر فاریابی سے مختلف ہے۔ لیکن اس اصفہانی ظہیر کے کوئی حالات کہیں نہیں ملتے۔ اس کے دیوان سے البتہ چند اشارات جمع کیے جاسکتے ہیں۔

شاعر خود کو ظہیر کے علاوہ ظہیری بھی کہتا ہے

اگر پرسند کس حال ظہیری را بگویندش
کہ در دام است آن مرغے کہ شب از آشیان گم شد

میان خوب رویان سربلندی می سزد او را
کہ دارد چون ظہیری عاشق زار دعا گوے

صائب کی طرح اس کا شاگرد بھی اہل وطن سے نالاں ہے:

ہر چند ظہیر از وطن خویش بنالیم　　　بر بارہ سلطان خراسان نہ توان بست

فکر ارباب سخن را نہ شناسند ظہیر　　　این قدر گنج کہ از سینہ فشاندیم عبث

معلوم ہوتا ہے کہ وہ رزق کی تلاش میں کرمان بھی کبھی گیا تھا:

ما را برات عشق ز کرمان بریده شد — زان پس بنام شاه خراسان نوشته اند

حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ (م ۲۰۳ ھ) کی مدح میں ایک غزل بھی ہے:

ز دور گوے ثریا یکے فریسم توس — ز جذبہ کرم خود مکن مرا مایوس

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دو نعتیہ غزلیں بھی ہیں:

کسے کہ می زند از شکوہ فلک تشنیع
تمیز عقل نہ دارد چو کودکان رضیع
اے ز بلال ناخنت بدر بیک اشارہ شق
چرخ نثار مقدمت کردہ ستارہ در طبق

دربار صفوی کے تشیع کے باوجود شاعر سنی معلوم ہوتا ہے:

ظہیر اگر تو بمحشر نجات می طلبی — ز صدق دامن پیغمبر و صحاب بگیر

شاعر تصوف سے تعلق رکھتا ہو گا:

من پرتوے ز عشقم و بر حسن مائلم — مجنون نجد عشقم و لیلیٰ قبائلم

مرد را بر تن لباس معرفت آرائشے است — زان طبیعت میل بر دیباے زرکش می کند

قناعت و استغنا کے مضامین بھی بہت جگہ آتے ہیں:

دنیا طلب مباش و مکن جستجوے گنج — قارون بخاک تیرہ شد از آرزوے گنج

یقین او بتوکل تمام نیست ظہیر — کسے کہ وقت سفر فکر زاد راہ کند

درین دو روزہ فانی ظہیر حیرانم — کہ بر متاع قلیل جہان کنند نزاع

شاعر سے متعلق دیگر تفصیل راقم الحروف کے انگریزی مضمون مطبوعہ سندھ یونی ورسٹی جرنل (جلد اول ۱۹۶۱ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

("چند فارسی شعرا" - از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، حیدرآباد، سندھ ۱۹۸۹ء)

حاشیہ

(۱) ملا طغرا (م ۱۰۶۸ ھ) کا شعر ہے:

نہ بودے اگر تیرگی بد نمود — شدے گاہ تکیہ ز چرخ کبود

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں:

حضرت شیخ عثمانؒ کا رسالۂ عشقیہ

بالائی (ضلع نواب شاہ۔ سندھ) میں محترم مولوی عبدالصمد صاحب کے پاس ایک قلمی نسخہ موسوم عشقیہ موجود ہے جس میں دو سو اٹھتیس اوراق ہیں اور خاتمے کی یہ عبارت ہے:

> تمت الکتاب بعون اللہ الملک الوہاب نسخہ عشقیہ من تصنیف سید عثمان مروندی قدس اللہ سرہ العزیز۔ روز شنبہ بوقت یک نیم پاس۔ بتاریخ نہم شعبان ۵۹۱ھ۔ کاتب الحروف بندہ قادر بخش قادری خاک پائے عالمان و فقیران غفراللہ لہ ولوالدین ولاستاذی ولجمیع المومنین و المومنات والمسلمین و المسلمات یا ارحم الراحمین ...

اس عبارت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ حضرت عثمان مروندی (لعل شہباز قلندر سیوانی) رحمۃ اللہ علیہ کا ہوگا جن کی عمر قریب سو سال بتائی جاتی ہے اور جن کا سال وفات ۶۷۳ھ ہے۔ لیکن اس عبارت میں جو ۵۹۱ھ درج ہوا ہے اس کو بغور دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں تحریف کی گئی ہے اور اس پر بعد میں قلم پھیرا گیا ہے۔ پھر جو یہ کہا گیا ہے کہ ۵۹۱ھ کی نویں شعبان کو شنبہ تھا، تو یہ بھی صحیح نہیں۔ کیوں کہ اس سال اس تاریخ کو شنبہ نہیں، چار شنبہ تھا (۱۹ جولائی ۱۱۹۵ء)۔ پھر کتاب کی داخلی شہادتوں سے کتاب اور مصنف دونوں کے زمانے کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔ چناں چہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسی شہادتیں پیش کر دی جائیں۔

کتاب کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ علی رسولہ محمد والہ اجمعین۔ سبحان اللہ قادرے کہ خاک را از لطف عمیم جان بخشید و بتشریف ولقد کرمنا بنی آدم مشرف گردانید و بخلوت یکہم و

بچون معزز ساخت و بدولت وصال و هو معکم بنواخت وفی انفسکم افلاتبصرون اشارتے است باختصاص و نحن اقرب الیہ من حبل الورید کرامتے ست خاص فاذکرونی اذکر کم نغمہ ایست یگانہ نواز وصلاے دعوتے استجب لکم نعمتے است بابرکت و ساز و صلوات اللہ من الازل الیٰ الابد علیٰ افضل العالم دوام احمد محمد کہ تجلی نخستین اول ماخلق اللہ نورے است و بر آل و اصحاب اوکہ بایھم اقتدیتم اھتدیتم ہر یک وسیلہ قرب ازدوری رضوان اللہ علیھم اجمعین۔ امابعد چوں دریں جہاں لطف الٰہی و فضل نامتناہی ہر بندہ راتوفیق طلب بخشد و در محبت خود بخود کشد دردل او مہر و دوستی خود اندازد تادر ذکر و بندگی شاہد و ہدایت یا بدو کسے راکہ گمراہ کند، محبت دنیاے تباہ مشغول کند و محجوب باسباب دنیوی در آرد کہ یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیراً کنیل مصر ما، للمحبوبین بلاء للمحجوبین

نیل مصری خود بقبطی خون نمود قوم موسیٰ را نہ خون بود آب بود

بیت

آن راکہ تو رہبری کنی کسے گم نہ کند واں را تو گم کنی کسش رہبر نیست

زہے لطف کمال کہ خاک صلصال راتاج شرافت انی جاعل فی الارض خلیفہ برفرق نہاد و فرزندان خلف اورا در ولایت الاان اولیائی تحت قبائی تصرف داد و راہ روان دین رابشرف قرب محض بکاس محبت از ماسوای پرداخت۔

خصوصاً حضرت الثقلین کہ درطی مسالک سلوک واحیاے مراسم دینی و ایجاد شواہد یقین بنہایت رسانیدہ محی الدین شددر طریق وصول از فناے تقید عبودیت بقاے قدرت مطلق پیوستہ عبدالقادر شد و خواجہ زمان و زمین۔ رفیع قدر و دوربین۔ صاحب دولت ودین خواجہ بہاء الدین کہ بانفاس متبرکہ و برہان مبرہن و یمن نظر روشن، توجہ شریفش در دلہاے نقش حق می بست۔ بیت

خواجہ کش جہاں غلام شدہ او خود از بندگیش دارد عار

وارشاد پناہی مظہر جلال ذوالجلال حضرت شیخ جلال کہ خلیفہ حضرت غوث الثقلین است قدس اللہ سرہ و نخست ارادت فقیر بسلسلہ قادریہ بوسیلہ بیعت مبارکش بودہ بحکم اشارت خواجہ نقشبند و اجازت غوث الثقلین ... نقشبندیہ از خدمت خواجہ اسحٰق یافتہ کہ سحق و خودفانی و قرب حیات جاودانی مخلصان را از صحبت ایشان حاصل می شد و چون شرف ملازمت

حضرت پیر دلی برکی یسر شد از کمال ولایت و محض کرامت سہ ۳ روز توجہ بحال بندہ فرمودند و ... نمودند کہ سالہا بل قرنہا زبان تقریر دخامہ تحریر در ادائے شکر آں عاجز و قاصر است و دور باقی از فیض ساقی یعنی منشاۃ از خدمت حضرت خواجہ باقیؒ نصیب شد۔ خادم ... عثمان کہ ریزہ چین خوان اخوان الصفائیست بلکہ جرعہ نوش بزم خمر الوفاء ولاارض من کاس الکرام نصیب، ہمیشہ دریوزہ استمداد از دردلہا نمودہ ... دستگیری از پائے مردے مردان کردہ و درجست وجوئے ایں دولت وتگ و پوی ایں سعادت از خاک اقدام وارستگان تنگ و نام، کحل الجواہر بر دیدہ دیدہ ... بردفق مقال و حسب حال است

دولت فقر خدایا بمن ارزانی دار کیں کرامت سبب حشمت تمکین من است

اے درویش تا بر چہار آتش گداختہ نہ گردی پختہ نشوی۔ اول آتش فقر۔ دوم آتش محبت۔ سوم آتش دم نہ زدن درقضا و قدر یعنی تسلیم۔ چہارم آتش از غم روزی بے غم بودن یعنی توکل۔ اے درویش تا ازیں چہار عقبہ در نگزری ترا عاشق نخواندند۔ وایں تحفۃ القلوب وہدیۃ الارواح بچہار مفصل شد و ہر فصل بچہار باب منسوب گشتہ و ہرباب بکلام ربانی و حدیث مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم و سخنان اہل اللہ کشائش یافت تا دوستان لائق و عاشقان صادق ازیں بہرہ برگیرند وباغیر مشغول شدن راحت نپذیرند کہ لاوحشۃ مع اللہ ولا راحۃ مع غیر اللہ۔ ایں رسالہ مسمی بعشقیہ دریائے معرفت شد تا عاشق را الفتے باشد۔

یہ طویل اقتباس ضرورتاً پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

۱۔ مصنف پہلے حضرت شیخ جلال (۱) (تھانیسری۔ المتوفی ۹۸۹ھ) سے بیعت ہوئے تھے جو حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۴۴ھ) کے خلیفہ تھے۔ یعنی مصنف نے پہلے قادری سلسلے میں ارادت حاصل کی تھی۔

۲۔ اس کے بعد حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے "اشارہ" (روحانی) اور حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی "اجازت" (روحانی) سے خواجہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ (۲) کی خدمت میں نقشبندی طریقہ اختیار کیا۔

۳۔ پھر حضرت پیر دلی برکی علیہ الرحمہ سے صرف تین دن کی صحبت میں ولایت کے کمالات کے عجیب عجیب مشاہدات ہوئے۔

۴۔ ان بزرگوں کے بعد حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۱۲ھ) کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوا۔

۵۔ مصنف نے اپنے اس رسالے کا نام "عشقیہ" رکھا تھا اور یہ کہ اس رسالے میں چار فصلیں ہیں اور ہر فصل میں چار باب ہیں۔

ان فصلوں کی تفصیل اس طرح آتی ہے کہ پہلی فصل میں فقر، تسلیم، توکل اور ذکر کے چار ابواب ہیں۔ دوسری فصل میں بھی چار ابواب ۱۔ سلوک کی انتہا، ۲۔ درویشوں کی عادات ۳۔ اہل اللہ کی ریاضت اور ۴۔ رضائے الٰہی کے تحمل سے متعلق ہیں۔ تیسری فصل میں بھی اسی طرح چار ابواب ہیں ہے۔ ۱۔ خاموشی اور گوشہ نشینی ۲۔ ذوق و محبت ۳۔ شوق اور ۴۔ تواضع۔ یہ فصل طویل مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد آخری یعنی چوتھی فصل ہوتی ہے جس میں حسب معمول چار ابواب ہیں اور وہ یہ ہیں: ۱۔ تضرع ۲۔ عاشقوں کی جان بازی ۳۔ نصیحت، دلجوئی، عیب پوشی وغیرہ اور ۴۔ عاشقوں کے حالات اور خاتمہ کتاب ہے۔

ان تمام فصلوں میں جگہ جگہ علماء، صلحاء اور صوفیہ کے اقوال یا اشعار ہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے علاوہ ان بزرگوں کا ذکر آتا ہے:۔

عبداللہ سری سقطی (م۲۵۳ھ۔ ۱۰ الف)۔ شیخ جنید بغدادی (م ۳۰۲ھ۔ ۶۱ ب)۔ حسین حلاج (م ۳۰۹ھ۔ ۵۳ الف ۔ ۶۵ الف)۔ شیخ ابوعلی دقاق (م ۴۰۵ھ۔ ۶۲ ب)۔ ابوسعید ابو الخیر (م ۴۴۰ھ۔ ۶۲ ب)۔ عبداللہ انصاری (م ۴۸۱ھ ۔ ۶۲ ب ۔ ۷۳ ب)۔ خواجہ یوسف ہمدانی (م ۵۳۵ھ۔ ۶۲ ب)۔ احمد جامی (م ۵۳۶ھ۔ ۵۵ ب)۔ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ۔ ۳ الف ۔ ۳۰ ب)۔ خواجہ معین الدین چشتی (م ۶۳۳ھ ۔ ب ۴۴)۔ سعدی (م ۶۹۱ھ ۔ الف ۵۔ ب ۵۰)۔ جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ ۔ ۲۶ الف ۔ ۳۸ ب ۔ ۶۳ الف)۔ سیف الدین باخرزی (م ۶۵۸ھ ۔ ۱۰۵ الف)۔ عراقی (م ۶۸۸ھ ۔ ۹۰ الف)۔ بہاء الدین نقشبند بخاری (م ۷۹۱ھ ۳ الف ۔ ۲۸ ب ۔ ۳۸ ب)۔ حافظ شیرازی (م ۷۹۲ھ ۔ ۳۵ ب۔ ۴۴ ب۔ ۵۸ الف۔ ۷۸ الف۔ ۱۰۱ الف۔ ۱۱۳ الف)۔ شرف الدین یحیی منیری (م ۷۸۲ھ۔ ۱۲۲ الف)۔ خواجہ محمد پارسا (م ۸۲۲ھ ۔ ۱۹ الف۔ ۶۲ ب)۔ زین الدین خوافی (م ۸۳۸ھ ۔ ۶۳ الف)۔ عبید اللہ احرار (م ۸۹۵ھ۔ ۵۷ ب)۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ۔ ۱۱۹ الف)۔ خواجہ باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ۔ ۲ ب)۔ رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے بکثرت بزرگوں کے اقوال، احوال یا اشعار درج ہیں۔ خود شیخ عثمان علیہ الرحمہ (۳)

(مصنف) نے اپنے اشعار یا غزلیں کثیر تعداد میں نقل کی ہیں۔ مثلاً یہ اوراق ہیں :۔ ۳ الف۔ ۱۵الف۔ ۱۶ الف ۔ ۱۹ الف ۔ ۲۱ ب ۔ ۳۳ ب ۔ ۵۱ الف ۔ ۶۳ الف ۔ ۶۹ ب ۔ ۷۳ ب ۔ ۸۵ ب۔ ۹۶ ب۔ ۱۱۷ ب۔ ۱۳۲ الف۔ ۱۶۱ ب۔ ۱۸۱ الف۔ ۱۸۲ ب۔ ۱۸۸ الف۔ ۱۹۶ ب۔ ۲۰۰ ب۔ ۲۱۲ الف ۲۱۳ ب ۔ ۲۲۱ الف ۔ شیخ عثمان علیہ الرحمہ کی ایک غزل (۱۵ الف) ملاحظہ ہو :۔

اے درعیاں نہاں و نہاں درعیاں توئی — بے مثل و لا مثال نشاں بے نشاں توئی

توآں نہ کہ کس ز تو یابد یکے نشاں — اے برتر از بلند و بلند از گماں توئی

در ظاہرا ترا طلبم و آنگہی نہاں — درچوں نہاں بجوئمت آنگہ عیاں توئی

در دہر و دور گردش عالم جہان و خلق — غائب میان ہر ہمہ و با ہماں توئی

ہر رو بروئے ظاہر و ہر سوبسو نہاں — معلوم شد چناں کہ ہمیں و ہماں توئی

بودیم درپئے تو بہر سو بجست و جوی — عثمان طلسم بود جمال جہاں توئی

مصنف کی شاعری کا عام رنگ یہی ہے اور غالباً ان کا کوئی اور موضوع نہیں۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کے زمانے کی تعیین کی جائے۔ انڈیا آفس لندن کا مخطوط نمبر ۲۹۱۵ بھی اسی رسالے کا دوسرا نسخہ ہے جو محمد شاہی جلوس کے اکیسویں سال یعنی ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء میں لکھا گیا تھا HERMMANN ETHE کا خیال ہے کہ اس کے مصنف "شاہ عثمان" وہی ہیں جن کے انتقال ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۷ء سے متعلق حضرت ہاشم کشمی علیہ الرحمہ (۴) نے اپنے دیوان (مخطوط نمبر ۲۸۹۸۔ انڈیا آفس۔ لندن) میں قطعہ تاریخ لکھا تھا۔ لیکن رسالہ عشقیہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ عثمان نہیں ہیں جن کا انتقال ۱۰۰۵ھ میں ہوا تھا بلکہ یہ مؤخر ہیں۔ کیوں کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے حضرت خواجہ باقی باللہ رحمتہ اللہ علیہ (م ۱۰۱۲ھ) سے استفادہ کیا تھا اور رسالے میں ایک ریختہ (۶۶ ب) اس طرح آتا ہے :۔

دلا غافل چہ می خسپی کہ اپنی میچ تھیں ڈریے — چو روزے مرگ در پیش است اتنی نیند کیوں کریے

چو دزد اندر کمیں باشد کرے جو نیند بنجارا — نہ باشد سود یک حبہ گنوادے مول بھی سارا

دریں دنیائے وہ روزے بڈائی کائیں کوں کریے — اگر صد سال شد عمرت نہایت ایک دن مریے

چہ مغروری دریں دنیا سدا اس جگ نا رہنا — ہمیں را ہے کہ در پیش سبھی اس پنتھ ہے چلنا

کجا رفتند آں شاہاں کہ جن کے بار تھے ہستی ۔۔۔ گرفتند جائے در صحرا گئے سب چھوڑ کر بستی
کجا رفتند آں مرداں کہ بانکی ٹوپیاں دھرتے ۔۔۔ ہمہ درخاک خسپیدند جن سیں سیہ بھی ڈرتے
کجا رفتند آں خوباں جنھوں کے نین تھے بانکے ۔۔۔ چناں بگزا شتند خانہ نہ پھر گھر بار دھر جھانکے
کجا آں ماہ روخوباں چو مور کنداوتے پاتی ۔۔۔ نہ نام ونے نشاں ماندہ سبھی گل گل بھئے ماٹی
کجا سوداگراں منعم جنھاں کے بار تھے تاندھے ۔۔۔ کلالاں خاک شاں بروند گھڑے کمہار بھانڈے
کجا آں زیب وآں زینت کہاں وہ روپ وہ رکھیا ۔۔۔ ہمہ رفتند از دنیا بھیا اس جگت کا لکھیا
درآں وقتے کہ تو میری نہ دنیا کام تجھ آوے ۔۔۔ کسے کو داد بخشیدہ وہی کچھ ساتھ پھر جاوے
نہ آنجا خویش کس باشد نہ کرہی یار کو یاری ۔۔۔ نہ کس مونس بود دیگر نہ بھائی باپ مہتاری
ترا در گور بسپارند پھر کر لوگ گھر آوے ۔۔۔ بخشند با خدا کارے نہ کوئی آوے پھر کا وے
درآں درگاہ بے رشوت نہ جانوں کیوں رہے پردا ۔۔۔ جنیدا مرد آں باشد کہ اس سنسار تھیں ڈردا

یہ شیخ جنید وہی ہیں جن کا ذکر حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اپنی کتاب " پنجاب میں اردو "میں کیا ہے (۵) اور ان کا مذکورہ بالا ریختہ بھی نقل کیا ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ گیارہویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ پھر اسی کتاب (صفحہ ۲۳۲) میں حافظ مرحوم نے شیخ عثمان جالندھری کا ذکر کیا ہے کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ (م ۱۰۳۴ھ) کے پیر بھائی تھے۔ ان کا ایک یہ ریختہ بھی نقل کیا ہے۔

عاشق دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب ۔۔۔ از ہمہ بیگانہ آؤ پیارے حبیب
اے نظرت آفتاب برمن مسکین بتاب ۔۔۔ جان و جگر شد کباب آؤ پیارے حبیب
اے دل و اے جان من درد تو درمان من ۔۔۔ ذکر تو سامان من آؤ پیارے حبیب
زاں لب شیریں شکر بار تو در و گہر ۔۔۔ ساز مرا بہرہور آؤ پیارے حبیب
چند کشی کشتہ را عاشق آشفتہ را ۔۔۔ بے دلم و بے نوا آؤ پیارے حبیب
دمبدم انتظار یک نظرم وا گمار ۔۔۔ عاشقم و خستہ دار آؤ پیارے حبیب
اے تو کس بے کساں مونس بے چارگاں ۔۔۔ غمخوار آوارگاں آؤ پیارے حبیب

حکم ترا بندہ ام نزد تو شرمندہ ام زار و سر افگندہ ام آؤ پیارے حبیب

وقت شبانم گزشت کار نیاید زدست پشت ز غمہا شکست آؤ پیارے حبیب

دربدر و کو بکو نعرہ زناں سوبسو دیدن تست آرزو آؤ پیارے حبیب

روز و شبم انتظار دم بدم بے قرار دیدہ چو ابر بہار آؤ پیارے حبیب

بردل عثماں غریب رحمت خود کن قریب زانکہ تو ہستی مجیب آؤ پیارے حبیب

یہی ریختہ کچھ فرق کے ساتھ ہمارے مخطوطہ میں (ق ۱۸۸ الف) بھی موجود ہے (۶) اس لیے کلی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ رسالہ جو غلطی سے حضرت عثمان مروندی (لعل شہباز قلندر رحمتہ اللہ علیہ) سے منسوب کر دیا گیا ہے، صحیح نہیں۔ بلکہ اس کے مصنف حضرت شیخ عثمان جالندھری علیہ الرحمہ ہیں۔ (۷)

حواشی

(۱) خزینۃ الاصفیاء جلد اول (صفحہ ۴۴۳۔ طبع لکھنؤ) میں کتاب کے مولف غلام سرور لاہوری نے حضرت جلال تھانیسری کی تاریخ یوں لکھی ہے :۔

جلال از جہاں چوں بجنت رسید | پئے سال ترحیل آں ذی کمال
یکے " شیخ پاکیزہ دل " شد عیاں | درگر ہست " مستاب عزت جلال "

۹۸۹ھ   ۹۸۹ھ

(۲) ممکن ہے کہ یہ اسحق حضرت ہاشم کشمی (صاحب زبدۃ المقامات) کے بھائی ہوں جن کے انتقال پر حضرت ہاشم کا مرثیہ ان کے دیوان میں موجود ہے۔

(۳) رسالہ عشقیہ کے مالک مولوی عبدالصمد صاحب کے پاس شیخ عثمان کا دیوان قلمی بھی موجود ہے۔

(۴) یہ ہاشم کشمی وہی بزرگ ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلیفہ اور زبدۃ المقامات (برکات احمدیہ) کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف " نسمات القدس من حدیقۃ الانس " قلمی ہے جو مدینہ طیبہ کے مکتبہ عارف حکمت میں محفوظ ہے۔ اس کتاب میں نقشبندیہ سلسلے کے ان بزرگوں کا ذکر ہے جو حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے ہوئے ہیں۔

(۵) پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۳۳۲ (مطبوعہ لاہور ۱۹۲۸ء)

(۶) مخطوطے میں (ب ۸۵، الف ۱۰۹) کچھ ہندی دوہرے بھی نقل کیے گئے ہیں۔

(۷) شیخ عثمان جالندھری کے " چہل مکتوبات " اور " تفسیر سورہ رحمن " وغیرہ کئی غیر مطبوعہ رسالے پنجاب کے بعض ذاتی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

(رسالہ الرحیم حیدرآباد سندھ، نومبر ۱۹۶۷ء)۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں :

رسالۂ گنج الاسرار

سندھ یونیورسٹی ۰ حیدرآباد میں ایک مخطوطہ ہے جس کا نام سرورق اس طرح آتا ہے۔ "رسالہ شیخ الاسلام فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز"

مخطوطے کے آغاز و اختتام کی عبارتوں میں یہ صراحت ہے کہ اس رسالے کا نام گنج الاسرار ہے اور اس کے مصنّف حضرت فرید الدّین مسعود ابن سلیمان ابن ابی بکر ابن عمر صلاح (رحمہم اللہ) ہیں۔ اس نام سے معاً یہ خیال آتا ہے کہ یہ مصنّف غالباً حضرت بابا فرید گنج شکر رحمہ اللہ علیہ (م ۶۶۴ھ) ہوں گے۔ کیونکہ ان کا اسم گرامی بھی مسعود ابن سلیمان ہے۔ لیکن عام تذکروں میں ان کا نسب نامہ اس طرح آتا ہے:

شیخ فرید الدین مسعود ابن جمال الدّین سلیمان ابن شعیب (۱) ابن احمد شاہزادہ ابن خواجہ یوسف شہزادہ ابن شیخ محمد ابن شہاب الدّین ابن شاہ احمد فرخ شاہ (بادشاہ کابل) ....(۲) یعنی معلوم ہوا کہ بابا صاحب علیہ الرحمہ کے اسلاف ہمارے مخطوطے کے مصنّف کے اجداد سے مختلف ہیں۔ مزید یہ کہ اسی رسالے کا ایک نسخہ جو انڈیا آفس ۰ لندن میں (بحوالہ فہرست مخطوطات جلد اول۔ صفحہ ۱۵۱۲ مخطوطہ نمبر ۲۸۰۲ / ۳ موجود ہے اس میں مخطوطے کا نام اس طرح آتا ہے:

رسالۂ یاری دربیان و شرح معرفت دل و ماہیت آن "۔

اور مصنّف کے نام کے آخر میں بخاری لفظ کا اضافہ ہے۔ اس لیے یہ بات اور واضح ہوجاتی ہے کہ بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمہ اس رسالے کے مصنف نہیں ہیں۔

اسی رسالے کا ایک اور نسخہ برٹش میوزیم، لندن میں بھی موجود ہے اور وہاں کی فہرست جلد دوم (صفحہ ۸۶۲ ب ۔ نمبر ۰) میں اس طرح ذکر آتا ہے کہ یہ رسالہ دراصل اس حدیث کی شرح میں ہے:

"لایسعنی ارضی ولاسمائی ولکن یسعنی قلب عبدی المومن"۔

مصنّف کے حالات سوائے ان چند ناموں کے اور کچھ معلوم نہیں ۔ البتہ گنج الاسرار، گنج العرش جیسی ترکیبیں (کہ ایک لفظ فارسی کا اور ایک عربی کا ہے) گیارہویں صدی ہجری سے پہلے ہمارے ملک میں نظر نہیں آتیں۔ پھر مصنّف نے ماہیت قلب اور ذکر خفی کا جس انداز سے ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر نقشبندیہ ہے ۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ مصنّف کا زمانہ غالباً غیر منقسم ہندوستان میں گیارہویں صدی ہجری کے بعد ہی رہا ہوگا۔ بہر حال یہ مفید اور نایاب رسالہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے ساتھ ہی اردو ترجمہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

(رسالہ اور اس کا ترجمہ کتاب "سراج البیان" از ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں مطبوعہ کراچی ۱۹۹۲ء میں دیکھا جاسکتا ہے)

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں:

بعض مظلوم کتابیں

"مظلوم" سے مراد ایسی کتابیں ہیں جن کے متعلق معلومات مفقود ہیں۔ سہواً بھی اور عمداً بھی۔ یہاں کوشش کی گئی ہے کہ چند حقائق پیش کر دیے جائیں۔ پھر بھی بہت ممکن ہے کہ خود راقم الحروف کو غلط فہمی ہو گئی ہو، اس لیے اصلاح کی درخواست ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس مضمون کو پڑھ کر بعض حضرات ناخوش ہوجائیں تو ان سے معذرت ہی کی جاسکتی ہے۔

انیس الارواح: — انیس الارواح، حضرت خواجہ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ (۶۱۷ھ) کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۳۲ھ) نے مرتب کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی نسبت سے قاریوں نے اس مجموعے کو خوب پڑھا اور اپنی سمجھ کے مطابق اس پر حاشیے چڑھادیے پھر کاتبوں نے ان حاشیوں کو بھی شامل متن کر کے اس کی اصل صورت کو مسخ کر دیا۔ موجودہ دور میں جب بعض فضلا نے اس کی ایسی صورت دیکھی تو اس کو غیر مستند بھی کہا اور بعض نے سرے سے انکار ہی کر دیا کہ وہ ملفوظات ان بزرگوں کے نہیں ہیں۔ یعنی ایسے فضلا نے اس کی موجودہ صورت ہی سے نتائج اخذ کرنا کافی سمجھا اور اس کے قدیم نسخوں کو تلاش کرنے کی کوئی کوشش ضروری نہیں سمجھی۔

یہ مجموعہ (رسالہ) جس صورت میں بھی تھا ضرور متقدین کی نظر میں تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) نے اخبار الاخیار میں حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۵۵ھ) کے تذکرے میں حمید قلندر کی خیر المجالس کا حوالہ دیا ہے کہ۔

"ایک عزیز دو گائیں ذبح کرے گویا اس نے ایک خون کیا اور جو شخص چار گائیں ذبح کرے گویا اس نے دو خون کیے اور جو شخص دس بکریاں ذبح کرے گویا اس نے ایک خون کیا۔ (یہ بات سن کر) پہلے تو حضرت خواجہ (نصیر الدین) نے فرمایا کہ یہ ہارونی نہیں بلکہ ہرونی ہے کہ وہ گاؤں ہرون تھا۔ (۱) حضرت خواجہ (عثمان) جہاں رہتے تھے۔ پھر فرمایا کہ یہ ملفوظ حضرت (عثمان) کا نہیں ہے۔ (ملفوظات کے) یہ نسخے مجھے بھی پہنچے ہیں۔ ان میں بہت

ے ایسے ملفوظات ہیں جو ان کے اقوال (تعلیمات) کے مطابق نہیں ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ شیخ نظام الدین قدس سرہ (م ۷۲۵ھ) فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی کیوں کہ شیخ الاسلام فرید الدین (گنج شکر م ۶۶۴ھ) اور شیخ الاسلام قطب الدین (بختیار کاکی، م ۶۳۳ھ) اور خواجگان چشت میں سے کسی نے بھی تصنیف نہیں کی۔" (یعنی ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ ملفوظات کے جمع کرنے کا ذکر نہیں ہے)۔ اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے زمانے ہی میں ان کے ملفوظات میں غلط چیزیں شامل ہو گئی تھیں۔ تاہم مونس الارواح کا وجود ان کے زمانے میں تھا۔ جیسا کہ مفتاح العاشقین (صفحہ ۱۸) میں ان کا ایک قول اس طرح آتا ہے:۔

"بعد ازاں ہم ازیں محل فرمود کہ اے درویش در انیس الارواح نبشتہ دیدہ

انیس الارواح کا ایک ملفوظ۔ جسے ایک پروفیسر صاحب نے wild talks (بے سروپا باتیں) کہا تھا (۲) خود حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک مستند تاریخ میں مذکور ہے۔ فاضل جلیل پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم نے ایک مقالے میں اسے اس طرح تحریر فرمایا ہے:۔

ہفت اقلیم رازی (۳) میں خواجہ صاحب کی ایک تحریر نقل کی گئی ہے جو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔اس میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ "بغداد کی مسجد جنید میں میں نے خواجہ عثمان ہرونی کی دولت ملازمت حاصل کی فرمایا "دوگانہ پڑھو" میں نے پڑھا۔ پھر فرمایا۔ "قبلہ رو بیٹھو" میں بیٹھا۔ فرمایا "سورہ بقرہ پڑھو" میں نے تعمیل کی۔ اس کے بعد فرمایا۔ "بیس بار کلمہ سبحان اللہ پڑھو"۔ میں نے پڑھا۔ پھر فرمایا "آؤ میں نے تمھیں خدا تک پہنچا دیا ہے۔" پھر قینچی لے کر چار ترکی کلاہ تراشی اور گلیم خاص مجھے عطا کی۔ پھر فرمایا۔ بیٹھو اور ہزار مرتبہ سورہ اخلاص پڑھو۔ ہمارے خانوادے میں یہی ایک دن اور ایک رات کا مجاہدہ ہوتا ہے جاؤ اور ایک رات اور ایک دن کو زندہ رکھو (یعنی جاگ کر عبادت میں مشغول رہو) جب دوسرا دن ہوا تو میں خواجہ کی خدمت میں گیا۔ فرمایا "اوپر دیکھو" جب میں نے آسمان کی طرف منہ کیا، تو پوچھا "کیا نظر آیا؟" میں عرض کیا، عرش عظیم تک (راہ) کھلی ہے" پھر فرمایا "زمین میں کیا مشاہدے کرتے ہو؟" عرض کیا "تحت الثریٰ تک میرے سامنے ہے" پھر آپ نے اپنی دو انگلیاں کھولیں اور فرمایا "کیا نظر آتا ہے؟" میں نے عرض کیا، "اٹھارہ ہزار جہانوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں"۔ پھر فرمایا "جاؤ تمھارا کام مکمل ہوگیا"۔ (۵)

مطبوعہ انیس الارواح کے شروع میں بھی یہ تمام عبارت کچھ فرق اور اضافے کے ساتھ ملتی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ وہ رسالہ ضرور حضرت خواجہ صاحب ہی نے مرتب فرمایا ہوگا، گو کہ اس کے اضافے، ترمیمات اور متعدد واقعات (جو دوسرے لوگوں نے شامل کیے ہوں گے) صحیح نہ ہوں۔ اور آٹھ سو سال کی پرانی کتاب میں ایسا ہونا بعید از قیاس بھی نہیں۔

حیات باقیہ :۔ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ (م ۱۰۱۲ھ) کے ملفوظات (جو حیات باقیہ کہلاتے گئے) اور ان کے ساتھ آپ کے مکتوبات و رسائل کا مجموعہ جو کلیات باقی (مع کلام منظوم) کے نام سے لاہور سے بھی (۱۹۶۷ء میں) شائع ہوا ہے اس کے مرتب نے اپنا نام پوشیدہ رکھا ہے۔ مجموعے کے شروع میں وہ لکھتے ہیں :۔

> "بعد از حمد صلوۃ نمودہ می آید کہ چوں بسابقہ عنایت ازلی و راہ نمونی سعادت لم یزلی این ذرہ احقرکہ نام خود را از عنایت بے اعتباری شائستہ اندراج این نامہ بلند قدر نمی بیند از جملہ بار یافتگان درگاہ خواجہ جہاں پناہ ۔۔۔ شد ۔۔۔"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ مرتب نے اپنا نام عمداً پوشیدہ رکھا ہے۔

حیات باقیہ دراصل ایک قسم کی ڈائری ہے جس میں ۱۰۰۹ھ سے ۱۰۱۲ھ تک کے بعض واقعات وقفے وقفے سے درج کیے گئے ہیں اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے ملفوظات اور ہدایات کو محفوظ کیا گیا ہے۔ حضرت خواجہ کا انتقال ۲۵ جمادی الآخر ۱۰۱۲ھ کو ہوا۔ مرتب نے سات بند کا ایک ترکیب بند (بہ طور مرثیہ) لکھا جس میں ایک جگہ اپنا تخلص اس طرح دیا ہے :۔

"رشدی ازاں نفس کہ دریغ خود نہفت دوست ساز طرب شکست و نوائے ترانہ مرد"

میرا خیال ہے کہ یہ تخلص بھی عمداً بدلا ہوا ہے اور مجموعے کے مرتب مولانا محمد صدیق المتخلص ہدایت ہیں جو پہلے حضرت خواجہ کے مرید ہوئے اور ان کے بعد حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے زیر تربیت رہے۔

ملفوظات میں پنج شنبہ، ششم صفر ۱۰۰۹ھ کے ذیل میں وہ حضرت خواجہ سے ملفوظات مرتب کرنے کی اجازت کا واقعہ لکھتے ہیں کہ، زیادہ اصرار اور عرض و معروض کے بعد

اجازت ملی، لیکن فرمایا کہ مجھے دکھلا دیا کرو۔ پھر ماہ رمضان ۱۰۰۹ھ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ :
میاں شیخ احمد (یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ) کی مکرر درخواست پر حضرت خواجہ نے اس مجموعے کے مرتب کرنے کی اجازت دی۔ ملفوظات میں جمعہ دوم جمادی الاولیٰ ۱۰۱۰ھ کے ذیل میں اپنی ضرورت شرعی روزی کے لیے سفر پر جانے کی اجازت چاہنے کا واقعہ لکھتے ہیں پھر شنبہ یکم صفر ۱۰۱۲ھ کو واپس آنے پر حضرت خواجہ کے ایک ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ
" تا کجا رفتی و چوں بودی وچہ آوردی ؟ "
پھر ۱۵ جمادی الآخرہ ۱۰۲۱ھ کے ذیل میں لشکر کی ملازمت سے متعلق عرض داشت کا ذکر ہے کہ اس موقع پر حضرت خواجہ نے فرمایا کہ " چند روز جائے نہ رود کہ آخر باے بازار باست ..... " پھر اسی ماہ کی ۱۷، ۲۲، اور ۲۵۔ تاریخوں کی صحبتوں کا ذکر آتا ہے اور یہ بھی کہ آخر وقت میں صرف خواجہ حسام الدین احمد (م ۱۰۴۳ھ) خدمت میں تھے۔ ملفوظات کے ان تمام وقائع سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب ۱۔ شاعر تھے ۲۔ حضرت خواجہ سے ملفوظات زیرہ لکھنے کی اجازت (حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سفارش پر) حاصل کر چکے تھے ۳۔ معاش کے لیے لشکر کی ملازمت بھی کر رہے تھے۔
ان کے شاعر ہونے کا ثبوت خود وہ ترکیب بند ہے جو ملفوظات کے آخر میں ہے۔ صاحب " حضرات القدس " (حصہ دوم) میں مولانا محمد صدیق کشمیؒ کے حالات میں ان کی شاعری اور ان کے اشعار کا ذکر ہے (۷)۔ مرتب نے ملفوظات لکھنے کی اجازت حاصل کی تھی۔ صاحب " حضرات القدس " (حصہ اول) نے حضرت خواجہ کے حالات کے ذیل میں مولانا محمد صدیق ہی کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت خواجہ کے متعلق میں نے فلاں فلاں بات ان سے معلوم کی۔ یعنی وہ حضرت خواجہ سے زیادہ قریب رہ چکے تھے (اور ملفوظات بھی لکھے تھے) اس لیے انہی سے معلوم کیا جاسکتا تھا۔ (۸) مولانا محمد صدیق کا لشکر میں ملازم ہونا، حضرت خواجہ کے مکتوبات (نمبر ۳۵۔ ۳۰۔ ۴۴) سے بھی مستنبط ہے اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مکتوبات میں بھی ذکر ہے۔ مثلاً دفتر اول کے مکتوبات ۹۱ میں آپ نے میر محمد نعمان کو لکھا ہے
" شنیدہ شد کہ مولانا محمد صدیق نوکری اختیار کردہ وضع فقراء را گذشتہ است۔ افسوس ہزار افسوس ..... "
دفتر اول کے مکتوب ۱۳۲ میں فرماتے ہیں :
" اے برادر ظاہرا از صحبت فقراء دل تنگ گشتہ مجلس اغنیاء

مجلس اختیار کردہ اید۔ بسیار بد کردہ اید۔ "

اسی دفتر کے مکتوب ۱۳۶ میں فرمایا ہے

"رفتن شما دریں دفعہ بہ لشکر معقول فقیر نمی شود ... "

پھر اسی دفتر کے مکتوب ۱۷۶ میں ارشاد ہے :

"شعر خوانی و قصہ پردازی را نصیب اعداء دانستہ بہ سکوت و حفظ نسبت باطن باید پرداخت ... " (۹)

ان ہدایات و ارشادات کے بعد مولانا محمد صدیق نے وہ مقامات طے کیے ہوں گے جن کا ذکر دفتر اول کے مکتوبات نمبر ۱۲۵۔ ۲۴۱۔ میں ہے اور ممکن ہے کہ اس کے بعد ہی آپ نے ۱۰۱۹ھ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے علوم و معارف "مبداء و معاد" کے نام سے مرتب کیے ہوں گے جس کے آخر میں آپ کے دو تاریخی قطعات بھی ہیں۔

بہر حال جو شخص ۱۔ شاعر ہو ۲۔ لشکر کا سپاہی رہ چکا ہو ۳۔ حضرت خواجہ کا فیض یافتہ ہو ۴۔ حضرت مجدد کو "استاذی" کہے اور ۵۔ جس سے صاحب حضرات القدس وغیرہ حضرت خواجہ کے حالات معلوم کریں وہ اس زمانے میں مولانا محمد صدیق کشمی (المتخلص بہ ہدایت) کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مکاشفات عینیہ (یا غیبیہ) :۔ راقم الحروف نے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مکاشفات ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۵ء میں کراچی سے شائع کیے تھے۔ بعض قلمی نسخوں میں اس رسالے کا نام مکاشفات عینیہ لکھا ہوا ہے اس لیے اسی نام کو ترجیح دی تھی۔

رسالے کے شروع میں (صفحہ ۵) تحریر ہے کہ

"نمودہ می آید کہ درسال یک ہزار پنجاہ و یک، ورقے چند از مسودات قدسی آیات حضرت قدوۃ المحققین ..... امامنا و قبلتنا الشیخ احمد بن عبدالاحد الفاروقی قدسنا اللہ سبحانہ بسرہ الاقدس از بعضے دوستان بدست افتاد ..... بخاطر یکے از فدویان ایں درگاہ قرار یافت کہ نقل ازاں بردارد و آں لآلی منثور را درسلک جمع و ترتیب ازد باید داشت کہ اکثر معارف آں اوراق از علوم سابقہ آنحضرت اند و نیز بعضے ازاں اوراق ازاں قبیل اند کہ حاصل علوم آں در

رسائل و مکاتیب آنحضرت است لیکن چوں بساط سخن درآنجا به طرح دیگراست واز فوائد زوائد نیز خالی نیست تبرکاً آں رانیز دررنگ سائر اوراق نقل گرفتہ بہ بیاض آورد و رسالہ موسوم بہ " مکاشفات عینیہ " ترتیب داد و شجرات مشائخ قادریہ و نقشبندیہ کہ آنحضرت املا فرمودہ اند و اجازت نامہا کہ بہ بعضے از خلفاے خود نوشتہ اند تیمناً نقل آں نیز پیش از مکاشفات آوردہ شدو استطراد آسامی اینک پیران چشت رانیز نوشتہ شد ہر چند املا آنحضرت نیست...."

اس عبارت میں صرف " امامنا وقبلتنا " جیسے الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ آپ کے صاحبزادہ والا مرتبت یعنی حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ (م ۱۰۷۹ھ / ۱۶۶۹ء) نے لکھے ہوں گے اور جہاں آپ کے مختلف خلفا۔ کے متعلق اجازت نامے درج ہیں وہاں سب سے آخری اجازت نامہ جو بہت مختصر بھی ہے خواجہ محمد ہاشم کشمی سے متعلق ہے اس لیے قیاس تھا کہ موخرالذکر نے انکسار کی وجہ سے اس طرح آخر میں درج کیا ہوگا اور اس مجموعے کے مرتب خواجہ محمد ہاشم کشمی ہی ہونگے۔ چناں چہ انھی کو اس کا مرتب قرار دیا گیا تھا۔ لیکن مولانا ابوالحسن زید فاروقی صاحب مدظلہ نے اپنی کتاب " حضرت مجدد اور ان کے ناقدین " (صفحہ ۴۶) میں لکھا ہے کہ یہ مجموعہ حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ ہی نے مرتب فرمایا تھا۔ بعد میں جناب محمد اقبال مجددی نے بھی حسنات الحرمین کے مقدمے (صفحہ ۱۹) میں یہی بات کہی ہے۔

بہرحال راقم الحروف کو اصرار نہیں ہے کہ خواجہ محمد ہاشم کشمی ہی نے یہ مجموعہ مرتب کیا ہوگا۔

حضرت مخدوم نوح بالائی کا فارسی ترجمہ قرآن مجید :۔ حضرت مخدوم نوح بالائی قدس سرہ (م ۹۹۸ھ / ۱۵۹۰ء) نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا تھا اور وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ (م ۱۱۷۶ھ) کے ترجمے سے مقدم ہے۔

جناب مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ صاحب (موجودہ سجادہ نشین ہالا) کی مالی اعانت سے راقم الحروف نے ۱۹۶۲ء میں اس ترجمے کا پہلا پارہ شائع کیا تھا۔ اس ترجمے کے کاتب

حضرت مخدوم نوح کے خلیفہ حضرت بہاء الدین گودریہ تھے جنھوں نے اپنے پیر بھائی حضرت سید ابوبکر کی فرمائش پر اس ترجمے کی کتابت کی تھی۔

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی صاحب مدظلہ نے سندھی ادبی بورڈ کے تعاون سے ۱۹۸۳ء میں پورا ترجمہ شائع کیا ہے اور حضرت بہاء الدین گودریہ کی تحریر کے ایک نسخہ کا عکس بھی اپنے مقدمے میں (صفحہ ۳۱ کے مقابل) دیا ہے۔ حضرت بہاء الدین نے ورق اول کے حاشیے میں اور پھر آخری ورق پر اس ترجمے کی کتابت سے متعلق جو تفصیل دی ہے وہ راقم الحروف نے پہلے پارے کے مقدمے میں پیش کر دی تھی۔ لیکن مولانائے موصوف نے اس پر توجہ نہیں فرمائی اور ۲۱ سال کے بعد جب خود اس تفصیل کا مطالعہ فرمایا تو اس کے بہت سے الفاظ مٹ چکے تھے۔ راقم الحروف اس تحریر کی قدامت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو یہاں پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔ پہلے ورق کے حاشیے پر حضرت بہاء الدین گودریہ لکھتے ہیں۔

بدانکہ باسمہ سبحانہ و صلوٰۃ حبیب علیہ السلام بعد از آوردن سرخی از شہرتہ مرقہ از بیست و ہفتم ماہ شعبان در نوشتن ترجمہ بعد ظہر شروع کر دم در تاریخ ۱۰۱۱ھ بتفضل و کرم الٰہی امید کہ بحرمت قرآن و بحرمت نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم جملہ ترجمہ بخیریت و سلامت تمام گردد۔ آمین آمین آمین۔ چوں سورہ توبہ تمام شد درمیان ماہ ذوالحج و محرم تابیست و ہفتم دے تعطیل افتادہ بعد باز از بیست و ہفتم محرم از سورہ یونس شروع ترجمہ کردم بعدہ تا آخر سورہ شعراء درماہ ربیع الآخر رسیدم۔ بعدہ باز فاصلہ شد تادرسیوم ماہ رمضان از سورہ نمل شروع کردم وقت ضحیٰ درخانہ خود متوجہ بجنوب تابیستم ماہ رمضان ...... دہ روزہ اعتکاف۔ بعد از عید رمضان شروع کردم از عنکبوت۔ ذی الحجہ پس از غرہ پنج نہ نوشتم تاروز بیستم ماہ ذی الحجہ شروع نوشتہ شد واز بیست و ششم ماہ ذی الحجہ تا ..... محرم الحرام نوشتم بعدہ از دوشنبہ جمع شروع افتاد ..... ثم بعد ذلک درروز پنج شنبہ ہفدہم ماہ صفر تمام شدبدست فقیر حقیر در حجرہ متبرکہ بحرمت ترجمہ قرآن کریم وقت ضحیٰ کبریٰ درتاریخ ۱۰۱۳۔ ہزار و سیزدہ سال از ہجرت حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم

بدانکہ دردہ ماہ دریں سال تمام ترجمہ شدہ است۔

اس عبارت سے واضح ہے کہ ترجمے کی کتابت ۲۷ شعبان ۱۰۱۱ھ (یک شنبہ / ۳۰ جنوری ۱۶۰۳ء) سے شروع ہوئی اور پنج شنبہ ۱۷ صفر ۱۰۱۳ھ (۵ جولائی ۱۶۰۴ء) کو مکمل ہوئی۔

پھر بالکل آخری ورق میں سرخ روشنائی سے حضرت بہاء الدین گودریہ نے مزید

تفصیل اس طرح لکھی ہے :۔

"تحریر مصحف را تاریخ، کاتبش نہ نوشتہ ولیکن تحریر ترجمہ در سال ثلث عشر والف سنہ بود بدست فقیر بہاء الدین گودریہ کہ یکے از فقیران سنداست و باعث بر نویسانیدن ترجمہ حضرت سید سادات طالب وصول رب العلمین میاں سید ابوبکر سلمہ اللہ تعالیٰ است و چوں ایں فقیر نظر کرد در مصحف مخدوم آں طریقے (کہ غوث ..... حضرت مخدوم نوح قدس سرہ ....) کہ در مصحف مخدوم است واضح تر کتابت بود مصحف بطریقے بود کہ در سند یافتہ نہ شود کہ اول ہر صفحہ او آیت است و آخر ہر صفحہ نیز آیت تمام بود و ہر دہ ورق جزوے تمام بود کہ در سینی کراس تمام شدہ است و درمیان ہر دو سطرے مفاصلہ سہ سطر ترجمہ واضح کتابت داشت و آں ترجمہ در مصحف پیش از جلد کردن تمام نوشتہ بود۔ و این فقیر نہ کاتب چوں کاتبان است و نہ خوش وقت ہرحال است و نہ بے جلد مصحف یافت و نہ درمیان دو سطر قابلیت بیش از یک سطر ترجمہ یافت بلکہ در با بہا چناں درج قرآن از جہت حروف قران می دید کہ چوں تمام ترجمہ زیر ہر حرفے نہ شد آں را بیرون نوشتہ است و درجاے بعضے چناں باریک نوشتہ شد کہ بناقل تمام صاحب علم کہ واقف رسم کتابت فقیر شدہ باشدمی یابد والحاصل مناسبت این مصحف بمصحف مخدوم در عشر عشیر واقع نہ شد بجز آنکہ ہر گاہ کہ نوشتم بہرحال کہ بودم از نوشتن گاہ ہر روز گاہ بعد از ایام ربعے از قرآن یا رکوعے یا چند سطرے بہر قلم باریک یا سطبر، راست حروف یا معوج تحریر شد۔ از حضرت سیدسادات معذرت حال خود بہ امید مغفرت گناہ درخدمت کہ باتقصیر تمام می کردم۔ الحال از امیدداری دعاے برائے خود و اہل و اولاد خود روے درشرم ساری بسیار ہستم لیکن چوں نقل کلام اہل فضل است کہ العذر عندالکرام مقبول، عفو گناہ خودرا امید دارم کہ چوں قابلیت اصلی مرامقدر بایں مرتبہ رسیدہ بود برہمان نہج ظاہر شدہ والسلام علی الناظرین۔ الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس۔ والدعاء مطلوب والفاتحۃ السلام الخاتمہ مرغوب۔ (۱۳)

اگر اس عبارت کا مقابلہ اس عبارت سے کیا جائے جو سندھی ادبی بورڈ کے شائع کردہ قرآن مجید کے مقدمے میں ہے تو اس کے اکثر مقامات میں کمی نظر آئے گی اور اس میں اوپر کے قوسین کی وہ عبارت بھی نہیں ہوگی جو حضرت بہاء الدین گودریہ نے حاشیے پر لکھی تھی۔

ذریعۃ الوصول الیٰ جناب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم :۔ یہ رسالہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کا مرتب کردہ ہے۔ اس میں ماثورہ دعائیں ہیں۔ مہران آرٹس کاؤنسل،

حیدرآباد (سندھ) نے خوبصورت سرورق کے ساتھ شائع کیا ہے۔ سال اشاعت درج نہیں۔

ایک فاضل نے رسالے کے شروع میں "زندگی مؤلف" فارسی میں لکھی ہے۔ اس میں مخدوم محمد ہاشم کی وفات ماہ رجب ۱۱۷۴ھ میں لکھی ہے لیکن سرورق پر ۱۱۷۵ھ درج ہے۔ اسی "زندگی مؤلف" میں انھوں نے لکھا ہے کہ "این رسالہ ذریعۃ الوصول الی جناب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم از تالیف مخدوم معظم است کہ بخط مؤلف در کتاب خانہ ایں حقیر موجود بود۔" یعنی ان کا خیال ہے کہ یہ رسالہ (بلکہ اس کے ساتھ دوسرے دو رسالے بھی) مخدوم محمد ہاشم ہی کے دست مبارک کے لکھے ہوئے ہیں اور اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ مجموعے کے سرورق پر اس طرح لکھا ہوا ہے۔

هذه الرسالة المسماة

بذريعة الوصول الى

جناب الرسول صلى الله

عليه وسلم من تاليفات

الفقير محمد ہاشم عفى

عنه

اس تحریر سے بے شک یہ شبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں "تالیفات" لفظ بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم اس سے پہلے اور کتابیں بھی مرتب فرما چکے تھے لیکن "زندگی مؤلف" میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کی سب سے پہلی کتاب ہے۔

"ایں سعی علمی اولین سعی باشد کہ از مخدوم صادر شدہ"

یہ رسالہ حضرت مخدوم نے ۱۱۳۳ھ میں (یعنی ۲۹ سال کی عمر میں) ترتیب دیا تھا۔ حمد و نعت کے بعد آپ لکھتے ہیں۔

"اما بعد می گوید بندہ ضعیف، امیدوار برحمت حضرت ملک قوی، محمد ہاشم بن مرحوم عبدالغفور سندی، رحمہما ربہما وستر عیوبہما اللہ الرحیم الغنی کہ این رسالہ ایست مختصر کہ درج کردہ می آید دروے کیفیات صلوات ماثورہ راکہ وارد شدہ اند در احادیث مرفوعہ ... و شروع کردہ شد دریں رسالہ روز چہار شنبہ دویم شہر رجب مرجب منتظم در سلک سنہ الف ومائۃ وثلث وثلثین از ہجرت بنویہ علیٰ صاحبہا افضل الصلوۃ والتحیۃ و فراغ یافت بتاریخ ہفدھم از شہر رجب باوجود تعویق بعضے عوائق ومدافعہ قدرے از علائق ..."

اس رسالے کے ساتھ ہی دو اور رسالے شامل ہیں اور سب ایک ہی خط میں ہیں۔ رجب ۱۱۳۳ھ کے پندرہ دنوں میں مرتب ہوئے پہلے رسالے کے بعد صفحہ ۴۳ سے دوسرا رسالہ محمد عمر مویرہ کا مرتب کردہ ہے جیسا کہ اس کے آخر میں (صفحہ ۵۲ پر) اس کی صراحت ہے اور اس کے بعد ہی صفحہ ۵۲ سے ایک رسالہ چہل صلوات سے متعلق ہے جو صفحہ ۶۲ پر ختم ہوجاتا ہے لیکن ناقص الآخر ہے۔ اس ناقص الآخر رسالے کا ایک مکمل قلمی نسخہ سندھی ادبی بورڈ (جام شورو) میں موجود ہے لیکن اس میں بھی مولف کا نام مذکور نہیں ہے اور وہ ماہ ربیع الثانی ۱۱۳۳ھ کا تحریر کردہ ہے۔ اس کے کاتب کوئی عبدالحلیم ہیں۔ یعنی یہ نسخہ مہران آرٹس کاؤنسل کے مجموعے کے قریب تین ماہ قبل نقل ہوا ہے۔

اب عرض اتنی ہے کہ یہ رسالے " بخط مولف " نہیں ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مہران آرٹس کاؤنسل والے نسخے میں صفحہ ۱۸ کی سطر ، میں یہ عبارت شروع ہوتی ہے :۔

" روایت کرد ابو یوسف جصاص در فوائد خود حضرت علی بن ابی طالب واز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہ گفتند ایشاں ہر دو ، کہ ذکر کرد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم دعاے راکہ خواندہ شود درحال وقوف بہ عرفہ و ذکر کرد دراثنائے آں ایں کیفیت صلوۃ راکہ صلی اللہ در ایں جا لفظ تعالیٰ نیز باید گفت، اگرچہ دراصل روایت بہ ثبوت نہ پیوستہ۔"

یہاں خط کشیدہ عبارت کے متعلق بین السطور میں جو تحریر ہے وہ یہ ہے :۔

" لفظ در این جا تا الیٰ قولہ بہ ثبوت نہ پیوستہ، حاشیہ است دراین جا۔ ولیکن راہ خطاء کاتب داخل کتاب کرد " .... یعنی یہ الفاظ اس مقام پر حاشیے میں تھے جس کو کاتب نے غلطی سے اصل کتاب میں داخل کر دیا۔

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ موجودہ نسخے کو کسی اور کاتب نے نقل کیا ہے اور اس نے یہ غلطی کی ہے کہ حاشیے کی عبارت کو اصل کتاب میں داخل کر دیا ہے۔ یعنی اصل نسخہ کوئی اور تھا جس کی یہ نقل ہے اور اس کا کاتب بھی کوئی اور ہے۔

مزید ثبوت کہ یہ رسالے " بخط مولف " نہیں ہیں، یہ بھی ہے کہ صفحہ ۵۸ میں ایک عبارت ہے :۔

" شیخ ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ بداں مجلس حاضر شد۔ امام موسیٰ برپاے خواست ...

گفت پیغمبر را علیہ الصلوۃ والسلام در واقعہ دیدم، جاے نشستہ و بسیارے از اکابر بخدمت دے ایستادہ ناگاہ شبلی درآں مجلس درآمد۔ متوجہ حضرت پیغامبر علیہ الصلوۃ والسلام شد۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برخواست وباادمعانقہ کرد و میان دو چشم او بوسہ داد ...... "

اس عبارت میں دو جگہ برخاست کے بجائے برخواست ہے جو مخدوم ہاشم جیسے فاضل نہیں لکھ سکتے۔ صفحہ ۲۰ (سطر ۱۲) میں بھی ہے:۔

" ..... در سماع آں خروش و فغاں از چندیں زاویہ کاشانہ برخواست ..... " یہاں بھی برخاست کے بجائے برخواست ہے۔ حضرت مخدوم ہاشم کے متعلق سوئے ظن ہوگا کہ وہ برخاست کے بجائے برخواست لکھیں چناں چہ اب واضح ہوگیا کہ یہ رسالے حضرت مخدوم کے خط کے تحریر کردہ نہیں ہیں بلکہ ان کا کاتب کوئی اور ہے۔

سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ :۔ اس موضوع پر اردو میں دو محترم بزرگوں کی کتابیں بڑی شہرت رکھتی ہیں۔ ایک تو مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی ہے جس کے پہلے ایڈیشن کی " تمہید " میں مولانا نے جن کتابوں کے حصول کے لیے اشتیاق ظاہر کیا تھا ان میں سے ایک محدث ابن عبدالحکم کی کتاب بھی تھی۔ تیسرے ایڈیشن میں انھوں نے اس کتاب کو بھی پیش نظر رکھا ہے جیسا کہ اس کے دیباچے میں ظاہر کیا ہے۔ دوسری فاضلانہ کتاب مولانا رشید اختر ندوی صاحب کی ہے جو لاہور سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ابن عبدالحکم کے بہ کثرت حوالے ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے ۵۸ صفحات میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خاندانی حالات جمع کیے ہیں، پھر ان کی خلافت، ازواج واولاد، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات، کارنامے، تدوین حدیث، عمارات، سیاست و حکومت، ملکی اور انتظامی معاملات وغیرہ کی تفصیل دی ہے۔

مولانا رشید اختر ندوی نے نئی ترتیب کے ساتھ شروع میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے آبائے کرام کے حالات، پھر آپ کے مختلف دینی، سیاسی اور اصلاحی کارنامے بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ حضرت نے دو سال اور پانچ ماہ کی حکومت میں قوم کو وہ سب کچھ دیا جو ان کے شایان شان تھا اور قوم کو جس کی ضرورت تھی۔ پھر جگہ جگہ مولانا نے ہمارے خواص اور ارکان حکومت کو چونکا دینے کی بھی کوشش کی ہے۔

لیکن ان دونوں بزرگوں سے بہت پہلے انھی کے قرب و جوار کے ایک عالم ابوالفیاض محمد عبدالقادر اعظم گڑھی کی بھی ایک کتاب اسی موضوع پر ہے جو ۱۳۰۵ھ کے قریب سعید المطابع، بنارس سے شائع ہوئی تھی، انھوں نے "سبب تالیف کتاب" میں لکھا ہے کہ :۔

"اب تک گو ہم نے بہت سوانح عمریوں کی سیر کی کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی جو عوام اہل اسلام اور خواص دونوں کے لیے برابر مفید و کارآمد ہو اور خداداد برکت سے دونوں فریقوں کے دلوں پر خاص اثر ڈالے جو باعث برکات دینی و دنیوی ہوئے۔ بالخصوص روحانی صفات، زہد و قناعت، صبر و استقلال، خوف و رجا، صلاح و تقویٰ، عدل و انصاف وغیرہ وغیرہ کی زمانے کے حال میں ایک تازہ روح پھونک دے اور مسلمانوں کے ان ہونہار بچوں کو .... سیدھی راہ پر لگادے۔"

مولانا ابوالفیاض محمد عبدالقادر نے اپنی کتاب پر " پہلا حصہ " لکھا ہے یعنی دوسرا حصہ بھی لکھنا چاہتے تھے لیکن معلوم نہیں کہ انھوں نے پھر وہ حصہ لکھا یا نہیں۔ پہلے حصے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے آبا و اجداد، پھر ان کی ولادت، تعلیم و تربیت، نکاح، مدینہ منورہ کی گورنری، فقہائے عشرہ، تعمیر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، انتظام چاہ و فوارہ و شاہراہ حج، کیفیت معزولی، شہادت سعید ابن جبیر، کیفیت بیعت خلافت، ترک سب، واقعہ باغ فدک، عدل و انصاف، عراق کی مالگزاری، یزید بن مہلب کی معزولی، جراح کی معزولی، بغاوت بسطام خارجی، حضرتؓ کا خوف و تقویٰ، حلم و تواضع، زہد و قناعت، مجددیت، نظام سلطنت، ہندوستان کے بعض علاقوں کی فتح، بعض اکابر کی وفات، علوم و فنون کی قدردانی، احادیث کے جمع کرنے کی تاکید، مسند عمر بن عبدالعزیزؒ خطبات، مذاق شعر، متفرقات، وفات وغیرہ کی تفصیلات ہیں اور مولانا نے حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا ہے :۔

بخاری، موطا امام مالکؒ، ابوداؤد، سنن نسائی، مشکوٰۃ، نووی شرح صحیح مسلم، فتح الباری، تذکرۃ الحفاظ، تقریب التہذیب، حاکم فی المستدرک، اسد الغابہ واصابہ، کامل ابن اثیر، ابن خلکان، طبقات ابن سعد، تاریخ الخلفاء، ابن عساکر، ابوالفدا، مجمع البحار، تخریج زیلعی، ازالۃ الخلفاء، احیاء العلوم، مروج الذہب و معادن الجواہر، خلاصۃ الوفا، جذب القلوب، ابن خلدون، روضۃ الصفا، ارکان اربعہ، الدین الخالص، مسامرات ابن عربی، زبدۃ شرح وفا، مجالس الابرار، نفحۃ الیمن، حج الکرام، تلخیص الحبیر، المتبکر المستطرف، خلاصۃ الوفا، حسن المحاضرہ، وصول الامانی وغیرہ۔

ا

مذکورہ بالا دو بزرگوں نے بھی ان کتابوں میں سے اکثر کو پیش نظر رکھا تھا۔ لیکن وہ دونوں بزرگ قلم کے بادشاہ ہیں اور یہی خصوصیت مابہ الامتیاز ہے۔ تاہم مولانا عبدالقادر کی کتاب ایسی نہیں ہے جو فراموش کی جاسکے۔

کشف المحجوب کا ایک نسخہ :۔ ہمارے ملک کے ایک نامور محقق اور فاضل یگانہ کے صاحبزادے نے حضرت داتا گنج بخش قدس سرہ (م ۴۶۵ھ) کی کشف المحجوب کی اشاعت کا ارادہ کیا تو بار بار مجھے اپنے دولت کدے پر کام کرنے کی دعوت دی۔ چناں چہ مئی ۱۹۶۵ء میں عزیز محترم مولانا سید محبوب حسن واسطی صاحب کے ساتھ ان کے یہاں حاضر ہوا اور گیارہ دن تک ان کا نمک کھایا۔ ان کا بہت ممنون ہوں۔ ان گیارہ دنوں میں ہم دونوں نے پورے دن اور آدھی آدھی رات تک کشف المحجوب کے ایک مخطوطے کی تصحیح کی۔ اس میں غلطیاں بہت تھیں تاہم بحمد اللہ کام پورا ہوگیا۔ آں محترم نے پھر مجھ سے اس کا مقدمہ لکھنے کی بھی فرمائش کی۔ گھر آکر میں نے وہ فرمائش بھی پوری کردی لیکن انھوں نے ایک مصلحت کی بنا پر اس مقدمے کو اپنے ایڈیشن میں شامل نہیں کیا اور اپنے " پیش لفظ " میں صرف اتنا اعتراف کیا ہے کہ (سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم کی طرح) میں نے بھی وہ مخطوطہ صرف پڑھا ہے (تصحیح کا کوئی ذکر نہیں)۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس مخطوطے کے ترقیمے میں کاتب نے اپنا نام بہاء الدین ذکریا لکھا تھا۔ یعنی ذال سے ذکریا لکھا تھا " زکریا " نہیں لکھا۔ یعنی وہ بچارہ اس قدر کم سواد تھا کہ اپنا نام بھی صحیح نہیں لکھ سکتا تھا۔ (اسی بات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مخطوطے میں کس قدر غلطیاں رہی ہوں گی)۔ اس کاتب نے سال کتابت ۱۰۱۴ھ لکھا تھا جس پر کسی نے سیاہ قلم پھیر کر ۳۶۳ھ بنادیا ہے تاکہ وہ کتابت حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہ (م ۶۶۶ھ) سے منسوب ہوسکے۔ چناں چہ کتاب کی اشاعت کے وقت کاتب کا نام اور اس کے تحریر کردہ سنہ کو مزید غیر واضح کردیا گیا ہے۔ لیکن کتاب کے شروع میں آں محترم کے والد ماجد مرحوم کے دو فاضلانہ مضمون (حضرت داتا گنج بخش اور حضرت بہاء الدین زکریا کے متعلق) شامل کردیے گئے ہیں جو مرحوم نے کسی وقت تحریر فرمائے تھے اور جو یقیناً بہت مفید ہیں۔ " پیش لفظ " میں آں محترم نے اپنا ایک خواب بھی شامل کردیا ہے جو بہت مبارک ہے۔

آخر میں چند مہریں بھی ہیں اور غالباً میر جملہ (گیارہویں صدی ہجری) کی مہر سے پہلے کی کوئی مہر نہیں ہے۔

حواشی

(۱) ہروں، نیشاپور کے علاقے میں ہے۔

(۲) محترم صباح الدین عبدالرحمن نے بزم صوفیہ (اعظم گڑھ، ۱۹۶۹ء) کے صفحہ ۶۳۰ میں افضل الفوائد کے ایک قلمی نسخے کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان چشتیہ بزرگوں نے اپنے اپنے مرشدوں کے ملفوظات جمع کیے ہیں۔ اسی کتاب کے صفحات ۶۳۱-۶۹۶۔ میں انھوں نے علی گڑھ کے ایک پروفیسر صاحب کے اعتراضات پر جو ملفوظات مذکورہ کے انکار سے متعلق ہیں مدلل تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ اپنی جگہ صحیح تھے اور کتابت وغیرہ کی غلطیوں کی وجہ سے جعلی نہیں کہلائے جاسکتے۔ ایک فاضل گرامی نے رسالہ بنیات (کراچی۔ مئی ۱۹۶۸ء) میں بھی رسالہ انیس الارواح پر تنقید کی ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "وہ کسی برہمچاری سادھو کی گھڑنت ہے" لیکن انھوں نے چند واقعات ہی کو رد کیا ہے پورے رسالے کو نہیں

(۳) بزم صوفیہ۔ صفحہ ۶۴۲

(۴) امین رازی کی ہفت اقلیم ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی

(۵) پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع۔ مقالات دینی و علمی، حصہ اول۔ (لاہور، ۱۹۷۰ء) صفحہ ۲۵

(۶) حضرت خواجہ کے انتقال کے وقت مولانا محمد صدیقؒ موجود نہ تھے۔ (دیکھیں حضرات القدس، حصہ دوم میں ان کے حالات۔

(۷) خواجہ محمد ہاشمؒ کی زبدۃ المقامات میں بھی ان کی شاعری اور اشعار کا ذکر ہے۔

(۸) لیکن پھر حضرت مجدد کی صحبت میں وہ ولایت سے مشرف ہوئے تھے۔ دیکھیں دفتر اول کے مکتوبات ۱۳۵-۲۳۱۔ آپ کے نام حضرت مجدد کے متعدد مکتوبات ہیں، دفتر اول:- ۱۲۲ - ۱۳۳ - ۱۳۴ - ۱۳۵ - ۱۳۶ - ۱۹۱ - ۱۷۶ - ۱۸۹ - ۲۱۲۔ اسی دفتر میں مکتوبات ۸۲۔ ۱۱۹ - ۱۴۲، میں بھی آپ کا ذکر ہے۔ دفتر دوم میں ۲۱۔ ۵۱۔ اور دفتر سوم کا مکتوب ۸ بھی آپ کے نام ہے۔

(۱۰) حضرت مجددؒ سے تربیت حاصل کرنے کے بعد ہی مولانا محمد صدیقؒ نے حضرت

خواجہؒ کے مکتوبات نمبر ۳۱،۸ کے تمسیدی کلمات میں آپ کو (حضرت مجددؒ کو) " استاذی " لکھا ہوگا۔

(۱۱) مطبوعہ دہلی ۱۹۰۷ء

(۱۲) مطبوعہ لاہور ۱۹۸۱ء محمد اقبال مجددی صاحب نے اسی کتاب کے صفحہ ۲۰-۲۱ میں میرے ایک سہو کی نشان دہی کی ہے جو مکتوبات معصومیہ (کراچی ۱۳۹۵ھ) کے مقدمے (صفحہ ۱۵) میں مکتوب نمبر ۱۴ سے متعلق ہے۔ وہاں کتاب میں فرق ہوگیا تھا۔ اس طرح چاہیے: ذکر اوراد و وظائف کہ حضرت عروۃ الوثقیؒ جمع نمودہ بودند و خلیفہ داشتہ باشند " لیکن خود محمد اقبال صاحب سے یہاں سہو ہوگیا ہے وہ مکتوب (نمبر ۱۴) مولانا محمد حنیف کے نام نہیں ہے جیسا کہ انھوں نے (صفحہ ۲۰-۲۱ میں) لکھا ہے۔ پھر اسی کتاب حسنات الحرمین (صفحہ ۱۰۶ ح) میں ان سے اور سہو ہوا ہے۔ وہ لکھ رہے ہیں کہ مکتوب (معصومیہ سوم ۶۰) ۱۰۵۷ھ کا ہے اور اس کے آخری جملے خواجہ محمد معصوم کے حج سے متعلق ہوں گے ایسا نہیں ہے بلکہ وہاں یہ ذکر ہے کہ ۱۰۵۷ء میں امان اللہ بیگ برہان پور سے سرہند آئے تھے اور وہ اپنے مکتوبات بیان کر رہے تھے جو آخر تک درج ہیں

(۱۳) ترجمے کے آخر صفحے میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ سید شہاب الدین بن سید حسین بن سید محمد بن سیکرابی بکر لکعلوی (جن کی فرمائش پر یہ ترجمہ لکھا گیا تھا) کی ملک میں یہ ترجمہ تھا۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں :

عمادی غزنوی یا عمادی شہریاری

رسالۂ معارف بابت مارچ ۱۹۴۰ء میں راقم الحروف کا ایک مضمون عمادی پر شائع ہوا تھا، جس میں بعض متاخرین فضلاء کی تقلید میں عمادی غزنوی کے علاوہ عمادی شہریاری کو ایک اور شاعر فرض کرلیا تھا۔ بعد میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اردو) کے لیے جب اس مضمون کی تلخیص کی ضرورت پیش آئی تو غور کرنے پر معلوم ہوا کہ عمادی غزنوی اور عمادی شہریاری دراصل ایک ہی شاعر کے دو مختلف نام ہیں۔ اور آتشکدہ آذر اور مجمع الفصحا، جیسی کتابوں کی وجہ سے اس تخلص کے دو شاعر سمجھ لیے گئے ہیں۔ لباب الالباب (ج ۲ ص ۲۵۰) میں "شعرائے غزنیہ ولوہور" کے ذیل میں "استاذ الائمہ عماد الدین الغزنوی" نام آتا ہے۔ اس کا قدیم ترین کلام جو دستیاب ہوسکتا ہے وہ سلجوقی سلطان ملک شاہ کے بھائی ملک ارغون (المتوفی ۴۸۹ھ ۔ ۱۰۹۶ء) کی مدح میں ہے :

ای بر سمن از مشک بعمداز وہ خالے — مسکین دل من گشت زخال تو بحالے

حالے بجہاں زارتر از خال ولم نیست — تا نیست دل آشوب تر از خال تو خالے

شاہ ہمہ شاہان ملک ارغون کہ ندارد — در مردی و فرہنگ نظیرے و ہمالے

آں قلعہ کشائے کہ ملک بر فلک اُورا — ہر روز دہد مژدہ بفرّتی و جلالے

در معرکہ بستاند و در بزم ببخشد — ملکے ابوادے و جہانے ابوالے

عالم تر و عادل تر ازو ہیچ ملک نیست — الا ملک العرش تبارک و تعالے

(مونس الاحرار ص ۶۹۴-۶۹۵)
حبیب گنج

سید حسن غزنوی (۵۵۶ھ ۔ ۱۱۶۱ء) نے اسی قصیدے کی تقلید میں خسرو شاہ بن بہرام شاہ غزنوی (۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء تا ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء) کی مدح میں کہا تھا :

ای یافتہ از چہرۂ تو حسن کمالے | دادہ ست جمالیت خدا دہ چہ جمالے
خسرو شہ بہرام شہ آں شاہِ جواں بخت | کایام نیاورد چناں خوب خصالے
خود حکم تو کن. کیں بہ یا شعر عمادی | " کای بر سمن از مشک بعمدا زدہ خالے "

سید حسن غزنوی نے عمادی کی تقلید میں ایک قصیدہ بہرام شاہ کی مدح میں بھی لکھا تھا :

خاک را از باد بوے مہربانی آمدہ ست | در دہ آن آتش کہ آب زندگانی آمدہ ست
خسرو اعظم خداوند جہاں بہرام آنکہ | رسم او جاں بخشی و عالم ستانی آمدہ ست
گرم بکشادم فقاعے از سر خوانِ ثنا ست | گرچہ شیریں نیست بارے ناروانی آمدہ ست

لیکن یہی قصیدہ سنائی کے یہاں (طہران ۱۳۲۰ شمسی ص ۹۰) سنجر کی مدح میں ہے، تیسرا شعر اس طرح ہے :

بر سر خوان عمادی من کشادم ایں فقع | "گرچہ شیریں نیست بارے ناروانی آمدہ ست"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری مصرع عمادی کے کسی قصیدے کا رہا ہوگا جو اب نہیں ملتا ۔ سید حسن اور سنائی نے عمادی کے قصیدوں پر جو قصیدے لکھے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ عمادی کی شاعرانہ حیثیت کیا رہی ہوگی اور اغلب ہے کہ وہ اسی عمر میں بھی بڑا رہا ہوگا۔ سنائی نے جوانی میں بلخ کا سفر کیا تھا کیوں کہ کارنامۂ بلخ میں سلطان مسعود سوم ابن سلطان ابراہیم غزنوی (المتوفی ۵۰۸ھ) کی مدح ہے جس میں خود ان کے والد کا ذکر آیا ہے (حکیم سنائی از خلیل اللہ خلیلی، کابل ۱۳۱۵ شمسی ص ۲۰) اس وقت عمادی غزنوی نے لکھا تھا :

چوں سنائی اوفتاد از خطۂ غزنیں بہ بلخ | تازہ کرد از مدحت قاضی حسن روے سخن
چوں مرا از لشکر سلطان بہ رے پیوست بخت | بر در قاضی حسن دیدم معالی را وطن
اندراں فکرت کہ ایں قاضی چو آں قاضی بود | از عرق در آب آتش راے دیدم خویشتن
آسماں گفت آفتابا با عمادی گو (سرشت ؟) | خاک ایں قاضی حسن از خون آں قاضی حسن
ای دریغا دے آن بودے کہ مدحش گفتمے | تا زمنہ فرق کردے شعر او از شعر من
گفتمے ای فلکت آں مرغے کہ در پرواز او | آورد فرمانِ تو سیمرغ را بر باب زن

گفتمے ای کردہ ! کلک ! برخلاف آسماں　　مشتری را زہرہ سوز و زہرہ را بربط شکن

(مجموعۂ قصائد فارسی ۲۹۰۲، صفحہ ۲۰۰، حبیب گنج)

دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سنائی نے غزنیں سے بلخ کا سفر کیا تھا (یعنی ۵۰۸ھ سے پہلے) اس کے بعد عمادی نے رے کا سفر اختیار کیا، اور وہ "لشکر سلطان" میں بھی تھا اور غالباً اسی وقت سے اس نے رے کے ایک بلوک شہریار میں قیام کیا، اس قیام کی مدّت معلوم نہیں لیکن اسی مقام سے وہ شاہ مازندران عماد الدولہ فرامرز شاہ کے دربار میں گیا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ ہے:

نے سیم و زر و نہ یار داریم　　پس ما بہ جہاں چہ کار داریم

نزدِ ہمہ خلق چوں عمادی　　در عاشقی اعتبار داریم

نومید ز شہریار شہریم　　اُمّید بہ شہریار داریم

سرمایۂ داد و دیں فرامرز　　کز ہیبت اُو حصار داریم

تا بر درِ او قرار کردیم　　بر چرخِ بریں قرار داریم

در لشکرِ او کمینہ مائیم　　بنگر کہ چہ کار و بار داریم

تیسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عمادی شہریار شہر سے عماد الدولہ فرامرز کے دربار میں گیا تھا، اور آخری شعر سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں کے لشکر میں داخل ہوگیا تھا، جیسا کہ وہ پہلے بھی سلطان مسعود سوّم کے لشکر میں رہ چکا تھا، ایک اور قصیدے سے معلوم ہوگا کہ یہی شہریار میں رہنے والا عمادی اپنے وطن غزنیں کو یاد کر رہا ہے:

اے مہر تو بر سپہر تمکیں　　ایمن شدہ از نماز پیشیں

سرمایۂ جان عمادِ دولت　　ملجاء ممالک سلاطین

آن کس کہ بتافت ہمچو زنجیر　　در حلقۂ مہرت از تف کین

گردد چشمش کشادہ بستہ　　چوں چشمۂ قفل و چشمِ زرفین

بستانِ حیاتِ جاوداں را　　از خطّ رضائے تست برچین

بے تو نہ بود کس و نہ باشد　　مدّے نہ بود تمام تر زین

بے تو نہ کند ضمانِ تن جان | سرّیست دریں سخن بہ تضمیں
زیں است کہ از ولم جدا نیست | ہستی و بدن برائے غزنیں
جستم ہمہ آرزو بتفریح | گفتم ہمہ رمزہا بہ تلقیں
آں باد ترا کہ خواست داری | آئین وراثت پیش از آئیں

شعر نمبر ۸ سے شاعر کا غزنیں سے گہرا تعلق واضح ہوتا ہے اور اس سے پہلے کے قصیدے سے معلوم ہوچکا ہے۔ کہ یہی شاعر شہریار سے اسی ممدوح کے دربار میں گیا تھا۔ اس لیے ظاہر ہوا کہ یہی عمادی غزنوی بھی ہے اور شہریاری بھی۔ اب اس ممدوح کے متعلق معلوم کرنا ہے کہ وہ کون تھا؟ Rabino نے مازندران (ص ۱۳۵) میں لکھا ہے کہ شمس الملوک رستم بن قارن (۵۱۰ھ تا ۵۱۳ھ) کا بیٹا سیف الدّین عماد الدولہ فرامرز ہی عمادی کا مُربّی تھا۔ اور مرزا قزوینی نے (بیست مقالہ ج ۲ صفحہ ۲۴۲، ۲۴۳) میں لکھا ہے کہ

"بہ احتمال بسیار قوی، مخدوم عمادی ہمیں شخص (فرامرز بن رستم) است .... و بطور قطع و یقین معلوم نہ شد کہ آیا وے پسر ایں رستم بن قارن شہریار است یا پسر فخرالدولہ رستم بن شہریار ...."

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عمادی کا ممدوح فرامرز بن مرد آویج وردان شاہ لنگرودی تھا۔ تاریخ طبرستان از بہاء الدین محمد بن حسن بن اسفندیار (مُرتّبہ عباس اقبال طہران ۱۳۲۰ شمسی جلد دوم ص ۹۳) میں ہے کہ

"سیّد جمال الدین ابو القاسم علوی ناتولسی رستۂ استرآباد بود او پدر او استرآباد بضمان داشتندی عماد الدولہ مرد آویج و فرامرز کہ ممدوح عمادی شاعر بودند بادشاہ بودند قلعۂ بالمن ملک ایشان بودہ برج عمادی ہنوز در آں قلعہ معمور است و آں راضی تو اشد شگافت۔ چوں مرد آویج و فرامرز درگذشتند و قلعہ با ارغش افتاد وردان شاہ برادر او (علی یعنی پسران فرامرز) بخدمت علاء الدولہ علی بن شہریار بن نجم الدولہ قارن (۵۱۵ھ تا ۵۲۵ھ) شدند۔ ایں سیّد جمال الدّین بخدمت وردان شاہ شد...."

اس عبارت میں مرد آویج کا لقب عماد الدولہ بتایا ہے۔ لیکن عمادی کے کلام میں یہ فرامرز کا لقب ہے۔ اور اس نے فرامرز ہی کی مدح لکھی تھی۔ اسی کتاب (صفحہ ۹۳، ۹۳) میں جو کہ اصفہبد (علاء الدولہ علی بن شہریار بن قارن) نے استرآباد کے قلعۂ بالمن کا محاصرہ کیا۔

اس میں فرامرز ابن مرد آویج تھا۔ دو مہینے کے بعد اس نے اصفہبد سے معافی مانگی اور اپنے بیٹے وردان شاہ کو بطور " نوا " اس کی خدمت میں بھیجا۔ اسی زمانے میں سلطان محمد بن ملک شاہ (المتوفی ۵۱۱ھ) کے بیٹوں نے اپنے چچا سنجر کے خلاف سر اٹھایا، سنجر ان کی سرکوبی کے لیے عراق روانہ ہوا اور اصفہبد کو مدد کے لیے بلوایا، ابھی اصفہبد روانہ نہیں ہوا تھا کہ اطلاع ملی کہ بھتیجوں نے رے آکر معافی مانگ لی ہے، تاہم اسی کے بعد موسم سرما میں ایک بھتیجا مسعود بن محمد ملک شاہ (المتوفی ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء) اصفہبد کے پاس آکر ایک ماہ تک مہمان رہا، اور مال و سپاہ حاصل کر کے گرگان کی طرف سے واپس ہوا۔ وہاں فرامرز بن مرد آویج نے باوجود یہ کہ اس کا بیٹا وردان شاہ اصفہبد کے حوالے تھا، مسعود سے اصفہبد کی شکایت کی، مسعود نے فرامرز کو پکڑ کر سنجر کے پاس بھجوا دیا اور " خواستند کہ اُورا بپایان قلعہ آوردند تا تسلیم کنند فرمان حق یافت " یعنی فرامرز کا انتقال ۵۳۰ھ / ۱۱۳۶ء کے قریب ہوا ہوگا۔ کیونکہ ابن اسفندیار (مترجمہ براؤن صفحہ ۵۹) میں ہے کہ خلیفہ المسترشد کے قتل (۵۲۹ھ / ۱۱۳۵ء) کے بعد سلطان پہلی بار اصفہبد کے یہاں آیا تھا۔

فرامرز کی مدح میں متعدد قصیدے ہیں، ایک قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرامرز پہلے بھی کسی پریشانی میں مبتلا ہو کر (شعر ۲۰۵) خراسان میں رہ چکا تھا:

اے کافر عشق تو مسلمان	دے دیو ہوائے تو سلیمان
طاق است بہ عشق تو مجازی	بر طاق نہادہ وصل و ہجران
ہر چند مسلّمی تو اُو را	در دولتِ شہریار ایران
قطب ملکان عمادِ دولت	سرمایۂ امن و پشتِ ایمان
عید است شما و عید پارین	رخ داشت ازین دیار پنہان
ممکن نہ بود بہ ہیچ حالے	عید این جا تو در خراسان
عید تو خجستہ باد ہر چند	بر من باشد ز عقل تاوان
زیرا کہ ہر آنچہ گفتم اوّل	زین قوم ہمی شود پشیمان
ہر چند نہ بودنی ست فرزند	نتوان گفتن بہ وصف یزدان
سودیست زمانہ در گذشتن	این را عدم از وجود ایشان

سبحان الله شد از تمامی کارِ تو چنانک وصف نتواں
در نعمت تو نکو نہ باشد خوردن غمِ خاندانِ ویراں

آخری اشعار میں عمادی نے اپنے تین بیٹوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ایک قصیدہ ایسا ہے جس کے تمہیدی اشعار سنائی کے یہاں بھی ہیں (دیوان سنائی صفحہ ۱۱۲، بمبئی ۱۳۲۸ھ) اور سلطان بہرام شاہ غزنوی (المتوفی ۵۵۲ھ) کی مدح میں ہیں اور وہی اشعار عمادی کے قصیدے میں بھی ہیں۔ اور وہ اسی عمادالدولہ فرامرز کی مدح میں ہیں۔

گرد رخت صف زدہ ست لشکر دیو و پری ملک سلیمان تُراست گم مکن انگشتری
شاہ فرامرز راد دولت و دیں راعماد خسروِ مازنداراں سایۂ نیک اختری

ایک اچھا قصیدہ اس طرح ہے:

تُرا چنانکہ توئی دیدہ‌ور نمی یابد بصر ز نورِ تو برتو ظفر نمی یابد
عمادی از پےِ جنگِ سپاہ ہجرانت زخونِ دیدہ قوی تر حشر نمی یابد
عماد دولتِ عالی کہ چشمِ دولت و دین بروں ز بارگہِ او بصر نمی یابد

ایک قصیدہ ہے:

دلے کہ بستۂ بندِ بلا تواند بود ز آب و آتش و خاک و ہوا تواند بود
عماد دولت عالی کہ گردِ موکبِ او برائے دیدۂ جاں توتیا تواند بود

اسی قصیدے میں بعض اشارات ہیں:

خدایگانا خصمانِ تو بداں بودند کہ کین تو ز سعادت عطا تواند بود
نبود شاں خبرآں کہ ہر یکے زیشاں بہ دام کردۂ خود مبتلا تواند بود

مازندرانی حکمرانوں کی طرح یہ ممدوح بھی امامیہ عقائد کا رہا ہوگا:

درآفتاب قیامت نسوخت کس زیرا بہ سایۂ عَلَمِ مرتضیٰ تواند بود

ایک قصیدے میں ہے:

اے بہ رخِ ہمچو گُل مایۂ شمس و قمر وے بہ لب ہمچو مُل، گوہر شہد و شکر
شاہ عمادِ دول، کز کف و از طبع اوست نخل سخارا رطب باغ خرد را ثمر

شمسۂ روے عَلَمِ پشتِ سپاہِ ترا
بدیہ کند ہر نفس شعلۂ نورِ ظفر

بعض قصیدوں میں یہ القاب آتے ہیں:

قطب الملوک شاہ عمادِ دول کہ چرخ
ہر ساعتے ز قدرتِ او امتحان برد

شاہ سیف الدّین عماد الدولہ کز تعظیمِ او
از کفِ خود ہرچہ خواہد رایگاں می افگند

ایک قصیدے کے آخری اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر نے ممدوح کے کسی مہمان کی وجہ سے (غالباً قدر ناشناسی کی وجہ سے) اپنی خودی کو ٹھیس لگنے سے بچایا تھا:

اے نرگسِ تو طبیب و بیمار
دے لالۂ تو امین و قرار

قطبِ ملکاں عمادِ دولت
کز ورگۂ اوست لافِ ابرار

شاہے کہ بود بہ باغِ ملکش
ہموار ترنج عدل پُربار

روزے کہ بر تو بود مہمان
بودم ز حدیث شعر بیزار

زاں بیم کہ نبایدم گفت
در اثناے شاہ تو بسیار

عذرم بپذیر اگر بمانم
در شیوۂ مدح تو ز رفتار

زیراک اندر نواے مدحت
برداشت بود بسے فرود ار

ایک قصیدہ اسی عمادالدولہ کے بیٹے شمس الدولہ (؟) کی مدح میں بھی ہے:

ہر کرا عشقت اختیار کند
بے قراری برو قرار کند

شاہ شمس عماد دین و دول
کہ بدو عالم افتخار کند

ملکے ، خسروے ، خداوندے
کہ کفش طعنہ بر بحار کند

عید را مہرگاں بہ میداں تاخت
تا ز درگاہِ تو در آر کند

تا مگر سعی تو بعید رضا
مہرگاں را امیدوار کند

آخری اشعار میں اگر عید اور مہرگان استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے تو ممکن ہے کہ ۵۵۲ھ / ۱۱۲۸ء کا زمانہ ہو، تاہم اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عمادی اپنے ممدوح عمادالدولہ فرامرز کے انتقال کے وقت ۵۳۰ھ / ۱۱۳۶ء قلعۂ یالمن (استر آباد) میں نہ ہوگا۔ بلکہ طغرل بن محمد بن ملک شاہ (المتوفی ۵۲۹ھ / ۱۱۳۳ء) کے دربار میں ۵۲۶ھ / ۱۱۳۲ء سے پہلے پہنچ چکا تھا،

کیوں کہ اس کے وزیر قوام الدین ابو القاسم درگزینی (المتوفی ۵۲۶ھ / ۱۱۳۲ء) اور اس کے بیٹے جلال الدین کی مدح میں قصیدے لکھے تھے. پھر عماد الدولہ فرامرز کے انتقال پر عمادی نے ایک رباعی مرثیے میں لکھی تھی:

اکنوں کہ عماد دولہ در خاک آسود — از دیدۂ من خاک شود خوں آلود
درخاک نہادہ چوں قوامِ دیں — آں را کہ سر از خاک برداشتہ بود

ایک مرثیہ چھوٹی بحر میں بھی ہے اور بہت پُردرد ہے:

در غمِ یار یار بایستے — یا غم را کنار بایستے
بر در دوست بار ممکن نیست — بر درِ صبر بار بایستے
مست و دیوانہ چند خواہم بود — زیرک و ہوشیار بایستے
ایں کہ من شرمسارم از مردم — سخت من شرمسار بایستے
از فریبِ جہاں عمادی را — نفسے زینہار بایستے
ایں ہمہ آرزو بیافتمے — حضرتِ شہریار بایستے
شہ فرامرز کز معالی او — اختراں را شمار بایستے
چوں مدارا نہ کرد با او مرگ — آسماں بے مدار بایستے

سلطان طغرل بن محمد ملک شاہ (المتوفی ۵۲۹ھ / ۱۱۳۴ء) اور عمادی کے تعلق کے متعلق راحت الصدور (ص ۲۱۰) میں ہے کہ "امیر عمادی اگرچہ بملک مازندراں اختصاصے داشت و لقب او از عماد الدولہ فرامرز شاہِ مازندراں مبنی است عظمت از شاعری حضرت سلطان (طغرل) یافت" - پھر عمادی کے دو قصیدے طغرل کی مدح میں ہیں:

کارِ خرد ساختہ ست کامِ ہنر حاصل ست — ہیچ بہانہ نماند شاہِ جہاں طغرل ست
خسرو کسریٰ غلام داند کز شرق و غرب — بندہ عمادی بشعر خوب ترین قائل ست

اے زلف و رخت سپہر و اختر — وے روے و لبت بہشت و کوثر
سلطان سپہر قدر طغرل — کز قبۂ وافش ست برتر
بزمِ کو بند گرد و گیراں — مانندِ جہاں روزِ محشر

از دود چناں شود کہ گوئی شیرِ عَلَم ست شیرِ مجمر

لباب الالباب (ج ۲ - ص ۲۹۳ بعد) میں ایک قصیدہ ہے، جس میں اتابک قراسنقر (شعر ۲) "امیر بار" (قتلغ، شعر ۴) وغیرہ کا ذکر بھی آیا ہے:

شاہ بہشت مجلس طغرل کہ روز رزم — از نعل پارہ گنبد کوکب حشر شکست

بے شبہتے سنانِ قراسنقر سترگ — آں روز بند چرخ حوادث شر شکست

در باغ عمر دشمنِ شاہِ جہاں طراز — بغرا بہ نوک نیزہ نہیبت شجر شکست

عجز شکستہ بند طبیعت درست شد — آں گر کہ میر بار صف آں نفر شکست

آوازۂ رسید پیاپے بر آسماں — بازار آق سنقر آشوب فر شکست

ایشاں بہ تیر و نیزہ شکستند ہر آنک — صدرِ جہاں بخامہ از آں بیشتر شکست

ایک قصیدے میں - امیر بار - عزالدین قتلغ کی مدح ہے (جس کا ذکر تاریخ میں نہیں آتا) جس کی وجہ سے عمادی طغرل کے دربار میں پہنچا تھا اور اس کا لقب سلطانی ہوگیا تھا:

دست درہم نمی کند کارم — پاے مردی نہ می کند یارم

لقبم دادہ اند سلطانی — چوں عمادی چرا چنیں خوارم

ہمہ عیبم جز آنکہ در شا — برسر میربار می بارم

عزِّ دینِ خداے قتلغ آں — کہ ز انعام او گراں بارم

از تو سلطاں شناختم گرنہ — من و سلطان کجا سزاوارم

نہ خورم غم، چرا خورم کہ توئی — از پے، ہر مراد غم خوارم

عمادی نے سلطانی ہونے کا ذکر سلطان طغرل کی مدح میں بھی کیا ہے:

دلم مجاز دست بردہٴ جانی — چہ کنم با تو دوستی جانی (۲)

خونِ خود خوردم و بخواہم خورد — از پے، وصلِ تو پشیمانی

جاوداں ماں کہ فرّ عشقِ تو بود — کہ عمادی شدہ ست سلطانی

اے عاقلاں کنارہ از من کنید ورنہ
چوں درد دل بگویم گریاں کنم شمارا

مرغ دلم پریدہ جانم بلب رسیدہ
آں یار برگزیدہ شاید کند دوا را

در رہگذار جاناں ہر روز آیم از جان
شاید کہ شاہ خوباں نوازد ایں گدا را ص ۹

دو روزہ مہر گردوں افسانہ است و افسوں
نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں مروت با دشمناں مدارا

ہنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی
کایں کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا ص ۵

حافظ کی غزل ان کی بہترین غزلوں میں سے ہے۔ اس کے اکثر ابیات ضرب المثل ہیں۔ پورے فارسی شعری ادب میں اس غزل کا جواب نہیں ملا قطب الدّین کی پھسپھسی غزل کا کیا ذکر ہے۔ لیکن بلا شبہ حافظ کی یہ غزل قطب الدّین کے سامنے ہے۔ چنانچہ حافظ کی دوسری بیت کا مفہوم اس شعر میں ادا کرنے کی نہایت ناکام کوشش ملتی ہے:

کشتیٔ ما شکستہ و بر تختہ پارہ ایم
اے باد شرطہ ہر چہ استادۂ بیا

ایک اور متوازی غزل ملاحظہ ہو۔ قطب الدین نے حافظ کا صرف ایک قافیہ باندھا ہے

قطب الدّین	حافظ
جز ہوای تو نیا شد سر بے ساماں را	رونق عہد شباب است دگر بستاں را
آرزو نیست بجز بزم وصالت جاں را	میرسد مژدۂ گل بلبل خوش الحاں را
کردہ ام عزم طواف حرم کعبۂ تو	ای کہ بر مہ کشی از عنبر سارا چوگاں
راہ بنما بہ سوئے خود من سرگرداں را ص ۱۵	مضطرب حال مگرداں من سرگرداں را ص ۸۰

جنھوں نے حافظ کی پوری غزل دیکھی ہے وہ بتائیں گے کہ حافظ نے اچھوتے مضامین کے کیسے کیسے موتی بکھیرے ہیں۔

حافظ کی ایک غزل کی زمین میں قطب الدّین نے دو غزلیں لکھیں۔ دونوں کی چند ابیات حافظ کی ابیات کے بالمقابل نقل ہیں۔ حافظ کی غزل ۱۲ بیت پر اور قطب کی غزلیں سات سات ابیات پر مشتمل ہیں۔

قطب الدّین	حافظ
بیٔ ہوای سر کوی تو سری نیست کہ نیست	روشن از پرتو رویت نظری نیست کہ نیست!

سوختہ ز آتش عشقت جگری نیست کہ نیست
ہمہ صاحب نظراں از تو نظر باختہ اند
نظرت جانب صاحب نظری نیست کہ نیست
نہ دہد دل کہ کنم سر غم عشقش فاش
ورنہ در ملک دلم زو خبری نیست کہ نیست ص ۱۳
خالی از نشہ ذوق تو سری نیست کہ نیست
کشتہ عشق تو در رہ گذری نیست کہ نیست
بی تو کس کی بسلامت رسد اندر کعبہ
کہ بہر گام دراں رہ خطری نیست کہ نیست
چونکہ اندر طلب جملہ جگرہا خون ست
خالی از خون جگر چشم تری نیست کہ نیست ص ۱۹

منت خاک درت بربصری نیست کہ نیست
ناظر روے تو صاحب نظرانند آری
سر گیسوے تو در ہیچ سری نیست کہ نیست
اشک غماز من ار سرخ برآمد چہ عجب
خجل از کردہ خود پردہ دری نیست کہ نیست
تا بدامن ننشیند ز نسیمش گردی
سیل خیز از نظرم رہ گزری نیست کہ نیست
تا دم از شام سر زلف تو ہر جا نزنند
با صبا گفت و شنیدم سحری نیست کہ نیست
مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست ص

حافظ کی ایک غزل کی پیروی میں قطب الدین نے ایک غزل لکھی، اس میں آخر الذکر نے حافظ کے کچھ فقرے لے لیے ہیں۔ دونوں غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

قطب الدین

قاضی روزجزا فتوئی ایں قصہ نوشت
کہ نباشد بہشت آنرا کہ غم عشق بہشت
نتوانم کہ کنم توبہ عشق اے زاہد
چہ غم کلک قضا بر سر من عشق نوشت
کردم از عشق سوالی کہ بگو حق بکجا ست
گفت ہر جا طلبی ہست چہ مسجد چہ کنشت
ہر کسی ہر چہ بکارد درود آخر کار
ہیچ چیزے نتواند درود آنکہ نہ کشت

حافظ

عیب رنداں مکن اے زاہد پاکیزہ سرشت
کہ گناہ دگراں بر تو نخواہند نوشت
من اگر نیکم و گر بد تو برو خود را باش
ہر کسی آں درود عاقبت کار کہ کشت
ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار و چہ مست
ہمہ جا خانہ عشقست چہ مسجد چہ کنشت
من از پردہ تقوئی بدر افتادم و بس
پدرم نیز بہشت ابد از دست بہشت

نیک باید کہ بود باطن مردم ورنہ	سر تسلیم من و خشت در میکدہ ہا
صورت ظاہر کس خواہ بود خوب کہ زشت	مدعی گر نہ کند فہم سخن گو سر و خشت ص ۵۶
عشق خیز و ہمگی از سخن قطب الدین	نا امیدم مکن از سابقہ لطف ازل ص ۵۳
گوئی استاد ازل قالبش از عشق سرشت ص ۲۵	تو پس پردہ چہ دانی کہ کہ خوبست و کہ زشت

اس غزل کا مقطع حافظ کی اس معروف بیت سے مستفاد ہے:

در پس آینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم ص ۲۶۲

غرض واضح ہے کہ قطب الدین کے سامنے حافظ کا دیوان موجود تھا، اور اس دیوان کی جستہ جستہ غزلوں کے جواب میں غزلیں لکھیں۔

قطب کی حسب ذیل غزلیں حافظ کی زمین میں ہیں دونوں کے مطلعے ذیلاً درج ہیں:

قطب الدین ص ۳۴	حافظ ص ۲۵
مرا کہ ہر دم و ہر لحظہ دیدہ خانہ تست	رواق منظر چشم من آشیانہ تست
ہر کدام نمی پای آشیانہ تست	کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانہ تست

ذیل کی متوازی غزلوں کے چند اشعار درج ذیل ہیں

مرا ز پیر طریقت ہمیں سخن یاد است	بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد ست
کہ رست از دو جہاں ہر کہ از خود آزادست	بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد ست
زگیر و دار جہاں دست خویش کوتہ کن	غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
مباش غرہ کہ بنیاد عمر برباد ست	زہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد ست
کجا روم چہ کنم درد خود کرا گویم	چہ گویمت کہ بہ میخانہ دوش مست و خراب
چنیں کہ یار تغافل شعار افتاد ست	سروش عالم غیبم چہ مژدہ ہا دادست
میان کعبہ مقصود با رہیست نہاں	ترا ز کنگرہ عرش می زنند صفیر
کہ نرفت بسعی خودش خدا داد ست	ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد ست
بپیچ سر ز شریعت ہم از طریق ادب	نصیحتی کنمت یادگیر و در عمل آر

کہ ذوق مرکب ایں راہ تقویت دادست
کہ ایں حدیث ز پیر طریقتم یاد ست

بروز وصل ز دیدار دوست بستاں داد
غم جہاں مخور و پندمن مبر از یاد

تو قطب دیں کہ شہنشاہ حسن بیدادست ص ۹۴
کہ ایں لطیفۂ عشقم ز رہروی یادست

مجو درستی عہد از جہان سست نہاد
کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد ست ص ۲۷

حافظ کی اس معرکۃ الآرا غزل کا جواب قطب الدّین سے بن نہ پڑا۔

قطب الدّین نے حافظ کی مشہور غزل

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمی بما کنند

کی پیروی ردیف میں تھوڑے سے تغیّر کے بعد کی ہے۔

صاحبدلے اگر نظرے سوئے ماکند
مسّ وجود ما ز نظر کیمیا کند

حافظ کی ایک نہایت مشہور غزل می کرد ردیف کی پیروی قطب الدّین نے کی ہے

دونوں غزلوں کی چند ابیات ملاحظہ ہوں۔

قطب الدّین	حافظ
دلربائی کہ نظر در ہمہ اشیا می کرد	سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد
غائبانہ نظر لطف سوئے ما می کرد	وانچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد
بیگماں بال و پر جملہ ملائک می سوخت	گوہری کز صدف کون و مکان بیرون است
گر بر ایشاں ہمہ یک راہ تجلا می کرد	طلب از گم شدگان لب دریا می کرد
از تر و خشک دو عالم اثری کی ماند	مشکل خویش بر پیر مغاں بردم دوش
آتش عشقش اگر جائے بہرجا می کرد	کو بہ تائید نظر حلّ معمّا می کرد
آں نگار از دل ما آئینہ می ساخت نخست	دیدمش خرّم وخنداں قدحی بادہ بدست
چہرۂ خویش در آئینہ تماشا می کرد	و انداراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
چوں تواں دید دریں روز مُرخش حیرانم	گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کہ داد حکیم
کہ چرا وعدۂ دیدار بفردا می کرد	گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

آنکہ از قدرت خود صورت ما نقش کشید
خویشتن را کہ نہاں بود ہویدا می کرد

قطب دین سرِ دو عالم بنگر ما ست نہاں
گر بدی جم طلب جام خود از ما می کرد

بیدلی در ہمہ احوال خدا با او بود
او نمیدیدش و از دور خدا را می کرد

ایں ہمہ شعبدہ خویش کہ می کرد اینجا
سامری پیش عصا و ید بیضای کرد

گفت آں یار کزو گشت سرِ دار بلند ص ۹۵-۹۶
جُرمش این بود کہ اسرار ہویدا می کرد ص ۹۶

حافظ کی اس معروف غزل کی پیروی کی ناکام کوشش قطب الدّین نے کی، حافظ کی یہ غزل عرفان و تصوف کے نازک مسائل کی دلنشین تصویر پیش کرتی ہے جن کا قطب الدّین کے یہاں نام و نشان نہیں۔ آخر الذکر کے مقطع سے صاف ظاہر ہے کہ حافظ کی غزل ان کے پیش نظر تھی۔

ایک متوازی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

حافظ	قطب الدّین
ہزار شکر کہ دیدم بکام خویشت باز	منم گدا و توئی پادشاہ بندہ نواز
ز روی صدق و صفا گشتہ با دلم دمساز	تو کار بندۂ عاصی بلطف خویش بساز
اگرچہ حسن تو از عشق غیر مستغنی ست	نشستہ بر سرِ کویت مدام منتظرم
من آں نیم کہ ازیں عشقبازی آیم باز	بداں امید کہ چشمم شود برویت باز
چہ گویمت کہ ز سوز دروں چہ می بینم	نمی کنم بکس اظہار درد عشق ولی
ز اشک پرس حکایت کہ من نیم غمّاز	شد اشک سرخ برخسار راز من غمّاز

ص ۱۰۵

دونوں نے اس زمین میں دو غزلیں (۱۳) لکھیں، یہ غزلیں قطب الدّین کے پیش نظر تھیں۔ اشک سرخ کی توجیہ حافظ کے ایک شعر میں کس خوب صورتی سے ملتی ہے:

اشک غمّاز من ار سرخ بر آید چہ عجب
خجل از کردۂ خود پردہ دری نیست کہ نیست ص ۱۵

حافظ کی ایک مشہور غزل کی پیروی قطب الدّین نے کی ہے۔ اس غزل کے بارے میں ایک افسانوی روایت یہ ہے کہ حافظ کے یہاں مقطع غزل یہ ہے:

گر مسلمانی ازین است کہ حافظ دارد   آہ اگر از پی امروز بود فردائی

اس پر لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ اس شعر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حافظ کا آخرت پر عقیدہ مشکوک ہے؛ چنانچہ انھوں نے اس کے پہلے حسب ذیل بیت کا اضافہ کرکے یہ ثابت کیا کہ بیت مذکور ان کا قول نہیں بلکہ کسی ترسا کا ہے

این حدیثم چہ خوش آمد کہ سحر گہ می گفت   بر در میکدہ با دف و نے ترسائی

چند ابیات دونوں متوازی غزلوں سے نقل کیے جاتے ہیں

قطب الدّین	حافظ
کیست کو را بود امروز دل دانائی	در ہمہ دیر مغاں نیست چو من شیدائی
درد او را نہ کند در رہ وصلت پائی	خرقہ جائی گرو بادہ و دفتر جائی
از سرای تن خود بادیہ عشق بپوی	دل کہ آئینۂ شاہیست غباری دارد
کہ اگر مرد رہی باش تو ہم رسوائی	از خدا می طلبم صحبت روشن رائی
اندریں روز بکوش و غم فردا می خور	کردہ ام توبہ بدست صنم بادہ فروش
نیست شک کز پی امروز بود فردائی	کہ دگر می نخورم بی رخ بزم آرائی
ص ۲۰۲	ص ۳۴۹

حافظ کی غزل کی دس ابیات پر اور قطب الدّین کی صرف چھ بیت پر مشتمل ہے۔ آخری منقولہ بیت سے واضح ہے کہ آخر الذکر شاعر کے پیش نظر حافظ کی غزل تھی اور اسی کے تتبّع میں اس نے یہ غزل لکھی۔

ردیف یا کی حسب ذیل دو متوازی غزلیں موجود ہیں۔ ان کے مطلعے مع حافظ کی غزلوں کے مطلعوں کے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

قطب الدّین	حافظ
ایام گل ارادہ مکن غیر جام مے	ساقی بیا کہ شد قدح لالہ پُر ز مے
ساقی بجوے نغمہ چنگ و رباب و نے	طامات تا بہ چند و خرافات تا بہ کے
ص ۲۰۰	ص ۲۹۰

رسید فصل بہاراں گذشت حیلۂ دی ‌ ‌ بصوت بلبل و قمری اگر نہ نوشی مے
خوش است جام مے از دست یار پی در پی ‌ ‌ علاج کی کنمت آخر الدواء الکے

ص ۱۹۷ ‌ ‌ ص ۲۹۸

حافظ اور قطب الدّین کی متوازی غزلوں کے مقطعے ملاحظہ ہوں:

در عشق تو ہر کہ نام دارد ‌ ‌ آں کس کہ بدست جام دارد
در بندگی اہتمام دارد ‌ ‌ سلطانی جم مدام دارد

(دیوان قطب الدّین: ۱۰۳) ‌ ‌ (حافظ ص ۱۳۹)

حافظ کی ایک دل پسند غزل غم مخور ردیف کی ہے۔ اس کی پیروی قطب الدین نے کی۔ حافظ کی غزل دس بیت پر اور آخر الذکر کی حسب دستور سات بیت پر مشتمل ہے

چند بیت ملاحظہ ہوں:

قطب الدّین	حافظ
اے دل ار دوری تو از دیدار جاناں غم مخور	یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
درد تو شاید رسد روزی بدرماں غم مخور	کلبۂ احزاں شود روزی گلستاں غم مخور
مدتی گر زیر بار ہجر باشی پایمال	ہاں مشو نو مید چوں واقف نۂ از سرّ غیب
عاقبت گردی خلاص از بار ہجراں غم مخور	باشد اندر پردہ بازیہای پنہاں غم مخور
دور ازاں دلبر اگر کارت بود یکسر خراب	در بیابان گر بشوق کعبہ خواہی زد قدم
کار تو سازد خدائے کارگرداں غم مخور	سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور
گر ہمی خواہی طواف کعبۂ مقصود خویش	گرچہ منزل بس خطرناک است و مقصد بس بعید
در بیابانِ غم از خار مغیلاں غم مخور	ہیچ راہی نیست کاں را نیست پایاں غم مخور
(ص ۱۱۰)	(ص ۱۶۲)

واضح ہے کہ قطب الدّین کے پیش نظر حافظ کی غزل تھی۔ چنانچہ حافظ کی آخری بیت کی صدائے بازگشت نہ صرف اس غزل میں بلکہ اور غزلوں میں بھی موجود ہے، مثلاً

ہر کہ کردہ سفر بادیۂ کعبۂ دوست ‌ ‌ کی غم سر زنش خار مغیلاں دارد ص ۰۰۳

هر کہ رو اندر طواف کعبہ کرد | کی غم خار مغیلانش بود ص۹۰
در تمنائے وصال کعبۂ دیدار یار | در بیابان غمش خار مغیلاں تابکی ص۲۰۶

"کلبۂ احزان" کئی بار استعمال ہوا ہے۔

ہمچو یعقوب از فراق یوسف گل پیرہن | دیدہ ہا گریان بہ کنج بیت الاحزان تابکی ص۲۰۶
نی جہالت نیست روشن کلبۂ احزان من | ساز روشن کلبہ ام ای شاہ خوبان الغیاث ص۶۵

"راہ بی پایان" کا استعمال دیکھیے:

راہہا را جملہ پایانی بود | راہ ما را نیست پایان مشکل است ص۵۳

ایک متوازی خط کے مطلعے ملاحظہ کیجیے:

قطب الدّین	حافظ
اگر تو سالک عشقی بجستی و چالاک	ہزار دشمنم ار می کنند قصد ہلاک
بیہ بخاک در دوست روئے خود بر خاک ص۱۴۱	گرم تو دوستی از دشمناں ندارم باک ص۲۰۲

حافظ نے ایک زمین میں دو غزلیں لکھیں۔ قطب الدّین نے ایک غزل ان کی پیروی میں لکھی:

قطب الدّین	حافظ
فاش می گویم و خواہم نرود از یادم	فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم
کہ بہ سودای غم عشق تو مادر زادم	بندۂ عشقم و از ہر دو جہان آزادم
در ازل پردگی خلوت جاناں بودم	طائر گلشن قدسم چہ دہم شرح فراق
کز حریمش بہ چنیں دور و دراز افتادم	کہ دریں دامگہ حادثہ چوں افتادم
ایں چنیں کز شرر عشق دلم می سوزد	من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود
عاقبت درد غم عشق دہد بربادم	آدم آورد دریں دیر خراب آبادم
یار کز دولت دیدار مرا بنوازد	کوکب بخت مرا ہیچ منجم نہ شناخت
من اگر سیر نخواہم ببرد بنیادم	یارب از مادر گیتی بچہ طالع زادم
قطب دیں غم نہ خورد ہر کہ خورد گو می خور	پاک کن چہرہ حافظ بسر زلف ز اشک

من ببودای غمش از دو جہاں آزادم ‏ ‏ ‏ ورنہ ایں سیل دمادم ببرد بنیادم

(ص ۱۶۲ - ۱۶۳) ‏ ‏ ‏ (ص ۲۱۶)

دونوں کی ایک اور غزل اسی زمین میں ہے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں:

حافظ

زلف برباد مده تا ندہی بربادم ‏ ‏ ‏ ناز بنیاد مکن تا نکنی بنیادم

می مخور با ہمہ کس تا نخورم خون جگر ‏ ‏ ‏ سرکش تا نکشد سر بفلک فریادم

زلف را حلقہ مکن تا نہ کنی در بندم ‏ ‏ ‏ طرّہ را تاب مده تا ندہی بربادم

(ص ۲۱۵)

قطب الدّین

تا من دل شده از مادر گیتی زادم ‏ ‏ ‏ عشق در بادیۂ وصل تو شد استادم

حلقۂ بندگیت تا کہ کشیدم در گوش ‏ ‏ ‏ از غم سود و زیانِ دو جہاں آزادم

زلف برباد مده زانکہ دلم بستۂ اوست ‏ ‏ ‏ ورنہ چوں زلف پریشاں بدہی بربادم

(ص ۱۶۳)

دیوان قطب الدّین میں بعض الفاظ۔ تراکیب اور فقرات جو حافظ کے یہاں سے اخذ کیے ہوئے ہیں۔ ان کی نشان دہی کی جاتی ہے:

قطب الدّین	حافظ
ببیں کہ تا بکجا رفت تیر ہمت ما ص ۱۴	ببیں تفاوت رہ کز کجا تا بکجا ص ۳
ہزار جان گرامی فدا کند بربہت ص ۲۰	ہزار جان گرامی فدای جانانہ
ہمای اوج عزّت بر سر ماست ص ۳۱	ہمای اوج سعادت بدام ما افتد ص ۷۷
بار وصلش کاسماں آں بار راطاقت نداشت ص ۵۵	آسماں بار امانت نتوانست کشید ص ۱۲۵
بہ می سجادہ بفروش و بزن تسبیح آتش را ص ۶۳	بدیں راہ و روش می رو کہ با دلدار پیوندی ص ۳۰۶
در ندارد طلب وصل تو نادر ویش است ص ۹۲	تا دریں خرقہ ندانی کہ چہ نادرویشم

عزیز من بشنو ایں سخن ز قطب الدّین
مباش در پی آزار بندگان خدای
ص۲۰۴

مباش در پی آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست
ص۵۴

ہمیں کہ فتنۂ آخر زماں علم برداشت
مرا ز فتنۂ آخر زماں نگہداری
ص۲۰۵

خواہم شدن بکوی مغاں آستیں فشاں
زیں فتنہ ہا کہ دامن آخر زماں گرفت
ص۶۰

از آں زماں کہ فتنۂ چشمت بمن رسید
ایمن ز شرِّ فتنۂ آخر زماں شدم ص۲۱۶

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ دیوان قطب الدّین کا خواجہ بختیار کاکی سے کوئی تعلّق نہیں، دراصل نام کی یکسانی سے دھوکہ ہوا۔ اوّل الذکر گیارھویں بلکہ بارھویں صدی ہجری کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ خواجہ بختیار کی طرف اس دیوان کا انتساب غلط ہے۔ اور یہ نتیجہ قطعی اور ہر شبہے سے پاک ہے۔ اس امر کی پہلی دلیل یہ ہے کہ قطب الدین نے حافظ کی قدم قدم پر پیروی کی ہے۔ حافظ کی وفات ۷۹۲ھ میں اور خواجہ بختیار کی ۶۳۴ھ میں، حافظ سے تقریباً ۱۵۸ سال پہلے ہوئی۔ پس حافظ کا پیرو ساتویں صدی ہجری کا شاعر نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اس کا بھی تو امکان ہے کہ حافظ نے قطب الدین کی پیروی کی ہو مگر یہ وسوسہ بے بنیاد ہوگا، حافظ نابغۂ روزگار تھا۔ قطب الدّین معمولی درجے کا شاعر۔ ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ حافظ ایسے معمولی درجے کے شاعر کو اپنا پیش رو بناتا۔ پس مُسلّمہ بات یہی ہے کہ قطب الدّین نے حافظ کی پیروی کی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قطب الدّین کی زبان جدید تر ہے۔ جس کو فارسی زبان شناسی کا ذرا سا ملکہ ہوگا وہ بتا دے گا کہ قطب الدّین کا کلام اوائل ساتویں صدی ہجری کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں سیکڑوں الفاظ، فقرات و ترکیبات ہیں جو ساتویں صدی سے قبل فارسی میں ناپید تھے۔ میں نے ابتداء میں چند مثالیں دی ہیں؛ ابھی یہ کام ادھورا ہے۔ دیوان قطب الدّین کے لفظیات کا عمیق مطالعہ ہو تو یہ بات اور زیادہ یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ غزلیات قطب الدین کا سبک قدیم سبک نہیں۔ خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی ساتویں صدی ہجری کے اوائل کے ہیں۔ اوّل الذکر کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل کے اس دور کی نمایندگی کرتا

ہے جس پر کئی صدیاں گذر چکی ہیں، اس سے اس سبک کی نمایندگی نہیں ہوتی جو سعدی شیرازی سے نصف صدی قبل رائج تھا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ خواجہ بختیار کاکی خواجہ معین الدّین چشتی کے اجل خلفاء میں تھے، بڑے بلند مرتبے کے عارف تھے، فنانی اللہ، ایسے فنانی اللہ کہ خواجہ احمد جام کے حسب ذیل شعر سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسی میں ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی:

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

قطب الدّین کے کلام سے ظاہر ہے کہ اس کو تصوف و عرفان سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، وہ کٹر سُنّی عقائد کا حامل ہے اور دوسرے عقیدے کے لوگوں کو بے ایمان اور بد عقیدہ اور جہنمی سمجھتا ہے جو صوفی آداب کے خلاف ہے۔ حسب ذیل اشعار سے میرے قیاس کی تائید ہوتی ہے:

یارانِ تو چار آمدند، پاکیزہ کردار آمدند گلہائے بے خار آمدند از خویش فانی با خدا

اوّل ابو بکرِ تقی در دین و دنیا بُد نقی اعدائے او باشد شقی آں جملہ را دوزخ سزا

او مظہر رحمٰن بود شمع ہمہ خوباں بود اعداش بے ایماں بود ہستم غلامش بی ابا

از خویشتن بگسستہ بُد بایادِ حق پیوستہ بُد برجائے تو بنشستہ بُد دو سال و دو مہ پیشوا

دہ سال و شش ماہِ دگر برجائے تو بودہ عمر وز نور عدلش چوں قمر بگرفت عالم را ضیا

ہر کس کہ بر باطل بود از حال او غافل بود و آنکس کز اہل دین بود داند مر اورا مقتدا

دین خدا مطلق گرفت اسلام زو رونق گرفت جائے ترا برحق گرفت آں حق شناس ورہ نما

عثمان پاکیزہ گہر دہ سال و دو سالِ دگر بر جائے پاکت بی ضرر بنشت از بہر خدا

او جسم بُد تو جان درو راضی بُدی دائم ازو دوبارہ شد داماد تو آں مظہر حلم و حیا

اعدائے او را روسیہ اعمال شاں جملہ تبہ سر تا بپا غرق گنہ باشد جہنم شاں جزا

ایّام یارِ چارمیں کاندر طریقت بُد امین بُد چار سال او ہمیں یعنی علی مرتضیٰ

غرض قرائن بالا سے یہ بات یقینی ہے کہ قطب الدّین جس کا دیوان زیر مطالعہ ہے وہ خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی سے جدا ہے۔ دراصل ادنیٰ سے قرینے پر دو شخصیتوں میں

التباس عام ہے۔ دیوان قطب الدّین مطبع نول کشور والوں کو ملا تو انھوں نے اس کو آسانی سے ایک بڑی ہمنام شخصیت یعنی خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی کی طرف منسوب کردیا اور ان کے نام سے چھاپ کر عام کردیا۔ اس میں جہاں ادبی خدمت ملحوظ تھی وہیں دینی اور مذہبی خدمت کا بھی جذبہ تھا۔ بعینہ یہی صورت دیوان معین الدین کے ساتھ بھی ہوئی۔ نول کشور پریس میں دیوان مذکور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے نام سے چھاپ دیا گیا اور مدتوں یہ دیوان انھی کا سمجھا جاتا رہا۔ خدا جزائے خیر دے پروفیسر حافظ محمود شیرانی کو جنھوں نے بھانپ لیا کہ یہ دیوان حضرت کا نہیں بلکہ معین الدّین فراہی کا ہے جو معین مسکین و معین تخلص سے شعر کہتے تھے۔ فراہی مشہور شاعر، ادیب، مفسر اور سیرت نگار تھے، متعدد کتابیں انھوں نے تصنیف کیں اور ان میں سے اکثر محفوظ ہیں۔ ان کی معارج النبوہ سیرت پر اہم تصنیف ہے انھوں نے اپنی نثری تصانیف میں قدم قدم پر اپنے اشعار نقل کیے ہیں، ان میں بیشتر وہی ہیں جو دیوان میں پائے جاتے ہیں، ان کے پوتے نے اخلاق جہانگیری نام کی ایک کتاب لکھی، اس میں بھی دیوان کے اشعار منقول ہیں۔ غرض داخلی اور خارجی شہادتوں سے قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ دیوان معین، معین مسکین فراہی کا ہے، خواجہ معین الدّین چشتی کا نہیں البتہ آخر الذکر کے نام سے چھپ گیا جس کی بنا پر بڑی گمراہی پھیلی۔

میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ دیوان قطب الدّین کا مشہور صوفی بزرگ خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی سے کوئی تعلق نہیں، یہ ان کے ہمنام کسی بہت بعد کے شاعر کا ہے نام کی یکسانی کی وجہ سے یہ دیوان بختیار کاکی کا سمجھا جانے لگا ہے لیکن اندرونی شہادت سے اس قیاس کی تردید ہوجاتی ہے۔

(معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۹۰ء)

حواشی

(۱) مشار ۲ : ۲۰۲۲ میں چار بار طبع ہونے کا ذکر کیا ہے (فہرست مشترک ۷: ۲۰۲)

(۲) اوش ۔ اندجان فرغانہ کا ایک قصبہ ہے: یہ شہر درۂ فرغانہ کے کنارے شہر فرغانہ کے شمال مشرق میں واقع ہے ۔ بابر کا تعلق بھی اسی خطے سے تھا۔

(۳) ہندوستان میں کُلچہ ہے ۔

(۴) فوائد الفواد میں یہ واقعہ نقل ہے ۔

(۵) یہ شعر شیخ احمد جام کا ہے جو عارف ہونے کے باوجود شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ امیر حسن نے اسی زمین میں ایک غزل لکھی جس میں اس شعر کی اس طرح تضمین کی ہے:

جاں بریں یک بیت دادست آں بزرگ
آری ایں گوہر ز کانِ دیگر ست
کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست .

(۶) یہ لفظ دیوان حافظ میں نہیں آیا

(۷) دیوان حافظ میں یہ قسم ایک بار بھی نہیں ۔

(۸) یہ فقرہ دیوان حافظ میں نہیں ہے ۔

(۹) یہ لفظ حافظ کے یہاں صرف ایک بار ملتا ہے ۔

(۱۰) یہ مصدر حافظ کے یہاں نہیں ملتا۔

(۱۱) یہ فقرہ حافظ کے یہاں نہیں ہے ۔

(۱۲) اگر چہ عمر ضائع شدن درست ہے لیکن اس کی تکرار یقیناً معیوب ہے۔ حافظ کے یہاں ضائع دو بار آیا ہے اور دونوں میں عمر کے ساتھ نہیں ۔ البتہ ہندوستان میں بہت عام ہے ۔

(۱۳) مستم کہ دیدہ بدیدار دوست گردم باز
چہ شکر گویمت اے کار ساز بندہ نواز
(حافظ ص ۲۸۱)

بروے ہر کہ در عجز و معرفت شد باز
تواند آں کہ سوے یار خود کند پرداز
(قطب الدّین ص ۱۲۱)

قطب الدّین کے یہاں غمّاز کا قافیہ اس بیت میں ملتا ہے:

عجب مدار کہ رسواے دہر گردم من
چنیں کہ طفل سرِ اشکم ہمی شود غمّاز

ڈاکٹر نذیر احمد :

کیا مصباح الارواح کا مصنّف جمالی دہلوی تھا

مصباح الارواح مثنوی کے طرز میں ایک کتاب ہے جس میں حصۂ نثر بھی کافی پایا جاتا ہے، نثر میں آیات قرآنی و احادیث کی مختصر تشریح عارفانہ رنگ میں ہے۔ پھر ان ہی مطالب کو نظم کے پیرایے میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ دراصل اس کتاب کا موضوع حضرت محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی ولادت با سعادت سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس بیان میں عرفان اور طریقت کا رنگ غالب ہے۔ اس کتاب پر ایک مقالہ تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ضیاالدین سجادی نے پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج لاہور کے جشن صد سالہ تاسیس کے (۱) موقع پر پیش کیا تھا۔ اس مقالے میں اس کا مصنّف جمالی دہلوی(۲) بتایا گیا ہے۔ یہ جمالی کنبوہ صاحبِ سیر العارفین ہیں جن کی وفات ۹۴۲ھ میں ہوئی ہے۔ سجادی صاحب نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ بعض ماخذ میں یہ کتاب جمالی اردستانی متوفی بسال ۸۷۹ھ کی طرف منسوب کی گئی ہے مگر ان کے نزدیک یہ انتساب غلط ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "او جالب توجہ آنکہ بسیاری از مآخذ آثار او را بہ پیر جمال (صحیح جمالی) یعنی جمالی اردستانی نسبت دادہ اند جملہ ہدایت در ریاض العارفین فتح الابواب و شرح الواصلین جمالی دہلوی را بہ نام جمالی اردستانی ذکر کردہ است"

اس سے واضح ہے کہ فتح الابواب و شرح الواصلین بھی جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں ۔آگے پھر لکھتے ہیں :

"در ہر حال مصباح الارواح جمالی دہلوی کہ موضوع بحث ماست

یک مثنوی (۳) است کہ در حدود چہار ہزار و چہار صد و پنجاہ بیت
(۴) دارد و نخستین مثنوی از ہفت بخش بیان حقایق احوال
المصطفیٰ است کہ شش بخش دیگران بہ ترتیب۔ احکام المحبین
نہایۃ الحکمۃ بدایۃ الجنۃ ہدایۃ المرف۔ فتح الابواب و شرح الواصلین
است۔"

اس سے واضح ہے کہ ان ساتوں تصانیف کا مصنف جمالی دہلوی ہی ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ جمالی دہلوی کی یہ ساتوں کتابیں جمالی کی تصانیف کے ایک قلمی مجموعے میں ہیں جن میں حسب ذیل کتابیں اور شامل ہیں، مہر قلوب، قدرت نامہ، نصرت نامہ، فرصت نامہ، مراۃ الحبیب اور شرح رباعیات بابا افضل اس حساب سے جمالی دہلوی کی ۱۳ تصانیف ہوتی ہیں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں

"در بعضی از مآخذ آثاری دیگر نیز بہ جمالی دہلوی نسبت دادہ اند
مانند مثنوی مرآت المعانی و نیز کتاب سیرالعارفین کہ بہ سال ۱۳۱۱ھ
ق در دہلی بہ چاپ رسیدہ و تذکرہ ای در مقامات و
احوال مشائخ چشتیہ و سہروردیہ ہند وارد" (دائرہ المعارف اسلامی)

اس بیان میں سیر العارفین کو تذکرے سے الگ قرار دینے میں پروفیسر سجادی سے غلطی ہوئی ہے۔ دراصل سیر العارفین ہی تذکرۂ مشائخ چشتیہ و سہروردیہ ہے (۵)

پروفیسر سجادی سے بڑا سہو ہوا ہے کہ انھوں نے مندرجۂ بالا ساری کتابوں کو جمالی دہلوی کی تصانیف قرار دے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مرآت المعانی اور سیر العارفین کے علاوہ جن کتابوں کا اوپر نام گنایا گیا ہے وہ جمالی اردستانی (۶) کی ہیں۔ مرآت المعانی اور سیر العارفین البتہ جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں۔

سجادی صاحب نے مصباح الارواح کی تصنیف ۸۹۸ھ بتائی ہے اور جمالی کی وفات ۹۴۲ ہجری لکھی ہے اگر وہ انھی دونوں باتوں پر غور کر لیتے تو اصل حقیقت کھل کر سامنے آجاتی۔ وفات کے وقت اگر جمالی کی عمر ۸۰ سال کی فرض کی جائے تو اس کی پیدائش ۸۶۲ ہجری قرار پاتی ہے اور ۸۹۸ ہجری میں جب وہ مصباح الارواح اور دوسری کتابوں کی تصنیف میں مصروف ہے اس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور اگر نوّے سال کی صورت میں ۹۶۸ جو کہ وہ سولہ

سال کا ہوگا۔ جمالی کی تصانیف اس تاریخ سے کچھ پہلے کی ہیں مثلاً محبوب الصادقین کی ۸۶۶ھ اور روح القدس کی ۸۶۵ہجری ہے۔ جمالی کی ان تصانیف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ علوم ظاہری کے سارے منازل طے کرچکا تھا اور تصوّف و علوم باطنی میں نہایت بلند مرتبہ حاصل کرچکا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ بارہ پندرہ سال کے بچّے سے ان علوم میں ایسی دستگاہ کا حصول کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔

ایک اور بات جو واضحاً متذکر الصدر ساری کتابوں کو جمالی دہلوی کی ملک قرار دینے مین حائل ہے وہ یہ ہے کہ سیر العارفین کی روایت ہے کہ ۹۲۳ ہجری میں جمالی دہلوی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔جمالی کی تاریخ پیدائش ۸۶۲ھ قیاس کرنے پر ۹۲۳ھ میں اس کی عمر ۸۱ سال اور ۸۵۲ ہجری فرض کرنے پر ۷۱ سال ہوتی ہے۔ ۸۰ سال کی عمر تو الدوتناسل کے اعتبار سے تقریباً ناممکن اور ۷۱ سال خلاف غیر عادی ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۸ وغیرہ سالوں میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں وہ جمالی دہلوی کی نہیں ہوسکتیں جس کی وفات ۹۴۲ھ ہے۔

اب میں شہادت کلام کی طرف متوجہ ہوتا ہوں میرے سامنے (۷) جمالی اردستانی کی حسب ذیل تصانیف پر مشتمل ایک قلمی مجموعہ (۸) موجود ہے۔

۱۔ مرأت یا گنج دقایق جس میں قصۂ اجوبہ و مجوبہ عارفانہ رنگ میں بیان ہوا ہے

۲۔ کنز الدقایق ۳۔ روح القدس ۴۔ تنبیہ العارفین ۵۔ محبوب الصادقین ۶۔ کتاب معلومات ۷۔ رسالۂ کشف الارواح ۸۔ راز تصوف ۹۔ مرأت الافراد۔ ان کتابوں کے مصنف جمالی اردستانی ہونے کے چند اور ثبوت ہیں:

> ۱۔ جمالی اپنے پیر مرتضیٰ علی اردستانی مقیم اردستان سے روایت کرتا ہے (۹) از پیر خود قطب العارفین و سیّد الافراد و سلطان اولیا محب و محبوب مصطفیٰ و مرتضیٰ پیر مرتضیٰ علی اصفہانی، ساکن اردستان خبر می دہم و فقیر (۱۰) از لب و دندان حضرت سالار محققان پیر مرتضیٰ علی اردستان علیہ الرحمہ شنیدم کہ فرمود حدیقۂ حکیم سنائی الخ

کنز الدقایق (۱۱) میں مذکور ہے کہ جمالی نے پیر مرتضیٰ علی اردستانی سے سنا کہ ان کی والدہ نوشیروان عادل کے خاندان سے تھیں۔

بیر مرتضیٰ علی اردستانی (۲) قدس اللہ روحہ العزیز۔۔۔ در زمانی کہ

نزدیک بود خرقۂ مبارک بیرون کند و باین فقیر ارزانی دارد الخ

واضح ہے کہ پیر مرتضیٰ علی اردستانی جمالی اردستانی کے پیر تھے۔ جمالی دہلوی کے پیر کا نام سماء الدین کنبوہ دہلوی (۱۳) ہے۔ ان کے ذکر سے جمالی دہلوی کا دیوان پُر ہے۔ سماء الدین کے نام قصیدہ موجود ہے۔ ان کی وفات پر دردناک مرثیہ کہا ہے۔ ان کے بیٹے کے مرنے پر بھی دوسرا مرثیہ لکھا ہے۔ سیر العارفین میں انکے حالات قلمبند کیے ہیں۔ اور ان کو اور صرف ان ہی کو اپنا پیر و مرشد مانا ہے۔ پس جو کتابیں پیر مرتضیٰ علی اردستانی کے مرید جمالی کی ہیں وہ جمالی اردستانی کی ہیں، جمالی دہلوی کی نہیں ہو سکتیں۔

۲۔ جمالی کی تصانیف میں ان کی دوسری کتابوں کا نام برابر آتا ہے مثلاً کشف ارواح میں ہے (۱۴):

جمالی شد تمام ایں کشف ارواح　　جہاں روشن کن از انوار مصباح

ای اخی معنیٰ ذلک من انباء الغیب نوحیہ الیک درین کتاب کشف الارواح شمۂ گفتہ شد آنچہ تعلق باہل خرابات دارد ان شاء اللہ در کتاب مصباح الارواح لسمع مشتاقان برسد۔ میخواستم کہ حقیقت سورۂ صف و جمعہ کہ ذکر آن در کتاب محبوب گذشتہ است درین کتاب بر بستم نشد این نیز جوابست بکتاب مصباح الارواح است

مرآت الافراد (۱۵) میں لکھتے ہیں:

اگر شرح ایں کلمات خواہی کہ نیک بدانی کتاب مصباح کہ ذکر مولود حضرت سید ولد آدم است مطالعہ کن۔"

مرآت الافراد (۱۶) کے ایک نجی خط میں مصباح الارواح کے ساتھ احکام المحبین اور نہایۃ الحکمۃ کا نام لیتے ہیں۔ یہ تینوں کتابیں پروفیسر سجادی کی فہرست میں شامل ہیں جو جمالی دہلوی کی بتائی گئی ہیں۔

۔ مقصود است اہل محبت در کتاب مصباح کہ مولود حضرت رسالتؐ گذشتہ بتامل مطالعہ کند و این کتاب را از برای آن نمی فرستادم کہ دو کتاب دیگر در عقب این کتاب آمدہ است یکی احکام المحبین نام دارد و دیگری نہایۃ الحکمۃ می خواستم در یک جلد

بفرستم ہنوز اندک کار تہذیب ماندہ بود بعد از این ہر کاروان کہ
آید وصول خواہد یافت۔"

کتاب (۱۷) مولود حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم بہ پنج ہزار بیت رسید واضحاً اس سے مراد مصباح الارواح ہے۔ جس کے اس نسخے میں جس کو پروفیسر سجادی نے پڑھا ساڑھے چار ہزار اشعار ہیں۔

پروفیسر سجّادی کی فہرست جو جمالی دہلوی کی کتابوں کی بتائی گئی ہے۔ اس کی حسب ذیل دو کتابیں جمالی اردستانی اپنی بتاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

شرح (۱۸) این کلمات در کتاب فتح الابواب کہ ذکر فتح مکہ است
بطلب کتاب (۱۹) ہدایۃ المعرفۃ مطالعہ کن۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ جو کتابیں مثلاً مصباح الارواح، احکام المحبین، نہایۃ الحکمۃ ہدایۃ المعرفۃ، فتح الابواب وغیرہ جمالی کی بتاتے ہیں، وہ خود بقول جمالی اردستانی اس کی اپنی ہیں۔

۳۔ جمالی دہلوی کے تین لڑکوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک بچپن میں مر گیا تھا جس کا نام حسن (۲۰) تھا۔ اس کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا جو دیوان میں محفوظ ہے۔ دوسرا شیخ گدائی جس کو ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں اور اکبر کے دور میں ایسا اعزاز نصیب ہوا جو خاندان کے کسی فرد کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ تیسرا بیٹا شیخ حیاتی تھا اس کی پیدائش ۹۲۳ھ میں ہوئی وہ شاعری کا بڑا ذوق رکھتا تھا۔ مسائل علمی میں بھی اس کو بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے اخبار الاخیار (۲۱) میں اور عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ (۲۲) میں شیخ کی بڑی تعریف کی ہے لیکن جمالی اردستانی کے یہاں ان میں سے کسی کا ذکر قدرۃً نہیں ملتا۔ اردستانی کے کئی نجی خطوط فرزند حمید الدین معروف کے نام ہیں ان میں اپنے اشتیاق ملاقات اور جدائی کا ذکر کرتے ہیں۔ بخوبی ممکن ہے کہ حمید الدین معروف ان کا لڑکا ہو۔ ایک خط میں اس کو فرزند جگر پرتاب سے خطاب کرتے ہیں (افراد ورق ۲۶۸ ب)۔ دوسری جگہ فرزند مقبول سے (۲۰۳ب)۔ دوسرا بیٹا غالباً خواجہ مظفر الدین ہے۔ بانوے ایام کے نام خط میں اس بیٹے کو ان کے پاس بھیجنے کا ذکر ہے۔ بانوے ایام سے غالباً ان کی رفیقہ حیات مراد ہیں۔ انھیں لکھتا ہے کہ مظفر الدین کو میرے پاس بھیج دو۔ فرزند خواجہ جمال الدّین محمد طائی کے بھی خط میں خواجہ مظفر الدّین کو ساتھ لانے کا ذکر موجود ہے (ورق ۲۰۴)۔ حمید الدّین معروف کے خط میں متعدد آدمیوں کو سلام لکھوایا ہے۔ ان میں سے کسی کا تعلق جمالی دہلوی سے نہیں معلوم ہوتا۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے

کہ جمالی اردستانی کا جمالی دہلوی سے کوئی تعلق نہیں اور جمالی اردستانی ہی مرآت الافراد (۲۳) کا مصنّف ہے، چنانچہ اسی کتاب میں اس نے اپنی کتابوں کے نام گنائے ہیں، جن میں بیشتر وہ ہیں جو پروفیسر سجّادی نے جمالی دہلوی کی بتائی ہیں۔ پس سجّادی صاحب کا ان کتابوں کے انتساب کے سلسلے کا قیاس سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

۴۔ جمالی دہلوی کے دیوان کے دو نسخے مکشوف ہیں، ایک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذخیرۂ حبیب گنج میں ۔ اس میں تقریباً ۲۱۰۰ اشعار ہیں، یہ دیوان قصائد اور ترکیب بند، ترجیع بند، مراثی پر مشتمل ہے، دوسرا کلّیات کا نسخہ ہے جو رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے، اس میں غزلیات و قصائد، قطعات، مراثی، مثنویات ہیں۔ ان کے علاوہ اس کا ایک تذکرۂ سیر العارفین اور دو مثنویاں مہر و ماہ اور مرآۃ المعانی ہیں۔ جمالی اردستانی کے کلام کے متعدد نسخے دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ان سے اس کی مختلف کتابوں اور رسالوں کے نام معلوم ہوتے ہیں، کلیات جمالی کے مختلف نسخوں کے مندرجات حسب ذیل ٹھہرتے ہیں :

۱۔ مصباح الارواح، پیرس (۲۴) کلکتہ ۲۔ احکام المحبین پیرس ۳۔ نہایۃ الحکمۃ، پیرس ۔ ۴۔ ہدایۃ المحبۃ، پیرس ۔ ۵۔ ہدایۃ المعرفۃ، پیرس ۶۔ فتح الابواب، مجلس، پیرس ۷۔ شرح الواصلین ۔ پیرس ۔ کلکتہ ۸۔ مہر القلوب ۔ پیرس ۔ کلکتہ ۹۔ قدرت نامہ پیرس، کلکتہ ۔ ۱۰۔ نصرت نامہ، پیرس کلکتہ ۱۱۔ فرصت نامہ ۔ پیرس ۔ کلکتہ ۔ ۱۲۔ مرآۃ الحبیب ۔ پیرس ۱۳۔ شرح رباعیات بابا (کاشانی افضل ۔ پیرس ۔) ۱۴۔ گنج دقایق یا مرآت علی گڑھ ۱۵۔ کنز الدقایق، مجلس ۔ علی گڑھ ۱۶۔ شرح الکنوز نفیسی ۔ ۱۷۔ روح القدس، علی گڑھ ۔ ۱۸۔ تنبیہ العارفین ۔ مجلس علی گڑھ ۱۹۔ محبوب الصدیقین مجلس ۔ علی گڑھ کلکتہ ۲۰۔ میزان الحقایق نفیسی ۔ ۲۱۔ کشف الارواح، مجلس، علی گڑھ، بوڈلین ۔ ۲۲۔ راز تصوف علی گڑھ ۲۳۔ معلومات ۔ مجلس، علی گڑھ ۔ ۲۴۔ مرآت الافراد، مجلس علی گڑھ ۲۵۔ مفتاح الفقر، مجلس ۲۶۔ نور علی نور ۔ مجلس ۔ کلکتہ ۔ ۲۷۔ فضیلۃ العقل، کلکتہ ۔ ۲۸۔ مشکوٰۃ المحبین مجلس ۲۹۔ مہرافروز ۔ مجلس ۔ ۳۰۔ استقامت نامہ ۔ مجلس ۳۱۔ ناظر و منظور ۔ مجلس ۳۲۔ مثنویات (کوتاہ) مجلس ۳۳۔ قصائد مجلس ۳۴۔ ترجیعات مجلس ۳۵۔ غزلیات مجلس ۔ ۳۶۔ رباعیات ۔ مجلس ۔ پیرس ۳۷۔ مفردات وغیرہ مجلس ۳۸۔ مستزادات مجلس ۔

ان میں مرآت الافراد کے علاوہ سب منظوم کلام ہے، گو ان میں سوائے چند کے سب میں نثر کا خاصا حصہ شامل ہے جمالی اردستانی کا شیوہ یہ ہے کہ اوّل نثر میں کوئی موضوع اجمالاً ذکر ہوتا ہے، پھر اسکی تفصیل اشعار میں (مخصوصاً مثنوی کے طرز میں) کی جاتی ہے۔ جمالی

کا سارا کلام عارفانہ ہے جس میں اس کے شدید عارفانہ و صوفیانہ جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردستانی کا کوئی منظوم کلام جمالی دہلوی کے کلیات میں شامل نہیں۔ علاوہ بریں دونوں کا رنگ بالکل جداگانہ ہے۔ جمالی اردستانی کے یہاں جو عشق کا زور اور ہیجان پایا جاتا ہے وہ کسی صوفی شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گا۔ جمالی دہلوی صوفی ضرور تھا، لیکن اس پر دنیاوی رنگ غالب تھا، متعدد بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھتا ہے، ابراہیم لودی کی تعریف میں اس کے قصائد موجود ہیں اور جب اس کی شکست بابر کے ہاتھوں ہوئی ہے تو بابر کی تعریف میں اس سے زیادہ پُرشکوہ نظمیں لکھتا ہے جن میں ابراہیم لودی کی تعریض بھی ملتی ہے۔ اس لحاظ سے جمالی کی سیرت کی بلندی (۲۵) مشتبہ ہوجاتی ہے۔ جمالی اردستانی کے کلام میں کسی دنیاوی شخص کا ذکر تک نہیں ملتا، کسی بادشاہ کی تعریف کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اس کا کلام محبت خدا، عشقِ رسول اور محبتِ اہلِ بیت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اس لحاظ سے دونوں کی الگ الگ راہیں ہیں۔ ایک اور اعتبار سے دونوں کے کلام میں کافی تفاوت پایا جاتا ہے۔ جمالی اردستانی کی منظومات دراصل قرآن اور احادیث کی عارفانہ تشریح ہیں جن میں جگہ جگہ نثر کی عبارت بھی پائی جاتی ہے اور اس کو اس معاملے میں اتنا غلو ہے کہ مشکل سے کوئی عبارت اس خصوصیت سے عاری ملے گی۔ اس لحاظ سے اگر اس کے کلام سے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا انتخاب کیا جائے تو شاید قرآن کا بیشتر حصہ اور احادیث کا معتدبہ حصہ ہمارے سامنے آجائے گا۔ اس خصوصیت سے جمالی دہلوی کا کلام بیگانہ ہے۔ اس سے بطور نتیجۂ صریح کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ علوم اسلامی پر جمالی اردستانی کو جتنی قدرت حاصل تھی اور جس کا اثر اس کے کلام میں موجود ہے، اس کا شائبہ جمالیؔ دہلوی کے یہاں نہیں۔

جمالی اردستانی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ہر کتاب کے نثری حصے میں وہ اخی، عزیز، فرزند وغیرہ کے الفاظ سے ہر جگہ خطاب کرتا ہے، یہ اس کا اپنا مخصوص طرز ہوگیا ہے۔ یہ جمالی دہلوی کی خصوصیت نہ تھی۔

ایک اور بات جو دونوں کے درمیان وجہ امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ جمالی اردستانی اپنی نثری تصنیف میں قدم قدم پر اشعار سے کلام کو مزین کرتا ہے بلکہ پوری پوری غزلیں اور قصیدے درمیان میں نقل کردیتا ہے، اس کی مرآت الافراد میں ایک قصیدہ ۸۰ ابیات اور دوسرا ۸۶ اشعار پر مشتمل ہے، جمالی دہلوی کا یہ شیوۂ نگارش نہیں۔

ایک اور اعتبار سے دونوں کے یہاں تفاوت پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جمالی

اردستانی نے دیوان اور کلیات کی ترتیب میں مروجہ طریقے سے عدول کیا ہے، نظم و نثر، قصیدہ، غزل و مثنوی، رباعی وغیرہ کو الگ الگ موضوع حتی الامکان نہیں بنایا گیا ہے، اکثر یہ سب ملے جلے پائے جاتے ہیں۔ اس کے بر خلاف جمالی دہلوی نے مروّجہ طریقے سے اپنا کلّیات مرتب کیا ہے۔

جمالی دہلوی کی تصانیف خصوصاً سیر العارفین میں ہندوستانی فضا ہے۔ ہندوستانی عرفاکی ہندوستان میں مرتب کی ہوئی کتابیں مانند فوائد الفواد، خیر المجالس، طبقات ناصری وغیرہ ہیں۔ جمالی اردستانی کی تصانیف کی فضا خالصۃً ایرانی ہے۔

غرض ان وجوہ کی بنا پر میرے نزدیک دونوں کے یہاں سوائے تخلص کے اشتراک کے اور کوئی چیز مشترک نہیں۔ دونوں دو الگ الگ شاعر ہیں۔ دونوں کا دور الگ ہے، دونوں کے کلام جدا جدا اور دونوں کا رنگ متضاد، یہ محض اپنی نظر کا قصور ہے کہ ہم دونوں میں فرق نہ کر سکیں۔

پروفیسر ضیاءالدین سجّادی نے جمالی اردستانی کا کلام جمالی دہلوی کی طرف منسوب کردیا تو ان سے بجاطور پر پوچھا جاسکتا ہے کہ جمالی اردستانی کے وجود کے جب آپ قائل ہیں تو ان کا کلام کہاں ہے، بہر حال یہ تو ایک رخ ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ جمالی اردستانی کی چند ابیات بعض کتابوں میں جمالی دہلوی کی طرف منسوب ہیں۔

محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں لکھا ہے کہ جمالی بہیت گدائی میں جامی کے پاس پہنچے تو انھوں نے جمالی کے شعر کی فرمائش کی انھوں نے یہ شعر پڑھے:

دو سکے زر ز پُر دلکے پوستکے و بوریا و گزگک دو

کالا غم نے و دزد غم نے بالا لنگکے و زیر

را لاابالی رند عاشق را جمالی بود بس قدر ایں

اگرچہ مجھے فی الحال کوئی قدیم سند اس واقعے کی نہیں ملی لیکن ریاض الشعرا (۲۶) میں جمالی دہلوی کے تحت پہلا اور تیسرا شعر منقول ہے لیکن ان اشعار کی نسبت جمالی دہلوی کی طرف غلط ہے، اس لیے کہ جمالی دہلوی ہرگز رند لاابالی نہ تھا، وہ اچھا خاصا درباری شاعر تھا، گو تصوف و عرفان سے لگاؤ بھی تھا، ان اشعار سے شاعر کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ جمالی اردستانی پر صادق آتی ہے، وہ عاشقِ خدا عشق میں سرشار دنیا کو خیر باد کہہ چکا تھا، یہی وجہ ہے

کہ تقی اوحدی نے عرفات میں ان اشعار کو جمالی دہلوی کی ملکیت ماننے سے انکار کیا ہے اور وہ حق بجانب ہے۔ تقی لکھتا ہے (۲۷):

"پیر جمالی عراقی مولد و منشاے وے اردستان است و از مریدان پیر مرتضیٰ علی اردستانی بودہ ۔۔۔ صاحب سلسلۂ مرید و مراد است، مریدان خود را برداشتہ پیادہ بمکۂ معظم بے زاد و راحلہ رفتہ و سلامت بکعبۂ مراد مقصود رسید ۔۔۔ اشعار بسیار گفتہ، رقص پیر جمالی بہ وے منسوب است، چہ ہمیشہ بذوق و سماع بودہ، باتفاق مریدان دست از ہستی وہمی خویش کہ محض پندار است بایں روش می افشاندہ، اوراست:

دو گزک بوریا و پوستکی — دلکی پُر ز درد و دوستکی

ایں قدر بس بود جمالی را — عاشق رند لاابالی را

بعضے ایں دو بیت را بہ جمالی دہلوی نسبت کردہ اند غلط و سہو است"

جمالی اردستانی کے کلیات کا ایک حصہ جو راقم کے ملاحظے میں رہا، اس میں یہ اشعار میری نظر سے نہیں گذرے، لیکن حسب ذیل ابیات میں وہ اپنے کو رند و لا ابالی قرار دیتا ہے اور اتفاق سے یہ فقرہ یقیناً پہلی بیت میں پایا جاتا ہے۔

کہ ما ہستیم(۲۸) رند و لا ابالی — مجو از ما بجز ساقی و ساغر

ایں(۲۹) راہ بغیر لا ابالی — کسی می نزود پے جمالی

پردۂ(۳۰) عشق جز ملامت نیست — قامت عشق در سلامت نیست

تا جمالی جمالِ عشق ندید — روے دل در پلاس فقر کشید

تاکہ نامحرمش نہ بیند روے — تا خورد فاش بادہ برسر کوے

اس طرح کے اشعار کی بنا پر جامی اور جمالی دہلوی کی ملاقات کے سلسلے میں جو افسانہ تراشا گیا ہے، وہ محض بے بنیاد ہے۔

استاد ضیاء الدین سجادی نے اپنے مقالے کے آخر میں یہ لکھا ہے:

"دریں مقالہ اہمیت کار جمالی دہلوی دریں مثنوی و سایر آثارش

نمودہ شدہ و باختصار دربارۂ آنہا گفتگوے بمیان آمدہ و لے موضوع
اصلی بحث ہماں مصباح الارواح است کہ برائے نخستین بار ایں
گونہ از آں صحبت می شود۔

اس بیان میں اتنی بات ٹھیک ہے کہ مصباح الارواح پر اب تک کسی نے الگ سے کوئی مقالہ نہیں لکھا تھا اور موصوف نے چند صفحے (۲۵۵ تا ۲۶۲) میں جمالی دہلوی اور اس کی طرف منسوب اس مثنوی کا تعارف کرایا ہے لیکن انھوں نے مسئلے کو بالکل الجھا کر رکھ دیا ہے، نہ وہ جمالی اردستانی سے واقفیت حاصل کرسکے اور نہ جمالی دہلوی سے، اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اس موضوع پر جو قابل ذکر مواد بیسیوں سال قبل، مشرق و مغرب میں سامنے آچکا تھا، وہ اس سے مطلقاً واقف نہ تھے۔ ذیل میں اس سلسلے کی بعض کوششوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، تاکہ معلوم ہوسکے کہ تہران یونیورسٹی کے اس ایرانی پروفیسر کی تحقیق کا کیا درجہ ہے۔

اودھ کے کتاب خانے (۳۱) میں جمالی کے کلام کے دو حصے تھے۔ اسپرنگر نے لکھا ہے کہ جمالی کی ایک تصنیف بیان الحقائق ہے جو سات حصوں میں منقسم تھی۔ پہلی مصباح الارواح اور آخری شرح واصلین۔ یہی بیان الحقائق مع چند اور رسالوں کے جناب سجادی صاحب کے پیش نظر تھی۔ اسپرنگر بھی سجادی صاحب کی طرح اردستانی کی شخصیت سے ناواقف ہے۔ اسٹورٹ نے ٹیپو سلطان کے کتاب خانے میں مصباح الارواح کے ایک نسخے کا پتا دیا ہے۔ تفصیل اس کے یہاں نہیں ملتی۔ آکسفورڈ کے کتاب خانۂ بادلیان میں جمالی کے کلام کے یہ حصے موجود ہیں:

کشف الارواح، فضیلۃ العقل، نورٌ علی نور، قصائد و رباعیات، فہرست نگار نے انھیں جمالی دہلوی کی تصنیف قرار دیا ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بھی بیان الحقائق کے پہلے اور ساتویں حصے موجود ہیں اور امپیریل لائبریری میں حسب ذیل پانچ مثنویاں موجود ہیں:

محبوب الصدیقین، مہر القلوب، فرصت نامہ، نصرت نامہ، قدرت نامہ، پروفیسر ایوناو، اسپرنگر، زاخو اور ایتھے کی رائے کی مخالفت کرتے ہوئے آج سے پچپاسوں سال پہلے لکھ چکا ہے کہ یہ مثنویاں جمالی دہلوی کی نہیں ہیں۔ اس کا بیان ملاحظہ ہو:

جمالی جو ۹۴۲ھ تک تقریباً بیس کتابوں کا مصنف ہو، وہ ساٹھ سال بعد کیونکر اس

قابل ہوگا کہ حج کی مشقت برداشت کرے اور وہاں سے واپسی پر سیر العارفین لکھے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سیر العارفین کا تعلق عہد ہمایوں سے نہیں (حالانکہ یہ قیاس بے بنیاد ہے) پھر بھی حسب ذیل قرائن کی وجہ سے دونوں کی شخصیت الگ الگ ثابت ہوتی ہے:

۱۔ جمالی جو مذہبی مفکر تھا اور جمالی صاحب سیر العارفین کے طرز فکر میں نمایاں فرق ہے

۲۔ اوّل الذکر شیعہ معلوم ہوتا ہے جب کہ سیر العارفین کا مصنّف سُنّی اور صوفیہ سلاسل میں سلسلۂ چشت سے متعلق تھا۔

۳۔ اوّل الذکر نے صرف ایرانی مشایخ کا ذکر کیا ہے۔ ہندوستانی مشایخ سے اس کا کلام عاری ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات یہ عرض کرنے کی ہے کہ ایواناو نے جمالی دہلوی کی وفات ۹۴۲ھ کے بجائے سہواً ۹۲۲ھ لکھی ہے، دراصل ۴ کا ہندسہ غلطی سے ۲ پڑھ لیا گیا ہے۔ دوسری بات جمالی اردستانی کا تشیع ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس کا کلام اہل بیت اطہار کی مدح سے پُر ہے۔ وہ حضرت علیؓ اور سیدنا حسنین علیہ السلام سے بڑی عقیدت رکھتا ہے۔ ان حضرات کی مدح کے سیکڑوں شعر اس کے یہاں موجود ہیں لیکن اس نے کم از کم ایک جگہ حضرت ابو بکرؓ کا ذکر ایسے الفاظ سے کیا جو شیعہ حضرات کا عمومی مسلک نہیں ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے (۳۲):

> "حق تعالیٰ کہ فرمود 'یا ایہا المدثر قم فانذر' در سرّاین آیت اشارہ بصحابہ کرد۔ می فرماید کہ اے پیغمبر برخیز و نزدیکاں را بیدار گرداں و ایشاں را بہ ایمان در آور و از غبار کفرشاں پاک گرداں کہ ایشاں جوش و لباس جان تواند دینِ اسلام بمدد ایشاں قرار گیرد کہ جان بے تن قرار نہ گیرد و ازیں جہت بود کہ اوّل صدیق ایمان آورد۔ و دیگر علی مرتضیٰ علیہ السلام کہ ابوبکر از تائبان است و علی ابن ابی طالب کز متطہران است قولہ تعالیٰ (۳۴) ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطہرین۔
>
> فانذر (۳۵) ○ وربک فکبّر ○ وثیابک فطہّر ○ والرّجز فاہجر
>
> یعنی نگذار کہ امّت گرفتار اہل شوند و بار ایشاں بر دوش خود گیرد نگذار کہ ایشاں در خاکدان دنیا بماند و با تو سیر نہ کنند و اہل ایشان

را کوتاہ گرداں خصوصاً ہر کہ بتو نزدیک است و رفیق تست از بہر
آں بود کہ صدیق گلیم بردوش بست و ترک دنیا کرد کہ گوش
صدقش ایں بشنید والرّجز فاہجر

علاوہ بریں اردستانی سلسلۂ سہروردیہ سے منسلک تھے جیساکہ خود ان کے حسب ذیل بیان (۳۶) سے واضح ہے:

"اوائل کتاب روح القدس دربیان روش انبیا، است کہ شراقعیش گویند اواسط آں در بیان اہل طریقت و آخرش در شرح اہل حقیقت کہ ارباب عشق و محبت اند و ایں قسم نیز اولش مشتمل بر ذکر شیخ الاسلام شیخ شہاب الدّین عمر سہروردی قدّس سرّہ کہ شیخ شریعت است در شرح د [ ] بیان احوال شیخ زین الملت و الدّین عبدالسّلام کاموی قدس سرہ کہ پیر طریقت است و آخرش مشتمل است بر بیان ظہور حضرت پیر مرتضیٰ علی اردستانی قدّس اللہ روحہ العزیز کہ از ارباب تصوف و محبت وعشق و حقائق معرفت است و اہل معرفت ازو سیر سلوک و عاشقاں دانستند"

شیخ شہاب الدّین سہروردی کی شخصیت اتنی معروف ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ شیخ زین الدّین عبدالسّلام کاموی (۳۷) شیخ کے تربیت یافتہ تھے۔ چنانچہ اردستانی نے آخر الذکر کے عرفان اور کسب فیوض کا ذکر متعدد جگہ کیا ہے (۳۸)

ازاں قطب عالم شہ سہرورد — درِ علم بکشود بر زین فرد
چو شد در کمالات بے مثل و طاق — فرستاد شیخش بسوئے عراق

ضمناً ذکر ہے کہ شیخ زین الدّین عبدالسّلام کاموی کے نام سے شیخ اسماعیل بن عبدالمومن بن ابی منصور اصفہانی نے کتاب العوارف کا ترجمہ ۶۶۵ ہجری میں کیا اس ترجمے کو راقم نے ایک تفصیلی مضمون کے ذریعے روشناس کرایا ہے۔ اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۸۹۰ھ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

ان وجوہ سے یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ جمال الدّین اردستانی سُنّی تھے گو انکی تفضیلیت بھی اسی طرح نمایاں ہے۔

آج سے ۲۶ سال قبل راقم نے ایک مضمون بعنوان "خسرو ثانی شیخ جمالی دہلوی" اردو ادب (جولائی تا ستمبر ۱۹۵۳ء) میں شایع کیا تھا۔ اس میں جمالی اردستانی کی منظومات کے جمالی دہلوی کی طرف انتساب کو غلط بتایا تھا۔ اگرچہ اس وقت میرے پیش نظر نہ جمالی اردستانی کا کلیات تھا اور نہ جمالی دہلوی کے کلّیات نسخۂ رام پور تک میری رسائی تھی۔ پھر بھی میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جمالی اردستانی کی تصانیف جمالی کی طرف منسوب نہیں ہوسکتیں۔ اس وقت میرے قیاس کی بنیاد یہ تھی:

یہ بہت مشکل سے تسلیم کیا جاسکے گا کہ ۸۶۶ھ میں شیخ جمالی دہلوی صاحب تصنیف ہوسکے گا، ساتھ ہی تصوف میں اس قدر پختہ ہوجائے گا کہ اس کے اہم مسائل شعر کے ذریعے عام کرسکے گا۔ جمالی نے لکھا ہے کہ وہ شیخ سماء الدین سے رن تھنبور میں مرید ہوا جب ان کی عمر ۶۵ سال سے زاید ہوگی۔ اگر شیخ کی عمر ۱۰۰-۹۰ سال کی سمجھ لی جائے تو چونکہ ان کا انتقال ۹۰۱ ہجری میں ہوا تو ان کی پیدائش ۸۰۱ھ یا ۸۱۱ھ میں ہوئی ہوگی اور رن تھنبور کا قیام ۸۷۶ھ کے بعد کا ہوگا۔ گویا جس زمانے میں جمالی دہلوی صاحب تصانیف بتایا جاتا ہے۔ ابھی تصوّف کے اعتبار سے طفل مکتب ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیخ جمالی کے ایک بیٹا (۳۹) ۹۲۳ھ میں پیدا ہوا۔ اگر ۸۶۶ھ میں ان کی عمر ۳۰ سال فرض کرلی جائے (کیونکہ اس سے کم عمر کا آدمی صاحب تصانیف کثیرہ نہیں ہوسکتا) تو ۹۲۳ھ میں وہ ۸۷ سال سے کم نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمر توالد وتناسل کے لحاظ سے زیادہ ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اخبار الاخیار میں ہے کہ شروع شروع میں نام کی رعایت سے جلالی تخلص کرتے تھے، پیر کی ہدایت سے جمالی کردیا۔ اس لیے اگر یہ جمالی کی ابتدائی تصانیف ہیں تو ان میں جلالی تخلص ملنا چاہیے۔

آخری بات یہ کہ ۸۶۶ھ اور ۸۷۶ھ کے درمیان ۲۶ کتابیں لکھ ڈالیں اور ۸۷۶ھ اور ۹۴۲ کے درمیان صرف چند کتابیں، اس کی کوئی معقول توجیہ نہیں۔

اس مضمون کے تقریباً ختم ہونے کے بعد مجھے کتاب خانۂ مجلس کے کلّیات جمالی اردستانی کا علم ہوا، جس کا ابن یوسف شیرازی نے تعارف کرایا۔ اس کتاب خانے میں جمالی کی ۱۴ کتابوں کے علاوہ قصاید، مستزادات، غزلیات، رباعیات اور مفردات وغیرہ کا کافی حصہ موجود ہے۔ فہرست نگار کے نزدیک یہ جمالی اردستانی (۴۰) کی تصانیف ہیں۔ وہ جمالی دہلوی

(۳۱) سے واقف ہی نہیں معلوم ہوتے۔

رسالۂ معارف اعظم گڑھ ۱۹۰۹ء کے چار شماروں میں (فروری تا جون) ڈاکٹر ظفر الہدیٰ مرحوم کے مقالے کا ترجمہ "جمالی لودی اور مغل دور کا شاعر" کے نام سے شائع ہوا۔ مترجم جناب سلطان احمد صاحب ہیں۔ اس کے تیسرے حصے میں "مثنویات جمالی" کے نام سے جمالی اردستانی کی پانچ مثنویوں یعنی مصباح الارواح، شرح الواصلین، محبوب الصدیقین، مہر القلوب، اور کشف الارواح کا کسی قدر تفصیلی اور پانچ مختصر مثنویوں یعنی فرصت نامہ، نصرت نامہ، قدرت نامہ، فضیلۃ العقل، اور نورٌ علی نور کا بہت اجمالی تذکرہ شامل ہے اور مضمون کی چوتھی قسط یعنی معارف مئی میں دکھلایا ہے کہ یہ منظومات جمالی دہلوی کے نہیں ہیں۔ ان کے فیصلے کی بنیاد یہ قرائن ہیں:

۱۔ بیان الحقایق لکھنے سے پہلے چوبیس مثنویاں لکھ چکا ہے۔ پس یہ کمسن سالی کی تصنیف ہے۔ سیر العارفین اس کے ۶۰ سال بعد لکھی گئی۔ اس لیے یہ دونوں ایک مصنف کی کتابیں نہیں ہو سکتیں۔

۲۔ ان مثنویات کا مصنف شیعہ معلوم ہوتا ہے۔ جمالی دہلوی سُنّی تھا۔

۳۔ ان مثنویات کا پلان اور انداز بیان جمالی دہلوی کی دونوں مثنویوں سے مختلف ہے۔

۴۔ مہر و ماہ اور مرآۃ المعانی جو جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں، دلکش انداز میں ہیں۔ مثنویات بالا کا انداز ایسا نہیں۔

۵۔ مثنویات کے نثری حصے کا سیر العارفین سے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں دو مصنفوں کے تراوش خامہ کا نتیجہ ہیں۔

مگر مضمون نگار طے نہیں کر سکے ہیں کہ یہ مثنویات کس جمالی کی ہیں وہ جمالی اردستانی سے ناواقف ہیں۔ بہر حال ان کی یہ بات صحیح نہیں کہ وہ شیعہ تھا۔ البتہ دونوں کے دوروں کا فرق اور دونوں کے انداز بیان میں تفاوت کا ذکر قبلاً ہو چکا ہے۔ مضمون نگار نے جمالی (اردستانی) کی گمشدہ مثنویوں کے نام خود جمالی کی دی ہوئی فہرست کی بنیاد پر لکھے ہیں۔ یہ وہی مثنویاں ہیں جن کے مختلف نسخوں کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ ان میں اب کوئی گمشدہ نہیں۔

مقالہ ختم کر چکا تھا کہ جمالی کی مثنوی مہر و ماہ کے مطبوعہ نسخے (۱۹۷۴ء) کا فاضلانہ مقدمہ جو پیر حسام الدین راشدی صاحب کے تراوش خامہ کا نتیجہ تھا نظر سے گذرا۔ اس میں

انھوں نے جمالی کی طرف منسوب چند مثنویوں کا نام درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا انتساب جمالی دہلوی کی طرف غلط ہے۔ ان کے نزدیک وہ جمالی اردستانی کی ہیں اس سلسلے میں انھوں نے حسب ذیل دلیلیں پیش کی ہیں :

۱۔ دونوں کے افکار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

۲۔ منسوب مثنویوں کا مصنّف جمالی شیعہ۔ جبکہ جمالی دہلوی سُنّی تھا۔

۳۔ جمالی دہلوی کی عمر ۸۰ سال فرض کرنے کے باوجود ۸۶۶ھ میں جو منسوب مثنویوں کا سال اتمام ہے، اس کی عمر ۳ سال کی ہوگی۔

۴۔ جمالی دہلوی کا شروع کا تخلص جلالی تھا، وہ ان مثنویوں میں نہیں ملتا۔

۵۔ ۸۶۶ھ اور ۸۷۶ھ کے درمیان چھبّیس کتابیں ملتی ہیں اور بعد کی طویل مدت میں صرف چند ہی کتابیں ہیں۔

۶۔ سیر العارفین میں ہندوستانی صوفیوں کا نام ہے۔جو جمالی کی دوسری تصانیف میں بالکل ناپید ہیں۔ یہ سب دلائل وہی ہیں جو گذشتہ صفحے میں بحث میں آچکے ہیں، بہر حال یہ مُسلّم ہے کہ یہ جمالی شیعہ نہ تھا۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ پیر صاحب نے اپنے مقدّمے میں پروفیسر سجّادی کے مقدّمے کا ذکر کیا ہے اور ان کے قیاس کو غلط ٹھہرایا ہے۔:

جمالی کی منظومات کا جو مجموعہ پروفیسر ضیاءالدّین سجادی کے مطالعے میں تھا اس کا مخطوطہ پیرس کا ہے (بلوشہ ۱۰۵۰) اس کا عکس تہران یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے اور اس کا مختصر ذکر فضل اللہ جمالی اردستانی دہلوی کے نام سے ایرج افشار نے فہرست مائیکرو فیلمہاے کتابخانۂ دانش گاہ تہران میں کیا ہے۔ دراصل یہاں جمالی دہلوی اور جمالی اردستانی دونوں کو ملادیا گیا ہے، البتہ سعید نفیسی کے ایک نسخے کے ذیل میں شرح الکنوز اور میزان الحقایق کو جمالی اردستانی کی تصنیف قرار دیا ہے۔

یہ مختصر تاریخ ہے جمالی اردستانی اور جمالی دہلوی کی شخصیات کے سلسلے کی کوشش کی، مگر پروفیسر سجادی کے پیش نظر صرف پیرس کے مجموعے کا عکس تھا، بقیہ مواد ان کی دسترس میں نہ تھا، تعجب اس پر ہے کہ تہران میں اس سلسلے میں جو کام ہوا وہ اس سے بھی ناواقف ٹھہرے، بہرحال اگر ان کو تھوڑا سا اور مواد مل جاتا تو ان کے مقالے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

سجّادی صاحب نے اپنے مقالے کی خاور شناسوں سے داد چاہی ہے اور مزید اس بنا

پر کہ مجھے مصباح الارواح اور دوسری کتابوں کو جمالی دہلوی کی تصانیف ہونے میں تامل تھا اور اس سلسلے میں میرا مضمون نکل چکا تھا، میں نے اس موضوع پر اظہار خیال کرنا ضروری سمجھا۔

جمالی اردستانی تحقیق ادبی کا دلچسپ موضوع ہے مگر یہ کافی مشکل موضوع ہے اور صرف اس شخص کے بس کی بات ہے جو فارسی کے علاوہ تاریخ اور علوم اسلامی میں کافی دستگاہ رکھتا ہو۔

حواشی

(۱) یہ مقالہ جشن نامہ ج ۲ مشتمل خطبات و مقالات مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۱۹۷۶ء میں شامل ہے ص ۲۵۵ تا ۲۶۲

(۲) مقالے میں ان کا نام شروع میں حامد بن خضر اللہ کئی بار درج ہوگیا ہے۔ واضح رہے کہ خضر اللہ کتابت کی غلطی ہے، فضل اللہ ہونا چاہیے۔

(۳) دراصل نثر کے ذکر سے صرف نظر ہوا ہے۔ اس سے دھوکا ہوسکتا ہے کہ اس میں نظم ہی نظم ہے مگر ایسا نہیں، جگہ جگہ نثر کی عبارتیں آ گئی ہیں، جمالی کی اکثر تصانیف کی یہی خصوصیت ہے۔

(۴) خود اردستانی کے ایک بیان میں اشعار کی تعداد پانچ ہزار بتائی گئی ہے۔

(۵) اس میں ہندوستان کے حسب ذیل ۱۴ مشائخ کا تذکرہ ہے۔ حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ، شیخ بدر الدین محمود، شیخ بہاء الدین زکریاؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، شیخ صدر الدین عارفؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، شیخ رکن الدین ابو الفتحؒ، حضرت نجیب الدین متوکلؒ، شیخ حمید الدین ناگوریؒ، حضرت جلال الدین تبریزیؒ، شیخ نصیر الدین اودھیؒ، سید جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ، شیخ سماء الدین دہلویؒ۔ بعض نسخوں میں تعداد میں کچھ کمی بیشی ہے۔

(۶) اردستان، کاشان اور اصفہان کے درمیان ایک قصبہ ہے۔ اصفہان سے ۱۸ فرسخ اور زوارہ سے دو فرسخ دور ہے۔ لغت نامۂ دہخدا میں جمالی اردستانی، جمالی دہلوی سے الگ قرار دیا گیا ہے۔

(۷) راقم نے ۱۹۵۴ء میں جمالی دہلوی پر ایک مضمون اردو ادب میں شائع کیا تھا اس میں جمالی دہلوی کو جمالی اردستانی سے الگ شاعر قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس وقت مواد کی قلت کی وجہ سے بحث کا انداز دوسرا ہے۔ آگے اس مقالے میں پرانے مضامین کا حوالہ آیا ہے۔

(۸) کتابخانۂ مسلم یونیورسٹی فارسی نمبر ۳/۷۰ ۲۹۰ ۔ ۲۰ سطری اشعار دو کالم میں ۔ ورق تقریباً ۲۸۰ خط نستعلیق خوب ۔ تاریخ کتابت ندارد ۔

(۹) مجموعۂ رسائل پیر جمالی، مسلم یونیورسٹی لائبریری فارسی ۳/۷۰ ۲۹۰ کنز الدقایق وغیرہ ورق ۲۶۲۔

(۱۰) ورق ۲۳۷ ۔ الف

(۱۱) ورق ۱۷۱ ۔ الف

(۱۲) ورق ۶۷ ۔ الف

(۱۳) سماع الدّین دہلوی پر راقم نے ایک مقالہ لکھا تھا جو معارف جنوری اور فروری ۱۹۵۵ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا ۔

(۱۴) مجموعۂ رسائل ورق ۲۲۰ ب۔ اس کے پہلے کے ابیات میں مرآت ۔ کنز الدقائق، روح القدس، تنبیہ، محبوب، غزل، قصیدہ، مستزاد حقایق، کشف اور مصباح کا نام آیا ہے۔

(۱۵) مجموعہ ورق ۲۶۳

(۱۶) ورق ۲۷۰

(۱۷) ورق ۲۷۰ ۔ ب

(۱۸) ورق ۲۳۶ ۔ ب

(۱۹) ورق ۲۶۷ ۔ الف

(۲۰) دیکھیے اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۳ء، صفحہ ۱۵۵، نیز اردو ادب ستمبر ۱۹۵۴ء، ص ۱۳۷ بعد

(۲۱) صفحہ ۲۲۹-۲۲۸

(۲۲) ج ۱ ص ۳۱۰۔

(۲۳) مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے میں جمالی اردستانی کا جو مجموعۂ رسائل ہے اس میں مرآت الافراد آخری رسالہ ہے ۔ ورق ۲۲۷ سے شروع ہو کر ۲۷۵ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ

اہم نثری تصنیف ہے جس میں عارفانہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے رسالوں کے علاوہ متعدد نجی خطوط شامل ہیں۔ ان میں مصنّف کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں کافی مواد موجود ہے۔ اس رسالے کا آخری حصّہ رسالہ فی تنبیہ السلاطین ہے۔ اس کتاب میں مثنوی کے متفرق اشعار کے علاوہ چند قصیدے شامل ہیں۔ دو قصیدے ۸۰ سے زیادہ ابیات پر مشتمل ہیں۔ متعدد غزلیں اور چند رباعیاں بھی آگئی ہیں۔ بقیہ دوسری کتابوں میں سوائے مثنوی کے اشعار کے غزل، قصیدہ اور رباعی وغیرہ کچھ نہیں ملتے یہ سارے منظومات عارفانہ ہیں جن میں عشق و محبت کی شورش بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

(۲۴) اس فہرست میں ہر کتاب کے سامنے جگہ کا نام لکھ دیا ہے جہاں کے کتاب خانے میں وہ نسخہ موجود ہے۔ پیرس کے نسخے کا عکس تہران یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی اور بوہار میں جمالی کی بعض مثنویات پائی جاتی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے کے نسخے کا ذکر ہوچکا ہے۔ نفیسی کے کتابخانے میں دو مثنویاں موجود تھیں۔ ان کا عکس تہران یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ مجلس سے مراد مجلس شورائے ملی تہران ہے اور ابن یوسف شیرازی نے جمالی کے کلیات کے تین نسخوں کا تعارف فہرست میں درج کرایا ہے۔ بوڈلین میں جو نسخہ ہے اس کا بھی ذکر وہاں کے کتاب خانے کے مخطوطات فارسی کی فہرست میں ہے۔

(۲۵) شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کے بارے میں لکھا ہے

"در محافل وار تکاب امور بغایت دلیر بود، کمتر کسے را از اکابر در مجلس فرصت سخن داد"

اس امر کی پوری تصدیق اس گفتگو سے ہوجاتی ہے جو مولانا جامی کے سامنے ہوئی تھی۔

(۲۶) نسخۂ کتاب خانۂ دانش گاہ علی گڑھ ورق ۸۰ ب

(۲۷) عرفات ج ا نسخۂ بانکی پور پٹنہ ورق ۱۹۱ - ۱۹۲

(۲۸) مجموعۂ رسائل جمالی اردستانی۔ نسخۂ کتاب خانۂ علی گڑھ ورق ۲۳۹

(۲۹) ورق ۱۰۹ - الف

(۳۰) ورق ۱۰۰ الف

(۳۱) اس بحث کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون ۔ خسرو ثانی جمالی دہلوی" اردو ادب، ستمبر ۱۹۵۳ء

(۳۲) مجموعۂ رسائل جمالی ۔ نسخۂ علی گڑھ ورق ۲۶، ب

(۳۳) قرآن سورہ ۴۳، آیت ۲۰۱

(۳۴) قرآن سورہ ۲ : ۲۲۲

(۳۵) قرآن سورہ ۴۳، آیت ۵۰۳

(۳۶) مجموعۂ رسائل جمالی اردستانی ۔ نسخۂ علی گڑھ ورق ۷۶ ۔ الف

(۳۷) شیخ زین الدین عبدالسلام کاموی کی زندگی کا یہ نہایت اہم مأخذ ہے۔ کئی سال سے راقم کو شیخ کے حالات کی تلاش تھی۔ اتفاق سے اب جاکر اس سلسلے میں کامیابی ہوئی ہے۔ اردستانی نے مرآۃ الافراد میں شیخ صدر الدین اشنوی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ درج کیا ہے۔ صدر الدین اپنے دور کے زبردست عالم اور فلسفی تھے ۔ چنانچہ اپنے علم میں غلو کی وجہ سے شہر بدر بھی کردیے گئے تھے۔ شاعر بھی تھے۔ وصّاف کے معاصر تھے چنانچہ اس نے ان کے متعلق دلچسپ اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ ان کی شاعری کا سب سے اہم مأخذ شیخ اسماعیل اصفہانی کا ترجمہ عوارف المعارف ہے۔ ان کے والد شیخ تاج الدین اشنی کے بھی کافی اشعار ترجمۂ عوارف میں محفوظ ہیں۔ اشنہ جہاں سے دونوں بزرگوں کا انتساب ہے اصفہان کاایک قریہ ہے۔اسی نام کا ایک قریہ رومیہ کے جوار میں ہے۔ جمالی اردوستانی کے بیان سے طے ہوگیا ہے کہ صدر الدین کا تعلق اصفہان والے قریے سے تھا۔ اشنہ سے اشنوی اور اشنی دونوں نسبتیں منقول ہیں۔

(۳۸) رسائل اردوستانی ورق ۴۳ ۔ الف

(۳۹) یہ بیٹا عبدالحی تھا جو کم عمری میں وفات پاگیا۔ لیکن اپنے علم و فضل کی وجہ سے کافی نام پایا۔ اخبار الاخیار میں اس کی بڑی تعریف ملتی ہے ۔

(۴۰) لغت نامۂ دہخدا میں جمالی اردستانی اور جمالی دہلوی کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے ۔ اور جمالی اردستانی کی ۱۵ مثنویوں کے نام درج کیے ہیں۔ ان میں مرآۃ الافراد کا بھی نام شامل کیا ہے جو نثری رسالہ ہے۔ گو چند قصیدے، متعدد غزلیں، دو ایک رباعیاں اور چند مختصر مثنویاں بھی درمیان میں آگئی ہیں۔ جمالی دہلوی کے پیر کا نام سما ۔ الدّین

کے بجائے بہاء الدّین درج ہو گیا ہے۔

(۴۱) ریحانۃ الادب ج ۱۰ ص ۲۸۲ میں جمالی کی تصانیف میں چند مثنویوں کے بعد اس کے دیوان قصائد و غزلیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ جمالی اردستانی اور دہلوی میں فرق نہیں کرتے۔

ڈاکٹر نذیر احمد:

کیا کتاب "مینا بازار" ظہوری کی تصنیف ہے

(تلخیص)

۔ [فاضل گرامی ڈاکٹر نذیر احمد نے معارف اعظم گڑھ کی تین قسطوں (اپریل، جولائی، اگست ۱۹۵۵ء) میں ستّر صفحات کا ایک مفصل مقالہ "مینا بازار" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں اولاً اس کتاب کے نام، عہد اکبری میں مینا بازاروں یا زنانہ بازاروں کی ابتدا، پھر جہانگیر اور شاہجہاں اور بعد کے زمانے میں اس کے تسلسل سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ رام پور اور لکھنؤ میں بھی زنانہ بازار لگتے تھے۔ دکن کے بازاروں میں سودا فروشی کا کام عورتوں کے سپرد تھا، مگر خریداروں میں مرد بھی آزادی کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ اس کا ذکر ظہوری کے حوالے سے کیا ہے جس نے برہان نظام شاہ کے نئے شہر کے بازار کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس دل چسپ تمہید کے بعد وہ اس پر روشنی ڈالتے ہیں کہ کتاب مینا بازار کا سنہ تصنیف کیا ہے اور استدلال کرتے ہیں کہ:

(الف) مینا بازار میں ظہوری کے ساقی نامے کا ایک شعر درج ہے۔ اس سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ کتاب ساقی نامہ ظہوری سے مؤخر ہے جو برہان نظام شاہ والی احمد نگر (حکومت ۹۹۹ھ تا ۱۰۰۳ھ) کے نام پر لکھا گیا تھا۔ اس لحاظ سے مینا بازار کا سنہ تصنیف ۱۰۰۳ھ کے قبل قرار نہیں پاسکتا۔

(ب) مینا بازار میں تمباکو فروش کا بھی ذکر ہے۔ تمباکو پہلے دکن میں آیا اور وہاں سے اواخر عہد اکبری میں شمالی ہندوستان لایا گیا صاحب مقالہ آثر

رحیمی کے مصنف باقی نہاوندی اور صاحب داراشکوہی کے حوالوں سے دل چسپ تفاصیل دے کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شمالی ہند کے بازاروں میں تمباکو کا رواج ۱۶۰۴ء کے بعد ہوا۔ کتاب مینا بازار اس سنہ کے بعد لکھی گئی ہوگی)۔

(ج) لیکن اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ مینا بازار عہد اکبری کے فوراً بعد لکھی گئی بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عہد اکبری کے بعد کسی زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی ہوگی خواہ وہ زمانہ جہانگیر، شاہجہاں یا اورنگ زیب کسی اور بادشاہ کی حکومت کا ہو، مگر اس کے قبل کا ناممکن ہے۔

زمانے کی تعیین کی اس ضروری بحث کے بعد، وہ مصنف کی تحقیق و تعیین کی طرف آتے ہیں، اور اس اختلاف سے بحث کرتے ہیں کہ اس کا مصنف ارادت خاں واضح ہے یا ظہوری۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ اختلاف نیا نہیں۔ پرانے فضلاء میں بھی اس طرح کا اختلاف تھا۔ مرزا قتیل نے چار شربت میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے۔ مصنف مینا بازار کے متعلق اور بھی جو اختلاف تھے، ان کو تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کے بعد، وہ ان اختلافات پر محاکمہ کرتے ہیں، جو تحقیقِ منسوبات کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ذیل میں اس محاکمے کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ نجم الاسلام]

محاکمہ:

اب وہ دلائل بیان کیے جاتے ہیں جن کی بناء پر کسی ایک مصنف کے موافق فیصلہ کیا جاسکے۔ میرے (ڈاکٹر نذیر احمد کے) خیال میں حسب ذیل قرائن ایسے ہیں جن کی بناء پر مینا بازار وغیرہ (پنج رقعہ، حسن و عشق) کو ظہوری کی تصنیف ماننے میں سخت تامل ہے

۱۔ ظہوری شمالی ہندوستان کبھی نہیں آیا ۔۔ جب تک کوئی مضبوط قرینہ ایسا نہ ہوگا جس سے ظہوری کی دل چسپی شمالی ہندوستان کے قلعے وغیرہ سے ثابت ہوسکے، اس وقت تک خواہ مخواہ کسی دکنی شاعر کے سر اس بازار کی تالیف کا سہرا نہیں باندھا جاسکتا۔

۲۔ کلیاتِ ظہوری کے کسی مخطوطے میں مینا بازار اور پنج رقعہ شامل نہیں۔ اس کلیات کے سات مخطوطے معلوم ہیں ۔۔۔ لیکن مینا بازار وغیرہ نہ ان نسخوں میں موجود ہیں، نہ ان میں ظہوری کا تخلص آیا ہے، نہ دکن سے متعلق ہیں اور نہ کسی تاریخ سے اس کی شہادت

بہم پہنچتی ہے، اس لیے ان کا شمار ظہوری کے مصنفات میں نہیں ہو سکتا۔

۳۔ ملک قمی ظہوری کا خسر تھا۔ دونوں ۱۵ سال تک احمد نگر میں ساتھ رہے۔ دونوں نے مشترک کتابیں لکھیں۔ اس کے بعد متعدد چیزیں ایک ہی نام سے لکھیں۔ جب ملک نے ظہوری کی سہ نثر کا جواب لکھا تو اس کی اور نثروں کا جواب بھی لکھنا قرین قیاس ہے، خصوصاً مینا بازار تو ایسی تھی کہ اس کے مقابلے میں ملک ضرور کوئی نثر لکھتا۔ لیکن اس کے کلیات میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں، اس لیے اس قیاس کو بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ مینا بازار وغیرہ ظہوری کی تصنیفات میں شامل نہیں تھیں۔

۴۔ ظہوری کی سہ نثر کے طرز میں مختلف لوگوں نے نثریں لکھیں۔ بعضوں نے تو اسی نام سے لکھیں (سہ نثر زمری، سہ نثر آصفی)، بعضوں نے اپنے ممدوحین کی تعریفیں ظہوری کی نثر دوم کی نقل میں لکھیں (بہار عظیم، نثر خیالی)۔ ان کے علاوہ بعض لوگوں نے ہو بہو سہ نثر کے طرز کا چربہ اتارنے کی کوشش کی (محمد علی ماہر مصنف گل اورنگ، ابو طیب ولا مصنف نثر ولا، ملا طغرا مشہدی در بعضے رسائل، نصیرائے ہمدانی، جلا لائے طباطبائی)۔ ظہوری کے مقلدین نے صرف سہ نثر کا چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے ... مجھے تلاش و جستجو کے باوجود کسی ایسی کتاب کا پتا نہ چل سکا جو مینا بازار کے جواب میں لکھی گئی ہو۔

۵۔ مینا بازار کے مطبوعہ نسخے ارادت خان واضح کی طرف منسوب ہیں، کم از کم چار مطبعوں (محمدی، مصطفائی، خدائی اور نول کشوری) کے نسخے میرے پیش نظر ہیں، جن میں واضح کو مصنف بتایا گیا ہے۔ اسی طرح بیشتر مخطوطات واضح ہی کے نام سے ملتے ہیں۔

۶۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ گیارہویں صدی ہجری کا لکھا ہوا کوئی نسخہ دنیا کے کسی کتاب خانے میں نہیں پایا جاتا۔ ظہوری کی وفات ۱۰۲۵ھ میں ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے اگر مینا بازار ظہوری کی ہوتی تو اس سنہ کے بہت قبل کی تصنیف ہوتی۔ ایسی حالت میں گیارہویں صدی کے آخر تک اس کے کسی نسخے کا نہ پایا جانا، اس کے ظہوری کی تصنیف ہونے کو بالکل مشکوک کر دیتا ہے۔

۷۔ مینا بازار کو ظہوری کی طرف منسوب کرنے والے مصنفین میں خان آرزو کے علاوہ حسب ذیل فضلاء ہیں۔ ٹیک چند بہار، علی ابراہیم خاں خلیل، عبدالرزاق سورتی، غیاث الدین، صہبائی، محمد بادشاہ ان میں سے بہار، غیاث الدین اور محمد بادشاہ لُغت نویس ہیں۔ ان کا بیان کسی تحقیق کی بناء پر نہیں ہے بلکہ جو بات مشہور ہوتی ہے لُغت نویس اسے اپنے

یہاں درج کرلیا کرتے ہیں ..... ابراہیم خلیل اہم مصنّف ہے مگر اس سے بھی ظہوری کی تصنیف کے متعلق بڑی سخت غلطی ہوئی ہے ..... مولانا صہبائی کی علمی فضیلت سے بھی کوئی انکار نہیں ہوسکتا ... مگر ان کی تحقیق آج کل کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی، اس لیے ظہوری کے سلسلے میں ان سے بھی کئی غلطیاں ہوئیں۔ ان کے برخلاف مینا بازار کو ظہوری کی تصنیف نہ ماننے والوں میں قدیم تذکرہ نویسوں کے علاوہ چند محقق بھی شامل ہیں۔ جنھوں نے معقول وجوہ کے ساتھ اپنا خیال ظاہر کیا ہے، خصوصاً مرزا قتیل اور غالب ... اور ان کی ہم نوا قدیم مصنفین کی بھی ایک جماعت ہے، اس لیے انکا قول زیادہ وقیع ہے۔

۸۔ ظہوری ایسے بازار سے واقف تھا جس کی تفصیل مینا بازار پر صادق نہیں آتی۔ احمد نگر کے ایک بازار کا ذکر ساقی نامے میں پایا جاتا تھا ... بیجاپور میں بھی بازار لگتا تھا اور اسد بیگ نے اس بازار کے چشم دید حالات لکھے ہیں ... بیجاپور کے اس بازار میں شمالی ہند کے زنانہ بازار کی طرح گُل فروش، تنبولی، اور سبزی فروش کی دو کانوں کا نہ ہونا بتاتا ہے کہ مینا بازار کا مصنّف ظہوری سے مختلف ہے۔

۹۔ ظہوری کی تینوں نثریں جو تین دیباچوں (دیباچۂ نورس، دیباچۂ گلزارِ ابراہیم دیباچۂ خوانِ خلیل) پر مشتمل ہیں، بڑے وقفے کے درمیان لکھی گئی ہیں۔ (از روے تحقیق بالترتیب ۱۰۰۵ھ، ۱۰۰۷ اور ۱۰۱۳ھ میں)۔ مینا بازار عہد اکبری کے خاتمے کے بعد ہی لکھی جاسکی ہوگی، یعنی اس کتاب کی تکمیل ۱۰۰۵ھ کے قبل نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ ظہوری کی تصنیف ہوتی تو یہ دیباچۂ خوانِ خلیل (۱۰۱۳ھ) کے کچھ ہی زمانے کے بعد کی ہوتی۔ ظہوری نے دیباچۂ خوانِ خلیل میں نورس پور کے بازار کے ضمن میں ساقی نامے کے وہ اشعار درج کیے ہیں جو برہان نظام کے نو تعمیر شہر کے موقع پر لکھے گئے ہیں ... جب نورس پور کے بازار کے لیے ساقی نامے کے اشعار جو تقریباً ۱۲ برس قبل نظم ہوئے تھے، لیے گئے تو پھر مینا بازار میں جو اسی زمانے میں لکھی گئی یہ اشعار کیوں نہیں نقل کیے گئے؟ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مینا بازار اور سہ نثر کے مصنّف کے طبائع میں بڑا فرق ہے۔

۱۰۔ ظہوری اپنی تمام تصانیفِ نظم و نثر میں اپنی شخصیت کو پوری طرح نمایاں کردیتا ہے لیکن زنانہ بازار کے مؤلف نے ہر چیز پر بڑا سخت پردہ ڈال رکھا ہے، نہ تخلص آیا ہے، نہ کسی ممدوح کا ذکر ہے، نہ کسی اور جگہ کا نام ملتا ہے، نہ زمانے کی طرف اشارہ ہے، اس لیے جب تک کوئی خاص وجہ نہ بتائی جائے، یہ کیوں کر مانا جاسکتا ہے کہ مؤلف مینا بازار اور

ظہوری، جن کے مزاج میں نمایاں فرق ظاہر ہوتا ہے، ایک ہی شخص ہیں۔

شہادتِ کلام:

اوپر دکھایا جاچکا ہے کہ واقعاتی و خارجی شہادت کی رو سے مینا بازار ظہوری کی تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ اب اس کے دوسرے اہم پہلو یعنی شہادتِ کلام سے بحث کی جاتی ہے یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی رہنمائی میں ہم کسی قطعی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔

جس طرح انسان شکل و صورت، رنگ و بو، اخلاق و طبائع میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی طرح اظہار خیال اور ادائے مطلب میں ایک دوسرے سے متفاوت ہیں۔ اگر ایک ہی عہد کے دو انشاپرداز لیے جائیں تو ان دونوں کے ادائے مضمون، انتخاب الفاظ اور اسلوب کلام میں نمایاں فرق ہوگا۔

ہر مصنّف خواہ وہ کسی پائے کا ہو، الفاظ کا ایک خاص ذخیرہ رکھتا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے مطالب ادا کرتا ہے۔ اس ذخیرے میں بعض الفاظ و تراکیب، محاورات، کنایات، تشبیہات، استعارات، صفات مصنف کے نزدیک زیادہ مقبول و مطبوع ہوتے ہیں، اس لیے وہ ان کا استعمال بالارادہ یا بلا ارادہ زیادہ کرتا ہے اور وہ اس کے روز مرّہ میں داخل ہوجاتے ہیں، جس طرح ایک مُصوّر کسی شخص کی ظاہری شکل و صورت اور خدوخال رنگوں کے ذریعے دکھا سکتا ہے، اسی طرح ایک محقّق یا ناقد کسی مصنّف کے ان تمام خصائص کی جو اس کی تصنیف کے خصوصی خدوخال ہیں سراغ رسانی کرسکتا ہے۔

اس لیے اب ہم سہ نثر اور مینا بازار کے خصوصی خدوخال کے موازنے پر بحث کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذیل کے معروضات قابل توجہ ہیں:

۱۔ ظہوری کی تصنیفات میں حمد و نعت کا باقاعدہ التزام ہوتا ہے، چنانچہ سہ نثر کی تینوں نثروں میں جو بطور دیباچے کے ہیں، حمد و نعت موجود ہے۔ اس کے برخلاف زنانہ بازار (مینا بازار) کا مؤلف حمد و نعت کے بغیر زنانہ بازار کی آرائش کی خوش خبری سے اپنی کتاب شروع کرتا ہے ... کیا اس سے دونوں مصنفین کے طبائع کا اختلاف ظاہر نہیں ہوتا۔

۲۔ ظہوری سہ نثر کی تینوں نثروں کے خاتمے میں بڑے التزام کے ساتھ دعائیہ فقرے لکھتا ہے جن میں بڑی ندرت و لطافت ہے۔۔ اس کے مقابلے میں مینا بازار کے خاتمے کی عبارت "دعا گفتم" کے فقرے پر تمام ہوتی ہے۔ ظہوری کی تینوں نثروں میں لفظ "اختتام" موجود ہے جو مینا بازار میں نہیں پایا جاتا۔ ظہوری کی تینوں نثروں کا خاتمہ اشعار ہی پر ہوا ہے،

مینا بازار میں اشعار سرے سے مفقود ہیں۔

۲۔ ظہوری ہر نثر کے ساتھ اتنی نظمیں شامل کرتا ہے کہ بعض اوقات نظم کا حصہ زیادہ ہوجاتا ہے، بالعموم وہ ہر موقع کے لیے تازہ نظمیں کہتا ہے ..... وہ نظم شامل کرنے کا ایسا عادی ہوچکا ہے کہ پرانے اشعار کو شامل کرکے اپنے ذوق کو پورا کرتا ہے۔ غالب و صہبائی کے درمیان (مینا بازار کے مصنّف کے اختلاف کے مسئلے پر) جو مکالمہ ہوا تھا، اس میں غالب نے اسی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔

۳۔ مینا بازار میں صفت در صفت اور مضاف در مضاف کی حسب ذیل صورتیں قابل توجہ ہیں

(الف) لفظ مفرد یا مرکب اور اس کی صفت لفظ مرکب۔ پھر ان کی صفت ایک دوسرا لفظ مرکب

○ عصمتیان روپوش، حیا پرور (ص ۲)

○ زنانہ بازارے ملایک نظر فریب، دل نشین تمام (ص ۲)

(ب) لفظ مفرد موصوف، صفت لفظ مرکب، مجموعہ موصوف ایسی صفت کے ساتھ جو تین لفظوں سے بنا ہو جن میں پہلا مضاف، دوسرا مضاف الیہ، تیسرا مضاف اور آخری دونوں مضاف الیہ بھی ہوں

○ گلزار جاوید بہار غیرت روضۂ رضواں (ص ۴)

(ج) تین مضاف کی مثال ملاحظہ ہو

○ بہاے گوہر اشک بے دلاں

(د) تین مضاف اور ایک صفت موصوف کی مثال

○ گاہ تماشاے گوہر آبدار غلطاں (ص ۹)

(ہ) چار مضاف کی مثال

○ کمر شکستہ ہزار کوہ یاد حسرت او

(و) تین مضاف مذکور ایک مضاف متصل یا محذوف مع ایک فک اضافت

○ رخسار نور پاش لعل شب چراغش (ص ۱۰)

(ز) چار مضاف اور ایک صفت موصوف کی مثال

○ رشک فزاے تجلّی کدۂ طور دیدۂ نابینا مادر زاد (ص ۱۰)

(ح) ایک اسم موصول اور چار صلہ جو اسم فاعل واقع ہوئے ہیں

○ آن یاقوت لب، گوہر دندان، مرجان پنجہ، صدف دہاں (ص ۷)

ظہوری کے یہاں "ج" کی ایک مثال اور "الف" کی بھی چند مثالیں مل جائیں گی، مگر بقیہ اور کی مثالیں نہیں پائی جاتیں

"الف" کی مثال: رخسار یوسف طلعتاں نمرود نخوت (ص ۲۲)

"ج" کی مثال: قانون سخن تار نفس (ص ۲۳)

کیا اس بیّن فرق کے بعد دونوں مصنّفین الگ الگ نہیں ہیں؟

۵۔ ظہوری کی سہ نثر میں تکرار لفظی (بمعنی کثرت) کی مثالیں حسب ذیل ہیں

دیباچۂ اول: خمن خمن (ص ۷)، چمن چمن (ایضاً)، باغ باغ (ص ۱۳)، مصر مصر (ایضاً)، سطر سطر (ص ۱۹)، صفحہ صفحہ (ایضاً)

دیباچۂ سوم: تودہ تودہ (ص ۶۹)، پشتہ پشتہ (ایضاً) خیابان خیابان (ص ۷۰)، رسالہ رسالہ (ص ۸۳)، دیباچۂ دوم میں اس کی کوئی مثال نہیں

مینا بازار میں تکرار لفظی (بمعنی کثرت) کی مثالیں ۵۰ سے متجاوز ہیں، حالانکہ اس کا حجم دیباچہ سوم کے برابر ہے اور اگر ظہوری کی نثر ہوتی تو اسی آخری نثر کے ایک سال بعد کی ہوتی۔ ظہوری کی نثر ان لفظی رعایات (تکرار لفظی کی پچاس مثالوں) کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتی۔

۶۔ سہ نثر میں ظہوری نے ایک جگہ ایک فقرہ لکھا، اس کے برابر وہی فقرہ بالعکس استعمال کر دیا ہے۔ وہ فقرہ یہ تھا "سخن تیغ، تیغ سخن (سہ نثر ص ۱۰)۔ صاحب مینا بازار کو یہ صنعت اس قدر مرغوب ہے کہ اسے گیارہ جگہ استعمال کر ڈالا۔ تجمل حسن، حسن تجمل (ص ۹)، گوہر بہا، بہائے گوہر (ص ۸)، خیال وصال، وصال خیال (ص ۱۳) ــــ ظہوری اس طرح کے تکلفات کا عادی نہیں ہے۔

۷۔ مفرد لفظوں اور ان لفظوں اور فقروں کے علاوہ جن کا تعلق نفس مضمون سے گہرا ہے، صاحب مینا بازار کے ذخیرے میں کچھ ایسی ترکیبیں ہیں جن کا وہ بار بار استعمال کرتا ہے، اور وہ اس کے روز مرّہ میں داخل ہو کر بالارادہ یا بلا ارادہ نوک قلم پر آجاتی ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی ظہوری کے یہاں نہیں آیا ہے، سبز بخت (ص ۳۵ تا ۴۳، دس بار) پشت گرمی (ص ۱۰ تا ۱۹، دو بار)، فتح الباب (ص ۳۲، ۳۳ دو بار)، بہ ہزار جاں ارزاں وصالش / بہ جاں ارزاں وصالش / متاع قیمتی وصالش (ص ۱۳، ۱۵)، قرة العین (ص ۵، چار

بار)، متاع روے دست دکاں (ص ۵، ۱۳، دو بار)، = دل (ص ۵، ۴۴ دو بار)، لعل شب چراغ / گوہر شب چراغ (ص ۲۰)، خوش قماش (تیرہ بار)، گلزار جاوید بہار (تین بار)، رستہ بازار (دو بار)، مزیّت و فوقیت (دو بار)، تنگ شکر (پانچ بار)، = گلگون (دو بار)، بساط گوہر بر چیدہ / بساط گوہر فروشی سخن بر چیدہ / بساط غریب برنگے چیدہ (ص ۸، ۱۰، ۵)، گُل رخ (ص ۱۸ تین بار)، بیرہ برداشتن (ص ۳۶، ۴۴ دو بار)، سیلان (سیلون، ص ۸ دو بار)۔

ظہوری کے یہاں جو فقرے زیادہ استعمال ہوئے ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ برکرسی نشستن (۳ بار)، ۲۔ چرب و نرمی (۲ بار)، ۳۔ بیجاگی (دو بار)، ۴۔ خز و پرنیاں (۲ بار)، ۵۔ عراق و خراسان (چار بار)، ۶۔ سرتفاخر بہ آسمان رسانیدن / کلاہ گوشۂ تفاخر بہ آسمان رسانیدن (۲ بار)، ۷۔ ابر نیسان باریدن (۳ بار)، ۸۔ نمک مائدۂ ملاحت / نمک خوان تکلم، ۹۔ تن دقیق / تن دہن / تن آشنائی، ۱۰۔ نخ لارسائی / نخ کمند / (ص ۳، ۵) ۱۱۔ خزانگی (ص ۹، ۵۳)۔

ان میں صرف ایک فقرہ "چرب و نرمی" ایک بار مینا بازار میں آیا ہے (ص ۲۳)۔

۸۔ صاحبِ مینا بازار "آگیں" اور "فرما" کے لاحقے سے لفظ بنانے کا مشتاق ہے مثلاً اس طرح کے لفظ مینا بازار میں آئے ہیں شہد آگیں، نوش آگیں، بہار آگیں، نشاط آگیں، آرزو فرما، وسوسہ فرما ... ظہوری اسم کیفیت اور حاصل مصدر کے استعمال کی طرف زیادہ مائل تھا، اس سلسلے کی حسب ذیل مثالیں قابل غور ہیں۔ بیجاگی، شعشگی، = جرگی، طرفگی، علطلی، سرگی، کتابگی، گلہ سنگی، بلند آوازگی، کمنگی، بے قرینگی، خزانگی، شگفتگی، کشادگی، پژمردگی، تازگی، وغیرہ وغیرہ۔ ان لفظوں سے بھی ان دو مصنفوں کی افتادِ طبع کے اختلاف کا پتا چلتا ہے۔

۹۔ مینا بازار کا مصنف ایک لفظ کو بڑی دور تک بار بار استعمال کرتا چلا جاتا ہے اس سے عبارت گنجلک اور نفس مضمون دشوار ہو جاتا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

(الف) ہر چند قوس قزح برو یافتن از آفتاب صفت رنگ آمیزی رابر طاق بلند نہادہ است لیک در برابر رنگینی پیش طاق تلوّن دکان رنگینش از طاق دل آسمان اُفتادہ (ص ۸)۔ اس میں "طاق" تین بار آیا ہے

(ب) یاقوت زردش یاقوت زرد آفتاب را روز بازار ..... یاقوت رنگ کشادہ" "ص ۸) اس میں "یاقوت زرد" تین بار، اور "یاقوت رنگ" ایک بار، "بساط گوہر" دو بار آیا ہے

(ج) عکس آب و تاب گوہر شب چراغش ... صفائی گوہرش را اخ (ص ۹)۔ اس

میں "گوہر" تین بار، "چراغ" تین بار اور "فروغ" دو بار آیا ہے۔

(د) مثلث او نقر ثلیث ... مثلث نوشتہ (ص ۲۴)۔ اس میں "مثلث" چار بار، "روزی" دو بار، اور "گل" بھی دو بار آیا ہے۔

(ہ) صفحہ ۳۱ پر "شیریں" پانچ بار، اور صفحہ ۳۰ پر ایک جملے میں "ریشہ" تین بار آیا ہے۔

اس طرح کی مثالیں مینا بازار میں ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن سہ نثر میں اس کی مثال خال خال ہے، اور اگر کہیں ایک لفظ دور تک لے گیا ہے تو اس میں بھی غیر معمولی لطافت و خوبی پیدا کی ہے ...

۱۰۔ ابراہیم عادل شاہ کو لفظ "نورس" سے جو شیفتگی تھی، اس کے نتیجے میں مختلف چیزوں کو یہ نام ملا، اور بالآخر خود بادشاہ "شاہِ نورس" کے لقب سے ممتاز ہوا۔ چنانچہ بیجا پوری مصنفین کے یہاں یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ ظہوری کی تحریروں میں بھی یہ لفظ اکثر ملتا ہے۔ سہ نثر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، نورس سرابستان حال نقش نورس، نورس شہریار، نورس پور، نغرۂ نورس، کتاب نورس، نورس مراد وغیرہ بار بار آئے ہیں۔ اس کے برخلاف مینا بازار میں یہ لفظ ایک بار بھی نہیں آیا ہے۔ مینا بازار میں اس کے بجائے لفظ "نور" دو جگہ آیا ہے۔ ظہوری "نورس" کو "نور" پر ترجیح دے، یہ قیاس میں نہیں آسکتا۔ اس لحاظ سے مینا بازار اور سہ نثر ایک ہی مصنف کی ملک قرار نہیں پاسکتیں۔

۱۱۔ سہ نثر میں صرف ایک لفظ ہندی الاصل "جگت گرو" آیا ہے، جو بادشاہ کا خطاب تھا۔ برخلاف اس کے مینا بازار میں پیڑہ، کھرک، کٹھل تمباکو، حقہ (بمعنی قلیان)، بوٹہ دار، چلم، تنبولی، سپاری، چونا، کتھا، اگال، بیڑہ، پان وغیرہ موجود ہیں۔ ان میں سے بعض لفظ فارسی دانوں نے بے تکلف استعمال کیے ہیں۔ ظہوری کے عہد میں بھی بعض لفظ رائج تھے، اور اس کے معاصرین کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں، اور پان، بیڑہ، اگال ظہوری نے اپنے ساقی نامے میں استعمال کیے ہیں، اور ایک نظم کی ایک بیت میں تیلی، بقال، گھی، وغیرہ کا لفظ آیا ہے، مگر یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ ظہوری نے نثر میں ہندی کے لفظ استعمال نہیں کیے ہیں، نہ سہ نثر میں، نہ رقعہ بنام فیضی میں اور نہ رقعہ بنام عماد خاں میں۔

۱۲۔ الفاظ کے استعمال میں تفاوت:

لفظ "بالا مال" دونوں میں آیا ہے۔ سہ نثر میں ایک بار مضاف کے طور پر اور دوسری جگہ اس کے بعد "از" آیا ہے۔ مینا بازار میں ایک جگہ تو مضاف ہے مگر دوسری جگہ

اس کے بعد "ب" آیا ہے۔

سہ نثر میں "غبن رفتن" استعمال ہوا، اور مینا بازار میں "غبن کشیدن"

سہ نثر میں "رستہ بازارش" کا جو فقرہ آیا ہے، اس سے وہ بازار مراد ہے جو نورس پور کو بیجا پور سے ملاتا تھا، مگر مینا بازار میں یہ فقرہ دو بار آیا ہے۔ ایک بار رستہ بازار زیبائی، دوسری جگہ رستہ بازار حسن۔ سہ نثر اور مینا بازار کے استعمال میں جو فرق ہے وہ صاحب نظر پر بخوبی عیاں ہے۔ کیا یہ چیز قابل توجہ نہیں کہ ایک ہی مصنف کے بیان میں اس طرح کے تضادات کیوں کر پائے جاسکتے ہیں ؟

۱۳۔ مینا بازار کے بکثرت الفاظ اور فقرے ایسے ہیں جو سہ نثر اور ظہوری کی دوسری تصنیفوں میں نہیں پائے جاتے۔ ان میں سے چند کی فہرست درج کی جاتی ہے: عصمتیاں، خلوتیاں، ملائک نظر فریب، مسیحان، چشمش مرساد، شبیہ شق القمر، یک نظر دیدن، مستغیانہ، یک مزہ بیرون خرامیدن، تقدس فرش، تودد، زاغ خامہ، تہ دل، بسیار از بسیار ... جوشش، دم اسد، قلم برداشتہ وغیرہ وغیرہ (فاضل مقالہ نگار نے بڑی تعداد میں الفاظ و فقرات کی نشان دہی کی ہے، پھر لکھتے ہیں کہ) ایک چھوٹی سی کتاب کے اتنے الفاظ اسی مصنف کی دوسری کتاب میں نہ آنا موجب حیرت ہے۔

۱۴۔ سہ نثر میں نثر مرجز کے بھی نمونے مل جاتے ہیں، یعنی اس کے بعض حصے کسی نہ کسی بحر میں موزوں ہوجاتے ہیں ... اس اعتبار سے بھی سہ نثر اور مینا بازار کے طرز متفاوت ہیں۔

۱۵۔ سہ نثر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے جملوں کی ساخت اور جذبات و خیالات میں ہم آہنگی ہے۔ جس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے جملے صفحہ قرطاس پر آتے رہتے ہیں۔ ہر پیرا گراف میں ابتداء میں بڑے جملے ملیں گے، مگر جوں جوں خیالات میں تیزی و روانی پیدا ہوگی، جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے جائیں گے۔ بالآخر ایسے جملے ملیں گے جن میں افعال و روابط محذوف ہوں گے۔ کبھی کبھی آخر والے جملے دو تین لفظوں پر ختم ہوجاتے ہیں جن میں افعال و روابط محذوف ہوں گے۔ کبھی کبھی آخر والے جملے دو تین لفظوں پر ختم ہوجاتے ہیں۔ اس طرح کا التزام نہ مینا بازار میں ہے اور نہ کسی اور کتاب میں۔

۱۶۔ ظہوری کی توجہ سہ نثر میں معنوی لطافت پیدا کرنے پر مرکوز ہے۔ وہ برابر اس کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے کلام میں شعریت و نشتریت پیدا کرے۔ وہ اپنی تحریر کو عمدہ طور پر

دل چسپ صنائع سے آراستہ کرتا ہے۔ لُغات سے حتیٰ الامکان بچتا ہے۔ اس کے برعکس مینا بازار کا مؤلف لُغات سے اپنی تحریر عالمانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس لیے اس میں لفظی رعایتیں، تصنّع وغیرہ بکثرت پائے جاتے ہیں (اس کے بعد چند مثالیں درج کی ہیں اور لکھا ہے کہ) یہ مثالیں جو بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش ہیں، صاف طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ سہ نثر دراصل نثر میں شعر کا بہترین نمونہ ہے۔ تنہا مینا بازار کا ذکر نہیں بلکہ اس اعتبار سے کوئی دوسری نثر اس کے ہم پلّہ نہیں ہو سکتی۔

۱۰۔ (ظہوری کی تخلیقات کے اقتباسات اور مینا بازار کے ہم موضوع اقتباسات کا مقابلہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ) ظہوری کی نثر میں جو دل آویزی ہے اس سے مینا بازار یکسر خالی ہے۔ اس لیے سہ نثر اور مینا بازار ایک ہی مصنف کی تراوش خامہ کا نتیجہ قرار نہیں دی جا سکتیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ سہ نثر کی تینوں نثریں تقریباً ۸ سال کے وقفے میں لکھی گئیں مگر ان تینوں میں بہ اعتبار طرز کوئی خاص فرق نہیں، جب کہ مینا بازار آخری نثر کے قریب لکھے جانے پر بھی بہ اعتبارِ طرز اس سے بڑی مغائرت رکھتی ہے۔

... جن مصنّفین نے مینا بازار کو ظہوری کی طرف منسوب کیا ہے انھوں نے اپنے فیصلے کی کوئی وجہ نہیں بتائی مگر مرزا قتیل نے اشارہ کیا ہے کہ ان کے فیصلے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ دونوں کے یہاں چند فقروں کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن صرف الفاظ، فقرات اور جملوں کی یکسانیت پر اس طرح کا قطعی فیصلہ غلط ہوتا ہے۔ اگر یہ معیار صحیح قرار دے دیا جائے تو ایک زبان کے سارے ادب چند مصنّفین کی ملک ہو کے رہ جائیں، کیوں کہ اس طرح کا التباس بالکل عام ہوتا ہے۔ طرزِ ادا کی یکسانیت، محاورے اور روز مرّہ کا استعمال وغیرہ البتہ فیصلہ کُن ہو سکتے ہیں اور ناظرین نے تفصیل سے ملاحظہ کر لیا کہ اس اعتبار سے سہ نثر ظہوری وغیرہ اور مینا بازار کے طرزوں میں بون بعید ہے۔ علاوہ بریں اگر مینا بازار کے چند فقرے سہ نثر ظہوری کے مشابہ ہیں تو ہمیں ان میں ایسے فقرے اور جملے مل جاتے ہیں جو عُرفی، نظیری، فیضی، ابوالفضل، طالب آملی، نعمت خاں کے یہاں بھی موجود ہیں، اس لیے اس معیار سے فیصلہ کرنا دشوار ہو جائے گا۔

... مینا بازار میں رعایت لفظی و تکرار کی کثرت، ہندی الفاظ و فقرات و محاورات کی افراط، تمباکو کی ساری تفصیلات وغیرہ اس کے تأخرِ زمانی کا پتا دیتے ہیں۔ کیا اس کے بعد یہ کہنے کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ مینا بازار ظہوری کی تصنیف ہے؟

.[مقالہ حواشی سے مزین ہے، جنھیں یہاں بہ نظر اختصار شامل نہیں کیا گیا ہے۔ تلخیص کی صورت میں بھی فاضل محقق کے اختیار کردہ منہاج تحقیق سے بخوبی تعارف ہو جاتا ہے۔ مینابازار سے ارادت خاں واضح کا تعلق ہنوز تشنۂ تحقیق ہے۔ مینابازار اور پنج رقعہ وغیرہ اس کے نام سے چھپتے رہتے ہیں، جب کہ ایک دیوان فارسی اور نثر فارسی میں تاریخ بہادر شاہی بالیقین اس کی تصانیف ہیں، جن کی مدد سے ایک مثبت نتیجے کی تلاش میں، اسلوبیاتی تجزیے اور تقابل کا عمل اسی طرح طور ارادت خاں واضح سے تعلق کے باب میں دہرایا جا سکتا ہے جیساکہ فاضل مقالہ نگار نے مینابازار سے ظہوری کے تعلق کی تحقیق میں اختیار کیا ہے اور بخوبی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مینابازار ظہوری کی تصنیف نہیں ہے۔ تلخیص نگار۔]

پروفیسر نذیر احمد:

فرہنگِ قوّاس کا ایک جعلی نسخہ

فرہنگ قوّاس جو عام طور پر فرہنگ نامہ یا فرہنگ نامۂ فخر قوّاس کے نام سے مشہور ہے، فارسی کی ایک اہم فرہنگ ہے۔ اس کا مولف فخرالدّین مبارک شاہ غزنوی ہے جس نے علاء الدین خلجی کے عہد میں (۶۹۵۔۷۱۵ھ) یہ فرہنگ مرتب کی۔ اس کی اہمیت دو اعتبار سے ہے۔ اوّل یہ کہ لغت فرس اسدی (م: ۴۶۵ھ) کے بعد یہی فرہنگ دست یاب ہے، گویا باعتبار قدامت فارسی فرہنگوں میں اس کا دوسرا نمبر ہے۔ دوم یہ کہ یہ فرہنگ ہندوستان میں لکھی گئی، چنانچہ چند الفاظ کی تشریح کے ضمن میں ہندوستانی لفظ بھی درج ہوگئے ہیں۔

فرہنگِ قوّاس کا محض ایک ناقص نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ (کرزن کلکشن نمبر ۵۱۶)۔ اس میں ۶۸ ورق ہیں، ہر صفحے میں ۱۸ سطر ہیں، خط نسخ میں ہے، سال کتابت اور کاتب دونوں معلوم نہیں۔ شروع کی چند سطریں غائب ہیں جو منقول عنہ کے نقص کی غمّاز ہیں، آخر میں چند ورق غائب ہونے کا پتا چلتا ہے۔ بخش پنجم کا آخری "گونہ" جو مصادر پر مشتمل تھا وہ پورے کا پورا غائب ہے۔ درمیان میں بعض مقام پر جگہ چھوٹی ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس نسخے پر نسخۂ ہذا کا مدار تھا، وہ بھی ناقص تھا۔ راقم الحروف نے اس نسخے کا ایک انتقادی متن مع توضیحی حواشی اور تفصیلی مقدمے کے بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب تہران سے ۱۳۵۳ شمسی میں شائع کر دیا ہے۔ کتاب تو پہلے تیار ہو چکی تھی۔ مطبوعہ متن کا حجم اصل مخطوطے سے کئی گنا ہے، اس کی تفصیل اس طرح پر ہے۔

مقدمہ مصحح ۱ تا ۴۰

متن مع توضیحی حواشی ۱ تا ۱۹۰

فہارس ۱۹۸ تا ۲۲۶

میری ایران کی چھپی ہوئی کتابوں میں یہ کتاب نہایت اہتمام سے چھپی ہے۔ فرہنگ قوّاس خالص فارسی کی فرہنگ ہے، اس میں عربی کے الفاظ شامل نہیں، اس میں پانچ

بخش ہیں ۔ بخش اول پانچ - گونوں " میں منقسم ہے۔ بخش سوم چار - گونے - پر مشتمل ہے۔ بخش چہارم میں پانچ گونے ہیں۔ ان میں پہلا اور آخری گونہ دو دو بہروں میں منقسم ہے۔ بخش پنجم نو - گونوں - میں منقسم ہے۔ ان میں نواں گونہ غائب اور آٹھویں کا آخری حصّہ مفقود ہے۔ فرہنگ زفان گویا فرہنگ قواس سے ایک صدی سے زیادہ بعد میں مرتب ہوئی۔ وہ اس فرہنگ کی پیروی میں سات بخش میں منقسم ہے اور اسی کی طرح بخش پھر گونے اور بہرے میں منقسم ہوئے ہیں۔ زفان گویا بھی خالص فارسی کی فرہنگ ہے گو اس کے بعض گونے عربی اور ترکی الفاظ پر مشتمل ہیں۔ زفان کا دیباچہ بھی قوّاس کے دیباچے کے زیر اثر خالص فارسی میں لکھا گیا ہے۔

خلاصۂ گفتگو یہ کہ میرے علم کے مطابق فرہنگ قوّاس کا یہی نسخہ معلوم ہے۔ لیکن ڈاکٹر شہریار نقوی کی فارسی کتاب " فرہنگ نویسی فارسی درہند و پاکستان " مطبوعہ وزارت فرہنگ تہران میں بھوپال کے حمیدیہ کتاب خانے کے ایک نسخے کا حوالہ درج ہے۔ اس کتاب کو چھپے ہوئے عرصہ ہوا چنانچہ اسی زمانے میں راقم نے نقوی صاحب کی کتاب پر تہران کے ایک مجلّے میں تبصرہ شائع کیا ۔ اس میں خصوصیت سے نقوی صاحب کے اس بیان کی کہ حمیدیہ کتاب خانے میں فرہنگ قوّاس کا نسخہ موجود ہے۔ تردید کی۔ میرے اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ ڈاکٹر شہریار کی توضیح سے ثابت تھا کہ یہ فرہنگ عربی فارسی الفاظ پر مشتمل تھی۔ حالاں کہ فرہنگ قوّاس کا جو نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے وہ خالص فارسی الفاظ کو حاوی ہے۔ اس میں عربی کے وہ الفاظ جو فارسی میں مستعمل ہیں۔ بالکل شامل نہیں۔ لیکن اس وقت تک مجھے حمیدیہ کتاب خانے کے نسخے کے مطالعے کا موقع نہیں ملا تھا۔ امسال (۱۹۸۳) فروری کے آخری ہفتے میں بھوپال جانے کا اتفاق ہوا، تو حمیدیہ کتاب خانے میں جو اب مولانا آزاد سنٹرل لائبریری کہلاتی ہے۔ اس نسخے کے مطالعے کا موقع نصیب ہوا، تو معلوم ہوا کہ وہ عربی کا ایک ضخیم لغت ہے۔ یعنی اس میں جو الفاظ درج ہوئے ہیں وہ سب عربی کے ہیں ۔ فارسی کے الفاظ سے یکسر صرف نظر ہوا ہے ۔ البتہ توضیح فارسی زبان میں ہے۔ غرض اس نسخے میں اور فرہنگ قواس کے اس نسخے میں جو کلکتہ میں ہے ۔ کوئی مناسبت نہیں ۔ دونوں نسخوں کا اختلاف حسب ذیل امور کے اعتبار سے ہے۔

۱۔ نسخہ کلکتہ خالص فارسی کا لغت ہے۔ جب کہ نسخہ بھوپال عربی کا لغت ہے۔

۲۔ نسخۂ کلکتہ مختصر لغت ہے۔ کل اوراق ۶۸ ہیں۔ نسخۂ بھوپال ضخیم لغت ہے۔ اس میں ۳۲۰ ورق ہیں، اور ہر صفحہ ۲۵ سطر پر مشتمل ہے۔

۳۔ نسخۂ کلکتہ کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں بلکہ موضوع کے لحاظ سے ہے، اور وہ کئی ابواب اور فصول پر مشتمل ہے جن کو نجش اور گونہ اور بہرہ کہا گیا ہے۔ نسخۂ بھوپال بہ اعتبار حروف تہجی مرتب ہوا ہے۔ اس میں ابواب و فصول کا کوئی ذکر نہیں۔

۴۔ نسخۂ کلکتہ میں معانی کی توضیح کے لیے اکثر اشعار سند میں پیش ہوئے ہیں۔ نسخۂ بھوپال اشعار سے خالی ہے۔

۵۔ نسخۂ کلکتہ ایک مختصر دیباچے سے مزیّن ہے۔ نسخۂ بھوپال دیباچے سے عاری ہے۔

۶۔ نسخۂ کلکتہ میں مؤلف کا نام دیباچے میں موجود ہے۔ نسخۂ بھوپال کے مؤلف کا نام معلوم نہیں۔ دیباچہ موجود نہیں، اس بنا پر مؤلف کے نام کا آسانی سے پتا نہیں چل سکا۔ ممکن ہے کہیں درمیان کتاب میں ضمناً آگیا ہو۔ پوری کتاب کا بغور مطالعہ ابھی نہیں ہو سکا ہے۔

ماحصل یہ ہے کہ دونوں نسخے کسی اعتبار سے مشابہ نہیں، دونوں دو فرہنگوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اس بنا پر سوال ہوتا ہے کہ ان دونوں میں اصل کون ہے اور جعلی کون، یعنی کون سا نسخہ فرہنگِ قوّاس ہے اور کس نسخے کا انتساب فخرالدّین مبارک شاہ معروف بہ فخر قوّاس کی طرف غلط ہے۔

میری تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ نسخۂ کلکتہ جو راقم کے اعتنا سے شائع ہو چکا ہے وہی فرہنگ قوّاس ہے جس کا مؤلف فخرالدّین مبارک شاہ غزنوی ہے۔ بھوپال کے اس نسخے کا عنوان فرہنگ قوّاس غلط ہے۔ کسی جعل ساز نے بعد میں جعل سازی کی ہے، اس پر غلط اندراج کر کے اس کو فخرالدّین مبارک شاہ کے نام منسوب کر دیا ہے نسخۂ کلکتہ کے اصل ہونے کی منجملہ اور دلائل کے ایک اہم قطعی دلیل یہ ہے کہ بعد کی فرہنگوں میں جو مندرجات فرہنگ قوّاس کے حوالے سے درج ہیں وہ نسخۂ کلکتہ میں موجود ہیں اور نسخۂ بھوپال میں ان کا پتا نشان نہیں۔ فخر قوّاس کے نصف صدی کے اندر ہی حاجب خیرات دہلوی نے ۴۳ھ فرہنگ قوّاس کا دیباچہ اپنی کتاب دستورالافاضل کے دیباچے میں شامل کرلیا۔ اگرچہ نسخۂ دستور الافاضل کا

ایک ورق غائب ہے۔ لیکن جو کچھ باقی ہے اس سے واضح ہے کہ قوّاس کا پورا دیباچہ اس کے یہاں تھا۔ اسی طرح زفان گویا جو ایک صدی سے زیادہ بعد میں مرتب ہوئی اس میں فرہنگ قوّاس کے مندرجات شامل ہیں۔ نسخۂ بھوپال کے جعلی ہونے کا یہی ثبوت کافی ہے کہ بعد کی فرہنگوں میں جو کچھ فرہنگ قوّاس کے نام سے درج ہے۔ اس کا اس نسخے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نسخے کے جعلی ہونے کی نوعیت صرف اس قدر ہے کہ اس کا انتساب فخر قوّاس کی طرف غلط ہے۔ یہ فرہنگ قوّاس نہیں۔ ایک جعل ساز نے بعد میں جعل سازی کی ہے اور اس پر ایسی تحریریں درج کی ہیں جن سے لوگ دھوکے میں آکر اسی کو فرہنگ قوّاس سمجھنے لگیں۔ ذیل میں وہ وجوہ درج کیے جاتے ہیں جن سے اس کا انتساب فخر قوّاس کی طرف غلط ثابت ہوتا ہے:

فرہنگ قوّاس علاء الدّین خلجی کے عہد (۶۹۵-۷۱۶ھ) کی تالیف ہے۔ اس کے مولف فخر الدّین قوّاس کا ذکر تاریخ فیروز شاہی تالیف ضیاء برنی میں اس طرح موجود ہے:

"صدر الدّین عالی و فخرالدّین قوّاس و حمید الدّین راجا و مولانا عارف وعبید حکیم و شہاب انصاری و حیدر لبتی کہ شعرای عصر علائی بودند واز دیوان عرض مواجب شاعری یافتند و ہر یکی را در نظم شیوہ و طرزی بودہ و دیوانہا دارند و نظم و نثر ایشاں بر استادی و شاعری ایشاں حاکی است۔"

محمد قاسم فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں بھی یہی عبارت درج کی ہے۔ دستور الافاضل میں حاجب خیرات نے اس کی بڑی مدح کی ہے۔ دستور ۷۴۳ ہجری کی تالیف ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ قوّاس اس سے کافی پہلے گزرا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ اس متن کی نمائندگی کرتا ہے جو فخر الدّین مبارک شاہ قوّاس کی تالیف ہے اور جو علاء الدّین خلجی کے عہد کے وزیر کے نام معنون ہے۔ بھوپال کا نسخہ جس متن کا نمائندہ ہے وہ خلجی دور سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ وہ بہت بعد کا ہے۔ اس کا مولف معلوم نہ ہوسکا۔ بہرحال اس کا خلجی دور کے کسی وزیر یا امیر سے انتساب سراسر خلاف واقعہ ہے۔ اس کے برخلاف اندرونی شہادت سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ نسخۂ بھوپال جس کتاب کی نمائندگی کرتا ہے وہ دسویں صدی ہجری سے قبل کی ہرگز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں۔

۱۔ اس میں آٹھویں صدی کی متعدد کتب اور مصنفین و شعراء کا ذکر ہے۔ جن میں سے دیوان سلمان ساوجی (م ۷۷۹ھ)، اختیارات بدیعی تالیف علی بن حسین انصاری (۷۷۰ھ)۔

شرح مخزن اسرار تالیف قوام بن رستم (۸۹۵ھ) اسی مؤلف کی دوسری تالیف بحرالفضائل (۸۳۷ھ) ہے۔ معدن المعانی تالیف حضرت مخدوم شرف الدین بن یحییٰ منیری (م ۷۸۲ھ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۲۔ اس میں نویں صدی کے متعدد تصانیف اور شعراء وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان میں سے قنیہ (نویں صدی ہجری)، مولانا جامی (۸۱۷۔۸۹۸ھ) فرہنگ شرف نامہ تالیف ۸۶۷ھ، قابل ذکر ہیں۔

۳۔ اس میں فرہنگ مؤید الفضلاء کا ذکر ہے جو بلاخمین کے بقول ۹۲۵ھ کی تالیف ہے۔

جس کتاب میں مؤید الفضلاء کا ذکر ہو، وہ دسویں صدی سے پہلے کی نہیں ہو سکتی، فرہنگ قواس اواخر ساتویں اور اوائل آٹھویں صدی کی تالیف ہے پس نسخۂ بھوپال فرہنگ قوّاس سے الگ کوئی فرہنگ ہے۔

(ب)۔ نسخۂ بھوپال میں متعدد جگہ فرہنگ قوّاس کا حوالہ درج ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فرہنگ قوّاس کے علاوہ یہ دوسری تصنیف ہے۔

نسخۂ بھوپال کے کاتب نے کہیں نہ اپنا نام لکھا ہے، اور نہ سنہ کتابت، خاتمہ کتاب پر صرف یہ الفاظ مندرج ہیں:

"تمت بعون اللہ و حسن توفیقہ"

اس کے فوراً بعد دوسرے خط میں حسب ذیل عبارت درج کی گئی ہے:

"در تاریخ جمادی الثانی (۱۰۸۰ھ) ہزار و ہشتاد و ہفت کہ وزارت صوبہ احمد آباد گجرات داشتم این کتاب استکتاب شد و بجلد رسید حررہ نظام الدّین احمد الصدیقی الحسینی عفی اللہ عنہ و عن ابویہ۔ چون تاریخ ختم نسخہ در اول نوشتہ بود درین جا نیز قلمی گردیدہ تا سن کتابت معلوم شود۔"

اسی خط میں سرورق پر یہ عبارت بھی موجود ہے:

"کتاب لغت موسوم بقوّاسی است کہ مولانا مبارک شاہ غزنوی مشہور بفخر قوّاس گفتہ۔"

ان دونوں تحریروں کو کسی جدید کاتب نے یکجا کر کے سرورق کے مقابل کے صفحے پر درج کر دیا ہے۔

ا۔ سرورق پر کسی قدر جلی خط نسخ میں حسب ذیل عبارت موجود ہے:

"در تاریخ ۔۔ کہ وزارت گجرات داشتم این کتاب استکتاب و بجلد رسید حررہ نظام الدّین احمد صدیقی الحسینی عفی عنہ و عن ابویہ۔"

یہ عبارت نظام الدّین احمد وزیر گجرات کی ہے (اصل تحریر میں تاریخ کا حصہ کچھ مٹا سا تھا، اس پر دوسرا کاغذ چپکا دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے تاریخ پڑھنے میں نہیں آتی) یہی تحریر جعلی شخص نے کتاب کے آخر میں اپنے نام سے درج کی، اس میں حسب ذیل عبارت بطور اضافہ شامل کر دی ہے۔

"چون تاریخ ختم در ورق نوشتہ بود درین جا قلمی گردیدہ تا سن کتابت معلوم شود"۔

جعلی تحریر سے ہرگز مترشح نہیں ہوتا کہ عبارت بالا اضافے کے طور پر ہے، بلکہ خود وزیر گجرات کی تحریر گردانی گئی ہے، حالاں کہ واقعہ ایسا نہیں، وزیر کی اصل تحریر جو سر ورق پر ہے اضافہ شدہ حصے سے بالکلیہ خالی ہے۔ امکان اس کا ہے کہ کٹی ہوئی تاریخ ۱۰۸۸ھ ہی ہو۔ علاوہ بریں وزیر کی تحریر اور جعلی شخص کی تحریر میں کافی تفاوت ہے۔ وزیر کا خط جلی قلم میں خوش خط اور واضح نسخ میں ہے، جب کہ جعلی شخص کی تحریر معمولی نستعلیق میں ہے اور قلم بھی خفی ہے۔

۲۔ نسخے کے پہلے ورق کے پہلے صفحے (سرورق) پر حاشیے میں دوسرا کاغذ چپکایا گیا ہے۔ جعلی شخص کی تحریر کا کچھ حصہ چپکے ہوئے کاغذ پر آگیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تحریر کاغذ کے چپکائے جانے کے بعد کی ہے۔ یہ کاغذ ۴۰۔۵۰ سال سے پہلے کا نہیں، گویا ۴۰۔۵۰ سال کے اندر یہ جعل ہوا ہے۔ سرورق کی جعلی تحریر یہ ہے:

"کتاب لغت موسوم بتوّاسیت کہ مولانا مبارک شاہ غزنوی مشہور الفخر قوّاس گفتہ"

اس عبارت میں "مشہور" "قوّاس کی "س" اور "گفتہ" چپکے ہوئے کاغذ پر آگئے ہیں جو زبان بےزبانی سے جعل ساز کی جعل سازی کا پردہ چاک کر رہے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جعل ساز کی تحریر نہ اصل کاتب کی تحریر ہے، اور نہ نظام الدّین احمد صدیقی وزیر گجرات (۱) کی ہے جن کے دور میں یہ نسخہ استنساخ ہوا۔

ذیل میں نسخۂ بھوپال کی خصوصیات مختصر طور پر درج کی جاتی ہیں:

دستی فہرست میں اس کا نمبر ۸۹، ہے۔ ۲۰۰ ورق یعنی ۴۲۰ صفحات ہیں، تقطیع

کلاں، ہر صفحہ ۲۵ سطروں پر مشتمل ہے، خط نسخ مایل بہ نستعلیق ہے، قلم متوسط ہے، نہ جلی نہ ریز، نہایت عمدہ اور روشن خط میں ہے، عنوان اور الفاظ سرخ روشنائی میں ہیں اور معانی سیاہ روشنائی میں۔ نسخہ نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے۔ حسن اتفاق سے نہایت اچھی حالت میں بھی ہے۔ صرف پہلا ورق الگ ہوگیا ہے۔ یہ نسخہ نہایت اہم ہے۔ نسخہ جس فرہنگ کے متن کی نمائندگی کرتا ہے اس کے چند خواص یہ ہیں۔

۱۔ یہ عربی کا لغت ہے۔ الفاظ کے معنی فارسی میں بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ معانی کے ذیل میں شواہد سے کلیۃً احتراز برتا گیا ہے۔

۳۔ اس میں خال خال فرہنگوں کے حوالے مل جاتے ہیں ان میں حسب ذیل فرہنگوں اور چند کتابوں کا نام تصادفاً مل گیا ہے۔

فرہنگ مؤید الفضلا	تل کے ذیل میں
فرہنگ صحاح	تدلی کے ذیل میں
دستور (شاید دستور اللغۃ)	تزئین، شوکت کے ذیل میں (ورق ۲۵۶)
تاج	توزی اور فق کے ذیل میں
دستور اللغۃ	تعاصی کے ذیل میں
قنیہ	شق اور شکران کے ذیل میں
معدن المعانی	ورق ۲۵۰
شرفنامہ (بظاہر شرفنامہ منیری)	صلیب کے ذیل میں
شرح مخزن	صلیب کے ذیل میں
اختیارات بدیعی	سرہ کے ذیل میں
شرح الموجز وغیرہ	سرہ کے ذیل میں

مولانا نور الدین جامی اور جمال الدین سلمان ساوجی دونوں کا ذکر لفظ "سلمان" کے ذیل میں ہوا ہے۔ ورق ۲۹۸ پر سلطان سکندر کا نام آیا ہے لیکن معلوم نہیں اس سے کون بادشاہ مراد ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح سے ہوئی ہے:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ہمزہ مفتوح برای چند چیز آید۔ اول برای استفہام الخ"

خاتمہ اس طرح پر ہے:

"یهتدی بالفتح و یهدی بفتح یکم و کسر سوم و بہ تشدید دال و یهدی بفتحتین و بہ تشدید دال راہ و راست می گردد واین سہ لغت مضارع اند از باب افتعال۔ الخ

تمت بعون اللہ و حسن توفیقہ"

اس کے بعد کی عبارت جعلی اور بہت بعد کی ہے اس کا ذکر عبارت بالا میں ہوچکا ہے۔

اس فرہنگ کا نام فی الحال معلوم نہ ہوسکا۔ بہرحال یہ ایک اہم لغت ہے جو عربی الفاظ کا بڑا قابل قدر ذخیرہ ہے۔ فرہنگ کی ترتیب حرف اول اور حرف آخر کے لحاظ سے ہوئی ہے۔ حرف اول باب اور حرف آخر فصل ہے۔ ترتیب میں الفاظ کے حروف کی تعداد کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یعنی دو حرفی، سہ حرفی، چہار حرفی، پنج حرفی، ششش حرفی۔

اس گزارش کا مدعا اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جو "تاریخ فرہنگ نویسی پاک و ہند" اور خود اصل نسخے کی جعلی یادداشتوں سے پیدا ہوگیا ہے۔ فرہنگ قوّاس ہندوستان میں فارسی کی سب سے پہلی فرہنگ ہے اور ایران میں بھی اس سے قبل کی ایک ہی فرہنگ یعنی لغت فرس اسدی طوسی ہے۔ اس لحاظ سے یہ فرہنگ نہایت اہم ہے۔ شہریار نقوی صاحب نے اپنی کتاب فرہنگ نویسی پاک و ہند میں اس فرہنگ کو جس کے متن کا نمائندہ نسخۂ بھوپال ہے، ہندوستان کا سب سے قدیم فرہنگ بتایا ہے۔ اس میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ فرہنگ قوّاس یقیناً سب سے قدیم فرہنگ ہے لیکن اس فرہنگ کے متن کی نمائندگی نسخۂ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ سے ہوتی ہے، نہ کہ نسخۂ بھوپال سے۔ یہ آخرالذکر فرہنگ قوّاس ہرگز نہیں۔ غالباً دسویں گیارہویں صدی کی کوئی عربی، فارسی فرہنگ ہے۔

حاشیہ

(۱) نظام الدّین احمد صوبہ دار احمد آباد گجرات اہم تاریخی شخصیت کا حامل ہے۔ اس کی یادداشت سے یہ نسخۂ مزیّن ہے جس سے اس نسخے کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ صوبہ دار کی تحریر کے نیچے دو مہریں تھیں جو مٹا دی گئی ہیں۔ بظاہر صوبہ دار کی مہریں ہوں گی۔

یہ عبارت ڈاکٹر نذیر احمد کے مقالے بعنوان "فرہنگ قوّاس کا جعلی نسخہ" کے ذیل میں ہے۔
یادداشت از نجم الاسلام:

۱۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا یہ مقالہ "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" جلد سوم، فارسی، ادب (اول)، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۱ء پر بھی بخوبی موثر ہے۔ اس تاریخ ادبیات میں فارسی لغت نگاری (۱۰۰۰ء تا ۱۵۲۶ء) پر جو مقالہ شامل ہے، اس میں فرہنگ قوّاس کو کتاب خانۂ حمیدیہ بھوپال کے اسی مجعول نسخے کے حوالے سے متعارف کرایا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ فرہنگ پانچ حصوں میں منقسم ہے، اور ہر حصہ مختلف عنوانوں کے تحت مزید چند ذیلی حصوں میں منقسم ہے، مثلاً ایک میں ذات خداوندی کا بیان ہے، دوسرا انبیاء و مذاہب سے متعلق ہے، تیسرا آسمانوں اور ستاروں، اور چوتھا عناصر اربعہ کے بیان میں ہے۔ یہ تقسیم نظم و نثر کی کتابوں کی روایتی ترتیب کی یاد دلاتی ہے۔ کتب خانۂ حمیدیہ کا نسخہ حاکم احمد آباد مولانا نظام الدّین کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ بڑی تقطیع پر مرقوم ہے۔ اس کے ۹۴۰ صفحات ہیں اور اس میں بیس ہزار الفاظ شامل ہیں۔ نسخے میں کوئی فہرست مطالب درج نہیں ہے۔ کتاب ہمزہ کے باب سے شروع ہوتی ہے۔ ہر فصل میں دو حرفی، سہ حرفی، چہار حرفی کلمات کی ترتیب مدّنظر رہی ہے۔ بعض جگہ اعراب گذاری کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے۔ کتاب میں فارسی حروف، پ، چ، ژ، گ کے لیے علیحدہ فصلیں ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ بنیادی طور پر مرتّب کی توجہ عربی کلمات پر مرکوز رہی اور فارسی الفاظ کے عام استعمال کی وجہ سے ان کی توضیح و تشریح ضروری نہیں سمجھی گئی۔ فارسی الفاظ کی جانب یہ عدم توجہ دراصل فارسی کی عام مقبولیت کی دلیل ہے، کیونکہ مؤلفین فرہنگ عام طور پر مستعمل الفاظ کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے تھے ..."

مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالشکور احسن اس مجعول نسخے کی بنیاد پر کیسے کیسے کلّیات و تعمیمات اخذ کرکے پیش کرتے گئے ہیں، حیرت ہوتی ہے۔ گو کہ انھوں نے اپنے اس تعارفی بیان کو کسی اور ماخذ کے حوالے سے قلم بند نہیں کیا ہے، اور اس کا امکان ہے کہ یہ مجعول نسخہ خود دیکھ کر

تفصیلات درج کی ہوں ۔ تاہم شہر یار نقوی کی وہ کتاب (" فرہنگ نویسی در ہندوپاکستان"
تہران ۱۳۴۱ء) ان کے مقالے کی کتابیات میں شامل ہے۔ جس کا رد ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے
مقالے میں کیا ہے۔ ا

امتیاز علی خاں عرشی:

ظہورالاسرار نامی اور مطبر کڑہ

خواجہ نظامی گنجوی رحمتہ اللہ علیہ کی مثنوی "مخزن اسرار" شہرہ آفاق کتابوں میں شمار کی جاتی ہے... متعدد اہل علم نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔

ان شروح میں سے ایک کتاب ظہورالاسرار نامی، مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں طبع بھی ہو چکی ہے، میرے پیش نظر اس شرح کا جو مطبوعہ نسخہ ہے، وہ مطبع مذکورہ میں دوسری بار جولائی ۱۸۸۵ء مطابق رمضان ۱۳۰۲ھ میں چھپا تھا۔

اس شرح کے دیباچے میں مصنف کا نام، ظہور الحسن بٹھوری بن محمد کلیم اللہ بن عظمت اللہ از اولاد سید ابوالحسن مرتضی حسن الحسینی، ظاہر کیا گیا ہے، کتاب کا نام دیباچے میں مذکور نہیں، لیکن ٹائیٹل پیج اور خاتمے میں اسے ظہورالاسرار کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، نیز یہی نام کتاب کے ہر صفحے کے بالائی گوشے میں مندرج ہے، اس نام کے پہلے جزو (ظہور) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ کتاب ظہورالحسن کی تصنیف ہوگی، لیکن سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے حسب ذیل عبارت لکھی گئی ہے:-

> "متن متین از کنز اسرار حضرت خواجہ نظامی گنجویست، و این شرح از استاد قدیم و دیرین"

بعد ازاں مصحح نے خاتمۃ الطبع میں شرح کو ظہورالحسن مذکور کی تالیف قرار دینے کے بعد تحریر کیا ہے:-

> "ہر چند، منقول عنہ این شرح کہ خیلی کہنہ زمان بود تاہم بمقامہا مخدوش، لیکن تا امکان بشری بصحت پرداختہ شد، و نیز در دیباچہ منقول عنہ بجائے نام مصنف دو سطر از آب رسیدگی بخط دیگر بود کہ اصل خط تمام منقول عنہ تفاوتی بین داشت چونکہ منقول عنہ مرسلہ مولوی محمد نورالحسن صاحب متخلص بہ ذہین رئیس موضع کرت پور ضلع بجنور۔

بہمان صورت بود، لہذا بدان حالت گذاشتہ شد کہ حقیقتش مدرک نشدہ
و نسخہ دیگر ہم دستیاب نہ گردیدہ کہ بمقابلہ اش تحقیق نام مصنف می
شد، و بسبب تبدل خط و احکاک و اثبات عبارت بجائے نام مصنف
پردہ از روے راز می کشود، اما این قدر بر زبان آوردن غیر مصلحت نبود
کہ لاریب شرح منقول عنہ از تصنیفات یکے از قدماے کاملین است
و بخیالات عالی بالاترین مگر بباعث مشکوک بودن مقام نام مصنف
احتمالی دارد کہ اظہارش قابل اشتباہ و آگہی ناظرین است و بس

(خاتمۃ الطبع، صفحہ ۲۶۸، نسخہ نمبر ۲۱۹، نظم فارسی)

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کارپردازان مطبع کو شرح مذکور کا جو نسخہ مولوی نورالحسن صاحب سے دستیاب ہوا تھا، اس میں دیباچے کے اندر مصنف کے نام کی جگہ سابق تحریر کو مٹا کر نئے خط سے پر کی گئی تھی، اور اگرچہ طرز عبارت و انداز بیان کے ماسوا روشنائی اور روش کتابت بھی اسی طرف اشارہ کر رہے تھے، کہ شرح مذکور ظہورالحسن کے بجائے کسی پرانے استاذ کی تصنیف ہے، گو دوسرا نسخہ نہ ملنے کے باعث سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی، اس لیے اہل مطبع نے جدید نام باقی رکھتے ہوئے اس شبہے کا اظہار مناسب خیال کیا۔

ظہورالاسرار کے اصل مصنف کا نام۔ خاتمے کے اس شبہے کی صداقت حسن اتفاق سے گذشتہ ہفتے مجھ پر واضح ہوئی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی تلاش اور تحقیق کے نتائج اہل علم کے روبرو پیش کر دوں، تاکہ توارد کی ایک عظیم الشان مثال گوشہ گمنامی میں پڑی رہنے سے بچ سکے، اور ارباب ذوق ظہورالحسن مذکور کے حق میں جو کبھی کے مرحوم ہو چکے ہیں، دعاے مغفرت فرمائیں۔

کتاب خانۂ ریاست رامپور میں مخزن اسرار نظامی کی شرح کے تین قلمی نسخے محفوظ ہیں۔
ان میں سے ایک نسخہ کسی نامعلوم کی تالیف ہے، بقیہ دو نسخے ایک ہی شرح کے ہیں لیکن دیباچے میں مصنف کا نام دونوں میں مختلف ہے، میں نے یہ طے کرنے کے سلسلے میں کہ ان دونوں میں سے کس نسخے کا نام درست ہے، یہ خیال کیا کہ مطبوعہ شرح کو دیکھوں، تاکہ اس شارح نے اس پیشرو شارح کی عبارت کا کوئی ٹکڑا اس کا نام لے کر نقل کیا ہو، تو کسی ایک

کتاب کے بیان کی تائید ہو سکے ۔ جب میں نے مطبوعہ نسخے کی عبارت کو پڑھنا شروع کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ میں ابھی قلمی نسخے میں بعینہ یہی عبارت پڑھ رہا تھا ۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی میں نے قلمی نسخے سے اس کا مقابلہ کیا تو ظاہر ہو گیا کہ حسب ذیل اختلافات سے قطع نظر کر لی جائے تو مطبوعہ اور قلمی شرح دونوں ایک ہی کتاب کے دو نسخے ہیں ۔

مذکورہ اختلاف حسب ذیل ہے :

۱۔ مطبوعہ نسخے میں حمد و نعت کے بعد تحریر ہے :

" اما بعد چنیں گوید ریزہ چین خانہ علمائے دہر جرعہ نوش ساغر فضلائے عصر ۔ احقر زمن ظہور الحسن بٹھوری بن محمد کلیم اللہ بن عظمت اللہ از اولاد سید ابوالحسن عریضی حسنی الحسینی غفر اللہ لہما والیہ (کذا) چوں دیدم کہ رغبت بیشتری فضلائے ، عصر وابنائے دہر الخ " (ص ۳)

یہی عبارت قلمی نسخے میں اس طرح ہے ۔

" امّا بعد چنین گوید ریزہ چین خوان علماء دہر و جرعہ نوش ساغر فضلاء عصر ، اضعف عباد اللہ القوی ، محمد بن قوام الدین بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۃ البلخی المعروف بکری غفراللہ لہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ ۔ کہ چون دیدم رغبت بیشتری از فضلاء دہرالخ " (ورق ۱ الف)

مصنف کے نام کے اختلاف کے علاوہ کتاب میں جا بجا بہت معمولی لفظی اختلاف بھی پائے جاتے ہیں ۔ مثلاً مطبوعہ نسخے میں مندرج ہے ۔

چنانکہ غواص لآلی نظم و نثر افضل العصر مولانا معین الدین بانسوی کہ درین علم و فضل بے نظیر و در معانی بیان بے بدل بودہ ، در بدائع الحکایات گفتہ " ۔ (ص ۴)

قلمی میں یہ عبارت اس طرح ہے ۔

" چنانکہ غواص لآلی نظم و نثر افضل العصر مولنا مغیث الدین بانسہ کہ در عصر بعلم و فضل بے نظیر و در معانی و بیان بے بدل بود ، در بدائع الحکایات گفتہ " ۔ (ورق ۱ ب)

لیکن ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ اختلاف لفظی کا منشا ، کاتبوں کی بے توجہی یا سہو و

نسیان ہوتا ہے اور شاید ہی کسی کتاب کا کوئی قلمی نسخہ ایسا دستیاب ہو سکے جو اسی کتاب کے دوسرے قلمی نسخے سے لفظ بہ لفظ مطابق ہو اس لیے یہ قابل لحاظ قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ پہلا اختلاف اہم ہے لیکن اس کی حقیقت صرف اس امر کے بیان کر دینے سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہمارا ایک قلمی نسخہ (نمبر ۶۰ فن پند و نصائح فارسی) ۱۰۵۵ھ کا نسخہ ہے اور اس میں مصنف کا نام محمد بن قوام الدین البلخی تحریر ہے دوسرا نسخہ (نمبر ۵۹ فن مذکور) بلا تاریخ ہے لیکن کاغذ روشنائی اور خط کے انداز سے پتا چلتا ہے کہ نمبر ۶۰ سے پرانا ہے اس میں بھی کم از کم ظہورالحسن نام نہیں ملتا۔لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی ظہورالحسن نے اصل مصنف کا نام حک کر کے اس کی جگہ اپنا نام لکھ کر کتاب کو اپنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ورنہ فی الحقیقت یہ شرح بلخی کی تصنیف ہے اور اسی کے نام سے اس کا حوالہ مخزن اسرار کی دوسری نامعلوم المصنف کی شرح میں دیا گیا ہے۔ مثلاً مولانا نظامی نعت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں ارشاد فرماتے ہیں :

تختہ اول کہ الف نقش بست　　بر در محجوبہ احمد نشست

محمد بلخی جس کی شرح ظہورالاسرار کے نام سے طبع ہوئی ہے اور اس وقت زیر بحث ہے " تختہ اول " کی شرح کرتا ہے

" تختہ " لوح محفوظ را گویند " اول کہ الف نقش بست " یعنی اول چیزے کہ قلم بر لوح محفوظ نبشت الف بود۔ (نسخہ قلمی نمبری ۶۰ ورق ۲۲۰ الف)

ظہورالاسرار میں بھی بعینہ یہی عبارت درج ہے۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ اس میں اول کہ الف نقش بست" کی جگہ " اول نقش بست " ہے۔ (نسخہ مطبوعہ صفحہ ۳۵)

نامعلوم المصنف کی شرح مخزن اسرار (نسخہ قلمی نمبر ۶۱ فن پند و نصائح فارسی) میں یہ تشریح محمد بلخی کی طرف منسوب ہے۔ اس شرح کے الفاظ یہ ہیں۔

" وانچہ در شرح محمد بلخی آوردہ کہ تختہ اول لوح محفوظ را گویند۔ یعنی اول قلم کہ بر لوح محفوظ نوشت الف بود " (شرح مذکور ورق ۹ ب)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ عبارت شرح محمد بلخی کی ہے۔ علاوہ ازیں مناجات دوم کے اس شعر کی شرح میں کہ

ہم تو پذیری کہ زباغ تو ایم　　قمری طوق سگ داغ تو ایم

شرح نامعلوم المصنف میں مندرج ہے۔

" در شرح محمد بلخی درین مقام آورده که خواجه احمد معشوق سالها دریاضت مشغول بود ۔ از ہاتف آوازی شنید که تو سگ درگاه مائی، مسرور شد ۔ بر مادر رفت و گفت ۔ مبارکباد که در چندین سال مراسگ درگاه خطاب شد ۔ گفت الحمد للہ اما مشغولی زیاده کن که مرتبه ازاں عالی ترشود " ہمچنان کرد تا " آوازے شنید که " معشوق درگاه مائی " بجرد آنکه از خلوت بیرون آمد ۔ اورا احمد معشوق میخواندند " (شرح مذکور ۔ ورق ۹ ۔ الف)

یہی عبارت باختلاف یسیر ہمارے نسخۂ شرح بلخی میں (ورق ۲۱ ۔ الف) موجود ہے ۔ اور بعینہٖ ظہورالاسرار (ص ۳۴) میں پائی جاتی ہے ۔ یہ اس بات کی دوسری روشن دلیل ہے ۔ کہ اصل میں شرح محمد بلخی کی تصنیف ہے۔

شرح نامعلوم المصنف میں اور مقامات پر بھی بلخی کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ لیکن طوالت کے خوف سے میں نقل نہیں کرنا چاہتا ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جو شرح ظہورالاسرار کے نام سے شائع ہوئی ہے ۔ اس کی عبارتیں دوسرے مصنف کی شرح میں شرح محمد بلخی کے نام سے نقل کی گئی ہیں جو ہمارے نسخہ ۔ نمبری ۹۰ کے دیباچے کی رو سے بھی محمد بلخی ہی کی طرف منسوب ہے۔

شرح بلخی کا سالِ تالیف ۔ اب یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہے ۔ کہ شرح محمد بلخی کس سنہ میں لکھی گئی اسپرنگر نے کتاب خانہ ہائے شاہ اودھ کی فہرست (ج ۱ صفحہ ۵۲۱ ۔ ۵۲۲) میں لکھا ہے ۔ کہ زیر نظر نسخے کے آخر میں حسب ذیل بیت تاریخی درج ہے جس سے ۱۰۹۱ھ نکلتا ہے

بفکر اندر شدم از بہر تاریخ   دلم گفتا زہے شرح گلستان

ڈاکٹر ریو نے فہرست کتب فارسی محفوظہ در برٹش میوزیم ۔ ج ۲ صفحہ ۷۰۳ ب) بلخی کی شرح کے ایک نسخے کی کیفیت لکھتے ہوئے اسپرنگر کے مذکورۂ بالا بیان کا حوالہ دیا ہے ۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ہمارے نسخے کے سرورق پر ایک نوٹ ہے جس میں کسی نے کتاب کی خرید کی تاریخ ثبت کی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۰۸۹ھ میں خرید ہوئی

تھی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ ہمارا نسخہ بلخی کی شرح کا پہلا نسخہ **(Recension)** ہے۔ ریو کا مقصد یہ ہے کہ اسپرنگر کی تاریخ ہے تو صحیح، لیکن وہ اس شرح کی پہلی ترتیب کی تاریخ ظاہر نہیں کرتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بلخی نے اسے ۱۰۹۱ھ سے قبل تالیف کیا تھا۔ بعد ازاں اس پر نظر ثانی ۱۰۹۱ھ میں کی۔ اس لیے برٹش میوزیم کے نسخے کو ابتدائی نسخہ قرار دینا چاہیے۔

ڈاکٹر ایتھے (فہرست کتب فارسی انڈیا آفس نمبر ۹۹۸) نے بھی اسپرنگر اور ریو کے نسخوں کے متعلق یہی طے کیا ہے کہ اول الذکر کا مخطوطہ نسخہ ثانی کی تاریخ تالیف ظاہر کرتا ہے۔ اور ثانی الذکر کی تاریخ خرید سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ شرح مذکور کی پہلی ترتیب ۱۰۸۹ھ سے قبل عمل میں آئی تھی۔

مسٹر آئی وناف نے (فہرست کتابخانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۹۶۴، مطبوعہ ۱۹۲۴ء) ۱۰۹۱ھ تاریخ تالیف تسلیم کر کے دوسری فہرستوں کے حوالے پر اکتفا کیا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر جیسے خوردہ بین نقاد نے مذکورۂ بالا الفاظ تاریخ زہے شرح گلستان کو شرح مخزن اسرار کی تاریخ تالیف کیوں قرار دیا۔ اور اس سے زیادہ تعجب ہے ریو اور ایتھے کی اس خوش اعتقادی پر کہ ان دونوں نے اسپرنگر کے بیان کو کس طرح مان لیا ان میں سے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ تو کسی شرح گلستان سعدی کی تالیف کی تاریخ ہے۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے:

خشت اول چون نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

اگر اسپرنگر کے متبعین اس کے قول کو نہ مانتے تو انھیں برٹش میوزیم کے نسخے کی تاریخ خرید کی موجودگی میں کسی تاویل کی ضرورت نہ پڑتی۔ کاش یہ محققین یورپ جن کا قلم اسلامیات کی تنقید میں شمشیر بُرّاں کا کام کرتا ہے۔ شرح کے اوراق میں تاریخ تلاش کرتے اور دیکھتے کہ خود شارح نے بھی اپنے زمانے کی طرف اشارہ کیا ہے یا نہیں؟ اگر وہ ایسا کرتے تو پیہم غلطی میں مبتلا نہ رہتے۔

شرح بلخی کے مطالعہ کرنے سے اس کی تالیف کا زمانہ ہی نہیں۔ بلکہ سال بھی معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ دوران شرح میں بلخی نے جا بجا اپنے معاصرین کا تذکرہ ایسے لفظوں میں کیا ہے جن سے ان کی معاصرت ظاہر ہوتی ہے۔ نیز ایک جگہ سلیمانی سنہ میں اور دوسری جگہ ہجری سنہ کے ذریعے سال تصنیف بھی ظاہر کیا ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اوس کے عصر سے

متعلق بیانات کا جائزہ لیں۔

ا۔ شرح کے دیباچے میں بلخی نے خواجہ نظامی کے کلام کے اشکال اور حسن قبول پر مولانا مغیث الدین بانسوی کی کتاب بدائع الحکایات کے مندرجۂ ذیل اشعار سے استدلال کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

" چنانچہ غوّاص لآلی نظم و نثر، افضل العصر مولانا مغیث الدّین بانسوی (بانسہ) کہ درین عصر بعلم و فضل بے نظیر و درمعانی و بیان بے بدل بودہ در بدائع الحکایات گفتہ:۔

بنزد شناسندۂ مثنوی	از آنہاست این نکتۂ معنوی
کہ کس گام در رتبہ سیر او	نزد، نی نظامی و نی غیر او
نظامی کہ استاد این شیوہ بود	ولش طوبی فضل را میوہ بود
بہ بسیار گفتن نگر جہد داشت	کہ آمیزش موم با شہد داشت
سخن را تصنّع بغایت نکرد	بسنجیدہ گفتن کفایت نہ کرد
ولی چون بمنطق قبولیش بود	ہمہ خار بالش رطب می نمود
خدا کردہ بودش قبولی عطا	کہ از زیر آن برنیاید خطا
خدا پردہ پوش است در ہر دلی	نمود آنچہ بودش خطا مشکلی
ولی بعض ابیات، یا نیم	کہ عقل است دروی سراسیمہ
آزان باست، حقا کہ آب حیات	شود زندہ زو گر پذیرو ممات
اگر حجم دفتر بنودی مراد	سخن را بمو دادہ بود است داد "

(صفحہ ۲ شرح مطبوع)

مولانا مغیث بانسوی یا مغیث الدین بانسہ، شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی (متوفی ۷۵۱ھ) کے معاصر ہیں۔ یہ بہت تیز طبع شاعر تھے ایک روز شیخ نصیرالدین چراغ دہلی پر قوال سے یہ شعر سن کر وجد طاری ہو گیا:

جفا بر عاشقان گفتی نخواہم کرد ہم کردی	قلم بر بیدلان گفتی نخواہم راند ہم راندی

مولانا مغیث نے یہ قصّہ سن کر ایک رسالہ لکھا جس میں اس شعر کے مطلب سے بحث تھی اور شیخ پر اعتراض کیا تھا۔ کہ انھوں نے کیوں اس لغو شعر پر سر دھنا۔

اخبار الاخیار (ص ۹۳ مطبع احمدی دہلی ۱۲۷۰ھ) میں شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے خزینۃ الاصفیا، (۳۳۳) میں مفتی غلام سرور لاہوری نے اس واقعے کو بتفصیل لکھا ہے۔

تذکرۂ مصنّفین دہلی (ص ۱۸) میں شاہ عبدالحق محدّث دہلوی نے بالفاظ ذیل مغیث کا ذکر کیا ہے:

"دور ہمان جزو زمان (عہد فیروز شاہ تغلق مراد ہے) مغیث ہانسوی نیز شخصے بود کہ بعالم فضیلت نسبتی داشت۔ در بیان صنائع و بدائع رسالہ دارد۔ اما مشہور نیست۔ و ذکر ازین مرد نیز در ذکر شیخ نصیر الدین محمود رفتہ است"۔

مولانا حکیم عبدالحی صاحب مرحوم نے نزہۃ الخواطر (ص ۱۶۹) میں مغیث کو فیروز شاہ خلجی (متوفی ۶۹۵ھ) کا معاصر قرار دیا ہے یہ سہو ہے اس لیے کہ انھوں نے اپنے بیان کی سند میں محدّث دہلوی کے مذکورہ بالا رسالے کا حوالہ دیا ہے اور اس میں مغیث کا تذکرہ مظہر کرہ کے بعد آیا ہے۔ جو بالاتفاق فیروز شاہ تغلق کے دربار کا شاعر ہے

بہرحال بلخی کو افضل العصر کا خطاب دیتا ہے۔ اور درین عصر "بے نظیر بتایا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہے کہ بلخی کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔

(۲) مخزن اسرار کے شعر:

مرکب این بادیہ دین است و بس   چارہ این کار ہمیں است و بس

کی شرح میں بلخی لکھتا ہے

"و عزیزی از خدمت شیخ الاسلام رکن الحقّ والدّین ابوالفتح قدّس اللہ سرّہ العزیز۔ سماع دارد کہ الخ"۔

(ص ۳۳۳ نسخہ نمبر ۲۰۲،۲۰۶ نسخہ نمبر نمبر ۵۹ و صفحہ ۲۰۱ نسخہ مطبوعہ)

میری رائے میں یہ شیخ رکن الدّین ابوالفتح ملتانی نہیں ہیں جنھوں نے ۷۳۵ھ میں انتقال فرمایا ہے۔ بلکہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید شیخ رکن الدین جعفر ہیں۔ تذکروں میں ان کی

کنیت مذکور نہیں اس لیے بعض بزرگوں کو رکن الدین ملتانی کنی بابی الفتح کا گمان ہوتا ہے
بہرحال شارح ان کا قول اپنے کسی دوست یا عزیز کی زبانی روایت کرتا ہے جس سے خیال کرنا بے جا نہیں کہ خود شارح ابوالفتح کے عہد سے قریب ہے اور عادۃً ایسا کم دیکھا گیا ہے کہ جو شخص کسی صدی کی ابتداء میں فوت ہو چکا ہو اس کے شاگرد دوسری آنے والی صدی میں ہوں، اس لیے یہ نتیجہ بعید از قیاس نہیں کہ شارح آٹھویں صدی میں موجود تھا۔

ان کے ماسوا شرح میں ضیاء الدّین بخشی (متوفی ۷۵۱ھ) مولانا حمید الدین قلندر (متوفی ۷۶۸ھ) احمد بن امیر خسرو اور مولانا خواجگی (متوفی ۸۱۹ھ) کا بھی ذکر ہے اور چونکہ کتاب میں کسی ایسے شخص کا حوالہ نہیں ہے جو آٹھویں صدی میں موجود نہ ہو اس لیے ہمارے اس خیال کو مزید تقویت بہم پہنچتی ہے کہ بلخی آٹھویں صدی کا عالم ہے۔

تذکرۂ معاصرین کے بعد ایسے بیانات کا جائزہ لینا چاہیے جن میں سنین کا ذکر آیا ہے
مخزن کے شعر:

ملک سلیمان مطلب، کان کجا است   ملک ہمان است سلیمان کجا است

کی شرح میں لکھا ہے۔

"از گاہ مہتر علیہ السلام تا این وقت دو ہزار و دویست و ہفتاد و یک سال گذشتہ است"

(ورق ۱۲۳ ب۔ نسخہ قلمی نمبری ۹۰ و ۱۲۲ الف نسخہ نمبری ۵۹)

شعر مندرجۂ ذیل کی شرح میں سنہ ہجری لکھا ہے:

درکف این ملک لیساری نبود   در رہ این خاک غباری نبود

"بدآنکہ درین وقت کہ از ہجرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم بمقصد و نود و پنج سال است الخ"

(نمبر ۵۹ ورق ۱۳۰ ب ص ۵۲ و صفحہ ۱۰۸ نسخہ مطبوعہ)

اس سنہ سے روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ شرح مخزن اسرار بلخی ۹۵ھ یا اس کے کچھ بعد اتمام کو پہنچی ہے۔

اب آپ ایک ستم ظریفی ظہورالحسن صاحب کی ملاحظہ فرمائیے۔ سابق اقتباس میں بلخی نے سلیمان علیہ السلام سے متعلق جو مدت ظاہر کی تھی اس میں آپ نے تغیر فرمایا ہے اور

لکھتے ہیں:

"ازاں گاہ سلیمان علیہ السلام تا این وقت یکہزار و دویست و ہشتادو پنج
سال گذشتہ است" (ص ۱۳۹)

ان کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اگر سلیمانی سنہ کو وہ جوں کا توں چھوڑ دیں گے، تب بھی اتنا حسابی ہر جگہ کہاں ہے کہ اس کی غلطی کو پکڑے انھیں تو دوسری عبارت کا سنہ ۹۵۰ھ بدلنا تھا مگر سوے قسمت سے یہ بن نہ پڑا۔ چنانچہ مطبوعہ نسخے میں یہ مقام ان کی غمازی کے لیے علی حالہ باقی ہے جس سے ایک طرف تو محققین یورپ کے بیانات کی غلطی ظاہر ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کتاب ۱۲۷۵ھ میں نہیں بلکہ اس سے صدیوں پہلے ۹۵۰ھ میں تالیف ہوئی تھی۔

بلخی کے نام کی تحقیق: شرح کے عام نسخوں میں مصنف کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ البلخی المعروف بکرئی ملتا ہے۔

صاحب کشف الظنون (ج ۵۔ ص ۴۶۶ طبع یورپ) نے صرف "بدر البلخی" لکھا ہے اسپرنگر نے مذکورہ بالا مکمل نام درج کیا ہے، مگر ایک تو "بدر خزانہ" کو نہ سمجھ کر اس کے محاذ میں علامت استفہام بڑھائی ہے، اور دوسرے ازراہ سہو المعروف بکرئی کو غلط سمجھے ہیں، اور اس لیے شارح کا عرف بکرئی بتاتے ہیں، حالانکہ ایک ادنی عربی طالب علم بھی یہ جانتا ہے، کہ حرف الباء پریپوزیشن کا کام کر رہا ہے، جزو کلمہ نہیں اصل میں اس کا عرف کرئی لکھنا چاہیے تھا،

ڈاکٹر ریو کے نسخے میں "بدر حرانہ" تھا، اس کو انھوں نے بریکٹس میں صحیح کر دیا ہے، علاوہ ازیں شارح کا عرف ان کے خیال میں کرٹی ہے، جو اغلباً ان کی قرارت کی غلطی ہے، اگرچہ امکان یہ بھی ہے کہ خود کاتب نے لکھا ہو۔

ڈاکٹر ایتے کے نسخے میں "المعروف بکرئی" مندرج ہے، اس لیے ان کو بھی وہی دھوکا ہوا، جو اسپرنگر نے کھایا تھا کہ شارح کا عرف بکرئی ہے، لیکن یہ اپنے پیشرو و ڈاکٹر ریو کا بھی احترام علمی ملحوظ رکھنا چاہتے ہیں، اس لیے اپنے اور اسپرنگر کے نسخے پر بھروسہ نہیں کرتے، اور یہ بھی آگے چل کر لکھ دیتے ہیں کہ یا جیسا کہ "ریو کے نسخے میں ہے، اس کا عرف کرٹی تھا"۔

روسی مستشرق ڈاکٹر آئیوناف نے اسپرنگر اور ایتے کا ساتھ دے کر اس کو بکرئی لکھا ہے

فہرست کتاب خانہ آصفیہ، حیدر آباد دکن (ج ص ۹۲۸) میں بھی مصنف کو "معروف بہ کرخی تسلیم کیا گیا ہے۔

کتاب خانۂ ریاست رامپور کے نسخوں میں سے جو نسخہ ۱۰۵۵ھ کا نوشتہ ہے۔ اس میں مصنف کا نام اس طرح لکھا گیا ہے۔

"محمد بن قوام الدین بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۃ البلخی المعروف بکری الخ" (ورق ۱ الف)

نسخہ نمبری ۵۹ میں یہ نام قدرے اختلاف کے ساتھ اس طرح ملتا ہے۔

"مطہر بن قوام بن رستم (بن) احمد بن محمود البلخی المعروف بکری"۔ (ورق ۲ الف)

عرف کی حقیقت: میری ناقص رائے یہ ہے کہ شرح مخزن اسرار کے مصنّف کا عرف کری یا کرئی ہے۔ نہ بکرئی اور نہ کرخی۔ اور یہ کڑہ کی طرف نسبت ہے۔ جہاں تک تاریخی ثبوت کا تعلق ہے اس سے آئندہ بحث ہوگی۔ یہاں صرف لسانی حیثیت سے یہ دیکھنا ہے۔ کہ کیا بکرئی درست ہے یا کرئی۔

ہمارے دونوں نسخوں میں اس لفظ کی کتابت ہے بکری۔ اس لیے یہ بھکر کی طرف نسبت ہو سکتی ہے اگر کاف کو شدد پڑھا جائے اور ہائے مخلوط کو بلحجۂ عربی ساقط کر دیا جائے لیکن دوسرے تمام نسخوں میں بکرئی تحریر ہے۔ اس لیے یہ قیاس نادرست قرار پائے گا۔ مزید برآں با کے اصلی ہونے کی صورت میں لازم ہوگا۔ کہ ایک بائے جارہ اور ہو؛ اور وہ کسی نسخے میں بھی نہیں۔ لہذا اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لفظ مذکور یائے نسبت اور ایسے اسم سے مرکب ہوا ہے جس میں ک، ر ضرور ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے میری دانست میں یہ کڑہ کی طرف منسوب ہے۔ جو عام طور پر پرانی تاریخوں میں کڑہ مانکپور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ الہ آباد کے قریب واقع ہے۔ اور مغلوں کے عہد تک مشہور شہروں میں گنا جاتا تھا۔

قاعدہ یہ ہے کہ ایسے اسماء کے ساتھ ی نسبت لگانے کی صورت میں جو ہ پر ختم ہوتے ہیں ہ کو ساقط کر کے اوس کے بجائے ی لکھا جاتا ہے۔ مثلاً امروہہ کی نسبت امروہوی، سامانہ کی سامانوی، ستہ کی ستوی۔ بعض اوقات ہ حذف کر دی جاتی ہے۔ مثلاً مکہ کی نسبت مکی، مدینہ کی مدنی، بنگالہ کی بنگالی، سکندرہ کی سکندری۔ لیکن پرانی کتابوں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ آخر کی

ہ کو ہمزہ سے بدل دیتے ہیں جیسے گنگوہ سے گنگوئی۔ بدایونی (ج ۲ ص ۵۰) کے یہاں نظر آتا ہے۔ اور حکیم احمد تتوی کو طبقات اکبری (قلمی ص ۲۵۴) میں تتئی لکھا ہے۔

مذکورۂ بالا قاعدے کے ماتحت لفظ کڑہ کی صحیح نسبت کڑوی ہونا چاہیے۔ چنانچہ حکیم عبدالحی صاحب مرحوم نے نزہۃ الخواطر کے صفحات ۱۱۹، ۲۴۳، ۱۶۱، ۱۸۰ اور ۱۳۶ پر کڑہ کے رہنے والے علماء کو الکروی ہی لکھا ہے۔

لیکن پرانی تصنیفات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کڑہ کے رہنے والے عالم اپنی نسبت الکروی کے بجائے الکرئی لکھا کرتے تھے۔ سردست اس بیان کی شہادت میں کتابخانہ ریاست رامپور کے دو قلمی نسخوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ کتاب ثمرۃ الفوائد فارسی (فن حدیث نمبر ۶۶) ہے۔ حمد و نعت کے بعد مصنف لکھتا ہے:

"اما بعد می گوید خاکپاء درویشان احمد محی الدین ابن سید محمد غوث المدعو بسید جیو، قدس اللہ سرہ العزیز الحسینی مجداً (۱) الکرئی مسکناً "۔

۲۔ وسیلۃ الطالبین الی محبۃ رب العالمین فارسی (اور او نمبر ۳۱) اس کا مصنف دیباچے میں تحریر کرتا ہے:

"و بعد می گوید متعلم فقیر خاکپائے صغیر و کبیر کمال عز کرئی "

مصنف کا پورا نام مخدوم کمال الدین عرف شیخ کالو ہے۔ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیخ حسام الدین مانکپوری، خلیفہ قطب العالم نور الدین احمد بن عمر بن اسعد لاہوری کا مرید ہے۔ اس لیے یہ یقیناً کڑہ مانکپور کا باشندہ تھا، جس کو اس نے الکرئی سے ظاہر کیا ہے۔

بنا بریں اسپرنگر، ایٹے اور آلو ناف کے نسخوں میں المعروف بکرئی اسی کڑہ مانکپور کی عرف نسبت قرار پائے گی۔ اور چونکہ یہ قدیم رواج کے مطابق ہے، اس لیے اس کو غلط بھی نہیں کہا جاسکے گا۔ اب الکرئی رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے کتاب خانے کے دونوں نسخوں میں ہے۔ میری دانست میں کاتب اصل کی غلطی سے الکرئی کی جگہ الکری ثبت ہوگیا ہے اور یا کتاب کے کسی نسخے میں خود مصنف نے کلی سکندری وغیرہ کے ماتحت الکری بحذف ہ آخر لکھا ہے۔

بہرحال یہ یقین ہے کہ شرح مخزن اسرار کا مصنف کرئی یعنی کڑہ مانک پور کا باشندہ ہے مگر اس کے خاندان کا اصل وطن بلخ تھا۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو "البلخی" بھی لکھتا ہے۔

لقب کی حقیقت : بدر الخزانہ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ شارح کا لقب ہے جو اصل میں بدرالدین تھا، موجودہ نسخوں کے منقول عنہ میں "الدین" کو خطی مشابہت کے باعث الخزانہ یا الخزانہ پڑھا گیا ہوگا، اسکے بعد سے یہی لفظ مروج ہوگیا۔

صاحب کشف الظنون نے صرف بدرالبلخی لکھا ہے، جس سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے، کہ بدر مصنف کا لقب ہے، اور چونکہ عربی مصنفین عام طور پر لقب سے "الدین" کو حذف کر کے اس کا پہلا جزو ذکر کر دیتے ہیں، اس لیے ہم یہ مان لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے کہ صاحب کشف کا مقصد "بدرالدین البلخی" ہے۔

اصل نام کی تحقیق : اب ہمیں نسخہ کتاب خانۂ رام پور، نمبری ۵۹ کی طرف متوجہ ہوجانا چاہیے۔ اس میں تمام دوسرے نسخوں کے خلاف مصنف کا نام مطہر بن قوام درج ہے اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے تمام نسخوں سے یہ کہہ کر قطع نظر کرلیں کہ یہ سب ایک اصل سے منقول ہونے کے سبب سے ایک نسخے کے برابر ہیں اور اس لیے نسخہ نمبری ۵۹ کے مقابلے میں ان کے بیان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، تو پھر ہم یہ جستجو کرنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ مطہر کرئی کون شخص ہے۔

تذکرے کی کتابوں میں ایک صاحب علم و فضل شاعر مطہر کڑہ کا ذکر نظر آتا ہے اورینٹل کالج میگیزین ماہ مئی ۱۹۳۵ء میں پروفیسر محمد وحید مرزا صاحب نے اس کے دیوان کے ایک نسخے کے سلسلے میں جو حکیم آشفتہ صاحب لکھنوی کی ملک ہے، ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا، اس مقالے کے ساتھ فاضل محترم مولانا محمد شفیع صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے تمام ان کتابوں کے اقتباسات شامل کر دیے ہیں جن میں مطہر کڑہ کا تذکرہ ہے، اور تبخانہ ملاصوفی مازندرانی سے اس کے قصائد وغزلیات کے اشعار بطور ضمیمہ نقل فرمائے ہیں۔

جولائی ۱۹۳۵ء کے رسالۂ معارف اعظم گڑھ میں مخدومی نواب صدر یار جنگ بہادر مولنا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں مطہر کے قصائد کے ایک جدید نسخے کی اطلاع دیتے ہوئے اس کے حالات زندگی پر اس کے کلام کی روشنی میں نظر ڈالی ہے، مذکورۂ بالا مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ

مطہر کڑہ مانکپور کا باشندہ تھا جو الہ آباد کے قریب اس عہد میں

صوبہ کا صدر مقام تھا۔ باپ کا نام معلوم نہیں لیکن وہ بھی شاعر اور شاہ وقت کے دربار سے منسلک تھا۔ مطہر نے مختلف علوم و فنون کی باضابطہ تعلیم حاصل کی تھی اور شعر گوئی کے ساتھ ساتھ علوم کا درس بھی دیتا تھا۔ یہ فیروز شاہ تغلق اور اس کے عہد کے امراء کی سرکاروں کا مداح تھا۔ چنانچہ عین الملک کی طرف سے اس کو صلے میں جاگیر بھی عطا ہوئی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے شرف ارادت حاصل تھا۔ اس لیے ان کی وفات پر ایک مرثیہ بھی لکھا ہے۔ جو دیوان میں موجود ہے لیکن شجرۂ منظومہ میں نظام الدّین اولیاء کے بعد رکن حقیقت نام ملتا ہے۔ جو کسی رکن الدّین کی طرف اشارہ ہے۔ اس کا دیوان عرصے تک غیر مرتب پڑا رہا ۔ مولانا محمد صوفی مازند رانی نے گجرات میں اس غیر مرتب دیوان کا ایک نسخہ پایا اور اوس کو مرتب کر کے شائع کیا اس نسبت سے اس کو بعض تذکرہ نویسوں نے گجراتی لکھ دیا ہے۔

سنہ وفات کا پتا نہیں چلتا ۔ لیکن اس کے ایک قصیدے میں ۷۷۰ھ کا ذکر آگیا ہے نیز دوسرے قصیدے سے جو محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق کی مدح میں ہے۔ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ۷۸۹ھ تک جو شاہِ مذکور کی تخت نشینی کا سال ہے بقید حیات تھا۔

اس کی تصنیفات میں دیوان کے علاوہ ایک رسالہ نصیب اخوان ہے۔ جو ۷۷۰ھ میں نصاب الصبیان فراہی کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

اس کے کلام میں جن شعراء کا تذکرہ ملتا ہے ۔ وہ سعدی ۔ جمال الدین نزاری۔ کمال اصفہانی۔ بدیع الہمدانی ۔ رضی نیشاپوری ۔ معزّی ۔ عنصری ۔ فردوسی ۔ انوری ۔ خاقانی ۔ فرید ۔ عسجدی ۔ عمعق ۔ سنائی ۔ ہمام ۔ ظہیر وغیرہ ہیں۔ " (انتہی ملخصاً)

مطہر کڑہ کے مذکورۂ بالا خلاصۂ حالات کو سامنے رکھ کر جب شرح میں مندرج سوانحی

اشارات کو دیکھا جائے تو دونوں ایک شخصیت پر منطبق ہوجاتے ہیں:

۱۔ اولاً یہ کہ مطہر کڑہ شاعر، اور مطہر المعروف بکری کا زمانہ ایک ہے، صرف یہ فرق ہے کہ قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ، مطہر شاعر ۷۸۹ھ تک بقید حیات تھا، جو محمد شاہ کی تخت نشینی کا سال ہے، اور شرح سے پتا چلتا ہے، کہ مطہر کری ۷۹۵ھ تک زندہ تھا، جو شرح کا سنہ تالیف ہے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص ۷۸۹ھ میں زندہ ہو، چھے سال بعد تک زندہ رہ کر ۷۹۵ھ کو پاسکتا ہے۔

۲۔ دویم یہ کہ قصائد میں مطہر شاعر نے جن شعراء کا ذکر کیا ہے، مطہر کری نے شرح میں اون میں سے متعدد شعراء کے اشعار کو سند میں پیش کیا ہے، مثلاً فردوسی، انوری، خاقانی، ظہیر، سعدی، سنائی، جلال الدین رومی، مولانا جمال الدین، فرق یہ ہے کہ قصائد میں امیر خسرو اور حسن سجزی وغیرہ کا ذکر نہیں، برخلاف اس کے شرح میں ان دونوں بزرگوں کا بارہا حوالہ ملتا ہے، شارح خسرو کو امیر خسرو ترک اللہ کہتا ہے، ایک مقام پر ملک احمد پسر امیر خسرو ترک اللہ کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے، (ص ۸۴ مطبوعہ و ص ۱۲۰ نسخہ قلمی ۷۰)

از تیغ آبدار بدہ آب در وغا   از ہیبت تو خشک شود خصم را دہان

ان کے ماسوا ضیا بخشی، (۷۵۱ھ) مغیث ہانسوی، حمید قلندر (۷۶۸ھ) اور مولانا خواجگی (۸۱۹ھ) کا تذکرہ بھی قصائد میں نہیں ہے، مگر استشہاد کے ذیل میں ملتا ہے۔

لیکن یہ فرق بھی چنداں قابل لحاظ نہیں کیوں کہ فخر کے موقع پر جن شعراء کا تذکرہ نہیں کیا جاسکتا، استشہاد کے وقت وہ ذکر میں آسکتے ہیں، بنا بریں ممکن ہے کہ مطہر نے ایک جگہ اہم مرتبہ والے شعراء کو پیش کیا ہے، اور اسی نے شرح میں اپنے مطلب کے ثبوت میں اپنے پیشرو اور معاصرین میں سے نسبتہً کم مرتبہ والوں سے مدد لی ہے۔

۳۔ سوم یہ کہ مطہر کری نے ایک مقام پر دماغ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے

"واین را در نصاب العقلاء شرح گفتہ ایم درین محل تمامی نتوان گفت۔"
(شرح مخزن، نسخہ مطبوعہ ص ۵۲)

اسی قسم کی ایک کتاب نصیب اخوان جو فراہی کی نصاب الصبیان کا جواب ہے مطہر کڑہ کی تصنیف خیال کی گئی ہے، ممکن ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے متن اور شرح کے ہوں لیکن یہ تو اغلب ہے کہ یہ ایک ہی موضوع کی دو کتابیں ہوں۔

اور چونکہ مطہر کڑہ کی نصیب اخوان ۷۰۰ھ کی تصنیف ہے اور مطہر کری نے شرح میں نصاب العقلاء کا تذکرہ ۸۵۰ھ میں کیا ہے اس لیے دونوں کے ایک شخص کی تصنیف ہونے پر کوئی تاریخی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

۴۔ چہارم یہ کہ مطہر کڑہ نے اپنے ایک قصیدے میں نظام الدّین اولیاء کے بعد کسی رکن حقیقت کا ذکر کیا ہے۔ مطہر کری نے اپنی شرح میں شیخ رکن الدّین ابوالفتح کا ذکر کیا ہے ۔میرے نزدیک یہ رکن حقیقت اور رکن ادلین ابوالفتح مولانا رکن الدّین جعفری ہیں، جو خواجہ نظام الدّین اولیاء کے مرید تھے۔ مرآۃ الاسرار (۲) میں لکھا ہے کہ صاحب ذوق و شوق اور مبتلائے سماع تھے، خوشنویس بھی تھے اس لیے اکثر سلطان المشائخ کے لیے کتابیں نقل کیا کرتے تھے۔

۵۔ پنجم یہ کہ مطہر کڑہ شاعر بھی تھا اور صاحب علم و فضل بھی، مطہر کڑای میں بھی یہ دونوں صفتیں موجود ہیں۔ اس کے صاحب علم ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ شرح میں مصابیح، صحاح جوہری ، تفسیر زاہدی ، تفسیر لباب ،تفسیر عمدہ ، شرح تلخیص المفتاح ، کتاب طبایع الحیوان ، تاج الاسامی ، دستور الافاضل ، جوامع الحکایات عوفی ، جامع الصنائع ، تہذیب المصادر ، فتح الباری شرح الجامع الصحیح للبخاری ، امالی قالی ، اور تفسیر کشاف وغیرہ عربی و فارسی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات پیش کرتا ہے، اور شاعری کی دلیل یہ ہے کہ کتاب کے دیباچے میں حسب ذیل حمدیہ اشعار بدون انتساب مذکور ہیں:

فحمد اللہ ثم حمد اللہ علی ما کسانا رداء النعم
وشکر اللہ ثم شکر اللہ علی ما حدانا بشکر النعم

معرفت آموز شناسندگان معصیت آمرز ہر آشندگان
مدد؛ کشائے دل ہر غم کشی شاد کن سینۂ ہر ناخوشی،

ان کے بعد نعت میں بھی کچھ شعر بدون انتساب درج کیے ہیں جو تاوقتیکہ یہ معلوم نہ ہوجائے کہ کس شاعر کے ہیں خود شارح ہی کے خیال کیے جاسکیں گے۔

ان اشعار کے ماسوا کتاب میں ایک شعر مطہر کے نام کے تحت بھی مذکور ہے ، خواجہ نظامی رحمۃ اللہ علیہ کے شعر:

گنبد پوینده که پاینده نیست جز بخلاف تو گراینده نیست

کے سلسلے میں لکھا ہے، کہ ملک الکلام خاقانی بھی اس مضمون کو اس طرح ادا فرماتے ہیں:۔

آرزوے کہ از جہاں خواہیم ۔۔ ہدہد، زانکہ مست بے خبر است
لیکن آں دادہ را بہشیاری ۔۔ داستاند کہ نیک بدگہر است

اس کے بعد لکھا ہے کہ افضل العصر مولانا مطہر فرماید، بیت،

در سخاوت بکود کاں ماند ۔۔ بدہد زود ، زود بستاند

(نسخۂ رامپور نمبر ۵۹)

ہمارے دوسرے نسخے ، نمبری ۹۰ (ص ۲۴۹) میں مطہر کو مظہر لکھا ہے، مگر اس کے ساتھ لفظ فرماید کی جگہ گوید ہے نسخہ مطبوعہ میں (ص ۱۵۰) افضل العصر مولانا ظہیر گوید مندرج ہے۔ میری رائے میں یہ لفظ مطہر ہے اور اصل نسخے میں عبارت ہوگی ،" بندہ احقر مطہر گوید " کسی ناقل کتاب نے ازراہ تعظیم اس کو بدل کر افضل العصر مولانا فرماید کر دیا ، اور کسی نے افضل العصر مولانا گوید رکھا ، جو اصحاب عربی زبان سے واقف ہیں ، انھوں نے اس قسم کا تغیر عربی کتابوں کے دیباچوں میں بارہا دیکھا ہوگا، کہ مصنّف نے جہاں اپنے لیے انکسار کے الفاظ لکھے تھے، وہاں شاگردوں نے کتاب نقل کرتے وقت تعظیمی لفظ درج کیے ہیں۔

اگر یہ قیاس صحیح ہو ، تو پھر مطہر کڑی شارح کتاب کے مطہر کڑہ ، شاعر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن یہاں یہ امر واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ میں نے نسخۂ مطبوعہ کے ظہیر کے پیش نظر سرسری طور پر دیوان ظہیر فاریابی کو دیکھا تھا، اور اس میں یہ شعر نہیں پایا، اگر کسی وسیع النظر بزرگ کو دیوان ظہیر کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ شعر مل جائے تو پھر میرا قیاس اس شعر پر مبنی نہ ہوگا، بلکہ اس سے پہلے جو وجوہ میں لکھ چکا ہوں ، ان پر میری رائے کی بنیاد قائم رہے گی۔

نتیجۂ بحث : نتیجۂ بحث یہ ہے کہ ظہور الاسرار نامی ظہور الحسن بجنوری کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ یہ بدرالدین مطہر بن قوام بن رستم محمود البلخی الکرئی نے ۷۹۵ء میں تالیف کی تھی، مختلف وجوہ کی بناء پر میرا اقتباس یہ ہے کہ مطہر کرئی وہی شخص ہے، جو فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں بنام مطہر کڑہ شعر گوئی کے وصف سے موصوف تھا، اور جس کا دیوان قصائد حال ہی میں دو جگہ دستیاب ہوا ہے، یہ اصلاً بلخ کا ہے لیکن اس کا باپ کڑہ مانکپور میں آباد ہوگیا تھا، اس لیے یہ

اپنے آپ کو "البلخی الکرئی" لکھتا ہے اس نے حسب ذیل کتابیں یادگار چھوڑی تھیں:

۱۔ دیوان اشعار ۲۔ شرح سکندر نامہ بری و بحری

۳۔ شرح مخزن اسرار ۴۔ نصیب اخوان ۵۔ نصاب العقلاء

ان میں سے نمبر ۱، ۲، ۴ اب بھی دستیاب ہوتی ہیں، بقیہ کا پتا نہیں۔

شرح مخزن کے بعض فوائد: قیاس در قیاس کی الجھنوں میں پڑنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شرح کے بعض دلچسپ اور مفید بیانوں کو ذیل میں درج کیا جائے۔ مولانا نظامی کے شعر:-

شیشہ زگل آب شکر می فشاند شمع بدستارچہ زر می فشاند

کے تحت میں شارح لکھتا ہے کہ "می ہر چند تلخ است باعتبار تلذذ شیرین بود، و نیز در ہند، می از شکر و گل می سازند و آن را عرق گل گویند، چنانکہ مولانا جمال الدین استباجی (؟) گوید:-"

بنوشم از کف خوبان دلی شرابی آنچنان کز گل چکد خوی

(ص ۱۰۳، نسخہ نمبر ۵۹)

۲۔ زلیخا کے سلسلے میں لکھا ہے: "کہ در مصر بادشاہ را عزیز گویند، چنانکہ در روم قیصر، و در چین خاقان و فغفور، و در شیراز اتابک، و در عراق کسریٰ، و در عرب ملک و سلطان و در ہند سلطان خوانند"

(ص ۱۴۸۔ نسخۂ مذکور)

۳۔ ایک مقام پر لفظ "منشور" کی تشریح میں لکھا ہے: "و منشور در اصطلاح و عرف، دو جمع سادات و مثال و فرمان پادشاہ و خلیفہ راہم گویند و این جا فرمان مراد است"، "و منشور نویس" دبیر را گویند کہ مثال پادشاہ و خلیفہ را بنویسد" (ایضاً ص ۱۶۰)

اس بیان سے ان لوگوں کی تائید ہوتی ہے جو لفظ مثل (بمعنی فائل) کو حرف ثا کے ساتھ لکھتے ہیں کیوں کہ اگرچہ مثل صحیح لفظ نہیں لیکن ہر نوع ہے تو اسی لفظ کا مخفف جوث کے ساتھ لکھا جاتا ہے، پس کوئی وجہ نہیں کہ اس کو مسل (سین کے ساتھ) لکھ کر اصل سے دور کیا جائے۔

۴۔ سمن سپید کو لکھا ہے کہ "در ہند سمن سپید راجنبیہ (چنپہ گویند)" (ص ۱۶۲ نسخۂ مذکور) اور عود کے متعلق لکھا ہے کہ از عودش عود قماری مراد است کہ آنرا ہندوی تیلیہ گویند،

درغایت بوئے خوش و سیاہ می باشد۔ (ایضاً ص ۱۹۶) شقاقل کے بارے میں لکھا ہے کہ شقاقل بیخ گزر دشتی است کہ بہ ہندوی سیالی و دبالی گویند (ایضاً ص ۳۰۲)

ان اقتباسوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارح ہندوستان کا رہنے والا تھا۔ ورنہ فارسی الفاظ کے لیے ٹھیٹ ہندی مترادف الفاظ نہ وہ تلاش کرتا اور نہ اوسے سہولت کے ساتھ یہ الفاظ ملتے۔

۵۔ شارح نے شیخ سعدی شیرازی کا حوالہ بار ہا دیا ہے۔ ان مقامات میں سے صرف ایک جگہ مصلح الدین سعدی لکھا ہے۔ باقی تمام مقامات پر " مشرف الدین سعدی " تحریر کیا ہے۔ اس سے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ آٹھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے اندر شیخ کا لقب مشرف الدین زبان زد تھا۔ اور اسی لیے مجھے شبہ ہے کہ جہاں کتاب میں مصلح الدین ملتا ہے وہ خود شارح کا ہی لکھا ہوا ہے کاتب کی تحریر نہیں ہے۔

۶۔ امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کے بھی بہت سے اشعار جا بجا ملتے ہیں ان کے نام کے ساتھ تقریباً ہر جگہ " ترک اللہ " لقب ضرور لکھا گیا ہے۔ یہ لقب حضرت نظام الدین اولیاء نے اپنے ترکی النسل مرید کو عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں خود خسرو نے اس کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

برزبانت چون خطاب بند ترک اللہ رفت   دست ترک اللہ بگیرد ہم باللہ اش سپار

معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی میں یہ لقب ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا تھا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ امیر خسرو کا نام بلا ترک اللہ کے لیا جائے

اس ضمن میں یہ تذکرہ بھی بیجا نہ ہوگا کہ شارح نے ایک مقام پر امیر خسرو مرحوم کی مثنوی " دو لرانی خضر خان " کے اشعار نقل کیے ہیں مگر اس کتاب کو " عشق نامۂ خضر خان " کے نام سے یاد کیا ہے۔

۷۔ شارح نے ایک مقام پر سنہ ہجریہ کے ساتھ چند اور سنین بھی ذکر کیے ہیں جن کا تذکرہ یہاں مناسب ہوگا۔ وہ لکھتا ہے:۔

> بدانکہ درین وقت تک از ہجرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم ہفصد، نود، پنج سال است۔ از خلقت آدم۔ صلوٰہ اللہ علیہ تا امروز شش ہزار ہفصد و نود پنج سال گذشتہ است۔ اما از خلقت جہان تا وقت طوفان بر قوم نوح علیہ السلام یک لکھ ہشتاد ہزار سال گذشتہ بود این تاریخ علائی و

ناصری و غوری است و از طوفان نوح پیغامبر علیہ السلام تا این وقت
چہار ہزار چہار صد نود و شش سال شدہ نسخہ نمبر ۵۹ ص ۲۸۰)

اس عبارت میں تاریخ علائی و ناصری و غوری قابل غور ہے

۸۔ ایک مقام پر شارح نے لفظ خرگاہ کے متعلق بڑا دلچسپ تاریخی نکتہ لکھا ہے، کہتا ہے:

"دخرگاہ را سلطان محمد شاہ بن تغلق شاہ نور اللہ مرقدہ خرمگاہ نام کردہ
بسبب کراہیت لفظ خرگہ ازان روز باز در دیار دہلی خرمگاہ میگویند "

(ایضاً ص ۳۱۰ و ص ۲۵۳)

میں نے عہد محمد تغلق کی تاریخوں پر سرسری نظر ڈالی، مگر یہ واقعہ نہیں ملا۔ اگر حقیقتہً تاریخوں میں اس کا ذکر آیا ہے تو محمد تغلق کی خوش ذوقی کی ایک اہم شہادت دستیاب ہوتی ہے اور اگر مذکور ہے گو میری نظر نہیں پڑی تو یہ تاریخ کے بیان کی مزید شہادت قرار پاتی ہے۔
والحمد للہ اولاً و آخراً (معارف اعظم گڑھ جولائی، اگست ۱۹۴۱ء)

حواشی

(۱) غالباً "جدا" کو کاتب نے مجدا لکھا ہے۔

(۲) مراۃ الاسرار قلمی، ورق ۲۰۰، تصنیف شیخ عبد الرحمن چشتی، جو ۱۰۶۵ھ میں تمام ہوئی۔

یادداشت: از نجم الاسلام

○ اس مقالے کے شروع میں، خاتمۃ الطبع کے ذیل میں مولوی نورالحسن ذہین کرتپوری کا نام آتا ہے۔ کرت پور کو سوا کرن پور لکھ دیا گیا تھا جسے درست کرکے ہم نے کرت پور لکھا ہے۔ افسر صدیقی امروہوی مرحوم، جو مولوی نورالحسن ذہین سے ذاتی طور پر واقف تھے، بتاتے تھے کہ مولوی نورالحسن ایک نابینا عالم تھے اور اخبار مدینہ بجنور کے، ابتدائی دور کے مدیر تھے۔ یہ سہ روزہ اخبار ۱۹۱۲ء (یا ۱۹۱۴ء) میں جاری ہوا تھا۔

○ مولوی ظہورالحسن بھٹوری، جن سے مطبوعہ کتاب ظہورالاسرار نامی غلط طور پر منسوب کر دی گئی تھی، کون تھے؟ اور کہاں کے رہنے والے تھے؟ ضلع بجنور میں بھٹور نام کا کوئی قصبہ نہیں، البتہ سہٹور نام کا قصبہ ہے۔ امکاناً بھٹوری، سہٹوری ہو گا۔

دساتیر کی مجعولیت پر قاضی عبدالودود کا مقالہ

(تلخیص از نجم الاسلام)

۱۔ دساتیر طبع اول کے مرتب و ناشر ملا فیروز (۱۸۳۰ء) کی عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ دساتیر کی زبان عہد حاضر کی کسی مشہور زبان سے یا اوستائی و پہلوی و دری سے کچھ "مناسبت" نہیں رکھتی۔ عہد خسرو پرویز میں ساسان پنجم نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ عہد شاہجہاں میں یہ کتاب سورج کی طرح ظاہر تھی لیکن اس کے بعد مخفی ہو گئی۔ اس کا ایک نسخہ ملا کاؤس (ملا فیروز کے والد) کو اصفہان میں ملا۔ انگریزوں کو جب اس کے وجود کی اطلاع ہوئی تو وہ اس کے ترجمہ انگریزی پر مصر ہوئے۔ یہ کام گورنر بمبئی (ڈنکن) نے شروع کیا لیکن قبل اتمام راہی عدم ہوئے۔ اس کے بعد جنرل سرجان مالکم نے خود ملا فیروز سے ترجمے کی تحریک کی اور ملا نے یہ کام مسٹر ارسکن کی اعانت سے انجام دیا۔ (نقوش ۱۰۵: ص ۲۰۸)

۲۔ اس کی جلد ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے دیباچے میں سر ولیم جونس نے دساتیر کی نسبت دبستان کے حوالے سے جو کچھ لکھا تھا وہ اور مارکوئس ہیسٹنگز نے ترجمہ ملا کے متعلق فورٹ ولیم کالج کے وابستگان سے ۱۸۱۶ء میں جو کچھ کہا تھا نقل ہوا ہے۔ (ایضاً۔ ص ۲۰۸)

۳۔ ملا فیروز کے حالات آقائے رشید شہر دان کی کتاب فرزانگان زردشتی میں مذکور ہیں۔ (ایضاً۔ ص ۲۰۸)

۴۔ (دساتیر کے ممکنہ جعل ساز آذر کیوان کے بارے میں) آقائے دکتر محمد معین نے "آذر کیوان و پیروان او" (مجلہ دانش کدہ ادبیات شمارہ ۳ سال ۴) میں لکھا ہے کہ "نام پدران آذر کیوان تا آذر مہر ہمہ نامہائے آتشکدہ ہاست کہ در فرہنگ ہای پارسی بعنوان ہفت آتشکدہ یاد شدہ اند و این ہفت آتش کدہ بصورتے کہ نقل کردہ اند، وجود خارجی نداشتہ۔ ص ۲۰۔

آذر کیوان کا نسب نامہ دبستان مذاہب میں درج ہے۔ اس نسب نامے میں مسلسل پانچ ساسان آئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ۵ ساسان پہلے سے کتابوں میں چلے آتے تھے لیکن ان کا

تعلق تاریخ سے نہیں، اساطیر سے ہے۔ مزید یہ کہ ان کا مفروضہ زمانہ خسرو پرویز سے بہت پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔ اس عہد میں کوئی گمنام ساسان نام کا ہوتو ہو لیکن کوئی ایسا شخص جس کا اس زمانے کی کتابوں میں ذکر آیا ہو، اور اس عہد کے اہم معاملات سے اس کا سروکار رہا ہو، نہ تھا۔ دکتر محمد معین کا قول ہے کہ "ناگفتہ خود پیداست کہ ایں شجرۃ النسب مجعولست و شاید نام پدر اورا صحیح نقل کردہ باشند۔"

ساسانوں سے قطع نظر یہ کب ممکن ہے کہ آذر کیوان اور ساسان پنجم کے درمیان آٹھ ہی پشتیں ہوں۔ دبستان میں جو نسب نامہ ہے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، بہ احتمال قوی خود آذر کیوان اس کا ذمہ دار ہے۔ (ایضاً، ص ۲۷۹)

۵۔ دبستان میں آذر کیوان کے متعلق مرقوم ہے کہ . . . اواخر عمر میں ایران سے ہند آیا اور کچھ دن پٹنے میں مقیم رہ کر ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوا۔ ۸۵ سال کی عمر ہوئی ... وہ گوشت کھانے اور جاندار کو مارنے اور آزار دینے سے مانع تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی روح اس کے جسم سے جب چاہتی ہے، باہر نکل آتی ہے۔ اس نے اپنے بعض مشاہدات کو منظوم کیا ہے .... اکبر کے زمانے میں آذر کیوان ہندوستان طلب کیا گیا لیکن اس نے عذر کیا اور اپنی کتاب بھیج دی ... یہ چودہ جزو پر مشتمل تھی اور فارسی، عربی، ترکی، ہندی چار زبانوں میں تصحیف و قلب و تصحیف کے ذریعے پڑھی جاسکتی تھی۔ ابوالفضل آذر کیوان سے اعتقاد تمام رکھتا تھا۔ اس کے دوسرے مسلمان معتقد بھی تھے، ازاں جملہ ابوالقاسم فندرسکی۔

اس بات کی کوئی قابل قبول شہادت نہیں کہ عہد اکبری میں اس سے ہندوستان آنے کی استدعا کی گئی تھی، یا فندرسکی اس کے معتقد تھے۔ صاحب دبستان، یا دوسرے دساتیریوں کی شہادت کا عدم و وجود برابر ہے۔ ۱۴ جزو کی ایسی کتاب کہ عربی، فارسی، ترکی، ہندی سب میں پڑھی جاسکے نہ کبھی لکھی گئی نہ لکھی جاسکتی ہے۔

اس کا قطعی طور پر ثابت کرنا ممکن نہیں لیکن قرائن قوی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ خود آذر کیوان دساتیر کا مصنف ہے۔ نامہ ساسان پنجم میں یہ عبارت ملتی ہے۔ "در تخمۂ تو پیغمبری ہمیشہ ماند"۔ (دساتیر، ص ۳۰۴)۔ آذر کیوان کے معتقدین نہ صرف اسے بلکہ اس کے بیٹے کو بھی نبی لکھتے ہیں۔ یہ پیش گوئی کہ ساسان پنجم کی نسل سے نبی آئندہ بھی ہوتے رہیں گے، اس غرض سے تھی کہ دعوے کا موقع مل سکے۔ (ایضاً، ص ۲۸۲،۲۸۰)

۶۔ دبستان مذاہب کے مصنف نے اپنے حالات تو دیے ہیں لیکن کسی جگہ اپنا نام نہیں

لکھا۔ ملا فیروز نے خیال ظاہر کیا ہے کہ میر ذوالفقار علی اس کے مصنف ہیں۔
مآثر الامراء نے ذوالفقار اردستانی موبد کو اس کا مصنف لکھا ہے۔
یہ قول بھی ہے کہ کیخسرو پسر آذر کیوان اس کا مصنف ہے، میں اس سے متفق ہوں۔ یہ بخوبی ممکن ہے کہ اس نے کبھی اپنے کو میر ذوالفقار اور کبھی ذوالفقار کہا ہو۔ موبد تخلص کے ایک شاعر کا دیوان فارسی کتاب خانہ خدا بخش میں موجود ہے اور اس کتاب خانے کی طرف سے شائع ہوگا۔ میرے نزدیک اس میں شبہے کی بہت کم گنجائش ہے کہ یہ موبد (وہی ہے) خواہ وہ آذر کیوان کا بیٹا ہو، یا نہ ہو۔ (ایضاً، ص ۲۸۱)

۷۔ قاطع برہان پہلی فرہنگ ہے جس میں دساتیری الفاظ ملتے ہیں، لیکن دساتیر کا حوالہ ایک آدھ جگہ ہو تو ہو۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ بیشتر دساتیری الفاظ اس میں موجود ہیں۔ اس فرہنگ میں ان لغات کے شمول کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بعد کی فرہنگوں میں بھی داخل ہوئے اور ان کی خاصی تعداد نظم و نثر فارسی میں ایران و ہند دونوں ممالک میں مستعمل ہونے لگی۔

(ایضاً، ص ۲۸۱)

۸۔ یہ بات کہ عہد شاہجہاں تک دساتیر ایک بہت مشہور کتاب تھی، غلط محض ہے۔ دساتیریوں نے جو کتابیں قرن یازدہم میں لکھی ہیں، ان سے اور برہان قاطع سے قطع نظر، دساتیر کا نام تک کہیں نہ آیا، اور نہ اس کے خاص الفاظ و مطالب کہیں ملتے ہیں۔ اس کی اشاعت کے بعد ہی مستشرقین مغرب نے اس کی مجعولیت کا بالاتفاق اعلان کیا۔ زردشتی البتہ دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک گروہ اس کی اصلیت کا قائل تھا اور دوسرا اسے جعلی قرار دیتا تھا۔ بالآخر اورینٹل کانگریس کے اجلاس جنیوا میں شہریار جی دادا بھائی بروچا نے اپنا مقالہ اس کے خلاف پڑھا اور اس کے بعد سے شاید ہی کوئی زردشتی ہو جو اس کی اصلیت کا قائل ہو۔ ان کے مقالے کا ایک اقتباس آقائے شہردان کے الفاظ میں یہ ہے:

> "پس از مطالعات دقیق دساتیر بایں نتیجہ میرسم کہ ایں کتاب بہ ہیچ وجہ نمی تواں جزو کتاب مذہبی مزد یسنا بہ شمار آورد، زیرمندرجاتش نہ با مندرجات اوستا برابر است و نہ بامندرجات کتب پہلوی دورہ ساسانیاں و یقیناً محصول دورہ نمیہ اخیر می باشد۔ ہر چند تعلیمات ایں کتاب با تعالیم زرتشت، نیز شباہت ندارد بلکہ تعلیمات ہنود، بودا (بدھ) و مذہب افلاطونی متمایل است، چناں

چہ خوردن گوشت حرام و ریاضت و زہد و فاقہ کشی و تجرد و ترک دنیا را موعظہ می نماید۔ دساتیر از نقطہ نظر تقویم و اساطیر و تاریخ و کتب مذہبی مزدلیسنا مغایرت تامی دارد و زبان آسمانی آن تحریفی است از السنہ پہلوی و پارسی و ہندی۔" (ایضاً، ص ۲۸۱، ۲۸۲)

۹۔ زردشتیوں کے کتب مقدس میں زردشت سے قبل کے پیغمبروں کی طرف اشارہ ہو، لیکن کسی کو بصراحت پیغمبر نہیں بتایا، اور نہ یہ زردشتی عقیدہ ہے کہ زردشت کے بعد کوئی نبی آئے گا۔ زردشتی مذہب میں زردشت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، دساتیری پیغمبروں میں اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ زردشتی و دساتیری عقائد بھی مختلف ہیں، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ زردشتیوں کے ایک گروہ نے اسے اپنی کتاب مقدس تسلیم کیا؟ اس کا راز اس کی فرضی قدامت میں مخفی ہے جس پر سر ولیم جونس نے بہت زور دیا تھا۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ ملا فیروز وغیرہ دنیا کی قدیم ترین کتاب کے مصنف ہونے کے فخر سے زردشتیوں کو محروم کردیتے۔ رہی دساتیری اور زردشتی عقاید کے احکام کے اختلاف کی بات تو صاحب دبستان نے اس کے باوجود دساتیر کو قبول کرنے کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ دساتیری فن تاویل میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ لفظوں کے الٹ پھیر سے وہ کوئی دعویٰ ایسا نہیں جسے ثابت نہ کرسکتے ہوں جو دبستان میں ہے۔

۱۰۔ آج زردشتیوں کے دو گروہ ہیں، ایک دساتیر کو عہد اکبری سے قبل کی کتاب نہیں مانتا، دوسرا یہ سمجھتا ہے کہ جعلی ہونے کے باوجود یہ اس قدر جدید نہیں اور واقعی خسرو پرویز کے عہد یا اس کے کچھ بعد کی ہے۔ اس گروہ کے دلائل بہت کمزور ہیں۔ (ایضاً، ص ۲۸۲)

(نقوش لاہور، شمارہ ۱۰۵، ۱۹۶۶ء)

غلط انتساب کی ایک مثال اور اس کا رد

قاضی احمد میاں اختر جو ناگڑھی:

مرزا غالب اور امیر مینائی

(مقالہ جس میں کسی محمد امیر لکھنوی کے کلام کو امیر احمد امیر مینائی لکھنوی سے منسوب کر دیا گیا ہے)

مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی اور منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی اُردو کے نامور شاعر گزرے ہیں، اور دونوں کا شمار اردو کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ غالب نہ صرف فارسی اور اردو کے ایک مسلم الثبوت اور بلند رتبہ شاعر تھے، بلکہ زبان دانی اور لغت کی تحقیق میں بھی منفرد اور یگانہ روزگار تھے۔ لغوی اور لسانی تحقیق میں ان کے کارنامے تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ امیر مینائی فن شعر اور لُغت کے علاوہ عربی و فارسی کے عالم اور رسمی علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ اردو شاعری میں وہ استاد مانے گئے ہیں، اس کے علاوہ فارسی میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے، اور لغوی و لسانی مباحث میں ان کو جو دسترس تھی وہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ خصوصاً امیر اللغات ان کی لغوی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے۔ اگرچہ وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ ان دونوں بزرگوں میں جو دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، ان سے بہت کم لوگ واقف ہیں، مرزا صاحب کے بعض خطوط سے ان تعلقات کا پتا چلتا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب امیر کی وجاہت اور فن شعر گوئی میں ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ اسی طرح امیر غالب کو سخن دانی، فارسی شعر و ادب اور لغت میں استاد مانتے تھے۔

غالباً ان دونوں کے تعلقات کا آغاز ۱۸۵۸ء سے ہوتا ہے جب کہ ان کا تعلق دربار رام پور سے تھا اور قیام رامپور کے زمانے میں ان دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی کسی تذکرہ

نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ خود امیر نے اپنے تذکرۂ "انتخاب یادگار" میں اس پر کوئی روشنی ڈالی ہے۔ امیر ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور گئے۔ اس سے پہلے ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خان ناظم مرزا غالب کے شاگرد ہو چکے تھے اور خط و کتابت کے ذریعے مرزا صاحب ان کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ خود مرزا صاحب ۱۸۶۰ء میں پہلی بار رامپور تشریف لے گئے۔ اس سے پہلے امیر سے ان کی ملاقات نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے آشنا ہو چکے تھے۔ مرزا کے تمام مکاتیب میں کوئی مکتوب امیر کے نام نہیں پایا جاتا۔ البتہ مرزا نے اپنے ایک خط میں، جو انھوں نے ۱۲ جون ۱۸۵۹ء کو اپنے ایک شاگرد منشی شیونرائن کے نام لکھا تھا، امیر کا ذکر کیا ہے، اور اس میں ان کو اپنا دوست بتایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

> "..... اب کے تمھارے معیار الشعرا میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رامپور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا۔ نام اور حال جو میں اوپر میں لکھ آیا اس کو اب کے معیار الشعرا میں چھاپ کر دو ورق یا چار ورق رامپور ان کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر یہ لکھو کہ در رامپور بر در دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد امیر تخلص برسد۔ مجھ کو اس کی اطلاع دو اور اس امر کی بھی اطلاع دو کہ رامپور کو تمھارا اخبار جاتا ہے یا نہیں" (مرسلہ یکشنبہ ۱۲ جون ۱۸۵۹ء) (۱)

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے رامپور جانے سے قبل ہی امیر سے ان کی خط کتابت نواب صاحب کے کلام کی اصلاح کے سلسلے میں رہی ہوگی اور اسی ضمن میں امیر نے رسالۂ معیار الشعرا، میں اپنے کلام کی اشاعت کے بارے میں مرزا صاحب کو لکھا ہوگا اور غزلیں بھیجیں ہوں گی جس کی بناء پر غالب نے اپنے شاگرد کو یہ ہدایت کی ہے۔

لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ ان دونوں کے مکاتیب میں جو چھپ کر شائع ہو چکے

ہیں ایک دوسرے کے نام کوئی مراسلت نہیں پائی جاتی۔ "دوست" کا لقب غالباً یہاں رسمی طور پر استعمال ہوا ہے کیوں کہ ایک ہی دربار سے دونوں متوسّل تھے اور اسی بناء پر ان دونوں میں گونہ تعلق قائم ہوگیا تھا ورنہ غالب امیر سے عمر میں دو چند تھے۔ ۱۸۵۹ء میں امیر کی عمر صرف ۳۱ برس کی تھی جب کہ غالب ۶۲ برس کی پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس لیے امیر کو انھوں نے رسماً اور اخلاقاً اپنا دوست بتایا ہے۔ اس خط میں غالب نے امیر کی ذاتی وجاہت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور نہ کوئی تعریفی کلمہ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ مرزا نے ان کی غزلوں کو اس قابل سمجھا کہ ان کے چھاپنے کی سفارش کی اور اپنے توسّط سے اپنے نام کے ساتھ ان کی اشاعت گوارا فرمائی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب نے امیر کا کلام پسند کیا اور اپنے ایک ہم عصر نوجوان شاعر کی ہمّت افزائی کی۔

اس واقعے کے کوئی تین برس بعد امیر کا ایک قطعہ غالب کی حمایت میں شائع ہوا۔ ۱۸۶۳ء میں جب غالب نے بُرہانِ قاطع کے رد میں قاطع برہان لکھی اور اس کی تردید میں غالب کے مخالفین نے بھی کئی رسالے اور نظمیں تصنیف کرکے چھپوائیں، تو غالب کے شاگردوں اور طرفداروں نے ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا، اور یہ بحث اس وقت کے اخباروں میں ایک مدّت تک چلتی رہی۔ چنانچہ آغا احمد علی کے بعض شاگردوں کے رد میں غالب کے دو شاگردوں فدا اور سخن نے ایک رسالہ "ہنگامۂ دل آشوب" کے نام سے لکھا جو ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں آگرہ سے منشی سنت پرشاد کے مطبع میں چھپ کر شائع ہوا۔ (۱) اس رسالے میں انھوں نے میر آغا علی صاحب شمس لکھنوی کے ایک مضمون کا ذکر کیا ہے جو غالب کے رد میں اودھ اخبار میں چھپا تھا۔ اس مضمون کا جواب امیر نے لکھا جو اسی اخبار میں شائع ہوا۔ اور ایک قطعہ اُردو میں غالب کی حمایت میں لکھا تھا جو اس رسالے میں موجود ہے۔ چنانچہ امیر کا یہ قطعہ رسالۂ مذکور سے نقل کیا جاتا ہے: (۲)

قطعہ من نتائج طبع دبیر بے نظیر منشی محمّد امیر صاحب متخلّص بہ امیر
رئیس لکھنؤ سلمہ اللہ تعالیٰ وارتقاہ علیٰ مدارج الاعلیٰ کہ از اودھ اخبار نقل نمودہ شد

بلا تعلّیِ مضموں لکھے ہیں چند اشعار — یہاں مُبالغۂ شاعری نہیں درکار
عجب وقائع حیرت فزائے عالم ہے — سُنیں پسند کریں مالک اودھ اخبار (۳)
ہوا ہے مستعد جنگ نظم بنگالی — ہوئی ہے غالب و مغلوب میں عجب پیکار

جواب ان کا لکھا پارسی قیامت کی
کہاں یہ سنگ رخام و کہاں دُرِ شہوار

یہ کھانے والے ہیں دن رات سکٹی مچھلی کے
عفونت ان کی زباں سے نہیں گئی زنہار

خرابی ان سے ہوئی اُردوے معلیٰ کی
چلم کو کہتے ہیں یہ کوکی خدا کی مار

سیاہ قلب کا مضموں سپر ہے سلٹ کی
پناہ دے نہ اسے تیغ حیدر کرار

سپاہی زادہ کا اس نے جواب خوب لکھا
کہ میرا دادا تھا نادر کی فوج کا سالار

کسی کے جد کو بنائے جو کوئی اپنا جد
کبھی دروغ کو ہوتا نہیں فروغ اے یار

وہ اپنے جد کا بتائیں خطاب سرداری
میانِ گنجفہ تجھے کون نادری اسوار

بغیر نام و نشاں کس طرح یقیں آوے
خلاف محض یہ جدِّ جدید کا اظہار

یہ ان کے اب جد فاسد کی بگڑی ہے ابجد
بنائیں وہ کوئی نام اس مقام پہ زردار

اسی طرح سے کلام ان کا سب ہے مصنوعی
دروغ نظم سے کیوں کر نہ ہو جہاں بیزار

رقم کیا ہے جو ہر جا کی جا پہ اب جاجا
یہ جاجا کون مرض کی دوا ہے اے بیمار

صحیح فارسی میں ہم نے مانا ہے جاجا
فصاحت اس کی تکلم میں ہے بہت دشوار

زباں بریدہ بکنجے نشستہ ام صم و بکم
خموش رہنا یہ ان کے لیے بہ از گفتار

خدا گواہ کہ اب عافیت اسی میں ہے
انھیں یہ چاہیے اس بات کے ہوں شکر گزار

سنو بیاں اسد اللہ خاں غالب کا
زمانہ ان کے حسب اور نسب سے واقف کار

خطاب یافتہ ہیں وہ رئیس دلی کے
زمیں سے تا بفلک حسن خانداں اظہار

وہ اپنے عصر کے خاقانی و نظیری ہیں
نظیر اون کا جہاں میں کہیں نہیں زنہار

سخن کی داد ملے زندہ ہو جو فردوسی
کلام ان کا وہ نام خدا ہے باغ و بہار

وہ نظم حضرت غالب جہاں میں غالب ہے
انھی کے قول پہ آفاق کا ہے دار و مدار

اساتذہ میں یہاں ناسخ جہاں منسوخ
انھی سے طالب اصلاح شاعران دیار

زمانہ ہم کو بھی کہتا ہے مصحف الدولہ
فہیم شہر ہیں البتہ شاعری دشوار

لکھا ہے ہم نے بھی اک مختصر جہاں آشوب — کیے ہیں اس میں قلمبند ہفت صد اشعار
جو سرگذشت کہیں کی نئی سنی لکھی — لکھا امیر نے یہ واقعہ بھی آخر کار

اس قطعے کے عنوان میں امیر احمد کی بجائے "محمد امیر" لکھا ہے جو غالباً دبیر بے نظیر کے قافیے کی رعایت سے درج ہوا ہے، کیوں کہ امیر تخلص کا کوئی دوسرا شاعر لکھنؤ میں مشہور نہیں ہوا۔ آخری شعر سے ایک خاص بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ امیر نے "جہاں آشوب" کے نام سے ایک نظم بھی لکھی تھی جو سات سو اشعار پر مشتمل تھی۔ لیکن امیر کی مطبوعہ تصانیف میں کہیں اس کا نام نہیں ملتا، نہ ان کے کسی سوانح نگار نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس نظم کی اشاعت ہی نہ ہوئی ہو اور وہ ان کے مسوّدات میں رہ گئی ہو۔

(نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۵۳ء)

حواشی

(۱) اُردوی معلیٰ، صفحہ ۳۷۳ طبع ۱۸۶۹ء، دہلی

(۲) یہ رسالہ نایاب تھا اس لیے منشی عطا حسین صاحب نے اس کو ایک مختصر دیباچے کے ساتھ رسالۂ اردو (انجمن ترقی اردو) بابت ۱۹۳۷ء میں شائع کرا دیا۔ اس طرح یہ رسالہ محفوظ ہو گیا ہے۔

(۳) رسالۂ اردو جنوری ۱۹۳۷ء، صفحہ ۸۱-۸۰۔

(۴) منشی نول کشور

یادداشت از نجم الاسلام:

قطعۂ مذکورۂ بالا میں ناظم نے ایک شعر میں اپنے "مختصر جہاں آشوب" کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اس کے اشعار کی تعداد "ہفت صد" بتائی ہے۔ ہفت صد اشعار پر مشتمل منظومہ "مختصر" کیونکر ہو سکتا ہے؟ شاید تعدادِ اشعار سہو کتابت کے سبب سے "ہفت و صد" کی جگہ "ہفت صد" ہو گئی ہے۔

مالک رام:

"مرزا غالب اور امیر مینائی"

اکتوبر ۱۹۵۴ء کے نوائے ادب میں مخدومی جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جو ناگڑھی کا مضمون "مرزا غالب اور امیر مینائی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ مجھے اس سے متعلق دو ایک باتیں عرض کرنا ہیں۔

قاطع برہان کے مناقشے کے سلسلے میں غالب کے طرفداروں میں ایک صاحب محمد امیر لکھنوی بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے غالب کی حمایت میں ایک اردو قطعہ لکھ کر اودھ اخبار میں چھپوایا تھا۔ اس کے بعد یہ وہیں سے ہنگامۂ دل آشوب میں نقل ہوا۔ قبلہ قاضی صاحب موصوف نے اپنے اس مضمون میں بھی یہ قطعہ شامل کیا ہے (بلکہ یہی ان کے مضمون لکھنے کا باعث ہوا ہے) اور ان کا خیال ہے کہ یہ منشی امیر احمد مینائی مرحوم کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن اس کے لیے انھوں نے اس کے سوائے کوئی دلیل نہیں دی کہ "امیر تخلص کا کوئی دوسرا شاعر لکھنؤ میں مشہور نہیں ہوا۔" میرے خیال میں موصوف کو غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ قطعہ امیر مینائی کا نہیں۔

اوّل تو یہ کوئی دلیل نہیں کہ چونکہ امیر تخلص کا کوئی اور لکھنوی شاعر "مشہور نہیں ہوا" اس لیے لازماً یہ نظم امیر مینائی کی ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ یہ کوئی غیر مشہور امیر لکھنوی ہوں۔ آخر یہ کس نے کہا ہے کہ یہ قطعہ "مشہور" امیر کا ہے۔

پھر یہ کہنا کہ عنوان میں امیر احمد (امیر مینائی کا اصلی نام) کی بجائے "محمد امیر" غالباً دبیر اور بے نظیر قافیے کی رعایت سے درج ہوا ہے۔ تو یہ بھی بہت کمزور دلیل ہے۔ نظم کی حد تک تو لوگوں نے ضرورت شعری کو تسلیم کیا ہے، لیکن نثر میں یہ باتیں نہ تسلیم کی جاتی ہیں نہ کسی نے لکھی ہیں، کہ امیر احمد کی جگہ آپ کا نام محمد امیر لکھ سکیں۔ اس سے یقیناً التباس کا قوی امکان تھا اور ہنگامۂ دل آشوب کے مرتب ضرور اس کی طرف اشارہ کردیتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اخبار میں بھی نام محمد امیر ہی چھپا تھا۔ اگر تلاش کی جائے تو ممکن ہے کہ اودھ اخبار کا وہ اصل پرچہ کہیں سے مل جائے جس میں یہ قطعہ پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس سے یہ

عقدہ حل ہو جائے گا۔

میرے شبے کو ایک اور بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔ اس قطعے میں شاعر لکھتا ہے:

لکھا ہے ہم نے بھی اک مختصر جہاں آشوب کیے ہیں اس میں قلم بند ہفت صد اشعار

امیر مینائی اس کے بعد ایک زمانے تک زندہ رہے اور ان کے کلام کے متعدد مجموعے بھی ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ اگر انھوں نے یہ جہاں آشوب لکھا ہوتا تو ناممکن ہے کہ وہ اسے کسی مجموعے میں شامل نہ کرتے۔ سات سو شعر کی طویل نظم اور وہ اس کا ایک شعر بھی کہیں شائع نہ کریں، باور نہیں کیا جاسکتا۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے کہیں اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔ بلکہ جہاں آشوب تو رہا ایک طرف، زیر نظر قطعہ بھی امیر مینائی کے کسی دیوان میں نہیں ملتا۔ آخر کیوں ؟

غرض یہ کہ جب تک کوئی اور اس سے زیادہ قوی قرینہ نہ ہو، محض امیر تخلص کی بناء پر اس قطعے کو امیر مینائی سے منسوب کرنا میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہوگا۔

اس مضمون میں فاضل مضمون نگار سے بعض اور جگہ بھی تسامح ہوا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔

۱۔ عنوان میں میرزا غالب کے بعد لکھا ہے " (۱۷۹۶ء - ۱۸۶۹ء) " غالب کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی جو مطابق ہے ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کے۔ اس لیے ۱۷۹۶ء کی جگہ ۱۷۹۷ء لکھنا چاہیے تھا۔

۲۔ نواب یوسف علی خاں ناظم نے غالب کی شاگردی ۱۸۵۵ء میں اختیار نہیں کی۔ ان کا پہلا خط جس میں انھوں نے شعر اصلاح کے لیے بھیجے ہیں، ۵ فروری ۱۸۵۷ء کا ہے، اس لیے صحیح ۱۸۵۷ء ہے (اگرچہ خود غالب نے بھی غلطی سے ایک خط میں جو انھوں نے بے خبر کے نام لکھا ہے، سال شاگردی ۱۸۵۵ء ہی لکھا ہے)

۳۔ قاطع برہان ۱۸۶۳ء میں نہیں بلکہ ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) میں شائع ہوئی، جیسا کہ اس کی متعدد تاریخوں سے ظاہر ہے۔ (عمدہ سخن غالب وغیرہ)

۴۔ لکھا ہے:۔

" آغا احمد علی کے بعض شاگردوں کے رد میں غالب کے دو شاگردوں فدا اور سخن نے ایک رسالہ ہنگامۂ دل آشوب کے نام سے لکھا، جو ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۳ھ میں آرہ سے ...شائع ہوا۔ "

(الف) آغا احمد علی کے بعض شاگردوں کے رد میں غالب کے دو شاگردوں نے رسالہ ہنگامۂ دل آشوب نہیں لکھا۔ سب سے پہلا قطعہ۔

مولوی احمد علی احمد تخلص نبود   درخصوص گفتگوے پارس انشا کردہ است

غالب نے لکھا۔ اس کے جواب میں آغا احمد علی کے صرف - ایک شاگرد -- عبدالصمد فدا سلہٹی نے اسی زمین میں قطعہ لکھا تھا اور غالب کے شاگردوں نے فدا ہی کا جواب دیا تھا۔

(ب) غالب کے دو شاگردوں کے تخلص فدا اور سخن لکھے گئے ہیں۔ فدا کی جگہ باقر (سیّد باقر علی بہاری) ہونا چاہیے تھا۔

(ج) ہنگامۂ دل آشوب بھی انھوں نے نہیں لکھا تھا، بلکہ یہ مجموعہ ہے مختلف اصحاب کی منظومات کا، وہ زیادہ سے زیادہ مُرتّب کیے جاسکتے ہیں۔

(د) ہنگامۂ دل آشوب کی تاریخ اشاعت ۱۸۶۶ء (۱۲۸۳ھ) لکھی گئی ہے۔ اس کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ اپریل ۱۸۶۶ء (ذی الحج ۱۲۸۳ھ) میں چھپا۔ اس میں چار قطعے تھے۔ جو غالب، فدا، باقر اور سخن نے لکھے تھے۔ بعد کے منظوم اور نثری سوال جواب دوسرے حصے میں چھپے جو ستمبر ۱۸۶۶ء .... (جمادی الاول ۱۲۸۳ھ) میں شائع ہوا۔ صراحت کی ضرورت تھی۔

اب صرف ایک بات رہ گئی ہے کہ غالب نے جو خط منشی شیونرائن کو لکھا اور جس میں امیر مینائی کا کلام معیار الشعراء میں چھاپنے کی سفارش کی تھی، اس کی علّتِ غائی کیا تھی۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ انھوں نے یہ کسی دوستی کی بناء پر نہیں لکھا۔ اس کی تہ میں دور اندیشی بلکہ زمانہ سازی کام کر رہی ہے۔ خود غالب ۱۸۵۰ء (فروری) سے نواب فردوس مکان کے استاد اور اس دربار کے وظیفہ خوار ہوئے۔ امیر مینائی بھی اسی سال کے نصف آخر میں رام پور پہنچے اور دربار سے وابستہ ہوگئے۔ غالب نے خیال کیا کہ اگر رام پور میں کوئی ایسا شخص ہو جو وقتاً فوقتاً میرے حق میں کلمۂ خیر کہتا رہے اور ضرورت پڑنے پر میرے مفاد کی حفاظت کرتا رہے، تو یہ پسندیدہ بات ہے۔ اسی لیے انھوں نے یہ خط منشی شیونرائن کو لکھا۔ اس سے مقصود امیر مینائی کو ممنونِ احسان بنانا تھا، تاکہ حسبِ ضرورت ان سے کام لیا جاسکے۔

میرے اس شبہے کی دلیل یہ ہے:

غالب نے آرام کو لکھا ہے - ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ

کر ان غزلوں کو چھاپ دو۔ یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے سے ان (امیر) کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا اس کو اب کے معیار الشعراء میں چھاپ کر دو ورق یا چار ورق رامپور ان کے پاس بھیج دو ...۔ مجھ کو اس کی اطلاع دو۔"

اگر یہ محض دوستی کے باعث تھا، تو محض اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ میں امیر کو جانتا ہوں، تم ان کا کلام چھاپ دو۔ لیکن وہ اس پر کفایت نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ بات اخبار میں بھی چھاپ دی جائے، کہ امیر کا یہ کلام غالب کی سفارش پر چھاپا جا رہا ہے۔ پھر اسی پر بس نہیں کرتے، بلکہ اصرار کرتے ہیں کہ یہ خاص پرچہ امیر کے پاس پہنچے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ غالب کے لکھنے پر ان کا کلام گلدستۂ مذکور میں چھپا ہے۔ یہی بات ہے، جسے زمین ہموار کرنا کہتے ہیں۔ ان کی نظر مستقبل پر ہے کہ اس طرح امیر کو زیر بار احسان بنایا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(نوائے ادب بمبئی، جنوری ۱۹۵۵ء)

مالک رام :

لطائفِ غیبی کا مصنف

یہ کتاب ۱۸۶۵ میں سید سعادت علی کی "محرق قاطع برہان" کے جواب میں لکھی گئی تھی اس پر مصنف کا نام میاں داد خاں سیاح لکھا ہے مگر یہ محض مغالطہ ہے۔ اصل میں یہ کتاب میرزا کی اپنی تصنیف ہے۔ اس کے لیے کئی داخلی اور خارجی دلائل ہیں۔

۱۔ میرزا ایک خط میں میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں : (۱)

> تمھیں جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو تم میرے بازو ہو میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ لطائفِ غیبی نے اعداء کی دھجیاں اڑا دیں۔

اس خط میں دراصل اشارہ ہے خود لطائف غیبی کی طرف، جسے میرزا اس سے پہلے شائع کر چکے تھے۔ اس کتاب کے آغاز ہی میں عبارت ہے۔ :

> سیاح بحروبر، ہیچمداں بے ہنر، سیف الحق، میاں داد خاں حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔

اگر کتاب خود سیاح کی لکھی ہوتی تو وہ دیباچے میں سیف الحق کیسے لکھتے جب کہ غالب نے یہ خطاب انھیں بعد کو دیا۔ فی الحقیقت میرزا نے کتاب لکھ کر ان سے منسوب کی اور پھر گویا انھیں اطلاع دیتے ہوئے یہ لکھا کہ میں نے تمھیں سیف الحق خطاب دیا ہے اور یہ اسکی وجہ ہے۔ میرزا کے خط کے اقتباس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ کلام تو میرا ہو گا لیکن وہ تمھارے ہاتھ سے لکھا اور شائع کیا جائیگا یعنی میں اپنی تحریر اپنے نام سے شائع نہیں کرونگا (میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہیگی)

۲۔ جن دنوں لطائف غیبی چھپی ہے اسی زمانے میں میرزا نے خود ایک اعتراض قتیل کے کلام پر لکھا اور اخبار میں سیاح کے نام چھپوا دیا۔ اس سے بھی اس بیان کو توثیق ہوتی ہے۔ کہ "میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ چلتی رہے گی" میرزا لکھتے ہیں : (۲)

محمد میرزا خاں میرے سبھی بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے مسمیٰ بہ اشرف الاخبار، اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں، اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔

لطیفہ یہ ہوا کہ کسی مولوی صاحب نے اس اعتراض کا جواب دیا تو میرزا کو "اکمل الاخبار" میں جواب الجواب چھپوانا پڑا۔ سیاح کو لکھتے ہیں: (۳)

واقعی اعتراض کے جواب ایک مولوی نے لکھے ہیں۔ اس ہفتے کے "اکمل الاخبار" میں دیکھ لو۔ جو تم سے کلام کرے اسی انداز سے تم بھی کلام کرو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جواب الجواب سیاح کے نام سے نہیں چھپا تھا۔

۳۔ لطائف غیبی میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں اگر یہ تصنیف خود سیاح کی تھی تو جو نسخے سیاح کو بھیجے گئے تھے وہ انھیں خود درست کر لیتے غالب یا کسی اور شخص کو انھیں اغلاط بتانے کی ضرورت جبھی پیش آ سکتی تھی کہ یہ کتاب کسی اور کی لکھی ہوتی۔ میرزا ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں: (۴)

ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے اس میں وہی لطائف غیبی ہے جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا کہ تم ان بیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو۔

اس سے ظاہر ہے کہ کتاب میرزا نے لکھی تھی اور اب وہ اس کی غلطیاں درست کر کے سیاح کو بھیج رہے ہیں۔

۴۔ لطائف غیبی کے دیباچے کا آخری فقرہ ہے: (۵)

مجھ کو تو حمیت اور رعایت حق اس تحریر کی باعث ہوئی کہ میں نے بیس لطائف جمع کیے اور اس نگارش کا لطائف غیبی نام رکھا:

در پسِ آینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ سیاح تو "در پس آینہ طوطی صفت" بیٹھے ہیں، "استاد ازل"

(غالب) جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ دہرا رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو کتاب کا نام لطائف غیبی بجائے خود غمازی کر رہا ہے کہ

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

۵۔ ان شہادتوں کے علاوہ سب سے بڑی داخلی شہادت خود لطائف غیبی کا اسلوب بیان و طرز تحریر ہے سیاح کی اپنی لکھی ہوئی کتاب "سیر سیاح" موجود ہے جو ۱۸۷۲ء (۱۲۸۸ھ) میں چھپی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھنؤ اور کانپور کے دو مشاعروں اور بعض اور مقامات کا حال لکھا ہے۔ ساری کتاب میں صرف پانچ صفحے نثر کے ہیں لیکن اس کا بھی یہ حال کہ شروع سے آخر تک مسجع اور مقفیٰ فقرے ہیں اور تصنع اور آورد سے کوئی سطر خالی نہیں۔ اس کی نثر کو لطائف غیبی سے کیا نسبت، جس میں بیساختگی اور آمد کا یہ عالم ہے کہ نگاہ کہیں رکتی ہی نہیں اور اس پر ظرافت اور بذلہ سنجی فقرے فقرے سے عیاں جو غالب کی تحریر کا طرۂ امتیاز ہے۔

۶۔ مولانا حالی لکھتے ہیں: (۶)

> میرزا کی اردو نثر میں زیادہ تر خطوط اور رقعات ہیں، چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے ہیں جو برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں: لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامۂ غالب۔

سوال یہ ہے کہ مولانا آزاد اور حالیؔ لطائف غیبی پر میاں داد خاں سیاح کا نام مصنف کی حیثیت سے چھپا ہوا دیکھنے کے باوجود اسے کیوں غالب کی تصنیف قرار دیا؟ اس کا جواب اس کے سوائے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انھیں معلوم تھا کہ یہ میرزا کی تصنیف ہے۔

غرض کہ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لطائف غیبی میرزا کی تصنیف ہے اور سیاح کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بفرض محال اگر کچھ ہے تو بس اتنا ہی کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کے جامع کی حیثیت رکھتے ہیں جیساکہ درفش کاویانی کے آخر میں سیاح کی تاریخ کا عنوان بھی "جامع لطائف غیبی" ہے۔

غالب نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں چار کتابیں فارسی نثر میں اور نظم میں لکھیں۔ اردو میں ان کا سارا سرمایہ ایک مختصر دیوان اور خطوط کے مجموعوں کے علاوہ تین چار اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ ساٹھ سال کی لمبی مدت کا ثمرہ بلحاظ مقدار کچھ ایسا قابل توجہ یا مہتم بالشان نہیں۔ خود انھیں بھی اس کا احساس تھا مگر حالات کی نامساعدت اور ابنائے دہر کی ناقدری نے

ان کے تمام ولولوں کو سرد کر دیا۔ خود کہتے ہیں کہ میں زمانے سے زیادہ نہیں تھوڑی سی آسایش اور اطمینان قلب چاہتا تھا اگر یہ مجھے یسر آ جاتے تو میں تخیّل کی بلند پروازی سے ارباب فن سے داد حاصل کرتا۔لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو جو کچھ انھوں نے اس پریشان حالی میں بھی لکھا اور صفحۂ قرطاس پر جو نقش جاوداں بنائے انکی قدر و قیمت کا اندازہ کس نے کیا اور اسکی صحیح داد بھی انھیں کب ملی؛

"مہر نیمروز" میں بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (۸)

مجھے اپنی خوش بختی پر جتنا ناز بھی ہو بجا ہے کہ آپ کا کا سا حکمران میرا خداوند گار و آقا ہے لیکن میری جان آپ کے قربان آپ کو بھی تو فخر ہونا چاہیے کہ غالب کا سا شاعر آتشیں نوا آپ کا غلام ہے۔ اگر آپ کا التفات میرے ہنر کے مطابق ہو تو میری جگہ آپ کے دیدہ و دل میں ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں۔ صاحبقران ثانی شاہ جہاں نے کلیم کو سیم و زر اور لعل و گہر سے تُلوایا تھا میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں، آپ سخن سنج حضرات کو بس یہ حکم دیں کہ وہ ایک بار میرے کلام ہی کو کلیم کے کلام کے ساتھ جانچنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

مولانا حالی لکھتے ہیں: (۹)

اس مضمون کو جو لوگ میرزا کے رتبے سے واقف نہیں ہیں، شاید خود ستائی اور تعلّی پر محمول کریں گے مگر ہمارے نزدیک میرزا نے اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو ان کے زمانے کے اہل نظر اور اہلِ تمیز ان کی نسبت رائے رکھتے تھے۔

خود میرزا کو گہرا احساس تھا کہ لوگوں نے میرے صحیح مرتبے اور مقام کا اندازہ نہیں لگایا اور افسوس کرتے ہیں کہ دنیا اپنی کم نظری کے سبب میری صلاحیتوں سے کماحقہٗ مستفیض نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں: (۱۰)

پنجاہ دو سال مغز سخن کا فتم امروز کہ شششمین سال از عرم گز ران می گزرد سخن آفرین راسپاس گزارم دہم جز آں بخشندہ بخشایش گر کس نیار د دانست کہ دریں پنجاہ و دوسال چہ درہائے معنی۔

بروے من کشادہ اند و کرسی اندیشہ مرا درفرازستان آگہی بکدام پایہ نہادہ اند حیف، کہ ابنائے روز گار حسن گفتار مرا نشناختند، مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیاب شناسائے فرۂ ایزدی نگشتند و ازیں نمائش ہائے نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام سرگراں گذشتند. گوئی نظیری ہمدرد من مقطع آں مینو آرامشگاہ نوائے ساز دم سرد من است:

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

(ذکرِ غالب، بار پنجم، دہلی، ۱۹۵۱ء)

حواشی

(۱) اردوے معلیٰ: ۱۳

(۲) اردوے معلیٰ ۱۳

(۳) اردوے معلیٰ: ۳۸۳

(۴) اردوے معلیٰ ۱۹

(۵) لطائف غیبی: ۳

(۶) یادگارِ غالب: ۱۹۸ یہی بات ان سے پہلے محمد حسین آزاد نے بھی لکھی ہے۔ (آبِ حیات: ۹۳۹)

(۷) کلیاتِ نثر: ۱۵ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

(۸) کلیاتِ نثر: ۳۶۹

(۹) یادگارِ غالب: ۱۴

(۱۰) درفشِ کاویانی: ۱۳۱ - ۱۳۲

مالک رام :

قادِر نامے کا مُصنّف

"خالق باری" اور "آمدنامہ" کی طرز پر ہم معنی فارسی اور اردو لغات پر مشتمل ایک مختصر منظوم رسالہ "قادر نامہ" کے نام سے مشہور ہے جس کی تالیف غالب سے منسوب ہے۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے میر افضل علی عرف میرن صاحب کے حالات میں میرن صاحب کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے (۱) کہ میرزا غالب نے یہ رسالہ عارف کے دونوں صاحبزادوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو فارسی پڑھانے کے لیے لکھا تھا۔ امیر مینائی بھی اپنے تذکرے میں اسے غالب کی تصنیف بتاتے ہیں (۲)۔ اس کے باوجود غلام رسول مہر کو رسالے کے غالب کی تصنیف ہونے میں شک ہے (۳)۔ انھوں نے اپنے نظریے کی تائید میں کوئی دلیل نہیں پیش کی۔ اور جب تک کوئی ناقابل تردید ثبوت سامنے نہ آئے، میرن صاحب اور امیر مینائی کی روایت بہرحال قابل ترجیح ہے۔ میرے نزدیک خود قادر نامے میں بعض ایسی داخلی شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رسالہ واقعی غالب کی تصنیف ہے۔

میرزا نے اپنی فارسی تصنیف "پنج آہنگ" کے آہنگ دوم (زمزمۂ چہارم) (۴) میں فارسی کے چند الفاظ دیے ہیں اور ان کی تشریح کرتے ہوئے ساتھ ہی اردو (ہندی) کے مرادف کلمے لکھے ہیں۔ یہ الفاظ تقریباً سب کے سب پرانی فارسی یعنی پہلوی زبان کے ہیں جو آج کل بالعموم مستعمل نہیں۔ مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مقامات پر "قادر نامہ" میں بھی یہی الفاظ اسی نہج سے نظم میں درج کر دیے گئے ہیں۔

۱۔ قادر نامے میں ہے :

مُنھ پہ گر جُھرّی پڑے آژنگ جان   فارسی چھینکے کی تو آونگ جان

پنج آہنگ میں لکھتے ہیں (۵) "آژنگ شکنی کہ بروئے افتد ہندی جھرّی گویند اور اس کے معاً بعد ہے :

"آونگ بمعنی ریسمان کہ بسقف آویزند و چھینکا در ہندی خوانند"

۲۔ اگلا شعر ہے:

مسّہ آژخ اور چھالا آبلہ | اور ہے دائی جنائی قابلہ

پنج آہنگ میں ہے (۶):

" آژخ عربی ثوثول و ہندی مسّہ "

نیز " پازاچ و آں راپیش نشیں نیز گویند، ہندی آں دای جنائی "

یہاں دائی جنائی قابل توجہ ہے جو دونوں جگہ استعمال ہوا ہے حالانکہ قابلہ کے لیے صرف دائی کا لفظ کافی تھا اور آمدنامہ میں صرف دائی ہی پر کفایت کی گئی ہے:

اخت بہن اور اخ ہے بھائی | مرضعہ انا قابلہ دائی

۳۔ پھر لکھتے ہیں:

اونٹ اشتر اور اشغر سیہ ہے | گوشت ہے لحم اور چربی پیہ ہے

یہاں اشغر کا لفظ قابل غور ہے۔ پنج آہنگ میں دونوں لفظ ایک ساتھ آگئے ہیں (۷):

" اشغر بوزن اشتر اسم جانور یست خار دار کہ بہندی سیہ گفتہ شود "

۴۔ قادر نامے کا شعر ہے:

زندگانی ہے حیات اور مرگ موت | شوی خاوند اور انباغ سوت

یہاں انھوں نے سوت کے لیے انباغ لکھا ہے، جو فارسی نہیں بلکہ ترکی لفظ ہے۔ عربی میں سوت یا سوکن کے لیے ضرہ آتا ہے اور فارسی والے بھی یہی بولتے ہیں۔ چنانچہ آمدنامہ میں سوت کے لیے ضرہ لکھا ہے لیکن مرزا نے چونکہ پنج آہنگ میں عربی لفظوں سے اجتناب کیا ہے اس لیے وہاں بھی انباغ ہی لکھا ہے۔ لکھتے ہیں (۸):

انباغ بمعنی دو زن کہ یک شوہر داشتہ باشند و آنرا بہندی سوت و سوکن نامند

۵۔ قادر نامے میں لکھتے ہیں:

چکسہ پڑیا، کیسہ کا تھیلی ہے نام | فارسی میں دھپے کا سیلی ہے نام

سیلی مرزا کا دل پسند لفظ ہے اور ان کے کلام میں بیسیوں جگہ استعمال ہوا ہے۔

۶۔ قادر نامہ:

آجل اور آروغ کی ہندی ڈکار | مے شراب اور پینے والا میگسار

پنج آہنگ (۱۰): " آجل بجیم مضموم عربی جشاء و ہندی ڈکار و اسم دیگر آروغ "

قادر نامہ:

ہے قلم کا فارسی میں خامہ نام　　　ہے غزل کا فارسی میں چامہ نام

چامہ غزل کے لیے لکھنا خاص غالب کا انداز ہے"۔ انھوں نے یہ پہلوی لفظ اپنی فارسی نثر میں کئی جگہ لکھا ہے اور پنج آہنگ میں بھی متعدد مقامات پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر دستنبو میں تفتہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

آں سپہر مہر را ماہ دو ہفتہ، شیوا زبان ہرگوپال تفتہ کو مرزا تفتہ مہر خوانش دادہ ام از میر نُہ سفتہ زر (۱۲) بمن فرستادہ و چامہ و نامہ پیوستہ فرستد

قدیم تاریخوں اور تذکروں کے علاوہ کسی اور فارسی مصنف کے ہاں غزل کے لیے چامہ کا لفظ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

۔ قادر نامہ:

بھڑ کی بھائی فارسی زنبور ہے　　　دسپنا انبر ہے اور انبور ہے

پنج آہنگ (۱۳): انبر بہ وزن قنبر آلہ ایست کہ آتش بدان کشند و آں را دسپنا نامند

اگرچہ دسپنا بھی اصل میں فارسی اور دست پناہ کا مخفف ہے، لیکن فارسی میں اسے آتش گیر کہتے ہیں۔ انبر اور انبور دونوں ترکی لغات ہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ مرزا نے دونوں جگہ انبر ہی لکھا ہے۔

۹۔ قادر نامہ:

پست اور ستّو کو کہتے ہیں سویق　　　ژرف اور گہرے کو کہتے ہیں عمیق

پنج آہنگ (۱۴): "پست بباے مکسور، عربی سویق و ہندی آں ستّو آں آرد یست بریاں۔

ستّو کے لیے سویق فارسی میں عام طور پر مستعمل ہے لیکن مرزا نے یہاں بھی ایک پرانا لفظ ڈھونڈ نکالا اور دونوں جگہ نظم اور نثر میں اردو، فارسی اور عربی تینوں کے لفظ دیے ہیں۔

۱۰۔ قادر نامہ:

جس کو کہتے ہیں جمائی فازہ ہے　　　جو ہے انگڑائی وہی خمیازہ ہے

پنج آہنگ (۱۵): آسا صیغہ امراست از آسودن، و بمعنی تمکین و وقار، نیز آید، و معنی ماند دہد و فازہ اگویند کہ ہندی آں جمائی ست

یہاں ایک بات قابل توجہ یہ ہے کہ دونوں جگہ جمائی لکھا ہے، نہ کہ جماہی جو اس لفظ کا دوسرا تلفظ ہے۔ سیلی کی طرح خمیازہ بھی مرزا کا دل پسند لفظ ہے۔

۱۱۔ قادر نامہ:

یارہ کہتے ہیں کڑے کو ہم سے پوچھ　　　پاڑ ہے تالاز ۔ اک عالم سے پوچھ

اس کے لیے پنج آہنگ میں لکھتے ہیں (۱۶):

یارہ د آں را دست بر نجن نیز گویند د آں پیرایہ ایست کہ زناں بدست
فگنند و ہندی آں کڑا۔

۱۲۔ قادر نامہ

اینٹ کے گارے کا نام آژند ہے　　　ہے نصیحت بھی وہی ۔ جو پند ہے

پنج آہنگ (۱۷): آژند بالف ممدودہ وزای فارسی مفتوح ہندی گارہ خوانند بکاف فارسی

۱۳۔ قادر نامہ:

اخکلندو جھنجھنا نیز نیرد ہے زور　　　بادفرہ پھرکی ہے اور ہے دزد چور

پنج آہنگ (۱۸): بادفرا و بادفرا اسم چرمے مدور کہ ریسمانے در آں انداختہ بگر دانند
وہندی آں پھرکی است۔

۱۴۔ قادر نامہ:

نام بکری کا کلاش اور عنکبوت　　　کہتے ہیں مچھلی کو ماہی اور حوت

پنج آہنگ (۱۵): کلاش عنکبوت و اسم دیگر آں کارتن وخانہ آں رانسیج گویند

یہاں میں نے دو شعر اور ان کے مقابل کی عبارتیں نقل کی ہیں جو ایک ہی لفظ سے متعلق دونوں جگہ ملتی ہیں۔ اب چند ایسے شعر ملاحظہ فرمائیں، جن میں خالص پارسی یا ترکی زبان کے ایسے لغات آئے ہیں، جو بہت کم مستعمل ہیں؛ اور جو مرزا کی خصوصیات میں سے ہیں:

آگ کا آتش اور آذر نام ہے　　　اور انگارے کا اخگر نام ہے

ہے زنخ ٹھوڑی ۔ ذقن بھی ہے وہی　　　خاد ہے چیل اور زغن بھی ہے وہی

پھر غلیواز اس کو کہیے جو ہے چیل　　　چیونٹی ہے مور اور ہاتھی ہے پیل

خر گدھا اور اس کو کہتے ہیں الاغ　　　دیگدان چولھا جسے کہیے اجاغ

خانہ گھر ہے اور کوٹھا بام ہے　　　قلعہ دژ ۔ خندق کا کھائی نام ہے

ہے کہانی کی فسانہ فارسی ۔۔۔ اور شُغلے کی زبانہ فارسی
لو سنو کل کا سبق آجاؤ تم ۔۔۔ پوزی افسار اور دمچی پار دم
بینگ انگوزہ ہے اور ارزیز رانگ ۔۔۔ ساز باجا اور ہے آواز بانگ
روئی کی پونی کا ہے پاغند نام ۔۔۔ دوک تکلے کو کہیں گے لا کلام
پند کو اندرز بھی کہتے ہیں ہاں ۔۔۔ ارض ہے پر مرز بھی کہتے ہیں ہاں

آخر میں چند ایسے اشعار لکھتا ہوں جن میں بعض ایسے لفظ آتے ہیں جو مرزا کے بہت دل پسند ہیں اور انھوں نے خاص طور پر اپنے کلام میں لکھے ہیں:

انگبیں، شہد اور عسل، یہ اے عزیز ۔۔۔ نام کو ہیں تین، پر ہے ایک چیز
روئی کو کہتے ہیں پنبہ، سن رکھو ۔۔۔ آم کو کہتے ہیں انبہ سن رکھو

(یوں آم کو فارسی میں نغزک کہتے ہیں)

گیتی اور گیہاں ہے دنیا، یاد رکھ ۔۔۔ اور ہے ندّاف دھنیا، یاد رکھ
کوہ کو ہندی میں کہتے ہیں پہاڑ ۔۔۔ فارسی گلخن ہے، اور ہندی ہے بھاڑ
تکیہ بالش اور بچھونا بسترا ۔۔۔ اصل بستر ہے، سمجھ لو تم ذرا
بسترا بولیں سپاہی اور فقیر ۔۔۔ ورنہ بستر کہتے ہیں برنا و پیر

غرض کہ اس مختصر رسالے میں متعدد داخلی شہادتیں ایسی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ میرزا غالب کی تصنیف ہے۔ اس میں بعینہٖ اسی نہج پر فارسی الفاظ کا موجود ہونا جو وہ پنج آہنگ میں لکھ چکے تھے۔ خالص پہلوی لغات کا استعمال جن سے مرزا کو خاص شغف تھا۔ ان الفاظ کی موجودگی جو مرزا کی نگارش کی خصوصیات میں سے ہیں۔ یہ سب باتیں اسے مرزا کی تصنیف ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ابھی میں نے طرز کلام اور اسلوب بیان کا ذکر نہیں کیا، ورنہ اس سے بھی ہم اسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔

پس روایت اور درایت دونوں کے رو سے یہ ثابت ہے کہ قادر نامہ میرزا غالب کے دماغ کی پیداوار ہے۔
(مشمولہ "تحقیقی مضامین"۔ دہلی ۱۹۸۰ء)

حواشی

۱۔ اردو، (۱۹۳۶ء) : ۶۰۵

۲۔ انتخاب یادگار : ۴۴ (مطبوعہ ۱۲۹۰ھ)

۳۔ غالب : ۳۳۸ (تیسرا ایڈیشن)

۴۔ کلیات نثر غالب : ۳۵ (نولکشور، کانپور۔ ۱۲۹۲ھ)

۵۔ ایضاً : ۳۶

۶۔ ایضاً : ۳۶

۷۔ ایضاً : ۳۷

۸۔ ایضاً : ۳۸

۹۔ ایضاً : ۳۹

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ پنج آہنگ : ۳۸

۱۲۔ سفتہ زر بمعنی ہنڈی

۱۳۔ پنج آہنگ : ۳۶

۱۴۔ ایضاً : ۳۷

۱۵۔ ایضاً : ۳۸

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایضاً : ۳۶

۱۸۔ ایضاً : ۳۷

۱۹۔ ایضاً : ۳۸

ڈاکٹر شوکت سبزواری:

قادر نامۂ غالب:
غالب کی زندگی میں شائع ہونے والے تین ایڈیشن

[قادر نامۂ غالب کی اصالت پر بعض علمی حلقوں کے شبہات کا رد ڈاکٹر شوکت سبزواری نے غالب کی زندگی میں شائع ہونے والے تین ایڈیشنوں کی تفصیل سے کیا تھا، جو خارجی شہادت کے زُمرے میں آتا ہے۔ ذیل میں اسے اُن کے مقالے "قادر نامۂ غالب" رسالۂ اردو کراچی، شمارہ ۱، ۱۹۷۱ء سے اقتباس کیا جاتا ہے۔ نجم الاسلام]

۱۔ لغت اور زبان سے غالب کی دل چسپی تو ابتدا ہی سے تھی، لیکن باقاعدہ اور منظّم طور پر اس کا اظہار اوّلاً ۱۸۳۵ء میں، اور اس کے بعد ۱۸۵۴ء کے لگ بھگ اس وقت ہوا جب زین العابدین خاں عارف کے لڑکوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) کو غالب نے فرزندی میں لیا، اور بقول مولوی عبدالحق انھیں فارسی پڑھانے کے لیے نصاب الصبیان ابونصر فراہی کے انداز پر ایک منظوم رسالہ لکھ کر اس کا نام "قادر نامہ" رکھا۔

یہ رسالہ شاید اس لیے کہ تعلیمی نوعیت کا تھا اور مبتدیوں کو فارسی سکھانے کے لیے لکھا گیا تھا، غالب کے ادبی مرتبے کی نسبت سے وہ مقام حاصل نہ کر سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ بعض علمی حلقے تو یہ باور کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوئے کہ یہ چھوٹا سا رسالہ غالب کے فکر سحر کار کا نتیجہ ہے۔ جنھوں نے غالب کے فکر کی پیدا وار سمجھا انھوں نے بھی اس سے کچھ زیادہ اعتنا نہ کیا، نہ اس کے زمانۂ تصنیف کی تعیین ہوئی نہ اس کے خطّی نسخوں اور چھاپوں کا استقصاء کیا گیا۔ (ص ۵)۔

۲۔ موجودہ تحقیق کے مطابق قادر نامے کا پہلا ایڈیشن ۱۲۷۲ ہجری (۱۸۵۶) میں مطبع سلطانی سے شائع ہوا۔ (ص ۶)

۳۔ ۱۲۸۰ ہجری (۱۸۶۳ء) کے ایڈیشن کو جو محبس پریس دہلی سے شائع ہوا اور جس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔ قادر نامے کا دوسرا ایڈیشن بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ قادر نامے کا دوسرا ایڈیشن نہیں۔ تیسرا ایڈیشن ہے۔ (ص ۶)

۴۔ دوسرا ایڈیشن برادر عزیز خلیل الرحمن صاحب داودی کی عنایت سے اس وقت میرے سامنے ہے۔ یہ جمادی الاولی ۱۲۷۸ ہجری (نومبر ۱۸۶۱ء) میں۔ محبس پریس والی اشاعت سے دو سال پہلے مطبع العلوم دہلی سے شائع ہوا۔ جب تک اور کوئی دوسری اشاعت سامنے نہ ہو۔ غالب کی زندگی میں شائع ہونے والے ایڈیشنوں میں زیر نظر اشاعت قادر نامے کی دوسری اشاعت ہوگی اور محبس پریس والی اشاعت سے اقدم اور اہم سمجھی جائے گی۔ (ص ۶)

سید امیر حسن عابدی:

بابر بعیش کوش والا شعر کس بابر کا ہے؟

ابھی حال میں ڈاکٹر عبدالحسن نوائی نے لکھا ہے کہ "بابر (۱) بزبان فارسی توجہ فراوان داشتہ و بدین زبان می گفتہ ... از اشعار او نمونہ ہای در کتب مختلف می توان دید (۲) ۔" نیز اکبر نامہ (۳) کے حوالے سے یہ شعر نقل کیا ہے۔

نو روز و نوبہار و می و دلبری خوش است

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

مگر مجھے اکبر نامہ (۴) میں یہ شعر نہیں ملا۔ بہرحال اپنے مضمون کے حاشیے میں نوائی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "شمار بیشتری از اشعار او در کتاب "شاہان شاعر" (۵) ... آمدہ (۶) مولف "شاہان شاعر" نے بھی یہ شعر ظہیر الدّین بابر کی طرف منسوب کیا اور ... ہے کہ انھوں نے عید کے دن یہ پوری غزل کہی تھی۔ (۷)

صرف نوائی صاحب ہی نہیں بلکہ بہت سے تذکرہ نویسوں اور دانشمندوں نے اشتباہاً اس شعر کو ظہیر الدّین بادشاہ ہند کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مولف "تذکرۂ شعرا پنجاب" نے بھی اس شعر کو ظہیر الدّین بابر کی طرف منسوب کیا اور لکھا ہے کہ باغ کابل کے حوض پر یہ شعر کندہ کیا گیا ہے۔ راشدی صاحب مرحوم نے بھی تعلیقات (۸) میں لکھا ہے کہ بابر نے باغ کابل میں ایک حوض کے پتھر پر یہ شعر کندہ کروایا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ خود بابر نے یہ شعر کہا تھا؟ البتہ اس نے اپنا لیا تھا۔

میرے خیال میں سب سے پہلے مولف تاریخ فرشتہ نے یہ شعر ظہیر الدّین بابر بادشاہ دہلی کی طرف منسوب کیا تھا۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں: "در بیرون کابل بدامنۂ مرغزاری کہ از بہشت برین نشانی بود، حوض کوچک در سنگ کندہ شراب ارغوانی پُر می کرد و با مردم خوش طبع ... بزم نشاط برپا کرد (۹) داد انبساط داد و این بیت خود را در کنار آن حوض ... کندہ بود۔ بیت:

نو روز و نوبہار و می و دلبری خوش است

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

تزک بابری میں ایک جگہ بابر نے لکھا ہے کہ "برہمین چشمہ در سنگی کہ پہلوی این چشمہ است، ... بیت راکندہ و ثبت نمود

شنیدم کہ جمشید فرخ سرشت

بسر چشمۂ بر بسنگی نوشت (۱۰)۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ابیات خود بابر نے کہے تھے؟ ہرگز نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر ایک اور بابر کا ہے جو عام طور سے مشہور نہیں ہیں۔ ولیم بیل نے دونوں بابروں کا ذکر کیا ہے۔ بابر قلندر کے متعلق لکھا ہے کہ بابر (سلطان) ابوالقاسم میرزا (۱۱) کے بیٹے اور شاہ رخ میرزا (۱۲) کے پوتے تھے۔ نیز انھوں نے خراسان میں ۸۵۵ھ / ۱۴۵۲ء سے ۸۶۰ھ / ۱۴۵۶ء تک حکومت کی۔ ۸۶۱ھ / ۱۴۵۷ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ (۱۳)۔ مولفین تذکرۂ منتخب اللطائف اور ریاض الشعرا۔ نے بھی لکھا کہ بابر بہادر ابوالقاسم بایسنغرمرزا کے بیٹے تھے۔ (۱۴) نیز ان کے یہ دو شعر نقل کیے ہیں۔

گفتم بتاچہ چارہ کنم درغم تو گفت

انجا جز آنکہ جان بسپارند چارہ نیست

نوروز (۱۵) و نوبہار ومی و دلبران مست

بابر بعیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست

دولت شاہ سمرقندی نے ابوالقاسم بابر بہادر کے متعلق بہت تفصیل سے لکھا۔ نیز ان کو "شاہزادہ عالی قدر سلطان محمد بن بایسنغر ... پادشاہ زادہ کریم طبع و مستعد و سخن شناس و مردانہ و شجاع و زیبا" (۱۶) بتلایا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ رخ سلطان اسے بادشاہ بنانا چاہتا تھا، مگر گوہر بیگم نہیں چاہتی تھیں۔ بالآخر قم، ری، نہاوند اور ان کے اطراف بغداد تک سلطان محمد کو دیے گئے۔ نیز سلطان محمد نے بھائیوں کی شکایت میں شاہ رخ کو یہ غزل بھیجی تھی:

من کہ ہمچوں ذرہ رو از مہر پنہان کردہ ام

از جفای روزگار و جور اخوان کردہ ام

ان کی سخاوت کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ کسی نے ان کے سامنے کہا کہ حاتم طائی نے اپنے گھر کے چالیس دروازے بنوائے تھے اور اگر کوئی فقیر چالیسوں دروازوں پر آتا تھا تو اس کو ہر دروازے پر ملتا تھا۔ اس پر بابر قلندر نے کہا کہ پہلے ہی دروازے پر اتنا دے دیا جائے کہ دوسرے دروازے پر جانے کی نوبت نہ آئے۔

ایک مرتبہ ۔ سلطان اعظم ابوالقاسم بابر بہادر " نے شیخ الشیوخ الفاضل صدر الدّین محمد الرّاس سے سوال کیا کہ بزرگان دین نے جو کچھ توحید کے متعلق کہا ہے ان کے متعلق ان کا کیا خیال ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ اگر محی الدین عربی (۱۷) ، رومی (۱۸) ، عطّار (۱۹) ، عراقی (۲۰) ، اوحدی (۲۱) ، اور حسینی (۲۲) نے کہا ہے تو اس پر یقین کیا جاسکتا ہے ۔ لیکن اگر نزاری قہستانی (۲۳) اور پیر تاج تولبی نے کہا ہے تو مہمل اور بدعت ہے۔

جب شاہزادہ ابوالقاسم بابر نے امیر شاہی سبزواری (۲۴) کو اپنے وطن سے استرا باد بھیجا تو انھوں نے استرا باد پہنچ کر یہ غزل کہی تھی :

تو شہریار جہان ما غریب شہر تو ایم

وطن گذاشتہ بی خان و مان ز بہر تو ایم

مولوی کریم الدین نے لکھا ہے کہ ابوالقاسم بابر نے آخر میں شراب ترک کر دی تھی اور بیشتر گویّوں اور قوّالوں سے گانا سنا کرتا تھا :

این ہمہ طمطراق کن فیکون

شمّہ ای نیست بین اہل جنون

یہ پڑھتے ہی وہ ایسا غائب ہوا کہ باوجود تلاش کے نہ مل سکا ۔ (۲۵) دولت شاہ کے قول کے مطابق یوں شان سے ابوالقاسم بابر کا جنازہ اٹھا کہ ویسا کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کا بھی نہیں اٹھا تھا ۔ ابوالقاسم بابر کے عہد کے علما ، و مشائخ میں محمد الرّداسی العکاشی ، مولانا محمد جاجرمی اور مولانا شرف الدّین علی یزدی (۲۶) اور شعرا ، میں طوطی شیرازی (۲۷) خواجہ محمد برسہ ، مولانا قنبری آفتاب نیشاپوری ، مولانا حسن شاہ ، ولی قلندر اور بدیعی سمرقندی ہیں۔

امیر علی شیر نوائی (۲۸) ان کے اشعار کو بڑے غور سے پڑھتے ، نیز اس پر تعجب کرتے تھے۔ وہ خود بھی اچھے شاعر تھے اور دوسروں کی صحیح داد دیتے تھے۔

سلطان محمد فخری نے روضۃ السلاطین میں بابر قلندر ابن بایسنغر مرزا کو " بس درویش صفت و خوش خلق و کریم الطبع و عالی ہمت بادشاہ " (۲۹) کہہ کر دولت شاہ کے الفاظ کو دہرایا ہے ۔ نیز ان کی یہ غزل دے کر :

در دور ما ز محنۃ سواران یکی منی است

راشدی صاحب مرحوم نے حاشیے میں لکھا ہے کہ صاحب مرآۃ الخیال نے اس غزل کو بابر بادشاہ دہلی کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ صاحب روضۃ السلاطین نے ابوالقاسم بابر کے تین شعر دیئے

ہیں، جن میں ایک ہی شعر ہے:

نو روز و نوبہار و گل و می و دلبران

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست (۳۰)

راشدی صاحب نے اس کے حاشیے میں یہ بھی لکھا ہے کہ صاحب مرآۃ الخیال نے اس کو بھی بابر بادشاہ دہلی کی طرف منسوب کر دیا ہے، در آنحالیکہ مرآۃ الخیال میں یہ اشعار موجود نہیں ہیں (۳۱) صاحب صبح گلشن نے اس غزل کے صرف حسب ذیل شعر کو نقل کر کے اسے ظہیر الدّین بابر بادشاہ دہلی کی طرف منسوب کر دیا ہے:

گفتم بتا چہ چارہ کنم در غم تو گفت

اینجا جز آنکہ جان بسپارند چارہ نیست (۳۲)

سلطان محمد فخری نے تحفۃ الحبیب (۳۳) لکھ کر بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، جس کا ابھی تک پوری طرح سے اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔ انھوں نے سعدی (۳۴) سے لے کر جامی (۳۵) تک کے تمام مشہور اور غیر معروف شعراء کے کلام کو یکجا کر دیا ہے، جن میں دونوں بابروں کا کلام بھی الگ الگ آگیا ہے۔ ایک کو وہ "بابر بادشاہ" اور دوسرے کو "سلطان بابر قلندر" لکھتا ہے۔ فخری نے عام طور سے کسی ایک بڑے شاعر کی غزل دے کر دوسرے بعد میں آنے والے شعراء کی ہم طرح اور ہم ردیف و قافیہ غزلوں کو جمع کر دیا ہے۔ مثلاً حافظ کی اس مشہور غزل کو دے کر:

راہیست راہ عشق کہ ہیچش کنارہ نیست

فروغی سمرقندی، انیسی (۳۶) اور خود اپنی غزل کے ساتھ "سلطان بابر قلندر" کی یہ غزل بھی دی ہے:

ہر دل کہ والۂ رخ آن ماہ پارہ نیست

اورا مگوی دل کہ کم از سنگ خارہ نیست

گفتم بتا چہ چارہ کنم در غم تو گفت

اینجا بغیر کشتہ شدن ہیچ چارہ نیست

نو روز و نوبہار و می و دلبران خوش است

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

بگشای مصحف رخ اگر می کشی مرا

در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

تاثیر غمزہ یا بدہ اندر کمال حسن

بنمای دل کہ از پی او پارہ پارہ نیست

اور حافظ (۳۷) کی یہ غزل دے کر :

یاد بادا کہ سرکوی توام منزل بود

مہری (۳۸) اور بنائی (۳۹) کی ہم طرح غزلوں کے ساتھ " حضرت بابر بادشاہ " ہروی کی یہ غزل بھی دی ہے :

لالہ را داغ تو آن دم کہ مرا حاصل بود

داغ عشق تو مرا لالہ صفت در دل بود

یار من رفت و مرا فرقت او کرد ہلاک

چکنم عمر من دل شدہ مستعجل بود

رخ نمودی و مرا مردنم آسان کردی

ورنہ در فرقت تو زیستنم مشکل بود

دوش چشم تو چو تیغ از پی کین بر می داشت

طاق ابروی تو ہم خون مرا مایل بود

بابر از عقل فرو مایہ چہ تشویش کند

ای خوش آن دم کہ زہی بیخود ولا یعقل بود

اگر فخری دونوں کے کلام کو ایک جگہ جمع نہ کرتے تو شبہے کی گنجایس باقی تھی ۔ مگر اب جب کہ دونوں کے کلام مع القاب و آداب کے دے دیے گئے ہیں تو کسی شبہے کی گنجایش باقی نہیں رہتی ۔

بابر نے اپنی خود نوشت میں دوسرے شعرا ۔ کے اشعار بھی نقل کیے ہیں :

عیب رندان مکن ای زاہد پاکیزہ سرشت

کہ گناہ دگران بر تو نخواہند نوشت

من اگر نیکم و گر بد تو برو خود را باش

ہر کسی آن درود عاقبت کار کہ کشت (۴۰)

حواشی

(۱) ۸۸۸ ـ ۹۰۳ ہجری / ۱۴۸۳ ـ ۱۵۳۰ عیسوی

(۲) دکتر عبدالحسین نوائی: پردہ ای دلپسند از نقش فارسی در روابط سیاسی ایران و ہند (۳۰ ـ ۳۳) مجموعۂ سخن رانیہای نخستین سیمینار پیوستگیہای فرہنگی ایران و شبہ قارہ ۔ جلد اوّل ۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ۔ اسلام آباد ۱۹۹۳ء

(۳) جلد اوّل ۔ ص ۱۳۱

(۴) ابوالفضل: اکبر نامہ ۔ دفتر اوّل ۔ تصحیح آغا احمد علی ۔ تحشیہ مولوی عبدالرحیم ۔ ایشیاٹک سوسائٹی ۔ بنگال ۔ مطبع مظہر العجائب المعروف بہ اردو گائڈ پریس ۔ کتاب پبلشنگ ہاؤس ۔ نئی دہلی ۔

(۵) ابوالقاسم حالت: شاہان شاعر ۔ ۱۳۳۶ ۔ تہران ۔ انتشارات علمی ۔ ص ۲۰۳ ـ ۲۰۸

(۶) ص ۳۵

(۷) سرہنگ خواجہ عبدالرشید: تذکرۂ شعرای پنجاب (ص ۹۸) ۔ ۱۳۳۶ ۔ اقبال اکادمی ۔ کراچی

(۸) تعلیقات روضۃ السلاطین (ص ۲۳۳)

(۹) محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی المشہور بہ فرشتہ: تاریخ فرشتہ ۔ جلد اوّل (ص ۲۱۱) ۔ مطبع منشی نول کشور ۔ کانپور ۔ ۱۲۸۱ ہجری

(۱۰) تزک بابری (ورق ۹۳) نسخۂ خطی ۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی ۔ لائبریری ۔ اس نسخے کے آخر میں کاتب لکھتا ہے: " تمام شد تزک بابری بتاریخ دواز دہم رجب ۱۱۲۳ھ " ۔ یہ نسخہ پرانا نہیں ہے ۔ مگر بہت خوبصورت اور صاف ستھرا ہے ۔

(۱۱) ۸۰۲ھ ـ ۸۳۶ھ / ۱۳۹۹ ـ ۱۴۳۳ء

(۱۲) ۸۰۸ھ ـ ۸۵۰ھ / ۱۴۰۵ ـ ۱۴۳۶ء

(۱۳) Thomas William Beale

An Oriental Biographical Dictionary, Kraus Reprint Corporation, New York, 1965

(۱۴) (الف) رحم علی خان ایمان: تذکرۂ منتخب اللطائف (ص ۹۱) ۔ باہتمام سید محمد رضا جلالی نائینی و دکتر سید امیر حسن عابدی ۔ چاپ تابان ۔ ۱۳۴۹ھ ش

(ب) والہ داغستانی: ریاض الشعراء ص ۱۱۹ ۔ نمبر ۳۷ ، ۵۳ ۔ نیشنل میوزیم ۔ نئی دہلی

(۱۵) منتخب اللطائف

(۱۶) دولتشاہ سمرقندی : تذکرۃ الشعراء (ص ۲۶) تحقیق و تصحیح محمد عباس ۔ کتابخانۂ بارانی

(۱۷) ابن عربی ۔ ابوبکر محی الدّین محمد بن علی حاتمی طائی اندلسی ۔ ۵۶۰ ۔ ۶۳۸ ہجری / ۱۱۶۵ ۔ ۱۲۴۰ عیسوی

(۱۸) مولانا جلال الدّین محمد بن حسین الخطیبی ۔ معروف ۔ مولوی ۔ وفات ۶۷۲ ہجری / ۱۲۷۳ عیسوی ۔

(۱۹) عطّار ۔ شیخ فرید الدین ابو حاضر محمد بن ابوبکر ابراہیم بن مصطفیٰ ۔ وفات : ۶۲۷ ہجری / ۱۲۳۰ عیسوی

(۲۰) فخر الدین ابراہیم ہمدانی متخلص بعراقی ۔ وفات : ۶۸۰ ہجری / ۱۲۸۱ عیسوی

(۲۱) شیخ ابو حامد اوحد الدین کرمانی وفات : ۶۳۵ ہجری / ۱۲۳۷ عیسوی

(۲۲) سیّد حسین وفات : ۷۱۹ ہجری / ۱۳۱۹ عیسوی

(۲۳) حکیم سعد الدّین نزاری قہستانی ۔ وفات : ۷۲۰ ہجری / ۱۳۲۰ عیسوی

(۲۴) امیر شاہی سبزواری ۔ آقا ملک ۔ وفات : ۸۵۷ ہجری / ۱۴۵۳ عیسوی

(۲۵) مولانا کریم الدین ۔ تکملۂ ابوالفدا (ص ۲۱۹) ۔ ۱۸۴۷ عیسوی

(۲۶) وفات : ۸۳۴ ہجری / ۱۴۳۰ عیسوی

(۲۷) مولانا معین الدین شاعر ترشیزی الاصل

(۲۸) وفات : ۹۰۶ ہجری / ۱۵۰۰ عیسوی

(۲۹) تذکرۂ روضۃ السلاطین (ص ۳۵) و جواہر العجائب ۔ مع دیوان فخری ہروی ۔ تصحیح و تحشیہ سیّد حسام الدّین راشدی ۔ سندی ادبی بورڈ ۔ حیدرآباد ۔ ۱۹۶۸ء

(۳۰) ص ۳۷ ۔ ۳۸

(۳۱) شیر علی خان لودی : مرآۃ الخیال (ص ۶۹) مطبع مظفری ۔ بمبئی

(۳۲) سیّد علی حسن خاں : صبح گلشن (ص ۵) ۔ مطبع شاہجہانی ۔ ۱۲۹۵ھ

(۳۳) قلمی نمبر ۳۸۷ ۔ خدا بخش لائبریری ۔ پٹنہ ۔

(۳۴) وفات : ۶۹۲ یا ۶۹۴ ہجری / ۱۲۹۲ یا ۱۲۹۵ عیسوی

(۳۵) وفات : ۸۹۸ ہجری / ۱۴۹۳ عیسوی

(۳۶) انیس خوارزمی سلطان یعقوب کے درباری شعراء میں سے تھے ۔ سلطان یعقوب ابن

حسن بیگ آق قیونلو ۔ پادشاہ ترکمان ۔ وفات : ۸۹۶ ہجری / ۱۴۷۷ عیسوی

(۳۷) وفات : ۷۹۱ ہجری / ۱۳۸۹ عیسوی

(۳۸) خاتون مہری، گوہر شاد بیگم کی مصاحب اور عبدالعزیز کی بیوی تھیں۔ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کی شاعرہ عورتوں میں سے تھیں۔

(۳۹) مولانا کمال الدین بنائی و حالی تخلص ۔ وفات : ۹۱۸ ہجری / ۱۵۱۲ عیسوی

(۴۰) ایران در بابر (ص ۶۱۷) ، ویلیام ارسکین ، ترجمہ و اقتباس ذبیح اللہ منصوری ، انتشارات زرین ، زمستان ، ۱۹۶۲ء

سید امیر حسن عابدی :

دیوانِ مخفی

مخفی تخلّص کے کئی شاعر گذرے ہیں۔ جیسے ملّا مخفی طبرستانی (۱)، مخفی رشتی لاهیجانی (۲)، سلیمہ بیگم مخفی (۳)، بنت گلرخ بیگم، دختر ہمایوں بادشاہ (۴)، نور جہاں بیگم مخفی (۵)۔

ان کے علاوہ اورنگ زیب عالم گیر (۶) کی صاحبزادی زیب النساء بیگم (۷) کا تخلّص بھی مخفی تھا۔ جن کے نام سے غلطی سے ایک پورا دیوان بار بار شائع ہوگیا ہے۔ وہ شاعرہ ضرور تھیں مگر صاحب دیوان نہ تھیں۔ تذکرہ نویسوں نے بھی نہ ان کا ذکر کیا اور نہ انھیں صاحب دیوان بتلایا ہے۔

دیوان مخفی کانپور کے مطبع نول کشور میں گیارہویں مرتبہ ۱۹۱۵ء میں چھپا تھا۔ اس کے علاوہ کانپور ہی کے محلہ ٹپکا پور میں مسیح الزماں نے دیوان مخفی شائع کیا تھا۔ نیز ان دونوں نے اس مطبوعہ دیوان کو زیب النساء کے نام سے شائع کیا ہے۔ مطبع نول کشور کے پہلے صفحے پر چھپا ہوا ہے۔

"دیوان مخفی من تصنیف لطیف شاہزادی عالم مخدّرہ نامی زیب النساء بیگم"

اور ٹپکا پور والے نسخے کے پہلے صفحے پر یہ عبارت ہے۔

"درین نسخۂ نادر تصنیف زیب النساء معروف بہ دیوان مخفی"

اس کے علاوہ دیوان مخفی کے دو ایک قلمی نسخے نیشنل میوزیم (۸) نئی دلی میں ہیں جن میں سے ایک کے آخر میں کاتب نے لکھا ہے۔

"تمام شد کلّیات زیب النساء متخلّص بہ مخفی بتاریخ بست و ہفتم مئی ۱۸۳۱ عیسوی"۔

دوسرے نسخے کے شروع میں کسی نے لکھا ہے۔

"دیوان مخفی از تصنیفات زیب النساء"۔

یہ تینوں نسخے اس غزل سے شروع ہوتے ہیں۔

اے ز ابر رحمت خرّم گل بستان ما

غزلوں کے علاوہ ان میں کچھ قصیدے۔ ترجیع بند، ترکیب بند، قطعے اور رباعیاں بھی ہیں ۔ بہرحال ان چاروں نسخوں کو سامنے رکھ کر یہ مضمون لکھا جا رہا ہے۔

پورے دیوان کے دقیق مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں بہت سے مخفی تخلص رکھنے والے شاعروں کا کلام جمع اور غلط ملط نیز ان سب کو زیب النسا، مخفی کے نام سے معنون کر دیا گیا ہے۔ جس سے اس کی شہرت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس دیوان میں حسب ذیل غزل حتماً زیب النسا، کی ہے۔ جن کا پورا نام مقطع میں دیا ہوا ہے

دختر شاہم و لیکن رو بفقر آوردہ ام　　زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النساست

اس کے علاوہ کچھ اور محدود کلام بھی ان کا ہوسکتا ہے۔ مگر زیادہ تر دوسروں، بلکہ ایک مخصوص ایرانی بلکہ خراسانی شاعر کا ہے۔

مطبوعہ دیوان مخفی (۹) اور قلمی نسخے (۱۰) میں یہ رباعی زیب النسا، مخفی کے نام سے دی ہوئی ہے:

دل بصورت ندہم تا شدہ سیرت معلوم　　بندۂ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم

واعظا ہول قیامت بدل ما مفگن　　ہول ہجران گذراندیم و قیامت معلوم

جب کہ تذکرۂ حسینی (۱۱) اور تذکرۂ شعرا، پنجاب (۱۲) میں یہی رباعی نور جہاں بیگم کے نام سے دی ہوئی ہے۔ اسی طرح سے یہ غزل جو پٹنکا پور والے مطبوعہ (۱۳) اور قلمی نسخوں میں زیب النسا، مخفی کے نام سے دی ہوئی ہے۔

ز سوز (۱۴) عشق تو زانگونہ دوش تن می سوخت　　کہ ہر نفس ز تو در سینہ پیرہن می سوخت

حدیث عشق ترا تا نوشت (۱۵) می کردم　　سپند وار نقطہ بر سر سخن می سوخت

درون سینہ چنان در گرفتہ بود آتش (۱۶)　　کہ آہ در جگر و نالہ در دہن می سوخت

شہید عشق ترا شب بخواب می دیدم　　کہ ہمچو شعلۂ فانوس در کفن می سوخت

ز آہ نیم شب و نالۂ سحر گاہی　　ستارہ بر فلک و غنچہ در چمن می سوخت

ز سوز سینۂ مخفی شد این قدر معلوم　　کہ ہمچو حسن سبزہ اش در گریستن می سوخت

مگر تذکرۂ حسینی (۱۷) اور صبح گلشن (۱۸) میں یہی غزل مولانا مخفی رشتی کے نام سے

دی ہوئی ہے۔ ٹیپکاپوری اور نول کشوری اور دونوں قلمی نسخوں (۱۹) میں اسی ردیف و قافیہ میں یہ غزل بھی ہے جو اس سے مختلف ہے:

ز تاب آتش عشقت شبم بدن می سوخت | ز سوز شعلۂ آہم دل سخن می سوخت
اگر نہ آب دم تیغ غمزہ ات خوردی | شہید عشق تو تا حشر در کفن می سوخت
بحال زار خرابم تمام شب امشب | ز دیدہ اشک رواں شمع در لگن (۲۰) می سوخت
رسیدہ است (۲۱) مرا مغز استخواں در پوست | بسان شمع بفانوس انجمن می سوخت
نہ شمع بود بہ مجلس نہ عشق (۲۲) پروانہ | کہ شمع اہل محبت در انجمن (۲۳) می سوخت
سحاب دیدہ اگر زد بر آتشم آبی (۲۴) | ز سوز عشق دل و جان مرد و زن می سوخت

کجاست آتش عشقی کہ از حرارت آن | نسیم بادیہ اندیشۂ وطن می سوخت

غلام ہمت بلبل کہ دوش تا دم صبح | ز برق شعلۂ آہش گل چمن می سوخت
چہ آتش است محبت کہ روز و شب مخفی | نہاں ز محرم و بیگانہ کوہکن می سوخت

اگر اس دیوان کو دقت سے پڑھا جائے تو پتا چلے گا کہ تھوڑے سے کلام کو چھوڑ کر اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ کسی اور مخفی کا ہے جو ان سب سے الگ ہے اور جو اگرچہ ہندوستان میں پیدا ہوا تھا مگر اصلاً ایران میں خراسان کے شہر اصطخر یا اصطرخ (۲۵) سے تعلق رکھتا تھا نیز اس کا نام بوعلی تھا۔ یا وہ اپنے آپ کو اس زمانے کا بوعلی سینا سمجھتا تھا۔ نیز اس نے کسی بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ کہا تھا، جیسا کہ حسب ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے

ای دیدہ سرشکی کہ بیاد وطن امشب | خواہم کہ زنم چاک گریبان بہ تن امشب

مخفیا چند بدل حسرت دیدار وطن | عنقریب است کہ در خاک فنایت وطن است

باز امروز دلم سوی خراسان رفتہ ست | رشتۂ کفر برفت است و بایمان رفتہ ست

امشب شب عیدست و من بمحاق ست | مخفی نظر سوی خراسان و عراق ست

نیست امید رہائی تا بروز رستخیز   خاک غربت ہر کرا در ہند دامن گیر شد

عمر شد صرف بت و بتخانہ ای ہندی نژاد   از برای امتحان یک روز راہ خانہ گیر

از گدایان تو ام شاہ خراسان مددی   کہ چو مرغان حرم در حرمت جا گیرم
بیا ای دل دمی یاد وطن کن   چو قمری نالہ بر سرو چمن کن

بو علی روزگارم از خراسان آمدہ   از پئے اغراض در درگاہ سلطان آمدہ

بس کہ در یاد وطن نادیدہ ماتم داشتم   تا بدامان دلم چاک گریبان آمدہ

حیرتی وارم کہ یارب چون درین ظلمات ہند   طوطی فکرم پئے شکّر ز رضوان آمدہ

تو از ملک خراسانی باصطرخ از وطن داری   بخواب شب اگر درد و غم ہندوستان بینی

مرد در کشور ظلمت کہ بس امر محال است این   کہ حسن رو میاں را در نقاب زنگیاں بینی

ہندوستان میں مخفی غالباً زیادہ تر بنگال میں رہے تھے، جو انھیں اس ملک میں سب سے زیادہ پسند تھا۔

جستجو کردم بسی مخفی چو در گرداب ہند   نسخۂ آسودگی جائی بجز بنگالہ نیست

انھیں کشمیر بھی پسند تھا۔

در مذہب ما دم زدن از عشق حرام است   مرغی کہ ہوای گل کشمیر ندارد

مگر پتا نہیں وہ وہاں گئے بھی یا نہیں۔

غالباً ان کے لڑکے کی جدائی اور موت ہو گئی تھی۔ جس کی طرف انھوں نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

شدم یعقوب ہجران و نیامد بوئی پیراہن　　پسر را نیست آن مہری کہ در خاطر پدر دارد

مخفیا چند ز جور فلک شعبدہ باز　　ہم چو یعقوب بدل داغ سپر تازہ کنم

یہ مخفی ایک عاشق مزاج، رند مشرب اور شراب و کباب و رباب کے عادی تھے۔ جس کا انھوں نے بار بار اظہار کیا ہے۔

مرو بصومعہ مخفی برو بہ میکدہ ای　　کہ نزد اہل حقیقت چو بے نوائی نیست

بادہ را لبریز کن ساقی و صحبت برشکن　　تا بکام دل نشینم ساعتی پہلوی دوست

عمری کہ نہ با ردی خوش و بادہ ناب است　　در مذہب ما خانۂ آن عمر خراب است

پیمانۂ دل پر کن و در جام تنگہ ریز　　کین گرمی ہنگامہ ز گرمی شراب است

مستان شب مستی در میخانہ بہ بندند　　در را برخ محرم و بیگانہ بہ بندند

سرگشتہ بیابان لب تشنہ تابکے خضر　　آب حیات بہتر ز آب عنب نباشد

فصل بہار و بادہ و مخفی شگوفہ ای　　مطرب بحکم شرع محبت رباب گیر

لا ابالی می روم مخفی و ساغر می زنم　　کافرم گر باشدم اندیشہ از بیم عسس

می کشان ہنگامہ می گردش جام است و بس　　حاصل می خوردن ما تلخی جام است و بس

پُر کن قدح و بدست من دہ　　بد مست نمی شوم بیک جام

رندیم و عشق بازیم پروای کس ندارم　　مستیم و لا ابالی بیم عسس ندارم

وقت گل رفت و حریفانہ شرابی نزدیم　　بر لب تشنہ دل قطرۂ آبی نزدیم

شد تہی شیشۂ عمر از می ہستی و ہنوز   بزم می گرم نشد تیغ کبابی نزدیم

بیا ساقی لبالب کن ز می ساغر کہ می خواہم   لبی بر لب نہم دل را بیادش بر لب جامی

لیکن آخر عمر میں انھوں نے خضاب لگانا چھوڑ دیا تھا اور شراب سے توبہ کرلی تھی۔

از شیوۂ ناصواب توبہ   از خوردن این شراب توبہ

ہر چند کہ غم ز دل رباید   از بوی بد شراب توبہ

در حالت نزع توبہ کردم   زین توبۂ بی حساب توبہ

چون باعث قوت گناہ ست   از خوردن این کباب توبہ

شد موی سیہ سفیدیت ابلق   از کردن این خضاب توبہ

ایک شعر میں انھوں نے اپنی چالیس سالہ عمر کا ذکر کیا ہے۔

مدت چل سالہ عقل در پی اندیشہ بود   تاکہ بر آورد این دل گوہری از کان او

اور بے شمار اشعار میں شاعر کے نابینا ہونے، بڑھاپے اور انتہائی ضعف و پیری کا ذکر ملتا ہے۔ نیز آخر وقت میں اپنے اصلی وطن کے جانے کی خواہش اور تمنا ملتی ہے۔ اور یہ بھی کہ اس ملک سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا تھا۔

تا کی جگر مرا خورد ہند کو جذبۂ معجز عراقت

[illegible] در بیشۂ ہند کار ما نیست

نور بصر و قوتِ پا رفت تو مخفی   در فکر سفر باش کہ ہنگام وداع است

جوانی رفت و پیری رفت و خود ہم می روی آخر   ہنوز اے دیدۂ حسرت بسوی این و آن بینی

، فغان کہ دست مرا قدرت تحرک نیست   کہ جیب عمر کنم پارہ از پشیمانی

ایک قصیدے میں شاعر نے کسی فیروز خاں نامی امیر کی مدح کی ہے۔ جو غالباً میر سامان کے عہدے پر فائز اور خود بھی اصلاً خراسانی تھے۔ نیز ان سے اپنی بے سروسامانی اور افلاس کا ذکر کیا ہے۔

سپہر منزلتا صاحبان داد آورد   شکوہ دولت فیروزہ خان دورانی

زروی لطف تبقصیر من قلم درکش   کہ با تو ہست مرا نسبت خراسانی

ز رفتن سر و سامان از آن ملالم نیست   کہ کار دست چپ و راست میر سامانی

مشو ملول کہ افلاس بر تو غالب شد   کہ ہست از دلی ہر قحط سال ارزانی

بہ پیش ہمت دانا گدائی محض است   شکایت سر و سامان از پریشانی

انھیں یہاں غالباً دیوانی میں کوئی عہدہ ملا تھا۔

مخفی بیا بعرصہ دیوان ملک ہند   مردانہ ہر سوال کہ داری جواب گیر

مگر کوئی اور کم رتبہ آدمی ان سے اوپر کے درجے پر فائز تھا جس سے انھیں نفرت تھی۔

با گردش چرخ در ستیزم   بر من شدہ جاہلی مسلّم

نیز انھیں بالآخر ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جس سے اور بھی وطن جانے کی خواہش

پیدا ہوئی تھی۔

وا نشد چون غنچہ دل در بہارستان ہند رفت مرغ روح مخفی گوشۂ کاکل گرفت

نادان اگر نبودی در ملک ہند مخفی اجزای عمر خود را شیرازہ گم نمی کرد

ان مخفی کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اکثر اپنے افلاس اور ہنر کی بے قدری کا ذکر کیا ہے۔ نیز انھیں قوت لایموت کی فکر رہتی تھی۔

آبرو ریزم بہ پیش ہر کسی در احتیاج از ضرورت یا دلم فکر ضروری دشمن است

بکار کس نمی آید ہنر مخفی درین عالم خر عیسیٰ ہنرمند ست اگر در کیسہ زر دارد

ہر روزی مکن اندیشہ کہ مخفی آخر رزق مقسوم رسد گرچہ پس و پیش رسد

آفتاب آسمان ہمتم زیر سحاب بر غلط از مشرق افلاس خود سر می زنم

در لباس فقر دارم تاج سلطانی بسر تا بچشم آرزوی خویش نشتر می زنم

بدرد مفلسی خو کن مشو شرمندۂ ہمت ملائک را اگر بر خوان حاتم میہمان بینی

گرفت لرزہ و افسردگی مرا چہ کنم کہ نیست در بر من جامۂ زمستانی

ایک قصیدے میں ان مخفی نے اپنے ممدوح کی مدح کی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اپنی مفلسی، ہنر اور اس کی بے قدری اور عزم سفر کا بھی ذکر کیا ہے۔

عہد جوانی گذشت آتش باہم گداخت مغز و دماغ و دلم در غم ہجران او

مفلسی از حد گذشت اہل ہنر را دریغ ماندہ تہ آستین دست زر افشان او

عزم سفر می کند این دل دیوانہ ام — آہ کہ جز نالہ نیست یار بیابان او

بر در سلطان عصر حیف ندارم دگر — تا کہ رساند بعرض مقصد ارکان او

ثانی صاحبقران بادشہ انس و جان — آنکہ فلک سر نہد بر خط فرمان او

ایک اور قصیدے میں بھی مفلسی اور فقر سے رہائی ، نیز ان کے ہنر اور کمال کی بے قدری اور بد قسمتی کا ذکر ملتا ہے ۔

گل آشفتہ مخفی بفن خود ارسطو نیست — بہند افتادہ است اما خراسانست یونانش

در این کشور زبونیہای طالع ناقصم دارد — وگرنہ در ہنر مندی نباشد ہیچ نقصانش

شدم مالک نصاب و از بلای آسمان رفتم — زدم از جان و دل دست توکل تا بدامانش

یہ مخفی ایک ہوس ران شاعر تھے ۔ نیز ان کے معشوق زیادہ تر غیر مسلم ہوتے ، جو بدلتے رہتے تھے ۔

پنجہ زد دست تمنا باز در زنجیر زلف — دل گرو کردم بہ پیش نامسلمانی دگر

مخفی ایک اچھے خطاط یا علم خطاطی سے واقف نظر آتے ہیں ۔

چون پنجہ زند شانہ در آن زلف کہ زنار — بس گشتہ مسلسل خط تعلیق و رقاع است

نیز وہ موسیقی سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے ۔

در دل اہل دلی شاید کنی مخفی اثر — در نشاپورک نوای راست را آہنگ ساز

ان مخفی کو اپنی شاعری اور ہنر پر فخر مگر اسی کے ساتھ بے قدری کا اندازہ تھا ۔

دارم سر دیوانگی و بہ سر بازار — زین بادہ کنم مست عرب را و عجم را

مخفی اگرچہ خانہ خراب ہنر شدم دارم ہوای صحبت اہل ہنر ہنوز

آفرین بر جگرم باد کہ در کشور ہند سکۂ نقد سخن رائج ایران زدہ ام

... کلامت می کند ہشیار ہر دیوانہ را مخفی در اعجاز سخن کار مسیحا کردہ ای

بمصر دہر نماندست مشتری ورنہ منم بحسن معانی چو یوسف ثانی

بی نطق تو چاشنی ندارد در کشور ہند ، ہیچ قندی

غزل میں حافظ (۲۶) کے بعد کا کوئی ایسا فارسی کا شاعر نہیں ہے جس نے اس کی پیروی نہ کی ہو اور اس کے رنگ میں غزلیں نہ کہی ہوں ۔ اور اس سے فائدہ نہ اٹھایا ہو ۔ مخفی نے بھی غزلوں میں اس کی غزلوں کو اپنے سامنے رکھا ہے ۔

غم می کند فزونی ای دوستان خدارا شاید شنفتہ ماند این راز آشکارا

کشتی عمر بشکست در بحر ناامیدی مشکل کہ باز بینم دیدار آشنا را

بگذشت موسم گل شد نالہ ہای بلبل تا کے شراب مستی یا ایہا السکارا

دیوان مخفی کے آخر میں ایک مخمس ہے جو حافظ کے شعر پر اس طرح ختم ہوتا ہے

عاشق نشان داغ خود از داغ لالہ خواست مخمور و نشۂ ز می صاف پیالہ خواست

مخفی مراد خویشتن از آہ و نالہ خواست زاہد شراب کوثر و حافظ پیالہ خواست

تا درمیانہ خواستہ کردگار چیست

مگر طالب آملی (۲۰) کی خاص طور سے توصیف و تمجید کی ہے ۔ جن کے غالباً وہ معاصر تھے ۔

تا طلبگار سخن شد نکتہ سنج معرفت ہمچو طالب طالبی از خاک ایران برنخاست

ان (خراسانی) مخفی کا یہ قصیدہ:-

دل من بلبل عشق ست و داغ دل گلستانش — فنا دیوار آن باغ و بقا حد خیابانش

خاقانی (۲۸) کے اس مشہور قصیدے کی پیروی میں ہے

"مرا دل پیر تعلیم است و من طفل زباندانش"

اسی طرح یہ قصیدہ:-

رخصتی گر برون آئی مرا در جسم و جاں بینی — ہماں کز دوریش صد داغ دل داری ہماں بینی

(جرنل عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک)

ج ۱۰، ۱۹۹۵ء

حواشی

(۱) معاصر شاہ عباس کبیر ۔

(۲) جو امام قلی خاں حاکم فارس اور امیر سلطان محمد کے درباریوں میں سے تھے ۔

(۳) ان کے والد نورالدین محمد نقشبند سلسلے کے خواجہ زادہ تھے ۔

(۴) ۹۳۷ ۔ ۹۶۳ ہجری / ۱۵۳۰ ۔ ۱۵۵۶ عیسوی

(۵) ۹۸۵ ۔ ۱۰۵۵ ہجری / ۱۵۷۷ عیسوی ۔ ۱۶۳۵ عیسوی

(۶) ۱۰۶۸ ۔ ۱۱۱۸ ہجری / ۱۶۵۸ ۔ ۱۷۰۷ عیسوی

(۷) ۱۰۳۸ ۔ ۱۱۱۳ ہجری / ۱۶۳۸ ۔ ۱۷۰۱ عیسوی

(۸) نمبر ۱۰۳۷ ۰ ۹۱ ۰ ۱۹۳۰ ۰ ۷۱ ۰ ۲۰ ۔ نمبر ۱۰۳۷ ۰ ۹۱ ۔ ۳ ۔ ۱۹۲ ۰ ۷۱

(۹) ص ۹۸ ۔ ۱۹

(۱۰) ۱۰۳۷ ۔ ۹۱

(۱۱) میر حسین دوست سنبھلی تذکرۂ حسینی (ص ۳۲۳) مطبع نول کشور ۱۸۷۵ عیسوی

(۱۲) سرہنگ خواجہ عبدالرشید ۔ تذکرۂ شعرائے پنجاب (ص ۳۳۱) اقبال اکادمی ۰ کراچی ۰ ۱۳۶۷ ہجری شمسی ۔

(۱۳) ۱۵۳۷ ۔ ۹۱

(۱۴) تذکرۂ حسینی ۔ مرموز ۔

(۱۵) نسخۂ نیشنل میوزیم ۔ عشق ۰ حسینی (شوق) تودر ۰۰۰ ۳ ص ۱۸

(۱۶) صبح گلشن ۔ سینہ ام آتش چنان گرفت قرار ۔

(۱۷) ص ۳۰۹ ۔

(۱۸) سید علی حسن خاں ۔ صبح گلشن (ص ۲۹۳) مطبع فیض شاہجہانی ۱۲۹۵ ہجری ۔

(۱۹) ص ۱۶ ۰ ۱۳ ۔

(۲۰) نسخہ ۹۱ شمع انجمن ۔

(۲۱) نسخے دونوں قلمی ۔ ز سوز سینہ ۔

(۲۲) نسخہ ۹۱ ۔ مجلس نہ عشق و ۰ نسخہ ۷۱ ۔ نہ عشق بود نہ مجلس نہ شمع پروانہ ۔

(۲۳) نسخہ ۱۱ با نجمن ۔

(۲۴) نسخہ ۱، دیدہ بمیرد اگر برآتش آب ۔ نسخہ ۱۰ ندارد کباب ... آں می سوخت ۔

(۲۵) اصطخر یا اصطرخ کا معرّب ہے ۔ فرہنگ ڈاکٹر محمد معین میں دیا ہوا ہے کہ " استخر یکی از بزرگ ترین شہر ہای فارس در دوران قبل از اسلام و بعد ازاں قلعۂ استخر از قلاع معروف تاریخی است کہ در انتہای شمال غربی جلگۂ مرو دشت قرار دارد "

(۲۶) شمس الدّین محمد بن بہاؤ الدّین معروف بہ لسان الغیب ۔ وفات ۷۹۱ ہجری / ۱۳۸۹ عیسوی ۔

(۲۷) محمد طالب آملی ملک الشعراء جہانگیر بادشاہ (۱۰۱۴ ۔ ۱۰۳۷ھ م ۱۶۰۵ ۔ ۱۶۲۷ عیسوی) وفات ۱۰۳۶ھ م ۲۷ ۔ ۱۶۲۶ عیسوی ۔

(۲۸) افضل الدّین ابو بدیل بن علی خاقانی ۔ وفات ۵۹۵ ہجری / ۱۱۹۹ عیسوی ۔

عطاء الرحمن کاکوی :

معدن المعانی

[اس مختصر مقالے میں مطبوعہ معدن المعانی کے ایک ایسے مقام کی نشان دہی کی گئی ہے جس سے مقالہ نگار کے بقول کتاب مشتبہ ہوجاتی ہے۔]

معدن المعانی حضرت مخدوم الملک بہاری کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس کے مرتب ان کے مسترشد زید ابن عربی ہیں، جنھوں نے ان کے قریب رہ کر "فرمودات" کو قلمبند کیا ہے، اس مجموعے کی حیثیت دوسرے ملفوظات مثلاً فوائد الفواد، راحت القلوب، فوائد السالکین وغیرہ کی جیسی نہیں، بلکہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے.....

یہ ایک مرتب کتاب ہے، جو مضامین کے اعتبار سے ۶۳ بابوں پر مشتمل ہے.....
معدن المعانی کے قلمی نسخوں کی طرف ابھی میں نے رجوع نہیں کیا ہے، اس وقت ایک مطبوعہ نسخہ پیش نظر ہے، جو دو حصوں میں ۵۰۰ صفحات کو محیط ہے، کتاب کے آخر میں یہ عبارت ہے،

"الحمد للہ .... کہ معدن المعانی من کلام .... حضرت مخدوم شیخ شرف الحق و الملتہ و الدین احمد یحییٰ منیری بہ سعی، مولوی عبدالقادر فردوسی بتاریخ بست دیکم شہر جمادی الاخری ۱۳۰۳ھ در مطبع شرف پریس بہار محلہ خانقاہ بہ اہتمام شیخ نعمت علی طبع شد۔"

اس کتاب کو طبع ہوئے کچھ اوپر ۹۰ سال ہوچکے ہیں، اور تصنیف کا زمانہ تقریباً ۶۰۰ سال پہلے کا ہے، حضرت مخدوم کی وفات ۷۸۲ھ میں ہوئی ہے، مادۂ تاریخ "پُر شرف" ہے۔

یہ کتاب افادیت کے لحاظ سے بہت اہم اور بیش قیمت ہے۔ شہنشاہ اکبر اس کو پڑھوا کر سنتا تھا، ابوالفضل کے پاس بھی اس کا نسخہ برابر رہا، وہ اس سے فائدہ اٹھاتا تھا، اس کتاب میں کثرت سے اساتذہ اور اکابر صوفیہ کے اشعار ہیں، مولانا روم، سعدی، خاقانی، عطار کے اشعار بکثرت ہیں، اور بہ قول مرتب زید ابن عربی ہر بحث کے سلسلے میں یہ اشعار زبان مبارک سے جاری ہوئے۔ باب بست و ہفتم، ص ۲۲۲ میں "در ذکر بریدن از خلق" کی بحث

میں یہ فقرہ ملتا ہے کہ (حضرت مخدوم) ایں مثنویات برخواند

عشق را با کفر و با ایمان چہ کار　　عاشقان را لحظۂ با جاں چہ کار

ہر کرا در عشق محکم شد قدم　　در گذشت از کفر و از اسلام ہم

منکرے گوید کہ ایں بس منکر است　　عشق او از کفر و ایمان برتر است

ان اشعار کے بعد عرفی کا یہ شعر بھی ملتا ہے

عاشق ہم از اسلام خرابست وہم از کفر　　پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

عرفی کا وجود تو حضرت کے دو سو سال بعد ظہور میں آیا۔ اس لیے اس کتاب میں اس کے اشعار کا پایا جانا حیرت انگیز ہے۔ غالباً پبلشر نے مضمون کے لحاظ سے ایک شعر اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ اور اس کا احساس نہ ہوا کہ اس سے کتاب ہی مشتبہ ہوجاتی ہے۔ خدا جانے اور کہاں کہاں اس قسم کے تصرفات ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ حضرت مخدوم کی کل تصانیف کا ایک مکمل اور دیدہ زیب اڈیشن شایع کیا جائے اور جس طرح نکلسن نے اپنی زندگی مولانا روم پر وقف کر دی تھی اسی طرح کوئی صاحب و علم اپنی زندگی کو حضرت مخدوم کی تصنیفات پر وقف کر دیں۔

ا۔ ظ۔ ز۔ ع

(معارف، فروری ۱۹۵۷ء)

ڈاکٹر وحید قریشی:

پیرِ کلیر رح اور اُن کا فارسی دیوان

۱

"ارمغان صابر" یا "دیوان صابر" ملک دین محمد اینڈ سنز، لاہور نے شائع کیا ہے۔ مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری جو صابری سلسلہ صوفیا کے سرخیل اور مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں، ان سے یہ دیوان منسوب کیا گیا ہے۔ شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں پیر کلیرؒ کا سلسلۂ نسب، حالات زندگی اور دیگر کوائف درج ہیں۔ دیباچہ احسان صابری صاحب پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ سیالکوٹ نے لکھا ہے۔ دیوان کی تلاش، تدوین اور دیگر امور کے سلسلے میں جو معلومات اس میں شامل ہیں، ان کے ضروری اقتباسات یہ ہیں:

> "حضرت (صابر) نے اپنے قیام اجودھن (پاک پتن) کے دوران چند ابیات و غزلیات کہی تھیں جو اب ناپید ہیں۔ اور کہیں نہیں مل رہی ہیں۔ کلیر شریف جانے کے بعد حضرت پر زیادہ تر سکر و صحو کی کیفیت طاری رہی، اس لیے ان کا کلام ادھر ادھر بکھر گیا۔ حضرت کے وصال کے بعد ان کے شیدائی اور عشاق حضرت کی تحریر کو اکثر چوما کرتے تھے۔ ان کے چومنے سے ہی کئی اشعار کے کچھ حروف مٹ گئے، بعد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے (کافی عرصے بعد) کشفی ذریعے سے ان کی درستی کی اور حضرت کا قلمی دیوان نئے سرے سے مرتب کیا...... ۱۸۸۸ء میں دہلی کے ایک صابری شیدائی نے حضرت کی کلیات اکٹھی کرکے ۵۰۰ کی تعداد میں شائع کرائی تھیں۔"(۱)

زیر نظر اشاعت اسی دہلوی مطبوعہ نسخے سے چھاپی گئی ہے حضرت صابرؒ کی پیدائش ۱۹ ربیع الاول ۵۹۲ کو بیان کی جاتی ہے (۲)۔ ایک روایت کے مطابق ۲۵ شوال کو ان کی والدہ

ان کے ماموں بابا فرید گنج شکرؒ کے پاس اجودھن لے گئیں جہاں آپ کا قیام ۶۵۰ ھ تک رہا۔ کلیر شریف میں ۶۹۰ ھ میں انتقال فرمایا (۳) گویا دیباچہ نگار کے بیان کے مطابق دیوان صابر کی تدوین کا زمانہ ۶۰۱ھ اور ۶۵۰ھ کے مابین ہے۔ دیباچہ نگار کے بیان کے مطابق ۶۵۰ھ اور ۶۹۰ھ کے درمیان دیوان کی غزلیں مریدوں کے ہاتھوں میں بکھری رہیں اور ۶۹۰ ھ کے بعد ان کے حروف مٹتے چلے گئے۔ اس کے بعد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ (ولادت ۸۶۰ھ وفات ۵ جمادی الاخر ۹۴۴ھ)(۴) نے کشفی طریقے سے تکمیل کی۔ ترتیب دیوان کی اس مدت کو ۸۶۰ھ اور ۹۴۴ھ کے مابین محدود کیا جا سکتا ہے۔

۲

حضرت پیر کلیرؒ کے حالات میں بھی معاصر ذرائع خاموش ہیں۔ آج کل جو چند ایک سوانح عمریاں دستیاب ہیں ۵ ان میں سے بیشتر متاخر مواد پر مبنی ہیں۔ حالات کے بارے میں معاصر مصادر کی خاموشی کئی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ قدیم ترین شہادت "سیرالاولیاء" کے مرتب امیر خورد کی ہے جو نہایت مختصر ہے اور جسے پڑھ کر یہ خیال آتا ہے کہ کیا یہ حالات واقعی انھی پیر کلیرؒ کے ہیں جو حضرت بابا فرید گنج شکر کے بھانجے، داماد اور خلیفہ تھے، یا یہ کوئی دوسری شخصیت ہے جس کا ذکر صاحب سیرالاولیاء نے کیا ہے؟ اس کے بارے میں شک اور شبہے کا اظہار مشہور محدث عبدالحق دہلویؒ (۹۵۸ ھ - ۱۰۲۵ھ) نے کیا ہے۔ "اخبار الاخیار" میں (اصول اسناد میں مہارت کی وجہ سے) فرماتے ہیں:

"شیخ صابرؒ در "سیرالاولیاء" می نویسد کہ درویشے بود ثابت قدم وصاحب نعمت، مرید شیخ فرید الدین است و شیخ فرید الدین وقتے کہ بہ او اجازت بیعت می کرد، فرمود، صابر زندگانی خوش خواہی گذرانید، و ہمچناں بود تا زندہ بود بعیش خوش می گذرانید۔ خوش باش و کشادہ بود، و غالباً این شیخ صابر غیر شیخ علی صابر - است (کہ) داماد شیخ فرید الدین و خلیفۂ او بود و قبر او در قصبۂ کلیر است و سلسلۂ شیخ عبدالقدوس وغیرہ بوے منتہی می شود۔ و ذکر او در سیرالاولیاء اصلاً نکردہ و آنچہ کردہ ہمیں شیخ صابر را ذکر کردہ بر آن نمط ۔ و در [illegible] کور شدہ و ترک ذکر او

خالی از غرابت نیست و تواند کہ مراد از شیخ صابر ہمیں شیخ علی صابر باشد واللہ اعلم۔"(۶)

میر خورد کا بیان قابل غور ہے۔ ایک تو اس لیے کہ شیخ صابر کے ضمن میں انھوں نے شیخ علی احمد صابر اور بابا فرید کی قرابت داری کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ بلکہ شیخ صابر کا ذکر اس انداز میں ہے جیسے کسی عام مرید کا حال ہو۔ دوسرے "سیرالاولیا" کے بیان کردہ بزرگ قصبہ ڈیکری کے رہنے والے بتائے گئے ہیں اور علی احمد صابر کی وطنیت، جائے پیدائش اور دیگر امور کے بارے میں کسی اختلاف کا ذکر متاخر تذکرے میں بھی نہیں ملتا۔ اس لیے انھیں مخدوم علی احمد صابر سے جدا شخص قرار دینا کچھ غلط نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ بابا فرید کا ارشاد اور اس کے نتیجے میں "آسائش سے زندگی بسر ہونے" (۷) کا حال بھی مخدوم علی احمد صابر کے حال پر منطبق نہیں، اس لیے "سیرالاولیا" میں بیان شدہ شیخ صابر اور بابا فرید کے بھانجے کو الگ الگ شخص قیاس کرنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ پیر کلیر تو ایک صاحب جذب شخص تھے اور دنیاوی رابطوں سے کنارہ کش رہے۔ ان کے مزاج کا عام رنگ بھی جمالی نہیں، جلالی تھا۔ اس لیے تذکروں اور تاریخوں میں ان کا حال نہیں ملتا اور عجیب تر بات یہ ہے کہ حضرت گنج شکرؒ کے ملفوظات بھی ان کے تذکرے سے خالی ہیں۔ تفصیلی حال بہت بعد میں مغلیہ دور کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ مغلیہ دور کے قدیم ترین ماخذ "سیر الاقطاب" (اللہ دیا، تصنیف ۱۰۵۶ھ) اور "اخبار الاخیار" کا اقتباس اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ "سیر الاقطاب" کا اقتباس (بعض حصوں کے حذف کے بعد) ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

"آں ازہد زہاد و آں اعبد عباد ... محرم اسرار خفی و جلی، آں جانشین نبی صلی اللہ علیہ وسلم و علی .... غوث صمدانی حضرت خواجہ علاء الدین علی احمد صابر المعروف بمخدوم علی احمد صابر قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز۔ شانے عظیم و رتبہ رفیع داشت و اورامقام جلالت بود چنانکہ کسے از غایت عظمت و ہیبت سویش دیدن نمی توانست و خرقہ فقر و ارادت از قطب الکاملین حضرت شیخ فرید الملۃ و الدین شکر گنج مسعود بن سلیمان اجودھنی قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز پوشیدہ۔ و آنحضرت داماد و خواہر زاد حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر و از خلفائے خاص الخاص

ایشان است و خدمت حضرت پیر دست گیر خود بسیار نموده چنانچہ از غایت مہربانی در باب او فرمود کہ علم ظاہری و باطنی من علاء الدین علی احمد صابر و شیخ نظام الدّین بدایونی سرایت کرد. و گاہے می فرمود کہ علم سینہ من شیخ نظام الدّین اولیا بدایونی رسید و علم دل من شیخ علاء الدین علی احمد صابر فائض گردیدہ و لقبش علاء الدین است و خطابش مخدوم از جانب الٰہی ست و صابر از پیر دست گیر حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج خود خطاب یافتہ۔

- نقل است کہ آن حضرت را در اوائل حال قسمت لنگر فقر او مطبخ خاصہ حضرت قطب الکاملین شیخ فرید الدّین شکر گنج قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز تا دواز دہ سال مقرر بود و خود تا این مقدار مدت چیزے نخورد تا روزے پیر و مربی ایشان بنور ولایت در یافتہ پرسید کہ بابا علاء الدّین شما کہ طعام قسمت می کنید خود ہم چیزے می خورید یا نہ عرض کرد کہ بندہ رابے اجازت حضرت پیر دستگیر چہ قدرت و مجال است کہ یک دانہ ازاں خوردن تواند فرمودند شیخ علاء الدّین علی احمد صابر است ازاں روز آن حضرت بخطاب صابر مخاطب گشتہ۔

"و آنحضرت گاہ گاہ فکر ہم فرمود و تخلص در فارسی احمد می فرمود در ہندی صابر ۔ چنانکہ غزلے کہ سوائش بنظر نیامدہ ۔ متعارف است و مشہور ۔ تبرکاً و تیمناً نوشتہ می شود:

امروز شاہ شاہاں مہمان شد است مارا
جبریل با ملائک درباں شد است مارا
در جلوہ گاہ وحدت کثرت کجا بگنجد
بزدہ ہزار عالم یکساں شد است مارا
در محفل گدایاں سامان ما نگنجد
بے برگ و بے نوائی ساماں شد است مارا
ما خانہ جہاں را بسیار سیر کردیم
اے شیخ بت پرستی ایماں شد است مارا

احمد بہشت و دوزخ برعاشقاں حرام است
این جا رضاے جاناں رضواں شد است یار

"نقل است کہ آں غوث صمدانی از کمال محبت حق سبحانہ تعالیٰ دوام در استغراق بود بحدے کہ از خود واز ہیچ چیز خبر نداشت و بے ہوش کم آمد و ہمیشہ در مشاہدہ می ماند چنانچہ می فرماید:

اس طرح اس میں ڈوب اے صابر
کہ بجز ھو کے غیر ھو نہ رہے

تابرتبہ رسید کہ عمدہ مشائخ عصر و قدوہ اولیاے دہر گردید نقل است چوں در ملفوظات حضرت شیخ فرید الدّین شکر گنج قدّس اللہ تعالیٰ سرّہ العزیز ذکر تاج الاولیا غوث صمدانی حضرت خواجہ علاء الحق والدّین علی احمد صابر قدّس اللہ تعالیٰ سرّہ العزیز کم واقع شدہ و حال ایشاں تمام و کمال ثبت نیست سبب او ایں کہ ملفوظات حضرت شکر گنج اکثر بہ اتفاق شیخ جمال ہانسوی جمع گشتہ اند و سواے آں کہ نوشتہ او را در خاطر داشت شیخ مذکور لازم و غبار خاطر آنحضرت و شیخ ہانسوی خود روشن است بنا بر آں ذکر چنانچہ کہ بالستہ واقع نشدہ" (۸)

اس اقتباس سے بعض باتوں کا پتا چلتا ہے:

۱۔ علاء الدّین علی احمد صابر المعروف بہ مخدوم علی احمد صابر سیّد تھے اور فرید الدّین گنج شکر کے داماد، خواہر زادے اور خلفا میں سے تھے۔

۲۔ علاء الدّین لقب اور مخدوم خطاب تھا جو عطیہ الٰہی سمجھنا چاہیے۔ صابر البتہ عطیہ مرشد تھا۔ بارہ برس حضرت شکر گنج کے لنگر کی تقسیم کا کام ان کے سپرد رہا اور انھوں نے خود کچھ نہیں کھایا۔ اس پر مرشد نے صابر کے لقب سے یاد کیا تھا۔

۳۔ حضرت شیخ فرید الدّین گنج شکرؒ کے ملفوظات میں صابر کے ذکر کے مسئلے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے مراسم شیخ جمال ہانسوی سے اچھے نہ تھے اور وہی ملفوظات کے اوّلین مرتب اور مدون تھے۔ اس لیے انھوں نے ان کا ذکر جیسا کہ کرنا چاہیے تھا، نہیں کیا۔

۴۔ فارسی اور ہندی (اردو) میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص احمد اور ہندی (اردو) میں صابر تھا۔ "سیر الاقطاب" کی تالیف (۱۰۵۶ھ) کے وقت تک ان کی صرف ایک فارسی غزل ملتی تھی اور ہندی (یا اردو) کا صرف ایک شعر ان سے،

منسوب بیان ہوا ہے۔ بظاہر اردو شعر "سیر الاقطاب" کے نسخوں میں تحریف کا شکار ہو کر بالکل جدید اردو ہو گیا۔ اس کی زبان حضرت صابر تو کیا "سیر الاقطاب" کے مصنف کے زمانے کے بھی ڈیڑھ دو سو برس بعد کی معلوم ہوتی ہے) فارسی غزل مطبوعہ دیوان صابر (ارمغان صابر) کے ص ۲۵۰ پر درج ہے۔ بگمان غالب آخری چار صفحے قدیم مطبوعہ نسخے میں نہ تھے اور مرتبین نے کسی دوسرے ذریعے سے شامل کیے ہیں کیونکہ یہ کلام دیوان کی ردیف وار ترتیب میں شمار نہیں کیا گیا اور آخر کتاب میں ملحق کیا گیا۔)

ان بیانات میں سے دو باتیں ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اول پیر کلیرؒ کا قیام اجودھن اور دوسرے اجودھن سے نقل مکانی کر کے ان کا کلیر شریف میں تشریف لے جانا۔

اجودھن میں حضرت کے ورود کا سنہ (۲۵ شوال) ۶۰۱ھ بیان کیا جاتا ہے (۹) "حقیقت گلزار صابری" کے مرتب (مخدوم شاہ محمد حسن) کے بیان کے مطابق ۲۵ شعبان ۶۰۰ھ کو روز چہار شنبہ وقت عصر، گیارہ روز میں برکت اسم اعظم جنبیہ کے پاک پٹن شریف (اجودھن) پہنچے" (۱۰) اس ہنگام میں حضرت شاہ شیخ فرید گنج شکر بابا صاحب مسعود العالمین، قطب عالم، غیاث ہند کو بیعت امامت اور ارشاد مرتبہ کیفیت باطن شاہنشاہی ولایت سے حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی صاحب الارواح کے ہاتھ پر صاحب مجاز مرفوع الاجازت ہوئے دو برس کامل گزر گئے تھے۔" (۱۱)

صاحب "حقیقت گلزار صابری" نے پیر کلیرؒ کی پیدائش ۱۹ ربیع الاول ۵۹۲ھ بیان کی ہے (۱۲) اس لحاظ سے اجودھن میں تشریف آوری کے وقت حضرت کی عمر ۸ برس قرار پائے گی۔ شیخ فرید گنج شکر کی صاحب زادی سے شادی ۲۱ شوال ۶۱۳ھ اور والدہ صابر کی وفات ۲ محرم ۶۱۴ھ بیان ہوئی۔ (۱۳) لیکن ان سنین کی بنیاد ان متاخر تذکروں پر ہے جن کی بنیاد کشف یا سنی سنائی روایات پر ہے۔ حضرت شیخ فرید الدّین گنج شکر بقرائن اصح ۵۸۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے (۱۴) خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی کا ورود ہند ۵۸۰ھ میں ہوا (۱۵) فرید الدین گنج شکر کو ۲ رمضان یا ۲۵ ذی الحجہ ۶۱۰ھ کو خلافت عطا فرمائی (۱۶) اس کے بعد حضرت گنج شکر نے دس برس دہلی میں اور بارہ برس ہانسی میں قیام فرمایا (۱۷)۔ گویا ۶۱۱ (۶۳۳ = ۱۲+۱۰+۶۱۱) ۶۳۳ھ یا ۶۳۴ھ میں آپ کا ورود اجودھن ممکن ہے۔ قیام ہانسی کا خاتمہ

حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے انتقال کے بعد ہوا (۱۸) بختیار کاکی کا انتقال ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ ھ میں ہوا (۱۹) اس کے کچھ بعد حضرت گنج شکر اجودھن (پاک پٹن میں اقامت گزیں رہے اس وقت ان کی عمر ۶۳ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس لحاظ سے پیر کلیر کا ۶۰۰ یا ۶۰۱ھ میں اجودھن پہنچنا کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔ اجودھن جانے کا زمانہ ۶۳۳ ھ کے بعد متصور ہوگا۔ صاحب "سیر الاقطاب" کے بیان کے مطابق اجودھن میں ان کے سپرد حضرت گنج شکر نے لنگر کی تقسیم کا کام کیا جو بارہ برس تک رہا۔ ظاہر ہے کہ تشریف آوری کے کچھ مدت بعد ہی یہ خدمت سپرد کی ہوگی۔ صابر کا لقب انھیں مرشد نے لنگر کی بارہ برس کی تقسیم کے بعد دیا۔ فارسی شاعری میں انھوں نے احمد اور ہندی (اردو) شاعری میں صابر تخلص کیا۔ بعد کی روایات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ پیر کلیر کی شاعری کا تمام و کمال زمانہ اجودھن کے قیام کی یادگار ہے۔ بعد میں تو وہ مجذوب ہوگئے تھے اور انھوں نے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

"حقیقت گلزار صابری میں ہے کہ پیر کلیر اپنے مرشد سے جدا ہو کر ۱۵ ذی الحجہ ۶۵۰ھ بروز شنبہ کلیر شریف تشریف لے گئے (۲۰) مرشد کا قیام اجودھن انتقال تک برابر رہا انھوں نے ۵ محرم ۶۶۴ھ کو اجودھن ہی میں انتقال فرمایا (۲۱) اور وہیں دفن ہوئے۔ اگر ۶۵۰ھ کا سنہ صحیح ہے تو اس تاریخ تک پیر کلیر مرشد سے سند خلافت لے چکے تھے۔ اجودھن چھوڑنے کے سنہ کے لیے کوئی قدیم شہادت ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس کے صحیح ہونے کا ایک قرینہ یہ ہے کہ پیر کلیر کو (جن کی پیدائش ۵۹۲ھ میں بیان کی جاتی ہے) ۶۵۰ھ (یعنی ۵۸ برس کی عمر تک) تو خلافت بہر حال مل ہی چکی ہوگی کیونکہ وہ کلیر شریف جا کر نور معرفت پھیلاتے رہے۔ ۶۹۰ھ میں انھوں نے کلیر انتقال کیا۔ کلیر کے بارے میں ہمارے پاس قدیم ماخذ دو ہیں اور دونوں کا تعلق مغلیہ دور سے ہے۔ ایک پیر کلیر کی بددعا کے زیر اثر اس کے برباد ہونے اور دوسرے میں ان کی وفات کے بہت بعد تک مزار کے ویران رہنے اور وحوش کی آماجگاہ رہنے کا ذکر ہے

"معارج الولایت" میں کلیر کی بربادی کا واقعہ اس طرح درج ہے:

"چوں حضرت صابر" در خطہ کلیر رونق افروز شد ہمہ علماء ظاہری و بعضے مشائخ بانکار وے بر آمدند و خادمان و مریدان آنجناب را آزار می دادند۔ چنانچہ وقتے حضرت صابر بریاران خود پیش از نماز جمعہ در مسجد

جامع تشریف بردہ بمقام صف اول برنشست ۔ چوں جماعتے از علما و مشائخ در مسجد در آمدند جاے خود را خالی نیافتند بخادمان شیخ گفتند کہ ازیں جا برخیزید و بجاے لایق خود بنشینید ۔ ایشاں جواب دادند کہ پیشتر ازیں اینجاے خالی بود ما آمدیم و بنشستیم ۔ شما بجاے دیگر بنشینید علما بدرشتی و سختی در آمدہ گفتند کہ اینجاے نشستن ماست دیگر کسے لایق اجلاس این جانیست چوں گفتگو بلند شد حضرت صابر سر از مراقبہ بر آوردہ گفت صاحب ولایت این دیار براے نشستن بمقام خویش پیش از ہمہ لایق و سزاوار است ایشاں گفتند کہ برہان شما چیست؟ فی الحال با یاران خویش از مسجد بر آمد و گفت برہان ولایت ما این است کہ شما ہمہ ہمدریں ساعت بمیرید ۔ بلکہ از ساکنان شہر ہم احدی زندہ نماند و باز تامدت مدید این شہر آباد نگردد بمجرد این کلمہ مسجد در افتاد و چند ہزار کس در ۃ آن ہلاک شدند و سکناے شہر ہم بمرض طاعون گرفتار شدہ در اندک ایام جان بحق تسلیم کردند" (۲۲)

"سیر الاقطاب" (۱۰۶ھ) میں لکھا ہے:

... "نقل است کہ بعد رحلت آں غوث صمدانی نیز آں شہر (کلیر) ویران بماند۔ حتیٰ کہ مجاوران را نیز تاب اقامت آنجا نماندہ بود و دور تر رفتہ سکونت نمودہ بودند۔ و بے حکم آمدن نمی توانستند ۔ و کسے را مجال نبودہ کہ بزیارت آنحضرت مشرف شود ازین جہت مرقد مقدس آنحضرت نیز ضائع شدہ بود واندران حین ہنداں قریب تربت شریف پرستش گاہ خود باسم " دیوی " برپا کردند آخر الامر او ہم نیست و نابود گشت ۔ و آمد و رفت کافراں برطرف گردید اتفاقاً روزے کافرے سناسی درانجا بگذشت ۔ قریب پرستشگاہ معلوم مرقدے دید نورانی و باہیبت و گرد وے انبوہ وحوش و طیور است و شیراں بدم خویش جاروب می کشید۔ حیران بماند و باخود گفت کہ این مقام 'لا معبد گاہ' ما یاں بود۔ چہ باشد کہ حالا مزار انور مسلمان در اینجا ظاہر شد۔ بارے بہ بینم و ملاحظہ نمایم۔ بدیں سبب نزدیک تر رفت و طیور کہ غلو داشتند

برجستند و بکنار رفتند۔ آن ملعون با خود آلتے آہنی داشت با خود گفت که این نشان والا شان راکنده و منہدم باید کرد۔ بدین گمان فاسد خواست که بکند۔ ناگاه روزے بر آمد آں ملعون روے خود بہ آں روزن فردو آورد، اندرون دیدن خواست که بغضب حق سبحانہ تعالی گرفتار گردید چنانکه گردنش دران روزن در آمد و زمین فشار کرد۔ ہر چند خواست که بروں آرد و جان بسلامت برد لیکن از دربار فیض بار این چنیں شیر زبردست کجا رفتن می تواند و بایں گمان فاسد جان خود بمالک جہنم سپرد وہم چناں افتاد بماند و حضرت غوث صمدانی بمجاوران روضہ خویش که از ہیبت و جلالت دربار سلطانی دور تر رفتہ بودند در واقعہ ایشاں را فرمود که زود تر ایشاں درینجا برسید و سگے مردار که با مرقد ما بے ادبانہ پیش آمده بود و بحکم حق سبحانہ تعالی بسزاے خود رسید از آں جا دور سازید صبح صادق مجاوراں افتاں و خیزاں بسرعت تمام درخطہ کلیر رسیدند و در آنجا آمدند چہ می بینند که شخصے کافر بر قبر شریف آنحضرت افتاد است و سرش تا گردن درون مرقد مقدس و معلی فرو ماند۔ فی الحال بر آوردند۔ دیدندکه روے ناپاک بعینہ شکل سگ است، چونکه از زبان مبارکش لفظ سگ در واقعہ شنیده بودند از آں جا دور ساختند و ازاں بعد بفرمان آں غوث صمدانی نزدیک تر روضہ منورہ آمده مسکن ساختند و مرقد مطہرہ آراستند روضہ مقدسہ که سقف او چوبیں بود ترتیب دادند ازاں روز بناے آمد و شد خلائق در آنجاے مقدس قائم گشت" (۲۳)

۳

سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے مندرجہ ذیل بنیادی نتیجے نکلتے ہیں:

(الف) پیر کلیر کا قیام اجودھن (پاک پتن) بہ قرائن ۶۳۴ھ کے بعد سے ۶۵۰ھ تک رہا۔

(ب) ۶۵۰ھ کے قریب مرشد کی زندگی ہی میں وہ کلیر شریف تشریف لے گئے اور کلیر ہی میں ان کا انتقال ہوا (۲۴)

(ج) پیر کلیر کی شعر و شاعری کا زمانہ (بروایت) قیام اجودھن کا دور ہے۔

(د) کلیر شریف پیر کی تشریف آوری (۶۵۰ھ) کے کچھ بعد ویران ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کا مزار ویران پڑا رہا اور درگاہ کے مجاور اور دوسرے متعلقین وہاں سے بہت دور کسی دوسرے مقام پر اقامت گزیں رہے۔

(ہ) مزار کی پرداخت کا اہتمام "مدّت مدید" کے بعد ہوا۔ اس سلسلے میں ایک روایت تو اوپر بیان ہوئی ہے۔ ایک دوسری متاخر روایت بھی ہے جس کے مطابق مزار ناپید ہو چکا تھا۔ اور اس کی دوبارہ دریافت ۹۰۰ھ میں قطب عالم شیخ عبدالقدّوس گنگوہیؒ نے کی جو آپ کے شجرہ طریقت کی ساتویں پشت میں خلیفہ تھے۔ "انھوں نے مزار اقدس کا پتا لگایا اور ایک پکی عمارت اپنے دست مبارک سے بنا دی" (۲۵) اس بارے میں مزار کے سجادہ نشینوں کی روایت یہ ہے:

"ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ کلیر کی ویرانی کے بعد سالہا سال تک مخدوم علاء الدین صابر کے مزار مبارک تک کوئی نہ جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی آپ کے روضۂ مبارک پر برائے زیارت حاضر ہوئے اور اس وقت سے اب تک حضرت مخدوم صابر کی درگاہ کی سجادگی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی اولاد میں چلی آتی ہے۔ شاہ امتیاز جہاں سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے راقم الحروف (قدوسی) سے ایک مرتبہ اس کی تفصیل بیان کی تھی جو بعد میں انھوں نے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے عرس کے موقع پر ۱۹۵۰ء میں شائع بھی کی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ ۹۳۲ھ سے ۹۴۴ھ (وفات عبدالقدوس گنگوہی ۵ جمادی الآخر ۹۴۴ھ) تک یعنی اپنی وفات تک شیخ عبدالقدوس گنگوہی حضرت مخدوم علاء الدین صابرؒ کی درگاہ کے فرائض سجادگی و تولیت انجام دیتے رہے" (۲۶)

اس روایت پر بھروسا کیا جائے تو مزار کی دریافت کا سنہ ۹۳۲ھ سامنے آتا ہے۔ گویا (۹۳۲ - ۶۹۰ = ۲۴۲) تقریباً ڈھائی سو برس مزار ویرانی سے دو چار رہا۔ جب مزار کا یہ حال تھا تو دیوان کی حفاظت کا کیا انتظام ہوتا۔

(ر) دیوان کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ وہ بکھرا ہوا تھا اور حضرت (صابر) نے بھی اس جمع آوری کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اشعار کے حرف مٹ گئے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے کشفی ذریعے سے اس کی تکمیل کی اور پچاس نقلیں کرا کر شائع

ںکیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو پھر ۱۰۵۶ھ (سال تصنیف سیر الاقطاب) تک دیوان کا پھر سے ناپید ہو جانا کہ صاحب "سیر الاقطاب" کے ہاتھ صرف ایک غزل لگی۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر اس روایت کو سچ بھی تسلیم کرلیں جب بھی دیوان کے بارے میں جو تصویر بنتی ہے وہ متداول دیوان کی حقیقت کو زیادہ قابل اعتماد نہیں بناتی:

۱۔ ۶۳۳ھ اور ۶۵۰ھ کے درمیان لکھا گیا۔

۲۔ ۶۵۰ھ اور ۹۰۰ھ کے درمیان دستبرد زمانہ کا شکار ہوا۔

۳۔ دیوان کی تدوین و تکمیل کشفی طریقے سے ۹۰۰ کے بعد کسی وقت ہوئی۔

۴۔ ۱۰۵۶ھ تک اس دیوان کی صرف ایک غزل دستیاب تھی۔

۵۔ ۱۸۸۸ء میں دیوان پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

۶۔ ۱۹۶۶ء میں دوسری بار شائع ہوا۔

متداول دیوان کے کل ۲۶۰ صفحات ہیں۔ ان میں ۲۵۶ صفحے تک ردیف وار غزلیں اور اس کے بعد تین بے ترتیب غزلیں، ایک ہندی دوہا اور آخر میں حضرت صابر کی وفات کے بارے میں تین تاریخی قطعات شامل ہیں۔ اس آخری حصے کو چھوڑ کر جو غالباً دوسرے ذرائع سے جمع کیا گیا ہے۔ پہلے ۲۵۶ صفحات میں سے بعض غزلوں کا جائزہ اس دیوان کے انتساب کو مشکوک کر دیتا ہے ہم نے اوپر خارجی شواہد اور اپنے دلائل سے یہ دکھایا تھا کہ تدوین دیوان کی سرگزشت اس کے انتساب کو زیادہ قابل اعتماد ظاہر نہیں کرتی۔ اب داخلی شواہد سے دیوان کے انتساب کے بارے میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

۱۔ دیوان میں ۲۵۶ صفحات تک جتنی غزلیں ہیں سب میں تخلص صابر اختیار کیا گیا ہے حالانکہ ان کی شاعری کے بارے میں جو قدیم ترین حوالہ (سیر الاقطاب میں) ہے اس کی رو سے آپ نے فارسی میں احمد اور ہندی (اردو) میں صابر تخلص اختیار کیا۔

۲۔ متن دیوان میں دو جگہ شاعر نے اپنا نام بھی بیان کیا ہے:

بہ بخشش از لطف خود مظہر علی را
بجز تو نیست کس پروردگارم
خدایا بدہ زود صابر علی را
ز احسان ایماں ز انوار ایقاں
بدہ عشق خود خاص صابر علی را
بہ ز محمدؐ (ص) یاسرار قرآں (ص ۲۳۰)

شاعر خانوادہ سادات سے ہے:

صابر تو ز حال ما چہ پرسی

فرزند رشید مصطفا ایم (ص ۲۱۲)

پیر کلیر سیّد تھے اور علاء الدین علی احمد کہلاتے تھے۔ ظاہر ہے دیوان کی یہ دو غزلیں ۔ایک میں نام مظہر علی اور دوسری میں صابر علی بیان کرتی ہیں۔ صابر تخلص کے دو شاعروں کا امکان ہے جن میں سے ایک کا نام مظہر علی اور دوسرے کا صابر علی ہے ۔

۳۔ متن دیوان میں جن اکابر اولیا کی توصیف کی گئی ہے ان کی کیفیت ملاحظہ ہو :

(الف) حضرت خواجہ معین الدین چشتی

لطف کن لطف یا معین الدین

توئی مشکل کشا معین الدین

اوفتادم بصد ہزار امید

بر درت بے نوا معین الدین

جز تو کس نیست دستگیری کن

ساز برپا مرا معین الدین

اوفتادم ز بے مددیایت

در جفا در جفا معین الدین

من ندارم بجز کرم بایت

در جہاں آشنا معین الدین

جلوہ ذات پاک حضرت تو

ہست در چشم ما معین الدین

یافت صابر ترا ز صدق یقین

سرور اولیا معین الدین

(ص ۲۲۳)

پیر کلیر چشتیہ سلسلہ صوفیہ سے منسلک تھے۔ حضرت فرید الدّین گنج شکر کے مرید تھے۔ حضرت گنج شکر ۔ خواجہ بختیار کاکی کے خلیفہ تھے اور خواجہ بختیار کاکی خواجہ معین الدّین چشتی اجمیری کے خلیفہ تھے۔ خواجہ معین الدّین چشتی کی پیدائش اندازاً ۵۳۴ھ اور انتقال ۶۳۳ھ

میں ہوا (۲۷)۔ پیر کلیر کی ولادت ۱۹ ربیع الاول ۵۹۲ھ قرار دی جاتی ہے۔ گویا خواجہ معین الدین اجمیری کی وفات کے وقت ان کی عمر ۴۱ برس کے قریب ہوگی۔ اشعار سے صوری ملاقات یا تعلق کا کوئی قرینہ نہیں تاہم اس مسلک سے شاعر کا تعلق ظاہر ہے۔

(ب) اسی دیوان میں حضرت فرید الدّین گنج شکر جن کے پیر کلیر خلیفہ اور حقیقی بھانجے تھے ان کا ذکر بالکل سرسری ہے۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ دوسرے بزرگوں کا تو بطور خاص ذکر ہے لیکن بابا فرید کا تذکرہ بہت مختصر ہے۔

(ج) حضرت نظام الدّین اولیا کا ذکر دیوان میں بدیں طور آیا ہے:

نشیں در بزم سلطان مشائخ
کہ ذات او ست ایمان مشائخ
ظہور گنج شکر در رخ او ست
ازیں وجہ ست سلطان مشائخ
نظام الدین نظام الدین بگوشد
کہ یاد او ست سامان مشائخ
زمن بشنو نظام الدین چشتی
کہ ہست اندر جہاں جان مشائخ
بخاک کوے تو سر بر نہادم
کہ کوے او ست بستان مشائخ

(ص ۷۶)

از کرم خسرو سلطان دیں
یافتہ ام گوہر کان یقیں
شکر کنم از دل و جاں تا ابد
یافتہ ام رتبہ حسن الیقیں
گرد سر روضہ چو گشتم نمود
در نظرم غیرت خلد بریں
سر نکند از رہ شرمندگی
پیش جمالت ہمہ خوبان چیں

چوں نشوی قطب زمین و زماں
ہست ترا جلوہ حق ہم نشیں
بخش بصابر تو ز ملک سخن
زانکہ توئی خسرو روے زمیں

(ص ۲۳۲)

دوسرے اقتباس میں سلطان العارفین حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاؒ کی ذات کی طرف اشارہ واضح نہیں لیکن دونوں اقتباسات کو باہم ملا کر بات واضح ہو جاتی ہے۔ موخرالذکر اشعار اس وقت کہے گئے جب سلطان المشائخ وفات پا چکے تھے۔ غزل میں ان کے روضے کا ذکر ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا کا انتقال ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ میں دہلی میں ہوا (۲۸)۔ پیر کلیر کا انتقال ۶۹۰ھ میں ہوا تھا۔ دیوان صابر میں حضرت نظام الدّین اولیاؒ کا ذکر کئی مقامات پر صراحت کے ساتھ آیا ہے اور حضرت فرید الدّین گنج شکر کا ذکر ایک تو کنایۃً مذکورہ بالا اشعار میں اور دوسری جگہ بھی اشارۃً اس طرح آیا ہے:

چو صابر ز مستی غفلت ز ہستی
فریدم فریدم فریدم فریدم

قرینہ یہ ہے کہ شاعر سلسلۂ نظامیہ سے منسلک ہے۔ یہ والہانہ عقیدت مندرجہ ذیل اشعار سے بھی ظاہر ہے:

ز امداد نظام الدین چشتی
بہشتی ام بہشتی ام بہشتی
ز فیض خاص سلطان المشائخ
عجب مطلع ز شوق دل نوشتی

(د) دیگر صوفی بزرگوں کا ذکر بھی دیوان میں ہے:

اگر خواہی کہ گردی در جہان عشق شمع دیں
بیابی دیدۂ دل رو بدرگاہ نصیر الدیں
بہ بینی از رہ معنی ظہور ذات حق بے چوں
اگر داری تو از روے حقیقت دیدۂ حق بیں
سراج العارفیں را دیدۂ دل ساز تا آنجا

بہ بیں در کثرت و وحدت جمال او بہ نیک آئیں
اگر خواہی شوی محرم ز راز ثم وجہ اللہ
بیک شرطے بیا اینجا بشو در سینہ نقش کیں
ز سودائے محبت از دو چشم خویشتن ز انجا
بہ بینی جلوہ ذات فرید الدیں نظام الدیں
بغیر از ذات حق کس نیست واقف از کمال او
کہ ہست آں چشمہائے ء ز بحر خواجہ قطب الدیں
اگر خواہی شوی در ہر دو عالم چوں مہ روشن
بگو از صدق دل خواجہ معین الدیں معین الدیں

(ص ۲۲۸)

خواجہ محمود ز لطف و کرم
قوت بخش دل بیمارے ۔ست
یک نظر از خواجہ حضرت کمال
مرہم ریش دل افگارے ۔ت
شاہد ما شیخ ابو احمد ست
ازنکہ چو حق واقف اسرار ۔ ۔ت

(ص ۳۸)

.... صابر از جبینم
ز خدام سراج العارفینم

(ص ۱۸۲)

رسیدم بر در ایوان دہلی
سلیمان منت ایمان دہلی
جمال حضرت سلطان دیدم
شدم از صدق دل قربان دہلی
ندارم ہیچ غم از لطف یزداں

مددگارم شدہ سلطان دہلی

ز نور روضۂ قطب منوّر

بہشت آمد بچشم شان دہلی

بجز ذات نصیر الدین محمود

ندیدم در جہاں سامان دہلی

بہ بزم شیخ ابو احمد بصد صدق

نشینم مست در ایوان دہلی

بود این شیخ ممدوح و مکرم

چو بسم اللہ بر کرسی دہلی

(ص ۲۳۵)

قطرہ بہ بحر اندر افتد چو بحر گردد

آن قطرہ یقیں شد در ذات شیخ عثمان

(ص ۲۳۵)

ان اشعار میں سراج العارفین شیخ نصیر الدّین چراغ دہلی ، فرید الدّین گنج شکر ، سلطان العارفین نظام الدّین اولیا ، خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی ، خواجہ معین الدّین چشتی ، خواجہ محمود کمال ، شیخ ابو احمد ، شیخ سلیمان ، حضرت قطب منوّر اور شیخ عثمان کے نام آتے ہیں۔ ان شخصیتوں میں سے سراج العارفین شیخ نصیر الدّین محمود چراغ دہلی اور حضرت قطب الدّین منوّر کا کسی قدر تفصیلی ذکر ہماری کچھ رہنمائی کر سکتا ہے۔

شیخ محمود چراغ دہلی ۶۶۵ھ کے الگ بھگ پیدا ہوئے (۲۹) اور آپ نے ۱۸ رمضان المبارک بروز جمعہ ۷۵۷ھ میں دہلی میں انتقال کیا (۳۰) آپ چشتیہ سلسلۂ صوفیا کے اکابر میں شمار ہوتے ہیں ، حضرت نظام الدّین اولیاء کے مرید تھے ، ۴۳ برس کی عمر میں (تقریباً ۷۰۸ھ میں) دہلی آئے اور حضرت کے مرید ہوئے (۳۱)۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ، پیر کلیر کا انتقال ۶۹۰ھ میں ہوا۔ شیخ محمود چراغ دہلی کے ورود دہلی کا سنہ ۷۰۸ھ کے قریب ہوا تو گویا آپ پیر کلیر کے انتقال کے کئی برس بعد سلسلۂ چشتیہ میں پیر کلیر کے پیر بھائی حضرت نظام الدّین اولیاء کے ہاتھ پر بیعت ہوئے (۳۲)

حضرت صابر کی وفات کے وقت حضرت نصیر الدّین محمود ابھی صرف ۱۵ برس کے تھے (پیدائش ۶۷۵ ھ) اور وہ دہلی میں اقامت پذیر تھے۔ لیکن دیوان صابر کا مصنف نہ صرف ان صوفی بزرگ کا خاص عقیدت مند ہے بلکہ ان کے القاب سے بھی واقف ہے حالانکہ کسی معاصر نے حضرت نصیرالدّین محمود کو چراغ دہلی یا سراج العارفین نہیں کہا۔ یہ خطاب بہت بعد میں انھیں دیا گیا تھا۔

قطب الدّین منوّر حضرت نصیر الدّین محمود کے پیر بھائی تھے۔ دونوں کو مرشد (حضرت نظام الدّین اولیا) سے خلافت ایک ہی دن ملی تھی (۳۳) (۷۲۴ ھ)۔ قطب الدین منوّر شیخ جمال الدّین ہانسوی (مرید فرید الدّین گنج شکر) کے پوتے اور شیخ برہان الدّین کے بیٹے تھے .... ۷۶۰ھ میں انتقال کیا (۳۴)۔ گویا ۷۶۰ھ کے بعد سلسلۂ چشتیہ میں واجب الاحترام قرار پائے ہوں گے کہ دیوان صابر کا مصنف انکے گن گا سکے۔ پیر کلیر کی وفات کے وقت تو یہ بہت چھوٹے ہوں گے۔ کچھ عجب نہیں کہ ابھی پیدا بھی نہ ہوئے ہوں۔ "ارمغان صابر" کا شاعر ان کے مزار کا ذکر کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ زمانہ ۷۶۰ھ کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے۔ ان شواہد کی بنا پر ہم یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ "ارمغان صابر" کے مصنف صابر (منظر علی؟ صابر علی؟ کوئی دوسرے شخص ہیں۔ ان کا سلسلۂ طریقت حضرت نظام الدّین اولیا اور ان کے خلفا سے متعلق ہے اور ان کا زمانہ حضرت نصیر الدّین محمود چراغ دہلی اور شیخ قطب الدّین منوّر کے بعد کا ہے۔ پیر کلیر اس دیوان کے مصنف نہیں قرار دیے جا سکتے۔

حواشی

(۱) ارمغان صابر (دیباچہ) ص ۲۰۵

(۲) ارمغان صابر (دیباچہ) ص ۱۰، حقیقت گلزار صابری (محمد حسن صابری) ص ۱۲۰ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات (اعجاز الحق قدوسی) ص ۲۱۱

(۳) ارمغان صابر۔ ص ۱۱، ص ۶۱

(۴) شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات (قدوسی) ص ۱۶۸، ۳۹۹۔

(۵) ان کے حالات پر اردو میں جو کتابیں ملتی ہیں وہ یہ ہیں:

(الف) حقیقت گلزار صابری از مخدوم شاہ محمد حسن (۱۳۰۳ھ) طبع پنجم۔ ملک دین محمد اینڈ سنز۔ بل روڈ۔ لاہور

(ب) زمزمۂ صابری از تسلیم احمد امروہوی (۱۹۰۰ء) مطبع حقانی امروہہ

(ج) جمال صابر کلیری از وحید احمد مسعود۔ نظامی پریس بدایوں

(د) تاریخ صابریہ معروف بہ سیاحت کلیر۔ ولی احمد خاں۔ بدایوں (۱۹۲۲ء)

(۶) اخبار الاخیار (عبدالحق محدثؒ) مطبع محمدی۔ محمد مرزا خاں۔ ص ۸۰۔

(۷) اصل عبارت میں "خوش گذرانیدن" کی ترکیب ہے جس کے معنی لغت نویس نے یوں بیان کیے ہیں:

خوش مرادف شاد و مرادف خوب دریں بیت حسن بیگ رفیع

عمر گر خوش گذرد زندگی خضر کم است

ور بناخوش گذرد نیم نفس بسیار است

بناخوش بمعنی بحال ناخوش باشد نظیر ایں لفظ تنگ است

(فرہنگ آنندراج جلد اول ص ۱۰۶۵)

گویا خوش بناخوش یا تنگی ترشی سے گزارنے کی ضد ہوا۔ مطلب یہ کہ آسائش سے اور اچھی طرح زندگی بسر کرنا۔

(۸) سیر الاقطاب، ص ۱۷۷، ۱۸۲۔

(۹) ارمغان صابر ص ۱۱

(۱۰) حقیقت گلزار صابری، ص ۱۲۳۔

(۱۱) ایضاً ص ۱۲۳۔

(۱۲) حقیقت گلزار صابری، ص ۱۰۷

(۱۳) ایضاً ص ۱۳۶۔ ۱۳۷۔

(۱۴) The Life and Times of Shaikh Faridud Din Ganj Shakar

از خلیق احمد نظامی ص ۱۱

سوانح حضرات بابا فرید الدّین مسعود گنج شکر (وحید احمد مسعود) ص ۳۰ " حضرت کا سال ولادت ۵۶۹ھ مستند خیال کیا گیا ہے "

(۱۵) سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، ص ۲۹۔

(۱۶) سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر ص ۴۲۔

(۱۷) ایضاً ص ۸۳۔

(۱۸) تذکرہ صوفیائے پنجاب (قدسی) ص ۳۳۹ (بحوالہ سیر الاولیا) بزم صوفیہ ص ۸۷۔

(۱۹) سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، ص ۱۰۸۔

(۲۰) حقیقت گلزار صابری ص ۱۳۸۔

(۲۱) خلیق احمد نظامی کی محولۂ بالا انگریزی کتاب ص ۵۶۔

سوانح حضرت بابا فرید الدّین مسعود گنج شکر ص ۱۸۱

(سیر الاقطاب ۶۹۰ھ راحت القلوب ۶۸۷ھ خزینۃ الاصفیا ۶۷۰ھ اخبار الاخیار ۶۶۴ھ مستند بیان سلطان المشائخ کا ہے یعنی ۶۶۱ھ)

(۲۲) خزینۃ الاصفیا (جلد اول ۱۸۶۴ء) ص ۳۱۷، ۳۱۸ (بحوالہ معارج الولایت)

(۲۳) سیر الاقطاب ص ۱۷۷ تا ۱۸۳۔

(۲۴) خزینۃ الاصفیا (بحوالہ معارج الولایت) ۱۳ ربیع الاول ۶۹۰ھ

جلد اول ص ۳۱۹۔ سیر الاقطاب میں ۱۳ ربیع الاول ۶۶۴ھ (ص ۱۸۳) شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات (قدوسی) میں بحوالہ خزینۃ الاصفیا ۶۹۶ھ ہے، حاشیے میں

لکھتے ہیں کہ بعد سلطان جلال الدّین خلجی ۔ جلال الدّین خلجی کا انتقال ۶۹۵ ھ میں ہوا (ص ۱۱۶)

(۲۵) ارمغان صابر ص ۱۵

(۲۶) شیخ عبدالقدّوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات ص ۱۱۶، ۱۱۷۔

(۲۷) سوانح خواجہ معین الدّین چشتیؒ (وحید احمد مسعود) ص ۴۳، ۵۰۔

(۲۸) بزم صوفیہ (صباح الدّین عبدالرّحمان) ص ۲۲۳۔

(۲۹) Khairul-Majalis (Ed Khaliq Ahmed Nizami P 38

بحوالۂ فرشتہ جس نے ۸۲ برس کی عمر میں انتقال کا ذکر کیا ہے

(۳۰) ایضاً ص ۱۶

(۳۱) بزم صوفیہ (صباح الدّین عبدالرّحمان) ص ۳۱۰۔

(۳۲) مطابق حاشیہ نمبر ۱ ص ۳۷ : سند خلافت ۲۰ ذی الحجہ ۷۴۲ھ کو ملی

(۳۳) بزم صوفیہ ۔ ترجمہ چراغ دہلی

(۳۴) اخبار الاخیار ۔ ص ۸۵۔

(۳۵) خزینۃ الاصفیا (جلد اول) ص ۳۶۰۔

("مطالعۂ ادبیات فارسی")

طبع لاہور ۔ ۱۹۹۶ء

ڈاکٹر محمد ایوب قادری:

شاہ ولی اللہ دہلوی رح سے منسوب بعض رسالے

شاہ ولی اللہ دہلوی سے منسوب بعض ایسے رسالے بھی ملتے ہیں جو شاہ صاحب کی تصنیف نہیں ہیں اور لوگوں نے شاہ صاحب سے منسوب کر کے چھاپ دیئے ہیں یا شاہ صاحب کی تصنیف بتاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام مرزا علی لطف مولف تذکرہ گلشن ہند کا ہے یہ تذکرہ ۱۸۰۱ء میں تالیف ہوا ہے۔ مرزا علی لطف نے ولی اللہ سرہندی المتخلص بہ اشتیاق کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سمجھ کر ان کی ہجو کی اور ان سے دو کتابیں منسوب کی ہیں وہ لکھتا ہے (۱)۔

"فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کے نہایت بلند تھا خصوصی علم حدیث اور تفسیر میں بہت بڑی دست گاہ رکھتے تھے یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدہ روزگار کا زبان خلائق پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کر کے جاری ہے اکثر کتابیں تصنیف اس بحر علم کی مشہور ہیں چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسین" ہے اور دوسرے کا نام "جنت العالیہ فی مناقب العالیہ" ہے تصنیفات سے اس محی الدین کی یادگار صفحہ روزگار پر ہیں والد ماجد ہیں یہ اس رونق بخش کشور قناعت کے کہ جس کا نام نامی مولوی عبدالعزیز ہے آج کے دن تک قدم توکل گاڑے ہوئے شاہ جہاں آباد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی (ف ۱۹۱۴ء) اس تحریر کا رد کرتے ہوئے حاشیے میں

لکھتے ہیں (۲)۔

"دونوں نام غلط ہیں۔ پہلی کتاب۔ تفضیل شیخین (۳) میں ہے شہادت امام حسین علیہ السلام کے ابطال سے خدانخواستہ اس کا کوئی تعلق نہیں اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے معاویہؓ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں"

بابائے اردو مولوی عبدالحق (ف ۱۹۶۱ء) نے بھی اسی نقطہ نظر کو قبول کیا ہے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں (۴)۔

"صاحب تذکرہ (مرزا علی لطف) نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسین" اور "جنت العالیہ فی مناقب المعادیہ" ان کی تصانیف میں سے ہیں حالانکہ ان مباحث میں ان کی کوئی کتاب نہیں ہے نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے اور نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے یہ محض اتہام ہے اس کے بعد یہ کہہ کر کہ یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کی خوب ہجو ملیح کی ہے"

شاہ محمد اسحاق دہلوی (ف ۱۲۶۲ھ) جب ۱۲۵۷ھ میں حجاز کو ہجرت کر گئے تو دہلی میں تقلید و عدم تقلید کے مباحث نے خوب زور پکڑا مقلدین و غیر مقلدین کے درمیان مناظرے ہوئے اور ان مباحث پر طرفین سے رسالے اور کتابیں لکھی گئیں (۵) اسی زمانے میں بعض جعلی کتابیں بھی وجود میں آئیں۔ قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی (ف ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء) اپنی ایک تالیف کشف الحجاب میں لکھتے ہیں (۶)۔

"اور ایسا ہی ایک اور جعل (غیر مقلدین) کرتے ہیں کہ سوال کسی مسئلے کا بنا کر اور اس کا جواب موافق اپنے مطلب کے لکھ کر علمائے سابقین کے نام سے چھپواتے ہیں چنانچہ بعض مسئلے مولانا شاہ عبدالعزیز کے نام سے اور بعض مسئلے مولوی حیدر علی کے نام سے علیٰ ہذا القیاس چھپوائے ہیں۔"

شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان کے ایک فرد اور ان کی تصنیفات کے مشہور ناشر ظہیر الدّین سید احمد ولی اللہی نبیسہ شاہ رفیع الدّین دہلوی جنھوں نے شاہ صاحب کی تصانیف کی بڑی تعداد طبع و شائع کرکے وقف عام کی ہے انھوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی چنانچہ وہ شاہ صاحب کی ایک کتاب تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء کے آخر میں لکھتے ہیں۔ (۷)۔

"بعد حمد و صلوٰۃ کے بندہ محمد ظہیر الدّین عرف سیّد احمد اول گذارش کرتا ہے بیچ خدمت شائقین تصانیف حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب و مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کہ آج کل بعض لوگوں نے بعض تصانیف کو اس خاندان کی طرف منسوب کردیا ہے اور در حقیقت وہ تصانیف اس خاندان میں سے کسی کی نہیں اور بعض لوگوں نے جو ان کی تصانیف میں اپنے عقیدے کے خلاف بات پائی تو اس پر حاشیہ جڑا اور موقع پایا تو عبارت کو تغیر و تبدل کر دیا تو میرے اس کہنے سے یہ غرض ہے کہ جو اب تصانیف ان کی چھپیں اچھی طرح اطمینان کرلیا جائے جب خریدنی چاہییں۔"

ظہیر الدّین صاحب اس سلسلے میں مزید وضاحت شاہ صاحب کی ایک دوسری تصنیف "انفاس العارفین" کے آخر میں "التماس ضروری" کے عنوان سے کرتے ہیں اور اس میں جعلی کتابوں کے نام اور ناشرین کی بھی نشان دہی کرتے ہیں (۸)

"دوسری التماس آپ کے ملاحظہ فرمانے کے لائق یہ امر ہے کہ فی زماننا الدنیا زور لایحصلھا الا بالزور کو بعض حضرات نے کمر باندھی ہے اور دنیا کمانے کے واسطے حضرات موصوفین (شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف) کی طرف اکثر کتابیں منسوب کرکے چھاپ دی ہیں جو کسی طرح ان حضرات کی تصنیف میں سے نہیں ہیں اور ارباب بصیرت ان کو پڑھ کر ان کے عیب اور مفاسد کو اس طرح جان لیتے ہیں جس طرح ایک تجربہ کار نقاد کھرے کھوٹے کو کسوٹی پر لگا کر پہچان لیتا ہے مگر چونکہ بقوائے

العوام کالانعام بیچارے اردو پڑھنے والے علم سے بے بہرہ لوگ اکثر ان جعلی اور مصنوعی رسائل کو پڑھ کر ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں اس واسطے میرا فرض ہے کہ میں ان رسائل کے نام اس کاغذ کوتاہ میں لکھ دوں اور اپنے دین دار بھائیوں کو ارباب زمانہ کی گندم نمائی وجو فروشی سے آگاہ کردوں آگے اس پر عمل کرنا نہ کرنا ان کا فعل ہے۔

منت آنچہ حق بود گفتم تمام　　　　تودانی دگر بعد ازیں والسلام

اور وہ جعلی و مصنوعی رسائل یہ ہیں:۔

۱۔ تحفۃ الموحدین	مطبوعہ اکمل المطابع دہلی	منسوب بہ طرف حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب
۲۔ بلاغ المبین	مطبوعہ لاہور	
۳۔ تفسیر موضح القرآن (۹)	مطبوعہ مطبع خادم الاسلام دہلی	منسوب بہ طرف مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم
۴۔ ملفوظات (۱۰)	مطبوعہ میرٹھ	منسوب بہ طرف حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز

المشتہر سید ظہیر الدین احمد مالک مطبع احمدی دوکان اسلامیہ دہلی"

ایک نامور عالم مولانا وکیل احمد سکندر پوری البلاغ المبین کے متعلق اپنی تصنیف "وسیلہ جلیلہ" میں لکھتے ہیں (۱۱)۔

"یہ کتاب (البلاغ المبین) کسی وہابی کی تصنیف ہے جسے کافی لیاقت نہ تھی مگر اعتبار و استناد کے لیے مولانا شاہ ولی اللہ کی طرف منسوب کی گئی اس کا انتساب ایسا ہی ہے جیسے دیوان مخفی کا زیب النساء کی طرف یا دیوان محی کا حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی طرف یا دیوان معین الدین ہروی کا حضرت معین الدین چشتی کی طرف"

تحفۃ الموحدین سب سے پہلے اکمل المطابع دہلی میں طبع ہوا پھر قیام پاکستان کے بعد مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے ادارہ اشاعۃ السنۃ نے رجب ۱۳۸۳ھ

میں اسے دوبارہ شائع کیا اس رسالے کے شروع میں ادارے کے ناظم محمد اسحاق صاحب نے " سخن گفتنی" کے عنوان سے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے (۱۲)۔

" حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا توحید کے مسئلے پر ایک مختصر لیکن جامع رسالہ تحفۃ الموحدین نصف صدی کے قریب کا عرصہ ہوا افضل المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا رسالہ فارسی میں ہے اس کا ترجمہ حضرت شاہ صاحب موصوف کے ایک سوانح نگار مولانا حافظ محمد رحیم بخش دہلوی نے کیا "

طبع ثانی کی اشاعت ہمارے پیش نظر ہے اس میں تحفۃ الموحدین کے سرورق پر مصنف یا مؤلف شاہ ولی اللہ تحریر نہیں ہے بلکہ از افادات شاہ ولی اللہ دہلوی لکھا ہوا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ناشر اس سلسلے میں خود متردد ہے لہذا اس نے اس رسالے کا اعتبار قائم کرنے کے لیے اس کا مترجم حیات ولی کے مؤلف مولانا رحیم بخش دہلوی کو بتایا ہے حالانکہ حیات ولی میں مولانا رحیم بخش دہلوی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف کی جو فہرست دی ہے اس میں کہیں تحفۃ الموحدین یا بلاغ المبین کا ذکر تک نہیں ہے (۱۳)۔

تحفۃ الموحدین کے آغاز میں مصنف کا نام ولی اللہ دہلوی تحریر ہے شاہ صاحب کی تصانیف کی ایک بڑی تعداد کی زیارت کا ہمیں شرف حاصل ہے ان میں کہیں بھی صرف ان کے نام کے ساتھ " دہلوی " کی نسبت تحریر نہیں ہے وہ ہر جگہ فقیر ولی اللہ یا ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم لکھتے ہیں۔

البلاغ المبین بھی سب سے پہلے مطبع محمدی لاہور سے ۱۳۰۰ھ طبع و شائع ہوئی ہے طابع و ناشر نے کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ ان کو اس کتاب کا قلمی نسخہ کہاں سے دستیاب ہوا۔ حالانکہ ایک اہل حدیث عالم مولوی فقیر اللہ اس کے طابع و ناشر ہیں اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ البلاغ المبین میں کہیں مصنف کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ کا نام نہیں ہے۔ شاہ صاحب کی ہر تصنیف میں آغاز کتاب میں ان کا نام موجود ہوتا ہے مگر البلاغ المبین میں ایسا نہیں ہے۔

ان دونوں کتابوں کی زبان طرز بیان اور طریقہ استدلال شاہ ولی اللہ دہلوی سے بالکل مختلف ہے۔ اکثر غیر مستند اور وضعی حدیثوں سے استدلال کیا گیا ہے (۱۴) صوفیاء کے اقوال

اور ان کے ملفوظات کے حوالے ملتے ہیں صاحب مجالس الابرار (شیخ احمد رومی)، شیخ عبدالحق دہلوی اور ابن تیمیہ کے حوالہ جات کی کثرت ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص طور سے ابن تیمیہ (۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء) کا پروپیگنڈا مقصود ہے۔ (۱۵) چنانچہ ان کا نام اس طرح لکھا گیا ہے۔ (۱۶)۔

"علامہ ابو العباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام مفتی ملک شام"

ملک کے مشہور اہل حدیث محقق و مورخ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں (۱۷)۔

"البلاغ المبین تو یقینا شاہ ولی اللہ کی کتاب نہیں اس کا اسلوب تحریر و طریق ترتیب مطالب شاہ صاحب کی تمام تصانیف سے متفاوت ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ابتدائی دور کی تصنیف ہوگی۔"

ان دونوں کتابوں تحفۃ الموحدین اور البلاغ المبین کا شاہ صاحب کی تصانیف میں یا ان کے صاحبزادگان کی تصانیف میں یا ان کے مستفیدین کی تصانیف میں کوئی ذکر یا حوالہ نہیں ملتا شاہ صاحب کے سوانح نگار اول مولانا رحیم بخش دہلوی مولف حیات ولی (۱۸) بھی ان کتابوں کا قطعاً ذکر نہیں کرتے دوسرے تذکرہ نگار مولوی رحمان علی مولف تذکرہ علمائے ہند، (۱۹) ، مولوی فقیر محمد جہلمی مولف حدائق الحنفیہ (۲۰) ، نواب صدیق حسن خاں مولف ابجد العلوم (۲۱) ، مولوی حکیم عبدالحی مولف نزہتہ الخواطر (۲۲) اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی مولف تاریخ اہل حدیث (۲۳) کے یہاں بھی ان کتابوں کا ذکر نہیں ملتا۔ (۲۴)۔

البلاغ المبین کا اردو ترجمہ تبلیغ حق کے نام سے ۱۳۶۴ھ میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا اس پر مولوی غلام محمد بی اے (عثمانیہ) مولف تذکرہ سلیمان نے مولانا سلیمان ندوی سے دریافت کیا (۲۵)۔

"بلاغ المبین کے نام سے ایک کتاب اہل حدیث حضرات کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور اس کو مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی بتایا گیا ہے کیا یہ کتاب واقعتاً شاہ صاحب کی ہے اور اگر ہے تو اس میں بعض مسائل ایسے ملتے ہیں جن میں شدت حد اعتدال سے زائد ہے۔"

مولوی غلام محمد صاحب نے قوسین میں اس کا جواب اس طرح لکھا ہے (۲۶)۔

"بعد میں تحقیق سے پتہ چلا اور خود حضرت والا (مولانا سلیمان ندوی) نے بھی تصدیق فرمائی کہ یہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیف ہے ہی نہیں، بلکہ کسی نے لکھ کر ان کی طرف منسوب کر دی ہے تاکہ شاہ صاحب کو ماننے والے ان عقائد کو مان لیں۔"

شاہ ولی اللہ دہلوی سے منسوب ایک رسالے کی نشان دہی مولانا محمد علی کاندھلوی خواہر زادہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے بھی کی ہے وہ لکھتے ہیں۔ (۲۷)۔

"میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں سنتا ہوں کہ لوگ غیر مقلدیت کو پروان چڑھانے کے لیے حضرت شاہ صاحب کی کتابوں سے ادھوری اور تراشیدہ عبارتیں نقل کرکے بیچارے عوام کو دھوکا دیتے ہیں یہی نہیں بلکہ "قول سدید" کے نام پر ایک من گھڑت کتاب کو شاہ صاحب سے منسوب کرتے ہیں"

اس سلسلے میں ایک اور رسالے کا ذکر بھی ضروری ہے جس کا نام "اشارہ مستمرہ" ہے اس کو شاہ صاحب کی تصنیف بتایا گیا ہے اس رسالے کو اردو ترجمے کے ساتھ فضل الرحمن صاحب مدرس جامعہ اسلامیہ نے ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء میں مکتبہ عربیہ قرول باغ دہلی سے شائع کیا ہے مترجم نے آخر میں لکھا ہے کہ اس کا مخطوطہ ٹونک کے کتب خانے سے حاصل ہوا تھا جو ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء کا مکتوبہ تھا۔

شاہ صاحب کی فہرست تصانیف میں دو رسالے "رسالہ اوائل" اور "فیما یجب حفظہ للناظر" بھی ناشرین کی عدم توجہ سے شامل ہو گئے ہیں جن میں سے پہلا رسالہ تو شیخ محمد سعید شیخ محمد سنبل کا مؤلفہ ہے اور دوسرا رسالہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کسی شاگرد نے لکھا ہے جس میں شاہ صاحب کا ذکر شیخنا کی صراحت کے ساتھ کیا ہے۔

(ماخوذ از مقدمہ مرتب "مجموعہ وصایا، اربعہ" شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ ۱۹۶۴ء)

حواشی

(۱) گلشن ہند از مرزا علی لطف تصحیح و حاشیہ از شمس العلما، شبلی نعمانی و مقدمہ از مولوی عبدالحق صفحہ ۲۳ (حیدرآباد دکن ۱۹۰۶ء)

(۲) ایضاً صفحہ ۲۲

(۳) کتاب کا نام "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" ہے

(۴) ایضاً مقدمہ صفحہ ۲۵

(۵) تفصیل کے لیے دیکھیے تنبیہ الضالین و ہدایت الصالحین (مجموعہ فتاوای علمائے دلی و حرمین شریفین در جواز تقلید) مطبوعہ مطبع سید الاخبار دلی ۱۲۶۲ھ / ۱۸۳۵ء

(۶) کشف الحجاب از قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی صفحہ ۹ (مطبع بہار کشمیر لکھنو ۱۲۹۸ھ)

(۷) تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء از شاہ ولی اللہ دہلوی مطبوعہ مطبع احمدی کلاں محل متعلق مدرسہ عزیزی دلی باہتمام ظہیر الدین ولی اللہی (سال طباعت ندارد)

(۸) انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ دہلوی مطبوعہ مطبع احمدی دلی متعلق مدرسہ عزیزی باہتمام ظہیر الدین

(۹) شاہ عبدالقادر نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں مکمل کرلیا اس پر مختصر تفسیری حاشیے ہیں اس ترجمے کا تاریخی نام "موضح قرآن" ہے موضع القرآن نہیں ہے تفسیر مولانا شاہ عبدالقادر المعروف بموضح القرآن" کے نام سے ایک تفسیر ابو محمد ثابت علی اعظم گڑھی اور غلام حسین مونگیری نے ۸-۱۳۰۷ھ میں مطبع خادم الاسلام دلی سے طبع کرا کے شائع کی یہ کتاب سات جلدوں میں طبع ہوئی ہے اس کی دوسری جلد پر شمس العلما، میاں نذیر حسین دہلوی (ف ۱۹۰۲ء) کے داماد مولوی سید شاہ جہاں کی تقریظ ہے اور آخر کتاب میں اشتہار ہے کہ شہر دلی پھاٹک حبش خاں مدرسہ سید محمد نذیر حسین صاحب سے طلب فرمائیں۔ اس تفسیر کی طرف سید ظہیر الدین نے اشارہ کیا ہے۔

(۱۰) ملفوظات شاہ عبدالعزیز (فارسی) کا پہلا ایڈیشن مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا اور مطبع ہاشمی میرٹھ سے (۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء) میں ان ملفوظات کا اردو ترجمہ سب سے پہلے شائع ہوا۔ ترجمے کے فرائض مولوی عظمت الٰہی بن محمد ہاشم نے انجام دیے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں ملفوظات شاہ عبدالعزیز کا اردو ترجمہ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز (کراچی) نے شائع کیا۔ مترجمین مولوی محمد علی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی ہیں اور پیش لفظ ڈاکٹر معین الحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔

(۱۱) وسیلۂ جلیلہ از مولانا وکیل احمد سکندر پوری صفحہ ۲۳ (مطبع یوسفی لکھنو سال طباعت ندارد)

(۱۲) تحفۃ الموحدین صفحہ ۱ (شائع کردہ ادارہ اشاعۃ السنہ۔ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان ۱۳۸۳ھ)

(۱۳) ملاحظہ ہو حیات ولی از مولانا رحیم بخش دہلوی صفحہ ۵۳۵ - ۵۸۰ (مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۵۵ء)

(۱۴) مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب و مولوی فقیر اللہ مرحوم نے حواشی میں اکثر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو بلاغ المبین صفحہ ۵۲۔۵۵ (لاہور ۱۹۶۲ء)

(۱۵) ملاحظہ ہو البلاغ المبین صفحہ ۶۰۔۹۹ (شائع کردہ مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۶۲ء)

(۱۶) ایک موقع پر حضرت شاہ ولی اللہ نے امام ابن تیمیہ کے سلسلے میں ایک خط لکھا ہے اس میں انھوں نے ان کو شیخ تقی الدین احمد ابن تیمیہ لکھا ہے ملاحظہ مکتوبات مناقب ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری صفحہ ۲۶ (مطبع احمدی دہلی سال طباعت ندارد)

(۱۷) مکتوب مولانا غلام رسول مہر بنام محمد ایوب قادری مکتوبہ ۲۸ فروری ۱۹۶۳ء

(۱۸) حیات ولی از رحیم بخش دہلوی صفحہ ۵۳۵۔ ۵۸۰ (مکتبہ سلفیہ لاہور ۱۹۵۵ء)

(۱۹) ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند (مولوی رحمان علی) مرتبہ و مترجمہ محمد ایوب قادری صفحہ ۳۳۵ (پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء)

(۲۰) حدائق الحنفیہ از مولوی فقیر محمد جہلمی صفحہ ۴۳۰۔ (نول کشور پریس، لکھنو ۱۹۰۶ء)

(۲۱) ابجد العلوم از نواب صدیق حسن خاں صفحہ ۹۱۲۔۹۱۳ (مطبع صدیقی بھوپال ۱۲۹۶ھ)

(۲۲) نزہۃ الخواطر جلد ششم از مولوی حکیم عبدالحی صفحہ ۳۹۸۔ ۳۱۵ (دائرہ المعارف

حیدر آباد دکن ۱۹۵۰ء)

(۲۳) تاریخ اہل حدیث از مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی صفحہ ۳۱۱۔۳۱۶ (اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور ۱۹۵۳ء)

(۲۴) تحفۃ الموحدین کو تو شاہ ولی اللہ کی تصنیفات میں ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مولف تراجم علمائے اہل حدیث (صفحہ ۴۲۔۴۶) نے بھی شامل نہیں کیا ہے۔

(۲۵) تذکرہ سلیمان از غلام محمد صفحہ ۳۶۹ (ادارہ مجلس علمی، کراچی ۱۹۶۰ء)

(۲۶) ایضاً

(۲۷) شاہ ولی اللہ اور تقلید از مولانا محمد علی کاندھلوی صفحہ ۳۵ (سیالکوٹ۔ سال طباعت ندارد)

یادداشت از نجم الاسلام:

مقالۂ مندرجۂ بالا میں شاہ عبد القادر کی "موضح قرآن" کے علاوہ، ان سے منسوب "موضح القرآن" کا ذکر آیا ہے۔ اس حوالے سے تقابلی مطالعے پر مبنی، راقم الحروف کے قلم سے ایک مضمون شامل اشاعت کیا جاتا ہے۔

محمد شکیل احمد صدیقی:

دیوان منسوب بہ منصورِ حلّاج

انا الحق کہنے والے حسین بن منصور حلّاج کا نام غیر معمولی شہرت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ منحرف حق بھی اس نام سے اسی طرح آشنا ہیں جس طرح وابستہ حق۔ اس لیے ان کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ حال ہی میں ان کی طرف منسوب ایک فارسی دیوان نے نگاہ شوق کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ لیکن اس کے مطالعے کے بعد بڑی مایوسی ہوئی اور اس نتیجے پر پہنچنا پڑا کہ یہ دیوان نعرۂ انا الحق بلند کرنے والے حسین بن منصور کا نہیں ہے۔

دیوان ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ تخلص حسین نظم ہوا ہے۔ مطبع زہرہ ایران میں زیر اہتمام کتابخانہ سنائی چھپا ہے۔ دیوان کے شروع میں جناب ولی اللہ یوسفیہ کا ۲۵ صفحات کا مقدمہ ہے جس میں عشق، اس کی ہمہ گیری اور تاثیر پر فاضلانہ بحث ہے۔ مختصراً منصور کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقدمے سے قبل ایک صفحے کا مقدمۂ ناشر، جس میں ناشر نے لکھا ہے کہ میرا کام ان اشعار کو مدوّن اور نشر کرنا تھا جو میں نے انجام دے دیا لیکن اس بات کی تحقیق کرنا کہ یہ اشعار منصورِ حلاج کے ہیں یا نہیں، محققوں کا کام ہے۔ اس تحریر نے ناشر کی ذمہ داری کو بڑی حد تک ہلکا کر دیا۔ مگر فاضل مقدمہ نگار ولی اللہ یوسفیہ نے اس کو منصور حلّاج کا کلام یقین کر لیا۔ اگر انھوں نے نگاہ تحقیق سے اس کو دیکھا ہوتا تو یہ چیز خود ان پر منکشف ہو جاتی کہ دریائے عشق کے غوّاص حسین بن منصور حلّاج کا کلام نہیں ہے جس کے مندرجۂ ذیل وجوہ ہیں:

۱۔ حسین بن منصور کے ہم عصر مشہور مورخ طبری یا ان کے بعد کے بھی کسی تذکرہ نگار نے یہ نہیں لکھا کہ وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ حسین بن منصور کے حالات صاحب کشف المحجوب نے بڑی ارادت و عقیدت سے لکھے ہیں۔ یہ صوفیائے کرام کے حالات سے متعلق پہلی کتاب ہے۔ اور منصورِ حلّاج کے عہد سے قریب تر یعنی پانچویں صدی ہجری کے وسط کی تالیف ہے۔ اس کے مولف حضرت شیخ ابوالحسن علی بن عثمان بن ابو علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش ہیں اور ان کا شمار اکابر صوفیہ میں ہے۔ اس سلسلے کی دوسری اہم تصنیف خواجہ فرید الدین

عطار کی تذکرۃ الاولیاء ہے۔ ان دونوں کتابوں میں ان کی تصانیف کی کثرت کا ذکر ہے۔ ہجویری نے یہ بھی لکھا ہے کہ حسین بن منصور حلاج کی پچاس تصانیف بغداد اور اس کے نواح میں ان کی نظر سے گذریں (۱) نیز یہ کہ ان کی بعض تصانیف، ابو جعفر بن المصباح الصیدلانی سے پڑھنے کا بھی ذکر کیا ہے (۲)۔ لیکن ان کے دیوان یا فارسی اشعار کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ وہ شعر ضرور کہتے تھے لیکن عربی میں۔ قرطبی نے صلۂ تاریخ طبری میں ان کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ (۳) ہجویری نے بھی ایک جگہ ان کے تین اشعار اور خواجہ فرید الدین عطار نے دو شعر نقل کیے ہیں۔ جن کو آگے پیش کیا جائے گا۔ اسی طرح رضا قلی ہدایت نے ریاض العارفین میں ان کے جو دس اشعار نقل کیے ہیں، وہ بھی عربی میں ہیں۔ اگر فارسی کے بھی اشعار ہوتے تو کہیں نہ کہیں ان کا فارسی شعر ضرور نقل کیا گیا ہوتا۔

۲۔ صاحبِ کشف المحجوب اور صاحبِ تذکرۃ الاولیاء نے جہاں بھی منصور کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نقل کیے ہیں وہ سب عربی میں ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی تحریر و تقریر کی زبان عربی تھی،

۳۔ حسین بن منصور حلاج تیسری صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کے شروع یعنی ۳۰۹ھ میں ان کے دار پر لٹکائے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ اس زمانے میں فارسی شاعری اپنے عہد طفولیت میں تھی، اور اس کا بادا آدم رودکی سمرقندی بھی عالم وجود میں نہ آیا تھا، لہذا ایسی آسان اور رواں زبان جیسی کہ اس دیوان کے اشعار کی ہے کبھی بھی اس دور کی نہیں ہو سکتی، اگر یہ کلام منصور حلاج کا ہوتا تو تذکرہ نگار رُودکی کے بجائے فارسی شاعری کا بادا آدم ان ہی کو قرار دیتے اور غزل میں پیغمبری کا سہرا بجائے سعدی کے ان کے سر بندھتا۔

۴۔ حسین بن منصور حلاج سے منسوب اس دیوان میں چند قصائد اور زیادہ تر غزلیں ہیں۔ دیوان کی ابتدا، جس قصیدے سے ہو رہی ہے وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ائمہ کی شان میں ہے، اور مندرجہ ذیل مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

اے دُور ماندہ از حرم خاص کبریا — سوئے وطن رجوع کن از خطۂ خطا

لیکن در حقیقت یہ قصیدہ حسین بن منصور حلاج کے بجائے ملا حسین واعظ کاشفی کا ہے۔ جس کے گیارہ اشعار رضا قلی ہدایت نے ریاض العارفین میں ملا صاحب کے نمونۂ کلام کے سلسلے میں نقل کیے ہیں (۴)، زیر بحث دیوان میں ایک قصیدہ ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے:

گر من سر از نشیمن دنیا بر آورم — گرد از قرار طارم اعلیٰ بر آورم

یہ قصیدہ خاقانی کے اس مشہور قصیدے کی زمین میں ہے:

ہر صبح سر ز گلشنِ سودا بر آورم — وز صور آہ بر فلک آوا بر آورم

خاقانی کا یہ طویل قصیدہ پچاسی اشعار پر مشتمل ہے، اور حسین بن منصور حلاج سے منسوب قصیدے میں تیس اشعار ہیں۔ ذیل میں ہم دونوں کے چند اشعار تقابلی مطالعے کے لیے درج کر رہے ہیں:

اشعار خاقانی	اشعار منسوب بہ منصور حلاج
قندیل دیر چرخ فرد میرد آں زماں	آتش فروزم از دل و در عالم افگنم
کاں سرد باد زآتش سودا بر آورم	تا من دخاں ز دخمۂ سودا بر آورم
خود بے نیازم از حشر اشک و فوج آہ	شوریدہ وار از نبۂ آخر الزماں
کاں آتشم کہ یک تنہ غوغا بر آورم	آشوب و شور و فتنہ و غوغا بر آورم
دل در مغاک ظلمت خاکی فسردہ شد	درہستیم ز مستی خود دستم ار دہد
رختش بتاب خانۂ بالا بر آورم	جانم ز نیستی سوے بالا بر آورم
زمزم فشانم از مژہ در زیر ناوداں	گر شرح درد خویش بگویم بکوہسار
طوفان خوں زصخرہ صما بر آورم	بس خون دل ز صخرہ صما بر آورم
دریاے سینہ موج زند ز آب آتشیں	کشتی عقل بشکنم اندر محیط عشق
تا پیش کعبہ لولوے لالا بر آورم	در قعر بحر لولوے لالا بر آورم
دیباچۂ سراچۂ کل خواجۂ رسل	گر در سراے غفلتم آسودہ باک نیست
کز خدمتش مراد مہنا بر آورم	از خوان فضل نقل مہنا بر آورم
امروز کز ثناش مرا ہست کوثرے	از عرش مرغ سدرہ فرود آورم بفرش
رخت از گو ثری بہ ثریا بر آورم	خاک ثری باوج ثریا بر آورم

حسین بن منصور کی طرف منسوب اشعار خاقانی کے اشعار کے مقابلے میں بہت آسان ہیں، اشعار خود بتا رہے ہیں کہ یہ انداز قدما، کا نہیں ہے۔ بعض اندرونی شہادتیں بھی موجود ہیں جن کی بنا، پر بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہ دیوان حسین بن منصور کا نہیں ہے۔

اسی دیوان کے صفحہ ۱۵ پر ایک شعر ہے:

خداوندا بجاں آمد دلم از درد بے دردی　　　شفائے خویش از قانوں طلب بر بوعلی سینا

شعر میں بوعلی سینا کا نام آیا ہے۔ شیخ بوعلی سینا ۳۷۰ھ میں پیدا ہوئے، حالانکہ حسین بن منصور حلاج ۳۰۹ھ میں اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے تھے، اس لیے حلاج کے دیوان میں بوعلی سینا کے ذکر کا سوال ہی نہیں ہو سکتا، دیوان میں بعض اشعار ایسے ہیں جن میں منصور کا ذکر ہے لیکن ہر جگہ یہ لفظ بطور واحد غائب استعمال ہوا ہے، واحد متکلم کہیں بھی استعمال نہیں ہوا ہے، مثلاً

منصور ز جانبازی خود شوق نکردے　　　گر جذب نہانیش ز درگاہ بنودے

مخلصانے کہ نظر بر چو تو منصور کنند　　　نے چو اصحاب ہوا کج نظراتند اے دوست

یہ صحیح ہے کہ شعرا، اپنے لیے صیغہ واحد غائب بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن ذیل کے شعر میں منصور سے موازنہ ہے۔

ما بر آنیم کہ مانند تو منصورے نیست　　　ہمہ ارباب نظر نیز بر آنند اے دوست

اگر یہ شعر منصور کا ہوتا تو موازنے کا سوال ہی کیا تھا، کیوں کہ موازنہ تو اپنے سے الگ شخصیت سے کیا جاتا ہے، یہ شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ دیوان حسین بن منصور حلاج کا نہیں ہے، ایک کا کلام دوسرے کے نام سے منسوب کر دینا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ کسی غیر معروف شاعر کی جگر کاوی اسی نام کی دوسری مشہور و معروف شخصیت کے ساتھ منسوب کر دی گئی، خواہ اس نے کبھی ایک شعر بھی نہ کہا ہو، اس دور میں جب کہ تحقیق کا میدان بہت وسیع ہو گیا ہے، کسی ملک کے اہل قلم کے لیے اس قسم کی غلطیاں کرنا قابل افسوس ہے۔

(رسالہ "معارف" اعظم گڑھ، نمبر ۱ جلد ۱۰۱)

حواشی

(۱)　کشف المحجوب ص ۱۹۱ مرتبہ از روے متن ژوکوفسکی مطبوعہ طہران

(۲)　ایضاً ص ۲۱۵

(۳)　صلۂ تاریخ طبری قرطبی ص ۹۰، ۹۸

(۴)　ریاض العارفین ص ۱۰۸ مطبوعہ چاپ خانۂ آفتاب طہران طبع دوم

امیر اللہ شاہین :

پرتھوی راج راسو کی تاریخی حیثیت

گیارہویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں ترکوں نے پنجاب سے گزر کر دلی اور اس کے اطراف و نواح کا رخ کیا تو راہ میں پڑنے والی آپس میں متصادم ریاستیں برسوں کی گراں خوابی سے چونکیں۔ مگر یہ قومیں ایک ایک کرکے مات کھاتی گئیں۔ اس نئی صورت حال نے انھیں متحد ہوجانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہ اتحاد اس سیل بیکراں کے آگے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور اس کی تمام تدبیریں وقتی ثابت ہوئیں اور اس کی جگہ ایک نئے اتحاد و رواداری کی فضا نے لی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں داخل ہونے والے ان مسلم قافلوں کے ساتھ محض چمکتی ہوئی تلواریں اور طرح دار ترک ہی نہ تھے بلکہ وہ "نفوسِ قدسیہ" بھی تھے جن کے دل سوزِ یقین سے جگمگا رہے تھے اور مقصد کی لگن سے لبریز تھے۔ اس لیے جو گردنیں نیزوں کی انیوں کو خاطر میں نہ لائیں وہ سخنِ دل نواز کے سامنے سرنگوں ہوگئیں۔ اس کے اثر سے ہندی شعر و ادب میں بھگتی کال کا آغاز ہوا جس سے پریم بھگتی، رام بھگتی اور کرشن بھگتی کی شاخیں پھوٹیں۔ اس کے نتیجے میں مشترکہ تہذیب کی داغ بیل پڑی جو عجم کے ذوق جمال، عرب کے سوز دروں اور ہندوستان کے فکرِ عمیق سے عبارت ہے۔ اور جس کے وجود میں آتے ہی نفرت و مغائرت کی وہ دیواریں ڈھے گئیں جو خونی معرکوں نے پیدا کر دی تھیں۔

اتحاد و رواداری کی اس فضا کو بنانے میں اس مشترکہ تہذیب کو ایک عبوری دور سے گزرنا پڑا جسے ہندی شعر و ادب میں ویرگا تھا کال کہا جاتا ہے۔ پرتھوی راج راسو اسی دور سے منسوب کتھا ہے۔ جیسل دیوراسو، کھمان راسو، رن مل چھند اور آلہ اودل ہی کی طرح یہ بھی ایک رزمیہ نظم بتائی جاتی ہے، جو نوجوانوں کے حوصلے بڑھانے کے لیے لکھی گئی۔ تاریخی پس منظر کے طور پر اس دور کا سماج اور مذہبی طبقے (Priest class) نگاہ میں رہیں۔ یہ نظمیں اس دور کی بتائی جاتی ہیں جب ایک طرف بجریانی سادھوؤں نے بدھ کے تقدس کو اپنی پیش دستیوں سے شرمسار کیا تھا اور دوسری طرف پروہتوں نے اپنے حقوق سے تجاوز کرکے دیوداسیوں کی عفت کو سرمعبد رسوا کیا تھا اور اس شنیع حرکت کے باوجود وہ اپنا اقتدار و

عظمت قائم رکھنے کے لیے کوشاں تھے، ان حالات میں ان فاتحین کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے تحفظ ذاتی کے پرانچر کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ نبرد آزماؤں نے میدانی ملک کا رخ کیا اور اہل قلم نے قرطاس و قلم سنبھالے اور رزمیہ نظمیں لکھیں۔

ان نظموں کی زبان ڈنگل بتائی جاتی ہے، جو اس ناگراپ بھرنش کی شاخ ہے، جو اس زمانے میں راجپوتانہ میں بولی جاتی تھی۔ ڈنگل اپنے پُرشکوہ انداز بیان اور لہجے کی گھن گرج کے لحاظ سے بہت مشہور ہے۔

ان سماجی حالات کو جو اشارۃً بیان کیے گئے، نگاہ میں رکھتے ہوئے راسو کا مطالعہ مفید مطلب ہوگا۔

راسو کی تاریخی حیثیت کی بحث میں مندرجہ ذیل امور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں:

۱۔ یہ کہ راسو کا اصل نسخہ کون سا ہے؟

۲۔ اس اصل نسخے کا سنہ تصنیف کیا ہے؟

۳۔ کیا فی الواقع راسو کا اصل مصنف چند بردائی ہے؟

۴۔ چند بردائی معروف تاریخی شخصیت پرتھوی راج کا درباری شاعر، ندیم خاص یا کوئی تاریخی شخصیت بھی ہے؟

پرتھوی راج راسو کا اصل نسخہ: اس وقت راسو کے لاتعداد نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں؛ اسی لیے سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان مختلف نسخوں میں اصل یا اصل سے زیادہ قریب نسخہ کونسا ہے، اس ضمن میں ہزاری پرشاد دویدی کی تحقیق ہماری خاصی مدد کرسکتی ہے۔ دویدی جی نے اپنی کتاب مختصر پرتھوی راج راسو .... میں راسو کے دستیاب شدہ نسخوں کو بہ لحاظ ضخامت چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، مختصر، مختصر ترین، درمیانی اور ضخیم (۱)۔

ان میں مختصر ترین نسخوں کے دو مخطوطے، مختصر مخطوطوں کے پانچ نسخے، درمیانی ضخامت کے گیارہ نسخے اور ضخیم مخطوطوں کے تینتیس نسخے اب تک دستیاب ہوچکے ہیں، ان کے علاوہ شری نان رام بھٹ اور سی کانتی ساگر کے نسخے نایاب ہیں، اسی لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کس ضخامت کے ہیں۔

ان مختلف نسخوں کے واقعات میں یکسانیت کے باوجود انداز بیان میں ضخامت کے مطابق اختصار یا طوالت ہے، بیکانیر کے پنڈتوں کا خیال ہے کہ اصل نسخہ مختصر ترین

ضخامت کا تھا، اسی میں مختلف زبانوں میں اضافے ہوتے رہے، اودے پور کے راؤ موہن سنگھ وغیرہ کی رائے اس کے برعکس زیادہ ضخامت والے نسخوں کے حق میں ہے اور وہ مختصر یا مختصر ترین اور درمیانی ضخامت والے نسخوں کو ضخیم راسو کی تلخیص بتاتے ہیں۔

کاشی ناگری سبھا نے راسو کا جو نسخہ شائع کیا وہ بھی زیادہ ضخامت والے نسخوں ہی کو بنیاد بنا کر مرتب کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں بنگال کی رایل ایشیاٹک سوسائٹی نے جب راسو کو شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا تو اس نے بھی زیادہ ضخامت والے نسخوں ہی کو پیش نظر رکھا تھا۔ ناگری پرچارنی سبھا نے اپنے نسخے کی ترتیب میں جس نسخے کو بنیاد بنایا تھا اس کا سنہ تالیف ۱۶۴۰-۴۲ء لکھا ہے (۲) لیکن بعد کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے ۱۶۴۰-۴۲ء پڑھ لیا گیا ہے حقیقتہ ۱۸۳۰ء ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بینارسیاجی اسی کو ۱۸۰۸ء کا مخطوط بتاتے ہیں اور ہزاری پرشاد دویدی کے نزدیک صحیح ۱۷۹۷ء ہے۔ بنیادی نسخے کے سنہ تالیف میں یہ فرق اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ نسخے پر سنہ صاف پڑھنے میں نہیں آتا۔ ایسی صورت میں زیادہ ضخامت والے نسخے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہوجاتی ہے۔ ناگری سبھا کے شائع کردہ راسو میں کل ۶۹ ابواب ہیں، بھوباسمے جو کہ ۶۹ واں باب ہے، کسی قدیم مخطوطے میں موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ کوئی جداگانہ تصنیف ہو جس کا راسو سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ بعد کے زمانے میں پرتھوی راج کی عظمت اور چندر کی تخلیقی صلاحیتوں کو خراج ادا کرنے کے لیے اس کا اضافہ کر دیا گیا ہو۔ اس کے علاوہ اودے پور میں ایک زیادہ ضخامت والے نسخے کی مصدقہ نقل مہاراجہ امر سنگھ دوم کی ملک ہے جس کا سنہ تالیف ماگھ کرشن ۶ بروز پیر ۱۷۶۰ء ہے۔

مختصر ترین نسخہ آساڑھ شکل پنچمی ۱۶۶۷ کا مکتوب ہے۔ اس میں دن کا تعین نہیں، یہ نسخہ اگر مستند مان لیا جائے تو راسو کے موجودہ تمام نسخوں میں قدیم ترین ہے۔

پرتھوی راج راسو کی تاریخی حیثیت۔ ۱۸۸۳ء میں بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی نے راسو کو شائع کرنے کا پروگرام بنایا اور اس کے کچھ حصے شائع بھی کیے، مگر ایک ماہر تاریخ داں ڈاکٹر بولہر نے راسو کی تاریخی حیثیت کو چیلنج کیا اور سوسائٹی کے اس اقدام کو غلط ٹھہرایا۔ ڈاکٹر بولہر جیسے فاضل کی رائے سے متاثر ہو کر ایشیاٹک سوسائٹی نے اشاعت کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ ڈاکٹر بولہر کا دعویٰ تھا کہ راسو تاریخی حیثیت سے ایک فرضی کتاب ہے۔ اس میں بیان کردہ واقعات کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ ادبی حلقوں میں اس انکشاف سے ہل چل مچ گئی۔ اس کی مخالفت و موافقت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ کچھ مخالفین نے جن میں شامل جی پیش پیش تھے،

یہاں تک کہ دیا کہ وہ ۱۷ ویں صدی کی ایک جعلی کتاب ہے۔ ادھر بعد کے زمانے میں راسو کے جو مزید نسخے دستیاب ہوئے ان کے بیان کردہ واقعات میں سر تا سر تخیل کی کار فرمائی ہے۔ اب اس بحث نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا۔ اب تک تو راسو کے واقعات اور کردار ہی فرضی اور غیر تاریخی ٹھہرائے جاتے تھے۔ ان نئے دستیاب شدہ نسخوں نے راسو کے مصنف چند بردائی کے وجود کو ہی مشکوک بنادیا۔ اب گفتگو اس مسئلے پر آگئی ہے کہ کیا فی الواقع چند بردائی پرتھوی راج کا ندیم خاص تھا؟ اگر تھا تو کیا شاعر بھی تھا؟ اگر شاعر تھا تو کیا فی الواقع اس نے کوئی ایسی تصنیف بھی کی ہے؟ ایسا تو نہیں ہے کہ تاریخ کی بھول بھلیوں نے چندر کوی کا ہیولیٰ بنا کر کھڑا کر دیا ہو، اور ہمارے والمیے نے اسے اس درجے کا "مقرب بارگاہ" بنادیا ہو کہ وہ چوہان کا درباری شاعر ہی نہیں اس کا جنم دن کا ساتھی اور اسی کے جیسے نوشتۂ تقدیر کا مالک بن گیا۔

راسو کے ان مختلف نسخوں میں زبردست اختلافات اور ترتیب کے الٹ پھیر کے باوجود چند عنوانات میں بڑی یکسانیت ہے۔ مثلاً

۱۔ آدی پرو	۶۔ کیماس بدھ
۲۔ دی کلی کتھا	۷۔ شسٹ رتو ورنن
۳۔ انگ پالی دی دات	۸۔ کنوج کتھا
۴۔ پنگ یگیہ وشونس	۹۔ بڑی لڑائی
۵۔ سنجوگتا نیم آچرن	۱۰۔ بان دیدھ

لیکن ان عنوانات کے ماتحت مندرج واقعات کی تفصیلات میں بڑا فرق ہے۔ مختصر نسخوں میں نہ صرف واقعات کی تفصیل مختصر اور مختصر ترین ہے۔ بلکہ رونما ہونے والے حادثات بھی مختصر ہیں۔ لیکن جوں جوں ان کی ضخامت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے واقعات یا وہ گوئی اور لاطائل نویسی کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ عنوانات میں تبدیلی کا حال یہ ہے کہ بڑی ضخامت والے نسخوں میں ۶۹ اور درمیانی ضخامت والے نسخوں میں ۱۹ ابواب کے تحت لکھی جانے والی کتھائیں مختصر اور مختصر ترین نسخوں میں سرے سے لاپتہ ہیں اور اگر ہیں بھی تو واقعات کے اس دفترِ بے معنی میں بُعد المشرقین ہے اور ان میں سے کسی واقعے کی بھی کسی تاریخ سے تصدیق نہیں ہوتی۔ ان کا پھیلاؤ الف لیلہ یا امیر حمزہ کی داستان بن گیا ہے۔ کہیں ہولی اور دیوالی کی کتھائیں مزے لے لے کر بیان کی گئی ہیں، کہیں شادیوں کی

دھوم دھام ہے۔ مختصر نسخوں میں جو چوہان دو شادیوں پر اکتفا کرتا ہے۔ وہ طویل نسخوں میں تیرہ شادیاں کرکے دم لیتا ہے۔ یہی حال اس کی جنگجوئی کا ہے، بات بات پر تلوار نکال لیتا ہے اور لڑائیوں کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا ہے، لیکن یہ لڑائیاں بڑے ادنیٰ مقاصد کے لیے تھیں، سب سے نمایاں مقصد زن ہے، اس میں پرتھوی راج کا کردار کسی الف لیلوی ہیرو سے کم نہیں، پہلی رانی انچھنی سے لے کر سنجوگتا تک کے لیے اسے مخالفین سے لڑنا پڑا، ششی ورتا سے گوندھرو دواہ کرنے کے لیے اس کے قبیلے سے تیغ زنی کرنی پڑی، اسے اپنے اور غیروں سب سے لڑا پڑا، کیماس جیسے نمک خوار وزیر کو اس کی کنیز انورکتی پر عاشق ہونے کے بعد اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر قتل کر دیتا ہے، راسو کے مصنفین نے شہاب الدّین غوری کی تاریخی جنگ کو بھی ایسی ہی ایک کنیز کو دربار دلی میں پناہ دینے کا سبب بنا کر تاریخی حقایق سے روگردانی اختیار کی ہے

مختلف نسخوں میں جنگوں کی تعداد میں بھی بڑا فرق ہے، مختصر نسخوں میں پرتھوی راج نے محض پانچ جنگیں لڑیں، درمیانی نسخوں میں ان کی تعداد ۲۳ اور زیادہ ضخامت والے نسخوں میں بھی ۵۵ تک ہے، اس اختلاف کے سبب سے ان نسخوں کی تاریخی حیثیت مجروح ہوجاتی ہے۔

شہاب الدّین غوری کو شکست دینے کا اعزاز ہر سامنت کو بخشا گیا ہے، مگر اس کی مسلسل شکستیں کسی تاریخی ذریعے سے ثابت نہیں ہوتیں، تمناؤں کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش میں راسو کے مصنفین سے بڑی تعجب خیز حرکتیں سرزد ہوئی ہیں، مثلاً ایک طرف تو غوری کی سخت جانی کا عالم یہ ہے کہ وہ بار بار شکستیں کھانے کے بعد بھی تمام جنگی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر پھر میدان میں آجاتا ہے، دوسری طرف پرتھوی راج کی وسعتِ نظر کا کمال یہ ہے کہ وہ اس سے تاوانِ جنگ وصول کرکے بھرے دربار میں بے غیرتی کے طعنے دے کر رہا کر دیتا ہے، ایسے خطرناک دشمن کو بار بار چھوڑ کر اپنے سر مصیبت لیتا ہے اور اسے کچل کر ختم نہیں کردیتا، اس کا کوئی جواب راسو کے مصنفین کے پاس نہیں ہے، بہ ظاہر یہ بڑے ظرف اور حوصلے کی بات ہے لیکن اس سے خود چوہان کے تدبّر اور فوجی تجربے پر حرف آتا ہے، کوئی جرنیل اپنے بدترین دشمن کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتا، اس کے مقابلے میں دوسری تاریخوں میں محض اس کو ایک سپاہی نہیں بلکہ مُدبّر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، ان واقعات اور راسو کے مختلف نسخوں سے اس کی شخصیت مجروح ہوجاتی ہے۔

اس لیے ان تمام نسخوں میں مختصر ترین نسخہ ہی قدیم ترین معلوم ہوتا ہے، اس کی

تصدیق اس میں مندرج سنہ تالیف سے بھی ہوتی ہے اور اس زبان سے بھی جو قدیم برج بھاشا سے قریب تر ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اصل نسخہ اَپ بھرنش میں لکھا گیا تھا۔ ایسی صورت میں موجودہ کوئی نسخہ بھی اصل نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی اَپ بھرنش میں نہیں ہے۔ یوں بھی جس دور کی یہ تصنیف بتائی جاتی ہے وہ مسلمانوں کی آمد آمد کا دور تھا۔ ان سے نمٹنے کے لیے جو ادب پیدا ہوا وہ ہندی ادب کا نقشِ اوّلین تھا جس کو یقیناً اَپ بھرنش نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ وہ ڈنگل میں تھا۔ اس لیے موجودہ کوئی نسخہ بھی اصل راسو نہیں ہوسکتا کہ یہ سب نسخے قدیم برج بھاشا یا پنگل کے روپ تو ہیں، ڈنگل کا نمونہ قطعاً نہیں۔

پرتھوی راج راسو کا سنہ تصنیف:۔ موجودہ نسخوں میں سنہ تصنیف نہ ہونے کے سبب سے اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا دشوار ہے البتہ اس کے لیے ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے مصنف چند برداِئی کے خاندانی حالات کا پتا چلایا جائے۔ اس کے حالات سے اس کی تصنیف کے بہت سے پہلو واضح ہوسکتے ہیں۔ اس بناء پر بہت سے ماہرین نے اس طرف توجہ کی ہے۔

پرتھوی راج راسو کا ذکر سب سے پہلے جسونت ادیت .... از دیت مصر ۱۷۰۰ء میں ملتا ہے۔ ہندی نریش سرجن اور اس کا لڑکا بھوج پرتھوی راج کے خاندان سے ہیں۔ ان کی تصنیف "سرجن چرت" میں جو ۱۶۳۵ء میں لکھی گئی، پرتھوی راج پر ایک پورا باب ہے۔ یہ کتاب چندر شیکھر کوی کے حال میں ہے۔ مگر اس میں ضمنی طور پر چند برداِئی کا ذکر بھی آگیا ہے۔ مگر راسو کے مصنف کی حیثیت سے اس کا ذکر اور تعارف نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۶۳۵ء تک خود چوہان کے اہل خاندان کو بھی راسو کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ شری موہن لال وشنو پانڈے نے گنگا بھاٹ کی جس تصنیف "چند چھند درنن کی مہیما" کا ذکر کیا ہے اور اس سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ۱۶۲۷ء میں راسو کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے متعلق یہ پوری طرح ثابت ہوچکا ہے کہ وہ بالکل ہی جدید تصنیف ہے۔ اس طرح اکبر کے عہد تک راسو کے وجود کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اسی لیے شری نروتم داس سوامی کا یہ اندازہ بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے فتح میواڑ کے بعد میواڑی راجاؤں نے اپنے خاندانی وقار کی بحالی کی خاطر اپنا رشتہ پرتھوی راج سے جوڑا ہوگا۔ اور اس کے لیے اس کی ایک بہن "پرتھا" کو پیدا کیا گیا ہوگا اور آخر میں ان تمام بے سروپا افسانوں کو راسو کے اس دفتر بے معنی میں جگہ مل گئی ہوگی اور راسو کو مرتب کرنے کا یہ کام کئی نسلوں تک جاری رہا، حتی کہ راسو کی موجودہ ضخیم تصنیف مکمل ہوگئی جس میں ہر قسم کا رطب ویابس شامل ہے۔

راسو کا مصنف چند بردائی :۔ عہد اکبری سے قبل چند بردائی نام کا کوئی کوی کسی قدیم تاریخی دستاویز میں نہیں ملتا۔ ۱۵۲۳ء کی ایک تصنیف "قدیم پربندھ سنگر ہے" میں دو ایسے چھندوں کا ذکر ملتا ہے جو کسی نا معلوم کوی کے بتائے جاتے ہیں۔ لیکن ان چھندوں کو کسی بڑی نظم یا دیوان کا جزو کہنا درست نہ ہوگا۔ پھر خود ان چھندوں کے سنہ تصنیف کا تعین بھی مشکل ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ ۱۲۹۰ء سے ۱۵۲۸ء تک کی مدت میں کسی وقت لکھے گئے ہیں۔ ان سے بھی صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ چند بردائی نام کا ایک کوی پرتھوی راج کے دربار سے وابستہ تھا۔ جس نے پرتھوی راج کی شان میں نظم میں اظہار عقیدت بھی کیا تھا۔ اس دور کے درباروں کی ظاہری شان و شوکت کے مطابق اس قسم کے بھاٹوں اور مداحوں کا ہونا قرین قیاس بھی ہے۔

چند بردائی کے نام کے سلسلے میں بھی نقادوں کے درمیان سخت اختلاف رہا ہے۔ چندرک، پرتھوی بھٹ اور چندر بلائے سے گزر کر اب تقریباً سب لوگ چند بلدائی پر متفق ہوگئے ہیں۔ جس سے چندر بردائی بنا ہے۔ جس کا مطلب بیان کیا جاتا ہے "بر دینے والا" یا وہ شخص جسے درگا نے بر دیا ہو۔

اس اختلاف کی بنا پر اس کی مزید تحقیق کے لیے پنڈت ہر پرشاد شاستری نے ۱۹۰۹ء میں راجپوتانے کا سفر کیا، اور ۱۹۱۳ء میں اپنی تحقیقات کی رپورٹ ایشیاٹک سوسائٹی کے سامنے پیش کی۔ اس رپورٹ کے مطابق پرتھوی راج نے اپنے زمانۂ حکومت میں جب ناگور آباد کیا تو اسے چند بردائی کو جاگیر میں بخش دیا۔ چنانچہ چندر کا خاندان ابھی تک ناگور میں آباد ہے۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ نانو رام سے شاستری جی کی ملاقات ہوئی انھوں نے بتایا کہ چندر کے چار لڑکے تھے۔ ایک مسلمان ہوگیا، ایک لاپتہ ہوگیا، دوسرے دو لڑکوں جل پن یا جل چند اور گن چند سے چندر کی نسل چلی۔ نانو رام نے یہ بھی بتایا کہ چند بردائی نے تین یا چار ہزار اشلوک لکھے تھے۔ ان کے بعد ان کے لڑکے نے اس میں اضافہ کرکے راسو کو مکمل کیا۔ نانو رام کے پاس بھی راسو کا ایک نسخہ محفوظ تھا۔ جو ان کے نزدیک اصل کے عین مطابق ہے۔ مگر تعجب ہے کہ شاستری جی اس نسخے کی زیارت سے محروم رہے۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نسخہ کس ضخامت کا تھا۔ اور مزید تعجب یہ ہے کہ شاستری جی نے نانو رام جی کے بیان پر ہی اکتفا کیا۔ اس نظم کے تین نسخے یورپ میں ہیں۔ جن میں سے ایک نسخہ لندن کی ایک سوسائٹی کے کتب خانے میں ہے۔ دوسرا بینکزی لائبریری میں اور تیسرا روس کے ایک فاضل رابرٹ لز

کے پاس ہے، جس نے ۱۸۲۶ء میں اس کا کچھ حصہ روسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا۔

اس نسخے کے مطالعے سے بھی پتا چلتا ہے کہ اس میں بڑی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔ اس طرح اس کی قدامت بھی بے دلیل ہو جاتی ہے۔

چند بردائی اور پرتھوی راج :۔ راسو کے درمیانی اور ضخیم نسخوں کی روایت کے مطابق چندر پرتھوی کا ندیم خاص، مشیر کار اور درباری شاعر ہی نہیں بلکہ جنم مرن کا ساتھی بھی تھا۔ دونوں کی جنم کنڈلیاں حیرت انگیز حد تک یکساں بتائی جاتی ہیں، ایسا ہونا کتنا ہی خلاف عقل ہو مگر ناممکن نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع چندر اور پرتھوی کا تعلق ایسا ہی اٹوٹ، اس درجہ خلاف عقل اور مضحکہ خیز تھا۔ تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے میں جب راسو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی تو اس کے ہر واقعے کو مکمل افسانوی رنگ دے دیا گیا، یہ واقعات جذبات سے مملو تھے۔ ایک خاص مزاج کو اس سے غذا مل رہی تھی، اس لیے یاران جفا کیش نے بلا سوچے سمجھے قبول کر لیا، ان تبدیلیوں کا بنیادی سبب سر تا سر جذباتیت پر مبنی تھا، اس لیے جذبات کی رنگ آمیزی سے اس پر عقیدت کا رنگ گہرا ہو گیا۔

پروفیسر شیرانی مرحوم نے اپنی گراں قدر کتاب پرتھوی راج راسو میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ بتایا ہے کہ ان کے پیش نظر راسو کے نسخے میں بیان کردہ واقعات ہی سرتاسر غلط نہیں ہیں بلکہ اس کی فضا و ماحول، بہت سے اسلحہ، عہدے اور مناصب سب بہت بعد کے بالخصوص مغلیہ عہد کی یادگار ہیں، پروفیسر صاحب مرحوم نے طبقات ناصری، بادشاہ نامہ عبدالحمید لاہوری اور "پرتھوی راج راسو" کے تفصیلی موازنے اور امراء کے ناموں کی فہرست سے یہ ثابت کیا ہے کہ راسو میں جس قسم کے نام ملتے ہیں وہ القاب وغیرہ مغلیہ عہد کی دین ہیں، مغلوں سے پہلے سرے سے تھے ہی نہیں، اور اگر تھے بھی تو ایک محدود طبقے تک مخصوص تھے، مثلاً سلطان کے امراء کے نام و خطاب میں لفظ "خان" سلطان کے عہد میں بالکل نہ تھا، اس کے جانشینوں کے زمانے میں اس کا بہت محدود رواج ہوا اور صرف شاہزادوں ہی کو یہ خطاب دیا جاتا تھا، مثلاً تاج الدین سنجر کا خطاب کزلک خاں، ملک عزیز الدین طغرل کا طغان خاں وغیرہ۔ مغلوں نے اس خطاب کو عام کیا اور ان کی دیکھا دیکھی راسو کے مصنفین نے اس مالِ مُفت کو اپنی غلط بخشی سے ہر کس و ناکس میں تقسیم کر دیا۔

راسو میں اکثر نام بالکل مصنوعی معلوم ہوتے ہیں، اس کا سبب مصنف کی تلفظ سے بے خبری ہے۔ مثلاً وہ بایزید کو بازید، جوشن کو جوسن، قریش کو خریس اور حسن کو حاسن لکھا

ہے۔ اور محمد عیسیٰ قلی کو اسا کلی بنا دیا ہے جسے دماغ پر زور دیے بغیر سمجھنا دشوار ہے۔

پروفیسر شیرانی مرحوم کے پیش نظر نسخے کے مصنّف نے صحّتِ الفاظ کی مطلق پرواہ نہیں کی ہے، ہر قسم کی بے قاعدگی روا رکھی ہے۔ الف کا اضافہ اور حذف تو عام بات ہے، یوسف، یعقوب اور عالم کو ایسپ، آکوب اور آلو لکھنا اس کی مضحکہ انگیز مثال ہے۔

مرحوم نے بڑی محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ راسو کے مصنّف نے محمد غوری کے اعلیٰ عہدیداروں کے جو نام دیے ہیں وہ بھی بعد کی پیداوار ہیں، مثلاً وزیروں کے نام تتار خان وغیرہ پہلی مرتبہ فیروز شاہ تغلق اور محمد تغلق کے زمانے میں رائج ہوئے۔ تاریخ میں غوری وزرا کے نام بالکل دوسری نوعیت کے ہیں۔ شہاب الدّین غوری کے نام کی بابت صراحت کی ہے کہ یہ عہد مغلیہ میں استعمال ہونے لگا ورنہ بچپن کا یہ نام سلطان کے دور حکمرانی میں استعمال نہیں ہوا تھا۔ راسو کے مصنّفین کو اس کے والدین کے نام کی بھی خبر نہیں اس کی کم علمی کا عالم یہ ہے کہ وہ " میر آتش " اور " رومی خاں " کے مناصب کو نام سمجھتا ہے اور یہ دونوں منصب بھی عہد مغلیہ میں رائج تھے۔

حافظ شیرانی کے علاوہ ڈاکٹر بولر، مورلیسن، ایم ایم گوپی اوجھا اور منشی دیوی پرساد جی وغیرہ بہت سے مؤرخوں نے جن کی تاریخی بصیرت میں کلام نہیں، بالاتّفاق پرتھوی راج راسو کو غیر مستند ثابت کر دیا ہے۔ اسی لیے ہزاری پرشاد دویدی کا خیال ہے کہ اس میں مندرج واقعات کو تاریخی ثابت کرنے کی کوشش کرنا سرے سے غلط ہے۔ اور یہ کوشش بند کر دینی چاہیے۔

مذکورہ بحث کی روشنی میں یہ مُسلّم ہوگیا ہے کہ شاماِل جی اور اجودھیا پرشاد کھتری جیسے نقّاد راسو کو غیر مستند ہی نہیں، جعلی کتاب قرار دیتے ہیں۔ اور ہزاری پرشاد دویدی جیسے متوازن فکر اور بالغ نظر نقّاد بھی موجود نسخوں کی روشنی میں ایک طرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ " پوری کہانی چندر کی تصنیف نہیں ہے، یہ تو اسی سے ظاہر ہے کہ " وانئر ویدھ پرسنگ " (لڑائی والا حصہ) لکھنے کے لیے کوی کے پاس اتنا وقت کہاں تھا۔ اس کے علاوہ غزنی پرسنگ (حصہ) کے شروع میں راسو نے ظاہر کر دیا ہے کہ " اچک جلہن لکھ دے چلی غزن ترپ کاج "۔ اس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ چندر کی تصنیف کردہ راسو سنجوگتا دواہ کے بعد ہی ختم ہوجاتی ہے۔

دوسری طرف وہ راسو کی زبان و بیان، نسخوں کی تفصیل و تشریح میں زبردست اختلاف اور ان کی تاریخی شہادت نہ ملنے سے متذبذب ہیں اور ان کا گمان ہے کہ " موجودہ

راسو میں چندر کے اصل مچند یقیناً موجود ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے مختصر انتخاب کے بارے میں یہ تصریح کر دی ہے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ راسو کا مول روپ (اصل نسخہ) ہے۔"

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں موجودہ راسو کی تاریخی حیثیت کے متعلق لکھتے ہیں "پرتھوی راج راسو کی تصدیق کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ ادب کی کتاب ہے۔ تاریخ نہیں۔ اگر جائسی کی پدماوت کے غیر تاریخی واقعات پر اتنا شور و غوغا نہیں ہوا تو کوئی ضروری نہیں کہ پرتھوی راج راسو پر ایسی سخت گرفت کی جائے۔"

اس سے اس کی تاریخی حیثیت کے متعلق ان کی رائے معلوم ہوجاتی ہے۔ گویا ہندی کے مستند نقادوں اور محققوں کی نظر میں بھی راسو پرتھوی راج کی سوانح حیات یا حقیقی مرقع نہیں ہے۔ اس لیے اس کے مندرج واقعات کو تاریخ میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ جائسی کی پدماوت کی طرح وہ بھی ایک داستان ہے۔ جس میں صرف تخیل کی بلند پروازی اور تصور کی شاعری ہے۔ جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس میں جن لوگوں کے نام ہیں۔ خواہ وہ صحیح اور تاریخی ہوں۔ مگر ان سے منسوب واقعات صرف داستان سرائی ہیں۔ بقول دویدی جی:

"ساتویں آٹھویں صدی میں اس ملک میں تاریخی شخصیتوں کے نام پر قصہ گوئی کا رواج خوب چلا۔ کیوں کہ ایران وغیرہ میں یہ وبا عام تھی۔ جس سے ہمارا دیش بھی متاثر ہوا۔ ۔ لیکن ہندوستانی شاعر نے تاریخی نام لیے۔ گو انداز بیان وہی پرانا (داستانوی) رکھا جس میں ادبیت پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اور واقعات کی طرف کم۔ اس طرح تاریخ تخیل کی بلند پروازی میں گم ہو گئی۔"

اور یہ سب اسی لیے ہوا کہ ہمارے یہاں تاریخی شعور عام نہ ہوا تھا۔ دویدی جی کے الفاظ ہیں:

"فی الواقع اس دیش میں تاریخ کو موجودہ معنی میں کبھی نہیں لیا گیا۔ تاریخی شخصیات کو تخیل کا پیکر بنا دینا ہمارا شیوہ رہا ہے۔ بعض میں الوہیت کی خصوصیات شامل کر کے ورا۔ بنا دیا گیا۔ جیسے رام۔ بدھ۔ کرشن اور بعض کو بڑا ہی رنگین و رومان پرور بنا کر کتھاؤں کا ہیرو بنا دیا گیا ہے۔ جیسے آدین بکرما دیت اور دھال۔"

اب تک راسو کے بارے میں جو تحقیق ہوچکی ہے اس کے اعتبار سے اس کو

تسلیم کرلینا چاہیے کہ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وہی ہے جو کہ جائسی کی پدماوت، قطبن کی مرگاوتی اور عثمان کی چتراولی کی ہے۔ گو یہ ادبی کتابیں ہیں، لیکن اپنے مصنّفین اور زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے مستند ہیں یعنی ان کے مصنّفین اور سنہ تصنیف معلوم و مُسلّم ہیں۔ لیکن راسو کے بارے میں یہ باتیں بھی یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتیں اور اس کے واقعات تو سراسر فرضی ہیں، جن کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔

(معارف اعظم گڑھ، نمبر۲، جلد ۱۰۱)

حواشی

(۱) سنکھشپت پرتھوی راج راسو، مصنف ہزاری پرشاد دویدی، ساہتیہ بھون پرائیوٹ لمیٹڈ ۱۹۶۱ء

(۲) ص ۱۲۷۔

الاستاذ عبدالرحمن المعلمی :
مترجم: ضیاء الدین اصلاحی :

تفسیر کبیر اور اس کے تکملے کے متعلق

[ذیل کا مضمون الاستاذ عبدالرحمن المعلمی کے ایک مضمون - حول تفسیر الفخرالرازی - کا ترجمہ ہے، جو مجلہ الحج مکہ کی تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار نے پوری تحقیق و کاوش کے بعد امام رازی کی اصل تفسیر اور اس کے تکملے کو ایک دوسرے سے الگ کیا ہے، اور چونکہ یہ ایک نہایت علمی اور تحقیقی بحث تھی اس لیے اس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ ضیاء الدین اصلاحی]

علامہ شیخ محمد بن عبدالعزیز نے مجھے بتایا کہ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے:

"امام فخرالدین رازی کی تفسیر مفاتیح الغیب ناتمام اور تشنہ تھی، اسے نجم الدین احمد بن محمد قمولی نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا"۔ چناں چہ طبقات اور درر کامنہ میں بھی نجم الدین قمولی کے حالات میں اس کا ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے تفسیر کو مکمل کیا ہے۔

شیخ نے اس بات کا تذکرہ کرکے گویا مجھے اس مسئلے کی تحقیق و تدقیق کی دعوت دی، کیونکہ آج امام رازی کی مکمل تفسیر چھپی ہوئی موجود ہے، اور عام طور سے پوری کی پوری ان ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہے، اور کسی کو اس کی خبر نہیں کہ امام صاحب کی اصل تفسیر کہاں تک ہے، یا کون سے حصے خود ان کے لکھے ہوئے ہیں اور کون سے دوسروں کے ہیں، اور اس خفاء کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ... اول و آخر حصہ ایک ہی نہج اور ڈھنگ پر ہے۔

لیکن ابھی تک مجھے باقاعدہ تفسیر کبیر کے مطالعے کی نوبت نہیں آئی تھی، اور سردست اس کے مطالعے کے لیے کچھ مواقع بھی تھے، اس لیے میں نے سوچا کہ اگر میں تراجم و تواریخ اور فہرستوں کو دیکھ لوں تو تفسیر کے مطالعے کی زحمت سے بچ جاؤں گا، اور اس مسئلے کی تحقیق بھی ہو جائے گی۔

لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان کتابوں کے دیکھنے کے بعد بھی مجھے کوئی ایسی تحقیق دستیاب نہیں ہو سکی جس سے یہ معلوم ہو کہ امام کی اصل تفسیر کہاں تک ہے۔ البتہ بعض جدید فہرستوں میں سیّد مرتضیٰ زبیدی کے قلم سے "شفا" خفاجی کی شرح کے حوالے سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ امام رازی سورۂ انبیاء تک تفسیر لکھ سکے تھے۔ اس لیے مجھے شوق ہوا کہ خفاجی کی عبارت اور اس کی شرح شفا، جو چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، دیکھوں۔

چناں چہ سب سے پہلے میں نے چاروں جلدوں کی فہرستوں پر ایک نظر ڈالی اور جہاں جہاں بھی مذکورہ بالا عبارت کا احتمال ہو سکتا تھا، وہاں کتاب کھول کر دیکھا، مگر وہ عبارت نہ مل سکی۔

اس لیے مجبوراً میں نے اس شرح کو شروع سے پڑھنے کی زحمت کی، مگر مجھے زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑی، کیونکہ پہلی جلد (مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۲۶۰ھ) کے صفحہ ۲۶۰ پر وہ عبارت مل گئی۔ مگر اس عبارت کا یہ فقرہ:

"الثابت فی کتب المورخین (سورۂ انبیاء تک امام کی تفسیر ہونا مؤرخین کی کتابوں میں ثابت ہے"۔)

میرے لیے سخت حیرت اور شبہے کا باعث بنا کیونکہ میں نے مؤرخین کی کتابوں کا اس بارے میں تتبع کر لیا تھا، اور مجھے کہیں بھی یہ تحدید نظر نہیں آئی۔

اگر یہ اتنی ہی ظاہر اور ثابت چیز تھی تو بعض کو تو کم از کم اس کی نشان دہی کرنا چاہیے تھا اور صاحب کشف الظنون سے یہ چیز کیسے مخفی رہی جب کہ ان کی وسیع النظری مسلّم ہے، اور خود زبیدی سے یہ بھی مسئلہ کیسے مخفی رہا کہ اس کو خفاجی کی کتاب کے حوالے سے نقل کرنے کی ضرورت ہوئی اور پھر اس کے بعد تمام لوگوں پر کیوں نہ یہ ثابت شدہ چیز واضح ہوئی، یہاں تک کہ انھیں زبیدی کے قلم سے خفاجی کی کتاب کے حوالے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے۔

اس لیے اب براہ راست تفسیر کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہو گیا۔ چناں چہ میں سورۂ انبیاء اور اس کے ماقبل و مابعد کی سورتوں کی تفسیر اٹھا کر دیکھنا شروع کیا، تو خفاجی کے قول میں اور زیادہ شک و شبہہ پیدا ہوا، کیونکہ مجھے پوری کتاب میں ایک ہی طرز نگارش اور اسلوب کلام نظر آ رہا تھا، اس لیے میں نے یہ قطعی رائے قائم کر لی کہ سورۂ انبیاء اور اس کے بعد کی سورتوں کی تفسیر کا مفسر وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے سورۂ کہف، مریم اور طٰہٰ کی تفسیریں لکھی ہیں،

اس کے بعد جب میں نے سورۂ بقرہ، آل عمران کی تفسیروں کے بعض مقامات دیکھے اور اسی کے ساتھ تفسیر کے اختتام کو بھی وقت نظر سے دیکھنا شروع کیا، تو ان سب کو ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا پایا، اور ان تمام سورتوں کی تفسیروں کا طرز تحریر سورۂ انبیاء کی تفسیر کے انداز تحریر کے بالکل مجھے مطابق ملا۔

لیکن جب سورۂ اخلاص کی تفسیر میں یہ الفاظ ملے کہ

وقد استقصینا فی تقریر دلائل الواحدانیة فی تفسیر قوله لو کان فیهما الهة الا الله لفسدتا

(ترجمہ) اور لو کان فیهما الهة الخ کی تفسیر میں ہم نے واحدانیت کے دلائل کی پوری تقریر کی ہے تو میں سمجھا کہ چونکہ یہ سورۂ انبیاء کی ایک آیت ہے اس لیے یہیں سے کہنے والے کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ امام رازی سورۂ انبیاء کی تفسیر تک پہنچے تھے اور اسی فقرے سے اس نے یہ رائے قائم کی ہو گی کیونکہ بات تو بہرحال تاریخی طور پر واضح تھی کہ امام نے تفسیر کو ناتمام چھوڑا تھا، اور دوسروں نے اسے مکمل کیا ہے، اور تفسیر نویسی کا عام قاعدہ یہ ہے کہ مفسر ابتداء قرآن سے تفسیر کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسی ترتیب سے لکھتا چلا جاتا ہے اور بظاہر امام رازی نے بھی ایسا ہی کیا ہو گا، اس لیے جب انھوں نے اپنی تفسیر خود مکمل نہیں کی ہے جیسا کہ مؤرخین قطعی طور سے کہتے ہیں تو ضرور کوئی ایسا مقام ہو گا، جہاں تک امام صاحب خود پہنچے ہوں گے۔ اور اس کے بعد سے دوسروں نے تکملہ کیا ہو گا، اور چونکہ مؤرخین کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام رازی نے تفسیر کا اچھا خاصا حصہ ناتمام چھوڑا تھا، اور سورۂ اخلاص تو یقیناً تکملے میں شامل ہو گی، اس لیے یہ لفظ "قد استقصینا" مکمل کرنے والے کا بیان ہے، اس لیے محولۂ بالا آیت کی تفسیر بھی مکمل کرنے والے ہی نے لکھی ہو گی۔

بہرحال ان معارضات اور مناقشات کو نظرانداز کیجیے، میں کہہ رہا تھا کہ خفاجی کے قول میں میرا شک و شبہ بڑھتا اور محکم ہوتا گیا، بلکہ اس کے قول کا بطلان بھی مجھ پر واضح ہو گیا جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ بار بار میں نے حج، مومنون، نور، فرقان، شعراء اور قصص کی تفسیروں کو غور و خوض اور نہایت ہی رک رک کر اور سمجھ سمجھ کر پڑھا، لیکن مجھے کوئی ایسا اسلوب تحریر نہیں دکھائی دیا جو میرے لیے پہلے کے مقابلے میں نیا اور نامانوس ہو اس کے ساتھ مجھے ایسے شواہد اور دلائل بھی کثرت سے ملتے گئے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ امام رازی ہی کا کلام ہے لیکن سورۂ عنکبوت کو شروع کرتے ہی صاف طریقے سے محسوس

ہونے لگا کہ یہاں دوسری روح جھلک رہی ہے ۔ اور دوسرا اسلوب بیان ہے جس میں پہلے اسلوب کی نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اس کے بعد بھی وہ طرز اور اسلوب اس میں نہیں پیدا ہو سکا ہے اور جب میں نے ذرا دقّتِ نظر سے کام لیا ۔ تو مجھے اور چند در چند ایسی چیزیں ملیں جو اس کو پہلی سورتوں کی تفسیروں سے جدا کر رہی تھیں ۔ اور بتا رہی تھیں کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ پھر میں نے سورۂ روم ۔ لقمان اور سجدہ کی تفسیروں کو بھی پڑھ کر جانچا تو یہی دوسرا طریقہ کلام جاری و ساری ملا۔

اس وقت میں نے سمجھا کہ حقیقت تک میری رسائی ہو گئی اور صحیح یہ ہے کہ امام رازی نے سورۂ قصص تک خود تفسیر لکھی ہے ۔ اس کے بعد سے تکملہ شروع ہوتا ہے ۔ پھر بھی میں نے اپنی کاوش جاری رکھی ۔ اور اس کے آگے ایک ایک سورہ کے شروع کی تفسیریں دیکھتا جاتا تھا ۔ جب سورۂ صافات کی تفسیر پڑھنا شروع کیا تو پھر وہی پہلا اسلوب تحریر نظر آیا ۔ جب اور آگے بڑھا تو پانچ چھ سورتوں تک یہ طرز تحریر دکھائی دیتا رہا ۔ مگر پھر اس سے آگے دوسرا اسلوب نگارش عود کر آیا ۔ اس طرح کبھی پہلا طریقہ بیان و انداز کلام ملتا رہا اور کبھی دوسرا ۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اب پورے غور و فکر کے ساتھ ایک ترتیب سے اس کا مطالعہ اور اس مسئلے کی تحقیق کرنا چاہیے ۔ چنانچہ اس تحقیق و تفتیش کے بعد میں جن نتائج تک پہنچ سکا ہوں ۔ انھیں اوّل سے آخر تک ترتیب کے ساتھ ۔ دلائل اور شواہد کی روشنی میں سوال و جواب کی شکل میں اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

امام رازی نے مکمل تفسیر لکھی ہے یا نہیں ؟

اس سوال کا جواب مندرجہ ذیل اقتباسات سے خود ہی واضح ہو جائے گا۔

ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانبا۔ میں امام رازی کے حالات میں ان کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

کتاب التفسیر الکبیر المسمی مفاتیح الغیب اثنا عشرۃ مجلدۃ بخطہ الدقیق (۱)

(ترجمہ) تفسیر کبیر کا اصل نام مفاتیح الغیب ہے ۔ یہ باریک خط میں بارہ جلدوں میں ہے۔

اس عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے تفسیر مکمل لکھی ہے ۔ مگر اسی کتاب میں ابی اصیبعہ نے آگے چل کر شمس الدین احمد بن خلیل الخولی کے ذکر میں

لکھا ہے:

ان لہ تتمۃ تفسیر القرآن لابن خطیب الری (۲)

(ترجمہ) ابن خطیب ری کی تفسیر قرآن کے ناتمام حصے کو اس نے مکمل کیا۔

ابن خطیب الری سے امام رازی مراد ہیں۔

ابن ابی صیبعہ نے خولی کے تذکرے میں اپنے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے خولی سے استفادہ کیا ہے، اور پھر خولی کی امام رازی سے ملاقات و استفادہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ امام رازی کا سال وفات ۶۰۶ھ اور خولی کا انتقال ۶۶۸ھ میں ہوا۔

علامہ ابن خلکان امام فخرالدین رازی کی تصنیفات کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

منھا تفسیر القرآن الکریم جمع فیہ کل غریب غریبۃ و ھو کبیر جدا لکن لم یکملہ و شرح سورۃ الفاتحہ فی مجلد (۳)

ان کی تصنیفات میں قرآن کی تفسیر بھی ہے اور اس تفسیر میں ہر عجیب و غریب چیز جمع کی ہے اور یہ بہت ضخیم ہے، لیکن امام نے اسے مکمل نہیں کیا تھا اور انھوں نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر ایک الگ جلد میں لکھی ہے۔

ابن سبکی المتوفی ۷۷۱ھ نے طبقات میں جن میں جس جگہ امام رازی اور ان کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے وہاں تو اس طرح کی کوئی بات نہیں لکھی ہے، مگر نجم الدین القمولی کے حالات میں لکھا ہے:

ولہ تکملۃ علی تفسیر الامام فخر الدین (۴)

اور اس نے امام فخرالدین کی تفسیر کو مکمل کیا،

شذرات الذہب میں قمولی کے ذکر میں اسنوی المتوفی ۷۷۲ھ کا قول ہے:

و کمل تفسیر ابن الخطیب (۵)

انھوں نے ابن خطیب کی تفسیر کو مکمل کیا،

اور خود امام رازی کے حالات میں لکھا ہے:

قال ابن قاضی شھبۃ و من تصانیفہ تفسیر کبیر لم یتمہ فی اثنی عشر مجلد الکبار (۶)

ابن قاضی شہبہ کا بیان ہے کہ امام رازی کی تصنیفات میں ایک بارہ جلدوں پر مشتمل ضخیم تفسیر ہے جسے انھوں نے نامکمل چھوڑا تھا۔

ابن قاضی شہبہ کا انتقال ۸۵۱ھ میں ہوا ہے۔

علّامہ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ نجم الدین القمولی کے حالات میں ارقام فرماتے ہیں:

واکمل تفسیر الامام فخر الدین (۷)

امام فخرالدّین کی تفسیر کو پورا کیا۔

تفسیر کبیر کو کس نے مکمل کیا؟

یہ دوسرا سوال ہے جس کا جواب بھی گذشتہ تصریحات میں دیا جا چکا ہے کہ خولی اور قمولی ہر ایک نے اسے مکمل کیا ہے (۸)

خولی:۔ اس کا صحیح نام و لقب اور نسبت اور سنہ وفات یہ ہے:

شمس الدّین قاضی القضاۃ احمد بن خلیل الخولی المتوفی ۶۳۷ھ

لیکن بعض تذکرہ نویسوں نے اس کے نام اور اس کے بیٹے شہاب الدین قاضی القضاۃ محمد بن احمد بن خلیل الخولی کے نام میں خلط ملط کر دیا ہے مگر صحیح نام معتبر کتابوں کے حوالے سے وہی معلوم ہوتا ہے۔ جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے۔

قمولی:۔ اس کا پورا نام و لقب یہ ہے: نجم الدین احمد بن محمد القمولی اور سال وفات طبقات ابن السبکی، الدرر الکامنہ، شذرات اور کشف الظنون وغیرہ میں ۷۲۷ھ درج ہے۔ لیکن کشف الظنون کے کسی نسخے کے حوالے سے ازہر اور تیموری کتب خانوں کی فہرستوں میں اس کا سن وفات ۷۷۷ھ درج ہے۔ مگر یہ غلط ہے۔ اور صحیح وہی ہے جسے ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ علّامہ سیوطی نے امام رازی کی تفسیر کا تکملہ لکھا ہے۔ جو سورۂ سبح (غالبا سورہ حشر مراد ہے) سے آخر قرآن تک ایک جلد میں ہے۔ لیکن صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ سیوطی کی بھی خود ایک تفسیر ہے۔ جس کا نام مفاتح الغیب ہے اور انھوں نے اسے اسی قدر لکھا ہی تھا۔ اور بظاہر یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ کوئی مستقل تفسیر تھی نہ کہ تکملہ۔

اب جب کہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتایا جا چکا ہے کہ امام رازی نے تفسیر کبیر کو ناتمام چھوڑا تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی اصل تفسیر کہاں تک ہے۔ یا کون کون سے حصے خود ان کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور کہاں سے تکملہ شروع ہوتا ہے۔ یا تفسیر میں کن کن مقامات میں یہ تکملے درج ہیں؟

امام رازی کی اصل تفسیر اور اس کے تکملے کی تعیین:

یہ دوسرا سوال ہے۔ اس کا جواب ذرا طویل اور تفصیل طلب ہے۔ قاضی عیاض کی شفا کی شرح میں شہاب خفاجی المتوفی ۱۰۶۹ھ نے لکھا ہے کہ

الثابت فی کتب التاریخ ان التفسیر الکبیر وصل الی سورۃ الانبیاء و کملہ تلمیذہ الخولی

(ترجمہ) تاریخ کی کتابوں سے یہ بالکل ثابت ہے کہ تفسیر کبیر سورۂ انبیاء تک ہوئی تھی اور اس کے بعد امام کے شاگرد خولی نے تکمیل کیا ہے۔

لیکن اس قول کے متعلق ہمارا شک و شبہ اوپر گذر چکا ہے اور ہم نے وہیں تفسیر میں اپنے غور و فکر کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ اس غور و فکر اور تحقیق و کاوش کے بعد جو کچھ ہمارے ہاتھ لگا ہے اجمال کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

ہمارے پیش نظر تفسیر کبیر کے دو نسخے ہیں اور ان ہی کے مطابق آئندہ حوالے ہوں گے۔ پہلا نسخہ ۱۲۸۰ھ میں مصر سے چھپے جلدوں میں شائع ہوا ہے اور دوسرا وہ قلمی نسخہ ہے جو حرم کے کتبے میں محفوظ ہے۔

۱۔ اس نسخۂ مخطوط میں سورۂ بقر کی تفسیر کے آخر میں مصنفؒ نے تاریخ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے

"و قدتم یوم الخمیس فی المعسکر المتاخم للقریۃ المسماہ باوصف سنہ اربع و تسعین و خمسمائہ"۔

اسی نسخے میں آل عمران کی تفسیر کے آخر میں یوں درج ہے

"وقال رضی اللہ عنہ اتم تفسیر ھذہ السورہ یوم الخمیس"۔

اسی طرح مطبوعہ نسخے میں بھی ہے مگر اس اضافے کے ساتھ

"اول ربیع الاخر سنہ خمس و ستین و خمسمائہ"

ایسے ہی اگلی بیشتر سورتوں کے آخر میں تاریخ کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں تک کہ سورۂ کہف کے آخر میں دونوں نسخوں میں یہ عبارت ملتی ہے۔

تم تفسیر ھذہ السورۃ یوم الثلثاء السابع عشر من صفر سنۃ اثنتین و ستہ مائۃ فی بلدہ غزنین

(ترجمہ) اس سورہ کی تفسیر بروز منگل ۱۷ صفر ۶۰۲ھ بمقام غزنین ختم ہوئی۔

لیکن یہاں سے یہ سلسلہ سورۂ یٰس کی تفسیر تک منقطع ہو جاتا ہے۔ اور صافات کی

تفسیر کے آخر میں نسخۂ مطبوعہ کے مطابق پھر تاریخ کا ذکر ملتا ہے۔

تم تفسیر هذه السورة ضحوة یوم الجمعة السابع عشر من ذی القعدة سنة ثلاث و ستمائة

(ترجمہ) اس کی تفسیر جمعے کے دن چاشت کے وقت ۱۷ ذوقعدہ ۶۰۳ھ کو مکمل ہوئی۔

اسی طرح یہاں سے سورۂ احقاف کے آخر تک تاریخ اختتام درج ہوتی چلی گئی جیسا کہ دونوں نسخوں میں احقاف کے آخر میں ہے:

تم تفسیر هذه السورة یوم الاربعاء العشرین من ذی الحجة سنة ثلاث و ستمائة

(ترجمہ) اس سورہ کی تفسیر چہار شنبہ کو ۲۰ ذی الحجہ ۶۰۳ھ میں تمام ہوئی۔

سورہ قتال کے آخر میں تاریخ کا کوئی ذکر نہیں، البتہ سورۂ فتح کی تفسیر کے آخر میں مطبوعہ نسخوں میں حسب ذیل تحریر ملتی ہے:

تم تفسیر هذه السورة یوم الخمیس السابع عشر من شهر ذی الحجة سنه ثلث و ستمائة

(ترجمہ) اس سورہ کی تفسیر پنجشنبہ ۱۷ ذی الحجہ ۶۰۳ھ کو پوری ہوئی۔

مگر یہ تاریخ غلط درج معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس سال پہلی ذی الحجہ کو جمعے کا دن تھا، جیسا کہ سابقہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے، نیز بعض کتابوں میں بھی ایسے قرائن درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال یکم ذی الحجہ کو جمعے کا دن تھا، اس لیے پنجشنبہ کو ۱۷ تاریخ کا ہونا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے۔

۲- شہاب خفاجی نے جس کو تکملہ خیال کیا ہے، اس میں بیشتر مواقع پر ایسے دلائل اور صریح اشارات ملتے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ امام رازی ہی کی تصنیف ہے، مثلاً سورہ انبیاء کی تفسیر میں ہے:

اما الماخذ الاول فقد تکلمنا فیه فی الجملة فی کتابنا المسمی بالمحصول فی الاصول (۹)

(ترجمہ) رہا پہلا ماخذ تو اس کے بارے میں ہم نے اپنی کتاب "محصول فی الاصول" میں گفتگو کی ہے۔

اسی طرح سورۂ زمر کی تفسیر میں لکھا ہے:

الثالث کان الشیخ الو الدضیاء الدین عمر رحمه الله یقول (۱۰)

(ترجمہ) تیسرے ہمارے والد اور استاد ضیاء الدین عمر رحمہ اللہ کہتے تھے۔

اسی سورہ کی تفسیر میں ہے:

لنا کتاب مفرد فی تنزیہ اللہ تعالے سبحانہ بتاسیس التقدیس (۱۱)

(ترجمہ) خدا کی تنزیہ کے متعلق ہماری ایک الگ سے کتاب ہے جس کا نام تاسیس تقدیس ہے

سورۂ حشر کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

لعلم لنا قد تمسکنا بھذہ الآیۃ فی کتاب المحصول فی اصول الفقہ (۱۲)

(ترجمہ) واضح رہے کہ ہم نے اس آیت کو اصول فقہ کی کتاب کتاب المحصول میں اختیار کیا ہے

ایسے ہی سورۂ مدثر کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

والاستقصاء فیہ قد ذکرناہ فی المحصول من اصول الفقہ (۱۳)

(ترجمہ) اور اس کے بارے میں ہم نے استقصاء محصول میں کیا ہے

اور سورۂ فجر کی تفسیر میں بھی لکھتے ہیں

وجواب المعارضۃ بالنفس مذکور فی کتابنا المسمی بلباب الاشارات (۱۴)

(ترجمہ) نفس معارضہ کا جواب ہماری کتاب لباب الاشارات میں ہے

کتاب المحصول اصول فقہ کی اور تاسیس التقدیس عقائد کی کتاب ہے۔ لباب الاشارات ابن سینا کے اشارات کا خلاصہ ہے۔ اور یہ تینوں امام فخرالدین رازی کی نہایت مشہور و معروف تصنیف ہیں۔ ایسے ہی ضیاء الدین عمر امام رازی کے پدر بزرگوار اور ان کے شیخ و استاد ہیں

ان واضح اشارات کے ساتھ بعض اور چیزیں بھی ملتی ہیں، مثلاً سورۂ فرقان میں ہے:

وفی تحقیقہ و بسطہ کلام دقیق یرجع فیہ الی کتبنا العقلیہ (۱۵)

(ترجمہ) اور اس کی تحقیق و بسط میں نہایت دقیق گفتگو ہے جس کے لیے ہماری کتب معقولات کو دیکھنا چاہیے۔

سورۂ قصص میں لکھتے ہیں:

وھذہ طریقۃ رکیکۃ بینا سقوطھا فی الکتب الکلامیہ (۱۶)

(ترجمہ) اور یہ نہایت رکیک طریقہ ہے جس کی خامی ہم نے کلام کی کتابوں میں واضح کی ہے

سورۂ فصلت کی تفسیر میں ہے:

لانا قد دللنا فی المعقولات (۱۸)

(ترجمہ) کیوں کہ ہم نے کتب عقلیہ میں اسے واضح کیا ہے

سورۂ قیامہ کی تفسیر میں لکھا ہے:

بینا فی الکتب العقلیہ ضعف تلک الوجوہ فلا حاجۃ ھھنا الی ذکرھا (۱۸)

(ترجمہ) ہم نے کتب عقلیہ میں اس کی کمزوری بیان کر دی ہے اس لیے یہاں اس کے ذکر کی ضرورت نہیں

ان صریح بیانات کے بعد غور کرنا چاہیے کہ جن حضرات کی طرف تکملے کی نسبتیں کی گئی ہیں ان کی بھی معقولات یا علم کلام میں کوئی کتاب ہے، جس کا انھوں نے حوالہ دیا ہے، اس لیے لامحالہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ امام رازی کی تصنیف کے اجزاء ہیں، البتہ سورہ یس کی تفسیر میں جو عبارت درج ہے کہ

قد ذکرنا الدلائل الدالۃ علی جواز الخلاء فی الکتب العقلیہ (۱۹)

دراصل صحیح نہیں بلکہ نسخۂ مخطوطہ کی عبارت صحیح ہے جو یہ ہے: قد ذکر الدلائل الخ

اب اس کے بعد ان اقتباسات کو بھی دیکھیے:

سورۂ نور کی تفسیر میں ہے:

فقد بینا فی اصول الفقہ (۲۰)

(ترجمہ) ہم نے اصول فقہ میں بیان کیا ہے

اسی طرح سورۂ نور ہی کی تفسیر میں کئی جگہوں پر سورۂ فرقان اور سورۂ نمل کی تفسیروں میں اسی طرز کے حوالے ملتے ہیں

سورۂ دخان کی تفسیر میں، قمطراز ہیں:

"وھذا الدلیل فی غایہ الضعف علی مابیناہ فی اصول الفقہ (۲۱)

سورۂ حدید میں ہے کہ

"سمعت والدی رحمہ اللہ یقول". (۲۲)

ایسے ہی سورۂ حشر میں ہے

"ان المسلم لایقتل بالذمی وقد بیناہ وجھہ فی الخلافیات". (۲۳)

ان حوالوں سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ سب امام رازی کے بیانات ہیں

۳۔ وہ اسلوب کلام اور انداز بیان جو اس نصف حصے میں پایا جاتا ہے جس کے متعلق قطعی طور سے یہ ثابت ہے کہ وہ امام فخرالدین رازی کی تفسیر ہے۔ وہی انداز اور اسلوب غوروفکر سے پڑھنے والوں کو سورہ قصص تک نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے بعد سورہ عنکبوت کی تفسیر سے سورۂ یٰسٓ تک ایک دوسری روح اور انداز نگارش ہے۔ ذیل میں ہم اس کی چند مثالیں نقل کرتے ہیں جس سے دونوں کے فرق و امتیاز کا اندازہ ہوتا ہے۔

الف۔ قرآن مجید کی بعض صورتوں کے شروع میں حروف مقطّعات کا جو استعمال ہوا ہے امام رازی نے سورۂ بقرہ کی تفسیر کے شروع میں اس پر بڑی طویل بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک اس بارے میں مختار قول یہ ہے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہوتے ہیں اور اس قول کا مقتضی آل عمران، اعراف، یونس، ہود، یوسف، رعد، ابراہیم، حجر، مریم، طٰہٰ اور ایسے ہی شعرا، نمل اور قصص کی تفسیروں کے شروع میں دکھائی دیتا ہے۔

لیکن سورۂ عنکبوت کی تفسیر کے شروع میں مفسر نے ایک لمبی بحث ایک جدید قول کو ثابت کرنے کے لیے کی ہے۔ اس بحث کا ماحصل یہ ہے:

"حروف مقطّعات مخاطب اور سامع کی تنبیہ کے لیے لائے جاتے ہیں" چناں چہ وہ لکھتے ہیں۔

"حکیم اور دانا جب غفلت میں سرشار آدمی سے خطاب کرتا ہے تو اصل گفتگو سے پیشتر ایسی باتیں کرتا ہے جن سے وہ مخاطب کو اپنی طرف مائل کر سکے۔ اور کبھی اصل گفتگو سے پیشتر کہی جانے والی چیز کوئی بے مفہوم آواز ہوا کرتی ہے۔ مثلاً کوئی کسی کے پیچھے سیٹی محض التفات کی خاطر بجاتا ہے اور کبھی یہ آواز منہ سے نہیں دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی تالی اس کے لیے پیٹتا ہے تاکہ سننے والا اس کی طرف متوجہ ہو۔ پس اسی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بیدار مغز تھے مگر چونکہ آپ انسان تھے۔ اس لیے کبھی کبھی بعض معاملات، بعض امور کی جانب سے آپ کو ذہول میں مبتلا کر دیتے تھے۔ اسی لیے ایک حکیم و دانا ہستی کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ اصل گفتگو سے پہلے تنبیہ اور ہوشیار کرنے کے لیے حروف لائے اور پھر یہ حروف جب غیر مفہوم المعنی ہوں تو تنبیہ کے لیے نہایت سودمند ہوتے ہیں۔"

پھر مفسر نے "الم" کے اعراب کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

قدذکر تمام ذلک فی سورہ البقرہ مع الوجوہ المنقولہ فی تفسیرنا و نزیدھاھنا ان علی ماذکرنا فی الحروف من انھا للتنبیہ لااعراب لھا (لی الم) لانھا جاریہ مجری الاصوات المنبھۃ

(ترجمہ) یہ تمام سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ان وجوں کے ساتھ جو اس میں منقول ہیں ، بیان ہو چکا ہے یہاں ہم یہ اضافہ کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے بتایا ہے یہ حروف تنبیہ کے لیے ہوتے ہیں اس لیے انکا کوئی اعراب نہیں کیونکہ یہ ان آوازوں کا کام دیتے ہیں جو تنبیہ کے لیے ہوتی ہیں۔

یہ عبارت ہم نے قلمی نسخے سے نقل کی ہے ، اور جو فقرے بریکٹ میں ہیں وہ ہم نے اضافہ کر دیے ہیں لیکن مطبوعہ نسخے کی عبارت اس سے مختلف ہے ، مگر اس طرز کے حوالوں سے ہمارے مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا ، کیونکہ صاحب تکملہ بھی " قد تقدم " اور " قد ذکر " وغیرہ الفاظ کے ذریعے اس کا حوالہ دے سکتا ہے اور یہ کوئی نامانوس طریقہ نہیں ،

اسی طرح سورۂ روم کی تفسیر کا افتتاح بھی اسی جدید قول کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اس میں ثبوت کا حوالہ ملتا ہے ، لقمان کے شروع میں وہ خاموشی سے گذر گئے ہیں سورہ سجدہ میں صرف اتنی بات کے ذکر پر اکتفا کیا ہے کہ

قد علم ما فی قولہ الم و قولہ لاریب فیہ من سورہ البقرہ وغیرھا

(ترجمہ) " الم " اور " لاریب فیہ " کے بارے میں سورہ بقرہ وغیرہ میں معلوم ہو چکا ہے۔

اور سورہ یٰس کے شروع میں یوں رقمطراز ہیں:

قد ذکرنا کلاما کلیافی حروف التہجی فی سورہ العنکبوت

(ترجمہ) سورۂ عنکبوت میں حروف تہجی کی بابت کامل گفتگو ہم بیان کر چکے ہیں

اب پہلی قسم میں کسی سورہ کا ماقبل کی سورہ سے ربط و نظم واضح کرنے کے لیے کوئی دھیان نہیں دیا گیا ہے ، لیکن دوسری قسم یعنی عنکبوت ، یٰس اور ان کے درمیان کی سورتوں میں اس کا اہتمام ملتا ہے

(ج) پہلی قسم (بقرہ تا قصص) میں اکثر کلامی مباحث سے تعرض کیا گیا ہے ، خواہ یہ بلاضرورت اور بلامناسبت ہی کے کیوں نہ ہوں لیکن دوسری قسم (عنکبوت تا یٰس) میں ایسا نہیں ہے ،

(س) پہلی قسم میں اکثر مشاہیر اور اکابر معتزلہ جیسے اصم ، جبائی ، قاضی عبدالجبار ، کعبی اور ابو مسلم اصفہانی کے قول نقل ہوئے ہیں ۔ اور متعدد مقامات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تفسیر کے پاس ان کی تفسیریں موجود تھیں لیکن دوسری قسم میں یہ چیز مفقود ہے ،

(د) معتزلہ کے دلائل بھی پہلی قسم میں شرح وبسط کے ساتھ اکثر ملتے ہیں اور مصنف نے کہیں ان کا جواب دیا ہے کہیں صرف معارضے پر اکتفا کیا ہے کبھی جواب کی طرف محض سرسری اشارہ کر دیا ہے اور کبھی خاموش گذر گئے ہیں مگر دوسری قسم میں یہ چیز شاذونادر ہی ملتی ہے۔

(ز) پہلی قسم میں مباحثہ اور جدال کے الفاظ مثلاً (سلمنا) (فلم قلتم) وغیرہ کی بہتات ہے۔ لیکن دوسری قسم میں اس کا کہیں پتا نہیں۔

(ط) دونوں ہی قسموں میں "کشّاف" کے حوالے بکثرت ہیں مگر پہلی قسم میں "قال صاحب الکشاف" وغیرہ کا اور دوسری میں عموماً "قال الزمخشری" وغیرہ کا التزام ملتا ہے۔

(ہ) پہلی قسم میں اکثر جب کسی آیت کی تفسیر مکمل ہو جاتی ہے اور دوسری آیت کی تفسیر شروع ہوتی ہے تو "قولہ تعالیٰ" اور دوسری قسم میں "قال تعالیٰ" کا استعمال ملتا ہے۔

(و) قسم اول میں ہر مدعا و مقصود پر بحث کے لیے اکثر "اعلم" کے لفظ سے آغاز ہوتا ہے مگر قسم ثانی میں ایسا بہت کم ہے

(ی) پہلے میں جمع کا قصد و تتبع بہت کم اور دوسرے میں اکثر ہے

(ق) قسم اوّل میں صرف مناسب حد تک عربی قواعد سے تعرض کیا گیا ہے مگر قسم ثانی میں اس کا زیادہ اہتمام ہے کہ بہت غلو سے کام لیا گیا ہے اور اس سلسلے میں بڑی دِقّت آمیزی اور نادر خیالی کا ثبوت دیا گیا ہے اور ایسی غریب و نادر چیزیں پیش کی گئی ہیں جن کا عربی کتابوں میں پتا نہیں چلتا۔

(ص) پہلی قسم میں نکات بلاغت سے بس مناسب اعتدال کے ساتھ تعرض کیا گیا ہے لیکن دوسری قسم میں اس سے اکثر تعرض ملتا ہے۔

سورہ یٰس کی تفسیر کے بعد: ہم پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ قسم اوّل میں جو تفسیر کے آغاز سے قصص کے اختتام تک ہے' پہلا طریقۂ تحریر اور انداز بیان کار فرما ہے اور دوسری قسم میں (جو عنکبوت سے یٰس تک ہے) دوسرا طریقۂ تحریر اور انداز بیان پایا جاتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کے بعد کی سورتوں کی تفسیروں کا کیا حال ہے۔

چنانچہ اس عقدے کی گرہ کشائی کے لیے جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو پھر ہمیں صافات کی تفسیر کے شروع سے احقاف کی تفسیر کے آخر تک وہی پہلی قسم کا طرز کلام اور انداز بیان جھلکنے لگتا ہے۔ یہ گویا تیسری قسم ہوئی۔ اس کے بعد سورہ قتال کی تفسیر کے شروع سے واقعہ کی تفسیر کے آخر تک دوسری قسم والا اسلوب عود کر آیا ہے جسے ہم چوتھی قسم قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد سورۂ ممتحنہ کی تفسیر کے آغاز سے تحریم کے آخر تک دوسری قسم کے جیسا اسلوب نگارش پیدا ہو گیا ہے لیکن اس حصے سے مفسر کی عجلت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی لیے وقت آفرینی بھی اس میں مقصود ہے اور تفسیری واحدی اور کشاف سے اخذ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس حصّے کو ہم چھٹی قسم کا نام دیتے ہیں۔ اس کے بعد سورۂ ملک کی تفسیر کے آغاز سے آخر قرآن تک پہلی قسم والی تحریر کی روح جلوہ فرما ہے۔ اس طرح یہ گویا ساتویں قسم ہوئی۔

اس میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ پہلی قسم امام رازی کی تصنیف اور پہلا انداز تحریر امام رازی کا ہے۔ اس لیے تیسری، پانچویں اور ساتویں قسم بھی امام رازی کی تصنیف ہو سکتی ہے اور ان قسموں کے اندر وہ سارے واضح اور صریح دلائل موجود ہیں جنھیں ہم نے نمبر ۲ میں بیان کیا تھا۔

نیز اس میں نمبر اوّل سے مطابقت بھی موجود ہے کیونکہ جس طرح سورتوں کی تفسیر کے آخر میں پہلی قسم میں تاریخیں مذکور ہیں اسی طرح تیسری قسم کے اواخر سور میں بھی تاریخوں کا اندراج ہے البتہ سورۂ فتح کے آخر میں بھی تاریخ مذکور ہے جو چوتھی قسم میں شامل ہے لیکن اس تاریخ کے مخدوش ہونے کا پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں اور اس کی تصنیف کے لیے یہ امر ہی کافی ہے کہ سورۂ فتح میں دوسری قسم کا سا انداز اور طریقۂ ادا موجود ہے۔

بقیہ اقسام امام رازی کی تصنیف نہیں ہیں: ہم نے پہلی، تیسری، پانچویں اور ساتویں قسموں کے امام ہی کی تصنیف ہونے پر بہت سے دلائل مہیا کر دیے ہیں۔ اب ہمیں اس بات کا ثبوت پیش کرنا ہے کہ دوسری، چوتھی اور چھٹی قسم امام صاحب کے علاوہ کسی اور کی تصنیف ہیں۔ یہ ثبوت حسب ذیل ہیں:

۱. طریقۂ بیان کا اختلاف، اس پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے اس لیے اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

۲. سورۂ روم (جو قسم ثانی میں ہے) کی تفسیر میں ہے:

"فاخبرنی الشیخ الورع الحافظ الاستاذ عبدالرحمن بن عبداللہ بن علوان بحلب" (۲۴)

عبدالرحمان مذکور کا سنہ وفات جیساکہ شذرات وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے ۶۱۳ھ ہے۔ سورۂ سبا (قسم ثانی) کی تفسیر میں لکھا ہے۔

"اخبرنا تاج الدین عیسیٰ بن احمد بن الحاکم البندمی قال اخبرنی والدی عن جدی عن محی السنۃ عن عبدالواحد الملیحی عن احمد بن عبداللہ النعیمی عن محمد بن یوسف الفربری عن محمد بن

اسماعیل البخاری (۲۵)

عیسیٰ کے حالات کا ہمیں علم نہیں ہو سکا مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ امام رازی سے متاخر ہیں کیونکہ عیسیٰ سے روایت کرنے والے اور محی السنۃ کے درمیان تین واسطے ہیں جب کہ امام رازی اپنے والد ضیاء الدین سے روایت کرتے ہیں اور ضیاء الدین محی السنۃ کے اصحاب میں شامل ہیں

سورۂ ق کی تفسیر میں ملتا ہے۔

انظلام بمعنی الظالم کا لتمار بمعنی التامر ... وهذا وجه جيد مستفاد من الامام زين الدين ادام الله فوائده " (۲۶)

ان زین الدین کی شخصیت بھی غیر معروف ہے اور عبارت سے ظاہر ہے کہ وہ تصنیف کے وقت زندہ تھے۔ بعض جگہ مذکور ہے کہ وہ معطی صاحب الالفیۃ (المتوفی ۶۲۸ھ) کے فرزند ہیں۔ سورۂ قمر (چوتھی قسم) کی تفسیر میں ہے۔

روى الواحدى فى تفسيره قال سمعت (الصواب فى تفسير ما سمعة على كما فى المخطوطه) الشيخ رضى الدين المويد الطوسى بنيسابور قال سمعت عبدالجبار قال اخبرنا الواحدى قال اخبرنا ابو القاسم عبدالرحمن بن محمد السراج ـــــ (۲۷)۔

محدث موید طوسی کا انتقال ۶۱۰ھ میں ہوا ہے۔

ان اقتباسات میں مفسر نے جن لوگوں سے روایت کی ہے وہ سب امام فخرالدین سے متاخر ہیں اس لیے وہ ان سے روایت نہیں کر سکتے اور ان چار قسموں میں جن کو ہم دلائل کے ساتھ امام رازی کی تصنیف بتا چکے ہیں۔ کہیں اس طرح کی روایت سے کوئی تعرض بھی نہیں ملتا اور نہ امام صاحب ہی سوائے اپنے والد ماجد کے کسی ہمعصر عالم سے کوئی بات نقل کرتے ہیں۔ اس لیے قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت کرنے والا مفسر احمد بن خلیل خولی ہے اور یہی صاحب تکملہ بھی ہے۔ باقی قمولی سب سے متاخر ہے۔ اس کی ان لوگوں سے ملاقات ثابت نہیں۔ ابن السبکی نے طبقات میں خولی کی مؤید طوسی سے ملاقات اور سماع کا تذکرہ بھی کیا ہے

سورۂ ذاریات (قسم رابع) میں ایک اعتقادی مسئلے کے ذکر میں لکھا ہے۔

الاستقصاء مفوض الى المتكلم الاصولى لا المفسر

(ترجمہ) اس کے متعلق استقصاء کرنا تو اصولی متکلم کا کام ہے نہ کہ مفسر کا۔

غور کرو یہ کیسے امام رازی کا کلام ہو سکتا ہے۔ اس میں تو ان پر ایک قسم کی طنز و

تعریف بھی کی گئی ہے اور امام صاحب کا معمول یہ ہے کہ وہ اس طرح کے مسائل میں پوری بحث و نظر سے کام لیتے ہیں یا کم از کم اپنی کلامی اور عقلی کتابوں ہی کا حوالہ دے دیتے ہیں سورۂ قمر (چوتھی قسم) میں تحریر فرماتے ہیں۔

سادسها ما قاله فخر الدين الرازي في تفسير قوله تعالى. فقال لها وللارض ائتيا طوعا اوكرها واخذ هذا من المفهوم اللغوي وهو قريب الى اللغة لكن بعيد الاستعمال في القرآن (۲۶)

(ترجمہ) چھٹا وہ جسے امام فخرالدین رازی نے فقال لها وللارض ائتيا طوعا او كرها .. کی تفسیر میں بیان کیا ہے اور انھوں نے اسے لغوی مفہوم سے اختیار کیا ہے اور یہ لغت سے تو قریب تر ہے مگر قرآنی استعمالات سے بعید ہے۔

یہ عبارت مطبوعہ نسخے کی ہے اور قلمی نسخے میں " سادسها قلنا " ہے اپنے گمان کے مطابق اصلاح کر دی ہے حالانکہ سیاق سے مطبوعہ کی تائید ہوتی ہے۔

جس آیت کا اس عبارت میں تذکرہ ہے وہ سورۂ فصلت کی آیت ہے اور اس آیت کی تفسیر میں یہ معنی و مفہوم موجود ہے اور سورۂ فصلت کو ہم نے تیسری قسم میں قرار دیا تھا اور اس کے متعلق دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ امام رازی کی تصنیف ہے اس عبارت سے اس کی مزید تائید بھی ہوتی ہے۔

سورۂ واقعہ (قسم رابع) کی تفسیر میں لکھا ہے۔

وشئي من هذا رايته في كلام الامام فخر الدين رحمه الله بعد مافرغت من كتابة هذا مما وافق خاطري على اني معترف باني اصبت منه فوائد لا احصيها

(ترجمہ) اس میں سے کچھ میں نے امام رازی کے کلام میں اس کو لکھنے کے بعد دیکھا جس سے میری موافقت ہوئی باوجودیکہ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان سے اتنے فوائد حاصل کیے ہیں جو شمار سے باہر ہیں۔

دونوں نسخوں میں عبارت اسی طرح ملتی ہے البتہ مخطوطے سے " معترف باني " ساقط ہے اور یہ بحث " ليس كمثله شئ " سے متعلق ہے جو سورہ شوریٰ کی آیت ہے، وہاں اس کی تفسیر میں وہ بعض باتیں ملتی ہیں جن کا یہاں ذکر کیا ہے اور سورہ شوریٰ قسم ثالث میں ہے جس کی تفسیر کے متعلق طے ہو چکا ہے کہ وہ امام رازی کی خود لکھی ہوئی ہے، اس لیے یہ اس کی مزید تائید ہوئی۔ اسی سے تھوڑا ہی پہلے یہ عبارت بھی ہے۔

وفيه مسائل الاولى اصولية ذكرها الامام فخرالدين رحمه الله فى مواضع كثيرة و نحن نذكر بعضها فالاولى قالت المعتزلة ، وقد اجاب الامام فخر الدين باجوبة كثيرة واظن به انه لم يذكر ما اقوله فيه

یہ نسخۂ مطبوعہ کی عبارت ہے مگر مخطوطے میں تھوڑا سا فرق ہے۔

*

حوالوں پر ایک عام نظر : ۲۔ حوالوں پر ہم عمومی حیثیت سے مفصّل بحث کرنا چاہتے ہیں حوالوں سے ہماری مراد "قد ذکرنا فی ..." وغیرہ کی طرز کی عبارتیں ہیں۔

یوں تو حوالے چھٹی قسم کے علاوہ ہر ایک میں ملتے ہیں، چھٹی قسم میں عجلت کی وجہ سے جیسا کہ ہم پہلے بھی کہا تھا حوالے مفقود ہیں۔

اس سے پہلے حوالوں کا جو ایک لمبا سلسلہ گذر چکا ہے، ان میں مصنّف کی کسی اور قسم میں یا تکملہ نویس کے جو حوالے "قد تقدم" وغیرہ کے جیسے الفاظ میں ملتے ہیں ان سے ہمارے خیال پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا البتہ دو طرح کے حوالوں سے اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

۱۔ کہیں کہیں تکملے میں جو ...... "قد ذکرنا" وغیرہ قسم کے الفاظ کے حوالے ملتے ہیں، ان سے شبہ ہوتا ہے، کہ کس طرح دوسرے کے مضمون اور خیال کو اپنی طرف منسوب کر لیا ہے۔

۲۔ مگر خود اصل میں بھی تکملے کا حوالہ ملتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیسے درست ہو سکتا ہے جو بات یا خیال اس وقت سرے سے موجود ہی نہیں تھا بلکہ بعد میں پیدا ہوا ہے اس کا حوالہ کیسے دے دیا گیا۔

امر اول کی نسبت عرض ہے کہ اس سے خود مجھے بھی بہت سخت تعجب ہوا، جب سورۂ عنکبوت کی تفسیر کی ابتداء ہی میں "قد ذکرنا مرارا" کے جیسے الفاظ ملے کیونکہ یہ قسم ثانی میں شامل ہے، اور اس سورہ سے پہلے جو سورتیں ہیں انھیں ہم نے قسم اوّل میں قرار دیا تھا اور ان کے بارے میں یہ قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ امام رازی ہی کی تصنیف ہیں، اور اسی قسم ثانی میں سورۂ بقرہ وغیرہ کی تفسیر کے متعدد حوالے جب نظر سے گذرے تو اور بھی حیرت ہوئی، کیونکہ اس قسم کے متعلق بھی ہمارا فیصلہ تھا کہ یہ امام صاحب کی تصنیف نہیں ہے، اس لیے مجھے احتمالات اور تاویلات کی جستجو ہوئی، اور اس سلسلے میں ایک قوی احتمال یہ نظر آیا کہ صاحب تکملہ نے اپنے کو اصل مصنّف کا شریک کار سمجھا، اور شرکاء میں ایک دوسرے کے کام کو اپنی جانب منسوب کر لینا روا ہے، اسی لیے اس نے "قد ذکرنا" کے جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں،

حالانکہ وہ اپنے سوا، اصل مصنّف ہی کو مراد لے رہا ہے،

اس کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ مجھے ان مقامات کا تتبع کرنا چاہیے، جن کا حوالہ دیا جا رہا ہے، تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کیا واقعی ان جگہوں میں اس طرح کا خیال موجود ہے یا نہیں، اس طرح مجھے ایک اشکال سے تو نجات مل جائے گی، مگر اس کے بعد دوسرے اشکال میں پڑجاؤں گا، مثلاً

پانچویں جلد میں ص ۱۰۲ پر تحریر ہے:

" وذكرنا فى تفسير الانفال فى اوائلها ان الصلوة ترك التشبيه بالسيد "

اور اسی جلد میں ص ۲۲۱ پر لکھتے ہیں:

المسئالة الرابعة لم قدم السمع هنا والقلب فى قوله تعالى ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم (البقرة) — وقد ذكرنا هناك ماهوا لسبب فى تاخير الابصار — وهو ان القلب والسمع سلب قوتهما بالطبع)

ان دونوں حوالوں کو جب ہم نے اصل مقام میں دیکھا تو اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا، یہ قسم ثانی کے دو حوالے تھے، اسی طرح اس قسم میں بعض دوسرے حوالے بھی ہیں، مگر اصل مقام میں ان کا یا تو وجود ہی نہیں یا صرف ایک گوشہ موجود ملا۔

اب چوتھی قسم بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سورۂ ق کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" ذكرنا ذلك فى تفسير الفاتحه حيث قلنا. قال بسم الله الرحمن الرحيم اشارة الى كونه رحمانا فى الدنيا حيث خلقنا، رحيما فى الدنيا حيث رزقنا رحمته ثم قال مرة بعد قوله الحمد لله رب العلمين الرحمن الرحيم اى هو رحمان مرة اخرى فى الاخرة بخلقنا ثانيا واستدللنا عليه بقوله بعد ذلك، مالك يوم الدين اى بخلقنا ثانيا و رحيم برزقنا ويكون هو المالك فى ذلك اليوم اذا علمت هذا (۳۱) — "

لیکن سورہ فاتحہ میں ان الفاظ و معانی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے،

سورۂ ذاریات کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

المسئلة الاولى قد ذكرنا الحكم فى القسم من المسائل الشريفة والمطالب العظيمة فى سورة والصافات ونعيدها ههنا وفيها وجوه الاول — واستوفينا الكلام فى سورة الصافات " (۳۲)

اسی طرح کی ایک اور طویل بحث ہے۔ جس کا سورۂ والصافات کی تفسیر میں کوئی نشان ہی نہیں ملتا۔ البتہ بعض اجزاء سورۂ یٰس کی تفسیر میں ملتے ہیں۔ اور سورہ یس قسم ثانی میں ہے اس کا اور اس قسم رابع کا مصنف ایک ہی ہے، لیکن والصافات قسم ثالث میں ہے، جس کے مصنف امام فخرالدین رازی ہیں۔

سورۂ طور کی تفسیر میں فرماتے ہیں،

المسئلہ الرابعہ هذا یدل علی انہ لم یطلب منهم اجرا ما وقولہ تعالے قل لا اسئالکم علیہ اجرا الا المودة فی القربی — المراد من قولہ الا المودة فی القربی هو انی لا اسئالم علیہ اجرا یعود الی الدنیا وانما اجری المحبۃ فی الزلفی الی اللہ تعالی ... وقد ذکرناہ هناک "۔ (۳۳)

یہاں تفسیر سورۂ شوریٰ کا حوالہ دیا ہے حالانکہ اس کا وہاں پتا تک نہیں۔ سورۂ طور ہی کی تفسیر میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

ویکون مستثنی منهم کماقال تعالی فصعق من السموات ومن فی لارض الا من شاء اللہ وقدو ذکرنا هناک ان من اعترف بالحق وعلم ان الحساب کائن فاذا وقعت الصیحہ یکون کمن یعلم ان الرعد یرعد ویستعد لسماعہ ومن لایعلم یکون کالغافل (۳۴)

،فصعق من فی السموت الخ والی آیت سورۂ فصلت حم السجدہ میں ہے جسے ہم نے قسم ثالث میں شمار کیا ہے۔ اس میں تو اس حوالے کا سرے سے پتا نہیں البتہ سورۂ ق (قسم رابع) میں ضرور اس قسم کی بات ملتی ہے۔

اسی طرح کے اور بھی کئی حوالے ہیں جن کا اصل مقام پر کوئی وجود نہیں اس لیے سب کو نقل کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

<u>ایک نیا اشکال اور اس کا حل</u>: ان حوالوں سے یہ صاف پتا چلتا ہے کہ حوالہ دینے والے نے اس تفسیر کا حوالہ دیا ہے اس لیے "ذکرنا" وغیرہ کے قسم کے الفاظ سے جو شبہ ہوا تھا وہ خود بخود رفع ہو گیا لیکن صاحبِ تکملہ کا اپنی کسی تفسیر کا حوالہ دینا خود اپنی جگہ پر ایک اشکال ہے جس کا جواب یہ ہے۔

پہلے گذر چکا ہے کہ دوسری چوتھی اور چھٹی قسم کا مصنف خولی ہے اور مشہور یہی ہے

کہ خولی نے امام صاحب کی تفسیر کا تتمہ لکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خولی کا تکملہ کوئی کتاب ہے جو امام رازی کی تفسیر کردہ سورتوں پر تعلیق اور جن سورتوں کی تفسیر امام صاحب نے نہیں تھی ان کی ایک کمل تفسیر پر مشتمل ہے چنانچہ وہ تفسیر میں اس تعلیق کا حوالہ دیتا ہے کیونکہ تکملہ اور تعلیق دراصل ایک ہی کتاب پر مشتمل تھے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تکملے کا خطبہ مفقود ہے کیونکہ وہ کتاب کے شروع میں تھا اور پہلی قسم پر جو تعلیق تھی اس سے ملا ہوا تھا اس لیے بعد میں لوگوں نے صرف ان ہی حصوں کی طرف توجہ کی جن کی تفسیر امام صاحب نے چھوڑ دی تھی' نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے تکملے کو لے لیا اور اسے امام صاحب کی اصل تفسیر میں شامل کر دیا' باقی **تعلیق** کو یوں ہی چھوڑ دیا اسی طرح اصل خطبہ بھی تعلیق کے ساتھ ضائع ہو گیا۔

<u>دوسرے طرز کے حوالے</u>: اب ان حوالوں کو دیکھنا چاہیے جو ان قسموں کے اندر ملتے ہیں جن قسموں کے متعلق ہمارا فیصلہ ہے کہ وہ امام کی تصنیف ہیں حالانکہ یہ حوالے ان سورتوں کے متعلق امام صاحب دے رہے ہیں جو ان قسموں میں ہیں جن کے متعلق اب کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ امام کی تصنیف نہیں ہیں۔

تیسری قسم میں تقریباً ستر حوالے ہوں گے۔ ان میں ایک ہی حوالہ ایسا ہے جو واقعی شک و شبہ میں ڈال سکتا ہے، وہ یہ ہے۔

لقد ما لکلام فی نظیر ھذہ الایۃ فی سورت العنکبوت و فی سورہ لقمان (۳۵)

اور پانچویں قسم میں صرف ایک حوالہ ملتا ہے: وھو مفسر فی سورۃ سبا (۳۶)

البتہ ساتویں قسم میں دس حوالے ہیں لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر اسی طرح مجمل ہیں اس لیے اصل مقام سے ان کے تقابل کا امکان ہی نہیں البتہ دو حوالوں میں تقابل ہو سکتا ہے چنانچہ تفسیر سورۂ نون میں فرماتے ہیں۔

" القراء مختلفون فی اظہار النون واخفائھا من قولہ ن والقلم و قد ذکرنا ھذا فی طٰس ویٰس۔ (۳۷)

لیکن سورۂ یٰس (قسم ثانی) میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور سورۂ طٰس میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں حالانکہ یہ پہلی قسم میں ہے مگر اس کی وجہ شاید وہی ہو جسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے (۳۸)۔

دوسرا حوالہ سورۂ "اقرا" کی تفسیر میں ہے۔

قد من تفسیر " النادی " عند قولہ " وتاتون فی نادیکم المنکر " (۴۹)

یہ سورۂ عنکبوت کی آیت ہے لیکن وہاں "نادی" کی کوئی تفسیر نہیں ملتی۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ حوالے اس تفسیر کے نہیں دیے جا رہے ہیں جو ہمارے پاس موجود ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سورۂ قیامہ کے دو حوالے سورۂ واقعہ میں ملتے ہیں حالانکہ یہ طے ہے کہ سورہ واقعہ امام کی تصنیف نہیں ہے۔

بہر حال ان حوالوں سے ہمارا منشا، اور مدعا کسی طرح مجروح نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم نے اس کے ثبوت میں نہایت محکم دلائل اور واضح شواہد پیش کیے ہیں کہ پہلی تیسری، پانچویں اور ساتویں امام رازی کی تصنیف ہیں اور دوسری، چوتھی اور چھٹی قسمیں کسی اور کی تصنیف ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان سے ہمارے خیال کی تائید ہی ہوتی ہے۔

اب صرف دو احتمال اور رہ گئے ہیں' پہلا احتمال یہ ہے کہ امام فخرالدین نے پوری تفسیر لکھی ہو اور اس کے یہ اجزا، گم ہو گئے ہوں جسے خولی نے مکمل کیا ہے دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان اجزا، کی امام نے سرے سے تفسیر ہی نہ لکھی ہو۔

پہلا احتمال: پہلے احتمال کی دو دلیلیں ہو سکتی ہیں،

۱۔ ایک وہی حوالے جو ابھی اوپر نقل ہو چکے ہیں

۲۔ عام طریقہ یہ ہے کہ مفسر شروع قرآن سے تفسیر لکھتا ہے اور ایک ترتیب سے لکھتا چلا جاتا ہے، اس لیے اس کے کوئی معنی نہیں کہ امام صاحب اس معتاد طریقے کو چھوڑ کر درمیان درمیان سے تفسیر لکھیں۔

دوسرا احتمال: دوسرے احتمال کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر واقعی امام صاحب کی تفسیر کے اجزا، گم ہو گئے ہوتے تو وہ ان کا خود ہی ذکر کرتے۔

۲۔ خولی کا شاگرد ابن ابی اصیبعہ خود اس بات کا تذکرہ کرتا ہے کہ امام رازی کی تفسیر ایک خط میں بارہ جلدوں کے اندر ہے لیکن ان کے گم ہونے کا کوئی ذکر نہیں کرتا البتہ خولی کے تکملے کا تذکرہ کرتا ہے۔

۳۔ ابن خلکان جیسے وسیع النظر اور صاحب علم شخص نے بھی صرف اتنی بات بیان کی ہے کہ امام رازی نے تفسیر کبیر مکمل نہیں کی۔

پہلے احتمال کا رد: پہلے احتمال میں "حوالوں" کے ذریعے جو دلیل قائم کی گئی ہے وہ چند قرائن سے نہایت کمزور معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ اولاً تو یہ حوالے بہت کم ہیں

۲۔ اکثر عبارتوں میں اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ امام صاحب آیندہ جو کچھ لکھنے والے ہیں اسکے حوالے دے رہے ہیں نہ یہ کہ ایسی چیزوں کا جن کے لکھنے سے فارغ ہو چکے ہیں۔ مثلاً اس قسم کی عبارتیں

" مفسر فی سورۃ سبا" " مفسر فی سورۃ الطور" "مفسر فی آخر سورۃ الطور" مفسر فی سورۃ الطور" " مفسر فی سورۃ النجم"

یا مثلاً بعض جگہوں میں "قد ذکرنا" کی جیسی عبارتیں بھی اس کا احتمال رکھتی ہیں کہ امام رازی نے آیندہ ارادے کو ایک امر واقع تصور کر لیا ہو اور یہ احتمال اس لیے بھی قوی ہو جاتا ہے کہ امام صاحب نے جن مقامات کے حوالے دیے ہیں وہ ترتیب قرآن کے لحاظ سے مقدم تھے اس لیے انھوں نے سمجھا ہو گا کہ جب اس مقام کی تفسیر لکھی جائے گی تو یہ خواہ مخواہ اس مقام سے مقدم ہی ہوگی۔ یہ واضح رہے جیساکہ گذشتہ حوالوں سے بھی معلوم ہوا کہ امام صاحب کی کتاب میں "سیاتی" وغیرہ کے قسم الفاظ سے حوالہ ملنا مشکل ہے۔

رہا یہ استدلال کہ امام صاحب کا خلاف عادت بلا ترتیب متفرق سورتوں کی تفسیر لکھنا معنی نہیں رکھتا توہم ایسے حوالے نقل کر رہے ہیں جن سے اس استدلال کی کمزوری واضح ہو جائیگی اور یہ بھی معلوم ہو گا کہ امام صاحب نے مالوف طریقے کے خلاف تفسیر لکھی تھی خواہ یہ بے معنی بات ہو یا با معنی کیونکہ یہ حوالے علانیہ کہہ رہے ہیں کہ انھیں پہلے لکھا گیا ہے اور جن جگہوں میں حوالے دیے جا رہے ہیں وہ بعد کی لکھی ہوئی ہیں ہر چند کہ ترتیب میں وہی مقدم ہیں مثلاً

سورۂ بقرہ کی ساتویں آیت کی تفسیر لکھتے ہیں۔

" المسئلة الثامنه واستقصينا بيانه فی سورة الشعراء (۳۰)

سورۂ مائدہ کی چھٹی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وقد حققنا الكلام في هذا الدليل في تفسير قوله تعالى . وما امروا الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين فليرجع (۳۱)

اور محولہ بالا آیت سورۂ بینہ میں ہے:

سورۂ اعراف کی آیت ۵۴ کے تحت رقم طراز ہیں

وهذا الوجه قد اطلعنا فی شرحه فی سورة طه فلانعیه هنا (۴۲)

یہ مثالیں پہلی قسم میں سرسری طور پر ہماری نظر سے گذری تھیں کیونکہ ہم نے اس حصّے کا بغور مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن اگر کوئی بغور پڑھے تو شاید اسے اس طرح کی اور بھی مثالیں مل جائیں۔

سورۂ صافات کی تفسیر میں امام صاحب تحریر فرماتے ہیں

ولعلنا قد شرحنا هذا الکلام فی تفسیر تبارک الذی بیده الملک فی تفسیر قوله تعالی ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح "۔

پھر کچھ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

" الا ستقصاء فیه مذکور فی قوله تعالی ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح

پھر اس سے اور آگے رقمطراز ہیں۔

" اذا اضیف ما کتبناه ههنا الی ما کتبناه فی سورة الملک ـــ "

اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" ہو کدهذا اثاینا فی تفسیر سورة سبح اسم ربک الاعلیٰ "

اسی طرح ساتویں قسم میں بے شمار حوالے ملتے ہیں جن میں سے بعض اسی طرح کے ہیں۔

مثلاً سورۂ ملک میں لکھتے ہیں۔

" ونظیر ہذہ الایۃ قوله، سلهم ایهم بذلک زعیم وقد تقدم الکلام فیه

اور یہ آیت سورہ نون میں ہے

یا جیسے سورۂ معارج کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

" فقد قررنا هذه المسئلة فی تفسیر قوله " یوم یقوم الروح والملائکة صفا "

اور یہ آیت محولہ سورۂ نبا، کی ہے

سورۂ الحاقہ کے آخر میں ایک مجمل حوالہ بھی ملتا ہے:

" واما تفسیر قوله: فسبح باسم ربک فقد کور فی اول سبح اسم ربک الاعلیٰ "

دو حوالے اس طرح کے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً ایک سورۂ فاتحہ ہی میں ہے:

" سنذکرہ فی الاول سورة القیامة "

اور دوسرا سورۂ تین میں واقعۂ فیل کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ہے:

" علی ما یاتیک شرحة "

اسی طرح بے شمار حوالے موخر سورتوں میں ترتیباً مقدم سورتوں کے ملتے ہیں جن میں "قد تقدم" کے سے الفاظ پائے جاتے ہیں مثلاً

معارج میں ملک کا مدثر، اور دہر میں مزمل کا، تکویر، مطففین اور انشقاق میں قیامۃ کا، مطففین میں ہل اتیٰ (دہر) کا، بروج میں تکویر کا، بلد میں جن کا، عادیات میں انفطار اور غاشیہ کا، قارعہ میں معارج اور الحاقہ کا اور تکاثر میں ضحیٰ کا حوالہ ملتا ہے۔

ایسے ہی اس آخری حصے میں پہلی قسم کی سورتوں مثلاً فاتحہ، بقرہ، انعام، اعراف، کہف، انبیا، حج، مومنون، فرقان اور نمل کے حوالے بھی ملتے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محولہ سورہ کی تفسیر کے لیے پہلے لکھا جانا کوئی ضروری نہیں ہے۔

بہر حال یہ، اور اس طرح کے جو حوالے "قد تقدم" وغیرہ کے الفاظ سے ترتیباً مقدم صورتوں کے ترتیباً موخر سورتوں میں ملتے ہیں، وہ اس بات کی دلیل قاطع نہیں ہیں کہ حوالہ لکھے جانے کے آیندہ ارادے کے مطابق حوالہ دے دیا ہو اور پھر بعد میں اس کی تفسیر لکھی ہو جیساکہ ان جگہوں سے معلوم ہوتا ہے یا عمر کے وفا نہ کرنے کی وجہ سے تفسیر لکھنے کی نوبت نہ آئی ہو جیساکہ دوسری، چوتھی اور چھٹی قسم سے ظاہر ہے۔

اور اسی آخری قسم میں زمر، احقاف (قسم ثالث) کے بھی حوالے درج ہیں۔

ہمارا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ امام رازی نے معتاد اور معمول کے خلاف بلا ترتیب تفسیر لکھی ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ امام صاحب نے ایسا کیوں کیا تو یہ سوال ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اس لیے اس سے ہم تعرض نہیں کرنا چاہتے۔

<u>دوسرے جواب کا خلاصہ</u>: اس دوسری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل سے کتاب (تفسیر کبیر) کا وہ حصہ مراد ہے جو خود امام فخرالدین رازی نے لکھا تھا اور یہ اصل قرآن مجید کے ان حصوں کی تفسیر کو شامل ہے۔

۱۔ سورۂ فاتحہ (اوّل کتاب) سے لے کر سورۂ قصص کے آخر تک

۲۔ سورۂ صافات کے شروع سے سورۂ احقاف کی تفسیر کے آخر تک

۳۔ سورۂ حدید، مجادلہ اور حشر کی تفسیریں

۴۔ سورۂ ملک کی تفسیر سے لے کر کتاب کے آخر تک کی تفسیریں

ان حصوں کے علاوہ جو کچھ حصے تفسیر میں شامل ہیں وہ احمد بن خلیل خولی کی تصنیف ہیں اور یہ خولی کی طرف منسوب تکملے کا ایک جزء ہے کیونکہ اس کا تکملہ جیساکہ پہلے بتایا گیا تھا اصل کی تعلیق پر مشتمل ہے۔ ھذا ما ظھر لی واللہ اعلم۔

اعظم گڑھ

(معارف ۔ اگست ستمبر ۱۹۵۷ء)

حواشی

(۱) عیون الانباء ج ۲ ص ۲۹

(۲) عیون الانباء ج ۲ ص ۱۷۱

(۳) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۷۳

(۴) طبقات ابن سبکی ج ۵ ص ۳۵

(۵) شذرات الذہب ج ۶ ص ۷۵

(۶) شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۱

(۷) الدرر ج ۱ ص ۲۰۳

(۸) مضمون نگار نے یہاں دونوں کو مکمل کرنے والا لکھا ہے حالانکہ بعد میں چل کر ان کا خیال یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف خولی نے اسے مکمل کیا تھا۔ (مترجم)

(۹) تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۵۲۱

(۱۰) تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۳۱۵

(۱۱) ایضاً جلد ۵ ص ۳۳۸

(۱۲) ایضاً ج ۶ ص ۲۷۵

(۱۳) ایضاً ص ۳۰۴

(۱۴) ایضاً ص ۵۳۷

(۱۵) تفسیر کبیر ج ۵ ص ۲۸

(۱۶) ایضاً ص ۱۳۵

(۱۷) ایضاً ص ۳۹۹

(۱۸) ایضاً جلد ۶ ص ۳۱۵

(۱۹) ایضاً جلد ۵ ص ۳۱۷

(۱۹) ایضاً جلد ۲ ص ۶۲۰

(۲۱) تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۵۸۳

(۲۲) ایضاً جلد ۶ ص ۲۳۲

(۲۳) ایضاً ص ۳۷۵

(۲۴) تفسیر کبیر جلد ۵ ۰ ۱۸۲

(۲۵) تفسیر کبیر جلد ۵ ۰ ۲۵۵

(۲۶) ایضاً ج ۶ ۰ ۱۸

(۲۷) ایضاً ۰ ۱۳۳

(۲۸) تفسیر کبیر ج ۶ ۰ ۵۳

(۲۹) تفسیر کبیر ص ۱۳۷

(۳۰) ایضاً ۱۹۶

(۳۱) تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۲

(۳۲) ایضاً ص ۳۰

(۳۳) تفسیر کبیر جلد ۶ ص ۷۲

(۳۴) ایضاً ص ۷۶

(۳۵) تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۶۰۲

(۳۶) ایضاً ج ۶ ص ۲۳۳

(۳۷) ایضاً

(۳۸) مگر مضمون نگار نے اپنے اس وعدے کا ایفاء نہیں کیا۔ (مترجم)

(۳۹) تفسیر کبیر جلد ۶ ص ۵۸۶

(۳۲) تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۹۳

(۳۳) ایضاً ج ۲ ص ۵۹۲

(۳۴) ایضاً ج ۳ ص ۲۳۶

حبیب الرحمٰن اعظمی:

الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟

کتاب الذخائر والتحف تھوڑے دن ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مقدمے کے ساتھ چھپی ہے اور معارف کے دو نمبروں (اپریل و مئی ۱۹۶۰ء) میں اس پر مفصل تبصرہ قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کے قلم سے شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کے مصنف القاضی الرشید بن الزبیر کی نسبت مقدمے میں لکھا ہے کہ ان کا حال ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا۔ مگر کتاب کی اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قاضی اطہر صاحب مبارکپوری نے معارف (دسمبر ۶۰ء) میں اپنی تحقیق یہ لکھی ہے کہ القاضی الرشید بن الزبیر کا تفصیلی ذکر تاریخ ابن خلکان میں موجود ہے اور وہ پانچویں نہیں چھٹی صدی کے ایک جامع الفنون عالم تھے۔

قاضی صاحب کا یہ بیان حرف بحرف صحیح ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ القاضی الرشید کا تفصیلی ذکر ابن خلکان کے علاوہ یاقوت کی معجم الادبا، یافعی کی مرآۃ الجنان اور ابن العماد حنبلی کی شذرات الذہب وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا الذخائر والتحف ان ہی القاضی الرشید کی تصنیف ہے جن کا ذکر کتب مذکورۂ بالا میں ہے یا کسی دوسرے القاضی الرشید کی؟ قاضی اطہر صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو ان ہی کی تصنیف مانتے ہیں۔ قاضی صاحب کے اس خیال کی کیا بنیاد ہے اس کو انھوں نے ظاہر نہیں کیا اور نہ اپنے خیال کی تائید میں انھوں نے کوئی دلیل پیش کی۔

اس کے برخلاف ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ یہ کتاب ابن خلکان والے القاضی الرشید کی نہیں بلکہ ان کے دادا کی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیال کی تائید میں خود اس کتاب کی اندرونی شہادتیں پیش کی ہیں۔

یہ واقعہ ہے اور دونوں فاضلوں کو یہ حقیقت تسلیم بھی ہے کہ القاضی الرشید باپ، بیٹے، پوتے، تینوں کا لقب ہے۔ اس لیے جب کسی کتاب کی نسبت یہ لکھا ہوا پایا جائے کہ وہ القاضی الرشید کی ہے تو یہ تحقیق ضروری ہوجاتی ہے کہ وہ کس القاضی الرشید کی ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دیکھا جائے تذکرہ نویسوں نے کس کی تصنیفات میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے مگر یہ طریقہ سرسری ہے۔ علاوہ بریں یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر مصنف کا تذکرہ کتابوں میں دستیاب ہوجائے اور اگر دستیاب بھی ہوجائے تو ضروری نہیں کہ اس کی تمام تصنیفات کا ذکر بھی موجود ہو۔

اس سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود کتاب کا غائر مطالعہ کر کے ٹوہ لگائی جائے کہ یہ کس کی تصنیف ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے یہی کیا ہے اور وہ ایسا کرنے پر مجبور بھی تھے۔ اس لیے کہ اس وقت تک ان کو کسی القاضی الرشید کا تذکرہ کتابوں میں نہ مل سکا تھا، مگر اب پھر جب کہ ایک القاضی الرشید کا تذکرہ تاریخ ابن خلکان کے حوالے سے قاضی صاحب پیش کر چکے ہیں؛ ڈاکٹر صاحب اپنی اس رائے پر قائم ہیں کہ یہ کتاب ان کی نہیں ہے' اس لیے کہ وہ چھٹی صدی کے ہیں اور کتاب کی اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا مصنف پانچویں صدی میں تھا۔

اس بحث میں اپنی رائے ظاہر کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن تین شخصیتوں کا لقب القاضی الرشید بتایا گیا ہے وہ تینوں معروف ہیں۔ ایک تو وہی ابن خلکان والے القاضی الرشید ہیں جن کا نام احمد ہے، دوسرے ان کے والد علی ہیں، اور تیسرے ان کے دادا ابراہیم ہیں، ان دونوں کا تذکرہ ہمارے دونوں فاضلوں کو نہیں مل سکا ہے۔ حالانکہ ان دونوں کا ذکر الطالع السعید مطبوعہ مصر ۱۳۳۳ھ میں موجود ہے۔ علی کی نسبت یہ مذکور ہے کہ وہ فاضل، شاعر اور رئیس تھے اور ان کی وفات ۵۲۵ھ میں ہوئی ہے اور ابراہیم کی نسبت یہ مرقوم ہے کہ وہ ۴۰۴ھ میں اضلاع قوص کے حاکم تھے۔ رشید و مہذب ان کے پوتے تھے۔ ان کی وفات پر ابن النضر نے مرثیہ لکھا ہے۔ ابن النضر کا وہ قصیدہ مشہور ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ احمد اور علی کا زمانہ چھٹی صدی ہے اور ابراہیم کا زمانہ پانچویں صدی ہے

اب آیئے ان دلائل کا جائزہ لیجیے جن کی بناء پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے الذخائر

والتحف کی تصنیف کا زمانہ پانچویں صدی قرار دیا ہے

قاضی اطہر صاحب کے لکھنے کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے اپنے مدعا کے ثبوت میں الذخائر کی ایک یہ عبارت پیش کی ہے ۔ اھدی میخائیل سنۃ ۴۴۴ مع رسول لہ ھدایا جلیلۃ شاھدت جمیعھا بتنیس ۔ اس ثبوت پر قاضی صاحب نے یہ جرح کر دی ہے کہ " اس میں قاضی رشید کے ان ہدایا کے دیکھنے کی تاریخ نہیں ہے، بلکہ میخائیل کے ہدایا بھیجنے کی تاریخ ہے۔ قاضی صاحب کی یہ جرح بالکل صحیح ہے اور واقعۃ اس سے ڈاکٹر صاحب کا مدعا ثابت نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوسری عبارت یہ پیش کی ہے اخبرنی خطیر الملک عند ورودہ الی تنیس من الشام فی ذیقعدہ ۴۶۲ھ ان اقبال الدولۃ علی بن مجاھد اس پر قاضی صاحب نے یہ کلام کیا ہے کہ " اس میں خطیر الملک کے تنیس آنے کی تاریخ ہے، قاضی رشید سے واقعہ بیان کرنے کی تاریخ نہیں ہے "۔

اس مقام پر قاضی صاحب کے کلام کا آخری حصہ نہیں ہے، اس لیے کہ جب قاضی صاحب کو یہ تسلیم ہے کہ ۴۶۲ھ خطیر الملک کے تنیس آنے کی تاریخ ہے، اور قاضی رشید کا کہنا ہے کہ جب ۴۶۲ھ میں خطیر الملک تنیس آئے تھے اسی وقت انھوں نے مجھ سے بیان کیا تھا، تو لازمی طور پر وہ قاضی رشید سے واقعہ بیان کرنے کی بھی تاریخ ہوئی، اس کا انکار مکابرہ ہے۔

اس کے بعد قاضی صاحب کا یہ کہنا کہ " پھر یہ تاریخ بھی محلِ نظر ہے ... ... ہوسکتا ہے کہ سنہ کی تعیین کتاب میں غلط طریقے سے ہوگئی ہو یا بعد میں نقل کی غلطی ہو " محض اس مفروضے کی بناء پر ہے کہ الذخائر ۔ ابن خلکان والے قاضی رشید کی تصنیف ہے لہذا اگر کسی دلیل سے اس مفروضے کی صحت و واقعیت ثابت ہو تب تو قاضی صاحب کا یہ کلام موجہ ہے ورنہ بلاوجہ وجیہ تاریخ کو محلِ نظر اور مصنف یا ناقل کو خاطی قرار دینا بڑی زیادتی ہے۔

پھر تنہا یہی ایک مثال تو نہیں ہے، آگے اور مثالیں بھی آرہی ہیں جن میں اسی طرح پانچویں صدی کے ہی سنین مذکور ہیں ۔ تو قاضی صاحب کہاں کہاں تاریخ کے غلط اندراج کا دعوی کرتے پھریں گے، مثلاً ڈاکٹر صاحب ایک یہ عبارت پیش کرتے ہیں - اھدی الامیر ناصر الدولۃ ابو علی الحسن بن احمد الی فی ۴۴۳ھ الی ارمانوس اور اس کے بعد یہ عبارت پیش کرتے ہیں - اخبرنی ابو الفضل ابراھیم بن علی الکفر طابی بدمیاط عند قدومہ من قسطنطنیہ فی شھور سنۃ ۴۴۳ھ انہ رای علی ارمانوس۔

ان دونوں عبارتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناصر الدولہ نے ۴۶۳ھ میں ارمانوس کو ہدیہ بھیجا۔ اور ابوالفضل ابراہیم نے اس کو ارمانوس کے جسم پر دیکھا، یہ بات خود ابوالفضل نے مصنف کتاب سے اس وقت بیان کی جب وہ ۴۶۳ھ میں قسطنطنیہ سے دمیاط آئے تھے۔ فرمایئے کیا ان عبارتوں میں بھی قاضی صاحب تاریخ کے غلط اندراج کا دعویٰ کریں گے؟ اور اگر کریں گے تو یہ دعویٰ قابل قبول ہوسکے گا؟ جب کہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ ارمانوس پانچویں ہی صدی میں تھا۔ اور اس نے ٹھیک اسی سال ۴۶۳ھ ہی میں سلطان الپ ارسلان کے مقابلے میں نہایت ذلت آمیز شکست کھائی تھی۔

قاضی صاحب نے آخری عبارت پر ریمارک کرتے ہوئے پھر غور نہیں فرمایا اور یہ لکھ دیا کہ "اس میں ابوالفضل ابراہیم کے قسطنطنیہ سے دمیاط آنے کی تاریخ ہے۔ قاضی رشید سے واقعہ بیان کرنے کی تاریخ نہیں ہے۔" حالانکہ جب ۴۶۳ھ ابراہیم کے دمیاط آنے کی تاریخ ہے اور قاضی رشید تصریح کرتے ہیں کہ اسی موقع پر ابراہیم نے مجھ سے واقعہ بیان کیا۔ تو لامحالہ وہ واقعہ بیان کرنے کی بھی تاریخ ہوئی۔

پھر اسے بھی جانے دیجیے۔ یہ تو بلا اختلاف ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ارمانوس ۴۶۳ھ میں موجود تھا اور مصنفِ ذخائر تصریح کرتا ہے کہ ابو الفضل ابراہیم نے ارمانوس کو دیکھا ہے، بس وہ اس کے معاصر ہیں اور ان کا زمانہ بھی پانچویں صدی ہے۔ پھر مصنّف ذخائر کا بیان بھی ہے کہ ابوالفضل نے مجھ سے فلاں واقعہ بیان کیا۔ لہذا مصنّف ذخائر خود اپنے بیان کی رو سے ابوالفضل کا معاصر ثابت ہوا۔ اور محقق ہوگیا کہ اس کا زمانہ پانچویں صدی تھا۔

اسی طرح جب خزانۃ البنود والاقصر تاریخی شہادتوں کی رو سے ۴۵۸ھ میں تعمیر ہوا ہے اور مصنّفِ ذخائر یہ اظہار کرتا ہے کہ اس وقت (ذخائر کی تصنیف کے وقت) تک اس کی تعمیر کو سو برس سے زائد ہوچکے ہیں، تو اس سے لازمی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تالیف ۵۵۸ھ کے کچھ بعد ہوئی ہے۔

اور جب یہ بات ہے تو ضروری ہے کہ اس کا مصنّف پانچویں صدی کے اعیان میں ہو، اور ابن خلکان والا قاضی رشید پانچویں صدی کے بجائے چھٹی صدی کا فاضل ہے۔ اسی طرح اس کا باپ علی بن ابراہیم کا شمار بھی چھٹی صدی ہی کے فضلا میں ہے اور ہر چند کہ وہ پانچویں میں بھی موجود رہا ہوگا لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ ۴۵۸ھ کے لگ بھگ

اس کی عمر تصنیف و تالیف کی عمر ہو، ہاں ابن خلکان والے قاضی رشید کا دادا ابراہیم چونکہ ۴۶۲ھ میں ولایت قوص کا حاکم تھا اس لیے ۴۵۸ھ میں اس کی عمر تصنیف و تالیف کی عمر ہوسکتی ہے

بہرحال ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد ہمارے نزدیک ان ہی کی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے۔ اور ہمارا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ الذخائر والتحف ابن خلکان والے القاضی الرشید کی تصنیف نہیں ہے بلکہ وہ ان کے دادا القاضی الرشید ابراہیم کی تصنیف ہے، اور ہر چند کہ کسی مصنف کی یہ تصریح کہ الذخائر، القاضی الرشید ابراہیم کی تصنیف ہے ۔ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ تاہم کتاب کی اندرونی شہادتوں کے بعد کسی دوسرے قاضی الرشید کو اس کا مصنف قرار دینا ممکن نہیں ہے۔

پھر یہ بات مشترک الورود ہے ۔ اس لیے کہ مصنف نے القاضی الرشید احمد کی تالیفات میں بھی الذخائر والتحف کا نام نہیں لیا ہے، ہمارے علم میں ان کی تالیفات کی سب سے زیادہ تفصیل یاقوت نے دی ہے ۔ مگر یاقوت نے بھی اس کا نام نہیں لیا ہے، ہاں یاقوت کے یہاں احمد کی تالیفات میں ایک کتاب کا نام الھدایا والطرف ضرور پایا جاتا ہے، جو نام سے الذخائر والتحف ہی کی قسم کی کوئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ مگر قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ الذخائر والتحف ہی ہے۔ یاقوت یا یاقوت کے کسی پیشرو نے غلطی سے اس کا نام الھدایا والطرف ذکر کر دیا ہے، اس لیے کہ اس قطعی فیصلے سے مطبوعہ الذخائر والتحف کی اندرونی شہادتیں مانع ہیں، نیز ہوسکتا ہے کہ دادا کی تقلید میں پوتے نے بھی اسی موضوع پر کچھ زیادہ شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہو اور مزید اضافے کیے ہوں ۔

یہ بحث تو ختم ہوگئی ۔ مگر اسی ضمن میں دو تین باتیں اور ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ انشاء اللہ خالی از فائدہ نہ ہوں گی۔

۱۔ القاضی الرشید احمد کے دادا القاضی الرشید ابراہیم بھی قضا و حکومت کے ساتھ اہل علم و فضل کی نگاہوں میں بہت معزز و محترم تھے، چنانچہ ان کی وفات پر قاضی ابوالحسن بن النضر نے جو نہ صرف ادیب بلکہ عالم و فقیہ بھی تھے ۔ ایک زوردار مرثیہ لکھا تھا۔

۲۔ قاضی اطہر صاحب نے القاضی الرشید کا نسبی تعلق قبیلہ غسان سے بتایا ہے، اور کچھ شبہ نہیں کہ یاقوت (المتوفی ۶۲۶ھ) اور ابن خلکان (المتوفی ۶۸۱ھ) اور یافعی (المتوفی ۷۶۸ھ) نے ان کو الغسانی کی نسبت کے ساتھ ذکر کیا ہے، مگر جعفر بن ثعلب ادفوی (المتوفی ۷۴۸ھ) نے جو

تود علاقہ اسوان کے باشندے تھے۔ القاضی الرشید اور ان کے لڑکے ابراہیم بن احمد کو قرشی اسدی لکھا ہے۔ اور اس نسبت سے متبادر ہوتا ہے کہ القاضی الرشید اور ان کے اسلاف کو ابن الزبیر اس لیے کہتے تھے کہ وہ لوگ حضرت زبیر بن العوام قرشی اسدی کی اولاد سے تھے اور قاضی رشید کے سلسلہ نسب میں جن زبیر کا ذکر ہے۔ وہ حضرت زبیر بن العوام ہیں، اور وہ القاضی الرشید کی چھٹی پشت میں نہیں ہیں۔ جیسا کہ قاضی اطہر صاحب نے لکھا ہے۔ بلکہ اور اوپر ہیں، جیسا کہ القاضی الرشید کے بیٹے ابراہیم کے سلسلۂ نسب سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو بروایت ادفوی حسب ذیل ہے۔

ابراھیم بن احمد بن علی بن ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن فلیتہ

بن سعید بن ابراھیم بن حسین القرشی الاسدی

دیکھیے اس میں القاضی الرشید احمد کی چھٹی پشت میں فلیتہ کا نام ہے۔

بہرحال یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اگر القاضی الرشید قرشی اسدی ہیں تو یاقوت وغیرہ مورخین نے ان کو الغسانی کیوں کر لکھ دیا، اور اگر وہ غسانی ہیں تو ادفوی نے قرشی اسدی کس بنیاد پر لکھا ہے۔

۳۔ قاضی صاحب کی یہ تحقیق حرف بحرف درست ہے کہ القاضی المہذب اور القاضی الرشید ایک نہیں ہیں، جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے بلکہ دو شخص ہیں اور دونوں باہم حقیقی بھائی ہیں۔ قاضی اطہر صاحب نے اپنے مضمون میں قاضی مہذب کے ضمنی تذکرے پر اکتفا کیا ہے۔ اس لیے عرض کیا جاتا ہے کہ القاضی المہذب کا مستقل تفصیلی تذکرہ یاقوت نے معجم الادباء ص ۹۰ ج ۹ اور ادفوی نے الطالع السعید، اور یافعی نے مرآۃ الجنان ص ۳۰۳ ج ۳ اور ابن العماد حنبلی نے شذرات الذہب ص ۱۹۰ ج ۴ میں لکھا ہے۔

۴۔ مشہور و معروف کاتب ابن العماد اصفہانی شعبان ۵۶۲ھ میں وارد دمشق ہوتے ہیں۔ اس کے بعد قاضی رشید صرف چار مہینے زندہ رہے، اس لیے یہ تو صحیح ہے کہ قاضی رشید کی حیات میں ابن العماد دمشق پہنچ گئے تھے لیکن رشید کی زندگی میں ابن العماد کا نور الدین زنگی کے دربار سے متوسل ہونا محقق نہیں ہے۔ اور سلطان صلاح الدین کے ساتھ اس دور کے انقلابات میں ابن العماد کا حصہ لینا تو یقینی طور پر قاضی رشید کی وفات کے بعد ۵۷۰ھ کا قصہ ہے۔

۵۔ ابوالمعالی سعد بن علی بغدادی خطیری کی کتاب کا نام معارف (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں غلط چھپ

گیا ہے۔ اس کا صحیح اور پورا نام زینۃ الدھر و عصرۃ اھل العصر ہے۔ اور وہ باخرزی کی کتاب دمیۃ القصر کا ذیل ہے۔ اور باخرزی کی یہ کتاب ثعالبی کی یتیمۃ الدھر کا ذیل ہے۔ ابن العماد کاتب نے خطیری کی کتاب زینۃ الدھر کا ذیل خریدۃ العصر کے نام سے لکھا ہے۔ پھر خود اپنی کتاب خریدۃ کا ایک ذیل لکھا ہے۔ اسی کا نام کتاب السیل علی الذیل ہے۔ ابن العماد نے قاضی رشید کا ذکر کتاب السیل اور ذیل یعنی خریدۃ العصر دونوں میں کیا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کتاب السیل اور خریدۃ کے ذیل میں ذکر کیا ہے اس لیے کہ خریدہ کا ذیل تو خود کتاب السیل ہے۔

یہ چند سطریں صرف علم کی خدمت کے لیے لکھی گئی ہیں۔ کسی پر اعتراض یا تنقیص مقصود نہیں ہے۔ بالخصوص فاضل عزیز قاضی اطہر صاحب مبارکپوری سے میرے تعلقات کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ میرے معروضات کو ان پر اعتراض کی حیثیت دی جاسکے۔ مجھے جو بات صحیح سمجھ میں آئی اس کے اظہار میں محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے بھی میں معذرت خواہ ہوں۔

(معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۶۱ء)

حبیب الرحمن اعظمی:

مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے؟

عبداللطیف بن ملک یا ابن فرشتہ ایک مشہور مصنف اور نامور عالم ہیں، ان کی تصنیفات میں مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار کو بہت شہرت و مقبولیت حاصل ہے، یہ شرح .... استنبول سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کے سوا ان کی تصنیفات میں شرح مجمع البحرین فقہ میں، اور شرح منار اصول فقہ میں بھی بہت مستند اور علماء میں متداول رہی ہیں۔ مبارق الازہار کی نسبت قاضی سید نور الدین حسین صاحب نے معارف (جولائی ۴۹ء) میں اور ڈاکٹر سید باقر علی صاحب استاد شعبہ عربی اسمٰعیل کالج بمبئی نے معارف (اکتوبر ۵۰ء) میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ وہ ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے جو احمد آباد کے باشندے تھے۔ ان کے والد کا نام عبدالملک بنبانی تھا اور ان کی وفات ۹۱۵ھ میں ہوئی ان کے صاحبزادے بھی عالم تھے اور ان کا نام خلیل محمد عباسی تھا، یہ نیا انکشاف معیار تحقیق پر پورا اترتا تو یقیناً ہماری معلومات میں ایک بڑا اہم اضافہ ہوتا لیکن افسوس کہ تاریخی اعتبار سے وہ کسی طرح قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتا۔

فاضل مضمون نگاروں کے اس انکشاف کا مطلب اگر یہ ہے عبداللطیف بن ملک اور عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی دو شخص ہیں اور ان میں آخرالذکر مبارق کے مصنف ہیں تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس وہ تمام مصنفین جنھوں نے ابن فرشتہ کا حال لکھا ہے یا جنھوں نے مبارق الازہار کا ذکر کیا ہے سب اسکو عبداللطیف بن الملک کی تصنیف بتاتے ہیں ملاحظہ ہو، الضوء اللامع، الشقائق النعمانیہ، اعلام الاخیار، شذرات الذہب، فوائد بہیہ، اتحاف النبلاء، کشف الظنون اور مقدمہ شرح وقایہ وغیرہ بلکہ مبارق کے مصنف نے خود اپنے نام کی تصریح اس طرح کی ہے، و بعد فیقول العبد الضعیف العویز عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک، (مبارق جلد ۱ ص ۲)

اور اگر ان فاضل مقالہ نگاروں کی یہ مراد ہے کہ مبارق کے مصنف ابن فرشتہ ہی ہیں

مگر وہی عبدالملک بنبانی کے لڑکے اور احمد آباد کے باشندے ہیں ، تو گذارش ہے کہ اس وقت جو کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں ان میں سب سے پہلے ابن فرشتہ کا ذکر ہم کو الضوءاللامع میں ملتا ہے ، اس میں ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے: عبداللطیف بن عبدالعزیز بن امین الدین بن فرشتہ، سخاوی کے بعد طاشکبری زادہ نے الشقائق النعمانیہ میں اور ان کے بعد کفوی نے اعلام الاخیار میں اور ابن العماد نے شذرات الذہب میں اور ان کے بعد مولانا عبدالحی لکھنوی نے الفوائد البہیہ میں ان کا ذکر کیا ہے اور سب نے ان کے والد کا نام عبدالعزیز بتایا ہے، یا صرف عبداللطیف بن الملک لکھا ہے ان میں سے کسی نے ان کے والد کا نام عبدالملک نہیں بتایا ہے، اسی طرح ان کے دادا کا نام کسی نے محمود نہیں لکھا ہے، جیسا کہ ڈاکٹر صاحب معارف (اکتوبر ۵۰ء) میں لکھتے ہیں بلکہ سخاوی نے ان کے دادا کا نام امین الدّین بتایا ہے،

تیسری چیز یہ ہے کہ یہ سب مصنفین ان کو ابن ملک یا ابن فرشتہ لکھتے ہیں ۔ الضوء اللامع میں ان کا جو سلسلۂ نسب مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ ان کے پردادا کا نام تھا، مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے پر دادا کا نام خضر تھا،

چوتھی غور طلب اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ان کے ہندی یا بنبانی ہونے کا ذکر نہیں کرتا ، بلکہ طاش کبری زادہ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترکی کے باشندے تھے، لکھتے ہیں۔

کان رحمہ اللہ تعالی معلما للامیر محمد بن آیدین و کان مدرسا بمدینۃ تیرہ (۱)

(ترجمہ) وہ امیر محمد بن آیدین کے معلم اور شہر تیرہ میں مدرس تھے،

ان تمام امور کو سامنے رکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ معارف کے محترم مقالہ نگار حضرات کو اشتباہ ہوگیا ہے ، انھوں نے جن عبداللطیف کا ذکر کیا ہے ، وہ ابن فرشتہ اور شارح مشارق کے علاوہ کوئی اور بزرگ ہیں جن کے والد کا نام عبدالملک بنبانی تھا، وہ نسباً عباسی اور احمد آباد کے باشندے تھے، مگر غلط فہمی سے ان کو شارح مشارق تصور کرلیا گیا،

ہماری اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ معارف کے مقالہ نگار حضرات نے جن عبداللطیف کا ذکر کیا ہے ان کا سنہ وفات ۹۱۵ھ بتایا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دسویں صدی کے علماء میں ہیں ، اور عبداللطیف بن فرشتہ شارح مشارق دسویں صدی کے پیشتر کے عالم ہیں۔ سخاوی کا ان کا الضوء اللامع میں ذکر کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ انھوں نے

نویں صدی میں وفات پائی ہے،

یہ ہم جانتے ہیں کہ سخاوی نے اس کتاب میں بعض ایسے عالموں کا ذکر بھی کر دیا ہے کہ جن کی وفات دسویں صدی میں ہوئی ہے۔ مگر ان کا ذکر انھوں نے ایسے انداز میں کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ ابھی زندہ ہے اور اس کے برعکس ابن فرشتہ کا ذکر جس پیرائے میں کیا ہے[۱] اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی وفات ہو چکی ہے۔

اور طاش کبریٰ زادہ نے تو صاف صاف یہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ سلطان بایزید یلدرم کے عہد حکومت کے علماء میں تھے۔ اور سلطان بایزید یلدرم کا عہد حکومت ۷۹۱ھ سے ۸۰۵ھ تک تھا۔ اور جب وہ اس عہد میں عالم کی حیثیت میں تھے یعنی یہ کہ وہ اس وقت کم از کم بیس پچیس سال کے تھے تو یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ انھوں نے ۹۱۵ھ میں وفات پائی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ابن العماد نے شذرات الذہب میں تصریح کر دی ہے کہ ابن فرشتہ کی وفات تقریباً ۸۸۵ھ میں ہوئی ہے۔ (۲)۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ شرح مشارق مطبوعہ استنبول کے سرورق پر جو مصنف کا سال وفات ۹۰۷ھ لکھا ہے وہ بھی مصححین کا وہم ہو۔

حاصل یہ کہ مذکورہ دلائل و قرائن کی بناء پر ہمارے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی احمد آبادی کی طرف مبارق الازہار شرح مشارق الانوار کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ وہ عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک کی تصنیف ہے جو نہ بنبانی ہیں، نہ احمد آبادی، نہ ان کی وفات ۹۱۵ھ میں ہوئی۔ عبداللطیف احمد آبادی کوئی دوسرے بزرگ ہیں،

آخر میں معارف کے مقالہ نگار بزرگوں کو ایک اور بات کی طرف بھی متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں[۱] وہ یہ کہ ان حضرات نے عبداللطیف احمد آبادی کا جو سنہ وفات ذکر کیا ہے وہ بھی بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ ڈاکٹر صاحب، عبداللطیف کے والد عبدالملک بنبانی کی نسبت لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۹۷۰ھ کے قریب قریب انتقال کیا، اور یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ بیٹے کی وفات باپ سے ۵۵ برس پہلے ہوئی ہو۔ الاّ یہ کہ کسی محقق تذکرہ نویس نے اس کی موجہ تصریح کی ہو۔

بیٹے کے سنہ وفات کو صحیح قرار دینے کے لیے یہ احتمال بھی پیدا نہیں کیا جاسکتا کہ

باپ کے سنہ وفات میں ممکن ہو غلطی سے آٹھ کے بجاے نو لکھ گیا ہو، اس لیے کہ عبدالملک بنبانی کتب احادیث کی روایت جار اللہ بن عبدالعزیز مکی سے کرتے ہیں، جیسا کہ ان اسانید سے جو ڈاکٹر صاحب نے نقل کی ہیں ظاہر ہے اور جار اللہ بن عبدالعزیز کی وفات ۹۵۴ھ میں ہوئی ہے اور ولادت ۸۹۱ھ میں، پس اگر عبدالملک کا سال وفات ۸۰۰ھ قرار دیا جاے تو جار اللہ سے ان کا روایت کرنا ممکن نہیں، نیز جار اللہ نے ۹۰۹ھ میں اپنے والد سے کتب ستہ کی سماعت کی ہے، تو لازم ہے کہ عبدالملک نے ۹۰۹ھ کے بعد جار اللہ سے سماعت کی ہو، اس بنیاد پر ان کی وفات ۹۰۹ھ سے پہلے ممکن نہیں ہے۔

دراصل اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ قاضی سید نور الدّین حسین صاحب نے مبارق الازہار کا مصنّف ملک عبداللطیف داورالملک کو سمجھا، اور ان کا سال وفات ۹۱۵ھ لکھا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے عبداللطیف ابن عبدالملک بنبانی کو مبارق کا مصنف تصور کر کے یہ تخیل قائم کیا کہ یہ عبداللطیف وہی ملک عبداللطیف داور الملک ہیں، لہذا انھوں نے ان کا سنہ وفات بھی ۹۱۵ھ لکھ دیا۔ حالانکہ یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے، یہ دونوں دو عبداللطیف ہیں۔ عبداللطیف داورالملک کا شمار امراے سلطان محمود بیگڑہ میں ہے اور وہ حضرت شاہ عالم گجراتی کے مرید و خلیفہ ضرور تھے لیکن کسی نے ان کے مشغلۂ تدریس و تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے، نیز ان کا سال وفات بھی ۹۱۵ھ نہیں ہے بلکہ صاحب مرآۃ احمدی نے ۹۰۹ھ میں ان کی وفات بتائی ہے (۳)۔

پھر ان کے والد کا نام صاحب مرآۃ احمدی نے ملک محمود بتایا ہے، اور عبداللطیف بن عبدالملک بنبانی حضرت شاہ مقبول عالم گجراتی کے استاذ الاستاذ تھے، شاہ مقبول عالم کی ولادت ۹۸۹ھ میں اور وفات ۱۰۳۵ھ میں ہوئی ہے (۴)۔

ان دونوں علما کے علاوہ عبداللطیف بن ملک تیسرے بزرگ ہیں جن کی نسبت شوکانی نے بتصریح لکھا ہے۔

له تصانیف منها شرح المشارق — وکان من علماء الروم الموجودین فی ایام السلطان مراد۔ (۵)۔

(ترجمہ) ان کی متعدد تصنیفات ہیں، ان میں سے ایک شرح مشارق ہے، ...... اور وہ ایک رومی عالم تھے، سلطان مراد کے زمانے میں موجود تھے۔

(معارف اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۵۳ء)

حواشی

(۱) الشقائق النعمانیہ ص ۲۳

(۲) شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۳۲

(۳) مرآۃ احمدی ج ۲ ص ۲۳

(۴) ایضاً ص ۲۷

(۵) البدر الطالع ج ۱ ص ۳۷۳

ضیاء الدین اصلاحی:

عون المعبود کا مُصنّف کون ہے؟

غایۃ المقصود اور عون المعبود دونوں ابوداؤد شریف کی نہایت اہم اور مشہور شرحیں ہیں۔ اول الذکر کو مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادی نے ۳۲ جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ مگر اس کی اب تک صرف ایک ہی جلد دہلی کے مطبع انصاری سے شائع ہوئی ہے۔ مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد ادریس صاحب جن کی امانت میں مسوّدہ تھا، اس وقت مشرقی پاکستان میں مقیم ہیں اور اب علم و فن سے ان کا اشتغال باقی نہیں رہا، اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ بقیہ جلدوں کا مسودہ محفوظ رہا یا نہیں۔ تاہم اس کی ایک جلد جو شائع ہوئی ہے اس سے اس کی اہمیت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ اس کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے، جس میں امام ابو داؤد کے حالات اور سنن کے متعلق نہایت مفید معلومات درج ہیں۔ شرح کی اہمیت کے لیے مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کا یہ بیان نقل کر دینا کافی ہوگا۔

حتی رأیت جزأ واحداً من الشرح الذی الفه الشیخ ابو الطیب شمس الحق العظیمی بغایۃ المقصود فوجدت لکشف کنوزہ کافلا و بجمیع مخزوناته حافلا وللہ درہ قد بذل فیه وسعه وسعی سعیه (۱)

(ترجمہ) میں نے شیخ ابوالطیب شمس الحق کی شرح غایۃ المقصود کا ایک حصہ دیکھا تو وہ ابو داؤد کے اسرار و غوامض کے کشف و اظہار کے لیے کافی وشافی ہے۔ بخدا یہ خوب ہے، مصنف نے اس میں پوری کاوش کی ہے اور تلاش و جستجو کا حق ادا کر دیا ہے۔

عون المعبود:۔ یہ شرح چار جلدوں میں سنن ابو داؤد کے متن کے ساتھ مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے اور دراصل غایۃ المقصود کا خلاصہ اور مختصر ہے۔ زیادہ تفصیل و وضاحت کا اس میں اس لیے اہتمام نہیں کیا گیا ہے کہ ان مقاصد کے لیے مصنف کے پیش نظر غایۃ المقصود تھی، تاہم شرح کی اہمیت اور عظمت مسلّم ہے، مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی جیسے باکمال محدث نے اس کی چند جلدیں دیکھ کر اپنی تحسین و مسرّت کا اظہار جن الفاظ میں فرمایا تھا اسے عون

المعبود کے ناشر مولانا تلطف حسین کی زبانی سنیے۔

ہمارے استاذ مولانا سیّد نذیر حسین محدّث دہلوی کی زندگی میں عون المعبود کی تین جلدیں شائع ہوگئی تھیں، وہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے اور جب بھی انھیں ملاحظہ فرماتے تو طابع، ناشر، مصحح اور شارح ہر ایک کے لیے دعائے خیر فرماتے اور کہتے کہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے نسخۂ سنن کے ضائع ہوجانے کا مجھے جتنا غم تھا وہ سب اسے دیکھنے کے بعد ختم ہوگیا۔

ایک اشتباہ کا ازالہ۔ عام طور سے مشہور و معلوم یہ ہے کہ عون المعبود کے مؤلف اور شارح مولانا شمس الحق صاحب ڈیانوی ہیں، مولوی ابویحییٰ امام خاں نوشہروی نے علمائے حدیث کے سوانح، خدمات اور کارناموں کے متعلق جو کتاب لکھی ہے اگرچہ اس کی صرف ایک ہی جلد شائع ہوئی ہے اور اس میں علمائے بہار کا کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن جو علماء اپنے القاب سے مشہور ہیں ان کا کتاب کے شروع میں ذکر کرتے ہوئے مولانا شمس الحق صاحب کو صاحب عون المعبود کے لقب سے مشہور بتایا ہے۔موصوف نے علماء اہلحدیث کی خدمات کے عنوان سے ایک مقالہ آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کی فرمائش پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے اجلاس منعقدہ ۲۹ مارچ ۱۹۳۶ء کو علی گڑھ میں پڑھا تھا جو کتابی شکل میں بھی شائع ہوگیا ہے[۱] اس میں اور معارف جلد ۵۹ میں ہندوستان میں علم حدیث کے عنوان سے انھوں نے تین قسطوں میں جو مضمون لکھا تھا اس میں بھی مولانا شمس الحق صاحب کو عون المعبود کا شارح بتایا ہے، لیکن راقم کو امام ابو داؤد پر مضمون لکھنے کے سلسلے میں جب یہ شرح ذرا توجہ سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اس کے خطبے ہی سے معلوم ہوا کہ وہ ان کے بجائے ان کے برادر خورد مولانا اشرف الحق صاحب کی شرح ہے، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور صاحب معجم المطبوعات کے بیان سے بھی یہی پتا چلا۔

یہ معاملہ میرے لیے باعث حیرت تھا اس لیے میں نے مخدومی و محترمی جناب مولانا شاہ معین الدّین احمد صاحب ندوی سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے بھی تعجب کا اظہار فرماتے ہوئے مجھے اس کے متعلق چھان بین کر کے مستقل مضمون تحریر کرنے کا حکم دیا۔

اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اس معاملے کو خود اصل کتاب ہی کے ذریعے حل کیا جائے، اس کے دیباچے کی تصریح پہلے ذکر کی جاچکی ہے، اس کے بعد جلد اوّل کے خاتمے پر یہ

عبارت اس کا مزید ثبوت تھی ہے۔

اللھم تقبلہ منی واغفرلی ولوالدی ولاخی ابی الطیب الذی اعاننی علی اتمام ھذا الکتاب

(ترجمہ) خداوندا اس شرح کو میری جانب سے قبول کر اور مجھے میرے والدین اور میرے بھائی ابوالطیب کو جنھوں نے اس کتاب کی تکمیل میں میری مدد کی، بخشش (مغفرت) عطا فرما۔

دوسری جلد کے خاتمے میں پھر اسی مفہوم کی عبارت ہے

قال العبد الفقیر محمد اشرف ـــــ اللھم اغفرلی ولوالدی ولاخی ابی الطیب الذی اعاننی علی اتمام ھذا الجزء۔

(ترجمہ) بندہ محتاج محمد اشرف عرض کرتا ہے ..... بخش دے اللہ مجھ کو میرے والدین اور محترم بھائی۔ ابوالطیب کو جنھوں نے اس حصے کی تکمیل میں میری مدد کی' اپنی مغفرت سے سرفراز کر۔

ان تحریروں سے پورا یقین ہوگیا کہ عون المعبود کے شارح مولانا اشرف الحق صاحب ہیں اور مولانا شمس الحق صاحب کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کی بناء پر یہ ان کی جانب منسوب ہوگئی لیکن پھر بہت جلد یہ یقین شک و تذبذب میں تبدیل ہوگیا، جب تیسری جلد کے خاتمے پر یہ دیکھا کہ

قال العبد الضعیف ابو الطیب محمد بن امیر الشھیر بشمس الحق العظیم آبادی۔

(ترجمہ) بندہ ناچیز ابوالطیب محمد بن امیر شمس الحق عرض کرتا ہے

اور چوتھی جلد کے شروع ہی میں ملا کہ

وبعد فیقول العبد الضعیف ابو الطیب محمد الشھیر بشمس الحق -------

(ترجمہ) بندہ محتاج ابوالطیب محمد شمس الحق کی گذارش ہے

اور اس جلد کے خاتمے پر نظر آیا....... قال العبد الضعیف ابو الطیب محمد بن امیر الشھیر بشمس الحق العظیم آبادی

اسی طرح چوتھی جلد کی شرح اور تنبیہات کے بعد خاتمے میں یہ فقرہ ہے

قال العبد الضعیف ابو الطیب محمد بن امیر الشھیر بشمس الحق العظیم آبادی عفا اللہ عنہ۔ ھذا آخر الجزء الرابع من عون المعبود شرح سنن ابی داؤد تقبل اللہ منی وجعلہ ذخیرہ لیوم المعاد ووفقنی لاتمام الشرح الکبیر المسمی بغایۃ المقصود

(ترجمہ) بندہ ضعیف ابوالطیب محمد بن امیر شمس الحق عظیم آبادی عفا اللہ عنہ کہتا ہے .... یہ عون المعبود شرح ابی داؤد کا آخری اور چوتھا حصّہ ہے۔ بار الہا اسے میری جانب سے قبول کر اور اسے میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنا اور مجھے اس طویل شرح کی تکمیل کی توفیق عطا کر جس کا نام غایۃ المقصود ہے۔

ان تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شرح مولانا شمس الحق صاحب کی ہے یا کم از کم آخری دونوں جلدیں تو بالیقین ان ہی کی لکھی ہوئی ہیں، لیکن آگے چل کر مولانا تلطف حسین صاحب کے بیان سے جن کے اہتمام میں یہ سب جلدیں شائع ہوئی ہیں اور جو مولانا شمس الحق صاحب کے ہمعصر، ہم سبق اور بے تکلف دوست تھے، اس خیال کی بھی تردید ہوگئی۔ اور معلوم ہوا کہ اصل شارح تو صاحب غایۃ المقصود ہیں لیکن کئی اور علماء اس کی تکمیل میں ان کے معاون اور شریک کار رہے ہیں۔ ذیل میں مولانا تلطف حسین صاحب کے بیان کا خلاصہ تحریر کیا جاتا ہے۔

"مولانا شمس الحق صاحب کو شرح ابوداؤد لکھنے کا مبارک خیال مولانا سیّد نذیر حسین صاحب، دہلوی کی تلقین و ترغیب سے ہوا۔ انھوں نے سنن کے گیارہ نسخے جمع کیے اور ہر ایک کا تقابل کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اسی کو اصل بنیاد قرار دیا۔ ترمذی کی تحفۃ الاشراف، منذری کی تلخیص، امام خطابی کی معالم السنن اور ابن اثیر کی جامع الاصول وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھا اور اس کے بعد غایۃ المقصود لکھنا شروع کیا، مگر بعض وجوہ سے اسی درمیان میں ایک اور مختصر شرح لکھنے کا خیال ہوا تو عون المعبود کی تالیف شروع کی۔ اور چند ممتاز علماء کو اپنا معاون بنایا جنھوں نے متن اور معارضہ کی تصحیح اور شرح کی تالیف میں ہاتھ بٹایا اور مولانا نے ہر ایک سے حسب استعداد جو مناسب خدمت چاہی لی۔ ان علماء و داعیان کے اسماء گرامی یہ ہیں

۱۔ مولانا ابو عبدالرحمن شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی جو شارح کے چھوٹے بھائی ہیں۔

۲۔ مولانا عبدالرحمن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی جن کے متعلق مولوی ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے لکھا ہے "سنن ابی داؤد کی مشہور عربی شرح عون المعبود فی شرح ابی داؤد لمولانا شمس الحق ڈیانوی کے ادارے میں آپ بھی مصنف کے شریک تھے، اس جماعت میں قاضی یوسف حسین خان پوری ہزاروی اور مولوی محمد شاہجہانپوری بھی تھے مگر مولانا شمس الحق صاحب کو سب سے زیادہ اعتماد آپ پر تھا۔ موخر الذکر ہر دو اصحاب سے اگر سہو ہوجاتا

تو اس کی اصلاح شارح علیہ الرحمہ آپ سے کراتے (۱)"۔

اس بیان سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً عون المعبود کے حقیقی شارح مولانا شمس الحق صاحب ہیں معاونین اور شرکا۔ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب مصنف کے خاص دست راست تھے۔

۳۔ مولانا ابو عبداللہ محمد ادریس ڈیانوی جو مولانا کے صاحبزادے ہیں۔

۴۔ مولانا عبدالجبار بن نور احمد ڈیانوی جو مصنف کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے۔

مولانا تلطف حسین صاحب نے ان چار اشخاص کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے وغیرہم من اہل الفضل یعنی ان کے علاوہ بعض دوسرے اہل کمال بھی شرح کی تکمیل و تالیف میں مصنف کے معاون رہے ہیں، جیسا کہ مولوی ابو یحیٰی امام خاں نوشہروی نے دو اور ناموں کا ذکر کیا ہے

۵۔ مولانا یوسف حسین صاحب خانپوری جو مولانا محمد حسین صاحب کے فرزند ہیں اور عون المعبود پر ان کی تقریظ بھی ہے۔

۶۔ مولانا محمد شاہ جہاں پوری

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام حضرت بھی عون المعبود کی شرح و تالیف میں کسی نہ کسی حیثیت سے مصنف کے ساتھ شریک اور ان کے ایما۔ و اشارہ کے مطابق اس کام کو انجام دیتے رہے ہیں۔ مولانا تلطف حسین صاحب لکھتے ہیں۔

فانهم لتلوا بما امر به ابو الطيف الشارح و قاموا لخدمته ما كلف به آناء الليل و النهار

(ترجمہ) یہ تمام لوگ شارح عون المعبود مولانا شمس الحق صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے اور شب و روز اس خدمت کو انجام دیتے جو مولانا ان کے سپرد کرتے تھے۔

اس کے بعد چند تقریظیں آخر میں درج ہیں جن میں سے بعض میں تفصیل مذکور ہے اور بعض میں نہیں ہے لیکن سب سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عون المعبود مولانا شمس الحق صاحب کی شرح ہے۔

مقدمۂ تحفۃ الاحوذی میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری کے جو مختصر سوانح تحریر کیے گئے ہیں اس میں بھی اس کا ذکر ہے کہ انھوں نے چار سال تک مولانا شمس الحق صاحب کی خدمت میں رہ کر عون المعبود کی ترتیب و تالیف میں مدد دی ہے۔ اور شارح کو ان پر بڑا اعتماد و اعتبار تھا۔

مزید تحقیق و تفتیش کی غرض سے اس مسئلے کو موجودہ جماعت اہلحدیث کے ایک

ممتاز ترین اور مشہور عالم مولانا عبید اللہ صاحب مبارکپوری سے دریافت کیا گیا، انھوں نے بھی یہی فرمایا کہ اصلی شارح مولانا شمس الحق صاحب ہیں اور دوسرے حضرات ان کے معاون تھے اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری اپنی خاص استعداد و صلاحیت کی بنا پر مصنّف کے زیادہ معتمد تھے، اور خود مصنّف معاونین سے جو کچھ لکھاتے انھیں بغور دیکھ کر مناسب اصلاح و ترمیم کرتے تھے۔

اس کے علاوہ تلاش و تحقیق کے جو ممکن طریقے ہوسکتے تھے اختیار کیے گئے، مولانا محمد ادریس صاحب کا پتا معلوم کرنے کی پوری کوشش کی گئی لیکن نہیں معلوم ہوسکا، اس لیے اس معاملے میں ان سے استصواب نہیں کیا جاسکا۔

ان تنقیحات اور تحقیقات سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ مولانا شمس الحق صاحب عون المعبود کے اصل شارح ہیں جیسا کہ مشہور بھی ہے۔

۲۔ کتاب کے بعض حصوں پر نظر ڈالنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوّلین دو جلدیں مولانا کے چھوٹے بھائی اشرف صاحب نے اور آخری دونوں جلدیں انھوں نے خود تحریر فرمائی ہیں۔

۳۔ اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں کئی علما، جن کے اسما پہلے گذر چکے ہیں، مولانا شمس الحق صاحب کے معاون اور شریک کار تھے اور شارح و معاونین کی تحریر میں حسب ضرورت مناسب صلاح بتاتے تھے۔

۴۔ ایک اور احتمال یہ ہے کہ عون المعبود مکمل مولانا اشرف صاحب کی شرح ہے، مولانا خلیل احمد صاحب اور صاحب معجم المطبوعات نے یہی سمجھا ہے، لیکن خود شرح کی تصریحات اور مرحوم و موجود کئی علما کے اقوال سے جو اوپر گذرے ہیں اس کی پوری تردید ہوتی ہے، اس لیے یہ احتمال سرے سے پیدا ہوتا ہی نہیں۔

دوسرا احتمال بظاہر قوی معلوم ہوتا ہے، مگر جو لوگ کتاب کی ترتیب و تالیف اور اشاعت میں شریک اور دخیل رہے ہیں وہ اس کی مطلق تصریح نہیں کرتے اور یہ پورے دعوے اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا تلطف حسین صاحب سے زیادہ اس معاملے میں کسی کو واقفیت نہیں ہوسکتی، وہ مصنّف کے نہ صرف گہرے دوست اور ہم سبق ہیں، بلکہ کتاب کے ناشر اور اس کی تکمیل پر مصنّف کو برابر اکساتے اور آمادہ کرتے رہے ہیں، اور مولانا عبید اللہ صاحب کا بیان اصل میں مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری سے جو شریک تصنیف

تھے سنا ہوا ہے، اس لیے وہ بھی بہت اہم ہے۔ ان قطعی بیانوں کی موجودگی میں دوسرے احتمال کی کسی طرح گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کتاب کے کچھ حصے مولانا اشرف صاحب کے تحریر کردہ ہیں اور مولانا شمس الحق صاحب نے ان کی دلدہی اور برادرانہ شفقت کی وجہ سے ان کی جانب کچھ حصے منسوب ہوجانے کو ناپسند نہیں کیا۔

البتہ پہلا احتمال جو مشہور بھی ہے بالکل صحیح ہے، اور تیسرا احتمال بھی اپنی جگہ درست ہے کہ بعض اہل علم نے کتاب کی ترتیب و تبویب اور شرح و تالیف میں تعاون کیا ہے لیکن اس تعاون کی وجہ سے ان کی جانب کتاب منسوب نہیں کی جاسکتی اور دنیائے تصنیف و تالیف کا یہ ایک عام طریقہ ہے کہ اساتذہ اور شیوخ اپنے شاگردوں سے مواد، معلومات اور ماخذ جمع کراتے اور کتاب کی تالیف میں متعدد امور ان کے سپرد کر دیتے ہیں اور کچھ ابواب بھی ان سے لکھا لیتے ہیں، اور حسب ضرورت اس میں معمولی یا غیر معمولی ترمیم بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اصل کتاب اساتذہ کی جانب منسوب ہوتی ہے، اور اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

(معارف، اپریل ۱۹۶۱ء)

استاذ پول کروس:
اردو ترجمہ و تعارف: حافظ غلام مرتضیٰ

ابن المقفع کی جانب منسوب ارسطاطالیسی تراجم

عرض مترجم:-

[مندرجۂ ذیل مقالہ اصل میں استاذ پول کروس نے جرمنی زبان میں لکھا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمان بدوی نے اس کو مع چند دیگر مقالات کے عربی زبان میں ترجمہ کر کے "التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامی" کے نام سے شائع کیا۔ اب اسی مقالے کا اُردو ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ ڈاکٹر بدوی نے اس مقالے پر حسب ذیل نوٹ لکھا ہے۔

"یہ علمی بحث اس مقالے پر تبصرہ ہے جو استاد فرنشسکو جبرئیلی نے مولفات ابن المقفع کے عنوان سے لکھا تھا اور ۱۹۳۲ میں "مجلہ الدّراسات الشرقیہ" کی تیرہویں جلد میں صفحہ ۱۹۷ تا ۲۴۲ میں شائع ہوا تھا۔ اور یہ تبصرہ بھی ۱۹۳۳ء میں اسی رسالے کی چودھویں جلد میں "ابن المقفع کے متعلق کے عنوان سے صفحہ ۱-۲۱ میں شائع ہوا تھا اس کے دو حصے تھے ایک ارسطاطالیسی تراجم کے متعلق تھا ذیل کا مضمون اسی کا ترجمہ ہے، دوسرا حصہ باب برزویہ کے بارے میں تھا۔]

جبرئیلی نے ابن المقفع کے متعلق جو مبسوط مقالہ لکھا ہے اس میں اس مسئلے پر بحث ہے کہ یہ روایت ابن المقفع نے فارسی ادب کے دوسرے تراجم مثلاً کلیلہ و دمنہ اور خدائی نامہ وغیرہ کی طرح ارسطو کی مؤلفات کے کسی جزو کا بھی ترجمہ کیا ہے، کیا کسی صحیح بنیاد پر قائم ہے؟

اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ ابن المقفع کی تمام علمی کاوشیں ادبی حیثیت رکھتی ہیں مؤلف (جبرئیلی) کی رائے میں اس کا احتمال نہیں ہے کہ یہ نسبت صحیح ہو لیکن انھوں نے اس خیال کی تائید میں کوئی دلیل نہیں دی اور نہ ان اہم ملحوظات کی توجیہ کی ہے جو اس بارے

میں مسلمان مصنفین کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ جبرئیلی کے ملاحظات درج ذیل ہیں۔

"اس لیے ہم نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ابن المقفع سریانی زبان جانتا تھا جس میں عموماً یونانی فلسفے کے مختصرات اور تراجم لکھے جاتے تھے۔ رہا ان کتابوں کے پہلوی ترجموں کا وجود جیساکہ اس سے قبل فنرش نے گمان کیا تھا اور جس کی طرف عربی اور ایرانی تراجم نے بھی ہلکے اشارے کیے ہیں تو یہ ایسا مفروضہ ہے جس کی کافی شواہد سے تائید نہیں ہوتی"

صدیقی:- آگے چل کر معلوم ہو گا کہ جس سبب سے ارسطاطالیسی تراجم ابن المقفع کی جانب منسوب ہوتے ہیں وہ دراصل ایک غلطی ہے جس میں پچھلے اسلامی مؤرخین مبتلا ہو گئے ہیں۔

سب سے پہلا ماخذ جو ابن المقفع کے تراجم کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ صاعد اندلسی کی "طبقات الامم" ہے۔ چنانچہ اس کا مصنّف لکھتا ہے کہ:

"رہی منطق تو پہلا شخص جو اس حکومت (دولت عبّاسیہ) میں اس کام کے لیے مشہور ہوا وہ عبداللہ بن المقفع ایرانی خطیب ہے جو ابوجعفر منصور کا کاتب تھا اس نے ارسطو کی تینوں منطقی کتابوں کا جو منطق صوری میں ہیں ترجمہ کیا۔ ان کے نام کتاب قاطیغوریاس، کتاب بادی ارمیناس اور کتاب انولوطیقا ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانے تک پہلی کتاب کے سوا ارسطو کسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا اس طرح اس نے کتاب المنطق کے مقدمے کا ترجمہ کیا جو فرفوریوس الصوری کی ایسا غوجی کے نام سے مشہور ہے یہ ترجمہ سلیس اور ماخذ سے قریب عبارت میں ہے۔ ایک ہندی کتاب کا بھی جو کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔ ترجمہ کیا۔ یہ پہلی کتاب ہے جو فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی۔ ابن المقفع عمدہ کتابوں کا مصنّف بھی ہے جن میں رسالہ "فی الآداب" اور "السیاسۃ" مشہور ہیں اس کا ایک رسالہ "الیتیمۃ" بھی ہے۔ اس کا موضوع سلطان وقت کی اطاعت و فرماں برداری ہے"

متاخرین نے اس باب میں اس سے زیادہ نہیں کیا کہ طبقات الامم کی اس عبارت کو جوں کا توں نقل کر دیا مثلاً ابن القفطی نے تاریخ الحکما میں "عبداللہ بن المقفع" کے نام کے تحت تقریباً حرف بحرف نقل کیا ہے۔ اسی طرح ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانبا۔ (مطبوعہ قاہرہ ۱۸۸۲ء) کی جلد اول صفحہ ۳۰۸ پر "برزویہ" نام کے تحت یہی کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ صاعد نے یہ روایت کہاں سے لی۔ ابن ندیم کی الفہرست میں المقفع کے بارے میں ایک طویل فصل ہے جس میں مولف نے اس کے حالات و تالیفات کو بیان کیا ہے لیکن اس کی فلسفیانہ تصانیف کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ہے (ص ۱۱۸ مطبوعہ فلو گل) حالانکہ اس کا ذکر ہے کہ فارسی زبان سے ترجمہ کرنے والوں میں ایک ابن المقفع بھی تھا اور مترجمین میں سر فہرست اسی کا نام رکھا ہے۔

البتہ الفہرست میں ایک دوسرے مقام پر اس قسم کے بیانات ملتے ہیں جو پہلی نظر میں صاعد کے قول کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں مثلاً صفحہ ۲۴۸ و صفحہ ۲۴۹ میں ابن المقفع کا شمار ان لوگوں میں کیا گیا ہے جنھوں نے قاطیغوریاس اور باری ارمیناس کو مختصر کیا تھا۔ اس کی تائید جاحظ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو اس نے کتاب الحیوان (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۳) کی جلد اول صفحہ ۳۸ پر لکھا ہے۔ جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ اس واقعہ سے بہت ہی قریب زمانے میں تھا اس لیے وہ متاخرین ترجمہ کرنے والوں میں سے اکثروں سے ذاتی طور پر واقف رہا ہوگا۔ وہ ترجمے کے مسئلے کی تنقید اور یونانی زبان سے جو تراجم ہوئے ہیں ان کی قدر و قیمت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تراجم اصل تصانیف سے مستغنی نہیں کر سکتے کیونکہ اس صورت میں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ مترجم کی فہم و دانش اسی درجے کی ہے جو اصل مصنف کی تھی اور بھلا ابن البطریق ابن ناعمہ، ابوقرہ، ابن فہر، ابن دہیلی اور ابن المقفع رحمہم اللہ تعالیٰ ارسطالیس کے جیسے اور خالد افلاطون کے جیسے کہاں ہو سکتے ہیں۔"

یہاں جاحظ کے اقوال پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے اور اتنا ثابت کر دینا کافی ہے کہ ایک ایسی کتاب جو تیسری صدی ہجری کے نصف اوّل میں تصنیف ہوئی اس میں ابن المقفع کا ارسطو کے مترجم کی حیثیت سے ذکر ہے۔

ایسی صورت میں یہ سوال کہ "کیا جبرئیلی اپنے شکوک میں حق بجانب نہیں ہے۔" پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اس کا حل ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے اور الفہرست ہی اس راہ میں صحیح نشان دہی کرتی ہے۔ اس سے قبل ہم نے لکھا ہے کہ ابن ندیم نے اس فصل

میں جو اس نے عبداللہ ابن المقفع پر لکھی ہے یونانی تراجم کے باب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے حالانکہ یہ اہم مسئلہ ایسا نہ تھا جس کو ابن ندیم نظر انداز کرتا ۔ خصوصاً جب کہ اس نے دوسرے مقام پر بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس صورت میں اس کا بہت زیادہ احتمال ہے کہ اس فصل میں اس کا ذکر نہ کرنا اس کی دلیل ہو کہ وہ ارسطو کے مترجم اور ادیب مشہور کو ایک شخص نہ سمجھتا ہو۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ارسطو کی دو کتابوں (قاطیغوریاس اور باری ارمینیاس) کے مترجمین کی فہرست میں صرف "ابن المقفع" کا ذکر کرتا ہے ۔ نہ کہ "عبداللہ بن المقفع" کا۔ اس سے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ دونوں دو مختلف اشخاص اور آپس میں رشتہ دار تھے جن میں سے ہر ایک "المقفع" کے نام سے موسوم تھا جس طرح اس کے اسلاف موسوم تھے۔

یہ نظریہ ایک دوسرے طریقے سے باآسانی ثابت ہو جاتا ہے چنانچہ ایک نیا مگر بوسیدہ مخطوطہ جو سینٹ جوزف کالج بیروت کی لائبریری میں نمبر ۳۳۸ پر ہے جس کا کئی سال ہوئے فرالانی نے تفصیلی ذکر کیا ہے ایساغوجی ، قاطیغوریاس ، باری ارمینیاس اور انا لوطیقا کے عربی ترجمے پر مشتمل ہے جسے محمد بن عبداللہ المقفع نے کیا تھا اس سے اس مسئلے میں شک باقی نہیں رہ جاتا کہ یہ وہی مترجم ہے جس کی طرف الفہرست اور جاحظ نے اشارہ کیا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ محمد عبداللہ (بن) المقفع اس مشہور کاتب کے بیٹے کے سوا کوئی شخص نہ ہو کیونکہ دوسرے ماخذوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع کے واقعی ایک لڑکا تھا۔ جس کا نام محمد تھا چنانچہ الفہرست ص ۱۱۸ میں ہے کہ اسلام لانے سے قبل اس کی کنیت ابو عمر تھی بعد میں ابو محمد ہوئی اور ابن خلکان نے صراحتہً اس کے بیٹے محمد کا ذکر کیا ہے۔ البتہ ہم اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس روایت کو کہ عبداللہ بن المقفع منصور کا کاتب تھا ان لوگوں کے سوا اور کوئی بیان نہیں کرتا جو ارسطو کی کتابوں کے ترجموں کو اسکی جانب منسوب کرتے ہیں۔ میرا گمان غالب ہے کہ یہ روایت درحقیقت اس کے بیٹے محمد سے متعلق ہے کیونکہ عبداللہ بن المقفع نے جیساکہ جبرئیلی نے مقالۂ مذکور میں لکھا ہے کہ ۱۳۹ھ میں وفات پائی اس لیے یہ بہت ممکن ہے کہ یہ اس کا بیٹا ہو گا جو خلیفہ منصور المتوفی ۱۵۸ھ سے متوسل تھا۔

اب ہم اس چیز کی طرف رجوع کرتے ہیں جو بیروت کے مخطوطے میں درج ہے اور اس پر بحث کریں گے کہ اس کا مضمون اس کے عنوان کی تائید کرتا ہے یا نہیں ۔ اس بحث میں ہم فرالانی کے بیان پر اکتفا کریں گے۔

فرلانی کہتا ہے کہ جس چیز کی ہم کو تحقیق کرنا ہے وہ ارسطو کی مذکورہ بالا کتابوں کا ترجمہ نہیں بلکہ ان کی شرحوں کا مختصر خلاصہ ہے جو ابن ندیم کے اس بیان کے مطابق ہے کہ ابن المقفع نے صرف قاطیغوریاس اور باری ارمیناس کا خلاصہ کیا تھا۔ ابن ندیم کو یہ معلوم ہی تھا کہ زیر بحث مسئلہ ان کتابوں کا نہیں بلکہ ان کی شروح کا ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ارسطاطالیسی شرح کیا تھی جو بعد میں ظہور میں آئی کیونکہ فرلانی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اس کے زیادہ گہرے مطالعے اور موازنے میں مدد نہیں ملتی۔ خود فرلانی نے شرح المقولات کے مقدمے میں اس تقابل و تشابہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو شرح المقولات اور یحییٰ نحوی اور سرجیوس راس عینی کی شرحوں کے درمیان پایا جاتا ہے لیکن اس کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرفوریوس کی ایساغوجی کی شرح قدیم مترجمین کے طبقۂ متاخرین کے انداز پر کی گئی تھی یعنی پہلے فلسفے کے متعلق ایک عمومی مقدمہ ہے جس میں فلسفیانہ مصطلحات کی تعریف اور علموں کی تقسیم ہے پھر فرفوریوس کی کلیات خمسہ کی بحث ہے اب اگر مخطوطے کے جزء اوّل کے خاتمے پر یہ لکھا ہے کہ کتاب ایساغوجی ختم ہو گئی تو اس کے بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوتا کہ شرح کتاب ایساغوجی ختم ہو گئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یحییٰ نحوی کی شرح ایساغوجی اس جزو اول کی اساس ہو جو اب مفقود ہے لیکن جیساکہ بومشترک کا بیان ہے ایک زمانے میں سریانیوں اور عربوں میں اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

البتہ باری ارمیناس اور انالوطیقا کی شرحیں مکمل ہیں اور ہر شرح مخطوطے کے تقریباً ۱۳۲ اوراق پر مشتمل ہے اس کے مترجم کا نام محمد بن عبداللہ (بن) المقفع تحریر ہے اس کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ آیا منطق کی ان چاروں کتابوں کی شرحوں کی تلخیص یا ترجمے کی نسبت اس شخص کی جانب صحیح ہے جس کی جانب وہ منسوب ہیں، یا اس کو آگے چل کر کسی قدیم مترجم، مسئلہ زیر بحث میں محمد بن عبداللہ (بن) المقفع کی جانب، منسوب کر دیا گیا ہے۔ فرلانی کو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ نسبت صحیح ہے کیونکہ یہ بابت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کوئی متأخر نسبت کرنے والا اپنی جگر کاوی کو کسی مشہور مترجم یا کم از کم الفہرست کی مبہم عبارت کا لحاظ کرتے ہوئے، مشہور ادیب ابن المقفع ہی کی جانب منسوب کرنے کی بجائے محمد بن عبداللہ (بن) المقفع سے ایک بالکل غیر معروف شخص کی جانب منسوب کرے۔

نفس کتاب سے متعلق داخلی تنقید کے ذریعے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کتابیں جن سے مترجم نے پیش نظر مخطوطے میں اعتنا کیا ہے فرفوریوس کی ایساغوجی اور منطق ارسطو کی پہلی تین کتابیں ہیں۔ اور فرلانی کے بیانات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مخطوط پوری انا لوطیقا کی شرح پر مشتمل ہے یا نہیں، اور اس کو اتفاق پر محمول نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مایرہوف کی بحثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سریانی خانقاہوں کے مدارس ان چار کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب کی تعلیم یا تفسیر سے اعتنا نہیں کرتے تھے اور غالباً اس کی وجہ متأخرین اسکندرانیین کی تقلید تھی جس کا بڑا سبب مذہبی رواج تھا جیساکہ اس کے ماخذ (الفارابی) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکندریہ میں مصنفات ارسطو کی تدریس ایک مذہبی کونسل کی قرارداد کے مطابق صرف ان ہی کتابوں میں محدود کر دی گئی تھی اور یہ رواج فارابی کے زمانے تک باقی تھا۔ ارسطو سریانیوں کے یہاں بھی صرف منطق کا مصنف سمجھا جاتا تھا جس طرح قرون وسطیٰ کے لاطینی علماء کے یہاں سمجھا جاتا تھا۔ صرف مسلمانوں ہی نے اس ارض ممنوعہ میں داخل ہونے کی جرأت کی اور جو کچھ ارسطو نے لکھا اس میں سیاست کے سوا سب پر توجہ کی۔

یہ واقعہ اس عبارت سے پوری مطابقت رکھتا ہے جو ہمارے پیش نظر مخطوطے کے ورق نمبر ۲۵۵ پر خاتمہ کتاب کے طور پر مرقوم ہے (فرلانی ص ۲۱۲)

"تم کتاب انو لو طیقاولیس بعد من ہذہ الکتب الا کتاب افودالطیعی ولم یمتعامن استقرائہ الا ماقد مناقی صدر الکتاب جماعاراثینا کا فیا عن التفسیر"

فرلانی کا یہ خیال غلط ہے کہ "افودالطیعی" سے مراد ارسطو کی کتاب الطبیعہ ہے اس لیے اس کے بجائے "السمع الطبعی" ہونا چاہیے کیونکہ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ منطقی کتابوں کے سلسلے میں کتاب الطبیعہ کے ذکر کے کوئی معنی نہیں دوسرے کتاب الطبیعہ کا قدیم عربی نام "سمع الکیان" ہے نہ کہ "سمع الطبعی" یا اس کے مشابہ کوئی ایسا لفظ ہونا چاہیے جس کے معنی ارسطو کی التحلیل الثانی کے ہوں یہ اس لیے کہ اصل عبارت یہ ہے:۔

تم کتاب انو لو طیقاولیس بعدہ من ھذہ الکتب الا کتاب فود الطیعی ولم یمتعنا من استقرئہ (دیکھیے دوزی جلد

دوم ص ۱۳۲) الا ماقد قدمنا فی صدر الکتاب جماعا رائینا (
ممکن ہے کہ یہ رائناہ ہو) کا فیاعن التفسیر "

اس کا افسوس ہے کہ بیروت کے مخطوطے میں یہ مقدمہ محفوظ نہیں رہ گیا ورنہ اس میں ہم کو ضرور کتاب ابودیقطیقا کے استقراء سے اعراض کے اسباب مل جاتے۔ ممکن ہے کہ لفظ جماعا میں تحریف ہو۔ صحیح لفظ اجماعا" یعنی مذہبی کونسل کی قرار دادیا اس کے مانند کوئی اور چیز ہو۔ بہر حال یہ واقعہ کہ ہمارے پیش نظر مخطوطے میں صرف اورغانون کی پہلی تین کتابوں اور ایساغوجی کے بارے میں بحث ہے اس کا ثبوت ہے کہ جو کتاب ہمارے سامنے ہے وہ اس قدیم اسلوب کے قریب ہے جس اسلوب پر عہد اسلامی کی ارسطاطالیسی کتابیں تھیں۔

اصطلاحات کتاب کی بحث ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے اور فرلانی نے بھی اس مسئلے کی جانب متنبہ کیا ہے کہ مترجم نے پوری کتاب میں جوہر کے معنی کو لفظ " عین " سے تعبیر کیا ہے حالانکہ تمام فلسفیانہ تراجم میں اس کے بجائے فارسی لفظ " جوہر" ہے۔

یہ مسئلہ اس لیے اور بھی زیادہ اہم ہے کہ فلسفے کے علاوہ دوسرے اسلامی فنون خصوصاً علم کلام اور تصوف وغیرہ کی کتابوں میں لفظ " عین " کے بجائے " جوہر " (اور "ذات") کا استعمال ہوا ہے لیکن یہ اصطلاح بعد کی مترجمہ کتابوں اور ان اسلامی ارسطاطالیسی فلسفے کی کتابوں کی اصطلاح کے مقابلے میں جو ان کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہیں، نامانوس ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ " عین " اسلام میں فلسفیانہ تعلیمات کے عہد اوّل میں ایجاد ہوا۔ اس کے بعد لفظ " جوہر " نے اس کو نکال دیا۔

اسکے علاوہ شرح ایساغوجی کے ابتدائی کلمات جن کو فرلانی نے نقل کیا ہے مثلاً

" ان لکل صناعتہ متاع " (یعنی ہر فن کے لیے ایک متاع ہونا ضروری ہے)

ممکن ہے کسی متن کا لفظی ترجمہ ہوں مثلاً وہ عبارت جو شرح امونیوس میں کلّیات خمسہ کے الفاظ کے لیے استعمال کی گئی ہے جس کے ایک لفظ کا ترجمہ یہاں لفظ "متاع" سے کیا گیا ہے حالانکہ عربی میں اس اصطلاح کا ترجمہ لفظ " موضوع " سے کیا جاتا ہے اور تقسیم بھی قابل غور ہے جو مخطوطے کے گذشتہ صفحے میں موجود ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ تقسیم ہے:

۱۔ حکمتہ تبصر القلب و تفکرہ — وہ حکمت جو قلب کے تبصرّ و تفکرّ سے متعلق ہے

۲۔ حکمتہ حرکتہ القلب و قوتہ — وہ حکمت جو قلب کی حرکت اور اس قوّت سے متعلق ہے

ان دو قسموں سے مراد علوم نظریہ ہے اور علوم عملیہ ہیں اگر ہم پوری کتاب پر غائر نظر ڈالیں تو یونانی فلسفیانہ اصطلاحات کے ترجمے کے تغیرات اور ان کلمات کو جو بعد میں ان کی جگہ استعمال کیے گئے شرح وبسط سے بیان کر سکتے ہیں لیکن جن اصطلاحات کا ہم نے ذکر کیا وہ مخطوطے کی اس تاریخ کے تعین کی تائید کے لیے کافی ہیں۔ ہم نے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اگر مخطوطے کی اصطلاحات کی قدامت سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ یہ ترجمہ دوسرے تراجم کی طرح یونانی سریانی زبان سے نہیں بلکہ درمیانی زبان فارسی (پہلوی) سے کیا گیا ہے جیساکہ فرلانی کا خیال ہے کیونکہ یہ مسئلہ یونانی لفظ اوسیا (جس کے معنی جوہر ہیں کا ترجمہ فارسی لفظ جوہر سے نہیں بلکہ عربی لفظ "عین" سے کیا جاتا ہے۔ فرلانی کے خیال کے برعکس ثابت کرتا ہے۔ ہمارے پاس اس کا ایک اور ثبوت بھی ہے کہ محمد بن عبداللہ (بن) المقفع کے ترجمے (یا خلاصے) کی اصل یونانی ہے جسے ہم بعد میں بیان کریں گے۔

مخطوطے کی توقیع سے ان نتائج کی جن تک ہم پہنچ سکے ہیں ایک ایسے طریقے سے تائید ہوتی ہے جس کی ہمیں توقع بھی نہ تھی۔ اس کے لیے ہم محرف متن مطبوعہ فرلانی کو نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ضروری تصحیح کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

> "تمت کتب الثلاثۃ من ترجمۃ محمد بن عبداللہ المقفع و قد ترجمہا بعد محمد ابو نوح الکتاب النصرانی ثم ترجمہا بعد ابی نوح، سلمۃ الحرانی صاحب بیت الحکمۃ لیحییٰ بن خالد برمکی للبیث الاربعۃ کلہا قبل ھو۔ الا الترجمتین الذین تکساق الملکانی النصرانی"۔

اس عبارت میں پہلا اشکال "صاحب بیت الحکمۃ" کا فقرہ ہے گفتگو یہاں اورغانون کی پہلی کتابوں کے ان تراجم سے ہے جو محمد کے ترجمے کے بعد ابونوح اور سلم نے کیے تھے۔ ان دو مترجمین کے بارے میں ہم بعد میں بحث کریں گے یہاں پر اتنا اشارہ کردینا کافی ہے کہ وہ بیت الحکمۃ جس کا صدر سلم تھا اس کو مامون ہی نے قائم کیا تھا اس لیے یہ ناممکن ہے کہ اس نے ارسطو کی کتابوں کا جو ترجمہ کیا تھا وہ یحییٰ بن خالد برمکی کے لیے کیا ہو جس کا سال وفات زیادہ سے زیادہ ۱۹۰ھ (م۸۰۵ء) ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ "قبل ھو الا الترجمتین" کا فقرہ اس بات پر دلالت کرتا ہے یہاں بھی گفتگو محمد ہی کے ترجمے کے متعلق

ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ متن میں "یحییٰ" سے قبل لازمی طور پر نقص (Lacuna) ہو گا۔ اور اس نقص میں محمد بن عبداللہ (بن) المقفع ہی کے کاموں کے متعلق کوئی فقرہ ہو گا اس بنا پر متن کی تکمیل کے باب میں میرا میلان مندرجۂ ذیل اصلاح کی جانب ہے۔

" وقد ترجمہ محمد بن عبداللہ القفع لیحییٰ بن خالد البرمکی الکتب الاربعتہ کلھا "

لیکن یہاں پر ایک دوسری دقت اس عبارت کے آخری کلمات خصوصاً لفظ تکسانی کی وجہ سے ہے اس لیے لفظ " الذین " کے بعد ایک فعل ہونا چاہیے جس کا فاعل " المکانی القصرانی ہے اب یا وہ فعل تحریف شدہ لفظ " تکسانی " میں موجود ہے یا یہ لفظ اس المکانی کے تحریف شدہ نام یا اس کے کلیسائی عہدے کو ظاہر کرتا ہے اور فعل کاتب سے سہواً چھوٹ گیا ہے۔ یہ بات پہلی ہی نظر میں توقیع کی مذکورۂ بالا عبارت سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہمارے پیش نظر ایک ایسی پرانی تصنیف کا تذکرہ ہے (سلم کا مذکورہ بالا ترجمہ) جو لکھی تو مامون کے زمانے میں گئی مگر اس سے پہلے جب کندی اور حنین نے ان کتابوں کی تفسیر و تلخیص کی تھی ورنہ ان دونوں کے نام ضرور مذکور ہوتے اور یہ توقیع ہم کو اسلام میں ارسطاطالیسی تقالید پر نظر ڈالنے کا موقع دیتی ہے جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہ تھا۔

قرلانی نے محمد بن عبداللہ (بن) المقفع کے ساتھ دوسرے دو مترجمین کی شخصیتوں کے بارے میں تحقیق کی زحمت نہیں گوارا کی حالانکہ ان کے متعلق ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ سلم جس کا لقب " صاحب بیت الحکمت " ہے وہ مامون کا ہمعصر تھا اس کے متعلق الفہرست صفحہ ۱۲۰ میں ہے کہ سہل بن ہارون سے جو اپنے زمانے کا مشہور کاتب اور مامون کے خزانۃ الحکمۃ کا مہتمم تھا اس کے گہرے تعلقات تھے۔ وہ مترجم تھا اور خاص طور پر فارسی عربی میں ترجمہ کرتا تھا۔ غالباً اس سے مراد اقتباسات ہیں جو اس نے کلیہ ودمنہ سے تیار کیے تھے جیسا کہ الفہرست کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ الفہرست ص ۲۴۳ اور ابن ابی صبیعہ جلد اوّل ص ۱۸۰ میں بھی ہے کہ اس کو دوسرے علماء کے ساتھ یونانی مصنفین کی کتابوں کی تلاش کے لیے قسطنطنیہ بھیجا گیا تھا اسی طرح الفہرست ص ۲۶۸ اور ابن القفطی ص ۹۸ میں ہے کہ اس مترجم کو مجسطی سے ایک قدیم ترجمہ کی اصلاح کا کام بھی سپرد کیا گیا تھا اور استینشنیڈ جو اس کو (سلم کو) مترجم سلام الابرص سمجھتا ہے اس کا یہ خیال غلط ہے وہ حران کا باشندہ تھا اس کا علم ہمیں صرف

اسی توقیع سے حاصل ہوتا ہے جو ہمارے مخطوطے کے خاتمے پر ثبت ہے۔

وہ شخص جو ارسطو کی کتابوں کے مترجمین میں سلم سے پہلے گذرا ہے۔ اس توقیع کی رو سے ابو نوح الکاتب النصرانی تھا اس کی شخصیت کو ہم یقینی طور پر متعین کر سکتے ہیں کیونکہ جاثلیق طیماثاوس اوّل متوفی ۸۲۳ء جسے خلیفہ مہدی اور ہارون رشید کے درباروں میں بڑا مرتبہ حاصل تھا اور جس کو خلیفہ نے ارسطو کی کتابوں کے عربی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا تھا وہ اکثر اپنے رسائل میں جن میں سے ۵۸ رسالے اب بھی محفوظ ہیں ان تراجم کا ذکر کرتا ہے اور یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ان تراجم میں ابو نوح نے اس کو مدد دی چنانچہ اس خط میں جو اس نے قسیس فثیون کو بھیجا تھا (مجموعہ رسائل کا نمبر ۴۳) ارسطو کی کتاب طوبیقا کے عربی ترجمے کا ایک خاص طرز سے ذکر کیا ہے۔ اس کا وہ حصہ جو اس ترجمے سے متعلق ہے یہ ہے:

- خلیفہ - نے ہم کو ارسطو فلسفی کی کتاب بوطیقا کو سریانی زبان سے عربی ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور بفضل خدا اس کام کو شیخ ابو نوح نے انجام دیا میں نے اس حصے میں جو سریانی زبان سے متعلق تھا کسی قدر اس کی مدد کی وہ خود سریانی اور عربی دونوں میں خاص مہارت رکھتا ہے ممکن ہے کسی نے پہلے بھی اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا ہو (ہم نے اس سے قبل بھی تم کو اس کے متعلق لکھا تھا اس سلسلے میں جو واقعات پیش آئے ان کی خبر دی تھی) لیکن یہ ترجمہ خلیفہ کی نظر سے نہیں گزرا اور یہ تراجم نہ صرف لفظی بلکہ معنوی حیثیت سے بھی سقیم ہیں ایک تو موضوع کی دشواری کی وجہ سے دوسرے مترجمین کی کم علمی کی وجہ سے۔

رسائل طیماثاوس میں دوسرے مقامات پر بھی ابو نوح کا تذکرہ ملتا ہے اور اسمانی نے عمر بن متی طربانی کی کتاب تاریخ البطارقہ پر اعتماد کرکے اس کے متعلق بعض دوسری چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے اس کا نام اور زیادہ متعین ہو جاتا ہے مثلاً اس کے نام کے ساتھ انباری لکھا ہے اور یہ بھی تحریر ہے کہ وہ موسیٰ بن مصعب والی موصل کا کاتب تھا اس کا مقابلہ اس کے لقب کاتب نصرانی سے کیجیے جو بیروت کے مخطوطے کی توقیع میں موجود ہے اور تعلیم میں طیماثاوس کا ہم سبق اور اس کا دوست بھی تھا اس نے ۷۷۹ء میں اس کے جاثلیق منتخب ہونے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں ایک چیز یہ بھی قابل غور ہے کہ عبدالیشوع نے اس کی کتابوں کی فہرست میں ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جو قرآن مجید کی تردید میں ہے (شرابجادی قرآن) لیکن ہمارے نزدیک یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ وہ وہی ابو نوح بن الصلت ہے جس کو الفہرست نے ص ۲۴۴ میں یونانی زبان کے مترجمین کے زمرے میں ذکر کیا ہے۔

ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے ارسطو کی کتابوں کے مختلف تراجم کے متعلق جو کچھ توقیع میں مذکور ہے وہ بالکل صحیح ہے اور محمد بن عبداللہ (ابن) المقفع نے خلیفہ مہدی یا ہادی کے عہد خلافت میں اورغانون کی کتابوں کا یحیی بن خالد کے لیے خلاصہ اور ترجمہ کیا اور نصرانی کاتب ابو نوح ہارون رشید کا معاصر تھا لیکن سلم جو بیت الحکمۃ کا مہتم تھا اس نے ایک مدت کے بعد مامون کے عہد خلافت میں اس کا کام کو انجام دیا توقیع میں ایک ایسی قیمتی روایت ہے جس میں تاریخ اسلام میں قدیم ترین ارسطاطالیسی تراجم کا پتا چلتا ہے ان تراجم کی تاریخ کے لیے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مترجم اوّل نے سریانیوں کے طریقے کے مطابق اورغانون کی صرف پہلی تین کتابوں کا ترجمہ کیا لیکن ابونوح اور طیماثاوس کے زمانے میں دوسری کتابوں کا بھی ترجمہ ہوا جیساکہ ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں یا کم از کم اس کے کچھ حصوں خصوصاً کتاب بوطیقا کا ترجمہ ہوا اور اس کے ساتھ ابودیقطیقا کتاب الخطابہ اور کتاب الشعر کا بھی ترجمہ کیا گیا پھر فلسفہ ارسطو سے واقفیت کا دائرہ منطقی کتابوں کے علاوہ مامون ہی کے عہد میں وسیع ہوا۔ ممکن ہے سلم پرانے طبقے سے تعلق رکھتا ہو لیکن ترجمے کی وہ تحریک جس کا علمبردار حنین بن اسحاق تھا اور جس کا سلسلہ بھی چوتھی صدی کے نصف آخر میں یحیی بن عدی اور ابن زرعہ تک قائم رہا اسی تحریک نے ارسطو کی جملہ تصانیف کو مسلمانوں کے لیے فراہم کیا۔

رہا یہ سوال کہ محمد بن عبداللہ (ابن) المقفع کا ترجمہ یا خلاصہ سریانی زبان سے ہوا یا یونانی سے تو اسکے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے اس مقصد کے لیے پورے مخطوطے پر غائر نظر ڈالنا ضروری ہے طیماثاوس نے اپنے مقدم الذکر رسالے میں ارسطو کی کتاب بوطیقا کے ان قدیم تراجم کے بارے میں جو بلا واسطہ یونانی زبان سے کیے جو کچھ لکھا ہے اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے تو میرے نزدیک اس کا امکان ہے کہ محمد نے سریانی ترجمے کے وسیلے یا براہ راست اصل یونانی سے ترجمہ کیا ہو

بہرحال اس بحث سے ہم جن نتائج تک پہنچے ہیں کہ مسلمانوں کی علمی تاریخ کے اعتبار سے انکی بہت بڑی اہمیت ہے کیونکہ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ارسطاطالیسی کتابیں قطعی فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ نہیں کی گئیں جیساکہ اکثر لوگوں کا خیال ہے اور اس کا سبب ابن المقفع کی جانب منسوب ایک روایت ہے جس کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی نیز یہ کہ تاریخ اسلام میں ارسطاطالیسی تراجم کی پہلی منزل جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا اس

مغرب (سریانی قوم اور اہل اسکندریہ) کے ارسطاطالیسی تصانیف کی ساتھ اعتنا سے کوئی علیحدہ چیز سمجھنے کا امکان نہیں اور یہ چیز اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب اس کو ہم ملحوظ رکھیں کہ اہل فارس کا اثر ریاضی اور علم الافلاک میں برابر قائم رہا جیساکہ نلینو اور اسکا نے ثابت کیا ہے۔ اسی طرح اسلام کے ابتدائی زمانے میں علم طب پر بھی مشرق کا اثر پڑا اور طب بندی جو اس وقت فارس کے بڑے بڑے مدارس میں چھائی ہوئی تھی قریب قریب اس میں ضم ہو گئی۔

با ایں ہمہ ان چیزوں میں یونان کا ترکہ اس درجہ قوی اور مستحکم تھا کہ اس نے تقریباً تمام مشرقی عناصر کو ان سے نکال پھینکا اور یہ چیز تیسری صدی کے اختتام سے پہلے تک ۔۔ تھی۔ جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے اس پر مشرق کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔ یہ ممکن ہے ۔سطو اور افلاطون کی تصانیف نوشیرواں کے لیے فارسی زبان میں ترجمہ ہوئی ہوں جیساکہ جیاس کا بیان ہے گو یہ روایت اس کے علاوہ کسی اور ذریعے سے ثابت نہیں ہوئی' البتہ یہ ثابت ہے کہ اسلام سے قبل جندیسا بور اور ایران کے دوسرے شہروں میں طب کے اعلیٰ مدارس میں فارسی زبان میں فلسفے کی تعلیم ہوتی تھی۔ ممکن ہے فلسفیانہ اصطلاحات مثلاً یونانی لفظ اوسیا کے لیے جوہر کا لفظ ان ہی مدارس نے وضع کیا ہو۔ لیکن یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ یونانی فلاسفہ کی کتابوں میں سے کوئی بھی کتاب فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ نہیں کی گئی۔

(رسالہ معارف ماہ مارچ ۱۹۵۰ء اعظم گڑھ)

سید محمد مطیع اللہ راشدی برہانپوری:

مجمع البحار پر تحقیقی نظر

[اس مقالے میں مجمع البحار و مجمع البحار الانوار کے ناموں اور ان کے مصنفوں کے ناموں سے متعلق التباسات کو دور کیا گیا ہے۔]

اس کتاب کے متعلق مختلف تذکروں میں ایسے بیانات ملتے ہیں جن کے مطالعے سے گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی، علامہ محمد طاہر پٹنی کے ذکر میں تحریر فرماتے ہیں۔

۱۔ و در علم حدیث تالیف مفیدہ جمع کرد ازانجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح است مسمّی بہ مجمع البحار و رسالہ دیگر الخ (اخبار الاخیار صفحہ ۲۸۰ سنہ مصنف ۹۹۹ھ)

خلاصہ:۔ مجمع البحار صحاح ستہ کی شرح ہے اور اسکے مصنف ہیں محمد طاہر رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ مولانا غوثی حسن گلزار ابرار میں حضرت شیخ طاہر سندھی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"بہت سی تصانیف صفحہ روزگار پر یادگار چھوڑ کر ملک تقدس کو روانہ ہوئے منجملہ تصانیف مذکورہ کے ایک تفسیر مجمع البحار ہے جو بالکل لطائف قشیری کے اسلوب پر طائفہ صوفیہ قدس سرہم کے نکات اور ارشادات کو حاوی ہے (صفحہ ۲۴،)

ایک روز اس تفسیر کے اجزاء دریائے کشف و شہود کے مستغرق شیخ لشکر محمد عارف شطاری قدس سرہ کی نظر سے گذرے تو بہت خوش ہوئے فرمایا اس رنگین کتاب کا مصنف اپنی حسنات کی جزاء کا اندازہ شاید قیامت کے روز ہی کر سکے گا کیونکہ یہ اندازہ آج کے روز ان حسنات کی کیفیت بیان کرنے سے نہیں ہو سکتا" (ص ۲۳۲ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار)

خلاصہ: مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے اس کو حضرت شیخ لشکر عارف باللہ نے مطالعہ فرما کر بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا اُس کے مصنف حضرت شیخ طاہر سندھی ہیں

۳۔ یہی مولانا غوثی اسی کتاب میں حضرت شیخ محمد بن طاہر نہروالہ کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

حدیث میں شیخ علی متقی کے شاگرد ہیں۔ اس فن میں ایک بے نظیر کمال حاصل کیا تھا۔ مجمع البحار نام ایک مشکل کشا شرح احادیث کی صحاح ستہ پر جو ہے وہ آپ کے قلم تالیف کی لکھی ہوئی ہے (اذکار ابرار۔ ۳۹۲)۔

خلاصہ: مجمع البحار احادیث صحاح ستہ کی مشکل کشا شرح ہے اور اس کے مصنف شیخ محمد ہیں جو شیخ طاہر نہروالہ کے فرزند تھے۔

۴۔ مورخ سندھ علی شیر قانع تتوی تحفۃ الکرام میں مجدالدین مولانا طاہر قدس سرہ کے ذکر میں قمطراز ہیں:

و در علم حدیث توالیف مفید جمع کرد از انجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح ستہ مسمی بہ مجمع البحار و رسالہ دیگر۔ (تحفۃ الکرام ج اول ص ۷۷)

خلاصہ: یہ عبارت اخبار الاخیار کی لفظ بلفظ نقل ہے البتہ عنوان میں مجمع البحار کے مصنف کا نام مجدالدین مولانا طاہر لکھا ہے۔

۵۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ماثر الکرام میں شیخ محمد بن طاہر الفتنی قدس سرہ تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں: توالیف مفیدہ وارد مثل البحار اور غریب الحدیث الخ (ماثر الکرام ص ۱۹۴)

خلاصہ: مجمع البحار کا نفس مضمون غرایب الحدیث ہے اور اسکے مصنف شیخ محمد بن طاہر الفتنی (پٹنی) ہیں۔

۶۔ مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں تحریر فرماتے ہیں (تذکرۂ شیخ محمد طاہر گجراتی میں): و درعلم حدیث توالیف مفید جمع کرداز انجملہ کتابے است کہ متکفل صحاح است مسمی مجمع البحار و رسالۂ دیگر الخ (خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۴۳۶)

خلاصہ: یہ بھی اخبار الاخیار کی نقل ہے۔ مفہوم یہی ہے کہ مجمع البحار صحاح ستہ حدیث شریف کی شرح ہے اور مصنف شیخ محمد طاہر گجراتی ہیں۔

۷۔ تاریخ الاولیاء اردو میں دو جگہ تھوڑے تغیر کے ساتھ شیخ محمد طاہر گجراتی قدس سرہ اور علامہ محمد طاہر پٹنی محدث رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں یہ عبارتیں ملتی ہیں:

محدّث بے بدل مفسّر بے عدیل فقیہ لاثانی تھے اور مکہ میں شیخ علی متقی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور پھر اپنے وطن کی جانب آکر تمام بدعات کو ملک گجرات سے دور کیا۔ تصانیف آپ کی متکفل شرح صحابہ (کذا) مسمی مجمع البحار الخ (تاریخ الاولیاء ص ۲۴۳ ج ۲)

۸۔ شیخ محمد طاہر پٹنی محدّث رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں۔

شیخ برخوردار سندی و شیخ اجل علی ابن حسام الدّین متّقی سے فیض کثیرہ حاصل کیا بڑے متّقی، پرہیزگار، صاحب تصانیف کثیرہ ہیں چنانچہ مجمع البحار تذکرہ موضوعات وغیرہ (تاریخ الاولیاء ص ۲۰مج)

خلاصہ۔ پہلی عبارت شرح صحابہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے، شرح صحاح ہونا چاہیے دوسری عبارت میں مصنّف تو ملا محمد طاہر پٹنی محدّث کو بتایا گیا ہے لیکن تصنیف کے موضوع کا ذکر نہیں کیا گیا۔

۹۔ حضرت مولوی خلیل الرحمٰن برہان پوری نے تاریخ برہانپور میں حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کے سلسلے میں منجملہ دیگر ناموں کے شیخ محمد طاہر پٹنی مصنّف کتاب مجمع البحار (صفحہ ۱۵۵) کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجمع البحار کے مصنّف حضرت شیخ محمد طاہر پٹنی ہیں۔ مجمع البحار کس موضوع پر ہے۔ یہ نہیں لکھا۔

اسی کتاب میں حضرت مولانا شیخ قاسم (سندھی) رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں تاریخ الاولیاء کے حوالے سے لکھا ہے کہ

وہ (شیخ قاسم) فرزند مولانا سندھی برہانپوری کے اور بھائی شیخ محمد پٹنی صاحب مجمع البحار کے تھے۔ حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہ خلف الصدق حضرت شیخ محمد قاسم کے ہیں (تاریخ برہانپور ص ۱۲۶ طبع ثانی مطبوعہ کوثر پرلیس برہان پور)

اس عبارت میں کاتب کی فروگذاشت ہے یا مصنّف کا سہو نظر۔ مسیح الاولیاء کے چچا شیخ طاہر سندھی تھے۔ یہاں پٹنی کے بجائے سندھی ہونا چاہیے۔

مذکورۂ بالا اقتباسات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

مجمع البحار نام کی دو کتابیں ہیں۔ ایک قرآن مجید کی تفسیر، دوسری شرح صحاح ستہ۔ اوّل الذکر تفسیر مجمع البحار کے مصنّف شیخ طاہر سندھی ہیں اور دوسری مجمع البحار شرح صحاح کے مصنّف شیخ محمد طاہر پٹنی یا شیخ محمد طاہر گجراتی یا ملّا محمد طاہر پٹنی اور بقول بعض شیخ محمد بن طاہر

نہروالہ یا شیخ محمد بن طاہر الفتنی ہیں۔

اب ہر ایک مجمع البحار کے متعلق مذکورۂ بالا تذکروں سے مزید صراحت پیش کیجاتی ہے۔

تفسیر مجمع البحار کا ذکر صرف مولانا غوثی حسن نے ہی اپنی کتاب گلزار ابرار میں کیا ہے ان کے سوا مذکورہ تذکرہ نگاروں میں کسی نے بھی نہ تفسیر مجمع البحار کا ذکر کیا ہے اور نہ اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر محدث سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا۔

مولانا غوثی نے تفسیر کو دیکھا ہے۔ اس کا مختصر نمونہ بھی گلزار میں نقل کیا ہے، مصنف کی خدمت میں انھیں نیاز بھی حاصل تھا اور وہ آپ کی فیض رساں مجلسوں میں باریابی کا شرف بھی اکثر و بیشتر حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے تفسیر مجمع البحار کے متعلق خاص بات یہ لکھی ہے کہ اگر اس کی علمی اہمیت کے پیش نظر عادلشاہ فاروقی (راجہ علی خاں) نے بڑی منت اور معقول سفارشوں کے ذریعے خواہش کی تھی کہ اس وقیع تصنیف کے کسی گوشے میں میرا نام درج ہو جائے تو میرے لیے باعث عظمت دارین ہوگا آپ نے یہ استدعا قبول کی اور ایک مزید خطبے کا اضافہ فرما دیا کیونکہ یہ تصنیف برار میں شروع ہو چکی تھی۔

محدث اپنے میزبان طفال خاں کے نام ایک خطبہ ابتدائے کتاب میں لکھ چکے تھے۔ اس لیے یہ دوسرا خطبہ شاہ فاروقی کی استدعا پر منسلک فرمایا علامہ غوثی نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں لکھا ہے:

> فرمانروائے صوبہ (خاندیس) علی عادل شاہ فاروقی نے مولانا حسین شیرازی کو جو حکمت کے فنون اور عقلی علوم میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے اور ندیم خاص جلال خاں براری کو جن کو رسمی علوم میں دستگاہ تھی مصنف (شیخ طاہر سندھی) کی خدمت میں بھیجا تھا اور التماس کی تھی کہ اگر اس پاسبان خلائق کا عہد اس کتاب میں درج کر دیا جائے تو غایت درجہ عنایت ہوگی۔ آپ نے یہ التماس قبول فرمائی اس وجہ سے کتاب ہذا کا خطبہ دو طرح پر واقع ہوا ہے (اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۲۳۴)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کا نمونہ یہاں نقل کر دیا جائے۔ اگرچہ علامہ غوثی نے کتاب میں تطویل سے بچنے اور اختصار ملحوظ رکھنے کا جگہ جگہ اظہار کیا ہے، پھر بھی صرف ایک آیت کی تفسیر قریب ۵۰ صفحات کے نصف کالم میں لکھی ہے۔ (اقتباس حذف کیا جاتا ہے)۔

اس بلند پایہ اور اہم تفسیر کی جانب سے تذکرہ نگاروں کی بے اعتنائی یا عدم دسترس

پر حیرت ہے اگر علامہ غوثی نے اس معرکۃ آلآرا تصنیف اور اس کے مصنف سے دلچسپی نہ لی ہوتی تو آج تفسیر کا نمونہ تو کیا نام بھی کسی کو نہ معلوم ہوتا۔ اور سندھ کے ایک فاضل اجل کا یہ کارنامہ نسیاً و منسیاً ہو کر رہ جاتا۔

حضرت مسیح الاولیاء نے جو شیخ طاہر محدث کے بھتیجے ہیں اپنی عربی تفسیر انوار الاسرار میں جگہ جگہ تفسیر مجمع البحار کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہے کہ مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے اور اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر سندھی ہیں۔ اس تفسیر کی تاریخ تصنیف کا علم نہ ہو سکا لیکن یہ یقینی ہے کہ دسویں صدی ہجری کے آخری عشرے میں بمقام برہان پور تکمیل کو پہنچی۔

مذکورۂ بالا مباحث سے یہ ثابت ہو گیا کہ مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے اور اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر سندھی ہیں۔

اب مجمع البحار شرح صحاح ستہ اور اس کے مصنف کی جانب توجہ مبذول فرمائیے۔ مصنف کے نام میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف قابل غور ہے مذکورہ تذکروں میں اخبار الاخیار ۹۹۹ھ سب سے مقدم کتاب ہے۔ اس کے مصنف حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مصنف مجمع البحار کے ہمعصر ہیں، انھوں نے کتاب کا نام مجمع البحار اور مصنف کا نام شیخ محمد طاہر لکھا ہے۔ اخبار الاخیار اس قدر مقبول رہی ہے کہ عہد طباعت سے قبل اس کی بے شمار نقلیں تیار ہونے کی شہادتیں ملتی ہیں اور طباعت عام ہوتے ہی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، زیر نظر نسخہ مطبع مجتبائی دہلی کا مطبوعہ ہے جو ۱۳۳۲ھ میں طبع ہوا ہے۔ ترقیمے کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب مختلف مطابع میں کئی بار چھاپی گئی تھی۔ اس میں بکثرت اغلاط ہیں۔ مطبع مجتبائی کے علم دوست کار پردازوں نے کئی نسخے مطبوعہ قدیم و جدید بہم پہنچا کر ان کی مدد سے دو سال کی محنت میں تصحیح کر کے اس نسخے کو طبع کیا۔ اصل عبارت یہ ہے۔

> الحمدللہ والمنۃ کہ دریں ایام سعادت فرجام کتاب اخبار الاخیار مصنفہ عالم و فاضل یگانہ مولانا عبدالحق محدث قدس سرہ کہ در تحقیق روایات و تدقیق معانی و مبانی بے نظیر و عدیم المثال است و بارہا در مطابع مختلفہ مطبوع شدہ ہدیہ ناظرین اولی الابصار گردیدہ اما از مر کثرت اغلاط ہیچگاہ طبع شائقین نمی آسود دریں ولا بفرمائش بعض احباب حسب الحکم جناب والد ماجد مدظلہم العالی مصححین ماہرین علم و فن چندیں نسخ مطبوعہ قدیم و جدید جمع فرمودہ تصحیح اغلاطش پرداختند و در

صرف وقت و محنت دو سال ازیں عہدہ برآمدند بحمداللہ کہ اکنوں بہ تصحیح تام در مطبع مجتبائی زیور حسن اہتمام دربر کشید الخ (ص ۴۹۳)

میں نے یہ عبارت اس لیے نقل کر دی ہے کہ اس کے مطبوعہ نسخوں کے غلط ہونے کی شہادت ملتی ہے اور اس مصحح نسخے میں بھی بعض غلطیاں ہیں۔

یہ شبہہ میں نے اس لیے ظاہر کیا ہے کہ علامہ غوثی بھی مصنف مجمع البحار شارح صحاح کے ہمعصر ہیں ان کی کتاب گلزار ابرار میں اسماء الرجال کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے منسلک ہے۔ ط کے باب میں صرف شیخ طاہر سندھی کا نام درج ہے۔ شیخ طاہر پٹنی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ م کے باب میں شیخ محمد بن طاہر موجود ہے۔ اس صورت میں سہو کتابت کا گمان نہیں کیا جا سکتا اور قرین قیاس یہی ہے کہ مصنف کا نام محمد بن طاہر ہو گا۔ ایک اور دلیل:

علامہ آزاد بلگرامی نے بھی مصنف کا نام محمد بن طاہر لکھا ہے ان کی عبارت اخبارالاخیار ہی کا اقتباس معلوم ہوتی ہے یا پھر ان کی نگاہ سے گلزار ابرار کا فارسی نسخہ گذرا ہو گا۔ علامہ آزاد کا ماخذ کوئی بھی نسخہ رہا ہو یہ دوسری شہادت ہے کہ مصنف کا نام محمد بن طاہر ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہر تذکرے میں محمد طاہر یا محمد طاہر شیخ درج ہے طاہر تنہا یا شیخ طاہر کسی نے نہیں لکھا۔ کسی بھی نام کے ساتھ برکت یا محض زینت کے لیے لفظ محمد کا اضافہ ہمارے زمانے میں شروع ہوا ہے۔ دسویں صدی ہجری تک اس قسم کی کوئی مثال میری نگاہ سے نہیں گذری۔ اس لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ مصنف کا نام محمد بن طاہر ہونا چاہیے۔

آخر میں زیر بحث کتاب مجمع البحار شرح صحاح کے نام پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے جس کا نام تمام تذکرہ نگاروں نے مجمع البحار لکھا ہے لیکن اس کتاب کا نام مجمع البحار نہیں بلکہ مجمع بحار الانوار ہے۔ یہ کتاب چھپ تو گئی ہے لیکن جہاں تک مجھے علم ہو سکا ایک ہی بار چھپی، دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی۔ پیش نظر نسخہ منشی نولکشور کے مطبع کا چھپا ہوا ہے، اس کی لوح (ٹائیٹل) کی عبارت یہ ہے۔

الحمدللہ الذی ھدانالھذاوماکنا لنھتدی لولا ان ھدانااللہ ہذاکتاب مبارک جامع لکشف مطالب الآیات وایضاح معانی کتاب اللہ واحادیث رسولہ المختار

مجمع بحار الانوار

فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار تالیف الفاضل الورع الماہر شمس المفاخر مولانا الشیخ محمد طاہر افاض اللہ علینا من برکاتہ طبع فی المطبع العالی منشی نولکشور ذی المعالی

کتاب عربی زبان میں ہے اور پاکیزہ خط نسخ میں تحریر ہے۔ ٹائیٹل کی عبارت بھی نسخ میں ہے اور کتاب کا نام دیدہ زیب طغرا میں تحریر ہے جو صاف اور بلا اشتباہ مجمع بحار الانوار پڑھا جاتا ہے۔

خاتمہ یا ترقیمہ میں بھی اسی نام کا اعادہ کیا گیا ہے جس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں

تم بحمداللہ وحسن توفیقہ الثلث الاول من مجمع البحار الانوار فی غرایب التنزیل ولطایف الاخبار فی العشرین من شہر المبارک رمضان ضاعف اللہ قدرۃ وضاعف اجرمن عظمۃ البلدالمسمی بالفتن صانہااللہ عن الفتن۔

ان فقروں سے ظاہر ہے کہ کتاب کا نام مجمع بحارالانوار ہے۔ رہا یہ کہ تمام تذکرہ نگاروں نے مجمع البحار کیوں لکھا ہے اس کی مختلف تاویلیں کی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلا تذکرہ جس میں اس کتاب اور مصنف کا ذکر ملتا ہے، اخبارالاخیار ہے اس کا قلمی نسخہ میری نگاہ سے نہیں گذرا۔ یہ کتاب عرصۂ دراز سے چھپ رہی ہے اور کئی اشاعتیں چھپ چکی ہیں جن میں مرورایام اور متواتر کاتبوں کی لاپروائی سے بڑی غلطیاں ہیں۔ ممکن ہے زیر بحث کتاب کے نام میں بھی اسی سلسلے میں سہو ہوگیا جو بعد میں متداول ہو گیا۔ یا پہلی اشاعت جس قلمی نسخے سے کی گئی ہے اس میں سہو کتابت سے مجمع بحارالانوار کے بجائے مجمع البحار درج ہو گیا ہو اور بعد میں یہی غلط نام رائج ہو گیا ہو۔

گلزار ابرار کے ترجمے اذکار ابرار میں بھی شرح صحاح ستہ کا نام مجمع البحار ہی لکھا ہے مگر گلزار ابرار کا فارسی نسخہ کمیاب بلکہ نایاب ہے اس کا اردو ترجمہ ہی متعارف و متداول ہے۔ یہی اشتباہ یہاں بھی ہوتا ہے کہ مترجم یا کاتب نے سہواً نام میں تبدیلی کر دی ہوگی۔

اندازہ ہوتا ہے کہ شرح صحاح کا ذکر کرنے والوں میں سے کسی نے بھی اصل کتاب کو نہیں دیکھا ہے۔ اس کی تعارفی شہرت کی بنا پر اس کا مختصراً ذکر درج کر دیا کیونکہ اخبارالاخیار اور گلزار ابرار میں اس کی کسی عبارت کی نقل یا اقتباس درج نہیں ہے اور نہ کسی

نے اس کو بچشم خود دیکھنے کے متعلق اشارہ کیا ہے۔

میں ان تحریروں کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دونوں کتابیں ہمنام نہیں بلکہ دونوں کے جدا جدا دو نام ہیں ا۔ مجمع البحار تفسیر ۲۔ مجمع بحار الانوار شرح صحاح ستہ۔

مجمع البحار قرآن مجید کی عربی زبان میں صوفیانہ و عارفانہ تفسیر ہے اور اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر محدث سندھی ہیں۔

مجمع بحارالانوار عربی زبان میں صحاح ستہ کی (مشکل کشا) شرح ہے اور اس کے مصنف حضرت شیخ محمد طاہر یا محمد بن طاہر پٹنی ہیں بلکہ محمد بن طاہر ہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

(معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۵ء)

ڈاکٹر حفیظ قتیل:

معراج العاشقین کا مصنّف

(تلخیص)

["معراج العاشقین کا مصنف" کے نام سے ڈاکٹر حفیظ قتیل (شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی) کی کتاب ۱۹۶۸ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی تھی، اس کی ضخامت ۱۰۰ صفحات ہے۔ یہ غلط انتسابات کی تحقیق کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس موضوع پر اولاً ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے مقالے میں اجمالاً اظہار خیال کیا تھا جس سے استفادے کا اعتراف مصنف نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔ ذیل میں اس کتاب کی تلخیص پیش کی جاتی ہے تاکہ منسوبات کی تحقیق سے متعلق ان کے اختیار کردہ طریقے کی نشان دہی ہوجائے۔ نجم الاسلام]

کتاب کی تلخیص

۱۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے معراج العاشقین کے غلط انتساب کی اشاعت کے ذمے دار مولوی عبدالحق ہیں۔ مولوی عبدالحق نے حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب رسالۂ معراج العاشقین کو دو قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے ۱۳۴۳ھ میں شائع کیا۔ ان نسخوں میں سے ایک نسخہ ان کے ذاتی کتب خانے میں تھا۔ دوسرا نسخہ انھیں ڈاکٹر محمد قاسم ناظم سمیات کے کتب خانے میں ملا۔ مولوی صاحب کی عبارت سے پتا نہیں چلتا کہ ان کے ذاتی نسخے کا نام کیا تھا۔ البتہ ڈاکٹر محمد قاسم کے نسخے کا نام معراج العاشقین تھا۔ اس نسخے کے نام کے بارے میں بھی شبہے کی گنجائش ہے اس لیے کہ مولوی صاحب نے نام قوسین میں لکھا ہے۔ رسالے کا نام واضح طور پر لکھا ہوتا تو نام کو قوسین میں لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ (ص ۱)

۲۔ ڈاکٹر محمد قاسم کے نسخے کے آخر میں صراحت تھی کہ یہ نسخہ اس قدیم نسخے کی نقل ہے جو ۹۰۶ھ

میں کتابت کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ "اس سے مجھے بہت کچھ اطمینان ہوا اور ایک حد تک اس بات کا یقین ہوگیا کہ یہ حضرت بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے، زبان بھی قدیم ہے۔ اس کے علاوہ عشق نامے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ..... اس میں حضرت کی تصانیف معراج العاشقین اور ہدایت نامے کا کئی جگہ تذکرہ آیا ہے۔

نہ جانے مولوی صاحب کو محض اس بنا پر کیسے یقین ہوگیا کہ یہ حضرت بندہ نواز ہی کی تصنیف ہے۔ زبان کی قدامت بھی اس رسالے کو بندہ نواز سے منسوب کرنے کی وجہ نہیں ہوسکتی۔ راقم الحروف (ڈاکٹر حفیظ قتیل) کو ممکنہ سعی کے باوجود محمد عبداللہ کی تصنیف عشق نامہ دستیاب نہ ہوسکی۔ عشق نامے کے مصنّف نے خواجہ صاحب کی جس تصنیف معراج العاشقین کا ذکر (ممکنہ طور پر) کیا (ہوگا)، گمان غالب یہ ہے کہ یہ رسالہ فارسی میں ہوگا۔ اگر یہ ہندی میں ہوتا تو عشق نامے کا مصنّف ضرور اس کی وضاحت کرتا اور مولوی عبدالحق خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کرتے۔ (ص ۳۲)

۳۔ مولوی عبدالحق نے اس رسالے کے متن پر غور نہیں فرمایا، اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ انھیں علم تصوف سے کچھ زیادہ دل چسپی نہیں تھی ..... مولوی صاحب کے اس رسالے کی عبارت کے نہ سمجھنے کی متعدد شہادتیں ملتی ہیں۔

(الف) رسالے کے آغاز ہی میں عبارت بے ربط ہو کر رہ گئی ہے، جس کے باعث مفہوم خبط ہوگیا ہے اور مولوی صاحب نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا ..... (ص ۶)

(ب) جگہ جگہ ایسے الفاظ، تراکیب اور فقرے نقل ہوئے ہیں جن کا کوئی مفہوم واضح نہیں ہوتا، مثلاً "ہم حال پر حال ہووے"۔ (ص ۷)

(ج) مولوی صاحب نے متن میں جو خط فاصل استعمال کیے ہیں وہ خود ان کی متن نافہمی پر دلالت کرتے ہیں ... مولوی صاحب نے ایسے ہر جملے کے مبتدا کے بعد خط فاصل لگا کر خبر کو دوسرے جملے سے ملا دیا ہے۔ اس لیے تمام ایسے جملے مہمل ہو کر رہ گئے ہیں۔ متن میں ایک جگہ تک -دں بد بوئی نہ لینا کے بعد زبان سوں بدبوئی نہ لینا لکھا ہے۔ زبان کا کام بولنا ہے، اس لیے یہ لفظ "بد بولنا" ہوگا۔ (ص ۷)

(د) جن بنیادوں پر مولوی صاحب نے معراج العاشقین کو خواجہ صاحب سے منسوب کیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس رسالے کی زبان کو قدیم سمجھتے ہیں .... چوں کہ متن کی بے ربطی، جملوں کے الجھاؤ اور مسائل کے اشکال کے باعث مولوی صاحب اس

رسالے کے متن کو سمجھنے سے قاصر رہے، خصوصاً جو انوکھی اصطلاحیں اس رسالے میں استعمال ہوئی ہیں ان کا سمجھنا اس مخصوص تصوف کے جانے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لیے مولوی صاحب نے سمجھ لیا کہ زبان بہت قدیم ہے یعنی قدامت کی وجہ سے ناقابل فہم ہے۔ حالانکہ رسالے میں جہاں عبارت درست ہے زبان پر قدامت کا گمان نہیں ہوتا۔ (ص ۸)

۴۔ مولوی عبدالحق کے شائع کردہ رسالۂ معراج العاشقین میں پانچ عناصر اور پانچ گُنوں کا جو تصوف پیش کیا گیا ہے، وہ عام تصوف سے مختلف ہے۔ دکھنی مخطوطات کے ذخائر میں نظم و نثر کے بکثرت رسائل ایسے ملتے ہیں جن میں اس مخصوص تصوف کو بیان کیا گیا ہے۔ ان سب رسائل میں وہی بیجاپور کا مخصوص تصوف بیان کیا گیا ہے۔ بیجاپوری تصوف کے اس قلمی سرمائے میں مخدوم شاہ حسینی بلکا نوری کے تین رسالے ہیں: رسالہ "الف" اس کا صرف ایک نسخہ موسومہ تلاوت الوجود مکتوبہ ۱۲۱۹ھ آغاز حیدر حسن کے کتب خانے میں ملا۔ "رسالہ ب" نسبتہً مختصر ہے، اس رسالے کے نسخے دس مختلف ناموں سے پائے جاتے ہیں۔ "رسالہ ج" ایک نہایت مختصر رسالہ ہے۔ اس کے تین نام ہیں۔ تلاوت الوجود ان میں مشترک ہے۔ تلاوت الوجود یعنی مطالعہ وجود جس کو بیجاپوری سلسلۂ چشتیہ میں پانچ عناصر پچیس گُن کے مطالعے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رسالہ ج معراج العاشقین اور اس کے مصنف کی تحقیق کے سلسلے میں زیر بحث نہیں آتا۔ صرف رسالۂ الف اور رسالۂ ب ہمارے کام کے ہیں اس لیے کہ معراج العاشقین کا تعلق انھی رسائل سے ہے۔ رسالہ الف اور رسالہ ب کے تقابل سے پتا چلتا ہے کہ مخدوم شاہ حسینی نے رسالہ الف پہلے لکھا، اس کے بعد اسی کے آخری حصے کو ۲۳ ویں باب سے آخر تک علیحدہ کر کے اور اس میں قدرے ترمیم کر کے تقریباً سو صفحات کا ایک علیحدہ رسالہ مرتب کیا۔ اس حصے کو علیحدہ کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ اسی حصے میں پانچ تن اور پانچ عناصر پچیس گُن کا وہ تصوف بیان کیا گیا ہے جو خانوادۂ امینیہ (شاہ امین الدین اعلیٰ کے خانوادے) کا اجتہاد ہے۔ رسالۂ ب کی حیثیت تالیف کی ہے جس میں رسالۂ الف کی عبارت کو من و عن نقل کرتے ہوئے کہیں آغاز میں، کہیں درمیان میں، کہیں آخر میں حسب ضرورت اضافے کیے گئے ہیں، اور کہیں ایسی عبارتوں کو حذف بھی کیا گیا ہے جو مسئلۂ زیر بحث سے براہ راست تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ یہ پورا کام جس سلیقے اور قابلیت سے کیا گیا ہے وہ یہی سمجھنے پر مجبور کرتا ہے کہ رسالۂ ب رسالۂ الف ہی کے مصنف کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

۵۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسالۂ معراج العاشقین مرتبہ مولوی عبدالحق کا تعلق رسالہ

الف سے ہے یا رسالۂ ب سے اور اس تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ معراج العاشقین کا تعلق رسالۂ الف سے نہیں ہے بلکہ رسالۂ ب سے ہے، اس لیے کہ :۔ اول یہ کہ اگرچہ معراج العاشقین میں ابواب کی سرخیاں نہیں ہیں لیکن مباحث کی ترتیب وہی ہے جو رسالۂ ب کی ہے۔ دوم یہ کہ معراج العاشقین میں بعض عبارتیں ایسی ہیں جو رسالۂ ب میں ہیں، رسالۂ الف میں نہیں ہیں۔ سوم یہ کہ بعض لفظ جیسے رسالۂ ب میں ہیں ویسے ہی معراج العاشقین میں ہیں۔ رسالۂ الف میں دوسرے لفظ ہیں۔ چہارم یہ کہ معراج العاشقین کی پوری عبارت رسالۂ ب میں ہے۔ رسالۂ الف میں نہیں ہے۔

۶۔ تلاوت الوجود اور معراج العاشقین کی عبارتوں کے مطالعے سے یہی نتیجہ مستخرج ہوتا ہے کہ معراج العاشقین تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے، نہ کہ تلاوۃ الوجود معراج العاشقین کی شرح ہے .... معراج العاشقین، رسالہ تلاوۃ الوجود کا خلاصہ تو ہے لیکن شروع سے آخر تک عبارت میں اس قدر بے ربطی، ابہام اور بے ترتیبی ہے کہ اٹھارہ صفحات کے اس مختصر رسالے میں مشکل سے چند سطریں ایسی ملیں گی جو درست، مربوط اور با معنی ہوں۔ تلاوۃ الوجود کے نسخوں میں بھی بکثرت غلطیاں ہیں لیکن ترتیب عبادت سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ نقل در نقل کی وجہ سے عبارت بگڑ گئی ہے۔ لیکن معراج العاشقین تو غلطیوں اور بے ربطیوں کی پوٹ ہے۔ کہیں سے بھی اس رسالے کو پڑھنا شروع کیجیے کوئی بات سمجھ میں نہیں آئے گی ... معراج العاشقین تلاوۃ الوجود کا کس قدر بے ربط اور مہمل خلاصہ ہے۔ خلاصہ نگار کو بیجاپوری فلسفے میں ان لوازم کی اہمیت اور ترتیب کا بھی اندازہ نہیں۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ شمس العشاق سے حضرت امین اور ان کے خلفاء تک کسی نے حواس کو لوازم میں شامل نہیں کیا۔ اگر یہ خلاصہ نگار کی جدت بھی ہو تو یہ جدت مہمل اور بد ذوقی پر دلالت کرتی ہے، اس لیے کہ حواس خمسہ کسی تن کے لوازم میں شامل بھی ہو سکیں تو پہلے تن واجب الوجود (تن ناسوتی) میں شامل لوازم میں ہوں گے نہ کہ ممکن الوجود کے لوازم میں۔ اسی طرح سبیلات (باٹ) کے ذکر کے سلسلے میں معراج العاشقین میں شتر گربگی ہے۔

۷۔ معراج العاشقین نام کے نسخے : راقم الحروف (ڈاکٹر حفیظ قتیل) کو ایسے صرف چار رسالے دستیاب ہوسکے ہیں جن کا نام معراج العاشقین ہے۔ ان میں سے پہلے دو رسالہ ب تلاوۃ الوجود کے نسخے ہیں۔ تیسرا رسالہ معراج العاشقین ہی ہے جس کا ابتدائی حصہ مختلف ہے۔

چوتھا رسالہ من و عن معراج العاشقین کا نسخہ ہے۔ ان رسالوں کے ضمن میں ایک اور رسالے کا ذکر ضروری ہے جس کا نام معراج العاشقین تو نہیں ہے لیکن مطبوعہ معراج العاشقین کی طرح یہ بھی رسالہ ب تلاوۃ الوجود کا ایک علیحدہ خلاصہ ہے۔ تفصیل ان سب کی یہ ہے:

(الف) اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف میسور میں نمبر ۱۸ پر ایک مجموعہ رسائل ہے اس کا آٹھواں رسالہ معراج العاشقین ہے، یہ رسالۂ ب تلاوۃ الوجود کا نسخہ ہے جو ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالے کے آغاز یا اختتام پر کوئی نوٹ نہیں جس میں سنہ کتابت، سنہ تصنیف، کاتب کا نام، مصنّف کا نام جیسی کوئی تفصیل ہو۔

(ب) انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتاب خانے میں ایک رسالہ ۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ بھی کوئی سرنامہ اور ترقیمہ نہیں ہے۔ صرف لوح پر رسالے کا نام اور مصنّف کا نام درج ہے "رسالۂ معراج العاشقین تصنیف حضرت خواجہ بندہ نواز قدّس سرّہ" یہ رسالہ بھی رسالۂ ب تلاوۃ الوجود ہی کا ایک نسخہ ہے۔

(ج) مولوی علیم الدین صاحب تاجر کتب حیدرآباد دکن کے ذخیرۂ مخطوطات میں ایک رسالہ معراج العاشقین کے نام سے راقم الحروف کی نظر سے گذرا ہے۔ یہ رسالہ ۲۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ پیشانی پر "معراج العاشقین" لکھا ہے۔ لیکن آغاز کی عبارت میں اس کا نام کشف الوجود بتایا گیا ہے اور یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ رسالہ "من عرف" کے اسرار کو سمجھانے کی غرض سے قادر ماں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اختتام کی عبارت میں پھر رسالے کا نام معراج العاشقین لکھ کر وضاحت کی ہے کہ بندہ نواز گیسو دراز نے یہ رسالہ قادر ماں کے لیے لکھا ہے۔ یہ رسالۂ ب تلاوہ الوجود کی من و عن نقل نہیں ہے۔ آغاز کی عبارت کسی اور رسالے سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ بیجاپوری مصنفین میں مختلف رسائل سے اقتباسات لے کر ایک علیحدہ رسالہ مرتب کرنے کا رجحان عام ہے۔

(د) عثمانیہ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں نمبر ۹۱۔ ۲۹۷ م ن ۔ ۱ پر اٹھارہ رسائل کا ایک مجموعہ ہے۔ کسی نے سرورق پر تصنیفات اولیائے دکن لکھ دیا ہے۔ اس مجموعے میں پانچویں نمبر پر رسالۂ معراج العاشقین ہے جو ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ لوح پر کوئی نام نہیں ہے۔ آغاز کی عبارت میں اس کا نام وجود المعراج اور اختتام کی عبارت میں وجود المعراج العاشقین لکھا ہے اور مصنف کا نام حضرت سید محمد صدر الدین ابوالفتاح حسینی بندہ نواز بلند

پرواز عاشق شہباز الملقب گیسو دراز بتایا ہے مگر اس کے ساتھ "خبر یافتہ" کی صراحت بھی ہے یعنی یہ رسالہ بندہ نواز کا سنا گیا ہے۔ کاتب کی یہ احتیاط بتاتی ہے کہ اس زمانے میں بھی محتاط اہل قلم کو اس رسالے کے بندہ نواز کی تصنیف ہونے میں شک تھا۔ (ص ۴۱)

(۵) معراج العاشقین کے نسخوں کے سلسلے میں کتب خانۂ سالار جنگ کے ایک رسالے کا ذکر مسئلۂ زیر تحقیق کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوگا۔ یہ رسالہ "رسالۂ تصوف" کے نام سے نمبر ۸۵ پر درج ہے اور اٹھارہ اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ بنیادی طور پر معراج العاشقین ہی ہے لیکن اس میں اور مطبوعہ معراج العاشقین میں کچھ اختلافات بھی ہیں۔ جگہ جگہ عبارت میں کمی بیشی ہے۔ آخر میں دس چیزوں کے بجائے نو چیزوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد بھی تین صفحے ہیں۔ یہ زاید عبارت بھی الفاظ اور جملوں کے معمولی اختلاف اور عبارت کی تقدیم و تاخیر کے ساتھ تلاوۃ الوجود میں موجود ہے۔ اس آخری حصے سے قطع نظر رسالے کی پوری ہیئت کم و بیش وہی ہے جو مطبوعہ معراج العاشقین کی ہے ... قیاس ہوتا ہے کہ یہ تلاوۃ الوجود ہی کا خلاصہ ہے لیکن کسی اور کا کیا ہوا ہے اور مطبوعہ معراج العاشقین کا خلاصہ کسی اور کا ہے۔ اور خلاصہ مطبوعہ خلاصے کے مقابلے میں واضح اور مربوط ہے۔ اس نئے خلاصے سے ہماری اس رائے کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے کہ معراج العاشقین کوئی مستقل رسالہ نہیں ہے بلکہ تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہے (ص ۴۲)۔

مطبوعہ معراج العاشقین میں صفحہ ۱۴ پر پانچ محل کا ذکر ادھورا ہے۔ نسخہ ۸۵ میں مکمل ہے اور واضح ہے۔ دونوں عبارتیں تلاوۃ الوجود رسالۂ ب سے ماخوذ ہیں لیکن رسالہ ۸۵ کے خلاصہ نگار نے عبارت کو سمجھ کر سلیقے سے تلخیص کی ہے۔

مطبوعہ معراج العاشقین اور رسالہ ۸۵ میں عبارت کی کمی بیشی ہے، وہ سب تلاوۃ الوجود رسالۂ ب میں موجود ہے۔ رسالہ ۸۵ کے آخر میں جو تین صفحوں کی زاید عبارت ہے، وہ بھی رسالۂ ب میں ملتی ہے۔

مطبوعہ معراج العاشقین حضرت امام جعفر صادق کی فرمائی ہوئی دس چیزوں پر ختم ہوجاتا ہے۔ رسالہ ۸۵ میں صرف نو چیزوں کے بعد عبارت آگے بڑھتی ہے، اور یہ عبارت رسالۂ ب کے بقیہ حصے سے جستہ جستہ اخذ کی گئی ہے۔

۸۔ معراج العاشقین کا موضوع : جو شواہد معراج العاشقین کے خواجہ بندہ نواز سے

انتساب کی مخالفت کرتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم شہادت اس رسالے کے مضامین و مطالب ہیں۔ معراج العاشقین کے مضامین کا تجزیہ کیا جائے تو اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) پانچ تن (ب) پانچ محل (ج) معراج کا فلسفہ (د) سالک کو دیدار الٰہی کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ سارے مسائل و مباحث صوفیائے بیجاپور کے اجتہادی تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔ میراں جی شمس العشاق، ان کے فرزند برہان الدین جانم اور پوتے امین الدین علی اعلیٰ (م ۱۰۸۵ھ) نے تصوف کی روش عام سے ہٹ کر ایک نئے دبستان کی تشکیل کی ہے۔ اس اجتہاد میں شمس العشاق سے زیادہ جانم اور جانم سے زیادہ حضرت امین نے حصہ لیا ہے۔ یہ سارا تصوف حدیث "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" پر مبنی ہے، یعنی مطالعۂ نفس۔ اس کے پہلے مرحلے میں (جس کو اس خانوادے میں واجب الوجود کا نام دیا گیا ہے) تن ناسوتی کے عناصر ترکیبی کا مطالعہ کیا جاتا ہے اس سلسلے میں جانم صرف چار عناصر آب و آتش و خاک و باد کا ذکر کرتے ہیں لیکن حضرت امین ان عناصر اربعہ کے ساتھ خالی یا ہوا کو بھی ایک عنصر تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہر عنصر کے پانچ پانچ گن بھی بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا تصوف پانچ عناصر پچیس گن کا تصوف کہلانے لگا۔ پانچویں عنصر خالی یا ہوا کا تصور بیجاپوری تصوف کو ہندستانی فلسفے سے ملا ہے جس کے مطابق کائنات پانچ تتوں سے پیدا ہوئی ہے اور انھی تتوں میں غائب بھی ہوجائے گی۔

حضرت جانم چار عناصر اور ان کے لوازم کا ذکر کرتے ہیں، پانچویں عنصر کو وہ ہوا کہتے ہیں لیکن اس کو اہمیت نہیں دیتے۔ جانم کے برخلاف ان کے بیٹے حضرت امین پانچ عناصر کو مانتے ہیں اور ان کے گنوں کی وضاحت کرتے ہیں ..... جانم نے وجود کے چار مراتب بیان کیے ہیں اور ان کے لیے چار نئی اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ واجب الوجود، ممکن الوجود، ممتنع الوجود، عارف الوجود ..... عام صوفیہ خدا کے وجود کو واجب اور مخلوق کے وجود کو ممکن کہتے ہیں لیکن جانم اور امین واجب الوجود کی اصطلاح انسان کے وجود خاکی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ حضرت امین اعتراف کرتے ہیں کہ جس مفہوم میں خدا کو واجب الوجود کہتے ہیں، تن ناسوتی کو اس مفہوم میں واجب الوجود نہیں کہتے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ روح کے لیے جسم لازم اور واجب ہے .....

۔ [حاشیہ: مصنف: جانم کے اجتہاد کے لیے جانم کی تصنیفات کے علاوہ ان کے خلیفہ محمود خوش دہاں کے رسالہ معرفت السلوک کا مطالعہ کیا جائے۔ حضرت امین کے تصوف کے مطالعے کے لیے حضرت امین کی تصانیف کے علاوہ رسالہ وجود العاشقین کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنے مقالے "دکنی ادب کی ترقی میں شاہ امین الدین علی اعلیٰ اور ان کے خلفاء کا حصہ" میں بڑی وضاحت کے ساتھ جانم اور امین کے اجتہادات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ راقم الحروف نے اس خانوادے کے تصوف کا اجمالی خاکہ قلم بند کرنے کے لیے ڈاکٹر شاہد کے مقالے سے استفادہ کیا ہے۔]

ان بزرگوں کے اجتہاد اور ان کی اصطلاحات کے مطالعے کے بعد ہم یہ کلّیے قائم کرنے پر مجبور ہیں کہ:۔

(الف) جس رسالے میں چار مراتب وجود کا ذکر ہو اور ان کے لیے جانم کی اصطلاحیں مستعمل ہوں اور ہر وجود کے لوازم بھی بیان کیے گئے ہوں تو یقیناً یہ رسالہ حضرت جانم کی تعلیمات پر مبنی ہوگا اور اس کا عہدِ تصنیف جانم کا عہد ہوگا۔

(ب) جس رسالے میں پانچ مراتب وجود، ان کے لوازم کے علاوہ پانچ عناصر پچیس گن کی تفصیلات ہوں، نیز جسم کی کائنات کی تقسیم کے لیے سات طبق زمین، سات طبق آسمان، بارہ برج، سات ستارے، پرند، موسم، عرش و کرسی، چاند سورج، درخت، جانور، ندی، دریا، پہاڑ اور برق و باراں کا ذکر ہو یا حضرت امین کے اجتہاد کا کوئی اور پہلو آئے جیسے ہر عنصر کے پھول، پھل، مقام، درد، دروازوں، اور جانوروں کی تفصیل ہو تو یقیناً یہ رسالہ حضرت امین کی تعلیمات سے مستفاد ہوگا اور اس کا عہد تصنیف حضرت امین کا عہد ہوگا یا ان کے بعد کا عہد ہوگا۔

۹۔ معراج العاشقین میں پانچ مراتب وجود کا ذکر جانم کے اصطلاحی ناموں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ پانچ سبیلات بھی معرفت السلوک میں بیان کردہ جانم کی تعلیمات کے دائرے سے مستفاد ہیں۔ معراج کی تمثیلی تفصیلات بھی حضرت امین کے خلفاء کی جولانی طبع کا نتیجہ ہیں۔ حضرت امین نے اپنے رسالے "گفتار شاہ امین" میں اور دوسری تحریروں میں معراج کا مختصر ذکر کیا ہے۔ خلفاء اس کو لے اڑے اور نمک مرچ لگا کر افسانہ بنا دیا۔ غرض یہ کہ معراج العاشقین کے مضامین ثابت کرتے ہیں کہ یہ رسالہ حضرت امین کی تعلیمات سے مستفاد ہی نہیں بلکہ پر ان اضافے بھی ہیں۔ اس لیے رسالے کا عہد تصنیف یقیناً حضرت (وفات ۱۰۸۵ھ) کے بعد کا زمانہ ہے۔

۱۰۔ اس جائزے کے بعد حضرت بندہ نواز کی تصانیف سے ان کے نظام تصوف کا استنباط کرنا اور معراج العاشقین کے تصوف سے اس کا مقابلہ کرنا ایک سعی لا حاصل ہے۔ حضرت بندہ نواز کی ہر تصنیف میں ان کا ایک ہی موضوع ہے اور وہ عشق ہے۔ وہ ہر پھر کر اسی موضوع کی طرف آتے ہیں۔ اس عشقیہ مزاج کی وجہ سے خواجہ صاحب کا تصوف ایک جذبہ ہے، فلسفہ نہیں، فلسفیانہ موشگافی ان کے مزاج کے خلاف ہے، خصوصاً ایسی موشگافی جو ظاہر شرع کے منافی ہو، ان کے مزاج اور مسلک دونوں کے خلاف ہے۔ وہ اس معاملے میں شیخ اکبر تک کو نہیں بخشتے (ص ۶۶)

۱۱۔ زبان و بیان: معراج العاشقین کی عبارت اس قدر غلط اور الجھی ہوئی ہے کہ اس کے مطالعے سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے۔ تاہم موجودہ متن میں جو صوتی اور صرفی شکلیں ملتی ہیں، وہ وہی ہیں جو گیارہویں صدی ہجری کے نصف آخر اور بارہویں صدی ہجری کی نثر میں ملتی ہیں۔ اس اعتبار سے رسالۂ معراج العاشقین، شرح تمہیدات ہمدانی اور شرح مرغوب القلوب (مصنف میراں جی خدا نما متوفی ۱۰۷۳ھ) رسالۂ وجودیہ اور ذکر نامہ (مصنف شاہ محمد نور دریا متوفی ۱۰۸۵ھ) ترجمہ شمائل الاتقیاء (مترجم میراں یعقوب متوفی ۱۰۸۷ھ) خلاصۃ الرویا (مصنف سید میراں حسینی متوفی ۱۱۱۵ھ) کی صف میں آتا ہے۔ بلکہ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے اس کو اس سلسلے کی آخری کڑی سمجھنا چاہیے۔ مثلاً میراں جی اور میراں یعقوب کی تصانیف کے مقابلے میں معراج العاشقین میں بعض حروف ربط کی ترقی یافتہ شکلیں ملتی ہیں۔

(الف) حرف ربط ستیں، ستے، تھیں، سیتیں، ستیں، سیتی، ستی، تے، تھے، تے، سوں، سے کی یہ شکلیں زبان کی ترقی کے ساتھ کم و بیش اسی ترتیب سے متروک ہوتی گئیں۔ میراں جی خدانما کے ہاں اس حرف ربط کی کم و بیش سبھی شکلیں ملتی ہیں، لیکن وہ تھے اور سوں کی شکلیں زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے مرید میراں یعقوب نے بھی اکثر شکلیں استعمال کی ہیں۔ لیکن وہ بھی تھے اور سوں زیادہ استعمال کرتے ہیں، اور ان دونوں میں بھی سوں کا استعمال زیادہ ہے۔ معراج العاشقین میں صرف دو شکلیں تے اور سوں استعمال ہوئی ہیں۔ ان میں بھی تے کے مقابلے میں سوں کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ صرف ایک جگہ ستی کی شکل ملتی ہے۔

(ب) اسی طرح میراں جی اور میراں یعقوب حرف ربط میں کے ساتھ منے بھی استعمال کرتے ہیں۔ معراج العاشقین میں صرف میں ملتا ہے۔

(ج) معراج العاشقین کی زبان کے ترقی یافتہ ہونے کے ثبوت میں، بعض قدیم

حرفی اشکال اور ان کے مقابلے معراج العاشقین کی ترقی یافتہ اشکال کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

	قدیم	معراج العاشقین
● صفت عددی:	دو نھو، دھوں، تینھوں	دونوں، تینوں
● ضمیر شخصی متکلم مفعولی:	مجیں، مجھ، ہمیں	مجھے، ہم
● ضمیر شخصی غائب مفعولی:	انن	ان
● فعل ماضی مطلق:	کیتا	کیا
● علامت مستقبل:	سی	گا
● فعل ناقص:	ہے، اتھے	ہے، تھے

(د) علامت فاعل نے: نے کا ترک دکنی زبان کی خصوصیت ہے گیارہویں صدی ہجری کے نصف آخر سے اس کا بے قاعدہ استعمال ملتا ہے۔ معراج العاشقین میں بھی ایک دو جگہ یہ علامت نظر آتی ہے۔

		قدیم	معراج العاشقین
(ہ)	حرف اضافت:	کیرا، کیری،	کا، کی
(و)	متعلق فعل مکان:	اپرال	اوپر

(ز) معراج العاشقین میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت بھی اس کے عہد تصنیف کو متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اس رسالے میں فارسی افعال مرکب کا ترجمہ کرنے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ خبر کرنا (خبر کردن)، پاک ہونا (پاک شدن) قبول کرنا (قبول کردن) کلمہ پڑھنا (کلمہ خواندن)۔

(ح) بقول ڈاکٹر حسینی شاہد، غالباً جانم کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ نہیں تھا، اس لیے اپنا راستہ آپ بنایا ہے، وہ اردو نثر لکھتے لکھتے فارسی نثر لکھنے لگتے ہیں، کبھی ایک جملہ اردو میں لکھتے ہیں اور ایک فارسی میں، مرکب جملوں میں اصلی جملہ اردو میں لکھتے ہیں اور تابع جملہ فارسی میں، اور کبھی اس کے برعکس بھی۔ جملے کا آغاز اردو سے کرتے ہیں اور ختم فارسی پر۔ عموماً فارسی حروف عطف اور حروف ربط استعمال کرتے ہیں ..... حضرت امین اپنے والد کی طرح فارسی کا سہارا نہیں لیتے۔ عبارتوں کے تقابلی مطالعے سے معراج العاشقین کے تأخر کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

۱۲۔ صوتی خصوصیات کے اعتبار سے بھی معراج العاشقین گیارہویں اور بارہویں

صدی ہجری کی دکنی تصنیفات کی صف میں آتا ہے۔ تخفیف کا عمل معراج العاشقین میں پانچ لفظوں میں اس طور پر ظاہر ہوا ہے: نک (ناک)، منگنا (مانگنا)، اسمان (آسمان)، ڈھنڈنا (ڈھونڈنا)، بھجا (بھیجا)۔ تسپیل کا رجحان معراج العاشقین میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ جاگا، ماٹی، کوچہ (کچھ)، چالے (چلے، ناکو (نکو) مواحد (موحد) پار دے (پردے) وغیرہ۔ تشدید کا میلان زبان کی قدامت کی علامت ہے۔ معراج العاشقین میں دو چار لفظوں پر اس میلان کا دھوکا ہوتا ہے مگر یہ مشکوک مقامات ہیں۔ بجاپوری دکنی گجری کے اثر سے انفیانے کا رجحان بہت زیادہ رہا ہے۔ شمس العشاق، جانم اور حضرت امین کے سلسلے کے مصنفین اس رجحان سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں، بعد میں زبان کی ترقی کے ساتھ کم ہوتا گیا۔ معراج العاشقین میں بھی جو حضرت امین کے تقریباً ایک صدی بعد کا رسالہ ہے، چند لفظوں میں انفی آواز ملتی ہے۔ مانیاں (مانیا)، دنیاں (دنیا)، بیچ (بیچ)، رہنگا (رہے گا)۔ یائے زائدہ کا استعمال بھی دکنی رسائل میں بتدریج کم ہوتا گیا۔ معراج العاشقین میں ایسے صرف دو لفظ ملتے ہیں بدبوئی، درمیانی۔ ان میں سے بدبوئی اب بھی دکن کے دیہات میں مستعمل ہے۔ ہائے مخلوط کا حذف بھی دکنی کا صوتی میلان رہا ہے اور یہ بھی امتداد زمانہ کے ساتھ کم ہوتا گیا ہے۔ معراج العاشقین میں بھی ہائے مخلوط چند ہی لفظوں میں حذف ہوئی ہے۔ باندنا (باندھنا)، رک (رکھ)، تماری (تمھاری)، بوجکر (بوجھ کر) بات (ہاتھ)، اوڑاکر (اڑھا کر)۔ لیکن اس رسالے میں ان چند لفظوں کے مقابلے میں ایسے لفظوں کی تعداد زیادہ ہے جن میں ہائے مخلوط موجود ہے جیسے چھپانا، سمجھنا، بھیجے، چوتھا، چھوٹا، ہاتھ، بوجھنا ہائے مخلوط کے ساتھ بھی لکھے ملتے ہیں۔۔ یہی حال ہائے ملفوظہ کا ہے۔ کاں (کہاں) میں محذوف ہے وہاں میں ملفوظ ہے۔ پونچے اور پہونچے دونوں شکلیں استعمال ہوتی ہیں۔ کوزی مصمتے کی دنتی مصمتے میں تبدیلی کی صرف ایک مثال ملتی ہے۔ تھنڈ (ٹھنڈ)۔ دکن میں آج بھی یہ لفظ دنتی مصمتے کے ساتھ ہی بولا جاتا ہے۔

۱۳۔ معراج العاشقین کے خواجہ بندہ نواز سے غلط انتساب کی توجیہ:۔

ناموں کے التباس سے ایسا ہوا ہے۔ خواجہ صاحب کا نام محمد ہے۔ نسباً سادات حسینی سے تھے۔ اس لیے نام سید محمد حسینی قرار پایا۔ کنیت ابوالفتح، القاب صدر الدین ولی الاکبر الصادق۔ بندہ نواز، گیسو دراز شیخ کے دیے ہوئے خطابات، عاشق شہباز، بلند پرواز، سرفراز، خاکسار عالم نواز، کلمات احترام ہیں۔ سلسلۂ خواجگان چشت سے تعلق کی وجہ سے خواجہ یا خواجۂ خواجگان۔

بیجاپور کے خانوادہ چشتیہ کے سلسلے کے ایک بزرگ سید شاہ محمد صدر الدین بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں میسور میں گزرے ہیں۔ ان کی نظم و نثر کے متعدد رسائل ملتے ہیں۔ صدر الدین نام سے دھوکا کھا کر کاتبوں نے ان کی بعض تصانیف کو خواجہ صاحب سے منسوب کر دیا ہے۔

اسی بیجاپوری سلسلے کے ایک بزرگ شہباز حسینی گیارہویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ ان کی چند غزلیں مختلف بیاضوں میں ملتی ہیں (مولوی عبدالحق نے "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں ان کی ایک غزل کے مقطع میں "شہباز حسینی" پاکر خواجہ صاحب سے منسوب کر دی ہے حالانکہ خواجہ صاحب نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا تھا۔ شہباز نہ ان کا لقب تھا نہ خطاب، یہ لفظ ان لاحقوں میں سے ہے جو بندہ نواز کا ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے متعقدین ان کے نام کے ساتھ لگاتے رہے ہیں)۔

۱۴۔ **معراج العاشقین کے مصنف کا شیخ** : رسالۂ ب (تلاوۃ الوجود) کے آخر میں مصنف نے دو شعر لکھے ہیں جو اس رسالے کے ہر نسخے میں موجود ہیں۔ یہی شعر رسالۂ الف (تلاوۃ الوجود) کے آخر میں بھی ہیں۔

ان شعروں میں مصنف اپنے شیخ کے فیضان کا ذکر کرتا ہے۔ مصنف مخدوم دونوں رسالوں میں اپنے پیر کا نام پیر اللہ بتاتے ہیں

- ع پیر اللہ حسینی دیے الحان
- ع حضرت شاہ پیر اللہ داتا

یہ ایسی قوی اندرونی شہادت ہے کہ اس سے دونوں رسالوں کے خواجہ بندہ نواز سے انتساب کی بالکلیہ تردید ہوجاتی ہے اور نتیجۃً تلاوۃ الوجود کا خلاصہ ہونے کی وجہ سے معراج العاشقین کے خواجہ صاحب سے انتساب کی بھی تردید ہوجاتی ہے۔

۱۵۔ رسالۂ الف، رسالۂ ب اور رسالۂ ج میں ان کے مصنّف مخدوم کے تعلق سے بہت مختصر مواد ملتا ہے لیکن اس مختصر سے بھی ان کا پورا اتا پتا مل جاتا ہے۔

رسالۂ الف میں خود مصنّف نے اپنے نام اور وطن کی وضاحت کی ہے:

"از تصنیف فقیر حقیر مخدوم شاہ حسینی، رہنما خانوادۂ چشت اہل بہشت وطن در ملک دکن صوبۂ دار الظفر بیجاپور محل رائچور پرگنہ کوتال ساکن

قصبۂ بلکانور "

مصنف نے اپنا نام صرف مخدوم شاہ حسینی بتایا ہے۔ مصنف مخدوم کی مزید شناخت پیر کے نام سے ہوتی ہے۔ مخدوم اپنے پیر کا نام اپنے شعروں میں پیر اللہ حسینی بتاتے ہیں۔ ایک بیاض میں مخدوم شاہ حسینی کے پوتے مرید سید عزیز اللہ حسینی کا چشتیہ اور قادریہ کرسی نامہ درج ہے :۔

(الف) کرسی نامۂ خواجگان چشت :۔ سید عزیز اللہ شاہ حسینی چشتی، فقیر اللہ شاہ حسینی چشتی، مخدوم شاہ حسینی چشتی، پیر اللہ حسینی چشتی، شاہ میراں جی خدا نما چشتی۔

(ب) کرسی نامۂ قادریہ :۔ سید عزیز اللہ حسینی چشتی القادری، فقیر اللہ شاہ حسینی چشتی القادری، مخدوم شاہ حسینی چشتی القادری، پیر اللہ حسینی چشتی القادری، میراں جی خدانما چشتی القادری، شیخ محمود خوش دہاں۔

ان دونوں کرسی ناموں میں مخدوم شاہ حسینی کے پیر کا نام پیر اللہ حسینی ہے جو میراں جی خدا نما (متوفی ۱۰۰۰ھ) کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اس اعتبار سے مخدوم شاہ حسینی کا زمانہ اواخر گیارہویں صدی ہجری اور اوائل بارہویں صدی ہجری قرار پاتا ہے۔ نہ تو مخدوم شاہ حسینی کے سنہ وفات کا پتا چل سکا اور نہ ٹھیک طور پر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ وہ کہاں مدفون ہیں۔ رسالۂ الف کی ایک عبارت کے مطابق مخدوم نے اپنے فرزند کا نام پیر اللہ بتایا ہے یعنی پیر کا نام اپنے بیٹے کو دیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ ان کے اجداد کا کچھ پتا ہے اور نہ احفاد کا۔

مخدوم شاہ حسینی کے چند شعر تو تلاوۃ الوجود (الف، ب، ج) کے آخر میں مندرج ہیں، کتب خانۂ آصفیہ کی ایک بیاض (نمبر ۲۰۲۵) میں ایک مختصر نظم میزبانی نامہ کے عنوان سے ہے جس کی لوح پر لکھا ہے " این رسالۂ میزبانی نامہ حضرت مخدوم شاہ حسینی نے فرمود است " یہ نمونے یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مخدوم نثر نگار ہی نہیں شاعر بھی تھے۔ (ص ۱۰۲)

۱۶۔ سنہ کتابت ۹۰۶ھ : (اب صرف ڈاکٹر محمد قاسم والے نسخے کے منقول عنہ کی کتابت کی بحث رہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد قاسم والا نسخہ اب کہاں ہے ؟ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ وہ اس نسخے کو خود دیکھنے کے مدعی ہیں، بلکہ اس بحث کی بنیاد تمام تر مولوی عبدالحق کے بیان پر رکھتے ہیں جنھوں نے اس نسخے کو خود دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :۔)

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر محمد قاسم کے کتب خانے کے نسخے معراج العاشقین کے آخر میں یہ عبارت مندرج ہے "این نسخۂ شریف را فقیر حقیر سراپا تقصیر سید محمد نصیر در قلعۂ نصرت آباد ساگر من مضافات دارالظفر بیجاپور بتاریخ ہفتم ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۱۰۶ھ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و شش ہجرہ از نسخۂ معتبر کہ قدیم کہ مکتوب ۹۰۶ھ نہ صد و شش ہجری بود نقل نمود"

پچھلے صفحات میں مختلف داخلی اور خارجی شہادتوں کی بنیاد پر واضح کر دیا گیا ہے کہ معراج العاشقین حضرت مخدوم سید محمد حسینی بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ گیارہویں صدی ہجری کے آخر اور بارہویں صدی کے آغاز کے عہد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے۔ رہا ۹۰۶ھ کا سوال اس تعلق سے یہ اعتراف کیا جاچکا ہے کہ ڈاکٹر محمد قاسم کا نسخہ راقم الحروف کو دستیاب نہیں ہو سکا ... عقل سلیم (اس نسخے کے منقول عنہ کے) سنہ کتابت ۹۰۶ھ کو غلط سمجھنے پر مجبور ہے۔ اس کے باوجود یہ سنہ ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے کہ آخر کاتب نے یہ سنہ کیوں لکھا۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے محقق کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ اس کو دکنی مخطوطات میں سنین کی کثرت اغلاط پر قیاس کرے۔

قیاسی توجیہات:- پہلی بات تو یہی ہے کہ کاتب نسخہ محمد نصیر نے منقول عنہ کا سنہ کتابت ہندسوں میں لکھنے کے بعد عبارت میں بھی لکھا ہے۔ یہ عبارت کاتب کا اضافہ ہوگی۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ کاتب محمد نصیر نے منقول عنہ کے سنہ ۹۶ھ کو ۰ درمیان میں سنہ کا نقطہ آجانے کی وجہ سے ۹۰۶ھ پڑھ لیا ہوگا۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو یہ سنہ ۱۰۹۶ھ ہوگا۔ اس لیے کہ محمد نصیر نے اس نسخے کی نقل ۱۱۰۶ھ میں کی۔ تیسرا قیاس یہ ہے کہ کاتب صرف صدی کا سنہ ۹۶ھ لکھنا چاہتا ہوگا لیکن سہوا ۹۰۶ھ لکھ گیا۔ دکنی مخطوطات کے کاتبوں سے اس طرح کا بھی سہو ہوا ہے ... یقیناً تحقیق میں اس طرح کی قیاس آرائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن جب متعدد شہادتوں سے رسالۂ معراج العاشقین گیارہویں صدی ہجری کے اواخر اور بارہویں صدی ہجری کے آغاز کے عہد کی ایک شخصیت کی تصنیف ثابت ہوگیا ہو تو سنہ ۹۰۶ھ کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ ایسی صورت میں سنہ کی غلطی کی تاویل و توجیہ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد:

رسائلِ شاہ امین الدّین اعلیٰ

کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ میں دکنی رسائل نظم و نثر کا ایک مجموعہ (الف ق ۲۹۰۰۶۱) محفوظ ہے۔ جس کو پروفیسر عبدالقادر سروری، مرتّب فہرست مخطوطات اردو جامعۂ عثمانیہ، نے حضرت امین الدّین علی اعلیٰ سے منسوب کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اس مجموعے میں بارہ رسالے ہیں جن میں سے بعض تو نسخ اور بعض نستعلیق رسم الخط میں لکھے ہوئے ہیں۔ سوائے ایک رسالے کے تمام خط ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ عموماً جہاں ایک رسالہ ختم ہوتا ہے، اس کے بالکل بعد ہی سے دوسرا شروع ہوجاتا ہے۔ اکثر رسالے نظم میں ہیں، لیکن ایک دو نثر میں بھی لکھے گئے۔ کسی بھی رسالے سے سالِ تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔"(۱)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے بھی پروفیسر سروری کی پیروی میں اس مجموعے کو رسائل شاہ امین الدّین اعلیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے اور ان میں سے، کا ذکر اپنی کتاب "اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء" میں حضرت امین کی تصانیف کے ضمن میں کیا ہے (۲)

اس مجموعے میں رسائل کی تعداد ۱۲ نہیں بلکہ مکمل اور ناقص رسائل کی مجموعی تعداد ۱۴ ہے۔ ان کے علاوہ ایک شجرہ بھی ہے جس کو پروفیسر سروری اور ان کی تقلید میں ڈاکٹر رفیعہ نے رسائل میں شمار کیا ہے۔ سوائے ایک آدھ کے کسی رسالے پر اس کا نام درج نہیں ہے۔ بعض رسالے مکمل ہیں اور بعض ناقص۔ جلد بندی میں بعض صفحات کی تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے۔ کسی رسالے پر مصنّف کا نام، سنہ تصنیف یا سنہ کتابت درج نہیں ہے لیکن اس مجموعے میں جو شجرہ نقل کیا گیا ہے وہ بابا شاہ حسینی ابن امین الدّین علی اعلیٰ پر ختم ہوتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ان رسائل کی کتابت ۱۱۱۹ھ سے پہلے مکمل ہوچکی تھی (۳)

پروفیسر سروری اس مجموعے کو حضرت امین سے منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان رسالوں کے متعلق غالب قیاس یہ ہے کہ یہ شاہ صاحب (حضرت امین) ہی

کی تصنیف ہیں۔ کیونکہ ان میں اکثر مقامات پر اپنے بزرگ شاہ میراں جی شمس العشاق یا شاہ برہان الدین کی مدح موجود ہے اور جب تک کوئی تخریبی شہادت ان کے خلاف دستیاب نہ ہو، یہ شاہ صاحب ہی سے منسوب کیے جانے چاہئیں۔ یہ اس لیے بھی کہ یہ رسالے ایک دوسرے کے سلسلے میں درج ہیں۔ کہیں کہیں امین نام بھی آیا ہے۔"(۳)

پروفیسر سروری نے مصنف کے تعین کے سلسلے میں اپنے قیاس کی تین وجوہ بیان کی ہیں۔

۱۔ اکثر مقامات پر میراں جی شمس العشاق یا شاہ برہان الدین کی مدح موجود ہے۔

۲۔ یہ رسالے ایک دوسرے کے سلسلے میں درج ہیں۔

۳۔ کہیں کہیں امین نام بھی آیا ہے۔

پہلی وجہ نہایت عجیب ہے۔ اس لیے کہ محض میراں جی یا برہان الدین جانم کی مدح سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ مدح یا وہ رسالہ جس میں یہ مدح درج ہے، حضرت امین کی تصنیف ہے۔ مدح کرنے والا حضرت امین کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مدح کرنے والا یا وہ رسالہ جس میں مدح آئی ہے میراں جی یا جانم کے سلسلے سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ اس خانوادے کے بیسیوں رسالے ایسے ملتے ہیں جن میں میراں جی اور جانم کا ذکر یا ان کی مدح موجود ہے اور ان رسالوں کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت امین کی تصنیف نہیں ہیں۔

دوسری دلیل بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔ دکنی کے سینکڑوں مجموعے، جن میں کتابت کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا ہے، ایسے ملتے ہیں کہ جہاں ایک رسالہ ختم ہوتا ہے وہیں سے دوسرا رسالہ شروع کر دیا گیا ہے اور ان مجموعوں میں بیشتر ایسے ہیں جن میں مختلف مصنفوں کے رسائل اکٹھے کر دیے گئے ہیں۔ البتہ زیادہ تعداد ایسے مجموعوں کی ہے جن میں ایک ہی خانوادے کی تصانیف ملتی ہیں، اس لیے زیر نظر مجموعے کو محض اس بنا پر امین الدین علی اعلیٰ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں میراں جی یا جانم کی مدح آئی ہے اور وہ ایک ہی سلسلے میں نقل کیے گئے ہیں۔

تیسری وجہ بظاہر وقیع معلوم ہوتی ہے۔ بعض رسالوں میں یقیناً حضرت امین کا نام آیا ہے اور وہ ان کی تصنیف بھی ہیں لیکن اس دلیل کی بنیاد پر کہ بعض رسائل حضرت امین کی تصنیف ہیں، دوسرے تمام رسائل کو بھی ان سے منسوب کر دینا تحقیقی احتیاط کے منافی

ہے، اس لیے کہ ایسے بیسیوں مجموعے ملتے ہیں جن میں حضرت امین کے رسائل نظم و نثر کے ساتھ ان کے والد اور دادا ہی کے نہیں ، ان کے احفاد ، خلفا اور مریدوں کے رسائل بھی شامل ہیں ۔

انھی وجوہ کی بنا پر راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس مجموعے کے تمام رسائل حضرت امین سے منسوب نہیں کیے جاسکتے ۔ ان میں سے چند یقیناً حضرت امین کی تصنیف ہیں۔ چند کے بارے میں قطعیت کیساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا ۔ لیکن بعض رسائل ایسے بھی ہیں جن کے مصنفین کا پتا چل سکا ہے ۔

ذیل میں ان تمام رسالوں کا جائزہ اسی ترتیب سے لیا جاتا ہے جس ترتیب سے پروفیسر سروری نے ان کا ذکر فہرست میں کیا ہے ۔

رسالہ نمبر ا

پروفیسر سروری لکھتے ہیں ۔

"اس میں سے پہلا رسالہ نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہے ۔ نثر سے شروع ہوتا ہے ۔

آغاز :

" ہور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح بھی اور تمام پیغمبران کی روح بھی یکیک اولیاں کی روح بھی گزرنے کی اب آگے ہونے والے کا ہاں ہور اب گزرتے سو کا ہاں اس طالبوں کو نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ۔

الہی کلیاں کھول حاجات کیاں ۔۔۔ بر آوے امید اس مناجات کیاں

تیراں ناؤں کیلی ہر ایک کنجی(۵) کا ۔۔۔ ترا رحم مرہم ہر ایک رنج کا

کیا گرچہ سرمست اس ٹھار سوں ۔۔۔ کہ چمن(۶) نے محمدؐ کے گلزار کوں

آگے معرفت کے نکات بیان ہوئے ہیں ۔ ایک جگہ لکھا ہے

آوردہ اند کہ حضرت شاہ برہان الدین اولیاءقطب الآفاق قدس سرہ العزیز نزدیک یک طالب آمد سوال کرد ...

سانچا حضرت شاہ برہان ۔۔۔ سیرت ہوکر کہتی جہان(۷)

یہ رسالہ ورق ۲ب پر ختم ہوتا ہے ۔

خاتمہ

کہ(۱۰) مل واصل کہ (۱۱) دیدار	کہ (۸) مل سوتے کہ (۹) ہوشیار
اس کا بجانا اس کا ہوے(۱۲)	اس کا بجانا اس کا ہوے

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے بھی پروفیسر سروری کی تقلید میں اس رسالے کو "رسالۂ نظم و نثر" کا نام دیا ہے اور یہ حاشیہ چڑھایا ہے کہ اس میں شاہ امین الدّین نے اپنے والد شاہ برہان کے اقوال کے حوالے جا بجا دیے ہیں (۱۳) حالانکہ نثر میں کہیں نہ شاہ برہان کا نام ہے، نہ ان کا کوئی قول نقل ہے۔

پروفیسر سروری اور ان کی تقلید میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے جس کو رسالۂ نظم و نثر بتایا ہے وہ دراصل ایک نثری اور دو منظوم رسالوں کا مجموعہ ہے۔

زیر نظر مجموعے کے تفصیلی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں حضرت امین، شاہ داول، سیّد علی گنج گوہر، میراں جی خدا نما وغیرہ کے رسائل نظم و نثر شامل ہیں۔ یہ بہت ضخیم مجموعہ تھا جس کے درمیان صفحات جگہ جگہ سے غائب ہوگئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ بہت شکستہ حالت میں کتب خانے میں داخل ہوا ہے جس کے صفحات کو ترتیب دے کر جلد بنوائی گئی ہے، اس کے باوجود بعض صفحات مقدّم موئخر ہوگئے ہیں۔

یہ مجموعہ قدیم ہے لیکن نقل کرنے والے نے خوش [illegible] کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ سوائے ایک کے کسی رسالے پر اس کا نام درج نہیں ہے۔ [illegible] مصنّف اور سنہ کتابت وغیرہ کا بھی ذکر نہیں ہے۔ بالعموم جہاں ایک رسالہ ختم ہوتا ہے، وہ[illegible] سے دوسرا شروع کردیا ہے۔ آغاز سے پہلے بسم اللہ اور خاتمے پر تمّت کا بھی ہر جگہ اہتمام نہیں ہے جس کی وجہ سے بعض رسالوں کے متعلق یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ وہ کہاں ختم ہوتے ہیں۔

مجموعہ ناقص الاوّل ہے۔ بہ حالت موجودہ جس رسالے سے مجموعے کا آغاز ہوتا ہے، وہ نثری ہے۔ یہ رسالہ چونکہ ناقص الاوّل ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ چوتھے صفحے کی دوسری سطر پر نثر ختم ہوتی ہے۔ تو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد اللہ رب العالمین، الصلوٰۃ و السلام علی سیّدنا محمد والہ و صحبہ اجمعین" لکھ کر نظم شروع کردی گئی ہے۔ نظم کا پہلا شعر حسب ذیل ہے

بر آویں امید اس مناجات کیاں	الٰہی کلیاں کھول حاجات کیاں

یہ نظم ۲۰ ابیات پر مشتمل ہے۔ بہترویں شعر کے بعد حسب ذیل سرخی ہے۔

"آوردہ اند کہ حضرت شاہ برہان الدّین قطب الآفاق قدّس اللہ سرّہ العزیز نزدیک آنحضرت یک طالب آمدہ یک سوال کردہ۔ آنحضرت آں سائل جواب دادند"۔

اس سرخی کے تحت جو نظم نقل کی گئی ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے

یک تھا طالب صادق مرد ‏ ‏ ‏ ‏ دانا عاقل اہل درد

ایک سو اکیس ابیات کے بعد صفحہ ۱۵ پر رکاب "دونوں کیرا" ہے لیکن اگلے صفحے ۱۶ سے نئی نظم شروع ہو گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ناقص الآخر ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ نثری رسالے کے بعد جو نظم شروع ہوتی ہے وہ ۲۰ ابیات پر ختم ہوجاتی ہے اور "آوردہ اند کہ حضرت شاہ برہان الدّین" کی سرخی کے تحت دوسری نظم شروع ہوتی ہے۔ پہلی نظم اور اس کے مصنّف کے نام کا پتا نہ چل سکا۔ پروفیسر سروری نے "اردو مثنوی کا ارتقا" میں اس کو شاہ برہان الدّین کی تصنیف بتایا ہے جو قرین قیاس نہیں۔ البتہ دوسری نظم "کشف الانوار" مصنّفہ شاہ داول ہے۔ اس مثنوی کا دوسرا مکمل نسخہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

اس طرح فہرست مخطوطات اردو، جامعۂ عثمانیہ میں پروفیسر سروری نے "رسائل شاہ امین الدّین اعلیٰ" کے سلسلے میں نمبر ۱ پر جس "رسالہ در نظم و نثر" کا ذکر کیا ہے وہ نہ تو ایک رسالہ ہے اور نہ نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ بلکہ انھوں نے ایک نثری رسالے اور دو مثنویوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، دوسری مثنوی کشف الانوار مصنّفہ شاہ داول ہے۔ لیکن پہلی مثنوی اور ناقص الاول نثری رسالے کے نام اور مصنّف کا پتا نہ چل سکا، اس لیے ان کو حضرت امین کی تصانیف میں شامل کرنا قرین احتیاط نہیں۔

رسالہ نمبر ۲

پروفیسر سروری لکھتے ہیں

"رسالہ منظوم اور نثری تحریر میں ہے (۱۴)"۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس کا نام "رسالۂ منظوم" بتایا ہے (۱۵)۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے پروفیسر سروری کے جملے میں لفظ منظوم کو خبر نہیں سمجھا، حالانکہ لفظ "رسالہ" مبتدا اور "منظوم اور نثری تحریر میں ہے" خبر ہے؟ بلکہ انھیں رسالہ منظوم میں صنعت توشیحی کا دھوکا ہوا۔ اس لیے رسالے کا نام ہی "رسالۂ منظوم

لکھ دیا۔

یہ دراصل حضرت امین کی مثنوی وجودیہ ہے جس کے نسخے کتب خانۂ نواب سالار جنگ (۱۰۱ تصوف ۱۰۲ تصوف) کتب خانہ شاہ برہان الدین (بیجاپور) ۔ کتب خانہ درگاہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ (بیجا پور) ۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں ملتے ہیں۔

رسالہ نمبر ۳

رسالہ موسوم کشف الانوار ۱۵ سے ۱۸ تک ۔ اور آغاز اور خاتمے کے شعر نقل کیے ہیں، جن میں یہ شعر بھی شامل ہے۔ (۱۶)

داول جس کے اونچے بھاگ   ان کے سر پر پریم سہاگ (۱۷)

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے بھی اس کو حضرت امین کی تصانیف میں شامل کیا ہے (۱۸)

تعجب ہے کہ وہ شعر نقل کرنے کے باوجود جسمیں شاہ داول کا تخلص موجود ہے پروفیسر سروری اور ان کی تقلید میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس مثنوی کو حضرت امین سے منسوب کیا ہے۔

نظم کا عنوان خاتمے پر لکھا ہوا ہے: " تمت تمام شد کتاب کشف الانوار "

شاہ داول نام کے کئی بزرگ گزرے ہیں لیکن یہ مثنوی شاہ داول خلیفہ شاہ برہان الدین جانم کی تصنیف ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے نظم میں اپنے پیر کا ذکر کیا ہے

سانچا حضرت شاہ برہان   سرت ہے کو کرتا دان

اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانۂ روضتین میں اور دوسرا نسخہ کتب خانۂ درگاہ حضرت امین میں اور تیسرا نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں موجود ہے۔ اس مجموعے کے ناقص الآخر نسخے کے علاوہ روضتین ۱۰ انجمن اور درگاہ حضرت امین کے نسخے بھی اس شعر سے شروع ہوتے ہیں۔

یک تھا طالب صادق مرد   دانا عاقل اہل درد

تینوں زیر نظر نسخے میں اس شعر سے پہلے ۲۰ ابیات زائد ہیں۔

رسالہ نمبر ۴

اس رسالے کے بارے میں پروفیسر سروری رقم طراز ہیں:

"..... موضوع تصوف ہے۔ یہ رسالہ خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین سے ملتا جلتا ہے۔ بعض ابتدائی اور درمیانی حصے بالکل مطابق ہیں۔ اکثر مقامات مختلف بھی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس رسالے اور معراج العاشقین کا ایک ہی فارسی ماخذ ہو"۔

آغاز: بسم اللہ الرحمن الرحیم

"اے تن واجب الوجود اس کا مقام شیطانی۔ باٹ شریعت۔ ذکر جلی۔ نفس امارہ۔ عقل قیاس۔ فرشتہ موکل میکائیل۔ شہدت مبداء۔ منزل ناسوت۔ دُسرا تن ممکن الوجود۔ اس کا باٹ طریقت۔ ذکر قلبی۔ نفس لوّامہ۔ عقل وہم فرشتہ ....."

رسالہ دس باب پر ختم ہوتا ہے جن کی تفصیل مصنف کے الفاظ میں یہ ہے:

"پہلا باب توبہ کے بیان میں۔ دوسرا باب پچھانت کرنا نفس دل روح سرنور ذات شریعت۔ طریقت اور تیسرا باب وضو کا (۴) دنیا کو ترک کر دینا۔ پانچواں باب تجرید و تفرید۔ چھٹا باب اپنی پچھانت ساتواں بات عشق کا آٹھواں باب تعشّق کا۔ نواں باب فنا اور بقا ہونے کا۔ دسواں باب صفت کا۔" اسی پر رسالہ ختم ہوتا ہے۔ معراج العاشقین میں یہ تقسیم نہیں ہے۔

خاتمہ:

> قولہ تعالیٰ و فی انفسکم افلا تبصرون خدا کیسا میں تمھارے تنا (تناں) میں ہوں دلے تمھیں دیکھتے نہیں منجے مقصود اس میں مرید منتی خدا کا وصل ہور قرب ہوریکانگے (یگانگی) تمام ہے۔ ہور جیکوئی بستائے درد مند ہے اسے سب صحت ہے۔ اگر کوئی عارف اچھے تو اس میں قرآن کے تیس سپارے ہور ایک سو چودا صورتاں ان میں تمام ہیں۔ تمت شد.. " (۱۲)

اس رسالے کے تعیّن میں بھی پروفیسر سروری نے غلطی کی ہے اور دو رسالوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ انھوں نے آغاز کا جو اقتباس نقل کیا ہے وہ رسالۂ وجودیہ مصنفہ میراں جی خدا نما کا ہے اور خاتمے کی عبارت میراں جی خدا نما ہی کے ایک اور رسالہ شرح مرغوب القلوب (۱۳) کی ہے۔ رسالے کی تفصیل جو خود مصنف کے الفاظ میں نقل کی ہے وہ رسالۂ مرغوب القلوب سے متعلق ہے

زیر بحث مجموعے میں رسالۂ وجودیہ حسب ذیل جملوں پر ختم ہوتا ہے:

......یوں اپس میں خدا کوں دیکھیا ہور ہر ایک چیز میں بی یونچ ہے۔ اس کا گواہی خدا دیا ہے۔ قولہ تعالیٰ فاینما تولو فثم وجہ اللہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید وفی انفسکم افلا تبصرون وھو معکم اینما کنتم۔ یوں آپس میں ذات خدا کی ہور ہر یک چیز میں دیکھ۔ واللہ اعلم بالصواب۔"

یہ عبارت جہاں ختم ہوتی ہے وہیں سے "این کتاب مرغوب القلوب کل امرذی بال لم یبد بہ بسم اللہ فھو ابتر پیغمبر علیہ السلام کہے جیو کو بچہ کام کرے گا خدا کا ناوں نالے کر تو او کام پامال ہوتے گا۔ ...." کی عبارت کے ساتھ مرغوب القلوب کا آغاز ہو گیا ہے۔ پروفیسر سروری نے غالباً اس عبارت پر غور نہیں کیا جس کی وجہ سے انھوں نے دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے مرغوب القلوب کا ذکر تصانیف میراں جی شمس العشاق کے تحت کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

> شرح مرغوب القلوب کا ایک مخطوطہ کتب خانۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں بھی موجود ہے۔ لیکن پروفیسر عبدالقادر سروری نے شاہ امین الدین اعلیٰ کے رسائل میں شمار کیا ہے ... چنانچہ پروفیسر صاحب نے جو اقتباسات نقل کیے ہیں وہ سب شرح مرغوب القلوب کے ہیں۔ (۱۴)

پروفیسر سروری نے دو ہی اقتباس نقل کیے ہیں جن میں سے ایک یقیناً مرغوب القلوب کا ہے۔ لیکن دوسرا اقتباس مرغوب کا نہیں بلکہ رسالۂ وجودیہ کا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے اس بیان سے کہ سب اقتباسات مرغوب القلوب کے ہیں، یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پروفیسر سروری کی طرح وہ بھی وجودیہ اور شرح مرغوب القلوب میں امتیاز نہیں کر سکیں۔

رسالۂ وجودیہ کے نسخے کتب خانۂ ادارۂ ادبیات اردو (۹۵۴) کتب خانۂ آصفیہ (۵۸۲ تصوف شالمات، ۴۴ شالمات) کتب خانۂ درگاہ حضرت امین (شاپور) میں اور مرغوب القلوب کے نسخے کتب خانۂ آصفیہ (۹۱۲ حدیث ۴۴۸ جدید) اور کتب خانۂ انجمن ترقی اردو

پاکستان (کراچی) میں ملتے ہیں۔ حکیم شمس اللہ قادری نے اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر محمد قاسم کے کتب خانے میں بھی دیکھا تھا۔

رسالہ نمبر۵

پروفیسر سروری کہتے ہیں کہ "کرسی نامے کے نام سے ایک شجرۂ چشتیہ درج ہے۔ اس کا اگلا حصہ مفقود ہے۔ شروع اس مقام سے ہوتا ہے۔ الٰہی بحرمت راز و نیاز حلقہ خلافت خواجہ نصیرالدین ابویوسف چشتی قدس اللہ العزیز" (۱۵)

کرسی نامہ شجرے ہی کو کہتے ہیں۔ یہ شجرہ حضرت علی سے شروع ہو کر بابا شاہ حسینی پر ختم ہوتا ہے۔ اس شجرے کا ابتدائی حصہ جیساکہ پروفیسر سروری کا بیان ہے مفقود نہیں ہے بلکہ اسی مجموعے میں موجود ہے اور خود پروفیسر سروری نے نمبر۱۱ پر اس کا ذکر کیا ہے(۱۶) لیکن وہ ان دونوں کو الگ الگ اور اوّل الذکر کو ناقص الاوّل اور مؤخرالذکر کو ناقص الآخر سمجھتے رہے۔ اسی لیے انھیں پتا نہ چل سکا کہ یہ ایک ہی شجرہ ہے جس کے اوراق جلد بندی میں منتشر اور مقدم و مؤخر ہو گئے ہیں۔ لیکن سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ شجرے کو حضرت امین کی تصانیف میں شامل کرلیا ہے۔ (۱۷)

شجرے کے خاتمے پر اسی سطر سے جہاں شجرہ ختم ہوتا ہے، بسم اللہ لکھ کر نیا رسالہ شروع کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر سروری نے اس رسالے کا ذکر شجرے کے ساتھ نمبر۵ کے سلسلے میں کیا ہے اور حسب ذیل نمونہ دیا ہے:۔

> "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پیر کوں ہور پیغمبر کوں ہور خدا کوں ایکچ کر دیکھے ہور ایکچ کر جانے حضرت علی قول کہے عرف ربی بربی رایت بربی۔ اس کا معنا حضرت کہے میں پچھانا خدا کوں خدا تیں دیکھیا خدا کوں خدا تیں"

اس رسالے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

حضرت سیّد محمد حسینی گیسو دراز قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں:

> "دنفس کوں پاک کرے گا تو دل کوں صاف ہوں گا"

اس کا خاتمہ یہ ہے:

> "ہور نفس، دل، روح، سر، نور، ذات، اے ایک ہیں۔ و لے ہر ایک صفت پر لونوں؟ جدا جدا ہوتا ہے۔ اے سب یوں بوجھیا

مونیک بخت ہے اور موحد یگانہ ہے۔ اسے بوجھے نہیں تو وہ
بد بخت ہے۔ اسے سب پیر کی مت سوں باتاں ہے
تمت تمام شد۔

آغاز کا نمونہ ٹھیک ہے لیکن خاتمے کی عبارت اس رسالے کی وہ نہیں ہے جو پروفیسر سروری نے نقل کی ہے۔ اس لیے کہ "حضرت سیّد محمد حسینی گیسودراز قدس اللہ سرہٗ العزیز فرماتے ہیں، والی عبارت جہاں سے شروع ہوتی ہے اس سے پہلے واللہ اعلم بالصواب تمت تمام۔ لکھا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تمّت تمام پر یہ رسالہ ختم ہوجاتا ہے اور اس کے بعد حضرت بندہ نواز کا قول یا ان کے کسی رسالے (یا ان سے منسوب کسی رسالے) کی عبارت نقل کر دی ہے۔

اس رسالے کے نام اور اس کے مصنّف کا پتا نہ چل سکا۔

رسالہ نمبر ۶

اس رسالے کے بارے میں پروفیسر سروری کا خیال ہے کہ:

"رسالہ ارشادات اور نکات تصوّف پر ہے۔ اس کے نو تماشے (فصول) ہیں اور ہر ایک میں ایک ایک نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ رسالے کا آغاز ہے، سفر کا تماشا ظاہر و باطن دیکھنا لازم تجھ امر الست بر بکم مختار میثاق تھے بوجہ پہلا تماشا دیکھنا واجب۔ پہلے تن کا بھوکہ حواس خمس یوکیوں مل برتیں کیتا کتے سنجو کہ پانچ اناسر۔"

خاتمہ:

نواں تماشہ: دھرا ادس دیکھ سکے نا لاجہ دومل جلوا ایک تخت پر
لذتوں کرتے راز سید علی مل

یکہ تماشا شاہ برہان کی سات سر پر تیرے پگڑی اللہ بختوں لاگی بات

تمام شد

تمہید کا حصہ نثر میں ہے لیکن پہلے تماشے سے نظم شروع ہوتی ہے۔ (۱۸)

ڈاکٹر رفیعہ نے اس رسالے کا نام ارشادات بتایا ہے اور لکھا ہے:

اس کی صرف تمہید نثر میں ہے ارشاد نامہ نامی ایک اور رسالے کا مولوی نصیر الدّین ہاشمی نے ذکر کیا ہے جس کا پتا انھوں نے

مولوی عبداللہ صاحب کے ذاتی کتب خانے میں چلایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ امین نے اپنے والد شاہ برہان کی مثنوی ارشادنامے کو نثر کا جامہ پہنایا ہے اور ہر باب کو تماشا سے موسوم کیا ہے۔ اس طرح اس رسالے میں نو تماشے ہیں۔ پہلا تماشا نظم سے شروع ہوتا ہے۔(۱۹)

پروفیسر سروری اور ڈاکٹر رفیعہ دونوں نے اس رسالے کی ہیت اور اس کے موضوع کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ اس لیے ان کا کوئی بیان درست نہیں ہے۔ یہ دراصل ایک شعر کی ایک مثنوی ہے جو نثر کی طرح لکھی گئی ہے۔ پروفیسر سروری اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے جس نثری تمہید کا ذکر کیا ہے وہ ان کے اپنے خیال کی پیداوار ہے۔ مثنوی کا پہلا شعر ہی تمہیدی حیثیت رکھتا ہے جس کے بعد مراتب وجود کا بیان عروج کے انداز میں دو دو ابیات میں کیا ہے۔ البتہ پہلے مرتبے کا بیان چار ابیات میں ہے اس لیے یہ کہنا نظم نو ابواب یا فصول پر مشتمل ہے درست نہیں

سروری صاحب اور ڈاکٹر رفیعہ نے جو نمونہ نثر کی طرح نقل کیا ہے، وہ دراصل مثنوی کے ابتدائی دو اشعار اور تیسرے شعر کے ابتدائی دو الفاظ پر مشتمل ہے۔

یہ مثنوی سید علی گنج گوہر کی تصنیف ہے۔ چنانچہ مثنوی کے آخری شعر میں شاعر اور اس کے پیر کا نام موجود ہے

سید علی مل دیکھ تماشا شاہ برہان کے سات
سر پر تیری پگڑی شہ کے بختوں لاگے ہات

اس مثنوی کا ایک نسخہ "سفر نامۂ سید علی گنج گوہر" کے نام سے پروفیسر آغا حیدر حسن کی مملوکہ اس بیاض میں موجود ہے جس کا کاتب نصرت ہے اور جو ۱۱۱۳ ہجری اور ۱۱۱۶ ہجری کے درمیان لکھی گئی ہے۔

رسالہ نمبر۷

نور نامہ

پروفیسر سروری نے اس رسالے کے بارے میں کوئی نوٹ نہیں لکھا ہے۔ صرف آغاز و اختتام کا نمونہ نقل کر دیا ہے

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علی رسولہ محمد و آلہ

اجمعین۔ بداں راشدک اللہ فی الدارین برطلب صادق (طالب صادق) مخفی و محتجب نماند کہ حق تعالیٰ در قرآن مجید فرمودہ۔ کہ اشہدان لاالہ الا اللہ ہور اس کا معنا خدا کیا ہے دیا کہ تحقیق نہیں کوئی موجود جز اہیں"۔

اس کے بعد نور معرفت کی تجلّیات کے مظاہر کا ذکر ہے۔

خاتمہ:

کہتا دوسری یک تمیز یو ہے کہ نور ایک دریا بے پایاں ہے اس پر موظان آتیاں جاتیاں سو عرفان ہے۔ اس دریا کے بھتر تھے موظان پر بلیا سو ذات کا میوہ ہے۔

تمّت تمام شد۔"

ڈاکٹر رفیعہ نے بھی اس رسالے کو حضرت امین کی تصانیف میں شامل کیا ہے۔ رسالے کے خاتمے پر رسالے کا نام تو درج ہے۔ لیکن مصنف کا پتا نہ چل سکا۔

رسالہ نمبر ۸

پروفیسر سروری نے لکھا ہے کہ "رسالہ نکات معرفت کا ہے" اور ڈاکٹر رفیعہ نے اس کا نام ہی "نکات معرفت" بتایا ہے دونوں نے حسب ذیل اقتباس نقل کیا ہے۔

اللہ بڑا صاحب ہے اس کو بہوت ہور نودرنا (۲۰) اس کی خدائی تھے دونو عالم پیدا کرنے میں عقل کیا (۲۱) انکھیاں حیرن ہیں۔ خدا دائم قائم ہے"

یہ عبارت شرح شرح تمہیدات عین القضات کے حصۂ تمہید کی ہے۔ اس کے بعد سے ابواب شروع ہوتے ہیں۔ پہلے باب "بصیرت اور بصارت" کے ابتدائی حصے کے بعد کتاب کا باقی حصہ غائب ہے۔ آخری حصے کی عبارت یہ ہے:

اجلے کاغذ پر اس کالے سترال میں نور تو نا دیکھیں (دیکھیں) اس (اسے) مخلوق کہتے ہیں۔ اسے جیوں پہلے قران میں خدا کھیا اس قران کوں کاغذ ... " یہ شرح "شرح تمہیدات عین القضات" مترجمہ میراں جی خدا نما کے اقتباس ہیں۔

زیر نظر مجموعے میں جس کے صرف تین صفحات محفوظ رہ گئے ہیں اس رسالے کے مکمل نسخے کتب خانۂ نواب سالارجنگ (۱۳۲ تصوّف، ۱۳۳ تصوّف)۔ کتب خانۂ انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کتب خانۂ روضتین (گلبرگہ) اور کتب خانۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

میں موجود ہیں۔

رسالہ نمبر ۹

رموز السالکین

پروفیسر سروری نے قیاس آرائی کی ہے کہ - غالباً شمس العشاق کے ارشادات کو امین نے لکھا ہے (۲۲) یہ غلط فہمی انھیں ترقیمے کے حسب ذیل الفاظ سے ہوئی ہے۔

تمت تمام شد گفتار صاحب شمس العشاق"

یہاں شمس العشاق سے مراد میراں جی شمس العشاق نہیں بلکہ حضرت بلکہ حضرتؒ امین ہیں ۔ جن کے نام کے ساتھ بھی شمس العشاق لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ درگاہ حضرت امین کے مخزونہ شجرہ کلاں میں ان نام اس طرح لکھا ہوا ہے۔

"شمس العشاق حضرت امین الدین علی معشوق ربانی ۔ علی ثانی ۔ قطب حقیقی حضرت پیر دستگیر روشن ضمیر قدس اللہ سرہ......."

رسالہ نمبر ۱۰

پروفیسر سروری اس رسالے کے بارے میں لکھتے ہیں

"رسالے کا آغاز نویں رسالے کے اشعار ہی سے ہوتا ہے لیکن پانچویں شعر سے دونوں میں اختلاف شروع ہو گیا ہے۔ مسلسل بارہ ابیات لکھنے کے بعد حدیث من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کی تشریح شروع ہوتی ہے کہ خاصیت خاک ہو کل فرشتہ ، مہتر جبرائیل رنگ زرد و خانہ خاک تلی و در افواہ است۔ رگاں اور گوشت استخوان اور پوست ابری جستی پشم برجان خاکی دم۔"

اس طرح رسالہ ختم ہوتا ہے

اتنیاں صفتاں سوں ہوس جمع ہوتا ہے۔ آخر باہر آتا بعد چہل روز تک نور میں رہتا ہور دیکھ پر آتا سو روح کا نظر اسے جانیاں سو دل کی جاگہ پکڑنے لگیا سو نفس معلوم ہوتا ہے۔ اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد و بارک و سلم (۲۳)

پروفیسر سروری نے اس رسالے کا نام نہیں بتایا ہے۔ حالانکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے پہلے "ایں کتاب رموز العارفین " درج ہے

اس رسالے کا آغاز رموز السالکین (۲۵) کے اشعار سے ہوتا ہے جن کی تعداد چار ہے۔ ان اشعار کے بعد مزید چند شعروں میں پانچ عناصر کا ذکر ہے۔ اشعار کے خاتمے پر حدیث من عرف لکھ کر پانچ عناصر کے پچیس گن کی تفصیل چند سطروں تک فارسی میں کی ہے اور پھر دکنی شروع ہو جاتی ہے۔

مصنّف کے بارے میں کوئی داخلی یا خارجی شہادت نہیں ملتی

رسالہ نمبر ۱۱

پروفیسر سروری لکھتے ہیں کہ "شجرہ چشتیہ درج ہے جو حضرت علی سے لے کر حضرت خواجہ ابو محمد چشتی قدّس اللہ سرّہ العزیز تک ہے اس کے بعد کا حصہ غائب ہے (۲۶)

یہ دراصل اسی شجرے کا ابتدائی حصہ ہے جس کا ذکر نمبرہ پر ہو چکا ہے۔

رسالہ نمبر ۱۲

پروفیسر سروری لکھتے ہیں کہ یہ آخری رسالہ خط نستعلیق شکستہ آمیز میں لکھا ہوا ہے جس کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج ہوا پیغمبر نے پوچھے کہ سات طبق آسمان اور سات طبق زمین کیا قدیم کیا جدید ہے۔ قال اللہ تعالیٰ یا نبی این ہمہ جدید آفریدہ ام ....

خاتمہ:

شاہد ہنکار را سک راس	مطلق محیط سب کے پاس
کج مخفی ہے پیو کا ٹھار	دل میں پیو کا دیکھ دیدار
جیو میں پیو کا ہے دیکھ ٹھاؤں	دونو کا ہے ایکیچ ناؤں
بندہ ہوے تو تحقیقت (۲۷) جان	اللہ نبی پر لیا ایمان
اللہ بندے کا ایک ہی ٹھان	مطلق دو کا ایک نشان
من عرف کر کری بوجھے گا	اس کو اللہ سوجھے گا
لا عبد و لا رب	تابہا بتلا نا میاں اب (۲۸)

کاتب نے "سوال و جواب" کی سرخی لگا کر حضرت امین کا رسالۂ گفتار (۲۹)

کاتب نے "سوال و جواب" کی سرخی لگا کر حضرت امین کا رسالۂ گفتار (۲۹) شروع کیا ہے۔ لیکن چند سطریں لکھنے کے بعد "قربیہ" کے کچھ شعر نشر ہی کے انداز میں نقل کر دیے ہیں اور انھی اشعار پر یہ رسالہ ختم ہوتا ہے۔ پروفیسر موصوف کو اس پیوند کاری کی وجہ سے اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ حضرت امین کا کوئی مستقل رسالہ نہیں ہے بلکہ ان کے نظم و نثر کے رسالوں کی بے ترتیب کتابت کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے۔

(رسالۂ اردو، کراچی شمارہ ۳۰۳، ۱۹۷۰ء)

●

شائقین کو مطّلع کیا جاتا ہے کہ رسالہ تحقیق کے شمارۂ اوّل (۱۹۸۷ء) اور شمارۂ چہارم (۱۹۹۰ء) کے نسخے ختم ہو چکے ہیں ان شماروں کا کوئی نسخہ شعبے میں، فروخت کے لیے دستیاب نہیں ہے۔ ان دونوں شماروں کی عکسی طباعت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔

حواشی

(۱) فہرست مخطوطات اردو جامعۂ عثمانیہ، ص ۲۶۔

(۲) اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، ص ۱۸۶۔

(۳) بابا شاہ حسینی کا سنہ وفات ۱۱۱۹ھ ہے، اور "دل بخدا پیوست" سے تاریخ نکلتی ہے۔

(۴) فہرست مخطوطات اردو جامعۂ عثمانیہ، ص ۲۸۔

(۵) گنجی غلط قراءت ہے، گنج ہونا چاہیے۔

(۶) چھنٹے

(۷) اس مصرعے کی صحیح قراءت یوں ہے: سرت ہے گر گرتا دان۔

(۸)، (۹)، (۱۰)، (۱۱) گر۔

(۱۲) فہرست مخطوطات اردو جامعۂ عثمانیہ، ص ۲۸۔

(۱۳) اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، ص ۹۳۔

(۱۴) فہرست مخطوطات اردو جامعۂ عثمانیہ، ص ۲۹۔

(۱۵) اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، ص ۱۸۹۔

(۱۶) فہرست مخطوطات اردو جامعۂ عثمانیہ، ص ۳۰۔

(۱۷) چرم۔

(۱۸) اردو نثر کا آغاز اور ارتقا، ص ۱۸۹۔

(۱۹) فہرست مخطوطات اردو جامعۂ عثمانیہ، ص ۳۱۔

(۲۰) اس رسالے کو مولوی عبدالحق (رسالۂ اردو بابت جولائی ۱۹۲۰ء)، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

(اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ، ص ۱۳۹) ، اور ڈاکٹر نذیر احمد (علی گڑھ ، تاریخ ادب اردو ، ۲۱۶) نے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف قرار دیا ہے ، جو درست نہیں ہے ۔ ملاحظہ ہو اردوے قدیم ۱۹۶۷ء ، ملحقات ص ۵۹ ، اور میراں جی خدا نما مصنفہ ڈاکٹر حفیظ قتیل ، ص ۸۳ ۔

(۲۱) اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ، ص ۱۳۹ ۔

(۲۲) فہرست مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ ، ص ۳۲ ۔

(۲۳) ایضاً ، ص ۳۰ ۔

(۲۴) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے بھی حضرت امین کی تصانیف میں کرسی نامے کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ، ص ۱۸۶) ۔

(۲۵) فہرست مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ ، ص ۳۲ ۔

(۲۶) اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ، ص ۱۹۳ ۔

(۲۷) سرانا ہور بہت نوازنا (صحیح قراءت)

(۲۸) کیاں (صحیح قراءت)

(۲۹) فہرست مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ ، ص ۳۵ ۔

(۳۰) ایضاً ، ص ۳۶ ۔

(۳۱) مولوی عبدالحق نے اس مثنوی کے بارے میں متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ رسالۂ اردو بابت جولائی ۱۹۲۷ء میں اس کو رموز الواصلین کے نام سے جانم کی تصانیف میں ، اور رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۲۸ء میں رمز السالکین یا رموز السالکین کے نام سے امین الدین علی اعلیٰ کی تصانیف میں شامل کیا ہے ۔ " اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاے کرام کا کام " میں اس کا ذکر نسیم الکلام کے عنوان سے کیا ہے اور جانم کی تصنیف قرار دیا ہے ۔

(۳۲) فہرست مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ ، ص ۳۷ ۔

(۳۳) تحقیق ۔

(۳۴) فہرست مخطوطات اردو جامعہ عثمانیہ ، ص ۳۷ ۔

(۳۵) اس رسالے کو بعض محققین نے جانم سے منسوب کیا ہے ، جو درست نہیں ہے ۔

سخاوت مرزا:

کیا صراط المستقیم وجہی کی تصنیف ہے؟

وجہی تخلص، ایران و ہندوستان میں کئی شاعر گزرے ہیں۔ ایک تو وجہی تفرشی ملازم اکبر بادشاہ تھا، جس کو تقی اوحدی نے ۱۰۱۹ھ میں گجرات میں دیکھا تھا۔ دوسرا وجہی (علی اکبر بیگ) کرد، معاصر شاہ عباس ثانی، مشہور مزاح گو شاعر تھا۔ تیسرے علامہ سید وجیہ الدین علوی گجراتی (۹۱۰-۹۹۸ھ) بھی فارسی میں کہا کرتے تھے اور تخلص وجہی تھا۔ چوتھا ملاّ وجہی گولکنڈوی، دکھنی زبان کا ایک باکمال شاعر اور نثر نگار مشہور ہے جس نے چار سلاطین قطب شاہی، یعنی سلطان ابراہیم قطب شہ (۹۰۰-۹۸۸ھ) و محمد قلی قطب شہ (۹۸۸-۱۰۲۰ھ) محمد قطب شہ (۱۰۲۰ھ-۱۰۳۵ھ) اور سلطان عبداللہ قطب شہ (۱۰۸۳ھ) کا زمانہ دیکھا ہے۔ مگر اس کے حالات تاریکی میں ہیں۔ یہ تو یقینی ہے کہ یہ آخر الذکر تین سلاطین کا درباری شاعر تھا۔ اس نے ۱۰۱۸ھ میں محمد قلی قطب شہ کا افسانہ عشق لکھا تھا، جو مثنوی قطب مشتری کے نام سے مشہور ہے۔

وجہی کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا کچھ پتا نہیں چلتا، اور نہ اس کا نام ہی صحیح طور پر معلوم ہو سکا ہے، البتہ یہ اپنے تخلص وجہی اور وجیہی سے معروف ہے۔ چنانچہ مثنوی قطب مشتری میں، تخلص وجیہی اور سب رس (نثر) میں وجہی آیا ہے۔ حدیقۃ السلاطین مؤلفہ نظام الدین احمد میں، بضمن تولد فرزند سلطان عبداللہ قطب شہ، "وجیہی" کو شاعر دکنی لکھا ہے۔ ان شواہد سے مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ وجہی اور جیہی دونوں تخلص کیا کرتا تھا۔ ہمارے پاس بھی دو قوی دلائل ہیں۔ وہ یہ کہ اس کے معاصر خواصی نے اس کو وجیہی سے مخاطب کیا ہے مثلاً کہتا ہے:

اس دکن کے شاعراں میں تج شہنشہ کے نزیک

ہے خواصی ہور وجیہی شاعر حاضر جواب

مگر اس کا دوسرا معاصر افضل گولکنڈوی اس کو وجہی سے مخاطب کرتا ہے:

تجہ ایسے شاہ کو ہوتا سو وجہی سار کا شاعر

اب سوال یہ ہے کہ اس کا نام کیا تھا؟ بعض کاتبوں نے اس کا نام "وجیہ الدین" اور گجراتی الاصل لکھا ہے، چنانچہ کتب خانۂ آصفیہ کے ایک قلمی نسخے سب رس مکتوبہ ۱۲۹۵ھ میں ہے:

"تمام شد کتاب گنج الاسرار الحمد للہ والمنۃ بحق حبیبہ۔ سبرس مصنف حضرت وجیہ الدّین رحمۃ اللہ علیہ۔ بتاریخ روز سہ شنبہ شہر صفر المظفر ۱۲۹۵ھ باختتام رسید"

اور آخری اوراق میں حاشیہ پر مکرّر کاتب نے یہ لکھا ہے:

"در تعریف مولانا وجیہ الدین قدّس سرّہ"

وجہی اپنی تصنیف "سب رس کو اولاد معنوی کہتا ہے۔ مثلاً

"اس کو خرد منداں ہوے فرزنداں خردمنداں ہوے اس فرزنداں میں ظاہرا فرزند سو یو کتاب لائق مستید (مستعد؟) ہر بات اپنے وقت کا لقمان۔ افلاطون اپنے وقت کا خسرو، فرہاد۔ مجنوں۔ اپنے وقت کا خاقانی۔ انوری۔ سعدی۔ اپنے وقت کا ظہیر۔ کمال۔ سلمان۔ اپنے وقت کا ہر یک بات کا بادی۔ کلام کا صاحب۔ نام کا صاحب، الہام کا صاحب، ہر یک کام کا صاحب، روشن ضمیر الخ۔"

نسخۂ تاج الحقایق (جامعۂ بمبئی) میں اس کے کاتب نے وجہی کا نام "وجیہ الدّین محمد" لکھا اور پروفیسر عبدالقادر سرفراز مرحوم مرتب فہرست کتب خانۂ جامعۂ بمبئی نے "وجیہ الدین وجہی" بیان کیا ہے۔ مگر اس کے متعلق کسی سند کا حوالہ درج نہیں۔ بہرحال وجہی نے اپنا تخلص اپنے نام "وجیہ الدین" کی مناسبت سے رکھا ہوگا۔

گجراتی الاصل ہونے کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے البتہ مولوی عبدالحق مدظلہٗ نے لکھا ہے

"گرچہ وجہی گولکنڈہ کا ہے اور گولکنڈہ اور حیدرآباد تلنگانے میں ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ مرہٹی مثل تو ایک جگہ لکھتا ہے۔ ایک گجراتی لفظ اور شعر بھی استعمال کرتا ہے۔ مگر کہیں تلنگی مثل یا فقرہ یا لفظ سوائے "درا" یا "درانی (۱)" کے، جس کے متعلق ابھی مجھے شبہ (دا لصحیح: شبہہ) ہے اس کتاب میں نہیں آیا۔ (سب رس مطبوعہ)"

رسالہ نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون گرناتھ ایچ. دیویکر کا بعنوان "قطب مشتری میں گجراتی، کنٹری اور مرہٹی الفاظ" شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار نے گجراتی، مرہٹی، کنٹری الفاظ کی ایک فہرست دے دی ہے جس میں گجراتی الفاظ سے متعلق بھی دس مصرعے درج کیے ہیں۔ اس میں الفاظ، گگے، تچھیں، آمنا، جونا، ہیے، نحاٹ کر، باندگی، نحاس، اوناول، ڈوسا، کو گجراتی الفاظ بیان کیا گیا ہے۔ گر یہ الفاظ تو ایسے ہیں جن کو دکھنی شعرا عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ البتہ الفاظ "جونا، آمنا اور ڈوسا" خاص معلوم ہوتے ہیں

فاضل مضمون نگار نے بعض نامور ادیبوں کو مہاجرین گجرات قرار دیا ہے۔ ۹۸۰ھ میں زوال گجرات کے بعد نواب دلاور خان وزیر بیجاپور نے بعض علما، احناف متوطن گجرات کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ وجہی اگر گجراتی الاصل ہے تو ممکن ہے کہ اس نے بجائے بیجاپور کے گول کنڈہ کو ترجیح دی ہو۔

بعض کاتبوں نے وجہی کو گجرات کے مشہور و معروف علامہ وجیہ الدین گجراتی ۹۱۰۔۹۹۸ھ سے گڈمڈ کر دیا ہے۔ جو سلطان محمود بیگڑہ اور سلطان مظفر سوم گجراتی کے معاصر تھے۔ اور یہی زمانہ سلطان ابراہیم قطب شہ کا ہے۔

علامہ وجیہ الدین علوی (۹۱۰۔ ۹۹۸ھ) گجرات کے ایک بڑے محقق عالم، محدث اور صوفی تھے۔ مگر وجہی زیر بحث نے اپنی تصانیف میں علامہ مذکور کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ سب رس میران جی، المعروف تاج الحقائق میں داورالملک "شاہ داول گجراتی" سے متعلق ایک ضرب المثل درج ہے اور خود سب رس مولفہ وجہی میں ایک اشارہ شاید حضرت محمد غوث گوالیاری کی طرف ہے جو علامہ علوی گجراتی کے پیر تھے۔ مثلاً وہاں "گوالیار کے چاتراں" لکھا ہوا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں شاید وجہی نامی ایک اور شخص بھی گزرا ہے جس کا مذہب اثنا عشری تھا اور علوم عقلی و نقلی کا زبردست عالم تھا۔ اس کی ایک تصنیف علم عقاید و کلام میں "صراط المستقیم فی دین قویم" بزبان فارسی، کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر حیدرآباد (دکن) میں محفوظ ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو سلطان ابراہیم قطب شاہ ۹۵۷۔۹۸۸ھ سے معنون کیا ہے۔

اب غور طلب یہ ہے کہ آیا یہ وجہی وہی مشہور شاعر و نثر نگار ہے جس کی مثنوی قطب مشتری، تالیف ۱۰۱۸ھ اور "سب رس" نثر دکنی تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے؟ اس کا صحیح پتا

چلانے کے لیے وجہی کے زمانۂ پیدائش و وفات اور عقاید پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

وجہی کے زمانۂ ولادت کے متعلق مولوی عبدالحق مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ :

"یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بچپن محمد قلی قطب شہ کے زمانے میں بسر ہوا۔ "سب رس" جب لکھی تو اس وقت ابراہیم قطب شہ کو مرے ہوئے اٹھاون برس ہوئے تھے۔ اس حساب سے یہ امر مشتبہ ہے کہ وجہی نے ابراہیم قطب شہ کا زمانہ دیکھا تھا..... الخ"۔

ڈاکٹر زور حیدرآبادی فرماتے ہیں کہ

"غالباً یہ ابراہیم قطب شہ (۹۵۷-۹۸۸ھ) کے عہد میں پیدا ہوا"

اور یہ شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ :

"اتنے قریب کے زمانے میں ایک ہی دربار کے دو شاعر یعنی مصنّف قطب مشتری اور سب رس ایسے گزر سکتے ہیں جن کا تخلص ایک ہی ہو"

مگر یہ کوئی قوی استدلال نہیں معلوم ہوتا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ابراہیم قطب شہ کے زمانے میں ایک وجہی تھا جو محض ایک فاضل تھا اور صرف فارسی کا شاعر تھا، اور دکھنی زبان سے اس کو تعلق نہ تھا۔ اور محمد قلی قطب شہ کا درباری شاعر وجہی مصنف قطب مشتری تھا اور اس مثنوی کی تصنیف کے وقت وہ ایک مشاق اور مشہور شاعر تھا، جس کو مولوی عبدالحق قبلہ بھی مانتے ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ سب رس کی تصنیف (۱۰۴۵ھ) کے وقت وجہی ۲۰ سال کا تھا۔ مگر کوئی سند پیش نہیں فرمائی ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو وجہی کی عمر ابراہیم قطب شہ کے زمانے میں پندرہ سولہ سال کی تھی۔

ہمارا استدلال یہ ہے، اور یہ امر مسلّمہ ہے کہ وجہی نے اپنی مثنوی قطب مشتری ۱۰۱۸ھ میں ایک شاعر فیروز کی بڑی تعریف کی ہے، جو، حضرت شیخ ابراہیم ملتانی (المعروف بہ مخدوم جی قادری بیدری المتوفی ۹۷۲ھ) کا دیکھنے والا ہے۔ نیز دوسرے شاعر محمود کی بھی تعریف کی ہے جو مثنوی مذکور کی تالیف سے بہت عرصہ قبل فوت ہو چکے تھے۔ اس لیے قرین قیاس ہے کہ وجہی نے فیروز کو دیکھا ہے۔ اور ابراہیم قطب شہ کے زمانے (۹۵۷-۹۸۸ھ) میں اس کا عالم شباب تھا، اور اس وقت اس کی شاعری کی ابتدا تھی۔ جب ہی تو وہ قطب مشتری جیسی مثنوی

کے متعلق فیروز و محمود سے اپنی داد کا طالب ہے، جو اس نے ۱۰۱۸ھ میں لکھی۔

ایک تصنیف "صراط مستقیم فی دین قویم" کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر مرحوم حیدرآباد (دکن) میں ہے۔ جس کے متعلق فاضل مرتبین فہرست مخطوطات عربی و فارسی نے لکھا ہے کہ یہ "وجہی" کی ہے جس کو وجہی نے سلطان ابراہیم قطب شہ ۹۵۷۔ ۹۸۸ھ سے معنون کیا ہے اور ایک جگہ اسی کتاب میں اشارہ کیا ہے کہ میری اور بھی مبسوط تصانیف علم کلام و عقاید میں ہیں "فارجع الیہا" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان مذکور کے ابتدائی زمانے میں اس کی کافی عمر تھی، کم از کم تیس بتیس سال کی تو ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے اگر یہ وجہی وہی ہمارا دکھنی شاعر ہے تو اس کی ولادت کا زمانہ، ابراہیم قطب شہ کا آخری زمانہ نہیں بلکہ ابتدائی عہد (۹۸۰ھ) ہے۔

وفات کے متعلق، طبعی گولکنڈوی نے اپنی مثنوی بہرام و گل اندام (تصنیف ۱۰۸۱ھ) میں اس کی دنیا میں عدم موجودگی کا اشارہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے وجہی مثنوی مذکور کی تالیف سے بہت عرصہ قبل فوت ہوچکا تھا۔ ڈاکٹر زور صاحب ۱۰۸۱ھ سے پچیس سال قبل وفات کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح گویا وفات تقریبا ۱۰۵۶ھ لکھی ہے۔ اس لحاظ سے اس کی عمر ۷۰ سال سے زاید تھی، اور اس کی آخری تصنیف "سب رس" (۱۰۴۵ھ) ہے۔ اس کے معاصر غوّاصی نے ایک قصیدہ عبداللہ قطب شہ کی مدح میں اپنی ضعیف العمری کے زمانے میں کہا ہے، جس میں وجہی کا ذکر ہے، اور وجہی کے ساتھ خود کو "شیر نیستان شاعری" کہتا ہے:

عارفاں ہیں سو کہتے ہیں یوں کہ اج اس دور میں
شیر ہیں یو شعر کے فن میں بحق بوتراب

اس لیے غوّاصی گو وجہی سے عمر میں چھوٹا ہو مگر دونوں نے طویل عمر پائی ہے۔ غواصی کے متعلق تو ۱۰۷۰ھ و ۱۰۸۹ھ تک بقید حیات ہونے کے اشارے ملتے ہیں، مگر وجہی کے متعلق، تصنیف سب رس ۱۰۴۵ھ کے بعد، تواریخ میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس لیے ڈاکٹر زور کا قول، جس کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے، زمانہ وفات ۱۰۵۶ھ مشتبہ ہوجاتا ہے۔

ان حالات کے تحت اگر "صراط مستقیم" کا مصنّف وہی دکھنی شاعر وجہی ہے تو اس نے کتاب مذکور قبل ۹۸۸ھ لکھی اور ابراہیم قطب شہ سے معنون کی، اور مثنوی قطب مشتری ۱۰۱۸ھ میں یعنی ابراہیم قطب شہ کا افسانۂ عشق لکھا، اور سب رس ۵۸۰ سال بعد ۱۰۴۵ھ

میں لکھی۔ اور اس وقت اس کی عمر ۸۰۔۸۵ سال سے کم نہ تھی۔

اس کی مشہور تصنیف سب رس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وجہی کو نہ صرف علم ادب و علم الالسنہ، بلکہ حدیث و تفسیر و تصوف و کلام پر کافی تبحر حاصل تھا۔ چنانچہ سب رس میں عربی فقروں اور احادیث کے بیسیوں حوالے موجود ہیں، جس سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ "صراط مستقیم" کا مصنف ممکن ہے وجہی مصنف قطب مشتری و سب رس ہی ہو۔ مگر "کتاب صراط مستقیم فی دین قویم" کا مصنف "وجہی گولکنڈوی" قرار دینے کے لیے اس کے عقاید پر غور کرنا ہوگا کہ اس کا مذہب کیا ہے؟

وجہی کے عقاید

اپنی تصنیف "صراط مستقیم" تصنیف قبل ۹۸۸ھ کے آئینے میں تو وہ زبردست مجتہد شیعہ ہے اور علوم عقلی و نقلی کا عالم تبحر ہے۔ اور مثنوی قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) کی داخلی شہادت سے بھی وہ اثناء عشری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے خلفاء راشدین کا بالکل ذکر نہیں کیا اور منقبت حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ایک نظم لکھی ہے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کو خاتم ولایت مانتا ہے مگر کسی دوسرے صحابی رضی اللہ کا ذکر نہیں کرتا۔

البتہ سب رس (نثر میں تصنیف ۱۰۴۵ھ) کی تمہید میں خلفائے راشدین کی تعریف کی ہے۔ یہ تمہید سب رس کے صرف ایک نسخے میں ہے۔ مثلاً عنوان یہ ہے۔

> "در نعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و چہار یار، منقبت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما"

ابابکر صدیق صادق ہیں خاص
کیے خارجیاں کو شریعت میں راس

عمر جب نبی کی امت میں ہوے
یہودی عرب نے جو تھے سر نوے

جمع کر جو عثمان قرآن کوں
شرم کا دیے زور ایمان کوں

ٹوٹیا کفر علی بہت لیے ذوالفقار
خدا بعد محمدؐ بھی چاروں ہیں یار

مگر اس کو الحاقی تصور نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ "سب رس" کے دوسرے نسخوں میں بعبارت نثر مدح صحابہ رضی اللہ موجود ہے، کہتا ہے:

"حضرت کہیں خدا شاہد، انا و علی من نور واحد، تن سوں، تن جیو سوں جیو، دم سوں دم، نبوت محمد پر ولایت علی پر ختم، ابابکر عمر ہور عثمان جنوں کی نیکی جانتا سب جہاں، حضرت کے یاراں ہیں، بزرگواراں ہیں ایکس تے ایک سب بھلے، جیوں خدا رسول فرمایا تھا تیوں چلے، لاف نیں کیے، خلاف نہیں کیے، حق پر چلن ہارے، ایسیچ اچھے ہیں خدا کے پیارے، ایسیچ رہتے ہیں حضرت کے یار، جنوں سوں حضرت کرتے تھے بچار، آخر بعد از حضرت کے بیٹھے حضرت کے ٹھار الخ۔"

اس لحاظ سے "صراط مستقیم" اور "قطب مشتری" کے وجہی اور سب رس کے وجہی کے عقاید میں بعد المشرقین معلوم ہوتا ہے۔ تو کیا وجہی نے آخر عمر میں اپنے عقاید بدل دیے تھے یا تفضیلی مذہب اختیار کر لیا تھا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

صراط المستقیم فی دین قویم، کتب خانۂ نواب سالار جنگ بہادر کا ایک نادر مخطوطہ ہے جو ایک مقدمہ، پانچ اصل، ایک خاتمے پر مشتمل ہے اور ہر اصل کے ضمن میں مختلف فصول ہیں۔

ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ "صراط مستقیم فی دین قویم" ملا وجہی گول کنڈوی کی تصنیف نہیں۔ دیباچے میں لفظ وجہی بیائے معروف لکھنے کی وجہ سے مرتب کو مغالطہ ہوا ہے کہ یہ وجہی کی ہے۔ مصنف کی عبارت یہ ہے:

"این بادشاہ جم جاہ را ...... بر وجہی کہ زبان از
بیان شمہ ازان لال و قلم دو زبان ...... " الخ

بلحاظ ربط مضمون دراصل لفظ وجہی بیائے مجہول پڑھنا چاہیے (یعنی وجہے) ورنہ ربط قایم نہ رہے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مصنف نے بمقام قندھار اپنے قیام کا اشارہ کیا ہے جہاں اس نے کتاب لکھی۔

قندھار (دکن) ضلع ناندیڑ وہ مشہور تاریخی مقام ہے جس کو سلطان برہان نظام شاہ والی احمد نگر نے ۹۵۵ھ میں بریدی سلاطین بیدر سے چھین لیا تھا ... اور وہاں ائمہ اثنا عشر کا

خطبہ پڑھوایا۔ خلفائے راشدین کے نام خارج کر دیے۔ یہاں ائمہ اثنا عشر کا خطبہ پڑھوایا، خلفائے راشدین کے نام خارج کر دیے۔ یہاں سادات امامیہ کے علماء و فضلاء آباد ہوئے .... اس کے زمانے میں خور شاہ ابن قباد الحسینی ایران سے احمد نگر آیا .... (پھر) گول کنڈہ آگیا۔ "تاریخ ایلچی نظام شاہ" اس کی تالیف ہے.... اس نے یہ تصنیف ۹۵۵ھ میں فتح قندھار (دکن) کے بعد قندھار دکن میں لکھی ..... اوائل عہد سلطان ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں وہ گول کنڈہ چلا آیا اور اپنی یہ کتاب سلطان موصوف کے نام کر دی ..... سلطان مذکور ہی کے ایما پر اس نے اپنی مشہور و معروف "تاریخ ایلچی نظام شاہ" تالیف کی۔

("مقالاتِ منتخبہ" اورینٹل کالج میگزین لاہور، ۱۹۷۰ء)

نجم الاسلام :

کیا نعتیہ قطعہ "یا صاحب الجمال و یا سید البشر" شاہ عبدالعزیزؒ کی تصنیف ہے

سعدی کی بے مثل نعت بلغ العلیٰ بکمالہ کی طرح یہ قطعہ بھی نہایت غیر معمولی اور ممتاز ترین نعت قرار دیا گیا ہے۔

یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر — من وجہک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ — بعد از خدا بزرگ، توئی قصۂ مختصر

ان بے مثل اشعار کا ناظم کون ہے؟ یہ امر تحقیق طلب ہے۔ عام طور پر جامی سے ان اشعار کو منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ چوں کہ یہ اشعار کلیات جامی میں شامل نہیں ہیں، اس لیے بعض حضرات کے نزدیک جامی سے ان اشعار کا انتساب تحقیق طلب ہے لیکن یہی صورت جامی کی بعض دوسری نہایت مقبول اور مشہور عام نعتوں کی بھی ہے اور نعت مذکورہ بالا کے علاوہ یہ نعتیں بھی بالعموم جامی ہی کی طرف منسوب کی جاتی رہی ہیں کہ نعت گوئی میں جامی کا درجہ مُسلّم ہے اور یہ نعتیں فی الجملہ اس سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اس صورت میں جب تک متعین طور سے یہ ثابت نہ ہوجائے کہ یہ اور کس شاعر کی تصنیف کردہ ہیں، جامی ہی کی سمجھی جاتی رہیں گی، جیسا کہ سمجھی جاتی رہی ہیں۔

چنانچہ ہفتہ دار اخبار "ہماری زبان" دہلی (انجمن ترقی اردو ہند) کی اشاعت بابت ۱۵ دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک استفسار کے جواب میں ان اشعار کو مراسلہ نگار جناب محمد اسمٰعیل آزاد نے ڈاکٹر طٰہٰ رضوی برق (آرہ، شاہ آباد) کی کتاب "اردو کی نعتیہ شاعری" مطبوعہ پٹنہ کے حوالے سے جامی ہی کی تصنیف بتایا ہے، جیسا کہ بالعموم مشہور ہے۔ علیٰ ہذا

گذشتہ صدی کی کتابوں میں بھی، مثلاً مرقع الور مصنفہ محمد مخدوم تھانوی (مطبوعہ مطبع آگرہ اخبار، ۱۲۹۳ھ) کے دیباچے میں، اس قطعے کا انتساب جامی ہی سے کیا گیا ہے۔ یہی صورت اس صدی کے ربع اول کی کتابوں میں بھی ہے۔ چنانچہ مآثر رحیمی مطبوعہ کلکتہ (ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۲۴ء) کے مرتب و مصحح شمس العلماء محمد ہدایت حسین (پروفیسر عربی و فارسی پریسیڈنسی کالج کلکتہ) نے بھی اپنے "مقدمۂ مرتب" میں اس قطعے کو جامی ہی سے منسوب کیا ہے۔

مگر حال ہی میں ایک فاضل محترم کی کتاب نظر سے گذری، جس میں مذکورۂ بالا نعتیہ قطعے کو ملفوظات شاہ عبدالعزیز کے حوالے سے شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ اور چوں کہ اس طرح حوالے کے ساتھ ان اشعار کے ناظم کا تعین کیا گیا ہے، اس لیے یہ بیان بظاہر بہت سے قارئین کو قابل قبول معلوم ہوگا، گو کہ اس اطلاع کا مأخذ جس کتاب کو بتایا گیا ہے یعنی ملفوظات شاہ عبدالعزیز وہ ایک مجہول تالیف ہے جس کے جامع کا نام معلوم نہیں۔

جہاں تک ملفوظات شاہ عبدالعزیز کا تعلق ہے اس میں تو کوئی ایسی روایت نہیں جس میں اس نعتیہ قطعے کا ذکر ہو اور اسے شاہ عبدالعزیز سے منسوب کیا گیا ہو۔ مگر اسی طرح کی ایک اور مختصر تالیف "کمالات عزیزی" میں اس کو شاہ عبدالعزیز سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ ملفوظات کی طرح کوئی مجہول کتاب نہیں۔ اس کے (کمالات عزیزی کے) لکھنے والے نواب مبارک علی خاں ولد نواب فرحت اندیش خاں نبیرۂ نواب خیر اندیش خاں میر منشی ہیں جو مرید تھے شاہ عبدالعزیز کے۔ انھوں نے یہ کتاب ۱۲۸۹ھ (م ۱۸۷۲ء) میں اُردو میں لکھی تھی اور پہلی بار ۱۲۹۰ھ میں مطبع ضیائی میرٹھ میں چھپی تھی۔ اس کے بعد مطبع مختار دہلی اور مطبع مجیدی کانپور سے بھی متعدد بار طبع ہوئی۔ پاکستان میں لاہور اور کراچی سے بھی، مجربات و عملیات وغیرہ کے اضافوں کے ساتھ اس کا وہ ایڈیشن دوبارہ چھپا ہے جس کے مُرتّب اول اور ناشر مولوی ظہیر الدین سید احمد ولی اللّٰہی دہلوی نبیرۂ شاہ رفیع الدین دہلوی تھے۔

ملفوظات شاہ عبدالعزیز اور کمالات عزیزی کے سلسلے میں یہ صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ اوّل الذکر کے جامع کا نام معلوم نہیں، لیکن دیباچے میں جامع نے صاف یہ ظاہر کیا ہے کہ ملفوظات انھوں نے شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں ان کی اجازت سے قیام دہلی ۱۲۳۳ھ کے دوران قلم بند کرنے شروع کیے۔ مگر کمالات عزیزی میں شامل شاہ عبدالعزیز کے ارشادات جمادی الاول ۱۲۸۹ھ میں، یعنی شاہ عبدالعزیز کی وفات (شوال ۱۲۳۹ھ) کے تقریباً پچاس سال بعد قلم بند کیے گئے ہیں۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز جو اصلاً فارسی میں لکھی گئی تھی

سب سے پہلے ۱۳۱۴ھ م ۱۸۹۶ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے طبع ہوئی تھی۔ تقریباً دو سال بعد یعنی ۱۳۱۵ھ میں مطبع ہاشمی میرٹھ کے مالک مولوی سراج الدین نے مولوی عظمت الٰہی ابن مولوی محمد ہاشم سے ملفوظات (فارسی) کا اُردو ترجمہ کرا کے طبع و شائع کیا، جیسا کہ ڈاکٹر سید معین الحق نے ملفوظات کے اُردو ترجمے مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء پر اپنے مقدّمے میں لکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کمالات عزیزی طباعت کے لحاظ سے اقدم ہے۔ غرض کہ یہ ایک جداگانہ تالیف ہے اور ملفوظات شاہ عبدالعزیز سے جدا ایک معلوم مؤلف کی جداگانہ تالیف کے طور پر اس کا حوالہ دینا چاہیے۔

اس صراحت کے بعد اب دیکھنا چاہیے کہ نعتیہ قطعے کا ذکر کمالات عزیزی میں کس طور آیا ہے۔ کمالات عزیزی میں مذکورہ نعتیہ قطعے کا، جسے مؤلف (نواب مبارک علی خاں میرٹھی) نے "رباعی" سمجھا ہے، ذکر یوں آیا ہے۔

> "ایک روز حضرت مولانا صاحب نے فرمایا کہ عمر شباب میں مجھ کو ساٹھ ستّر ہزار شعر عربی و فارسی و ہندی یاد تھے، اب بھی دس گیارہ ہزار یاد ہوں گے۔ پھر آپ نے ایک رباعی (کذا) جو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں تصنیف فرمائی تھی، پڑھی۔ رباعی:
>
> یا صاحب الجمال و یا سید البشر ..."

اس روایت کے حق میں یہ بات ہے کہ راوی شاہ عبدالعزیز کے مریدین میں سے ہے۔ مگر یہ امور قابل غور بھی ہیں:

۱۔ نواب مبارک علی خاں نے شاہ عبدالعزیز کی وفات (۱۲۳۹ھ) کے تقریباً پچاس سال بعد یہ کتاب لکھی تھی۔

۲۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جو بعض فضائل آپ کے (شاہ عبدالعزیز کے) مجھے معلوم ہیں، بنظر ایضاح و مطالعۂ شائقین حق شناس کمالات عزیزی نام رکھتا ہوں" یعنی اس کتاب میں صرف وہی ارشادات نہیں جو انھوں نے خود شاہ عبدالعزیز سے سنے ہوں گے، دوسروں کی زبانی بھی جو کچھ معلوم ہوا وہ بھی اس میں شامل ہے۔

۳۔ ترپّن روایتوں میں سے صرف ایک روایت (نمبر شمار ۱۷) ایسی ہے جس کے آغاز میں انھوں نے صراحت کی ہے کہ "راقم کے روبرو حضرتؒ نے فرمایا۔" اور بمشکل تین ایسی جن کے راویوں کی نشان دہی کی ہے (نمبر شمار ۱۴، ۱۵، ۳۲) جو بالترتیب یوں شروع ہوتی ہیں

(الف) ایک خواجہ صاحب متوطّن دہلی دوست راقم بیان کرتے تھے کہ ....

(ب) مولوی حافظ احمد علی صاحب استاد راقم متوطن تھانہ بھون دہلی میں طالب علمی کرتے تھے، انھوں نے خواب دیکھا ...۔

(ج) دہلی میں مولوی خدا بخش صاحب مرحوم متوطن میرٹھ سے فرمایا کہ ......"

بقیہ روایتوں کے آغاز میں کوئی ایسی صراحت نہیں کہ جس کی وجہ سے انھیں کوئی خصوصیت حاصل ہو اور معمولی سُنی سنائی بات نہ سمجھا جائے۔ بلکہ ان میں سے بعض کی کمزوری تو صاف ظاہر ہے مثلاً ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص نے ایک کتاب پشتو زبان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی برائی میں لکھی تھی ... آپ نے اس کا جواب زبان پشتو میں لکھ کر منتشر کر دیا۔ حالانکہ شاہ عبدالعزیز کا زبان پشتو سے واقف ہونا اور اس زبان میں کوئی کتاب لکھنا کسی بیرونی شہادت سے یا خود شاہ عبدالعزیز کے مصنفات سے ثابت نہیں۔ خود نواب مبارک علی خاں کے علم میں بھی تھا کہ شاہ عبدالعزیز پشتو نہیں جانتے تھے جیسا کہ اسی روایت (نمبر شمار ۲۲) میں ہے جو تمام و کمال یہ ہے:

"جناب حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ فلاں شخص نے ایک کتاب پشتو زبان میں ہماری مذمت میں لکھی ہے اور اس کے باپ کا نام اور مقام سکونت اور کتاب کا نام بھی ظاہر فرمایا۔ آپ نے عرض کیا میں زبان پشتو نہیں جانتا ہوں۔ حضرت امیر رح نے فرمایا کچھ مضایقہ نہیں۔ آپ خواب سے بیدار ہوئے۔ بعد تلاش کتاب دستیاب ہوئی۔ آپ نے اس کا جواب زبان پشتو میں لکھ کر منتشر کر دیا۔"

مگر نواب مبارک علی خاں ایک انجانی زبان میں کتاب لکھ دینے کو کرامت اور فضل و کمال کا معیار جان کر ضبط تحریر میں لے آئے ہیں۔ ایسی روایات جو کشف و کرامت کے بیان میں ہیں، کمالات عزیزی میں خاصی تعداد میں ہیں۔ ایک روایت کسی نواب سعادت یار خاں کے بارے میں ہے جو رؤسائے دہلی میں سے تھے۔ اس کے آخری فقرے میں جو ذم کا پہلو شاہ عبدالعزیز کی صاحبزادیوں کے حق میں نکلتا ہے، ظاہر ہے اور مؤلف کمالات عزیزی کے ضعف تالیف کو بھی صاف ظاہر کرتا ہے۔

۴۔ اب نعتیہ قطعے والی روایت کو لیجیے تو وہ بھی انھی روایتوں میں سے ہے جن کے بارے میں صراحت نہیں ہے کہ کس کے روبرو یہ بات شاہ عبدالعزیز نے فرمائی تھی۔ اگر یہ قیاس کیا جائے کہ یہ بات شاہ عبدالعزیز نے مؤلف کے روبرو فرمائی تھی تو بھی غور طلب ہے

کہ شاہ عبدالعزیز کا ارشاد اپنے حافظے کے متعلق تھا، نہ کہ اپنی شعر گوئی کے بارے میں۔ مگر راوی نے یاد کیے ہوئے اشعار کے ذکر میں تصنیف کردہ اشعار کا ذکر اپنی طرف سے ملا دیا ہے۔ جب کہ ربط کلام کا تقاضا یہ ہے کہ بیان ان اشعار کا ہو جو صاحب ملفوظات (شاہ عبدالعزیز) کو یاد تھے اور یہی کہا جائے گا کہ شاہ عبدالعزیز نے یہ ارشاد فرما کر کہ "عمر شباب میں مجھ کو ساٹھ ہزار شعر عربی و فارسی و ہندی یاد تھے۔ اب بھی دس گیارہ ہزار یاد ہوں گے" جو قطعہ پڑھا تھا اس کے بارے میں مؤلف کمالات عزیزی کا یہ خیال کرنا کہ وہ شاہ عبدالعزیز کی تصنیف کردہ رباعی تھی، محض مؤلف کا گمان اور قیاس ہے۔ پس ہمارے خیال میں کمالات عزیزی جیسی کتاب کی صرف یہ ایک روایت اس نعتیہ قطعے کو شاہ عبدالعزیز کی تصنیف قرار دینے کے لیے کافی نہیں۔ جب تک کسی دوسرے مضبوط مأخذ سے بھی یہ اطلاع نہ پہنچے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ خود شاہ عبدالعزیز کی اپنی کتاب میں ان مذکورۂ بالا نعتیہ اشعار کا ذکر کیوں کر آیا ہے۔

شاہ عبدالعزیز کی مشہور تفسیر "فتح العزیز" سوا تین پاروں کی، فارسی زبان میں ہے۔ یعنی سورۂ فاتحہ سے پارہ دوم (سیقول) کے ربع اول تک اور آخر کے دو پارے۔ تبارک الذی اور عم یتسا۔ لون کی تفسیر۔ جس کے بارے میں شاہ عبدالعزیز کے معاصر، مولانا فضل امام خیر آبادی نے اپنی کتاب تراجم الفضلاء میں لکھا ہے کہ "این تفسیر در حالت بیماری و استیلائے ضعف کہ طاقت نوشتن نہ داشتند تصنیف فرمودند۔ از شاگردے کہ تازہ بشرف اسلام مشرف شدہ بود فرمودند کہ آنچہ گویم بنویس" اور غالباً اسی اطلاع پر قیاس کر کے ملفوظات شاہ عبدالعزیز کے جدید اردو ترجمے (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۰ء) کے مترجمین محمد علی لطفی و مفتی انتظام اللہ شہابی نے اپنے مقدمے میں لکھ دیا ہے کہ "یہ تفسیر شاہ صاحب کے آخر عمر کی تصنیف ہے جب شاہ صاحب کی قوت بصارت جاتی رہی تھی"۔ یہ تفسیر ۱۸۵۷ء سے قبل کے زمانے میں کلکتے سے چھپی تھی۔ وہاں کے علماء نے اس کو بہت صحت کے ساتھ چھاپا تھا اور اسی مطبوعہ نسخے کی عبارت کے موافق ۱۲۶۱ھ م ۱۸۴۵ء میں محمد حسن خاں رامپوری نے اس کا اُردو ترجمہ کیا جو اسی سنہ ۱۲۶۱ھ کی ستائیسویں رمضان المبارک کو چھپ کر تیار بھی ہوگیا۔ بعد میں فارسی متن مطبع مجتبائی دہلی سے بھی چھپا اور محمد حسن خان رامپوری کا اُردو ترجمہ بھی چھپتا رہا ہے۔ کچھ برس پہلے کراچی سے بھی اس کو چھاپا گیا ہے۔ ان تعارفی کلمات کے بعد اب نعتیہ قطعے کی طرف آیئے۔ فارسی تفسیر "فتح العزیز" میں سورۂ الم نشرح کے ذیل میں اس کا ذکر یوں آتا ہے

"و نعم ما قیل یا صاحب الجمال ... قصۂ مختصر"

اس کا اُردو ترجمہ محمد حسن خاں رامپوری نے اس طور سے کیا ہے

"یعنی کیا اچھی بات کہی ہے کسی شاعر نے یا صاحب الجمال .... قصہ مختصر"

اس تفسیر کے متن میں اشعار فارسی بکثرت آتے ہیں اور کہیں کہیں عربی اشعار بھی آتے ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ شاہ عبدالعزیز کو بکثرت اشعار یاد تھے۔ شعروں سے قبل اس تعریفی جملے کو لاکر کہ "و نعم ما قیل" جس کا ترجمہ محمد حسن خاں رامپوری موقع بموقع اس طرح کرتے ہیں، اور کیا خوب کہا ہے (سورہ عبس)، کیا اچھا کہا کسی شاعر نے (سورہ الشمس)، اور بے شک کیا خوب کہا ہوا ہے (سورہ الضحیٰ)۔ اپنی تعریف آپ کرنے کے مرتکب ہونے کی توقع کم سے کم شاہ عبدالعزیز سے تو ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ یہ فقرہ (و نعم ما قیل) وہ ان اشعار سے قبل لائے ہیں جو یقیناً ان کے نہیں:

تواضع ز گردن فرازاں نکوست   گدا گر تواضع کند خوے اوست

(سورہ عبس)

چوں بعلم ازل مرا دیدی   دیدی آنگہ بعیب بگزیدی

من بعیب آں و تو بعلم ہماں   رد مکن آنچہ خود پسندیدی

(سورہ الضحیٰ)

اگر یہ کہا جائے کہ وہ نعتیہ اشعار شاہ عبدالعزیز کے تھے مگر انھوں نے اخفاء سے کام لیا تو اس اخفاء کا کوئی سبب نہیں۔ یہ نعتیہ اشعار کچھ اس قسم کے نہ تھے کہ ایک محدث اور بلند پایہ عالم کے وقارِ علم کے منافی تصور کیے جاتے اور اپنی طرف انتساب کا اخفاء کیا جاتا۔ اگر یہ قیاس کیا جائے کہ تواضع کی وجہ سے اخفاء کیا یعنی بر بنائے انکسار اپنے شاعر ہونے یا شعر کہنے کو ظاہر نہ کیا تو ایسا بھی نہیں، کیوں کہ شاہ عبدالعزیز کے عربی قصائد معلوم و مشہور ہیں، عربی میں ان کا شعر کہنا ثابت ہے۔ ان کے تذکرہ نگاروں نے اس کمال فن (عربی شعر گوئی) کا ذکر کیا ہے۔ تواضع کے طور پر نہ تو شاہ عبدالعزیز نے اپنی عربی شعر گوئی کا اخفاء کیا نہ ان کے تذکرہ نگاروں نے۔

تفسیر فتح العزیز (تفسیر عزیزی) کے ایک قدیم کلکتہ ایڈیشن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ "صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات" مؤلفہ محمد عتیق صدیقی میں یہ اطلاع ملتی ہے کہ

دلی میں بھی یہ کتاب ۱۸۶۱ء میں مطبع العلوم میں چھپی تھی جہاں اس وقت تک شاہ عبدالعزیز کے فیض یافتگان ایک بڑی تعداد میں تھے مگر کسی نے نشان دہی نہیں کی کہ تفسیر فتح العزیز میں مذکورہ نعتیہ قطعہ (یا صاحب الجمال ...) شاہ عبدالعزیز کا ہے۔

۱۲۹۶ھ میں مطبع العلوم علی گڑھ سے حضور احمد سسوانی کا اُردو رسالہ "نکات قرآنی فی فضائل رسول ربانی" چھپا، جس کا ایک نسخہ بزرگ محترم محمد شفیع الرحمان، بھرایونی مرحوم و مغفور کے ذخیرۂ کتب میں نظر سے گذرا۔ یہ اپنے موضوع پر اُردو میں ایک بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔ اس کتاب کے مصنّف کو شاہ عبدالعزیز اور ان کی تفسیر فتح العزیز سے کمال عقیدت و رغبت ہے کہ اوّل تو متن کتاب کے آغاز سے قبل جلی طور سے وہ التماس کرتے ہیں کہ اصلی کتاب کے ملاحظے سے پہلے تفسیر فتح العزیز ملاحظہ فرمادیں اور چاشنیِ مقصود کا مزہ اٹھادیں، اور پھر مقدّمۂ کتاب میں بھی اس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اسے "خلاصہ جملہ تفاسیر نادرہ عزیز کا" قرار دیا ہے، اور لکھا ہے کہ جو شائق زیادہ کا ہو تفسیر مذکورہ میں دیکھ لے۔ یہ کتاب کمالات عزیزی کے بعد کی ہے مگر اس کے مصنّف حضور احمد سسوانی نعتیہ قطعۂ مذکورہ کے بارے میں کمالات عزیزی کی اطلاع کے خلاف اسے جامی ہی کی تصنیف بتاتے ہیں۔

اب ملاحظہ ہو کہ نعتیہ قطعے کا بیان حضور احمد سسوانی کی اس کتاب میں صفحہ ۴۳، ۴۴ پر یوں آتا ہے:-

"سبحان اللہ سچ ہے بڑوں کی بڑی بات چنانچہ جناب مولانائے جامی جامع علوم ظاہری و باطنی نے یہ عقدہ جو نزدِ کج فہمی سائل کے سخت مشکل اور لاینحل تھا، کس لطف سے حل فرمایا اور سرِ پُر دردِ بیمارانِ نافہمی و خود پسندی کو کیا خوب علاج فرمایا اور زخمی جگرِ محبّتِ رسولِ خدا کو کیا خوب علاج فرمایا یعنی محامد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا عمدہ رباعی کہ دل رُبائی میں خاصیّتِ کہربائی رکھتی ہے فرمائی ہے، خصوصاً مصرعۂ آخر ہمچو نگین بر خاتم ہے، کس چمک سے معنی خاتم النبیین کے جڑے ہیں:

یا صاحب الجمال و یا سیّد البشر　　من وجہک المنیر لقد نوّر القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقّہٗ　　بعد از بزرگ توئی قصّہ مختصر

چنانچہ سر آمد کاملین، تاج المفسرین و المحدثین، صاحب تفسیر مذکورہ نے

بسورہ الم نشرح بمقام وصف ختم المرسلین مقولہ جناب ممدوح کو کیا خوب فرمایا۔ فرما کے وصف ہمیشہ نا تمام خاتم النبیین علیہ السلام کو اسی پر ختم کر دیا۔ درحقیقت حسب مقولہ الکنایہ ابلغ من التصریح کے گویا عقیدۂ حقہ جمہور علماء سلف اور خلف کو بکمال خوش بیانی اور آب و تاب ایمانی حسب آیات قرآنی کے بیان فرما دیا اور مقتدای دین اسلام ہونا مولانا جامی کا بھی سب پر بخوبی ثابت کر دیا۔"

پھر ایک اور جگہ بھی (صفحہ ۱۴۲ پر) اس کتاب میں اس طرح مذکور ہے :

"سبحان اللہ جناب مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ جامع علوم ظاہری و باطنی نے کیا خوب جامع کلام دافع اوہام سے ہر دو فریق گرداب نافہمی کو ایک ہی مصرعۂ نعتیہ سے معقول فرما دیا اور بنیاد عقیدہ کاملہ کو بخوبی تمام قائم کر دیا کہ مصرعہ بعد از خدا بزرگ توئی، قصۂ مختصر۔ یعنی مدار ایمان و اسلام کا اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے کم اور تمام مخلوقات سے زیادہ جانے چنانچہ تاج المفسرین و المحدثین، صاحب تفسیر فتح العزیز نے در سورۂ والضحیٰ بمقام اوصاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام ان ابیات کو کمال لطف سے بیان کیا ہے۔"

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ فقرۂ بالا میں سورۂ والضحیٰ سہواً درج ہوا ہے۔ درست یہ ہے کہ اس نعتیہ قطعے کا ذکر صرف سورۂ الم نشرح کی تفسیر میں آیا ہے جیسا کہ اسی کتاب "فضائل رسول ربانی" کے اقتباس اول میں اوپر آچکا ہے۔

آخر میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اس مضمون کا اصل مقصد زیر بحث نعتیہ قطعے کا جامی کی تصنیف ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق نہیں ہے کیوں کہ اس سلسلے میں کوئی قابل تشفی مواد یا کوئی قابل ذکر شہادت بدست نہیں۔ بلکہ کوئی ایسی قدیم کتاب یا دستاویز بھی نہیں ملتی جس میں زیر بحث نعتیہ قطعے کا ذکر ہو اور وہ تفسیر فتح العزیز سے اقدم ہو۔ مقصد صرف یہ ہے کہ محض کمالات عزیزی کی بنیاد پر اس قطعے کو شاہ عبدالعزیز کی تصنیف قرار نہیں دینا چاہیے جب کہ خود شاہ عبدالعزیز اپنی تفسیر فتح العزیز میں اسے ونعم ما قیل (کسی نے کیا خوب کہا ہے) کہہ کر نقل کرتے ہیں۔ سردست بہتر یہی ہے کہ انتساب کے بارے میں اسی قدیم قیاس کو علیٰ حالہ برقرار رکھا جائے جیسا کہ گذشتہ صدی کی کتابوں میں جامی کی طرف کیا

جاتا رہا ہے۔ تاوقتیکہ کوئی قوی شہادت آئندہ اس کے خلاف نہ مل جائے اور اس قطعے کے ناظم کی پورے طور پر تحقیق نہ ہوجائے۔

(۲)

پس نوشت کے طور پر مزید چند تصریحات پیش کی جاتی ہیں

(الف) زیر بحث نعتیہ قطعہ "ارمغان نعت" مطبوعہ کراچی میں حافظ سے منسوب ہے۔ راقم نے اس مجموعے کے مُرتّب سے، جب کہ وہ زندہ تھے، اس اطلاع کے مأخذ کی نشان دہی چاہی لیکن وہ نہیں بتاسکے کہ انھوں نے کس بناء پر اس قطعے کو حافظ سے منسوب کیا۔

(ب) فاران کراچی کے سیرت نمبر بابت جنوری ۱۹۵۶ء میں ایک شک ساتھ یعنی سوالیہ نشان دے کر اس قطعے کو احمد جام (رح) (م ۵۳۶ھ) کے نعتیہ اشعار کے تحت درج کیا گیا ہے۔ مُرتّب کا منشا یا تو یہ تھا کہ اس قطعے کا ناظم نا معلوم ہے یا یہ کہ ایک شک کے ساتھ یہ احمد جام کا تصنیف کردہ ہے۔ لیکن احمد جام سے منسوب دیوان میں یہ اشعار موجود نہیں۔ گو کہ اس زمین میں چند دیگر اشعار ملتے ہیں۔

(اورینٹل کالج میگزین لاہور، جلد ۵۸، مشترکہ شمارہ ۳، ۴، ۱۹۸۲ء)

نجم الاسلام:

غلام علی آزاد بلگرامی سے منسوب گربہ نامہ اور اس کا اصل مصنف

۱

شمالی ہند کے نثری قصوں میں محمد حسین کلیم کی مفقود "کتابے در نثر ہندی" کے بعد (جس کے "یک قصہ رنگین (۱) در نثر ہندی" ہونے کا اشارہ عمدۂ منتخبہ میں موجود ہے) نو طرز مرصع تحسین پہلا نثری قصہ ہے جو دستیاب ہے۔ تحسین نے ایک درویش کے قصے کے بقدر داستان لکھی تھی کہ انتقال کیا۔ اس نامکمل حالت میں بھی قصے کی کچھ شہرت ہوئی۔ کچھ لوگ اسے پورا کرنے اور بہتر بنانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ نے اس قصے کی تحریک پر نئے قصے لکھے۔ چنانچہ:

۱۔ اب جو مکمل "نو طرز مرصع" تحسین سے منسوب ہے اس کے باقی ماندہ حصے کسی اور شخص نے بعد کو لکھے ہیں۔ (مولوی عبدالقادر رامپوری نے اپنے وقائع میں انکشاف کیا ہے کہ تحسین کی چہار درویش میں منثور کلام سب علی الدین خاں مراد آبادی کا ہے۔ (۲) جو نواب عظمت اللہ خاں محمد شاہی حاکم مراد آباد کے پڑپوتے اور حاجی رفیع الدین خاں شاگرد شاہ ولی اللہ دہلوی کے بھتیجے تھے۔

۲۔ نو طرز مرصع کے ایک ایسے مخطوطے (مخزونہ انڈیا آفس لائبریری) کا ذکر ڈاکٹر گیان چند جین نے "اردو کی نثری داستانیں" میں کیا ہے جس میں داستان اول تحسین کی ہے اور بقیہ حصہ محمد ہادی عرف مرزا مغل غافل نے لکھا ہے۔ غافل کو تحسین کی لکھی ہوئی ایک درویش کی داستان ملی، باقی حصہ خود لکھ کر پورا کیا۔

۳۔ میر امن کی باغ و بہار، نو طرز مرصع تحسین ہی کی بنیاد پر لکھی گئی ہے۔

۴۔ عظمت اللہ نثار دہلوی کا "قصہ رنگین گفتار" (تاریخی نام ۱۲۲۶ھ) بھی "نو طرز مرصع

ہی کی تحریک پر لکھا گیا تھا۔

۵۔ ایک اور قدیم نثری قصہ جو نوطرز مرصّع کی تحریک پر لکھا گیا ہے "گربہ نامہ" ہے یہ قصّہ گذشتہ صدی میں بھی اور موجودہ صدی میں بھی کئی بار چھپا ہے۔ مخطوطات بھی ملتے ہیں لیکن قدامت کے لحاظ سے اردو نثر کی تاریخ میں اسے جو مقام حاصل ہونا چاہیئے تھا اس سے محروم رہا ہے۔ اردو نثر کی تاریخیں اس کے ذکر تک سے خالی ہیں۔ یہاں اسی قصے کا تعارف و تذکرہ اور اصل مصنف کا پتا لگانا مقصود ہے۔

گربہ نامے کے دستیاب نسخے:

گربہ نامے کے حسب ذیل مطبوعہ اور قلمی نسخے راقم کی نظر سے گذرے ہیں:

۱۔ نسخہ مطبوعہ مطبع حسینی دہلی۔ بہ اہتمام شیخ غلام حسین۔ بہ عنوان "چوہے نامہ و بلی نامہ و افیونی نامہ"۔ ۲۲ صفحات۔ مملوکہ جناب خلیل الرحمان داؤدی (ارم کا منظوم چوہے بلی نامہ در متن، غلام علی آزاد کا منثور چوہے بلی نامہ در حاشیہ اور افیونی نامہ در آخر۔ یہی صورت دیگر مطبوعہ نسخوں کی بھی ہے۔)

۲۔ نسخہ مطبوعہ مطبع دامنگیر واقع لاہور، باہتمام گردیزی، صفحات ۱۰، ناقص الآخر۔ مملوکہ جناب خلیل الرحمان داؤدی۔

۳۔ مطبع جام جہاں نما میرٹھ کے مطبوعہ نسخے کی خطّی نقل۔ بقلم جناب خلیل الرحمان داؤدی۔ داؤدی صاحب کی تصریح کے مطابق مطبوعہ نسخہ غدر (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) سے پہلے کا چھپا ہوا تھا۔ کیوں کہ مطبع جام جہاں نما میرٹھ، غدر (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) میں بند ہوگیا تھا۔ داؤدی صاحب کی اس خطّی نقل کی ایک نقل اب راقم کے پاس بھی موجود ہے جس میں مشکوک الفاظ کی تصحیح راقم نے دیگر نسخوں کی مدد سے کی ہے۔

۴۔ نسخہ مطبوعہ گردھر اسٹیم پریس لاہور، ناشر جے ایس سنت سنگھ، چوک متی لاہور۔ یہ راقم کے پاس موجود ہے۔

۵۔ نسخہ قلمی مخزونہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، محرّرہ فدا، سنہ کتابت ۱۲۷۰ھ۔ اس قلمی نسخے میں افیونی نامہ اور ارم کا منظوم چوہے نامہ بھی شامل ہے۔

گربہ نامے کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں بھی ہے۔ بلوم ہارٹ کی تصریحات (۳) کے مطابق یہ ۱۲۵۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام عبدالکریم ہے۔ گربہ نامے کے

معلوم و متعارف نسخوں میں یہ قدیم ترین نسخہ ہے۔ مخدومی پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی معرفت اس کی عکسی نقل حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تا حال (۱۹۶۸ء) نقل موصول نہیں ہوئی۔

گربہ نامے کا مصنف:

بعض حضرات نے گربہ نامے کو بارہویں صدی ہجری کے مشہور ہندوستانی عالم اور تذکرہ نگار حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ) کی تصنیف بتایا ہے۔ مثلاً

۱۔ خم خانۂ جاوید میں آزاد بلگرامی کے حال میں مذکور ہے کہ "اردو زبان میں بھی ایک چوہے بلی نامہ رقم کیا ہے" (جلد اوّل صفحہ ۲۶)۔

۲۔ نجم الغنی خاں رامپوری نے بحر الفصاحت میں آزاد بلگرامی کے ذیل میں لکھا ہے کہ "انھوں نے ایک قصۂ دل چسپ تو اردو میں بھی لکھا ہے جو بلی نامے کے نام سے مشہور ہے"۔ (صفحہ ۳۳)۔

۳۔ "مخطوطات انجمن ترقی اردو" جلد اوّل مرتبہ افسر صدیقی و سرفراز علی میں بھی بلی نامے کا مصنف غلام علی آزاد بلگرامی کو بتایا گیا ہے۔ (انجمن کے مخطوطے میں نام کے ساتھ بلگرامی کی صراحت موجود نہیں ہے۔ یہ اضافہ اجمالی فہرست کے مرتب جناب سرفراز علی کا ہے)۔

بلوم بارٹ کی صراحت ان تصریحات کے خلاف ہے۔ بلوم بارٹ نے گربہ نامے کو آزاد بلگرامی نہیں بلکہ کسی اور شخص "سید غلام علی دہلوی" کی تصنیف بتایا ہے۔ پس یہ امر تحقیق طلب ہے کہ گربہ نامے کے مصنف میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں یا میر غلام علی نام کا کوئی اور شخص جو دلی کا رہنے والا تھا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ خود قصے کے متن میں مصنف کا نام مختلف نسخوں میں کس طرح آیا ہے۔

قصے کے متن میں مصنف کا نام:

(الف) راقم کے دیکھے ہوئے نسخوں میں جن کی تفصیل اوپر پیش کی جا چکی ہے، قصے کے خاتمے کی عبارت میں (باستثنا نسخہ نمبر ۲، ناقص الآخر جس میں خاتمے کی عبارت غائب ہے)

مصنف کا نام یوں آیا ہے:

"اس عاصی نے کہ مسمی فقیر غلام علی آزاد ہے ......"

یعنی متن میں بلگرامی کی صراحت موجود نہیں ہے۔

(ب) انڈیا آفس لائبریری کا مخطوطہ قدیم ترین ہے۔ اس میں اس مقام پر نام کس طرح آیا ہے، اس کا علم نہیں۔ لیکن بلوم ہارٹ نے چوں کہ وضاحتی نوٹ مین مصنف کا نام سید غلام علی دہلوی بتایا ہے، اس لیے اس مخطوطے کے متن میں مصنف کے نام کی صراحت یوں ہی، یعنی دہلوی کے ساتھ ہوناچاہیے۔ بلوم ہارٹ نے اس مخطوطے کا ترقیمہ بھی نقل کیا ہے جس میں مصنف کا نام "غلام علی قوم سید" درج ہے۔ اس صورت میں گمان غالب یہی ہے کہ مصنف کا پورا نام بلوم ہارٹ نے مخطوطے کے متن کی بنیاد پر لکھا ہے۔ بہر کیف مصنف کے بلگرامی ہونے کا ثبوت اس مخطوطے کے متن سے بھی نہیں ملتا۔

آزاد بلگرامی کی اردو نگاری:

آزاد بلگرامی اپنے زمانے کے مشہور مصنفوں میں سے تھے۔ ان کی شہرت و ناموری کو دیکھتے ہوئے کسی اور غلام علی کی نثری تحریر یا آزاد تخلص کے کسی شاعر کی غزل ان کی طرف منسوب ہوجانا بعید نہیں۔ چنانچہ خم خانۂ جاوید میں آزاد بلگرامی سے گربہ نامہ ہی نہیں، نو اشعار کی ایک اردو غزل بھی منسوب کی گئی ہے جس کا مقطع یہ ہے:

لب ہلانا روبرو قائم کے ہے ترک ادب   عذر کر آزاد، تا ہو عفو یہ تقصیر لب

بلکہ اس شعر پر قیاس کر کے خم خانۂ جاوید میں یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ آزاد اردو میں قائم چاند پوری سے مشورہ لیتے تھے۔ جناب کلب علی خاں فائق کی زبانی معلوم ہوا کہ "تقریر لب - تحریر لب" والی یہ غزل ایک اور آزاد، شاگرد قدرت اللہ قاسم کی ہے اور گلدستۂ نشاط مؤلفہ ایشری سنگھ نشاط میں موجود ہے۔

آزاد بلگرامی نے اپنی کئی تصانیف میں اپنے حالات تفصیلاً درج کیے ہیں لیکن جہاں تک راقم کو علم ہے، اپنی اردو نگاری کا ذکر نہیں کیا۔ دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ چمنستان شعرا اور گل رعنا کے مؤلف لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی تو ان کے بڑے عقیدت مند شاگرد بھی تھے لیکن چمنستان شعرا میں، جو اردو شاعروں کا تذکرہ ہے، آزاد کا ذکر بہ حیثیت اردو شاعر کے نہیں کیا۔ اگر آزاد بلگرامی کے ایک اور، اورنگ آبادی شاگرد، اسد علی

خاں تمنا نے اپنے "گل عجائب" میں آزاد بلگرامی کے دو اردو شعر (۴) درج نہ کیے ہوتے تو آزاد کا اردو میں شعر کہنا بھی شک و شبہ میں رہتا۔

جہاں تک نثر میں کسی قصے کی تصنیف کا تعلق ہے، اس کا ذکر نہ آزاد بلگرامی کی اپنی تصانیف میں آیا ہے، نہ معاصرین کے تذکروں میں۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ گربہ نامہ آزاد بلگرامی کی تصنیف ہے یا نہیں، اب صرف گربہ نامے کی داخلی شہادت ہی رہ جاتی ہے۔

داخلی شواہد:

اس سلسلے میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں:

۱۔ گربہ نامے کے ابتدائی فقرے میں مصنف خود کو "فقیر سیاح بہارستان عالم" کہتا ہے، اس لیے اس قصے کا مصنف ایک ایسا ہی شخص ہوسکتا ہے جس نے خوب سیاحی کی ہو

۲۔ قصے میں ایک جگہ یہ فقرہ آتا ہے: "ایک یار دمساز اور مہربان دلنواز نے فرمائش کی کہ تو بھی کوئی قصۂ دل چسپ بطرز نو طرز مرصع کے اگر سلک تحریر میں کرے تو یہ سلسلہ بندی واسطہ سر رشتہ یادگاری کا ٹھہرے۔" گویا مصنف گربہ نامے کی تصنیف کو اپنی یادگاری کا سر رشتہ سمجھتا ہے۔ شاید گربہ نامہ اس کی پہلی تصنیف ہے۔

اب ان امور کی روشنی میں زیر بحث مسئلے کو دیکھیے۔ اس میں شک نہیں کہ:

۱۔ آزاد بلگرامی پر "سیاح بہارستان عالم" کا فقرہ صادق آتا ہے

۲۔ وہ اپنی تصانیف میں اپنے نام کے ساتھ "فقیر" لکھنے کے عادی ہیں اور اس قصے کے متن میں بھی مصنف اپنے لیے یہی کلمۂ انکسار دو جگہ لایا ہے۔

۳۔ آزاد بلگرامی عربی و فارسی کے زبردست عالم ہیں اور قصے میں عربی فقرے اور فارسی اشعار بکثرت موجود ہیں۔

لیکن یہ ہرگز قابل تسلیم نہیں کہ آزاد بلگرامی جیسا کثیر التصانیف مصنف اپنی عمر کے آخری دور میں اس معمولی سے قصے کو اپنی یادگاری کا سر رشتہ قرار دے۔ جس شخص نے باوجود اردو دیوان کا مالک ہونے کے (حسب روایت گل عجائب) اپنی تصانیف میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ وہ اس مختصر سے اردو قصے پر کیوں کر مفتخر ہوگا۔ نو طرز مرصع کی تصنیف سے بہت پہلے آزاد بلگرامی کے متعدد تصنیفی کارناموں کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ پھر آزاد بلگرامی کا اتنی بہت سی گراں قدر تصانیف کا مالک ہوتے ہوئے بھی اس قصے کی تصنیف کو اپنی

یادگاری کا سر رشتہ سمجھنا چہ معنی دارد؟

جہاں تک اس اتفاقی امر کا تعلق ہے کہ میر غلام علی آزاد کا کوئی ہم نام، ہم ذات اور ہم عصر شخص انھی کی طرح سیاح ہونے کی شرط پر بھی پورا اترتا ہو تو یہ کچھ نہ ممکن الوقوع نہیں۔ ذیل میں ایک اور غلام علی کا حال درج کیا جاتا ہے جو ان شرائط پر پورا اترتے ہیں مگر ہیں دہلی کے رہنے والے۔

میر غلام علی دہلوی:

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں میر غلام علی دہلوی نام کے ایک شخص کا ذکر ملتا ہے جس کا پورا نام گلزار ابراہیم میں میر غلام علی آزاد (تذکرۂ میر حسن، تذکرۂ عشقی اور ریاض الفصحاء میں صرف "میر غلام علی") درج ہے۔ وطن دہلی اور تخلص اظہر۔ یہ شخص میر شمس الدین فقیر و مفتون کا شاگرد ہے۔ بلاد مشرق کی سیاحی بھی کی ہے۔ علی ابراہیم خاں نے لکھا ہے کہ "با راقم مربوط بود" اس لیے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مؤلف گلزار ابراہیم کو میر غلام علی کا پورا نام میر غلام آزاد لکھنے میں سہو ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ اپنے استاد میر شمس الدین کی طرح میر غلام علی دہلوی کے بھی دو تخلص ہوں، ایک آزاد، دوسرا اظہر، یا آزاد نام کا جزو ہو۔

میر غلام علی دہلوی کا سال وفات گلزار ابراہیم کے مطابق ۱۱۹۲ھ ہے۔ اس سال سے قبل نو طرز مرصع ایک قصے کے بقدر لکھی جا چکی تھی اور شہرت پانے لگی تھی۔ اس لیے عجب نہیں کہ یہی میر غلام دہلوی گربہ نامے کے مصنف ہوں۔ ان کے علاوہ اسی نام کے کسی اور دہلوی شخص کا حال تذکروں میں نہیں ملتا جو اسی زمانے کا ہو۔

ہر کیف، یہاں مقصود یہ دکھانا ہے کہ بعض شرائط اور شواہد آزاد بلگرامی ہی نہیں، اور شخص پر بھی صادق آتے ہیں، اس لیے صرف ایسے شواہد کی بناء پر آزاد بلگرامی کو گربہ نامے کا مصنف قرار دینا درست نہ ہوگا۔ اب رہی یہ بات کہ مصنف گربہ نامے کو اپنی یادگاری کا سر رشتہ قرار دیتا ہے، تو یہ بات ایسی ہے کہ اس کی بناء پر قطعیت کے ساتھ اس قدر ضرور کہا جاسکتا ہے کہ گربہ نامہ آزاد بلگرامی کے کسی ہم نام کی تصنیف ہو تو ہو لیکن خود آزاد بلگرامی کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

گربہ نامے کے بعض قدیم اسالیب:

ذیل میں گربہ نامے کی نثر کے بعض ایسے اسالیب کی نشان دہی کی جاتی ہے جن

سے اس کی قدامت کا ثبوت داخلی طور پر بھی ملتا ہے:

۱۔ تقدیم و تاخیرِ الفاظ: مثالیں: "ساتھ بیان لطائف اور ظرائف کے"۔ "روبرو ان سرو قدوں کے"۔ "یہ سلسلہ بندی واسطہ سررشتہ یادگاری کا ٹھہرے"۔ لباس درویشی کا"۔ "مشتاق دیدار کا"۔ "باتیں ہوش آمیز"۔ واسطے حصول مقصود کے"۔ "متصل ایک قریے کے"۔ حسب الامر اس کے"۔ "سخن شیریں اس ملعون کے"۔ "زبانی طوطی اور اور جانوروں کے"۔

۲۔ سجع و موازنہ: پہلی مثال: "ایک روز کا ذکر ہے کہ یاران لطیف اور دوستان ظریف، ساتھ بیان لطائف اور ظرائف کے باہدگر شکرفشاں تھے اور فقیر سیاح بہارستان عالم روبرو ان سرو قدوں کے، قمری کے مانند طوق سکوت کا گلے میں ڈالے ہوئے بمفحوائے من سکت سلم و من سلم نجی کے، مثل آئینے کے حیران"۔ دوسری مثال: "کیا ممکن ہے کہ ایک لفظ الف بے تائید تم صاحبوں کے تلفظ میں اٹکے اور کیا حرف ہے کہ ایک حرف ساتھ انحراف تم حریفوں کے صورت تقریر کی پاسکے"۔ (اس فقرے میں کئی دوسری صنعتیں بھی برتی ہیں۔)

۳۔ قدیم انداز تخاطب: مثال: "اور سن تو اے لگے" (یہ انداز تخاطب "اور جان تو اے عزیز" کی قسم کا ہے جو قدیم دکنی تصانیف نثر میں عام ہے)۔

۴۔ ترک نے: "گربہ سوچی"۔ یہ ترک نے کی واحد مثال ہے جو گربہ نامے میں ملتی ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ نے مذکور نہیں ہے بلکہ مقدر بھی نہیں کیوں کہ فعل فاعل کے مطابق ہے (اس قسم کی مثالیں دلبستان دہلی کی دیگر قدیم نثری تصانیف مثلاً کربل کتھا میں بھی موجود ہیں)۔

۵۔ الفاظ و محاورات قدیم: "نام دیتی بہن" (منہ بولی بہن)۔ "اس میں" (اتنے میں)۔ "معلانہ" (عورت کے لیے لکھنوی معنوں میں)۔ "روزے سطے کرنا" ("میں نے سات روزے آج سطے کیے ہیں بعد سطے تین روزوں کے کسی درخت کی چھال سے افطار کروں گی")۔

۶۔ نثری فقروں کے درمیان اشعار کا بکثرت استعمال: گربہ نامے میں نثری فقروں کے درمیان اشعار بکثرت استعمال کیے ہیں۔ ان کی کثرت ایک اور قدیم نثری قصے "جذب عشق" مصنفہ حسین شاہ حقیقت (مابین ۱۲۰۴ھ و ۱۲۱۰ھ) کی یاد دلاتی ہے۔ اشعار زیادہ تر

فارسی ہیں جو متقدمین میں کے ہیں۔ قصّے کے اخلاقی مقصد کے پیش نظر گربہ نامے کے مصنف نے بالارادہ ایسے اشعار نثر میں زیادہ سے زیادہ کھپانے کی کوشش کی ہے جو پند و نصائح پر مشتمل ہوں۔ اُردو اشعار صرف ایک دوہرے، ایک شعر اور ایک مصرعے کی حد تک آئے ہیں، وہ یہ ہیں۔

دوہرا : غافل ہو کر بیٹھنا بے عقلوں کا کام   جن پر ڈنکا موت کا ان کو کب آرام

شعر : بہ آب زر لکھا ہے بو علی نے   کہ سونے سے مسافر کو خطر ہے

مصرع: تقدیر کے آگے کچھ تدبیر نہیں چلتی

ان کے ناظموں کا علم نہیں ہوسکا۔

۱۔ عربی فقرے: گربہ نامے میں عربی فقرے بھی بکثرت آئے ہیں جو نہ صرف یہ کہ مصنف کی عربی دانی پر دال ہیں، بلکہ اس دور کی نثر کے ایک مخصوص رجحان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ ذیل میں وہ عربی فقرے درج کیے جاتے ہیں: "من سکت سلم و من سلم نجی"۔ "من ضحک ضحک"۔ "سواد الوجہ فی الدارین"۔ "الدنیا زور لایحصل الاّ بزور"۔ "کُلّ امر مرہون باوقاتہا"۔ الانتظار اشدّ من الموت"۔ "الرفیق ثم الطریق"۔ "لایکلف اللہ نفسا الا وسعہا"۔ "ان اللہ لایضیع اجر المحسنین"۔ "استغفراللہ"۔ "صاحب الغرض مجنون"۔ "کسنور مغلوب یصول علی الکلب"۔ "وفی السماء رزقکم وما توعدون"۔ "وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ" "درزقہا و من یتوکل علی اللہ فہو حسبہ"۔ "لایموت فیہا ولا یحیی"۔ "موتوا قبل ان تموتوا"۔ اذا نزل القدر بطل الحذر"۔ ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون"۔ الدنیا مزرعۃ الآخرہ"۔ "الدنیا جیفۃ و طالبہا کلاب"۔ "الضدان لایجتمعان"۔ "اذا جاء اجلہم لایستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون"۔ التقدیر تضحک علی التدبیر" "العاقل تکفیہ الاشارہ"۔

نمونۂ نثر:

ذیل میں گربہ نامے سے ایک اقتباس بہ طور نمونۂ نثر درج کیا جاتا ہے:

"یہ جو مثل مشہور ہے کہ نو سے چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی۔ اس کا اصل مطلب یوں سنا جاتا ہے کہ ایک روغن گر کے گھر بلی تھی۔ جب وہ معمّرہ اور ضعیفہ ہو گئی تو ضعف اور ناطاقتی کے سبب ہاتھ چالاکی اور سبُکی اس کی کا نہایت تنگ ہوا۔ یہاں تک کہ پکڑنے اور

مارنے چوہوں سے دست کش ہو کر خود مانند چوہوں کے کنارہ گیر ہوئی اور ناچاری سے ایک گوشۂ عزلت میں قناعت کر کے بیٹھ رہی۔ آخر الامر بعد امضائے ایام یعنی گزرنے چند روز کے بلحاظ جرأت اور غیرت قدیمانہ کے تجویز خاطر میں لائی کہ میں مستحقہ نہیں جو گوشہ گیر ہو کر محتاج نان نفقہ کی اس سفلہ زمانے سے رہوں۔ اس قدر بے عزتی خوب نہیں ہے۔

شعر: دونان از منت دونان سنان بر سینہ میدارد　　　سنان بر سینہ اولیٰ تر نہ دونانِ دونان خوردن

پس اولیٰ اور انسب یہ ہے کہ کمر ہمت کی باندھیے۔ شعر:

ہر کارے کہ ہمت بستہ گردد　　　اگر خارے برد گلدستہ گردد

اور گھر سے باہر نکل کر طالع آزمائی کیجیے۔ شعر:

رزق ہر چند بی گمان برسد　　　شرط عقلست جستن از درہا

اور مشہور ہے کہ فی الحرکت برکت۔ اور سعی کسی کی خدا کے فضل سے رائیگان نہیں جاتی۔ السعی منی والاتمام من اللہ ایزد اقدس و تعالیٰ شانہ نے اگرچہ مجھ کر پیر ضعیفہ کیا ہے مگر

ارم پہلے لکھ حمد رب عطا　　　مقابل میں جس کے نہیں دوسرا

حمد کے پانچ اشعار اور نعت کے تین اشعار کے بعد داستان موش و گربہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

لگا کر ایدھر کان اے دوستاں　　　سنو گربہ و موش کی داستاں

کسی شخص نے اس کو از راہِ عقل　　　کیا فارسی میں تکلف سے نقل

بحسن و فصاحت اب اے مہرباں　　　میں اُردو میں کرتا ہوں اس کو بیاں

پر اب گوش دل سے سنیں اہل ہوش　　　کہ ہے نظم یوں قصۂ گربہ موش

یہ مثنوی ایک سو نوّے اشعار کی ہے۔ اختتامی شعر یہ ہے

وہ بلّی تھی کھا پی کے راجی ہوئی　　　ارم یوں یہ فیصل لڑائی ہوئی

ارم کا حال معلوم نہیں ہوسکا۔

(ب) گربہ نامے کے ساتھ دوسری ملحقہ تحریر "افیونی نامہ" ہے جو صرف تین صفحات کے بقدر ہے۔ اس کا انداز بالکل جنگ نامۂ جعفر زٹلی کا سا ہے۔ افیونی نامہ کے مصنف کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ نمونۂ نثر یہ ہے:

"راویان اخبار اور ناقلان آثار ایک افیونی کا بیان زبان فیض ترجمان سے اس طرح پر اظہار کرتے ہیں کہ ڈبۂ افیون کا کھول کے، کانٹے میں تول کے، پانی میں گھول کے جو پیتے ہیں تو آنکھوں کو میچ، حقے کو کھینچ، پینک کے بیچ ہو کر کچی میں جا کر لیٹ گئے۔ تو کیا دیکھا کہ ایک شہر، شکر آباد اس کا نام ہے کھوئے کی شہر پناہ اور در بہشت کی چوکھٹ، برفی کا بازار، لوزات کا فرش زمین، تل شکری کا داسا، جلیبی کا پھاٹک، بتاشِ پھینی کی کنڈی، گھیور کے برج، قند کے کنارے، سیو کی جھاڑیاں، دودھ کا دریا، شربت کی نہر، شکر قری کا ریتا، حلوے کی دلدل، شہد کی کھائی، کھاجوں کے پہاڑ، شکر پاروں کے روڑے، کہیں بہت کہیں تھوڑے، جا بجا ڈھیر لگے تھے ..."

(صحیفہ لاہور، شمارہ ۴۳، اپریل ۱۹۶۸ء)

۲

صحیفہ شمارہ ۴۳ (اپریل ۱۹۶۸ء) میں راقم الحروف منقولہ بالا کا مضمون "گربہ نامہ" کے عنوان سے چھپا تھا جس میں غلام علی آزاد بلگرامی سے اس قصے کے انتساب کو ناقابل تسلیم ثابت کر کے یہ عرض کیا گیا تھا کہ "گربہ نامہ" آزاد بلگرامی کے کسی ہم نام غلام علی کی تصنیف ہو تو ہو لیکن خود آزاد بلگرامی کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

مضمون کی اشاعت کے بعد، اب یہ عُقدہ بخوبی حل ہو چکا ہے اور یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے، کہ اس قدیم نثری قصے کے مصنف غلام علی آزاد بلگرامی نہیں، بلکہ غلام علی امروہوی ہیں۔ ذیل میں وہ شواہد پیش کیے جاتے ہیں جن سے قصے کا غلام علی امروہوی کی تصنیف ہونا ثابت ہے۔

۱۔ انڈیا آفس لائبریری کا قلمی نسخہ:

گربہ نامے کے معلوم و متعارف نسخوں میں انڈیا آفس لائبریری کا قلمی نسخہ (بلوم ہارٹ نمبر ۹۳) قدیم ترین ہے۔ یہ ۱۲۵۰ء کا مکتوبہ ہے۔ گربہ نامے کے مصنف کی تحقیق کے سلسلے میں اس مخطوطے سے استفادہ ضروری تھا۔ لیکن مضمون مذکورۂ بالا کی اشاعت کے وقت

تک راقم کو اس کی عکسی نقل موصول نہیں ہوئی تھی اور مضمون میں اس کا اظہار بھی کر دیا گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد محبی زبیر بن عمر صاحب مقیم لندن کی مہربانی سے عکسی نقل موصول ہو گئی۔ اس میں مصنف کا نام بلوم ہارٹ کی صراحت ("غلام علی دہلوی") سے کچھ مختلف یعنی "غلام علی امر دہلوی" پایا۔ نام کے جزو آخر کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے رہنمائی فرمائی کہ یہ سہو کتابت کا شکار ہے۔ "امروہوی" ہونا چاہیے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا سندھ یونیورسٹی حیدر آباد آنا ہوا۔ موصوف نے بھی "امروہوی" کے حق میں رائے قائم کی۔ اس طرح تحقیق مزید کی ایک راہ کھلی۔ تاہم غلام علی امروہوی نام کے کسی شخص کا تاریخی وجود اور "گربہ نامے" کا مصنف ہونا اب بھی ثبوت طلب تھا۔

تاریخ امروہہ مؤلفہ محمود احمد عباسی کی ایک جلد انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانۂ خاص میں نظر سے گزری۔ اس میں غلام علی شاہ نام کے ایک امروہوی بزرگ کا ذکر ملا۔ حضرت افسر امروہوی نے بھی غلام علی، ولی تخلص مصنف خالق باری کے کچھ حالات روداد معارف اسلامیہ ۱۹۳۳ء، لاہور صفحہ ۱۱۲ سے اخذ کر کے عنایت فرمائے۔ لیکن دونوں ماخذ غلام علی کے مصنفِ گربہ نامہ ہونے کی صراحت سے خالی تھے۔

۲۔ تواریخِ واسطیہ:

جناب کلب علی خاں فائق رام پوری نے تواریخ واسطیہ مصنفہ سید رحیم بخش امروہوی (طبع اول ۱۳۲۲ھ، مطبع گلزار احمدی مراد آباد) میں سید غلام علی شاہ کی تصانیف کے ذیل میں بلی نامۂ نثر کی صراحت ڈھونڈ نکالی۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں راقم کو لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو فائق صاحب نے باکمالِ عنایت تواریخ واسطیہ کے متعلقہ اقتباس اور غلام علی کے شجرہ کی نقل بھی فراہم فرمائی اور کتاب کا مطبوعہ نسخہ (مخزونۂ کتب خانۂ مجلس ترقی ادب لاہور) دیکھنے کا موقع بھی عنایت فرمایا۔ بعد کو اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی ملا۔ افسوس کہ یہ کام کی کتاب کراچی کے کتاب خانوں میں دستیاب نہیں۔ تواریخِ واسطیہ میں رجال کا ذکر محلہ دار کیا گیا ہے۔ چوتھی فصل "محلّہ بھوکر" (۵) کے بیان میں ہے، جس میں "جدول منصب داران اولاد سید محمد فاضل بن سید عبدالمجید" کے عنوان کے تحت سید غلام علی شاہ کا ذکر یوں آتا ہے۔

"سید غلام علی شاہ ولد سید صابر علی شاہ شاعر ناثر و حکیم، ولی تخلص، ان کو

استعداد علم عربی و فارسی و طب میں عمدہ طریقے کی حاصل تھی۔ یہ حکّام عالی مقام سے بہت ملاقات ملّت رکھتے تھے۔ بہت خطوط حکّام ذوی الاحترام، صاحبان انگلشیہ موسومہ شاہ صاحب موصوف ان کے پوتوں کے پاس اب تک موجود ہیں جن کے مضامین و القاب و دیگر حالات سے اقتدار و بزرگی و رتبہ شناسی ان کی بخوبی ظاہر ہے۔ یہ بڑے مشہور و معروف، باتوقیر، صاحب تدبیر، خوش تقریر، بزرگ منش، منشی باکمال، فصاحت و بلاغت میں بے مثال، صورت و وجاہت میں صاحب جمال، شاعر و ناثر و ناظم، ولی تخلص، ہنرمند و ہوشیار، دانشمند با وقار، متّقی پرہیز گار تھے۔ ان کی تالیف و تصنیف سے کتاب اظہار دانش و انشاء جعفری و ولی نامہ نثر، و خالق باری منظوم، و قصۂ اصحاب کہف وغیرہ یادگار ہیں اور حسب ضرورت مطب بھی رکھتے تھے۔ بہت اشخاص اس شہر کے انشاء نویسی وغیرہ میں ان سے تلمذ رکھتے تھے اور مبلغ اسّی روپے سالانہ سرکار سے ان کو ملتا تھا اور سوائے ان مواضعات معافی کے، جو آپ کے موروثی تھے، ایک موضع بلک جعفر آباد ضلع و پرگنہ بجنور سرکار کی طرف سے ان کو تاحین حیات معاف رہا۔ بعدہ ضبط سرکار ہوگیا۔ اب وہ بطریق مال گذاری و زمینداری ان کے پوتوں کے قبضہ و ملک میں ہے۔" (ص ۱۸۳، ۱۸۴)۔

تواریخ واسطیہ میں غلام علی شاہ کے بعد ان کے بیٹے سید جعفر حسین تھانہ دار قصبہ مغل پور، اور پوتوں باقر حسین، شاکر حسین، یاور حسین، عابد حسین اور دو پڑپوتوں فیاض حسین (ولد باقر حسین) اور ممتاز حسین (ولد باقر حسین) کا ذکر بھی موجود ہے۔ اب ذیل میں غلام علی شاہ کا شجرہ نسب نقل کیا جاتا ہے:

"سیّد غلام علی شاہ بن سیّد صابر علی شاہ بن شاہ جعفر علی بن سیّد محمد فاضل بن سید محمد صادق بن سیّد محمد جعفر بن محمد فاضل بن سیّد عبدالمجید بن سیّد حسین بن سید عبدالعزیز بن شاہ مردان علی ولد سیّد بہاء الدین بن سید بڑے بن سیّد ظہور الدین بن سیّد حسین بن سیّد محمود ملقب بہ سالار بن سیّد میر علی بزرگ بن مخدوم سیّد شرف الدین شاہ ولایت۔"

حضرت افسر امروہوی کے فراہم کردہ اقتباس سے جو روداد معارف اسلامیہ ۱۹۳۳ء

لاہور سے ماخوذ ہے، غلام علی امروہوی کی ایک اور تصنیف خالق باری منظوم کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس لیے اسے بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے

"ولی تخلص، سید غلام علی نام، امروہے کے باشندے مگر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کس محلے کے رہنے والے تھے۔ ان کی ایک تصنیف خالق باری نام کی ہے جس کی ابتداء اس طرح ہے

پیدا کنندہ خالق و باری است پاک ذات　　روزی دہندہ باشد و رزاق کائنات

اس نسخے میں فارسی و عربی الفاظ کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے، ہندی الفاظ نسبتہً کم دیے ہیں،

ککڑی خیار باشد و لکڑی چو ہیزم است　　مکڑی است عنکبوت و عقرب چو کژ دم است

خالق باری میں تجنیس کا خاص التزام ہے۔ خود کہتے ہیں

ہر لفظ را رعایت تجنیس مشکل است　　بر نقص من نگہ نکند ہر کہ کامل است

ابیات چند من کہ غلام علی ولی　　تالیف تازہ ساخت بنام علی ولی

اصلاح خواہم از ہمہ مردان مصلحین　　ترسم مگر ز شرِّ شیاطینِ عیب چیں

بس طول و عرض عرض دلیل ملالت است　　یک اختصار بہ ز ہزاراں طوالت است

اس کی ضخامت ۳۵ صفحات ہے۔ سطور فی صفحہ ۱۳، مطبع ... میں چھپ چکی ہے"۔

غلام علی امروہوی کا تصنیف کردہ ایک قصہ "قصۂ اصحاب کہف" بھی ہے۔ "صوبۂ شمالی و مغربی کی اخبارات و مطبوعات" مؤلفہ محمد عتیق صدیقی میں مطبع مصطفائی دہلی کی ۱۸۵۳ء کی فہرست مطبوعات کے ذیل میں "قصۂ اصحاب کہف" کے چھپنے کی اطلاع درج ہے۔ ممکن ہے یہ غلام علی امروہوی کا تصنیف کردہ قصہ ہی ہو۔

(صحیفہ لاہور، شمارہ ۵۵، اپریل ۱۹۷۱ء)

پس نوشت:

۱۔ مضمون کی ابتداء میں اردو کے قدیم نثری قصوں کے ذیل میں محمد حسین کلیم کی "کتابے در نثر ہندی" اور "نو طرز مرصع" تحسین کا ذکر آتا ہے۔ اس ذیل میں "قصۂ مہر افروز و دلبر" از موسوی خاں کو بھی شامل سمجھا جائے، جس کا حق تعارف ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ادا کیا ہے

حواشی

(۱) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے نو طرز مرصع شایع کردہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے مقدمے میں ایک قدیم نسخے کا ترقیمہ نقل کیا ہے۔ جو یہ ہے "میر محمد حسین عطا خاں یک قصہ گفتہ بودند کہ وفات یافتند سہ باقی ماندہ ہمیں قدر دیگر بودند۔ تمام شد قصۂ یک درویش منجملہ قصۂ چہار درویش بتاریخ دوم رجب ۱۲۲۳ھ بمقام شکوہ آباد"۔

(۲) علم و عمل جلد اوّل صفحہ ۱۰۲۔ مولوی عبدالقادر رامپوری، جن کے وقائع کا ترجمہ علم و عمل کے نام کے چھپ چکا ہے، نہ صرف علی الدّین خاں مراد آبادی اور ان کے خاندان سے بخوبی واقف تھے بلکہ منشی مشرف علی خان پسر تحسین سے بھی واقف تھے۔ مراد آباد میں مولوی عبدالقادر رامپوری کی سسرال تھی اور اپنی عملی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ مراد آباد میں رہے تھے (آخر میں ترک وطن کر کے مستقلاً مراد آباد میں آ بسے تھے)۔ اسی قیام مراد آباد کے دوران میں انہیں منشی مشرف علی خاں پسر تحسین سے بھی واسطہ پڑا تھا۔ جو اس زمانے میں کمشنری بورڈ متعلقہ علاقہ مراد آباد کے انگریز حاکم کے منشی تھے۔ اس ذاتی واقفیت کی بناء پر مولوی عبدالقادر رامپوری نے لکھا ہے کہ چہار درویش میں سب مشہور کلام علی الدین خاں مراد آبادی کا ہے۔ غالباً دینی تقشّف کی بناء پر علی الدّین خاں نے قصّے کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہ کیا اور یہ ادبی خدمت بڑے صاحب کے میر منشی کے کھاتے میں داخل ہو گئی۔ ایسا ہوتا آیا ہے۔

(۳) بلوم ہارٹ کا وضاحتی نوٹ ذیل میں کم و کاست درج کیا جاتا ہے

"گربہ نامہ": The story of the old cat who went on a pilgrimage and devoured a cock and a crane whom she had persuaded to accopany her. By Saiyid Ghulam Ali of Delhi.

Begins.

"یہ جو مشہور ہے کہ نو سو چوہے کھانے بلی حج کوں چلی، اس کا مطلب یوں سنا جاتا ہے کہ ایک روغن گر کے گھر میں بلی تھی۔ جب وہ معمورہ (کذا) اور ضعیفہ ہوئی تو ضعف اور ناطاقتی کے سبب میں ہاتھ کی چالاکی اور صفائی اس کی کا نہایت تنگ ہوا۔"

The story appears to be an adaptation of the tale entitled "The Partridge and Quail, who were devoured by the sanctimonious Cat" in Wollastion's English Translation of the Anwar-Suhaili of Hussain Vaiz Kashif's Persian version of the Fables of Bid pai Book IV, No. 5.

Copied by Abdul Karim. On 25th Muharram, A.H. 1250 (A.D. 1834). Colophon:

The date 1850 is evidently a mistake for 1250.

"تمام شد این کتاب گربہ نامہ تصنیف غلام علی قوم سیّد بدستخط حقیر و فقیر عاصی عبدالکریم عفی عنہ بمکان دیوانخانہ جناب مولوی صاحب قبلہ مولوی نجات خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بوقت یکپاس روز برآمد حسن انجام یافت تحریر فی تاریخ بست و پنجم محرم روز مبارک پنجشنبہ سنہ ۱۸۵۰ھ۔"

(۴) گُلِ عجائب، طبع اوّل: ۱۹۳۶، صفحہ ۳ "اشعار یکہ از دیوان فصیح البیان اور التقاط و اقتباس یافتہ بر نظارگیان این سیر گاہ چنیں عرض می شود۔"

باغ میں جانا ہے میرا کام کا　　　شوق ہے مجھ کو گُلابی جام کا

کیوں کیا اس کی بے پروائیوں سے دل پریشان ہے
نہ آیا ایک دم مجھ پاس جس کا نام جاناں ہے"

(۵) محلّہ بھوکر کے بارے میں حضرت افسر امروہوی کی زبانی معلوم ہوا کہ اب یہ محلہ جعفری کے نام سے موسوم ہے

زاہد منیر عامر:

مہربان خاں رند سے منسوب کلام کی اصالت

...ہم زیر نظر مخطوطے (دیوان سوز، ترقی اردو بورڈ کراچی، جس میں غزلیات کے تمام مقطعوں میں تخلص پر سیاہی پھیر کر اوپر "سوز" لکھ دیا ہے) کے مقطعوں میں مٹائے گئے تخلص پر رند کا قیاس کرتے ہیں کہ کاتب نے یہ غزلیات کلام رند سمجھ کر کتابت کی ہوں گی لیکن بعد ازاں کسی قاری یا مصحح نے حقیقت حال سے واقفیت کی بناء پر ان میں تخلص درست کر دیا۔ لیکن ہمارے اس قیاس پر دو اعتراضات ہوسکتے ہیں۔ اول یہ کہ جو کلام سوز نے رند کے لیے کہا، اسے پھر دیوان سوز میں کیوں کر شمار کیا جاسکتا ہے۔ دوئم یہ کہ سوز کی طرح سودا بھی رند کے ملازم تھے، کیا ضروری ہے کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق سوز ہی سے ہو، وہ سودا کا کلام بھی ہوسکتا ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب ہمیں سعادت خاں ناصر کے تذکرہ خوش معرکۂ زیبا سے ملتا ہے۔ ناصر نے ترجمہ رند میں لکھا ہے:

> "اکثر وہی غزلیں میر سوز صاحب کے دیوان میں موجود اور نام رند کا ان میں سے نابود یہ نہ چاہیے جو چیز بالعوض گئی ہو اس کا دعویٰ انصاف سے بعید ہے واللہ اعلم بالصواب" (۱)

مشفق خواجہ کی تحقیق کے مطابق سعادت خاں ناصر تیرھویں صدی ہجری کی دوسری دہائی میں پیدا ہوئے (۲) یہ زمانہ میر سوز کے انتقال کا ہے اس اعتبار سے ناصر، سوز کے قریب تر تذکرہ نگار ہیں اور ان کی بات بنیادی اہمیت دیے جانے کی مستحق ہے اور ناصر کے متذکرہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رند کی "راجدہانی" ختم ہونے پر سوز نے وہ کلام جو وہ رند کو لکھ کر دیتے رہے خود اختیار کرلیا تھا اور اسی بات پر ناصر نے ترجمۂ رند میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

اب آئیے دوسرے ممکنہ اعتراض کی طرف۔

میر حسن نے ترجمۂ رند میں لکھا ہے :

"بسیاری کلامش را چون کلام سودا و میر سوز سر لوح دیوان خود می انگارد" (۳)

قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعرا۔ کے ترجمۂ رند میں لکھا :

"اکثر اشعار در دیوان او یافتہ شد کہ آن را میر سوز نسبت بطرف خود می کند و بعضی گویند کہ از مرزا رفیع است والعلم عند اللہ" ۔ (۴)

قدرت اللہ شوق نے کسی قدر طبقات کی تفصیل بھی دی ہے اور آخر میں لکھا ہے :

"علی ھذا القیاس اکثر غزلیات مربوط و مضبوط کہ داخل دیوان اوست آنرا بہ مرزا رفیع و سوز وغیرہ نسبت می کنند ۔ خداوند کہ واقع از کیست" ۔ (۵)

قاضی عبدالودود نے اپنے ایک مضمون میں شوق کا جو اقتباس دیا ہے اس کے مطابق "رند کے دیوان میں جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ سودا و سوز کے بکثرت اشعار ہیں" ۔ (۶)
یہی وجہ ہے کہ مختلف تذکروں میں رند کا انتخاب دیتے ہوئے متعدد تذکرہ نگاروں نے سوز کے اشعار درج کیے ہیں ۔ کچھ یہی حال سودا اور سوز کے کلام کا بھی ہے ۔ کلیاتِ سودا مرتبہ عبدالباری آسی اور نسخۂ مصطفائی میں متعدد غزلیں ایسی ہیں جو (مقطعوں کے مصرعۂ اولیٰ کے علاوہ) بعینہٖ دیوان سوز میں موجود ہیں ۔

ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے پھر ایک مختلف مبحث میں اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ :

"سوز اور سودا کا کلام خلط ملط ہوگیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ قدیم نسخہ سودا کا ہے یا سوز کا جس میں متنازعہ فیہ کلام شامل ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ مہربان خان رند کے کلام میں صرف سوز کا حصّہ ہے یا سودا کا بھی میری تحقیق کے مطابق بہت سی غزلیں جو سوز کی قرار دی جارہی ہیں وہ حقیقتاً سوز کی ہیں" ۔ (۷)

یہ تمام اقتباسات و نکات اس اعتراض کی تائید کرتے ہیں کہ کیا ضروری ہے ۔ کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق سوز ہی سے ہو وہ کلام سودا کا بھی ہوسکتا ہے ۔ اب ہم اس اعتراض کا جائزہ پیش کرتے ہیں ۔

سودا کے کلام کے ضمن میں نسخۂ جانسن کو سب سے زیادہ مستند مانا گیا ہے کیوں کہ یہ

سودا کی زندگی میں کتابت ہوا۔اس نسخے کی تاریخ کتابت ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اکتوبر ۱۷۸۰ء (مطابق شوال ذی قعدہ ۱۱۹۴ھ) اور جون ۱۷۸۱ء (مطابق جمادی الآخر ۱۱۹۵ھ) کے درمیان قرار دی ہے ۔ میر سوز کا انتقال ۱۲۱۳ھ / ۹۹ ۔ ۱۷۹۸ء میں ہوا ۔ گویا اس نسخے کی کتابت کے وقت سوز بھی زندہ تھے ۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کے نتائج تحقیق ہمیں بتاتے ہیں کہ کلام سودا کے ضمن میں

"نسخۂ جانسن تمام نسخوں میں بہتر اور معتبر نسخہ ہے کیوں کہ یہ سودا کی زندگی ہی میں اس کی عمر کے آخری حصے میں اس کی ہدایات کے تحت لکھا گیا اور سوائے مثنوی در ہجو فدوی کے اس نسخے میں اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے الحاقی یا مشکوک قرار دیا جاسکتا ہو "۔ (۸)

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے اپنے مرتبہ کلیات سودا میں جہاں سودا کا محقق کلام درج کیا ہے وہاں منسوب اور ملحق کلام بھی دیا ہے (۹) لیکن غزلیات کے تجے حصوں میں کسی حصے میں بھی ایسی غزلیات نہیں ہیں جو سوز سے بھی منسوب ہوں یا جن کا انتساب رند کی جانب بھی کیا جاتا ہو ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق صرف سوز سے ہے سودا سے نہیں ۔

قاضی عبدالودود اپنے ایک مضمون میں ملحقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"اردو میں سودا کے کلیات مطبوعہ میں میر سوز کی سو سے زیادہ غزلیں داخل ہیں اور ناقدین کرام کلام سودا کی خصوصیات کے بیان میں بے تکلف ان سے کام لیتے رہے ہیں" (۱۰)

قاضی صاحب کے اس بیان سے بھی کلام سوز کا سودا سے الحاق معلوم ہوتا ہے ۔ قاضی صاحب نے ہی ایک اور جگہ اس بارے میں لکھا ہے :

"دیوان رند کے نسخۂ مذکورہ (یعنی نسخۂ کلکتہ ۔ ناقل) کا یہ حال ہے کہ غالباً اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سوز کے کسی نسخے میں نہ ہو لیکن ایک شعر بھی ایسا نہیں جو کلیات سودا کے کسی معتبر نسخے میں موجود ہو "۔ (۱۱)

یہ تمام شواہد ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ رند سے منسوب کلام کا تعلق میر سوز سے ہے سودا سے نہیں ۔

کلّیات سودا کے جن نسخ میں سوز یا رند کا کلام پایا جاتا ہے وہ ساقط الاعتبار ہیں۔ کم از کم ایک سو سات غزلیں ایسی ہیں جو سوز کی ہیں لیکن کلّیات سودا کے غیر معتبر نسخوں میں پائی جاتی ہیں۔

"مجلۂ تحقیق" پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ شمارہ مسلسل ۵۳۔۵۴۔ (۱۹۹۲ء۔ ص ۶۳۔۶۶)
مقالہ بعنوان " دیوان میر سوز اور الحاقات " سے مقتبس۔

متعلقہ حواشی

۱۔ سعادت خاں ناصر "خوش معرکۂ زیبا مرتبہ مشفق خواجہ۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء، ج اول، ص ۲۱۵۔

۲۔ مشفق خواجہ: "تحقیق نامہ"۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۹۱ء، ص ۳۰۱

۳۔ میر حسن: "تذکرۂ شعرائے اردو" مرتبہ حبیب الرحمان خاں شروانی۔ دہلی: انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء، ص ۷۵:

۴۔ قدرت اللہ شوق: "طبقات الشعرا" مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی۔ لاہور۔ مجلس ترقی اردو ادب ۱۹۶۸ء، ص ۳۸۵

۵۔ قدرت اللہ شوق: محولۂ بالا۔ ص ۳۸۸

۶۔ قاضی عبدالودود: کلیات سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ (مقالہ) در سویرا۔ شمارہ ۲۹۔ لاہور: سویرا آرٹ پریس (۱۹۶۱ء) ص ۵۵

۷۔ ولی الحق انصاری، ڈاکٹر: مقالات پر بحث مشمولہ تدوین متن کے مسائل (خدا بخش سیمینار) پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۳

۸۔ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر: مستعملہ مخطوطات کی تفصیلات "کلیات سودا از مرزا رفیع سودا، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء، ج اول، ص ۱۷

۹۔ شمس الدین صدیقی: پیش لفظ کلیات سودا، محولۂ بالا، ص ۸

۱۰۔ قاضی عبدالودود "اصول تحقیق" (مقالہ) اردو میں اصول تحقیق مرتبہ ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء، ج دوم، ص ۳۲

۱۱۔ قاضی عبدالودود: کلیات سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ، مشمولہ سویرا۔ ۲۹، لاہور، سویرا آرٹ پریس، ۱۹۶۱ء، ص ۵۵

خورشید احمد خاں:

نوشہ گنج بخش سے منسوب اردو کلام کی اصل حقیقت

[فاضل مقالہ نگار نے اس عنوان کے تحت "گنج الاسرار" اور "انتخاب گنج شریف" دو کتابوں کے نوشہ گنج بخش سے انتساب کا بطلان کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں اس مقالے کا وہ حصہ پیش کیا جاتا ہے جو "گنج الاسرار" سے متعلق ہے۔ یہ مقالہ اورینٹل کالج میگزین لاہور، شمارہ خاص ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ نجم الاسلام]

(۱)

مفرد اشعار کا غلط انتساب تو کوئی بات نہیں۔ ہمارے یہاں تو ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک شاعر کا پورا دیوان دوسرے شاعر سے منسوب کر دیا گیا۔ اس کی ایک تازہ مثال ضلع گجرات (پنجاب) کے ایک صوفی بزرگ شیخ حاجی محمد قادری المشہور نوشہ گنج بخش کی ہے جو سلسلۂ قادریہ کی ایک شاخ نوشاہیہ کے بانی تھے۔ کسی قدیم اور مستند سوانح میں ان کے شاعر ہونے کا ذکر نہیں(۱)۔ مگر ان کی وفات (۲) کے تقریباً اڑھائی تین سو سال بعد ان کے تذکروں میں چند اردو اشعار ان کے نام سے منسوب کیے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۳ء میں ۱۰۹ اشعار کی ایک مثنوی(۳) ان کے نام سے طبع ہو گئی۔ قدرتی طور پر اب "گنج الاسرار" کا ذکر بھی اردو ادب کے تذکروں میں داخل ہونے لگا(۴)۔ یہ مثنوی ایم اے اردو کے نصاب میں بھی شامل ہو گئی(۵)۔ ۱۹۷۵ء میں ایک اور کتاب "انتخاب گنج شریف"(۶) چھپ کر آئی تو پتا چلا کہ حضرت نوشہ گنج بخش صرف ایک مثنوی کے مالک ہی نہیں بلکہ "اردو پنجابی کے پہلے صاحب دیوان شاعر" ہیں(۷)۔ تاریخ ادب اور خصوصاً پنجاب میں اردو کے ہر طالب علم کے لیے یہ خبر بڑی خوش کن اور چونکا دینے والی تھی مگر بوجوہ ذہن اسے آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

(۲)

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ صرف تین سو سال قبل کے ایک صوفی بزرگ اور تصوّف کے ایک سلسلے کے بانی کی شخصیت تاریخی طور پر دھندلائی ہوئی ہے اور حالات کے بارے میں متضاد بیانات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے (۸) کہ ان کا نام حاجی محمد (۹) تھا یا نعمت اللہ (۱۰) وہ سیّد (۱۱) تھے یا علوی (۱۲) اگر علوی تھے تو حضرت عبّاس (۱۳) کی اولاد تھے یا حضرت مناف (۱۴) کی۔ کھوکھر (۱۵) تھے یا گلگلو (۱۶)۔ فی الحال ہمیں اس سے بھی غرض نہیں کہ وہ ۱۰۶۴ھ (۱۷) میں فوت ہوئے یا ۱۱۰۳ھ (۱۸) میں۔ ان کا مزار ساہن پال (۱۹) میں ہے یا رنمل (۲۰) میں۔ ان کے سجّادہ نشین ان کے بڑے بیٹے محمد برخودار (۲۱) ہوئے یا چھوٹے بیٹے محمد ہاشم (۲۲)۔ اس وقت تو ہمیں صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ گنج الاسرار اور انتخاب گنج شریف (جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے) واقعی حضرت نوشہ گنج بخش کا کلام ہے؟ اگر نہیں تو اس کا اصل مالک یا مالکان کون ہیں۔

(۳)

"گنج الاسرار" دوسری کتاب سے دس سال پیشتر چھپی تھی اس لیے ہم پہلے اسی کا جائزہ لیں گے۔

۱۰۹ (۲۳) اشعار کی اس مثنوی کی "تکمیل و ترتیب کے بارے میں فاضل مرتب فرماتے ہیں - میں نے نہایت جستجو کے ساتھ خاندان کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور بزرگان نوشاہیہ کی قلمی بیاضوں کو ملاحظہ، اور کافی تلاش و جستجو سے ان سب اشعار کو متفرق تحریروں سے جمع کرکے یہ جامع اور مکمل نسخہ گنج الاسرار مرتب کیا ہے۔ اس کا ماخذ یہ نسخے ہیں۔ حروف ابجدی سے ان کے اشارے مقرر کر دیے ہیں

		سال تصنیف	تعداد اشعار
(الف)	لطائف گل شاہی	۱۱۵۰ھ	۱۸
(ب)	نسخہ مکتوبہ مولوی علم الدین بہلولی	۱۲۸۰ھ	۵۷
(ج)	زمزمۂ نوشاہی	۱۳۳۵ھ	۸۷
(د)	مجموعۂ وظائف قادری نوشاہی	۱۳۳۷ھ	۳۹

(ھ)	سبیل سلسبیل	۱۳۴۲ھ	۲۹
(و)	گلزار نوشاہی	۱۳۴۳ھ	۴۴
(ز)	کشکول نوشاہیہ	۱۳۵۰ھ	۴۴

ان میں سے میں نے نسخہ "الف" اور "ج" کو اصل قرار دیا ہے (۲۴)"۔

مثنوی کے مفصل مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ فاضل مُرتّب (شرافت نوشاہی) نے صرف ان نسخوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایسے اشعار بھی درج کر دیے ہیں جو ان میں سے کسی نسخے میں بھی نہیں (۲۵)۔ پھر فاضل مُرتّب نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ آیا مندرجہ بالا تمام کتب قلمی نسخوں کی شکل میں ہیں یا مطبوعہ۔ اگر قلمی نسخے ہیں تو کہاں ہیں۔ بہرحال نسخہ "و" (گلزار نوشاہی) (۲۶) تو مطبوعہ شکل میں ہے۔ اس میں کسی ماخذ کی نشان دہی کیے بغیر ۴۴ اشعار حضرت نوشہ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ جن دو نسخوں کو اصل قرار دے کر بنیاد بنایا گیا ہے ان میں سے نسخہ "الف" (لطائف گل شاہی) کا مخطوطہ ہم نہیں دیکھ سکے البتہ اس کا ایک مبیضہ بمقفہ (۲۷) چند لمحوں کے لیے دیکھنے کو مل گیا تھا۔ اس میں اٹھارہ اشعار درج تو ہیں مگر شاعر کا نام کہیں نہیں لکھا گیا۔

گنج الاسرار کا آخری شعر بھی، جس میں تخلص استعمال ہوا ہے، اس بیاض میں نہیں ہے۔ البتہ شرافت صاحب نے خود اپنے قلم سے وہاں فارسی میں ایک نوٹ لکھا ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ "میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ اشعار حضرت نوشہ گنج بخش کے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ اس شکل میں یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ نسخہ "الف" کے اٹھارہ اشعار حضرت نوشہ ہی کے ہیں۔ بقیہ نسخوں تک ہماری رسائی نہیں ہوئی مگر چار نسخوں میں (جن میں اصل نسخہ "ج" بھی شامل ہے) کوئی بھی چالیس سال سے زیادہ پرانا نہیں (۲۸)۔ تین سو سال سے بھی قبل وفات پانے والے بزرگ کے کلام کے لیے ان مخطوطات کو ثبوت کے طور پر کیسے تسلیم کر لیا جائے جب کہ ان میں یہ اشعار بھی بغیر کسی مستند حوالے کے درج ہوں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس مثنوی کی زبان تین چار سو سال قبل کی معلوم نہیں ہوتی (۲۹)۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

بہت ریاضت محنت طاعت   دل حاضر راکھے ہر ساعت

فضل خدا کا ار توفیق   جب سالک کون ہووے رفیق

تب پہنچے اس راہ سعادت علم موافق کرے عبادت

طامت اوہ جو پیر فرماوے اپنا کیا کچھ کام نہ آوے

دارو وہ جو دیوے حکیم آپ دارو کیا کرے سقیم

جو آویں بندیوں کے کام دین دنیا میں ہوویں تمام

سب قرآن مجید میں آئے حق تعالی نے آپ فرمائے

گنج الاسرار کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ اشعار بے ربط ہیں اور ان میں مضمون اور مطالب کا تسلسل بھی نہیں۔

(۴)

اب صرف یہ بتانا باقی رہ گیا کہ ان اشعار کا اصل مالک کون ہے۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اردو کی ایک مثنوی "گلزار فقر" کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے

"دلی میں ابھی اردو دبستان قائم بھی نہیں ہو چکتا کہ پنجاب میں لوگ اردو زبان میں مثنویاں لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ میرپور (کشمیر) کے شیخ غلام محی الدین تصوف میں مثنوی "گلزار فقر" ۱۱۳۱ھ میں ختم کرتے ہیں (۳۰)۔

"مثنوی گلزار فقر از غلام محی الدین ولد قطب عالم شیخ محمد یوسف ساکن میرپور۔ میرپور فی زمانا گذشتہ صدی کے سیاسی خلفشار کے باعث داخل کشمیر ہے، لیکن مغلیہ عہد میں داخل پنجاب تھا۔ مثنوی ہذا ۱۱۳۱ھ میں لکھی جاتی ہے۔ ہم مصنف کے حالات زندگی سے بالکل تاریکی میں ہیں۔ ان کے بیان سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک صادق العقیدہ صوفی تھے۔ چنانچہ تصوف کے مضمون پر یہ مثنوی انھوں نے لکھی ہے۔ اس کی ابتدا۔ ہے

سنوں سادھو اک من کی بات جس میں پائی ذات صفات

کہے فقیر غلام محی الدین دین دار کو چاہیے چین

دین دار کون دین پیارا واری دین پہ عالم سارا

دین دار کا اوچا پایا چوداں طبق میں اوسکی چھایا

گلزار فقر اسی سال لکھی جاتی ہے جس سال دلی میں یہ تتبع ولی دکنی کے، تغزل کی بنیاد

پڑتی ہے (۳۱)"۔

ذخیرۂ شیرانی، کتب خانۂ دانش گاہ پنجاب لاہور میں "گلزار فقر" کے دو قلمی نسخے (۳۲) موجود ہیں۔ "گنج الاسرار" کے ساٹھ سے زائد اشعار اسی مثنوی سے ماخوذ ہیں۔ مقابلہ کریں تو گنج الاسرار میں اشعار کی بے ربطی اور عدم تسلسل کے برعکس گلزار فقر میں پورا پورا ربط اور تسلسل موجود ہے۔ ذیل میں دونوں مثنویوں کے چند مشترک اشعار کا تقابلی نمونہ پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کرام اس بات کا بذات خود اندازہ لگا سکیں کہ "گنج الاسرار" نام کی تصنیف دراصل کس کی ہے

شعر نمبر	گنج الاسرار (اشعار ۱۔۴)	شعر نمبر	گلزار فقر (اشعار ۳۰۔۳۳)
۱	جس ذات کا اللہ ناؤں اس کا تجھے بتاؤں تھاؤں	۳۰	جس ذات کا اللہ ہے ناؤ تس کا مجھے بتاؤ تھاؤ
۲	کم ایک سے تین ہزار اتنے نام دھرے کرتار	۳۱	ایک کم سوں اور تین ہزار ایتے نام دھرے کرتار
۳	اتے ہوون جس کے ناؤں کیونکر چھپتا اس کا تھاؤں	۳۲	ایتے ہوون جس کے ناؤ کیونکر چھپیا اس کا تھاؤ
۴	ظاہر دسے عالم کچا کیونکہ چھپتا صاحب سچا	۳۳	ظاہر دستا عالم کانچا کیونکہ چھپیا صاحب سانچا

شعر نمبر	گنج الاسرار (اشعار ۵۔۲۰)	شعر نمبر	گلزار فقر (اشعار ۲۴۲۔۲۵۷)
۵	حق ہے باقی عالم فانی فانی کی ناں رہی نشانی	۲۴۲	حق باقی اور عالم فانی فانی کی نا رہے نشانی
۶	وحدت نوں توں کر تحقیق اس کون من سون کر تصدیق	۲۴۳	غیر نفی کر تحقیق اس کون من سوں کر تصدیق

۷ ایس مکان کون پہنچن مشکل
سخت راہ ہے دور ہے منزل

۸ بہت ریاضت محنت طاعت
دل حاضر راکھے ہر ساعت

۹ فضل خدا کا ار توفیق
جب سالک کوں ہووے رفیق

۱۰ تب پہنچے اس راہ سعادت
علم موافق کرے عبادت

۱۱ طاعت اوہ جو پیر فرماوے
اپنا کیا کچھ کام نہ آوے

۱۲ دارو وہ جو دیوے حکیم
آپ دارو کیا کرے سقیم

۱۳ کلام خدا کی دارو کھاناں
جس جاناں پر حق کرماناں

۱۴ جو اذکار اذکار افعال
جو اوراد وظائف اعمال

۱۵ جو حروف کلمات عظام
جو آیات اسماء کرام

۱۶ جو آویں بندیوں کے کام
دین دنیا میں ہوویں تمام

۱۷ سب قرآن مجید میں آئے
حق تعالیٰ نے آپ فرمائے

۲۴۴ پر اس مقام کو پہنچن مشکل
سخت راہ ہے دور ہے منزل

۲۴۵ بہت ریاضت محنت طاعت
دل حاضر راکھے ہر ساعت

۲۴۶ فضل خدا کا اور توفیق
جب سالک کوں ہووے رفیق

۲۴۷ تب پہنچے اس راہ سعادت
علم موافق کرے عبادت

۲۴۸ پیر طاعت وہ جو پیر فرماوے
اپنا کیا کچھ کام نہ آوے

۲۴۹ دارو وہ جو دیوے حکیم
آپ دارو کیا کرے سقیم

۲۵۰ کلام خدا کی دارو کھانا
جس جانا بر حق کرمانا

۲۵۱ جو اذکار اذکار اشغال
جو اوراد وظائف اعمال

۲۵۲ جو حروف کلمات عظام
جو آیات اسماء کرام

۲۵۳ جو آوے بندیوں کے کام
دنیاں دین میں ہووے تمام

۲۵۴ سبھ قرآن مجید میں آئے
حق تعالیٰ نے آپ فرمائے

۱۸	توں کیا جانیں میرے کام	۲۵۵	توں کیا جانے میرے کام
	کون آیت ار کون ہر نام		کون آیت اور کون ہے نام
۱۹	کون شغل ار کونسا ذکر	۲۵۶	کون شغل اور کون ذکر
	کونسا عمل ار کونسا فکر		کون عمل اور کون فکر
۲۰	تو اندھلا تجھ کوں کیا سوجھے	۲۵۸	تو اندھلا تجکوں کیا سوجھے
	بھلے برے کوں توں کیا بوجھے		بھلے برے کوں توں کیا بوجھے

گنج الاسرار کا آخری شعر (نمبر ۱۰۹) اس طرح ہے

یہ سالک عابد کے کام   نوشہ ظاہر کیے تمام

گلزار فقر میں اس شعر کا نمبر ۲۹۸ ہے اور یہ یوں لکھا گیا ہے

یہ سالک عابد کے کام   جو سبھ ظاہر کیے تمام

ان دونوں اشعار کے متن میں فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے مصرعے میں "جو سبھ" کی بجائے "نوشہ" تحریر کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے یہ تبدیلی شرافت صاحب کے کسی قلمی یا مطبوعہ ماٗخذ میں موجود ہو اور انھوں نے وہاں سے بعینہ نقل کر دیا ہو۔ اغلب یہی ہے کہ لفظ تبدیل کر کے اس کو نوشہ سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

گنج الاسرار کے بقیہ پچاس اشعار کے متعلق پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ کہاں سے آ گئے کہ شریف احمد شرافت نوشاہی کے ایک قریبی عزیز اور ایک جدی بزرگ جناب ابوالکمال برق نوشاہی کی ایک تحریر نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ فرماتے ہیں: "گنج الاسرار سے متعلق تو پہلے بھی مشہور ہے کہ یہ حضرت نوشہ گنج بخش کی تصنیف ہے اور اس کا نام رمز العباد ہے لیکن اس کا جو نسخہ جناب شریف احمد ساہن پالی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے اس میں انھوں نے کئی اشعار اپنی طرف سے اضافہ کر دیے ہیں۔" (۳۳)

حواشی

(۱) شرافت نوشاہی: گنج الا - ار، ساہن پال، انجمن سادات نوشاہیہ ۱۳۸۳ھ، ص ۲۱، ۲۲۔
(۲) بقول جناب شرافت نوشاہی انھوں نے ۱۰۶۳ھ میں وفات پائی۔
(۳) گنج الاسرار، محولہ بالا۔
(۴) ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو ۔ جلد اول ، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء، ص ۶۲۸۔
(۵) "پاکستان کا قدیم اردو ادب"۔
(۶) "انتخاب گنج شریف"۔ جمع و تدوین شرافت نوشاہی۔ تقدیم محمد اقبال مجددی، لاہور۔ دارالمؤرخین ، ۱۹۷۳ء۔
(۷) ایضاً مقدمہ ، ص ۳۱۔
(۸) حضرت نوشہ گنج بخش کے حالات زندگی اور صحیح سال وفات کے بارے میں ایک مضمون انشاء اللہ جلد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔
(۹) انتخاب گنج شریف، محولۂ بالا، ص ۱۵۔
(۱۰) سید جلال الدین شیرازی ، نسب نامۂ سادات قلمی ورق ۶، ۱۰۔ ذخیرۂ شیرانی ، دانش گاہ پنجاب، لاہور نمبر ۲۲۰۹۔
(۱۱) برصغیر پاک و ہند میں سید کا لفظ خاتون جنت سیدہ فاطمہ زہرا کی اولاد کے لیے بولا جاتا ہے۔ عرب ممالک میں انھیں شریف کہتے ہیں۔
(۱۲) انتخاب گنج بخش محولۂ بالا، ص ۱۹، ۳۱۔ ایضاً
(۱۴) محمد اشرف نوشاہی: کنزالرحمت ، اجھکے ضلع گوجرانوالہ ۔ ۱۹۱۱ء، ص ۳۱۔
(۱۵) محمد حیات قادری نوشاہی: گلزار نوشاہی ، ص ۵۔
(۱۶) حضرت نوشہ گنج بخش کے پڑپوتے اپنی کتاب تذکرۂ نوشاہیہ (احوال حضرت نوشہ) ، (تصنیف ۱۱۴۹ھ) میں لکھتے ہیں "میاں نور محمد نام بزرگ از یاران حضرت شاہ حاجی گلگو میگویند"۔ ملاحظہ فرمائیں مخطوطہ نمبر ۶۱۸۸۔ ذخیرۂ شیرانی دانش گاہ پنجاب لاہور۔ ورق ۶۵ ، الف ۔

(۱۷) انتخاب گنج شریف محوّلۂ بالا ۔ ص ۱۷۔

(۱۸) مفتی غلام سرور لاہوری ۔ خزینۃ الاصفیا۔ لکھنو ۔ نولکشور ۔ ص

(۱۹) انتخاب گنج بخش شریف محوّلۂ بالا ۔ ص ۱۸۔

(۲۰) ابوالکمال برق نوشاہی ۔ چہار بہار ۔ مکتبۂ نوشاہیہ ڈوگر ۔ ۱۹۷۹ء۔ مقدمہ ۔ ص ۲۸۔

(۲۱) انتخاب گنج شریف محوّلۂ بالا ۔ ص ۲۱۔

(۲۲) ۔ چہار بہار۔ محوّلۂ بالا۔ ص ۲۹۔

(۲۳) ڈاکٹر جمیل جالبی نے اشعار کی تعداد ۱۹۳ لکھی ہے جو صحیح نہیں۔ ۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اوّل ۔ لاہور ۔ مجلس ترقی ادب ۔ ۱۹۷۵ء ۔ ص ۹۲۷۔

(۲۴) شرافت نوشاہی: گنج الاسرار محوّلہ ۔ ص ۲۷ ۔ ۲۸ ۔ تعداد اشعار و سنین ۔ ص ۱۹ ، ۲۱۔

(۲۵) ایضاً ۔ ص ۳۳۔

(۲۶) محمد حیات قادری نوشاہی: گلزار نوشاہی محوّلۂ بالا ۔

(۲۷) ۔ شریف التواریخ۔ جلد اوّل کی تعارفی تقریب (غالباً اپریل) ۱۹۸۰ء میں پاکستان نیشنل سینٹر لاہور میں منعقد ہوئی تھی ۔ اس موقع پر شرافت صاحب نے " مخطوطات" کے نام پر چند بیاضات نمائش کے لیے رکھے تھے۔ انھی میں اس بیاض (لطائف گل شاہی) کا بقیہ بھی شامل تھا۔ یاد رہے کہ صاحب بیاض میاں گل محمد نوشاہی حضرت نوشہ گنج بخش کے پڑپوتے ہیں مگر انھوں نے کہیں اپنے پردادا کے شاعر ہونے کا ذکر تک نہیں کیا۔

(۲۸) " گنج الاسرار " ۱۳۷۳ء میں مرتب ہوئی۔

(۲۹) ڈاکٹر جمیل جالبی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس کی زبان بارہویں صدی ہجری کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ " تاریخ ادب اردو " جلد اوّل ۔ ص ۹۲۶۔

(۳۰) مقالات حافظ محمود شیرانی ۔ جلد دوم ۔ ص ۱۲۸۔

(۳۱) ماہنامہ " سات رنگ" کراچی ۔ نومبر ۱۹۶۱ء " قدیم اردو" ۔ ص ۶ ، ۷۔

(۳۲) ایک اطلاع کے مطابق اس مثنوی کے قلمی نسخے ڈاکٹر احمد حسین احمد قریشی قلعداری (گجرات) اور مولوی عبدالمالک مصنف " شاہان گوجر" (بہاولپور) کے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔

(۳۳) شیخ محمد ہاشم " چہار باغ" تقدیم سیّد ابوالکمال برق نوشاہی ۔ ڈوگہ (ضلع گجرات)

ڈاکٹر نذیر احمد

خسروِ ثانی جمالی دہلوی سے منسوب کتابیں

[سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ (جولائی تا ستمبر ۱۹۵۴ء) میں ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک مبسوط فاضلانہ مقالہ شیخ جمالی دہلوی کے احوال و آثار پر شائع ہوا تھا۔ اس میں جمالی دہلوی کی چار اصیل تصنیفات (مہر و ماہ، دیوان، مرآۃ المعانی، سیر العارفین) کے علاوہ ایک بحث منسوب کتابوں کی بھی آتی ہے، جسے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ نجم الاسلام]

دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں چند اہم کتابیں جمالی کی طرف منسوب ہیں۔ اسپرنگر (۱) نے ایک کتاب بیان الحقائق جمالی کی تصنیف بتائی ہے۔ اس کے مطابق یہ کتاب کئی حصوں میں منقسم تھی، پہلی مصباح الارواح اور آخری شرح الواصلین تھی۔ پہلے حصے کی تاریخ تکمیل ۸۶۸ ہجری ہے جو حسب ذیل بیت میں پائی جاتی ہے:

ہشت سال و شصت سال و ہشت صد   رفتہ بُد از ہجرت شاہ رصد

بیان الحقائق حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور ان کے اقوال وغیرہ کی صوفیانہ تشریح ہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (۲) میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے جو صرف پہلے اور ساتویں حصے پر مشتمل ہے، علاوہ بریں اس میں ۱۔ کچھ رباعیاں ہیں جو حضرت رسول اللہ اور حضرت علی اور دوسرے بزرگان دین کی مدح میں ہیں۔ ۲۔ مہر القلوب، صوفیانہ اور مذہبی مثنوی ہے۔ اسٹورٹ (۳) نے بغیر کسی تفصیل کے مصباح الارواح کا ذکر کیا ہے۔ بادلی (۴) میں اسی طرح کا ایک نسخہ موجود ہے جو جمالی دہلوی کی طرف منسوب ہے۔ اور جس کے حسب ذیل حصے ہیں۔

۱۔ کشف الارواح ۲۔ فضیلۃ العقل ۳۔ نورٌ علیٰ نور ۴۔ قصائد مع مناجات و رباعیات۔

امپیریل لائبریری (۵) کلکتہ میں حسب ذیل پانچ مثنویاں پائی جاتی ہیں:

۱۔ محبوب الصادقین ۲۔ مہر القلوب ۳۔ فرحت نامہ ۴۔ نصرت نامہ ۵۔ ندرت نامہ۔

جانم نے ان نظموں میں اپنی ساری مصنفات کے نام لکھ دیے ہیں۔ محبوب الصادقین سب سے قدیم ہے اور اس میں حسب ذیل کتابوں کے نام درج ہیں۔

۲۔ مرآت

۳۔ کنز الحقائق

۴۔ تنذیہ العارفین

۵۔ میزان الحقائق

۶۔ مستزاد

۷۔ کشف الارواح

محبوب الصادقین ۸۶۶ ہجری میں تصنیف ہوئی۔ اس لیے ان سب کا سن تالیف اس سے قبل ہو گا۔

دوسری فہرست چار کتابوں کی ہے جو مصباح الارواح میں ہے۔

۸۔ روح القدس

۹۔ مرآۃ الفقر

۱۰۔ معلومات

۱۱۔ مصباح الارواح

مصباح ۸۶۸ھ ہجری میں تصنیف ہوئی اس لیے بقیہ ۸۶۶ ہجری اور ۸۶۸ ہجری کے درمیان میں لکھی گئیں

تیسری فہرست نو کتابوں پر مشتمل ہے جو شرح الواصلین میں ہے۔

۱۲۔ نعت و منقبت

۱۳۔ احکام

۱۴۔ نہایت

۱۵۔ ہدایت

۱۶۔ ہدایت

۱۷۔ فتح الابواب

۱۸۔ مشکوۃ

۱۹۔ مہر افروز

۲۰۔ شرح الواصلین

شرح الواصلین کی تصنیف ۹۰۹ میں ہوئی ۔ اس لیے ان کتابوں کا سن تصنیف ہجری ۹۰۸ اور ۹۰۹ ہجری کے درمیان سمجھنا چاہیے۔

ان کے علاوہ مذکورۂ بالا فہرستوں کی کم از کم چھے کتابیں جمالی کی طرف منسوب ہیں ، اس طرح کل ۲۶ چھوٹی بڑی کتابیں جمالی کی ہیں۔

اب قابل غور سوال یہ ہے کہ آیا جمالی دہلوی مولف سیر العارفین وغیرہ ہی مذکورۂ بالا ۲۶ کتابوں کا مصنف تھا یا یہ جمالی کوئی دوسرا شاعر تھا۔ اسپرنگر (۶) زاخو اور ایتے (۷) نے تو دونوں کو ایک ہی قرار دیا ہے ۔ لیکن افتاذ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست (۸) میں دونوں کو الگ الگ دو شاعر قرار دیا ہے ۔ اس کا قیاس یہ ہے کہ

" جمالی جو ۹۰۹ ہجری تک تقریباً بیس کتابوں کا مصنف ہو ، وہ ۲۰ سال بعد کیونکر اس قابل ہو گا کہ حج کی مشقت برداشت کرے اور وہاں سے واپسی پر سیر العارفین لکھے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سیر العارفین کا تعلق عہد ہمایوں سے نہیں ہے (حالانکہ یہ قیاس سراسر بے بنیاد ہے) پھر بھی حسب ذیل قرائن کی بنا پر دونوں شاعروں کی شخصیت علیحدہ علیحدہ ثابت ہو جاتی ہے ۔

۱۔ جمالی مذہبی مفکر اور جمالی صاحب سیر العارفین کے طرز فکر میں نمایاں فرق ہے۔

۲۔ اول الذکر مذہباً شیعہ معلوم ہوتا ہے جب کہ سیر العارفین کا مولف سنی تھا اور صوفیہ سلاسل میں سلسلۂ چشت (۹) سے متعلق تھا۔

۳۔ اول الذکر نے ایران کے مشائخ و صوفیہ کا ذکر کیا ہے مگر ہندوستانی مشائخ کا ذکر کہیں نہیں پایا جاتا ۔ لیکن جمالی دہلوی مشائخ چشت کا نام ضرور لاتا ہے۔

افتاذ نے مزید یہ قیاس کیا ہے ۔

" جمالی کے وفات کے سلسلے کی پہلی تاریخ یعنی ۸۲۲ یا ۸۲۵ ہجری (۱۰)

تو ایرانی جمالی سے متعلق سمجھنا چاہیے اور دوسری تاریخ یعنی ۹۴۲ ہجری جمالی دہلوی سے۔ لیکن یہ محض قیاس ہے۔ اس کے لیے تاریخی اسناد درکار ہیں۔"

اس سلسلے میں کوئی خاص رائے دینے کے قبل افتاد کی چند غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔ ان کا یہ خیال کہ حج سے واپسی کے بعد ہی جمالی نے سیر العارفین لکھی، بالکل بے بنیاد ہے۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ جمالی کی واپسی حج اور تصنیف سیر العارفین کے درمیان تقریباً ۴۰ سال کا وقفہ ہے۔ چونکہ دونوں باتوں کا ذکر ایک ہی سلسلے میں ہوا ہے۔ اس لیے سرسری مطالعے سے اس طرح غلط فہمی یقینی ہے۔

دوسری بات جو قابل لحاظ ہے اور جس کی طرف شیخ جمالی کی وفات کے سلسلے میں اشارہ ہو چکا ہے، یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو اختلافات ہیں وہ محض غلط قرات کا نتیجہ ہیں، ۹۴۲ ہجری کو غلطی سے ۹۲۲ ہجری پڑھ لیا گیا۔ اور "خسرو ہند بوده" کے بجائے "خسرو ہند" سے تاریخ نکالی گئی جس کے ۹۴۲ کے بجائے ۹۲۵ ہوتے ہیں۔ غرض ان دو یا تین، تاریخوں کا تعلق محض ایک ہی شاعر یعنی جمالی دہلوی ہی سے ہو گا۔

میرے خیال میں افتاد کے شبہات قابل توجہ ہیں۔ یہ بہت مشکل سے تسلیم کیا جا سکے گا کہ ۸۲۶ ہجری میں شیخ جمالی دہلوی صاحب تصانیف ہو سکے گا، ساتھ ہی تصوف میں اس قدر پختہ ہو جائے گا کہ اس کے اہم مسائل شعر کے ذریعے عام کر سکے گا۔ جمالی نے لکھا ہے کہ وہ شیخ سماء الدین سے رن تھمبور (۱۱) میں مرید ہوا (جب ان کی عمر ۶۵ سال سے زائد ہو گی) اگر شیخ کی کل عمر ۱۰۰ سال کی سمجھ لی جائے (جو بہت مشکل سے سمجھی جا سکے گی) تو چونکہ ان کا انتقال ۹۰۱ ہجری (۱۲) میں ہوا ہے اس لیے ان کی پیدائش ۸۰۱ میں ہوئی ہو گی۔ اور رن تھمبور کا قیام ۸۶۶ ہجری کے بہت بعد ہو گا۔ گویا جب وہ صاحب تصانیف بتایا جاتا ہے تو وہ تصوف کے اعتبار سے طفل مکتب ہو گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیخ جمالی کا ایک لڑکا ۹۲۳ ہجری (۱۳) میں پیدا ہوا۔ اگر ۸۲۶ ہجری میں، ان کی عمر ۲۰ سال فرض کر لی جائے (کیونکہ اس سے کم عمر کا آدمی صاحب تصنیف کثیرہ نہیں ہو سکتا) تو ۹۲۳ ہجری میں وہ ۸۰ سال سے کم نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمر توالد و تناسل کے اعتبار سے زیادہ ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اخبار الاخیار (۱۴) میں ہے کہ شروع شروع میں نام کی رعایت

سے جلالی تخلص کرتے تھے۔ پیر کی ہدایت سے جمالی کر دیا۔ اس لیے اگر یہ جمالی کی ابتدائی تصانیف ہوتی ہیں تو ان میں جلالی تخلص ملنا چاہیے۔

آخری بات یہ کہ ۸۶۶ ہجری اور ۸۷۶ ہجری کے درمیان ۲۶ کتابیں لکھ ڈالیں اور ۸۷۶ اور ۹۴۲ ہجری کے درمیان صرف چند کتابیں لکھیں اس کی کوئی توجیہ معقول نہیں ملتی۔

ان وجوہ سے میرا بھی قیاس یہی ہے کہ جمالی دہلوی۔ جمالی ایرانی سے الگ ہے۔ اس لیے اول الذکر کی مصنفات وہی چار ہیں جن کا ذکر ہم شروع میں کر آئے ہیں۔

حواشی

(۱) فہرست اودھ ص ۳۳۹۔ ۳۴۰۔

(۲) فہرست افتاؤ ص ۲۸۳۔ ۲۸۲ نمبر ۶۳۸

(۳) اسٹورٹ کیٹلاگ نمبر ۲۷، ص ۹۹

(۴) نمبر ۱۲۷۳ ص ۸۷۰

(۵) بحوالہ فہرست افتاؤ ص ۲۸۳۔ ۲۸۶

(۶) فہرست اودھ ص ۳۳۶

(۷) بادلی ص ۸۷۰

(۸) فہرست افتاؤ ص ۲۸۳

(۹) خاص طور پر سہروردیہ سلسلے سے متعلق تھے

(۱۰) ایضاً ص ۲۸۵

(۱۱) سیر العارفین ورق ۱۲۵ ب

(۱۲) ایضاً ورق ۱۲۷ ب

(۱۳) اخبار الاخیار ص ۲۲۹

(۱۴) ص ۲۲۹

متعاقب تحریریں

پروفیسر محمد ابراہیم ڈار:

دیوانِ خواجہ معین الدّین چشتی اجمیری

(مطبوعہ رسالہ "اردو" کراچی، بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۵۰ع)

علم و ادب کی دنیا میں بعض اوقات عجیب عجیب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ انھی عجائبات میں سے بعض کتابوں کا غلط انتساب ہے۔ شیخ فرید الدّین عطّار کے نام چند ایسی کتابیں منسوب کردی گئیں جن کا مُصنّف کوئی فرضی عطّار ہے یا اصلی مُصنّف کے بجائے ان کتابوں کو شیخ عطّار کی تصنیفات ٹھہرایا گیا۔ میرزا قزوینی اور مولانا شبلی ایسے متبحر عالم اس حقیقت نما دروغ کو سچ تسلیم کرتے رہے، یہاں تک کہ مرحوم پروفیسر محمود خاں شیرانی نے پوری جامعیت و استقصا کے ساتھ اس فریب کا پردہ چاک کیا۔ ان کی تحقیقات سے یہ بات ثبوت کو پہنچ گئی کہ ان کتابوں میں سے کئی ایک کا مصنّف کوئی جعلی عطّار ہے اور بعض کا انتساب غلط طور پر عطّار کے نام کردیا گیا ہے۔ شیرانی صاحب کے مضمون شائع ہونے کے کئی سال بعد ایران کے پروفیسر سعید نفیسی، شیخ عطّار کے احوال و تصانیف کے متعلق اپنی کتاب میں، شیرانی صاحب کے نظریے کی تقلید کرتے ہوئے، ان کتابوں کو جعلی عطّار کا صدقہ بتاتے ہیں۔ جب آقائے سعید نفیسی کی کتاب کا ایک نسخہ شیرانی صاحب کی خدمت میں ارسال کیا گیا تو وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ایک ایرانی محقّق بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہے جہاں وہ کئی سال پہلے پہنچ چکے ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ان کی دِقّت نظر نے آقائے سعید نفیسی کی تحقیقات میں یہ خامی محسوس کی کہ وہ ان تمام کتابوں کو جعلی عطّار کی ملک ٹھہراتے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض کے حقیقی مالک موجود ہیں۔

اسی قسم کے غلط انتساب کی ایک بین مثال حضرت خواجہ معین الدّین اجمیری کا دیوان ہے جسے مطبع نول کشور کے مہتمم کئی بار شائع کرچکے ہیں۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں حضرت خواجہ صاحب کی جلیل القدر شخصیت کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کی بنا پر یہ دیوان خواص و عوام میں بہت مقبول ہوا اور عقیدت مندوں کے حلقے میں اس کی بڑی قدر ہوئی، لیکن اہل علم کو اس امر کی تحقیق کا خیال نہ آیا کہ یہ دیوان، جسے وہ ہر قسم کے احترام کا مستحق

سمجھتے ہیں، خواجہ صاحب کی تصنیف ہے یا اس کا جائز مالک کوئی اور شاعر ہے۔ سب سے پہلے رسالۂ اردو کی اشاعت جولائی سنہ ۱۹۲۳ء میں شیرانی صاحب نے اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ ان جیسے محقق کے لیے یہ باور کرنا دشوار تھا کہ اگر یہ دیوان واقعی خواجہ صاحب کا تھا تو اتنی صدیوں تک یہ ایک گنجِ مخفی کی طرح اہلِ علم کی نظروں سے کس طرح پوشیدہ رہا۔ کئی ایسی کتابوں کے نام ہمیں معلوم ہیں جو آج تقریباً ناپید ہیں لیکن ان کے نام کم از کم کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ادھر خواجہ صاحب کے دیوان کا یہ حال ہے کہ خواجہ صاحب کی وفات سے صدیوں بعد تک اس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ سچ ہے کہ بعض تذکرہ نویس مثلاً تقی اوحدی، والہ داغستانی، میر حسین دوست سنبھلی، لطف علی آذر اور رضا قلی ہدایت، خواجہ صاحب کی طرف بعض اشعار منسوب کرتے ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی خواجہ صاحب کے صاحب دیوان ہونے کا ذکر نہیں کرتا۔ مولوی خدا بخش خاں کی بانکی پور لائبریری میں اس دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے لیکن کیٹیلاگ مرتب کرنے والے صاحب صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

> "اس اعتقاد کے تسلیم کرنے کا کہ یہ دیوان مشہور و معروف خواجہ معین الدین چشتی سے علاقہ رکھتا ہے، ہمارے پاس صرف یہی ذریعہ ہے کہ تقی اوحدی عرفات میں اور والہ ریاض الشعرا میں اس دیوان کے بعض اشعار نقل کرکے ان کو حضرت خواجہ کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن نہ یہ دونوں مؤلف اور نہ کوئی اور مصنف صاف طور پر یہ ذکر کرتا ہے کہ خواجہ کی یادگار کوئی دیوان بھی ہے۔"

اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے شیرانی صاحب نے اپنی تحقیقات کا آغاز کیا اور آخر تلاش و جستجو کے بعد انھیں ایک ایسے مصنف کا سراغ مل گیا جسے اس دیوان کا حقیقی مالک تسلیم کیا جاسکے۔ یہ مصنف ملّا معین واعظ فراہی ہیں جنھیں مولانا جامی کے ہم عصر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ملّا معین اپنے زمانے کے ایک مشہور واعظ تھے۔ وہ محض ایک شعلہ بیان مقرر ہی نہ تھے بلکہ تحریر و انشا کے میدان کے بھی مرد تھے۔ چنانچہ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان ہی میں سے ایک کتاب معارج النبوہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے نے شیرانی صاحب کو یقین دلا دیا کہ خواجہ صاحب کی طرف منسوب کیے ہوئے دیوان کے مالک ملّا معین ہیں۔ ملّا کی یہ عام عادت ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں جا بجا اپنے اشعار بلکہ بعض اوقات پوری کی

پوری غزلیں نقل کرتے جاتے ہیں اور پھر اس بات کی صراحت بھی کر دیتے ہیں کہ یہ اشعار ان کے اپنے نتائج افکار ہیں۔ شیرانی صاحب کو پندرہ سولہ غزلیں ایسی مل گئیں جنھیں ملّا معین نے معارج النبوہ میں اپنے نام کی صراحت کے ساتھ درج کیا ہے اور وہی خواجہ صاحب کے دیوان میں بھی ملتی ہیں۔ یہ ایک ایسی صاف اور واضح حقیقت ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی انصاف پسند کو کوئی عذر نہیں ہوسکتا۔ لیکن سنہ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ شمس العلماء پروفیسر محمد عبدالغنی نے اپنی کتاب "مغلوں سے پہلے ہندوستان میں فارسی ادب" میں خواجہ صاحب کی طرف دیوان کے انتساب کو درست تسلیم کرتے ہوئے اس کی بعض چیدہ غزلوں کو مع انگریزی ترجمے کے درج کیا۔ اس قسم کے اندراج کی غالباً یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ شیرانی صاحب کا مضمون شمس العلماء کے ملاحظے سے نہیں گزرا تھا۔ تاہم جب شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں شمس العلماء کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی تو شمس العلماء کو بادل ناخواستہ یہ بات تسلیم کرنی پڑی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دینا چاہی کہ ان غزلوں کے علاوہ، جن کی نشان دہی شیرانی صاحب نے کی ہے، باقی غزلیں خواجہ صاحب کی تصنیف ہوسکتی ہیں۔ اتفاق سے بمبئی کی کریمی لائبریری میں، جو آج کل اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام ہے، ہمیں ملّا معین کی ایک دوسری کتاب سورۃ الفاتحہ کی فارسی تفسیر مل گئی ہے۔ حسب عادت اس میں بھی ملّا معین جا بجا اپنے اشعار نقل کرتے ہیں۔ ہم چند ایسی غزلیں ڈھونڈھنے میں کامیاب ہوگئے ہیں جو معارج النبوہ میں درج کی ہوئی غزلوں کے علاوہ ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان غزلوں کو قارئین کی خدمت میں پیش کریں، ہم ملّا معین سے متعلق وہ اطلاع نقل کرنا چاہتے ہیں جو امیر علی شیر نوائی کی مجالس النفائس کے فارسی ترجمے میں قزوینی نے ہم پہنچائی ہے۔ ملّا کے متعلق شیرانی صاحب کی معلومات کا سب سے بڑا ماخذ حبیب السیر ہے۔

علماء و شعراء کی سرپرستی میں امیر علی شیر، سلطان حسین سے بھی گوے سبقت لے گیا تھا۔ وہ محض ایک وزیر باتدبیر ہی نہیں تھا بلکہ اقلیم سخن میں بھی ایک بلند مرتبے پر فائز تھا۔ ترکی زبان میں اس کا خمسہ ترکی دانوں سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ فارسی میں بھی اسے شعر گوئی پر وہی قدرت حاصل تھی جس کا ثبوت اس کے ترکی کلام میں ملتا ہے۔ اس نے اپنے ہم عصر شعرا کا ایک تذکرہ ترکی میں "سنہ ۸۹۶ھ میں "مجالس النفائس" کے نام سے مرتب کیا۔ اپنی بیش بہا معلومات کی بنا پر یہ کتاب بڑی مقبولیت کی مستحق ٹھہری، چنانچہ ہم دیکھتے

ہیں کہ اس کی افادی حیثیت کے پیش نظر تقریباً ایک ہی وقت میں اس کے دو فارسی ترجمے تیار کیے جاتے ہیں۔ ایک ہرات میں سنہ ۹۲۸ھ کے قریب اور دوسرا سنہ ۹۲۹ھ میں اسلامبول میں۔ پہلے کا مصنف فخری ہے جو اپنے ترجمے کو "لطائف نامہ" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہ وہی فخری ہے جو دو دیوانوں "بوستان خیال" اور "تحفۃ الحبیب" کا مالک ہے اور جس نے سندھ کے والی عیسیٰ خاں ترخان کے لیے سخن ور عورتوں کا تذکرہ بنام "جواہر العجائب" مرتب کیا۔ لطائف نامہ کے دیباچے میں شاہ اسماعیل صفوی، اس کے بیٹے سام میرزا اور امیر الامرا درمش خاں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد یہ کتاب وزیر خراسان خواجہ حبیب اللہ کی مجلس میں ہدیۂ پیش کی جاتی ہے۔ خاتمۂ کتاب میں ایک پوری فصل شاہ اسماعیل کے وزیر میرزا شاہ حسین کے لیے وقف کی گئی ہے۔

دوسرا ترجمہ اسلامبول میں محمد بن المبارک القزوینی، اسماعیل صفوی کے رقیب سلطان سلیم کے نام سے معنون کرتا ہے۔ چونکہ شاہی دربار میں قزوینی طبیب کے فرائض سرانجام دیتا تھا، اس لیے وہ حکیم شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ قزوینی نے سات مجلسوں کا ترجمہ سات بہشتوں میں کیا ہے۔ آخر میں ایک فصل کا اضافہ بنام بہشت ہشتم کیا گیا ہے۔ آٹھویں بہشت دو "روضوں" میں منقسم ہے۔ روضۂ اوّل میں ان شعرا کا ذکر ہے جو سلطان سلیم سے پہلے گزر چکے ہیں اور روضۂ دوم میں سلطان سلیم اور اس کے درباری شاعروں کا بیان ہے۔ اس ترجمے میں بھی کئی ایسے اضافے ہیں جو بہت مفید اور قیمتی ہیں۔ آج سے تقریباً بیس سال پہلے برادر عزیز ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ (پروفیسر اورینٹل کالج لاہور) فخری کا ترجمہ بالاقساط اورینٹل کالج میگزین میں شائع کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ایران کے نامور فاضل اور سابق وزیر تعلیم آقاے علی اصغر حکمت نے فخری اور قزوینی کے دونوں ترجموں کو یک جا کر کے اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ غالباً آقاے حکمت کو سیّد صاحب کے شائع کردہ نسخے کا علم نہیں ورنہ وہ ضرور ان کی محنت اور تحقیق کا اعتراف کرتے۔ فخری اور قزوینی کے سلسلے میں ہماری معلومات کا ماخذ آقاے حکمت کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔ فخری(۱) کا بیان ملا معین کے متعلق بہت مختصر ہے:

"مولانا معین واعظ حاجی محمد فری (فراہی) کا بیٹا مشاہیر میں سے ہے۔ فی الحال شہر کا مقرر کردہ واعظ ہے۔ یہ مطلع اس کا ہے۔

گر فصل بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد
گر وصل نگار آمد کہ دل با وصل ہمدم شد"

قزوینی ملا معین سے زیادہ خوش نظر نہیں آتا۔ وہ امیر علی شیر کے بیان پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اپنی طرف سے اضافہ کرتا ہے کہ ملا پر دیوانگی غالب تھی۔ اس جنون کی تہمت کی ذمے دار شاید ملا کی خود داری اور آزادہ روی ہو۔ ذیل میں ہم قزوینی کے بیان کا مطلب اردو میں پیش کرتے ہیں۔

"مولانا معین واعظ مولانا محمد فرہی (فراہی) کا بیٹا ہے۔ یہ بھی اچھا واعظ ہے اور تمام خراسان میں اس کا وعظ خاص و عام میں مقبول ہے لیکن یہ دیوانہ سا ہے اور اس کے مرید بھی ایسے ہی ہیں۔ چونکہ لوگ اسے دیوانہ سمجھتے ہیں اس لیے جو جی میں آتا ہے منبر پر کہہ دیتا ہے اور کوئی اس سے باز پرس نہیں کرتا۔ اور کرے بھی کیوں جب کہ دیوانہ اور عاشق مواخذے سے بری ہیں۔ ایک روز منبر پر اس نے یہ کہہ دیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایمان تقلیدی ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ حضرت امیر کے اس قول "لو کشف الغطاء ما ازددت یقیناً" (اگر پردہ ہٹا دیا جائے تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا) کا مفہوم درست طور پر نہیں سمجھا۔ دیوانگی کے عذر کی بنا پر لوگوں کے مواخذے سے تو بچا رہا لیکن خدا تعالی نے اسے معذور نہ سمجھا اور ایسے شکنجے میں گرفتار کیا کہ لوگ دیکھ کر دم بخود رہ گئے اور کہنے لگے کہ اگرچہ انھوں نے کوئی گرفت نہیں کی لیکن خدا تعالی نے اس کو اس گستاخی کی سزا دی۔ مولانا نظام الدین کہا کرتے تھے کہ ملا معین ایک قابل جوان ہے لیکن منبر کے تختے نے اس کی قابلیت کو ضائع کر دیا ہے۔ یہ مطلع ملا کا ہے:

گر فصل بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد
گر وصل نگار آمد کہ دل با وصل (۲) ہمدم شد (۳)

ملا معین کی جس غزل کا مطلع فخری اور قزوینی نے نقل کیا ہے، وہ دیوان خواجہ معین اجمیری مطبوعہ نولکشور سنہ ۱۸۹۳ع کے صفحہ ۲۲ و ۲۳ پر موجود ہے۔ اس غزل کے آٹھ شعر مع مطلع "معارج النبوہ" میں ملتے ہیں۔ مطلع بالا "مخزن الغرائب" (۴) میں بھی معین فراہی کے نام سے دیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ملا معین کی تفسیر "اسرار الفاتحہ" کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ یہ تفسیر ۵۳۳ صفحات پر محیط ہے اور سنہ ۱۳۰۰ھ میں مطبع نول کشور میں حلیہ طبع سے آراستہ

ہوتی ہے۔ سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اخوند ملّا خیر محمد پشاوری کی تحریک پر چھاپی گئی ہے اور افغانستان میں مروّج رہی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں معین اپنی ضخیم کتابوں مثلاً تفسیر بحرالدّرر، اربعین فی احادیث سیّد المرسلین، معارج النبوہ اور قصص التنزیل کا ذکر کرتے ہیں۔ بعض دوستوں کی فرمائش پر وہ اپنی تفسیر بحرالدّرر میں سے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر علاحدہ مرتب کرنے پر رضا مند ہوجاتے ہیں۔ ملّا معین بڑے طومار نویس ہیں۔ ان کی تفسیر فاتحہ ایک مقدمے اور پندرہ مجلسوں پر مشتمل ہے اور ہر مجلس میں کئی کئی فصلیں اور باب ہیں۔ ملّا کا انداز خطیبانہ اور واعظانہ ہے۔ وہ اپنی تحریر کو دل کش بنانے کے لیے نادر حکایات اور عمدہ اشعار جا بجا لاتے ہیں۔ انھیں عربی اور فارسی شعر و ادب کے ساتھ بڑی دل بستگی ہے۔ فارسی شعرا میں سے رشید وطواط، نظامی، کمال اسمٰعیل، عطّار، مولانا روم، سعدی، امیر خسرو، عراقی اور حافظ کے اشعار اس تفسیر میں جگہ پاتے ہیں۔ ملّا معین اپنے والد اور استاد ملّا محمد فراہی کے اشعار بھی درج کرتے ہیں لیکن بے شمار عربی اور فارسی اشعار کے علاوہ ملّا معین نے حسب عادت اپنے اشعار سے تفسیر کے صفحات کو مزیّن کیا ہے۔ معارج النبوہ کی طرح یہاں بھی بعض اوقات وہ پوری کی پوری غزلیں درج کردیتے ہیں۔ ان میں سے کئی غزلیں تو ایسی ہیں جو معارج النبوہ میں بھی موجود ہیں۔ ہم ایسی تمام غزلوں سے اعراض کرکے صرف ان اشعار اور غزلوں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائیں گے جن کی طرف شیرانی صاحب نے اشارہ نہیں کیا اور اس کے ساتھ ہی جو دیوان خواجہ معین الدین میں بھی ملتی ہیں۔

ملّا کے یہاں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ اشعار کے سلسلے میں وہ اپنا حق تصنیف جتانے کے لیے مختلف پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں۔ "للفقیر معین المسکین" "قال العبد الضعیف مؤلف ھذا الکتاب"، "کما قلت فی شعر لی" عربی اسلوب کی چند مثالیں ہیں لیکن فارسی میں بعض اوقات بڑے پر تاثیر طریقے پر اپنی دیوانگی و بے خودی کی کیفیت بیان کرتے ہیں "چنانچہ فقیر تو گوید"، "چنانچہ فقیر تو گفتہ است"، "چنانچہ فقیر حقیر گوید"، "چنانچہ فقیر ترا سری درین معنی بخاطری می گذشت"، "چنانچہ معین دیوانہ گفتہ است۔"

ذیل میں ہم ان غزلوں اور اشعار کی نشان دہی کرتے ہیں جن کو ملّا معین نے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے اور جو دیوان خواجہ معین الدین میں بھی موجود ہیں۔

۱۔ صفحہ ۵۲۶۔ لمولفہ ختم لہ، بالخیر

خزینہ است مرا پُر ز نقد علم و ادب

کجا ست آہ سحر گاہ و نالۂ دل شب

اس غزل کے نو اشعار دیے گئے ہیں ۔ مقطع میں ملّا کا نام معین موجود ہے۔ دیوان کے صفحہ ۸، ۹ پر یہ غزل درج ہے اور اس کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے۔

۲۔ صفحہ ۲۰۵۔ لمؤلفہ

دلا بحلقۂ رندان بزم عشق در آ
کہ از شراب بقا جرعۂ دہند ترا

اس غزل کے سات اشعار مع مقطع ہیں ۔ صفحہ ۳۲۸ پر بھی اس غزل کے سات اشعار نقل کیے گئے ہیں ۔ یہی غزل دیوان کے صفحہ ۳ و ۴ پر درج ہے اور اس میں کل اشعار تیرہ ہیں ۔

۳۔ صفحہ ۸۲۱۔ قال العبد الضعیف مؤلف الکتاب فی ہذا الخطاب

نام او می بردم اوّل تا چنان شد عاقبت
کو چو شیر اندر رگ و جانم روان شد عاقبت

مع مقطع اس غزل کے نو اشعار درج ہیں ۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۱۴ و ۱۵ پر اس غزل کے اشعار کی تعداد سات ہے۔

۴۔ روزی کہ یار جام صفا پُر ز می کند
عاشق دران وفا ز جفا یاد چون کند

اس غزل کے پانچ اشعار صفحہ ۲۵۲ پر درج ہیں اور مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۳۲ و ۳۳ پر اس غزل کے کل اشعار سات ہیں ۔ تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۳۵ پر اس غزل کے پانچ شعر دوبارہ نقل کیے گئے ہیں اور اس کے پہلے لمؤلفہ لکھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ملّا معین اس کے مالک ہیں ۔

۵۔ ای تو سلطان دار ملک وجود
ہمہ عالم طفیل تو مقصود

اس غزل کے نو اشعار تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۸۰ پر نقل کیے گئے ہیں۔ مقطع سے پہلے شعر میں ملّا معین اپنا نام یوں لاتے ہیں ۔

می فرستد معین بخدمت تو
صد ہزاران درود نامعدود

اور آخری شعر اس طرح ہے:

دارم امید از شفاعت تو
شود از من خدای من خوشنود

یہی غزل مطبوعہ دیوان کے صفحات ۲۰ اور ۲۱ پر موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد دس ہے لیکن اس میں مقطع اس طرح دیا گیا ہے:

می فرستد معین درود بتو
حق تعالی ز من شود خوشنود

۶۔ روز قیامت می رسد تا گفتگو یک سو شود
اسرار پنہان از ازل از پردہ ہا بیرون شود

یہ پوری غزل جس میں بارہ اشعار ہیں تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۶۱ پر درج ہے اور اسکے پہلے لمؤلفہ لکھا ہے۔ اسی غزل کے تین اشعار صفحہ ۳۵۲ پر بھی دیے گئے ہیں۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۳۱ و ۳۲ پر یہ غزل موجود ہے لیکن وہاں اس کا مطلع یوں نقل کیا گیا ہے:

گر پردہای آب وگل از جان و دل یک سو شود
از کسوت ہر ذرہ مہر دگر بیرون شود

جہاں تک باقی اشعار کا تعلق ہے، کوئی فرق نہیں۔ مقطع دونوں میں ایک جیسا ہے:

مسکین معینی تا کنون در شام غم مانده زبون
ای ماه اگر آئی برون استاده اش میمون شود

۷۔ سخن بشنو معینی غم مخور از آتش دوزخ
کہ موسی را جمال یار اندر نار می تابد

ایک غزل کا یہ مقطع تفسیر سورۃ الفاتحہ کے صفحہ ۲۹۶ پر نقل کیا گیا ہے اور اس کے پہلے یہ الفاظ ہیں "چنانچہ فقیر تو گفتہ است"۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل ملا معین کی ہے۔ مطبوعہ دیوان میں یہ غزل صفحہ ۳۵ و ۳۶ پر درج ہے اور اس کا مقطع تفسیر الفاتحہ کے مقطع کے مطابق ہے۔ اس غزل کا مطلع مدارج النبوہ میں بھی نقل کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو پروفیسر شیرانی

کا مضمون)

۸۔ گر صبا ز سر کوی دوست می آید
که از زمین و زمان بوی دوست می آید

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ، پر اس غزل کے پانچ اشعار درج ہیں۔ یہی غزل مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۲۶ پر موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد سات ہے۔

۹۔ گنتمش عکس جمالش چون مرا موجود کرد
تا بمانم زندہ زان قوتم بباید داد باز

اس غزل کے تین اشعار تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۵۰۵ پر نقل کیے گئے ہیں اور ان سے پہلے ملا معین لکھتے ہیں: "چنانکہ فقیر تو گوید" ملا کے اس اظہار کے بعد کوئی شبہ وارد نہیں ہوسکتا۔ جب ہم مطبوعہ دیوان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس کے صفحہ ۳۰ و ۳۱ پر یہ غزل درج ہے اور اس کے کل اشعار گیارہ ہیں۔

۱۰۔ مرا بہر دو جہان دولت وصال تو بس
وصال چیست که آمد شد خیال تو بس

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۹۶ پر اس غزل کے چھے اشعار بشمول مقطع درج ہیں اور پھر صفحہ ۲۹۴ پر اسی غزل کے پانچ اشعار پائے جاتے ہیں۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۳۱ و ۳۲ پر یہی غزل درج ہے اور اس کے اشعار کی تعداد سات ہے۔

۱۱۔ تا من باو پیوستہ ام از غیر او ببریدہ ام
من حلّ و عقد عقل را در یکد گر پیچیدہ ام

یہ پوری کی پوری غزل تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۸۸ پر درج ہے اور مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۲ و ۵۳ پر موجود ہے اور اس کے کل اشعار بارہ ہیں۔

۱۲۔ لمؤلفہ: جام دیدار خدا کرد چنان مخمورم
که خمارش نہ نشیند بہ بہشت و حورم

یہ ۱۴ اشعار کی غزل تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۴۳۶ پر درج ہے اور "لمؤلفہ" کے پہلے ملا معین لکھتے ہیں "چنانکہ فقیر تو می گوید"۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۶۱ و ۶۲ پر یہی غزل موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد پندرہ ہے۔

۱۳۔ ما بہر وصال از دل و جان نیز گذشتیم
در وصل نخواہی تو ازان نیز گذشتیم

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۴۳، پر اس غزل کے نو شعر نقل کیے گئے ہیں جن میں مقطع بھی شامل ہے۔ ان اشعار کے پہلے "چنانکہ فقیر تو گوید" کے الفاظ موجود ہیں۔ اس غزل کے تین اشعار تفسیر کے صفحہ ۸۰ پر بھی درج ہیں۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۹ پر یہ غزل موجود ہے اور اس کے کل اشعار گیارہ ہیں۔

۱۴۔ ای نور عشقت تافتہ اندر سویدای دلم
بگرفتہ نور عشق تو پنہان و پیدای دلم

گیارہ اشعار کی یہ غزل تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۸۰ پر درج ہے اور اس کے پہلے مّلا معین لکھتے ہیں "قال الفقیر الضعیف معین المسکین"۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۱ و ۵۲ پر یہ غزل موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے۔

۱۵۔ گر ز دود نفس ظلمت ناک بودم سوختہ
ز امتزاج آتش عشق تو نورانی شدم
من چنان بیرون شدم از ظلمت ہستی خویش
تا ز نور ہستی او آنکہ می دانی شدم

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۵۱ پر اس غزل کے دو شعر نقل کیے گئے ہیں اور ان کے پہلے مّلا معین لکھتے ہیں "کما قلت فی شعر لی"۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۶ پر یہ سات اشعار کی غزل موجود ہے۔ اس کا مقطع قادیانی حضرات میرزا غلام احمد کے دعوے کی حمایت میں نقل کیا کرتے ہیں۔

دمبدم روح القدس اندر معینی می دمد
من نمی دانم مگر من عیسی ثانی شدم

وہ اس شعر کو حضرت خواجہ صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

۱۶۔ لمؤلفہ: سوی من آ کہ ترا یار وفادار منم
ہر چہ داری بمن آور کہ خریدار منم

دس اشعار کی یہ غزل تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۱۴۰ پر درج ہے۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۴۹ پر یہی غزل موجود ہے لیکن وہاں اشعار کی تعداد گیارہ ہے۔

۱۷۔ معین کہ دست تہی می رود بدرگہ دوست
مگر کہ ہم کرم او شود وسیلۂ من

غزل کا یہ مقطع تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۹۳ پر نقل کیا گیا ہے۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۶۰ پر یہ آٹھ اشعار کی غزل موجود ہے۔

۱۸۔ ای صدای بلبلان در صحن بستان حمد تو
وی نوای مرغ جان در باغ ایمان حمد تو

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۱۹ پر اس غزل کے چھے اشعار بشمول مقطع درج ہیں۔ تفسیر کے صفحہ ۲۰۰ پر ملا معین اس کا ایک شعر نقل کرتے ہوئے "لذا قلت" لکھتے ہیں جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ غزل ان کی ملک ہے۔

حامدان کو عرش را در مدح فرش ره کنند
ز اوج عزّت پایۂ ناید بپایان حمد تو (۵)

۱۹۔ تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۳۰ پر گیارہ اشعار کی پوری غزل درج ہے جس کا مطلع یہ ہے:

چو از جمال نقاب بطون بر اندازی
دران ظہور وجود مرا عدم سازی

یہی غزل مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۸۶ و ۸۰ پر موجود ہے۔

۲۰۔ بخدا غیر خدا در دو جہان نیست کسی
صد دلیل است ولی واقف ازان نیست کسی

یہ پوری غزل مع مقطع تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۵۱۴ پر درج ہے۔ مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۸۹ پر یہی غزل موجود ہے اور اس کے کل اشعار نو ہیں۔

مندرجۂ بالا شواہد سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ حضرت خواجہ معین الدّین کے نام سے شائع کردہ دیوان آپ کی ملکیت نہیں بلکہ ملا معین فراہی اس کے مالک ہیں۔ مرحوم شیرانی صاحب کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے:

"ممدوح (ملا معین) کثیر تعداد تصنیفات کے مالک ہیں۔ اگر ان کی تالیفات میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین واثق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا اس میں پتا لگ جائے گا بلکہ اس کے علاوہ سینکڑوں نئی غزلیں ہاتھ آئیں گی جو دیوان کے حجم کو المضاعف کردیں گی۔"

پروفیسر محمد اسلم:

دیوانِ معین: چند معروضات

(تلخیص)

حافظ محمود شیرانی کا شمار برعظیم ہند و پاک کی نابغہ ہستیوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تاریخ و ادب کو تنقید کا ایک نیا اسلوب بخشا اور ان کی سعی و کاوش سے تاریخ و ادب کے کئی اہم اور نئے گوشے ہمارے سامنے آئے جو اس سے قبل ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔۔۔

اس مختصر سے مضمون میں شیرانی مرحوم کی تمام تصانیف اور نگارشات کا احاطہ کرنا مقصود نہیں، صرف ان کے ایک مضمون کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے " دیوان خواجہ معین الدین اجمیری: کیا یہ دیوان اُنھی کی ملکیت ہے ؟ " کے عنوان سے ایک عالمانہ مقالہ تحریر فرمایا تھا، جو اب " مقالات شیرانی " میں شامل ہے (۱)۔ میں اپنے اس مختصر سے مضمون میں اسی مقالے کے بارے میں چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جس زمانے میں ظہیر الدین محمد بابر (م: ۱۵۳۰ء) فرغانہ پر حکمراں تھا، اسی زمانے میں ہرات کے تخت پر سلطان ابوالغازی حسین (م: ۱۵۰۶ء) رونق افروز تھا۔ ان دنوں ہرات میں ملا معین الدین الواعظ بن شرف الدین حاجی محمد الفراہی الہروی نام کے ایک عالم اور شاعر رہتے تھے جو تصوف اور توحید (وحدت الوجود؟) کے موضوعات پر سند تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کے ایک بھائی قاضی نظام الدین ہرات میں منصبِ قضا پر فائز تھے ان کی منصب قضا سے دستبرداری پر سلطان ابوالغازی حسین کے اصرار پر ملا معین الدین نے سن ۹۰۵ھ میں یہ منصب قبول کرلیا (۲)۔

منصبِ قضا کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ملا معین الدین جیسے واعظ اور شاعر مزاج انسان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لیے وہ خود ہی ایک سال بعد اس عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔ ان کے ایک ہمعصر عالم اور مفکر مولانا فضل اللہ بن روز بہان صاحبِ سلوک الملوک تحریر فرماتے ہیں کہ قاضی کو ایک سال سے زائد عرصے تک منصب قضا پر فائز نہیں رہنا چاہیے ورنہ وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ اسے چاہیے کہ وہ ایک سال تک قاضی کے فرائض

انجام دینے کے بعد دوبارہ کسی مدرسے میں تدریس کے فرائض سنبھال لے (۳)

ملا معین الدین ہرات کی جامع مسجد میں ہر جمعے کو وعظ کہا کرتے تھے جس میں لوگ بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوا کرتے تھے (۴)۔

موصوف اپنی تصنیف "اعجاز موسوی" میں اپنے اس شغل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"باوجود عدم استطاعت مدّت چہل سال تقریباً بامر خطیر تذکیر اقوام نمودہ و درین مدّت بمطالعۂ تفاسیر و احادیث مرویۂ اکابر و مشاہیر و مصنفات ارباب موعظت و تذکیر مستجمع اخبار و آثار و مشتمل بر حکایات و اشعار و تواریخ و انظار می بود" (۵)

ملا معین الدین کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی ایک تصنیف "معارج النبوہ" کو بڑی شہرت ملی ہے انھوں نے اسرار سورۃ الفاتحہ، تفسیر القرآن، روضۃ الواعظین، تفسیر حدائق الحقایق اور اعجاز موسوی کے عنوان سے کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں (۶) عمر رضا کحالہ نے اپنی معجم المؤلفین میں امام ابو حفص عمر النسفی (م: ۱۱۴۲ء) کی ایک تصنیف "کنز الدقائق" پر ان کی ایک شرح کا بھی ذکر کیا ہے (۷)

ملا معین الدین شاعر بھی تھے اور انھیں یہ فن اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ اعجاز موسوی کے دیباچے میں موصوف نے اس بات کا اعتراف واضح طور پر کیا ہے کہ ان کے والد بزرگوار بھی شاعر تھے (۸)

ملا معین الدین کا دیوان عوام میں "دیوان خواجہ معین الدین اجمیری" کے نام سے مشہور ہوگیا اور صوفیوں نے اسے حرز جان بنا لیا۔ شیرانی مرحوم پہلے بزرگ محقق تھے جنھوں نے اس دیوان کی ملکیت کو چیلنج کیا اور داخلی شواہد سے یہ ثابت کیا کہ یہ دیوان خواجہ اجمیری کا نہیں ہوسکتا۔

شیرانی مرحوم نے اپنی رائے کی تائید میں یہ دلائل دیے ہیں:

اولاً۔ اس دیوان میں اداسی کی جھلک پائی جاتی ہے جو حضرت اجمیری کے دیوان میں نہیں ہونی چاہیے۔

ثانیاً۔ ملا معین الدین کے کلام میں جو گھلاوٹ اور لطافت موجزن ہے وہ خواجہ صاحب کے ایام حیات میں قطعاً مفقود تھی (۹)

ثالثاً۔ خواجہ اجمیری کے بعد امیر خسرو، شیخ سعدی اور حافظ شیرازی نے فارسی زبان

کو صیقل کیا اور دیوان خواجہ معین الدین کی زبان صیقل شدہ ہے

رابعاً۔ کلام میں عشق کا جذبہ بہت غالب ہے اور رندی و سرمستی کے مضامین خال خال ہی موقعوں پر نظر آتے ہیں

خامساً۔ کلام میں محراب و منبر اور وعظ و واعظ کا ذکر بار بار آیا ہے، جو ایک باصفا صوفی کے کلام میں نہیں ہوگا (۱۰)۔

یہ وہ داخلی شواہد تھے جن کی بناء پر حافظ محمود شیرانی نے اس دیوان کو خواجہ معین الدین اجمیری کے بجائے معین الدین الواعظ المتخلص بہ معین یا معینی کی تصنیف قرار دیا ہے۔

حسنِ اتفاق سے شیرانی مرحوم کو ملّا معین الدین کی ایک تصنیف " معارج النبوہ " میں مصنف موصوف کے چند ایسے اشعار مل گئے جو دیوان خواجہ اجمیری میں شامل ہیں۔ اس سے ان کا شبہہ یقین میں تبدیل ہوگیا۔ شیخ ابراہیم ڈار نے شیرانی مرحوم کے کام کو آگے بڑھایا۔ انھیں بمبئی کے ایک کتاب خانے میں ملّا معین الدین کی تصنیف " اسرار سورۃ الفاتحہ " مل گئی (۱۱)۔ اس میں بھی ملّا معین الدین کے ایسے اشعار درج تھے جو دیوان خواجہ اجمیری میں بھی موجود ہیں۔

ان دونوں بزرگوں کی رسائی اخلاق جہانگیری، اعجاز موسوی اور حدائق الحقائق تک نہیں ہوسکی۔ راقم الحروف نے ان دونوں بزرگ محققوں کے کام کو آگے بڑھانے کی اپنی سی کوشش کی ہے اور داخلی شواہد کے بجائے خارجی شواہد کا سہارا لیا ہے۔

جہانگیر کے عہد حکومت (۱۶۰۵ء - ۱۶۲۷ء) میں نور الدین خاقانی نام کے ایک بزرگ لاہور میں منصب قضا پر فائز تھے۔ جنھوں نے " اخلاق جہانگیری " کے عنوان سے ایک ضخیم تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ اب تک اس تصنیف کے دو ہی نسخے دریافت ہوئے ہیں، جن میں سے ایک نسخہ ٹونک (راجستھان) کے ایک علم دوست بزرگ صاحبزادہ محمد مصطفیٰ خاں جوہر کی ملکیت ہے اور اس پر ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) میں ۱۹۶۴ء میں ستمبر کے شمارے میں ایک فاضلانہ مضمون چھپ چکا ہے۔ یہ نسخہ بڑا قریب العہد ہے اور تصنیف کے صرف آٹھ سال بعد کا کتابت شدہ ہے

اخلاق جہانگیری کا دوسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے اور اس کی مائیکرو فلم میرے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے (۱۲) ـــــــ

نور الدین خاقانی، صاحب اخلاق جہانگیری، ملّا معین الدین الواعظ کا پوتا تھا اور ام...

نے اپنی اس تصنیف میں جا بجا اپنے دادا کے اشعار درج کیے ہیں۔ جب وہ موقع کی مناسبت سے اپنے دادا کا کوئی شعر درج کرتا ہے تو اس سے قبل "لجدہ مولف" ضرور لکھتا ہے اس نے اخلاق جہانگیری میں اپنے دادا کے جو اشعار نقل کیے ہیں، وہ "دیوان خواجہ معین الدین اجمیری" میں موجود ہیں۔

یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ جو شیرانی مرحوم نے یہ مضمون تحریر فرمایا تو انھوں نے معین الدین الواعظ کی تصانیف، ماسوائے معارج النبوہ، دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی تھی۔ اسی طرح شیخ ابراہیم ڈار نے بھی اسرار سورۃ الفاتحہ کے علاوہ ملا صاحب کی دیگر تصانیف نہیں دیکھیں۔ اگر یہ بزرگ اخلاق جہانگیری کے علاوہ حدائق الحقائق اور اعجاز موسوی پر بھی ایک نظر ڈال لیتے تو ان کے مضمون کی شکل ہی بالکل مختلف ہوتی اور انہیں اپنی تائید میں داخلی شواہد کے علاوہ خارجی شواہد بھی مل جاتے۔

آمدم برسر مطلب: دیوان خواجہ معین الدین اجمیری میں ایک غزل ہے جس کا مطلع اور مقطع یوں ہے

اندر آئینۂ جان عکس جمالی دیدم   ہمچو خورشید کہ در آب زلالی دیدم

نہ طلوع و نہ غروب و نہ زوالی دیدم   تا معین ذرہ صفت رفت بجئ نور ازل (۱۳)

یہی غزل معین الواعظ کی تفسیر اسرار سورۃ الفاتحہ میں بھی موجود ہے (۱۴)۔
ملا معین الدین کی ایک غزل کا مطلع ہے

نگر صبا ز سر کوی دوست می آید   کہ از زمین و زمان بوئی دوست می آید (۱۵)

یہ غزل دیوان خواجہ معین الدین اجمیری میں بھی موجود ہے (۱۶)
تفسیر اسرار سورۃ الفاتحہ میں معین الدین الواعظ کی ایک غزل ملتی ہے جس کا مطلع و مقطع یوں ہے

از مطلع دل زد علم یک لمعہ از رخسار او   شد ذرہ ذرہ ہستیم در پرتو انوار او

مسکین معین در یک غزل بنمود اسرار ازل   بشنو کمال لم یزل در کسوت گفتار او (۱۷)

یہ غزل بعینہٖ دیوان خواجہ معین الدین اجمیری میں موجود ہے (۱۸)
تفسیر اسرار سورۃ الفاتحہ میں معین الواعظ کی ایک غزل موجود ہے جس کا مطلع یوں

دلا بحلقۂ رندان بزم عشق درا   کہ جرعۂ ز شراب بقا دہند ترا
اگر تجلی نور قدم ہمی خواہی   معین نقاب صور از جمال خود بکشا (۱۹)

یہ پوری غزل دیوان خواجہ صاحب میں موجود ہے (۲۰)۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ شیرانی مرحوم نے یہ مضمون ۱۹۲۴ء میں تحریر فرمایا اور تفسیر اسرار سورۃ الفاتحہ اس سے ۲۶ سال قبل ۱۸۹۸ء میں نولکشور کے اسی مطبع سے چھپ چکی تھی جس میں خواجہ صاحب کا دیوان چھپا تھا۔ تعجب ہے کہ ملاّ معین الدین کی یہ مطبوعہ کتاب ان کی نظروں سے کیوں کر اوجھل رہی۔ شیخ ابراہیم ڈار نے ملاّ معین الدین کی اس تصنیف سے استفادہ کیا ہے۔ انھیں یہ تفسیر کریمی لائبریری بمبئی (حال اُردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ) میں ملی تھی (۲۱) انھوں نے بھی یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ انھوں نے اس تفسیر کا مطبوعہ نسخہ ہی دیکھا تھا یا مخطوطہ۔ انھوں نے جس انداز سے اس تصنیف کا ذکر کیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی مطبوعہ کتاب نہیں دیکھی

قاضی نور الدین خاقانی نے اپنے دادا ملاّ معین الدین کی ایک غزل "اخلاق جہانگیری" میں نقل کی ہے جس کے دو شعر پیش خدمت ہیں:

نقاب از روی خود بکشا روی زیبا را؟   و زلزلہ مست گردان عاشق شیدا را
زبوبیت شمہ کوی قرین ابن مریم شد   وگرنہ قوت احیا کی بود مسیحا را؟ (۲۲)

یہ غزل بعینہ "غزلیات خواجہ معین الدین چشتی" کے عنوان سے ایک مخطوطہ میں، جو حبیب گنج کلکشن، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے، موجود ہے (۲۳)۔

ملاّ معین الدین کی ایک غزل کا مقطع ہے

وقت آنست کہ دل واقف اسرار شود   جای آنست کہ جان طالب دیدار شود (۲۴)

یہ غزل دیوان معین الدین اجمیری میں موجود ہے (۲۵)

اعجاز موسوی، ملاّ معین الدین کی ایک مشہور تصنیف ہے، جو حافظ محمود شیرانی کے علم میں بھی تھی (۲۶)۔ اس میں انھوں نے اپنا یہ شعر درج کیا ہے۔

من بلبل عشقم کنون سوئے گلستان میروم   بوی از آن گُل یافتم اندر پی آن میروم (۲۷)

جس غزل کا یہ مطلع ہے وہ غزل دیوان خواجہ صاحب میں بھی موجود ہے (۲۸)۔

اعجاز موسوی میں فاضل مصنف نے ایک موقع پر اپنا یہ شعر درج کیا ہے:

آتشی افروخت عشق و جسم و جان من بسوخت　　گفتم آہی بر کشم کام و زبان من بسوخت (۲۹)

یہ شعر دیوان خواجہ اجمیری میں بھی موجود ہے (۳۰)۔

اعجاز موسوی میں ملا معین نے اپنی ایک غزل نقل کی ہے جس کا مطلع و مقطع یوں ہے:

ترا میخواہم اے دلبر کہ بینم　　توی مقصود من در ہر کہ بینم

معین امروز میخواہد وصالش　　ندارد صبر تا محشر کہ بینم (۳۱)

یہی غزل بعینہٖ دیوان خواجہ اجمیری میں موجود ہے (۳۲)۔

اعجاز موسوی میں ملا معین نے اپنی ایک غزل نقل کی ہے جس کے دو شعر پیش خدمت ہیں:

آتشی آمد پدید و جسم و جان یکسر بسوخت　　دل دردن سینہ ام چون عود در مجمر بسوخت

خلق گویندم معین این رمز بر منبر گوی　　آہ کین آتش ہزاران واعظ و منبر بسوخت (۳۳)

یہ غزل دیوان خواجہ صاحب میں بھی موجود ہے (۳۴)۔

حدائق الحقایق، ملا معین الواعظ کی ایک اہم تصنیف ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اس کا ذکر اپنے مقالے میں کیا ہے لیکن انھوں نے اس سے استفادہ نہیں کیا ہے اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ حدائق الحقایق کا ایک مکمل مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے (۳۵)۔ ...

حدائق الحقایق میں ملا معین نے اپنا یہ شعر درج کیا ہے

چون سر و دست طمع گر کنی ز خود کوتاہ　　سزد کہ پای درین انجمن دراز کنی (۳۶)

یہ شعر دیوان خواجہ اجمیری میں موجود ہے (۳۷)

حدائق الحقایق میں ملا معین الدین نے اپنا ایک شعر یوں نقل کیا ہے:

ما نمی گوئیم نعمت یا بلا خواہیم و بس　　بلکہ مادائم رضای دوست را خواہیم و بس (۳۸)۔

یہ شعر بھی دیوان خواجۂ بزرگ میں موجود ہے (۳۹)۔

حدائق الحقایق میں ملا صاحب نے اپنا ایک شعر یوں نقل کیا ہے

نفحۂ عشق گر آن سوی جہان می آید　　بمشام دلم از عالم جان می آید (۴۰)

یہ شعر بھی دیوان خواجہ معین الدین اجمیری میں موجود ہے (۴۱)۔

حدائق الحقایق میں ملا معین نے اپنا یہ شعر لمولفہ لکھ کر نقل کیا ہے:

ہر کہ ہجرش ز وصل شد بلغ برسول و کتاب شد قلنع (۴۲)

یہ شعر مروجہ دیوان میں موجود نہیں ہے۔ ان کا ایک شعر ہے

بسم الله الرحمٰن الرحیم این چہ کتاب است کتاب کریم (۴۳)

یہ شعر بھی مطبوعہ دیوان میں کہیں نظر نہیں آیا۔ حدائق الحقایق میں انھوں نے لمولفہ کے تحت اپنا یہ شعر درج کیا ہے:

دل چوبکی بیش نیست دوست یکی بس بود واں یک بی اشتراک ذات مقدس بود (۴۴)

یہ شعر بھی دیوان خواجۂ بزرگ میں نہیں ملتا۔ حدائق الحقایق میں ملّا معین نے لمولفہ لکھ کر اپنا یہ شعر درج کیا ہے:

ایدل تو چہ قطرۂ ندانم کاندر تو نہانست بحرِ اعظم (۴۵)

یہ شعر بھی مجھے مروجہ دیوان میں کہیں نہیں ملا۔ اعجاز موسوی میں بھی ملّا معین الدین نے اپنے ایسے بہت سے اشعار درج کیے ہیں، جو مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے ہیں۔ اسی طرح تفسیر اسرار سورۃ الفاتحہ میں بھی ان کے اشعار موجود ہیں، جو مطبوعہ دیوان میں کہیں نظر نہیں آتے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملّا معین الواعظ کا سارا کلام مدوّن نہیں ہوا اور وہ ادھر ادھر بکھرا پڑا ہے۔ اگر فارسی زبان و ادب کا صحیح ذوق رکھنے والا کوئی ریسرچ اسکالر جو علم عروض سے بھی کماحقہٗ واقف ہو، ملّا معین کی تصانیف کا بلاستیعاب تحقیقی مطالعہ کر کے ان کا کلام از سرِ نو مدوّن کر دے تو یہ علم و ادب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

(مجلۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ)

حواشی

(۱) محمود شیرانی: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء، ج ۰۶ ص ۱۸۱۔ ۱۹۳

(۲) ایضاً، ص ۱۸۳

(۳) فضل اللہ روز بہان: سلوک الملوک، مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۷

(۴) میر خواند: روضۃ الصفاء، مطبوعہ تہران، ۱۳۳۹ ش، ج ۷، ص ۲۶۹

(۵) ملا معین: اعجاز موسوی، مطبوعہ عمدۃ المطابع، ۱۲۷۲ھ، ص ۲

(۶) محمود شیرانی: مقالات حافظ محمود شیرانی، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء، ج ۰۲ ص ۱۸۵

(۷) عمر رضا کحالہ: معجم المؤلفین، مطبوعہ دمشق، ۱۹۶۰ء، ج ۰۲ ص ۳۱۲

(۸) ملا معین: اعجاز موسوی، ص ۱۷۲

(۹) محمود شیرانی: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، ج ۰۶ ص ۱۸۸

(۱۰) ایضاً، ص ۱۸۱، ۱۸۲

(۱۱) محمود شیرانی: مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد ۰۶ ص ۵۹۰

(۱۲) نور الدین خاقانی: اخلاق جہانگیری، مخطوطہ، انڈیا آفس لائبریری، لندن، نمبر ایتھے ۲۲۰۷

(۱۳) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، مطبوعہ نولکشور، ۱۹۱۰ء، ص ۳۸

(۱۴) ملا معین: اسرار سورۃ الفاتحہ، مطبوعہ نولکشور، ۱۸۹۸ء، ص ۵۱۱

(۱۵) ایضاً، ص ۴۹۷

(۱۶) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، ص ۲۶

(۱۷) ملا معین: اسرار سورہ الفاتحہ، ص ۳۸۴

(۱۸) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، ص ۷۹ ۔ ۸۰

(۱۹) ملا معین: اسرار سورۃ الفاتحہ، ص ۲۷۵

(۲۰) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، ص ۳ ۔ ۴

(۲۱) محمود شیرانی :مقالاتِ شیرانی، ج ۰۶ ص ۵۹۰

(۲۲) نور الدین خاقانی :اخلاق جہانگیری، ورق ۳۹۵ الف

(۲۳) غزلیات خواجہ معین الدین چشتی، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، حبیب گنج گلگشن ۲۱۰ / ۲۱۳ ، ورق ۱ الف

(۲۴) ملاّ معین :اسرار سورۃ الفاتحہ، ص ۵۲۲ - ۵۲۳

(۲۵) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، ص ۲۷ - ۲۸

(۲۶) محمود شیرانی :مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، ج ۶ ص ۱۸۶

(۲۷) ملاّ معین :اعجاز موسوی، ص ۳۷

(۲۸) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، مطبوعہ نولکشور، کانپور، ۱۸۷۵ء، ص ۵۷

(۲۹) ملاّ معین :اعجاز موسوی، ص ۳۶

(۳۰) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، کانپور، ۱۸۷۵ء، ص ۱۱

(۳۱) ملاّ معین :اعجاز موسوی، ص ۲۳۲ - ۲۳۳

(۳۲) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، کانپور، ۱۸۷۵ء، ص ۵۵

(۳۳) ملاّ معین :اعجاز موسوی، ص ۹۲

(۳۴) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، کانپور ۱۸۷۵ء، ص ۱۳

(۳۵) ملاّ معین :حدائق الحقایق، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، فارسی Pa-12a

(۳۶) ایضاً، ورق ۶ الف

(۳۷) دیوان خواجہ معین الدین، کانپور ۱۸۷۵ء، ص ۹۰

(۳۸) ملاّ معین :حدائق الحقایق، ورق ۱ب

(۳۹) دیوان خواجہ معین الدین، کانپور ۱۸۷۵ء، ص ۴۲

(۴۰) ملاّ معین :حدائق الحقایق، ورق ۱۸۸ ب

(۴۱) دیوان خواجہ معین الدین اجمیری، کانپور، ۱۸۷۵ء، ص ۴۳

(۴۲) ملاّ معین :حدائق الحقایق، ورق ۷ الف

(۴۳) ایضاً، ورق ۷ ب

(۴۴) ایضاً، ورق ۲۲ الف

(۴۵) ایضاً، ورق ۹۶ الف

ڈاکٹر تنویر احمد :

ظہور الاسرار نامی اور مطہر کڑہ

"ظہور الاسرار" اور "مطہر کڑہ" کے عنوان سے محترم امتیاز علی عرشی صاحب کا ایک مضمون معارف اعظم گڑہ بابت ماہ جولائی و اگست ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ نظامی گنجوی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کی ایک شرح ظہورالاسرار کے نام سے مطبع نولکشور میں چند بار شائع ہوئی جس کے دیباچے (۱) میں شارح کا نام ظہور الحسن بھوری بتایا گیا ہے۔ عرشی صاحب نے اس مضمون میں ثابت کیا ہے کہ یہ انتساب غلط ہے۔ دراصل یہ شرح بدرالدین مطہر بن قوام بن رستم بن احمد بن محمد البلخی المعروف بکرئی نے ۹۰۵ء لکھی تھی۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مطہر بلخی کرئی شارح "مخزن الاسرار" اور فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ء - ۷۹۰ء) کے عہد کا مشہور شاعر مطہر کڑہ ایک ہی شخص تھے۔ مجھے عرشی صاحب کے دوسرے قیاس سے اختلاف ہے۔ اس کی تفصیل بعد میں عرض کروں گا۔ فی الحال یہ عرض کرنا ہے کہ عرشی صاحب سے ۱۲ سال قبل حافظ محمود شیرانی مرحوم نے رسالۂ "مخزن" لاہور بابت مارچ۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں "فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ میں اردو زبان کا عنصر" کے عنوان سے اسی موضوع پر گفتگو کی تھی۔ حافظ صاحب نے اس مضمون میں محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ البلخی المعروف بکرئی کی فرہنگ "بحرالفضائل" پر بحث کی ہے۔ اور اس میں سے ہندوستانی کے کئی سو لفظوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ صاحب فرہنگ نے مختلف لغات کے ذیل میں یہ الفاظ بطور مترادفات کے لکھے ہیں۔ خود مؤلف نے آخری باب (چہاردہم) کا عنوان قائم کیا ہے۔ "درالفاظ ہندوی کہ در نظم بکار آید" بحرالفضائل کے ساتھ ساتھ اس مضمون میں مؤلف ہذا کی دوسری کتاب شرح "مخزن الاسرار" پر بھی گفتگو کی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ شرح "مخزن الاسرار" کا مؤلف وہی ہے جس نے بحرالفضائل لکھی ہے۔ اور شرح پر بحث کرتے وقت یہ ثابت کیا ہے کہ نولکشور پریس میں یہ کتاب غلط نام سے شائع ہوئی (۲)۔ ظہورالحسن بھوری اس کا مؤلف نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے یورپی مستشرقین اسپرنگر (۳)

ایتھے (۴) ۰ اور ریو (۵) وغیرہ کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جنھوں نے اس فرہنگ کو گیارہویں صدی ہجری کا بتایا ہے ۰ اور یہ ثابت کرنے کی ناتمام کوشش کی ہے کہ محمد بن قوام یعنی شارح مخزن گیارہویں صدی کے اواخر کا مؤلف تھا۔

عرشی صاحب نے بھی اپنے مضمون میں ان ہی دونوں باتوں کی وضاحت کی ہے ۰ گویا مضمون کا زیادہ حصہ ان ہی مباحث سے متعلق ہے ۰ جو شیرانی صاحب کا موضوع گفتگو تھا ۰ اگر عرشی صاحب کے پیش نظر شیرانی صاحب کا مضمون ہوتا تو شاید ان کی گفتگو کا انداز بدل جاتا ۰ بہرحال عرشی صاحب کے نتائج بعینہٖ وہی ہیں جو شیرانی صاحب کے ہیں ۰ لیکن مضمون کے دوسرے حصے میں عرشی صاحب نے دوسرے موضوع پر گفتگو کی ہے ۰ ان کے نزدیک شارح " مخزن الاسرار " عہد فیروز شاہی کا مشہور شاعر مطہر کڑہ ہے ۰ شیرانی صاحب نے اس کے بجائے شارح " مخزن " کی ایک کتاب فرہنگ " بحرالفضائل " کا پتا دیا ہے ۰ اور مضمون میں پورا زور اسی فرہنگ کی تشریح و توضیح پر صرف ہوا ہے۔

ایران میں بھی شارح " مخزن الاسرار " کی شخصیت کے بارے میں غلط فہمی واقع ہوئی ہے ۰ " گنجینۂ گنجوی " (ص ۰ تی) میں آیا ہے

" شرح مخزن الاسرار تالیف محمد بن قوام بن رستم بن رستم معروف بہ کرئی در ۱۰۶۱ھ تالیف آں بانجام رسیدہ "۔

صاحب گنجینۂ گنجوی نے یہ تاریخ اسپرنگر اور دوسرے یورپی مستشرق سے لی ہے ۰ مگر نقل میں غلطی ہو گئی ۰ یعنی تاریخ ۱۰۹۱ھ کے بجائے ۱۰۶۱ھ درج ہو گئی ہے ۰ شارح کے شجرے میں بھی تھوڑی سی غلطی باقی رہ گئی ہے۔ یعنی اس کے پر دادا کا نام رستم کے بجائے احمد لکھا ہے ۰ اس غلطی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ تعجب ہے کہ صاحب " گنجینہ " سے ایسی غلطی ہو ۰ حالانکہ خود وحید دستگردی کے پیش نظر شرح کا ایک نسخہ موجود تھا، جیسا کہ انھوں نے " مخزن الاسرار " کے خاتمے پر ذکر کیا ہے۔

" دو نسخۂ خطی قدیمی ۰ رابدست افتادہ ۰ یکی را محمود نام بلخی در حدود سنہ ہشتصد، دیگری را قاضی ابراہیم تبتی (کذا) درسنہ بنام یوسف محمد خاں تالیف و درحقیقت ہماں شرح محمود بلخی را زیر ورد کردہ "۔

اگرچہ وحید دستگردی نے اس جگہ شرح کی تاریخ ۸۰۰ ہجری لکھی ہے (گیارہویں ہجری

نہیں) لیکن جو خود شرح میں ۹۵ھ درج ہے تو پھر ٹھیک تاریخ درج نہ کرنا بے احتیاطی کی دلیل ہے۔ دوسرے شارح کا نام محمد کے بجائے محمود اور قاضی ابراہیم کو جو دوسرے شارح ہیں۔ تتوی کے بجائے تبتی لکھنا بڑی بے خبری ہے۔ اس سے بھی بڑی غلطی وہ ہے جو گنجینۂ گنجوی میں ملتی ہے۔ یعنی تاریخ تالیف ۹۵ھ کے بجائے ۱۰۶۱ھ قرار دیا ہے۔

لیکن خود ایران میں ابن یوسف شیرازی نے فہرست کتاب خانۂ مجلس شوری ملی میں اس کتاب خانے کے دو قلمی نسخوں کی مدد سے مؤلف اور سال تالیف کے بارے میں بالکل صحیح اطلاع بہم پہنچائی ہے(۶)۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے پیش نظر نولکشور پریس کا مطبوعہ نسخہ نہ تھا جس میں اس کا انتساب دوسرے مؤلف کی طرف کر دیا گیا ہے۔ اس بنا پر ان کو غلط فہمی میں پڑنے کا موقع نہ تھا۔ مگر یورپی مستشرقین کے غلط بیانات یقیناً ان کے سامنے تھے۔ مگر انھوں نے ان سے صرف نظر کر کے مؤلف کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ بلخی معروف بکری اور سال تالیف ۹۵ھ درج کیا ہے۔ جو بالکل صحیح ہے۔

ادھر حال ہی میں لاہور کی "پنجاب پبلک لائبریری" میں جو فارسی مخطوطات ہیں۔ ان کی ایک توضیحی فہرست شائع ہوئی ہے۔ اس میں "بحرالفضائل" کا ایک نسخہ ہے۔ مگر اس کی وضاحت کے سلسلے میں وہی سب غلطیاں دہرائی گئی ہیں۔ جو اسپرنگر۔ ایتھے وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ اس کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مؤلف گیارہویں صدی ہجری کے اواخر کا آدمی ہے۔

ان ابتدائی امور کے ذکر کرنے کے بعد اب ہم جناب عرشی صاحب کے مضمون کے دوسرے حصے کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں انھوں نے شارح "مخزن الاسرار" اور مطہر کڑہ کو ایک شخص ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے دلائل یہ ہیں۔

۱۔ دونوں کا زمانہ اور وطن ایک ہے

۲۔ کم از کم شرح "مخزن الاسرار" کے ایک نسخے (۷) میں شارح کا نام مطہر بن قوام ملتا ہے۔

۳۔ دیوان مطہر میں جن شعراء کا ذکر ہے۔ ان میں سے اکثر شرح "مخزن الاسرار" میں مذکور ہیں؛

۴۔ شارح مخزن مذکور "نصاب العقلاء" کا مؤلف ہے۔ اسی طرح ایک کتاب "نصیب اخوان" ہے۔ جو مطہر کی بتائی گئی ہے۔ دونوں کے ایک ہونے کے امکان ہیں۔

۵۔ مطر کرہ نے حضرت نظام الدّین اولیا۔ کے بعد کسی بزرگ رکن حقیقت کا ذکر کیا ہے۔ شارح نے شرح میں رکن الدّین ابوالفتح کا نام لیا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں۔

۶۔ دونوں شاعر اور عالم تھے۔

قبل اس کے عرشی صاحب کے دلائل کے سلسلے میں کچھ عرض کیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شخصیتوں کے الگ الگ ہونے کے جو اہم قرائن ہیں پہلے انھیں پیش کر دیا جائے۔

۱۔ محمد بن قوام یعنی شارح " مخزن الاسرار" کی ایک اور تالیف" بحرالفضائل فی منافع الافاضل" ہے۔ اس کتاب کے حسب ذیل نسخوں کا علم ہو سکا ہے۔

۱۔ کتاب خانۂ آصفیہ۔ دو نسخے۔ ایک مختصر (۸) (نمبر ۸۰) دوسرا ناقص الاول (نمبر ۲۵۱)

۲۔ انڈیا آفس لائبریری (۹)۔ تین نسخے۔ ایک کامل۔ دو ناقص۔

۳۔ پنجاب پبلک لائبریری لاہور (۱۰)۔ ایک نسخہ۔ ناقص۔

۴۔ دانش گاہ تہران۔ تین نسخے۔ ایک کتاب خانۂ مرکزی (نمبر ۳۲۶۹) دوسرا مذکورہ نشریۂ کتاب خانۂ تہران ۲۔ ۲۰۰ اور تیسرا مذکورۂ نشریۂ کتاب خانہ ۳ : ۶

۵۔ ملک پروفیسر شیرانی ایک نسخہ۔ کامل اور قدیم

ان نسخوں میں جو تفصیلات ملتی ہیں۔ ان سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرہنگ اور شارح " مخزن الاسرار" ایک ہی شخص یعنی محمد بن قوام بن رستم کی تراوش خامہ کا نتیجہ ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے خود فرہنگ مذکور سے اس کی تاریخ تالیف تلاش کی ہے۔ فرہنگ کے چوتھے باب میں مختلف فرقوں کے مروجہ سنین و تاریخ کے ضمن میں یہ عبارت مرقوم ہے۔(۱۱) :

" آغاز تاریخ ہجری از غزہ ماہ محرم گرفتند و دریں وقت از تاریخ ہجرت پیغامبر ہشت صد و سی و ہفت سال است "

اسی طرح بکرماجیت کے سال سمبت کے بیان میں مذکور ہے (۱۲):

" و تاریخ ایشان از جلوس رائے بکرماجیت است در اجین و در این وقت از تاریخ او یکہزار چار صد و نود سال است"۔

ان دونوں بیانوں میں اس فرہنگ کی تاریخ ہجری کے اعتبار سے ۸۳۰ھ اور سمبت کے اعتبار سے ۱۴۹۰ ہے ۸۳۰ ہجری ۱۴۲۳ء عیسوی کے مطابق ہے ۱۴۹۰ء سمبت کی بھی اسی عیسوی سال سے تطبیق ہوتی ہے۔ آج کل ۲۰۲۳ سمبت ہے ۱۴۹۰ سمبت میں فرہنگ مذکور تالیف ہوئی۔ گویا آج سے ۵۳۳ سال قبل۔ ۱۹۶۶ء میں ۵۴۳ کی تفریق سے یعنی ۱۴۲۳ء برآمد ہوتا ہے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ یہ کتاب ۵۴۳ شمسی سال (۵۵۹ قمری سال) قبل تصنیف ہوئی۔

اس کتاب کی تاریخ تالیف دو اور جگہ بیان ہوئی اور دونوں جگہ غلط ہے۔ ڈاکٹر شہریار نقوی نے اپنی کتاب "فرہنگ نویسی" میں لکھا ہے (۱۳) "ولی چنانکہ در شرح مخزن الاسرار تالیف دیگر قوام اشارہ شدہ فرہنگ مزبور در سال ۸۵۰ھ نوشتہ شدہ است"۔ شرح مخزن میں فرہنگ کا ذکر مطلق نہیں۔ بلکہ خود اس شرح میں مذکور ہے کہ ۸۵۰ھ میں شارح اس کی تالیف میں مشغول ہے۔ نشریہ دانش گاہ تہران (۱۴) میں بھی اس فرہنگ کی تاریخ تالیف ۸۵۰ھ بتائی گئی ہے اور فہرست کتاب خانۂ مرکزی دانش گاہ تہران کا حوالہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ فہرست مزبور میں ۸۵۰ھ شرح مخزن کی تاریخ تالیف قرار دی گئی ہے نہ کہ فرہنگ بحرالفضائل کی۔ بہرحال ان تمام امور سے واضح ہے کہ فرہنگ مذکور ۸۳۰ ہجری مطابق ۱۴۹۰ سمبت میں مرتب ہو رہی تھی۔

تاریخ درج کرنے کے بعد مرحوم شیرانی صاحب نے لکھا ہے (۱۵):

"دونوں کتابوں (شرح اور فرہنگ) کے درمیان ۴۲ سال کا فرق ہے جس سے ہمیں قیاس کرنا چاہیے کہ شرح مخزن بلخی نے اپنی عمر کے ابتدائی زمانے میں اور بحرالفضائل آخری زمانے میں لکھی"

اب ہم مطہرہ کڑہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ وہ فیروز شاہ تغلق کے دور کا مشہور شاعر تھا۔ مگر اس کے دیوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی شاعری فیروز شاہ کی تخت نشینی کے قبل ہی نقطۂ عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کا ایک ممدوح عین الملک تھا۔ اس کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے ہیں۔ ایک قصیدے میں غازی پور جانے کا پتا چلتا ہے (۱۶)۔ عین الملک محمد تغلق کے عہد میں اودھ اور ظفر آباد کا حاکم تھا۔ ۷۴۰ھ میں اس نے بغاوت کی تو اس کو مشرقی خطے سے الگ کرکے دہلی بلا لیا گیا (۱۷)۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مطہر

کا قصیدہ ۷۴۰ھ سے قبل کا ہو گا۔ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے قریب کے بھی قصائد کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی مدح میں بعض تذکروں (۱۸) میں نقل ہے۔ آخر الذکر کی وفات ۷۵۷ھ (۱۹) میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ قصیدۂ مذکور اس سال سے کافی پہلے لکھا گیا ہو گا۔ حضرت چراغ دہلی کی وفات پر ایک پُر درد مرثیہ لکھا ہے جو دیوان کے علاوہ بعض اور مقامات (۲۰) پر بھی نقل ہوا ہے۔ ایک قصیدہ جو ۷۸۹ھ (۲۱) میں لکھا گیا ہے اس میں اپنی عمر ۷۰ سال (۲۲) بتائی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اس کی پیدائش ۷۱۹ھ کے قریب ہوئی ہو گی۔ ان تمام امور کا قطعی نتیجہ یہ ہے کہ مطہر اور شارح مخزن الاسرار دو الگ شخصیتیں ہیں۔ اس لیے کہ شارح مخزن نے ۸۳۰ھ میں فرہنگ بحر الفضائل تالیف کی ہے۔ اس وقت مطہر کی عمر ۱۲۱ سال کی ہو گی۔ بالفاظ دیگر ان دونوں شخصیتوں کے درمیان عمروں کا تفاوت دونوں کے ایک ثابت ہونے میں مانع ہے۔ پروفیسر شیرانی شرح مخزن کو جو ۸۵۰ھ میں تالیف ہوئی، شارح کی ابتدائی تالیف قرار دیتے ہیں۔ وہ مؤلف کی دونوں تالیفات کے درمیان ۳۲ سال کی مدت کی بنا پر ایک کو اوائل عمر اور دوسری کو اواخر عمر کی تالیف قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مطہر جس کی پیدائش ۷۱۹ھ کے قریب ہوئی اور جو ۷۴۰ سے قبل شاعری کی دنیا میں پوری طرح روشناس ہو چکا ہو، وہ ۸۳۰ھ کی تالیف کا مصنف نہیں ہو سکتا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ مطہر کڑہ اور شارح مخزن ایک شخص نہیں ہیں۔

۲۔ شارح مخزن اور مطہر کڑہ کے ناموں میں فرق ہے۔ اوّل الذکر کا پورا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود ہے۔ اور مطہر کے اصل نام کا پتا ہی نہیں۔ شارح مخزن کے نام میں مطہر شامل نہیں ہے۔ عرشی صاحب کے پیش نظر ایک نسخے میں اور پشاور کے ایک دوسرے نسخے میں محمد کے بجائے مطہر ہے۔ ان کے علاوہ تمام نسخوں میں محمد ہی نام ملتا ہے۔ جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس کی صحت کے قرائن یہ ہیں:

۱۔ شرح کے دو نسخوں کے علاوہ باقی تمام نسخوں میں یہی نام ہے۔

۲۔ قاضی ابراہیم تتوی نے بلخی کی شرح سے بہت استفادہ کیا ہے۔ وہ بھی شارح مخزن کا نام محمد بلخی (۲۳) لکھتے ہیں۔

۳۔ بحر الفضائل کے تمام نسخوں میں مؤلف کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود درج ہے۔ اس سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ شارح مخزن کا نام محمد ہے۔ مطہر

اس کی تصحیف ہے۔ اس لیے جب دونوں نام الگ الگ ہیں تو دونوں کے ایک ہونے کا ادنیٰ قرینہ بھی باقی نہیں رہتا۔

۴۔ شرح مخزن الاسرار میں کم از کم ایک بار مطہر کا ذکر اس طرح آیا ہے

"افضل العصر مولانا مطہر گوید"۔

اس عبارت کے آخری دو لفظوں میں مختلف نسخوں میں اختلاف ہے۔

میرے پیش نظر نسخے (۲۴) میں یہی ہے۔ رضا لائبریری میں دو نسخے ہیں (۲۵)۔ ایک میں گوید اور دوسرے میں فرماید ہے۔ مطبوعہ نسخے میں (۲۶) مطہر کے بجائے ظہیر ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ شارح مخزن اور ظہیر فاریابی ہم عصر نہیں ہیں۔ اس بنا پر مطبوعہ نسخے میں "ظہیر" کو چھاپے کی غلطی پر محمول کرنا چاہیے۔ عرشی صاحب نے ناحق ظہیر فاریابی کے دیوان کی چھان بین کی۔ جب کہ ظہیر شارح سے دو صدی متقدم ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ شارح مطہر کو اپنے دور کے اہم فاضلوں میں شمار کرتا ہے۔ اسی بنا پر وہ شاعر سے الگ ہو جاتا ہے۔ شارح مخزن الاسرار اپنے ایک دوسرے معاصر مغیث ہانسوی کو بھی افضل العصر قرار دیتا ہے (۲۷) اس سے اس قیاس کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ "افضل العصر" کاتب کا اضافہ نہیں، بلکہ خود شارح کا فقرہ ہے۔

عرشی صاحب نے اس سلسلے میں دوسرے طور پر (۲۸) استدلال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> "میری رائے میں اصل نسخے میں یہ عبارت ہو گی۔ "بندہ احقر مطہر گوید" کسی ناقل نے افضل العصر مولانا مطہر گوید لکھا ہو گا۔ جو اصحاب عربی زبان سے ناواقف ہیں انھوں نے اس قسم کا تغیر عربی کتابوں کے دیباچوں میں بار بار دیکھا ہو گا کہ مصنّف نے جہاں اپنے لیے انکسار کے الفاظ لکھے تھے، وہاں شاگردوں نے کتاب نقل کرتے وقت تعظیمی الفاظ درج کیے ہیں۔"

عرشی صاحب کے اس طرز استدلال کے متعلق کچھ کہے بغیر عرض ہے کہ جب شرح کے تمام نسخوں میں افضل العصر ہو اور یہ فقرہ شارح نے اپنے دوسرے معاصرین کے لیے استعمال کیا ہو تو اس کو مصنّف کا ہو بہو فقرہ نہ سمجھنے پر اصرار، کمزور استدلال ہے۔ البتہ اس سلسلے میں اگر کوئی اور قرینہ بھی ہوتا تو بات دوسری ہوتی، ورنہ تنہا یہ استدلال صرف کمزور

ہی نہیں بلکہ قابل ترک بھی ہے۔

تفصیلات بالا سے واضح ہے کہ مطہر کڑہ اور محمد بلخی شارح "مخزن الاسرار" کے ایک ہونے کے قرائن تقریباً بے بنیاد ہیں۔ ذیل میں محترمی عرشی صاحب کے دلائل و قرائن کے سلسلے میں کچھ معروضات پیش کی جاتی ہیں۔

میرے خیال میں ان کے دلائل میں کوئی دلیل ایسی نہیں جو خود مکتفی ہو۔ اگر ایسی شہادت ہوتی تو پھر ان کے پیش کردہ قرائن مستحکم اور بڑی حد تک قابل قبول ہوتے۔ لیکن اس قسم کی شہادت نہ ہونے سے عرشی صاحب کے پیش کردہ دلائل بے معنی رہ جاتے ہیں۔ ہم وطن اور ہم عصر ہونا ایک ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ نام بھی ایک ہو۔ باپ دادا اور خاندان کے دوسرے افراد بھی ایک ہوں۔ اگر یہ آخری چیز نہ ہو تو ہم وطن اور ہم عصر ہونا بے معنی ہے۔ ایک جگہ اور ایک ہی دور میں لاکھوں آدمی رہتے ہیں۔ سب ایک نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان لاکھوں آدمیوں میں اگر کوئی دو ایسے ہوں جن کا نام ایک ہی ہو (۲۹)۔ ان کے باپ دادا کا بھی ایک ہی نام اور لقب ہو تو البتہ دونوں کے ایک ہونے کا قوی قرینہ ہو گا۔ محترمی عرشی صاحب نے شارح "مخزن الاسرار" اور مطہر کے نام کے ایک ہونے پر کوئی قابل ذکر بحث نہیں کی۔ انھوں نے محض ایک نسخے کی بنیاد پر شارح کا نام مطہر قرار دے دیا۔ اور اس "ترجیح اور انتخاب کی تائید میں کوئی ادنیٰ بات بھی پیش نہیں کی۔ اس لیے ان کے استدلال میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ اور جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں۔ شارح کا نام مطہر نہیں محمدؐ تھا۔ اس کا پورا ثبوت شرح کے مختلف نسخوں کے علاوہ قاضی ابراہیم کی قدیمی سند اور "بحرالفضائل" کے نسخوں کے مطالب کے ذریعے فراہم ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ شارح کا نام محمدؐ تھا۔ مطہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جب دونوں کے نام الگ الگ ہیں تو زمانہ اور وطن ایک ہونے سے دو آدمی ایک نہیں ہو سکتے۔

مطہر شاعر نے اپنے کلام میں کچھ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض شاعروں کا ذکر شرح مخزن الاسرار میں بھی ملتا ہے۔ اس سے دونوں کے ایک ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے۔ یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ معاصرین اور متقدمین کا ذکر لوگ کیا ہی کرتے ہیں۔ اس ذکر سے دو شخصیتوں کے ایک ہونے کا کیا تعلق؟

یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکی کہ شارح "مخزن الاسرار" کی تالیف "نصاب العقلاء" اور

الخزانہ پڑھا گیا ہو گا۔ اس کے بعد یہی لفظ مروج ہو گیا۔

عرشی صاحب کا استدلال اس لیے کمزور ہے کہ قطع نظر اس امر کے کہ شرح مخزن کے سارے نسخوں میں بدر خزانہ پایا جاتا ہے ۔ خود" بحرالفضائل" کے نسخوں میں بھی یہی قراءت ملتی ہے۔ پروفیسر شیرانی مرحوم کے پیش نظر بحرالفضائل کا جو نسخہ تھا وہ بہت قدیم تھا اور ان کا خیال ہے کہ شاید یہ مصنّف کے عہد ہی کا ہو (۳۲)

" بحرالفضائل کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ نویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے ۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر خود مصنّف کے عہد میں نقل ہوا ہو اس میں املا کی وہ تمام خصوصیات جو نویں صدی کے نصف اول میں رائج تھیں ۔ موجود ہیں"۔

ایسے قدیم نسخے میں بدر خزانہ ہے ۔ اس کے علاوہ شارح " مخزن الاسرار" اور مولف بحرالفضائل کا لقب فضل الدّین (۳۳) تھا نہ کہ بدرالدین ۔ یہ لقب ان دونوں کتابوں کے متعدد نسخوں میں موجود ہے ۔ ان وجوہ کی بنا پر نہ یہ صحیح ہے کہ بدر خزانہ بدرالدّین کی غلط خوانی کا نتیجہ ہے ۔ نہ یہ کہ بدرالدّین مولف کا لقب تھا ۔

۲۔ مولانا جمال الدّین استاجی کے بجائے مولانا جمال الدّین استاجی ہونا چاہیے ۔ یہ اپنے دور کے نامور عالم اور شاعر تھے ۔ ان کی مدح میں مطہر کڑہ نے ایک قصیدہ (۳۴) لکھا ہے ۔ چار قصیدے راقم الحروف کو دستیاب ہو چکے ہیں ۔ جو " فکر و نظر" بابت اپریل ۱۹۶۵ء (۳۵) میں شائع ہو چکے ہیں۔

۳۔ محمد تغلق شاہ نے خرگاہ کا نام خرمگاہ تجویز کیا تھا ۔ عرشی صاحب کو اس دور کی تاریخوں میں یہ لفظ نہیں مل سکا (۳۶) مگر حافظ محمود شیرانی صاحب نے شمس الدین عفیف کی تاریخ فیروز شاہی (ص ۱۰۱) سے یہ جملہ نقل کیا ہے :

" برایں نواح آگاہی داد تا خواجہ جہاں زودرین چوڈول سوار کنند و بخرم گاہ برند" (۳۷)

مطہر کی طرف منسوب کتاب " نصیب اخوان" متن اور شرح کیونکر ہو گئیں ۔ نہ عرشی صاحب نے اوّل الذکر کتاب ہی دیکھی اور نہ ان کو اس کے مندرجات ہی کا علم ہے ۔ تو پھر اس کا کسی اور کتاب سے رشتہ جوڑنا بے بنیاد قیاس ہے ۔ اس لیے قابل ترک ہے۔

رکن الدّین ابوالفتح جو شرح مخزن میں ضمناً اس طرح مذکور ہیں (۳۰)

" عزیزی از خدمت الاسلام رکن الحقّ و الدّین ابوالفتح قدّس اللہ سرّہ العزیز سماع دارد"۔

وہ اور دیوان مطہر میں مذکور " رکن حقیقت" اگر ایک ہی ہوں (اگرچہ ان دونوں کے ایک ثابت کرنے کے قرائن بھی اپنی جگہ بہت کمزور ہیں) تو اس سے شارح اور شاعر کے ایک ہونے پر کیونکر استدلال ہو سکتا ہے۔

اس طرح شارح اور شاعر دونوں کی ۔ شاعری و علمی فضیلت میں شرکت سے دونوں کا ایک ہونا کیونکر لازم ہو گا ۔ یہ استدلال بھی بغیر کسی معاون دلیل کے بے بنیاد ہے۔

خلاصہ یہ کہ عرشی صاحب کے یہاں کوئی مضبوط دلیل نہیں ۔ انھوں نے اس اہم بحث کو کہ شاعر اور شارح دونوں کا ایک ہی نام تھا ، تشنہ چھوڑ دیا ہے ۔ اس کی بنا پر ان کے سارے قرائن ضعیف اور قابل ترک ہو جاتے ہیں ۔ جب نام ہی الگ ہوں تو پھر ایک ہونے کا کیا ذکر ۔ اس کے برخلاف راقم سطور کے نزدیک مطہر کڑہ اور شارح " مخزن الاسرار" کے دو الگ الگ شخص ہونے کے زبردست قرائن موجود ہیں ۔ دونوں کے نام الگ ہیں ۔ شارح اپنا نام مع اپنے اجداد کے نام کے ہر جگہ ذکر کرتا ہے ۔ مطہر کے پورے دیوان میں اس تخلص کے سوا کچھ اور نہیں ملتا ۔ پھر دونوں کی عمروں میں تفاوت ہے ۔ اور آخری بات یہ کہ شارح مطہر کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ وہ الگ معلوم ہوتا ہے۔

اب عرشی صاحب کے بعض ایسے امور کی طرف توجہ کی جاتی ہے جو موضوع سے براہ راست متعلق نہیں مگر ضمنی طور پر ان پر گفتگو ہو چکی ہے ۔

۱۔ وہ بدر خزانہ البلخی کو بدرالدین البلخی سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک بدر خزانہ کتابت کی غلطی ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں (۳۱)

" بدر الخزانہ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ شارح کا لقب ہے ۔ جو اصل میں بدرالدین تھا ۔ موجودہ نسخوں کے منقول عنہ میں الدین کو خطی مشابہت کے باعث الخزانہ یا

حواشی

(۱) عرشی صاحب کے پیشِ نظر طبع دوم کا نسخہ تھا جو ۱۸۸۵ء ۳ ۱۳۰۲ھ میں چھپا تھا۔ حافظ محمود شیرانی کے مطالعے میں اشاعت دوم طبع نولکشور کا نسخہ تھا جس کی تاریخ ۱۸۸۸ء درج ہے۔

(۲) اس غلطی کا احساس مطبع والوں کو بھی تھا مگر کوشش کے باوجود ان کو اس کی صحت کی کوئی صورت نہ مل سکی کیونکہ دوسرا نسخہ انھیں نہیں مل سکا۔ دیکھیے خاتمۃ الطبع کی عبارت)

(۳) فہرست کتاب خانۂ اودھ ص ۵۲۱ میں "زہے شرح گلستان" سے تاریخ تصنیف یعنی ۱۰۹۱ھ نکالی ہے۔

(۴) یہی تاریخ انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۹۹۸ اور ۲۵۱۲ کے ذیل میں موجود ہے۔

(۵) فہرست مخطوطات فارسی ص ۵۳۰۔ ایوناؤ نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست میں انھی کی پیروی کی ہے۔

(۶) ج ۳ ص ۵۰۶، ۵۰۸۔

(۷) مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے بقول اس شرح کا جو نسخہ مدرسۂ رفیع الاسلام پشاور کے کتاب خانے میں تھا، اس کا نام مخزن الاسلام اور مصنف کا نام مظہر بن قوام بن رستم لکھا ہے۔

(۸) فہرست میں عنوان بحرالافاضل درج ہے (ج ۲ ص ۱۳۵)۔

(۹) فہرست مخطوطات فارسی مخطوط نمبر ۹۹۸۔

(۱۰) دیکھیے فہرست مخطوطات فارسیہ، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۲۵۱۔

(۱۱) رسالۂ مخزن، مارچ ۱۹۲۹ء۔

(۱۲) رسالۂ مخزن مارچ ۱۹۲۹ء۔

(۱۳) ص ۵۸۔

(۱۴) ج ۲ ص ۲۰۰ ۔

(۱۵) مخزن ۔ مارچ ۱۹۲۹ء ۔

(۱۶) مثلاً بیت یہ ہے : لیک چوں مدت حرانست ہنوزم باقی
برد والا ملک الشرق سوی غازی پور

(۱۷) منتخب التواریخ بداونی ج ۱ ۔ ص ۳۳۲

(۱۸) مثلاً دیکھیے اخبار الاخیار ص ۸۳ ، ۸۴

(۱۹) ان کی وفات کی تاریخ ۱۸ ماہ رمضان ۷۰۵ھ ہے ۔ دیکھیے مقدمۂ خیر المجالس ص ۶۱ ۔

(۲۰) تاریخ محمدی اور اخبار الاخیار میں منقول ہے دیکھیے مقدمۂ مذکور ص ۶۴ ۔ ۶۵

(۲۱) ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ کی مدح ہے جو فیروز شاہ ہی کی زندگی میں ۷۸۹ھ میں تخت نشین کر دیا گیا تھا ۔

(۲۲) بیت یہ ہے :

من ہم چو دیدم لیکہ چو ہفتاد و سہ گذشت عمر و فلک بریں ست کہ پشتم دو تا کند

(۲۳) عرشی صاحب جس کو نامعلوم شرح نگار لکھتے ہیں وہ غالباً یہی بزرگ ہیں ۔ انھوں نے بلخی کے مطالب کو ذرا سی تبدیلی کے بعد اپنی شرح میں شامل کر لیا ہے ۔ دیکھیے خاتمۂ مخزن الاسرار طبع تہران ۔ مزید دیکھیے معارف جولائی ۱۹۴۱ء ص ۴۲ ۔

(۲۴) برٹش میوزیم کے نسخے کا عکس ہے ۔

(۲۵) نمبر ۹۰۰۵۹ ہے ۔

(۲۶) دیکھیے معارف اگست ۱۹۴۱ء ص ۹۳ ۔

(۲۷) معارف جولائی ۱۹۴۱ء ص ۳۵ ۔

(۲۸) معارف اگست ۱۹۴۱ء ص ۹۳ ۔

(۲۹) محض نام کا ایک ہونا کافی نہیں ۔ اس لیے کہ ایک ہی عہد میں ایک ہی جگہ ایک نام کے کئی آدمی ہو سکتے ہیں ۔

(۳۰) معارف جولائی ۱۹۴۱ء ص ۴۷ ۔

(۳۱) معارف اگست ۱۹۴۱ء ص ۸۸ ۔

(۳۲) دیکھیے رسالۂ مخزن بابت ماہ اپریل ۱۹۲۹ء ۔

(۳۳) دیکھیے فہرست کتاب خانۂ مرکزی دانش گاہ تہران، ج ۱۱ نمبر ۳۲۶۹

(۳۴) یہ قصیدہ ۲۳ شعر کا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ استاجی بڑے پائے کا عالم تھا۔ قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:

جمال الدین ای استاد استاج　　درِ تو کعبۂ علم است وما حاج

(۳۵) ص ۱۹ - ۲۰

(۳۶) معارف اگست ۱۹۳۱، ص ۹۰۔

(۳۷) کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ خرگاہ فارسی ادب میں پہلے سے موجود تھا اور کم و بیش خرگاہ کے معنی میں مستعمل بھی تھا۔ فرہنگ جہانگیری (ج ۱ ص ۳۳۹) میں لکھا ہے خرمگاہ اور خرنگہ خرگاہ را گویند بشمس شمس فخری (صح جندی) راست۔

از علوہمت فراش "خرمگاہ قدر　　خیمۂ قدر ترا برادج او ادنیٰ فزدہ"

سروری نے مجمع الفرس (چاپ تہران ج ۱ ص ۴۰۶-۴۰۰) میں چند اور قدیم مثالیں جمع کی ہیں خرمگاہ و خرنگہ (ہر دو بضم خا و فتح رای مہملہ مشدد و مخفف دکاف فارسی) یعنی خرگاہ مثال اول بتخفیف) حکیم خاقانی گوید

تابش رخسار تو از راہ چشم　　کرد خرمگاہ دل از ارغواں

و شمس جندی نیز گوید از علوہمت فراش خرمگاہ قدر الخ

مثال دوم عمید تولکی گوید

گہی صحن ہوا خرنگہ اوست　　گہی در دامن کوہش مآب است

واضح ہے کہ خاقانی اور عمید دونوں محمد شاہ تغلق سے پہلے کے ہیں۔ عمید کا تعلق غلام خاندان کے بادشاہوں سے تھا۔ لیکن مولف فرہنگ رشیدی نے خرمگاہ کو غلط بتایا ہے۔ وہ لکھتا ہے (طبع تہران ص ۵۸۶) "خرمگاہ و خرنگہ یعنی خرگاہ و بتخفیف را نیز آمدہ۔ بدآنکہ صحیح خورنگاہ است نہ خرمگاہ مخفف خورد نگاہ چنانکہ بیاید۔ پھر ص ۶۲۱ پر لکھتا ہے" خورنگہ و خورنگاہ پیشگاہ ایوان یعنی جائے افتادن خور۔ خورنق معرب آں و بعضی گفتہ اند مخفف خورد نگاہ چہ ملوک سابقاً طعام در پیشگاہ می خوردند و قصری کہ نعمان بن منذر برای بہرام گور بنا کردہ بود بنا برآں خورنگہ گفتند کہ در آں طعام می خورد .... خاقانی گوید

خواہی کہ در خورنگہ دولت کنی طواف　　بگریز ازیں خرابۂ نا دلکشای خاک

عبدالواسع جبلی گوید

از خوبی و خوشی چو سدیر و خورنگہ است مشہور در مداین و معروف در کور

رشیدی نے جو تفصیل پیش ہے اس سے خورنگہ اور خورنگاہ کی تائید و تصدیق ہوتی ہے لیکن اس نے اپنے اس دعوے پر کہ "خرمگاہ" غلط ہے، کوئی ثبوت نہیں فراہم کیا ہے، بلکہ بعد میں اس کا ذکر تک نہیں کیا، چونکہ شعرائے متقدم نے یہ لفظ استعمال کیا ہے اس بنا پر صاحب رشیدی کے لیے سوائے خاموشی کے اور کوئی چارہ نہ تھا اور جب تک یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ ان شعراء کے کلام میں لفظ خرگہ یا خرمگاہ محرّف یا مصحف ہے اس وقت تک ان کے وجود کے متعلق کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خرم گاہ یا خرگہ کا وجود محمد بن تغلق عہد کے سے پہلے سے ہے اور محمد بن قوام نے اس لفظ کے سلسلے سے شرح مخزن میں جو تفصیل لکھی ہے وہ در خور اعتناء نہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد:

بھاگ متی اور بھاگ نگر: افسانہ یا حقیقت

(پروفیسر ہارون خاں شروانی کے کتابچے "بھاگ متی کا افسانہ" کے رد میں)

[یہ مبسوط مقالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تمہیداً ان امور کی توضیح و تشریح ہے جن سے بعد کے حصے میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کے رد میں استشہاد کیا گیا ہے۔ یہاں صرف دوسرا حصہ نقل کیا جاتا ہے جس سے بھاگ متی اور بھاگ نگر کی اصلیت سے متعلق شبہات کا بخوبی ازالہ ہو جاتا ہے۔ نجم الاسلام]

پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب نے "بھاگ متی کا افسانہ" کے عنوان سے ۱۸ صفحے کا ایک رسالہ مع ۲ صفحے کے دو ضمیموں کے شائع کیا ہے۔ اس میں ایک طرف تو بھاگ متی کے قصے کو جعلی بتایا گیا ہے اور دوسری طرف حیدر آباد کے قدیم نام بھاگ نگر کی صحت سے انکار کیا گیا ہے۔ شروانی صاحب کا خیال ہے کہ محمد قاسم فرشتہ نے محض زیب داستان کے لیے یہ قصہ گھڑ لیا ہے اور بعد کے مؤرخوں نے اس پر خاطر خواہ اضافہ کر کے ایک دلچسپ رومانی داستان تیار کرلی ہے۔ ان کے استدلال حسب ذیل ہیں:

۱۔ فرشتہ نے حیدر آباد کی آباد کاری کے ۱۸ سال بعد تک (یعنی تا ۱۰۱۸ھ) کے واقعات درج کیے ہیں، اس کے علاوہ کسی ہم عصر تاریخ میں بھاگ متی یا بھاگ نگر کی طرف اشارہ نہیں۔ برہان مآثر ۱۰۳۸ میں تکمیل کو پہنچی، اس کے مصنف علی بن عزیز طبا طبائی نے گول کنڈہ اور حیدر آباد کے حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج کیے ہیں، لیکن اس میں بھاگ متی یا بھاگ نگر کا ذکر نہیں۔ اسی طرح گول کنڈہ کی شاید سب سے مستند تاریخ "تاریخ محمد قطب شاہ" (۱۰۲۵ھ) میں حیدر آباد کی بنیاد اور وہاں کی عمارتوں کا مفصل ذکر ہے، اس میں بھاگ متی یا بھاگ نگر کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ اسی طرح تاریخ "حدیقۃ السلاطین" (۱۰۵۴ھ) بھی بھاگ نگر کے تذکرے سے خالی ہے اور "حدائق السلاطین" (۱۰۹۲) میں حیدر آباد کے متعلق یہ لکھا ہے:

"شہر حیدرآباد کہ مسکن ارباب علم و داد و مامن اصحاب رشد و ارشاد است از مستحدثات آن والا نژاد است کہ در سنہ ہزار و چہار طرح انداختہ کلمہ حیدرآباد بہشت بنیاد بتاریخ موافق افتادہ"

رفیع الدّین شیرازی نے بھی لکھا ہے کہ گول کنڈہ سے دو فرسخ کے فاصلے پر نیا شہر آباد ہوا تھا، شہر کیا تھا "گویا تمام شہر یک باغ است"

اس سلسلے میں میرے معروضات یہ ہیں:

(الف) بعض تاریخوں کی خاموشی سے ایسے واقعے کا انکار جو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ متعدد تاریخوں اور تذکروں میں پایا جاتا ہو، عموماً قابل قبول نہیں۔

(ب) شروانی صاحب کے بعض بیان تصحیح طلب ہیں۔ انھوں نے برہان مآثر کی تاریخ تالیف ۱۰۳۸ھ لکھی ہے، حالانکہ وہ ۱۰۰۰ ہجری میں لکھی جانی شروع ہوئی اور ۱۰۰۳ھ میں مکمل ہوئی۔ مطبوعہ نسخے کے اردو دیباچے میں ہے:

"تاریخ برہان مآثر برہان نظام شاہ کی فرمائش سے (مؤلف نے) لکھی۔ سنہ تالیف ۱۰۰۰ھ "برہان مآثر" کے اعداد سے برآمد ہوتا ہے" (ص ۱)

خود مؤلف نے مقدمے میں لکھا ہے:

"چون این نسخہ ہمایون بنام ہمایون حضرت خاقان زمان ... مرقوم می شود، او را بہ برہان مآثر موسوم ساخت واز نوادر اتفاقات اسم مذکور بلسان عدد از تاریخ سال مبداء این مسطور ایضاح می کند" (ص ۱۰)

خاتمے کی عبارت ملاحظہ ہو:

"واین واقعہ در ۱۳۔ رجب ۹۹۹ھ روی نمود۔ چون احوال فرخندہ مال، صاحب قران، دریا نوال و وقایعی کہ از مبداء طلوع نیّر زوالش از برج ولادت تا حال بوقوع انجامیدہ زیادہ از آنست کہ این مجلد را مجال گنجائی آن باشد ناچار خامہ بدائع نگار در تحریر آن دفتر علیحدہ خواہد پرداخت"۔ (ص ۵۹۲)۔

لیکن بعد میں ۱۰۰۵ھ میں مؤلف نے احمد نگر کی فتوحات (بوسیلہ خان خانان) پر ایک باب کا اضافہ کر دیا جو ۵۹۳ تا ۶۳۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

دراصل بارون شروانی صاحب کو ۱۰۳۸ سال تصنیف قرار دینے میں قلمی نسخے کی تاریخ

کتابت سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔ ترقیمہ ملاحظہ ہو:

"تمت ہذا الکتاب بعون الملک الوہاب علی ید الفقیر الحقیر المحتاج الیٰ رحمت الملک الغنی ابوطالب ابن سیّد علی طبا طبا الحسنی بتاریخ ۵ شنبہ بیست وددم شہر محرم الحرام ۱۰۳۸"

۱۰۳۸ نسخے کی تاریخ کتابت ہے۔ اس نسخے کے پہلے ۵۹۲ صفحات خود مؤلف کتاب یعنی علی بن عزیز اللہ کے قلم کے ہیں۔ ان کی کتابت کی تاریخ ۱۰۰۳ھ ہے۔ یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"وقع الفراغ من تالیفہ و تسویدة فی لیلۃ الاحدی رابع عشر من شہر المبارک المسمّیٰ بہ ربیع الاول من شہور سنہ ثلث والف من الہجرہ النبویہ ... علی ید العبد المذنب المفتقر الی رحمۃ اللہ الولی علی بن عزیز اللہ الطباطبائی الحسنی..."

شروانی صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ برہان مآثر میں گول کنڈہ اور حیدرآباد کے حالات شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں۔ دراصل یہ بہمنوں اور نظام شاہیوں کی تاریخ ہے اور اس کے مندرجات یہ ہیں:

طبقۂ اول سلاطین گل برگہ از علاء الدین حسن تا فیروز شاہ بہمنی۔ طبقۂ دوم سلاطین بیدراز احمد شاہ بہمنی تا محمود شاہ بہمنی طبقۂ سوم سلاطین احمد نگراز سلاطین احمد شاہ کبری تا ۹۹۹ھ ضمیمہ (بغیر عنوان) از حملۂ مغلیہ تا ۱۰۰۵ھ

اس تاریخ میں عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں کا ذکر ضمناً آگیا ہے۔ محمدؐ قلی قطب شاہ کا حال اس عنوان کے تحت آیا ہے:

"ذکر فوت پادشاہ معدلت دستگاہ ابراہیم قطب شاہ و جلوس مہر سپہر سلطنت و بختیاری قطب ملک حشمت دکامگاری محمدؐ قلی قطب شاہ برسریر سلطنت و جہانداری"

اس کے ضمن میں جلوس سلطنت اور محاصرہ نلدرگ کا (جو ۹۹۱ھ میں واقع ہوا اور اسی وقت مؤلف برہان مآثر بھی عراق سے گولکنڈہ پہنچا تھا) کسی قدر تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی جگہ نہیں۔ اس بناء پر بھاگ نگر یا حیدرآباد کی تلاش اس کتاب میں بے سود ہے۔ مجھے مطبوعہ کتاب میں نہ حیدرآباد کا ذکر ملا اور نہ بھاگ نگر کا۔ بہرحال اس کی

خاموشی کی داستان ذرا طویل ہوگئی۔ لیکن قارئین اندازہ کریں گے کہ اس کے مؤلف کے یہاں اس شہر کا ذکر ممکن ہی نہ تھا۔

تاریخ محمدؐ قطب شاہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن حیدر آباد کی تعمیر کی تاریخ یعنی ۱۰۰۰ھ مجھے اس کتاب کے روٹو گراف میں کہیں نظر نہیں آئی۔ ثانیاً چونکہ یہ تاریخ ۱۰۲۵ھ میں لکھی گئی اور اس میں بھاگ نگر کے بجائے شہر کا نام حیدر آباد ہی ہوگا اس لیے کہ اس وقت بھاگ نگر کی تاریخی حیثیت ہو چکی ہوگی۔ پس اس آخر الذکر نام کی غیر حاضری سے اس کے عدم وجود کا استدلال زیادہ قوی نہیں۔ یہی بات حدیقۃ السلاطین اور حدایق السلاطین کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ آخر الذکر میں حیدر آباد کی آبادکاری کی تاریخ ۱۰۰۴ھ لکھی اور یہی تاریخ "حیدر آباد بہشت بنیاد" کے اعداد سے بھی نکلتی ہے۔

(۲) شروانی صاحب کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ خود محمدؐ قلی قطب شاہ نے ۱۲ پیاروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں بھاگ متی نام موجود نہیں۔ اسی طرح بھاگ نگر کا ذکر اس کے یہاں نہیں جب کہ حیدر آباد کا نام تین بار آیا ہے۔ یہ استدلال قوی ہے لیکن کسی اور مضبوط قرینہ کی عدم موجودگی کی بنا پر قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

(۳) "خافی خاں جس کا مأخذ صرف فرشتہ ہو، جو سلطان کی محبوبہ کا نام کبھی بھاگ رتی اور کبھی بھاگ متی اور محمدؐ قطب شاہ کو محمدؐ قلی کا بیٹا بتاتا ہو اس کا قول کیوں کر قابل استناد ہوگا" (ملخصاً)

بھاگ رتی اور بھاگ متی اختلاف نسخ ہیں۔ ان کو کتابت کی غلطی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ مصنف کی غلطی پر نہیں۔ محمدؐ قطب شاہ محمدؐ قلی کا بھتیجا تھا، بیٹا نہیں۔ خافی خاں کا بیان یقیناً غلط ہے۔ لیکن اس غلط بیان سے بھاگ متی والے واقعے کی تردید کیوں کر ہوگئی۔ کسی ایک مؤلف کے کسی سلسلۂ واقعات کے ایک بیان کی غلط ہونے سے اس کے سارے بیان غلط قرار نہیں دیے جاسکتے۔ ہر بیان کی صحت و تکذیب کے لیے الگ الگ پیمانے ہوں گے۔ ایک پیمانے سے سب کو نہیں ناپا جاسکتا۔

(ب) شروانی صاحب مزید فرماتے ہیں

"طبقات اکبری کے متعلق یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس کا مؤلف محمدؐ قلی کے طویل اور شاندار عہد کو صرف ایک فقرے میں ختم کر دیتا ہے۔ محمد علی

(کذا) قطب الملک بن ابراہیم قائم مقام پدر شد و برپا تری بھاگ متی نام عاشق شدہ ... قطب شاہی خاندان خصوصاً محمدؐ قلی قطب شاہ کی توہین و تذلیل میں وہ فرشتہ سے کہیں بڑھ جاتا ہے ... نظام الدین کو تو بادشاہ کا ٹھیک نام بھی معلوم نہیں (قلی کے بجائے علی)۔ شاہی خاندان تو درکنار اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ سلطان ۹۸۸ھ میں تخت پر بیٹھا تھا نہ کہ ۹۹۳ھ تعصب سے بھرے ہوئے ایسے بیان کو تاریخی واقعات کی بنیاد کیسے قرار دیا جاسکتا ہے"۔

شروانی صاحب کا بیان منطقی ربط سے خالی نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں نظام الدین (صاحب طبقات اکبری) بادشاہ کی تذلیل کرتا ہے۔ وجہ تذلیل یہ کہ اس نے بھاگ متی کے قصے کا ذکر کر دیا۔ اسی وجہ سے شروانی صاحب اس کے تعصب سے بھرے ہوئے قول کی تائید نہیں کرسکتے۔ اگر اس واقعے کی تصدیق ہوجائے کہ بھاگ متی کا قصہ صحیح ہے تو نہ وجہ تذلیل باقی رہے اور نہ بیان تعصب سے بھرا ہوا ہو۔ یہ طرز استدلال واقعے کی توثیق یا تکذیب کے سلسلے میں منفی ہے اور اسی بناء پر قابل ترک۔ اس پر ثبوت کی ضرورت تھی کہ واقعہ غلط ہے اور اس کا پیش کرنے والا متعصّب۔

رہا بادشاہ کے نام کے ٹھیک نہ جاننے اور ۱۰۰۲ھ میں اس کی مدت حکومت کے غلط لکھنے کا سوال، تو اس میں پہلی بات تو مطلق قابل توجہ نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ نظام الدّین اس کا نام "محمدؐ قلی" کے بجائے "محمدؐ علی" لکھتا ہے۔ دراصل بات ایسی نہیں۔ طبقات اکبری ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخے میں ہر جگہ اس کا نام محمدؐ قلی ملتا ہے۔ یہی نام اس کے انگریزی ترجمے میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگر کسی نسخے میں ایک جگہ محمدؐ علی مل گیا تو اس کو مصنّف کے سر منڈھنے کا کوئی ادنیٰ جواز نہیں۔ یہ چھاپے یا کتابت کی غلطی ہے۔ مصنّف کی غلطی اور کاتب کی غلطی میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ایسی تحقیق جس میں کاتب کی غلطیاں مصنّف کی بتائی جائیں۔ قابل توجہ نہیں ہوگی۔ دور کیوں جایئے۔ برہان مآثر میں بھی ایک جگہ محمدؐ قلی کے بجائے محمدؐ علی ملتا ہے۔ کیا اس کی بناء پر مؤلف برہان پر یہ ایراد ہوسکتا ہے کہ وہ سلطان کے نام سے واقف نہیں۔ برہان مآثر کی عبارت یہ ہے:

دکامگاری سمی رسول اللہ المؤید من عنداللہ ابوالمظفر محمدؐ علی قطب شاہ الخ (ص ۱۰)

البتہ یہ حقیقت ہے کہ ۱۰۰۲ھ میں محمدؐ قلی کی حکومت کو ۱۴ سال ہو چکے تھے۔ مگر مطبوعہ نسخے میں ۹ سال درج ہے۔ بظاہر یہ مصنف کی غلطی ہے۔ لیکن اس غلطی سے یہ استدلال نہ ہوگا کہ نظام الدّین مولف طبقات اکبری سلطان محمدؐ قلی کے ذلیل کرنے میں فرشتہ سے آگے بڑھ گیا ہے۔

(ج) انشائے فیضی کے بارے میں شروانی صاحب کا خیال درست نہیں:

"انشائے فیضی کے آصفیہ کے قدیم نسخے میں محمدؐ قلی کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ سالار جنگ کے جدید اور معمولی نسخے میں یہ اطلاع ملتی ہے: "احمد قلی قطب الملک تشیع دارد ماموره (کذا) ساختہ و عمارات را پرداختہ بھاگ نگر بنام بھاگ متی فاحشہ کہنہ و معشوق قدیم دوست ... " محمدؐ قلی قطب شاہ کے متعلق جو دو فقرے ہیں وہ طنز سے بھرے ہوئے ہیں۔ تشیع دارد۔ فاحشہ کہنہ۔ معشوق قدیم وغیرہ۔ خط کا لب لباب یہ ہے کہ اکبر کے دکن میں آنے کی دیر ہے۔ یہ خط آصفیہ کے قدیم نسخے میں نہیں ملتا اور تاوقتے کہ اس کی اصل کا پتا نہ لگے اس پر حجّت کیسے مبنی ہو سکتی ہے"۔

دراصل جیسا کہ شروع میں عرض ہو چکا ہے فیضی شوال ۹۹۹ ہجری میں خاندیش اور احمد نگر کی سفارت پر گیا اور وہاں سے ۱۰۰۱ ہجری کے وسط میں ایک عرضداشت لکھی۔ اس میں محمدؐ قلی قطب شاہ کا ذکر ہے۔ یہ عرضداشت اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے اکثر سیاسی و علمی ثقافتی واقعات پر مشتمل دستاویز ہے اور ہندوستان کے دور وسطی کے طالب علم کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ انشائے فیضی کے متعدد نسخوں میں یہ عرضداشت منقول ہے۔ ادھر ڈاکٹر ارشد نے اس کو مرتب کر کے مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۷۳ء میں شائع کر دیا ہے۔ اس میں پانچ لطیفے ہیں۔ لطیفۂ اول چھے عرضداشتوں پر مبنی ہے جو اکبر بادشاہ کو لکھی گئی ہیں۔ انھی میں دوسری عرضداشت میں محمدؐ قلی قطب شاہ کا ذکر موجود ہے۔ اس کا اردو ترجمہ شروع میں دیا جا چکا ہے۔ اصل فارسی یہ ہے:

و محمدؐ قلی قطب الملک تشیّع دارد و معموره ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر نام، و بنام بھاگ متی کہ فاحشہ کہنہ و معشوقۂ قدیم اوست، بنا کردہ (ص ۱۰۰)۔

ان چھے عرضداشتوں میں سب سے طویل عرضداشت یہی ہے جو ص ۹۷ تا ۱۲۵ پھیلی ہوئی ہے۔ یہ عرضداشت دربار اکبری میں چھپ چکی ہے اور ص ۳۰۹ سے ۳۱۷ تک حاوی ہے۔ مولانا شبلی

شعرالعجم ج ۳ میں اس کے ضروری اقتباسات مع اس کی اہمیت کے ص ۲۹ تا ۳۲ درج کر چکے ہیں ۔ ان کے علاوہ علامہ آزاد بلگرامی نے سرد آزاد میں فیضی کی سفارت اور عرضداشت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

شیخ فیضی وقتے کہ از درگاہ اکبری بہ سفارت برہان شاہ والی احمد نگر مامور شد ۔ در عریضہ خود از احمد نگر بہ اکبر پادشاہ می نویسد کہ در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد وصوفی مشرب اندو در شعر رتبۂ عالی دارند الخ (ص ۳۲)

دوبارہ پھر لکھتا ہے:

شیخ فیضی در عریضۂ خود از احمد نگر بہ اکبر پادشاہ بر می نگارد کہ مولانا ظہوری نقل کرد کہ روزے در باغ یکی از شرفاے مکۂ معظمہ مجمعی بود اقسام مردم بر کنار نشستہ صحبتے داشتند الخ (ص ۳۶)

یہ دونوں اقتباس انشای فیضی مطبوعہ لاہور کے ص ۱۳۵ اور ۱۳۰ پر موجود ہیں۔

ان تفصیلات سے یہ بات مسلم ہو گئی کہ فیضی نے احمد نگر سے جو عرضداشت اکبر کی خدمت میں بھیجی تھی اس میں یہ اطلاع تھی کہ محمدؐ قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگ متی اور ان کے نام پر بھاگ نگر آباد کیا گیا تھا ۔ یہ اطلاع جو ایک سفیر اپنے بادشاہ کے پاس بھیجتا ہے دوسرے ذرائع سے حاصل کی ہوئی اطلاع سے زیادہ اہم ہوتی ہے ۔ شروانی صاحب تاریخ کے تقاضے سے پوری طرح واقف تھے ۔ اس لیے اس واقعے کی اہمیت کا جتنا ان کو احساس ہوگا ہم سب کو نہیں ہوسکتا ۔ اسی بناء پر ان کا اصرار یہ تھا کہ دراصل عرضداشت میں محمدؐ قلی قطب شاہ کا ذکر ہی نہیں تھا ۔ اب جب کہ وثوق سے معلوم ہے کہ اس میں وہ واقعہ شامل ہے ۔ اگر ان تک یہ اطلاع پہنچ جاتی تو یقیناً وہ اپنے بیان پر اصرار نہ کرتے ۔ یہ بات تو احمد نگر کی عرضداشت کی نسبت سے تھی ۔ شمالی ہندوستان کے مورخوں پر جو اعتراض ہوئے ہیں وہ بھی بڑی حد تک بے بنیاد ہیں ۔ اس وجہ سے شروانی صاحب کا فیصلہ قابل قبول نہیں ۔ فیضی اور نظام الدین بخشی کے بیان کی بنیاد پر بھاگ متی اور بھاگ متی کے واقعے ناقابل رد ہیں۔

۳۔ شروانی صاحب فرماتے ہیں کہ فرشتہ اور دوسرے دکنی مورخین کے بیانات بے بنیاد ہیں:

۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام کہانی فرشتہ (محمدؐ قاسم فرشتہ ۔ مولف تاریخ فرشتہ)

کے ذہن رسا کا ایک کرشمہ ہے۔ اسے اصلی یا فرضی جنسی کیفیات کے بیان کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ دکن کی تاریخ میں اس نے اس فن میں کمال ہی پیدا کر دیا ہے۔ اس نے فیروز شاہ بہمنی کی جنسی کار گزاریاں دکھانے میں جو انتہا کی ہے اس کا ثانی ملنا نا ممکن ہے۔ اسے باغ نگر کا لفظ ملا۔ اس سے اس نے بھاگ نگر نکالا۔ جب اس کو احساس ہوا کہ بھاگ نگر بغیر بھاگ متی کے لطف سے خالی ہوگا تو اس نے نہ صرف بھاگ متی کی تخلیق کی بلکہ اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے ایک ہزار سوار بھی اس کے جلو میں رکھ دیے فرشتہ کے زمانے سے لے کر مغل تاریخوں کی قلم بندی تک کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ بھاگ متی کون تھی یا کہاں تھی۔ جب مغل آئے تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہ کہیں ایک بازاری عورت کا ذکر ہے اور اس کے نام پر ایک شہر بھی آباد کیا گیا ہے تو انھوں نے قطب الملک کے نام کو نیچا دکھانے کے لیے اس کے ماتھے پر ایک اور کلنگ کا ٹیکا لگانے کی کوشش کی۔ اس کی کوشش کو غلام حسین کے ہاتھوں زک پہنچی مگر یہ زک نہایت کمزور ثابت ہوئی اور فاحشہ بھاگ متی کے رومان میں جو لطف تھا اسے انیسویں صدی اور اس کے بعد کے مؤرخین نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔" (ص۔ ۱۶)

اس بیان کی بنیاد ان چار چیزوں پر ہے:

۱۔ فرشتہ کو جنسی کیفیت کے بیان میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس لیے اس نے بھاگ متی کے قصے کی تخلیق کی۔ اس نے باغ نگر سے بھاگ نگر کر لیا۔

۲۔ مغل مؤرخین نے اس قصے پر بڑی عمارت تیار کی۔

۳۔ بعد کے دکنی مؤرخین نے اس پر اور بھی اضافہ کیا۔

۴۔ ماہ نامے کے مؤلف نے اس کی تردید کی مگر وہ زیادہ اثر انداز نہ ہوئی۔

اس سلسلے میں میرے معروضات یہ ہیں:

بھاگ متی کا افسانہ گھڑنے کا الزام محمد قاسم فرشتہ پر لگایا گیا ہے۔ اس کی تاریخ ۱۰۱۱ ہجری میں لکھی گئی۔ اور اس سے ۱۶ سال قبل فیضی بھاگ متی اور بھاگ نگر کا ذکر کر چکا ہے۔

اور اس میں شبہ نہیں کہ فیضی کا بیان ایک سفیر کا بیان ہے۔ وہ ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک ہے۔ تو بیچارے فرشتہ پر جس نے ۱۶ سال بعد یہ بات لکھی ہے۔ یہ الزام کیوں کر عائد ہوتا ہے۔ فرشتہ پر مزید جنسی کیفیات کے خواہ مخواہ بیان سے لذت اندوزی کا بہتان غلط ہے۔ یہ تو فیضی کے بیان کی صورت رہی۔ نظام الدین بخشی کی طبقات اکبری جس میں بھاگ متی اور بھاگ نگر کا واقعہ مذکور ہے۔ فرشتہ سے ۱۵ سال قبل کی تالیف ہے۔ یہ مزید اس بات کی مظہر ہے کہ فرشتہ پر بھاگ متی کا قصہ تراشنے کا الزام بیجا ہے۔

باغ نگر سے بھاگ نگر کی تبدیلی کا الزام بھی بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ اول باغ نگر رفیع الدین شیرازی کے تذکرۃ الملوک میں درج ہے۔ جو فرشتہ سے مقدم نہیں۔ دوم یہ کہ رفیع الدین نے شہر کا نام باغ نگر نہیں لکھا بلکہ یہ کہ گویا تمام شہر یک باغ است۔ سوم جب فیضی ۱۶ سال قبل اور نظام الدین ۱۵ سال قبل بھاگ نگر نام لکھتے ہیں اور اس کو بھاگ متی کی طرف منسوب کرتے ہیں تو باغ نگر محض افسانہ تراشی ہے اور کچھ نہیں۔

فرشتہ پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے بھاگ متی کے جلو میں ایک ہزار سوار کھڑے کر دیے۔ یہی بیان نظام الدین بخشی ۱۵ سال قبل دے چکا ہے۔ بیچارہ فرشتہ بے گناہ ہے۔

شروانی صاحب کے دوسرے اور تیسرے اعتراض بھی بے حقیقت ہیں۔ بھاگ متی اور بھاگ نگر کے وجود کے بارے میں جب شبہ نہیں تو نہ مغل مورخین قابل الزام اور نہ دکنی مورخین۔ ممکن ہے جزئیات میں مبالغے سے کام لیا گیا ہو، لیکن اصل بات تو اپنی جگہ باقی ہی ہے۔

ماہ نامہ میں بھاگ متی کے عشق کی داستان فرضی بتائی گئی ہے۔ مگر چونکہ وہ اس واقعے کے سوا دو سال بعد کی تاریخ ہے اس لیے تواتر کے ساتھ مرقوم واقعے کی تردید اس کے بیان سے نہیں ہو سکتی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ماہ نامے میں بھاگ نگر کے وجود سے انکار نہیں بلکہ اس کی نسبت بھاگ متی کے بجائے بھاگ رتی کے نام پر جو محمد قلی کی ماں تھی، بتائی ہے۔

شروانی صاحب نے حیدرآباد کے وجود کے سلسلے میں ۱۰۱۲ ہجری کا ایک سکّہ پیش کیا ہے جس پر اس شہر کا نام درج ہے۔ یہ سکّہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ شہر ۱۰۱۲ ہجری میں وجود میں آچکا تھا لیکن اس سے اس نقطے کی تردید نہیں ہوتی کہ اس تاریخ سے قبل بھاگ

نگر شہر بھاگ متی کے نام پر آباد ہوچکا تھا۔

۵۔ یورپی سیّاحوں نے باغ نگر لکھا ہے جو رفیع الدّین کے بیان پر مبنی ہے۔

شروانی صاحب نے یورپی سیّاحوں کے جو اقتباسات دیے ہیں ان میں برنیر اور تھیونو کے یہاں BAGNAGAR ہے، لیکن ٹیورنر کے یہاں BAGNAGAR کی تشریح GARDEN OF NAGAR ہے، جو یقیناً غلط ترجمہ ہے، دراصل اس کا منشا CITY OF GARDEN ہوا، ان سیّاحوں کے یہاں کا فقرہ باغ نگر اضافت مستوی نہیں مقلوب ہے، شروانی صاحب کا قیاس ہے کہ ان کے بیانات کی بنیاد رفیع الدّین شیرازی کا وہ جملہ ہے جس میں لکھا ہے کہ تمام شہر باغ ہے، وہاں نہ باغ نگر کا فقرہ ہے اور نہ یہ کہ شہر کا نام باغ نگر ہے، بہر حال فیضی کے بیان کی روشنی میں بھاگ نگر یا بھاگ متی کے وجود پر شک نہیں کیا جاسکتا۔

۶۔ شروانی صاحب کے نزدیک محمدؔ قلی قطب شاہ کی کم عمری کا عشق مشتبہ ہے، ان کا خیال ہے کہ اگر فرشتہ کی داستان پر اعتماد کیا جاتا ہے تو ایک عجیب صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔ محمدؔ قاسم فرشتہ کے بقول تخت نشینی کے وقت محمدؔ قلی قطب شاہ کی عمر ۱۴ سال کے بجائے ۱۲ سال کی تھی، پرانا پُل ابراہیم قطب شاہ کی وفات سے ۲ سال قبل ۹۸۶ھ میں مکمل ہوا، اور اس کی تعمیر میں دو تین سال لگے ہوں تو معاشقے کی ابتدا میں محمدؔ قلی قطب شاہ کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔

کسی اور معاملے میں فرشتہ کا قول جب قابل تسلیم نہیں تو محمدؔ قلی کی عمر ہی کے معاملے میں اس کے بیان کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ تاریخ محمدؔ قطب شاہ ۱۰۲۰ ہجری میں وفات کے وقت سلطان محمدؔ قلی کی عمر ۴۹ سال کی تھی اس اعتبار سے پیدائش کی تاریخ ۹۷۱ھ ہوئی، پس ۹۸۶ ہجری میں پل بننے کے وقت شاہزادہ ۱۵ سال کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ ۱۴ سال کے لڑکے کا عشق بعید از قیاس نہیں، اگر اتنی کم عمر کا عشق قابل قبول نہیں تو ۱۶، ۱۷ سال کی عمر کی شادی کیوں کر تسلیم کی جاسکتی ہے۔ محمدؔ قلی کے بہنوئی ابراہیم قلی کی شادی شاہ میر کی لڑکی سے ۹۹۱ھ میں ہوئی، اس وقت محمدؔ قلی کی عمر ۲۰ سال سے کم رہی ہوگی، لڑکی کی عمر یقیناً کافی کم رہی ہوگی، اور یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ یہ لڑکی کی دوسری شادی تھی، اس کی پہلی شادی اس کے بڑے بھائی شاہ قلی سے ہوچکی تھی۔ خلاصۂ گفتگو یہ کہ ۸، ۷ سال کی عمر میں تعشق کی روایت زیادہ وزن نہیں رکھتی۔

ی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ فیضی کے واضح بیان کے بعد بھاگ متی اور بھاگ نگر کے واقعے کی صداقت ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہوجاتی ہے۔ یہ سرکاری بیان نہایت مُصدّقہ ہے جو ایک سفیر کے قلم سے اس کے آقا کی خدمت میں پیش ہوا تھا۔ اور اس بیان کو جب طبقات اکبری کے بیان سے ملاتے ہیں تو یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ ۱۰۰۲ ہجری تک نئے شہر کا نام بھاگ نگر ہی تھا۔ فرشتہ، عبدالباقی نہاوندی مولف مآثر رحیمی اور خافی خان مولف منتخب اللباب وغیرہ مورخین کے بیان سے صاف طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ بعد میں بھاگ نگر حیدرآباد کہلایا۔ یہ تاریخی حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ البتہ یہ چیز جانچنے کی ہے کہ نام کی تبدیلی یعنی بھاگ نگر سے حیدرآباد کب عمل میں آئی۔ شروانی نے ۱۰۲۱ ہجری کا سکہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس تاریخ میں شہر حیدرآباد کہلاتا تھا اور بخوبی امکان ہے کہ اس تاریخ سے قبل ہی یہ تبدیلی وجود میں آچکی ہو۔ اگر مآثر رحیمی کی یہ روایت تسلیم کرلی جائے کہ حیدرآباد نام کی تجویز ہونے میں مرزا محمد امین میر جملہ شہرستانی کو دخل تھا تو ۱۰۱۰ھ کے قبل یہ نام وجود میں نہ آیا ہوگا اس لیے کہ میر جملہ اسی سال دربار قطب شاہی میں باریاب ہوا تھا، اور ایک سال بعد میر جملہ مقرر ہوا قرین قیاس یہی ہے کہ میر جملگی کے بعد یعنی ۱۰۱۱ھ اور ۱۰۱۲ھ کے درمیان بھاگ نگر کا نام حیدرآباد تجویز ہوا ہوگا۔ بھاگ متی اور بھاگ نگر کے سلسلے میں شروانی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ در خور توجہ نہیں۔

(خدا بخش لائبریری جرنل، شمارہ ۳۷)

حواشی

(۱) انشای فیضی مطبوعہ لاہور، ص ۹۰۔ ۱۳۵۔

(۲) فرشتہ نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی محمدؐ قلی قطب شاہ کی بہن چاند سلطان معروف بہ ملکہ جہاں سے شادی کے موقع پر اس شہر کا نام بھاگ نگر رکھا ہے۔ یہ شادی ۹۹۶ ہجری میں ہوئی۔ اس سنہ میں بھاگ نگر کا نام موجود تھا۔ (تاریخ فرشتہ ج ۲، ص ۵۰)

(۳) ابراہیم عادل شاہ ثانی کی چچی کا بھی نام چاند سلطان تھا جو احمد نگر کی تاریخ میں اپنی شہرت رکھتی ہے۔ سلطان نے اپنی کتاب نورس میں اپنی بیوی کا ذکر گیتوں میں کیا ہے۔ گیت نمبر ۲۱، ۲۲)

ابراہم سب سندری دیکھیا یو لُجھن ہے کہاں   جات چاند سلطان نانو بی بی ملکیجہاں

دھنی بی بی چاند سلطان ملکیجہاں   اتم سندر ناری ایسی کہاں

(۴) اس کتاب میں حیدرآباد کا نام موجود نہیں، اور موجود ہوتا کیوں کر اس لیے کہ فیضی کی وفات ۱۰۰۲ھ میں ہو گئی اور اس وقت تک حیدرآباد وجود میں نہیں آیا تھا۔ مطبوعہ انشاے فیضی کی فہرست میں حیدرآباد ملتا ہے۔ لیکن وہ مقدمے یا حاشیے میں مرتب کی طرف سے اضافہ ہے، اصل متن میں نہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد :

چندر بدن و مہیار کے مُصنّف کے تعیّن کے بارے میں محمد اکبرالدّین صدّیقی صاحب کی کوشش کا جائزہ

(تلخیص)

۱۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء کے نوائے ادب میں محمد اکبر الدین صدیقی صاحب لکچرر عثمانیہ یونیورسٹی نے مرزا محمد مقیم مقیمی سلمی مصنف "چندر بدن و مہیار" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس میں اس الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایک بات یہ پیدا کی ہے کہ میرزا محمد مقیم استرآبادی نہیں بلکہ مشہدی تھا۔ اور اب تک اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ غلط ہے۔ (ص ۵۸)

۲۔ میرے خیال میں فاضل مقالہ نگار نے اس ضمن میں زیادہ کاوش نہیں کی۔ جو مضامین یا کتابیں اس سلسلے میں نکلی ہیں ان کا بہنوز مطالعہ نہیں کیا۔ میری چیزوں کا کیا ذکر ڈاکٹر زور اور نصیرالدین ہاشمی وغیرہ کی کتابیں بالاستیعاب مطالعے میں نہیں آئیں۔ ورنہ بعض مُسلّمات کا انکار ایسی جلدی نہ کرتے۔ کون نہیں جانتا کہ میرزا محمد مقیم استرآبادی کا ذکر خود اس کے معاصر اور ہم وطن فزونی استرابادی نے فتوحات میں کیا ہے وہ اپنے عہد کا اچھا خاصا شاعر تھا۔ ... ایسی حالت میں یہ دعویٰ کہ مقیم استرابادی کوئی شخص ہی نہیں محمد عادل شاہ کے دور کا شاعر مشہدی تھا۔ حیرت انگیز ہے۔ (ص ۵۸)

۳۔ صدیقی صاحب نے محمد عادل شاہ کے دور کے جن شعرا کا نام دیا ہے ان میں سے تین یعنی ملک قمی، میرزا محمد مقیم رضوی اور عبدل کا تعلق اس بادشاہ کے عہد سے ہرگز نہ تھا۔ نصرتی نے محمد عادل شاہ کا زمانہ ضرور پایا تھا مگر اس کے کارنامے علی عادل شاہ ثانی کے دور کی یادگار ہیں۔ (۶۲، ۶۳)

۴۔ مرزا محمد مقیم رضوی مشہدی اور مقیمی کو ایک کر دیا گیا ہے اور مقیمی بھی کون؟ وہ دکھنی شاعر جس نے چندر بدن و مہیار لکھی ہو۔ اگرچہ یہ مُسلم ہے کہ میرزا محمد مقیم رضوی، میر محمد رضا رضوی تخلص رضائی کا لڑکا تھا مگر اس کی شاعری کا ذکر نہیں ملتا۔ ... میرے خیال میں صدیقی صاحب کی مراد مرزا محمد مقیم استرابادی سے ہوگی جو بقول فرشتہ محمد عادل شاہ کا درباری شاعر تھا۔ صدیقی صاحب نے اس کو مشہدی بتا کر ایک طرف تو مرزا محمد مقیم رضوی سے مشابہ کر دیا ہے اور دوسری طرف اس کا تخلص مقیمی لکھ کر اسے چندر بدن و مہیار کا مولف ٹھہرایا ہے حالانکہ ان کے پاس کوئی ادنیٰ دلیل نہیں جس کی رو سے وہ مرتضیٰ نظام شاہ (وفات ۹۹۶) کے عہد کے اہم نظام شاہی امیر اور محمد عادل شاہ بیجاپوری کے دربار کے دکھنی مصنف مقیمی کو ایک قرار دے سکیں۔ بغیر ثبوت اور قرینے کے دو بعید العصر شخصیتوں کو نہ صرف ہم عصر بلکہ ایک ہی قرار دینا تاریخی بے احتیاطی کا بین ثبوت ہے۔ (۶۳-۶۵)

۵۔ برہان ماثر میں کہیں بھی مرزا محمد مقیم رضوی کو شاعر نہیں بتایا گیا ہے، نہ فارسی کا اور نہ دکھنی کا۔ معلوم نہیں فاضل مقالہ نگار نے کس بنا پر اس بے چارے کو مقیمی فرض کرکے اس کے سر ایک دکھنی مثنوی تھوپ دی۔ (ص ۷۰)

۶۔ مرزا محمد مقیم بیجاپور میں نہ تھا۔ ۹۸۶ھ تا ۹۹۵ھ میں وہ احمد نگر میں ملتا ہے۔ اس وقت اس کی شہرت مُسلّم تھی۔ محمد عادل شاہ کے دور بیجاپور میں اس کی موجودگی کے امکان نہیں ہوسکتے۔ مزید، اس وقت اس کی عمر ۹۱ سے ۱۲۱ سال تک ہوتی ہے جو بالکل ناممکن ہے (ص ۷۰)

۷۔ (صدیقی صاحب نے) لکھا ہے: "مرزا مقیم سلمی مقیمی ہی ہے جس نے دکھنی میں چندر بدن و مہیار لکھی ... صدیقی صاحب سے پھر ایک اور غلطی ہوئی۔ ابھی تک وہ مرزا محمد مقیم رضوی مشہدی اور مرزا محمد مقیم استرآبادی کو ایک سمجھتے تھے۔ اب مرزا مقیم سلمی کو بھی ان کے ساتھ ملا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ حدیقۃ السلاطین کے بیان کیے ہوئے قطب شاہی دور کے ملا مقیم کو بھی ان ہی کے ساتھ شامل کردیا۔ (ص ۷۲)

۸۔ قطب شاہی امیر ملا مقیم کی شخصیت الگ ہے۔ اس طرح مقیمی سے قطع نظر چار مقیم ہوتے ہیں:۔ (الف) مقیم مشہدی مرتضیٰ نظام شاہ کے عہد کا امیر جو ملا محمد رضا مشہدی کا لڑکا تھا۔ (ب) مرزا محمد مقیم استرآبادی، محمد عادل شاہ کے دور کا فارسی شاعر۔ (ج) مرزا محمد

مقیم سلمی، دور محمد عادل شاہ کا فارسی شاعر جس کا تعارف صدیقی صاحب نے کرایا۔ (د) ملا مقیم، عبداللہ قطب شاہ کے دور کا امیر جو ۱۰۴۱ھ کے قریب محمد عادل شاہ کی خدمت میں آیا تھا

اس میں نمبر ۲ اور نمبر ۳ کے ایک ہونے کا امکان ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ ان میں سے کوئی مقیمی ہو جو دکھنی مثنوی کا مصنف ہے، مگر صدیقی صاحب کی منطق کچھ سے بالاتر ہے۔ وہ ان سب کو ایک ہی شخص سمجھتے ہیں (ص ۱۰۳)

۹۔ میرے نزدیک مرزا مقیم استرابادی اور مقیمی صاحب چندر بدن و مہیار دو الگ الگ شخصیت ہیں۔ وجوہ یہ ہیں۔

(الف) فزونی استرآبادی نے مرزا مقیم کو فارسی زبان کا اچھا شاعر قرار دیا ہے اور اس کے کافی اشعار فتوحات میں نقل بھی کیے ہیں۔ ان میں اس کا تخلص مقیم آیا ہے ... فزونی نے کہیں بھی اس کا تخلص سوائے مقیم کے مقیمی نہیں لکھا، اور نہ یہ لکھا کہ وہ اردو میں بھی مشق سخن کرتا تھا۔

اس کے خلاف چندر بدن و مہیار کا مؤلف مقیمی تخلص کرتا تھا۔ (ص ۱۰۰)

(ب) میں نے شبہہ ظاہر کیا تھا کہ مرزا محمد مقیم استرابادی اور مقیمی شاعر دکنی کے درمیان جو فصل ہے وہ کیسے کم ہوگا۔ کیا نام کی کسی قدر یکسانیت دو شخصیتوں کو ایک ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ "بہار گلشن" میں مقیم تخلص کے سات شاعروں کا ذکر میرے شبہے کو کیونکر رفع کرسکتا ہے؟ بلکہ اس سے تو میرے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ایک ہی تخلص کے بہت سے شاعر ہوسکتے ہیں (ص ۱۰۰)

(ج) کوئی ایسا قوی قرینہ نہیں جس سے مرزا مقیم کو چندر بدن کا مؤلف قرار دیا جائے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ چندر بدن کی تکمیل ۱۰۴۸ھ کے قبل ہوئی ہے، اور ان ہی ایام میں میرزا مقیم تازہ تازہ وارد ہندوستان ہوا تھا مگر اس کمزور قرینے سے ایرانی مقیم کو چندر بدن کا مؤلف قرار دینے میں بڑا تردّد ہے۔ (ص ۱۰۸)۔

(د) اس میں شبہہ نہیں کہ مرزا مقیم نام کے جن چار اشخاص کا برابر ذکر آتا ہے، ان میں سے دو کا تعلق بیجاپور سے تھا اور دونوں محمد عادل شاہ کے دربار سے منسلک معلوم ہوتے ہیں اور کم از کم ایک مقیم کے متعلق (خواہ وہ ان دونوں میں سے ہو یا الگ) تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اردو یا دکھنی میں بھی لکھتا تھا۔ بہرحال، امکان اس کا ہے کہ وہ مقیم، مقیمی تخلص

کرتا ہو۔ مگر مرزا مقیم استر ابادی کے متعلق خیال ذرا مشکل سے ہو گا، اس لیے کہ اس کے ورود ہند یا بیجاپور اور تاریخ تصنیف مثنوی میں بہت ہی کم فرق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مقیم درباری شاعر تھا، پھر کیوں اس کی مثنوی بادشاہ وقت کی مدح سے خالی رہی۔ مرزا محمد مقیم سلمی کا حال معلوم نہیں ۔ ممکن ہے کہ وہ اور استر ابادی ایک ہی ہوں۔ اگر وہ الگ اور ہندوستانی الاصل ہے تو پھر اسے مقیمی فرض کرنے میں کسی قسم کی قباحت نہ ہو گی۔

ہم کو صدیقی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھوں نے سلمی کے دیوان کا تعارف کرا کے اس کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ مقیمی کی شخصیت کا تعین ہو جائے۔ کاش وہ مرزا مقیم استر ابادی اور سلمی کی شخصیت پر زیادہ روشنی ڈالتے ۔ ممکن ہے، فزونی نے اوّل الذکر کے جو اشعار نقل کیے ہیں وہ سلمی کے دیوان میں موجود ہوں۔ اگر ایسا ہو تو پھر ان دونوں کو ایک ہی شاعر قرار دیا جائے گا۔ (ص ۸۰)

اعتذار اس شمارے میں عنوانات" گوشہ متون"، "اضافات" اور مہام شورو کے مخطوطات" کے لیے گنجائش نہیں نکالی جا سکی، انھیں آئندہ شمارے میں پیش کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ ۔

مکتوبات

مکتوبات ڈاکٹر مختار الدین احمد بنام نجم الاسلام

(۱)

علی گڑھ

۲۰ جنوری ۱۹۹۵ء

مکرمی ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب السلام علیکم

آپ کے خطوط مورخہ ۲ دسمبر ملے تھے اور اب ۴ جنوری کا تحریر کردہ گرامی نامہ ۱۸ ماہ رواں کو ملا۔ ممنون ہوا۔

"عرض دیدہ شد" عہد اکبری کے جن دو نسخوں میں ملتا ہے ان کے نام تحریر فرمایئے اور کچھ تفصیلات۔ وحید قریشی صاحب کو لکھوں گا لیکن وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔

آثار غالب مکمل چھاپا جاسکتا ہے لیکن مکتوبات فارسی تو ضرور چھپنے چاہییں، یہ پھر شایع نہیں ہوئے۔ اصل یعنی حکیم حبیب الرحمن کے کتب خانے کا قلمی مجموعہ مجھے ڈھاکہ میں تو نہیں مل سکا، تلاش کے باوجود۔ یہ غالباً شادانی صاحب کے پاس رہ گیا۔ اسلام آباد میں آپ تلاش کرلیں تو خوب ہو۔ خطوط فارسی شایع کرنے کے لائق ہیں، ضرور شایع کیجیے۔ حواشی میں اضافے ہوسکیں تو اور بہتر ہے۔ کتاب آثار اب کہیں نہیں ملتی، اس لیے خیال ہے کہ اس کا ری پرنٹ چھپوایا جائے۔ یہ آپ کے فارسی خطوط کی اشاعت میں مانع نہیں۔

غالب کے غیر مدوّن فارسی مکتوبات کی اشاعت کی سخت ضرورت ہے۔ عرشی مرحوم نے کام شروع کیا تھا لیکن پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا سکے۔ آپ اس کام کا بیڑا اٹھائیں تو یہ بڑی مفید علمی و ادبی خدمت ہوگی۔ ایک فارسی خط میں نے اردو ادب علی گڑھ میں شایع کیا تھا جس سے غالب کے قیام لکھنؤ کی مدت پر روشنی پڑتی ہے آپ نے نہ دیکھا ہو تو مضمون کا عکس بھیج دوں گا۔ کچھ اور خطوط بھی کسی زمانے میں چھپے ہیں۔ آپ پنج آہنگ وغیرہ کے خطوط کو شامل کر کے مکمل کلیات مکاتیب فارسی شایع کرنا چاہتے ہیں یا، جو پنج آہنگ کے بعد مکشوف ہوئے ہیں انھیں مرتب کرنا چاہتے ہیں؟

گوشۂ اختر کے لیے ان کے کچھ خطوط فروری میں "ان شاء اللہ" بھیجوں گا۔ میں مرحوم

پر کوئی مقالہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ ان کے خطوط جمع کر رہا ہوں رسالہ "مصنف" سے۔ ممکن ہے کچھ دوسرے رسائل میں بھی مل جائیں۔ آپ بھی جمع کرنے کی کوشش کریں۔ کراچی میں ملنے چاہییں۔ انجمن ترقی اردو، بورڈ اور غالب لائبریری میں ملنے چاہییں۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے گفتگو ہوئی۔ فنائی ثلاثہ پر تمہید لکھ کر بھیجنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ان کا ایک مضمون بھی ساتھ جائے گا۔

سیمینار میں آپ کا بہت انتظار رہا۔ خیر پھر کبھی سہی۔ یار زندہ صحبت باقی۔ خان خانان کی مہر میں نے دیکھی ہے۔ اس وقت یاد نہیں کہاں کس کتب خانے میں۔ ممکن ہے وہ نسخہ نہ دیکھا ہو جس پر اس کی مہر ہو۔ کہیں اس کا عکس دیکھا ہو۔ براہ کرم تفصیل لکھیے عکس ہوا کر بھیج دوں گا۔ اگر وہ مخطوطہ جس پر خان خانان کی مہر ہے کتب خانہ خدا بخش میں ہے تو پھر آپ کو بیدار صاحب کو لکھنا مناسب ہوگا۔ میں یہاں ذخیرۂ حبیب گنج میں دیکھوں گا۔

شانہ و گردن کی تکلیف ابھی دور نہیں ہوئی۔ روزانہ میڈیکل کالج اب بھی جاتا ہوں چالیس منٹ تک Traction کا عمل جاری رہتا ہے۔ پڑھنے لکھنے پر پابندی ہے۔ یہ جو میں خط لکھ رہا ہوں وہ ڈاکٹروں کی ہدایات کے خلاف ہے۔ کہتے ہیں جھکنا نہیں چاہیے۔ لکھنا پڑھنا جھکے بغیر کس طرح ممکن ہے؟ بہرحال دعا فرمائیے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

خواجہ صاحب کی مصروفیات کا آپ سے علم ہوا۔ لیکن ایسا بھی پروف پڑھنا کیا کہ آدمی ایک خط نہ لکھ سکے۔ بہرحال دیر سویر وہ لکھیں گے ضرور۔ اور لکھیں گے تو تفصیلی خط لکھیں گے۔

والسّلام

مختار الدّین احمد

ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں) کا مضمون "میرا علی گڑھ" دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے۔ آپ کے پاس شاید کوئی نسخہ نکل آئے۔ نہ ہو تو زیروکس کرا کے بھجوا دیں۔ بہت ممنون ہوں گا۔

(۲)

۹ / ۳ / ۹۵ء

مکرمی ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب السّلام علیکم

اب " میرا علی گڑھ " بھیجنے کی ضرورت نہیں ۔ لاہور سے سیّد محمد کاظم صاحب سے منگوالیا ہے۔ بحمد اللہ طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ان شاء اللہ ہفتے عشرے میں مضمون بھیج دوں گا ۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کہتے تھے کہ میرے نام آپ کا خط نہیں ملا ۔ وہ پھر تلاش کریں گے ۔

اب تک تو تحقیق (تحقیق یا نشر تحقیق ؟) کے تین چار سو صفحے کمپوز ہوگئے ہوں گے ۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے متن فارسی پر تمہید لکھ کر بھیج دی تھی ۔ مل ہوگی ۔

سخی احمد ہاشمی مرحوم پر کچھ لکھیے لکھوائیے ۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے ۔ والسلام

مخلص

مختار الدّین احمد

(۳)

(یہ تحریر مکتوب مورخہ ۲ جون ۱۹۹۵ء کے ساتھ منسلک تھی جو گم ہوگیا ہے)

استدراکات ۔

مکتوب ۱۳ : ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (۱۸۹۰ء لاہور ۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۸۳ء لاہور)

مکتوب ۱۵ : بشیر الدّین احمد مؤلف واقعات دارالحکومت دہلی و خلف ڈپٹی نذیر احمد (۳ اگست ۱۸۶۱ء ۔ ۲۳ اگست ۱۹۲۷ء)

مکتوب ۲۰ : سیّد باقر علی ترمذی نے بمبئی یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے اور " عربی و اسلامیات کے فروغ میں گجرات کا حصہ " کے موضوع پر مقالہ لکھ کر اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا ۔ افسوس ہے یہ علمی مقالہ اب تک شائع نہ ہوسکا ۔ ترمذی ۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے قاہرہ گئے ہوئے تھے۔ اچانک علیل ہوئے اور وہیں وہ وفات

پاگئے ۔ وہ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے ۔ شفیق استاد نے شاگرد کی وفات کے بعد ان پر ایک مفصل مضمون نوائے ادب (بمبئی) میں چھپوایا تھا ۔ یاد آتا ہے کہ یہ مضمون ڈار مرحوم کے مجموعہ مقالات "مضامین ڈار" میں بھی شائع ہوا ہے ۔ اس وقت تلاش سے نہ نوائے ادب کا ہی شمارہ ملا اور نہ ان کا مجموعہ مضامین ۔ ترمذی کی وفات جون ۱۹۵۱ء میں ہوئی ۔

حاشیہ (۴) : ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (ولادت ۲۶ دسمبر ۱۸۸۵ء قصبہ سندیلہ ضلع ہردوئی ۔ وفات شب ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء الہ آباد)

حاشیہ (۲۵) : بشیر احمد علوی کا کوروی (۲۹ محرم ۱۳۲۰ھ کا کوری ۔ جولائی ۱۹۶۹ء کا کوری) یہ منشی امیر احمد علوی کا کوری ڈپٹی کلکٹر اور اردو کے معروف مصنف (۱۴ جون ۱۸۶۹ء - ۳۰ مئی ۱۹۵۲ء) کے بڑے بیٹے تھے ۔ ڈاکٹر بشیر احمد علوی اور قیصر تمکین علوی (متولد یکم جنوری ۱۹۳۸ء) جو آج کل انگریزی روزنامہ ٹائمز (لندن) کے شعبۂ ادارت سے منسلک ہیں، بشیر علوی مرحوم کے صاحب زادے ہیں ۔ قیصر تمکین کی خود نوشت "خبر گر" لاہور سے شائع ہوئی ۔

حاشیہ (۲۶) : پرنسپل عبدالشکور (۳ جولائی ۱۸۹۸ء بریلی ۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۰ء بریلی)

حاشیہ (۲۷) : سید حسن امام گیاوی (وفات ۲۳ اپریل ۱۹۶۷ء کراچی)

حاشیہ (۳۱) : شیخ عبداللہ پاپا میاں ۔ پیدائشی نام ٹھاکر داس ۔ ولادت ۲۱ جون ۱۸۷۴ء ضلع پونچھ کشمیر ۔ قبول اسلام ۱۸۹۱ء ۔ وفات ۹ اپریل ۱۹۶۵ء علی گڑھ ۔ عبداللہ لاج اور ویمنز کالج میرس روڈ کے درمیان دفن کیے گئے ۔

(۴)

علی گڑھ

۳-۵-۹۶ء

حبیب گرامی السلام علیکم ۔

ایک ہفتہ ہوا کہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ رسالہ "تحقیق" کا تازہ شمارہ کل آگیا ہے ۔ مجھے تعجب ہوا کہ میرے پاس نہیں پہنچا ۔ پھر خیال ہوا کہ ڈاک میں کبھی ایک دو دن کی تقدیم و تاخیر ہوجاتی ہے ۔ کل آجائے گا ۔ لیکن پرچہ دیکھنے کا اشتیاق تھا کہ شب کو ان کے یہاں گیا اور رسالہ لے آیا ۔ رات کو اور پھر صبح کو سارا رسالہ پڑھ گیا ۔

کل ۲ مئی کو ۲۱ اپریل کا مرسلہ پیکٹ ملا۔ دوسرا نسخہ عطا خورشید صاحب کو پہنچا دیا گیا۔

جو اصحاب قاضی احمد میاں اختر مرحوم سے اچھی طرح واقف نہیں وہ آپ کا مرتب کردہ گوشہ دیکھ کر ان کی قدر و قیمت پہچانیں گے۔ افسوس کہ پاکستان نے ایسے جلیل القدر مصنّف کی قدر نہیں کی۔ اس گوشے کے سب مضامین بہت اچھے ہیں۔ ان کے خطوط اور دوسری تحریریں آپ نے چھاپ کر اس گوشے کو مفید تر بنا دیا ہے۔ مرحوم کے نام مکتوبات پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان کے تعلقات کتنے وسیع تھے۔ افسوس کہ وہ توزک اختری مرتب نہیں کر سکے۔ ڈاکٹر زاہد حسین سے میں واقف نہیں، یہ ممکن ہے ڈاکٹر زاہد علی ہوں جو حیدرآباد (دکن) کے رہنے والے تھے اور جنھوں نے فاطمی عہد پر کام کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد نظام الدین کا نام دو جگہ کیوں درج ہے؟ یہ وہی ہیں جو صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی تھے اور جنھوں نے پروفیسر براؤن کی نگرانی میں جوامع الحکایات عوفی پر کام کیا تھا۔ (۱۱) ڈاکٹر قریشی کا نام بھی لکھ دیا جاتا تو اچھا تھا۔ یہ فضل الدّین قریشی ہوں گے جو پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ طبعیات کے استاد تھے۔ (۱۴) سے مراد اگر یہ خاکسار ہے تو یہ مرحوم نے عزّت افزائی کی ہے کہ انھوں نے ایک طالب علم کو بڑے بڑے نامور اور جلیل القدر دکاترۂ ادب کی صف میں شمار کیا۔ علم دوست احباب میں ایک نام عبدالماجد لاہوری کا نظر پڑا۔ یہ کون تھے؟ ادیب و مصنّف کی فہرست میں (۱۵) مولوی محمّد سے مراد ممکن ہے عثمانیہ یونیورسٹی کے اردو کے استاد، ارباب نثرِ اردو کے مصنّف ہیں۔ یادداشتیں بہت مفید ہیں، آپ نے اچھا کیا کہ ان کا انتخاب کر کے شایع کر دیا۔ یہ پورا حصہ قابل اشاعت تھا، ص ۲۰۴ پر صلاح الدّین صفوی چھپ گیا ہے یہ صلاح الدّین الصفدی مصنف الوافی بالوفیات ہیں۔

مرحوم کے کتبخانے کی فہرست میں (۳۸) تاریخ فرّخ آباد از ولی اللہ فرّخ آبادی پر نظر پڑی۔ میری اس کتاب سے دلچسپی ہے، عرصہ ہوا میں نے اس کی فصل تذکرۂ شعرائے فرّخ آباد کو انجمن کے رسالے اردو ادب میں شائع کر دیا تھا۔

مقالات میں تکملۂ مقالات الشعرا، پر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے ملاحظات بہت قیمتی ہیں، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے سیّدنا ابوالعلا، اکبر آبادی اور ان کے مکتوبات پر بہت پر معلومات مضمون لکھا ہے۔ دکتر معین الدّین عقیل نے شیر بانو بیگم کی خود نوشت خوب تلاش کی اور اسے بہت سلیقے سے پیش کیا ہے۔

دیوان غمگین (طبع لاہور) پر آپ کا مضمون بہت اہم ہے۔ اسے میں نے بہت دلچسپی

سے پڑھا۔ لاہور سے دیوان کی اشاعت کا علم ہوا تھا اور پروفیسر وحید قریشی یا پروفیسر محمد اسلم کو لکھ کر یہ دیوان منگوانے والا تھا۔ یقین تھا کہ یہ عبدالقادر خاں غمگین کا دیوان ہے۔ اب آپ کے مضمون سے صورت حال کا علم ہوا۔ آپ نے متن پر بہت گہری نظر ڈالی ہے اور بہت اہم نتائج اخذ کیے ہیں۔ خوشی ہوئی کہ یادگار نامۂ فخرالدّین علی احمد اور فخرالدّین علی احمد والیوم آپ کو پسند آئے۔ آپ نے اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ پاکستان کے دس صدور جمہوریۂ اسلامیہ میں سے کسی ایک کی ایسی علمی یادگار اب تک وجود میں نہیں آئی۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ ہندوستان کے ایک اور مسلمان صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی ۱۰۱ ویں سالگرہ کے موقع پر مالک رام صاحب نے اردو اور انگریزی میں مضامین لکھوا کر دو جلدوں میں انھیں ۱۹۶۸ء میں پیش کیا تھا۔ یہ دونوں علمی مجموعے بہت پسند کیے گئے۔ کاغذ بڑھ گیا اور رسالۂ تحقیق کے شمارہ ۸۔۹ کی حسن ترتیب و حسن طباعت کی وہ تعریف و توصیف نہیں کرسکا جس کا یہ شمارہ مستحق ہے۔ کامیابی پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ والسلام

مختار الدین احمد

گوشۂ اختر میں مذکور نام عبدالماجد لاہوری سہو کتابت ہے۔ اسے مجید لاہوری سمجھا جائے۔ قیام پاکستان کے بعد قاضی احمد میاں اختر اور مجید لاہوری ایک زمانے میں کراچی کے محلے کمارادر میں رہتے تھے اور باہم مراسم رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ 'الصفدی' (جس کی تصحیح ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے بجا طور پر فرمائی ہے) کی ایک کتاب شرح لامیۃ العجم دو جلدوں میں مطبوعہ مطبعۃ الازہریہ مصر، قاضی احمد میاں اختر کے ذخیرۂ کتب کی فہرست میں ملتی ہے۔ نجم الاسلام

اضافہ:

اسی ایروگرام میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے نام مکتوب بھی تھا اور اس میں بھی تحقیق پر تبصرہ تھا۔ اس کا متعلقہ حصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

تحقیق کا تازہ شمارہ سخت انتظار کی حالت میں ملا۔ اسے دیکھ کر دیر آید درست آید کی مثل یاد آگئی بہت اچھے مضامین ہیں۔ قاضی

صاحب مرحوم پر اتنا مواد اس شمارے میں ہے کہ ریسرچ کے
طالب علم دو تحقیقی مقالے اس سے تیار کرسکتے ہیں ۔ آپ کا
مضمون سب سے پہلے پڑھا اور مستفید ہوا ۔ آپ کا فرمانا بجا ہے
کہ بعض الفاظ جو گجرات سے مخصوص سمجھے جاتے ہیں وہ جبل پور
تک میں بولے جاتے ہیں، یہی نہیں بعض الفاظ یوپی اور بہار میں
بھی مروج ہیں ۔ بہار میں بھی بنیوں کو بقال کہتے ہیں ۔ ضلع پٹنہ اور
قصبہ بہار شریف میں سیدھے سادھے بلکہ بے وقوف کو بودھا بقال
کہا جاتا ہے ۔ بودھا یعنی سیدھا سادہ ۔ اس طرح وہاں "مناہی" کا
لفظ بھی مستعمل ہے ممانعت کے معنی میں ۔ حال سے بحال ہونا
بھی مستعمل ہے ۔ دھاوا بمعنی حملہ بھی مروج ہے ، اور لٹ بھی ۔
اسی طرح ہنسلی بھی بولتے ہیں جو گلے کا ایک مشہور زیور ہے ۔

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کا مضمون بہت پسند آیا ۔ غرض قاضی صاحب پر نجم الاسلام صاحب نے بہت قیمتی اور پُر معلومات گوشہ شائع کیا ہے ۔

(۵)

علی گڑھ

۱۲/۶/۹۰ء

محترمی پروفیسر نجم الاسلام صاحب السّلام علیکم

مکرمت نامہ مورخہ ۳۱ یہاں قدرے تاخیر سے ۱۲ کو موصول ہوا ۔ رسالہ تحقیق کے تازہ شمارے کے دو نسخے مل گئے تھے اور میں نے رسید بھیج دی تھی ۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو یہ رسالہ پہلے ہی مل گیا تھا ، دوسرے ہی دن ان کے یہاں سے لاکر پورا رسالہ پڑھ لیا تھا ، آف پرنٹس کا انتظار ہے ۔

ڈاکٹر بلوچ پر میں نے کوئی مضمون نہیں لکھا ہے ، مجلۃ المجمع العلمی کے میمن نمبر میں کسی مضمون میں ان پر ایک فٹ نوٹ چھپا ہے ، اس میں اضافہ کر کے ان شاء اللہ بھیج دوں گا ۔

منسوبات کے بارے میں ابھی کوئی عنوان ذہن میں نہیں آیا ہے ۔

مقالات کے حصے کے لیے ایک تحریر بھیجوں گا ۔ یہ ذوالفقار علی مست کے تذکرے پر ہے جس کا واحد نسخہ کتب خانۂ برلین میں محفوظ ہے ۔ میں نے ۱۹۵۵ء میں اسے ٹیوبنگن میں

دیکھا تھا اور اس کے مفصل نوٹس تیار کر لیے تھے۔ ابتدا میں تمہید ہوگی اس کے بعد کچھ شعرا کے حالات و اشعار۔ یہ زیر ترتیب شمارے کے لیے موزوں نہ ہو تو بلاتکلف لکھ دیں۔

شعبۂ عربی سے ایک عزیز کراچی جا رہے تھے۔ ان کی معرفت ڈکٹر نذیر احمد صاحب کے دو چھوٹے چھوٹے مفید مضمون غلط منسوبات پر اور ایک مقالہ موجودہ شمارے کے لیے پہنچا ہو گا۔

منوہر سہائے انور پنجاب کے رہنے والے تھے اور فارسی و اردو تہذیب کے پروردہ۔ انھوں نے تقسیم ہند سے پہلے سراج الدین علی خان آرزو پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی۔ فارسی انشا، ادب پر ایسی گہری نظر رکھتے تھے کہ جب قاضی عبدالودود صاحب کو فارسی کے پیچیدہ فقرات کے سمجھنے میں الجھن ہوتی تھی تو وہ بلاتکلف ان سے رجوع کرتے تھے۔ حسن اتفاق سے قاضی صاحب کے نام ان کے کوئی ڈیڑھ سو خطوط مجھے مل گئے ہیں۔ دس بیس خطوط اوروں کے نام بھی حاصل ہوگئے ہیں۔ میں انھیں مرتّب کر رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تحقیق کی ایک اشاعت میں اس شمارے کے آخر میں بطور ضمیمہ آجائیں۔ تحریر صاف شھری اور ایسی پاکیزہ ہے کہ کمپوز کرانے کے بجائے عکسی اڈیشن نکالا جاسکتا ہے۔ لیکن اس طرح ضخامت بڑھ جائے گی۔ کمپیوٹر کے ذریعہ کمپوز کرائیں گے تو میرا خیال ہے کہ مجموعۂ مکاتیب دو سو، سوا دو سو صفحات میں آجائے گا۔ براہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

ایک بار آپ نے پوچھا تھا ضرورت ہو تو الزبیر بھاولپور کا کتب خانہ نمبر بھجوادوں۔ میں نے کہا تھا بھجوا دیجیے۔ کتبخانۂ محمد حسین آزاد پر آپ نے مندرج مضمون کی عکسی نقل مرحمت فرمائی تھی اور میں نے اس زمانے میں شکریہ کا خط لکھ دیا تھا۔ سنا تھا اس کے کچھ اور خاص نمبر چھپے تھے۔ یہ کن موضوعات پر شایع ہوئے تھے، لکھیے گا۔

محمود میمن بھائی سے کبھی ملاقات ہوتی ہے؟ خدا کرے ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔

پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کی خدمت میں بوقت ملاقات میرا سلام کہیے۔ ان کا گرامی نامہ مورخہ ۱۶ اپریل اور محمد یوسف صاحب کا مضمون مل گیا تھا اور میں نے رسید بھی بھیج دی تھی۔ آپ کا ممنون ہوں آپ نے یوسف صاحب کا مضمون اپنے قلم سے لکھ کر کاتب صاحب کو بہت سی زحمتوں سے بچالیا۔ جزاک اللہ۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے ہم لوگ برابر دعاگو رہتے ہیں۔ خدا انھیں صحت مند بنائے اور صحت مند رکھے۔

امید آپ بخیر و عافیت ہوں گے والسّلام

مخلص

مختار الدّین احمد

(۶)

علی گڑھ

۲۲/۶/۹۷ء

مخترمی جناب پروفیسر نجم الاسلام صاحب السّلام علیکم

مورخہ ۲۲ اپریل رام پور سے ۵ جون کو پہنچا اور اسی دن اس کا جواب دے دیا، ملا ہوگا۔ اس میں پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے مکتوبات کے عکس کا ذکر ہے۔ ہفتہ عشرہ ہوا ایک دن مرتّب صاحب کا ٹیلیفون آیا ان کی طرف سے کوئی اور صاحب کر رہے تھے اور ان خطوط کے عکس کا مطالبہ کر رہے تھے۔ دو منٹ کے بعد وہ بھی ٹیلیفون پر آئے اور انھوں نے کہا میں اب تک ان خطوط کے انتظار میں ہوں۔ میں نے کہا حضرت آپ نے تو کوئی خط نہیں لکھا، ڈاکٹر رفیع الدین کے نام کے خطوط بھیجے ان کی آج تک رسید بھی نہیں بھیجی، بہرحال آپ ایک اچھا کام کر رہے ہیں، میں خطوط کے عکس آپ کو ضرور بھیجوں گا۔

تلاش کیے تو کوئی پچاس خطوط اور رقعات نکلے۔ ان کے زیروکس بنوالیے ہیں۔ مشکل یہ ہے بعض خطوط پر سال تحریر درج نہیں۔ آج بیٹھ کر ان کی تاریخ تحریر طے کی پھر انھیں ترتیب سے رکھا۔ حواشی لکھنے لگا تو شاید بہت تاخیر ہوجائے اور یوں بھی رفیع الدین صاحب کے نام کے خطوط تو ظاہر ہے بغیر حواشی کے چھپیں گے۔ اب کل دیکھوں گا یا تو کل میں یہ عکس ڈاک کی نذر کردوں گا کہ آپ تک جلد پہنچ جائے یا پھر موقع ہوا تو مختصر حواشی لکھ دوں گا۔ لیکن اس عمل میں دو تین دن ممکن ہے لگ جائیں۔ اشاعت کے لیے آپ ان خطوط پر ایک نظر ضرور ڈال لیں کوئی بات ناقابل اشاعت ہو تو حذف کردیجیے گا اگر وہ جو خطوط مرتب کر رہے ہیں یا شائع کر رہے ہیں سرگرم عمل نہ ہوں تو انھیں اپنے پاس محفوظ رکھیے اور جب اور جس طرح چاہیے استعمال کیجیے۔ دیکھیں یہ پیکٹ آپ کو کب ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب محترم و مکرّم کے لیے برابر دعاگو رہتا ہوں ان کی خدمت میں جب ملاقات ہو تو میرا اور بیگم صاحبہ کا سلام پیش کردیجیے۔ مصطفائی صاحب کو دعا کہیے۔ والسّلام

مختار الدّین احمد

(٧)

علی گڑھ

١٧۔٩۔٩٧ء

محبیّ نجم الاسلام صاحب

مرتب مکاتیب پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کا حیدرآباد سے ٹیلیفون آیا تھا مکتوبات کے ارسال کے لیے۔ افسوس ہے کہ آج سے پہلے سارے خطوط کے عکس نہیں ہوا سکا، اب تیار ہو کر آگئے ہیں۔ بھیج رہا ہوں۔ براہ کرم ایک نظر ڈال کر خطوط پر نمبر درج کر دیجیے، بریکٹ میں۔

میں کل صبح ان شاء اللہ دہلی جا رہا ہوں۔ رات کو ایرپورٹ پہنچنا ہے اور علی الصّباح عمان / اردن کے لیے روانہ ہونا ہے۔

ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب) کی خدمت میں سلام پیش کر دیجیے۔

اب یہ خطوط آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ آپ چاہیں یا ان صاحب کو دے دیں، یہ آپ کے صواب دید پر ہے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

والسّلام

مختار الدّین احمد

(٨)

علی گڑھ

٦/١١/٩٧ء

محبیّ، السّلام علیکم

بلوچ صاحب پر مضمون تیار ہوگیا ہے۔ احتیاطاً زیروکس ہونے کے لیے بھیجا ہے۔ آجائے تو رجسٹری کرانے ڈاک گھر بھیج دوں۔ شنبے کو ١٢ بجے رجسٹری بند ہوجاتی ہے۔ خدا کرے آدمی جلد آجائے اور رجسٹری ہوجائے۔

بہت عجلت میں مضمون لکھا ہے۔ آپ اچھی طرح اسے دیکھ لیں۔ کہیں میمن صاحب کسی الاستاذ اور کہیں کچھ اور لکھا گیا ہے صفحہ ٨ پر میمن صاحب کا خط درج ہوگا

عربی میں ہے ۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے الٰہی بخش کو عربی میں کیا خط لکھا ہوگا[۲] اردو میں ہوگا میں نے مجلّے میں چھاپتے وقت عربی میں ترجمہ کر دیا ہوگا ۔ خط بظاہر بلوچ صاحب سے مجھے ملا ہوگا ۔ میرے ذخیرۂ کاغذات میں موجود نہیں ۔ اگر آسانی سے ممکن ہو تو انھیں ٹیلیفون کر کے یا خط لکھ کر اصل اردو خط کی نقل منگوایئے اور اس کو شایع کیجیے ۔ مجبوری ہے تو عربی میں سہی ۔ اور خط نہ چھاپنا چاہیں تو اردو میں خلاصہ چھاپ دیجیے ۔

بلوچ صاحب کے ساتھ کراچی کا ایک گروپ فوٹو مجھے حکیم مسعود احمد برکاتی صاحب کی عنایت سے ملا تھا ، بھیج رہا ہوں شایع کرنا ہو تو شایع کر دیجیے ۔ اس میں افتخار عارف ، برکاتی صاحب ، مشفق خواجہ صاحب کے ہم زلف ذوالفقار مصطفےٰ اور بلوچ صاحب ہیں ۔ اوّل و آخر میں جو دو صاحبان ہیں میں انھیں نہیں جانتا ۔ برکاتی صاحب کو تو نہیں ذوالفقار صاحب کو لکھ رہا ہوں کہ اگر انھیں دونوں کا نام معلوم ہوجائے تو وہ آپ کو مطلع کر دیں کہ تصویر کے ساتھ نام چھاپنا ضروری ہے ۔ نہ معلوم ہو تو اوّل و آخر میں نامعلوم لکھ دیتے ہیں ۔ لیکن یہ مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ کہیں سنین وفات درج نہیں ، آپ کو آسانی سے معلوم ہوسکے تو لکھ دیجیے ورنہ بریکٹ کو قلمزد کر دیجیے ۔

بلوچ صاحب سے میرے تعلقات زیادہ نہیں رہے وہ کچھ مصروف کچھ کوتاہ قلم بھی ہیں ۔ بمشکل ایک دو خط ان کے آئے ہوں گے پھر ان کے جاننے والے اور ان کے کارناموں سے واقف آپ کے یہاں بہت لوگ ہیں انھوں نے ان کے تفصیلی حالات اور ان کے کارناموں کا ذکر ضرور کیا ہوگا ۔ میں نے مناسب سمجھا کہ الاستاذ اور ان کے تلامذہ کا ذکر کروں اور ایسے معلومات پیش کروں جن کے جاننے والے اب یہاں بھی نہیں ملتے ، وہاں کہاں ملیں گے ۔ اس طرح کچھ معلومات علی گڑھ اور شعبۂ عربی کے بارے میں شاید محفوظ ہوجائیں ۔ آپ کو یہ فاضل معلوم ہوں تو بلاتکلف حذف کر دیجیے ۔

تصویر چھاپنے کے بعد حفاظت سے واپس کر دیجیے گا ۔ آپ بڑے نظم و ضبط کے آدمی ہیں یہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی ۔

درّانی مرحوم پر جو کتاب پشاور میں چھپی ہے اسے حاصل کر کے بھیج سکیں تو خوب ہو ۔ ان کا سال وفات معلوم ہوسکے تو اضافہ کر دیجیے گا ۔

کیا اچھا ہو اگر مسودے پر ڈاکٹر صاحب قبلہ ایک نظر ڈال لیں ، کچھ باتیں اس زمانے کی انھیں بھی یاد ہوں گی ۔ ممکن ہے واقعات کے اندراج میں مجھ سے چوک ہوئی ہو ۔ لیکن ان کی

مشغولیت اور ضعف شاید اس کا موقع نہ دے۔

مضمون کمپوز ہوجائے اور اس کی تصحیح ہوجائے تو براہ کرم اس کی ایک عکسی کاپی طباعت سے پہلے بھیج دیجیے۔ آف پرنٹس ممکن ہو تو کچھ زیادہ نکلوائیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اور میرے بہت سے خطوط ایک شمارے میں چھپے تھے۔ آپ نے ازراہ کرم خاصے آف پرنٹس بھجوانے تھے۔ سب تقسیم ہوگئے۔ دیکھیے کہیں دو چار اور پڑے مل جائیں تو بھیج دیجیے گا۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اچھے ہیں۔ افسوس ہے کہ کل ۵ دسمبر کو یہاں پروفیسر خلیق احمد نظامی وفات پاگئے۔ ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

والسّلام

مختار الدّین

ابھی محمود احمد برکاتی اور مسعود احمد برکاتی صاحب کے خطوط مؤرخہ ۳۔ دسمبر دہلی سے موصول ہوئے۔ ایک ماہ کے لیے جے پور جا رہے ہیں۔ افسوس کہ علی گڑھ کا ویزہ ان کے پاس نہیں۔ اب تو تصویر کے بارے میں ذوالفقار مصطفےٰ صاحب ہی کچھ بتا سکیں گے۔

(۹)

علی گڑھ

۲۵ / ۱۱ / ۰۹۷

محترمی ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب السّلام علیکم

مکرمت نامہ مورخہ ۳۰ / ۱۰ یہاں ۱۱ / ۱۱ کو موصول ہوا۔ ۴ / جولائی کا خط بھی ملا۔ تحقیق کے آف پرنٹس بھی ملے، بہت بہت شکریہ۔ اس شمارے سے قبل کے شمارے میں جو مکتوبات زیادہ تعداد میں چھپے تھے وہ مطلوب ہیں۔ اب ان کے ملنے کے امکانات کم ہیں لیکن کوشش کر کے دیکھیں۔

زیر طباعت شمارے کا حال معلوم ہوا۔ خطوط پڑھ کر بہت شرمندہ ہوا اور مضمون تو کیا لکھتا برادر گرامی ڈاکٹر نبی بخش بلوچ پر بھی چند صفحے لکھ کر نہ بھیج سکا۔ اب لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آج تک نصف لکھ لیا ہے۔ دس بارہ صفحوں کا مضمون ہوجائے گا۔ ایک ہفتے میں بھیج دوں گا۔ اور

اصحاب نے دوسرے پہلوؤں پر لکھا ہوگا میں نے " علامہ میمن کا ایک ممتاز شاگرد " اپنے مضمون کا عنوان رکھا ہے اور علی گڑھ اور میمن صاحب کے حوالے سے یہ مضمون لکھا جا رہا ہے۔ اس میں ان کے متعدد خواجہ تاشوں کا ذکر اور ایسے معلومات آگئے ہیں جو محفوظ ہوجائیں تو اچھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور ان کی علمی کوششوں پر دوسرے حضرات نے لکھا ہوگا لیکن علی گڑھ کا ذکر ان میں کم آیا ہوگا۔

خوشی ہوئی کہ آپ نے قاضی مرحوم کے یادگار نامے کے لیے مضمون لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اپنی ملاقاتوں کے ساتھ کچھ اور علمی باتیں آجائیں تو اچھا ہے۔ میں نے ان کی متعدد کتابیں آپ کی خدمت میں بھیجی ہیں۔

خالد محمود صاحب ٹیلیفون کرنے اور خطوط ملنے کے بعد خاموش ہوگئے۔ انھوں نے کتاب اب تک نہیں بھیجی۔ راشد شیخ صاحب کا خط لاہور سے آیا ہے۔ ملیں تو انھیں میرا سلام کہیے۔ علی گڑھ میگزین چار ہزار چھپی تھی، طلبا، کی تعداد کوئی بیس ہزار ہے۔ مجھے صرف چند کاپیاں ملیں تھیں، وہ میں نے احباب میں تقسیم کر دیں۔ اگر کوئی نسخہ ہاتھ آگیا تو شیخ صاحب کے لیے رکھ لوں گا۔ خدا کرے سمیع الدین صاحب اس طرف آ نکلیں۔ دکتر نذیر احمد صاحب امریکہ سے آگئے ہیں بخیر ہیں۔

امید آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

پروفیسر غلام مصطفیٰ کا گرامی نامہ آیا ہے۔ جواب مضمون کے ساتھ بھیجوں گا۔

والسّلام

مختار الدّین احمد

(۱۰)

علی گڑھ

یکم جنوری ۱۹۹۸ء

مکرمی پروفیسر نجم الاسلام صاحب السّلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۲۰ نومبر سمیع الدین صاحب کے ذریعے موصول ہوا ۹ دسمبر کو۔ تاخیر کی وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ میں دکتر نذیر احمد صاحب کے ساتھ ایوان غالب دہلی کی لائبریری کمیٹی کے جلسے میں شرکت کے لیے دہلی گیا ہوا تھا۔ شب کو واپس آیا تو ڈاکٹر صاحب اور آپ کے

گرامی نامے ملے ۔ خیال تھا کہ دو چار دنوں میں وہ فیروز آباد وغیرہ سے گھوم پھر کر آئیں گے تو خط کا جواب لے جائیں گے ۔ ہفتہ عشرہ گزر گیا اور وہ نہ آئے تو ان کی تلاش شروع ہوئی ۔ ان کے ایک کرم فرما محمد ظفر الدین سے جا کر ملا تو معلوم ہوا وہ تو واپس گئے ۔ بہت افسوس ہوا کہ ان سے ملاقات نہ ہو سکی ۔ آپ کے خط کے جواب میں الگ تاخیر ہوئی ۔ آپ منتظر ہوں گے جواب کے ۔

دسمبر کا مہینہ سخت مصروفیت کا ہوتا ہے ۔ غالب سیمنار کے لیے مضمون لکھنا تھا پھر وہاں جا کر شریک ہونا تھا ۔ ہم دونوں ۲۰ کی صبح گئے اور ۲۹ کی شب واپس آئے ۔

توقع تھی کہ آپ تشریف لائیں گے، وہاں سے کوئی بھی نہ آسکا، اس لیے مایوسی ہوئی ۔

بلوچ صاحب پر مضمون لکھ کر ۹ دسمبر کو دہلی لیتا گیا اور وہیں اسے رجسٹری سے روانہ کیا۔ رجسٹری نمبر ہے ۵۳۲۰ اور تاریخ روانگی ۹ ۔ ۱۲ ۔ ۹۰، آپ کی طرف سے اس کی رسید نہ آنے سے سخت تردد ہے۔ وہ پیکٹ رجسٹرڈ ہے اس لیے ضرور پہنچا ہوگا۔ براہ کرم دو سطریں رسید کی بھیج دیجیے کہ رفع تردد ہو۔

منسوبات کی فہرست دیکھی ۔ آپ نے ماشاء اللہ کافی تفصیلی فہرست مرتب کر ڈالی ہے۔ آپ کیا یہ سب مضامین اس شمارے میں شایع کر رہے ہیں۔ یہ تو کئی شماروں میں آئیں گے ۔ غالباً آپ اس فہرست کے چند مضامین شایع کر رہے ہوں گے اور فہرست مکمل تاکہ اس کا افادہ عام ہوجائے ۔ اپنی گزارشات چند دنوں کے بعد بھیجوں گا ۔ اس وقت تو صرف یہ جاننے کی فکر ہے کہ مضمون آپ کو اب بھی ملا، یا نہیں ۔ براہ کرم فوراً اطلاع دے کر ممنون کریں ۔

دہلی میں دکتر سیّد امیر حسن عابدی صاحب سے منسوبات کے سلسلے میں گفتگو کی ۔ انھوں نے بابر کی طرف مشہور شعر بابر بعیش کوش ... کی نسبت کے بارے میں ایک مضمون ایک مجموعۂ مضامین میں لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ شعر سلطان بابر قلندر کا ہے ۔ یہ کتاب منگوا کر ان کے مضمون کا عکس بنوا کر بھیج رہا ہوں یہ آپ کی دلچسپی کا ہوگا ۔ نئے سال اور رمضان المبارک کی تہنیت قبول فرمائیں۔ تحقیق کا زیر طبع شمارہ کب تک شایع ہو رہا ہے ۔

والسلام

خیر طلب

مختار الدین احمد

علی گڑھ

۲ جنوری ۱۹۹۸ء

محترمی ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب السلام علیکم

کل آپ کے نام لفافہ روانہ نہ ہو سکا کچھ اور خطوط بھی لکھنے تھے اور کل کی ڈاک بھی دیکھ لینی تھی۔ کل کی اور اب آج کی ڈاک بھی دیکھ لی۔ آپ کا کوئی خط نہ تھا اب تردّد میں اور اضافہ ہوا۔ براہ کرم فوراً صورت حال سے آگاہ کیجیے۔ منسوبات کے بارے میں گزارشات پیش ہیں۔

۱) دیوان مخفی پر دکتر سیّد امیر حسن عابدی نے بھی مضمون لکھا ہے جو رسالہ العلم (بمبئی) میں چھپا۔ اس کے اڈیٹر سیّد علی جواد زیدی تھے۔ آپ چاہیں گے تو مضمون کی نقل عابدی صاحب سے حاصل کرلوں گا۔

۲) انھی کا ایک مضمون اسی قسم کے موضوع پر کتب خانۂ تونک کے جرنل میں چھپا ہے۔ یہ دکتر شریف حسین قاسمی صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے پاس ہے

۳) دیوان معین الدّین چشتی از دکتر نذیر احمد۔ معارف۔ یہی مضمون منادی (دہلی) میں بھی شایع ہوا ہے۔

۴) معراج العاشقین کی نسبت پر بھی ایک مضمون یاد آتا ہے دکتر نذیر احمد یا کسی اور کا چھپا ہے۔

۵) ظہور الاسرار از پروفیسر محمد ابراہیم ڈار۔

۶) ابراہیم ڈار ہی کا ایک ایسا ہی مضمون کسی اور کتاب کے متعلق شایع ہوا ہے۔ ان کا مجموعۂ مضامین دیکھوں گا۔ اورینٹل کالج میگزین (جوبلی نمبر) میں کسی کا ایک مضمون چھپا تھا۔ ڈار مرحوم نے اس کا جواب لکھا تھا

۷) جمالی دہلوی اور مصباح الارواح از دکتر نذیر احمد اردو ادب (علی گڑھ)

۸) جمالی دہلوی از حسام الدین راشدی

۹) مقیمی فارسی کا شاعر ہے اردو کا نہیں۔ غلط نسبت۔ کئی قسطوں میں معارف میں چھپا تھا از دکتر نذیر احمد۔ اگر آپ کو نہ ملے تو لکھیے یہ ان کے تحقیقی مقالات میں بھی چھپا ہے میں عکس بنوا کر بھیج دوں گا۔

۱۰) کیا مقیمی چندر بدن کا مصنّف ہے؟ از نذیر احمد اردو ادب۔ اکبر الدّین صدیقی

(حیدرآباد دکن) کے رد میں
تلک عشرہ کاملۃ ۔ ان میں سے جن مضامین کے عکس آپ حاصل کر سکیں
حاصل کرلیں، جن میں زحمت ہو بے تکلف لکھیے۔
امید ہے آپ بخیر ہوں گے
مرسلہ خطوط پر ایک نظر ڈال کر پوسٹ کرادیجیے۔ عقیل صاحب کے نام کا خط براہ کرم
فوراً بھیجیے کہ وہ جاپان روانہ ہونے والے ہوں گے۔

والسّلام

مختار الدّین احمد

(۱۲)

علی گڑھ
۶۔۱۔۹۸ء

محبّی نجم الاسلام صاحب السّلام علیکم
گرامی نامہ مورخہ ۲۶ دسمبر ابھی سخت انتظار کی حالت میں ملا۔ پڑھ کر بہت تشویش ہوئی
کہ اس میں بلوچ صاحب پر مرسلہ مضمون کے پہنچنے کی اطلاع نہیں۔ میں مضمون بذریعہ
رجسٹری ۹ دسمبر ۱۹۹۷ء کو بھیج چکا ہوں رجسٹری نمبر یہ ہیں ۵۳۲۰۔
ایک خط آپ کو اور لکھا ہے جس میں تحقیق کے گوشۂ منسوبات کی فہرست کی رسید آپ کو بھیجی
ہے اور کچھ اپنے معروضات۔ اس میں بھی لکھا ہے کہ مضمون کی رسید نہ ملنے پر تردّد ہے۔
اب اگر آج کے خط پہنچنے تک بھی وہ رجسٹرڈ پیکٹ نہ ملے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ضائع
ہوا۔ حیرت ہے کبھی کبھی معمولی ڈاک سے خط پہنچ جاتے ہیں اور رجسٹری غائب ہوجاتی ہے
۔ اگر وہ رجسٹری آپ تک پہنچ گئی ہو تو رسید کا خط بھیج دیجیے، نہ پہنچی ہو تو ممکن ہے اور
آپ کو زحمت نہ ہو تو تار دیجیے یا ٹیلیفون کر دیجیے۔ مضمون کی نقل میرے پاس ہے۔ ۔۔
بھیج دوں گا۔ مضمون مل جائے اور چھپ جائے تو آف پرنٹس کا خاص طور پر خیال رکھیے گا۔
مولوی مخصوص اللہ کی کتاب 'ارشاد نامہ' کے متعلق پھر لکھوں گا۔
نئے سال کی تہنیت قبول فرمایئے۔

والسّلام

مختار الدّین احمد

علی گڑھ

١٠ جنوری ١٩٩٨ء

محبی، السلام علیکم

میں مرسلہ رجسٹری سے مایوس ہوگیا تھا اور مجھے اس بات کا تقریباً یقین ہوگیا تھا کہ راہ میں ضائع ہوگئی۔ اس لیے کل یک شنبہ کو مضمون کی نقل کی زیروکس بنوالی تھی کہ آج آپ کو بھیج دوں گا۔ ابھی آپ کا گرامی نامہ مورخہ ٣١ دسمبر بارہویں دن موصول ہوا اور اس سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی بحمدہ مضمون آپ کو موصول ہوگیا۔ مقالے کا پروف پڑھ کر نہ بھیجیے گا۔ صرف اس خیال سے کہ اگر کوئی قابل ذکر غلطی رہ گئی ہے تو میں آپ کو اطلاع دے دوں اور آپ کسی مضمون کے کسی صفحے کے آخر میں جو جگہ بچ گئی ہو اس میں یہ تصحیح نامہ چھاپ دیں۔

لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو برادر گرامی نبی بخش بلوچ صاحب کو یہ مضمون دکھا دیں۔ اگر وہ چاہیں کہ کچھ حذف کر دیا جائے تو حذف کر دیجیے۔ یہ دیکھ لیں کہ واقعات کی غلطی مضمون میں نہ ہو۔ وہ تصحیح کر دیں تو اسی طرح شائع کر دیں جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ آپ اس کی ضرورت نہ سمجھیں تو پھر یہ ضرور نہیں۔ آپ ایک نظر ضرور ڈال لیں۔

تصویر چھاپیں تو دو غیر معلوم صاحبوں کے نام برکاتی صاحب سے معلوم کرلیں۔ انھیں خط لکھ رہا ہوں، بھیج دیں۔

ڈکٹر نذیر احمد صاحب بخیر ہیں، ابھی تشریف لے گئے ہیں آپ کا ذکر خیر رہا۔ ان کے جانے کے بعد ڈاک آگئی۔ کل ڈکٹر سیّد امیر حسن عابدی صاحب تشریف لائے تھے۔ میں نے دلی میں ان سے آپ کے لیے ان کا مضمون دیوان مخفی طلب کیا تھا۔ وہ آئے تو جرنل عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک لیتے آئے جس میں یہ مضمون چھپا ہے۔ جلد ١٠ (١٩٩٥ء) یہ مضمون پہلے العلم بمبئی میں چھپا تھا اب اسے ٹونک والوں نے عابدی صاحب کو اطلاع دیے بغیر اپنے جرنل میں چھاپ دیا۔ کل اس مضمون کا عکس بنوالیا تھا آج بھیج رہا ہوں۔

برکاتی صاحبان کے نام کے خطوط براہ کرم ڈاک کے حوالے کر دیجیے گا۔ ایک رقعہ انیس شاہ کے نام بھی بھیج رہا ہوں۔ سمیع الدّین مصطفائی ملیں تو میرا سلام کہیے۔ وہ مجھ سے ملے

بغیر چلے گئے ۔ کوئی مجبوری ہوگی ۔ جس دن وہ مجھ سے ملنے علی گڑھ آئے اس دن ایک میٹنگ میں ایوان غالب دہلی گیا ہوا تھا ۔ پھر وہ نہ آئے ۔ انھیں میں نے کبھی کہا تھا کہ اپنے یہاں کے پوسٹ کارڈ بھیج دیجیے ۔ کبھی کبھی کسی کو صرف دو سطریں لکھنی ہوتی ہیں ان کے لیے نہیں چاہتا کہ احباب دو روپے خرچ کریں ۔ اب یہی فرمائش آپ سے ہے لیکن اس کی کوئی جلدی نہیں ۔

بوقت ملاقات ، ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام مسنون والسّلام

مخلص

مختار الدّین احمد

پس نوشت !

یہ خط لکھ چکا تھا کہ سسوان کے ایک صاحب جمال ناصر مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کا ایک نسخہ دے گئے جو مرتب نے نسرین صاحبہ کی معرفت میرے لیے بھیجا تھا ۔ اس پر تاریخ ترسیل ۲ نومبر ۱۹۹۰ء درج ہے ۔ یعنی کتاب کوئی ڈیڑھ ماہ کے بعد پہنچی ۔ انھوں نے ان خاتون کو دیا ، ان خاتون نے جمال صاحب کو دیا ، جب یہ علی گڑھ سے سسوان پہنچے تھے ، انھوں نے کوئی پندرہ دن کے بعد کتاب مجھ تک پہنچائی ۔ وہ بزرگوار اگر حیدرآباد سے ڈاک سے بھیج دیتے تو مجھے دس بارہ دن میں مل جاتی ۔

آپ کے کسی گرامی نامے میں بھی اس کی اشاعت کی کوئی اطلاع نہیں ملی ۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے اپنے نام ڈاکٹر صاحب کے خطوط کے عکس بھی آپ کو بھیج دیے تھے اور آپ نے شاید ڈاکٹر صاحب کو دے دیے تھے کہ وہ ایک نظر ان پر ڈال کر مرتب کو دے دیں ۔ اس جلد میں کوئی خط شائع نہیں ہوا ۔ یا میرا حافظہ دھوکا دے رہا ہے ، اور میں نے صرف ڈاکٹر رفیع الدین کے نام کے خطوط بھیجے تھے ۔

مرتب کے مقدّمے میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کہ سیّد صاحب کے خطوط انھیں کہاں سے حاصل ہوئے ۔

میں نے شب کے دس بجے کے بعد ، مجموعہ دیکھ لیا ۔ بڑے مفید خطوط ہیں اور بڑا اچھا کام انھوں نے کیا کہ شائع کر دیے ۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے آپ سے علمی مدد نہیں لی ورنہ اس کی ترتیب بہتر ہوتی اور ضروری حواشی بھی درج ہوتے ۔ بہرحال خطوط چھپ گئے یہی کیا کم ہے ۔ کیا ان کا ارادہ دوسری جلد کی اشاعت کا بھی ہے ؟

جو صاحب جلیل قدوائی صاحب کے خطوط شائع کر رہے تھے تو وہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے؟ لکھیے گا کہ ان کا کام کس مرحلے میں ہے۔

مورخہ ۲۶ دسمبر جو مجھے ۸ جنوری کو ملا۔ اس کا جواب اسی دن لکھ دیا تھا جس میں منسوبات کے بارے میں کچھ گزارشات تھیں

بلوچ صاحب والے مضمون کے آف پرنٹس کا خاص خیال رکھیے کہ زیادہ سے زیادہ ہوں۔ آپ کو زحمت دیتے ہوئے شرمندہ ہوں لیکن احباب تقاضا کرتے ہیں کیا کروں

ایک رجسٹری ۳ جنوری کو بھیجی ہے وہ ملی ہوگی۔

(۱۴)

علی گڑھ

۲۰-۱-۹۸ء

محترمی نجم الاسلام صاحب

السلام علیکم

مؤرخہ ۹ فروری آج جمعہ ۲۰ ماہ حال کو ملا۔ حیرت ہے کہ مشفق خواجہ صاحب کو میرا خط ۹ (فروری) تک موصول نہیں ہوا۔ جو میں نے عید کے دوسرے دن ۳۱ جنوری کو روانہ کیا تھا۔ تصحیح نامہ براہ راست آپ کو بھیجتا لیکن اس وقت اپنے میزبان کا نام یاد نہیں تھا، خیال ہوا کہ وہ لکھ کر بھیج دیں گے، ورنہ آپ کو زحمت ہوگی کہ آپ ان سے معلوم کریں۔ اگر اندازہ ہوتا کہ ٹیلیفون سے اس آسانی سے آپ لوگ بات چیت کرلیتے ہیں تو میں یہ تکلیف نہ کرتا۔ لطیفہ یہ ہے کہ خط پوسٹ کرنے کے بعد یاد آگیا کہ ان کا نام مہتاب ظفر تھا۔ خدا کرے میرا خط ۹ (فروری) کے بعد خواجہ صاحب کو مل گیا ہو اور انھوں نے تصحیح نامہ بھیج دیا ہو۔ یہ خط رجسٹرڈ نہیں تھا اس لیے خطرہ اس بات کا ہے کہ راہ میں ضائع ہوا ہو۔

عابدی صاحب کے مقالے (بابر لعیش کوش) کا پروف مرسلہ ۲۲ جنوری میں نے دکتر نذیر احمد صاحب کو دے دیا تھا جو دہلی جانے والے تھے۔ انھوں نے قاسمی صاحب کو دے دیا ہوگا۔ عابدی صاحب سے ڈاکٹر صاحب کی ملاقات غالباً نہیں ہوئی کہ وہ تین ماہ کے لیے شانتی نکیتن چلے گئے ہیں۔ دیوان مخفی والا پروف جو آج ملا ہے ڈاکٹر صاحب کے ذریعے قاسمی صاحب کو بھجوادوں گا۔ اگر اغلاط زیادہ ہوئے تو ممکن ہے وہ آپ کو تصحیح نامہ بھیجیں ورنہ وہ

اس سے صرف نظر کریں گے ۔ عابدی صاحب کب واپس کرتے ہیں نہیں معلوم ۔ پھر یہ کہ جو تصحیح آپ نے کر دی ہوگی وہ اسی کو کافی سمجھیں گے اور یوں بھی جتنی دیر میں وہ پروف پڑھیں گے اتنی دیر میں وہ ایک نیا مضمون لکھ لیں گے۔ عابدی صاحب کے "پس نوشت" کا انتظار نہ کیجیے، بھیج دیں تو بہت اچھا۔ قاسمی صاحب کو متوجہ کر رہا ہوں۔ عابدی صاحب کو شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی کے پتے پر خط لکھا جاسکتا ہے۔ یہ کارڈ مل جائے تو لکھیے گا کہ کب پہنچا۔ ایک تجربہ کر رہا ہوں ۔ سنا ہے کارڈ جلد مل جاتے ہیں۔

والسّلام

مختار الدّین احمد

پس نوشت:

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ سے آگئے اب وہ رام پور گئے ہیں ۔ قاسمی صاحب بھی دہلی سے وہاں پہنچیں گے ۔ رضا لائبریری میں مارچ / اپریل میں ایک سیمینار منعقد ہو رہا ہے ۔ گورنر یوپی نے اس کے لیے دس لاکھ منظور کیے قاسمی صاحب کو لکھ چکا ہوں پھر لکھ رہا ہوں ۔

(۱۵)

۲۶ ۔ جنوری ۱۹۹۸ء

مکرمی پروفیسر نجم الاسلام صاحب السلام علیکم

مورخہ ۱ جنوری یہاں ۱۴ کو پہنچا ۔ ممنون ہوا ۔ پروف دیکھا طباعت بہت اچھی ہے ۔ بہت حد تک صحیح چھپا ہے۔ کچھ معمولی غلطیاں نظر آئیں ایک علیحدہ کاغذ پر ان کا اندراج کر دیا ہے۔ آپ قلم سے انھیں درست کرتے جائیں اور مرسلہ کاغذ پر انھیں قلمزد کرتے جائیں ۔

اوتو اسپئیز کا سال وفات معلوم نہ ہوسکا ۔ نامورانِ علی گڑھ میں ان پر ایک مضمون چھپا ہے اس میں بھی تاریخ وفات درج نہیں ۔ میں نے صاحب مضمون کو ٹیلیفون کر کے پوچھا انھیں اب بھی معلوم نہیں ۔ میں ۱۹۵۵ء میں ان سے بون (جرمنی) میں ملا تھا غالباً ۷۰ء تک زندہ تھے لیکن اب یہ خانہ خالی چھوڑ دیجیے ۔

دکتر ضیاء الدّین مرحوم کے سنین ولادت و وفات لکھ لیے ہیں۔

جن صاحب کے یہاں اسلام آباد میں مشفق خواجہ صاحب نے میرے قیام کا انتظام

کیا تھا ان کا نام ابھی حال تک مجھے یاد تھا۔ خواجہ صاحب نے ایک خط میں ان کی تاریخ وفات بھی لکھی تھی وہ اس وقت تلاش میں نہیں ملا۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ یہ خط اور غلط نامہ (یا صحت نامہ) انھیں بھیج رہا ہوں وہ ان کا نام آپ کو لکھ کر بھیج دیں گے۔ یاد نہیں رہا وہ بدایوں کے شاعر جامی کے بیٹے تھے یا جام نوائی کے۔

آف پرنٹس زیادہ سے زیادہ بنوا کر ممنون کیجیے۔

اب آپ کے گرامی نامے سے متعلق چند گزارشات:

معین الدّین عقیل صاحب کا خط آپ نے ٹوکیو بھیج کر ممنون کیا۔ یہ آپ نے ٹھیک کیا کہ ذوالفقار مصطفےٰ کا خط خواجہ صاحب کو بھیج دیا۔ دیوان مخفی پر عابدی صاحب کے مضمون کی نقل بھیجوں گا۔ وہ یہاں آئے ہوئے تھے پانچ دن علی گڑھ میں رہ کر دہلی واپس گئے ہیں۔ ایک شام میرے یہاں بھی آئے تھے۔ آپ کا خط پہلے آجاتا تو میں ان سے دریافت کرلیتا کہ ان کا مضمون کہاں چھپا ہے اب خط لکھ کر دریافت کر کے آپ کو معلوم کراؤں گا۔

ان کا پتا مجھے کیا یہاں کسی کو معلوم نہیں۔ وہ گھر پر بہت کم رہتے ہیں زیادہ تر باہر رہتے ہیں، کبھی مخطوطات کی تلاش میں، کبھی کسی سیمینار میں مقالہ پڑھنے کے لیے اور کبھی کسی سلیکشن کمیٹی میں شرکت کے لیے۔ انھوں نے سفر اور خط کی تفریق ختم کر دی ہے۔ متقاعد ہونے کے بعد ان کا زیادہ وقت سفر میں گزرتا ہے جہاں وہ جم کر رہتے ہیں اور بہت خوش رہتے ہیں۔ گھر پر وہ مسافروں کی طرح رہتے ہیں۔ رات کسی طرح گزار کر وہ پہلی بس سے دوست احباب سے ملنے یونیورسٹی، ایوان غالب، سفارت خانۂ ایران چلے جاتے ہیں۔ دہلی میں جب رہتے ہیں تو اکثر شعبۂ فارسی ضرور جاتے ہیں اور کبھی کبھی پورا دن وہیں گزارتے ہیں۔ صدر شعبہ پروفیسر شریف حسین قاسمی ان کے شاگرد ہیں اور وہ اپنے استاد سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انھیں ہم لوگ قاسمی صاحب کے پتے پر خط لکھتے ہیں۔

سیّد امیر حسن عابدی صاحب بڑے خوش نصیب آدمی ہیں۔ شاگردوں سے انھیں بھرپور محبت ملی ہے یہ اپنے شاگردوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور ہر وقت ان کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں، وہ لوگ بھی ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ آپ انھیں قاسمی صاحب کی معرفت شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کے پتے پر خط لکھ سکتے ہیں۔

قاسمی صاحب سے ان کا مضمون طلب کیجیے، میں بھی انھیں لکھ رہا ہوں۔ ٹونک لائبریری کے جرنل میں جو مضمون دیوان مخفی پر عابدی صاحب کا چھپا ہے اس کی عکسی نقل

آپ کو روانہ کرچکا ہوں ۔ یہ مضمون پہلے بھی کہیں چھپ چکا ہے ۔ ان کا دوسرا مضمون "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" ایک مجموعۂ مقالات " ادب شناسی " مرتبہ پروفیسر آزرمیدخت صفوی صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ ۱۹۹۶ء) میں چھپا ہے یہ آپ لکھتے ہیں کہ آپ کے پاس موجود ہے ۔ یا تو اسی رسالے سے عکس بنوا کر آپ کو بھیجا گیا ہے یا ممکن ہے یہ مضمون کہیں اور پہلے چھپ چکا ہو اور اس کا عنوان وہ ہو جو آپ نے درج کیا ہے یعنی بابر بعیش کوش والا شعر کس بابر کا ہے " ۳۱ ۔ ا عابدی صاحب کے مضمون کا پروف ملا ۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلی جا رہے ہیں آج میں نے وہ پروف ان کے حوالے کیا ہے وہ عابدی صاحب یا قاسمی صاحب کو دے دیں گے۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے میں نے مضامین کے بارے میں گفتگو کی، وہ چار مضامین تلاش کر کے بھیجنے کا وعدہ کرتے ہیں ۔

دیوان قطب الدّین چشتی

ظہور الاسرار

اردو شہ پارے پر تفصیلی مضمون تحقیقی مقالات میں ہے، یہی مضمون معارف میں چھپا تھا ۔ مقیمی پر ایک مضمون جو اکبر الدّین صدیقی مرحوم کے اردو ادب میں اردو میں چھپا عید سعید کی تہنیت قبول فرمایئے۔

والسّلام

مختار الدین احمد

(۱۶)

۳۔ ۲۔ ۹۸ء

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب السّلام علیکم

غلط نامہ یا تصحیح نامہ دو تین دن ہوئے مشفق خواجہ صاحب کو بھیج دیا تھا کہ وہ ایک آدھ اضافے کے بعد آپ کو بھیج دیں ۔ ایک آدھ غلطی اور نظر آئی پروف میں لیکن وہ اہم نہیں:

ص ۹ سیّد محمد عثمان علی گڑھ میں اے کرنے کے بعد۔ ایم اے بنا دیجیے

ص ۱۲ سطر ۹ مسلمانوں کے حملوں زمانے میں۔ حملوں کے کر دیجیے

ص ۱۲ سطر ۱۶ نام یاد آگیا محتاب ظفر۔ اس ا ع کے لیے مشفق خواجہ صاحب

کو زحمت دی تھی

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

دکتر نذیر احمد صاحب کل ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے دہلی گئے ہیں وہیں سے وہ لکھنو جائیں گے۔ یہاں گورنر کی صدارت میں رضا لائبریری رام پور کی مجلس منتظمہ کا جلسہ ہے، اس سے پہلے ڈائریکٹر کے تقرر کے لیے ایک سلکشن کمیٹی بھی شاید ہونے والی ہے۔ وہ ۵ فروری تک آئیں گے۔ اس کے بعد منسوبات کے متعلق چار مضامین کے عکس بھیجنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

والسّلام

مختار الدّین احمد

(۱۷)

علی گڑھ

۳۰۔ ۳۔ ۹۸ء

مکرمی پروفیسر نجم الاسلام صاحب السّلام علیکم

رجسٹری شدہ لفافہ مرسلہ ۹ مارچ کل ملا۔ کل ہی ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے ملا۔ آپ کے خط کے ضروری اقتباسات انھیں سنائے۔ وہ علیل ہیں لیکن تحریریں آپ کے کام کی ان سے لے آیا کہ آپ کو بھیج دوں۔ میں نے اصرار کیا ہے کہ آپ ایک خط بھی نجم الاسلام صاحب کو ضرور لکھیں۔ انھوں نے لکھ کر بھیجنے کا وعدہ کیا۔

سر سیّد کے جشن میں شرکت کے لیے یہاں سے کچھ لوگ روانہ ہوئے ہیں اور تین اصحاب آج صبح روانہ ہو رہے ہیں۔ اب ~ ب یہ خط آپ کو لکھنا شروع کیا تھا کہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب خط اور آپ کے لیے دو کتابیں لے کر آئے۔ میں نے پارسل بنا دیا ہے جو دکتر اقتدار حسین صدیقی کے پاس بھجوانا ہے کہ وہ مشفق خواجہ صاحب کو کراچی میں دے دیں اور وہ آپ کو حیدرآباد بھیج دیں۔ پھر یہ رائے ہوئی کہ پارسل ایسا بنا دیا جائے کہ اقتدار صاحب ڈاک سے براہ راست آپ کو بھیج دیں۔ اس طرح آپ تک یہ کتابیں جلد پہنچنے کی توقع ہے اگر حامل کتب ذرا چستی سے کام لیں۔

باقی رہے ڈاکٹر صاحب اور میرے خط آپ کے نام تو یہ اسلوب احمد انصاری صاحب کے حوالے کر رہا ہوں کہ وہ فوراً کراچی پہنچتے ہی ڈاک کے سپرد کر دیں کہ آپ کو معلوم ہوجائے

کیا کیا مضامین آپ کو بھیجے گئے ہیں۔

اگر آپ اس کانفرنس میں شریک ہوئے تو انھیں چاہیے کہ یہ خط اسلوب صاحب اور پیکٹ اقتدار حسین صدیقی صاحب آپ کو وہیں پیش کر دیں۔

آپ کے دونوں خط (۱۴ فروری، ۹ مارچ) ملے، آف پرنٹس کی یہاں بڑی مانگ ہوتی ہے۔ موقع ہو تو تیس میں پانچ دس کا مزید اضافہ کر دیجیے۔

عابدی صاحب ابھی تک سفر سے نہیں لوٹے۔ ان کے مضامین کی جو تصحیح آپ نے کر دی ہے وہ کافی ہے، آپ شائع کر دیں۔ شریف حسین صاحب کے مضمون کا پتا نہ چل سکا میں نے لکھ دیا تھا کہ اپنے مضمون کا عکس آپ کو براہ راست بھیج دیں یا مجھے بھجوائیں۔ ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہ ایرانی دائرۃ المعارف کے کاموں میں بہت مصروف ہوگئے ہیں۔ یہ دو خط خواجہ صاحب کے ذریعے آپ کو ملیں گے۔ مضامین کی رسید بھیج دیجیے گا۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی خدمت میں سلام پہنچا دیجیے۔

والسّلام

مختار الدّین احمد

مکتوبات ڈاکٹر نذیر احمد بنام نجم الاسلام

(۱)

علی گڑھ

۳ مارچ ۱۹۹۰ء

محترم پروفیسر نجم الاسلام صاحب، سلام مسنون

معذرت خواہ ہوں کہ عرصے بعد آپ کو خط لکھنے کا موقع ملا۔ افسوس ہے کہ فی الحال تحقیق کے اصولوں پر کچھ لکھنے کی فرصت نہیں نکل رہی ہے۔ ایک پرانا مضمون معارف میں تھا۔ اس کا عکس حاصل کر کے بھیج رہا ہوں۔ یہ طویل ہے آپ حسب ضرورت اس میں ترمیم کر لیں۔ اگر مناسب خیال فرمائیں تو منسوبات کے ذیل میں اسے بھی شامل کر لیں۔

مجھے کچھ یاد نہیں کہ آپ کے پاس میرے کون سے مقالے طباعت کے لیے ہیں شاید فرہنگ کے ابداد کے سلسلے کا کوئی مقالہ آپ کے پاس ہو۔ اگر ہو اور وہ طباعت کے لیے تیار نہ کر لیا ہو تو اسے طبع نہ فرمائیں۔ ان شاء اللہ کچھ عرصے بعد آپ کی خدمت میں کوئی دوسرا مقالہ بھیج دوں گا۔ فرہنگ پر مقالہ قاضی عبدالودود یادگار نامے میں شامل کر لوں گا۔۔۔ اگر آپ نے اسے پسند فرما لیا ہو اور پروف بھی تیار کرا لیا ہو تو اسے چھاپ لیں۔ یادگار نامے کے لیے دوسرا مضمون لکھوں گا۔

فارسی زبان و ادب کا انسائیکلوپیڈیا زیر ترتیب ہے۔ اس کا نصف پاکستان میں اور نصف ہندوستان میں تیار ہو رہا ہے۔ ہندوستانی حصے کی تیاری کا کافی کام میرے ذمے ہے۔ اس کی وجہ سے میرا کام کافی بڑھ گیا ہے۔ دوسرے علمی کاموں کی طرف توجہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ ان سائیکلوپیڈیا کا کام برسوں کا ہے۔ خدا کرے یہ کام چلتا رہے اور تکمیل کے درجے تک پہنچ جائے۔

قاضی عبدالودود یادگار نامے کی جلدی ہے۔ خواہش تو یہی ہے کہ اس سال کے اختتام تک یہ کام پورا ہو جائے۔ لیکن ابھی دوستوں کی توجہ اس طرف بہت کم ہوئی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

امسال غالب سیمینار شاید کچھ بڑے پیمانے پر ہو۔ زیادہ بیرونی دانشوروں کو دعوت دینے کا خیال ہو رہا ہے۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ امسال ویزا کے حاصل کرنے میں زیادہ

رکاوٹ نہ ہوگی۔ ان شاء اللہ اس سلسلے کی کارروائی اس طرف جلد شروع ہوجائے گی۔

محترم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب کی خدمت میں میرا مؤدبانہ سلام پہنچائیں اور دعاؤں کی درخواست کریں۔ اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب۔ ایک تقریب کے سلسلے میں اپنے وطن تشریف لے گئے ہیں، امروز فردا میں واپس آنے والے ہیں۔

مخلص

نذیر احمد

(۲)

علی گڑھ

۱۹ مارچ ۱۹۹۸ء

محبّ مکرم۔ سلام مسنون۔ مجھے ندامت ہے کہ مدت سے آپ کی خدمت میں کوئی خط نہ لکھا، اس کی وجہ کاہلی کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ کام ضرور زیادہ ہے لیکن اس کے درمیان گھنٹے آدھ گھنٹے کا وقت نکال لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کتنے مستعد ہیں کہ آپ کو برابر خط لکھتے ہیں اور اس میں سارے علمی امور کا احاطہ کرلیتے ہیں۔ اس کے ذریعے میری کوتاہی کی تلافی بھی کرتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو پروف آپ نے بھیجے ان میں کچھ اصلاح کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ آپ اس کو چھپوالیں۔ فی الحال پروفیسر مختار الدین احمد کی خواہش پر چند تحریریں بھیجی جا رہی ہیں۔ اگر ان میں کچھ موضوع سے مناسبت رکھتی ہوں تو انھیں شامل کرلیں۔ جمالی اردستانی کی کچھ تصانیف جمالی دہلوی کی طرف منسوب ہوگئی ہیں۔ اس موضوع پر میں نے ایک تفصیلی مضمون رسالہ اردو ادب ۱۹۵۴ء میں شائع کیا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اگر وہ آپ کو مل سکے تو اس کو اپنی کتاب میں شامل کرلیں۔ مرحوم حسام الدین راشدی نے جمالی دہلوی کی مثنوی مہر و ماہ کو شائع کیا۔ اس کے عالمانہ مقدمے میں میرے مقالے کا کئی جگہ حوالہ دیا ہے۔ کوشش کے باوجود مجھے وہ مضمون یہاں نہیں مل سکا۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ مطہّر کا دیوان حال ہی میں خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع ہوگیا ہے۔ لیکن ابھی تک وہ مطبوعہ نسخہ مجھے نہیں ملا۔ گو اس کے مرتب عزیزی ڈاکٹر

عبدالرزاق میرے شاگرد ہیں۔ مظہر کے دیوان کی ترتیب ان کے پی ایچ ڈی کا موضوع تھا، اور علی گڑھ ہی سے ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی ملی تھی۔ بہرحال کوشش میں ہوں کہ وہ کتاب مجھے جلد از جلد مل جائے۔

زفان گویا کی دوسری جلد چھپ کر آگئی ہے ایک نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

یادگار نامۂ قاضی عبدالودود زیر ترتیب ہے۔ ہم سب لوگوں کی خواہش تھی کہ آپ کا کوئی مقالہ اس میں شامل ہوتا۔ لیکن اصرار کیسے کریں۔ آپ تو اتنے بڑے پروجیکٹ کی تکمیل میں مصروف ہیں، پاکستان کے دانشوروں کے مقالے کم ملے ہیں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے غالب نامے کے مضامین کے دو ضخیم انتخابات مرتب ہوئے ہیں۔ ایک تحقیقات دوسرا تنقیدات کے نام سے۔ ان شاء اللہ عنقریب یہ دونوں مجلات آپ کو بھیجوں گا۔

آج کل اعجاز خسروی کے انگریزی ترجمے پر نظرثانی کر رہا ہوں۔ پانچوں جلدوں پر نظرثانی کی ذمہ داری میرے سر ہے۔ دو جلدوں پر کام ختم کر چکا ہوں۔ ادھر طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ ۳۰ فروری کو گر پڑا تھا۔ فریکچر تو نہیں ہوا لیکن کمر میں کافی درد تھا۔ یہ درد ہنوز باقی ہے۔ اس کی وجہ سے علمی کاموں میں پچھلا جیسا انہماک نہیں ہے۔ آپ سے دعا کی درخواست ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب سے بھی میرے لیے دعا کی درخواست کریں۔

مخلص

نذیر احمد

تبصرے

تبصرے

۱۔ یادگار خطوط۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کے نام

مُرتّب : خالد محمود

ناشر : زبیر پبلیکیشنز، حیدرآباد، سندھ

سالِ اشاعت : ۱۹۹۸ء ضخامت : ۷۲۰ صفحات

مبصر : نجم الاسلام

یہ کتاب حال ہی میں طبع ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔ اس میں ایک سو بائیس مکتوب نگاروں کے ۴۳۰ مکتوبات شامل ہیں۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے مکتوبات کی ہے جو بصورت عکس طبع کیے گئے ہیں۔ اس طرح ایک بڑی تعداد میں مشاہیر، فضلاء اور ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے تلامذہ اور احباب و متعلقین کی شانِ خط کے نمونے محفوظ ہو گئے ہیں۔ بقیہ مکتوبات مشینی کتابت میں چھپے ہیں۔ کتاب بڑے سائز پر ہے اور ایک ایسی شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو حاوی ہے جس کا حلقۂ تعارف اور دائرۂ عقیدت و ارادت اور سلسلۂ رشد و ہدایت نہایت وسیع ہے۔ ان سب مکتوبات کا محفوظ رہ جانا کہ وہ ایک بڑے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں قابلِ تحسین ہے۔ اور جب یہ دیکھا جائے کہ اس کتاب کے مقدّمے میں جو خود مکتوب الیہ کے قلم سے ہے، یہ صراحت ملتی ہے کہ

> "ان خطوط کے علاوہ دوسرے متعدد مشاہیر کے خطوط بھی تھے۔ شاید ڈھونڈنے سے مل جائیں۔ لیکن عزیزی خالد محمود سلمہٗ کے لیے ان کی اشاعت مزید بار نہ بنے، ان کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ آں عزیز نے موجودہ خطوط ہی کی اشاعت کے لیے جو محنت کی ہے اور جو سرمایہ لگایا ہے وہ روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ یہ کوشش نہایت کامیاب ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ اس عظیم و ضخیم کتاب کی اشاعت کے بعد مرتّب، مشاہیر کے باقی ماندہ خطوط بھی کوشش

کر کے حاصل کریں گے اور طبع کرائیں گے۔

یہ کتاب اگرچہ مرتب کی اس قسم کی دوسری کوشش ہے (پہلی کوشش وہ کتاب تھی جس میں انھوں نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے تحریر کردہ خطوط مختلف مکتوب الیہم سے کوشش اور محنت کر کے حاصل کیے تھے اور "مکتوبات حضرت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں" کے نام سے شائع کیے تھے۔) اس دوسری کتاب میں مکتوبات کی ترتیب مکتوب نگار حضرات کے ناموں کی الفبائی ترتیب کے ساتھ قائم کی گئی ہے۔ یہ ایک آسان مگر کم مفید صورت ہے کیونکہ قارئین کے سامنے فاضل مکتوب الیہ کی روشن علمی و روحانی شخصیت کے قابل ذکر اور قابل توجہ پہلو نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتے ہیں۔ مثلاً مشاہیر کے خطوط جو مفید علمی نکات پر مشتمل ہیں اور مکتوب الیہ کی علمی شخصیت کو سمجھنے میں بے حد مفید ہیں، اس ضخیم کتاب میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مکتوب الیہ کی شخصیت کے دیگر پہلو مکتوبات کے آئینے میں جدا جدا نمایاں ہو کر سامنے نہیں آ پائے ہیں اور اب یہ فضلا کی توجہ کے طالب ہیں کہ ان مکتوبات کو ایک تحقیقی مطالعے کا موضوع بنا کر عمدہ نتائج اخذ کیے جائیں۔ توقع رکھنی چاہیے کہ ہمارے تجزیہ نگار اس کتاب کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں گے اور ایسے مطالعات پیش کریں گے جن سے اس عہد کی ایک نہایت بلند پایہ علمی اور روحانی شخصیت سے، مشاہیر اور تلامذہ اور متعلقین و مریدین کے روابط کو سمجھنے میں مدد ملے گی، بلکہ اس صدی کے ایک بڑے حصے کی علمی سرگرمیوں کی جھلک بھی مکتوبات کے آئینے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے مرتب علمی دنیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ مکتوبات پیش کر کے مطالعات کا بہت کچھ سامان مہیا کر دیا ہے۔

آخر میں مرتب نے اپنا ایک خط بھی بصورت عکس شامل کیا ہے جو اس قدر شدید جذبات عقیدت سے مملو ہے کہ اور کہیں یہ رنگ دیکھنے میں نہیں آیا۔ غالباً اسی جذب و جنوں کا فیضان ہے کہ بکھرے ہوئے مکتوبات کی جمع آوری اور ترتیب و طباعت کے ہفت خواں کو سر کر لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ آخری تین صفحات میں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کی تصانیف و توالیف کی ایک فہرست بھی ترتیب دے کر مرتب نے شامل کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب محترم کی چھوٹی بڑی کل مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۹۰، ہو گئی ہے۔

کتاب کی ایک بہت نمایاں اور قابل ذکر و قابل توجہ خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر

مکتوب نگار کے بارے میں مکتوب الیہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے قلم سے چند سطری تاثرات بصورت عکس شامل ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی ایک حیثیت ضمنی تذکرے کی بھی ہو گئی ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے خلف اکبر ڈاکٹر سراج احمد خاں کے نام معنون کیا گیا ہے۔

۲۔ فرہنگ زفان گویا، جلد دوم

تالیف : بدر ابراہیم
تصحیح و تحقیق و ترتیب : پروفیسر نذیر احمد
سنہ اشاعت : ۱۹۹۸ء ضخامت : ۲۳۸ صفحات
ناشر : خدا بخش لائبریری پٹنہ
مبصر : نجم الاسلام

"فرہنگ زفان گویا" فارسی کی قدیم لغتوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بخش اوّل کو دو دستیاب نسخوں کی مدد سے مرتب کرکے پروفیسر نذیر احمد نے ۱۹۸۹ء میں خدا بخش لائبریری پٹنہ کی طرف سے چھپوایا تھا۔ پھر نیشنل میوزیم کراچی کے ایک قلمی مجموعے میں شامل ایک تیسرے نسخے کا عکس دسترس میں آیا۔ اور اب انھوں نے باقی ماندہ "شش بخش" کا تنقیدی متن تیار کرکے جلد دوّم کی صورت میں شائع کرایا ہے۔

لُغت شناسی ڈاکٹر نذیر احمد کا خاص میدان ہے۔ ان کے تیار کردہ، فرہنگ قواس اور دستور الافاضل کے تنقیدی متن ایران سے چھپے ہیں۔ اور ایک اور قدیم لُغت لسان الشعرا، کا تنقیدی متن بھی وہ تیار کر چکے ہیں۔ ان کی کتاب "نقد قاطع برہان" سے بھی بخوبی ظاہر ہے کہ فارسی علم لُغت پر ان کو مہارت تامہ حاصل ہے۔

زفان گویا کی جلد دوّم میں اوّل خدا بخش لائبریری کے موجودہ ناظم، جناب حبیب الرحمن چغتائی کی طرف سے مختصر کلمات تعارف ہیں، پھر مرتب کے قلم سے "پیش گفتار" جس میں متن کتاب کے مشتملات (شش بخش، کنایات، نہایات) کا تعارف، اور نیشنل میوزیم کراچی کے مذکورۂ بالا، زیر استعمال قلمی مجموعے کا تعارف، اس کے املائی خواص، اور اس کے حواشی کا ذکر ہے (ان حواشی پر ڈاکٹر نذیر احمد کا مقالہ رسالۂ تحقیق کے شمارۂ

ششم میں شامل ہو کر چھپا تھا) اس قلمی مجموعے میں جو حواشی زفان گویا سے متعلق تھے، انھیں بطور نمونہ اپنے پیش گفتار میں پیش کیا ہے۔ پھر اس کے بعد کتاب کا متن مع حواشی مرتّب آتا ہے۔ جو ۱۸۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ آخر میں زفان گویا کے الفاظ کا اشاریہ بھی شامل ہے۔

۳۔ رضا لائبریری جرنل، رام پور شمارہ سوم

مدیر اعلیٰ : پروفیسر نثار احمد فاروقی

مدیر و ناشر : ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی، او ایس ڈی، رضا لائبریری

مقام اشاعت : رضا لائبریری، رام پور

سنہ اشاعت : ۱۹۹۶ء۔ ضخامت : ۳۴۵ صفحات

مبصّر : نجم الاسلام

لائبریری جرنل کی ایک مضبوط روایت خدا بخش لائبریری پٹنہ نے قائم کی تھی، جس کے مفرد و مشترک ایک سو دس شمارے نکل چکے ہیں۔ اس جرنل نے علم و ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک اور رسالہ "رضا لائبریری جرنل، رام پور" رضا لائبریری نے جاری کیا ہے۔ اس کے تین شمارے اب تک نکل چکے ہیں۔ تینوں شمارے بلند پایہ علمی مقالات کے حامل ہیں۔ ذیل میں اس کے تیسرے شمارے پر تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

ابتداء میں مدیر اعلیٰ پروفیسر نثار احمد فاروقی کا "حرف ابتداء" ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ اس جرنل کا برصغیر کے علمی حلقوں میں عام طور پر خیر مقدم ہوا ہے اور یہ کہ یہ لائبریری ہندوستان میں مشرقی مخطوطات کا سب سے قدیم اور سب سے زیادہ مال دار خزینہ ہے انھوں نے دو نوادر کی اجمالی طور پر نشان دہی بھی کی ہے۔ ان میں سے ایک شہنشاہ بابر کا ترکی دیوان ہے، جس پر مغل شہنشاہ شاہجہاں کے قلم سے تصدیق بھی ثبت ہے۔ ایک اور نادر کتاب تاریخ محمدّی ہے، جس کے واقعات ۶۰۶ھ سے شروع ہو کر ۱۲۰۸ھ پر ختم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں ۱۱۶۱ھ کے بعد کسی دوسرے قلم نے اضافے کیے ہیں۔ ان دونوں نوادر سے متعلق کچھ مواد بھی شامل اشاعت ہے۔ بابر کے ترکی دیوان کے ۲۴ صفحات کا عکس رسالے کے صفحات ۳۲۔۳۳ کے درمیان ملتا ہے اور "تاریخ محمدّی جلد ۲ حصہ ۱" جس کی تصحیح پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کی ہے، رسالے کے صفحات ۲۸۹ سے ۳۴۴ تک شامل ہے۔ پھر مدیر اعلیٰ اپنے

"حرف ابتدا" میں اس لائبریری کے ایک اور مختصر رسالے "یقظۃ النائمین" کو متعارف کراتے ہیں۔ یہ رسالہ بھی پروفیسر نثار احمد فاروقی کی تصحیح اور مقدمے کے ساتھ شامل اشاعت ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اس جرنل کے مقاصد میں ایک یہ بھی ہے کہ رضا لائبریری رام پور کے نادر مخطوطات کا تعارف کرایا جائے اور انھیں طبع کیا جائے۔

یوں تو اس شمارے کے سب ہی مقالات مفید اور بلند پایہ ہیں مگر چند کا ذکر اپنے ذوق و رجحان کے مطابق بطور خاص پیش کیا جاتا ہے۔ پہلا مقالہ "ایک اہم اور نادر فارسی خطی مجموعے کا انکشاف" کے عنوان سے پروفیسر نذیر احمد کا ہے۔ انھوں نے نیشنل میوزیم کراچی کے ایک قلمی مجموعے کا تعارف پیش کیا ہے۔ جس میں علاوہ دیگر مشمولات کے تین قدیم فارسی لغتوں "فرہنگ قواس" "فرہنگ زفان گویا" اور "فرہنگ لسان الشعرا" کے متن شامل ہیں۔ اس مضمون میں فاضل مقالہ نگار نے علمی دنیا کو مطلع کیا ہے کہ فرہنگ قواس کے نو دریافت نسخے کی مدد سے انھوں نے اس فرہنگ کا ایک معتبر انتقادی متن تیار کر لیا ہے۔ جو طباعت کے لیے پریس کو بھیجا جا رہا ہے۔ انھوں نے فرہنگ زفان گویا کی جلد دوم کی تیاری میں بھی اس قلمی مجموعے کو پیش نظر رکھا ہے۔ (یہ کتاب چھپ گئی ہے اور اس پر تبصرہ رسالۂ تحقیق کے اس شمارے میں شامل ہے)۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس مقالے میں لسان الشعرا سے متعلق بھی مفید معلومات پیش کی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس مقالے کے ذریعے نیشنل میوزیم کراچی کے اس نادر فارسی قلمی مجموعے کا عمدہ طور پر تعارف کرایا ہے۔

ایک اور قابل ذکر مقالہ "عبدالقیوم کی تاریخ ادب اردو کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے پروفیسر گیان چند کا ہے۔ مقالہ رد و نقد کے لحاظ سے اچھا ہے، کمزوری جو کچھ ہے انتخاب کتاب کی ہے اور سوال اٹھتا ہے کہ یہ ناتمام اور ناقص تاریخ ادب اردو کیا اس التفات کے قابل ہے کہ اس پر اس قدر توجہ کی جائے جیسا کہ کی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک اور مقالہ "ہندوستانی مشائخ کی مجالس و آثار میں شیخ عطار کا ذکر" ہے۔ جس کے لکھنے والے پروفیسر شریف حسین قاسمی ہیں۔ اس میں لباب الالباب عوفی، بو علی قلندر پانی پتی سے منسوب مثنوی گل و بلبل، فوائد الفواد، مرتبہ امیر حسن سجزی، سیر اولیا، امیر خورد کرمانی، شمائل الاتقیا، تالیف خواجہ زین الدین خلیفہ خواجہ برہان الدین غریب، ثمرات القدس، تالیف بخشی لال بیگ، ذکر جمیع اولیا، دہلی اور اسی نوعیت کی مزید چند کتابوں سے عطار کے ذکر کے حوالے دیے ہیں۔ آخر میں

صراحت کی ہے کہ فی الحال اس اجمالی تبصرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک عمدہ علمی محنت کسی مفید اور بڑے نتیجے کے بغیر تمام ہو جاتی ہے۔

ایک اور قابل ذکر مقالہ "شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور موضح قرآن" کے عنوان سے مولانا اخلاق حسین قاسمی کا ہے۔ اس میں موضح قرآن سے متعلق مفید کوائف، ترجمے کی خصوصیت، پہلے ایڈیشن کی خصوصیت، تفسیری فوائد، اور موضح قرآن کے مطالب پر مولانا ابوالکلام آزاد کے چند اشکالات سے بحث کی گئی ہے۔

ایک مقالہ "شرائف عثمانی تاریخ بلگرام کا ایک مأخذ" ہے جس کے لکھنے والے ڈاکٹر سیّد حسن عباس ہیں۔ اس میں آزاد بلگرامی کے ایک ہم عصر غلام حسن صدّیقی متخلص بہ ثمین بلگرامی کی "شرائف عثمانی" کو متعارف کرایا گیا ہے جو ۱۱۵۹ھ کی تالیف ہے۔

یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ مقالہ نگار نے اس کے مختلف دستیاب مخطوطات کی تفصیل درج کی ہے اور اس کے مشمولات (مقدمہ، ابواب و فصول اور خاتمہ) کو بھی اجمالاً متعارف کرایا ہے۔ کتاب کے درمیانی اوراق میں کچھ فرامین کی نقلیں بھی ہیں جن کے اصلی یا جعلی ہونے کے بارے میں بقول مقالہ نگار فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ایک اور مقالہ "حیات امیر مینائی، کچھ نئے ماخذ" کے عنوان سے ڈاکٹر محمدؐ شعار اللہ خاں کا ہے۔ مقالہ نگار کو صولت پبلک لائبریری رام پور میں ہفتہ وار اخبار مفید عام آگرہ کا ۱۰ نومبر ۱۹۰۰ء کا شمارہ دستیاب ہوا جس میں عبدالجبار خاں آصفی م ۱۹۲۶ء کے قلم سے امیر مینائی کے سفر دکن کا حال اور علالت و وفات کی تفصیلات درج ہیں۔ مقالہ نگار نے اپنے تعارفی کلمات کے بعد اس نادر تحریر کو نقل کر دیا ہے۔

بقیہ مقالات بھی قابل توجہ اور قابل مطالعہ ہیں۔ لائبریری جرنلوں کی اس روایت کو ہمارے زمانے میں اولاً خدا بخش لائبریری جرنل نے قائم کیا تھا، اب رضا لائبریری نے اس روایت کو مستحکم کر دیا ہے۔ فی الحقیقت اعلیٰ پائے کے ذخائر مخطوطات رکھنے والی لائبریریوں میں ایسے جرنلوں کا اہتمام علمی دنیا کی ایک اہم خدمت ہے جس کا اجرا، ہمارے ملک کے بڑے اور اہم ذخائر مخطوطات رکھنے والی لائبریریوں کو بھی کرنا چاہیے۔

۴۔ حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات، جلد دوّم

مصنّف : ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی

سنہ اشاعت : ۱۹۹۵ء ۔ ضخامت : ۵۲۰ صفحات

ناشر : مجلس ترقّی ادب لاہور

مبصّر : نجم الاسلام

اس کتاب کی پہلی جلد پر جو ۵۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، رسالۂ تحقیق کے شمارہ ہفتم میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد جلد دوّم (صفحہ ۵۰۱ تا ۱۰۹۰) چھپ کر سامنے آئی۔ یہ جلد کتاب کے آخری پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوانات یہ ہیں: شیرانی کی متفرق تدوینی خدمات، شیرانی بہ لحاظ ناقد ادب، شیرانی بحیثیت مورخ، شیرانی اور دیگر علوم، شیرانی کا اسلوب نگارش۔

چند جزوی امور سے قطع نظر، یہ حصّہ بھی عمدہ طور پر لکھا گیا ہے اور اس کی تصنیف پر مصنّف کو مبارک باد پیش کی جاتی ہے۔ شیرانی کے احوال و آثار کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو رہ گیا ہو۔

باب ششم چار اجزا، یا مدارج پر مشتمل ہے۔ اس کے دوسرے جزو میں جو لازمی مدارج کے عنوان سے ہے، ذیلی عنوانات متنی تعیّن، تصنیفات کے غلط انتسابات کی تردید اور اصل مصنّف کا تعیّن، اور تصنیفات کا عصری تعیّن آتے ہیں۔ ان ذیلی عنوانات کے تحت تحقیقِ منسوبات سے متعلق شیرانی کے کام پر عمدہ تصریحات ملتی ہیں، بالخصوص کلّیاتِ انوری اور شاہنامۂ فردوسی میں الحاقی عناصر کے ذیل میں' فردوسی سے منسوب کلام مجہول اور ہجو سلطان محمود کے ذیل میں' اور دیوان ذوق مرتّبہ آزاد میں الحاقی عنصر کے ذیل میں۔ تصنیفات کے غلط انتسابات اور اصل مصنّف کی تعیین کے ذیل میں فردوسی سے منسوب یوسف زلیخا، عطّار سے منسوب مجہول تصنیفات، دیوان منسوب بہ خواجہ معین الدّین چشتی اجمیری، اور قصّۂ چہار درویش کے امیر خسرو سے منسوب ہونے پر شیرانی کے تحقیقی کام کا احاطہ کیا گیا ہے اور شیرانی کے دلائل کی عمدہ طور پر نشان دہی کی گئی ہے۔ قصّۂ چہار درویش کے ذیل میں انھوں نے میر احمد کے دیباچے سے متعلق شیرانی کی چوک کو منصفانہ طور پر تسلیم کیا ہے مگر یہ صراحت بھی کی ہے کہ اس سے شیرانی کے اصل کام کی اہمیت کم نہیں

ہوئی ۔ یہ صراحت بالکل درست ہے اور شیرانی یہ ثابت کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں کہ قصۂ چہاردرویش امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔ "تصنیفات کا عصری تعین" کے تحت "پرتھی راج راسا" سے متعلق شیرانی کے تحقیقی کام کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس ذیل میں تاریخی دلائل اور تہذیبی، لسانیاتی اور ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ نیز متفرق فاحش اغلاط کو بھی جن کی نشان دہی شیرانی نے کی ہے ۔ بیان کیا ہے۔

باب ہفتم میں "شیرانی بہ لحاظ ناقد" کے عنوان کے تحت شیرانی کے تنقیدی سرمائے کا جائزہ لیا ہے ۔ اور اس کے ذیل میں شیرانی کی تبصرہ نگاری پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

باب ہشتم میں عنوان "شیرانی بحیثیت مورخ" کے تحت زیادہ تر تاریخی تحقیق میں شیرانی کے طریق کار سے بحث ہے اور تاریخ کے بعض اہم مسائل میں شیرانی کے موقف کو بھی بیان کیا ہے ۔ غرض کہ بطور مورخ شیرانی کی اہم خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جو کم و بیش سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

باب نہم "شیرانی اور دیگر علوم و فنون" کے عنوان سے ہے ۔ اس کے تحت علم عروض ۔ شعر و شاعری ۔ علم مسکوکات ۔ آثار عتیقہ ۔ کتابت و طباعت اور تعلیم و تدریس کے ذیلی عنوانات کے تحت شیرانی کی مہارتوں کا عمدہ طور پر جائزہ لیا ہے ۔ شیرانی کی شعر و شاعری کو یوں تو ان کی ادبی زندگی میں ہمیشہ ثانوی درجہ حاصل رہا۔ لیکن کبھی کبھی کلام چھپا ہے۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کے رسالہ آج کل دہلی میں شیرانی کی پہلی برسی کے موقع پر جہاں ان کے احوال و آثار پر ایک عمدہ مقالہ چھپا تھا وہیں ان کا کہا ہوا ایک اردو قصیدہ بھی نمایاں طور پر چھپا تھا۔

گر کروں شرح ستم گاری تحریر جبیں　　عرصۂ حشر بنے میرے قصیدے کی زمیں

جو شیرانی کی پختہ کارانہ شعر گوئی پر دال تھا ۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے شیرانی کی شعر گوئی کے بہت سے نمونے اس حصے میں شامل کیے ہیں اور قصیدۂ مذکورہ بالا کے چند شعر بھی نقل کیے ہیں۔

باب دہم اس کتاب کا آخری باب ہے جس میں شیرانی کے اسلوب نگارش کی لسانی ، فکری اور شخصی پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ استشہاد و استدلال پر مبنی حصوں میں ان کا اسلوب کیا ہے ۔ مجموعی طور سے شیرانی کے اسلوب میں فنی محاسن کی نشان دہی

بھی کی ہے اور بجاطور یہ ثابت کیا ہے کہ شیرانی کے اسلوب میں ان کی شخصیت کا پر تو ہے

ہر باب کے حواشی اس باب کے آخر میں دیے گئے ہیں اور کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریہ بھی ہے۔ اس مقالۂ علمی کی تحقیق و تصنیف پر اور اس کے تمام و کمال چھپ کر شائع ہوجانے پر نہ صرف فاضل مصنّف کو بلکہ عمدہ پیشکش پر ناشر کو بھی مبارک باد پیش کی جاتی ہے۔

۵۔ رضا لائبریری کی علمی وراثت

مُرتّب : ڈاکٹر سیّد حسن عباس

سنہ اشاعت : ۱۹۹۶ء۔ ضخامت : ۱۳۶ صفحات

ناشر : رضا لائبریری رام پور

مبصّر : نجم الاسلام

یہ کتاب رام پور رضا لائبریری کا تعارف نامہ ہے جسے بڑے سائز پر چھاپا گیا ہے۔ اس میں فضلاء کے ایسے مقالات جمع کیے گئے ہیں جو یا تو کتاب خانے کی اہمیت کو مجموعی طور پر اجاگر کرتے ہیں یا اس کتاب خانے کے مخطوطات اور خطاطی و مصوری کے نمونوں سے متعلق ہیں۔ اس کتاب خانے میں نادر مخطوطات کے علاوہ خطاطی اور مصوری کے بھی عمدہ نمونے موجود ہیں۔ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی کے قلم سے ہے جو کتاب خانے کے موجودہ افسر بکار خاص ہیں۔ جن فضلاء کے مقالات شامل ہیں ان میں مولانا امتیاز علی عرشی اور حافظ احمد علی خاں شوق رامپوری بھی ہیں۔ یہ دونوں مرحوم فضلاء اس کتاب خانے کے ناظم رہے ہیں۔ دیگر مقالہ نگاروں میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، مولانا سیّد ہاشم ندوی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ساغر نظامی، شبیر علی خاں شکیب، ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی، سیّد احمد رام پوری اور مُرتّب ڈاکٹر سیّد حسن عباس کے مقالات بھی قابل ذکر اور قابل توجہ ہیں

آخر میں رضا لائبریری جرنل پر ایک ماہنامے کا تبصرہ بھی نقل کیا گیا ہے۔ کتاب کا سرورق رضا لائبریری کی موجودہ عمارت "حامد منزل" واقع قلعۂ رام پور کی ایک خوب صورت رنگین تصویر سے مُزیّن ہے۔ چند مصوّر مخطوطات کے صفحات کی رنگین عکسی تصاویر بھی شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ رضا لائبریری کی علمی وراثت سے متعلق جاذب توجہ اور پُر از معلومات تحریریں اور عکس اس تعارف نامے میں شامل ہیں۔

۶۔ مطالعۂ ادبیات فارسی

مصنّف : ڈاکٹر وحید قریشی

سنہ اشاعت : ۱۹۹۵ء۔ ضخامت :

ناشر : پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔

مبصّر : نجم الاسلام

یہ کتاب فاضل گرامی ڈاکٹر وحید قریشی کے ستائیس اردو مقالات اور ایک انگریزی مقالے پر مشتمل ہے۔ سب کے سب مقالے فارسی ادب سے متعلق ہیں۔ اس مجموعۂ مقالات کو پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور نے اپنے شاندار علمی و تعلیمی خدمات کے ایک سو پچیس سال مکمل کرنے کی مناسبت سے شائع کیا ہے۔

فاضل مصنّف اس کالج کی علمی اور تحقیقی وراثتوں کے حامل اور امین ہیں۔ ان کی علمی تربیت میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جیسے بلند پایہ محقق اور فاضل کی رہنمائی شامل حال رہی ہے۔ ان سب مقالات سے جو اس کتاب میں شامل ہیں، فارسی زبان و ادب اور بالخصوص برصغیر کے فارسی ادب پر مصنّف کی ماہرانہ دسترس اور آگہی بخوبی ظاہر ہے۔ منہاج تحقیق بھی جو ان مقالات میں برتی گئی ہے، محکم اور مستدل ہے، ہمارے طالبان تحقیق اس مجموعۂ مقالات سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

۷۔ المصداق

مدیر منتظم : شاہ انجم بخاری

سنہ اشاعت : ۹۸۔ ۱۹۹۷ء۔ ضخامت: ۱۱۲ صفحات

ناشر : مجلس شیخ عبدالحق محدّث دہلوی، حیدرآباد، سندھ۔

مبصّر : نجم الاسلام

یہ کتابی سلسلے کا دوسرا شمارہ ہے۔ اس سلسلے کو مجلس شیخ عبدالحق محدّث دہلوی حیدرآباد سندھ کے تحقیقی مجلّے کے بطور جاری کیا گیا ہے۔ اس کا مزاج علمی ہے۔ زیادہ تر مقالات شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کی تعلیمات اور مصنّفات کے تعارف سے متعلق ہیں۔ ان کے عنوانات یہ ہیں۔ مسلک شیخ عبدالحق محدّث دہلوی قدس سرّہ (عبدالحکیم شرف قادری) شیخ

محقق اور ان کی شاعری (محمد شہزاد مجددی) ۰ مدارج النبوہ اور چند شہادت کا ازالہ (خادم حسین قریشی) اور تعلیمات حضرت شیخ محقق مکتوبات کی روشنی میں (شاہ انجم بخاری) ۰ اس اشاعت میں فضلاء کے خطوط بھی شامل ہیں۔ اس حصے میں ۰ دیگر فضلاء کے علاوہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۰ ڈاکٹر مختارالدین احمد اور حکیم محمود احمد برکاتی کے مکتوبات بھی ہیں۔ اس علمی رسالے کے اجراء پر مجلس شیخ عبدالحق محدث دہلوی حیدرآباد کے اراکین کو مبارکباد پیش کی جاتی ہے۔

۸۔ اقبال اور ظفر علی خاں

مصنف : جعفر بلوچ

سنہ اشاعت : ۱۹۹۵ء ضخامت : ۲۸۶ صفحات

ناشر : اقبال اکادمی پاکستان لاہور

مبصر : نجم الاسلام

اقبال اور ظفر علی خاں اسلامیان برصغیر کے دو ایسے اکابر ہیں جن کی ملی اور ادبی خدمات اور سیاسی سرگرمیاں بہت سے مشترک گوشے رکھتی ہیں ۰ گو کہ دونوں کا مزاج اور انداز فکر جداگانہ ہے۔ دونوں نے لاہور میں رہ کر ملت اور علم و ادب کی خدمات انجام دیں ۰ اشتراک عمل کے لیے متعدد مواقع آئے۔ اس کتاب کے مصنف نے ان دونوں اکابر کی زندگیوں کے ان مشترک گوشوں اور باہمی روابط کو عمدگی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ کتاب دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

۹۔ انفاس امدادیہ

مصنف : لطیف اللہ (ناظم آباد ۰ کراچی)

سنہ اشاعت : ۱۹۹۵ء ضخامت : ۲۰۲ صفحات

ناشر : ادارۃ النشر المعارف ۰ کراچی

مبصر : نجم الاسلام

قبلاً ۰ مصنف کے دو تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں ۔ ایک غایۃ الامکان فی درایۃ المکان کا اردو ترجمہ مع متن فارسی جو ان کی تحقیق کے مطابق عین القضاۃ ہمدانی کا فارسی رسالہ ہے۔ دوسری کتاب محمد صادق کشمیری کی تالیف کلمات الصادقین ہے جسے انھوں نے فارسی سے

اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے

اس زیر تبصرہ کتاب " انفاس امدادیہ " میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے سوانح ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں اور ان کی تعلیمات اور روحانی کارناموں کی تفصیل بھی ہے۔ شوق و محنت کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر کی گذشتہ صدی میں اسلامیان برصغیر کی اہم ملی اور روحانی شخصیتوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں ۔ کچھ شعر و شاعری سے بھی ذوق تھا، جیسا کہ ان کے مجموعۂ کلام " گلزار معرفت " سے ظاہر ہے۔ مکتوبات بھی خاصی تعداد میں دستیاب ہیں۔ کتاب کے مصنف کو حاجی امداد اللہ کے جو مکتوبات دستیاب ہوئے ان کی تعداد ایک سو گیارہ تک پہنچتی ہے۔ کتاب کا انتساب مصنف نے اپنے مرشد ڈاکٹر غلام محمد (م ۱۹۹۳ء) کے نام کیا ہے۔

۱۰۱۔ تحقیقی نقوش

مصنف : شفقت رضوی

سنہ اشاعت : ۱۹۹۵ء ضخامت : ۱۵۶ صفحات

ناشر : بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی

مبصر : نجم الاسلام

یہ مصنف کے پانچ مقالات کا مجموعہ ہے جن کے عنوانات یہ ہیں ۔ ۱۔ عارف الدین خاں عاجز: حیات و کلام ۲۔ ضیاء الدین پروانہ مع متن انوار السراج ۳۔ عنایت اللہ خاں فتوت اور مثنوی " دُرِ معنوی " ۴۔ مہ لقابائی چندا ۵۔ کچھ بیان سراپا کا ۔ یہ سب مقالات " دکنیات " سے متعلق ہیں اور اس میدان میں مصنف کی ماہرانہ دسترس کے آئینہ دار ہیں ۔ ان مقالات کے ذیل میں " انوارالسراج "، " دُرِمعنوی "، ایمان شاعر کہا ہوا سراپا " مسدس در تعریف ماہ لقابائی" بھی نقل کر دیا ہے۔ مصنف قبلاً مہ لقابائی چندا کا دیوان مرتب کر چکے ہیں جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا تھا، اس مجموعۂ مقالات میں، مہ لقابائی کا مرقع، کتبۂ مزار اور مقبرے کے عکسی تصاویر بھی شامل کی ہیں ۔ آخر میں بہادر یار جنگ اکیڈمی کی فہرست مطبوعات بھی درج ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ اکیڈمی سرگرمی سے اپنے سلسلۂ مطبوعات کو جاری رکھے ہوئے ہے اور اب تک ۱۹ کتابیں شائع کر چکی ہے ۔ مصنف شفقت رضوی کی تصنیف کردہ کتابوں کی فہرست بھی شامل ہے جس کے مطابق (تحقیقی نقوش کو شامل کر کے) ان کی بارہ کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔

۱۱۔ شبلی کا ذہنی ارتقاء

مصنف : ڈاکٹر سید یحییٰ ہاشمی

سنہ اشاعت : ۲۰۰۱ء ۔ ضخامت ۔ ۵۲۰ صفحات

ناشر : مجلسِ یادگارِ ہاشمی ، کراچی

مبصر : انعام الحق عباسی

یہ مرحوم ڈاکٹر سیّد یحییٰ احمد ہاشمی کا مقالۂ تحقیق (۱۹۶۵ء) ہے جو بعد از مرگ شائع ہوا ہے اور غالباً ۲۰۰۱ء میں چھپ کر سامنے آیا ہے ۔ مرحوم سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو رہے ہیں ۔ ۱۹۹۵ء میں حج کی غرض سے مکۂ معظمہ گئے اور وہیں وفات پائی ۔

یہ ایک ضخیم اور مبسوط مقالہ ہے۔ اس میں شبلی کے ذہنی ارتقاء یا زندگی کا سال بہ سال جائزہ ہے جو ۱۸۸۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۴ء پر تمام ہوتا ہے ۔ اس طرح چونتیس برسوں کی روداد شبلی کی حیات اور کارناموں کے حوالے سے قلم بند ہوئی ہے ۔ اس میں ابواب و فصول جو کچھ ہیں یہی سنہ ہیں یعنی ہر سنہ کو ایک باب کا سرنامہ بنایا گیا ہے اور اس سنہ کے دوران شبلی کی جملہ علمی و ادبی سرگرمیوں کا حال مستند حوالوں کے ساتھ درج کیا گیا ہے ۔ ہر سنہ کی تفصیل کے خاتمے پر حواشی بھی ملتے ہیں جس سے بیانات کا ماٗخذ معلوم ہو جاتا ہے ۔ اس طرح شبلی کی علمی اور معاشرتی زندگی اعظم گڑھ میں وکالت سے شروع ہو کر وفات کے وقت تک عمدہ طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے ۔

اگرچہ شبلی کے ذہنی ارتقاء سے متعلق جداگانہ طور پر تو کوئی باب نہیں ہے جس میں شبلی کی علمی و ذہنی زندگی کے نشیب و فراز سے متعلق نتائج اخذ کر کے پیش کیے گئے ہوں ۔ لیکن جو کچھ تفصیلات بیان ہوئی ہیں وہ شبلی کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں یقیناً رہنمائی کرتی ہیں ۔ اس مقالے کا انداز تحریر اور انداز تحقیق ڈاکٹر ہاشمی نے اپنے استاد اور نگراں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے ایک مشہور مقالے " حالی کا ذہنی ارتقاء " سے لیا ہے اور ڈاکٹر صاحب محترم ہی اس مقالے کے نگراں تھے ۔ کتاب کے آغاز میں " آہ ! میرے ہاشمی " کے عنوان سے ایک تعزیتی تحریر بھی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے قلم سے شامل ہے ۔ 'حرفِ سپاس' ڈاکٹر ہاشمی کے صاحب زادے پروفیسر سیّد زبیر احمد ہاشمی نے لکھا ہے ۔

یہ مقالہ دبستان شبلی کے حوالے سے ایک اہم علمی خدمت قرار دیے جانے کے لائق ہے اور مجلس یادگار ہاشمی کو اس کی اشاعت پر مبارک باد پیش کی جاتی ہے ۔ کتاب مشینی

کتابت میں طبع ہوئی ہے اس طرز کتابت کی اپنی مجبوریاں ہیں جو اس کتاب میں بھی جا بجا نظر آتی ہیں ۔ ایسی ضخیم کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریے کا ہونا ضروری تھا اگر یہ کتاب مصنف خود اپنی زندگی میں اپنی نگرانی میں طبع کراتے تو ضرور اس طرف توجہ کرتے کیوں کہ وہ ان متعلقاتِ کتاب کی اہمیت سے بہ خوبی آگاہ تھے اور امکاناً - طویل اقتباسات بھی ان کے قلم کی زد میں آجاتے۔

۱۲۔ نیرنگِ اُندلس

مُصنّف : منظور الٰہی

سنہ اشاعت : ۱۹۹۶ء ۔ ضخامت ۔ ۲۸۲ صفحات

ناشر : سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور ۔

مبصّر : نجم الاسلام

شیخ منظور الٰہی ایک منفرد انداز تحریر اور توانا فکر رکھنے والے مصنّف کی حیثیت سے پہلے ہی بخوبی متعارف ہیں ۔ انسانی رشتوں کا جیسا محبت آمیز احترام ان کے تحریر کردہ خاکوں میں ملتا ہے وہ بھی ان کی پُر تاثیر انشاء پردازی کا ایک بڑا حوالہ بنتا ہے ۔ لیکن اس وقت تو ان کی تازہ تر تصنیف " نیرنگِ اندلس " کو اپنے قارئین سے تعارف کرانا مقصود ہے ۔

کتاب جس موضوع پر لکھی گئی ہے وہ بجائے خود مسحور کن ہے ۔ یہ ایک ایسے عہد رفتہ کی بازیافت ہے جسے اقبال نے اپنی پوری فکری و فنّی توانائیوں کے ساتھ " مسجد قرطبہ " کی شکل میں ہمارے شعور کی گہرائیوں میں بسایا تھا ۔ مصنّف کتاب نے اس جاگزیں ملی تصوّر کو ادبیت ، حکمت ، اور تاریخ کے عناصر کی ترکیب سے تازگی بخشی ہے ، اور اپنی پُر تاثیر نثر کا جادو جگایا ہے ۔ اس میں کچھ دخل اردو و فارسی اشعار کے موزوں و برجستہ استعمال کا بھی ہے جو ان کی سابقہ تحریروں کی طرح ، اس کتاب میں بھی ملتا ہے اور جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو و فارسی اشعار کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں ۔

اس کتاب میں بیس ابواب ہیں ، جن کے عنوانات (رہ نوردِ شوق ، فتح مبین ، موسیٰ بن نصیر ، صقر قریش ، عروس البلاد ، طاؤس و رباب آخر ، راز ریگو السیہ ، اشبیلیہ ، جنگِ بازیافت ، بالآخر غرناطہ ، دمِ واپسیں ، ادارۂ تفتیش و احتساب ، انتظامیہ ، امارت کا مأخذ ، ثقافت ، شاعری ، فلسفہ ، زوال و سقوط کی وجوہات ، اور مسلم ہسپانیہ کی میراث) مجموعاً ایک ایسی تصویر

پیش کرتے ہیں جس میں بصیرت و بصارت کی تسکین کے بہت سے گوشے ہیں ۔ امور حکومت کے تجزیے اور عروج و زوال کے اسباب کی تحلیل سے متعلق بحثوں یا مختصر یاد داشتوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ مُصنّف نے اُندلس کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ کے اس عہد کی روح تک پہنچنے کے لیے بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ پڑھا ہے ۔ کتاب کے آخر میں کتابیات بھی درج ہے جس میں چھے اردو اور بارہ انگریزی مصادر و منابع کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ اس طرح ، یہ محض تاثراتی تحریر نہیں ہے بلکہ اس کتاب کی بنیاد مطالعۂ تاریخ پر رکھی گئی ہے ۔ اس عمدہ ادبی و علمی پیش کش پر مُصنّف اور ناشر کو مبارک باد پیش کی جاتی ہے ۔

۳۱۱۔ نعت رنگ (پانچ شمارے)

مدیر : صبیح رحمانی

سن اشاعت : اپریل ۱۹۹۵ء تا فروری ۱۹۹۸ء

ناشر : اقلیم نعت ، کراچی

مبصّر : سیّد جاوید اقبال

یہ ایک کتابی سلسلہ ہے ۔ جس کے پانچ شمارے ہمارے پیش نظر ہیں قابل لحاظ ضخامت (پانچواں شمارہ ۳۳۱ صفحات) اور خوب صورت پیش کش کے ساتھ اس کو نکالا گیا ہے ۔ ہر شمارہ عمدہ اور خیال انگیز مضامین کے ساتھ شائع ہوا ہے ۔ ایک ہی موضوع پر اتنی تازگی اور اتنے تنوّع کے ساتھ مضامین حاصل کرلینا بجائے خود موجبِ حیرت ہے ۔ خدا کرے کہ یہ تنوع اور تازگی آئندہ بھی برقرار رہے ۔ اس کے ہر شمارے پر اظہار خیال اور تبصرہ و تعارف تو یہاں ممکن نہیں البتہ مطالعے کے بعد جو مجموعی تأثر ابھرتا ہے اسے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ۔

ان شماروں میں اردو نعت کی تاریخ ، اردو نعت کی تنقیدی تاریخ ، مسلم معاشرے میں نعت کی اہمیت و افادیت ، اردو نعت کے اسالیب بیان ، اردو نعت کی صنفی بحث اور نعت فہمی سے متعلق قابل لحاظ مواد فراہم کیا گیا ہے ۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ اتنے بہت سے اہل قلم حضرات نے تازگی کے ساتھ نعت کے فکر و فن سے متعلق مقالات لکھے ہیں ۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ ان کوششوں کی یہ بدولت دور جدید میں نعت کے تازہ تر رجحانات سے متعلق عمدہ مطالعات اس کتابی سلسلے کے ذریعے سامنے آتے رہیں گے ۔

۱۴۱۔ مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں ، جلد اول

مُرتّب : خالد محمود

سنہ اشاعت : ۱۹۹۷ء ۔ ضخامت : ۳۹۲ صفحات

ناشر : زبیر پبلی کیشنز ، لطیف آباد ، حیدر آباد

مُبصّر : سیّد جاوید اقبال

تصنیف و تالیف کے میدان میں یہ مرتب کی پہلی کوشش ہے۔ مکتوب نگار استاذ الاساتذہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں ہیں جو اس دور کے ایک نہایت ممتاز عالم اور محقق ہیں اور جن کا حلقۂ تعارف بے حد وسیع ہے۔ وہ کثیر الاشغال ہیں۔ وسیع علمی سرگرمیوں کے ساتھ ، تلامذہ و احباب اور مریدین کا بھی ایک وسیع حلقہ ہے جو اندرونِ ملک ہی نہیں ، بیرونِ ملک بھی پھیلا ہوا ہے۔ ان کے مکتوبات کو جمع کرلینا بجائے خود قابلِ تحسین ہے۔ مُرتّب نے یہ کام خوبی اور محنت سے کرلیا ہے۔ مکتوبات سے مکتوب نگار کی ممتاز شخصیت کے جو پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں اگرچہ خود مُرتّب نے انھیں اپنے مطالعے کا موضوع نہیں بنایا ہے ، تاہم دوسروں کے لیے مطالعے کا وافر سامان مہیا کر دیا ہے ۔ متعدد مکتوبات علمی نکات کے حامل ہیں اور سوانحی پہلو بھی رکھتے ہیں ۔ مجموعے میں ۴۵ مکتوب الیہم کو لکھے ہوئے مکتوبات شامل ہیں ۔ اوّل عرضِ مُرتّب کے عنوان سے مُرتّب کی ایک مختصر تحریر ہے ، پھر چودھری عبدالحمید جالندھری کا مختصر مُقدّمہ ہے۔ مجموعے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر مکتوب الیہ کے بارے میں فاضل مکتوب نگار نے پائینِ صفحہ اپنے قلم سے چند سطروں میں تعارفی کلمات و تاثرات بھی لکھے ہیں۔ یہ بات نادر ہے اور مفید بھی کہ ایسا کسی اور مجموعۂ مکتوبات میں اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔

رفتارِ تحقیق

○ ۱۹۹۸ء میں جناب عدنان محمود صدیقی کو ان کے مقالے "مرزا فرحت اللہ بیگ: شخصیت اور فن" پر سندھ یونیورسٹی کی طرف سے ایم فل اردو کی ڈگری کے لیے کامیاب قرار دیا گیا۔ ان کے مقالے کے نگراں ڈاکٹر نجم الاسلام تھے۔

○ ۱۹۹۰ء ہی میں، شعبۂ تعلیمات حکومت بلوچستان کے نامزد کردہ اسکالر جناب ضیاء الرحمن کو ان کے مقالے "

The Culture of present-day Baluchistan
in Urdu literature of Pakistan.

" پر سندھ یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے کامیاب قرار دیا گیا۔ ان کے مقالے کے نگراں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں تھے۔

مجالسِ تحقیق و مذاکرہ

۱۹۹۶-۹۷ء کے دوران بوجوہ مجالس تحقیق و مذاکرہ منعقد نہیں ہو سکیں۔

and Persian literature.

4. *"GOSHA-I TAHQIQ-I MANSUBAT":*

Thirteen articles pertaining to the researches on problems of un-identified authorship, false ascriptions, interpolations, forgeries and wrong attributions, mainly with reference to Urdu and Persian literature. Articles contributed by Dr.Ghulam Mustafa Khan, Dr. Nazir Ahmed, Hakim Muhammad Musa of Amitsar, Dr. Sayyid Hasan Abbas , Syed Jawed Iqbal, Hina 'Ambarin, Dr. Najmul Islam, as well as Urdu translations of the articles written by four contemparary Persian scholars of Iran.

5. *"GOSHA-I TAHQIQ-I MANSUBAT": PART 2*

Forty six selected articles, on the various aspects of 'Mansubat' (false ascriptions etc.), published during the last 100 years of Urdu scholarship.

6. *"MAKTUBAT":*

19 academic letters written by Dr. Mukhtaruddin Ahmed and Dr. Nazir Ahmed to Dr. Najmul Islam.

7. *REVIEWS ON BOOKS AND PERIODICALS:*

Reviews on 14 books and periodicals written by Dr. Najmul Islam, Sayyid Jawed Iqbal and Inamul Haq 'Abbasi.

50th Anniversary Celebrations of the University of Sind (1947-97).

TAHQIQ, VOL. 10-11, 1996-97

Research Journal of the Dept. of Urdu, University of Sindh, Jamshoro, Pakistan.

A GLIMPSE OF THE CONTENTS

1. *"GOSHA-I BALOCH":*

'Felicitation Corner' in honour of Dr. Nabi Bakhsh Khan Baloch, Professor Emeritus, formerly Vice-Chancellor of the University of Sindh, comprising

(a) articles on his life and works,

(b) a complete list of his published works, and

(c) six articles contributed by him.

2. *"MINHAJ-I TAHQIQ": (METHODOLOGY OF RESEARCH)*

(a) Mrs. Nagina Perween Thaheem: "Wapasi Tarjama Technique", on back-translation technique as applied in cross-cultural research.

(b) Mr. Zahid Munir 'Amir: "Tadween: Mi'yari Uslub Ki Talash", on 'literary editing — a search for better methodology'.

3. *"MAQALAT": (ARTICLES)*

Twelve articles, contributed by Dr. Ghulam Mustafa Khan, Dr. Nazir Ahmed, Dr. Najmul Islam, Dr. Asafa Zamani, Sayyid Muhammad Saleem and Dr. Qamar Jahan Mirza, on various topics pertaining to Urdu